جلد سوم
اللہ
نور السمٰوٰت والارض
نقوش
قرآن نمبر
0305 6406067
PDF Book Company

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ
نقوش قرآن نمبر
شمارہ نمبر ۱۴۵
۲۰۰۱ء
بانی: محمد طفیل
مدیر: جاوید طفیل
خط و کتابت کا پتا
نقوش ○ اُردو بازار ○ لاہور
فون: ۷۳۵۲۵۷۵-۷۲۳۶۵۱۶
۷۳۱۱۲۹۱
فیکس: ۹۲-۴۲-۷۲۲۹۳۸۹
قیمت فی جلد=/۲۵۰ روپے
جاوید طفیل نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اُردو لاہور سے شائع کیا۔

فہرست

جلد سوم

توحیدِ الٰہی

فکرِ الہامی ذکرِ انسانی

وُجود باری تعالیٰ اور مُسلم عُلما و مُفکرین

نقوش قرآن نمبر کے بارے میں اہلِ علم کی آراء

طلوع

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا

ہمارے پروردگار تیری رحمت اور علم ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے

المومن - ۷

○

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہ سکو گے۔

ابراہیم - ۳۴

○

ارض و سما میں جو کچھ بھی ہے وہ سب وجودِ انسانی کے لیے اللہ کی رحمت و نعمت ہے۔

انسان اپنے تمام تر علم و فہم اور مادی ترقی کے باوجود اللہ کی ان گنت رحمتوں اور مہربانیوں کو شمار کرنے اور ان کا شکر بجا لانے سے قاصر ہے اور رہے گا، لیکن اُس کی رحمتوں کی نہ رُکنے والی بارش بھی ہمیشہ سے پوری کائنات میں جاری ہے اور رہے گی۔

جاوید طفیل

الله
المجيد
الباعث
الشهيد
الحق
الوكيل
القوي
المتين
توحیدِ الٰہی

توحید

اور

اس کے ایجابی اصول و ارکان

سید سلیمان ندوی

توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزاء کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں، مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہو سکتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دے دیا گیا تھا، یک قلم محو کر دیا۔ بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتب، منقح، سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی، جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن نامحدود زمانوں میں قوموں کے لئے ان کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی تھی، جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کے لئے تھی، اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدیؐ کے بعد عقل انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی، اور قدرت کے سر بمہر خزانے وقف عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہو گا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل و براہین، ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے، جن میں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام طبقوں اور قوموں کے لئے ہوئی، اس لئے آپؐ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں، اس لئے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح

صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، متشککوں، دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صانع کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوئیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ مصر، یونان، ہندوستان، اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر، عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے، مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ دلائل کی زبان اور طرز تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے مگر اصل مغز سخن صرف ایک ہے، اس بنا پر وحی محمدیؐ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرز ادا میں اس کو بار بار دہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحی محمدیؐ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صانع کائنات، ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے،متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا جس میں سامان تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی، ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے، وہ کسی معبد کی چہاردیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اسی لئے وحی محمدیؐ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ق لا وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ O ق لا (روم:۳۰)

ترجمہ: اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر، دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ (۱)

ترجمہ: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روز ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ج أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ط قَالُوا بَلَىٰ ج شَهِدْنَا ج (اعراف: ۱۷۲)

ترجمہ: اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا ہاں ہم گواہ ہیں۔

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے، وحیِ محمدیؐ نے بار بار انسان کے اس دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی زیر خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے، وہ انسانوں سے پوچھتی ہے:

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (ابراہیم:۱۰)

ترجمہ: کیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے۔

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخٰلِقُوْنَ ؕ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ (طور:۳۵،۳۶)

ترجمہ: کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا ان ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے بہرحال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ کس کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں، نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا، اور اولین نر و مادہ کا اور مادۂ تخلیق و روح کا خالق کون ہے۔

یہ گوناگوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز، انسان کی خیالی بلندپروازی اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ ۙۚ (آلِ عمران:۱۹۰)

ترجمہ: آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اسکا سیاہ و سپید ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّھَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ (حم سجدہ: ۳۷)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے رات، دن اور سورج اور چاند ہیں۔

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر، تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے ہیں۔ اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا، مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں، جس طرح فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندروں سے

بخارات اٹھتے ہیں، وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں، اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں جہاں پیداوار اور زمین کی نشوونما کی حاجت ہے اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ O (بقرہ، ۱۶۴)

ترجمہ: بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لئے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی سے ذریعہ مرے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں کے پھیلانے میں اور ہواؤں کے کبھی ادھر اور کبھی ادھر بدلنے میں اور آسمان و زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے۔

إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ O ط وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ O (جاثیہ: ۳۔۴)

ترجمہ: بے شک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل، پھول، میوے اور درخت اگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ج فَأَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ج وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ط اُنْظُرُوْٓا إِلٰى ثَمَرِهٖٓ إِذَآ أَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ط إِنَّ فِي ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ O (انعام: ۹۹)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے اگنے والی چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے نکالے، جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدی جدی شکل کے جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو بے شک ان میں ایمان والے لوگوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کی اپنی ہستی کو دلیل بتایا ہے، پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں، ایک ایک کر کے پیش کیا ہے، اول تو خود انسانوں کی پیدائش، پھر اس میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر، پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے، پھر انسانوں کے

اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ○ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ○ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ○ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ○ (روم ۲۰ ـ ۲۵)

ترجمہ: اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو، اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا اور اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں (دلیلیں ہیں) اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے، اس میں جاننے والوں کے لئے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا، اور تمہارا اس کی مہربانیوں کی تلاش کرنا ہے اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے، جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی (رحمت کی بارش کی) امید رکھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

اس اخیر آیت میں آسمان اور زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے، تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں، لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورۂ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے۔ یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوت کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے، اس کے بعد ایک جاندار و بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ ○ (لقمان۔۱۰)

ترجمہ: اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کئے۔

سورہ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) سے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعۃً کہیں سے زندگی آ جانا اور اس میں روح پھک جانا، اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے۔

اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (الم سجدہ : ۷۔۹)

ترجمہ: وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی، اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے، تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی، اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمہ ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ (ذاریات : ۲۰۔۲۱)

ترجمہ: اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر کیا تم نظر نہیں کرتے۔

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے، وہ بھی غور کے قابل ہے، ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اس کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے، اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۔ (نحل ۶۶)

ترجمہ اور تمہارے لئے جانوروں میں عبرت ہے ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں کے لئے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

ایک ہی قسم کے پھل ہیں، اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔ (نحل:۶۷)

ترجمہ اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہو، اس میں سمجھ والوں کے لئے دلیل ہے۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا ۔ (فرقان : ۶۱)

ترجمہ: بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکنے والا چاند بنایا۔

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون سے اس کی گواہی دیتی ہے۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۔ (نمل:۸۸)

ترجمہ: اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے۔

مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝ (ملک : ۳۔۴)

ترجمہ: تجھے مہربان والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے، پھر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی)۔

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصاء بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

۳۔ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب، خود بخود، اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

اہل فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے علل و اسباب کا سلسلہ ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہو گا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا، اگر یہ یونہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے، اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی، تسلسل عقلاً بھی محال ہے، بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے، اس بناء پر لامحالہ سلسلۂ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علتِ کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی علق و پیدائش اور وجود و کون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے تاہم وہ انسانی عقل میں آئی ہے، اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے، قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس لیل کا ماخذ مذکور ہے، سورۂ ہود کے آخر میں ہے:

وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ ط (ہود ۱۲۳)

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ۝ لا (نجم:۴۲)

ترجمہ: اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوج اور اس پر بھروسا کر۔

اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسانی کمزوریوں سے واقف تھے، چند صحابیوں نے آکر عرض کی یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے، فرمایا، کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہو گئی؟ گزارش کی، ہاں یارسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم)، فرمایا یہ تو خالص ایمان ہے، مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے، یہ کیفیتِ ایمانی کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح آپ نے فرمایا، لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور

پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا، زمین کو خدا نے بنایا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں، اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا، فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے، جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ میں اللہ پر ایمان لایا۔(۳)

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں، اس لئے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں، یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں

اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقل مند بھی ہیں جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں، اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں، وحی محمدیؐ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے، دنیا میں ایک ذرہ بھی اسوقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا، جب تک دانہ اُگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے، پھر اس کے اُگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ (انبیاء:۲۲)

ترجمہ۔ اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے، تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانینِ قدرت، اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے، فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو، تو یوں ہو گا کہ عالم کائنات معلول ہے، اس کی کوئی علت تامہ ہو گی، یہ ظاہر ہے، ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہو سکتیں، کیونکہ علتِ تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو، اب عالم کی علتِ تامہ اگر ایک نہ ہو، بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علتِ تامہ کے وجود کے بعد، عالم کے وجود میں دوسری علتِ تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علتِ تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علتِ تامہ نہ ہوگی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علتِ تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے، سورج، چاند اور تاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت، گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہو گا کہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں، جن میں کبھی سر مو فرق نہیں ہوتا، ہر شے ایک اصول کی پابند، اور ایک عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

وَ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (مومنون. ۹۱)

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ○ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا، تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

(بنی اسرائیل ۴۲_۴۳)

ترجمہ اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔ کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ (یہ مشرکین) کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈھتے، پاک اور بلند ہے وہ (خدا) اس بات سے جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں، اس (خدائے) برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جوان کے اندر ہے، بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔

اسی وحدت نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے۔

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ○ (ملک: ۳_۴)

ترجمہ تو خدا کے بنانے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر رد ہو کر تھک کر واپس آ جائے گی۔

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں ہو سکتی، اسی لئے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے، یہ دنیا وحدت نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے، ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکے، اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل

توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں؟ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کا تعین۔

خدا کی حقیقی عظمت

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے، مگر قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے، یہودیوں کا خدا، ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لئے پیدا کی تھی، اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا، وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولادیں تھیں، عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی، ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لئے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین

کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے، اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں، شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج، چاند، زمین، آسمان، انسان، حیوان،زبان والے اور بے زبان، سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں، اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں، اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اسی کے بندے ہیں، وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک ہے، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے، وہ ہر قسم کے صفات عالیہ اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے اس کے مانند کوئی نہیں، اس کی شبیہ و مثال کوئی نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناطے سے پاک ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج (زمر:٦)

ترجمہ: وہ ہے اللہ تمہارا رب اس کی بادشاہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (زمر: ٤٤)

ترجمہ: آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام : ١٤)

ترجمہ: آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ط (انعام : ٧٣)

ترجمہ: چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط لَهُ الْحُكْمُ (قصص : ٨٨)

ترجمہ: اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ج وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ O (شوریٰ ١١)

ترجمہ: اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (مومن : ٦٥)

ترجمہ: وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ط وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ (انعام ٥٩)

ترجمہ: غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے، درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ O (آل عمران : ٢٦)

ترجمہ: "اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جس کو

چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (یونس ۱۰۷)

ترجمہ: اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○ (بقرہ ۲۵۵)

ترجمہ: اللہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو نہ اونگھ آتی ہے، نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ایک ہے، کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو لوگوں کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، سب کو جانتا ہے اور وہ اس کے علم کے حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے اور ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (حدید ۴۔۵)

ترجمہ: جو زمین میں گھستا اور جو اس سے نکلتا ہے جو آسمان سے اترتا اور اس میں چڑھتا ہے، وہ سب کو جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو اللہ اس کو دیکھتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (فاتحہ:۱)

ترجمہ: سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔

وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (آلِ عمران ۸۳)

ترجمہ: اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔

وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ○ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ○ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ○ (بروج : ۱۴۔۱۶)

ترجمہ: وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے بندوں سے محبت کرنے والا ہے تخت کا مالک ہے بڑی شان والا ہے جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ (جمعہ:۱)

ترجمہ: آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (اسرائیل : ۴۴)

ترجمہ: اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔

اس معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت و جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا جن و انس، شجر و حجر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سر بسجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگ وجود کے ساز سے (اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا طٰہٰ ۱۴) "میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں" کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ

توحید محمدیؐ کا دوسرا بنیادی اصول اس عالم خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں، جنات اور ارواح خبیثہ سے ڈر کر دہائی پکارتے ہیں، آسمانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں، انہوں نے درحقیقت انسان کے اصل رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔ قرآن کی ابتدائی سورۃ میں آدم کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے، اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا، اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا وہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط (بقرہ ۳۰) کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقات الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل یہ منتخب ہوا، یہ منصب اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو عطا ہوا، نہ زمین کے حصہ میں آیا، نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے، صرف انسان ہی کا سینہ تھا جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا اور اسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی فرمایا:

> اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْھَا وَ حَمَلَھَا الْاِنْسَانُ ط (احزاب: ۷۲)

ترجمہ: ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

وحی محمدیؐ نے انسان کا رتبہ یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے۔

> وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ۞ ع (بنی اسرائیل ۷۰)

ترجمہ: ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔

انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے معتدل قوی اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوئی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ؗ (تین ۴)

ترجمہ البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔

یہاں تک کہ انسان خدائی صورت کا عکس قرار پایا۔ متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت () پر پیدا کیا۔ اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو مارو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورت الٰہی کا عکس ہے۔ عین میدان جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہئے(۲) کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔(۳) غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا(۴)۔ ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (ق) بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفات کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے، علم قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ صفات کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں اور چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے کثر حواس کا مصدر ہے، جس سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے اعضاء میں اسی کو فیض رحمانی کا مورد ظاہر کیا۔(۵) اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہے کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے اور اس کی زبان سے غیر خدا کی حمد کا ترانہ نکلے۔

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام: ۱۶۵)

ترجمہ اور اس نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔

تو اب وہ عالم کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کی خاطر بنیں وہ روئے زمین کی چیزوں کی خاطر نہیں بنا ہے۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ (بقرہ: ۲۹)

ترجمہ: جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانوں) تمہارے لئے بنایا۔

اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ (حج: ۶۵)

ترجمہ: زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لئے نہیں، بلکہ وہ ان کے لئے بنے ہیں جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لئے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لئے بنے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لئے بنی ہے اور انسان خدا کے لئے بنا ہے، اس لئے جب کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گزاری میں مصروف رہنا چاہیئے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا تو وحی محمدیؐ نے ان سے کہا:

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ (نحل ۲)

ترجمہ: اور خدا نے رات، دن اور چاند اور سورج تمہارے لئے کام میں لگایا، اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغام محمدیؐ نے ان انجانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں تم ان کے نہیں ہو۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ (نحل: ۵)

ترجمہ اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا تمہارے لئے جن میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔

انسانوں نے دریا، سمندر کو دیوی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں۔

وَ هُوَالَّذِىْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا و ترى الْفُلْكَ مو[illegible] و لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (نحل: ۱۴)

ترجمہ: اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تا کہ [illegible] میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں اور تا کہ تم خدا کے فضل و کرم (روزی) کی تلاش کرو۔

آگ بھی انسانوں کی مسجود بنی، حالانکہ وہ خود ان ہی کی محبت میں جل رہی ہے۔

الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۞ (یٰس ۸۰)

ترجمہ: جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس سے اور آگ روشن کرتے ہو۔

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے، انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اسی کے لئے ہے، پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے۔

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کی تلقین کی، وہ ان ہی دو اصولوں پر قائم ہے، ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے، اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہئے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کاملہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں جو ماورائے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے، اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں، انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہئے، ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدیؐ نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا۔ مگر وہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اسکے صفات کیا ہیں، اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جا سکتی ہیں، کن کن باتوں سے وہ پاک ہے، اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیئے؟ اس سے کیا مانگنا چاہیئے اور کیونکر مانگنا چاہیے؟ اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہیئے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنا ایک خیالی یا حقیقت ہے، اس سے محبت بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جا سکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حیثیت ہے، اس کی قدرت کہاں تک ہے، اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کی قوتوں اور اس کی عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسا کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجب الاطاعۃ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے، اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لئے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے، کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں۔ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا، عرب جاہلیت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کر لو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیئے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اس کی وحدت بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لحہ اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے، اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور لطف و محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض، اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے منزہ و پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ و اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا، اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسیوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسماں و زمین کو فنا کر دے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے، اس کی

محبت دنیا کا اصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (رعد : ۲۸)

ترجمہ: ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا، وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (آلِ عمران ۱۹۱)

ترجمہ: وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکشوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا، اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے، اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدار ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رہا، خدا نے ان کی مدح کی کہ:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللہِ (نور : ۳۷)

ترجمہ: وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت، خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا، خدا نے ان کی توصیف کی کہ۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (بقرہ ۱۶۵)

ترجمہ: ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی، ان کی صداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ:

وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (طلاق : ۳)

ترجمہ جو خدا پر بھروسا کرتا ہے تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔

اَلَیْسَ اللہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (زمر : ۳۶)

ترجمہ کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔

وَ تَخْشَی النَّاسَ ۚ وَ اللہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ (احزاب : ۳۷)

ترجمہ اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیئے۔

ان میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء و صفات

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی

وسعت کہاں سے کہاں پہنچی مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے۔ یہی ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطق کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بنتے ہیں، لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ عالم ہے تو ذات اور ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی گاہ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی۔ عرب کا جاہل اللہ نام ایک علی ہستی سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفت سے بھی وہ قطعاً بیگانہ تھا۔ دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے، مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا، قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے، لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی آگاہ تھے۔ بعض عیسائی عربوں میں، اللہ کے ساتھ ساتھ الرحمان کا لفظ بھی مستعمل تھا۔ جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں۔ اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس ابرہہ کے نام سے سد عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے، عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑ سی ہو گئی تھی، اس لئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوایا تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ، قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمن کیا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سننے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لئے رحمان کا لفظ مستعمل ہونے کی وجہ سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ۝ ۩ السجدۃ (فرقان : ٦٠)

ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمن کیا ہے، کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں، رحمن کا نام ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح و ستائش کرتے ہیں۔

اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (انبیاء ۔ ٣٦)

ترجمہ: (مشرک آپ کو دیکھتے ہیں تو مذاق سے کہتے کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔

تعلیم محمدیؐ نے عرب کے ناآشنایانِ حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء و صفات کی کوئی حد نہیں، اسکو سب

ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ (بنی اسرائیل ۱۱۰)

ترجمہ کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب سے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام "یہوا" تھا، مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی، دوسرا عام نام "الوہیم" ہے، جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور افعال ربانی کے ترجمان ہیں، تورات کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے، صفات الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والا خدا یعنی "رَبُّ الافواج" کا لفظ ہے جو صرف خدا کی صفات جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں "باپ" کا لفظ خدا کے لئے استعمال ہوا ہے، اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے، گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں، ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کی صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے، عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ، باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں، باپ حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے، اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں اس تشریح سے صفات الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی، مجرد رہ گیا ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسیم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ برہما، مہیش وشنو تین صفات خالق، ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی ہے، شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے، حیات، علم اور سرور یا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات و اسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دو صفتوں ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہو گا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا ہے، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا، وہ نبوت محمدیؐ کے عظیم الشان کارناموں میں ہے۔

آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپ نے یہ دعا سکھائی، اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے نے اپنے علم غیب میں اسکو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی، خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا، تجھ سے درخواست کرتا ہوں۔ () قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا

قل لو کان البحر مدادا لکلمت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمت ربی و لو جئنا بمثله مددا○(الکہف ۱۰۹)

ترجمہ کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے، تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی، اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔

دوسری جگہ کہا گیا

و لو ان ما فی الارض من شجرة اقلام و البحر یمده من بعده سبعة ابحر ما نفدت کلمت الله ط (لقمان ۲۷)

ترجمہ اور اگر اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

الغرض تمام اچھے اور کمال نام اسی کے لئے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں۔

الله لا اله الا هو ط له الاسماء الحسنى ○(طٰہٰ : ۸)

ترجمہ نہیں ہے کوئی معبود لیکن وہی اللہ، اسی کے لئے ہیں سب اچھے نام۔

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لئے ہے، خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو، لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں۔

قل ادعوا الله او ادعوا الرحمن ایاما تدعوا فله الاسماء الحسنى (اسرائیل ۱۱۰)

ترجمہ کہہ دے (اے پیغمبر) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جو چاہو کہہ کر پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو۔

و لله الاسماء الحسنى فادعوه بها ص و ذروا الذین یلحدون فی اسمآئه ط (اعراف ۱۸۰)

ترجمہ اور اللہ ہی کے لئے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

تعلیم محمدیؐ کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے، قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع ہو گا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو، اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْہَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرْبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُہَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَہْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۙ (نور ۳۵)

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۬ۚ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَ مَا خَلْفَہُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوْدُہٗ حِفْظُہُمَا ۚ وَ ہُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (بقرہ ۲۵۵)

ہُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّہَادَۃِ ۚ ہُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ہُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُہَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ہُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ ہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۠ (حشر ۲۲۔۲۴)

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ ہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاہِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْہَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْہَا ؕ وَ ہُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوْلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیْلِ ؕ وَ ہُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

(حدید ۱۔۶)

ترجمہ۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، وہ نہ پورب ہے نہ پچھم ہے اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے، اور خدا لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے یہ مثالیں بیان اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے، آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کی آل و اولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو، گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے جواب میں وحیِ محمدیؐ نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی۔[۱]

قُلْ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ یَلِدْ ۙ وَ لَمْ یُوْلَدْ ۙ وَ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۠
(اخلاص: ۱۔۴)

ترجمہ۔ کہہ دے (اے پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جا پناہ ہے نہ

اس سے کوئی اولاد ہے اور نہ اس کے ماں باپ ہیں (جنہوں نے اس کو جنا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے، جو اس کی بیوی ہو۔

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے جو صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "صمد" وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو، کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث اور جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔ یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے، غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا، جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو، اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک، اعلیٰ اور بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو کہ عرب کے قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے، لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تعلیم سے منور ہو چکا تھا، حضرت ابوہریرہؓ آپ سے سن کر کہتے تھے کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی، اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے، اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں وہ ایک اور "صمد" ہوں، جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اسکو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر[۲] ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ یمنی عرب ہیں، یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیم محمدیؐ سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ "صمد" کا ہے، لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے۔ "صمد" کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقہ میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو، اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جان بچائیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو، اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو، اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اسی لئے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو، صمدۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو، حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ "صمد" وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجہ کمال پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پرواہ و بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجہ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی بمرتبہ کمال ہو، یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو۔(۱)

ان معنوں کے علاوہ صحابہ و تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں۔

ابن عباسؓ۔ وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصریؒ۔ وہ حی و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انسؒ۔ جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعودؓ۔ جسکے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضاء نہ ہوں۔

بریدہؓ۔ جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمہؒ و شعبیؒ۔ جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہؒ۔ جس سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہؒ۔ باقی غیر فانی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی (۲) اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں، اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، کیونکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی "چٹان" کے ہیں جو آفات اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے، اسرائیلی الہٰیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جا بجا خدا کے چٹان کا لفظ آیا ہے۔ استثناء (۳۲، ۳۱، ۳۰) میں ہے۔

"اگر ان کی چٹان ان کو بیچ نہ ڈالتی اور خداوند ان کو اسیر نہ کرواتا، کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان"۔

یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے، سموایل کے پہلے صحیفہ میں، یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے۔ "خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں، تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں"۔ (۲۔۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں اَحَدٌ (ایک) اور صَمَدٌ (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض وہ یکتا و تنہا، اکیلا بے ہمتا، بے نیاز، بے پرواہ، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے، لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان ہے، جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ (الذریٰت ۵۰)

ترجمہ: ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔

یہ سورۂ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لئے اسکو ثُلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے، جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا۔ آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انہوں نے کہا، اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوئی ہیں، جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپؐ نے فرمایا، بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے۔[۱] ایک اور انصاری صحابی تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے، تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے، ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپؐ

سے اس سے اس کی وجہ دریافت کی تو گزارش کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے، ارشاد ہوا کہ یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔(۲) قتادہ بن نعمان ایک صحابی تھے جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور اسی کا عمل کرتے رہتے تھے۔ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔(۳)

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی، اس روحانی سب اور نورانی فیض سے ۔۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آتے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل ہو گا۔(۴) خدا طاق ہے، وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔ آخری فقرہ اس مصلحت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے؟ پورے سو کیوں نہ مقرر کئے گئے۔ یہ اس لئے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا رمز آشکارا نہ ہوتا۔ صحیح احادیث میں اسی قدر ہے لیکن ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے، ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے، لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں، پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں اور بعض نام ایسے جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں اس لئے علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے اس لئے ان روایتوں سے یہ شبہہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے میں محصور ہیں بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحیٰی، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی ابن تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں، اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفاتِ الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں(۱) ہے، اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغاز مضمون میں اوپر گزر چکی ہیں، استدلال کیا ہے۔

بہرحال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علماء نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کرکے گنایا ہے، یہ تمام نام وہ ہیں جو یا بطور علم اور بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں، یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے۔ علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے، لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگزر یعنی صفاتِ جمالی ظاہر ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو صفاتِ جلالی کہتے ہیں، تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفاتِ کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے، اور یا اس کی تنزیہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی

یعنی وہ اسماء و صفات حسنیٰ جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس اخیر تعبیر کی بناء پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے، اس کے معنی رحم والے کے ہیں، یہ گزر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا، عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا، قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے، ظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس راز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو اجنبی ذاتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدت الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مترادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا:

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ (اسرائیل ۰)

ترجمہ: اللہ کہو یا رحمٰن جو چاہو کہو، اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں۔

اَلرَّحِیْمُ: رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے، جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے، اس لئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے اَلرَّحْمٰنُ اور اَلرَّحِیْمُ خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے، کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہو گا، وہ اس کی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے، اس عالم اور اُس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور ہے، اور ہو گا۔

اَلرَّبُّ پرورش کرنے والا، یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔

اَللَّطِیْفُ: لطف والا مہربان۔

اَلْعَفُوُّ: معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْوَدُوْدُ: محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

اَلسَّلَامُ: امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

اَلْمُحِبُّ: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

اَلْمُؤْمِنُ: امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

اَلشَّکُوْرُ: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

اَلْغَفُوْرُ وَ الْغَفَّارُ: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

الحفیظ و الحافظ حفاظت کرنے والا نگہبان، بچانے والا۔

الوہاب: دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

الرازق و الرزاق: روزی دینے والا، نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

الولیُّ: دوست، حمایتی، طرف دار۔

الرؤف: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

المقسط: انصاف والا، عادل۔

الھادی: راہ دکھانے والا، رہنما۔

الکافی: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لئے کافی۔

المجیب: قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

الحلیم: بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

التواب و قابل التوب توبہ قبول کرنے والا، بندہ کے گناہوں سے درگزر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

الحنان ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

المنان احسان کرنے والا۔

النصیر: مدد کرنے والا۔

ذوالطول: کرم والا۔

ذوالفضل: فضل والا

الکفیل: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

الوکیل بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

المقیت روزی پہنچانے والا۔

المغیث فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

المجیر پناہ دینے والا۔

المغنی: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

صفاتِ جلالی

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے۔

المَلِکُ وَ المَلِیکُ: بادشاہ، فرمانروا۔

العزیز: غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

القاھر و القھار: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

المنتقم: سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

الجبار: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے، جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

المھیمن: سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

اَلْمُتَکَبِّرُ: اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شَدِیْدُ الْعِقَابِ: سخت سزا والا۔

شَدِیْدُ الْبَطْشِ: بڑی گرفت والا، جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے لیکن صحیفہ محمدیؐ میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا ذکر ہوتا ہے، جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح جو جی میں آئے جو چاہے کر گزرتا ہے بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اوراس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے۔ فرمایا

اَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِO (آل عمران : ۱۸۲)

ترجمہ: بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عزیزٌ (غالب) کے ساتھ حکیمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ وَ مَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (ص: ۶۵) وہیں یہ بھی کہا گیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَھُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ۔ (ص:۶۶) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمایا:

وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِO (مومن : ۳۱)

ترجمہ: اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کی صفت ذُوْ عِقَابٍ اَلِیْمٍ دردناک عذاب دینے والا، جہاں بیان کی گئی تو اس سے پہلے لَذُوْ مَغْفِرَۃٍ یقیناً بخشش والا (حٰم السجدہ:۴۳) بھی فرما دیا گیا، غرض صفات جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو، تاکہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہ اور پاکی سے۔

صفاتِ وحدانیت

یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں

اَلْوَاحِدُ: ایک۔

اَلْاَحَدُ: ایک۔

الوِتْرُ حاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

صفات وجودی

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا و دوام، ازلیت اور بے زوال ظاہر ہوتی ہے۔

الموجود وجود والا ہست۔

الحی ہمیشہ زندہ غیر فانی۔

القدیم وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔

القیوم جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

الباقی جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

الدائم ہمیشہ رہنے والا۔

الاوّل وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

الاخر وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

المقدم جو سب سے آگے سے ہے۔

المؤخر جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

الظاہر جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)۔

الباطن جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)۔

علم

یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

الخبیر خبر رکھنے والا۔

العلیم جاننے والا۔

علام الغیوب: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

علیم بذات الصدور: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

السمیع سننے والا۔

البصیر: دیکھنے والا۔

المتکلم بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

الواجد پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔

الشہید: حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں۔

الحسیب: حساب کرنے والا، یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار، ان کا بھی جاننے والا۔

المحصی: گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد ان کا بھی جاننے والا۔

اَلْمُدَبِّرُ تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔

اَلْحَکِیْمُ: حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

اَلْمُرِیْدُ: ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔

اَلْقَرِیْبُ: نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

اَلْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ: ہر مشکل کو کھولنے والا۔

اَلْقَدِیْرُ وَالْقَادِرُ: قدرت والا۔

اَلْمُقْتَدِرُ: اقتدار والا، جسکے سامنے کوئی چون و چرا نہیں کر سکتا۔

اَلْقَوِیُّ: زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

اَلْمَتِیْنُ: مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

اَلْجَامِعُ جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

اَلْبَاعِثُ اٹھانے والا، مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا، یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اول۔

مَالِكُ الْمُلْكِ سلطنت کا مالک، جسکے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

اَلْبَدِیْعُ: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔

اَلْوَاسِعُ: سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اَلْمُحِیْطُ: احاطہ کرنے والا، جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

اَلْمُحْیِیْ وَالْمُمِیْتُ: جلانے والا اور مارنے والا۔

اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

اَلْمُعْطِیْ وَالْمَانِعُ دینے والا اور روک لینے والا۔

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا، یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِیْدُ: جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا، اور جو ہو کر فنا کر دی گئی اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ: اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانے والا) اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا) اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا) اَلْمَانِعُ (روکنے والا) وغیرہ، ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے، ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے یعنی خدا کو صرف اَلضَّارُّ، اَلْخَافِضُ، اَلْمَانِعُ اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں، جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے یعنی اَلضَّارُّ، اَلنَّافِعُ، اَلْخَافِضُ کے ساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کے ساتھ اَلْمُعْطِیْ اور اَلْمُذِلُّ کے ساتھ اَلْمُعِزُّ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے،

قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں، بلکہ ایک طرح کی برائی ہے۔ ہاں نفع و نقصان پہنچانے والا عزت و ذلت دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہو گا، اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں، یا ایسا عزت دینے والا جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور و مضطر ہو گا، اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہو گا البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہ

یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب و نقصان سے اس کی براءت کو ظاہر کرتی ہیں۔

العلیُّ	مرتبہ والا۔	العظیمُ	عظمت والا
الکبیرُ	بڑا۔	الرَّفیعُ	بلند۔
الجلیلُ	بزرگ۔	الکریمُ	شریف۔
الغنیُّ	بے نیاز۔	الصَّادِقُ	سچا راست باز۔
الماجدُ	عزت والا۔	الحمیدُ	تعریف والا۔
القُدُّوسُ	پاک۔	الحقُّ	سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اسکے سوا سب باطل ہیں۔
الجمیلُ	اچھا۔	البَرُّ	نیک۔
العدْلُ	عادل۔	مُنَزَّہٌ	ہر عیب سے پاک۔
الصَّمَدُ	بزرگی کی ہر صفت میں کامل۔	الرَّشِیدُ	سیدھی راہ چلنے والا، نہ بھٹکنے والا۔

ان تعلیمات کا اثر اخلاق انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء و صفات کا عقیدہ دینِ محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے یعنی اس کے یہ محامد و اوصاف اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں، ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں، اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں، بقیہ اوصاف و محامد انسان کے لئے قابل نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں، اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے، اور ان اسماء و صفات کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل و پیروی کی خواہش کرے، محامدِ الٰہی گویا استادِ اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہئے، اس لئے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامدِ الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اس استاد ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہئے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصل وصلی کے مطابق ہے۔

گزر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط (بقرہ۔۳۰) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔ خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہو گا، اتنا ہی وہ

اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا، یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہو گا جب وہ سر تا پا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

صِبْغَةَ اللہِ ج وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللہِ صِبْغَةً ز (بقرہ ۱۳۸)

ترجمہ: خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ اس "خدائی رنگ" سے مقصود خدا کا "دین فطرت" ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ان اللہ خلق آدم علی صُورَتِہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزری ہے کہ اس "صورت" سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی شکل و صورت ہے، یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفات کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں حد بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے، اور انسان کو اخلاق و صفت میں ملاء اعلیٰ سے تشبہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصانِ خدا کے اس مقولہ تخلقوا باخلاق اللہ خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو، کا مطلب ہے، حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللہ الاعظم حسن خلق خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ کی صفتِ کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں۔ جلالی، کمالی، اور تنزیہی۔ صفات جلالی جو کبریائی عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں، اور نہ یہ اوصاف بندگی و عبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں، ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل صفات پیدا ہوں، یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری اسی لئے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لئے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا وہ فطرت کے خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا وہ کی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

اَبٰی وَ اسْتَکْبَرَ ق ز وَ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ○ (بقرہ:۳۴)

ترجمہ: اس نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لئے ہے، اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں۔

وَ لَهُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ص (جاثیہ:۳۷)

ترجمہ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ہے۔

صحیح مسلم میں (۱) ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت و کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا۔ دوسری جگہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے برا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں۔(۲) العزیز الجبار المتکبر ط (حشر ۲۳) اسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے، مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرط عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں، اور سر نیاز اظہار بندگی کے لئے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت و جلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا، یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔

و للہ العزۃ و لرسولہ و للمؤمنین (منافقون۔۸)

ترجمہ: اور عزت خدا کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے۔

حاکم میں ابوہریرہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں، وہ اپنی عزت و جلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے، تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے معزز بننا چاہتا ہے تو یہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائے گا "(اس کا) مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا"۔ (قرآن) اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے، کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا، اور جو کبریائی کرتا ہے تو وہ خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہتا ہے، جو خدا ہی کے لئے تھی۔(۳)

خدا کی صفات عالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی و ابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے۔ صفات تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں، ان کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

خدا کے صفات جمالی وہ اصل اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لئے حسب تعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے، عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ "خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر، جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں"، اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے، اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈالے گا، خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔(۴) قرآن کہتا ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔

ان تبدوا خیرا او تخفوہ او تعفوا عن سوٓء فان اللہ کان عفوا قدیرا○(نساء۔۱۴۹)

ترجمہ: اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی، ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی، سزا کا منظر دیکھ کر حضورؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا، ادا شناسوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو، خدا معاف کرتا ہے اور عفو و درگزر پسند کرتا ہے، تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے، وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔(۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک صحابی نے عرض کی یارسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اسکا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا:

ان اللہ عز و جل جمیل یحب الجمال۔(۲)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اچھا ہے، جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے، یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے، خدا جمال والا ہے، وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔(۳) یہ

روایت بھی ہے کہ "خدا جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، وہ سخی ہے، سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے، صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔"[۴] روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔ "وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، خوش خلقی سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔"[۵] ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں: "اے عائشہؓ خدا نرمی والا ہے، وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔"[۶] ایک مرتبہ آپؐ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔[۷] عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔[۸]

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ تو تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ (ابوداؤد باب فی الرحمۃ) رشتہ داروں اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا، جو تجھ کو ملائے گا، اس کو میں بھی ملاؤں گا۔[۹] ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے۔ "میں خدا ہوں، میں رحمان ہوں، میں نے رحم پیدا کیا ہے، اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اسکو ملاؤں گا، جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔"[۱۰] پھر فرمایا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔ بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں، جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔[۱۱] آپؐ نے فرمایا: خدا نے رحم کے سو حصے کئے، ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا، اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچے کے لئے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔[۱۲]

بخل خدا کی صفت نہیں مگر آپ نے فرمایا تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو، ورنہ تم پر تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔[۱] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا، قیامت میں اسکی پردہ پوشی خدا کرے گا۔[۲] یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو،[۳] خدا تمہاری مدد میں ہے۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں، اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے۔[۴] اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا کہ خدا بھی غیرت والا ہے اور مومن بھی غیرت والا ہے، اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔[۵]

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے۔

وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۝ (آل عمران: ۱۸۲)

ترجمہ: اور بے شک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس لئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

یا عبادی انی حرمت الظلم علیٰ نفسی وجعلتہ بینکم محرماً فلا تظالموا۔[۶]

ترجمہ: اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک صاف رہنا چاہئے، آپؐ نے فرمایا:

ان اللہ طیب یحب الطیب ونظیف یحب النظافۃ فنظفوا ولا تشبھوا الیھود۔ (۷)

ترجمہ: خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک و صاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے تو تم پاک و صاف رہا کرو یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔

یہ توحید کا ایک رُخ تھا، اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں، انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا، وہ ان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں، یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دل سے نکال دیا۔ سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی۔ بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ بابل و مصر، ہند و ایران کے خدا اور ربکم الاعلیٰ ہونے کے بجائے، انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے جن کا عزل و نصب، دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا، بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچ نیچ، بلند و پست، شریف و ذلیل، مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی، اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم ہو چکی تھی، اور زمین، قوموں اور ذاتوں کے ظلم وجبر او رغرور و فخر کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آکر اس اونچائی نیچائی، بلندی و پستی اور نشیب و فراز کو برابر کیا، سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا، اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں۔

بہرحال اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا، جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لئے وہ مساوات انسانی کے حقیقی جوہر سے بھی اب تک نابلد ہیں، انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوت درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا اور وہ دولت و فقر اور رنگ و قومیت کے امتیازات کو خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے مساوات کی نعمت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں، اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں۔ دولت و فقر، رنگ و روپ اور نسل و قومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتے، اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ او رخدا کی فرمانبرداری کا ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات: ۱۳)

ترجمہ: تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہے۔

خدا کا ڈر اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے۔ عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے۔ جس کی ہیبت وجلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے، کانپتے رہنا چاہیئے۔ اس کے گوشۂ چشم میں لطف وعنایت کا گزر نہیں، محبت و پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں ہوتا، وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدیؐ کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات اوپر گزر چکے ہیں، ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ اس کے چند پرجلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ اور مالکیت عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں، بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار اور لطف و کرم، رحم اور مہر کی تجلی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہوں سے مغالطہ ہوا۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

(۲) دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں، آپ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ اس کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں، خوف اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی۔ ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ، ناز تبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد صرف خوف کے جذبہ سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے، بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور یہی نبوت محمدیؐ کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے، ان کے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی اور صراط مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بناء سراسر خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار[۱] اور باپ کا بدلہ پشت ہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔[۲] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔[۳] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی گو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے۔[۴] مگر دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے، وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف اسرائیل اور بنی اسرائیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ سمجھتا ہے، اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین

رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی۔ وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہئے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہئے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ۚ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (اعراف ۵۵)

ترجمہ (لوگو) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارا کرو، وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا، اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل و کرم کی) امید رکھتے ہوئے پکارا کرو بے شک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ (انبیاء ۹۰)

ترجمہ وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ پرلطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے، مگر اس کو جبار و قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ (یٰس:۱۱)

ترجمہ: اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (ق:۳۳)

ترجمہ: جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہے۔

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ (طٰہٰ ۱۰۸)

ترجمہ: اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا۔ اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی نخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب دونوں کی جامع تھی، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک طرف آپؐ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں اور دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم اور سرور سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں منظر آپ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آ جاتے تھے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپؐ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبانِ مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں تو جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی، آپؐ پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت آتی تو اسکے حصول کی دعا کرتے تھے۔(۱)

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے اسی لئے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء ایمان کامل خوف اور امید کے درمیاں ہے۔ کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم و کرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسا ان کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے، اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ فرمایا

وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ (اعراف:۱۵۶)

ترجمہ: اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی۔

رحمتی سبقت غضبی (بخاری)

ترجمہ: میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو فرزندِ الٰہی کا لقب دیا۔ بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا اور حضرت عیسیٰ کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزندِ الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ (مائدہ:۱۸)

ترجمہ۔ ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ (مائدہ ۱۸)

ترجمہ: کہہ دو کہ اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے (اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو جن کو اس نے پیدا کیا۔

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (جمعہ:۶)

ترجمہ۔ اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمتِ الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد نبویؐ میں آ کر دعا کی کہ "خدایا مجھ کو اور محمدؐ کو مغفرت عطا کر۔" آپؐ نے فرمایا "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"۔(۱) ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا! مجھ پر اور محمدؐ پر

رحمت بھیج، اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر۔ آپؐ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا: یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔

محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس سلسلہ میں تعلیم محمدیؐ کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدائی محبت و کرم کی تعبیر کے لئے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں، اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا، اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیرمادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے، محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے، دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لئے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی مائیں بنیں، جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے، خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے، جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے۔ اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اس لئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا، سدا سہاگ فقراء اس تخیل کی مضحکہ خیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا، راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ ان کے خواص تک کو گمراہ کر دیا، جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری پیچیدگیوں میں گرفتار ہو گئے، عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا، ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سداسہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑھیاں پہن لیں، اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے، اسی لئے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لئے ان الفاظ کا استعمال ضلالت اور گمراہی قرار دیا، لیکن وہ ان الفاظ کے اصل معنی اور منشاء کو اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے، اس کا انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (بقرہ۔۲۰۰)

ترجمہ: تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لئے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط و استوار ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحم و محبت کے اس جسمانی طریقہ، تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت و پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں، انسانوں کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اس لئے ان کے ذہن

میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہِ راست پیدا نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کے لئے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقے سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو۔ انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ان دیکھی ہستی کی ذات و صفات کے متعلق جس کو ہم خدا کہتے ہیں، ہر مذہب میں ایک تخیل ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گردوپیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے جہاں تک بنی نوع انسان کے لئے ممکن ہے، خدا کے متعلق باپ ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے، اسی لئے دعوت محمدیؐ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا، تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانی ہی کی مادی بولی میں کرنا تھا، اس لئے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا، اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لئے اسلام نے مستعار لے لیا، اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر اس سے ربط و تعلق کا اظہار کیا اور استعارات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آ چکی تھیں، ان سے انسانوں کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں، جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے گئے تھے ہر قوم نے اس علم اور نام کے لئے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی۔

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے، وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہلِ لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ وہ وَلَاہٌ سے نکلا ہے اور ولہ' کے اصل معنی عربی میں اس "غم"، "محبت" اور "تعلقِ خاطر" کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ وَالِہٌ (شیدا) مستعمل ہے، اس لئے اللہ کے معنی "محبوب اور پیارے" کے ہیں، جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشاں ہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "منوہن" یعنی "دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ "رحمان" اور "رحیم" ہیں، ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں رحم والا، مہربان، لطف و کرم والا۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (محبوب، مہربان رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہی صفات ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے، کیا اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے

کے لئے کوئی دلیل ہو سکتی ہے۔

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ "رحمان" ہے، جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل ۱۱۰)

ترجمہ اس کو محبوب (اللہ) کہو یا مہرباں (رحمان) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

قرآن مجید نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحماں کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمہاری نظر سے گزر چکا ہے، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے جو جمالی اوصاف آئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف اَلْوَدُوْدُ سورۂ ذات البروج میں آیا ہے، جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سر تا پا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے۔ اس کے سوا خدا کا ایک اور نام "الولیُّ" ہے۔ جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں، خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے "الرَّؤُف" ہے۔ رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے، رافت کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام "حنَّانٌ" ہے جو حنّ سے مشتق ہے۔ "حنّ اور حنین" اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں۔ دیکھو وہ ان رشتوں کے نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں کے سبب سے محبت اور پیار کے جو خاص جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کو خدا کے لئے بے تکلف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ غَفَّارٌ (بخشش کرنے والا) اور غَفُوْرٌ (بخشنے والا) ہے یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے، وہ سَلَامٌ (امن و سلامتی) ہے، یعنی اپنے بے آسرا بندوں کے لئے وہ سر تا پا امن و سلامتی ہے، وہ مُؤْمِنٌ (امن دینے والا) ہے، وہ اَلْعَدْل ہے یعنی سر تا پا انصاف ہے، وہ العفوّ (معاف کرنے والا) ہے، اَلْوَهَّابُ (عطا کرنے والا) ہے اَلْحَلِيْمُ (بردبار) ہے، الصَّبُوْرُ (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) ہے۔ التَّوَّابُ (بندوں کے حال پر رجوع ہونیوالا) ہے۔ اَلْبَرُّ (نیک اور مجسم خیر) اور اَلْمُقْسِطُ (منصف اور عادل) ہے۔ ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

توراۃ کے اسفار، انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے پُر محبت اور سراپا مہر و کرم سے لبریز اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطفِ احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے یکسر خالی ہے، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں، بات یہ ہے کہ اسلام ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ شرک و کفر کی اس ضلالت و گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سر تا پا روحانی معنوں کو مادی

اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس طرح وہ توحید کی بلندترین سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منکم نزل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا ہو۔ روحانی حقائق کی تعبیر کے لئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا، یقیناً مادی اور جسمانی استعارات و مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھتی۔ چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات و مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلندتر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب (باپ) کے بجائے "رب" کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

اَب اور رَب ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہو گا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے۔ اَب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر یہ تعلق حددرجہ ناقص، محدود اور آنی ہوتا ہے۔ بیٹے کے وجود، قیام و بقاء ضروریاتِ زندگی، سامانِ حیات، نشوونما اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ، مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو کہ عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لحہ کے لئے بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے۔

ربوبیت (پرورش) عبد اور معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے، جو ایک لحہ کے لئے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے، انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا قطرۂ آب و ہو یا قطرۂ خون، مضغہ گوشت یا مشتِ استخواں، شکمِ مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لحہ، رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں، جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بہکے ہوئے انسانوں کو کس کسطرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِ الٰہی ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی

جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبانِ الٰہی نے شہادت دی۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ (بقرہ:١٦٥)

ترجمہ: اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

اس نشۂ محبت پر باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان سب کو قربان اور نثار ہو جانا چاہیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِهٖ ؕ (توبہ ٢٤)

ترجمہ: اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشہ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، ان کو پکار کر سنا دیا گیا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ (مائدہ:٥٤)

ترجمہ: مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کر کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

حضرت مسیحؑ نے کہا درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا۔ اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں، مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران:٣١)

ترجمہ: اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

محبت کیونکر حاصل ہو، وحیِ محمدیؐ نے اس رتبہ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ○ (مریم:٩٦)

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے، رحمت والا خدا ان کے لئے محبت پیدا کرے گا۔

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں۔ ایمان اور عملِ صالح یعنی نیک کام۔ چنانچہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○ (مائدہ:١٣ و بقرہ:١٩٥)

ترجمہ: خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (بقرہ:۲۲۲)

ترجمہ: خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ○ (آل عمران:۱۵۹)

ترجمہ: خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ (مائدہ: ۴۲، و حجرات:۹)

ترجمہ: خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ○ (توبہ: ۴ و ۷)

ترجمہ: خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ (صف:۴)

ترجمہ: خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستے میں لڑتے ہیں۔

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ○ (آل عمران:۱۴۶)

ترجمہ: اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ ○ (توبہ:۱۰۸)

ترجمہ: اور خدا پاک و صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے پیار کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا۔ محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لئے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لئے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔(۱)

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف ہی وہ کانٹے ہیں جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہتے ہیں۔ لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں، ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہو گا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ○ (یونس:۶۲)

ترجمہ: ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محبت کا وہ جذبہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگزر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے، اس کا نام رحم اور رحمت ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے، وہ نہیں تو کچھ نہیں، اس لئے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے، مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتا ہے، گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر ان کے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ○ (زمر:۵۳)

ترجمہ: اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

فرشتے حضرت ابراہیم کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ ○ (حجر:۵۵)

ترجمہ: تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔

خلیل اللہ اس امر سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبہ خلت محبت سے بالاتر ہے، اس نے جواب دیا:

وَ مَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ○ (حجر:۵۶)

ترجمہ: اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون ناامید ہوتا ہے۔

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں منجملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے،خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، سیہ کاروں کو اس کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے، رحمان و رحیم بھی اور عفو و رؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔

كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ (انعام:۱۲)

ترجمہ: اللہ نے ازخود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ہمارا بابِ رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (انعام: ۵۴)

ترجمہ: اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان سے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے برہِ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بے شک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں۔

وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ (اعراف:۱۵۶)

ترجمہ: اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو ازخود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی۔ جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا

عتاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا۔ یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے۔ بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹا! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہوں گا۔ خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مجھے پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹے اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کر دوں، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹا! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر آؤں۔[1] کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی وفات کا وقت جب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشتا۔[2] یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جن کی بناء پر دوستوں، عزیزوں اور قرابتداروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رحم و محبت ہے۔ نیز جس کی بناء پر دنیا میں عشق و محبت کے شاندار مناظر نظر آتے ہیں تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہدِ حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کتنا حصہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں۔[3] اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے۔ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ صحابہؓ نے تنگ آ کر کہا۔ خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔ رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی ۔ فرمایا اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔[4] تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لئے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا، خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے، کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور ان کو ذات الٰہی کے ساتھ وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا۔ بلالؓ کو دیکھو، ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر ان کو لٹایا جاتا ہے، ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لئے ان کو مجبور کیا جاتا ہے۔ وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مگر زبان سے وہی احد، احد (ایک ایک) کا ترانہ نکلتا ہے۔[5] مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے، ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحن مکہ میں جوشِ وحدت پرستی سے سرشار ہو کر کلمہ توحید کا باآواز بلند اعلان کرتے ہیں۔ ہر طرف سے پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے بعض لوگ آ کر چھڑا دیتے ہیں لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر محبتِ الٰہی کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔[6]

ایک صحابی جو رات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لئے متعین تھے،وہ اپنی نیند ٹالنے کے لئے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور نماز میں محو رہتے ہیں ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی کہتے ہیں کہ جو سورہ شروع کی تھی، جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کئے بغیر چھوڑ دوں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو جانشین عین حالت نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں مگر مقتدیوں کی صف اس ذی، باقی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی و میت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے۔ اسی لئے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے یعنی رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ ط (البینہ ۸)

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی۔ اس کا جنازہ اٹھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی۔ قبر کھودی جانے لگی تو فرمایا اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اس کے ساتھ کشادگی فرمائی ہے۔ اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہؓ نے پوچھ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا! ہاں، کیوں کہ اس کو خدا اور رسول پیارے تھے۔(۱) ایک دفعہ آپ نے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا۔ وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر سورۃ کے آخر میں قل ھواللہ ضرور پڑھتے، جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمتِ اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا! ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے، فرمایا کہ ان کو بشارت دو کہ وہ رحم کرنے والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ (۲) یہ بشارت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمتِ والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ فرمایا! تم نے اس کے لئے کیا سامان کر رکھا ہے۔ انہوں نے نادم ہو کر شکستہ دل سے عرض کی۔ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا، جو کچھ سرمایہ ہے وہ صرف خدا اور رسول کی محبت ہے اور بس۔۔۔ فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا۔ صحابہؓ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔ (۳)

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبرئیلؑ سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں، تم بھی اس کو پیار کرو، تو جبرئیل بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہردلعزیزی اور حسنِ قبول بخشا جاتا ہے۔ (۴)

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔(۵) یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانہ محمدیؐ کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔

امام بزاز نے مسند میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں، لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔[1] الخ، یہ قابلِ رشک رتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا ہے۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا خداوندتعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔[۲]

یہ محبت الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ پر نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اسی کی محبت کے سبب سے مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب سے میرے اہل بیت سے محبت کرو۔[۳] یہ عشق و محبت کی دعوت محبوبِ ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب "حبیب خدا" ہے۔ دیکھو کہ حبیب اور محبوب میں خلعت و محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں۔ آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے۔ کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے، امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبتِ الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے، خداوندا

اسئل حبك و حب من يحبك وحب عمل يقرب الیٰ حبك ۔ (احمد، ترمذی، حاکم)

ترجمہ: میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کردے۔

اَللّٰهُمَّ اجعل حبك احبّ الی من نفسی واهلی ومن الماء البارد (ترمذی و حاکم)

ترجمہ: الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے لیکن حضورؐ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی وہ صرف محبت الٰہی کا زلال خالص تھا، جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا۔ عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشقِ الٰہی (مسیح) کا قول ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا، پھر وہ کون روٹی ہے، جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا۔ حضورؐ دعا فرماتے ہیں۔

اللهم ارزقنی حبك وحب من ينفعنی فی حبك ۔ (ترمذی)

ترجمہ: خداوندا! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نفع ہو مجھے روزی کر۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے، مگر جانتے ہو کہ اس راہ میں آخری منزل کیا ہے؟ صحیحین میں ہے۔

ماکان اللہ و رسولہ احب الیہ ممّا سواھما۔ (۴)

ترجمہ یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور ان سے اس طرح محبت کریں جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بناء پر کہ وہ شرک کا رستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے، اس لئے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے خالی ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ دعویٰ سر تا پا بے بنیاد ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدیؐ کی بلندی نظر اور محبت کا علوے معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں، ثبوت میں قرآن پاک کی یہ آیت پاک بھی پہلے پیش کی جا چکی ہے۔

فاذکُرُوا اللہ کذکرکُمْ اٰباءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا ط (بقرہ:۲۰۰)

ترجمہ تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔

لیکن احادیث سے ہمارا دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ پڑی ہے جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آ رہا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے، جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے، اس کو اپنے بچہ کے جوشِ محبت میں چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دودھ پلا لیتی ہے۔ دفعۃً رحمۃ للعالمینؐ کی نظر پڑتی ہے اور آپؐ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟ لوگ عرض کرتے ہیں ہرگز نہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے، خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔(۱)

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے، یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا: ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے۔ تو بولی کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی۔ یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا: خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔ (۲)

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے چادر میں باندھ کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا۔ ماں نے دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آ کر بچوں پر گر پڑی۔ ارشاد ہوا کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔(۳)

ایک صاحب ایک چھوٹے بچے کو لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے۔ انہوں

نے کہا۔ ہاں۔ فرمایا: تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی تم کو اس بچہ سے ہے۔ وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ (۳)

جمالِ حق کا پہلا مشتاق اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے۔ مرض کی شدت ہے بدن بخار سے تپ رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلانِ خاص کی طاقت پاتا ہے۔ مسجدِ نبویؐ میں جان نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضورؐ کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے۔ دفعۃً لبِ مبارک ہلتے ہیں اور یہ آواز آتی ہے ۔ لوگو! میں خدا کے سامنے اسبات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے جیسے ابراہیمؑ کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا۔ (۱) یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالتِ نزع میں زبان پر یہ کلمہ تھا۔ خداوندا بہترین رفیق۔

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گنہگار بندوں پر اس کی شانِ بخشش کا ترانہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین نے یہ پیغام ربانی ہم کو سنایا:

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی۔ تو مجھ سے راستہ پوچھو، میں بتاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا لیکن جس کو میں نے کھلایا تو مجھ سے کھانا مانگو، میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا، لیکن جس کو میں نے پلایا تو مجھ سے پانی مانگو، میں تم کو پلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو میں تم کو معاف کروں گا۔ اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں ہے اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن وانس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہو گا، اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے گنہگار کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ذرہ برابر کمی نہ ہو گی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہو گی۔ لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈبو کر نکال لی جائے۔ اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے، وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔ (۳)

محبت کا یہ پرکیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا، تسلی و تشفی کا یہ روح افزا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، عفو و کرم کے بحرِ بیکراں کا یہ ساحلِ امید آپ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا اور گنہگاروں کو "میرے بندو!" کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حواشی

۱۔ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ لاہور: مکتبہ مدنیہ ۱۴۰۸ھ۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الایمان۔

۳۔ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الاستیذان، ابن ابی عاصم فی السنۃ والطبرانی عن حدیث ابن عمر باسناد رجالہ ثقات و ادب المفرد بخاری و احمد عن ابی ہریرہ و صحیح مسلم کتاب البر، نیز توراۃ میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے۔ جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا، خدا کی صورت پر اسے بنایا (پیدائش۔ ۵۔ ۲)

۵۔ صحیح بخاری کتاب العتق، و صحیح مسلم کتاب البر و الصلۃ۔

۶۔ صحیح مسلم کتاب البر آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے۔

۷۔ ادب المفرد امام بخاری باب لا تقل قبح اللہ وجہہ۔

۸۔ اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

۹۔ بخاری جلد اول ص ۳۷۹۔

۱۰۔ یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں بسند نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل میں بھی (مسند عبداللہ بن مسعود) ہے۔

۱۱۔ مستدرک حاکم تفسیر اخلاص (صحیح) و جامع ترمذی تفسیر سورۂ مذکور و کتاب الاسماء بیہقی ص ۲۳ (الہ آباد)۔

۱۲۔ صحیح بخاری سورۂ اخلاص۔

۱۳۔ صحیح بخاری کتاب التوحید۔

۱۴۔ ایضاً کتاب الصلوٰۃ۔

۱۵۔ مسند احمد بسند ابی سعید الخدری۔

۱۶۔ صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم کتاب الذکر و مسند احمد بسند ابی ہریرہ و جامع ترمذی، نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابو عوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ۔

۱۷۔ تمہید ابوشکور سالمی القول الثالث فی عدد الاسماء یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

۱۸۔ کنزالعمال ج ۱۲ ص ۲ بروایت حضرت عمار بن یاسر۔

۱۹۔ کتاب الادب باب الکبر ج ۲ ص ۳۹۱ مصر۔

۲۰۔ صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب۔

۲۱۔ کنزالعمال ج ۲ ص ۱۷۹ و مستدرک حاکم۔

۲۲۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ۔

۲۳۔ مستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۲۸۲ کتاب الحدود۔

۲۴۔ صحیح مسلم کتاب لایمان و ترمذی باب الکبر۔

۲۵۔ کنزالعمال کتاب الرحمۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔

۲۶۔ کنزل العمال کتاب الرحمۃ بحوالہ کامل لابن عدی۔

۲۷۔ ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی۔

۲۸۔ صحیح مسلم ابو داؤد، حاکم، نسائی، ابن ماجہ بیہقی فی الادب۔

۲۹۔ صحیح مسلم کتاب الصدقات و ترمذی تفسیر سورہ حجرہ۔

۳۰۔ ابوداؤد باب استحباب الوتر۔

۳۱۔ صحیح بخاری باب صفۃ الرحم۔

۳۲۔ ابواب البر والصلۃ۔

۳۳۔ ترمذی باب مذکور۔

۳۴۔ جامع بخاری باب رحمۃ الولد۔

۳۵۔ جامع بخاری باب رحمۃ الولد۔

۳۶۔ صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ۔

۳۷۔ مسلم کتاب البر والصلہ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا بان یستر علیہ فی الآخرۃ۔

۳۸۔ ابوداؤد کتاب للادب باب فی المعونۃ للمسلم۔

۳۹۔ صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۰۳۔

۴۰۔ جامع ترمذی باب ماجاء فی الغیرۃ من ابواب النکاح۔

۴۱۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ و مسند ابن حنبل ج ۸ ص ۲۱ مصر، و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵۔

۴۲۔ ترمذی باب فی الشفقۃ ص ۵۶۳۔

۴۳۔ یرمیاہ ۳۲، ۴۰، ۱۵ وغیرہ۔

۴۴۔ خروج ۲۰، ۵، ۳۴، ۷ و استثناء ۴، ۲۴، ۵، ۹ وغیرہ

۴۵۔ خروج ۲۰، ۷ و ۳۴، ۶ وزبور ۸۶، ۱۵ و ۱۰۳، ۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے۔

۴۶۔ لوقا کی انجیل ۱۲، ۵ اول پطرس ۲۰، ۱۷، دوم قرنتیون ۷۔ افسیون ۵، ۲۱، الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

۴۷۔ مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۳۔

۴۸۔ صحیح بخاری کتاب الادب۔

۴۹۔ ابوداؤد کتاب الادب۔

۵۰۔ احمد بن حنبل مسند ابوذر ج ۵ ص ۱۷۶۔

۵۱۔ جامع ترمذی (ابواب الدعوات) و دیگر کتب احادیث (صحیح)

۵۲۔ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۳۳۔

۵۳۔ بخاری کتاب الادب باب ص ۸۸۷۔

۵۴۔ بخاری کتاب الادب باب یکرہ من لعن شارب الخمر ص ۱۰۰۳۔
۵۵۔ سیرت ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین و اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۰۶ مصر۔
۵۶۔ طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاری۔
۵۷۔ صحیح بخاری، سنن ابی داؤد کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم۔
۵۸۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی حفر القبر۔
۵۹۔ مسلم کتاب صلوۃ المسافرین و قصرہا، باب فضل قرأۃ قل ہو اللہ احد، یہ واقعہ بخاری کتاب الصلوۃ باب الجمع بین السورتین میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔
۶۰۔ مسلم کتاب الادب باب المرء مع من احب بخاری کتاب الادب باب ماجاء فی قول الرجل ویلک۔
۶۱۔ مسلم کتاب الادب باب اذا حب اللہ عبدا حببہ لعبادہ۔
۶۲۔ بخاری کتاب الرقاق باب التواضع۔
۶۳۔ اس کی ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں، دیکھو مشکوۃ کتاب الاداب فی حب اللہ فصل ثانی (صفحہ ہذا)۔
۶۴۔ مشکوۃ باب مذکور۔
۶۵۔ مشکوۃ باب اہل بیت بروایت ترمذی۔
۶۶۔ مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بہن وجد حلاوۃ بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔
۶۷۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد۔
۶۸۔ سنن نسائی باب مایرجی من الرحمۃ۔
۶۹۔ مشکوۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسماء باب رحمۃ اللہ وغضبہ۔
۷۰۔ المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص ۷۵، مصر۔
۷۱۔ صحیح مسلم کتاب المساجد۔
۷۲۔ صحیح بخاری ذکر نبوی۔
۷۳۔ صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۹۰ و ص ۱۷۷ و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے، لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں۔ دیکھو متی ۲۵ ص ۲۵ تا ۴۵، مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیے۔

تفاسیرِ قرآنی میں توحیدِ الٰہی

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی

قرآنی بنیاد و نہاد

قرآن مجید کتابِ توحید ہے۔ توحید ہی اسلام و قرآن کی بنیادی تعلیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرکزی صفت اس کی وحدانیت ہے۔ اسی صفتِ الٰہی کی تشریح و تعبیر مختلف اسالیب میں کلامِ الٰہی میں کی گئی ہے۔ سی حقیقت کو بار بار مختلف انداز و ادا میں اجاگر کرنے کو تصریفِ آیات کی خوبصورت و معنی خیز اصطلاح اور نام دیا گیا ہے۔ تصریف میں تکرار کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ ہر مقام و محل، ہر سیاق و سباق اور ہر موقع و واقعہ میں الفاظ و معانی کا جہانِ دیگر نظر آتا ہے۔

توحید کے اظہار و اثبات کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے نامِ نامی اور اسمِ گرامی سے بیشتر کام لیا ہے۔ اس کی الوہیت ہی اس کی توحید کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اس بن کوئی نہیں موجود۔ اور جو کچھ اس کے ماسوا موجود ہے وہ اس کی مخلوق ہے۔ تخلیق اپنے خالق پر دلالت کرتی اور اس کی گواہی دیتی ہے۔ مخلوقاتِ عالم اپنی تخلیق و تکوین ہی کے لئے خلاقِ مطلق کی محتاج نہیں، وہ اپنے وجود و بقا کے لئے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، پروردگاری اور شہنشاہیت سب جہانیانِ عالمین کے وجود، بقاء اور ارتقاء کی ضامن ہیں۔ تمام دوسری صفاتِ الٰہی اور اسمائے حسنیٰ اپنے اپنے معانی، مفاہیم، جہات میں توحیدِ الٰہی پر گواہی دیتی ہیں۔ مگر ان سب سے پہلے اور بڑھ کر صرف اسمِ اعظم ـــ اللہ ـــ ذاتِ مطلق کی وحدانیت کا ثبوت ہے۔ وہ اپنی ذات و صفت، وجود و بقاء، حیات و ابدیت، دنیا و آخرت اور ہر لحاظ و اعتبار سے واحد، یکہ اور تنہا و احد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید، وحدانیت اور یکتائی کو واضح الفاظ اور واضح عبارات میں بھی ثابت کیا ہے۔ تاکہ مضمر و قید اور پیوستہ و وابستہ بیاناتِ قرآنی کو مزید کھول دے، زیادہ واضح کر دے اور تابندہ تر بنا دے۔ متعدد آیاتِ کریمہ میں لفظ "واحد" استعمال کیا گیا ہے اور مقامِ واحد پر ذاتِ مطلق کے لئے "احد" لایا گیا ہے۔ "احد" کا استعمال اپنے واحد سیاق و سباق میں ہے جبکہ "واحد" کے سیاق و سباق مختلف ہیں، مقامات و محلات گوناگون ہیں، تناظر و مناظر جدا جدا ہیں اور استعمالات رنگارنگ ہیں۔

توحید الٰہی کے بیان و اظہار کا ایک خوبصورت و دل نشین، مدلل و مفصل، محکم و مضبوط انداز و اسلوب بنفسِ نفیس ذاتِ مطلق کا اپنا اظہار و اثبات ہے۔ اللہ تعالیٰ واضح فرماتا ہے کہ وہ واحد ہے۔ کبھی وہ اپنے کو صرف واحد کہنے پر اکتفا کرتا ہے، کبھی موقع و محل کے اعتبار سے "واحد" کی ایک اور صفت لے آتا ہے۔ کبھی اپنی واحد صفت کو مختلف صفات سے تمام و مدلل کرتا ہے۔ واحد کی صفت اسم اعظم ـــــ اللہ ـــــ کی تابع و شارح بنا کر لاتا ہے۔ صفات کی رنگا رنگی، بوقلمونی اور گونا گونی "وحدانیت" کے مستور و مخفی اور پوشیدہ و مضمر معانی کی گرہیں کھولتی ہے۔

کلام و بیان سے سیاق و سباق نے بھی توحید و وحدانیت الٰہی کی تحکیم، تائید اور اثبات میں بے نظیر حصہ لیا ہے۔ براہ راست فرمانِ الٰہی کے علاوہ توحید کے اظہار و اثبات کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوسرے ذرائع بھی استعمال فرمائے ہیں۔ متعدد مقامات پر منطقی استدلال اختیار فرمایا تو کہیں تاریخی استناد سے کام لیا۔ انبیائے کرام کی زبانِ صداقت بیان سے اقرار و اظہار کرایا تو ان کی تبلیغ و رسالت کو بھی اس کا ذریعہ بنایا۔ خداوندگانِ عالم کی کثرت پر نقد کر کے اپنی وحدانیت ثابت کی تو اہل کتاب کے عقیدۂ فرزندی و تثلیث پر تنقید کر کے اس کی وضاحت کی۔ تمام ادیان میں توحید کو جدری ساری بنایا تو دنیا و آخرت میں اپنی وحدانیت قائم و دائم کی۔

اظہار و اثباتِ توحید کی خاطر قرآن مجید میں جن اسالیب، سیاق و سباق، پس منظر و پیش منظر اور مقامات و مسالک کو کام میں لایا گیا ہے ان کا تذکرہ و تجزیہ آیاتِ کریمہ کے حوالے سے مستند تر بنے گا اور واضح تر بھی۔ یہاں صرف ان آیتِ کریمہ ہی پر اکتفا کرنا مناسب و موزوں معلوم ہوتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے "وَاحِدٌ و اَحدٌ" ہونے کی حقیقت اجاگر کی گئی ہے۔ "اللہ" اور اس کی دوسری صفاتِ جلیلہ کے حوالے سے اس کی وحدانیت کا ثبوت متعدد دوسرے مقالات و مضامین میں فراہم کیا گیا ہے اور ضمناً اس بحث میں بھی آتا رہے گا۔

اثباتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے بنفسِ نفیس اپنی ذات کی طرف سے اپنی توحید کو سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۶۳ میں واضح کیا ہے:

وَ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۝ۧ

ترجمہ۔ اور تمہارا رب اکیلا رب ہے۔ کسی کو پوجنا نہیں اس کے سوا۔ بڑا مہربان ہے، رحم والا۔

(ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ)

سورۂ نحل آیت نمبر ۲۲ میں اپنی وحدانیت کو ثابت کرتے ہوئے اس کا تعلق آخرت پر ایمان نہ لانے کے جرم اور اس کے برے اثرات سے جوڑ دیا ہے:

اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۝

ترجمہ۔ معبود تمہارا، معبود ہے اکیلا، سو جو یقین نہیں رکھتے پچھلے دن کی زندگی کا، اور ان کے دل نہیں مانتے، اور وہ مغرور ہیں۔

مختلف قسمیں کھانے کے بعد اپنی الوہیت اور وحدانیت ثابت کر کے اس کو ربوبیت سے ہم آہنگ کر دیا ہے:

اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ۝ؕ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ۝ؕ (صٰفٰت: ۴۔۵)

ترجمہ: بے شک حاکم تمہارا ایک ہے۔ رب آسمانوں کا اور زمین کا، اور جو ان کے بیچ ہے، اور رب مشرقوں کا۔

یوم قیامت کی واحد شہنشاہیت کے حوالے سے اپنی وحدانیت کا اظہار غافر۔۱۶ میں کیا ہے اور اس کی مزید تائید صفاتی قہاریت سے لائی گئی ہے:

يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۗ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۗ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○

ترجمہ جس دن وہ لوگ نکل کھڑے ہوں گے، چھپی نہ رہے گی اللہ پر ان کی کوئی چیز۔ کس کا راج ہے اس دن؟ اللہ کا ہی جو اکیلا ہے دباؤ والا۔

کچھ آیات کریمہ ایسی بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کا اظہار و اثبات تو اپنی زبان اور اپنی جانب سے کیا ہے مگر ان میں اپنی وحی اور رسولوں کی پیغمبری کو بھی ایک واسطہ بنا لیا ہے۔

الٰہی و نبوی شہادت

سورۂ انعام نمبر۱۹ ایک ایسی اہم آیتِ مقدسہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی شہادت اپنی وحدانیت پر قائم کی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب والشہادۃ ہے کی اپنی گواہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجی جانے والی وحی، رسول کی تنذیر و تبلیغ کو بھی ذریعہ اثبات بنایا ہے۔ کثرتِ الٰہ اور تعددِ خداوندگان پر تنقید کر کے بھی اس کا اثبات کیا ہے اور شرک سے رسولِ مکرم کی اپنی براءت کا اعلان کروا کے اس کو مزید مستحکم و محکم بنایا ہے:

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۗ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ۗ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ۗ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ۘ

ترجمہ: تو کہہ کس چیز کی بڑی گواہی؟ کہہ: اللہ گواہ میرے اور تمہارے بیچ۔ اور اترا ہے مجھ کو یہ قرآن، کہ تم کو اس سے خبردار کروں، اور جس کو یہ پہنچے۔ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ معبود اور بھی ہیں؟ تو کہہ میں نہ گواہی دوں گا۔ تو کہہ: وہی ہے معبود ایک، اور میں قبول نہیں رکھتا جو تم شریک کرتے ہو۔

وحی، رسالت، تبلیغ، تنذیر کے ذرائع و وسائل کو کام لاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحیدِ الوہیت کو اپنی توحیدِ ربوبیت کے ساتھ آمیز کیا ہے۔ اللہ، رب اور خالق کی بنیادی صفات و اسماءِ مبارکہ کو بھی توحید پر دلیل بنایا ہے۔ شرکاء اور دوسرے خالقوں کی تنقید و تردید کر کے تخلیق کے لحاظ سے بھی اپنی توحید ثابت کی ہے اور بینا و نابینا اور تاریکی و روشنی کی مثالوں سے بھی گواہی، شہادت اور ثبوت فراہم کیا ہے:

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۗ قُلِ اللّٰهُ ۗ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۗ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ (الرعد:۱۶)

ترجمہ: پوچھ کون ہے رب آسمان و زمین کا؟ کہہ اللہ۔ کہہ: پھر تم نے پکڑے ہیں اس کے سوا حمائتی، جو مالک نہیں اپنے بھلے برے کے۔ کہہ کوئی برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھتا؟ یا کہیں برابر ہے اندھیرا اور اجالا؟ یا ٹھہرائے ہیں

انہوں نے اللہ کے شریک کہ انہوں نے کچھ بنایا ہے جیسے بنایا اللہ نے؟ پھر مل گئی پیدائش ان کی نظر میں۔ کہہ۔ اللہ ہے بنانے والا ہر چیز کا، اور وہی ہے اکیلا زبردست۔

سورۂ کہف نمبر۱۱۰ کی آیت کریمہ میں بھی وحی، رسالت اور رسولِ مکرم کی تبلیغ و انذار کو توحید کے اثبات کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس توحید ربانی کا ایک تقاضا توحیدِ عبادت اور عملِ صالح بھی بتایا گیا ہے جیسے کہ بعض دوسری آیت کریمہ میں بھی موجود ہے

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۠

ترجمہ: تو کہہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ تمہارا صاحب ایک صاحب ہے۔ پھر جس کو امید ہو ملنے کی اپنے رب سے، سو کرے کچھ کام نیک، اور ساجھا نہ رکھے اپنے رب کی بندگی میں کسی کا۔

یہی ذرائع و وسائل سورۂ انبیاء نمبر۱۰۸ میں استعمال کر کے اثباتِ توحید کا لازمی تقاضا اسلام لانا بتایا ہے:

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝

ترجمہ: تو کہہ، مجھ کو تو حکم یہی آتا ہے کہ صاحب تمہارا ایک صاحب ہے۔ پھر ہو تم حکم برداری کرتے؟

تبلیغ و تنذیر اور تعلیم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ثابت کر کے اس کا تعلق و ربط تذکیر سے قائم کیا گیا سو کی گئی، اس کو عقل و فہم کی بات سورۂ ابراہیم نمبر۵۲ میں ثابت کیا گیا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝

ترجمہ: یہ خبر کر دینی ہے لوگوں کو، اور تا چونک رہیں اس سے، اور تا جانیں کہ معبود ہے ایک، اور تا سوچ کریں عقل والے۔

سورۂ کہف کی آیتِ کریمہ کی مشابہ و مماثل سورۂ فصلت/حٰم السجدۃ نمبر۶ ہے جس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اور وحی الٰہی سے سرفرازی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت واضح کرنے کے بعد توحید کا تقاضا و لازمہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب رجوعِ تام، اس پر استقامت، اس سے استغفار کیا جائے۔ اور جو ایسا نہ کرے اور مشرک بنا رہے اس کی تباہی و بربادی کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ۝

ترجمہ: تو کہہ میں بھی آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ تم پر بندگی ایک حاکم کی ہے، سو سیدھے رہو اس کی طرف اور اس سے گناہ بخشواؤ۔ اور خرابی ہے شرک والوں کو۔

انذارِ رسول اور تبلیغ پیغمبر کے ساتھ توحیدِ الٰہی کو سورہ ص نمبر۶۵ میں جوڑا گیا ہے مگر یہاں اس کے ساتھ قہاریت کو بھی شامل کر دیا گیا ہے کہ وہ واحد بھی ہے اور قہار بھی یا واحد قہار بھی۔ اس میں اسم اعظم اللہ بھی موجود ہے تاکہ اس کی الوہیت کی توحید بھی ثابت ہو جائے اور یہ ایسی توحید ہے جو تمام خداوندانِ عالم کے وجود کی نفی بھی کرتی ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

ترجمہ: تو کہہ: میں تو یہی ہوں ڈر سنانے والا۔ اور حاکم کوئی نہیں مگر اللہ اکیلا، دباؤ والا۔

زبانِ نبوت سے سب سے بڑی شہادت اور سب سے عظیم اثبات توحید الٰہی کے باب میں سورۂ اخلاص میں لایا گیا ہے جہاں اللہ کی "احدیت" کا انوکھا اور بے مثال اظہار و اعلان ہے۔ دوسری آیاتِ مقدسہ میں جو صفات الٰہی لائی گئی ہیں وہ توحید کو مزید مؤکد و مدلل اور محکم و مستحکم کرتی ہیں۔ وہ اثبات ہی اثبات ہے کہ اس کی تمام نفی بھی اثبات پر دلالت کرتی ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

ترجمہ: تو کہہ: وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ نرادھار (بے نیاز) ہے۔ نہ کسی کو جنا، نہ کسی سے جنا، اور نہیں اس کے جوڑ کا کوئی۔

سورۂ اخلاص میں تمام مروجہ اقسامِ کفر و شرک کی تردید بھی کی گئی ہے۔ ان میں شرک کے حوالے سے ثنویت یا دوئی اور تعددِ خداوندان بھی شامل ہیں، فرزندیت یا تثلیث کا عقیدہ بھی۔ اللہ کے جسم، ہمسر اور ہم پلہ شرکاء بھی۔ اللہ کی صمدیت مخلوقات سے اس کے ماوراء و غیر محتاج ہونے کے علاوہ اس کی قومیت کا بھی احاطہ و ادراک کرتی ہے۔ بعض دوسری آیاتِ کریمہ میں توحیدِ الٰہی کا اعلان و اثبات اور تعبیر و تشریح انہیں جیسے بعض دوسرے حوالوں سے کی گئی ہے۔

ثنویت پر تنقید کے حوالہ سے

دوئی کی تردید و ابطال کر کے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اثبات سورۂ نحل نمبر۱۵ میں کیا گیا ہے اور اس حقیقت کے تناظر میں تمام مخلوقات کو خشیتِ الٰہی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝

ترجمہ: اور کہا اللہ نے نہ پکڑو معبود دو، وہ معبود ایک ہے۔ سو مجھی سے ڈرو۔

اسی حقیقت کو سورہ انبیاء نمبر۲۲ میں توحیدِ الٰہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

ترجمہ: اگر ہوتے ان دونوں میں اور حاکم سوا اللہ کے، دونوں خراب ہوتے۔ سو پاک ہے اللہ، تخت کا صاحب، ان باتوں سے جو بتاتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں نظامِ کائنات کی صحت و بقاء کے حوالے سے بھی توحیدِ الٰہی کا اعلان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ وضاحت فرماتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور الٰہ، معبود اور خداوند کی موجودگی ہی آسمان و زمین میں فساد و خرابی کا باعث ہوتی۔ اگر آسمان و زمین اپنی جگہ پر قائم، صحیح اور باقی ہیں تو محض اس بنا پر کہ ان دونوں کا الٰہ واحد ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ثنویت، کثرت یا شرک کی کوئی اور قسم جو توحیدِ الٰہی کے منافی ہو کلامِ الٰہی میں مردود و مقہور قرار دی گئی ہے۔ سورۂ مومنون نمبر۹۱ میں اسی حقیقت کو دوسرے اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى

بعض ؕ سُبْحٰنَ اللهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۝ۙ

ترجمہ: اللہ نے کوئی بیٹا نہیں کیا، اور نہ اس کے ساتھ کسی کا حکم چلے۔ یوں ہوتا، تو لے جاتا ہر حکم والا اپنے بنائے کو، اور چڑھ جاتا ایک پر ایک۔ اللہ نرالا ہے ان کے بتانے سے۔۔۔

تثلیث کی تردید

اہل کتاب چونکہ الہامی مذہب اور ربانی دین کے حاملین کرام سمجھے جاتے تھے لہٰذا ان کا شرک اہل کفر کی ملاوٹ سے زیادہ خطرناک اور دوررس نتائج کا حامل بن سکتا تھا اور بنا تھا۔ قرآن مجید نے اسی بنا پر تثلیث اور اس کی بنیادیں دستور والدیت و فرزندی کے عقیدہ پر ضرب کاری لگائی اور توحید کا غیر مشتبہ اظہار کیا۔ سورۂ مائدہ نمبر ۳ میں ان کے عقیدۂ تثلیث کو کفر سے تعبیر کیا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ

ترجمہ: بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ ہے تین میں کا ایک۔ اور بندگی کسی کو نہیں مگر ایک معبود کو۔

جب کہ سورۂ نساء نمبر ۱۷۱ میں تثلیثی شرک سے روکا گیا اور توحید کو ان کے لئے باعث خیر بتایا گیا:

وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ

ترجمہ: اور مت بتاؤ اس کو تین۔ یہ بات چھوڑو کہ بھلا ہو تمہارا۔ اللہ جو ہے سو ایک معبود ہے۔

ارباب باطل اور جھوٹے خداؤں کی دوئی ہو یا کثرت، اللہ تعالیٰ کے فرزند کا تصور ہو یا مددگاروں کا عقیدہ یا ان جیسے دوسرے تصورات فاسدہ اور عقائد باطلہ ہوں، وہ سب کے سب بدترین عقیدہ اور فاسدترین فکر شرک کے مختلف مظاہر ہیں۔ اسی سے مت مظاہر پرستی تک جا پہنچتی ہے۔ مختلف اجرام فلکی جیسے سورج، چاند، تاروں وغیرہ کی عبادت یا متعدد اجسام ارضی جیسے شجر و حجر، انسان و جانور اور آتش و آب کی پوجا کسی نہ کسی مشرکانہ عقیدہ و خیال کے تحت کی جاتی ہے۔ ان تمام مخلوقات ارضی و سماوی کو اللہ رب العالمین کا عزیز و قریب، مددگار و معاون اور نائب و جانشین سمجھا جاتا ہے اور ربوبیت کا حامل اور الوہیت کا حق دار تسلیم کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے متعدد آیات کریمہ میں تمام مظاہر فطرت اور اجرام فلکی و زمینی کی معبودیت و ربوبیت سے نہ صرف انکار کیا ہے بلکہ ان کی مخلوقیت پر اصرار کیا ہے۔ مخلوق ہونے کے سبب ان کی لاچاری، مجبوری، محتاجی، غلامی اور ہر لحاظ سے اللہ خالق و رب پر ان کی "انحصاری" کو ثابت کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ربوبیت و معبودیت سے جن آیات کریمہ میں انکار فرمایا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ ان میں اللہ تعالیٰ کی اپنی "وحدانیت" کا واضح ذکر نہیں ہے تاہم وہ پوری طرح مضمر و مستور وجود ہے۔

توحید الٰہی کے اثبات اور دوئی یا کثرت کی تردید والی آیات کریمہ میں بھی یہ فرق زیادہ نمایاں ہو گیا ہے جیسے سورۂ ص نمبر ۵ میں فرمایا گیا:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ۝

ترجمہ: کیا اس نے کر دی اتنوں کے بدل ایک ہی کی بندگی؟ یہ بھی ہے بڑے تعجب کی بات۔

سورۂ زمر نمبر ۴ میں "فرزندی" کے تصور کی جڑ کاٹی گئی اور دوئی، تثلیث اور کثرت کی بیک وقت تردید

کی گئی:

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○

ترجمہ: اگر اللہ چاہتا کہ اولاد کرلے تو چن لیتا اپنی خلق میں جو چاہتا۔ وہ پاک ہے، وہی ہے اللہ اکیلا، دباؤ والا۔

اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو رب بنانے کے ساتھ ساتھ اپنے علماء و احبار اور راہبوں کو بھی کارساز، خداوند اور مشکل کشا بنا لیا تھا۔ سورۂ توبہ نمبر ۳۱ میں نصاریٰ کے عقائد و اعمال کی تردید کی، ان کے شرک اور مشرکانہ توصیفِ الٰہی کی تنزیہ کی اور توحیدِ الٰہی کی حیثیت و تشریح کی

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

ترجمہ: ٹھہرائے ہیں اپنے عالم اور درویش خدا، اللہ کو چھوڑ کر، اور مسیح بیٹا مریم کا۔ اور حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک صاحب کی، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، وہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے۔

تاریخی استدلال

تمام اقوامِ عالم پر بالعموم اور اہلِ کتاب مشرکین پر بالخصوص توحیدِ الٰہی واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بعض سابق انبیائے کرام کی زبانِ صداقت بیان سے توحیدِ الٰہی کا اعتراف و اقرار کرایا اور ان کے اخلاف اور فرزندوں کی زبان سے توحیدِ الہ اور توحیدِ رب کا ایمان واضح فرمایا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام جو بنو اسرائیل کے اصل بانی اور جدامجد تھے کی وصیتِ پیغمبری کا حوالہ سورۂ بقرہ نمبر ۱۳۳ میں ملتا ہے

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○

ترجمہ: کیا تم حاضر تھے جس وقت پہنچی یعقوب کو موت؟ جب کہا اپنے بیٹوں کو تم کیا پوجو گے بعد میرے؟
بولے: ہم بندگی کریں گے تیرے رب اور تیرے باپ دادوں کے رب کو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق۔
وہی ایک رب۔ اور ہم اسی کے حکم پر ہیں۔

انہیں کے عظیم فرزند اور جانشین پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں کو توحید ہی کا درس دیا تھا کہ ان کے آباء و اجداد کی یہی ملت، یہی دین اور یہی تعلیم تھی

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ ۭ(یوسف ۳۹)

ترجمہ: اے رفیقو بندی خانے کے! بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر؟ یا اللہ اکیلا زبردست۔

ان آیاتِ کریمہ میں حضرت یعقوب و یوسف کے علاوہ ان کے آباءِ کرام حضرت ابراہیم و اسحٰق بھی شامل ہیں کہ بنو اسرائیل ان کے ہی اخلاف میں تھے۔ ان کے ساتھ حضرت اسمٰعیل کا شمار ان کے آباء و اجداد میں کرنا بہت اہم ہے کہ نسلِ براہیمی کی دوسری شاخ کو بھی موحدین میں شمار کرتا ہے اور اس سے زیادہ یہ بات اہم ہے کہ بنو اسرائیل کی حضرت اسمٰعیل کی رسالت و نبوت اور ان کی ذریت میں نبی آخرالزمان کے ظہور سے ان کے انکار کی بھی تردید کی گئی ہے۔

تمام ادیان میں توحید کا اثبات

مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ سے توحیدِ الٰہی کا اثبات ہونے کے علاوہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تمام ادیان میں حقیقت واحد صرف توحید ہی ہے۔ کفر و شرک کی تمام قسمیں ان کے ماننے والوں کی بدعتیں ہیں۔ اس حقیقت کو واضح الفاظ میں دوسری آیات میں بھی بیان کیا ہے جیسا کہ سورۂ حج نمبر ۳۴ میں فرمایا:

وَ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهٗ أَسْلِمُوْا ۗ وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝

ترجمہ: اور ہر فرقے کو ہم نے ٹھہرا دی ہے قربانی، کہ یاد کریں نام اللہ کا ذبح پر چوپایوں کے، جو ان کو دئے۔ سو اللہ تمہارا ایک اللہ ہے سو اسی کے حکم میں رہو۔ اور خوشی سنا عاجزی کرنے والوں کو۔

یہی بات اہلِ کتاب کے حوالہ سے سورۂ عنکبوت نمبر ۴۶ میں واضح فرمائی ہے

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا أَهْلَ الْكِتٰبِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ ۖ إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَ إِلٰهُنَا وَ إِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جھگڑا نہ کرو کتاب والو سے مگر اسی طرح پر جو بہتر ہو۔ مگر جو ان میں بے انصاف ہیں اور یوں کہو کہ ہم مانتے ہیں جو اترا ہم کو، اور اترا تم کو، اور بندگی ہماری تمہاری ایک کو ہے، اور ہم اسی کے حکم پر ہیں۔

دنیا و آخرت میں توحیدِ الٰہی

صرف اس عالم آب و گل ہی میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اثبات نہیں کیا گیا بلکہ آخرت و معاد کے حوالے سے بھی اس ذاتِ مطلق کی توحیدِ خالص کو واضح کیا گیا۔ قرآن کریم کی کچھ آیاتِ مبارکہ اس کی توحیدِ مطلق کو کبھی الوہیت، ملوکیت اور بادشاہت کے حوالہ سے اجاگر کرتی ہیں جیسا کہ سورۂ غافر نمبر ۱۶ میں موجود ہے اور جس کا حوالہ اوپر گذر چکا۔ اس نوع کی اور بھی آیاتِ کریمہ قرآن مجید میں مل جاتی ہیں جیسے سورۂ ابراہیم نمبر ۴۸ میں فرمانِ الٰہی ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝

ترجمہ: جس دن بدلی جاوے اس زمین سے اور زمین اور آسمان، اور لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے۔

ان تمام آیاتِ مقدسہ میں اور ان جیسی دوسری آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت اجاگر فرمائی ہے کہ زمان و مکان کا کوئی عالم ہو وہ واحدٌ واحدٌ ہے۔ یہ زمان و مکان، دنیا و آخرت، زمین و آسمان، ابر و ہوا اور ان گنت "زمانیات و مکانیات" مخلوقاتِ عالم کے لئے ہیں کہ وہ اور ان کا وجود و فنا ان دونوں سے مشروط و محدود ہے۔ ذاتِ مطلق بسیط ہے اور زمان و مکان اور ہر قید و شرط سے ماوراء۔

لہٰذا اس کی ذات مطلق ہے اور اس کی توحید بھی مطلق اور اس کی تمام صفات و افعال بھی مطلق۔ وہ دنیا میں بھی واحد ہے اور آخرت میں بھی۔ ان دونوں سے قبل بھی واحد ہے اور ان کے بعد بھی۔ اس کی ذات کی

مانند اس کی توحید کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ ان آیاتِ کریمہ سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ جس طرح دنیا میں اس کی جناب میں کسی سفارش اور سفارشی کا گذر نہیں اسی طرح آخرت میں بھی کسی کی شفاعت اور تشفاعتی کا دخل نہیں۔ وہ اپنی ذات میں واحد ہے، اپنی الوہیت میں واحد ہے اپنی شہنشاہیت میں واحد ہے، اپنی ربوبیت میں واحد ہے، اپنی معبودیت میں واحد ہے۔ وہ اپنی ہر شان میں "واحد و احد" ہے۔

تفسیراتِ توحید: اصولی مباحث

مفسرینِ کرام اپنی تفسیر، تشریح اور تعبیر کی بنیاد قرآنِ مجید کی آیاتِ کریمہ کے الفاظ و معانی پر رکھتے ہیں۔ الفاظ و کلماتِ قرآنی کی لغوی، اصطلاحی اور تشریحی تاویل کرتے ہیں۔ ان میں پوشیدہ و پیوستہ معانی و مفاہیم کی توضیح کرتے ہیں۔ بقولِ امام ابن تیمیہ (احمد بن عبدالحلیم حرانی ۷۲۸-۶۶۱/۱۳۲۸-۱۲۶۳) الفاظ و آیات کے متبادر معانی کے ذریعہ وہ مرادِ الٰہی کو واضح کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ موصوف کا نظریہ ہے کہ الفاظ و عبارات سنتے ہی ایک صاحبِ زبان کا ذہن جن معانی و مفاہیم کی طرف منتقل ہوتا ہے وہی اس کے اصل معانی ہیں اور وہی مرادِ الٰہی ہیں۔ اس سے مشتق وہ تعبیرات، اصطلاحات اور تشریحات قرآنی ہیں جو اسلام و قرآن کے مخصوص دینی، تشریعی اور قانونی تناظر میں جدید معانی و مفاہیم کی حامل بن گئی ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (۷۶-۱۱۱۴/۶۲-۱۷۰۳) اپنے رسالہ الفوزالکبیر میں بہ آسانی سمجھ میں آ جانے والے جزوِ قرآن کو قرآنِ منطوق کا نام دیتے ہیں۔ اس کو ہر اہلِ زبان یا عربی جاننے والا بلا کاوش سمجھ لیتا ہے۔ خواہ وہ ایک فقرہ، کلمہ، آیت، یا سورت ہو۔

اصل عباراتِ قرآنی کے علاوہ مفسرینِ کرام کی تفہیم و افہام، تشریح و بیان اور تاویل و تفسیر میں ان کی اپنی ذاتی فہم اور سمجھ بوجھ کا دخل بھی ہوتا ہے۔ اس فہم و عقل کی تعمیر و تشکیل میں متعدد بلکہ بہت سارے اسباب، محرکات، عوامل، عناصر اور اشیاء کی کارفرمائی اور کارگذاری ہوتی ہے۔ مفسرینِ کرام کی اپنی ذہنی ساخت، تعلیم و تربیت، اساتذہ و شیوخ کے خیالات و آراء کی اثرانگیزی، ان کے اپنے عصری افکار و نظریات، ماہرینِ فن کے خیالات و تعبیرات، سابق مفسرینِ عظام کی تشریحات و توضیحات، ان کی اپنی اور ان کے شیوخ کی دینی اور مذہبی فکر، مسالکِ فقہی سے ان کی وابستگی یا شیفتگی، ان کا علمی و فنی تخصص، حالات و زمانہ کے تقاضوں کا ادراک حتیٰ کہ ان کے ماحول، فضا اور خواب و بیداری کی کیفیات ان کی تفسیرات کی تعمیر و تشکیل اور رنگ سازی میں کارفرما ہوتی ہیں۔

توحیدِ الٰہی کے باب میں مفسرینِ کرام کی تشریحات و تعبیرات مختلف انداز و طریقہ کی ملتی ہیں۔ اس کی بنا پر مفسرینِ توحیدِ قرآنی کو مختلف طبقات و درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، مگر اس تقسیم سے زیادہ ضروری ان کے طریقِ کار، اندازِ بیان اور اسلوبِ مطالعہ کی تفہیم ہے۔

قدیم ترین مفسرینِ کرام بالعموم واضح آیاتِ توحید کی دوسری آیاتِ واضحہ کی مانند کوئی تفسیر و تاویل نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں وہ آیاتِ مبارکہ اپنے معانی و مفاہیم میں اتنی واضح، صاف، شفاف اور صریح ہیں کہ ان کی تشریح مزید کی کوئی ضرورت نہیں، خود قرآنی الفاظ و عبارات اور آیات اپنے معانی و مفاہیم بیان کر دیتی ہیں، دلنشیں بنا دیتی ہیں۔ اگر ان کو ان آیاتِ کریمہ میں کہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے تو مختصر ترین عبارات میں اور بسا اوقات دو چار الفاظ ہی میں ان کے معانی بتا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایسی تفسیرات الفاظ و

عبارات قرآنی سے بھی کم ہوتی ہیں۔

تفسیرات توحید کا ایک اور اندازِ بیان یہ ہے کہ کلامِ الٰہی کے الفاظ و عبارات کو وہ اپنے انسانی الفاظ و بیان میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی Paraphrasing (وضاحت مطلب) ہوتی ہے۔ اس میں متن کو قاری، طالب علم، استاد اور مفسر محض اپنے الفاظ میں بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اگر شکوہِ متن اور وقارِ عبارت کے سبب کسی کی سمجھ میں معانی و مفاہیم پوری طرح اجاگر نہ ہوتے ہوں تو انسانی تسہیل اور تفہیم کی اسلوب کی بنا پر وہ اس کے فہم کی گرفت میں آ جائیں۔

بالعموم مخصوص علوم و فنون سے وابستہ مفسرین کرام یا قدیم ترین صاحبانِ تفسیر یا مختصر تفاسیر کے اہلِ قلم ایسی مختصر تفسیرات توحید کرتے ہیں۔ یہ دراصل تفسیر و تاویل کے مخصوص میدان کی چیز ہی نہیں ہوتیں۔ وہ تو ان الفاظ و عبارت کی تسہیل محض ہوتی ہے۔ مگر بہرحال ان مختصر تشریحات میں بھی ایک جہانِ فکر خوابیدہ ہوتا ہے جو ان کے مخصوص افکار و نظریات اور خاص فہم و شرح کی پرتیں کھول دیتا ہے۔

تفسیر ماثور کرنے والے اہلِ قلم بالعموم احادیث نبوی، آثارِ صحابہ، اقوالِ ماہرینِ قرآنیات، اور آراءِ علمائے سلف سے سروکار رکھنے کے سبب آیات توحید کی تفسیر و تشریح میں صرف توضیح مطالب تک محدود رہتے ہیں یا آیات کریمہ میں موجود دوسرے مسائل و معارف بیان کرتے ہیں۔ عام طور پر ایسا سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی آراء، اپنے عہد کے دینی افکار، تجزیاتی و تحلیلی خیالات سے گریز کرتے ہیں۔ یہ کلیہ بہت سے اساطین تفسیر ماثور پر صادق نہیں آتا، بالخصوص امام طبری (محمد بن جریر بن یزید ۲۲۴-۳۱۰/۸۳۹-۹۲۳) کی تفسیر طبری (جامع البیان عن تاویل آی القرآن) پر کہ وہ بلااستثناء اپنی آراء اور تجزیاتی مطالعات سے بھی برابر اپنے قارئین کو نوازتے ہیں۔ امام ابن کثیر (اسمٰعیل بن عمر دمشقی ۷۰۱-۷۷۴/۱۳۰۱-۱۳۷۳) اور حافظ سیوطی (عبدالرحمٰن بن ابی بکر ۸۴۹-۹۱۱/ ۱۴۴۵-۱۵۰۵) جیسے مفسرین البتہ تفسیر ماثور کی حدبندی کی پوری پابندی کرتے ہیں۔

ناقدین و مورخین قرآنیات نے جن مفسرینِ کرام کو رائے جائز پر مبنی تفسیر و مفسر کے طبقہ میں رکھا ہے ان کے ہاں دلائلِ نقلی —— احادیث، آثار و اقوال—— سے زیادہ زور دلائلِ عقلی، فکر، تدبر، منطق، فلسفہ، تصوف—— پر ہوتا ہے۔ ان کی تفاسیر آیاتِ توحید میں عصری رجحانات اور فکری میلانات کی عکاسی بھرپور طریقے پر ملتی ہے۔ وہ صحیح افکار و نظریات کی پیشکش سے جس قدر تعرض کرتے ہیں اسی قدر بلکہ کبھی کبھی اس سے کسی قدر زیادہ ان افکار و خیالات و آراء سے بحث کرتے ہیں جو بظاہر کتاب و سنت کی صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ مسلم دینی، فکری اور فلسفیانہ تحریکات اور ان کے اکابر کے اقوال و مسالک سے بھی بحث کرتے ہیں۔ توحیدِ الٰہی تمام مسلم فلاسفہ، صوفیہ، مفکرین، مدبرین اور مختلف دوسرے اہلِ فکر و دانش کا بنیادی محبوب موضوع رہا ہے اور فلسفہ الٰہیات میں تو ذاتِ مطلق اور اس کی صفاتِ عالیہ کو محوری مقام حاصل ہے۔

آیاتِ توحید کی تفسیر و توضیح میں ہر طرح کے مفسرینِ کرام کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ اولین آیتِ توحید پر مختصر تبصرہ یا مفصل بحث یا مدلل کلام کر کے اپنے فریضہ تفسیر کی ادائی سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں اور بعد میں آنے والی آیاتِ توحید کی تفسیر میں یا تو اپنی اولین تفسیر و توضیح کا حوالہ دے دیتے ہیں یا موقع و محل پر

مختصر وضاحتِ مطالب سے کام لیتے ہیں۔ وہ مختلف سورتوں میں وارد ہونے والی آیات توحید کی تشریح و تفصیل کا ان کے اپنے مقامات پر کار منصبی انجام نہیں دیتے۔ سوائے ان آیاتِ کریمہ کے جو اپنے مخصوص معانی و مطالب کی بنا پر زیادہ شرح و بسط کی طالب ہوتی ہیں۔ البتہ وہ ان مابعد مقامات پر مختصر اس سیاق و سباق، پس منظر اور شانِ تفسیر کا ضرور لحاظ رکھتے ہیں جن میں وہ آیاتِ توحید وارد ہوئی ہوتی ہیں۔

تفسیر بالرائے کے بعض ائمہ مفسرین نے اس عام روش کی پابندی کرنے کے باوجود بعد کے مقامات اور سورتوں میں آنے والی آیاتِ توحید پر مفصل و مدلل بحث و کلام کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس وقت وہ سیاق و سباق اور پس منظر پر تبصرہ کرتے ہیں۔ آیات کریمہ کا مخصوص مدلول بتاتے ہیں، اس کے خاص پہلو پر کلام کرتے ہیں، سورت کے مجموعی نظم یا پہلے اور بعد کے مقامات کی آیاتِ کریمہ کے تناظر میں ان پر تنقید و تبصرہ سے کام لیتے ہیں۔ اس کے معارف و علوم کھولتے ہیں، پوشیدہ معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان سے مختلف اور جدا زاویوں سے کلام کرتے ہیں۔ وہ مختلف آیاتِ توحید کے ضمن میں اپنی گذشتہ بحثوں کا حوالہ تو دیتے ہی ہیں اسی کے ساتھ وہ اپنی اس موضوعِ خاص پر کسی دوسری تصنیف و کتاب کا حوالہ بھی لے آتے ہیں کہ تفصیل کا طالب اس سے رجوع کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ سابق و پیش رو مفسرین کے تفسیری مباحث کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ ان مفسرین کرام کے ہاں مختصر، مفصل اور مختصر تفاسیر کا سلسلہ بالترتیب ملتا ہے جو ان کی گوناگونی اور بوقلمونی میں تو اضافہ کرتا ہی ہے، تفسیری جہات میں بھی وسعت و تنوع لاتا ہے۔

پہلی دوسری صدی

نزولِ قرآن کریم کے زمانے میں یا اس سے متصل عہد میں عین قرآن کی تفسیر و توضیح کی اتنی ضرورت ہی نہ تھی جتنی بعد کے زمانے میں پڑی۔ اول تو صحابہ کرام اور ان کے تابعین عظام کی غالب اکثریت خود اہلِ زبان تھی دوسرے توحیدِ الٰہی ان کے لئے آیاتِ کریمہ کی طرح واضح اور روشن تھی۔ ان کو کسی تشریح و تفسیر یا توجیہ و تاویل کی حاجت ہی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اولین دو اسلامی صدیوں میں "واحد"، "احد" یا "لاالٰہ الا اللہ" یا ان جیسے دوسرے کلمات و تراکیبِ توحید کی تفسیر و تاویل ابتدائی تفاسیر میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہت سے بہت یہ ہوا کہ "لاشریک" "لاند" وغیرہ کے الفاظ لا کر وضاحت کر دی کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک و سہیم نہیں اور وہ یکہ و یکتا اور تنہا معبود حقیقی ہے۔ بالعموم "واحد" اور احد وغیرہ پر مشتمل آیات کریمہ کی تفسیر ہی نہیں ملتی۔ پہلی صدی کی تفسیر ابن مسعود اور دوسری صدی کی تفسیر سفیان ثوری یا تفسیر سفیان بن عیینہ کا یہی انداز ہے۔ چند مثالوں سے بات اور واضح ہوگی۔

تفسیر ابن مسعود میں سورۂ بقرہ کی آیات کریمہ ۱۳۳ اور ۱۶۳ کی تفسیر ہی نہیں کی گئی۔ سورۂ بقرہ نمبر ۲۲ میں لفظ انداد کے حوالے سے حضرت ابن مسعود کی ایک مرفوع حدیث میں یہ بتایا گیا کہ اللہ عدل (واحد) ہے اور اس نے سب کو پیدا کیا لہٰذا اس کا ہمسر بنانا گناہِ اعظم ہے۔ (مرتبہ محمد احمد عیسوی، شرکۃ الطباعۃ العربیۃ السعودیۃ، ریاض ۱۹۸۵ء، ۲/۳۴۴)۔ بالعموم ان آیات کریمہ کی تفسیر ہی موجود نہیں ہے جن میں توحید الٰہی کا بیان آیا ہے اور اگر کہیں ایسی آیاتِ مقدسہ پر توجہ دی گئی ہے تو دوسرے مباحث و امور کے لئے۔ مذکورہ بالا سورتوں اور ان کی

آیات توحید کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے، بالخصوص سورۃ الاخلاص کے حوالے سے (۲/۸۔۷۳۷)۔ تفسیر سفیان ثوری (م ۱۶۱/۷۷۷) سورۂ بقرہ نمبر ۲۲ میں یہ تفسیر توحید ہے کہ اہل کتاب! تم جانتے ہو کہ وہ توریت و انجیل میں بھی واحد بتایا گیا ہے۔ (تفسیر القرآن الکریم، مرتبہ امتیاز علی عرشی، رامپور ۱۹۶۵ء، ۲)۔ آیت نمبر ۱۶۳ کی تفسیر نہیں دی، جبکہ آیت نمبر ۱۶۳ میں شان نزول کا بیان ہے۔ سورہ نساء، مائدہ، انعام کی آیات کریمہ کی تفسیر توحید نہیں جبکہ سورۂ توبہ نمبر ۳۱ میں علماء بنی اسرائیل کے حلال و حرام ہونے کے حوالے سے تفسیر کی گئی ہے مگر توحید کا بیان بھی ذکر نہیں۔(۸۳) سورہ ابراہیم نمبر ۴۸ میں تبدیل ارض کا ذکر ہے مگر توحید کا نہیں(۱۱۶) اور جبکہ نمبر ۱۱۰ میں ریاکاری سے اجتناب کا ذکر ہے(۱۳۸)۔ امام سفیان ثوری نے ایسی بہت سی آیات توحید سے بحث میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے جن پر دوسرے مفسرین نے طویل طویل بحثیں کی ہیں۔ حتیٰ کہ سورۂ اخلاص کی تفسیر ہی نہیں کی۔ وجہ صرف ایک ہے کہ ان کے نزدیک توحید الٰہی ایسا واضح، صریح، روشن باب تھا جس پر کچھ مزید لکھنے کی گنجائش ہی نہ تھی کہ قرآن مجید کی آیات کریمہ خود اس کی عظیم ترین تفسیر فراہم کرتی ہیں۔

تیسری چوتھی صدی

امام طبری نے سورۂ بقرہ نمبر ۱۶۳ کی تفسیر میں پہلے اپنے طریقہ کے مطابق آیت کریمہ کی توضیح کی ہے کہ الوہیت کے معنی پہلے گذر چکے (آیات کریمہ سابقہ۔۔۔ تفسیر طبری ۲۶۸/۲۔۱۳۲) اور وہ دراصل مخلوق کی عبادت کرنا ہے یا ان کی عبدیت ہے۔ آیت کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ وہی اللہ اے لوگو تمہاری اطاعت کا حق رکھتا ہے اور تمہاری عبادت کا سزاوار ہے کہ وہی معبود واحد اور رب واحد ہے لہٰذا اس کے ماسوا کی نہ عبادت کرو اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرو۔ اگر تم اس کے ساتھ کسی اور کو اپنی عبادت میں شریک کرو گے تو وہ بھی تمہاری طرح تمہارے اللہ کی مخلوق ہوگا جب کہ تمہارا اللہ اکیلا الٰہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، اس کی مثیل ہے نہ نظیر۔

آگے امام موصوف کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے معنی میں اختلاف پایا جاتا ہے:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اللہ کی وحدانیت کا معنی یہ ہے کہ اسکے تمام اشباہ و امثال کی اس سے نفی کی جائے۔ جیسے کہ عرب محاورہ ہے کہ فلاں لوگوں میں اکیلا یا اپنی قوم میں واحد ہے۔ "فُلَانٌ وَاحِدُ النَّاسِ، وَهُوَ وَاحِدُ قَوْمِهٖ" اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں اس جیسا کوئی نہیں یا اس کی قوم میں اس کے مشابہ یا نظیر نہیں۔ لہٰذا "اللہ واحد" کا معنی ہوگا کہ اللہ کی نہ مثال ہے نہ نظیر۔ ان کے گمان میں ان کی تاویل و تفسیر کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ "واحد" چار معانی میں لایا جاتا ہے۔ (۱) اپنی جنس میں اکیلا (واحد) ہو جیسے انسان تمام بنی نوع انسان میں سے ایک ہے۔ (۲) یہ کہ وہ غیر متفرق ہو جیسے وہ جزء جو منقسم نہیں ہو سکتا۔ (۳) یہ ہو کہ اس سے مثل و اتفاق سمجھا جائے۔ جیسے قول عرب: "یہ دونوں چیزیں ایک ہیں" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ اور اپنی مشابہتِ معانی کے سبب وہ شئے واحد بن کر رہ گئی ہیں۔ (۴) یہ کہ اس سے نظیر و مشابہ کی نفی مراد لی جائے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جب تین اولین معانی اللہ تعالیٰ کے باب میں مراد نہیں لئے جا سکتے لہٰذا ہمارے بیان کردہ چوتھے معنی ہی صحیح ہیں۔

دوسرے لوگوں کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اشیاء سے اور اشیاء سے اسکو منفرد سمجھا جائے۔ وہ اپنی ذات میں منفرد ہے کیونکہ وہ کسی شے میں داخل نہیں اور کوئی شے اس میں داخل نہیں۔ وہ پہلے قول و خیال کی تردید کرتے ہیں اور اپنے معانی کی صحت پر اصرار کرتے ہیں۔

امامِ موصوف اس کے بعد آیتِ کریمہ کے اگلے حصہ "لا الٰہ الا ھو" کی تشریح و تفسیر میں فرماتے ہیں کہ وہی رب العالمین ہے لہذا بندوں پر اسی کی عبادت واجب ہے اور اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں۔ نہ ربوبیت کیونکہ اسکے سوا تمام چیزیں اس کی مخلوق ہیں۔ لہذا سب پر اس کی اطاعت اور اس کے سامنے خضوع و فرمانبرداری واجب ہے۔ ان پر مخلوق ہونے کے سبب اس کی وحدانیت اور الوہیت کا اقرار لازمی ہو جاتی ہے۔ امام طبری شرک کی تمام اقسام کی تردید کرنے کے بعد آیتِ کریمہ کے آخری جزو کی تفسیر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تمام عقل و فہم والوں پر اپنی توحید کی وضاحت فرماتا ہے اور اس سے متعلق بیّن و صحیح و قطعی دلائل و براہین دیتا ہے۔ وہ گویا فرماتا ہے، اے مشرکو! اگر تم کو میری خبر میں کہ تمہارا اللہ الٰہ واحد ہے کوئی شک و شبہ ہے اور تمہارے تمام خداوندان و ارباب، الوہیت کے حق دار نہیں ہیں تو میرے دلائل پر تدبر کرو اور اس میں غور کرو۔ میرے دلائل میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات دن کی گردش ہے، وہ کشتیاں ہیں جو سمندر میں انسانوں کے نفع کے لئے تیرتی ہیں۔ آسمان سے میرا اتارا ہوا وہ پانی ہے جس کے ذریعہ میں زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہوں، وہ چوپایے ہیں جن کو میں نے زمین میں پھیلا دیا ہے، وہ بادل ہے جس کو میں نے آسمان و زمین کے بیچ مسخر کر دیا ہے۔ تو کیا وہ تمام معبودانِ باطل، شرکاء، رب اور اصنام جن کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہو اجتماعی یا انفرادی طور سے میری مذکورہ بالا مخلوقات و تخلیقات میں سے کسی ایک کو پیدا کرنے پر قادر ہیں یا اس جیسی کوئی شے بھی وجود میں لا سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تم ان کی پوجا کرنے میں حق بجانب ہوتے لیکن ان کی معذوری و مجبوری کی صورت میں میرے علاوہ کسی اور کو الٰہ و معبود ماننے کا جواز ہے اور اس کی عبادت و پوجا کا؟ اللہ تعالیٰ کی اپنی توحید و وحدانیت کے ان دلائل پر غور کرنا چاہیے۔ (طبری ۳/۲۶۔۲۷)

سورۂ بقرہ ۱۳۳ کے حوالہ سے امام طبری نے توحیدِ الٰہی کی جو بحث کی ہے وہ بہت مختصر ہے۔ حضرت یعقوب نے جب اپنے فرزندوں سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے تو انہوں نے کہا کہ ہم اسی معبود کی عبادت کریں گے جس کی آپ عبادت کرتے ہیں اور جو آپ کے آباء و اجداد ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق کا معبود ہے۔ یعنی "الٰہ واحد" کی کہ اس کے لئے عبادت خالص کریں گے اور اس کی ربوبیت کو واحد و یکہ و تنہا تسلیم کریں گے اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کریں گے اورنہ اس کے سوا کسی اور کو رب بنائیں گے۔ امامِ موصوف نے اس کے علاوہ دوسری باتیں آیتِ کریمہ مختلف الفاظ و عبارات کے بارے میں کہی ہیں: "الٰھا وَاحِدا" ای: "نُخْلِصُ لَهُ العِبَادَةَ، وَنُوَحِّدُ لَهُ الرُّبُوْبِيَّةَ، فَلَا نُشْرِكُ بِهِ شَيْئاً، وَ لَا نَتَّخِذُ دُوْنَهُ رَبّاً"۔ (تفسیر طبری، ۳/۹۸۔۹۹)

امام طبری نے دوسرے سلف وخلف مفسرین کرام کی مانند دوسری آیاتِ توحید کے ضمن میں دو اہم طریقے اختیار کیے ہیں: ایک یہ کہ وہ آیتِ کریمہ کے موضوع کے تناظر اور پچھلی اور اگلی آیاتِ کریمہ کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر بحث کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ بحث بہت مختصر ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ

نساء نمبر۱۷۱ کے باب میں رقم طراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا "فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ" اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کی تصدیق کرو اور یہ بھی تسلیم کرو کہ اس کا کوئی فرزند نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی جناب سے رسولانِ عظام جو کچھ تمہارے پاس لائے ہیں اسکی بھی تصدیق کرو اور یہ بھی مانو کہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور نہ اسکی کوئی بیوی ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر و مقابل۔ اور تین تین رب مت کہو"۔ امام موصوف نے اس کے بعد کچھ نحوی صرفی بحث کر کے وضاحت کی ہے کہ اہل کتاب کو خبردار کیا یہ ہے کہ وہ اپنے عقیدۂ تثلیث سے باز آ جائیں کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک اور اس کی ذات پر جھوٹ باندھنا ہے۔ لہٰذا اس عقیدۂ فاسد سے اجتناب ان کی دنیا و آخرت دونوں میں مفید ہے"۔ (تفسیر طبری، ۹/۴۲۲_۴۲۳)

عقیدۂ تثلیث سے متعلق سورۂ مائدہ نمبر ۷۳ ہے، لہٰذا امام طبری کی تفسیر آیت اسی کے تناظر میں ہے۔ اس آیت کریمہ کا خطاب ان اسرائیلیوں سے ہے جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر و شرک کا رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اللہ ثالثُ ثلاثۃ" ــــ اللہ ہے تین میں کا ایک"۔ ہماری معلومات کے مطابق جماہیر نصاریٰ کی یعقوبیہ، ملکیہ اور نسطوریہ فرقوں میں تقسیم سے قبل یہی قول تھا کہ "قدیم الٰہ جوہر واحد ہے جو تین اقانیم (عیسائی مذہب کی اصطلاح میں باپ بیٹا اور روح القدس) پر مشتمل ہے۔ وہ باپ و والد جو غیر مولود ہے، وہ مولود فرزند جو والد نہیں اور ان دونوں کے درمیان وہ زوجہ/زوج جو پائی جاتی ہے

"الالٰہُ القدیمُ جَوْھَرٌ واحدٌ یَعُمّ ثلاثۃَ أقانیمَ اَبًا وَالدًا غیرَ مَوْلُوْدٍ، وابنًا مَوْلُوْدًا غیرَ وَالِدٍ، وزوجًا مُتْبِعَۃً بینَھُما"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان "وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اِلٰهٌ وَّاحِدٌ"۔ میں عیسائی عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ لوگو! سوائے ایک معبود کے تمہارا کوئی اور معبود نہیں۔ وہ کسی کا والد ہے نہ مولود، بلکہ وہ ہر والد و مولود کا خالق ہے۔ اس کے بعد امام طبری نے بقیہ آیت کریمہ کے معانی، مفاہیم اور مسائل سے بحث کی ہے۔ (تفسیر طبری، ۱۰/۴۸۳_۴۸۱)

سورۂ انعام نمبر۱۹ میں امام طبری نے آیتِ کریمہ کی وضاحتِ مطلب سے سروکار رکھا ہے۔ مشرکوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ دوسرے خداوندوں کے ہونے کی گواہی دیتے ہو یعنی تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بتوں وغیرہ میں سے بھی معبودانِ باطل ہیں لیکن اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ایسی گواہی نہ دیں بلکہ ان کا انکار کریں اور فرمائیں کہ وہ معبود واحد ہے اور اس کی مخلوقات پر جو عبادتِ الٰہی واجب ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ میں تمہارے شرک سے کلی طور پر بری ہوں۔ اور ہر شریک سے اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ میں اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتا ہوں نہ اس کو الٰہ مانتا ہوں"۔ امام طبری نے اس کے بعد شانِ نزول سے بحث کی ہے کہ ایک خیال کے مطابق یہ یہود کے بعض خاص سرداروں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے اور اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس کی ایک حدیث مرفوع نقل کی ہے۔ اس کے مطابق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں نحام بن زید، قردم بن کعب اور بحری بن عمیر آئے اور کہا:

اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی الہ ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا الہ الا اللہ"۔ اسی کے ساتھ میں مبعوث ہوا ہوں اور اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اور ان کے قول کے بارے میں آیت کریمہ اتاری۔ (تفسیر طبری، ۱۱/ ۹۳-۲۹۲)

امام ابو جعفر طبری نے سورۂ توبہ نمبر ۳۱ کے باب میں پہلے تو یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ یہود نے اپنے احبار کو رب بنا لیا۔ احبار سے مراد علماء ہیں۔ حبر و احبار کی تاویل اس سے قبل میری اس کتاب میں آ چکی ہے۔ (۶/ ۳-۵۴۲، ۱۰/ ۳۴۱، ۳۴۸) پھر رہبان کی تشریح کی ہے اور حضرت عدی بن حاتم طائی کی تین احادیثِ نبوی اور حضرت حذیفہ کی بھی تین روایتِ مرفوع، حضرت البختری کی تین، حضرت حسن کی ایک، حضرت ابن عباس کی دو اور ابوالعالیہ کی ایک روایت نقل کی ہی کہ یہود و نصاری اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے، نہ ان کا سجدہ کرتے، نہ ان کے لئے نماز و روزہ کرتے بلکہ وہ ان کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھتے تھے، اللہ کی معصیت میں ان کی اطاعت کرتے۔ معاصی میں ان کی اطاعت کو رب بنانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کو الٰہ واحد کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں اور ایک رب کی اطاعت کریں۔ اور بہت سے خداؤں سے دور رہیں۔ کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت ہر شے پر واجب ہے اور تمام مخلوق پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ اسی کی وحدانیت و ربوبیت اصل ہے اور وہی سب کو کرنی چاہیئے۔ اس میں حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ کو فرزندِ الٰہی سمجھنے اور بنانے کی تردید بھی کی گئی ہے۔ (تفسیر طبری، ۱۴/ ۱۳-۲۰۸)

سورۂ یوسف نمبر ۳۹ کی تفسیر میں امام طبری رقمطراز ہیں: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے قید خانے کے رفیقوں سے گفتگو کی اور ان میں سے ایک مشرک تھا۔ لہٰذا اس کو اسلام لانے اور خداوندانِ باطل اور بتوں کی عبادت ترک کرنے کی نصیحت کی۔ امام طبری نے ان دونوں کو "صَاحِبَیِ السِّجْنِ" کہنے کی حکمت بیان کی ہے اور آیاتِ قرآنی سے اس کی نظیر پیش کی ہے پھر آیتِ کریمہ میں توحیدی فقرہ کی وضاحت کی ہے۔ کیا مختلف و پراگندہ ارباب اور بہت سارے خداؤں کی عبادت بہتر ہے یا ایک خدائے واحد قہار کی؟ جبکہ معبودانِ باطل نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ضرر، اور واحد معبود اپنی قدرت و سلطان میں "لاثانی" ہے۔ یعنی وہ ہر شے کا قاہر ہے اور اسی بنا پر تمام اشیاء اس کی فرمانبردار، مطیع ہیں خواہ خوشدلی سے ہوں یا بے دلی و کراہت کے ساتھ۔ اسی مفہوم کے دو اقوال حضرت قتادہ و حضرت مجاہد سے نقل کئے ہیں اور تیسرا قول ابن اسحاق کا ہے۔ (تفسیر طبری، ۶-۱۲/ ۱۳۰)

امام موصوف نے سورۂ رعد نمبر ۱۶ میں آیتِ کریمہ کے متن کی توضیح مطالب کی ہے اور بینا و نابینا اور روشنی اور تاریکی کی قرآنی مثالوں کے پس منظر میں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ آپ مشرکوں سے جو اللہ کے سوا بہت سی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں فرما دیں۔ تم ان خداؤں کو پوجتے ہو جن کے پاس نہ نفع پہنچانے کی سکت ہے اور نہ ضرر اور اللہ کو چھوڑ دیتے ہو حالانکہ اسی کے ہاتھ میں تمہارا فائدہ اور نقصان ہے۔ صاحبِ ایمان وہ بینا ہے جو اپنے ایمان کی روشنی میں چیزوں کو دیکھتا ہے، راستہ پہچانتا ہے اور تاریکی سے محفوظ رہتا ہے جبکہ کافر وہ نابینا ہے جو اپنے کفر کی تاریکی میں عالمِ حیرت میں غرق بھٹکتا رہتا ہے اور حقیقت تک کبھی نہیں پہنچتا۔ بقول حضرت مجاہد نابینا اور بینا کافر و مومن ہیں اور ظلمات و نور ضلالت و ہدایت ہیں۔ طبری

رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت مجاہد کی ان کے حضرات رواۃ سے چھ روایتیں نقل کی ہیں جو ہم معنی و ہم مطلب ہیں۔ اگرچہ الفاظ و عبارات اور اختصار و طوالت کا فرق ہے۔(تفسیر طبری، ۶۔ ۱۳/۸۷۔۸۶)۔

سورۂ ابراہیم نمبر ۴۸ میں امام طبری نے زیادہ روایات اس مسئلہ پر جمع کی ہیں کہ قیامت میں جب آسمان و زمین بدل جائیں گے تو لوگ صراط پر ہوں گے۔ اللہ واحد قہار کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت میں منفرد ہے، وہ ہر شے پر قاہر ہونے کے سبب غالب ہو جاتا ہے اور اس کو جس کے لئے اور جیسے چاہتا ہے چلاتا ہے۔ جب چاہتا ہے اپنی مخلوق کو زندہ کرتا ہے اور جب چاہتا ہے مارتا ہے۔ کوئی شئے اس پر غالب نہیں آ سکتی اور قیامت کے دن جناب الٰہی میں پیشی کے لئے حاضر ہونے سے اپنی قبروں میں زندہ ہونے والے قہر و جبر نہ کر سکیں گے۔ (۶۔ ۱۳/۱۶۷ بالخصوص و ماقبل)

سورۂ نحل نمبر ۲۲ میں الٰہ واحد کی تفسیر طبری یہ ہے کہ وہی تمہارا معبود ہے جو تمہاری اطاعت اور خالص عبادت کے حقدار ہے، نہ کہ دوسرے معبودانِ باطل۔ لہٰذا صرف اسی واحد الٰہ کی بات مانو اور صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ ماسوا کو شریک نہ کرو۔ جو لوگ قیامت کے منکر ہیں وہی متکبر ہیں اور الٰہ واحد کی عبادت کے منکر ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کو منفرد مانتے ہیں، نہ اسکی وحدانیت کے اقرار کرنے والے، اور ایسا اس بنا پر ہے کہ ان کے اسلاف سے جو شرک ان تک پہنچا ہے اسی میں وہ بھی مبتلا ہیں۔ (تفسیر طبری، ۷۔ ۱۴/۶۵)۔ اسی سورہ کی آیت کریمہ ۵۱ میں تفسیر طبری بہت مختصر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! میرا کوئی شریک نہ بناؤ اور نہ دو معبودوں کی عبادت کرو۔ اگر تم میرے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت کرو گے تو اس کو میرا شریک بناؤ گے۔ میرا کوئی شریک ہے ہی نہیں۔ وہ تو الٰہ واحد ہے اور معبودِ واحد ہے۔ اور وہ میں ہوں لہٰذا مجھ سے ڈرو۔ یعنی اپنی معصیت و نافرمانی پر میرے عذاب و سزا سے بچو۔ (تفسیر طبری، ۷۔ ۱۴/۸۰)

امامِ طبری نے سورۂ انبیاء نمبر ۲۲ کی تفسیر بھی بہت مختصر کی ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر آسمانوں اور زمین میں بہت سے خدا (الہۃ) ہوتے جن کے لئے عبادت صحیح ہوتی سوائے اللہ تعالیٰ کے جو تمام اشیاء کا خالق ہے اور جس کے لئے ساری عبادت والوہیت مختص ہے اور جس کے بغیر کوئی الٰہ نہیں ہو سکتا تو آسمان و زمین یعنی آسمان و زمین والے فساد کا شکار ہو جاتے۔ اللہ جل وعلا ان کے بہتانوں سے پاک ہے اور مشرکوں کی تمام جھوٹی الزام تراشی سے منزہ ہے۔(تفسیر طبری، ۷۔۱۷/۱۱) یہی رنگ و آہنگ امامِ موصوف نے اسی سورہ کی آیتِ کریمہ نمبر ۱۰۸ میں اختیار کیا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرماتا ہے اے محمد! آپ فرما دیں کہ میرے رب نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ لہٰذا تمہارا فرض ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو کیونکہ عبادت الٰہ واحد کو سزاوار ہے اور کسی ماسوا کو نہیں۔۔۔(تفسیر طبری، ۷۔۱۷/۸۳)

امامِ طبری نے سورۂ حج نمبر ۳۴ کی تفسیر میں توحید ربانی کی توضیح اس طرح کی ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
ہر امت اور ہر جماعت کے لئے جو اہلِ ایمان میں سے گذری ہم نے ان کی قربانی مقرر کی کہ وہ اس کا خون بہائیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیں۔ اس کے بعد حضرت مجاہد سے دو روایات قربانی کے باب میں نقل کر کے فرماتے ہیں کہ تمہارا الٰہ واحد ہے لہٰذا اصنام اور دوسرے خداؤں سے بچو اور جھوٹ بولنے سے بھی اجتناب کرو

کیونکہ تمہارا اللہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی عبادت کرو اور الوہیت کو اسی کے لئے خالص کرو، اسی کے سامنے جھکو اور اسی کی عبودیت کا اقرار کرو۔(تفسیر طبری، ۷۔۱۷/۱۱۶ و مابعد) سورۂ عنکبوت نمبر ۴۶، سورۂ صٰفٰت نمبر ۴، سورہ صٓ نمبر ۵، ۶۵، سورۂ زمر نمبر ۴، سورۂ غافر نمبر ۱۶، سورۂ فصلت نمبر ۶ میں امام طبری کی تشریح آیات توحید کا لگ بھگ یہی انداز ہے۔ کہیں کہیں چند الفاظ و عبارات کا فرق ہے اور آیات کریمہ کے پس منظر کی رعایت ہے۔ (سورہ عنکبوت کے لئے ۸۔۲۱/۱۴۳)۔

سورۂ صٰفٰت نمبر ۴ کی تفسیر وحدانیت میں امام طبری فرماتے ہیں اے لوگو! تمہارے جس معبود کی عبادت تم پر واجب ہے اور جس کے لئے تمہارا اخلاص اطاعت ناگزیر ہے وہ واحد ہے جس کا ثانی ہے، نہ شریک۔ لہٰذا اسی کے لئے عبادت خالص کرو اور صرف اسی کی اطاعت کرو اور اس کی عبادت میں تم کسی کو شریک نہ کرو۔(۹/ ۲۳) سورۂ صٓ نمبر ۵ میں توحیدالٰہی کی تفسیر مشرکینِ عرب کے استعجاب اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کے پس منظر میں کی ہے کہ تمام معبودوں کو باطل کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک الٰہ واحد کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔ اس تفسیر کے ضمن میں امام طبری نے مشرکین مکہ کو دعوت بالخصوص ابوطالب کو دعوتِ اسلام دینے سے متعلق کئی احادیث و روایات بھی نقل کی ہیں۔(۹/ ۸۰۔۷۷)۔ اسی سورہ کی آیتِ کریمہ نمبر ۶۵ میں معروف وضاحتِ توحید ہے کہ اللہ واحد کے سوا اور کسی معبود کے لئے عبادت جائز نہیں اور نہ اس کے لئے ربوبیت حلال ہے کیونکہ اللہ کے سامنے ہی تمام چیزیں سجدہ ریز ہوتی ہیں، اس کی عبادت کرتی ہیں، وہ ایسا واحد معبود ہے جس کے ملک میں کوئی شریک نہیں، اس کی بیوی نہیں، اپنے تمام ماسوا پر وہ غالب ہے۔(۹/ ۱۱۷)۔

سورۂ زمر نمبر ۴ میں اولاد سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کر کے اس کی توحید و وحدانیت ثابت کی ہے۔ اس کا کوئی فرزند نہیں ہو سکتا کہ اس کے سوا تمام مخلوق ہیں۔ اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ اس کا عبد و بندہ نہ ہوتا کیونکہ تمام اشیاء اس کی ملکیت ہیں تو اس کا فرزند کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ واحد ہے اس کے ملک و سلطان میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اپنی قدرت سے اپنی تمام مخلوق پر غالب و قاہر ہے کیونکہ وہ اس کی قدرت و سطوت کے سامنے سرنگوں ہیں۔(۹۔ ۱۲۳/۱۲۲)۔ سورۂ غافر نمبر ۱۲ اور ۱۶ میں بھی امام طبری نے توحید الٰہی کا مضمون دہرایا ہے کہ الوہیت اللہ کے لئے خاص ہے کیونکہ وہ واحد ہے اور تم کو شرک کرنے سے روکتا ہے۔ اسی کا حکم سارے جہان پر چلتا ہے کہ وہ علی کبیر و مالک الملک ہے۔ وہ ایسا واحد ہے جس کا کوئی مثل ہے اور نہ شبیہ اور اپنے سوا وہ ہر ایک پر غالب ہے۔(۹۔ ۳۲/۲۔۳۴)۔ سورۂ فصلت نمبر ۶ میں اللہ تعالیٰ کی معبودیتِ واحدہ کے تناظر میں تفسیر کی ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت جائز نہیں۔(۹۔ ۶۰/۴۴)۔

سورۂ اخلاص کی تفسر میں امام طبری نے آغازِ کلام شانِ نزول کے مختصر بیان سے کیا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رب العزت کے نسب کے بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ سورۂ نازل فرمائی۔ دوسری شانِ نزول یہ بیان کی ہے کہ یہود نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو تمام مخلوق کو پیدا فرمایا تو اللہ کو کس نے خلق کیا؟ اس کے جواب میں یہ سورۂ اتری۔ ان دونوں سے متعلق متعدد روایات امامِ موصوف نے نقل کی ہیں۔ سورۂ کی تاویل کی ہے کہ وہ اللہ ہے جس کے لئے ہر

شے کی عبادت ہے اور اس کے سوا کسی اور کے لئے جائز ہے اور نہ صحیح۔ "احد" کے اعراب سے بحث کرنے کے بعد لکھی ہے کہ بعض کے نزدیک وہ "واحد" کے معنی میں ہے اور مزید یہ تشریح کی ہے کہ ہم نے اس سے پہلے "احد" کے معنی کی وضاحت کر دی ہے لہٰذا اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ "صمد" اور لم یلد ولم یولد" کے معانی کی وضاحت کے بعد آخری آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس کا کوئی شبیہ ہے نہ برابر کا (عدل) اور اس کے مثل جیسا کوئی نہیں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس کی برابری کر سکے، وہ واحد قہار ہے۔ کلام عرب میں "الکفو"، "الکفی"، "الکفاء" واحد معنی میں آتے ہیں یعنی مثل اور مشابہ کے پھر نابغہ بنی ذبیان کے شعر سے استشہاد کیا ہے۔ (۱۰ـ۳۰/۲۳ـ۲۲۱)۔

پانچویں چھٹی صدی

معتزلی امامِ تفسیر زمخشری (محمود بن عمر، جاراللہ، ۴۶۷ـ۵۳۸/۱۰۷۵ـ۱۱۴۴) کی تفسیر "الکشاف عن حقائق غوامض التاویل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل" جو اپنے مختصر نام "کشاف" سے زیادہ مشہور ہے قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت پر عظیم ترین تالیف سمجھی جاتی ہے۔ اہلِ سنت کے حلقوں میں بھی وہ مقبول و متداول ہے مگر اس کے شائبہ اعتزال کے سبب احتیاط بھی روا رکھی جاتی ہے۔ فکرِ اعتزال کا زیادہ تر تعلق ذات و صفاتِ الٰہی سے ہی ہے۔ مگر توحید کے باب میں کسی قسم کا نزاع نہیں۔ بالعموم امام زمخشری نے آیاتِ توحیدِ الٰہی کے باب میں بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے۔

انہوں نے سورۂ بقرہ نمبر۱۶۳ میں "الٰہ واحد" کی کل یہ تشریح کی ہے۔ فَرْدٌ فِي الْإِلٰهِيَّةِ لَا شَرِيْكَ لَهُ فِيْهَا وَ لَا يَصِحُّ اَنْ يُّسَمّٰى غَيْرُهُ اِلٰهاً وہ اپنی الٰہیت میں فرد ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کے ماسوا کو الٰہ کہنا صحیح نہیں۔ "لا الٰہ الاھو" میں تشریح زمخشری ہے: "تَقْرِيْرٌ لِلْوَاحْدَانِيَّةِ بِنَفْيِ غَيْرِهٖ وَاِثْبَاتِهٖ۔ اس کے غیر کی نفی کر کے اس کی وحدانیت کو ثابت و محکم کیا گیا ہے۔ (۱/۱۵۷)۔ اسی سورۂ کریمہ کی آیت نمبر۱۳۳ کے باب میں انہوں نے سب کچھ کہا ہے مگر الٰہ واحد سے زیادہ توحید کی تفسیر نہیں کی۔ (۱/۱۴۵)۔

سورۂ نساء نمبر۱۷۱ کے حوالے سے انہوں نے عقیدۂ تثلیث کی وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نزدیک جوہر واحد ہے مگر اس کے اقانیم تین ہیں: "اقنوم الاب، اقنوم الابن اور اقنوم روح القدس"۔ پہلے سے مراد وہ ذات لیتے ہیں دوسرے سے علم اور تیسرے سے حیات۔ اس طرح اللہ تین بن جاتا ہے۔ زمخشری نے مسیحیت کے عقیدہ پر نقد کر کے آیاتِ قرآنی سے استدلال کیا ہے اور اللہ کے ولد ہونے کی نفی کی ہے کہ وہ صفاتِ اجسام و اعراض سے ماوراء ہے۔ (کشاف ۱/۳۶۰)۔ جبکہ سورۂ مائدہ نمبر۷۳ کے باب میں واضح کیا ہے کہ وجود میں کوئی الٰہ ہرگز نہیں سوائے اس کے جو وحدانیت سے موصوف ہے اور اس کا ثانی نہیں۔ وہ اللہ واحد و لاشریک ہے۔ (۱/۵۱۷)

امام زمخشری نے سورۂ انعام نمبر۱۹ میں اللہ کی شہادت اور بعض دوسری چیزوں سے تو بحث کی ہے مگر توحیدِ الٰہی پر ایک لفظ نہیں لکھا (کشاف، ۲/۸)۔ جبکہ سورۂ توبہ نمبر۳۱ کے باب میں ایک جملہ یہ لکھ دیا ہے کہ اہلِ کتاب کو اللہ کی عبادت کرنے اور اس کی توحید تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا تھا (کشاف ۲/۸ـ۲۰۷)۔ البتہ سورۂ

یوسف نمبر۳۹ کے حوالہ سے دوچار باتیں لکھی ہیں۔ عبادت واحد قہار رب کی کرنی چاہیے جس کی ربوبیت میں کوئی شریک نہیں بلکہ وہ قہار و غالب ہے۔(کشاف ۲/۲۶۷)۔ سورۂ رعد نمبر۱۶ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ ربوبیت میں متوحد ہے، قہار ہے کہ اس کے اوپر کسی اور کا غلبہ نہیں۔ اس کے سوا تمام چیزیں "مربوب و مقہور" ہیں۔ (کشاف ۲/۳۰۷)۔

سورۂ نحل نمبر۲۲ کے حوالے سے امام زمخشری نے لکھا ہے کہ غیراللہ کی الوہیت کا انکار کرنے سے یہ تو پہلے ہی ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ واحد ہے اور اس کی وحدت میں کوئی شریک نہیں۔ اس کی وحدانیت کے ثبات اور اس کی دلیل کی وضاحت کے باوجود مشرکین اپنے شرک پر قائم، ان کے قلوب وحدانیت کے منکر اور وہ خود اس سے استکبار کرنے اور اقرار سے روگردانی کرنے والے ہیں۔(کشاف ۲/۳۶۷)۔ اسی سورت کی آیت کریمہ نمبر۴۸ میں ان کی بحث کا مدار زیادہ تر اس نکتہ پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو الٰہوں (الٰھین اثنین) کی پوجا کرنے سے کیوں منع فرمایا۔ "اثنین" کا اضافہ کرنے سے جنسیت و عددِ مخصوص پر زور دینا مقصود ہے۔ اس کی وحدانیت والوہیت تو اس کے بغیر ہی ثابت ہوتی ہے۔(کشاف ۲/۳۷۵)۔ سورۂ کہف نمبر۱۱۰ میں دوسرے مباحث تو ہیں مگر توحید کا بحث نہیں کے برابر ہے۔(۲/۵۸۶)۔ البتہ سورۂ انبیاء نمبر۲۲ کے حوالے سے پہلے نحوی نکات زیر بحث لانے کے بعد توحید کے باب میں اتنا ضرور کہا ہے کہ ان دونوں کا مدبر صرف واحد ہو سکتا ہے اور وہ سوائے اللہ واحد کے اور کوئی نہیں۔ کیونکہ رعیت دو بادشاہوں کی تدبیر سے فاسد و خراب ہو جاتی ہے کیونکہ ان دونوں میں اختلاف، ایک دوسرے پر غالب ہونے اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔(۳/۸۶)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زمخشری نے اس باب میں اسلامی تاریخ سے ایک حوالہ دیا ہے۔ عبدالملک بن مروان نے جب عمرو بن سعید اشدق کو قتل کیا تو کہا تھا: "واللہ! مجھ پر اس کا خون میرے دیدۂ چشم سے بھی زیادہ عزیز تھا لیکن ایک سلطنت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے"۔

سورۂ انبیاء نمبر۱۰۸ میں امام زمخشری نے وحدانیت کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے والی وحی الٰہی سے مربوط کر کے کہا ہے کہ اس کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحدانیت کے اظہار پر تھا۔(کشاف ۳/۱۰۹)۔ جبکہ سورۂ حج نمبر۳۴ میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ قربانی پر شرک سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔(کشاف ۳/۱۲۳)۔ سورۂ عنکبوت نمبر۴۶ میں توحید پر ایک لفظ نہیں ہے۔ (۳/......) اسی طرح سورہ صفت نمبر۴ میں بھی کچھ نہیں۔ (۴/۶-۲۵) البتہ سورہ ص نمبر۵ کے حوالے سے لکھا ہے..... یہ کافرین توحید پر تعجب کرتے ہیں جو کہ حق ہے اور اس کے ماسوا کچھ صحیح نہیں، اور شرک پر تعجب نہیں کرتے جو ایسا باطل ہے کہ اس کی صحت کی کوئی صورت نہیں۔ پھر آیتِ کریمہ کے شانِ نزول میں سیرتِ نبوی کا ایک اہم واقعہ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام اور اس پر مسلمانوں کے انتہائی جوش و مسرت کا بیان کر کے قریش کے غم و غصہ، ابوطالب سے ان کے وفد کی ملاقات اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکالمہ اور آپ کی دعوتِ حق کو بیان کیا ہے۔ آیتِ توحید کا بلاغی موازنہ دوسری سورۂ کریمہ کی آیت زخرف نمبر۱۹: "وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا" کے مثل قرار دے کر ان کے قول کو سبیلِ دعویٰ و زعم پر محمول بتایا ہے کہ جماعت کا

واحد ہونا محال ہے۔(۵۸/۴)۔ اس سورہ کی دوسری آیتِ کریمہ نمبر۶۵ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بلاشبہ دینِ حق تو توحیدِ الٰہی ہی ہے اور یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔ جو واحد، بلاشریک و سہیم اور ہر شے کا قہار ہے اور تمام عالم میں اسی کی بادشاہی اور ربوبیت ہے۔(۸۰/۴)۔

امام زمخشری نے سورۂ زمر نمبر۴ کے حوالے سے توحید کی وضاحت یوں کی ہے اگر وہ فرزند بنانا چاہتا تو یہ محال و غیر صحیح ہوتا کیونکہ وہ ناممکن ہے۔ ایسا اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو چن کر مخصوص و مقرب بنا لیتا ہے جیسے انسان اپنی اولاد کے باب میں کرتا ہے۔ اس نے فرشتوں کا انتخاب کیا تو تم یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اولاد الٰہی ہیں۔ یہ تمہاری جہالت ہے۔ اس کی اولاد و اولیاء نہیں ہو سکتے کہ وہ واحد ہے لہٰذا اس کی بیوی نہیں ہو سکتی۔ جب بیوی نہیں تو اولاد کہاں ہو سکتی؟ کیونکہ اگر بیوی ہوتی تو وہ اسی کی جنس سے ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی اپنی کوئی جنس نہیں۔(۸۶/۴)۔

سورۂ غافر/مومن نمبر۱۶ میں امام زمخشری نے آیت کریمہ کے ابلاغی معانی اور ندا کہ آج بادشاہت کس کی ہے؟ اور جواب کہ اللہ واحد قہار کی سے زیادہ تعرض کیا ہے کہ منادی و مجیب ایک ہی ہو گا یعنی اللہ تعالیٰ۔ اس سے قبل بروزِ محشر تمام مخلوقات کو جمع کر کے ان کے سامنے اس اعلانِ اولین کے کئے جانے کی حکایت بیان کی ہے۔(۱۲۲/۴)۔ اس سے اگلی سورت کریمہ فصلت نمبر۶ میں توحیدِ الٰہی کا بیانِ زمخشری مختصر ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو بتا دیں کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ تمہارا الٰہ واحد ہے۔ لہٰذا اسی کی طرف توحید و اخلاصِ عبادت کے ساتھ رجوع کرو، دائیں بائیں توجہ نہ کرو اور اولیاء و شفعاء بنانے کی شیطان جو تمہیں پٹی پڑھاتا ہے اس پر دھیان نہ دو اور شرک سے توبہ کرو۔ (۱۳۶/۴)۔

امام زمخشری نے سورۂ اخلاص کی آیت اولیٰ میں ضمیر "ھُوَ" کا اسم "اللہ" سے تعلق یہ بتایا ہے کہ وہ ضمیر الشان ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ اللہ واحد ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ لغوی بحث کرنے کے بعد سورہ کے نزول کی شان لکھی ہے کہ قریش نے جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے "صفتِ رب" پوچھی تو یہ سورہ اتری۔ امامِ موصوف کے نزدیک "احد"، "واحد" کے معنی میں ہے اور اس کی اصل "وَحَدٌ" ہے۔ پھر قراءت سے تعرض کیا ہے اور دوسرے مسائل سے۔ دوسری آیات کے حوالے سے توحید کے باب میں پھر لکھا ہے کہ مشرکین بھی اقرار کرتے تھے کہ وہ آسمان و زمین کا خالق ہے اور ان کا بھی خالق ہے لہٰذا وہ واحد ہے، الوہیت میں متوحد ہے، اس میں کسی کی شراکت نہیں، وہ کسی کا باپ و فرزند اس لئے نہیں کہ اس کی جنس کا کوئی نہیں اور تناسل کے لئے جنسیتِ واحدہ سے ہونا ضروری ہے۔ اس کا کوئی مماثل بھی نہیں اور نہ مشاکل۔ "احد" میں وحدانیت کی صفت کے ساتھ ساتھ شرکاء کی نفی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کسی کا حاجتمند نہیں، غنی از دو عالم ہے۔ دوسرے سب اس کے محتاج ہیں۔ یہ سورہ کریمہ توحیدِ الٰہی اور اس کی صفات کی معرفت پر دلائلِ قاطعہ پیش کرتی ہے۔ (کشاف ۱۴۴/۵۴-۲۵۳)۔

چھٹی صدی

امام رازی (فخرالدین محمد ۶۰۶-۵۴۴/۱۲۰۹-۱۱۴۹) نے اپنی تفسیرِ کبیر میں امام طبری کی مانند سورۂ بقرہ نمبر۱۶۳ کی تفسیر میں "واحد" یا وحدانیتِ الٰہی کی بہت مفصل تشریح کی ہے۔ لفظ اللہ/الٰہ کے باب میں کہا ہے کہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر میں اس پر بحث گزر چکی ہے۔ جہاں تک "واحد" کا تعلق ہے اس میں متعدد "مسائل" ہیں۔ ان کی بحث میں کل نو مسائل بیان کئے گئے ہیں مگر چوتھے مسئلہ کی بحث میں مختلف اشکالات بھی زیر بحث لائے ہیں جن کی تعداد چار ہے اور ان اشکالات کے جوابات بھی دئے نہیں۔ پھر مسائل کے ذکر کے دوران بہت سے وجوہ اور ذیلی مباحث لائے ہیں جیسا کہ ان کا طریقہ ہے۔ ان کی بحث بر وحدانیت کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

اول مسئلہ کے تحت ابو علی کا قول نقل کیا ہے کہ "واحد" عربوں کے کلام میں دو صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک بطور اسم اور دوسرے بطریقِ صفت۔ اعداد اور گنتی ۔۔۔ ایک، دو تین۔۔۔ میں وہ اسم ہے، صفت نہیں۔ ایسے اور بھی مقامات و استعمالات ہیں جہاں وہ بطور اسم آتا ہے۔ بطور صفت واحد کا استعمال کلامِ عرب میں یوں ہوتا ہے جیسے کوئی کہے کہ ایک آدمی کے پاس سے میں گذرا۔ یہاں وہ ایک ہی شے ہے۔ جب اس اسم کا اطلاق حق سبحانہ و تعالیٰ پر کیا جاتا ہے تو وہ وصف و صفت ہوتا ہے جیسے عالم و قادر وغیرہ کی صفتِ الٰہی۔ اور وہ اسم بھی ہوتا ہے جیسا کہ ہمارا قول ہے کہ وہ ایک شے ہے۔ لیکن آیت کریمہ "وَاِلٰهُكُمْ اللّٰهُ وَّاحِدٌ" قولِ اول یعنی اس کے وصف ہونے کی تائید کرتی ہے۔

امام رازی اس باب میں اپنی رائے دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن اشیاء پر وحدانیت کے مفہوم میں مشترک ہونے کے سبب عقلی اعتبار سے واحد ہونے کا اطلاق کیا جاتا ہے وہ اپنی حقیقت و ماہیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ یعنی وہ جوہر ہوتی ہیں یا عرض، جسم ہوتی ہیں یا مجرد۔ ان میں سے ہر ایک کا محل یعنی ماہیت صحیح ہوتی ہے لہٰذا لفظ "واحد" واحد ہونے کے مجرد معنی کا فائدہ دیتا ہے اور اس صورت میں وہ اسم ہوتا ہے اور کبھی واحد ہونے کا فائدہ اس وقت ملتا ہے جب وہ کسی دوسری شے کی صفت بن کر آتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ صفت و وصف ہوتا ہے۔ واحد اللہ تعالیٰ کا اسم بھی ہے اور وصف بھی۔

دوسرا مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی "واحدیت" اس کی ذات کی ایک زائد صفت ہے یا نہیں؟ علماء کا اس باب میں اختلاف ہے۔ امام رازی نے ایک طبقہ کا خیال پیش کیا ہے کہ وہ ذات کی ایک صفتِ زائد ہے۔ ان کے دلائل کا فلسفیانہ بیان پیش کیا ہے کہ جوہر اور عرض میں فرق ہے۔ جوہر جوہر ہے اور جوہر کے مقابل عرض ہے اور واحد کا مقابل کثیر ہے۔ اسی میں انہوں نے یہ بحث بھی کی ہے کہ وہ سلبی ہے یا ثبوتی۔ دلائل کے بعد ثابت کیا ہے کہ اس کی وحدانیت ثبوتی ہے سلبی نہیں۔ اور اس طرح اس کی صفت ذات پر زائد ہے۔ لیکن اس قول کی تردید کی ہے کہ وہ ذات پر صفتِ زائد نہیں ہو سکتی اور اس کے لئے فلسفیانہ دلائل دئے ہیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ واحد ہونے کے سبب کوئی شے منقسم نہیں ہو سکتی جیسے کہ ایک انسان کا بحیثیت انسان دو انسانوں میں تقسیم ہونا محال ہے بلکہ وہ اجزاء اور ٹکڑوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر تمام موجودات وحدت رکھتی ہیں کہ وہ وحدت سے مجرد و خالی نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ دلیل و خیال صحیح نہیں کیونکہ وجود وحدت اور شے اور موجودات کا نفس اور شے ہے موجود کے ساتھ وحدت کو لازمی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ وجود واحد و کثیر میں منقسم ہو سکتا ہے۔

چوتھے مسئلہ کے تحت بیان کیا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ دونوں اعتبار سے واحد ہے۔ اول اس کی ذات بہت سے امور (امور کثیرہ) سے مرکب نہیں۔ دوم یہ کہ وجود میں کوئی ایسی شے نہیں جو اس کے واجب الوجود ہونے میں اور تمام ممکنات کے وجود کا مبداء ہونے میں شراکت رکھتی ہو۔ امام موصوف نے جوہر، مرکب وغیرہ کی فلسفیانہ طویل بحث کرنے کے بعد واضح کیا ہے کہ اللہ سبحانہ کی حقیقت دراصل حقیقت احدیت فردیت ہے جس میں کسی وجہ سے بھی کثرت نہیں پائی جاتی، نہ کثرتِ مقداری جیسی کہ اجسام میں پائی جاتی ہے اور نہ کثرتِ معنوی جیسی کہ فصل، جس سے مرکب نوع میں یا ماہیت و تشخص سے مرکب شخص میں ملتی ہے۔ امام رازی نے اس کے بعد ذات الٰہی اور اس کی ان گنت صفات اور دونوں کے تعلق سے بحث کی ہے کہ صفات ذات میں شامل ہیں یا اس سے الگ۔۔۔ ان سے متعلق مباحث، وجوہ اور اشکالات کا مفصل و مدلل ذکر کر کے واضح کیا ہے کہ ذاتِ الٰہی ان تمام صفات سے موصوف ہے، وہ اپنی ذات میں قائم ہے یا اس کی ذات اپنے آپ میں قائم ہے اور اپنی ذات میں واجب ہے۔ یہ بحث بھی خالص فلسفیانہ اور جواب الجواب کی نوعیت والی ہے کہ معتزلی فکر کا رد کیا ہے۔

پانچویں مسئلہ کے تحت معتزلی امام جبائی کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چار وجوہ سے واحد ہونا بیان کیا جاتا ہے (ا) کیونکہ وہ ابعاض (ٹکڑوں) والا نہیں ہے نہ اجزاء والا۔ وہ اپنی قدامت میں منفرد ہے اور وہ اپنی الوہیت میں منفرد ہے اور اپنی ذات کی صفت میں منفرد ہے جیسے وہ اپنی ذات و نفس میں قادر ہے۔

انہوں نے ابوہاشم کا قول نقل کیا ہے کہ وہ تین وجوہ سے واحد ہے یعنی چار کی جگہ تین وجوہ بیان کی ہیں۔ انہوں نے قدامت اور صفاتِ ذات کو ایک ہی وجہ بتا دیا ہے۔ قاضی کا قول ہے کہ اس آیت میں اس کی الوہیت/الٰہیت کا نور ہی مراد ہے کیونکہ توحید کو اس کے ساتھ جوڑا گیا یا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی کے سبب توحید کے بعد "لاالٰہ الاھو" کا کلمہ الوہیت لایا گیا ہے۔

امام رازی کے بقول "ہمارے اصحاب" (اشاعرہ) کا یہ کہنا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی ذات میں واحد ہے جس کا کوئی قسیم نہیں اور اپنی صفات میں واحد ہے جن میں اس کا کوئی شبیہ (مشابہ) نہیں، اور وہ اپنے افعال میں واحد ہے جن میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ پھر ان تینوں پر فلسفیانہ بحث اور حکیمانہ دلائل سے تعرض کیا ہے۔ صفات میں اس کی واحدیت کے تعلق سے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ممتاز صفات سے موصوفیت اس کے ماسوا کی اپنی صفات سے موصوفیت مختلف وجوہ سے ممتاز ہے (ا) اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ فانی ہے لہٰذا اسکی تمام صفات اس کی اپنی ذات و نفس کی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی عطا کردہ ہیں اور یہ دوسرا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کے اپنے نفس کی ہیں، کسی غیر کی عطا نہیں۔ دوم یہ کہ غیر اللہ کی صفات زمانہ کی گردش سے وابستہ ہونے کے سبب حادث ہیں جبکہ صفاتِ حق ایسی نہیں کہ ان پر گردشِ زماں کا کوئی اثر ہو۔ سوم یہ کہ صفاتِ حق غیر متناہی ہیں متعلقات کے اعتبار سے کیونکہ اس کا علم تمام معلومات سے اور اس کی قدرت تمام مقدورات سے متعلق ہے، بلکہ تمام غیر متناہی معلومات میں سے ہر ایک میں اس کو غیر متناہی معلومات حاصل ہیں کیونکہ وہ جوہر فرد (واحد) کے باب میں وہ جانتا ہے کہ وہ کیسا تھا اور متناہی احیاز (مقامات) میں سے ہر ایک میں اس کا کیا حال ہو گا اور متناہی صفات کی ہر قسم کے اعتبار سے اللہ سبحانہ اپنی صفات میں اس جہت سے واحد ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی ذات ان صفات سے بایں طور موصوف نہیں ہے کہ وہ اس کی ذات میں وہ حال ہیں اور اس کی ذات ان کا محل ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ذات الٰہی اپنی صفات کی بنا پر کامل ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم نے واضح کیا ہے کہ ذات ان صفات کے مبدأ کے مانند ہے۔ اگر ذات کی تکمیل صفات سے ہوتی تو مبدأ ذات ناقص ہوتا اور ممکن رممکنات کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوتی اور ایسا ہونا محال ہے۔ بلکہ اس کی ذات ہی اس کی ذات کی تکمیل کرتی ہے اور اس کی تکمیلِ ذات کے لوازم میں سے یہ ہے کہ صفاتِ کمال اس کے ساتھ ہمیشہ پائے جائیں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ جس طرح صفاتِ الٰہی کی حقیقت و کنہ عقل انسانی کو معلوم نہیں اسی طرح اس کی ذات کی حقیقت بھی غیر معلوم ہے۔ کیونکہ ہمیں علم الٰہی کے بارے میں شاید صرف اتنا معلوم ہے جتنا اس نے عالم مخلوقات کی پختگی و مضبوطی کے لئے ظاہر فرما دیا ہے۔ اس کے علم سے ہمیں اسی قدر پتہ ہے جتنا اس نے بتایا ورنہ ہم یہ تک نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے۔۔۔ اسی طرح اس کے قادر اور حی ہونے کا معاملہ ہے۔۔۔ جہاں تک اس کے اپنے افعال میں واحد ہونے کا معاملہ ہے تو یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ کوئی بھی موجود یا واجب ہو گا یا ممکن۔ واجب تو صرف ذاتِ الٰہی ہے اور اس کے ماسوا جو کچھ ہے وہ ممکن ہے۔ اور جو شے ممکن ہے اور جو موجود ممکن ہے وہ اس وقت تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ واجب سے متصل نہ ہو۔ یہ حکم ممکنات کی اقسام کے اختلاف و رنگارنگی کی وجہ سے بدل نہیں سکتا خواہ وہ ملک، ملک یا بندوں کا فعل ہو یا کچھ اور ہو۔ لہذا یہ ثابت ہوا کہ جو کچھ اس کے سوا ہے وہ اس کی ملکیت، بادشاہت، تصرف، قہر، قدرت اور غلبہ کے ماتحت ہے۔ اس سورت میں اس کی قضاء و قدر کے اسرار کی خوشبوؤں کا محض ایک شمہ ملتا ہے۔ اور اس کے فرمان انا کُلَّ شَیْءٍ خلقناہُ بِقَدَرٍ۔ (سورۃ القمر نمبر ۴۹ ہم نے ہر چیز بنائی پہلے ٹھہرا کر۔۔۔) کے حقائق میں کچھ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ موجود تو بس وہی ہے یا جو کچھ اس سے وابستہ ہے۔ جب سفینۂ فکر اس بحر ناپیدا کنار میں اترتا ہے تو خواہ وہ ابدالآباد تک رواں دواں رہے رک نہیں سکتا کیونکہ سفر یک چیز سے دوسری شے کی طرف جاری ہی رہے گا۔ شئے اول متروک ہو چکی ہو گی اور شئے دوم مطلوب ہو گی اور وہ دونوں متغائر رغیر چیزیں ہوں گی۔ لہذا انسان عالم فردانیت و وحدانیت سے خارج ہو گا۔ لیکن جب وہ عالم حادث اور عالم قدامت کے برزخ میں قدم رکھے گا وہاں حرکات ختم، علامات و نشانات مضمحل ہو جائیں گی اور عقول واذہان (اسباب) میں مجرد "وہ" باقی رہ جائے گا۔۔۔

چھٹے مسئلہ کے تحت امام رازیؒ نے یہ بحث کی ہے "اِلٰھُکُم" میں جو تمہاری طرف اللہ کی اضافت کی گئی وہ صحیح ہے اور ساتویں مسئلہ میں یہ بتایا ہے کہ اس اضافت رمضاف و مضاف الیہ کی بنا پر اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ ہی معبود ہے۔

آٹھویں مسئلہ میں "اِلٰھُکُمُ اللہُ وَاحِدٌ" پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ الٰہیت میں واحد ہے کیونکہ لفظ "واحد" کا "الٰہ" کے لفظ کے بعد آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ "وحدت" "الٰہیت" میں معتبر ہے نہ اس کے سوا کسی اور "غیر" میں۔ اس صورت میں صفت کا درجہ رکھتا ہے کہ وہ واحد سید ہے یا واحد عالم

ہے۔ "اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" کہنے کے بعد ممکن ہے کسی کے دل میں یہ وہم گذرے کہ ہمارا الٰہ تو ایک ہے شاید ہمارے علاوہ دوسروں کا الٰہ ہمارے الٰہ کا مدمقابل ہے لہٰذا اس وہم کا ازالہ توحید مطلق کے بیان سے فرما دیا اور کہا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ"۔ اس میں ماہیت کی نفی ہے اور اس کے تمام افراد کی بھی۔ امام رازی کے مطابق اس اضافی جملہ نے "توحید تام محقق" یعنی "ثابت شدہ کامل توحید" کا فائدہ/معنی عطا فرمایا ہے۔ اس کے بعد اس کلمۂ توحید میں بعض نحوی، عقلی، فقہیہ نکتیں کی ہیں جن میں "ھو" پر طویل و مفصل و مدلل بحث شامل ہے۔ (تفسیر کبیر، ۴/۱۵۲-۱۴۴)

سورۂ نساء نمبر ۱۷۱ میں اللہ تعالیٰ نے عیسائی عقیدۂ تثلیث کی تردید کر کے اپنی وحدانیت کا اثبات کیا ہے۔ امام رازی نے اس کی تفسیر میں عقیدۂ تثلیث کی بحث اٹھائی ہے کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ "اللہ تعالیٰ جوہر میں تو واحد ہے مگر اقانیم میں تین" نہ صرف مجہول ہے بلکہ عقلی طور پر محال ہے۔ انہوں نے ایک ذات کو بظاہر تین صفات سے موصوف کیا ہے حالانکہ وہ تینوں درحقیقت "ذوات" ہیں۔ امام رازی نے اس میں دو مسئلے بیان کئے ہیں اور پھر توحید والے فقرہ قرآنی کی تشریح کی ہے۔ "اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" سے اپنی توحید کی تاکید کی ہے اور "سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ" سے اولاد/فرزند سے منزہ ہونے کی وضاحت۔ فرزند سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کے دلائل ہم نے سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں تفصیل و استقصاء سے بیان کئے ہیں۔ (تفسیر کبیر، ج ۱۱/۲، ۷۲)

عقیدۂ تثلیث کے تناظر ہی میں توحید الٰہی کا اثبات سورۂ مائدہ نمبر ۷۳ میں کیا گیا ہے۔ یہاں بھی امام رازی نے "ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ" کے حوالے سے عیسائی عقیدہ کے دو طریقوں سے بحث کر کے ان کی تردید اور توحید کی تصدیق کی ہے۔ "وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" میں دو قول ہیں (۱) "مِن" صلہ زائدہ ہے اور کہنے کا مطلب ہے کہ ایک الٰہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ استغراق کے معنی رکھتا ہے اور مفہوم ہے کہ اس حقیقت کے وجود میں صرف ایک ذات ہے اور بس۔ (تفسیر کبیر، ۳۔ ۹/۱۲-۴۰۸)

امام طبری کی مانند امام رازی نے سورۂ انعام نمبر ۱۹ میں آیت کریمہ کے مختلف اجزاء و مضامین کی تفسیر کی ہے ان میں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی گواہی، تنذیر و تبلیغ کے لئے قرآن کریم کی تنزیل، قرآن مجید سے واقف ہونے والوں کی گواہی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا نہیں ہیں اور صرف وہی الٰہ واحد ہے اور آپ شرک سے بری ہیں۔ امام رازی کی بحث کے مطابق آیتِ کریمہ کا آخری حصہ توحید کے ایجاب اور شرک سے براءت پر ہے۔ اس میں تین وجوہ سے بحث کی ہے (۱) "قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ" کا مطلب ہے کہ میں تمہارے شرکاء کے اثبات کے تذکرہ کی گواہی نہیں دے سکتا۔ (۲) "اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" میں اِنَّمَا هُوَ یہ معنی و فائدہ دیتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی الٰہ ہے ہی نہیں۔ اور لفظ "واحد" توحید کی صراحت اور شرک کی نفی کرتا ہے۔ (۳) "اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ" میں شرکاء کے اثبات سے براءت کی تصریح کر دی گئی ہے۔ اس آیتِ کریمہ نے بیان کے عظیم ترین طریق اور تاکید کی بلیغ ترین صورت میں توحید کے ایجاب پر دلیل ثابت کر دی ہے۔ علماء کا قول ہے کہ جو شخص اسلام لائے اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ شہادتین (یعنی کلمۂ اسلام) سے شروع کر کے دین اسلام کے سوا تمام ادیان سے اپنی براءت ظاہر کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت کی بنا پر اس کے استحباب پر نص فرمایا ہے۔ (۴۔ ۱۲/۵۰۰-۴۹۷)

سورۂ توبہ نمبر ۳۱ کے حوالے سے امام رازی نے بیان کیا ہے کہ اہل کتاب نے اپنے "احبار" اور "رہبان" یعنی علماء کے بارے میں یہ اعتقاد نہیں اپنایا تھا کہ وہ معبودان و خداوندانِ عالم (الہۃ العالم) ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ان کے اوامر و نواہی میں ان کی اطاعت کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت عدی بن حاتم طائی کی حدیث نبوی کے علاوہ اپنے شیخ و مولانا خاتمہ المحققین و المجتہدین کا مقلد فقہاء سے ایک مباحثہ بھی نقل کیا ہے۔ اور قول ثانی کے تحت اس ربوبیت پر بحث کی ہے۔ اور آخری آیت نقل کر کے واضح کیا ہے کہ تورات، انجیل اور دوسری الٰہی کتابیں توحید کی ناطق ہیں۔ اللہ سبحانہ کا امر و تکلیف میں شریک ہے نہ مسجود و معبود ہونے میں اور نہ ہی تعظیم و اجلال کی انتہائی صورت کے وجوب میں اس کا کوئی شریک ہے۔ (۶۔۱۶/۳۱۔۳۰)

سورۂ یوسف نمبر ۳۹ میں متفرق ارباب کے پس منظر میں توحید الٰہی کا اثبات حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان مبارک سے کیا گیا ہے۔ امام رازی نے دوسرے مسائل کے علاوہ توحید پر بحث کی ہے اور بتوں کی پوجا اور اس کے عقیدہ کے فساد کو پہلا بحث بنایا ہے۔ ان کے بقول بت پرستی کی تردید اور توحید کی تائید کے بہت سے دلائل و براہین ملتے ہیں۔

اول دلیل و حجت یہ ہے کہ وضاحتِ الٰہی کے مطابق کثرتِ خداوندان/رب اس عالم میں خلل و فساد کا باعث بنتی ہے۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے: "لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا"۔ انبیاء نمبر ۱۲۔ جبکہ الٰہ کا واحد ہونا حسن نظام کے حصول اور حسن ترتیب کے ظہور کا مقتضی ہے۔ اس آیتِ سورۂ یوسف میں جو استفہام پایا جاتا ہے وہ انکار کے معنی میں ہے۔

دوسری حجت یہ ہے کہ یہ اصنام اور بت معمول ہیں عامل نہیں، مقہور ہیں قاہر نہیں۔ جب انسان ان کو توڑنا یا باطل کرنا چاہتا ہے تو ایسا کر سکتا ہے لہٰذا وہ مقہور ہوئے کہ ان کی کوئی اثر انگیزی نہیں۔ اس لحاظ سے ان سے نہ کوئی فائدہ متوقع ہے اور نہ کوئی نقصان۔ جبکہ "الٰہ العالم" فعال ہے، قہار ہے، قادر ہے، خیرات/نیکیاں/اچھائیاں پہنچانے اور شرور و آفات دور کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ تو مراد یہ ہے کہ ذلیل و مقہور خداوندوں کی عبادت بہتر ہے یا اللہ واحد و قہار کی عبادت؟

تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا واحد ہونا اس کی عبادت کو واجب کرتا ہے۔ کیونکہ اگر دوسرا کوئی الٰہ ہوتا تو ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ ہم کو کس نے پیدا کیا اور رزق دیا اور ہم سے کس نے شرور و آفات دور کیں۔ ہم اس کی عبادت کریں یا اس کی؟ یہی ابہام، خرخشہ اور شک کثرتِ اصنام کی عبادت میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا واحد ہونے کی حقیقت نے واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے اور اس کی وحدانیت ہی اس کو معبود و مسجود بناتی ہے۔

چوتھی دلیل کے تحت امام موصوف نے اللہ کی قدرت اور اصنام کی بے بسی پر کلام کیا ہے اور پانچویں دلیل کے تحت اس کی صفتِ "قہاری" پر بحث کی ہے۔ یہ شریف و عالی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قہار نہیں اور وہ اپنے ماسوا پر قہاری کرتا ہے۔ اس بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ الٰہ اپنی ذات کی بنا پر واجب الوجود ہے، اگر وہ ممکن الوجود ہوتا تو مقہور ہوتا۔ لہٰذا الوہیت، وحدانیت، قہاری، واجب الوجود ہونا سب ایک دوسرے سے مربوط و ملزوم ہیں۔ (تفسیر کبیر، ۶۔۱۸/۱۸۔۲۵۷ و بعد)۔

صاحب تفسیر مفاتیح الغیب نے سورۂ رعد نمبر۱۶ کی تفسیر میں پہلے یہ وضاحت کی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں یعنی کل مخلوقات عالم اللہ تعالیٰ کی سجدہ گذار، اطاعت گذار اور فرمانبردار ہیں کیونکہ وہ رب السموات والارض ہے۔ جمادات کی اطاعت کے معانی، بینا و نابینا اور تاریکی و روشنی میں فرق، غیر اللہ کے خالق ہونے کی تردید اور شرک کی تنقید کرنے کے بعد واضح کیا ہے کہ الٰہیت میں کسی طرح کی شرکت محال ہے اور معبودان باطل نہ کسی فعل پر نہ کسی تخلیق پر اور نہ کسی اثر پر قادر ہیں۔ کیونکہ ان کو الوہیت میں شریک کرنا محض جہالت و حماقت ہے۔ اس کے بعد امام رازی نے اس آیت کریمہ کے حوالہ سے چند مسائل سے بحث کی ہے۔ اور ان میں سب سے اہم مسئلہ خلق افعال کا ہے۔

امام موصوف کا بیان ہے کہ ہمارے اصحاب میں افعال کی تخلیق کے مسئلہ سے چندوجوہ کے تحت تعرض کیا ہے ( ) معتزلہ کے اس خیال و عقیدہ پر نقد کیا ہے کہ حیوانات کی حرکات و سکنات ان کی تخلیق ہے اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق حرکات و سکنات کے مماثل ہے۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ بندے اپنے افعال کے خالق نہیں ہوتے۔ بقول قاضی بندہ فعل کرتا اور باعثِ حدث ہوتا ہے لیکن وہ تخلیق نہیں کرتا۔ اگر ہم یہ بھی کہیں کہ وہ تخلیق کرتا ہے تو وہ اللہ کی طرح تخلیق نہیں کرتا۔ کیونکہ ہم میں سے ہر شخص اللہ کی قدرت سے فعل کرتا ہے اور فعل کا صدور اس سے کسی منفعت کے حصول اور کسی مضرت کے دفعیہ کے لئے ہوتا ہے جبکہ اللہ ان میں سے ہر چیز سے منزہ و پاک ہے۔ بندہ کو خالق بایں معنی کہا جاتا ہے کہ اس کا خلق فعل خلق الٰہی کی مانند نہیں ہوتا۔ یہ فرقہ مجبرہ/جبریہ کے عقیدہ کی بھی تردید کرتا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کا عین خلق ہے وہی بندہ کا کسب و فعل ہے۔ یہ عین شرک کیونکہ ان افعال کے خلق میں الہ اور بندہ ان دو شریکانِ تجارت کے مانند ہو جاتے ہیں کہ ایک کا مال نہیں ہوتا مگر دوسرے کا اس میں حق بن جاتا ہے۔ یہ آیت کہ بندہ خالق فعل نہیں ہے بطور مذمت آیا ہے ...۔ امام رازی نے حسب دستور لفظ خلق کی تعریفِ معتزلہ وغیرہ بیان کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ دوسری وجہ کے تحت بیان کیا ہے کہ بندہ کا فعل ایک شے ضرور ہے لہذا اس کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہوا۔ لیکن خلق الٰہ کا یہاں فرق موجود ہے۔

امام رازی نے فقرۂ آیت "وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" کے تحت بیان کیا ہے کہ وہ خالقیت میں واحد ہے اور تمام ماسوا کے لئے قہار ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ بیان کیا ہے کہ جہم کا مزعومہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی اسم کا وقوع نہیں ہوتا اور صرف اسی اسم کا نہیں کی اسم بھی اس پر واقع نہیں ورنہ وہ اپنے نفس کا خالق ہو جاتا جیسا کہ آیتِ کریمہ۔ اَللّٰہُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ میں ہے اور یہ محال ہے۔ لہذا اس پر اسم کا وقوع نہیں ہو سکتا۔ جہم نے آیتِ کریمہ: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ سورۂ شوریٰ نمبر۱۱ (نہیں اس کی طرح کا سا کوئی) اور سورہ اعراف نمبر۱۸۰: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا: (اور اللہ کے ہیں سب نام خاصے، سو اس کو پکارو وہ کہہ کر) سے استشہاد کیا ہے۔ امام رازی نے ان کے جوابات دیئے ہیں جن کاخلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات افعال کے اثر سے منزہ ہے کہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ اور تیسرے مسئلہ کے تحت معتزلہ کے عقیدہ پر نقد کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں عالم ہے اور علم کی وجہ سے عالم نہیں اور اپنی ذات میں قادر ہے قدرت کی صفت کی بنا پر نہیں دراصل معتزلہ صفات کو ذات کے لوازم شمار کرتے

ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے خلقِ قرآن کے مسئلہ میں اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ لیکن ان کا عقیدہ و استدلال غلط محض ہے کہ دلائل عقلیہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات صفات سے متصف ہے۔ امام رازی نے یہاں دلائل عقلیہ کی وضاحت نہیں کی ہے۔ (تفسیر کبیر ۱۹/۲۸۔۲۹)۔

سورۂ ابراہیم نمبر ۴۸ کے حوالہ سے زیادہ بحث قیامت میں "تبدیل آسمان و زمین" سے متعلق ہے۔ (۱۹/۱۴۳۔۱۱۱) "الٰہ واحد" سے چند مسائل اخذ کئے ہیں۔ اول مسئلہ یہ ہے کہ اس کتاب میں بار بار ہم نے ذکر کیا ہے کہ نفسِ انسانی کے دو شعبے ہیں:

(۱) نظری قوت اور موجودات کی تمام اقسام، اجناس و انواع کی معرفت میں اس کے حال کا کمال تاآنکہ نفس آئینہ کی مانند ہو جائے جس میں عالم ملکوت کا قدس (پاکیزگی) اور عالم لاہوت کا جلال منعکس و جلوہ گر ہونے لگے۔ ان تمام علوم و معارف اور صیقل گری و جلاء کا بلندترین علم (رئیس) اس توحید الٰہی کی معرفت ہے جو اس کی ذات و صفات و افعال کے مطابق و موافق ہو۔

(۲) دوسرا شعبہ عمل قوت اور اس کی سعادت کا ہے اور اس کی سعادت یہ ہے کہ وہ اخلاقِ فاضلہ سے متصف ہو جائے تاکہ اس سے افعالِ کاملہ کا صدور ہو۔ اس قوت کی سعادتوں کی معراج (رئیس) اللہ تعالیٰ کی اطاعت و خدمت گذاری ہے۔

اس معرفت کے حصول کے بعد ہم کہتے ہیں کہ "الٰہ واحد" کے بارے میں ہم قوت نظری کے حال کے کمال کی ریاست کی طرف اشارہ ہے اور آیتِ کریمہ کا آخری حصہ "وَ لِیَذَّکَّرَ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ" قوت عملی کے کمالِ حال کی ریاست کی جانب اشارہ ہے۔ اس تذکیر میں یہ فائدہ ہے کہ اعمالِ باطلہ سے اجتناب کیا جائے اور اعمالِ صالحہ پر توجہ دی جائے۔ انہیں دونوں میں انسان کی سعادت پوشیدہ ہے۔ دوم یہ کہ ان مواعظ و نصائح کی تذکیر کے لئے توحید کی معرفت لازمی ہے اور اعمالِ صالحہ کی پیروی بھی جیسا کہ یہ آیات کریمہ بتاتی ہیں۔ جب انسان ان تحذیرات و تخویفات کو سنتا ہے تو اس کا خوف بڑھ جاتا ہے اور وہ غور و فکر میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں وہ توحید و نبوت کی معرفت حاصل کرتا ہے اور اعمالِ صالحہ میں مشغول ہو جاتا ہے۔ امام رازی نے آیتِ کریمہ کے بعض دوسرے پہلوؤں سے بھی تعرض کیا ہے۔ (تفسیر کبیر ۱۹/۱۵۔۱۱۴)۔

تفسیر کبیر کے مؤلفِ گرامی نے سورۂ نحل نمبر ۵۱ کی تفسیر میں خاصی طویل بحث کی ہے۔ مختصر تمہید میں فرمایا کہ اللہ کے سوا عالمِ ارواح یا عالمِ اجسام میں جو کچھ ہے وہ جلال و کبریاء الٰہی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ شرک سے اس کے بعد منع کرتے ہوئے حکم دیا کہ دو الٰہ (اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ) مت بناؤ کہ وہ تو الٰہ واحد ہے۔ "اِلٰهَیْنِ" کہنے سے دو الٰہ ہونے کا مفہوم ملتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے "اثْنَیْنِ" کا اضافہ کیوں کیا۔ "صاحب النظم" کا قول ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے مراد ہے کہ دو کو الٰہ مت قرار دو۔ دوسرے میرے خیال میں زیادہ پسندیدہ تفسیر یہ ہے کہ جب کوئی شے زیادہ ناپسندیدہ و قبیح ہوتی ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ نفرت پیدا کرنے کے لئے جو مبالغہ کیا جاتا ہے اس میں بہت سی عبارات و تعبیرات لائی جاتی ہیں تاکہ اس کی قباحت عقل پر واضح تر ہو جائے۔ امام رازی نے دو الٰہوں رخداؤں کے ہونے کی قباحت پر زیادہ بحث کی ہے اور پھر توحید کے تعلق سے بیان کیا ہے کہ جب دلائل

سابقہ سے ثابت ہو گیا کہ عالم کے لئے ایک الٰہ ضروری و ناگزیر ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ دو خداؤں کا وجود محال ہے تو یہ بھی ثابت و محقق ہو گیا کہ "اللہ واحدٌ احد حیٌ صمدٌ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔ امامِ موصوف نے آیت کریمہ کے سیاق و سباق، نظم و ترتیب اور دوسرے امور سے بھی بحث کی ہے۔(تفسیر کبیر، ۲۰/۳۰ـ۲۱۹)

توحید سے متعلق سورۂ کہف نمبر۱۱۰ میں امام رازی کی تفسیر بطور حوالہ ہے کہ "اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" میں فقط "اَنَّمَا" حصر کا فائدہ دیتا ہے اور دوسرے الٰہ تو واحد الٰہ ہے جس کا اثبات دلائلِ سمعیہ/ سماعی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں "مطلوبوں" کو ہم نے تمام سورتوں میں طاقتور صورتوں، وجوہ اور دلائل سے واضح کیا ہے۔(تفسیر کبیر ۲۱/ ۵۰۳)

امام رازی نے سورۂ انبیاء نمبر۱۰۸ کی تفسیر میں پہلے "صاحب الکشاف" کا حوالہ دیا ہے اول آیت کے بارے میں کہ اس میں حصر پایا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنے والی وحی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ثابت کرنے ہی پر منحصر ہے۔ "فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" کے فرمانِ الٰہی میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ جب وحی ان طریقوں (سُن) سے آتی ہے تو بندوں کو حکم ملتا ہے کہ اس ذاتِ مطلق کے لئے توحید خالص کرو اور اس کے شرکاء کی نسبت سے نجات پالو۔ امام رازی نے بعض اور تفسیری نکات کا بھی اس میں ذکر کیا ہے۔(تفسیر کبیر، ۸ـ۲۲/۱۹۳ و مابعد)

سورۂ حج نمبر۳۴ میں ہر امت کے لئے قربانی کے طریقِ خاص کے پس منظر میں توحید کو اجاگر کیا گیا ہے۔

امام موصوف نے "امت"، "منسک" اور ان سے متعلق مباحث کے بعد "فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" کے باب میں بہت اہم بات کہی ہے۔ آیت کی کیفیتِ نظم کی دو صورتیں (وجہان) ہیں، اول یہ کہ الٰہ تو واحد ہے مگر تکالیف (شرعی ذمہ داریاں) ازمنہ، اشخاص و مصالح کے اختلاف سے مختلف ہو گئیں۔ دوم یہ کہ اپنے جانوروں کی قربانی کرتے وقت غیر اللہ کا نام مت لو اور شرک کی صرف اس نوع ہی سے نہ بچو بلکہ تمام "تکالیف" میں للہِ واحد کی اطاعت و فرمانبرداری کرو۔ (تفسیر کبیر، ۸ـ۲۳/۲۵ـ۲۲۴)۔

شاید اپنی مختصر ترین وضاحتِ توحید امام رازی نے سورۂ عنکبوت نمبر۴۶ میں کہی ہے کہ وحی الٰہی میں خواہ وہ کسی بھی نبی کو دی گئی ہو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید ہی ثابت و مدلل کی ہے۔(۹ـ۲۵/۶۳)۔ اسی طرح سورۂ صٰفّٰت نمبر۴ میں وارد و مذکور "اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ" کی توضیح توحید مختصر ہے۔ زیادہ بحث اس سے قبل مذکور ہونے والی تین قسموں پر ہے کہ ان قسموں کے بعد یہ دلیل یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے۔ یہاں انہوں نے سورۂ انبیاء نمبر۲۲ سے پھر استشہاد کیا ہے۔ اور پانچویں آیت کہ وہ آسمانوں، زمین، ان کے مابین اور مشارق کا رب ہے کو توحید کی تاکید محکم اور دلیلِ مزید بتایا ہے۔ (۹ـ۲۶/۶ـ۳۱۵)۔ سورہ صٓ نمبر۴ میں مشرکوں کے اس استعجاب پر بحث کی ہے کہ نبی مکرم علیہ السلام نے معبودانِ باطل کے بالمقابل ایک الٰہ کا عقیدہ پیش کیا تھا۔ توحید سے زیادہ مشرکوں کی جہالت پر بحث ہے۔(تفسیر کبیر، ۹ـ۲۶/۳۶۸)۔

قرآن مجید نے سورۂ زمر نمبر۴ میں اللہ کے فرزند نہ ہونے کی حقیقت کے پس منظر میں توحید الٰہی

ثابت کی ہے۔ امام رازی کے مطابق اس کلام کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرزند سے منزہ ہونے کے "دلائل قاہرہ" دیے جائیں۔ اور ان کا بیان مختلف وجوہ سے ہو سکتا ہے۔ (۱) اگر وہ کوئی فرزند بالفرض بناتا ہی جو کامل ترین بیٹا بناتا مگر مشرکوں نے اللہ کی طرف لڑکی کی نسبت کر دی۔ (۲) اللہ سبحانہ حقیقی واحد ہے، اور واحد حقیقی کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ امام موصوف نے یہاں بھی واجب الوجود ہونے اور ممکن الوجود نہ ہونے اور صاحب اجزاء و محتاج ہونے کی تردید کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اور آخر میں کہا ہے کہ "ولد" ہونے کے لئے زوجہ کا ہونا ضروری تھا اور زوج و زوجہ کے لئے لازمی ہے کہ وہ دونوں ایک ہی جنس سے ہوں۔ اس صورت میں نہ صرف زوجہ بلکہ ولد بھی اللہ کی جنس سے ہوتا اور ایسا محال ہے۔ اس کی صفت قہاری بھی اس کے فرزند کے ہونے کی مخالف ہے کیونکہ ولد و فرزند والا محتاج ہوتا ہے اور محتاج کو موت آتی ہے اور مرنے والا مقہور ہوتا ہے۔ وہ قاہر نہیں ہو سکتا جبکہ اللہ تعالیٰ قاہر ہی نہیں قہار ہے لہٰذا دلائل قطعی سے ثابت ہو گیا کہ اس کا کوئی فرزند نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر کبیر، ۹۔۲۶/۴۲۲)۔

امام موصوف نے سورۂ مومن رغافر نمبر۱۶ میں زیادہ بحث اس نکتہ پر کی ہے کہ بروز قیامت جب یہ سوال ہوگا کہ آج کس کی بادشاہی ہے تو تمام حاضرین کہہ اٹھیں گے "اللہ واحد قہار" کے لئے۔ امام رازی کا اپنا قول ہے کہ یہ بات بعید نہیں کہ سوال کرنے والا اور جواب دینے والا خود اللہ تعالیٰ ہو یا سوال کرنے والے تو ملائکہ ہوں اور جواب دینے والے دوسرے ملائکہ۔ بہرحال اللہ کی وحدانیت اور قہاری اس دن بھی ثابت بلکہ ظاہر ہو گی۔ (تفسیر کبیر، ۹۔۲۷/۵۰۰)

سورۂ فصلت رحم السجدہ نمبر۶ میں وحی الٰہی کے حوالہ سے توحیدِ الٰہی کا اثبات کیا گیا ہے۔ امام رازی نے وحی محمدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس وحی کا خلاصہ دو معاملات میں منحصر ہے علم اور عمل۔ علم بلکہ رئیس علم یہ ہے کہ توحید کی معرفت حاصل کی جائے کیونکہ حق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے۔ اور یہی اس آیت میں مراد ہے۔ عمل یہ ہے کہ توحید کے تقاضوں پر عمل کیا جائے یعنی اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے احکام کو مانا اور اس کے نواہی سے رکا جائے۔ (تفسیر کبیر، ۹۔۲۷/۵۴۱)۔ یہاں تک تفسیر قرآن کریم امام رازیؒ کے قلم سے تھی۔

تفسیر مفاتیح الغیب میں آخری بحثِ توحید سورۂ اخلاص میں پائی جاتی ہے۔ یوں تو پوری سورت کریمہ توحید کی سورت ہے لیکن اس کی اولین آیت اصل الاصول ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان فرما دیں کہ وہ اللہ "احد" ہے۔ مؤلف گرامی نے چوتھے مسئلہ کے تحت اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اَحَدٌ" میں دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ وہ "واحد" کے معنی میں ہے۔ جیسا امام خلیل کا خیال ہے۔ دوسرا قول جو ازہری وغیرہ کا ہے کہ "واحد" اور "احد" دو مترادف اسم نہیں ہیں۔ بقول ازہری اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو احدیت سے موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ "واحد" اور "احد" کے فرق یہ ہیں۔ (۱) واحد احد میں داخل ہے جبکہ احد واحد میں داخل نہیں۔ (۲) اگر کہا جائے کہ واحد نے مقاومت کی تو یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ دو نے کی ہو گی لیکن احد میں دوسری کی مقاومت ممکن ہی نہیں۔ (۳) واحد کا استعمال اثبات میں ہوتا ہے اور احد کا نفی میں۔ چنانچہ اس

میں عموم کا فائدہ ہوتا ہے۔ احدیث حقیقت ذات کا لازمہ ہے۔ (تفسیر کبیر، ۱۱۔ ۳۲/۶۱۔۳۶)۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ امام رازی ستائیسویں پارہ کے نصف ہی میں تھے کہ رحلت فرما گئے۔ باقی تفسیر کا تکملہ تو ان کے شاگردوں نے کیا ہے۔ (دریابادی ۷/۱۳، ۱۲۱۳ ح نے علامہ آلوسی کی تنقید امام رازی پر یہ توضیح کی ہے)۔

ساتویں مصدر

امام قرطبی (ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری م ۶۷۱/۱۲۷۳) مسلم اندلس کے عظیم ترین علماء میں سے تھے۔ ان کی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" اگرچہ فقہی تاویل آیات سے زیادہ سروکار رکھتی ہے اور علماء و فقہاء کے درمیان انہیں کی بنا پر فقہی احکام کے استنباد کا ایک عظیم ترین ماخذ سمجھی جاتی ہے، تاہم وہ دوسرے مسائل و مباحث سے بھی برابر تعرض کرتی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ امام جصاص (ابوبکر احمد بن علی رازی ۳۰۵_۷۰/۹۱۷_۸۱) اور قاضی ابن العربی (ابوبکر محمد بن عبداللہ مالکی ۴۶۸_۵۴۳/۱۰۷۵_۱۱۴۸) جیسے حنفی مالکی اور شافعی حنبلی فقہاء اور دوسرے فقہاء و مفسرین کی تصانیف تفسیر پر ایک گونہ فضیلت و امتیاز رکھتی ہے۔ انہوں نے آیاتِ توحید سے برابر بحث کی ہے اور ان کی تفسیر کا منفرد رنگ اس میں موجود نظر آتا ہے۔

سورۂ بقرہ نمبر ۱۶۳ کی تفسیر میں دو مسئلے نکالے ہیں (۱) گذشتہ آیات کریمہ سے اسکا نظم وابستہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حق چھپانے سے منع فرمایا تو اولین چیز جس کا اظہار واجب اور کتمان ناجائز ہے توحید کا معاملہ ہے۔ اس اہم موضوع کو دلائل و براہین سے اور عجائبِ تخلیقات سے ثابت فرمایا کہ ان کا ایک ایسا بنانے والا ضرور ہے کہ اس جیسا کوئی اور نہیں۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ جب قریش نے رسولِ کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رب العالمین کا نسب پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص اور یہ آیت نازل فرمائی۔ مشرکوں کے تین سو ساٹھ بت تھے تو اللہ نے واضح فرمایا کہ وہ ایک ہے۔ دوسرے یہ کہ کلمہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" میں نفی واثبات دونوں ہیں اول حصہ کفر اور دوسرا آخری ایمان ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ شبلیؒ کے بارے میں حکایت ہے کہ وہ "اللہ" تو کہا کرتے تھے "لاالہٰ" نہیں کہتے تھے۔ جب اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا مجھے خدشہ ہے کہ کلمہ انکار میں ہی مبتلا رہ جاؤں اور کلمہ اقرار تک پہنچوں ہی نہیں۔

امام قرطبی نے اس پر نقد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ان (صوفیہ) کے دقیق علوم کا ایک حصہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس معنی کو نفی و اثبات میں بیان فرمایا ہے اور باربار بیان فرمایا ہے۔ اور اس کلمہ کے کہنے والے کے لئے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ثوابِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ مؤطا، بخاری، مسلم وغیرہ کتبِ حدیث میں نقل ہوا ہے۔ ہم نے اسم الٰہی ۔ واحد۔ کلمہ "لا الہ الا ھو" اور صفات "الرحمٰن الرحیم" پر اپنی کتاب "الکتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللّٰہ الحسنیٰ" میں زیادہ تفصیل سے کلام کیا ہے۔ (مطبعہ دارالکتب المصریہ، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ۲/۱۹۰-۹۱)

سورۂ بقرہ نمبر ۱۳۳ میں امام قرطبی نے "اِلٰهًا وَّاحِدًا" کی تکرار کو وحدانیت کی صفت کو مزید روشن کرنے کی خاطر قرار دیا ہے۔(۲/۱۳۸) جب کہ سورۂ نساء نمبر ۱۷۱ میں زیادہ بحث تعددِ الٰہ کی معترضوں سے متعلق ہے۔ (۱۹۲_۹۵۱۵)۔ امام قرطبی نے سورۂ مائدہ نمبر ۷۳، سورۂ انعام نمبر ۱۹، سورہ توبہ نمبر ۳۱ میں توحیدِ الٰہی سے متعلق جو

کچھ کہا ہے وہ دوسری سورتوں کے ضمن میں ملتا ہے اور وہ تعدد الٰہ کے تناظر میں ہے جیسے [illegible] یوسف نمبر ۳۹ کی، تفسیر میں مختصرا فرماتے ہیں کہ خداوندان پراگندہ نہ نفع پہنچاتے ہیں اور نہ ضرر [illegible] سب پر غالب، ہو اور اس آیت کریمہ کی نظیر "اللہ خیر اما یشرکون" سورۂ نمل نمبر ۵۹ میں ملتی ہے۔ [illegible] قول یہ بھی، بیان کیا گیا ہے کہ اگر متعدد خدا ہوتے تو ارادہ میں وہ مختلف و متفرق ہوتے اور ایک [illegible] دوسرا۔ لہذا یہ واضح ہو کہ جب تفرقہ نہیں پایا جاتا تو بہت سے اللہ بھی نہیں پائے جاتے۔ (۵۔۹/۱۹۲ [illegible] تراث العربی بیروت ۱۹۶۶ء کے حوالے یہاں ہے)۔ اسی طرح سورۂ رعد نمبر ۱۶ کے ضمن میں [illegible] بہت سے مسائل سے بحث کی ہے مگر توحید پر ان کا بیان مختصر ہے۔ پہلے خالق السموات والارض اور [illegible] حیثیت سے توحید الٰہی واضح کی پھر واحد کے معنی میں یہ جہت تو پیدا کی وہ ہر شے سے قبل واحد [illegible] شے کے لئے ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ صانع واحد اللہ ہے تو اس کے شرکاء کا تعدد کیونکر صحیح ہو [illegible] عالم کے دو صانع ہوتے تو مخلوق اشتباہ کا شکار ہو جاتی کہ وہ کس کی مخلوق اور کس کی نہیں۔ (۵۔۹/۳۰۳)

سورۂ ابراہیم نمبر ۴۸ اور نمبر ۵۲ میں امام قرطبی کا مشترکہ بیان توحید مختصر بھی ہے اور ضمنی بھی۔ انہوں نے زیادہ بحث قیامت کے دن تبدیل سموات و ارض پر کی ہے اور بعض دوسرے مسائل آیت کریمہ پر بھی۔ توحید کے باب میں اگر کچھ لکھا تو بس اتنا کہ لوگ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ہے جس پر دلائل و براہین قائم و ثابت کر دیئے گئے ہیں۔ (۵۔۹/۳۸۶) اسی طرح سورۂ نحل نمبر ۲۲ میں ان کی تفسیر مختصر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کا محال ہونا بیان کیا ہے کہ معبود واحد ہے اس کے سوا نہ کوئی رب ہے اور نہ کوئی معبود۔ (۵۔۱۰/۹۵)۔ اسی طرح اس سورہ کی آیت کریمہ نمبر ۵۱ میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہاں "اثنین" کے ساتھ "اثنین" تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ کیونکہ الٰہ حق متعدد نہیں ہو سکتا اور ہر وہ شے جو تعدد قبول کر لے وہ الٰہ نہیں بن سکتی لہذا "اثنین" پر اقتصار کیا گیا کہ اس میں تعدد کی نفی مراد ہے۔ الٰہ واحد سے مراد اس کی ذات مقدسہ ہے اور اس کی وحدانیت پر عقلی اور شرعی دلیل قائم ہو چکی ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں بحث گذر چکی اور اس کی تفصیل ہم نے "شرح الاسماء" میں اسم واحد کے ضمن میں بھی بیان کی ہے۔ (قرطبی، ۵۔۱۰/۱۱۳)۔ سورۂ کہف نمبر ۱۱۰ میں اسی بنا پر توحید الٰہی کا بیان تفسیر قرطبی میں نہیں کے برابر ہے۔ (۶۔۱۱/۷۲۔۷۰)۔

سورۂ انبیاء نمبر ۲۲ کے حوالے سے امام قرطبی نے پہلے تو آیت کریمہ کے متن کی توضیح مطلب کا فریضہ انجام دیا ہے پھر امامان نحو و لغت کسائی و سیبویہ کے خیالات نقل کئے ہیں پھر معانی بیان کئے ہیں۔ ایک معنی بقول امام فراء یہ ہیں کہ اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو ان کے باہمی فساد کا شکار ہو جاتے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر دو الٰہ ہوتے تو تدبیر عالم خراب ہو جاتی۔ کیونکہ ایک الٰہ ایک ارادہ کرتا اور دوسرا اس کے منافی تو دوسرا یا ان میں سے ایک عاجز ٹھہرتا۔ یعنی شرکاء کے باہمی تنازعہ اور اختلاف سے دونوں سیارے خراب اور ان کے اہل برباد ہو جاتے لہذا وہ شریک و اولاد و اولیاء سے پاک اور واحد ہے۔ (قرطبی، ۶۔۱۱/۲۷۹)۔ اس سورہ کی آیت کریمہ نمبر ۱۰۸ میں کچھ خاص تفسیر نہیں ہے۔ (۶۔۱۱/۳۵۰)۔ اسی طرح سورۂ حج نمبر ۳۴ میں حج کی قربانی اور مناسک حج سے تو بحث ہے مگر توحید کے بارے میں بس اتنا ہے کہ تم سب کا الٰہ واحد ہے۔ لہذا ذبیحہ

میں بھی تم پر اسی کے لئے اخلاص واجب ہے۔(۶۔۱۴/۵۸)۔ سورۂ عنکبوت نمبر۴۶ میں اہل کتاب سے مجادلہ وغیرہ پر بحث ہے مگر توحید الٰہی پر ایک جملہ بھی نہیں دیا ہے امام موصوف نے (۷۔۱۳/۵۱۔۳۵۰)۔ سورۂ صٰفٰت نمبر ۴ میں قسموں پر زیادہ بحث ہے اور توحید الٰہی سے متعلق فقرے کو جواب قسم کہہ کر بات ختم کر دی ہے۔ (۸۔۱۵/ ۶۳۔۶۴)

امام قرطبی نے سورۂ ص نمبر ۵ میں قریش کے تعجب اور سورۂ آیت کے شانِ نزول سے بحث کی ہے اور بس۔ (۸۔۱۵/ ۵۰۔۱۴۹)۔ جبکہ اسی سورہ کی آیت کریمہ نمبر۶۵ کے باب میں صرف یہ تشریح کی ہے کہ اللہ سے معبود مراد ہے اور واحد و قہار سے لاشریک ہونا (۸۔۱۵/۲۲۵)۔ سورہ زمر نمبر۴ میں ولد سے تنزیہ الٰہی کر دی ہے کہ یہ ممکن نہیں اس کی مخلوق میں کوئی اس کی اولاد ہو۔ (۸۔۱۵/ ۲۳۴)۔ سورۂ غافر نمبر۱۶ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بقول امام حسن بصری اللہ تعالیٰ ہی سائل و مجیب ہو گا کیونکہ جب دوسرا کوئی قیامت کے دن جواب نہیں دے گا تو پھر وہی دے گا۔(۸۔۱۵/۳۰۰)۔ دوسری روایت کے مطابق مومنین خوشی و سرور سے یہ جواب دیں گے۔ امام موصوف نے ان دونوں پر بحث کر کے اول کو ترجیح دی ہے۔ (۸۔۱۵/۳۰۱)۔ سورۂ فصلت نمبر۶ میں توحید پر بحثِ امام نہیں ملتی۔(۸۔۱۵/۳۴۰)

امام قرطبی نے سورۂ اخلاص میں مفصل شرح کی ہے۔ "ھُوَاللہُ احدٌ" کی توضیح عبارت ہے "وہ واحد و تر (یک و تنہا) جس کا کوئی شبیہ نہیں، اور نہ نظیر ہے، نہ اس کی بیوی ہے، نہ اولاد اور نہ شریک۔"احد" کا اصل "وحد" ہے جیسے کہ نابغہ کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں گذر چکا کہ "واحد" اور"احد" کا فرق کیا ہے اور "کتاب الاسنیٰ" میں اس پر کافی بحث کی گئی ہے۔ وہ دائم باقی لم یزل ولایزال ہے اور "وَاحِدٌ واحدٌ" ہے اس لئے اس کی والد و اولاد نہیں اور نہ کوئی ہمسر۔ (۱۰۔۲۰/ ۲۴۶۔۲۴۴)

آٹھویں صدی

امام حافظ ابن کثیر دمشقی (ابوالفداء اسماعیل بن کثیر قرشی (۷۰۱۔۷۷۴/۱۳۰۱۔۱۳۷۳) اور ان کی "تفسیر القرآن العظیم" خالص تفسیر ماثور کے نمائندہ ہیں۔ وہ احادیث نبوی، اقوالِ صحابہ اور افکار مفسرین سے زیادہ تعرض کرتے ہیں۔ آیات کریمہ کے متون کی توضیح مطالب سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ اپنی زبان میں ان کے معانی کھولتے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر وہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتے ہیں اور ہم معنی آیات کریمہ بطور استدلال و استشہاد ایک خاص موقع پر لے آتے ہیں۔ روایات و آثار کے سوا ان کے ہاں اختصار تفسیر پایا جاتا ہے۔

سورۂ بقرہ ۱۶۳ کے باب میں رقم طراز ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی الٰہیت میں تفرد کی خبر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کا شریک ہے نہ عدیل (برابر کا)۔ بلکہ وہی اللہ، واحد، احد، فرد، صمد ہے جس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں اور وہی رحمن و رحیم ہے ان دونوں موخر الذکر اسماء حسنیٰ کی تفسیر سورۂ فاتحہ کے آغاز میں گذر چکی۔ حضرت اسماء بنت یزید بن سکن سے منقول حدیثِ نبوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دونوں آیتوں ـ۔ سورۂ بقرہ نمبر ۱۶۳ اور آیت الکرسی/بقرہ نمبر۲۵۵ میں اللہ کا اسم اعظم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیتِ الٰہیت پر بطور دلیل آسمانوں اورزمین اور تمام مخلوقات کی تخلیق کا ذکر کیا ہے۔ اور بلاشبہ مخلوقاتِ عالم اس کی وحدانیت پر گواہی

دیتی ہیں۔ (تفسیر القرآن العظیم، ۱/۲۰۱)

حافظ ابن کثیر سورۂ نساء نمبر۱۷۱ کی تفسیر میں عقیدہ تثلیث کے پس منظر میں تفسیر آیت تو کرتے ہی ہیں مگر اس عقیدۂ ضلالت سے متعلق دوسری آیات کریمہ کا بھی وہاں بطور استدلال ذکر کرتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب کو غلو اور مبالغہ سے منع کرتا ہے اور یہ نصاریٰ میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں حد سے تجاوز کر کے ان کو اس منزلت سے اعلیٰ منزلت پر فائز کر دیا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو فائز کیا تھا اور ان کو مقام نبوت سے منتقل کر کے اللہ کے سوا ایک معبود و الٰہ بنا دیا اور اللہ کے ساتھ ان کی بھی عبادت کرنے لگے۔ بلکہ انہوں نے تو حضرت عیسیٰ کے جانشین اور پیروؤں کو بھی مبالغہ سے عصمت کا پیکر بنا دیا اور ہر سچ، جھوٹ، غلط صحیح بات میں ان کی فرمانبرداری کرنے لگے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ"۔ حافظ ابن کثیر نے اس کے بعد بہت سی احادیث و آیات نقل کی ہیں جن کا تعلق حضرت عیسیٰ، ان کی والدۂ ماجدہ حضرت مریم کی بشریت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت و نبوت سے ہے۔ (تفسیر القرآن العظیم، ۱/۵۸۹۔۹۱)

امام طبری کی مانند حافظ ابن کثیر نے سورۂ مائدہ نمبر۷۳ کی تفسیر میں نصرانی فرقوں۔ ملکیہ، یعقوبیہ، نسطوریہ وغیرہ کے عقائدِ تثلیث و فرزندی کے پس منظر میں آیتِ توحید کی وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد الٰہ ہے وہ تین میں سے ایک نہیں ہے۔ وہ متعدد نہیں بلکہ وہ واحد ہے بلاشریک ہے، وہ تمام کائنات اور سارے موجودات کا الٰہ ہے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم سے متعلق آیاتِ کریمہ اور بعض روایات یہاں بھی نقل کی ہیں۔ (تفسیر القرآن العظیم ۲/۸۲۔۸۱)

سورۂ انعام نمبر۱۹ میں اپنی سابقہ ولاحقہ آیاتِ کریمہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں (اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں خبر دیتا ہے کہ وہ مالکِ ضرر و نفع ہے، اپنی مخلوق میں اپنی مرضی کا متصرف ہے، اس کے حکم کو روکنے والا اور اس کے فیصلہ کو رد کرنے والا کوئی نہیں۔ ایک آیتِ کریمہ اور حدیثِ نبوی کو اس باب میں نقل کرنے کے بعد دوسری آیتِ قہاری کا حوالہ لاتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر ہے کہ سب کی گردنیں اسی کے آگے جھکتی ہیں اور تمام جبارانِ زمین اسی کے آگے سرنگوں ہیں۔ کیونکہ وہ واحد و قہار ہے۔ لہٰذا اسی کی وحدانیت، الوہیت اور ربوبیت کی شہادت دو۔ حافظِ موصوف نے اس آیتِ مبارکہ میں حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و عروج کے بارے میں انبیائے سابقین اور تمام کتبِ مقدسہ کی بشارات کا بھی حوالہ دیا ہے اور اہلِ کتاب کے کتمانِ حق کا بھی۔ (تفسیر القرآن العظیم ۲/۱۲۶)

حافظ ابن کثیر نے سورۂ توبہ نمبر۳۱ میں بھی یہود کے عقیدۂ فرزندی اور عیسائیوں کے عقیدۂ فرزندی حضرت عیسیٰ پر نقد کے پس منظر میں تفسیر کی ہے۔ انہوں نے بعض ائمہ مفسرین سدی وغیرہ کے اقوال نقل کر کے آیتِ توحید کی وضاحت کی ہے کہ ارباب و علماء کو الٰہ مت بناؤ اور ان کی حرام و حلال میں پیروی مت کرو کہ اللہ تعالیٰ ہی الٰہ اور حرام و حلال کرنے والا ہے۔ وہ تمام شریکوں، نظیروں، مددگاروں اور اضداد و اولاد سے منزہ ہے، اس کے سوا اور کوئی رب ہے نہ الٰہ۔ (تفسیر القرآن العظیم ۲/۳۴۸۔۳۴۹)

حضرت یوسف علیہ السلام نے (سورۂ یوسف نمبر ۳۹ میں) اپنے دونوں رفیقوں کی جانب توجہ کی اور ان کو اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور اللہ کے سوا تمام خداوندانِ باطل کو چھوڑنے کی نصیحت کی جن کی عبادت ان دونوں کی قوم کرتی تھی۔ "اللہ واحد قہار" وہ ہے جس کے جلال و عظمت و سلطان کے سامنے ہر شے سرنگوں ہے۔ (تفسیر القرآن العظیم، ۴۷۹/۲)

سورۂ رعد نمبر ۱۶ کے حوالہ سے حافظِ موصوف رقمطراز ہیں: اللہ تعالیٰ ثابت فرماتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں کیونکہ سب لوگ اس حقیقت کے معترف ہیں کہ وہی آسمان و زمین کا خالق، رب او رمدبر۔ اس کے باوجود انہوں نے اللہ کے ساتھ بہت سے خدا شریک کر رکھے ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے مالک ہیں، نہ اپنے عبادت گزاروں کے، وہ نفع و ضرر پہنچانے پر بھی قادر نہیں تو ایسے بیچارگانِ عالم اللہ قادر مطلق کی برابری کر سکتے ہیں؟ جو لوگ اللہ واحد لاشریک کی عبادت کرتے ہیں وہ اپنے رب کے عطا کردہ نور پر ہیں۔ اسی لئے نور و ظلمات اور بینا و نابینا کی مثال دی۔ مشرکین اپنے خداوندانِ باطل کی عبادت کرنے کے باوجود اپنے تلبیہ "لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ" میں اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اللہ واحد ہے، اس سے مشابہ کوئی شے نہیں اور نہ مماثل ہے، اس کا کوئی مدمقابل نہیں نہ برابر کا ساتھی ہے، نہ وزیر ہے، نہ اولاد ہے اور نہ بیوی۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔ (تفسیر القرآن العظیم ۵۰۷-۸/۲)

سورۂ ابراہیم کی تفسیر قیامت کے دن تبدیلِ ارض و سمٰوات کی نوعیت پر احادیثِ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، احمد، ابن ماجہ وغیرہ سے بحث کی ہے کہ اس دن لوگ بقولِ نبوی (حضرت عائشہ کی حدیث) صراط پر ہوں گے۔ حافظ ابن کثیر نے امام طبری کی بعض روایات بھی نقل کی ہیں۔ زیادہ بحث انہیں مسائل پر ہے۔ وحدانیتِ الٰہی پر کل ایک دو جملے ہیں کہ واحد قہار اللہ وہ ہے جس کے آگے ہر شے سرنگوں ہے۔ وہ ہر ایک پر غالب و قاہر ہے اور تمام گردنیں اس کے حضور میں خم اور تمام عقلیں اس کی جناب میں سجدہ ریز ہیں۔ (تفسیر القرآن العظیم ۵۴۳، ۴۴/۲)۔ اسی سورہ کی آیت نمبر ۵۲ کے باب میں لکھا ہے کہ تمام دلائل و براہین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔ (۵۴۵/۲)۔

سورۂ نحل نمبر ۲۲ میں حافظ ابن کثیر نے سورۂ بقرہ نمبر ۱۶۳ کی تفسیر آیت کے الفاظ آیتِ توحید کے بارے میں دہرائے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں، وہ واحد، احد، فرد، صمد ہے۔ کافرین کے قلوب اس کا تعجب سے انکار کرتے ہیں۔ اس باب میں مفسر گرامی نے سورۂ ص نمبر ۵: أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ— اور سورۂ زمر نمبر ۴۵: وَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ — نقل کی ہیں۔ (تفسیر القرآن العظیم، ۵۶۶/۲)۔ جب کہ اسی سورہ کی آیتِ کریمہ نمبر ۵۱ کی تفسیر توحید یوں کی ہے: اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اس کے علاوہ اور کسی سے دعا مانگی جا سکتی ہے نہ اس کی عبادت کی جا سکتی ہے۔ وہ اللہ واحد لاشریک ہے، ہر شے کا مالک، خالق اور رب ہے۔ استدلال میں دوسری آیتِ کریمہ نقل کی ہے۔ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۚ— (نحل نمبر ۵۲۔ اور اسی کا اتصاف ہے ہمیشہ) اور حضرات مفسرین کی آراء سے اس کے معانی مستقل کے بتائے ہیں۔ (تفسیر القرآن العظیم ۵۷۲/۲)۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ حافظ ابن کثیر نے اس آیتِ

کریمہ میں "دو الٰہوں" کی تردید والے فقرے سے بالکل بحث نہیں کی ہے جیسے کہ دوسرے بعض مفسرین نے بحث کی ہے۔ یہاں انہوں نے بہت اختصار سے بھی کام لیا ہے اور افکار و آراء سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا۔

حافظ ابن کثیر نے سورۂ کہف نمبر ۱۱۰ میں "الٰہ واحد" کی تفسیر "لا شریک لہ" سے کی ہے۔ (تفسیر القرآن ۱۰۸/۳) اسکے بعد کی۔ احادیث و روایات میں "شرک اصغر ریا اور "شہوۃ خفیہ" سے متعلق بھی بحثیں آئی ہیں۔ (۱۰۹-۱۰/۳)۔ سورۂ نحل نمبر ۲۲ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے سوا دوسرے خداؤں کو بنانے پر نکیر فرماتا ہے کیونکہ وہ کسی شے پر قادر نہیں۔ اگر وجود میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو آسمان و زمین میں فساد پھیل جاتا۔ تائید میں حسب دستور ایک دوسری آیت کریمہ ما اتخذ اللہ من ولد و ما کان معہ من الٰہ اذا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (سورۂ مومنون نمبر ۹۱ اللہ نے کوئی بیٹا نہیں کیا۔ اور نہ اس کے ساتھ کسی کا حکم چلے۔ یوں ہوتا، تو لے جاتا ہر حکم والا اپنے بنائے کو اور چڑھ جاتا ایک پر ایک، اللہ نرالا ہے ان کے بتانے سے)۔ نقل کر کے مزید وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس قول باطل سے کہ اس کا کوئی فرزند یا شریک ہے پاک و منزہ ہے۔ (۱۷۵/۳) حافظ موصوف نے اس سورۂ کریمہ کی آیت نمبر ۱۰۸ میں توحید کی تفسیر بالکل نہیں کی ہے۔ (۲۰۲/۳)

سورۂ حج نمبر ۳۴ کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اللہ کے نام پر مناسک کا ذبیحہ اور خون بہانا تمام ملتوں میں مشروع رہا ہے۔ اس کی تائید میں بعض احادیث و آثار نقل کرنے کے بعد وضاحت کی ہے کہ تمہارا معبود واحد ہے اگرچہ انبیاء کی شریعتیں مختلف رہی ہیں اور بعض بعض کی ناسخ بھی رہی ہیں تاہم وہ ایک اللہ واحد لاشریک کی عبادت ہی کی دعوت دیتی رہی ہیں۔ (۲۲۱/۳)۔ سورۂ عنکبوت نمبر ۴۶ کی تفسیر میں توحید الٰہی پر بحث یا تبصرہ کے سوا اور سب کچھ موجود ہے۔ (۴۱۵-۶/۳)۔ سورۂ فاطر نمبر ۳ ـــ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ (کوئی ہے بنانے والا اللہ کے سوا، روزی دیتا تم کو آسمان اور زمین سے، کوئی حاکم نہیں مگر وہ ـــ) کی تفسیر میں البتہ یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خبر دیتا ہے اور ان کی توحید کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں جیسا کہ وہ خلق کرنے اور رزق دینے میں مستقل ہے لہذا عبادت میں اسی کی فردیت اختیار کی جائے اور بتوں، دیوتاؤں وغیرہ میں سے کسی غیر کو اس کے ساتھ شریک نہ کیا جائے۔ (۵۴۷/۳)

تفسیر ابن کثیر میں سورۂ صٰفٰت نمبر ۴ کے حوالے سے تفسیر توحید الٰہی بس اتنی ملتی ہے کہ وہ سبحانہ و تعالیٰ ہی الٰہ ہے اور اس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں اور وہ آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور مخلوقات کا رب ہے اور اپنی مخلوق میں مالک و متصرف ہے۔ (۲/۴)۔ سورۂ ص نمبر ۵ میں لکھا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوت دی تو ان کو شرک چھوڑنے اور توحید اختیار کرنے پر بڑا تعجب ہوا اور اس پر بھی بڑی حیرت ہوئی کہ معبود ایک ہے اور وحدانیت میں الوہیت کو منحصر کرتا ہے۔ (۲۷/۴)۔ اس سورہ کی آیت کریمہ نمبر ۶۵ میں الٰہ واحد اور ہر شے پر غالب و قاہر ہونے کی تفسیر کی ہے۔ (۴۴/۴)۔ سورۂ زمر نمبر ۳-۱ میں تفسیر توحید یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرو اور مخلوق کو بھی اسی کی دعوت دو اور ان کو بتاؤ کہ اللہ واحد کے سوا اور کسی کی عبادت

صحیح نہیں کیونکہ وہ لاشریک، بلاعدیل اور بلامقابل ہے۔ اللہ سبحانہ و تقدس اس بات سے منزہ و پاک ہے کہ اس کا کوئی فرزند ہو کیونکہ وہ محال بات ہے۔ وہ واحد، احد، فرد، صمد اور ہر چیز اس کی غلام اور فقیر ہے اور اپنے سوا ہر شے پر غالب و قاہر ہے۔ لہٰذا تمام چیزیں اسکے سامنے سرنگوں اور فرمانبردار و مطیع ہیں۔(۴/۴۵-۴۴)۔

سورۂ غافر مومن نمبر ۱۶ میں "واحد اور ہر شے پر غالب و قاہر" ہونے کی تفسیر مختصر کی ہے۔ البتہ احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ سے واضح کیا ہے کہ بروز قیامت بادشاہ اصل ہونے کے بارے میں سوال و جواب دونوں جناب الٰہی سے ہوں گے (۴/۷۴)۔ سورۂ فصلت نمبر ۶ میں اصنام، انداد اور ارباب متفرقین کی تردید کر کے کہا ہے کہ اللہ ہی الٰہ واحد ہے۔(۴/۹۱-۹۲)۔ حافظ موصوف نے سورۂ اخلاص کے شانِ نزول بیان کرنے کے بعد امام طبری اور امام ترمذی کا قول نقل کیا ہے کہ صمد وہ ذات ہے جو نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ والد۔ کیونکہ جو شے پیدا ہوتی ہے وہ مرتی بھی ہے اور جو شے مرتی ہے اس کی وراثت بھی چلتی ہے اور اللہ عز و جل نہ کبھی مرے گا اور نہ اس کا کوئی وارث ہوگا۔ اس کا کوئی شبیہ ہے نہ برابر کا اور اس جیسا کوئی نہیں۔ حافظ موصوف نے شانِ نزول اور اس کے فضائل کے بارے میں خصوصاً متعدد دوسری روایات و احادیث نقل کی ہیں۔(تفسیر القرآن العظیم ۴/۵۶۵-۵۷۱) لیکن تفسیر توحید الٰہی بہت مختصر نقل کی ہے۔

نویں صدی

امام ثعالبی (عبدالرحمٰن بن محمد بن مخلوف مالکی ۷۸۶-۸۷۵ھ/۱۳۷۰-۱۳۸۴ ـــــ) کی تفسیر "الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن" تفسیر ماثور، مختصر توضیحِ مطالب، لغوی تشریحات اور اقوالِ مفسرین کی کتاب ہے۔ ہر چیز اتنی مختصر ہے کہ اکثر و بیشتر یہ تفسیر دوسری تفاسیر کے حاشیہ پر چھپتی رہی ہے۔ داراحیاء التراث العربی، بیروت نے ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء میں تین محققین کرام ـــ شیخ علی محمد عوض، شیخ عادل احمد عبدالموجود اور دکتور عبدالفتاح ابوسنہ ـــ کی تحقیقات سے مزین کر کے ایک خوبصورت محقق ایڈیشن چھاپا ہے جس کے حواشی و تعلیقات میں دوسرے مفسرینِ کرام کی تحقیقات و خیالات کا حوالہ ملتا جاتا ہے۔ البتہ باب توحید میں ثعالبی کی تعبیرات و تشریحات بہت مختصر اور بسااوقات ایک دو فقروں، جملوں پر مبنی ہوتی ہیں۔

انہوں نے سورۂ بقرہ نمبر ۱۶۳ میں "اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" سے متعلق صرف یہ لکھ دیا ہے کہ اس آیت میں وحدانیت کا اعلان و اظہار ہے۔(۱/۳۴۹) جبکہ اسی سورہ کی آیتِ کریمہ نمبر ۱۳۳ کے حوالے سے توحیدِ الٰہی کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ (۱/۳۲۳) آیت الکرسی (بقرہ نمبر ۲۵۵) میں توحید کے باب میں بس یہ موجود ہے کہ وہ توحید اور صفاتِ عالیہ پر مشتمل ہے۔ (۱/۴۹۹) کیونکہ بقولِ امام غزالی وہ اللہ کے اسم اعظم پر مشتمل ہے اور "غایة المغنم فی اسم اللہ الاعظم" کے مؤلف کی نقل کردہ ایک روایت اس تعلق سے بیان کی ہے۔(۱/۵۰۳-۵۰۴)۔ سورۂ نساء نمبر ۱۷۱ میں توحید کے مسئلہ پر کچھ نہیں لکھا (۲/۳۳۱) اور نہ سورۂ مائدہ نمبر ۷۳ کی آیتِ توحید کی بابت (۲/۴۰۷-۴۰۸)۔ سورۂ انعام نمبر ۱۹ میں ثعالبی کا کل جملہ توحید یہ ہے: اللہ سبحانہ نے اپنے نبی علیہ السلام کو حکم دیا کہ کافروں کی شہادت سے اپنی برأت اور اللہ عز و جل کی توحید کا اعلان کر دیں نیز ان کے شرک سے برأت ظاہر فرما دیں۔(۲/۴۵۲)۔ سورۂ توبہ نمبر ۳۱ کی آیت توحید (۳/۱۶۷-۱۷۵)، سورۂ یوسف نمبر ۳۹ (۳/۳۲۷-۳۲۸)، سورۂ رعد

نمبر۱۲ (۳/۶۔۳۶۵)، سورۂ ابراہیم نمبر۳۸، نمبر۵۲ (۳/۳۔۳۹۱) میں توحید کے معاملہ پر قطعی سکوت ملتا ہے۔

امام ثعالبی نے سورۂ نحل نمبر۲۲ میں آیت کریمہ میں وارد لفظ "منکرۃ" کی تشریح "انکار اللہ کے منکر" کے بطور کی ہے اور اس موقع پر سورۂ ص نمبر۵ کی آیت کریمہ کا حوالہ دے کر کہا ہے۔ ان کے قول کو اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔(۳/۲۱۳)۔ البتہ سورۂ اسراء نمبر ۴۲ کے حوالے سے توحید پر ان کا بیان زیادہ دلچسپ و اہم ہے۔ حضرت سعید بن جبیر وغیرہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت "تمانع" کا بیان اور سورۂ انبیاء نمبر۲۲: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" کی توسیع ہے۔ امام ابن عطیہ کی تفسیر "المحرر الوجیز" (۴۵۹) کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ اس کا غیر الہ نہیں ہو سکتا اور اس کی دلیل ہم ابوالمعالی وغیرہ کے قول کے مطابق یوں دے سکتے ہیں اگر اس کو ہم فرض بھی کر لیں تو یہ مفروضہ صحیح ہو گا کہ ایک اپنے جسم کو عالم تسکین میں رکھنا چاہتا ہے اور دوسرا اسے حرکت دینا چاہتا ہے۔ دونوں ارادوں کا نافذ ہونا ناممکن ہے اور ایک ہی وقت میں ساتھ ساتھ بھی وہ محال ہے۔ لہذا جسم نہ تو متحرک ہو گا نہ ساکن۔ اگر ان دونوں میں سے ایک کا ارادہ صحیح ہو گا اور دوسرے کا نہیں تو جس کا ارادہ پورا نہیں ہوا وہ الہ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بالفرض وہ دونوں اختلاف نہ کریں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کا اختلاف عقل کی رو سے جائز بھی ہو گا اور محال بھی۔ اور جائز کا حکم واقع کا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر دو الہ ہوتے تو یہ ناممکن نہیں کہ وہ تین ہوتے لہذا ان کے تعدد کا تسلسل ایک بے نہایت نقطہ تک جاری رہتا۔ ایک اور دلیل یہ ہے کہ مخلوقات (مخترعات) میں سے وہ جزو جو تقسیم نہیں ہو سکتا وہ صرف "قدرتِ واحدہ" سے ہی متعلق ہوتا ہے جس میں کسی قسم کا اشتراک ممکن نہیں اور جس کو "واحد" اختراع فرماتا ہے وہ مخلوق ہوتا ہے۔ یہ مفصل و مطول بحث کی تلخیص ہے"۔ (۳/۴۷۷۔۴۷۶)

سورۂ کہف نمبر۱۱۰ میں توحید پر کلامِ ثعالبی موجود نہیں۔ (۳/۵۴۷) جبکہ سورۂ انبیاء نمبر۲۲ میں یہ وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں "امر تمانع" (یعنی دو یا دو سے زیادہ الہ کے وجود کے محال ہونے) کی بات فرمائی ہے اور پھر سورہ اسراء نمبر۴۲ میں اپنی بحث کا حوالہ دیا ہے کہ وہاں کلام ہو چکا۔(۴/۸۴)۔ ظاہر ہے کہ پھر سورۂ انبیاء نمبر۱۰۸ میں توحید کی تشریح کیونکر کرتے۔ (۴/۵۔۱۰۴)۔ دوسری سورتوں کی آیاتِ توحید کے باب میں امام ثعالبی کا یہی معمول ہے کہ وہ خاموشی کو کلام پر اور سکوت کو بحث پر ترجیح دیتے ہیں۔ جیسے سورۂ حج ۳۴۔ (۴/۲۳۔۱۲۱)، سورۂ عنکبوت نمبر۳۶ (۴/۹۔۲۹۷)۔ سورۂ صٰفّٰت نمبر۴ (۵/۳۔۲۲)، سورۂ ص نمبر۵ (۵/۵۔۵۴)، سورۂ ص نمبر۶۵ (۵/۵۔۷۴)، سورۂ زمر نمبر۴ (۵/۷۹)، سورۂ غافر نمبر۱۶ (۵/۱۰۸۔۱۰۷)، سورۂ فصلت نمبر۶ (۵/۱۔۱۲۵)، اور اسی طرح کی دوسری آیاتِ کریمہ کے باب میں سکوت ہی سے کام لیا ہے۔

امام ثعالبی نے سورۂ اخلاص کی تفسیر میں پہلے اس کی شانِ نزول بیان کی ہے جو توصیف رب سے متعلق ہے اور جس کا ذکر طبری وغیرہ کے ہاں آ چکا پھر "احد" کے معانی بتائے ہیں۔ احد بمعنی واحد ہے وہ وحدانیت کی تمام جہات کے اعتبار سے فرد ہے۔ اس کے مثل کوئی شے نہیں۔ پھر دوسری صفاتِ الٰہی اور مسائلِ تاویل سے بحث ہے۔ (۵/۹۔۶۳۸)۔ سورۂ کریمہ کی آخری آیت۔ "وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ" کے معنی بتائے ہیں کہ اس کا کوئی

ضد نہیں اور نہ ند (برابر کا) ہے اور نہ ہی شبیہ (مشابہ) ہے۔ پھر تائید میں سورۂ شوریٰ نمبر ۱۱ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ O نقل کر کے کفو کے معنی نظیر کے لکھے ہیں اور دوسری نحوی و صرفی اور بلاغی باتیں بھی اختصار کے ساتھ کہی ہیں۔ امام ثعالبی کی تفسیراتِ توحید کا یہی انداز مختصر دوسری آیاتِ کریمہ کے حوالے سے بھی مل سکتا ہے۔

دسویں صدی

امام ابوالسعود (محمد بن محمد العمادی ۸۹۶۔۹۵۱ ر ۱۴۹۰۔۱۵۷۴) کی تفسیر "ارشاد العقل السلیم الیٰ مزایا القرآن الکریم" یا صرف "تفسیر ابی السعود" کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ اصلاً وہ توضیحِ مطالب اور تشریحِ متون قسم کی کتاب [illegible] ہے۔ نحو و صرف، لغت اور توضیحِ مطلب سے زیادہ تر تعرض کرتی ہے۔ اس لئے تفسیر مختصر بھی کہی جا سکتی ہے۔ [illegible] آیاتِ توحید میں بھی یہی رنگ ملتا ہے۔

سورۂ بقرہ ۱۶۳ سے تعلق سے ان کی تشریح و تعبیر آیت کریمہ کچھ یوں ہے "اِلٰهُكُمْ" تمام انسانوں کے لئے خطاب عام ہے یعنی وہ تمہاری عبادت کا مستحق ہے۔ "اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ الٰہیت میں فرد ہے اور اس نام سے اس کے ماسوا کو پکارنے کی کوئی صورت و صحت نہیں۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" مبتدا کی دوسری خبر یا خبر کی دوسری صفت یا اعتراض ہے۔ بہرحال جو کچھ ہو وہ "وحدانیت" کا اثبات (مقرر) کرنے والی ہے اور اس وہم کو دور کرنے والی ہے کہ وجود میں کوئی دوسرا الٰہ پایا جا سکتا ہے جو عبادت کا مستحق ہو۔ "الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" مبتدا کی دو مزید خبریں ہیں یا مبتدا، محذوف کی خبر واحد میں وہ بھی توحید کا اثبات کرتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تمام نعمتوں سے، ان کے اصول و فروع سے، ان کی جلیل و دقیق قسموں سے نوازا ہے اور اس کے ماسوا جو کچھ ہے وہ اپنے وجود کے لئے اس کا محتاج ہے اور اس سے جو کمالاتِ الٰہی ہویدا ہوتے ہیں وہ بلاریب اس کی وحدانیت کو محقق اور ذاتِ الٰہی کے لئے انسانوں اور دوسری مخلوقات کی عبادات کو قطعی طور سے محصور کرتے ہیں۔ (مکتبہ و مطبعہ محمد علی صبیح و اولادہ، مصر (غیر مورخہ)، ۱۴۳/۱)۔ جبکہ اسی سورۂ کریمہ کی آیت ۱۳۳ کے حوالے سے توحید کی وضاحت یوں کی ہے فرزندانِ یعقوب علیہ السلام نے عرض کیا کہ ہم اس الٰہ کی عبادت کریں گے جس کے وجود پر اتفاقِ عام ہے اور جس کی الٰہیت مسلّم اور عبادت واجب ہے۔ "اِلٰهًا وَّاحِدًا" میں توحید کی تصریح اور ہر قسم کے وہم کا ازالہ پایا جاتا ہے۔ (۱۲۸/۱)

علامہ ابوالسعود نے سورۂ نساء نمبر ۱۷۱ کی تفسیر میں "ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ" میں تین اقانیم کی وہی وضاحت کی ہے جو بعض متقدمین کر چکے ہیں اور "اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" کی تشریح میں لکھا ہے کہ وہ تمام وجود میں ہر وجہ و صورت سے تعدد سے پاک ہے اور اپنی ذات سے پاک ہے۔ اور اس کا کوئی فرزند اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس کا کوئی مماثل نہیں۔ (۴۰۱/۱)۔ یہی تفصیل و تشریح سورۂ مائدہ نمبر ۷۳ میں بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ دہرا دی ہے۔ (۵۰/۲۔۴۹)۔ فرماتے ہیں کہ وجود میں کوئی ایسی ذات نہیں جو واجب ہو اور عبادت کی مستحق ہو بایں طور کہ وہ تمام موجودات کا مبدأ ہے سوائے ایک الٰہ کے جو وحدانیت سے موصوف اور شرک قبول کرنے سے پرے ہے۔ پھر اقانیم ثلاثہ کی وضاحت کی ہے۔

انہوں نے سورۂ انعام نمبر۱۹ کی تفسیر میں نحوی تفصیل کے علاوہ مختصر آیت کی تشریح و تفسیر کی ہے۔ شانِ نزول میں قریش کا استفسار بابت ذکر وصفت رب، شہادتِ الٰہی کی عظمت، تبلیغ و تنبیہ ... کرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود موجود ہی نہیں اور میں اس ذات کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں اور شرک سے انکار کرتا ہوں۔(۸۷/۲)۔ سورۂ توبہ نمبر۳۱ میں احبار و رہبان کی تحریم و تحلیل اور ہر لحاظ میں پیروی کے پس منظر میں متقدمین کی طرح توحید کی تفسیر کی ہے اور حضرت عدی بن حاتم ... کی روایت بابت شانِ نزول نقل کی ہے۔ تمام کتبِ سماویہ بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام کا اصرار ... صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی جائے کہ وہ عظیم الشان ہے۔ یہ آیت وحدانیت کا مقرر ہے۔(۲۹۹/۲) سورۂ یوسف نمبر۳۹ میں توحیدِ الٰہی کی مختصر تشریح یہ ہے کہ اللہ معبود حق ہے واحد ہے اور الوہیت میں ... اور قہار و غالب ہے۔(۷۲/۳)۔ سورۂ رعد نمبر۱۶ کی آیتِ توحید میں ان کا مختصر بیان یہ ہے کہ وہ توحید کی ... ہے کہ شرکاء و خالقوں کے خلق سے ماوراء، الوہیت میں متوحد و واحد اور ربوبیت میں متفرد ہے اور اپنی ذات سے ... سب پر غالب ہے۔(۱۰۳-۱۰۴/۳)۔ سورۂ ابراہیم کی دونوں آیاتِ کریمہ نمبر۴۸، ۵۲ میں دوسرے مسائل سے زیادہ بحث کی ہے اور توحید کی وہی تفسیر سابق دہرا دی ہے۔(۱۳۷-۱۳۸/۳) کہ واحد لاشریک ہے۔

تفسیر ابی السعود میں سورۂ نحل نمبر۲۲ (۱۶۹/۳)، نمبر۵۱ (۱۷۸-۱۷۹/۳) میں توحید الٰہی کی وہی جانی پہچانی اور بار بار دہرائی جانے والی تفسیر و تشریح ملتی ہے۔ اول آیت کے سیاق میں فرمایا کہ اس کے ساتھ کسی شے کی شراکت نہیں اور تمام آیات اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ دوسری آیت کے تناظر میں لکھا کہ تثنیہ کا عدد لانے سے بقیہ اعداد کی نفی ہو گئی اور وہ سب الوہیت کے منافی ہیں کہ اللہ وحدت سے موصوف ہے۔ لہٰذا یہ امر مسلم الثبوت ہے۔ سورۂ کہف نمبر۱۱۰ میں تحریر فرمایا کہ نہ خلق میں اور نہ تمام احکامِ الوہیت میں اس کا کوئی شریک ہے۔(۲۷۲/۳)۔ ان کا بیانِ توحید سورۂ انبیاء نمبر۲۲ کے ضمن میں یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ تعددِ الٰہ کا ابطال دلائل و براہینِ قاطعہ کے ساتھ کرتی ہے بلکہ اس کو محال قرار دیتی ہے۔ اگر دو الٰہ ہوتے تو ان کا ارادہ متحد ہوتا یا مختلف، دونوں صورتوں میں ایک الوہیت باطل ٹھہرتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ واحد ہے اور لاشریک (۳۳۷/۳) اسی طرح آیتِ کریمہ نمبر۱۰۸ کی تشریح میں وحی و رسالتِ محمدی کا اصل الاصول اور مقصود توحید کی تعلیم کو بتایا ہے۔(۳۵۶/۳)۔

سورۂ حج نمبر۳۴ میں قربانی کے مختلف مناسک کے تناظر میں لکھا ہے کہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں ایک نکتہ مزید یہ پیدا کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ "واحدا" کی بجائے "الٰہ واحد" فرمایا کیونکہ مراد یہ ہے کہ اللہ اپنی وحدانیت میں واحد ہے جس طرح اپنی ذات میں واحد ہے اور اسی طرح وہ ہر لحاظ سے واحد ہے۔(۱۳/۴)۔ سورۂ عنکبوت نمبر۴۶ میں لَا شَرِيكَ لَهُ فِي الْأُلُوهِيَة کہ الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں (۴/۱۷۲) لکھ کر تفسیر توحید پوری کر دی جبکہ سورۂ صٰفٰت نمبر۴ میں الٰہ واحد کو حق کی تحقیق یعنی توحید کا اثبات کہا ہے۔(۲۹۵/۴)۔ سورہ ص نمبر۵ (۲۸۲/۴)، نمبر۶۵ میں تفسیر توحید کچھ خاص نہیں اور یہی حال دوسری سورتوں کی آیات کا ہے۔ (سورۂ زمر نمبر۴ ۳۰۰/۴، سورۂ غافر نمبر۱۶: ۶/۵، سورۂ فصلت نمبر۶ ۱۸/۵)۔ سورۂ

اخلاص میں "ھُوَاللہُ احدٌ" میں "ھُو" کو الضمیر الشان کہا ہے۔ احدٌ بمعنی واحد ہے۔ قریش کے استفسار بابت صفت رب شان نزول ہے۔ ضمیر الشان اور واحد کے احد میں تبدیل ہونے سے زیادہ بحث ہے۔ اس کا نہ کوئی شریک ہے، نہ مماثل، نہ متشاکل، نہ بیوی، نہ فرزند، وہ ہر لحاظ سے واحد اور وحدانیت میں فرد ہے اور یہ سورہ اس کی توحید کی عظیم ترین شہادت ہے۔(۵/ ۹۲۔۴۹۱)۔

بارہویں ۔ تیرھویں صدی

امام شوکانی (محمد بن علی بن محمد صنعانی ۱۲۵۰۔۱۱۷۳ / ۱۸۳۴۔۱۷۵۹) کی تفسیر "فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر" جیسا کہ اسکے کامل عنوان سے ظاہر ہے تفسیر ماثور اور رائے جائز پر مبنی تفسیر کی کتاب ہے۔ امام موصوف یمن کے عظیم علماء اہلسنت میں شمار ہوتے ہیں، اور ان کی تفسیر متاخرین میں بہت مقبول و مستند اول ہے کیونکہ وہ صحیح روایات، موزوں افکار، مناسب تعبیرات اور ان سب سے زیادہ صحیح و مستند طرز فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔وہ عقیدہ سلف کی بھی ترجمان ہے جیسا کہ آیاتِ توحید کے حوالے سے ان کی تفسیرات و تشریحات عکاسی کرتی ہیں۔

سورۂ بقرہ نمبر ۱۶۳ کی تفسیر میں نحوی و صرفی اور بلاغی تفصیلات دینے کے بعد امام شوکانی امام ابن عطیہ اندلسی کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ " اِلٰھًا وَّاحِدًا " حال ہونے کے سبب قولِ حسن ہے کیونکہ اس وحدانیت کا حال ثابت کرنا مقصود ہے۔ تحقیقی امور کے لئے انہوں نے دوسرے بہت سے علماء و مفسرین کی آراء بھی نقل کی ہیں۔(مطبعۃ مصطفیٰ البابی، مصر ۱۹۶۴ء، ۱/ ۱۴۱)۔ اسی سورہ کی دوسری آیتِ کریمہ نمبر ۱۶۳ میں اول کی مانند دوسری تفصیلات بہت زیادہ ہیں۔ توحید الٰہی کی بس اتنی تشریح ہے کہ " اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ " میں توحید کی طرف اور شرک کے علائق سے اجتناب کلی کی طرف ارشاد ہے اور ماسبق آیاتِ کریمہ میں جو حق نہ چھپانے کا حکم دیا گیا ہے اس کی طرف اشارہ ہے کہ اول شے جس کا اظہار لازمی اور کتمان حرام ہے وہ توحید کا معاملہ ہے۔ (۱/ ۱۶۲)۔ سورۂ نساء نمبر ۱۷۱ میں اقانیم ثلثہ اور ان کی مختلف تعبیراتِ عیسوی کے پس منظر میں توحید الٰہی کی تشریح شوکانی یہ ہے کہ تثلیث سے بچو اور اللہ واحد پر ایمان لاؤ کہ اس کا کوئی شریک ہے، نہ بیوی اور نہ اولاد، وہ اولاد رکھنے سے منزہ ہے اور جن کو مشرکین نے شریک بنا رکھا ہے وہ خود مملوک و مخلوق ہیں جو شریک و فرزند نہیں ہو سکتے۔ (۱/ ۵۴۱)۔ سورۂ مائدہ نمبر ۷۳ میں عقیدۂ تثلیث کے پس منظر میں یہی تفسیر ہے بس فرق یہ ہے کہ اللہ کا وجود ہی اصل مانا ہے۔ سورۂ نساء میں اپنی تفسیر کا حوالہ بھی دیا ہے کہ وہاں یہ بحث گذر چکی۔(۲/ ۶۴۔۶۳)۔

صاحبِ فتح القدیر نے سورۂ انعام نمبر ۱۹ کی تفسیر میں اپنے نحوی، صرفی اور لغوی مباحثِ معمول کے بعد مختصر تشریح توحید کی ہے کہ وہ اپنی ربوبیت میں منفرد ہے اور اس کی توحید پر براہین کا قیام سب سے عظیم و جلیل شہادت ہے۔ (۲/ ۱۰۵)۔ سورۂ توبہ نمبر ۳۱ میں اہلِ کتاب کے احبار و رہبان کو رب نہ بنانے اور اللہ واحد کی عبادت کرنے کا جو حکم ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ان کی اطاعت نہ کرو بلکہ صرف اللہ واحد کی اطاعت و عبادت کرو کہ وہ شرک سے منزہ ہے۔(۲/ ۳۵۴)۔ سورۂ یوسف نمبر ۳۹ میں توحیدِ الٰہی کی تشریح متن یہ ہے کہ اللہ معبود ہے اور اپنی ذات و صفات میں منفرد ہونے کی بنا پر معبود ہے۔ اس کا کوئی ضد و مقابل و شریک نہیں۔وہ قہار و غالب

ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ (۲۷/۳)۔ سورۂ رعد نمبر۱۶ میں اور اس سے قبل کی آیات میں یہ توضیح شوکانی ملتی ہے کہ مخلوق پر یہ واجب ہے کہ وہ اللہ کی توحید کریں اور اس کے لئے مخلص ہوں۔ وہ خالق و مالک ہے، ربوبیت میں منفرد ہے اور اپنے سوا تمام چیزوں پر غالب۔ اس کے سوا جو چیز ہے سب مقہور مغلوب ہے۔(۷۳-۷۴/۳)۔

امام شوکانی نے حسب معمول سورۂ ابراہیم نمبر۴۸ اور نمبر۵۲ میں بھی توحید کی نہایت مانوس و مختصر تشریح کی ہے۔ وہ واحد قہار ہے کیونکہ الوہیت میں منفرد ہے اور اپنے معاندین سے انتقام لینے والا ہے۔(۱۱۸/۳)۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے اپنی وحدانیت اور شرک سے منزہ ہونے پر دلائل و براہین فراہم کر دیے ہیں لہذا انسانوں کی عبرت و نصیحت اور علم و تبلیغ کے لئے وہ کافی ہیں۔(۱۱۹/۳)۔ یہی صورت حال سورۂ نحل کی دونوں آیاتِ کریمہ کی تفسیر میں ملتی ہے۔ آیتِ کریمہ نمبر۲۲ میں صرف وحدانیت کی تشریح میں ان کا حوالہ دیا ہے۔ (۱۵۶/۳) جبکہ نمبر۵۱ میں لکھا ہے کہ شریک بالخصوص دو الٰہ بنانے سے روکا اور ثابت فرمایا کہ الوہیت صرف ایک الٰہ واحد میں منحصر ہے اور وہ اللہ سبحانہٗ ہے۔ "الٰہ" میں وحدت الٰہی کی حقیقت یوں بھی موجود ہے۔(۱۶۸/۳)۔ باقی بحث اس امر پر زیادہ ہے کہ "الٰہین" میں دو کا مفہوم موجود ہے تو پھر "اثنین" (دو) کا عدد کیوں لایا گیا؟

سورۂ کہف نمبر۱۱۰ کے حوالے سے امام شوکانی نے توحید کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں اور اس میں توحید کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ اور انسانوں کو عمل صالح اور توحید خاص کا حکم دیا گیا ہے۔(۳۱۸/۳) احادیثِ نبویؐ اور روایات و آثار کے ذریعہ یہ واضح کیا ہے کہ ریاکاری یعنی شرک اصغر، اور "شہوۂ خفیہ" سے بھی بچنے کا امرِالٰہی اس میں موجود ہے۔(۳۱۹/۳)۔ سورۂ انبیاء نمبر ۲۲ کی توضیح عبارت میں امام فراء کے حوالے سے معنی لکھے ہیں کہ اگر آسمان و زمین میں دو معبود ہوتے تو وہ خراب ہو جاتے۔ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ کی موجودگی اس امر کو مستلزم ہوتی کہ دونوں میں سے ہر ایک تصرف کرنے پر قطعی طور سے قادر ہوتا اور اس صورت میں تنازعہ اور اختلاف رونما ہوتا اور پھر فساد ہوتا لہذا اللہ واحد ہی ہے۔(۴۰۳/۳) اس سورت کی آیتِ کریمہ نمبر ۱۰۸ کے حوالے سے توحید کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ (۴۲۳/۳)۔ جبکہ سورۂ حج نمبر۳۴ کی تفسیر میں اللہ کے الوہیت میں منفرد ہونے اور بلاشریک معبود ہونے کی بات دہرا دی ہے (۴۵۱/۳)۔ سورۂ عنکبوت نمبر۴۶ میں " لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ لَا ضِدَّ وَ لَا نِدَّ " کی تکرار ملتی ہے(۲۰۵/۴)۔ سورۂ صٰفٰت نمبر۴ میں "وہ واحد ہے اور بلاشریک" کا جملہ ہے۔(۳۸۶/۴)۔ سورۂ ص نمبر۵ میں الٰہ واحد کی کوئی تفسیر نہیں کی۔ (۴۲۰/۴) البتہ سورۂ ص نمبر۶۵ میں "الٰہ" کی تفسیر مستحق عبادۃ سے، اللہ واحد کی لاشریک معبود سے اور قہار کی اپنے ماسوا سب پر غالب سے کی ہے۔(۴۴۳/۴)۔ سورۂ زمر نمبر۴ کی تفسیر میں لاشریک اللہ لاولاد سے منزہ اور اس کے ماسوا تمام کے مخلوق ہونے اور مخلوق کے فرزندِالٰہی ہونے کے استحالہ پر کہ ان دونوں کے درمیان مجانست نہیں پائی جاتی بحث کی ہے۔ (۴۴۹/۴)۔ سورۂ غافر نمبر۱۶ میں حضرت حسن کا خیال دہرایا ہے کہ سائل و جواب دینے والا دونوں اللہ تعالیٰ ہو گا۔ اہلِ جنت اور اہلِ ایمان کے اقوال بھی بتائے ہیں۔(۴۸۵/۴)۔ سورۂ فصلت نمبر۶ میں بیانِ شوکانی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کو توحید کی طرف دعوت دی کہ اس کو ایک مانو اور اسی کی

اتباع کرو۔ (۵۰۶/۴)۔ سورۂ اخلاص میں توحید الٰہی کی تفسیر شوکانی سابق مفسرین سے مستعار ہے۔ شانِ نزول صفتِ رب کے بارے میں سوالِ مشرکین ہے۔ ضمیر شان وغیرہ نحوی مباحث کے بعد کہا ہے کہ اللہ احد ہے یعنی واحد کے معنی میں ادا کیا ہے۔ ایک خیال ابوالبقاء کا ہے کہ احد اصل ہے اور واحد کے مقابلہ میں اس میں عموم کا مفہوم زیادہ ہے۔ ازہری کے بقول غیر اللہ کو احدیت کے ساتھ موصوف نہیں کیا جاتا جبکہ واحد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اقوال مفسرین میں امام رازی، طبری وغیرہ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ (۵۱۵-۵/۱۸)۔ معنی توحید یہ کہ وہ اللہ احد صمد، بلا ولد و والد اور بلا شریک و مقابل ہے۔

تیرھویں صدی

متاخرین میں علامہ محمود شکری آلوسی (۷۰ـ۱۲۱۷ / ۵۴ـ۱۸۰۲)

بہت بڑے مفسر سمجھے جاتے ہیں اور ان کی تفسیر "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی" اپنی نوع کی ایک ممتاز، منفرد و تفسیر ہے۔ اس میں علوم و فنون کا ایک بیش بہا گنجینہ موجود ہے۔ اس کا ایک خاص وصف آیات قرآنی کی تاویل میں تصوف کی آمیزش ہے۔ اس میں تفصیل و تطویل کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ احادیث نبوی، آثار صحابہ، اقوال مفسرین اور آراء متکلمین بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی بدولت متاخرین علماء بالخصوص اہل علم پاک و ہند میں بہت زیادہ مقبول ہے۔

سورۂ بقرہ نمبر ۱۶۳ کے باب میں علامہ آلوسی نے حضرت ابن عباس کی اس روایت کا حوالہ دیا ہے جس میں مشرکین نے صفت رب کا سوال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا۔ اس آیت کریمہ کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اثبات کی دلیل بتاتے ہیں اور اس کا ربط گذشتہ آیاتِ کریمہ سے قائم کرتے ہیں کہ اہل کتاب اللہ کی وحدانیت کو چھپاتے تھے۔ نحوی نکتہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آیت کریمہ میں "إلٰهكم" کی نسبت مخاطبین کی جانب استحقاق کی بنا پر کی گئی ہے نہ کہ واقعہ حقیقت کے بطور، کیونکہ غیر مستحق خداؤں کی تو کثرت ہے۔ لفظ الٰہ کا اعادہ اور وحدت سے اس کی توصیف اس معنی کے اظہار کے لئے ہے کہ الوہیت میں معتبر صرف وحدت ہے اور اس بنا پر اس کا عبادت کا استحقاق ہے۔ کلامِ عرب سے الٰہ واحد کی بعض مثالیں دے کر وضاحت کی ہے کہ یہاں اصل زور وحدانیت کے اثبات پر ہے اور اس کے معنی ہیں کہ اس کا نہ کوئی نظیر ہے، نہ اس کی ذات و صفات کا کوئی شبیہ اور نہ ہی اس کے افعال کا کوئی شریک و سہیم۔ یہاں گنتی کا آغاز مقصود نہیں۔ عقلِ سلیم کے مالکوں کے نزدیک سب سے صحیح قول یہ ہے کہ عبادت کے استحقاق میں اس کا کوئی نظیر و شبیہ نہیں۔ اور اس میں تمام کمالات کا التزام پایا جاتا ہے اور نقص و خلل سے کامل تنزیہ۔ " لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ " اور " الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ " مبتدا کی دوسری خبریں ہیں اور وحدانیت کو مزید محکم ظاہر کرتی ہیں۔ (روح المعانی ۲/ ۲۷-۲۶)۔

اہلِ کتب کے عقیدِ فرزندی و تثلیث کے حوالہ سے علامہ آلوسی نے سورۂ نساء نمبر ۱۷۱ اور سورۂ مائدہ نمبر ۷۳ میں تفسیر کی ہے۔ انہوں نے تعدد و کثرتِ خداوندان کی عقلی و نقلی دلائل سے تردید کی ہے۔ زیادہ زور عقیدۂ تثلیث پر دیا ہے۔ وحدانیت پر بحث مختصر ہے کہ وہ اپنی ذات سے تعدد سے پاک ہے اور اس کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ پھر فرزند نہ ہونے پر پوری بحث استوار کی ہے۔ فرزندی میں باپ اور بیٹے میں مشابہت،

تشبیہ، تمثیل وغیرہ کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ مولانا راغب پاشا کے حوالے سے علامہ بوصیری (محمد بن سعید) کا ایک اقتباس تردید تثلیث میں نقل کیا ہے۔ (روح المعانی ۶/۳۳) جبکہ موخر الذکر آیت کریمہ میں "ثالث ثلاثۃ" ہونے اور نہ ہونے کی بحث کے بعد وحدانیت الٰہی کے باب میں لکھا ہے کہ موجودات میں کوئی بھی واجب الوجود اور مستحق عبادت ذات موجود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی تمام موجودات کا مبدا ہے۔ اور وہی وحدت سے موصوف ہے، وہ شرکت قبول کرنے سے ماوراء ہے، کیونکہ تعدد کی صورت میں الوہیت کی نفی لازم آتی ہے جیسا کہ اس پر تمانع (ممانعت) کی دلیل دلالت کرتی ہے۔ الوہیت ہی کی نفی ہو جائے گی تو تعدد کہاں سے ہوگا۔ جبکہ وہ ذات الٰہی اپنی ذات سے تعدد کے شائبہ سے بھی ہر حال و وجہ میں منزہ و پاک ہے۔ (روح المعانی ۶/۱۹۵)۔

علامہ آلوسی نے سورۂ انعام نمبر۱۹ کے موضوعات۔ اللہ کی عظیم ترین شہادت یعنی وحدانیت، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعدد الٰہ سے انکار اور توحید الٰہی کی گواہی۔ سے بحث میں نحوی و دوسری جہات کو زیادہ مدنظر رکھا ہے۔ ان نحوی، صرفی، کلامی مباحث میں انہوں نے زمخشری، طیبی وغیرہ مفسرین کے اقوال کے علاوہ احادیث کا بھی حوالہ دیا ہے۔ توحید الٰہی کا باب مختصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ شرک سے پاک ہے۔ (روح المعانی ۷/۱۰۳)۔

احبار و رہبان کو رب بنانے کی جو بات سورۂ توبہ نمبر۳۱ میں کہی گئی ہے علامہ آلوسی کے مطابق اس سے یہودی و عیسائی علماء کی تحریم و تحلیل یعنی قانون سازی میں پیروی کورانہ مراد ہے۔ حضرت علامہ نے غلو اور عقیدت شیوخ میں مبالغہ کی نفی کی ہے اور حضرت عدی بن حاتم کی روایت اس باب میں نقل کی ہے۔ وحدانیت کے باب میں صرف یہ وضاحت کی ہے کہ ان کو اللہ واحد کی عبادت اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا۔ اللہ کے سوا سب مامور و محکوم ہیں۔ (روح المعانی، ۱۰/۷۵)

حضرت یوسفؑ اور ان کے قیدی رفیقوں کے مابین مکالمہ میں متفرق ارباب کی نفی اور اللہ واحد قہار کا اثبات سورۂ یوسف نمبر۳۹ میں کیا گیا ہے۔ علامہ آلوسی نے توحید کی مختصر تعریف و تفسیر کی ہے۔ اللہ واحد جو اپنی الوہیت میں منفرد ہے اور غالب ہر شے پر اور تمام موجودات پر ہے عبادت بندگان عالم کا سزاوار ہے۔ علامہ موصوف نے امام زمخشری کے عقیدۂ وحدانیت اور اس کے معتزلی رنگ سے بحث کرتے ہوئے اس پر علامہ طیبی کا نقد بھی تفصیل سے نقل کیا ہے۔ (روح المعانی، ۱۲/۲۱۹)۔ اسی طرح سورۂ رعد نمبر۱۶ میں اللہ کی صفات "واحد قہار" پر بہت مختصر بحث کی ہے کہ وہ "الوہیت میں متوحد اور ربوبیت میں منفرد ہے اور اپنے ماسوا تمام چیزوں پر غالب ہے اور ان ماسوا چیزوں میں ان کے معبودان باطل بھی شامل ہیں لہذا مغلوب اللہ تعالیٰ کا شریک کیونکر ہو سکتا ہے؟ (روح المعانی، ۱۳/۱۲۶)۔ اللہ واحد قہار کی یہی تشریحات سورہ ابراہیم نمبر۴۸ اور نمبر۵۲ میں ملتی ہیں۔ اگر کوئی اضافہ ہے تو بس اتنا کہ ان دونوں صفت سے اس لئے تعرض کیا گیا کہ خطاب و تربیت میں خوفناکی در آتی ہے کیونکہ جب وہ ایک لاشریک عظیم و قہار بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو ان کو زیادہ خطرہ محسوس ہو گا۔ اس وقت اللہ کے سوا نہ کوئی بچانے والا ہو گا نہ فریاد سننے والا۔ (روح المعانی ۱۳/۲۲۹ و مابعد)

سورۂ نحل نمبر۲۳ اور نمبر۵۱ میں علامہ آلوسی نے صانع و مصنوع کے حوالے سے توحید کے دلائل بیان

گئے ہیں۔ ان میں تمام مخلوقات عالم بالخصوص آسمان و زمین کی تخلیق، انسان کی پیدائش وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ امام آلوسی نے اسی مذکورہ آیات کریمہ کا تعلق ان دونوں آیات سے جوڑا ہے۔ "الہ واحد" میں جن لوگوں نے یہ مفہوم نکالا ہے کہ وہ قیامت کے دن الہ واحد ہو گا اس کی امام ابوحیان کے حوالہ سے تردید کی ہے۔ اور اس کی تائید میں نحوی دلائل دیے ہیں۔ اس کی وحدانیت ازلی و ابدی ہے۔(روح المعانی، ۸۹/۱۴۔۸۷، ۱۱۔۱۱۰)۔ موخر الذکر آیات کریمہ میں اس قول مشہور کی تردید کی ہے کہ "اِلٰہَیْنِ" میں "اثْنَیْنِ" اور "اِلٰہٌ" میں "واحد" صفت ہے۔ وہ دونوں تاکید کے واسطے نہیں بلکہ "ایضاح و تفسیر" کے لئے لائے گئے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ "الہ" میں جنسیت کے اعتبار سے فردیت کی وحدت پائی جاتی ہے۔ علاوہ زمخشری کی رائے پر بحث کی ہے اور کافی تفصیل سے۔ (روح المعانی، ۱۴/ ۹ ۔ ۱۰)۔

سورۂ کہف نمبر ۱۱۰ میں علامہ آلوسی کی تفسیر توحید پر نحوی و کلامی وغیرہ مباحث زیادہ غالب ہیں، توحید کے باب میں رقم طراز ہیں کہ تمہارا الہ یعنی تمہارا معبود حق ہے اور اس پر وحدانیت چھائی ہوئی ہے بلکہ منحصر ہے۔ کہ وہ وحدانیت کی صفت سے تجاوز ہی نہیں کرتا۔ یہ وحدت الوہیت کی ہے۔ دوسری صفات جیسے تعدد وغیرہ کا اس میں گزر ہی نہیں۔ امام زمخشری اور بعض دوسرے علماء کے خیال سے بھی تعرض کیا ہے۔ (روح المعانی، ۱۶/ ۵۰۔۴۹)۔

علامہ آلوسی نے سورۂ انبیاء نمبر ۲۲ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا کی بہت مفصل تفسیر کی ہے۔ اس کے اہم نکات کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ (۱) اس آیتِ کریمہ میں تعددِ الہ کا ابطال کیا گیا ہے۔ (۲) "فیھما" سے بظاہر مراد زمین و آسمان ہیں لیکن عالمِ علوی اور عالم سفلی دراصل مراد ہیں۔ "کون" (ہونے) کا مطلب "تمکن" ہے جو تصرف، تدبیر کے معانی رکھتا ہے اور اس سے مراد محض قرار پانا اور ٹھہرنا نہیں ہے۔ فاضل کلنبوی پر تنقید، علامہ طیبی کی تائید، خفاجی اور دوسرے علماء و مفسرین کی تشریحاتِ نحوی و صرفی اور دیگر مباحث سے کافی تعرض کیا ہے۔ (۳) اکثرین کا مذہب بیان کیا ہے کہ اس میں استغراق نہیں ہے۔ (۴) تعددِ الہ سے تدبیر و نظام کائنات مختل ہو جائے گا۔ (۵) اللہ تعالیٰ خالق قادر، مدبر اور کامل الوہیت کا حامل ہے، وہ واحد و غیر متعدد ہے۔ جس کا اعتراف مشرکین تک کرتے ہیں۔ (۶) متعدد آیاتِ قرآنی بھی اس کی تائید میں نقل کی ہیں۔ (روح المعانی، ۱۷/ ۲۷۔۲۲)۔ علامہ آلوسی نے مسلک جمہور کے تحت ارادۃ المغایرۃ کا اہم بحث پیش کیا ہے کہ عقلی دلائل تعددِ الہ کی نفی پر گواہی دیتے ہیں۔ اس سورۂ کریمہ کی آیت نمبر ۱۰۸ میں "الٰہ واحد" کی تفسیر وحدانیت پر اللہ تعالیٰ کے انحصار یا ذاتِ الٰہی میں وحدانیت کے ارتکاز سے بحث کی ہے۔ (۱۷/ ۸۹۔۹۷)۔ اکثر مفسرین اور زمخشری کے مباحث سے بھی کافی تعرض کیا ہے۔ سورۂ انبیاء نمبر ۲۲ میں دوسرے مفسرین و مفکرین میں طیبی، خفاجی، الشمنی، مبرد، سیبویہ، دمامینی، شلوبین اور ابن الصائغ وغیرہ شامل ہیں۔ اس بحث میں بعض کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جیسے الرضی کی شرح الکافیہ، تلویح، مالکی کی شرح التسہیل وغیرہ۔

علامہ آلوسی نے دوسرے مفسرینِ قدیم و جدید کی مانند بعد کی سورتوں میں وارد آیاتِ توحید کی تفسیر میں اختصار کا طریقہ اپنایا ہے۔ چنانچہ سورۂ حج نمبر ۳۴ میں پہلے تو صرفی بحث کی ہے پھر توحید کی وضاحت پر قوم

کے طریقۂ قربانی کے تناظر میں کی ہے کہ یہ مختلف طریقے ہی اس کی وحدانیت پر [illegible] کرتے ہیں۔ دوسرے یہ بات قرینِ عقل ہے کہ ایک ہی الٰہ واحد کا نام قربانی اور ذبح پر لیا جائے کہ وہی الوہیت کا مستحق ہے اور اپنے اس استحقاق میں فرد و منفرد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں کہ شرک نقص الوہیت کو مستلزم ہے۔ (روح المعانی، ۱۷/۱۳۰ و مابعد)۔ سورۂ عنکبوت نمبر۴۶ میں "الٰہ واحد" کی بس اتنی تشریح ہے کہ [illegible] الوہیت میں کوئی شریک نہیں"۔ (روح المعانی، ۲۱/۳۔۴۔۳)۔ سورۂ صٰفٰت نمبر۴ میں لکھا ہے کہ یہ [illegible] ہے۔ (صانع) کی وحدت عقل سے اس کے ثبوت کے بعد دلیل نقلی سے ثابت ہوتی ہے کامل بات نہیں ہے [illegible] اختلاف نہ کرنے والا اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ لہٰذا تخلیق و پرورش آسمان و زمین اور جہات [illegible] حیثیت سے اس کی وحدانیت ثابت کی۔ (روح المعانی، ۲۳/۶۲)۔ سورۂ ص نمبر۶۵ میں خیال ظاہر کیا ہے [illegible] اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی خاص صفت توحید الٰہی کی طرف دعوت تھی۔ (۲۳/۱۹۹)۔ [illegible] (۲۴/۱۰)، سورۂ غافر/مومن نمبر۱۶ (۲۴/۵۲۔۵۱) سورۂ فصلت/حم السجدہ نمبر۶ (۲۴/۸۶) میں اسی [illegible] وحدانیت الٰہی پر کلام کیا ہے۔

سورۂ اخلاص میں البتہ نسبتاً مفصل تر بحث ملتی ہے۔ اسماء و فضائل سورہ کے بعد [illegible] آیت کریمہ میں "ھُوَ" پر بحث کی ہے۔ مشہور بات یہ ہے کہ وہ ضمیر شان ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے امام عبدالقاہر جرجانی کی "دلائل الاعجاز" اور شہاب قاسی کے خیالات نقل کئے ہیں کہ ضمیر میں نہیں مضمون جملہ میں شان ہے اور وہ ہے وحدانیت۔ یہ بہت طویل بحث ہے جس میں افکار علماء و مفسرین زیادہ ہے اور توحید پر بحث کم۔ پھر احد پر بحث کی ہے کہ وہ واحد کے معنی میں ہے۔ احد و واحد کا فرق مختلف مفسرین، نحویین اور علماء کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اس کو مضمون کے اعتبار سے سورۃ التوحید کہا ہے۔ (روح المعانی ۳۰/۲۶۹۔۲۶۵ و مابعد)۔

چودھویں۔ پندرھویں صدی

اردو تفاسیر توحید

عہد جدید بالخصوص بیسویں صدی عیسوی اور چودھویں صدی ہجری میں مفسرین برصغیر پاک و ہند نے اپنی اپنی تفاسیر میں سخن شناسی، نکتہ آفرینی، دقت نظری، جودتِ طبع اور تبحر علمی کا کچھ کم ثبوت نہیں دیا۔ اگرچہ یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ وہ شعوری طور سے یا غیر شعوری لحاظ سے پیشرو مفسرین بالخصوص متقدمین کرام کی تعبیرات و تشریحات سے لازمی طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ وہ جابجا اپنی تفاسیر میں اپنے پسندیدہ مفسرین سے کسب فیض کرنے کے شواہد اقتباسات یا آراء و افکار کی صورت میں پیش کرتے جاتے ہیں۔ بسا اوقات وہ ناپسندیدہ افکار و اقوال پر نقد بھی کرتے ہیں۔ اور یہ ان کی جودتِ طبع اور تبحر علمی کا نشان ہوتا ہے۔ ان کی تعبیراتِ قرآنی میں گہرائی و گیرائی بھی پائی جاتی ہے اور فکرِ قرآنی کے ارتقاء میں ان کی تحریری رنگ آمیزی بھی۔ صرف زبانِ اردو یا برصغیر پاک و ہند کے عجمی ماحول اور مخصوص تہذیب و تمدن کے پس منظر میں ہی ان کی تفسیروں کی اہمیت نہیں ہے بلکہ سلف وخلف کے مجموعی ذخیرۂ قرآنیات میں ان کی ایک اپنی خاص پہچان اور قدر و قیمت ہے۔

تمام اردو تفاسیر کا جائزہ لینا مقصود ہے نہ مفید۔ لہذا چند مقبول ترین اور مشہور ترین تفاسیر تک اس مطالعہ کو محدود رکھا گیا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۳۳۹_۱۲۶۸/۱۹۲۰_۱۸۵۱) اور ان کے شارح و جامع مولانا شبیر احمد عثمانی (۶۹_۱۳۰۵/۱۹۵۰_۱۸۹۷)، فاضل بریلوی امام احمد رضا خاں ۱۳۴۰_۱۲۷۲/۱۹۲۱_۱۸۵۶) اور ان کے شارح و تکملہ نگار مفتی احمد یار خاں نعیمی (۹۰_۱۳۲۴/۷۱_۱۹۰۶)، مولانا محمد اشرف علی تھانوی دیوبندی (۱۳۶۲_۱۲۸۰ / ۱۹۴۳_۱۸۶۳)، مولانا عبدالماجد دریابادی (۹۷_۱۳۱۰/۱۹۷۷_۱۸۹۲) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۹۸_۱۳۲۱/۷۹_۱۹۰۳)، مولانا امین احسن اصلاحی ۱۵۱۷_۱۳۲۴/۹۷_۱۹۰۶) کو مختلف مکاتب فکر کا نمائندہ جان کر جگہ دی گئی ہے۔ ضمناً بعض دوسرے مفسرین کا حوالہ بھی آتا رہے گا۔ اردو تفاسیر توحید میں مجموعی طور سے بحث ایک جگہ مگر تاریخی ترتیب کے مطابق کرنی مناسب سمجھی گئی ہے۔

سورۂ بقرہ نمبر ۱۶۳ میں بالعموم مفسرین اردو نے یا تو توحید پر کلام ہی نہیں کیا یا "وحدہ لاشریک" کے معروف فقرہ کو کافی سمجھا۔ البتہ سورۂ بقرہ نمبر۱۶۳ کے حوالے سے ان کے ہاں کافی تفصیل و توضیح، تشریح و تعبیر، اور تفسیر و تشریح ملتی ہے۔ شیخ الہند نے اپنی موضح فرقان میں تحریر فرمایا "معبود حقیقی تم سب کا ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد کا احتمال بھی نہیں۔ سو اب جس نے اس کی نافرمانی کی بالکل مردود اور غارت ہوا۔ دوسرا معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ اس سے نفع کی توقع باندھی جاتی۔ یہ آقائی اور پادشاہی یا استادی اور پیری نہیں کہ ایک جگہ موافقت نہ آئی تو دوسری جگہ چلے گئے۔ یہ تو معبودی اور خدائی ہے۔ نہ اس کے سوا کسی کو معبود بنا سکتے ہو اور نہ کسی سے اس کے علاوہ خیر کی توقع کر سکتے ہو۔ جب یہ آیہ " وَ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ " نازل ہوئی تو کفار مکہ نے تعجب کیا کہ تمام عالم کا معبود اور سب کا کام بنانے والا ایک کیسے ہو سکتا ہے اور اس کی دلیل کیا ہے۔ اس پر آیہ " اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الخ نازل ہوئی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائیں۔ (دارالتصنیف کراچی ۱۹۷۵ء، ۳۰)

مفتی نعیمی نے آیتِ کریمہ نمبر۱۶۳ کی تفسیر میں البتہ یہ لکھا ہے کہ "---- رب وہ ہے جو ان انبیاءِ کرام کا رب ہے۔ یہ حضرات رب کی معرفت کی دلیل ہیں اس طرح سچا دین وہ جو صالحین کا دین ہو، رب وہ ہے جسے نبیوں، ولیوں نے رب مانا"۔ (تفسیر نعیمی برحاشیہ کنزالایمان ادارہ استقامت، کان پور غیر مورخہ، ۳۱)۔ آیتِ کریمہ نمبر۱۶۳ میں رقم طراز ہیں "چونکہ رب کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے اس لئے ایسے مواقع میں رحمت ہی کا ذکر فرماتا ہے۔ عمومی رحمت کے لحاظ سے وہ رحمان اور خصوصی رحمت کی وجہ سے وہ رحیم ہے کہ کبھی چھوٹی کبھی بڑی کبھی ٹھنڈی کبھی گرم، کبھی اندھیری کبھی چاندنی، کبھی آرام کبھی تکلیف (مفسیر نعیمی، ۳۷)۔ اس تشریح میں واحدنیت کے بجائے صفاتِ رحمٰن و رحیم سے بحث کی گئی ہے۔

مولانا تھانوی کا ارشاد ہے: "اور ایسا معبود جو تم سب کا معبود بننے کا مستحق ہے وہ تو ایک ہی معبودِ حقیقی ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہی رحمان ہے رحیم ہے۔ اور کوئی ان صفات میں کامل نہیں۔ اور بدون کمالِ صفات معبودیت کا استحقاق باطل۔ پس بجز معبودِ حقیقی کے کوئی اور مستحق عبادت نہ ہوا۔ ربط: مشرکینِ عرب نے جو یہ آیت " وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ " اپنے عقیدہ کے خلاف سنی تو تعجب سے کہنے لگے کہ کہیں سارے

جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہیئے۔ حق تعالیٰ آگے دلیلِ توحید فرماتے ہیں۔ دلیل توحید اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ...... (بیان القرآن، تاج پبلشرز دہلی ۱۹۹۴ء، ۹۱/۱)

صفاتِ الٰہی میں کمال اور رحمن رحیم کے حجت توحید ہونے کا خیال مولانا تھانوی نے بقول خویش بیضاوی سے لیا ہے۔ سب کے معبود ہونے کا خیال بھی انہیں سے ماخوذ ہے۔

مولانا دریابادی نے توحید کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے "یہاں خطاب ساری نوعِ انسانی سے ہے۔ نفسِ وجودِ باری تو مشرکینِ عرب کو بھی تسلیم تھا، جس طرح آج بھی ساری مشرک قوموں کو تسلیم ہے۔ لیکن مشرکین علاوہ اس خدائے عظیم یاخدائے برتر کے اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا یا دیوتا تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ مشرکینِ قدیم تو اپنی قوم کے علاوہ دوسری قوموں کے، یہاں تک کہ اپنی دشمن قوموں کے دیوتاؤں کے وجود کے قائل تھے، ان کی قوت کے قائل تھے، ان کی خدائی کے قائل تھے۔ بس صرف ان کی عبادت کے منکر تھے اور اس کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ دشمن کا دیوتا بھی دشمن ہی ہو گا۔ گویا خدا بھی جذبات، احساسات کے لحاظ سے انسان کا مثنیٰ ہوتا ہے۔ قرآن نے آکر اس عقیدہ پر بھی ضرب کاری لگائی اور وضوح سے بار بار اعلان کیا کہ قابلِ پرستش و ناقابلِ پرستش ہونا کیسا، کسی دوسرے خدا یا دیوتا کا وجود ہی سرے سے نہیں، نہ چھوٹے کا نہ بڑے کا، نہ ملکی کا نہ غیر ملکی کا۔ اور اللہ کے ساتھ شریک کا وجود محض وہمِ انسانی کی ایک اختراع ہے۔ ہمارے قدیم مفسرین بھی بغیر جدید علم الاقوام (اتھنالوجی) کی کسی تحقیق کے اس نکتہ تک پہنچ گئے تھے۔ اذ اخذ لانْ یُوْهِمَ انّ فی الْوُجُوْدِ اِلٰهًا وَلٰكِنْ لَا يَسْتَحِقُّ مِنْهُمُ الْعِبَادَةَ (بیضاوی) ...... وَ كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ تَلْكَ مِائَةٍ وَسِتُّوْنَ صَنَمًا (قرطبی)" (مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۹۵ء، ۲۹۶_۲۹۷/۱)۔

بعد کی آیاتِ مبارکہ کے حوالے سے مولانا مودودی نے توحید کی تشریح میں لکھا۔ "...... اگر انسان کائنات کے اس کارخانے کو جو شب و روز اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، محض جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ عقل سے کام لے کر اس نظام پر غور کرے، اور ضد یا تعصب سے آزاد ہو کر سوچے، تو یہ آثار جو اس کے مشاہدے میں آرہے ہیں اس نتیجہ پر پہنچانے کے لئے کافی ہیں کہ یہ عظیم الشان نظام ایک ہی قادر مطلق حکیم کے زیرِ فرمان ہے، تمام اختیار و اقتدار بالکل اسی ایک کے ہاتھ میں ہے۔ کسی دوسرے کی خودمختارانہ مداخلت یا مشارکت کے لئے اس نظام میں ذرہ برابر کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا فی الحقیقت وہی ایک خدا تمام موجوداتِ عالم کا خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری ہستی کسی قسم کے اختیارات رکھتی ہی نہیں کہ خدائی اور الوہیت میں اس کا کوئی حصہ ہو۔" (تفہیم القرآن مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۲ء، ۱۳۰_۱۲۸/۱)۔

صاحبِ تدبر قرآن مولانا اصلاحی نے اس آیتِ کریمہ کے حوالے سے توحید کی مفصل تشریح کی ہے۔ اس کے اہم نکات ہیں۔ "الٰہ کے معنی معبود کے ہیں، اسی پر الف لام تعریف کا داخل کر کے لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے لئے اسمِ ذات استعمال ہوا...... یہ توحید ہی سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز ہے جو ملتِ ابراہیم کی وراثت کی حیثیت سے اس امتِ مسلمہ کی طرف منتقل ہوئی۔ اس کا ذکر یہاں مثبت اور منفی دونوں ہی پہلوؤں سے فرمایا ہے تاکہ اس میں کسی رخنہ کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے...... اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ شرک کے اسباب و

محرکات میں سے ایک بہت بڑا سبب خدا کے ہر قسم کے شغل و عمل اور ہر نوع کے تعلق سے ارفع اور بالاتر ہونے کا غلط تصور بھی ہے۔ یہ تصور ہے تو ایک تنزیہی تصور لیکن بعض صورتوں میں یہ خدا کی بے ہمگی کو اس قدر بڑھا دیتا ہے کہ خلق سے اس کا تعلق بالکل ہی منقطع ہو جاتا ہے اور اس تک رسائی حاصل کرنا یا خلق کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق رکھنا اس کی شانِ الوہیت کے منافی قرار پا جاتا ہے۔ خدا کی بے ہمگی کا یہ تصور فطری طور پر دلوں میں اس کی طرف سے ایک مایوسی پیدا کرتا ہے اور یہ مایوسی بالآخر ان وسائل و وسائط کو جنم دیتی ہے جن کو انسان خدا۔ پاسنے کی شکل میں اپنے لئے تسلی و طمانیت کا ذریعہ بناتا ہے۔ قرآن نے معرفت الٰہی کی راہ کے اس مغالطے کو دور کرنے کے لئے جگہ جگہ یہ کہا ہے کہ خدا کی وحدانیت، اس کی بے ہمگی اور اس کی برتری کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی ایسی صفات کا بھی حوالہ دے دیا ہے جو خلق کے ساتھ اس کے تعلق کو واضح کرنے والی ہیں تاکہ انسان وسائل و وسائط کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے خود خدا کے دامن رحمت کو پکڑنے اور اسی میں چھپنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس پہلو سے سورۂ اخلاص میں، جو توحید کی سب سے بڑی سورہ ہے، اگر ایک طرف خدا کی بے ہمگی و واضح کرنے کے لئے "هُوَ اللهُ أَحَدٌ" (وہ اللہ ہے سب ہے) فرمایا تو تو ساتھ ہی اس کی باہمگی کو واضح کرنے کے لئے "اللهُ الصَّمَدُ" (اللہ باہمہ ہے) بھی فرما دیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ خدا سب سے بے نیاز اور بالاتر ہونے کے باوجود سب کے لئے پناہ، سب کے لئے مرجع اور سب کے لئے سہارے کی چٹان بھی ہے"۔۔۔ مولانا اصلاحی نے رحمٰن و رحیم کی صفات الٰہی کے علاوہ جلال و قہر و غضب سے بھی بحث کی ہے کہ ان دونوں میں توازن پایا جاتا ہے بلکہ اس کی رحمانیت و رحیمیت غالب تر ہے"۔ (تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۸۵ء، ۱/۹۶۔۳۹۳)۔

شیخ الہند کے شارح مولانا عثمانی نے سورۂ نساء نمبر۱۷۱ کے حوالے سے توحید کی تشریح یہ کی ہے "۔۔۔ اور حق تعالیٰ کی شانِ مقدس میں بھی وہی بات کہو جو سچی اور محقق ہو، اپنی طرف سے کچھ مت کہو۔ تم نے یہ کیا غضب کیا کہ حضرت عیسیٰ کو جو کہ رسول اللہ ہیں اور اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے تھے ان کو حق کے خلاف خدا کا بیٹا کہنے لگے اور تین خدا کے معتقد ہو گئے. ایک خدا، دوسرے حضرت عیسیٰ، تیسرے حضرت مریم۔ ان باتوں سے باز آؤ۔ اللہ تعالیٰ واحد اور یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہو سکے۔ اس کی ذات پاک اس سے منزہ اور مقدس ہے۔ یہ تمام خرابی اس کی ہے کہ تم نے وحی کی اطاعت و پابندی نہ کی۔ (ف۱/۱۳۵)۔

فاضل بریلوی کے شارح مفتی نعیمی کی تعبیر یہ ہے: "۔۔۔ بعض عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، بعض انہیں تیسرا خدا مانتے تھے اور بعض انہیں کو خدا مانتے تھے۔ ان تینوں فرقوں کی تردید کے لئے یہ آیتِ کریمہ اتری۔ اللہ میں ایک فرقہ کی تردید ہے "وَاحِدٌ" میں دوسرے کی اور "لَہٗ وَلَدٌ" میں تیسرے کی۔ کیونکہ بچہ اختیار کرنا مجبوری اور مغلوبی سے ہوتا ہے۔ موت کا خطرہ، دشمنوں کا ڈر، شہوت کی مغلوبیت بچہ کا باعث ہے، رب ان سب سے پاک ہے"۔ (۳، ۱۶۶/۴)۔

مولانا تھانوی نے عقیدۂ تثلیث کے پس منظر میں لکھا ہے: "۔۔۔ اور یوں مت کہو کہ خدا تین ہیں، مقصود منع کرنا ہے شرک سے، اور وہ سب اقوالِ مذکورہ میں مشترک ہے۔ اس شرک سے باز آجاؤ۔۔۔ اور توحید

کے قائل ہو جاؤ کیونکہ معبودِ حقیقی تو ایک ہی معبود ہے، اور وہ صاحب اولاد ہونے سے منزہ ہے۔ جو کچھ آسمانوں اورزمین میں موجودات ہیں سب اس کی ملک ہیں اور ان کا منزہ اور مالک علی الاطلاق ہونا دلیل ہے توحید کی۔ جس کی تقریر سورۂ بقرہ کے معاملہ سی و نہم میں گزر چکی۔۔۔ اور "ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہیں اور ان کے سوا سب کارسازی میں ناکافی اور محتاج الی الغیر اور ایک حد پر جا کر عاجز ہیں اور یہ کثرت صفات کمال سے ہے اور صفات کا کمال الوہیت سے ہے۔ جب وہ غیر اللہ میں منتفی ہے تو الوہیت بھی منتفی ہے۔ پس توحید ثابت ہے"۔ عقائد نصاریٰ کے بارے میں مولانا نے روح المعانی کا حوالہ دیا ہے اور یہ تفصیل بھی۔(بیان القرآن ۱/۱۷۵)

مولانا دریابادی نے عیسائی عقائد کی تردید و تفصیل کرنے کے بعد توحید کے تعلق سے لکھا ہے "واحد ہر اعتبار سے اور اپنے ہر معنی میں۔ نہ وہ ایک تین میں تقسیم ہے نہ وہ ایک اپنے کو تین شخصوں میں ظاہر کرنے والا ہے، نہ تریموتی کی کوئی قسم بھی صحیح ہے۔ نہ کوئی اس کا اوتار، نہ کوئی اس کا اقنوم، نہ وہ کسی کا بروز، نہ وہ کسی میں حلول۔ وہ واحد عدد کے اعتبار سے بھی، اور ہر دوسرے اعتبار سے بھی، کیا ظاہراً، کیا باطناً۔ ثنویت، تثلیث اور شرک مطلق کے عقیدے بہت قدیم ہی نہیں، بلکہ یونان، ایران، مصر، ہند، عراق چین وغیرہ دنیا کے اکثر ملکوں میں شائع رہ چکے ہیں۔ آیت کا یہ جزو ان سارے ہی عقائد پر ضرب لگاتا ہے"۔ (تفسیر ماجدی، ۱/۸۴۰)۔

تفہیم القرآن کے مؤلف مولانا مودودی نے یہ تشریح کی ہے کہ "۔۔۔ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اسکے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لئے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ توحید اصل دین ہے"۔۔۔ مولانا نے پھر تثلیث کے وہم و خیال کے ارتقاء اور اسکے اسباب سے بحث کر کے اس سے باز آ جانے اور "اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کرنے اور مسیح کو صرف اسکا پیغمبر قرار دینے نہ کہ کسی طور پر شریک فی الالوہیت" ماننے پر زور دیا ہے۔ (تفہیم القرآن ۱/۲۹_۴۲۸)۔

صاحبِ تدبر قرآن مولانا اصلاحی کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں دین میں غلو اور مبالغہ کرنے سے روکا ہے۔ انہوں نے غلو فی الدین کے مفہوم، اسکے فتنہ کے راستوں سے بحث کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ اللہ کے بندہ، رسول اور خاص کلمہ تھے۔ عقیدۂ تثلیث جیسا کہ فتنہ ہے اور اس کی تردید میں مولانا دریابادی کا ایک اقتباس حاشیہ میں دیا ہے۔ تثلیث سے روکنے اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی تعلیم قرآنی کے بعد توحیدِ الٰہی کے باب میں لکھا ہے کہ "اللہ ہی واحد الٰہ ہے۔ اس کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کی صفاتِ الوہیت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ اس کے اولاد مانی جائے۔ وہ ازلی و ابدی اور سب سے مستغنی اور بے نیاز اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔۔۔ وہ سب کی کارسازی، سب کی مدد اور سب کے بھروسے کے لئے کافی ہے۔۔۔ وہ اپنی ذات و صفات میں بھی کامل ہے اور اپنی خلق کے لئے بھی کافی و وافی ہے۔۔۔" (تدبر قرآن، ۲/۳۷_۴۳۶)۔

سورۂ مائدہ نمبر ۷۳ کے حوالے سے شارح شیخ الہند مولانا عثمانی نے عقیدۂ تثلیث کی تردید تو کی ہے مگر

توحید پر کچھ مزید نہیں لکھا۔ (۱۵۵/ف ۲۰۱)۔ مفتی نعیمی نے بھی عیسائی عقیدوں سے بحث کی ہے اور توحید پر سکوت اختیار کیا ہے۔(۱۹۰/ف ۹۰۸)۔ مولانا تھانوی نے البتہ اتنا لکھا ہے کہ "حضرت مسیح نے خود فرمایا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے"۔ باقی حضرت عیسیٰ کے اللہ ہونے کی تردید کی ہے۔ (بیان القرآن ا۔ ۴۹/۳)۔ مولانا دریابادی نے عقیدۂ تثلیث کی تردید کے بعد لکھا ہے "من اللہ" میں "من" زائد ہیت یا استغراق کے لئے ہے اور آیت کے معنی ہیں کہ سرے سے ایسے معبود کا کوئی وجود ہی نہیں، جو صفت و یکتائیت سے متصف نہ ہو"۔ پھر بیضاوی، کشاف، بحر کی عربی عبارتیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ "واحد۔ صفات کی یکتائی وغیرہ کے علاوہ عدد کے لحاظ سے بھی ایک۔ اس لفظ کا استعمال جب ذات باری تعالیٰ کے لئے ہوتا ہے تو اس سے مراد ایک ذات ہوتی ہے جس میں تجزی بھی ناممکن ہو اور تکثر بھی۔ ایسی ذات فرد جس کے لئے وحدت ہمیشہ اور لازمی ہو اور جو کسی شرکت کو قبول ہی نہ کرے"۔ مولانا نے اسی مفہوم کی عربی عبارت امام راغب اور نہایہ سے نقل کی ہے اور تاج اور نہایہ کی مزید دو عبارتیں نقل کر کے لکھا ہے کہ "یہ وہ ذات ہے جو بے مثل و بے نظیر ہونے میں منفرد اور ناقابل تقسیم و تجزی ہونے اور بے نظیر و بے مثل ہونے کے اوصاف بس ذات باری میں ہی جمع ہو سکتے ہیں"۔ (تفسیر ماجدی، ۱/۲۹-۲۴۸، ۲۴۹ ص)۔ مولانا مودودی نے بھی صرف تثلیث کے عقیدہ کی تردید سے سروکار رکھا ہے۔(۱/۶-۴۹۰) اور طویل طویل اقتباسات دیے ہیں۔ جبکہ مولانا اصلاحی نے عقیدۂ تثلیث پر اپنی بحث کے لئے آل عمران اور نساء کی گذشتہ بحث کا حوالہ دیا ہے اور اس کے "گھونے پن" کو واضح کر کے بس اتنا لکھا ہے کہ "کائنات کا خالق و مالک تو اللہ وحدہ لاشریک ہے...."۔ (تدبر قرآن، ۲/۵۶۷)۔

سورہ انعام نمبر۱۹ کی تفسیر میں مولانا عثمانی فرماتے ہیں "... اگر سمجھو تو میرے صدق پر خدا کی یقینی اور کھلی ہوئی شہادت یہ قرآن موجود ہے جو اپنے کلامِ الٰہی ہونے پر خود ہی اپنی دلیل ہے.... ایسا قطعی اور صریح پیغامِ توحید سننے کے بعد بھی تم یہی کہتے رہو گے کہ خدا کے سوا اور بھی معبود ہیں۔ تم کو اختیار ہے جو چاہو کہو، میں تو کبھی ایسا حرف زبان پر نہیں لا سکتا بلکہ صاف صاف اعلان کرتا ہوں کہ لائقِ عبادت صرف وہ ایک خدا ہے۔ باقی جو کچھ تم شرک کرتے ہو میں اس سے قطعاً بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتا ہوں"۔ (۱۶۸/ف ۱)۔

مفتی نعیمی نے اپنے پانچ حواشی میں گواہی، شانِ نزول، گواہی کی دلیل، نبوتِ محمدی کی آفاقیت اور اصحابِ فترہ کے لئے عقیدۂ توحید کی کفایت اور ایماندار کے اعلان و اظہارِ ایمان سے بحث کی ہے، توحید سے بالکل نہیں۔ (۲۰۶/ے۔۱۱)۔ مولانا تھانوی کی تفسیر آیتِ کریمہ میں توضیح متن کا انداز پایا جاتا ہے اور گواہی، اعلانِ توحید، شرک سے بیزاری پر زور ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم ربانی دیا گیا ہے اس کا مختصر حوالہ ہے کہ "بس وہ تو ایک ہی معبود ہے اور بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار و نفور ہوں"۔ (ا۔ ۸۳/۳)۔

مولانا دریابادی نے گواہی کا تعلق رسالتِ محمدی اور حقانیتِ قرآن سے جوڑنے کے بعد "شیٔ" کے تسمیہ، رسالتِ محمدی کی آفاقیت اور منکروں کے عقیدہ کی تردید سے بحث کرنے کے بعد لکھا ہے: "اثباتِ توحید کے ساتھ ہر پہلو سے نفیٔ شرک بھی قبولِ اسلام کے لئے شرط ہے۔ چنانچہ بعض فقہاء اس کے قائل ہوئے ہیں کہ تو مسلم

کو اسلام لاتے وقت علاوہ اقرارِ شہادتین کے شرک سے بری بھی کرنا چاہیے"۔ جصاص کے حوالے سے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے اور الٰہ واحد کی تشریح کی ہے کہ "وہ خدائے واحد اپنی ذات و صفات ۔ ہر لحاظ سے واحد ہی ہے"۔ لفظ "اِثْنَیْن" کے بارے میں امام رازی کا ایک مختصر اقتباس دیا ہے اور واحد کی مزید تعریف یوں کی ہے "یعنی عدد کے لحاظ سے بھی ایک، اس کے اندر گنجائش نہ ثنویت کی، نہ تثلیث کی، نہ کسی اور قسم کے تعدد کی"۔ (۴/۱۷ـ۱۶/۲۹ـ۲۶)۔ مولانا مودودی کی تشریح کا سارا زور گواہی کے بیان پر ہے یعنی توحید کے باب میں تنا ضرور لکھا ہے کہ "ــــ اس جہانِ ہست و بود میں خدا کے سوا اور بھی کوئی کارفرما حاکم ذی اختیار ہے جو بندگی و پرستش کا مستحق ہو؟ــــ خدا ایک ہی ہے اور خدائی میں کسی کا کچھ حصہ نہیں ہےــــ" (۱/۵۲۹)۔ مولانا اصلاحی نے نحوی بحث کے بعد آیت کا مطلب لکھا ہے کہ "ــــخدا کا کوئی شریک نہیں ہےــــ وہ واحد لاشریک ہے، کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہےــــ وہ ایک ہی معبود ہے اور میں ان تمام چیزوں سے اپنی برات کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک گردانتے ہو"۔ (تدبر قرآن، ۳/۳۲ـ۳۱)۔

سورۂ توبہ نمبر۳۱ کی تفسیر میں مولانا عثمانی نے توحید کا لفظ تو استعمال کیا ہے مگر اس کی تشریح نہیں کی۔(۲۴۸)۔ مفتی نعیمی نے تورات و انجیل میں اسی حکم (توحید) اور اہلِ کتاب کے مشرک ہونے کا صرف ذکر کیا ہے۔(۶/۳۰۵ـ۷)۔ مولانا تھانوی نے توضیح متن میں احبار و رہبان کے رب بنانے کی نوعیت اجاگر کی ہے اور خدا کے معبود واحد حقیقی ہونے کی بات کہی ہے۔(۱ـ۳/۱۰۷)۔ مولانا دریابادی نے آیت کریمہ کی تفسیر ماثور، شانِ نزول سے متعلق حضرت عدی بن حاتم کی روایت، ارباب بنانے کی حقیقت، مسلمانوں کے لئے اماموں اور مشائخ کو مستقل مطاع بنانے کے باب میں عبرت اور امام رازی کی اس باب میں عبارت، شرک سے اجتناب اور توریت میں موجود حکمِ توحید ۔ "میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے" مع ماخذ نقل کیا ہے۔ (۲/۳۹ـ۳۴۸)۔ مولانا مودودی کی تفسیر آیت میں حضرت عدی کی روایت اور اس کے حوالے سے اہلِ کتاب کے علماء کی ربوبیت کی نوعیت ہی جیسی چیزوں پر بحث ہے۔ (۲/۹۰ـ۱۸۹)۔ مولانا عثمانی بھی احبار و رہبان کو رب بنانے کے مفہوم سے تعرض کیا ہے اور حضرت عدی کی روایت نقل کی ہے۔(۳/۵۶۳)۔

سورۂ یوسف نمبر۳۹ کے حوالے سے مولانا عثمانی کا بیانِ توحید ہے "ــــ مختلف انواع و اشکال کے چھوٹے بڑے دیوتا جن پر تم نے خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں ان سے لو لگانا بہتر ہے یا اس اکیلے زبردست خدا سے؟ جس کو ساری مخلوق پر کلی اختیار اور کامل تصرف و قبضہ حاصل ہے اور جس کے آگے نہ کسی کا حکم چل سکتا ہے نہ اختیار، نہ اسے کوئی بھاگ کر ہرا سکتا ہے نہ مقابلہ کر کے مغلوب کر سکتا ہے"ــــ (۵، ۳۱۰)۔ مفتی نعیمی نے آیت کی تفسیر میں چند مسائل بیان کئے ہیں لیکن توحید پر کچھ نہیں لکھا۔(۱/۳۸۴)۔ مولانا تھانوی نے اس ضمن میں تشریحِ توحید ان الفاظ میں کی ہے: "ــــ اس مذہب کا رکنِ اعظم یہ ہے کہ ہم کو کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو لائقِ عبادت قرار دیں۔ (یعنی توحید اس مذہب کا رکنِ اعظم ہے) اور یہ عقیدۂ توحید ہم پر اور دوسرے لوگوں پر بھی خدا کا ایک فضل ہے کہ اس کی بدولت دنیا و آخرت کی فلاح ہےــــ متفرق معبود اچھے یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھاــــ" (۹ـ۱/۵/۸۰)۔ مولانا مودودی نے حضرت یوسف کی

اس تقریر کو پورے قصے کی جان اور قرآن کی توحید کی بہترین تقریروں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ ان کے متعدد پہلوؤں پر مفصل بحث کی ہے۔ توحید پر چند جملے ہیں "اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے جسے تم بھی کائنات کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو۔۔۔ اس نے تو فرمانروائی کے سارے حقوق اور اختیارات اپنے ہی لئے مخصوص رکھے ہیں اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"۔ (۲/۴،۴۰۲)۔ مولانا اصلاحی نے مختصر بحث میں لفظ قہار کے معنی کنٹرول کے لئے ہیں اور اسے ایک خدا کی بدیہی حقیقت قرار دیا ہے کہ وہ لاشریک ہے۔ (۴/۲۰،۲۱۹)۔

سورۂ رعد نمبر۱۶ کی تفسیر میں مولانا عثمانی نے اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقاتِ عالم کی خالقیت کی بنا پر اس کو اکیلا زبردست ثابت کیا ہے۔(۳۲۵)۔ مفتی نعیمی نے "ولی اللہ" اور "ولی من دون اللہ" کا فرق اور کفر کے تعدد اور ایمان کی یکتائی کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خلق پر قادر ہے، نہ کہ کسب پر، وہ ہر برائی سے پاک ہے۔۔۔ ہمارے اعمال اور اچھی بری چیز کا خالق رب ہے۔ بری چیز کا پیدا کرنا برا نہیں"۔(۳۹۹/۵،۳)۔ مولانا تھانوی نے اپنی توضیح متن میں مختلف فقروں کی تشریح اپنے الفاظ میں کی ہے۔ "اللہ ہی ایسا قادر مطلق ہے کہ اسی کے سامنے سب سر خم کئے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں۔۔۔ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی اپنی ذات و صفاتِ کمال میں واحد ہے اور سب مخلوقات پر غالب ہے۔۔۔"(۱/۵،۸،۱۰۷) مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ "اگر دنیا میں کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہوتیں اور کچھ دوسروں نے ۔۔۔ تب تو واقعی شرک کے لئے کوئی معقول بنیاد ہو سکتی تھی لیکن جب ۔۔۔ انہیں خود تسلیم ہے کہ خلق میں ان جعلی خداؤں کا ذرہ برابر بھی کوئی حصہ نہیں ہے تو پھر یہ جعلی معبود (خالق) کے اختیارات اور اس کے حقوق میں آخر کس بنا پر شریک ٹھہرائے گئے"؟ پھر لفظ قہار کی تشریح کی کہ "جو اپنا زور اور اپنا حکم سب پر چلائے اور سب کو مغلوب رکھے"۔(۲/۴۵۲)۔ مولانا اصلاحی نے اعمیٰ و بصیر، نور و ظلمت کی تفصیل اور شرک کی تردید کی ہے۔ موخرالذکر میں ان کی دلیل مولانامودودی کی دلیل کے مماثل ہے۔(۴/۸۰،۲۷۹)۔

سورۂ نحل نمبر۲۲ میں مولانا عثمانی نے لکھا ہے کہ "جو دلائل و شواہد اوپر بیان ہوئے ایسے صاف اور واضح ہیں جس میں ادنیٰ غور کرنے سے انسان توحید کا یقین کر سکتا ہے لیکن غور و طلب تو وہ کرے جسے اپنی عاقبت کی فکر اور انجام کا ڈر ہو"۔ (۳۴۸،۵)۔ مفتی نعیمی کا بیان ہے کہ "اللہ تعالیٰ ذاتاً بھی ایک ہے اور صفاتاً بھی ایک، لہذا جو کوئی رب کو مان کر کسی اور میں اس کی سی صفات مانے وہ بھی ایسا ہی مشرک ہے جو رب کی ذات میں شریک کرے"۔ (۴۲۸،۱۲)۔ مولانا دریابادی کا فرمان ہے کہ "خطاب ساری نسلِ انسانی سے ہے۔ سب کو بتایا ہے کہ حق تعالیٰ لاثانی و لاشریک ہے، تعدد و شرک کا گذر نہ اس کی ذات میں نہ اس کی صفات میں۔۔۔ مسیحی شرک جس کی بنیاد تین اقنوموں پر ہے اس کی پوری تردید "الٰہ واحد" کے اندر آ گئی"۔ (۲/۵۷۷،۳۱)۔ مولانا تھانوی نے "اللہ تعالیٰ کو خالق، متفرد برحق معبود اور الہ واحد" ثابت کیا ہے۔ (۱/۶،۳۹)۔ باقی توضیح متن کا انداز ہے۔ مولانا مودودی نے منکرین کے آخرت سے انکار کا ذکر کیا ہے، توحید کا نہیں۔(۲/۵۳۴،۲۰)۔ مولانا اصلاحی نے بس یہ لکھا کہ "یہ امر تو ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ تمہارا ایک ہی معبود ہے۔۔۔" (۴/۳۹۹)۔ باقی بحث ان کے ہاں بھی انکارِ آخرت پر ہے۔

اسی سورۂ کریمہ کی آیتِ مبارکہ نمبر ۵۱ میں مولانا عثمانی کی تشریح یہ ہے "..... جب تمام آسمانی و زمینی مخلوق ایک خدا کے سامنے بے اختیار سربسجود و عاجز و مقہور ہے پھر عبادت میں کوئی دوسرا شریک کہاں سے آ گیا؟ جو سارے جہان کا مالک و مطاع ہے تنہا اسی کی عبادت ہونی چاہیے اور اسی سے ڈرنا چاہیے"۔(۳۵۲،۷)۔ اگلی آیت میں تکوینی طور پر ہر چیز کی عبادت الٰہی پر ماموری کا ذکر ہے۔ مفتی نعیمی کا بیان ہے کہ "الوہیت کا خوف اللہ کے سوا کسی کا نہیں چاہیے....."(۳،۴۳۴)۔ باقی دوسرے خوفوں کا حوالہ ہے۔ مولانا تھانوی نے توضیح متن میں فرمایا: "..... دو یا زیادہ معبود مت بناؤ پس ایک معبود ہی ہے اور جب یہ بات ہے تو تم لوگ خاص مجھ ہی سے ڈرا کرو کیونکہ جب الوہیت میرے ساتھ خاص ہے تو جو اس کے لوازم ہیں کمال قدرت وغیرہ وہ بھی میرے ساتھ خاص ہوں گے..... اور لازمی طور پر اطاعت بجا لانا اسی کا حق ہے....."(ا۔۴۸/۶)۔ مولانا دریابادی نے آیت کریمہ کے بعض بلاغی پہلوؤں پر کلام کرنے کے بعد اور کشاف کا حوالہ دینے کے بعد "الٰہ واحد" کی یہ تشریح پیش کی ہے "وہ اکیلا اور بالکل لاشریک تنہا خدا ہے، مادہ، روح وغیرہ کوئی چیز بھی شریک الوہیت نہیں۔ آیت سے مقصود الوہیت کا اثبات نہیں، توحید کا اثبات اور ثنویت کی تردید ہے"۔ پھر بیضاوی کی ایک عبارت اسی مفہوم کی نقل کی ہے جس میں ایک نکتہ کا اضافہ ہے کہ آیت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وحدت الوہیت کی لازم ہے"۔ (۲/۴۹۶، ۴۳)۔ مولانا مودودی کی تشریح بہت مختصر ہے کہ "دو خداؤں کی نفی میں دو سے زیادہ خداؤں کی نفی آپ سے آپ شامل ہے، ..... اسی کی اطاعت پر اس پورے کارخانۂ ہستی کا نظام قائم ہے"۔(۲/۵۴۶، ۴۳۔۴۴)۔ مولانا اصلاحی کی تفسیر توضیحِ متن کی سی ہے: "یہ توحید کے حق میں خود خدا کی شہادت کا حوالہ ہے جو اس کے انبیاء اور رسولوں کتابوں اور صحیفوں کے ذریعہ سے لوگوں کو پہنچی ہے۔ فرمایا کہ اس نے لوگوں کو اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے یہی تعلیم دی ہے کہ دو معبود نہ بنانا، میں ایک ہی معبود ہوں تو مجھی سے ڈرو"۔ (۴/۴۱۷)۔ اگلی دو آیات کے حوالہ سے انہوں نے توحید کی نفسی دلیل بیان کی ہے کہ "..... اصل فطرت کے اندر صرف ایک خدا کا شعور ہے ..... جب کسی حقیقی پریشانی کا وقت آتا ہے تو یہ سارے بناوٹی دیوی دیوتا غائب ہو جاتے ہیں، صرف ایک ہی خدا باقی رہ جاتا ہے....."۔

سورۂ کہف نمبر ۱۱۰ کے حوالے سے مولانا عثمانی نے بشریتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور فضلِ الٰہی سے تمام کمالات و علوم کے عطیہ پر بحث کی ہے جو وحی کے ذریعہ عطا ہوئے ہیں "جن میں اصل اصول علم توحید ہے اسی کی طرف میں سب کو دعوت دیتا ہوں"..... اس کے بعد اہلِ ایمان کے لئے ضروری بتایا ہے کہ وہ شرکِ جلی اور شرکِ خفی سے بچتے رہیں....."(۳۹۵،۱)۔ مفتی نعیمی نے اپنے عقیدہ کے مطابق بشریتِ محمدی پر بحث کی ہے اور توحید پر کچھ نہیں لکھا (۴۸۶،۱)۔ مولانا تھانوی نے توحید کی زیادہ تشریح کی ہے: "..... اس کے کمالات تو غیر متناہی ہیں اور کوئی معبود تراشیدہ ایسا ہے نہیں۔ پس الوہیت و ربوبیت اسی کے ساتھ مختص ہوئی..... میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں..... میرے پاس بس یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے..... بلکہ توحید خود دلائل عقلیہ سے بھی ثابت ہے....." (ا۔۸/۶۔۱۳۷)۔ مولانا دریابادی نے زیادہ بحث وحی آنے سے اور شرک کی اقسام ..... جلی اور خفی..... سے کی ہے۔ "اِلٰہٌ..... وَّاحِدٌ" کے باب میں بس یہ لکھا ہے کہ "میرا پیام تو

پیامِ توحید ہی ہے"۔ (تفسیر ماجدی، تاج کمپنی لمیٹڈ ایڈیشن لاہور۔کراچی ۱۹۵۴ء، ۶۲۳/۳، ۱۹۰ / یہاں سے تاج ایڈیشن کے حوالے ہیں) مولانا مودودی نے آیتِ کریمہ کی تفسیر نہیں کی (۵۰/۳) جبکہ مولانا اصلاحی نے توضیحِ متن کے بعد آیت کے معانی بیان کر دیے (۳۳۶/۴)۔

سورۂ انبیاء، نمبر ۲۲ کی تفسیر میں مولانا عثمانی رقمطراز ہیں۔ "تعددِ الٰہ کے ابطال پر یہ نہایت پختہ اور واضح دلیل ہے جو قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کی۔۔۔ عبادت نام ہے کامل تذلل کا، اور کامل تذلل صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جا سکتا ہے جو اپنی ذات و صفات میں ہر طرح کامل ہو۔ اسی کو ہم "اللہ" یا "خدا" کہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ خدا کی ذات ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہو نہ وہ کسی حیثیت سے ناقص ہو نہ بیکار، نہ عاجز ہو نہ مغلوب، نہ کسی دوسرے سے دبے نہ کوئی اس کے کام میں روک ٹوک کر سکے۔ اب اگر فرض کیجئے آسمان و زمین میں دو خدا ہوں تو دونوں اسی شان کے ہوں گے۔ اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور علویت و سفلیت کی تدبیر دونوں کے کلی اتفاق سے ہوتی ہے یا گاہ بگاہ باہم اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔ اتفاق کی صورت میں دو احتمال ہیں یا تو اکیلے ایک سے کام نہیں چل سکتا تھا اس لئے دونوں نے مل کر انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی کامل قدرت والا نہیں، اور اگر تنہا ایک سارے عالم کا کامل طور پر سرانجام کر سکتا تھا تو دوسرا بیکار ٹھہرا حالانکہ خدا کا وجود اسی لئے ماننا پڑا ہے کہ اس کے مانے بدون چارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اختلاف کی صورت فرض کریں تو لامحالہ مقابلہ میں یا ایک مغلوب ہو کر اپنے ارادہ اور تجویز کو چھوڑے گا، وہ خدا نہ رہا اور یا دونوں بالکل مساوی و متوازی طاقت سے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ارادہ اور تجویز کو عمل میں لانا چاہیں گے۔ اول تو (معاذ اللہ) خداؤں کی اس رسہ کشی میں سرے سے کوئی چیز موجود نہ ہو سکے گی اور موجود چیز پر زور آزمائی ہونے لگی تو اس کشمکش میں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گی۔ یہاں سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر آسمان و زمین میں دو خدا ہوتے تو آسمان و زمین کا یہ نظام کبھی کا درہم برہم ہو جاتا، ورنہ ایک خدا کا بیکار یا ناقص و عاجز ہونا لازم آتا ہے جو خلافِ مفروض ہے"۔ (۴۱۹، ۵)۔

مفتی نعیمی کی تشریح توحید نسبتاً مختصر ہے "۔۔ اگر ایسے چند خدا مانے جائیں جیسے مشرکین مانتے ہیں تو یہ مجبور محض ہیں اور مجبور و بے خبر کی الوہیت سے عالم تباہ ہو جائے گا جیسے غافل بادشاہ کی سلطنت سے ملک برباد ہو جاتا ہے۔ اور اگر حقیقی قدرت و علم والے چند الٰہ ہوں تو یا اگر وہ دونوں متفق ہو کر عالم کا کام چلائیں تو ایک معلول کے لئے دو مستقل علتیں لازم آویں گی۔ یہ محال بالذات ہے۔ اور اگر وہ دونوں الٰہ مختلف ہوں تو اجتماع ضدین بلکہ اجتماع نقیضین لازم آوے گا۔ یہ تمام چیزیں محال بالذات ہیں۔ خزائن العرفان"۔ (۵۱۵، ۹)

مولانا تھانوی نے گذشتہ آیاتِ کریمہ سے ربط دے کر ظاہر کیا کہ آسمان و زمین وغیرہ کی تخلیق ہی "ہمارے واحد ہونے پر ہماری مصنوعات دلالت کر رہی ہیں۔۔۔ یہ اعظم دلالت علی التوحید ہے"۔ آیتِ کریمہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ "زمین میں یا آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود واجب الوجود ہوتا تو دونوں کبھی کے درہم برہم ہو جاتے کیونکہ عادۃً دونوں کے ارادوں اور افعال میں تزاحم ہوتا اور اس کے لئے فساد لازم ہے لیکن فساد واقع نہیں ہے اس لئے تعددِ آلہہ بھی منتفی ہے۔۔۔" (۲/۷، ۴۳)۔ مابعد آیات سے بھی ربط دیا ہے۔ مولانا

مودودی نے اسے سادہ اور گہرا استدلال بتانے کے بعد نظام کائنات کے چلنے سے بحث کی ہے اور "نظم کا وجود خود ہی ناظم کی وحدت کو مستلزم ہے۔ قانون اور ضابطہ کی ہمہ گیری آپ ہی اس بات پر شاہد ہے کہ اختیارات ایک ہی حاکمیت میں مرکوز ہیں اور وہ حاکمیت مختلف حاکموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے"۔ (مزید تشریح کے لیے بنی اسرائیل حاشیہ نمبر ۴۷ کا حوالہ بھی دیا ہے) (۱۵۳/۳، ۲۲)۔ جبکہ مولانا اصلاحی نے دوسری آیات سابقہ و لاحقہ کے حوالے سے توحید کا اثبات کیا ہے لیکن آیتِ کریمہ زیر بحث پر کلام نہیں کیا۔(۱۳۵/۵)۔ مولانا مودودی کی تفسیر خاصی مفصل ہے۔ اس کے بنیادی نکات ہیں (۱) "خدا کے تصور و تعریف ہی میں یہ امر داخل ہے کہ وہ مطلق الارادہ و مطلق الاختیار اور مالکِ کل ہو۔۔۔ (۲) تصادم و تزاحم بہرحال دو خداؤں کے درمیان ناگزیر ہے، اور کائنات کی تنظیم و ترتیب کا مشاہدہ خود اس تصادم و تزاحم کی تکذیب کر رہا ہے، سو اس نظام کائنات کا وجود جسکے آگے بشری صناعوں کی صناعیاں گرد ہیں، دلیل قاطع ہے توحیدِ صانع عالم پر۔۔۔ متکلمین نے۔۔۔ اس دلیل کو برہان تمانع کا لقب دیا ہے۔۔۔(۲۶۰/۳، ۲۷)

سورۂ انبیاء نمبر ۱۰۸ کے حوالے سے تمام اردو مفسرین کرام نے کوئی خاص تشریح توحید نہیں کی ہے۔ (عثمانی، ۴۲۸، ۱۰) نعیمی، ۵۲۸، ۳، تھانوی ۲۔۷/۵۹۶۰، دریابادی ۶۷۳/۴ (تاج طبع)، مودودی ۱۹۲/۳، ۱۰۱، اصلاحی ۱۹۹/۵) جبکہ سورۂ حج نمبر ۳۴ کی تفسیر میں سب پر قربانی بنام الٰہی کرنے اور غیراللہ کے نام سے نہ کرنے کا مفہوم غالب ہے۔ (عثمانی ۴۳۵، ۲)، نعیمی ۵۳۵، ۱۱، تھانوی ۲۔۷/۴۲، دریابادی، ۲۸۳/۴، ۵۳۔۵۵، مودودی، ۶/۳ـ۲۲۵، اصلاحی، ۲۴۸/۵ "معبود ہم سب کا ایک ہی ہے تو اس کی قربانی اور عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ بناؤ بلکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرو۔ یہی حوالگی قربانی کی اصل روح ہے"۔ مولانا مودودی کے ہاں بھی عبادت کے خالص ہونے پر زیادہ زور ہے۔

سورۂ عنکبوت نمبر ۴۶ کی تفسیر توحید میں اردو مفسرین نے کچھ زیادہ کلام نہیں کیا۔ مسلمانوں کی توحید پرستی اور اہلِ کتاب کی تعدد پرستی پر کلام ہے یا طریقۂ تبلیغ و دعوت پر۔ توحید میں صرف توضیحِ مطلب کا انداز پایا جاتا ہے کہ وہ اللہ واحد ہے اور لاشریک۔ (عثمانی ۵۲۲، ۷، نعیمی ۶۴۱، ۹، تھانوی ۳۔۸/۳۵، ۱۳، دریابادی، ۸۱۹/۵، ۵۶، مودودی ۳/ ص ۹-۷۰، ۸۳، اصلاحی ۵۵/۶ـ۵۴)۔

"الٰہ واحد" پر مشتمل دوسری آیاتِ کریمہ جیسے صٰفّٰت نمبر ۴، ص نمبر ۵، نمبر ۶۵، زمر نمبر ۴، غافر نمبر ۱۶ اور فصلت نمبر ۶ میں مذکورہ بالا اردو مفسرین کا انداز یہ ہے کہ وہ توضیحِ متن کا انداز اختیار کرتے ہیں یا آیاتِ کریمہ میں وارد معاملات و امور سے توحید پر دلیل لاتے ہیں یا توحید پر دوچار جملے لکھ دیتے ہیں جو پہلے ہی دوسرے سیاق و سباق میں آچکے ہیں۔ ان میں بالعموم کوئی نئی بات، نئی دلیل نہیں ہوتی۔ (عثمانی ۵۷۸، ۹، ۵۸۷، ۷، ابوطالب سے مکالمہ نبوی، ۵۹۳، ۵۹۴، ۷، ۶۰۷، ۸، ۶۱۸، ۸، نعیمی ۷۱۱، ۱۱، ۷۲۳، ۵، قبول اسلام عمر و مکالمہ بہ ابوطالب، ۷۲۹، ۹، ۲_۷۳۱، ۱، ۷۳۸، ۱ـ ۷۶۱، ۷، تھانوی ۲_۹/۳۰_۱۱۹، ۲_۱۰/۲_۱، ۱۲، ۱۵، ۳۶، ۵۰۔

دریابادی ۸۹۳/۶، ۱، ۹۰۷، ۷، ۹۱۵، ۵۹، ۹۱۸، ۲، ۹۳۸، ۱۷، ۹۵۳، ۵۔ مودودی، ۲۰۸/۴، ۲۰، ۳۲۰، ۷، ۳۲۶، ۳۵۷، ۹، ۳۹۹، ۴۴۱، ۶۔ اصلاحی: ۵۳/۶، ۳۵۳، ۳ـ۵۱۳، ۸ـ۵۴۷، ۵۶۳، ۲۶/۷، ۳۵، ۸۰ـ۷۹۔

سورۂ اخلاص کو بالعموم سورۂ توحید کہا گیا ہے اور ہر مفسر نے اس کی مختصر یا مفصل تفسیر کر کے حقیقتِ توحید اجاگر کی ہے۔ مولانا عثمانی کا بیان ہے کہ "...... وہ ایک ہے جس کی ذات میں کسی قسم کا تعدد و تکثر اور دوئی کی گنجائش نہیں، نہ اس کا کوئی مقابل نہ مشابہ، عقائد مجوس و ہنود کا رد کرنے کے بعد "صمد" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں اور وہ ہی ہے جس کی بزرگی اور فوقیت تمام کمالات اور خوبیوں میں انتہا کو پہنچ چکی ہے اور وہ وہی ہے جو کھانے پینے کی خواہشات سے پاک ہے اور وہ ہی ہے جو خلقت کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہنے والا ہے..... نہ اس کی کوئی اولاد نہ وہ کسی کی اولاد اور اس کا کوئی جوڑ نہیں نہ ہمسر"۔ (۷۹۱، ۹۔۲)۔ مولانا نے دوسرے عقائد کی بھی تردید کی ہے۔ مفتی نعیمی کی تشریحِ توحید یہ ہے کہ "حقیقتاً کہ نہ اس کے اجزا ہیں، نہ کوئی اس کا قسیم و شریک نہ مثل..... ہر چیز سے غنی کہ نہ کھائے نہ پیئے نہ کسی کام میں کسی کا حاجتمند..... (اولاد حادث و ہم جنس سے محفوظ و منزہ) اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی، نہ ذات میں نہ صفات میں، کیونکہ وہ واجب ہے خالق ہے باقی سب ممکن، مخلوق اور حادث ہیں۔ اس کے صفات ذاتی، قدیم، غیر محدود، مخلوق کے صفات عطائی، حادث اور محدود"۔ (۹۶۵۔۵۔۱)۔

مولانا تھانوی کی تفسیر سورۂ اخلاص بہت مختصر ہے۔ "..... وہ یعنی اللہ اپنے کمالِ ذات اور صفات میں ایک ہے۔ کمالِ ذات یہ ہے کہ واجب الوجود ہے اور کمالِ صفات یہ کہ علم و قدرت وغیرہ اس کے قدیم اور محیط ہیں اور اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب محتاج ہیں۔ اس کے اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے....." پھر منکرین توحید کی کئی قسمیں بیان کر کے سب کی تردید کی ہے۔ (۲۔۱۲/۲۵۔۱۲۴)۔

مولانا دریابادی نے متقدمین و متاخرین مفسرین کے اقوال کے ساتھ سورۂ اخلاص میں موجود الٰہی توحید کی تفسیر کی ہے "ذات و صفات سب کے لحاظ سے واحد و یکتا۔ نہ عدد میں دو، نہ اس کا کوئی اقنوم، نہ اس کا کوئی مظہر یا اوتار، نہ اس کا کوئی مثل و نمونہ۔ یعنی "هُوَ الْوَاحِدُ الْأَحَدُ الَّذِي لَا نَظِيْرَ لَهُ وَ لَا وَزِيْرَ وَ لَا نَدِيْدَ وَ لَا شَبِيْهَ وَ لَا عَدِيْلَ۔ (ابن کثیر) ..... لفظ "اَحَد" کا استعمال عربی میں مختلف موقعوں پر ہوتا رہتا ہے۔ جب صیغۂ اثبات میں اور صفتِ مطلق کی طرح پر آتا ہے تو اس کا اطلاق بجز حق تعالیٰ کے اور کسی پر جائز نہیں کہ صرف وہی اپنی ذات و صفات میں بے نظیر و بے ہمتا ہے۔ وَ الثَّالِثُ اَنْ يُسْتَعْمَلَ مُطْلَقًا وَصْفًا وَ لَيْسَ ذٰلِكَ اِلَّا فِيْ وَصْفِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (راغب)"۔ اسی مفہوم کی عربی عبارت ابن کثیر سے نقل کیے۔ "کل لغت کا بیان اس باب میں بالکل واضح و صریح ہے کہ یہ اسم صرف ذاتِ حق کے ساتھ مخصوص ہے اور صفتِ احدیت صرف اسی کے حق میں آ سکتی ہے"۔ یہ معنی تاج سے مع عربی عبارت نقل کیے ہیں اور تفسیر کبیر سے بھی..... "اس کا بجائے "الاحد" کے صیغہ نکرہ میں آنا اظہار عظمت کے لئے ہے"۔ (کبیر)۔ امام رازی سے کئی اقتباس دیے ہیں اور دوسری آیاتِ کریمہ کی تفسیر میں اسی طرح توحیدِ الٰہی کا رخ زریں اجاگر کیا ہے۔ (تفسیر ماجدی، تاج طبع ۷/۱۲۱۳، ۳۔۱)۔ مولانا دریابادی نے صاحبِ تفسیر کبیر کا قول نقل کیا ہے، "جس طرح سورۃ الکوثر شانِ رسالت میں جامع ہے اسی طرح سورۃ الاخلاص شانِ توحید میں جامع ہے۔ سورت کا نام سورۃ الاخلاص ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ یہ سورت ایک ثلث

قرآن ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ توحیدِ ذاتی، توحیدِ صفاتی و توحیدِ افعالی کی جامعیت و استقصاء کے لحاظ سے یہ سورت اپنی نظیر بس آپ ہی ہے"۔

سورۂ اخلاص کی تفسیر میں مولانا مودودی کی تشریح توحید یہ ہے "وہی ہستی ہے جس کو تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔۔۔ جسے تم خود اپنا اور ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق اور مدبر و منتظم مانتے ہو اور سخت وقت آنے پر جسے دوسرے سب معبودوں کو چھوڑ کر پکارتے ہو"۔ مولانا موصوف نے اس آخری نکتہ کے متعلق متعدد سورتوں کی ہم معنی آیاتِ کریمہ سے استشہاد کیا ہے۔ پھر لکھا ہے "وہی میرا رب ہے جس کی بندگی کی طرف میں تمہیں بلاتا ہوں۔ اس جواب میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ کمالیہ آپ سے آپ آ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ بات سرے سے قابلِ تصور ہی نہیں ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والا، اسکا انتظام اور اس کے معاملات کی تدبیر کرنے والا، اس میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کو رزق دینے والا، اور مصیبت کے وقت اپنے بندوں کی مدد کرنے والا زندہ نہ ہو، سنتا اور دیکھتا نہ ہو، قادرِ مطلق نہ ہو، علیم و حکیم نہ ہو، رحیم اور کریم نہ ہو اور سب پر غالب نہ ہو"۔۔۔ اللہ ہے، یکتا ہے۔۔۔ ایک ہے۔۔۔" مولانا نے "اَحَدٌ" کے معنی و مفہوم کو کلامِ عرب اور لغت وغیرہ کے لحاظ سے واضح کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "۔۔۔نزولِ قرآن کے بعد یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے استعمال کیا گیا ہے، دوسرے کسی کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس غیر معمولی طرزِ بیان سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یکتا و یگانہ ہونا اللہ کی خاص صفت ہے۔ موجودات میں سے کوئی دوسرا اس صفت سے متصف نہیں، وہ ایک ہے، کوئی اس کا ثانی نہیں۔۔۔ وہی اکیلا رب ہے، کسی دوسرے کا ربوبیت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور چونکہ الٰہ (معبود) وہی ہو سکتا ہے جو رب (مالک و پروردگار) ہو اس لئے الوہیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔۔۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہی تنہا کائنات کا خالق ہے، تخلیق کے اس کام میں کوئی اور اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اکیلا مالک الملک ہے، نظامِ عالم کا مدبر و منتظم ہے، اپنی مخلوقات کا رزق رساں ہے۔۔۔ (۱) وہی ایک خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اس سے پہلے کوئی خدا تھا، نہ اس کے بعد کوئی خدا ہو گا۔ (۲) خداؤں کی کوئی جنس نہیں ہے جس کا وہ فرد ہو، بلکہ وہ اکیلا خدا ہے اور کوئی اس کا ہم جنس نہیں۔ (۳) اسکی ذات محض واحد نہیں بلکہ اَحَد ہے جس میں کسی حیثیت سے بھی کثرت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ اجزاء سے مرکب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل اور صورت رکھتا ہو۔ جو کسی جگہ میں رہتا ہو یا کوئی چیز اس کے اندر جگہ پاتی ہو، جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضاء ہوں، جس کی کوئی سمت اور جہت ہو اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے بالکل پاک اور منزہ وہ ایک ہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے احد ہے۔۔۔" پھر واحد کا عربی میں معنی و مفہوم اور اَحَد سے اس کے فرق کو واضح کیا ہے کہ "اَحَد" میں اس کی وحدانیت ہر لحاظ سے کامل ہے"۔ مولانا موصوف نے دوسری آیاتِ کریمہ سورۂ اخلاص کی تفسیر بھی بہت مفصل کی ہے اور ان سب کا استدلال یہ بتایا ہے کہ "وہ احدیت میں یکتا اور وحدانیت میں فرد ہے"۔ (تفہیم القرآن ۶/۴۴۳-۵۳۵)۔ اردو میں سورۂ اخلاص کی یہ شاید سب سے زیادہ مفصل تفسیر ہے۔

مولانا اصلاحی کی تفسیر سورۂ اخلاص میں توحیدِ الٰہی سے متعلق اہم نکات یہ ہیں: "هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ" میں "ھو"

ضمیر شان ہے۔ اللہ اسم ذات ہے، اہل لغت نے "واحد" اور "احد" میں یہ فرق کیا ہے کہ "احد" وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو۔ اور "واحد" وہ ہے جس کی صفات میں کوئی اس کا شریک نہ ہو۔ غالباً اسی وجہ سے لفظ "احد" اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے صفت کے طور پر نہیں آیا ہے۔ اس سے یکتائی و بے ہمگی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے، ہر رشتہ و قرابت سے پاکی و برتری اس کا لازمہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ قدیم ہے اور باقی سب حادث و مخلوق۔ ظاہر ہے کہ جو سب سے پہلے خود بخود تھا وہ ہمیشہ سے تھا کیونکہ جو کبھی نیست رہا ہو وہ خود ہرگز ہست نہیں ہو سکتا..... وہ ہمیشہ سے ہے..... اس کے سوا جو بھی ہیں وہ سب اسی کی مخلوق ہیں.... پس یہ کہنا کہ وہ احد ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ وہ قدیم لم یزل و خالق کل ہے"۔ مولانا اصلاحی نے دوسری آیاتِ سورۂ ہذا سے بھی توحید کے معانی نکالے ہیں۔ صمد میں وہ مرجع خلائق ہونے کے سبب احد ہوا۔ "لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ" میں "خدا کی یکتائی اور بے ہمگی کی حقیقت بے نقاب کر دی ہے۔ "وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ" کوئی اس کے جوڑ کا نہیں، سب مخلوق وہ خالق، سب محتاج وہ غنی، سب فانی اور وہ تنہا باقی...." (تدبر قرآن، ۹/۵۲۔۶۳۸)۔

توحید

(Vision of Islam) کے مصنفین ڈاکٹر ولیم سی چیٹک اور مادم ساچیکو مراتا State University of New York کے Religous Studies Department میں اسلام کا مضمون پڑھاتے ہیں۔ ان کے طالب علموں کا تعلق دنیا کے مختلف خطوں سے ہے جن میں امریکہ، چین، انڈونیشیا، البانیہ اور مراکو شامل ہیں۔ ان طلباء میں بعض غیر مسلم بھی ہوتے ہیں جو اسلام کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان طالب علم بھی مختلف وجوہات کی بنا پر اسلام کے بارے میں مزید جاننا چاہتے ہیں۔ بعض طالب علم اور ان کے والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو اسلام کے بارے میں آگاہی ہو تاکہ وہ امریکی معاشرے کی خرابیوں سے بچ سکیں۔

مصنفین کے خیال میں ہم اسلامی تعلیمات کے ذریعے پوری انسانیت کو درپیش بہت بڑے بڑے سوالات کا جواب دے سکتے ہیں۔

Vision of Islam جدید دور کی ایک اہم کتاب ہے جس میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے بارے میں مدلل اور اچھوتے انداز میں جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام کا مضمون پڑھاتے ہوئے ان کو امریکی معاشرے کی بے باکی اور لاعلمی دونوں کا سامنا رہا۔ اس کتاب سے ہم اس حصے کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جس کا تعلق توحید سے ہے۔

(ادارہ)

توحید

مصنفین: ڈاکٹر ولیم سی چیٹک
ساچیکو مراتا

مترجم: محمود عالم قریشی

پہلی شہادت

شہادت دو حصوں پر مشتمل ہے جن کو ہم شہادتِ اول اور شہادتِ ثانی کہہ سکتے ہیں۔ شہادتِ اول کے ذریعہ گواہی دی جاتی ہے "کوئی الہٰ نہیں سوائے اللہ کے" اور شہادتِ ثانی تصدیق کرتی ہے کہ "محمدؐ اللہ کے رسول ہیں"۔ پہلی شہادت توحید ظاہر کرتی ہے جبکہ دوسری نبوت کی بات کرتی ہے۔

مسلمانوں کے لئے شہادت اول وسیع تر معنی میں اسلام کا اظہار ہے۔ یہ توضیح کرتی ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کے تابع ہے۔ محدود معنی میں یہ تمام انبیاء کے لائے ہوئے مذہب اسلام کو ظاہر کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی سب سے واضح آیت ہے:

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ (الانبیاء : ۲۵)

ترجمہ: ہم نے تم سے پہلے کبھی کوئی پیغمبر نہیں بھیجا سوائے اس کے کہ ہم نے اسے یہ کہہ کر بشارت دی کہ میرے سوا کوئی الہٰ نہیں لہذا میری عبادت کرو۔

تمام پیغمبر توحید ہی کے ساتھ مبعوث ہوئے۔

غیر مسلموں کے لئے ابتداءً شہادت اول کی عالمگیر حیثیت کو سمجھنا مشکل ہے۔ ایک مشکل تو تصورِ الہٰ اور اللہ کی ہے۔ جب وہ سنتے ہیں "کوئی الہٰ نہیں سوائے اللہ کے"۔ وہ لوگ عام طور پر درست سوچتے ہیں جب وہ اُس معبود پر یقین نہیں رکھتے جس کو وہ سمجھنے لگے ہوں کیونکہ وہ اس حقیقت سے بہت دور ہے جس کی طرف شہادت اول اشارہ کرتی ہے، لہذا ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اسلامی تصورِ الہٰ کو واضح کرنے کے لئے کافی تفصیل سے کام لیں۔

دوسرا مسئلہ جو غیر مسلموں کے لئے شہادت اول کی عالمگیری کو سمجھنے میں حائل ہے وہ لفظ اللہ کا عام استعمال ہے۔ جب لوگ یہ لفظ سنتے ہیں تو وہ قدرتاً سوچتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ مسلمان ایک معبود کو مانتے ہیں جس کا نام اللہ ہے۔ یعنی اللہ پر یقین رکھتے ہیں جیسے قدیم یونانی زیس کو مانتے تھے، جیسے ہندو وشنو کو مانتے ہیں

جبکہ ہر قبیلہ کا اپنا ایک الہ ہے۔ اللہ کے متعلق اسی اصطلاحی تناظر میں سوچنے کا مطلب ہے جیسے یہود اور عیسائی اللہ ہی کو مانتے ہیں مسلمانوں کا اپنا ایک الہ ہے یہ الہ کا غلط تصور ہے۔

عربی زبان میں اللہ کے معنی صرف خدا ہیں۔ قرآن و حدیث اور تمام اسلامی روایات یہی بتاتی ہیں کہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا ایک ہی واحد معبود ہے۔ عربی بولنے والے مسلمان، عیسائیوں اور یہودیوں کے معبود کے حوالہ سے اللہ کے لئے کوئی دوسرا لفظ استعمال کرنے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ عربی بولنے والے عیسائی اور یہودی بھی خود جس الہ کی پرستش کرتے ہیں اس کے لئے لفظ اللہ ہی استعمال کرتے ہیں۔

انگریزی زبان میں شہادت اول پر مباحثوں میں لفظ "اللہ" کا استعمال خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اگر اس کا ترجمہ "کوئی الہ نہیں سوائے اللہ کے" کیا جائے تو یہ اس جملہ سے مختلف مضمرات رکھتا ہے۔ "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے"۔ مثلاً یہ دعویٰ قطعی غیر معقول نہیں لگتا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے سکھایا کہ "کوئی الہ نہیں سوائے اللہ کے"۔ لیکن یہ کہنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ وہ تبلیغ کرتے رہے کہ "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے"۔ انگریزی قارئین جو اسلام سے ناواقف ہیں قدرتاً یہ سمجھنے کی طرف راغب ہوتے ہیں کہ اللہ ایک قسم کا نقلی اور بدیسی خدا ہے کچھ اسی طرح کا جیسے وہ جس کو غیر اہل کتاب اور دوسرے کافر (جیسے جن بھوت) پوجتے ہیں۔

بعض مسلمان جب انگریزی بولتے ہیں تو بہت سی وجوہ کی بنا پر لفظ اللہ کے استعمال پر اصرار کرتے ہیں۔ اولاً قرآن میں یہ خدا کا حقیقی نام ہے۔ لہٰذا خود اس لفظ کی خاص برکات ہیں۔ دوم، بیشتر مسلمان جو انگریزی بولتے ہیں وہ پیدائشی انگریزی بولنے والے نہیں ہوتے۔ ساتھ ہی ان پر یہ بالکل واضح ہے کہ اسلام ہی اصل سچا مذہب ہے۔ لہٰذا وہ ان غلط فہمیوں کا تصور نہیں کر سکتے جو پیدائشی انگریزی بولنے والے غیر مسلموں کے ذہنوں میں لفظ "اللہ" کہنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ سوم، بہت سے مسلمان اپنے دین کے علم پر عبور نہیں رکھتے، پس وہ سوچتے ہیں کہ اللہ ہی اصل خدا ہے اور انگریزی میں لفظ گاڈ (god) یا خدا ایک جھوٹے معبود سے منسوب ہے۔

اللہ

اسلام میں ایمان کا پہلا عقیدہ اللہ ہے۔ لیکن اللہ کون ہے، کیا ہے؟ عملاً تمام مسلم علماء دعویٰ کرتے ہیں کہ لفظ "اللہ" کی صحیح فہم بغیر ربانی انکشاف کے ناممکن ہے۔ دوسرے الفاظ میں اللہ کو چاہیے کہ وہ خود لوگوں کو بتائے کہ وہ کون ہے۔ تاہم دوسرے لوگوں کا سمجھنا خاصا مشکل ہے اور تقریباً ناممکن حتیٰ کہ وہ بول کر اپنے مدعا کا اظہار کریں۔ ہم لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں۔ لیکن اللہ ہماری حد بصر سے دور ہے۔ اگر ہم سمجھنا چاہیں کہ اللہ کون ہے تو وہ خود ہم کو بتائے۔ اللہ لوگوں سے پیغمبروں کے ذریعہ گفتگو کر کے بتاتا ہے کہ وہ کون ہے۔ اس کے الفاظ الہامی کتب میں ضبط ہیں۔ جو چیز مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا نبی اور قرآن کو اس کا پیغام مانتے ہیں۔ تمام پیغمبروں کا بنیادی پیغام ایک ہی ہے۔ "کوئی الہ نہیں سوائے اللہ کے"۔ مختصراً مسلمان خیال کرتے ہیں کہ لفظ اللہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو خود قرآن کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔

ظاہر ہے اللہ کو سمجھنے کے لئے پہلا قدم قرآن کو سمجھنا ہے۔ لیکن سمجھنے کے لئے قرآن کوئی آسان کتاب نہیں۔ بلامبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان گذشتہ چودہ سو سال سے قرآن کی تشریح کرتے چلے آ رہے ہیں اور

وہ تاحال اس کے معنی کی تہہ تک نہیں پہنچے۔ دوسرے الفاظ میں آپ اللہ کے متعلق جتنا کچھ بھی کہیں پھر بھی بہت کچھ کہنا باقی رہتا ہے۔

بعض ان چیزوں کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے جو قرآن اللہ کے متعلق کہتا ہے ہم عربی الفاظ الٰہ اور اللہ پر نظر ڈال لیں۔ عربی لغت ہمیں بتاتی ہے کہ الٰہ کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے جس کو پرستش، عزت اور معاونت کے لئے اپنایا جائے۔ قرآن اس لفظ کو مثبت اور منفی دونوں معنی میں استعمال کرتا ہے یعنی وہ اصلی خدا اور بناوٹی خداؤں کو اسی ایک لفظ سے ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً قرآن کی ان آیات میں یہ لفظ مثبت معنی میں استعمال ہوا ہے:

وما من الٰہ الا الٰہ واحد ط (مائدہ ۷۳)

ترجمہ کوئی معبود نہیں سوائے ایک معبود کے۔

انما اللہ الٰہ واحد ط (النساء ۱۷۱)

ترجمہ معبود بس ایک ہی ہے۔

اور فالٰہکم الٰہ واحد فلہ اسلموا ط (الحج: ۳۴)

ترجمہ سو تمہارا معبود ایک ہے پس اس کی اطاعت کرو۔

قرآن لفظ الٰہ منفی معنی میں بھی استعمال کرتا ہے یعنی ایک خودساختہ جھوٹے خدا یا بتوں کے لئے۔ مثلاً قرآن میں بنی اسرائیل سے حالات اور سونے کے بچھڑے کے احوال میں لوگ حضرت موسیٰ سے کہتے ہیں

قالوا یٰموسی اجعل لنا الٰھا کما لھم الھۃ ط (الاعراف ۱۳۸)

ترجمہ یا موسیٰ ہمارے لئے ایک معبود بنا دے جیسے ان کے معبود ہیں۔

جواب میں حضرت موسیٰ کہتے ہیں

قال اغیر اللہ ابغیکم الٰھا (الاعراف ۱۴۰)

ترجمہ: کیا! میں تمہارے لئے کوئی معبود اللہ کے سوا تلاش کروں؟

لفظ الٰہ کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ "کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ کے" کا مطلب ہے کہ تمام الٰہ جن کی پرستش لوگ اللہ کے سوا کرتے ہیں جھوٹے ہیں۔

قرآن الٰہ کو دوسرے منفی مفاہیم میں بھی استعمال کرتا ہے۔ بہرحال خدا (الٰہ) کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے جس کی پوجا اور خدمت کی جائے خواہ وہ چیز کچھ بھی ہو۔ یہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ معبود صرف وہ چیز ہی ہے جس کی خدمت کی جائے کیونکہ لوگوں کے بہت سے معبود ہو سکتے ہیں۔۔۔ قرآن اکثر ان کے اس عمل پر اعتراض کرتا ہے۔ جب ہم سوچنے کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ خدا ایسی ہستی ہے جو موجود ہے، وہ آسمانوں میں ہے۔ کوئی ہم سے بالاتر ہستی۔ مگر عربی لفظ الٰہ یہ وسعت پوری نہیں کرتا۔ آپ کاملاً ایک ایسے خدا کی پرستش کر سکتے ہیں جو آپ کے اندر ہے یا آپ سے کمتر ہے۔

قرآن سختی سے ان لوگوں پر نکیر کرتا ہے جو اپنے میلانات و جذبات کی پوجا خدا کی طرح کرتے ہیں۔ جو لفظ وہ استعمال کرتا ہے "ہویٰ" ہے جس کا ترجمہ ہم "خواہش نفس" کرتے ہیں۔ اس لفظ کے مطابق اس کے لغوی معنی آندھی یا جھکڑ ہیں۔ ایک اندرونی آندھی جو کبھی ادھر اور کبھی ادھر چلتی ہے۔ ایک لمحاتی وہم۔ ایک دن آپ

ایک چیز کی خواہش کرتے ہیں اور دوسرے دن آپ کوئی اور چیز چاہتے ہیں۔ قرآن کے مطابق سب سے بدترین معبود ہے۔ جب آپ اس کی پوجا کرتے ہیں تو آپ کو قطعاً علم نہیں ہوتا کہ اب کیا بات ہونے والی ہے؟ عملاً آپ کے خیالات، احساسات اور جذبات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ ہوا چلتی رہتی ہے۔ قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اگر کوئی اس کے تابع ہو جائے تو انجام تباہی ہے۔ چند قرآنی آیات یہ بات سمجھنے میں مدد دے سکتی ہیں۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ (نازعات۔ ۴۰۔۴۱)

ترجمہ: اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا ہو اور اس نے اپنے نفس کو خواہش سے روکا ہو تو اس کا ٹھکانہ بہشت ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ (الفرقان: ۴۳)

ترجمہ: کیا تم نے دیکھا اس کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا۔

وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (القصص ۵۰)

ترجمہ: اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اپنی خواہش پر چلے، بغیر اللہ کی ہدایت کے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (الجاثیہ ۲۳)

ترجمہ: بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا حاکم اپنی خواہش کو ٹھیرا لیا اور اللہ نے اس کو راہ سے بھٹکا دیا باوجود اس کے علم کے۔

قرآن ھوی (خواہش) کے معنی میں الہ کے جمع کے صیغہ کو بھی اسی معنی میں استعمال کرتا ہے۔ سترہ میں سے سولہ مقامات پر جہاں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس کے ساتھ فعل پیروی کرنا آیا ہے۔ جو لوگ اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں (اپنے اندر کے چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی) اور نتیجۃً ان کا اختتام دوزخ میں ہوتا ہے۔ یہ پیغام واضح ہے۔ لوگوں کو اللہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جھوٹے خداؤں کی پیروی سے بچنا چاہیئے۔ یہ ہدایت وحی کی شکل میں آتی ہے۔

یہی لفظ "خواہشات" بعد کے زمانہ میں الحاد اور فرقوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ جو لوگ فرقوں کے ارکان ہیں، اپنی خواہشات کے رخ پر چلتے ہیں اور پیغمبروں کے پیغام پر کوئی دھیان نہیں دیتے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ الہامی کتابوں کو کس طرح سمجھا جائے وہ اپنے من کی سوچ پر چلتے ہیں یا اپنے سربراہ کے توہمات پر۔ لفظ "خواہشات" کا فرقوں کے معنی میں استعمال خود لفظ زندقہ کے استعمال کے مساوی ہے۔ اس کا انگریزی متبادل (Haresy) یونانی زبان سے نکلا ہے جس کے معنی چننا ہیں۔ زندقہ ایک طریقہ ہے جسے کوئی اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنے لئے چن لیتا ہے۔

اگر الہ ایک جھوٹا یا سچا خدا ہو سکتا ہے تو اپنی تعریف کے لحاظ سے اللہ ایک سچا خدا ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز ہے جس کی پرستش کی جا سکتی ہے تو وہ اللہ ہی ہے جس کی عبادت کی جائے۔ یہ کہنا کہ "کوئی الہ نہیں سوائے اللہ کے" ظاہر کرتا ہے کہ کسی کی کوئی خدمت یا پرستش نہیں کرنا چاہیئے سوائے اللہ کے کیونکہ سوائے اس کے ہر معبود جھوٹا ہے۔

شرک:

ایمان کا پہلا اصول توحید ہے یعنی یہ اقرار کہ معبود صرف ایک ہے۔ توحید کے معنی انتہائی جامعیت کے ساتھ کلمۂ توحید میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ "کوئی الہ نہیں سوائے اللہ کے" سے مطلب یہ ہے کہ صرف ایک ہی سچی اور اہل ہستی عبادت کے لائق ہے۔ دوسرے تمام جن کی خدمت اور پرستش کی جاتی ہے جھوٹے ہیں، کسی اور کی بندگی کرنا غلطی اور گمراہی

میں مبتلا ہوتا ہے، شرک کرتا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

شرک کے معنی ہیں شریک کرنا، حصہ دار بنانا، ساجھی بنانا، کوئی ساتھی مہیا کرنا، کا رفیق بنانا۔ دینی تناظر میں شرک کے معنی نظام کائنات میں اللہ کے حصہ دار بنانا ہیں اور تاوقتیکہ اللہ کے ساتھ یا اس کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرنا۔ قرآن میں یہ لفظ بکثرت آیات میں آیا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا (النساء ٣٦)

ترجمہ بندگی کرو اللہ کی اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ O (لقمان: ٣١)

ترجمہ اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا، یقیناً شرک بھاری ظلم ہے۔

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ O (الانعام:١٩)

ترجمہ کہہ دیجئے (اے محمد) بے شک وہی ایک معبود ہے اور میں بیزار ہوں ان سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ط (الرعد: ٣٦)

ترجمہ کہہ دیجئے مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ اللہ کی بندگی کروں اور اس کا شریک نہ کروں۔

اس طرح دوسروں کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے سے اجتناب کرنا قرآنی پیغام کا مرکزی حصہ ہے کیونکہ دراصل یہ توحید کا دوسرا رخ ہے۔ یہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے کہ کلمہ توحید اسلام کا پہلا ستون ہے اور توحید بذات خود اسلام کا پہلا اصول ہے۔ آدمی یہ سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ کیوں شرک کی شدید مذمت کی گئی ہے اور کیوں قرآن کے مطابق یہ واحد ناقابل معافی گناہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ج (النساء ٤٨)

ترجمہ بے شک اللہ اس کو نہیں بخشتا جو اس کا شریک ٹھہرائے اور جس کو چاہے اس سے نیچے کے گناہ بخش دیتا ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ (المائدہ: ٧٢)

ترجمہ بے شک جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی۔

توحید کو سمجھنا اسلام کے لئے بنیادی چیز ہے لہٰذا شرک کی نوعیت پر قدرے مزید غور مفید ہوگا۔ عربی محاورہ ہے کہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہم دن کو رات کے ذریعہ سمجھتے ہیں اور رات کو دن کے ذریعہ۔ اسی طرح ہم توحید کو سمجھ سکتے ہیں اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ کیا کچھ شرک ہے۔

شرک کے لغوی معنی اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے وقت اس جرم کا شعوری احساس ہونا چاہئیے۔ ہم کس طرح کسی کا شریک ٹھہرا سکتے ہیں جب تک اس کو جانتے نہ ہوں؟ پھر یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ اگر ہم اللہ کے متعلق معلومات نہیں رکھتے اور کسی دوسری چیز کی پرستش کرتے ہیں تو ہم شرک کے مرتکب نہیں ہوتے۔ یہ ایک الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ مختلف جہت سے اس تک رسائی ہو سکتی ہے۔ بغیر نازک دینی نکات میں الجھے ہم ایک بنیادی جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

بیشتر مسلم مفکرین خیال کرتے ہیں کہ علم توحید کا تعلق بشریت کے مفہوم سے ہے۔ یہ ابتدائی بشری فطرت میں مضمر ہے کیونکہ انسانوں کی تخلیق اس علم کے ساتھ ہوئی ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں"۔ رسول ان کو اسی بات کی یاد دہانی کے لئے بھیجے گئے جس کا انہیں پہلے سے علم تھا۔ چنانچہ دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہرانا انسان کی سب سے بنیادی جبلت کی خلاف ورزی

ہے۔ یوں کہیے کہ یہ فطرتِ انسانی سے بے وفائی ہے بلکہ بشریت کی حدود سے اخراج ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اتنا شدید گناہ کیوں ہے۔ یہ تو اس چیز کو الٹ دیتا ہے جو ہم کو بشر بناتی ہے۔ اس نظریہ توحید سے [illegible] بشر نہ ہونے کے دعوی کے مترادف ہے۔ اگلے جہان میں جنت بشر کی میراث ہوگی جبکہ وہ لوگ جنہوں نے زندگی [illegible] حیثیت سے گیا لیکن بشریت کے بنیادی تقاضے کے مطابق زندگی نہ گذاری ان کا ٹھکانا۔

شرک پر بحث کرتے ہوئے ان چیزوں کی نوعیت ذہن میں رہنی چاہیے جن کو ہم خدا [illegible] شریک کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے سوا کسی مخلوق یا مجرد دغوی معنی میں بتوں کی خدمت گذاری ہی کا سوال نہیں ہے۔ [illegible] و گمان بھی ایک الٰہ ہے اور وہ جو اس کی پیروی کرتے ہیں مشرک ہیں۔ پس اپنے نظریات اور احساسات کی پیروی [illegible] ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ بتوں کی پوجا سے زیادہ سنگین شرک ہے کیونکہ بتوں کی پوجا ظاہر ہے اس [illegible] کا علاج نسبتاً آسان ہے۔ وہم و گمان کی پرستش پوشیدہ ہے اور اکثر ایسے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے جو [illegible] ہیں۔

ظاہرہ شرک کا علاج شرع کی پیروی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب لوگ اسلام [illegible] پر عمل کرتے ہیں تو وہ اللہ کی ہدایات کی پیروی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اعمال درست طور پر منظم کر دیے جاتے ہیں۔ [illegible] پوشیدہ شرک اسلام کے حدود سے متعلق نہیں بلکہ ایمان و احسان سے تعلق رکھتا ہے یعنی دوسرے اور تیسرے حد [illegible] اس کی شناخت اور علاج ظاہرہ شرک سے زیادہ مشکل ہے۔ انسان کو صرف چند ایسے اعمال کی ضرورت نہیں جن سے توحید کی ظاہرہ شکل قائم ہو بلکہ یہاں سوال اس کے اپنے خیالات، سوچ بوجھ، رویوں اور اخلاقی اقدار کو توحید کے مطابق [illegible] کا ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے [illegible] وقت تک جہاد کریں جب تک وہ اللہ کی وحدانیت کی شہادت نہ دیں۔ اور اسلام کے اس زبانی اقرار کے بعد وہ امت کے [illegible] بن جائیں۔ ان کے رکن ہونے کے اچھے معیار کی تصدیق اس وقت ہوتی ہے جب وہ اسلام کے باقی پانچ ارکان کی پیروی کرتے ہیں، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (یہاں ایک بار پھر ہم نماز کی اولین اہمیت دیکھتے ہیں) "ترک صلوٰۃ انسان کو شرک اور اخفاء حق میں مبتلا کر دیتا ہے"۔ لیکن قیام صلوٰۃ ظاہری فعل ہے یہ ہمیں بالالتزام یہ نہیں بتاتا کہ انسان کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ لوگ شرع کی پابندی کرتے ہوں تو یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ایمان ان کے دلوں میں اتر گیا ہے۔ متعدد احادیث لوگوں کے رویوں اور خیالات کے بارے میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تشویش کو ظاہر کرتی ہیں۔ آپؐ کے ایک صحابی سے روایت ہے۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکل کر ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے جبکہ ہم دجال سے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمہیں وہ بات بتاؤں جو دجال سے زیادہ خوفناک ہے؟ لوگوں نے کہا ضرور بتایئے۔ آپؐ نے فرمایا: پوشیدہ شرک! دوسرے الفاظ میں یہ کہ آدمی صلوٰۃ قائم کرے اور احسن طریقہ سے مگر ایسی ہستی کے لئے جو اسے دیکھ رہی ہے"۔

ایک اور حدیث اس کی مکمل وضاحت کر دیتی ہے کہ بت پرستی اور کفر اپنے عام معنی میں شرک کے زیر بحث نکات کو ختم کرنا شروع نہیں کر دیتے

"سب سے خوفناک چیز جس کا مجھے اپنی امت سے متعلق ڈر ہے دوسروں کو اللہ کا شریک بنانا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سورج یا چاند یا بتوں کی پرستش کریں گے، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ پوشیدہ خواہش کے ساتھ اللہ کے سوا کسی اور کے لئے عمل کریں گے"۔

مختصر یہ کہ مسلمان اللہ کو پرستش اور خدمت کے قابل واحد ہستی سمجھتے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور کی خدمت انسان کے مقصد تخلیق کے خلاف ہے۔ شرک یا دوسروں کو اللہ کا شریک بنانا صرف ایک سے زائد خداؤں کی پرستش پر ہی دلالت نہیں کرتا بلکہ اپنی خواہشات یا اللہ کی ہدایت کے علاوہ کسی چیز کی پیروی بھی ظاہر کرتا ہے۔

اشیاء کے اس پہلو تناظر میں توحید کی ایک عملی اہمیت ہے کیونکہ یہ زندگی کے روزمرہ معمولات پر حاوی ہے۔ یہ واضح کرتا ہے کہ عمل کے کیا محرکات ہونے چاہئیں۔ شرک غلط محرکات کی بنیادی وجہ ہوتا ہے۔ یہ دو یا اس سے زیادہ کو دیکھنا ہے جبکہ اصل صرف ایک ہی ہے۔ یہ ہر قسم کی گمراہی، غلطی اور خسارہ پر منتج ہوتا ہے۔

اگر توحید صرف اللہ کی عبادت اور شرک دوسرے معبودوں کی پرستش ہے تو ہم سوال کر سکتے ہیں کہ اللہ کی عبادت دوسروں کی پرستش سے بچتے ہوئے کس طرح کریں؟ بے شک پہلا جواب تو اپنے محدود معنی میں اسلام ہے یعنی شریعت، مگر شریعت صرف عمل پر منطبق ہے۔ پھر نیت، سمجھ اور رویہ کا کیا بنا؟ ان کو کیسے لگام دی جا سکتی ہے اور توحید سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟ اس قسم کے سوالات کا جواب دینے کے لئے لفظ اللہ استعمال کرتے ہوئے ہمیں موضوع کا واضح تصور ہونا چاہیے، یہی کام اس مضمون نے پیش نظر رکھا ہے۔

آیات الٰہی / اللہ کی نشانیاں

قرآن، خود نمائی کی طرف اللہ کا کلام ہے۔ اللہ قرآن میں جو کچھ فرماتا ہے وہ اس کی اپنی ذات کا اظہار ہے بالکل اسی طرح جیسے ہم گفتگو میں اپنا اظہار کرتے ہیں۔ شاید ہم ایک کردار ادا کر رہے ہوں مگر یہ کردار خود ہم نے منتخب کیا ہے اور کوئی دوسرا اسے اس طرح ادا نہیں کر سکتا جیسے ہم ادا کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارا اپنا اظہار ہوتا ہے۔

مسلم علماء جب قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہر سورہ، ہر آیت، ہر لفظ، ہر حرف کو ذات الٰہی کا اظہار سمجھتے ہیں۔ قرآن میں کوئی چیز بغیر معنویت کے نہیں ہے کیونکہ اللہ نے مکمل آگاہی کے ساتھ کلام کیا ہے۔ چنانچہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ارشاد فرما رہا ہے اور لوگ اس کے کلام کو اپنی بساط کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ اسلام میں تمام مذہبی کارگہ قطعی طور پر قرآن ہی کے گرد گھومتی ہے۔

قرآن لوگوں کو اللہ کی خبر دیتا ہے کیونکہ یہ اُن کی طرف اللہ کا مقصدی اور ارادی کلام ہے۔ قرآن میں ہر چیز ذات الٰہی کی معرفت میں مدد دینے والی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کیوں قرآن اپنے الفاظ اور جملوں کو آیات کہتا ہے:

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَ مَا یَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ○ (البقرہ ۹۹)

ترجمہ ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اتاریں، انکا انکار سوائے نافرمانوں کے کوئی نہیں کرتا۔

تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ○ (یونس ۱)

ترجمہ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں۔

تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ○ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا (یوسف ۱۔۲)

ترجمہ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں، ہم نے اس کو عربی زبان میں قرآن کے طور پر اتارا ہے۔

قرآن اللہ کی توحید بیان کرتا ہے تاہم یہ واحد کتاب نہیں جو اس کا اظہار کرتی ہے۔ دوسری الہامی کتب میں بھی یہ مرکزی موضوع ہے۔ اور اسی طرح تمام مخلوقات اپنے خالق کے وحدہٗ لاشریک ہونے کا اظہار کرتی ہیں۔ قرآن میں لفظ آیت تقریباً چار سو مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ آسمانوں اور زمین کی ہر ایسی شے کے لئے استعمال ہوا ہے جو اللہ کی

قدرت کی خبر دیتی ہے۔ تمام اشیاء اللہ کی آیات ہیں اس لئے کہ وہ مسلم ہیں، وہ اللہ کی تخلیقی قوت کے مظاہر ہیں۔ ہر بات جو صادر ہوتی ہے ہمیں عالم تخلیق میں اللہ کی فعالیت کے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتی ہے۔ آیات صرف فطری دنیا اور تاریخی واقعات ہی میں نہیں بلکہ ہمارے اندر بھی ہیں۔

وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَالنَّھَارَ اٰیَتَیْنِ (بنی اسرائیل:۱۲)

ترجمہ۔ ہم نے رات اور دن دو نشانیاں بنائیں۔

وَ اٰیَةٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ ج صلے اَحْیَیْنٰھَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْکُلُوْنَ O (یٰس ۳۳)

ترجمہ۔ اور ان کے لئے ایک نشانی مردہ زمین ہے، ہم نے اس کو زندہ کردیا اور اس میں سے اناج نکالا سو وہ اسی میں سے کھاتے ہیں۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَ اَلْوَانِکُمْ (الروم ۲۲)

ترجمہ۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے، اور تمہاری طرح طرح کی بولیاں اور رنگ۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ O ط (الشوریٰ ۳۲)

ترجمہ۔ اور اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ سمندر میں جہاز چلتے ہیں جیسے پہاڑ۔

وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ O لا وَ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط (الذریٰت ۲۰۔۲۱)

ترجمہ۔ اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے واسطے اور خود تمہارے اندر۔

قرآن آیت کے لفظ کو ایک اور معنی میں بھی استعمال کرتا ہے۔ ان معجزات اور الہامی کتب کا حوالہ دیتے ہوئے جو رسولوں کو بطور ثبوت دی گئیں کہ وہ اللہ کے پیغام کے حامل ہیں۔ اللہ کے رسول لوگوں کو تاریخی واقعات کی اہمیت بتاتے ہیں۔ تمام پیغمبر اور ان کے پیرو مسلم ہیں اسی طرح یہ اطلاعات اور غیبی سرگرمیاں اللہ کی حکمت اور قوت کی نشانیاں ہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ O ج مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا صلے فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ O (الشعرآء:۱۵۳۔۱۵۴)

ترجمہ: انہوں نے (صالحؑ) سے کہا تجھ پر تو کسی نے جادو کیا ہے، تو بھی ہم جیسا ایک آدمی ہے، سو لے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ O لا اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ (ہود ۹۶۔۹۷)

ترجمہ۔ اور ہم بھیج چکے ہیں موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور سند دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس۔

فَلَمَّا جَآءَھُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی (القصص ۳۶)

ترجمہ۔ پھر جب موسیٰ ہماری واضح نشانیاں لے کر ان کے پاس پہنچا تو وہ بولے یہ ایک باندھے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں۔

لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖٓ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ O (یوسف:۷)

ترجمہ: البتہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

قرآن اپنے الفاظ کو آیات کہتا ہے اور اصطلاحی طور پر سورتوں کے اجزا پر لاگو ہو گیا ہے۔

آیت کے محاورے بنتے ہوئے لفظ میں مضمر کسی غیر واضح چیز کو واضح کرنا اہم ہے۔ ایک نشان لوگوں کے مطالعہ کے لئے لگایا جاتا ہے۔ لوگ کوئی نشان مقرر نہیں کرتے، نہ کوئی اشارہ کرتے ہیں تاوقتیکہ وہ کوئی پیغام نہ دینا چاہتے ہوں۔ اس محاورے کا قرآنی استعمال [illegible] تین مفاہیم میں ہماری توجہ اسلام کی بنیادی بصیرت کی طرف مبذول کرتا ہے۔ ایک نکتہ جو مسلمانوں کے لئے عیاں ہے اس وقت باعث تشویش بن جاتا ہے جب غیر مسلم اس کو فوراً ذہن نشین نہیں کر پاتے۔ الہامی کتب ہم سے ایک خاص پیغام کے ساتھ براہ راست گفتگو کرتی ہیں اور اللہ ہم سے توقع رکھتا ہے کہ ہم یہ پیغام پڑھیں گے اور مناسب رد عمل [illegible] ہیں۔ جب قرآن اللہ کی آیات کا حوالہ دیتا ہے تو وہ ایک خاص انداز میں کسی ایسی چیز پر اختتام پذیر ہوتا ہے جیسے "شاید تم توجہ دو"، یا "کیا تم نہ سمجھو گے"، یا "کیا تم دیکھتے نہیں"۔ بدترین فعل جو نوع انسان کر سکتی ہے اس پیغام کو نظر انداز کرنا ہے۔ جو جدھر بھی وہ دیکھیں ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔۔۔ پیام توحید۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ۝ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ۝

ترجمہ: اور آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر ان کا گذر ہوتا رہتا ہے اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے، اور بہت لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر شرک کرتے رہتے ہیں۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ط (الم سجدہ ۲۲)

ترجمہ: اور کون اس سے زیادہ بے انصاف ہے جسے اس کے رب کی آیات یاد دلائی گئیں پھر وہ اس سے منہ موڑ لے۔

توضیح آیات:

آیات الٰہی تاریخی پس منظر میں اللہ کی خبر دیتی ہیں۔ آیات بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں، ایک پیش گویانہ، دوسری فطری۔ پیشگویانہ آیات کو زبانی اور تحریری (کتب سماوی) اور مادی (معجزات) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ فطری قسم کو بیرونی (ہمارے گرد و پیش کی دنیا، خواہ فطرت خواہ سوسائٹی) اور اندرونی (خود ہماری ذات سے متعلق) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بعض پیشگویانہ آیات کی بات ہم اس وقت کریں گے جب ہم نبوت پر بات کریں گے۔ بیرونی اور اندرونی نشانیوں پر ہم اس وقت غور کریں گے جب ہم کائنات پر انسان کے حوالے سے بات کریں گے۔ یہاں ہم صرف یہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں کہ آیات کس طرح ہمیں لفظ اللہ کے معنی سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔

اپنی تعریف کے مطابق آیات نشانات الٰہیہ ہیں۔ اگر ہم آیات کو سمجھ لیں تو ہم اللہ کو کسی قدر سمجھیں گے۔ آیات کے پیغام کو ذہن نشین کرنے کے لئے ایک طریقہ تو دنیا کی فطری نشانیوں کو دیکھنا اور ان کی زبان سمجھنا ہے۔ ایک طرح سے یہی جدید سائنس کر رہی ہے، یہ فطرت کے پیغام اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تاہم سائنس کے بعض مفروضات فطرت کی اصلیت سے متعلق ہیں یوں یہ اللہ کے سوال کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور اس کو سائنسی کار عظیم کے لئے غیر متعلق ٹھہراتی ہے۔

فطری دنیا کے بارے میں اسلامی عام طرز فکر اور سائنس کا بنیادی فرق یہ ہے کہ مسلمان اس یقین و ایمان سے شروع کرتے ہیں کہ "کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ کے"۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان پہلے ہی جانتے ہیں کہ آیات، آیات الٰہی ہیں مگر وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اللہ کیا فرما رہا ہے۔ سائنسدان محسوس کرتے ہیں کہ مظاہر قدرت کو سمجھنے کے لئے اس بات سے

کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی اللہ ہے بھی یا نہیں۔ نتیجہ یہ کہ دو مختلف نظریات ہیں جن کو آسانی سے [illegible] نہیں کیا جاسکتا۔

اس مسئلہ کو مزید آگے بڑھائے بغیر ہم سائنسی اور اسلامی نظریہ اشیاء میں ایک [illegible] ہیں۔ اکثر لوگ ایک نقش مصوری کو دیکھتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مصور کیا کہنا چاہتا ہے۔ [illegible] متعلق آراء مختلف ہوتی ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ نقش میں مصور کوئی پیغام [illegible] ہے۔ ہم نقش کا مطالعہ ایک درجن مختلف سائنسی نظریات سے بھی کرسکتے ہیں۔ ہم کینوس، روغن اور رنگ کا تجزیہ [illegible] کے درمیان اقلیدسی تعلق وغیرہ کا بھی۔ اس کام کے لئے ہم طبعیات، کیمیا، حیاتیات، اقلیدس اور [illegible] بحث [illegible] ہیں مثلاً عمرانیات، تاریخ اور نفسیات وغیرہ۔ یہ سب درست اور ان طریقوں سے چیزوں کو دیکھنے اور [illegible] دیکھنے میں کوئی تضاد نہیں۔ لیکن فرض کیجئے سائنسدانوں کا ایک گروہ یہ دعویٰ کرنا شروع کردیتا ہے کہ نقش [illegible] میں آ گیا ہے اور یہ کسی مصور کی کارگزاری نہیں اور اگر کوئی تھا بھی تو اس کے پاس پیغام دینے کے لئے کچھ نہ تھا، وہ محض [illegible] بکھیر رہا تھا اور اگر اس کا کوئی پیغام تھا بھی تو ہمارے پاس اس کے ادراک کا کوئی ذریعہ نہیں۔

مسلمانوں کے لئے توحید کا ثبوت چیزوں کے اپنے مقام میں ہے جیسے اکثر لوگوں [illegible] اس کے پیغام کا ثبوت اس کے نقش کے وجود میں ہے۔ روایتی مسلمانوں کے لئے آشکارا ہے کہ اللہ نے کائنات کو [illegible] جیسی وہ ہے جیسے کسی بھی باشعور شخص کے لئے یہ آشکارا ہے کہ کسی مصور نے ان نقوش کو بنایا ہے جو عجائب گھر میں آویزاں ہیں۔ مسلمانوں کی یہ بنیادی بصیرت بعض اوقات "بوڑھیوں کا مذہب" کہا جاتا ہے، اس کے استحقار کے لئے نہیں بلکہ یہ اشارہ کرنے کے لئے کہ کوئی ایسا عقل کھرا نہیں جو اس نکتہ کو نہ پاسکے۔ یہ محاورہ ایک واقعہ سے مشتق ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کچھ صحابہ کے ساتھ شہر میں چلے جارہے تھے کہ آپؐ کو کسی قبیلہ کی ایک بوڑھی خستہ حال عورت ملی جو چرخہ پر اون کات رہی تھی۔ آپؐ نے اسے سلام کیا اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: "کیا تم اللہ پر ایمان رکھتی ہو"؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "کیوں"؟ اس نے جواب دیا کہ ایک چرخہ اس وقت تک نہیں چلتا جب تک اسے گھمانے والا ایک ہاتھ نہ ہو اور کائنات بھی اس وقت تک حرکت نہیں کرسکتی جب تک اسے کوئی چلانہ رہا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی طرف دیکھا اور فرمایا "تم میں بوڑھی عورتوں ایسا دین ہونا چاہیے"۔

کائنات میں موجود نشانیوں سے لوگ کس حد تک اللہ کو پہچان سکتے ہیں؟ فلسفہ اور بہت سے مذاہب کے علم معرفت میں دائمی سوال رہا ہے اور یہ اس سوال سے پوری طرح منسلک رہا ہے کہ آیا بنی نوع انسان کو اللہ کی طرف سے الہامی کتب کی ضرورت ہے یا نہیں۔ عام مسلم نظریہ ہے کہ آیات کا ادراک کرنے کے لئے ربانی مدد کی ضرورت ہے۔ بغیر پیغمبری رہنمائی آیات کا مطالعہ ایسے ہی ہے جیسے کسی تقریر کو بلا زبان جانے یا یہ احساس کئے بغیر کہ یہ تقریر ہے سمجھنے کی کوشش کرنا۔

اللہ سے متعلق علم کے معاملہ میں مسلمانوں کی بنیادی حیثیت یہ ہے کہ دنیا اور وہ خود لاعلم ہیں۔ بے شمار اسرار ایسے ہیں جن کو انسانی عقل کبھی حل نہیں کرسکتی۔ تاہم اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ لوگ سمجھنے کی کوشش کرنا ترک کردیں۔ جہالت کسی حد تک قابل علاج ہے۔ علاج تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ رسولوں کی بات سنی جائے۔ خصوصاً اس کا مطلب یہ

تسلیم کرتا ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور اس کی نشانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ قرآن اللہ کے متعلق کیا کہتا ہے دراصل یہ سمجھنا ہے کہ اللہ بندوں سے اپنے بارے میں کیا کہہ رہا ہے۔ یہ صورت حال براہ راست اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اللہ کا ایک پیغام ہے جسے قرآن کہا جاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور یہ سمجھنے کے لئے کہ یہ کیا کہتا ہے ہمیں اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس پیام کا موضوع جیسا ہم نے اوپر دیکھا توحید ہے۔

جس حد تک تعلیمات با معنی ہو سکتی ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن مغربی علماء نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے اس کی نوعیت کو تاریخی تناظر میں دیکھا ہے یعنی یہودی اور مسیحی پس منظر، سماجی تعلقات، اقتصادی حالتوں اور مسائل زبان کے تناظر میں۔ انہوں نے مخصوص طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ابتدائی امت کے گرد و پیش تاریخی اور سماجی حالات کا علم بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ جو آیات تاریخی واقعات کا حوالہ دیتی ہیں ان کو انہی واقعات کے لحاظ سے سمجھنا چاہیے۔

اس جدید مغربی تحقیق کے بعض اجزاء ابتدائی زمانہ سے ہی مسلمانوں کو معلوم ہیں اور اکثر مغربی علماء صرف اپنے پیش رو مسلمانوں کے تحقیقی نتائج پیش کرتے ہیں۔ اس طرز فکر اور مسلمانوں کے روایتی طرز فکر میں بڑا فرق یہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی یہ تصور نہیں کیا کہ کسی آیت کے معنی کی تکمیل اس کی تاریخی اہمیت سے ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی یہ استدلال کرنا چاہے کہ قرآن تاریخی ماحول کے حوالہ سے ہی سمجھا جا سکتا ہے تو مسلمان مفسر جواب دے سکتے ہیں کہ تاریخی ماحول خود اللہ کی نشانیاں ہیں بس ان کی ایک اہمیت ہے جو بنیادی سے زیادہ ہے۔ آپ تاریخی حالات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں جب آپ کو یہ ادراک ہی نہ ہو کہ یہ حالات توحید کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ الہامی کتابوں کی آیات اور فطرت میں پائی جانے والی نشانیوں کا فرق یہ ہے کہ الہامی آیات ہمیں واضح الفاظ میں بتاتی ہیں کہ یہ اللہ کا پیام ہے لیکن انسان تاریخی نشانات میں ربانی پیام کا اس وقت تک احاطہ نہیں کر سکتا جب تک وہ الہامی آیات کو نہ سمجھ لے۔

جدید اور روایتی اسلامی انداز فکر، الہامی اور تاریخی آیات کی تفہیم کے لئے دونوں متفق ہیں کہ تاریخ معنویت رکھتی ہے اور اس کو سمجھا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم ان وجوہ کا احاطہ کر سکیں جن سے یہ وقوع پذیر ہوئے۔ جدید مغربی فکر میں وجوہ نیچے سے اوپر کو چلتی ہیں۔ یعنی تصورات کے معنی مثلاً اللہ، مذہب، امت، انسان اور تاریخ کو ان اجزاء ترکیبی میں تلاش کرنا ہوگا جنہوں نے انہیں وجود دیا۔ یہ اجزاء قدرتی بھی ہو سکتے ہیں، ماحولیاتی، سماجی، نفسیاتی، اقتصادی وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی فکر کا راوپر سے نیچے کو چلتی ہے۔ یہ توحید سے شروع ہوتی ہے اور پھر توحید ہی کی بنیاد پر ہر چیز کو اللہ کے تعلق کے لحاظ سے اپنے مقام پر رکھتی ہے۔ کسی شے کے معنی اس کی اہمیت میں پائے جاتے ہیں۔ شے ایک نشانی ہے اور نشانی اللہ کی بات کرتی ہے۔

مسلمان تاریخی اجزاء کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ قرآن خود ان کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔ جب قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے ہر پیغمبر اپنی قوم کی زبان بولنے والا بھیجا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ط (ابراہیم ۴)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تا کہ انہیں احکام خدا کھول کھول کر بتا دے۔

یہ اس نظریہ کی طرف خاص اشارہ ہے کہ ربانی پیغامات تہذیب، تاریخ اور ان لوگوں کی بولی کے مطابق ہیں جن کے لئے یہ نازل کئے گئے۔ یہ کہنے سے اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ ربانی پیغامات ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہے جو کلام فرماتا ہے ــــ عربی، عبرانی، سنسکرت اور چینی جس زبان میں بھی ہو ــــ اور یہ انسان ہی ہیں جو سن رہے ہیں۔ یہ اس صورت حال سے بہت بعید ہے کہ انسان نے زبان ایجاد کی اور اس کے ساتھ اللہ بھی۔

زیادہ سادگی کا خطرہ مول لیتے ہوئے کوئی شخص بات مختصر کرتے ہوئے روایتی اسلامی طرز فکر میں آیات کی توضیح اور مختلف جدید رجحانات کے تحت تاریخی نظریہ کو بائبل کے حوالہ سے سمجھنے کی کوشش کر سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دہرائی "اللہ نے نوع انسان کی تخلیق اپنے ہی نقش پر کی"۔ مسلمان علماء نے اس کا یہ مطلب لیا کہ کائنات کی ہر چیز جس سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے اس کو اس ربانی حقیقت کے حوالہ سے سمجھنا چاہیے جو فطرت انسانی کی عکاسی کرتی ہے۔ تاہم جدید علمیت اس معاملہ میں اسی مقولہ کو الٹ کر دوسرا نظریہ رکھتی ہے کہ اللہ اب ایک فعال شریک کار نہیں رہا بلکہ محض ایک انسانی اختراع ہے۔ لہٰذا جدید علمیت کہتی ہے کہ انسانوں نے اپنی تخلیق کے مطابق اللہ بنالیا۔ جدید نظریات کے انسانی مذہب کی ابتدا مذہبی اعتقادات اور اعمال کی اس بے تحاشا گوناگونی کی تشریح کرتی ہے جو ہر زمانہ میں تاریخ میں پائی گئی ہے۔

اگر ہم جدید لوگ چیزوں کی اسلامی بصارت کی منطق کا احاطہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ مسلمانوں کے لئے اشیاء کی ابتدا اللہ سے ہوتی ہے اور وہاں سے نیچے کی طرف آتی ہے۔ عام طور پر ہمارے لئے چیزیں ہمارے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور اوپر اٹھتی ہیں یا جو زیادہ قرین قیاس ہے ان میں سے کسی طریقہ سے بھی۔ جدید تصور کے مطابق اوپر، نیچے کی بات الجھن بن جاتی ہے کیونکہ ہمیں ایک معیار منتخب کرنا پڑتا ہے جس سے سمتوں کا تصفیہ کیا جا سکے اور لوگ آسانی سے ایسی چیزوں پر متفق نہیں ہوتے۔

اسماءِ ربانی:

یہ واضح رہے کہ اللہ کا عام تصور کسی ایسے مذہب سے انصاف نہیں کر سکتا جس کا اپنا تصور الٰہ یہ ہو کہ وہی ایسا مرکز ہے جس پر ہر دوسری چیز جانچی جا سکتی ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ مسلمان اللہ سے کیا مراد لیتے ہیں، ہمیں قرآن سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

کیونکہ قرآن بذات خود اللہ کا کلام ہے لہٰذا اس کا ہر لفظ اللہ کا اظہار کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے جو ہم کہتے ہیں، حتی کہ جب ہم کسی دوسرے کا قول نقل کر رہے ہوتے ہیں، ظاہر کرتا ہے کہ ہم کیا ہیں، لیکن اللہ کے اظہار ذات کو سمجھنے کے لئے ہمیں ایک نکتہ تفرق کی ضرورت ہے جہاں سے ہم پیمائش شروع کریں گے۔ ظاہراً نکتہ آغاز مذہب کا پہلا ستون یعنی شہادت ہوگا، یعنی یہ حقیقت کہ "کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ کے"۔

کس نوعیت کی ہستی کا اظہار لفظ اللہ سے ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب کا مخصوص اسلامی طریقہ اولاً قرآن سے رجوع کرنا ہے کہ وہ بتصریح اللہ کے متعلق کیا کہتا ہے کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے اجمالاً اللہ سے متعلق ہے، یہاں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس بارے میں قرآن بہت کچھ کہتا ہے۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے متعلق کیا کہتا ہے ایک طریقہ تو صرف اس کتاب کو پڑھنا ہے لیکن ہم پہلے ہی یہ اظہار کر چکے ہیں کہ جدید نسل کے لئے اس طریقہ کو آسان بنانے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ اس کام کو آسان بنایا جا سکتا ہے اگر بعض

معیاری مذہبوں سے مدون جو اسلامی دینیات میں پائے جاتے ہیں، اس قسم کی باتیں جو اللہ کے متعلق کہی جاتی ہیں۔

یہ ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ قرآن لامحدود خزانوں کی کتاب ہے جس نے بے شمار فلسفیوں، علماء دین، مفتیوں، شاعروں اور فنکاروں کو ہزاروں سال متحرک و متاثر کیا، مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر اس کے اثرات مستزاد ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم قرآن کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے کیونکہ کسی عنوان پر جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ ابتدائی اور قیاسی ہوتا ہے۔ حسن معنی میں اور جس طرح تاریخی ارتقاء ہوتا ہے اس میں چیزیں بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ ذہن میں اس تنبیہ کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اللہ سے متعلق اپنی تعلیم کا خلاصہ اسماء الحسنیٰ میں کرتا ہے۔ لفظ الحسنیٰ حسنہ سے تفضیلی صفت ہے جس کے معنی خوبصورت اور اچھے کے ہیں۔ اللہ کے ناموں کو سب سے خوبصورت کہتے ہوئے قرآن اشارہ کرتا ہے کہ جیسے اللہ خود حسین و جمیل ہے اسی طرح اس کے اسماء حسین و جمیل ہیں کیونکہ وہ اس کے حسن کا اظہار کرتے ہیں۔ جس طرح اللہ کا حسن و جمال دیگر مخلوقات سے زیادہ لامحدود ہے اسی طرح اس کے اسماء کا حسن بھی دیگر اشیاء کے ناموں کے حسن سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن اللہ سے بہت سے نام منسوب کرتا ہے۔ قرآن میں عام مستعمل ناموں میں سے رحمٰن، رحیم، علیم، حی، قوی، خالق اور غفور ہیں۔ یاد رہے کہ یہ اسماء ذات نہیں۔

بہت سے مسلمان ماہرین الٰہیات خیال کرتے ہیں کہ اللہ اسم خاص ہے (اسم علم) جو اللہ نے خود کو دیا لیکن کوئی ایسا لفظ نہیں جو کاملاً انگریزی Personal کا متبادل ہو۔ ایک اسم خاص کے طور پر اللہ کے اس طرح مخصوص معنی نہیں جیسے لندن کے ہیں۔ دوسرے ماہرین الٰہیات ترجیح دیتے ہیں کہ اسم اللہ بہت سے مختلف مصادر میں سے کسی ایک سے مشتق ہے اور یوں اس کو بامعنی نام بناتے ہیں۔ پھر یہ ان ناموں سے مشابہ ہوگا جیسے علیم، غنی اور رحیم۔ مثلاً بعض علماء اللہ کو الٰہ سے مشتق بتاتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے معنی صرف اللہ ہیں حالانکہ دوسری تجاویز بھی ہیں۔ جدید ماہرین علم اللسان خصوصاً خیال کرتے ہیں کہ یہ خاص تصور صحیح ہے لیکن یہ محض علم اللسان کا ایک سوال نہیں ہے کیونکہ اس کے دینی مضمرات بھی ہیں اور اس سے یہ تشریح کرنے میں مدد ملتی ہے، بہت سے مسلم مصنفین اس پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

کثرت پرستانہ مذاہب میں ہر خدا ایک ذاتی چہرہ پیش کرتا ہے جس میں ایک یا زیادہ صفات متشکل ہوتی ہیں جیسے ہندو دیومالا خداؤں کے بہت سے اعمال اور مہمات کے احوال پیش کرتی ہے، مثلاً برہما، وشنو اور شیوا کے۔ یہ احوال اس طرح پیش کئے گئے ہیں جیسے یہ خدا افراد تھے۔ ساتھ ہی ہندو اکثر کہتے ہیں کہ برہما خالق، وشنو قائم رکھنے والا اور شیوا فنا کرنے والا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر خدا بہت سی دیگر صفات اور خصوصیات بھی رکھتا ہے جو اکثر دوسرے خداؤں کی صفات پر منطبق ہیں۔

اللہ کے قرآنی نام اسلامی دنیا کی نظر میں ایک ایسا کردار ادا کرتے ہیں جو بعض طریقوں سے بہت سے ایسے ایزدی کرداروں کے مماثل ہیں جو بعض شکلوں میں کثرت پرستی میں پائے جاتے ہیں، البتہ اہم اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اسماء کبھی ذات کی شکل اختیار نہیں کرتے نہ الگ ہستی کی طرح دیکھے جاتے ہیں۔ ہر نام ایک خصوصیت یا صفت کی نمائندگی کرتا ہے نہ کہ کسی جامد شے کی۔ مثلاً اللہ کو کبھی باپ، آسمان حتیٰ کہ سورج اور چاند نہیں پکارا جاتا۔

ربانی نام جو سب سے جامد محسوس ہوتا ہے شاید "الملک" ہے لیکن دوسرے ربانی ناموں کی طرح یہ بھی اشارہ نہیں کرتا کہ یہ اللہ کی تصویر جامد انداز میں ہے۔ ہاں اس نام کے معنی ہیں کہ اللہ ایک حقیقت ہے جو بادشاہت کی صفات کا اس حد تک

حامل ہے کہ کوئی دوسری چیز اس نام کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اگر اللہ بادشاہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام طاقت اور حکومت کا اختیار اسی کو ہے جبکہ ارضی بادشاہ، صدر اور آمر اللہ کے شاہانہ اقتدار کا ایک ہلکا سایہ تو بھی نہیں ہیں۔

توحید کا مطلب ہے کہ اسماء ربانی کی بتائی ہوئی صفات دراصل صرف اللہ کی ملکیت ہیں اور [illegible] آخری میں اور استعاراتی طور پر مخلوق کی۔ کوئی بھی الٰہی نام توحید کے اس جملہ میں آسکتا ہے "کوئی الہ نہیں سوائے [illegible]" یوں شہادت اول کو ایک سریع قاعدہ کے طور پر توحید کے گوناگوں منشا کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اگر اللہ رحمٰن ہے تو رحمٰن کے سوا کوئی الہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ [illegible] سکتی ہے جس کو پرستش، عقیدت اور خدمت کے لئے اپنایا جائے۔ رحمٰن منبع ہے رحم کا جو دوسروں کے لئے اچھائی، مہربانی [illegible]ت کا اظہار ہے۔ رحمٰن پرستش اور خدمت کی چیز ہے، کیونکہ ہر کسی کو خدمت کے لئے رحم کی ضرورت ہے۔ بغیر [illegible] کوئی اچھائی، مہربانی اور محبت حاصل نہ ہوگی۔ یا شاید ہم یہاں ہوں بھی نہ کیونکہ ہمارا وجود خود ایک تحفہ ہے جس [illegible]یت لازمی ہے۔ پس شہادت ہمیں بتاتی ہے کہ تمام رحم و کرم رحمٰن کا تحفہ ہے۔ سوائے رحمٰن کے کوئی الہ نہیں [illegible] ہے کہ سوائے اللہ کے رحم کے کوئی رحم نہیں ہے یا کوئی رحم کرنے والا نہیں سوائے رحمٰن کے۔ اللہ کا رحم ساری دنیا [illegible] اسی کا رحم اصل رحم ہے دوسرا کوئی رحم اس نام کا مستحق نہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی خیال اس حدیث میں بیان فرمایا ہے

> اللہ نے سیکڑوں رحم اس دن پیدا کئے جس دن اس نے آسمان و زمین تخلیق کئے۔ [illegible] رحم اس [illegible] کرتا ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ ان میں سے ایک رحم اس نے زمین میں رکھا۔ اس [illegible] ماں بچہ کی طرف راغب ہوتی ہے اور پرندے اور جانور ایک دوسرے کی طرف ملتفت ہوتے ہیں۔ جب قیامت آئے گی تو وہ ان رحموں کو اس رحم سے مکمل فرمادے گا۔

اللہ حمد کے لائق ہے۔ دوسرے الفاظ میں جیسا کہ قرآن کی پہلی آیت کہتی ہے "سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں"۔ اس دنیا میں جو کچھ قابل تعریف ہے وہ اچھا، سچا اور مناسب ہے۔ مختصراً یہ ایک حقیقی شے ہے یعنی وہ جو حقیقت کی پوشیدہ فطرت سے مطابقت رکھتی ہے جو اللہ خود ہے جو اچھائی، حسن اور مستحسن ہے۔ یہ کہنا کہ "سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں" یہ کہنا ہے کہ قابل تعریف ہونا صرف اللہ کو سزاوار ہے۔

اللہ علیم ہے، کوئی الہ نہیں سوائے علیم کے۔ تمام علم اسی علیم سے ماخوذ ہے۔ کسی کو کوئی علم حاصل نہیں سوائے علیم کے۔ کوئی ایسا نہیں جو جانتا ہو سوائے اللہ کے۔ تمام علم انسانی کسی نہ کسی درجہ میں محض جہالت ہے۔

اللہ قوی ہے۔ کوئی طاقت والا نہیں سوائے قوی کے۔ تمام قوت اللہ کے پاس ہے، تمام مادی، دنیاوی، سیاسی اور کائناتی طاقت اللہ کی لامحدود قوت کے مقابل کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

> اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (البقرہ ۱۶۵)

ترجمہ قوت ساری اللہ کے لئے ہے۔

> لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (الکہف: ۳۹)

ترجمہ: کوئی طاقت نہیں سوائے اللہ کے پاس۔

جیسا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک کلمہ جسے مسلمان اکثر دہراتے ہیں، "کوئی قوت و طاقت

نہیں سوائے جو اللہ اعلیٰ اور مہیب کے پاس ہے"۔

اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ اللہ کے سوا کوئی تخلیق نہیں کرتا۔ جیسا کہ قرآن بتاتا ہے، شہادت کو ایک بلیغ سوال بناتے ہوئے:

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللهِ (فاطر ۳)

ترجمہ کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے؟

اللہ الباقی ہے۔ سوائے اس کے کوئی چیز ابدی نہیں۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ط (القصص ۸۸)

ترجمہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اس کے منہ کے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْإِكْرَامِ ۝

ترجمہ زمین میں جو کچھ ہے سب فنا ہونے والا ہے اور تیرے رب بزرگی اور عظمت والے کا منہ ہی باقی رہے گا۔

اللہ غنی ہے۔ کوئی غنی نہیں سوائے اللہ کے۔ آسمان اور زمین میں ہر چیز اپنے وجود اور معاش کے لئے اللہ پر مکمل انحصار کرتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

ترجمہ اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ، وہ تو بے پروا اور قابل تعریف ہے"۔

اللہ مالک الملک ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ (آل عمران:۲۶)

ترجمہ: کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک۔

اللہ تنہا چیزوں کا مالک ہے اور کوئی شے اپنے لئے کسی چیز کی ملکیت نہیں رکھتی۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (آل عمران: ۱۸۹، المائدہ ۱۸)

ترجمہ: اور اللہ ہی کے لئے آسمان و زمین کی سلطنت ہے۔

وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ (بنی اسرائیل:۱۱۱)

ترجمہ اللہ کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ز وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرُ ۝ (الملک ۱)

ترجمہ بڑی برکت والا ہے وہ جس کے ہاتھ میں راج ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔

ہم اللہ کے سارے کے سارے ننانوے ناموں کا اعادہ نہیں کریں گے مگر ہم ایک اور نام پر نظر ڈال لیتے ہیں جو ایک لحاظ سے توحید کے معنی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اجاگر کرتا ہے جو الحق ہے (اصل)۔ اللہ حق ہے کوئی چیز اصل نہیں سوائے حق۔ اللہ کے سوا ہر شے غیر اصل، چند روزہ، مٹ جانے والی، عارضی، تصوراتی، محو ہو جانے والی ہے۔ غرض چیزوں کی ہر خوبی اور خاصیت جس کا کوئی مثبت پہلو ہے کسی ربانی خوبی ہی سے ماخوذ ہے اور اپنی ہستی کے لئے اللہ کی ممنون ہے۔ ہر اچھی، قابل تعریف، ابدی اور حقیقی چیز اللہ کی ملکیت ہے۔ پس "تعریف اللہ کے لئے ہے" اور کسی دوسرے کے لئے نہیں۔

کائنات اور عالم کو اللہ کے سوا ہر چیز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پہلی شہادت کا مطلب ہے [illegible] کائنات اصل نہیں۔ آخری تجزیہ میں یہ حق کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ مگر یہ منظر لاوجودیت کی طرف نہیں لے جاتا۔ وجودیت مقتضی ہے کہ ہمارے وجود کی نیستی اور فریب کاری بے معنویت کا ایک احساس اور مایوسی پیدا کرے۔ لیکن توحید امید، یقین اور خوشی کی نوید دیتی ہے۔

اگر دنیا اور ہم غیر حقیقی ہیں تو اس حقیقت کی توضیح کس طرح ہو سکتی ہے۔ ہم یہاں [illegible] حقیقت سے واقفیت کے باوجود؟ ہم یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ ہم غیر حقیقی ہیں جب ہم یہ کہہ بھی رہے ہیں؟ ہماری ذات، ہماری گفتگو، ہماری فہم کی کچھ تو اصلیت ہونا چاہیے ورنہ نفس کبھی ادراک نہ کر سکتا اور کبھی یہ نہ کہہ سکتا کہ یہ غیر حقیقی ہے۔ [illegible] غیر حقانیت میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔ اگر کسی طور کوئی بھی حقیقت نہ ہوتی تو اللہ ہم سے کلام کی تکلیف کیوں [illegible] بہر حال یہ حقیقت جو دنیا میں پائی جاتی ہے ہماری یا دنیا کی ملکیت نہیں ہے۔ حقیقت اللہ کی ملکیت ہے۔ "سب [illegible] ہے"۔ ہم بطور ہم غیر حقیقی ہیں بجز اس حد کے جس تک اللہ ہم پر رحم و کرم کرتا ہے۔ ہم رحم و کرم [illegible] ہیں۔

اس گتھی کو سلجھانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کہا جائے اللہ کی حقانیت غیر [illegible] مطلق ہے مگر ہماری حقیقت موصولہ ہے۔ اللہ کی حقانیت ابدی اور غیر متغیر ہے۔ یہ کسوٹی ہے جس پر تمام چیزیں پرکھی جاتی ہیں۔ دوسرے تمام حقائق اللہ کی حقانیت کے عمل سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ لہٰذا دوسری چیزوں کو اللہ کے تعلق سے سمجھا جا سکتا ہے ان کی حقیقت موصولہ ہے۔ "کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ کے" کا مطلب ہوگا کہ اللہ کے علاوہ ہر دوسری شے کو اللہ سے تعلق سے سمجھا جائے۔

اگر ہم اللہ کو حوالہ کا حتمی نکتہ نہ لیں تو کسی چیز کو سمجھتے وقت احاطہ میں نہیں لا سکتے [illegible] چیز کو دوسری غیر حقیقی چیزوں کے تناظر میں سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارا علم غیر حقیقی، غیر یقینی، متغیر اور ناقابل [illegible] ہوگا۔ ہم شک اور تذبذب کا شکار ہو جائیں گے، لوگ یقینی علم حاصل کر سکتے ہیں اگر انہوں نے حتمی حوالہ کا ادراک کیا ہو اور یہ توحید پر منحصر ہے اپنی جگہ توحید ایک پابندی عائد کرتی ہے جو ایمان کہلاتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر ہم علم و ایمان کی مطابقت پر آ جاتے ہیں۔

یہ امر حادثاتی نہیں کہ دوسری سورۃ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے "یہ وہ کتاب ہے جس میں کچھ شک نہیں"۔ اسلامی نظر سے شک توحید کے ذریعہ رفع ہو سکتا ہے جو لوگوں کو شناخت کراتی ہے کہ ہر مثبت صفت کی جڑ (اصل) حقیقت میں ہے۔

کلام:

اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں گفتگو (کلام) کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے مسلمان قرآن اور دیگر الہامی کتب کو اللہ تعالیٰ کا کلام مانتے ہیں۔ اللہ کے کلام کے الفاظ اور جملے آیات مانے جاتے ہیں۔ لیکن جیسے اللہ اپنے کلام کے ذریعہ الہامی کتب کی آیات نازل فرماتا ہے اسی طرح وہ کلام کے ذریعہ کائناتی اور فطری نشانیاں بھی ظاہر کرتا ہے۔ بائبل میں اللہ تعالیٰ تخلیق کا آغاز یہ فرماتے ہوئے کرتا ہے۔ "روشنی ہو جائے"۔ بہت سے مسلم علماء کی نظر میں تمام تخلیقی عمل کلام الٰہی کی کارگزاری ہے۔

تمام قرآنی آیات اللہ کے لفظ یا الفاظ بیان کرتی ہیں، مثلاً مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ کیجیے

وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ (لقمان: ۲۷)

ترجمہ: اور اگر جتنے درخت زمین میں ہیں قلم ہوں اور سمندر اس کی سیاہی ہو اور اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو اللہ کی

باتیں تمام نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست حکمتوں والا ہے۔

پہلی نظر میں یہ آیت الہامی کتب کی بات کرتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بہت سے مفسر اس کو اللہ کی تخلیقی قوت کا حوالہ خیال کرتے ہیں۔ ہر مخلوق اس وقت وجود میں آتی ہے جب اللہ اس سے کہتا ہے "ہو جا" یوں ہر مخلوق اللہ کا لفظ (کلام) ہے۔ اللہ کی تخلیقی قوت لامحدود ہے پس اس کی مخلوق کبھی بھی وجود میں آنا بند نہیں کرتی۔

قرآنی موضوع تخلیق بذریعہ کلام کی وجہ سے بہت سے مسلم مفکر صفت کلام کو یہ بتانے کے لئے کہ اللہ اور دنیا میں ایک رشتہ ہے استعمال کرتے ہیں۔ انسانی کلام کو ربانی کلام کی ایک نشانی خیال کیا جاتا ہے۔

جب ہم کلام کرتے ہیں، تو ہم کوئی بات کہنے کی نیت سے شروع کرتے ہیں خواہ نیت ہم پر واضح نہ ہو۔ غیر ارادی کلام معلوم نہیں ہوتا۔ فوری نوعیت کی اندرونی احساس یا خیال کی اطلاع ہے جیسے تعجب یا درد۔ ہم ایک خیال ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو ہم بولتے ہیں۔ بے شک ہم ہر قسم کے نقائص کے باوصف محض انسان ہیں پس ہمارے الفاظ اکثر گذمڈ ہوتے ہیں اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے کہنے کے قابل نہیں۔ اللہ کے ساتھ صورتحال مختلف ہے کیونکہ وہ کمزوریوں سے مبرا ہے۔ اس کے الفاظ بالکل اسی طرح ادا ہوتے ہیں جیسے وہ چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم لازماً ان کو سمجھتے ہیں۔ قرآن لوگوں کو تکرار سے اپنی آیات پر غور کرنے کی ہدایت کرتا ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ اللہ کیا فرماتا ہے۔ اللہ واضح کلام کر رہا ہے لیکن اس کے سامعین اتنے ذہین نہیں۔

اگر ہم انسانی کلام کو ایک نسبت کے طور پر استعمال کریں تو ہم اس میں اور کلام الٰہی میں بہت یکسانیت پاتے ہیں۔ مثلاً کہے ہوئے ایک لفظ اور بولنے والے کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ لفظ وہ نہیں جو بولنے والا ہے کیونکہ لفظ ایک ثانیہ کے لئے ہوتا ہے پھر معدوم ہو جاتا مگر لفظ بولنے والے سے مکمل طور پر مختلف بھی نہیں کیونکہ بغیر بولنے والے کے کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ الفاظ اپنے وجود کے لئے پوری طرح بولنے والے پر منحصر ہیں۔ اسی طرح اللہ کی ہر مخلوق (ابدیت کے نکتہ نگاہ سے) صرف ایک ثانیہ کے لئے موجود ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے وجود کے لئے مکمل طور پر اللہ پر انحصار کرتی ہے۔ وہ ایک لفظ بولتا ہے اور اللہ کے نظریۂ بقا کے مطابق ہمیں یہ مدت العمر کے لئے موجود محسوس ہوتا ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط (القصص۔۸۸)

ترجمہ: ہر چیز کو فنا ہے سوائے اس کے منہ کے۔

بعض علماء نے کائنات کو ایک کتاب سے تشبیہ دی ہے جسے اللہ تعالیٰ لکھ رہا ہے۔ دنیا کی ہر شے ایک حرف ہے۔ حروف مل کر لفظ بناتے ہیں۔ پرندے، پھول، پتھر اور درخت تمام حروف سے مرکب الفاظ ہیں۔ ہر معاملہ میں حروف ایک ہی ہو سکتے ہیں مگر وہ مختلف ترکیبوں سے اکٹھے کئے گئے ہیں تاکہ ہمیں مختلف الفاظ فراہم ہوں۔ ہم کہہ سکتے ہیں سر، دُم، بازو، ٹانگیں، دل اور جگر حروف ہیں۔ بہت سے جانور یہ حروف رکھتے ہیں لیکن انہیں ہر ایک میں مختلف انداز سے جمع کیا گیا ہے۔ پودے اور معدنیات بالکل ہی مختلف حروف سے مرکب ہیں۔

اپنے طور پر حروف کے کوئی معنی نہیں۔ جب ہم انہیں یکجا کرتے ہیں وہ الفاظ ہو جاتے ہیں جو با معنی ہوتے ہیں، تاہم الفاظ بھی دراصل کوئی مطلب نہیں رکھتے سوائے جملوں کے سیاق و سباق کے۔ بغیر سیاق و سباق ہم کبھی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ لفظ کے کیا معنی ہیں۔ اگر ہمیں ایک جملہ کی ضرورت ہو یعنی ایسا اظہار جو با معنی ہو، ہم الفاظ کو بے ترتیب نہیں پرو سکتے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے "حروفِ کائنات" جیسے ہاتھی، لہسن، کاکروچ قدرتی زبان کے سیاق و سباق میں جس میں وہ استعمال ہوئے ہیں معنی رکھتے ہیں۔

عالم ایک کتاب کی شبیہ ہے، کے تصور کو جاری رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ [illegible] ایک باب یا سورہ میں رکھنے کی ضرورت ہے جس کا مطلب، جیسا ہم نے دیکھا، بالحاظ لغت ایک احاطہ ہے۔ کائناتی کتاب کی سورتیں، ہماری کائنات کی دنیاؤں کی طرح ہیں، لیکن کسی نہ کسی طور ہر دنیا دوسری دنیاؤں سے متعلق ہے۔ جدید [illegible] کی اصطلاح میں ہر ستارہ اور کہکشاں آپس میں تمام دوسروں سے متعلق ہے گو ہم کو علم نہ ہو کہ یہ باہم تعلق کس طرح [illegible]۔ اسلامی اصطلاح میں ایک دنیا اپنے گرد کی دوسری دنیاؤں کے تعلق سے ہی مفہوم رکھتی ہے خواہ تعلق مکانی ہو یا زمانی، [illegible] چل کر دیکھیں گے۔

اسلامی علم کائنات ہماری تجرباتی دنیا کو بہت سی دنیاؤں میں سے ایک کی حیثیت سے دیکھتا ہے [illegible] موجود ہیں اور یہ اس کو دنیاؤں کے سلسلہ میں سے اس کی طرح دیکھتا ہے جو یکے بعد دیگرے آتی ہیں۔ ہماری دنیا کی اہمیت [illegible] اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم یہ سوچیں کہ دوسری دنیاؤں میں اس کی موزوں جگہ کہاں ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک باب کی [illegible] اہمیت کا انحصار اس کتاب پر ہے، جس کا وہ حصہ ہے۔

مختصراً دنیا کو اللہ کی ایک کتاب سے مماثلت دیتے ہوئے مسلمان مفکر کہہ رہے ہیں [illegible] آیات کا ایک مجموعہ ہے جس کا ایک پیغام ہے۔ لیکن ہمیں ان آیات کو کل کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے تاکہ پیغام سمجھ [illegible]۔ اللہ کی کتاب کا موضوع یقیناً توحید ہے: یہ اعلان کہ اللہ منفرد حقیقت ہے جو تمام ظواہر میں پنہاں ہے۔

روح اور صفات خداوندی

قرآنی اسماء ربانی نے مسلمانوں کو فطرت کی حقیقت پر غور کرنے کے لئے لاانتہا ذریعہ [illegible] ہے۔ اسماء الٰہی پر بحث کسی ایسی غیر مرئی اور لاتعلق ہستی پر منتج نہیں ہوتی جو اصل دنیا سے کوئی علاقہ نہ رکھتی ہو۔ اس کے برعکس اسماء الٰہی کی نشانیاں ہمارے ہر فعل میں موجود ہیں اور خود ہم میں اگر کائنات اور ہمارا وجود سوائے ربانی نشانیوں کے وسیع منظر کے اور کچھ نہیں تو یہ نشانیاں ہمیں بتا رہی ہیں کہ اللہ کون ہے یا اس کے اسماء کیا ہیں۔

اسماء ربانی کو خواص یا صفات بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ماہیت اور گن متعین کرتے ہیں۔ اللہ سخاوت اور عدل کی صفات رکھتا ہے پس اس کے دو نام الوھاب (فیاض) اور العدل ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ الزبتھ سخی اور منصف ہے۔ فرق یہ ہے کہ اللہ کے معاملہ میں یہ دونوں صفات مطلق ہیں جبکہ الزبتھ کے لئے یہ دونوں اضافی ہیں۔ یہ کہنے کا مطلب کہ اللہ فیاض ہے یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی فیاض نہیں اور دراصل کوئی دوسری چیز فیاض کہلانے کی مستحق نہیں۔ مگر یہ کہنا کہ الزبتھ فیاض ہے صرف یہ مفہوم رکھتا ہے کہ وہ بہت سے لوگوں سے نسبتاً فیاض ہے۔ ہم جیسے کہہ رہے ہیں کہ اس کے پاس فاضل وقت ہے اور اسے لوگوں کی مدد کرنا اچھا لگتا ہے جبکہ بہت سے لوگ اپنا وقت اور توجہ دوسروں پر صرف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

مسلم مفکر اکثر اسماء الٰہی کو مختلف انواع میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ یہ جتا سکیں کہ ہم اللہ کے متعلق کیا جان سکتے ہیں۔ مثلاً اسماء کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کیا نہیں ہے، دوسرا بتاتا ہے وہ کیا ہے اور تیسرا بتاتا ہے کہ وہ کس طرح کائنات سے باہم متعلق ہے۔ ان کو اسماء الٰہی کی روح، اس کی صفات اور اس کی قدرت کے نام کہا جا سکتا ہے۔

کسی چیز کی روح (ذات) اس کی اصلیت ہے، اس کا مغز جو اس کو بیان کرتا ہے اور اسے وہ بتاتا ہے جو وہ ہے۔ مثلاً ہم

دریافت کر سکتے ہیں کہ گائے کی اصل روح کیا ہے۔ اگر ہم اس کا مطالعہ کریں تو ہم وہ تعریف بیان کر سکتے ہیں جو گائے کو گائے قرار دینے کے لئے غیر مشروط بنیادی اجزا ہیں اور اسے گھوڑے یا گدھے سے ممیز کرتے ہیں۔

جہاں تک اللہ کی بات ہے تو سوال یہ ہے کہ اللہ کی اصل ذات کیا ہے؟ اللہ کی بنیادی حقیقت کیا ہے جو اسے اللہ کے سوا کچھ اور نہیں بناتی یعنی جو اسے دوسری ہر چیز سے ممیز کرتی ہے؟ ایک مثالی جواب تو یہ ہے کہ اللہ کسی دوسری چیز کے مانند نہیں جبکہ دنیا کی ہر چیز کسی نہ کسی دوسری چیز کے مماثل ہے۔ جو بات اللہ کو دوسری چیزوں سے نمایاں کرتی ہے ٹھیک یہ ہے کہ وہ کاملاً بے طرح ہے جبکہ مثال کے طور پر بنی نوع انسان گائے، گدھے اور دوسرے جانوروں کی طرح ہے اور بعض مدارج میں وہ معدنیات کے مماثل ہے۔ دنیا کی ہر چیز کسی نہ کسی انداز میں بنی نوع انسان سے مشابہ ہے، زیادہ واضح طور پر ہر چیز کسی نہ کسی انداز میں ہر دوسری شے کے مشابہ ہے۔ صرف اللہ ہی دوسری چیزوں سے منفرد ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی دوسری چیز کے مشابہ نہیں

لیس کمثلہ شیء ؕ (الشوریٰ ۱۱)

ترجمہ: کوئی شے اس کے مثل نہیں۔

اللہ کی ذات وہ ہے جو وہی ہے اور جو دوسری کوئی شے نہیں۔ مگر ٹھیک ٹھیک وہ ہے کیا؟ وہ کوئی قطعی شے نہیں ورنہ وہ اپنی اس قطعیت کے ساتھ دوسری قطعی اشیاء کے مثل ہوتا، لیکن کوئی شے اللہ کے مثل نہیں۔

اس قسم کی بحث کس قدر منفی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ کہنے کے لئے کہ ہم اللہ کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں ایک پیچیدہ طریقہ ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا کہ ہم نہیں جانتے کہ اللہ کیا ہے مترادف ہوگا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے۔ ہم کس طرح جانتے ہیں؟ کیونکہ قرآن کہتا ہے "کوئی شے اس کے مثل نہیں"۔ ہم چیزوں کو شناخت کرتے ہیں کہ وہ کس کے مثل ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ قطعاً کسی چیز کی طرح نہیں تو ہم جان جاتے ہیں کہ ہم اسے نہیں پہچانتے۔ لیکن یہ ناواقفیت بذات خود عقلمندی ہے کیونکہ یہ ہم کو توحید کے بنیادی مفہوم کا ادراک سکھاتی ہے۔ کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ کے" یعنی "اللہ کے علم کے سوا کوئی علم نہیں" اور "دراصل کوئی علیم نہیں سوائے اللہ کے"۔ مسلم علماء دین نے اس خیال کو یوں ظاہر کیا ہے "اللہ کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے"۔

جب لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ انہیں علم نہیں تو اسلامی کتب میں اس کو جہل مفرد کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابل جب لوگ کہتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے کہ انہیں علم نہیں تو اس کو جہل مرکب کہا جاتا ہے۔ جہل مفرد کو اللہ کے تناظر میں مسلمان دانشور عقلمند گردانتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں وہ جہل مرکب کو انتہائی بدقسمتی تصور کرتے ہیں۔ جو شخص اللہ کے معاملہ میں جاہل مرکب ہے خیال کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے اللہ کیا ہے۔ جو ایسے خیال کرتا ہے وہ شہادت اول کے مقصد کو پانے میں ناکام رہا اور اس لئے انسانیت سے خارج ہو گیا۔

ہم نے بات شروع کی تھی کہ اللہ کی صفات کو سمجھنے کے لئے اسماء حسنٰی ہیں۔ ان اسماء سے ہمیں اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ کی معرفت بنی نوع انسان کی ضدی اکثریت نے کبھی قبول نہیں کی اس لئے انکار کی صورت میں جہنم کی وعید ہے۔ چنانچہ بعض اسماء حسنٰی انذار کا فائدہ دیتے اور لوگوں کو اپنی کوتاہیوں کو سمجھنے اور ان سے باز آنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً القدوس جس کا ترجمہ 'پاک' کیا جاتا ہے۔ اس کے لفظی کے معنی

ہیں کہ اللہ ہر اس خامی اور عیب سے پاک ہے جس کا تصور کسی مخلوق کے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ دوسری مثال المحمود ہے۔ یعنی اس کا جلال، عظمت اور فوقیت ایسی ہے کہ وہ سزاوار حمد ہے۔ ایک اور نام اسلام (امن) ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ ہر قسم کی بے ترتیبی، عدم توازن اور جھگڑے سے پاک ہے۔ یا مثلاً غنی (مستغنی) ہے۔ یعنی اللہ کائنات کی کسی شئے پر انحصار نہیں کرتا اور وہی سب کو دینے والا ہے۔ اب جو کوئی ان باتوں کو نہیں سمجھتا یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تو قصور اس کے اپنے فہم و ادراک کا ہے۔

اگر ذاتی نام ہمیں بتاتے ہیں کہ اللہ کیا نہیں ہے تو اسماء توصیفی ہمیں بتاتے ہیں کہ اللہ کیا ہے۔ گو اللہ کی ذات خاص کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تاہم یہ جانا جا سکتا ہے کہ وہ ہم پر خود کو اپنی آیات کے ذریعہ آشکار ... کس قسم کی صفت کا انتخاب کرتا ہے۔ اللہ کی ناآگاہی اور آگاہی میں کوئی تضاد نہیں۔ آخر یہی بات کسی بھی انسان کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں زید زندہ ہے، آگاہ، متقی، قوی، بینا اور سامع ہے۔ درست، لیکن یہ ہمیں زید کی شخصیت یا زید کے متعلق کتنا کچھ بتاتا ہے کہ دراصل اپنی ذات میں وہ کیا ہے؟ کیا زید اس بات سے مطمئن ہو جائے گا کہ ہم نے اس کی صفات کی فہرست مرتب کرنے میں اس کے متعلق ہر اہم بات کا ذکر کر دیا ہے؟

مختصراً ہم کسی شخص کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا یا ویسا ہے، مگر جو کچھ بھی ہم کہیں ہم اس شخص کی شخصیت کو مکمل نہ کر سکیں گے۔ بعینہٖ یہ کہنا کہ اللہ ایسا ہے اور ایسا ہے، اللہ کی حقیقت کو مکمل نہیں کرتا، بلکہ اس سے کہیں بعید۔۔۔ اللہ لامتناہی اور سراسر حقیقت ہے جس کے متعلق مناسب حقیقت والا کم ہی جان سکتا ہے۔ ہم اصلیت کو اسی حد تک سمجھ سکتے ہیں جس حد تک ہم خود اصلی ہیں۔ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم میں کس قدر اصلیت ہیں۔ یہی سب توحید ہے۔

سائنسی میدان میں انسانی علم کی محدودیت واضح ہے۔ باوجود ان دریافتوں کے جو مسلسل ہو رہی ہیں، عقل انسان تاحال ان گنت واردات کی تہ میں نہیں پہنچ سکی جو زیر زمین اور سطح زمین پر ہیں۔ تو ہم اپنے سیارے کا اندازہ کیونکر لگا سکتے ہیں یا اس کے بعد ہماری کہکشاں اور اس سے آگے کائنات کی کروڑہا کہکشاؤں کا، جو کچھ سائنسی اصطلاح میں جانا جا سکتا ہے اس کے مقابلہ میں موجودہ علم انسانی کو خالص لاعلمی کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اللہ کا تعلق ہے "کوئی شے اس کے مثل نہیں" ساری کائنات کا علم بھی ہمیں لازماً اللہ کو سمجھنے میں مدد نہیں دے گا۔

مختصراً صفاتی نام صرف نام ہیں جو یہ متعین کرتے ہیں کہ اللہ کیا ہے، کم از کم انسانی فہم کی عملی غرض سے۔ وہ خصوصیات جو کسی بھی فرد مثلاً زید کے لئے بیان ہوں وہ الٰہی صفات بھی ہیں جیسے حی، علیم، صاحب ارادہ، قوی، سمیع، بصیر۔ اللہ اور زید میں فرق یہ ہے کہ اللہ کی صفات حقیقی ہیں جبکہ زید کی صفات حقیقت کے عکس کا ایک ڈھیر ہیں۔ انسانی زندگی اصل زندگی نہیں کیونکہ یہ جلد معدوم ہو جاتی ہے لیکن اللہ کی زندگی دائمی ہے۔ یوں "کوئی شے اس کے مثل نہیں" اللہ کے صفاتی اسماء پر بھی حاوی ہے۔ یہ کہہ کر کہ اللہ حیّ ہے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی زندگی ہماری زندگی کی طرح نہیں نہ کسی اور طرح کی ایسی زندگی کی طرح جس کا ہم ادراک کر سکیں۔

تیسری قسم کے ناموں کو اسماء افعال کہا جا سکتا ہے۔ افعال اللہ کی مخلوقات ہیں یا اس کی فعالیت کے نتائج۔ اسماء افعال کو اس حقیقت کے ذریعہ شناخت کیا جا سکتا ہے کہ وہ صرف مخلوق کی اصطلاحات میں ہی مفہوم دیتے ہیں اور ان کے مترادفات بھی اسماء الٰہی ہیں۔ مثلاً المحی، الممیت، الرافع، المذل، الغفار، المنتقم۔

اسماء و صفات کے معاملے میں یہ فرض کرنا ضروری نہیں کہ کوئی مخلوق بھی ہے۔ اللہ حیّ ہے لیکن یہ اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ کوئی اور چیز بھی زندہ ہو۔ اللہ علیم ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک کائنات موجود ہے جس کو وہ جانتا ہے، شاید وہ صرف خود کو جانتا ہے۔ مزید برآں اسماء و صفات کے متضاد اللہ پر لاگو نہیں کئے جاسکتے۔ اللہ نہ بے حس ہے اور نہ بے خبر۔

اس کے مقابلے میں اسماء افعال مخلوقات کا تقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ خود سے زندہ ہے ازلیت اور ابدیت کے ساتھ، پس اسم المحیی اللہ کے افعال کی اصطلاحات میں ہی قابل فہم ہوگا اور اسی طرح اگر وہ ایک کام کر سکتا ہے تو وہ اس کا متضاد بھی کر سکتا ہے۔ اگر وہ زندگی دے سکتا ہے تو اس کو واپس بھی لے سکتا ہے۔ وہ کسی مخلوق کو رفعت دیتا ہے تو دوسری کو ذلت۔ وہ بعض لوگوں کو ان کے گناہوں کے باوجود معاف کر دیتا ہے لیکن دوسروں سے ان کی نافرمانیوں کا حساب بھی لیتا ہے۔

بالآخر معاملات کو سمجھنے کے لئے ہم پھر دہرا دیں کہ یہ صف بندی بہت سے ممکنہ طریقوں میں سے ایک ہے جس سے اللہ کے ناموں پر غور کیا جا سکتا ہے۔ یہ مختتم بات نہیں اور ہم اسے محض ایک فکری انداز کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اس وقت معرض وجود میں آتا ہے جب مسلم علماء دین اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ اللہ نے قرآن میں اپنے لئے بہت سے نام نازل کئے ہیں:

رحمت اور غضب

افعال کے نام ایسے نام ہیں جن کے متضاد و مخالف بھی اللہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ جب یہ سنتے ہی کہ متضاد نام اللہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں تو ایک بدیہی سوال کرتے ہیں وحدہ لاشریک اللہ کیونکر ایسی صفات کا حامل ہو سکتا ہے جو متضاد ہوں۔ کیونکر اللہ رحیم اور صاحب جلال دونوں ہو سکتا ہے۔ آسان ترین جواب، جیسا کہ ہم ابھی تشریح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اللہ واحد ہے لیکن وہ بہت سی مخلوقات کی تدبیر کرتا ہے۔ تمام مخلوقات کے رب کی حیثیت سے وہ ہر مخلوق کو مختلف طریقوں سے مربوط رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ ہر مخلوق کو مربوط رکھنے کے طریقے وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ محیی و ممیت ہے لیکن نہ تو وہ ایک ہی وقت، ایک ہی رشتہ سے ایک چیز کو زندگی عطا فرماتا ہے، نہ ساتھ کے ساتھ اسے قبض کر لیتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ کسی کو زندگی بخشتا ہے اسے ایک مدت مقررہ تک قائم رکھتا ہے پھر اسے واپس لے لیتا ہے۔

تمام متضاد صفات کے درمیان لطیف رشتے ہیں جو ہمیں ان کے تضاد کے حتمی نہ ہونے کو ظاہر کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے تضاد کو اضافی و امدادی بھی کہا جا سکتا ہے۔ جونہی ہمیں ادراک ہوتا ہے کہ متضاد نام ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں، ہم توحید سے قریب تر ہو جاتے ہیں یہ تضاد یکتائی کے پس پشت تنوع ہے۔

بہت سے اسماءِ الٰہی کے اضدادی بنیاد پر جوڑے بنائے جاسکتے ہیں۔ وہ اکثر دو گروہوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ پہلا گروہ دلربا اور نجیب خصوصیات کی نشاندہی کرتا ہے جو یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ایسی خوبیوں کے حامل سے قربت اچھی ہوگی۔ ان خوبیوں کو لطف کہا جاسکتا ہے کیونکہ وہ پر جوش اور ہم معنی ہوتی ہیں۔ ان میں ایسے اسماءِ الٰہی شامل ہیں جیسے رحیم، رحمٰن، ودود، رؤف، غفار اور جمیل۔ اسماء کا دوسرا گروہ اتنا جاذب نہیں کیونکہ وہ غور کرنے والوں میں ایک احساس رعب و خوف پیدا کرتے ہیں۔ ان میں ایسے نام شامل ہیں جیسے قہار، منتقم، متین، ملک، عدل، ضار اور ممیت۔

جتنا زیادہ آپ اس کے متعلق سوچیں اتنا ہی یہ واضح تر ہو جانا چاہیے کہ بہت سے اہم سوالات کا جواب ہاں اور نہیں میں

نہیں دیا جاسکتا۔ اس معاملہ میں ہم سب سے اہم سوال حل کر رہے ہیں یعنی فطرت کی اپنی اصلیت۔ اگر ہم روزمرہ معاملات میں ہاں اور نا کہہ سکتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہمیشہ اصل (حق) کے متعلق قطعی بیان دے سکتے ہیں۔ یقیناً یہ بہتر ہوتا اگر ہر چیز آسان اور سادہ ہوتی بغیر کسی پیچیدگی کے۔ لیکن زندگی اور وجود آسان اور سیدھے سادے نہیں ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ آسان اور سادہ ہیں اکثر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بنیادی عقیدے کے بہت سے رخ اسی طرف ہیں لیکن یہ اسلامی ذہنی رجحان کے لئے ایک اجنبی طریقہ رسائی ہے جو نزاکتوں ([illegible]) اور تناظر کا تغیر پیدا کرتا ہے۔

تقرب اور بُعد

توحید پر دو نکتہ نظر سے غور کیا جا سکتا ہے۔ پہلے نقطہ نظر کے مطابق توحید کے معنی ہیں کہ ہر اصل اور اچھی چیز کا مالک اللہ ہے۔ حق کے سوا کوئی چیز اصل نہیں۔ تعریف سب اللہ کے لئے ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز محض اس بنا پر کہ وہ دوسری ہے غیر حقیقی ہے پس اس کی ذاتی اچھائی کوئی نہیں۔ دوسرے نقطہ نظر سے توحید کا مطلب ہے کہ تمام دنیا کے اندر پایا جانے والا اچھائی اور حق کا ہر شائبہ اللہ سے ماخوذ ہے جو حق برحق ہے۔ پہلے نکتہ نظر سے اللہ حق ہے اور دنیا غیر حقیقی، دوسرے نکتہ نظر سے دنیا کسی نہ کسی درجہ میں اللہ کی حقانیت سے رنگ پاتی ہے۔

یہ دو نظریات اور منظر اسماء الٰہی سے ہم رشتہ ہیں۔ اگر ہم جاہ و جلال والے ناموں پر غور کریں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ اللہ کی حقانیت اور دنیا کو غیر حقیقی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ ذوالجلال، عظیم اور محتشم ہے جبکہ دنیا چھوٹی، ادنیٰ اور لایعنی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ حقیقی اور مستقل ہے مگر اس کی حقیقت کے مقابلہ میں دنیا ایک ڈھلتے سایہ کی مانند ہے۔

اللہ بادشاہ ہے جو تمام چیزوں پر اختیار رکھتا ہے۔ وہ حاکم مطلق ہے اور عالمین سے بے نیاز ہے کیونکہ اسے کائنات کی کسی شے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کائنات کو ہر قدم پر اللہ کی ضرورت ہے کیونکہ وہی اس کے وجود کا منبع ہے۔

لفظ بادشاہ (الملک) نکتہ کو اتنا نہیں ابھارتا جتنا موجودہ دور سے پہلے کر سکتا تھا۔ اس وقت بادشاہ ہوتے تھے۔ دستوری فرمانروا بادشاہ نہیں، ایک صدر یا آمر بھی بادشاہ نہیں ہوتا۔ قدیم زمانہ میں بادشاہ کا تصور دنیا کے مختار کل کا تھا۔ اسلام میں بھی یہ موجود ہے اور یقیناً اللہ کے الملک کہلانے سے واضح ہے۔ بادشاہ کا ہر لفظ آخری حکم ہوتا ہے۔ اکثر اس کے برابر ایک جلاد تیشہ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔ اس کے لئے اپنے کسی رعایا کی طرف انگلی کا اشارہ ہی اس کی گردن مار دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ بادشاہ اپنی رعیت سے پردہ کرتا تھا کیونکہ اس کے مصاحبین کے سوا کوئی بھی اس کے دیدار کا اہل نہ تھا۔ بغیر اجازت یا اچانک اس کا چہرہ دیکھ لینا فرمان اجل ہو سکتا تھا۔

مختصراً بادشاہ تمام رعایا پر اللہ کی حاکمیت کی ایک قوی علامت تھا اور بادشاہوں کا یہ خاصا تھا کہ وہ عوام سے دور رہیں تاکہ رعب اور خوف قائم ہو۔ ایک لحاظ سے اللہ ایک قوت والا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے جو اعلیٰ، قوی، کبیر، جلیل اور قدوس جیسے ناموں کا اہل ہے۔ اپنے بُعد اور مخلوق سے الگ رہنے کے باعث بادشاہ اپنے غضب کا اظہار اکثر بے پناہ قوت کے مظاہرہ سے کرتا ہے۔ وہ ان لوگوں کے خلاف اپنی افواج بھیجتا ہے جو سرتابی کی جرأت کرتے ہیں اور اس کا انتقام حقیقتاً ہیبت ناک ہوتا ہے۔ جب لوگ ان صفات شاہی اور غضب کے ساتھ اللہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کا فطری رد عمل عاجزی اور خوف کا ہوتا ہے۔ اگر محض یہی کچھ ہوتا جو قرآن اللہ کے متعلق بتاتا ہے تو اسلام ایک خوفناک مذہب ہوتا لیکن اللہ کے نام جمیل اور رحمت بھی ہیں۔ اللہ اپنی ہر ہر مخلوق کے لئے شفیق ہوتا ہے۔ وہ بہت سے بچوں والی ماں کی مانند ہے جو اپنے ہر بچے کے لئے بہترین کی خواہش کرتی ہے۔

ایک روز رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بعض صحابہ کے ساتھ سفر فرما رہے تھے وہ بدوؤں کے ایک ڈیرہ پر رکے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا یہ کون لوگ ہیں؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ مسلمان ہیں۔ جب وہ آرام کر رہے تھے تو ایک عورت زمین میں بنائے ہوئے تندور میں روٹی پکا رہی تھی، اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ جب وہ تنور کی آگ تیز کر رہی تھی اس کی لپٹیں اٹھیں اور وہ اپنے بچہ کو گرمی سے بچانے کے لئے اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ چند منٹ بعد وہ عورت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور پوچھا "کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟" آپؐ نے جواب دیا ہاں۔ اس نے کہا "کیا یہ سچ نہیں کہ اللہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم ہے؟" آپؐ نے فرمایا "یہ درست ہے"۔ اس نے کہا "ایک ماں کبھی اپنے بچہ کو آگ میں نہیں پھینکے گی"۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کی طرف دیکھا اور رو پڑے۔ کچھ لمحوں بعد آپؐ نے اس عورت کی طرف دیکھا اور فرمایا: "اللہ صرف اس کو سزا دے گا جو نافرمان اور باغی ہے وہ جو اللہ سے بغاوت کرتا ہے اور یہ کہنے سے انکار کرتا ہے کہ "کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ کے"۔

دوسرے الفاظ میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ صرف ان کو سزا دے گا جو توحید کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے دور ہٹ جانے پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے

لا تقنطوا من رحمة الله ؕ ان الله یغفر الذنوب جمیعا ؕ (الزمر ۵۳)

ترجمہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک وہ سارے گناہ بخش دیتا ہے۔

یہ قرآن کے پیغام کا دوسرا رخ ہے۔ اگر اللہ ایک سخت گیر بادشاہ ہے تو وہ ایک تیمار دار نرس بھی ہے۔ رحم اور شرافت کے اسماء اللہ کی شفقت ظاہر کرتے ہیں ودود، رحمٰن، غفور، تواب، رقیب، محی۔ یہ صفات ہیں جو اپنی مخلوقات سے اللہ کی قربت کی توضیح اور اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں وہ کبھی بھی ان کو تنہا نہیں چھوڑتا۔

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ○(ق ۱۶)

ترجمہ: اور ہم رگ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔

وَ ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ؕ (الحدید : ۴)

ترجمہ: اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ؕ (البقرہ: ۱۱۵)

ترجمہ: جس طرف بھی تم منہ کرو وہاں ہی اللہ متوجہ ہے۔

ایک ایسے اللہ کے لئے جس کا تصور ایسا ہو انسان کا فطری رد عمل اس سے قربت محسوس کرنا اور اس سے محبت کرنا ہے۔

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کے دو چہرے ہیں۔ ایک رحیم چہرہ دوسرا غضب ناک یا ایک نرم اور دوسرا سخت گیر چہرہ یا ایک قریب اور دوسرا بعید چہرہ۔ لوگوں کو غضب والے چہرے سے ڈرنا چاہیے اور رحیم چہرے سے محبت کرنا چاہیے۔ مگر وہ اپنے تاثرات کا اظہار کس طرح کریں؟ طبعاً اگر لوگ کسی چیز سے ڈرتے ہیں تو وہ اس سے دور بھاگ جاتے ہیں، لیکن اللہ سے کوئی بھی نہیں چھپ سکتا کیونکہ جہاں بھی تم جاؤ اسے متوجہ پاتے ہو۔ پس قرآن لوگوں کو حکم دیتا ہے:

فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ ؕ (الذاریات: ۵۰)

ترجمہ: اللہ کی طرف دوڑو۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگا کرتے تھے "میں تیری رحمت میں پناہ چاہتا ہوں تیرے غضب سے، میں تیرے عفو میں پناہ چاہتا ہوں، تیری سزا سے، میں تجھ سے ہی تیری پناہ چاہتا ہوں"۔ جب ہم اللہ سے ڈرتے ہیں تو ہم اس سے دور نہیں بھاگتے، ہم اس کی طرف بھاگتے ہیں اور جب ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں تب بھی ہم اسی کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہی توحید کا عین منشا ہے۔ ہم کسی طرح بھی چیزوں سے رجوع کریں ہم واپس اللہ کی طرف ہی پناہ لیے جاتے ہیں۔

یکتائی اور کثرت کے تعلق سے قربت اور بعد کے متعلق سوچنا دوگنا ہو سکتا ہے۔ توحید تصدیق کرتی ہے کہ اللہ ایک ہے۔ کیونکہ اللہ لامحدود ہے، کائنات اس کی یکتائی میں کوئی حصہ نہیں بنا سکتی۔ دوسری دنیا (کائنات) بے شمار حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ اللہ واحد ہے جبکہ دنیا کثرت والی ہے۔ دوسرے نکتہ نگاہ سے اللہ کی وحدانیت کائنات کے اندر جھلکتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ کائنات ایک مکمل شے ہے اور اس کے تمام حصے ہم آہنگی، توازن اور مساوات میں شریک ہیں۔

تنزیہ و تشبیہ

دین کی تکنیکی زبان میں، خصوصاً اس میں جس نے ساتویں/تیرھویں صدی کے بعد نشوونما پائی، عام طور پر اللہ کی قربت و رحم اور اس کے بعد و غضب کے احساس کے تضاد کو ظاہر کرنے کے لئے دو اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ اصطلاحیں تنزیہ (عدیم المثالی کا بیان) اور تشبیہ (مماثلت کی تصدیق) ہیں۔

تنزیہ کے لغوی معنی کسی چیز کے خالص اور کسی دوسری چیز سے مبرا ہونے کا اعلان ہے۔ یہ وثوق سے کہتا ہے کہ اللہ مخلوقات کے تمام نقائص اور خامیوں سے منزہ و مبرا ہے۔ تنزیہ کے تناظر میں اللہ اتنا پاک اور خالص ہے کہ اس کا کسی پیدا شدہ چیز بشمول قیاس سے تقابل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہمارے تمام تصورات مخلوق ہیں۔ قرآن کی آیت جو تنزیہ کو وضاحت سے بیان کرتی ہے وہ ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ: ١١)

ترجمہ: اس کی طرح کی کوئی چیز نہیں۔

جو اسماء الٰہی تنزیہ ظاہر کرتے ہیں وہ اللہ کے جوہر (ذات) کے نام ہیں جو پہلے بیان ہو چکے مثلاً قدوس، حمید، ممتاز اور افضل۔ لیکن تمام شاہانہ اور غضب ناک نام بھی اسماء تنزیہ کہے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ مخلوق سے اللہ کے فرق پر زور دیتے ہیں یعنی یہ حقیقت کہ وہ مخلوقات کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے لامحدود فاصلہ پر ہے۔

تشبیہ کے معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے مثل قرار دینا ہے گویا وثوق سے کہنا کہ اللہ کو کوئی نہ کوئی مماثلت اپنی مخلوقات سے ہونا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ کیسے اس سے کوئی علاقہ رکھ سکتی ہیں؟ کائنات اور الہامی کتب اس کی صفات مقرر کرتی ہیں مثلاً حیات، علم، خواہش، قوت، رحم، سخاوت اور فراہمی۔ یہ اللہ کی صفات ہیں مگر یہ مخلوقات میں بھی پائی جاتی ہیں۔

تمام اسماء الٰہی کسی نہ کسی طرح کی تشبیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمیں یہ سوچنے کا موقع فراہم کرتے ہیں کہ اللہ ایسا اور ایسا ہے، گو ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی شے اس کے مثل نہیں۔ جونہی ہم اللہ کا نام لیتے ہیں ہم اپنے ذہن میں وہ کیسا ہے کا ایک تصور قائم کرتے ہیں۔ مثلاً جونہی ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ اللہ رحمٰن ہے، ہم رحمانیت کے اپنے تصور کے مطابق اللہ کا تصور کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ جب ہم اللہ کا ذاتی نام لیتے ہیں جیسے مختار تو ہم اس نام کو مختاری کے اپنے تصورات کے حوالے سے سمجھتے ہیں۔

ہر اسم الٰہی ایک تشبیہ کا خیال دلاتا ہے لیکن اللہ کے جمیل اور رحیم نام تشبیہ پر تنزیہ کی نسبت زیادہ زور دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ نام جو ہمیں مخلوقات سے اللہ کی قربت اور ان کے متعلق فکر کا احساس دلاتے ہیں وہ اسماء تشبیہ کے زمرہ میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ اللہ رحیم اور ودود ہے اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ دور اور الگ تھلگ نہیں بلکہ وہ قریب اور لوگوں کے روزمرہ معاملات کی فکر میں ہے۔ شرافت اور رحم کے نام ایک ایسے اللہ کو بیان کرتے ہیں جس کا لوگ ادراک کر سکتے ہیں اور اس سے محبت کر سکتے ہیں۔ یہ اسماء تجویز کرتے ہیں کہ ایک متفکر ماں کی طرح اللہ اپنی مخلوقات کے قریب رہتا ہے اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہے۔ جب کوئی شریف، اچھا اور محبت کرنے والا ہو تو عام انسانی رد عمل مثبت ہوتا ہے۔

تنزیہ کا تناظر اللہ کی وحدانیت کی تصدیق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ اکیلا ہی حق ہے۔ پس اللہ کے علاوہ ہر شے غیر حقیقی اور ناقابل التفات ہے۔ اللہ کی واحد حقانیت تمام غیر حقیقی چیزوں کو خارج کر دیتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں تشبیہ کا تناظر اعلان کرتا ہے کہ اللہ کی وحدانیت یہی ہے کہ اس کی ایک حقیقت تمام مخلوقات پر بھی لاگو ہے۔ دنیا جو اصل نہیں اور فریب نظر آتی ہے دراصل سوائے ایک حق کے کچھ نہیں جو اپنی آیات دکھا رہا ہے۔ بجائے تمام چیزوں کو خارج کرنے کے اللہ کی وحدانیت ان کو شامل کرتی ہے۔

اکثر تنزیہ اور تشبیہ کا تعلق دو ربانی ناموں سے ہوتا ہے باطن (اندرونی غیر واضح) اور ظاہر (بیرونی اور واضح)۔ جتنا حق باطن ہے تمام بیرونیت غیر اصل ہے اور یکتائی صرف ذات حق میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جس حد تک اللہ ظاہر ہے تمام ظاہر اصل ہے۔ پس اللہ کی حقانیت اور یکتائی کے ذریعہ عالم خود حقیقی اور ایک ہے۔

اللہ کی لاثانیت اور مماثلت دونوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر اللہ بعید ہے تو وہ قریب بھی ہے۔ وہ جمیل ہے اور اپنے جمال کی وجہ سے دلوں میں محبت پیدا کرتا ہے، اس کا جمال کسی مخلوق کے جمال کی طرح نہیں۔ "کوئی شے اس کے مثل نہیں"۔ اپنی قربت کے درمیان وہ دور ہے اور اپنی مماثلت میں وہ لاثانی ہے۔

ایک طریقہ اس کی لاثانیت کے تصور کو سمجھنے کا یہ ہے کہ ایک لامحدود دائرہ کا تصور کیا جائے (شکل نمبر ۱)۔ اللہ مرکز پر ہے وہ حجم سے ماورا وہ مرکزی نقطہ ہے جو دائرہ کی ابتداء ظاہر کرتا ہے۔ دنیا جس کا تجربہ ہم کرتے ہیں محیط اور مرکز سے لامحدود فاصلہ پر ہے۔ بہت سی دنیائیں ہیں جن کی تصویر کشی مرکزی دائروں میں کی جا سکتی ہے۔ بعض اللہ سے قریب اور بعض بہت دور۔ تمام دنیاؤں کا مرکز ایک ہے اور سب کی سب اللہ کی لاثانیت کے باعث مرکز سے کٹی ہوئی ہیں۔ صرف مرکزی نقطہ کا کوئی حجم نہیں "اور کوئی شے اس کے مثل نہیں"۔ ساتھ ہی ہر ہم مرکز دائرہ دوسرے دائرے جیسا ہے۔ خلق کی ہوئی اشیاء ایک سی صفات میں شریک ہیں لیکن اللہ ان کی کسی صفت میں شریک نہیں۔
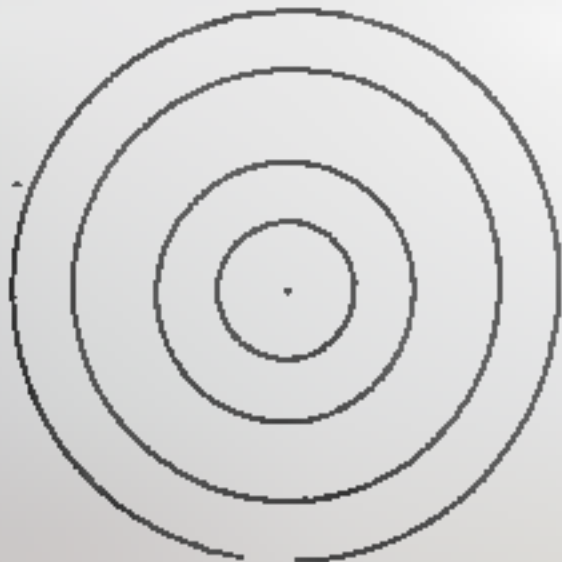
شکل نمبر ۱

تشبیہ کو متشکل کرنے کے لئے ہم اسی بے حجم نقطہ کو استعمال کر سکتے ہیں لیکن اب ہمیں تصور کرنا پڑے گا کہ نقطہ کے بے شمار قطر باہر کی طرف پھیل رہے ہیں (شکل نمبر ۲)۔ کائنات کی ہر مخلوق ایک قطر پر واقع ہے اور براہ راست مرکز سے منسلک ہے اور مرکزی نقطہ سے اپنی اصلیت حاصل کر رہی ہے۔ قطر اللہ کا تعلق مخلوق سے محبت، رحم، لطف اور شفقت کے ذریعہ کر رہا ہے۔
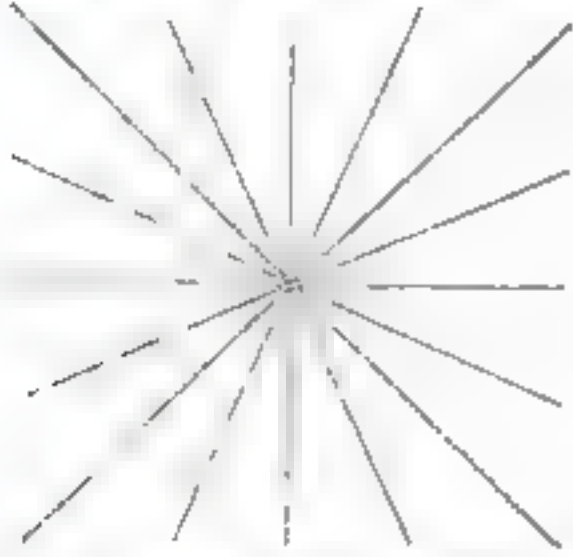
شکل نمبر ۲

تاہم تنزیہ و تشبیہ حقانیت کی مکمل تصویر پیش نہیں کرتیں۔ دنیا کو سمجھنے کے لئے بیک وقت دونوں تناظر کی ضرورت ہے (شکل نمبر ۳)۔ تب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز اللہ سے نزدیک اور دور ہے بیک وقت اللہ سے مشابہ اور غیر مماثل ہے۔ ہر چیز بیک وقت رحم و غضب، لطف اور سختی، حیات اور موت، عطا اور مراجعت، اصلیت اور غیر اصلیت سے متصادم ہے۔۔۔ یہی توحید ہے۔
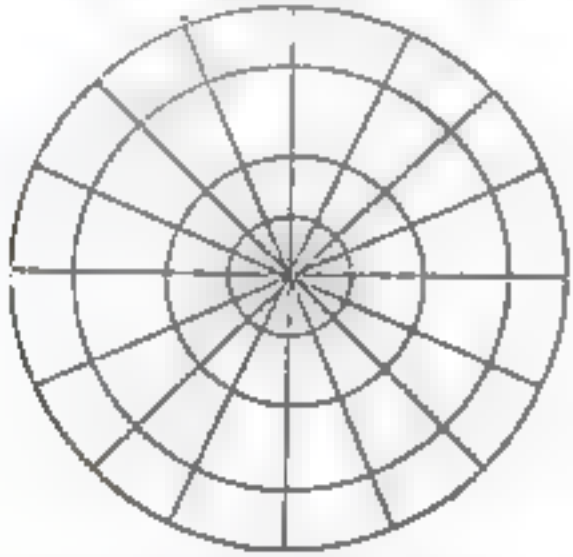
شکل نمبر ۳

تنزیہ اور تشبیہ یا اللہ کی دوری اور قربت کے دو تناظر اسلامی متون اور مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ ہم ایک آسان مثال پیش کرتے ہیں۔ ہم پہلے ہی قرآنی فارمولے کا حوالہ دے چکے ہیں "تعریف اللہ کو سزاوار ہے" جسے مسلمان اکثر مواقع پر مختلف سیاق و سباق میں تلاوت کرتے ہیں کیونکہ یہ اللہ کے حضور شکر کا اظہار ہے۔ جب کوئی اچھی بات ہوتی ہے جب وہ کوئی چیز کھاتے یا پیتے ہیں یا کوئی ایسی چیز دیکھتے ہیں جس سے مسرت ہوتی ہے تو وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ اگر وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی میں ذرا محتاط ہوں تو وہ ہر اچھی اور بری بات، مصیبت اور خوشی ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ وہ تسلیم کریں گے کہ ہر چیز جو اللہ کی طرف سے آتی ہے اس کا شکریہ کے ساتھ اقرار کیا جائے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر حال میں شکر اللہ ہی کا ہے"۔

صیغۂ حمد رکلمات حمد نعمتوں کو اللہ سے وابستہ کر دیتا ہے۔ وہ کائنات اور روح کی نشانیوں کو ان کی ربانی ابتداء سے متعلق کر دیتا ہے۔ یوں وہ تشبیہ کے تناظر کی توثیق کرتا ہے۔ اللہ کی قربت اور ہر مرحلہ پر اس کا عمل، نوع انسانی کے لئے اس کا لطف و

کرم سب کی توثیق۔

ایک اور قرآنی ترکیب جس کی عام طور پر تلاوت کی جاتی ہے "کبریائی اللہ کی ہے" (سبحان اللہ) ہے۔ "تعریف اللہ کو سزاوار ہے" کے مقابلہ میں یہ مرکب تنزیہ پر زور دیتا ہے۔ یہ اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب اللہ کی حکمتوں میں سے کوئی حکمت ظاہر ہوتی ہے یا اس کی نعمتوں کا ذکر آتا ہے۔ قرآن اس فقرہ کو اس معنی میں بھی استعمال کرتا ہے۔ جب وہ مشرکوں کے نظریات کی تردید کرتا ہے۔ مثلاً

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۙ﴿﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴿﴾ (الصّٰفّٰت۔ ۱۵۸ ـ ۱۵۹)

ترجمہ: اور انہوں نے خدا اور جنوں میں رشتہ ٹھیرا لیا ہے۔ حالانکہ کہ جنات جانتے ہیں کہ وہ (خدا کے سامنے) حاضر کئے جائیں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بتاتے ہیں۔

یہ جملے جو مسلمان عادتاً اور اکثر بغیر اس کے معنی پر غور کئے تلاوت کرتے ہیں روزمرہ زندگی میں تنزیہ اور تشبیہ ظاہر کرتے ہیں۔ جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کلمات کی ضرورت ہے کیونکہ انسانی حیثیت تقاضا کرتی ہے کہ اللہ کو غائب و حاضر سمجھا جائے۔

مختصراً تنزیہ اور تشبیہ توحید کے دو قطبین کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے یہ دو دوامدادی نظریات اس وقت سامنے رہنے چاہئیں جب ہم بعض بنیادی مسائل پر بحث کریں جیسے کائنات میں نوع انسانی کا کردار، نبوت کی نوعیت اور اللہ کی طرف واپسی۔

رحم کی تقدیم

توحید کا تناظر اللہ کی یکتائی کا دعوی کرتا ہے وہی اصل حقیقت ہے۔ یہ تسلیم کرتا ہے کہ اللہ دنیا کی تمام چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ حقیقت سے کسی رابطہ کے بغیر چیزیں وجود نہیں پا سکتیں۔ یہ دعوی کرتا ہے کہ اللہ تمام چیزوں سے بے پناہ دور ہے (تنزیہ) لیکن یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ وہ تمام چیزوں میں موجود ہے (تشبیہ)۔

ہم نے تجویز کیا تھا کہ فرمانروائی اور غضب کے اسماء تشبیہ کے مقابلہ میں تنزیہ سے زیادہ قریب ہیں کیونکہ اسماءِ فرمانروائی اللہ کی مکمل غیریت، اس کے جبروت اور شاندار عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔ اسماء جیسے جبار، قہار، مقتدر اور شدید العقاب ایک دور بیٹھے بادشاہ کی خبر دیتے ہیں جو اپنی سلطنت کو بغیر میرے یا تمہارے جذبات کا خیال کئے جیسے چاہتا ہے چلاتا ہے۔

اسی طرح اسماءِ جمال و رحم تنزیہ کے مقابلہ میں تشبیہ سے زیادہ قریب ہیں، کیونکہ وہ کسی ایسی ہستی کی خبر دیتے ہیں جس کو روزمرہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل پر گہری نظر ہے۔ اگر اللہ شہ رگ سے زیادہ قریب نہ ہوتا تو وہ کیوں کہتا:

ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (المومن: ٦٠)

ترجمہ: مجھ کو پکارو کہ میں تمہیں جواب دوں۔

اگر ہم اللہ کو قریب و بعید، رؤف و غنی اور حلیم و شدید دونوں تصور کریں تو ہم بہت جلد اللہ کے سلسلہ میں حواس باختہ ہو جائیں۔ ہم اس کے غضب سے ڈریں یا اس کے رحم کی آس لگائیں؟ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، روایتی جواب ہمیشہ یہ رہا ہے کہ

لوگوں کو خوف اور امید دونوں رکھنا چاہئیں۔ بغیر خوف لوگ گستاخ ہو جائیں اور عواقب کی پروا کئے بغیر من مانی کرنے لگیں۔ بغیر آس وہ لرزہ براندام ہوں اور مر جائیں۔

کیا آس اور خوف میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا چاہیے یا لوگ دونوں کو برابر گردانیں؟ اگر اللہ کی صفات ملوکیت اور جمال صحیح توازن میں ہیں تو کہنا پڑے گا کہ لوگوں کو خوف اور آس کی یکساں ضرورت ہے۔ لیکن اصل میں روایت بتاتی ہے کہ ملوکیت اور جمال ایک سطح پر نہیں ہیں۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ خوف الٰہی اتنا ردعمل پیدا نہیں کرتا جتنا مخلوق کا خوف۔ اس دنیا میں جب آپ کسی چیز سے خوف کھاتے ہیں تو اس سے دور بھاگتے ہیں لیکن اگر اس سے کسی منفعت کی امید ہو تو اس کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں۔ تاہم منطق بات یہ ہے کہ جب اللہ سے خوف کھایا جائے تو اس کی طرف پیش قدمی کی جائے کیونکہ اس سے بھاگ کر کوئی جائے پناہ نہیں۔ اللہ سے ہر تعلق اس کی قربت کے حصول کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کی قربت کا انسانی ردعمل اس سے اور زیادہ قربت تلاش کرتا ہے۔ قربت ایک تشبیہی صفت ہے نہ کہ تنزیہی۔

اللہ کی لاثانیت کا پیام ہے کہ لوگ مماثلت کے حصول کی جدوجہد کریں اور مماثلت کا پیام ہے کہ انہیں زیادہ مماثلت حاصل کرنا چاہیے، لاثانیت نہیں مماثلت ہی مرغوب منزل ہے۔

بے شک اللہ نوع انسانی سے دور ہے اور بار دیگر یہی توحید کا اللہ ہے نہ کہ موجودہ مقبول ثقافت کا خدا۔ یہی خدا حیات، علم، ارادہ، قوت، نطق، رحم، فلاح اور ہر اصل چیز کا منبع ہے یہ کہنا کہ اللہ بعید ہے تصدیق کرتا ہے کہ بندے حقیقت سے دور رہتے ہیں کیونکہ ان کی حیات، علم، طلب، قوت اور ہر مثبت صفت انتہائی مدہم اور ناپائیدار ہے۔

اللہ قریب بھی ہے کیونکہ کوئی چیز بھی حقیقت سے فرار حاصل نہیں کر سکتی۔ نوع انسانی کی بات کرنا حیات، علم، طلب وغیرہ کی بات کرتا ہے خواہ وہ کتنی ہی کمزور صفات کیوں نہ ہوں۔ مکمل عدمیت میں کوئی فرار نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ صفات اولاً انسانوں کی ملک نہیں۔ آپ جس چیز پر قابض نہیں اسے کیونکر پھینک سکتے ہیں؟ یہ صفات الٰہی ہیں اور جیسے وہ فیصلہ فرماتا ہے یہ ہمارے پاس رہتی ہیں۔ جیسا کہ ہم اس وقت دیکھیں گے جب ہم مراجعت پر بات کریں گے۔ اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ موت محض ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہے۔ حالات بدل جاتے ہیں لیکن وجودیت کی بنیادی صفات نہیں بدلتیں۔

یہ سب یہ ثابت کرنے کے لئے ہے کہ اللہ ہی حق ہے جبکہ مخلوق غیر حقیقی ہیں۔ ہر حقانیت جو چیزوں کے پاس ہے ان کو اللہ نے دی ہے اور اسی کی قوت واختیار میں رہتی ہے۔ ان کے پاس اللہ کی عطا کردہ حقیقتوں سے فرار کا کوئی ذریعہ نہیں۔ حقیقت ہی سب کچھ ہے جبکہ غیر حقیقت کچھ بھی نہیں۔ حقانیت اللہ کی ملکیت ہے، جس قدر کوئی شے حقیقی ہے اتنا ہی وہ اللہ سے قریب ہے۔ جتنا وہ کم حقیقی ہے اتنا ہی وہ اللہ سے دور ہے۔ لیکن فاصلے کے باوجود چیزیں اللہ سے نزدیک ہیں کیونکہ حقیقت ہونا اللہ کی ایک نشانی یا اس کی روشنی کی ایک شعاع ہے۔

عموماً قرآن اور حدیث قرب وبُعد پر ان کے انسانی انجام کی حدود میں بحث کرتے ہیں۔ اللہ سے فاصلہ پر ہونا صفات ملکوتیت اور غضب کے تابع ہونا ہے اور یہ ایک تکلیف دہ صورتحال ہو سکتی ہے۔ قریب ہونا صفات جمال ورحم کے تابع ہونا ہے اور یہ خوشگوار مقام ہے۔ ہم دیکھیں گے قرآن کس طرح فاصلہ کو جہنم اور جنت کو قربت سے مربوط کرتا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ جمال اور رحم بمقابلہ ملکوتیت اور غضب کے زیادہ حقیقی ہیں کیونکہ جمال اور رحم اللہ سے قربت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جو کچھ اللہ سے قریب ہے زیادہ اس جیسا ہے بمقابلہ اسکے جو فاصلہ پر ہے اور یوں زیادہ حقیقی ہے۔ پس صفات تشبیہ صفات تنزیہ کے مقابلہ میں حق کی بہتر نمائندہ ہیں۔

ایک طریقہ جس سے قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسماءِ جمال و رحم اللہ کی اصل ماہیت کی زیادہ صحیح نمائندگی کرتے ہیں بمقابلہ اسماءِ سطوت اور غضب۔ اسکے اس بیان میں ہے کہ اللہ کا رحم تمام چیزوں کو چینے سے لگاتا ہے۔

عذابی اصیب بہ من اشاءُ و رحمتی وسعت کُلَّ شیءٍ (الاعراف ۱۵۶)

ترجمہ میں اپنا عذاب جس تک چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں لیکن میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔

قرآن کبھی یہ نہیں کہتا کہ اللہ ہر چیز پر عذاب ڈالتا ہے۔ وہ غضب ناک ہے صرف ان مخلوقات کے لئے جو خود سے اس کی قربت کا انکار کرتے ہیں، جو حقیقت کی موجودگی میں اپنے خیالات اور اعمال کے ذریعہ فرار اختیار کرتے ہیں۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے اپنے تخت پر لکھ رکھا ہے "میرا رحم میرے غضب پر فوقیت رکھتا ہے"۔ یہ فوقیت وجودی نہیں وجودیاتی ہے۔ بالفاظ دیگر رحم، غضب کے مقابلہ میں حقیقت کے لئے زیادہ بنیادی ہے۔ رحم کا تعلق حق کی خاص فطرت سے ہے جبکہ غضب ایک ثانوی صفت ہے جو بعض مخلوقات کے مخصوص حالات میں پیدا ہوتی ہے۔

یہ تصور کہ رحم اللہ کے غضب پر سبقت لے جاتا ہے اسلامی فکر کا ایک نہایت اہم اصول ہے۔ اس کے بے شمار اصولی اور عملی ردعمل ہیں۔ ہم وقتاً فوقتاً ان کی طرف پلٹتے رہیں گے لیکن وقتی طور پر یہ دیکھنا اہم ہے یہ اصول کس طرح تنزیہ اور تشبیہ میں تعلق قائم کرتا ہے۔ اللہ کی لاثانیت موجودات کی ایک حقیقت ہے لیکن اس کی مماثلت زیادہ بنیادی حقیقت ہے۔ توحید ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ ہم سے مختلف ہے لیکن وہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے مختلف نہیں اور یہ دوسرا بیان مقدم ہے۔ رحم سبقت لے جاتا ہے اور رحم ہی حق سے قربت قائم کرتا ہے۔

اسلام اختلاف کے نظریہ سے شروع ہوتا ہے۔ ہم اللہ سے مختلف ہیں اور اس سے دور۔ اللہ بالکل دوسرا ہے اور پیدا کی گئی اشیا اپنی مثبت صفات کی کمی کے باعث مجبور محض ہیں، لیکن اسلامی تعلیمات کا مقصد لوگوں کو غضب (فاصلہ) کے حوالہ کر دینا نہیں بلکہ انہیں رحم (قربت) کی طرف لے جانا ہے۔ لوگوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اللہ سے اپنے فاصلہ کے متعلق کچھ کریں گے اور اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ قربت کی طرف چلیں گے قربت کی تمنا کی جانی چاہیے کیونکہ ہر چیز کے لئے قربت ہی حق، خیر، مفید اور خوش کن ہے۔

ایک ربانی صفت جو مخلوق کے تعلق سے مستحکم ہے یہ ہے کہ رحم ہی سب کچھ ہے جو اللہ لوگوں کو خیر اور حق کے فوائد پہنچانے کے لئے کرتا ہے۔ رحم اللہ کی بنیادی غرض کی نمائندگی کرتا ہے کیونکہ رحم خود اللہ ہے۔ غضب ایک حادثاتی معاملہ ہے جو بالآخر نابود ہو جائے گا کیونکہ غضب ان چیزوں سے متعلق ہے جو اللہ سے علیحدہ ہیں اور صحیح معنی میں کوئی چیز بھی اللہ سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔ جونہی قربت حاصل ہوتی ہے دوری نہیں رہتی۔

رحم کے اسلامی فکر میں بنیادی کردار پر اس گفتگو کے ساتھ ہم اسماءِ الٰہی اور صفات پر اپنی گفتگو ختم کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ بحث کبھی مکمل ہو سکتی ہے کیونکہ اسماء اور صفات کی نمو توحید کی تشریح کا محض ایک طریقہ ہے اور توحید اس بات کی تشریح ہے کہ کس طرح اللہ اپنی مخلوق سے وابستہ ہے جو لامتناہی آیات ہیں۔ ہر آیت الٰہی میں اللہ سے متعلق سیکھنے کیلئے ایک سبق ہے اس کی فطرت کے ادراک کے لئے کوئی درس۔ لیکن آیات کی کوئی انتہا نہیں کیونکہ کائنات کا، جو اللہ کے علاوہ ہر چیز

ہے، کوئی آخر نہیں۔

افعال:

صفات الٰہی پر لاانتہا بحث کی جا سکتی ہے لیکن عموماً ان کا خلاصہ ننانوے ناموں میں دیا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی صفات پر بھی لاانتہا بحث ہو سکتی ہے جس طرح جدید سائنس واضح کرتی ہے لیکن قرآن اور حدیث سے ایک واضح تنظیمی تصور سامنے آتا ہے جس نے مسلم علماء کو کائنات کی ایک ایسی تصویر فراہم کی ہے جو آیات الٰہی کا ایک مستقل وسیع اور مربوط منظر پیش کرتی ہے یا آیات کا ایک بڑا ذخیرہ جو ایک واحد پیغام کا اعلان کرتا ہے۔

اسلامی علم دین کی زبان میں افعال الٰہی کی اصطلاح کا استعمال تخلیق کی ہوئی چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، یہ بتانے کے لئے کہ تمام اشیاء اللہ کی تخلیقات ہیں اور اس کی صفات کی علامات، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں افعال کی اصطلاح ذات اور خواص کے سیاق و سباق میں استعمال ہوتی ہے۔ اللہ کی ذات خود اللہ ہے اس کی حقیقت صرف وہی جانتا ہے۔ صفات الٰہی اللہ کی ذات کی وہ خوبیاں (اس کے اسماء) ہیں جو وہ اپنی مخلوق پر اپنی آیات (خواہ الہامی کتب میں خواہ فطرت میں) کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ افعال کائنات کی چیزیں اور واقعات ہیں جو اللہ کی سرگرمی سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ان تینوں اصطلاحوں کا باہم تعلق اس وقت سمجھ میں آ سکتا ہے جب ہم ان کو اپنے اوپر لاگو کریں۔ کسی شخص کی ذات بلحاظ وصف، جیسے مرد یا عورت، بوڑھا یا جوان، خوشگوار یا ناخوشگوار، زیرک یا غبی، قوی یا ضعیف اس کی ذات ہی ہے۔ صفات وہ وظائف ہیں جو اس شخص میں ہیں، جیسے مردانگی، جوانی، خوشگواری اور زیرکی۔ افعال وہ سب کچھ ہیں جو وہ شخص کرتا ہے یا اس کی شخصیت سے ظاہر ہوتے ہیں جس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ جوان، خوشگوار یا زیرک ہے۔

غور کیجئے افعال صفات پر منحصر ہیں اور صفات ذات پر، خواہ ہم اللہ کے متعلق گفتگو کریں یا اشخاص یا دوسری چیزوں کے متعلق۔ ایک طالبعلم کلاس میں حاضری دیتا ہے جو بہت سی صفات مثلاً حیات، علم، طلب، قوت اور گویائی کی بنا پر ایک فعل ہے۔ یہ تمام صفات کسی کی موجودگی (ذات) پر منحصر ہیں۔ اگر کوئی نہ ہو تو ہم صفات پر گفتگو نہیں کر سکتے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ آپ ایک بڑھئی ہیں اور مکان بناتے ہیں۔ ذات آپ ہیں، صفات میں نجاری کا علم، مکان بنانے کی طلب اور ہتھوڑا و آری اٹھانے کی قوت شامل ہیں۔ افعال وہ تمام کام ہیں جو آپ مکان بنانے کے لئے کرتے ہیں۔ آخری فعل جو تمام کائنات کے مماثل ہے مکان ہے۔

مختصراً جب ہم اللہ اور توحید پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ تین مختلف سطح رہوتی ہے۔ پہلے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایک واحد حقیقت (ذات) موجود ہے جو اظہار کے تنوع میں پوشیدہ ہے۔ دوسرے ہم وہ ذرائع بیان کرتے ہیں جن سے وہ چیز ہمیں نظر آتی ہے اور ہمارے بیانات صفات کہلاتے ہیں۔ تیسرے ہم ان چیزوں کو بیان کرتے ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ایسے افعال کے طور پر جنہیں ہم پہچانتے ہیں کہ یہ افعال ان صفات پر منحصر ہیں ظاہر ہوتی ہیں۔

اللہ کے افعال وہ تمام چیزیں ہیں جو وہ کائنات میں تمام زمان و مکان میں تخلیق کرتا ہے۔ عالم یا کائنات اپنی تمام زمنی اور فضائی وسعت میں، محض ایک لامحدود فعل ہے جو ہر اس چیز کو خارجی شکل دیتا ہے جس کو اللہ اپنے لامحدود علم سے جانتا ہے۔

ایک نقطہ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ صرف دو چیزوں کا وجود ہے: اللہ اور اس کے افعال۔ عموماً اس منظر کو یہ کہہ کر ظاہر کیا جاتا ہے کہ ہمارے پاس اللہ اور اس کے علاوہ ہر چیز ہے، یوں "اللہ کے سوا ہر چیز" کائنات کا مترادف ہے یا اللہ کے کل

افعال کا مجموعہ۔ صفات یا اسماء، مشاہدے میں آنے والے اللہ اور کائنات کے تعلق کو بیان کرتے ہیں۔ صفات ہستیوں کی شکل میں موجود نہیں بلکہ ذہن ان کا ادراک اس تعلق سے کرتا ہے جو افعال اور ذات میں ہے۔

خود کو ایک مثال کے طور پر لیجئے۔ تمام کائنات میں آپ ہیں اور آپ کے علاوہ بھی۔ آپ کی صفات چیزوں کے تیسرے گروہ کے طور پر وجود نہیں رکھتیں جو آپ سے اور دوسری چیزوں سے مختلف ہوں۔ آپ کی صفات کی مثالیں چھوٹی اور بڑی، ماں اور بیٹی، زیرک اور غبی، مضبوط اور کمزور، درگزر اور انتقام وغیرہ ہیں۔ آپ پہاڑوں، سیاروں اور ستاروں سے چھوٹے ہیں اور کیڑوں، جراثیم اور ایٹم سے بڑے ہیں۔ آپ اپنے بچوں کے حوالے سے ماں ہیں، اور اپنی ماں کے تعلق سے بیٹی۔ آپ اپنے بعض دوستوں، اپنے بہت سے بچوں کے مقابلہ میں زیرک ہیں۔ آپ اپنے بعض واقف کاروں اور ارسطو و آئنسٹائن جیسے لوگوں کے مقابلہ میں غبی ہیں۔ جب ایک بلا آپ کو نوچتا ہے تو آپ درگزر کرتے ہیں لیکن جب مچھر آپ کا خون پیتا ہے تو آپ منتقم ہو جاتے ہیں۔

ہماری تمام صفات دوسروں سے ہمارے تعلقات پر منحصر ہیں۔ اسی طرح اللہ کی صفات کا تصور دوسری چیزوں سے اس کے تعلق کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری چیزیں اس کی اپنی ذات کے علاوہ ہر چیز ہے یعنی افعال۔

غیر مرئی اور مرئی

قرآن ہر چیز جو دنیا کے متعلق کہتا ہے اسے اللہ کے افعال کا بیان تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض بیان زیادہ عام ہیں اور بعض زیادہ معین۔ بعض آیات بہت سے یا تمام افعال بیان کرتی ہیں اور بعض کوئی ایک یا چند۔ قرآنی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے، حدیث سے مدد لیتے ہوئے اور وقتی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلم مفکرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ افعال کو دو بنیادی گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

قرآن متعدد آیات میں ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ "نادیدہ (غیر مرئی) اور ظاہر (مرئی) کا عالم ہے۔ واضح طور پر ہر موجود چیز کو ہم دیکھ سکتے ہیں یا نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارا علم وہاں تک پہنچتا ہے جہاں تک ہم دیکھ سکتے ہیں، گرفت کر سکتے ہیں، احاطہ کر سکتے ہیں، تفتیش اور تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اور تقریباً ساری دنیا کو ہمارے لئے لاعلم چھوڑ دیتا ہے کیونکہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ اسے دیکھنے اور گرفت میں لانے کا نہیں ہے۔ لیکن ہمارے بالمقابل اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے خواہ ہم اسے دیکھ سکتے ہوں یا نہ دیکھ سکتے ہوں۔

جب قرآن نادیدہ (غیر مرئی) کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس کا یہ منشا معلوم نہیں ہوتا کہ عملاً ہماری نظر ان تک نہیں پہنچتی بلکہ اصولاً ہماری نظر وہاں تک نہیں پہنچتی۔ ہماری آنکھیں صرف مادی اشیاء کو دیکھ سکتی ہیں۔ جبکہ دنیا صرف مادی چیزوں تک ہی وسیع نہیں یہ غیر مادی چیزوں کی سطح پر بھی بہت وسیع ہے۔

دوسری سورۃ کے آغاز میں قرآن اپنے متعلق ان لوگوں کے لئے ایک رہنما کی حیثیت سے گفتگو کرتا ہے جو اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کے معاملہ میں محتاط ہیں اور "جو بے دیکھی چیزوں پر یقین کرتے ہیں"۔ اگر ہم ایمان کو ایک لفظ میں بتانا چاہیں تو ہم "نادیدہ" کہہ سکتے ہیں۔ بے شک الہامی کتب ہم کو تحریری شکل میں نظر آتی ہیں لیکن ان کے معنی ہمارے لئے نادیدہ ہیں جو تشریح کرتا ہے کہ کیوں تمام مذاہب کے لوگوں نے بہت زیادہ وقت اور محنت اپنی الہامی کتب کے معنی کی تلاش میں صرف کی ہے اور کیوں وہ یہ کئے جا رہے ہیں۔

مختصراً مسلمانوں نے دو بنیادی قسم کی حقیقتیں شناخت کی ہیں نادیدہ اور ظاہر یا غیر موجود (غائب) اور جو دیکھی گئیں (شہادۃ)۔ نادیدہ کو دو بنیادی گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اللہ اور فرشتے۔ اللہ کو کسی نے نہیں دیکھا جبکہ فرشتوں کو دوسرے فرشتے، اللہ اور بعض مستثنیٰ انسان جیسے پیغمبر دیکھتے ہیں۔ پس فرشتے بیشتر انسانوں کے تعلق سے نادیدہ ہیں لیکن اپنے اور اللہ کے تعلق سے ظاہر ہیں۔

ظاہر حسی دنیا ہے جو ہر اس چیز پر مشتمل ہے جسے ہم اصلاً یا اصولاً دیکھ سکتے ہیں۔ ظاہر کو بھی دو اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ وہ چیزیں جنہیں ہم سب دیکھ سکتے ہیں مثلاً بیرونی دنیا اور وہ چیزیں جن کو دیکھنے میں ہم سب شریک نہیں مثلاً خواب اور فریب نظر۔ خواب صرف دیکھنے والے کے لئے ظاہر ہیں لیکن ہماری دنیا میں کسی اور کے لئے نہیں۔ بے شک اللہ ہمارے خوابوں کا علم رکھتا ہے اور وہ فرشتے بھی جن کا کام انہیں دیکھنا ہے (یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ فرشتے اپنے فرائض کے لحاظ سے بہت سی اقسام میں بٹے ہوئے ہیں)۔ دوسری قسم کی چیزیں بھی ہیں جو نیم ظاہری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں، موجودات جن کا بیشتر حصہ نہیں دیکھا جا سکتا لیکن موقع بموقع وہ اپنے کو ظاہر کرتی رہتی ہیں۔ جن اسی قسم میں آتے ہیں (ہم ان کے متعلق آگے چل کر مزید بیان کریں گے)۔

آسمان اور زمین:

دنیا کی بحث سے متعلق قرآنی اصطلاحات کا ایک اور جوڑا جو اکثر استعمال ہوا ہے آسمان اور زمین ہے۔ آسمان کی بات کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ اسے جنت کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے۔ اسلام میں جنت دوزخ کے مقابل استعمال ہوتا ہے جبکہ آسمان ہمیشہ زمین کے مقابل آتا ہے۔ جنت اور دوزخ کا تعلق اللہ کی طرف واپسی (آخرت) سے ہے۔ ان کا مکمل تجربہ یوم آخر سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ لیکن زمین و آسمان کائنات کی اس صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو دنیا کی تخلیق سے یوم آخر تک کی ہے۔ یوم آخرت کو آسمان اور زمین بدل دیئے جائیں گے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ (ابراہیم ۴۸)

ترجمہ جس دن اس زمین سے اور زمین بدلی جائے اور آسمان بدلے جائیں اور لوگ نکل کھڑے ہوں اللہ واحد اور زبردست کے سامنے۔

قرآن سات آسمانوں کی بات کرتا ہے اور ان کی نشاندہی سات سیاروں (ایک اصطلاح جس کے معنی یونانی اور عربی میں آوارہ آسمانی اجسام ہیں) سے کی گئی ہے۔ ان سیاروں کو موجودہ علم فلکیات پر قیاس نہ کرنا ضروری ہے۔ گو مسلمانوں نے علم فلکیات کی سائنس کو ایک بلند درجہ تک ترقی دی، قرآنی علم فلکیات آیات کا علم فلکیات ہے۔ جو کچھ ہم اپنی ظاہری آنکھ سے دیکھتے ہیں اس کو ہمارے لئے نادیدہ کی تعلیم کے ذریعہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ، فرشتے اور یوم آخرت۔ آسمان سے متعلق قرآنی مباحث اس سطح پر رہتے ہیں جسے تاریک رات میں لوگ اپنے صحن میں نکل کر دیکھ سکتے ہیں۔

یہ ذہن نشین رکھنا مفید ہو گا کہ آسمان ان لوگوں کے لئے ہمیشہ بامعنی رہے ہیں جو فطرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے ہیں اور ان کو باوجود فضائی آلودگی اور انسان کے بنائے ہوئے روشنی کے ذرائع کی مزاحمت کے واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جدید دنیا میں، سائنسی علم نے ہمیں فطرت کے براہ راست تجربہ سے دور کر دیا ہے۔ ہم اب چیزوں کو اس طرح نہیں دیکھ سکتے جس طرح وہ خود کو پیش کرتی ہیں۔ اس کے برخلاف ہم چیزوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح ہمیں ابتدائی اسکول میں سکھایا گیا۔

صرف یہی نہیں، اکثر ہم چیزوں کو دیکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے کیونکہ ہم خیال کرتے ہیں کہ سائنسدان، ماہر سب کچھ جانتے ہیں اور ہم خود کوئی اہم چیز دریافت نہیں کر سکتے۔ اگر ہمیں کسی چیز کے علم کی ضرورت ہے ہم اسے کسی کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔ بہر حال، ہمارے ٹیلی ویژن کی جلتی بجھتی لیکٹرانک روشنی زیادہ حرکی اور نظر فریب ہے بمقابلہ ستاروں کے جو شاید ہی حرکت کرتے ہوں۔ (لوگ ٹیلی ویژن سے پہلے آخر رات کو کیا کرتے تھے؟)

ایک صعودی ترتیب میں سات سیارے چاند، عطارد، زہرہ، سورج، مریخ، جوپیٹر اور زحل ہیں۔ ہر سیارہ اپنے آسمان میں تیرتا ہے۔ کہاوت عام طور سے اس فہرست میں دو اور آسمانوں کا اضافہ کرتی ہے۔۔۔ کرسی اور عرش۔۔۔ بعض اوقات ان دونوں کو ستارے جڑے ہوئے گنبد اور بلا ستاروں کا کرہ خیال کیا جاتا ہے۔ قرآن کرسی کا ذکر صرف ایک مرتبہ اس مشہور آیت میں کرتا ہے جو اکثر مساجد اور مزاروں پر لکھی نظر آتی ہیں

اللهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○ (البقرہ ۲۵۵)

ترجمہ اللہ (وہ معبود برحق ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ، ہمیشہ رہنے والا، اسے نہ کوئی اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ کون ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس سے (کسی کی) سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے (اسی قدر معلوم کرا دیتا ہے) اس کی بادشاہی (کرسی اور علم) آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے اور اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں وہ بڑا عالی رتبہ اور جلیل القدر ہے۔

یاد رہے کہ قرآن کائنات کے متعلق نہیں بلکہ صفات الٰہی کی بات کر رہا ہے۔ اللہ کو تمام چیزوں کا علم ہے لیکن لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا وہ چاہتا ہے کہ وہ جانیں۔ بالفاظ دیگر ان کا علم ناپا تولا ہے جبکہ اس کا علم ناپ تول سے مبرا ہے۔ پھر یہ آیت گزرتی دنیا کا ذکر کرتی ہے۔۔۔ آسمان اور زمین۔ اور یہ کہتی ہے کہ اللہ کی کرسی ان پر حاوی ہے۔ کرسی بظاہر وہ جگہ ہے جہاں اللہ اپنے قدم رکھتا ہے۔ اگر اللہ کے قدم عالم کے پار ہیں تو اس کا سر کہاں ہو گا؟ یہ بات نہیں کہ اللہ کے سر اور پیر ہیں یا کم از کم اس معنی میں جن میں ہمارے سر پیر ہیں تاہم تمثیل معنی خیز ہے۔ اللہ میں جو کچھ سب سے نیچے ہے اس سے بہت دور ہے جو دنیا میں سب سے بلند ہے۔ ہم پر اثر انداز ہونے کے لئے اللہ کو نیچے جھکنا پڑتا ہے اور اسے پانے کے لئے ہمیں اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔

کرسی اللہ کے تخت سے نیچے واقع ہے جہاں اللہ، بادشاہ، آسمان اور زمین کو تخلیق کر کے تشریف فرما ہو گیا۔ قرآن تخت کا ذکر اکیس آیتوں میں کرتا ہے جو سب کی سب اللہ کی بادشاہت اور قوت کی معنی خیز ہیں۔ تاہم، غالباً بادشاہت کے پر شکوہ اور سخت تصور کو زائل کرنے کے لئے قرآن صرف ایک ربانی نام کو براہ راست تخت سے متعلق کرتا ہے اور وہ ہے رحیم۔

اللہ دوسری چیزوں جیسا نہیں جس کا اولین وصف بادشاہی اور سختی ہے۔ اس کے برخلاف اللہ ایک بادشاہ ہے جس کا شرف اس کی سختی سے کہیں زیادہ ہے۔ یاد رکھئے تخت پر جو تحریر ہے وہ یوں ہے "میرا رحم میرے غضب پر فوقیت رکھتا ہے"۔ اللہ کی حاکمیت اپنی مخلوق کے لئے سوائے خیر کے کچھ نہیں لاتی۔ لہٰذا عرش کا قرآنی تصور جاہ و جلال اور جمال کو شامل کرتا ہے۔ ایسی

چیز کے لئے جو سارے عالم پر حاوی ہے، یہ نہایت مناسب ہے کیونکہ عالم دونوں قسم کی صفات کا مجموعہ ہے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ جب قرآن آسمانوں کا ذکر کرتا ہے تو وہ نظام شمسی کی بات کر رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ آسمان سیاروں سے مزین ہے جو نظر آتے ہیں جبکہ آسمان خود نظر نہیں آتا۔ احادیث کا ایک حصہ اس کی وضاحت کرتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کا بیان ہے جس کا ذکر قرآن میں کئی جگہ ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُO (بنی اسرائیل ۱)

ترجمہ: وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصےٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا ہَوٰیO مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰیO وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْہَوٰیO اِنْ ہُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰیO عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰیO ذُوْمِرَّۃٍ ؕ فَاسْتَوٰیO وَہُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰیO ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰیO فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰیO فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰیO مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰیO اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰیO وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰیO عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰیO عِنْدَہَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰیO اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰیO مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰیO لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰیO (النجم ۱۔۱۸)

ترجمہ: تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔ کہ تمہارے رفیق (محمدؐ) نہ رستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں۔ اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔ ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا۔ (یعنی جبرائیل) طاقتور نے پھر وہ پورے نظر آئے۔ اور وہ (آسمان کے) اونچے کنارے میں تھے۔ پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔ تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔ پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف جو بھیجا سو بھیجا۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔ کیا جو کچھ وہ دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو؟ اور انہوں نے اس کو ایک اور بار بھی دیکھا ہے۔ پرلی حد کی بیری کے پاس۔ اسی کے پاس رہنے کی بہشت ہے۔ جبکہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔ ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی۔ انہوں نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

یہ سفر معراج کہلاتا ہے جس کے لغوی معنی سیڑھی ہیں۔ یہاں یہ تصویر اس سیڑھی سے غیر متعلق نہیں جو حضرت یعقوبؑ نے آسمان کی طرف بلند ہوتی دیکھی تھی جس پر فرشتے چڑھ اور اتر رہے تھے۔ (کتاب پیدائش ۲۸ ۱۲) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سیڑھی سے اللہ کے پاس لے جایا گیا اور پھر آپؐ اپنے لوگوں کے پاس ان کو تبلیغ جاری رکھنے کے لئے سیڑھی سے اتر کر تشریف لائے۔

مختصراً معراج کا بیان ہمیں بتاتا ہے کہ ایک رات حضرت جبرائیل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جگایا اور آپؐ کو ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ حضرت جبرائیل نے آپؐ کو براق (ایک پروں والا گھوڑا) پر سوار کرایا جس کا ہر قدم اس کی جھلک کے برابر تھا۔ چند قدم کے بعد وہ یروشلم کی مسجد پہنچے جہاں حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک تمام پیغمبر جمع تھے۔ اس مسجد میں جسے قرآن مسجد

اقصیٰ کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی اور تمام پیغمبروں نے آپؐ کی امامت میں نماز پڑھی۔

پھر جبرائیل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑا اور وہ چاند کے آسمان تک گئے۔ جبرائیلؑ نے دروازہ پر دستک دی اور ایک آواز نے پوچھا "کون ہے"؟ آواز کو یہ یقین دلا کر کہ ان دونوں کو بلایا گیا ہے جبرائیل کو اندر آنے دیا گیا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے آئے۔ آدمؑ ان کے انتظار میں تھے اور جبرائیل نے تعارف کرایا۔ آدمؑ نے کہا "ایک اچھے بیٹے اور اچھے پیغمبر کو خوش آمدید"۔ پھر جبرائیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر جاری رکھا۔ باقی چھ آسمانوں میں سے ہر ایک پر وہ ایک یا زیادہ پیغمبروں سے ملے۔ آسمانوں میں سفر کرتے ہوئے انہوں نے دوزخ کا نظارہ کیا اور پھر جنت کا۔ بعض جدید علماء نے تجویز کیا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کے بیان نے دانتے کو اپنی ڈیوائن کامیڈی میں جہنم اور جنت کا نقشہ پیش کرنے کا وجدان دیا۔

جنت سے گزر کر وہ اس پیڑ پر پہنچے جو غالباً عرش کے عین نیچے واقع ہے جبرائیل نے کہا اس مقام سے آگے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلے جانا پڑے گا کیونکہ اگر جبرائیل اس سے آگے اڑا تو اس کے پر جل جائیں گے۔ چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ گئے اور یہاں روئیداد خاموش ہو جاتی ہے۔ واپسی پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر جبرائیل سے مل گئے اور ان پیغمبروں کو اللہ حافظ کہنے کے لئے جو وہاں رہتے ہیں ہر آسمان پر رکے۔

اس بیان سے یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ آسمانوں کی بحث لازماً سیاروں سے زیادہ تعلق نہیں رکھتی جن سے ہم مانوس ہیں۔ جیسا کہ بعض مستند مسلم علماء نے نشاندہی کی ہے یہ ایک علامتی بیان ہے جو مختلف طبقات زندگی اور اس حقیقت کا حوالہ دیتا ہے کہ ہر سطح مختلف ربانی اوصاف واضح کرتی ہے۔ ہر پیغمبر جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملے مجموعی ربانی پیام کی نمائندگی کرتا ہے یا مجموعی آیات کا ایک حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کتب سماوی اور کائنات میں ظاہر کرتا ہے۔ کسی مسلمان نے کبھی یہ تصور نہیں کیا کہ آدمؑ، موسیٰ، ابراہیمؑ اور دیگر پیغمبر سیاروں پر رہتے ہیں یا کم از کم ان سیاروں پر نہیں جن کا شعور ہم موجودہ علم فلکیات سے پاتے ہیں بلکہ سیارے آسمان میں رواں آیات الٰہی ہیں جو زندگی کو اس کے پیام کی روشنی سے منور کرتے ہیں۔ وہ نشانیاں ہیں جو زندگی کی بلند تر اقالیم کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن کو وہ لوگ دیکھ سکتے ہیں جو اللہ سے ملاقات کے لئے جاتے ہیں جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے تمام صاحب ایمان لوگوں کو موت کے بعد یوم آخرت تک انتظار کرنے انہی آسمانوں میں سے لے جایا جاتا ہے۔

جب آسمان اور زمین پر بحث کی جاتی ہے تو بنیادی مسئلہ ان تعلقات کی نوعیت کا ہے جو پیدا شدہ دنیا کی چیزوں کے درمیان قائم ہیں یا وہ درجہ بندی ہے جو کائنات میں اللہ کی حاکمیت کے نتیجہ میں قائم ہے۔ ہمیں کائنات کے ساتھ اللہ کے تعلق کا علم بھی اس کی صفات کا کائنات کی صفات سے تقابل کے ذریعہ (تنزیہ) حاصل ہوتا ہے اور یہ ظاہر کر کے کہ دونوں طرف کی صفات بعض باتوں میں مماثل ہیں (تشبیہ)۔ اسی طرح ہم اللہ کی مخلوق کے تعلقات کا علم نتائج اخذ کر کے حاصل کرتے ہیں جو آسمان اور زمین چھوٹے پیمانہ پر اللہ اور کائنات کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

جب مسلم مفکرین آسمان اور زمین کو لاثانیت کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو وہ دونوں کو متضاد انداز میں بیان کرتے ہیں: بلند و پست، روشن اور تاریک، قوی اور ناتواں، متحرک اور غیر متحرک، معطی اور وصول کرنے والا۔ جب وہ متشابہ اوصاف پر زور دیتے ہیں تو یہ توضیح کرتے ہیں کہ آسمان کی صفات زمین میں بھی پائی جاتی ہیں مگر کم حیثیت میں۔

اللہ خالق ہے۔

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (فاطر: ۳۵)

ترجمہ: کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے؟

سوال نظریاتی ہے اور کسی کو شک نہیں کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ آیت کا مقصد اللہ کی وحدانیت پر زور دینا ہے۔ لیکن ایک اور قرآنی آیت کہتی ہے:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَO (المومنون:۱۴)

ترجمہ: اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے۔

یوں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ دوسری چیزیں تخلیقی صفت میں حصہ دار ہیں۔ کائنات میں آسمان پہلی جگہ ہے جہاں تخلیقی صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کے مقابل زمین کی صفات کا انحصار آسمان سے اثر پذیری پر ہے۔ مزید یہ کہ آسمان بھی زمین پر انحصار رکھتا ہے۔ کیونکہ زمین کے بغیر آسمان کے پاس اپنا فن ظاہر کرنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

آسمان ایک مجتمع، بلا امتیاز اور غیر مادی قوت کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ زمین ایک منتشر، ممتاز اور مادی مجموعہ آیات جو آسمان کی نادیدہ قوت کو واضح کرتی ہے۔ آسمان کے اوصاف کا قرآنی نمونہ پانی ہے جو صاف اور غیر امتیازی ہے۔ جب آسمانی پانی برستا ہے تو اس سے بے تحاشا مختلف النوع چیزیں پیدا ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء ۳۰)

ترجمہ: اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

مسلم مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آیت صرف جانوروں اور پودوں سے متعلق نہیں بلکہ تمام مخلوق سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ جیسا کہ قرآن بار بار کہتا ہے زمین و آسمان کی ہر شے اللہ کی حمد کرتی ہے۔ کوئی شے بغیر زندہ ہوئے کیونکر نغمہ سرا ہو سکتی ہے؟

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ (الانعام ۹۹)

ترجمہ: اور وہی تو ہے جو آسمان سے مینہ برساتا ہے پھر ہم ہی (جو مینہ برساتے ہیں) اس سے ہر طرح کی روئیدگی اگاتے ہیں۔

وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ O (الحج ۵)

ترجمہ: ایک وقت میں زمین خشک پڑی ہوتی ہے پھر جب ہم اس پر مینہ برساتے ہیں تو وہ شاداب ہو جاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے اور طرح طرح کی بارونق چیزیں اگاتی ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًاO لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (الفرقان ۴۸۔۴۹)

ترجمہ: اور ہم آسمان سے پاک اور نتھرا ہوا پانی برساتے ہیں تاکہ اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیں۔

اگر آسمانی پانی پاک و صاف ہے تو یہ اپنی غیر امتیازی فطرت کے باعث واحد بھی ہے۔ زمین میں جذب ہو جانے کے بعد ہی یہ تنوع پیدا کرتا ہے:

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ (الرعد: ۴)

ترجمہ: اور زمین میں کئی طرح کے قطعات ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے

درخت جوڑے جوڑے اور رنگ الگ۔ پانی ان سب کو ایک ہی ملتا ہے۔

زمین اس جگہ کی نمائندگی کرتی ہے جہاں آسمان اپنی خصوصیات ظاہر کرتا ہے جیسے آسمان اور زمین (کائنات) مل کر اللہ کی نشانیاں ظاہر کرتے ہیں۔ آسمان اللہ سے نزدیک ہے اور زمین سے دور ہے۔ پس آسمان ہمیں صفات تشبیہ کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ زمین صفات تنزیہ سے مرعوب کرتی ہے۔ تاہم زمین بھی جس حد تک وہ زرخیزی اور سخاوت ظاہر کرتی ہے اللہ کے شرف اور رحم کی صفات کو ظاہر کرتی ہے لہذا زمین کو بھی تشبیہ کے تناظر میں دیکھنا چاہیئے۔ آسمان بھی تنزیہ سے مبرا نہیں کیونکہ

كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ (القصص: ۸۸)

ترجمہ اس کی ذات (پاک) کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

اس میں آسمان بھی شامل ہے۔

ان قرآنی تعلیمات پر کہ کس طرح آسمان اور زمین اللہ کی آیات ظاہر کرتے ہیں لامتناہی بحث کی جا سکتی ہے اور یہ سب اظہار توحید ہو گا لیکن ہم خاص تصور پر نظر رکھیں گے جس کا ذکر حدیث جبرائیل میں ہے یعنی فرشتے۔ ہم نے کہا تھا کہ فرشتے توحید سے زیادہ نسبت رکھتے ہیں بمقابلہ نبوت اور معادیات، گو وہ بھی ان حلقوں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اب ہم یہ واضح کرنا شروع کرتے ہیں کہ کس طرح فرشتوں کا قرآنی تصور اللہ کی بصیرت کی اسلامی شکل ہے اور کائنات اور نوع انسان کی تصویر کشی میں مدد کرتا ہے۔

فرشتے

حضرت جبرائیل سے متعلق حدیث میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں کو اللہ کے فرشتوں پر ایمان ہونا چاہیے۔ جیسے اللہ کے تصور کے بغیر اس پر ایمان بے معنی ہے اسی طرح فرشتوں پر ایمان بھی بے معنی ہے جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ فرشتے کیا ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں جاری فرشتوں کا تصور اللہ کے متعلق عام خیالات کے مثل ہے۔ بہتر ہے کہ ابتدا سے ہی پروں والے تیر اندازی کرتے چھوٹے چھوٹے لڑکوں یا چنگ بجاتی یونانی دوشیزاؤں کو خیر باد کہہ دیا جائے۔

فرشتہ کے لئے عربی لفظ ملک ـــ جیسے اس کا عبرانی بھائی ملاک ـــ وہی معنی دیتا ہے جو یونانی انجلو یعنی پیامبر۔ قرآن اس اصطلاح کو عموماً صیغہ جمع میں تقریباً نوے مرتبہ استعمال کرتا ہے۔ مزید برآں قرآن بہت سے فرشتوں کا ذکر نام لے کر کرتا ہے جیسے جبرائیل، میکائیل، ہاروت اور ماروت ـــ اور فرشتوں کی بہت سی قسموں کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہے جو ان کے فرائض کے لحاظ سے ہے۔ قاری، حمد کرنے والے، ڈرانے والے، تقسیم کار، ڈھالنے والے، چننے والے، الگ الگ کرنے والے، چڑھنے والے، کاتب، پہرہ دار، قاصد، بازی لے جانے والے وغیرہ۔ عموماً قرآن ان فرشتوں کا سرسری ذکر کرتا ہے۔ وضاحت کے لئے تفاسیر سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال ابتداء میں یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن فرشتوں کے متعلق بہت کچھ کہتا ہے۔

آج کل ہماری اپنی تہذیب میں کم لوگ ہی فرشتوں کو سنجیدگی سے لیتے ہیں اگرچہ اس موضوع پر مقبول عام کتب بہتات سے ملتی ہیں۔ بہت سے عیسائی مبلغین خیال کرتے ہیں کہ فرشتے توہم کے زمانہ کی باقیات ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک قسم کی علامت ہیں جس کی اب ضرورت نہیں۔ لیکن اسلامی عقیدہ میں فرشتے ہمہ وقت موجود حقیقت ہیں اور جتنا مسلمان ایمان اور عمل سے اپنے مذہب کے متعلق جانتے جاتے ہیں اتنا ہی وہ ان کے متعلق سنجیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ بغیر فرشتوں کے وجود کو تسلیم کئے

کوئی شخص نماز بھی ادا نہیں کرسکتا۔ رسمی نماز کی تکمیل پر آدمی دائیں بائیں السلام علیکم کہتا ہے خواہ وہ تنہا ہی نماز پڑھ رہا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کو سلام کرنا ضروری ہے جو بقول رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نماز ادا کرنے والے کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔

فرشتے ہر جگہ موجود ہیں۔ اللہ کے پاس بھی فرشتے ہیں جو اس کے عرش و تخت کو اٹھائے ہیں اور دوسرے جو اس کے گرد اللہ کی حمد و تکبیر کرتے گھومتے رہتے ہیں۔ فرشتوں نے نوع انسان کی تخلیق کو دیکھا اور ایک فرشتہ رحم کے اندر جنین میں انسانی روح ڈالتا ہے۔ پہلی چیز جسے لوگ کمتر دیکھتے ہیں فرشتے ہیں جن میں خاص عزرائیل، موت کا فرشتہ ہے۔

اللہ کے نادیدہ پیامبر

فرشتے کیا کرتے ہیں؟ بنیادی طور پر وہ پیام لاتے ہیں۔ زیادہ وسیع نظر سے وہ مدد سے احکامات بھی لاتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم لفظ پیام کو ملک کے نام میں وسیع و مکمل معنی دیں جیسے ہم اسلام اور دوسری اہم اصطلاحات کو وسیع معنی دیتے ہیں۔ مختلف قسم کے پیام ہوتے ہیں جن میں بعض کو ہم عموماً پیام تصور بھی نہ کریں۔ فرشتے زبانی پیام یا تحریری متن پہنچانے پر مامور ہیں صرف پیغمبر ہی الہامی کتب اور تختیاں پاتے ہیں۔

الہامی کتب پیغمبروں پر ایک خاص فرشتہ کے ذریعہ نازل ہوئیں جس کو اللہ نے الہامی گفتگو سپرد کی یعنی جبرائیل۔ مزید یہ کہ ہمیں لغوی معنی میں ایسا نہیں سمجھنا چاہیے جیسا ہم کہتے ہیں کہ حضرت جبرائیل کا کام الہام پہنچانا ہے۔ ہمیں الہام کو وسیع معنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ الہام اللہ کی گفتگو یا الفاظ ہیں جو خاص بندوں پر نازل کئے جاتے ہیں تاکہ انسانوں کو مسرت کی رہنمائی ملے۔ پس ایک الہام کا لازماً عام معنی میں ایک کتاب ہونا ضروری نہیں۔ اللہ کے الفاظ جو بھی شکل اختیار کریں الہام کہلائیں گے۔

اللہ کا پیام لازماً کتابی شکل اختیار نہیں کرتا یہ ایک انسانی شکل بھی اختیار کرسکتا ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے جس سے ہم ان آیات قرآنی کو سمجھ سکتے ہیں جو عیسیٰ سے جبرائیل کا تعلق بیان کرتی ہیں۔ قرآن تمام نبیوں اور رسولوں میں سے صرف عیسیٰ کا حوالہ "اللہ کا لفظ" سے دیتا ہے یوں وہ ایک الہامی کتاب سے مماثل ہیں۔ ایک اور اصطلاح جو قرآن بعض فرشتوں کے حوالے سے استعمال کرتا ہے پھینکنے والے ہے کیونکہ وہ پھینکتے ہیں یا اللہ کا پیام انسانوں کی طرف اچھالتے ہیں۔ پس یہ فطری معلوم ہوتا ہے کہ جبرائیل، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن لائے، وہی فرشتہ ہوں گے جنہوں نے مریم کو خبر دی کہ وہ مسیح کو جنم دیں گی۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۝ (مریم ۱۷)

ترجمہ: ہم نے ان کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا۔

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۡ (النساء: ۱۷۱)

ترجمہ: مسیح یعنی مریم کے بیٹے عیسیٰ محض اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ بشارت تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا اور اس کی طرف سے ایک روح تھے۔

فرشتوں کے لائے ہوئے بیشتر پیام ایک جامد حادثہ یا واقعہ کی شکل اختیار کرلیتے ہیں ایک کتاب کی نہیں۔ ہم پہلے یہ معلوم کرچکے ہیں کہ تمام مخلوقات اللہ کے الفاظ تصور کی جاسکتی ہیں۔ اس صورت میں تمام مخلوقات اللہ کے بھیجے ہوئے پیام ہیں۔

دوسرے الفاظ میں ہر چیز اللہ کی نشانی (آیت) ہے یعنی ہر چیز ہمیں اللہ کے متعلق تعلیم دیتی ہے۔ اللہ کے متعلق یہ تعلیم بے ترتیب نہیں۔ معلم خود اللہ ہے جو خود کو ظاہر کرنے کے لئے نشانیاں پیدا کرتا ہے۔ پس آیت کی اصطلاح جو فطری مظہر الہامی کتب اور معجزات کی طرف اشارہ کرتی ہے تقریباً پیام کے ہم معنی ہے۔

اگر فرشتے اللہ کے پیام پہنچاتے ہیں تو فرشتوں کا کچھ نہ کچھ تعلق اللہ کی آیات سے ہونا چاہیے۔ ہر آیت ---ہر تخلیق شدہ چیز کے پس پردہ ... ایک فرشتہ استادہ ہے بعض کتب بیان کرتی ہیں کہ ہر چیز کے ساتھ ایک فرشتہ ہے اور بارش کے ہر قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے۔ اگر فرشتے اللہ کے پیام پہنچاتے ہیں اور اگر تمام چیزیں اس کے پیام ہیں تو اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے۔

مختصراً نشانیوں پر توحید کی روشنی میں غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فرشتے ثالث کے فرائض ادا کرتے ہوئے ظاہری دنیا اور اس کے خالق اللہ کے درمیان ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ فرشتے خود غیر مرئی ہیں وہ نادیدہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس وہ آسمانی مخلوق ہیں اللہ اور زمین کے درمیان معلق۔

قرآن اور حدیث پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم مصنفین نے فرشتوں کی جو کائنات میں مامور ہیں مختلف گروہ بندیاں کی ہیں۔ ایک جگہ ہمیں چودہ بڑے گروہ ملتے ہیں بغیر تعلق پیدا کرنے کی کوشش کے (ہم مثال کے طور پر دو سے سات تک کو فرشتوں کا سردار تصور کر سکتے ہیں)

۱۔ جو عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ (اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ ۔ المومن۔ ۷)

۲۔ روح جو سب سے بڑا فرشتہ کہا جاتا ہے۔

۳۔ اسرافیل جو آخر وقت پر دو مرتبہ صور پھونکے گا۔ پہلی پھونک پر آسمان اور زمین میں ہر فرد بے ہوش ہو جائے گا اور دوسری پر سب کو اپنے رب کے حضور لا کھڑا کیا جائے گا۔

۴۔ جبرائیل الہامات کا فرشتہ۔

۵۔ میکائیل جو جسم و روح کے لئے توانائی بہم پہنچاتا ہے۔

۶۔ عزرائیل موت کا فرشتہ۔

۷۔ فرشتے جن کو خلق کی گئی چیزوں کا کوئی علم نہیں اور وہ اپنا تمام وقت ذکر الٰہی میں صرف کرتے ہیں۔

۸۔ سات آسمانوں کے فرشتے۔

۹۔ حفاظت کرنے والے اور کراماً کاتبین فرشتے۔ (وَ اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۙ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ۙ الانفطار ۱۰۔۱۱) جن میں دو ہر بشر کے ذمہ دار ہیں۔ ایک اس کے اچھے اعمال لکھتا ہے اور دوسرا برے اعمال۔

۱۰۔ خدمت گار فرشتے۔ (لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَ مِنْ خَلْفِہٖ ۔ الرعد ۱۱) جو برکات لاتے ہیں اور مخلوق کی خبروں کے ساتھ اللہ کے پاس لوٹتے ہیں۔

۱۱۔ منکر و نکیر جو مُردوں سے ان کی قبروں میں سوال کرتے ہیں۔

۱۲۔ سیاحین جو ان مجالس کی تلاش میں زمین میں سفر کرتے ہیں جہاں ذکر الٰہی ہو رہا ہو۔

۱۳۔ ہاروت و ماروت دو فرشتے جو بابل میں اترے اور وہاں کے باشندوں کو جادو کا توڑ سکھایا لیکن لوگوں نے اس کا بعد میں غلط استعمال کیا۔ (وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ ...... البقرہ ۱۰۲)

۱۴۔ فرشتے جو ہر موجود شے کے ذمہ دار ہیں، امن قائم رکھتے ہیں اور اخلاقی بگاڑ دور کرتے ہیں۔ ان کی تعداد صرف اللہ کو معلوم ہے۔

نور:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو نور سے پیدا کیا۔ نور اللہ کا ایک نام ہے اور قرآن کہتا ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (النور ۳۵)

ترجمہ: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ فرشتے کیا ہیں ضروری ہے کہ ہم سمجھیں نور کیا ہے۔ طبعی انداز میں نور کے متعلق سوچنا ہمارے لئے مفید نہ ہوگا بلکہ ہمیں ان نشانیوں کو گرفت میں لانا پڑے گا جو نور کو دیکھنے سے ہم پر ظاہر ہوتی ہیں۔

عموماً ہم نور کو آشکارا خیال کرتے ہیں لیکن دراصل وہ نہاں ہے۔ ہم نور کو اس وقت دیکھ سکتے ہیں جب وہ تاریکی کے ساتھ شامل ہو۔ اگر صرف نور ہوتا اور تاریکی نہ ہوتی ہم اس کی شدت سے اندھے ہو چکے ہوتے۔ غور کیجئے جب ہم سورج کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہیں تو کیا ہوتا ہے جبکہ وہ ترانوے ملین میل کے فاصلہ پر ہے اور زمین کی فضا میں سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر ہم فضا سے باہر چلے جائیں سورج سے چند میل قریب ہو جائیں تو غالباً ہم بغیر اپنی نظر سے ہاتھ دھوئے اس کی طرف ایک لمحہ کے لئے بھی نہ دیکھ سکیں۔ جس کو ہم آشکارا نور کہتے ہیں وہ خاصا زرد مادہ ہے۔ بمشکل اس کا موازنہ بغیر چھنی سورج کی روشنی سے کیا جاسکتا ہے نہ کہ خدائی نور سے جو تمام کائنات کو منور کرتا ہے۔ پس اسلام میں کہا جاتا ہے کہ اللہ کا نور اتنا چمکدار ہے کہ تمام لوگ اس سے اندھے ہو چکے ہیں۔

اللہ اَن دیکھا ہے فرشتے ان دیکھے ہیں اور نور اَن دیکھا ہے۔ پس یہ تعجب خیز نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ اور فرشتے نور ہیں۔ آپ اعتراض کر سکتے ہیں کہ ہم ہر طرف نور چمکتا دیکھتے ہیں لیکن ہم فرشتوں اور اللہ کو نہیں دیکھتے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ توحید ہمیں بتا رہی ہے کہ آیات سوائے اللہ کی درخشانی کے کچھ نہیں اور مخلوق سوائے اللہ کی تخلیقی قوت کے مظاہر کے کچھ نہیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (النور:۳۵)

ترجمہ: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

اور آسمان و زمین اس نور کی چمک کا عکس ہیں۔

نور نہاں ہے لیکن بغیر روشنی کے ہم کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ پس نور کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک نہاں چیز ہے جو دوسری چیزوں کو نمودار کرتی ہے۔ اسی طرح اللہ اور فرشتے نہاں ہیں لیکن بغیر ان کے کوئی دنیا نہیں ہو سکتی۔ یوں اللہ اور فرشتوں کو ایسی نہاں چیزیں کہا جاسکتا ہے جو عالم کو نمودار کرتی ہیں۔

نور کا متضاد تاریکی ہے اور تاریکی محض نور کا غیاب ہے۔ دوسرے الفاظ میں روشنی کوئی شے ہے لیکن تاریکی کوئی شے

نہیں۔ ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں کیونکہ ایک لاشے کسی شے سے خلط ملط ہے۔ ہم نہیں دیکھ سکتے اگر صرف نور ہو یا صرف تاریکی ہو۔ روشنی اور تاریکی کو بیک وقت آنا چاہیئے تاکہ بصارت پیدا ہو۔

اللہ نور ہے۔ نور کا متضاد تاریکی ہے جو کوئی شے نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اللہ کا کوئی اصلی اور موجود متضاد نہیں کیونکہ لاشے حقیقتاً کچھ چیز نہیں۔ اگر کوئی شے نہیں ہے ہم متضاد کا ذکر کیونکر کر سکتے ہیں؟ بے شک ہم کہتے ہیں لاشے کسی شے کا متضاد ہے لیکن اس لاشے کا کوئی وجود اس کے سوا نہیں کہ یہ طرز اظہار ہے یا بحث و توضیح کے لئے ایک فرضی شے ہے۔

مخلوقات نور ہیں یا تاریکی؟ بے شک جواب ہو گا کہ وہ دونوں میں سے کچھ بھی نہیں یا وہ دونوں ہیں۔ اگر وہ نور اور نور کے سوا کچھ نہیں تھے تو وہ نہ ہوتے اور اگر وہ تاریکی کے سوا کچھ نہ ہوتے تو ان کا وجود نہ ہوتا۔ پس وہ ایک ناممکن ملک میں رہتے ہیں یعنی نہ نور نہ تاریکی۔

تشبیہ کے حوالے سے مخلوقات نور ہیں لیکن تنزیہ کے حوالے سے وہ تاریکی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جہاں تک چیزیں اللہ سے مماثل ہیں وہ منور ہیں لیکن جہاں تک وہ اللہ سے غیر مماثل ہیں وہ تاریک ہیں۔ ان میں کوئی تابانی ہونا چاہیئے ورنہ ان کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔

تاریکی میں رہنا (نسبتاً تاریکی کیونکہ مکمل تاریکی کا کوئی وجود نہیں) اللہ سے دور رہنا ہے یہ ربانی اوصاف جلال اور غضب سے مغلوب ہونا ہے جو چیزوں کو اللہ سے دور رکھتے ہیں۔ روشنی میں رہنا اللہ سے قریب رہنا ہے۔ یہ صفات جمال و رحم سے مغلوب ہے جو چیزوں کو اللہ سے نزدیک کرتے ہیں۔

ایک ہی نور ہے اور وہ نور اللہ ہے۔ تاریکیاں بہت سی ہیں کیونکہ ہر مخلوق اللہ کے تعلق سے تاریکی کی نمائندگی کرتی ہے۔ تاریکی جتنی گہری ہو گی اتنی ہی اللہ سے دوری ہو گی۔ مکمل تاریکی کا وجود نہیں کیونکہ یہ ہر لحاظ سے اللہ سے انقطاع ہے۔ کوئی چیز کس طرح قائم رہ سکتی ہے اگر اس کا کوئی بھی رشتہ حق کے ساتھ نہ ہو جو ہر وصف کا منبع ہے؟

تخلیق شدہ چیزیں اللہ سے فاصلہ پر اختلاف اور غیریت میں رہتی ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ نسبتاً تاریکی میں رہتی ہیں۔ نسبتی تاریکی کے بہت سے انداز اور شکلیں ہیں کیونکہ لامحدود طریقے ہیں جن سے چیزیں اللہ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ "کوئی شے اس کے مثل نہیں" لیکن ہر چیز اپنے خاص انداز میں اس سے مختلف ہے۔

اختلاف میں رہنے کا مطلب ہے اللہ کو تنزیہ کے تناظر میں دیکھنا اور یوں صفات تشدد، جلال اور غضب سے مغلوب رہنا ہے۔ مذہب کا منشا تنزیہ سے تشبیہ، فاصلہ سے قربت، اختلاف سے یگانگت، تعدد سے یکتائی، غضب سے رحم، تاریکی سے روشنی کی طرف ایک تحریک چلانا ہے۔

قرآن اکثر تشریح کرتا ہے کہ تخلیق سے اللہ کا منشا یکتائی پیدا کرنا ہے اور وہ اکثر نور و ظلمت کے الفاظ اس مقصد کے اظہار کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ایسی آیات کی اہمیت اسی وقت واضح ہو جاتی ہے جب ہم توحید کے معنی پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ غور کیجئے مندرجہ ذیل آیات میں نور ایک ہے کیونکہ نور اللہ کا ایک وصف ہے لیکن تاریکیاں بہت سی ہیں کیونکہ تاریکی ایک وصف ہے جو مخلوق کے تنوع کے ساتھ مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۚ (الرعد۔۱۶)

ترجمہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہیں یا اندھیرا اور اجالا برابر ہو سکتا ہے؟

هُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ (الحدید: ۹)

ترجمہ۔ وہی تو ہے جو اپنے بندے پر واضح آیتیں نازل کرتا ہے تاکہ تم کو اندھیروں میں سے نکال کر روشنی میں لائے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ (الانعام: ۱۲۲)

ترجمہ۔ بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کر دی جس کے ذریعے سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو اور اس سے نکل ہی نہ سکے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰۗىِٕكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ (الاحزاب: ۴۳)

ترجمہ۔ وہی تو ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔

یہ آخری آیت ہمیں پھر فرشتوں کی طرف منتقل کر دیتی ہے جو نور سے تخلیق کئے گئے ہیں۔ اسی لئے وہ لوگوں کو جو ظاہری دنیا میں رہتے ہیں اللہ کی روشنی دینے میں مدد کر سکتے ہیں۔

فرشتوں کی تابانی:

اللہ نور ہے۔ اللہ کے نور مطلق کی ضد مطلق تاریکی ہے جو قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ اللہ کے علاوہ کوئی حقیقت اس کے قیام کو سہارا دینے والی نہیں۔

فرشتے نور سے تخلیق کئے گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اللہ سے مختلف ہیں جو غیر تخلیق کردہ نور ہے۔ فرشتوں کے نور کی ایک ضد ہو سکتی ہے، ایک تخلیق کردہ ظلمت۔ یہ ظلمت مکمل تاریکی نہیں کیونکہ ایسی صورت میں اس کا وجود نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ تخلیق کردہ شے نہیں ہو سکتی۔ فرشتوں کے تخلیق کردہ نور کی ضد ایک تخلیق کردہ غیر ملکوتی ظلمت ہے یعنی فرشتوں کے نور کے تعلق سے کوئی تاریک شے۔

قرآن تخلیق کردہ نور اور تخلیق کردہ ظلمت دونوں کا ذکر اس آیت میں کرتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ڛ (الانعام ۱)

ترجمہ۔ ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیرا اور روشنی بنائی۔

غور کیجئے پیدا شدہ روشنی کا ذکر صیغہ واحد میں ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آخری تجزیہ میں "اللہ کے سوا کوئی نور (روشنی) نہیں"۔ تمام روشنی محض اللہ کے نور کا انعکاس ہے پس بالآخر تمام روشنی ایک ہے۔ اس کے مقابلہ میں تاریکیاں کئی ہیں کیونکہ وہ ان لاتعداد طریقوں کی نمائندگی کرتی ہیں جن سے چیزیں اللہ سے دور اور مختلف ہو سکتی ہیں۔

نہاں، ناپیدا کردہ روشنی (اللہ) کی کوئی ضد نہیں۔ پیدا شدہ روشنی بھی نہاں ہے لیکن اس کی ایک ضد ہے جو کوئی بھی ظاہر شے ہو سکتی ہے۔ ہر وہ چیز جو آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں سورج کی روشنی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔ کیا وہ تاریکی ہے؟ جواب ہاں اور نہ ہے۔ ہاں ملکوتی روشنی کے تعلق سے لیکن نا مادی چیزوں کے حوالہ سے۔ یاد رکھئے کہ مخلوقات کی بات اللہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کامل نور ہے۔ جب ہم مخلوق پر بحث کر رہے ہوں تو ہر چیز لازم و ملزوم ہوتی ہے۔ فرشتے دوسری مخلوقات کے حوالہ سے منور ہیں لیکن اللہ کے حوالہ سے تاریک۔ چاند ستاروں کے رشتہ سے چمکدار ہے لیکن

سورج کے ناطے سے تاریک۔

ملکوتی روشنی وہی نہیں جو طبعی روشنی ہے لیکن یہ اس کی بہت سی صفات میں شریک ہے۔ روشنی وہ ہے جو اندھیرے کو دور کرتی ہے، سائیوں اور دھندلکوں کو ہٹاتی ہے، منور کرتی، چمکاتی، بے نقاب اور ظاہر کرتی ہے۔ ملکوتی اور طبعی روشنی دونوں یہ سب کچھ کرتی ہیں۔ تاہم نسبتہ بات کرتے ہوئے دونوں میں اہم فرق بھی ہیں۔ طبعی روشنی بے جان ہے جبکہ ملکوتی روشنی زندہ ہے۔ طبعی روشنی منور کرتی ہے لیکن ملکوتی روشنی بصیرت بھی دیتی ہے۔ کسی چراغ کو جلانا ایک بات ہے، ملکوتی سایہ کے ذریعہ علم دینا، جیسا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرائیل نے قرآن پہنچایا، ایک دوسری بات ہے کیونکہ علم روشنی ہے اور قرآن "چمکتا ہوا نور ہے"۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًاO (النساء۔۱۷۴)

ترجمہ: لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس (روشن) دلیل آچکی ہے اور ہم نے (کفر اور ضلالت کا اندھیرا دور کرنے کو) تمہاری طرف چمکتا ہوا نور بھیج دیا ہے۔

ہم نے کہا تھا کہ پیدا کی ہوئی روشنی کی ضد پیدا کی ہوئی تاریکی ہے۔ اگر روشنی اور تاریکی دو متناسب اصطلاحیں ہیں تو ہر پیدا شدہ چیز اس نقطۂ نظر کے مطابق تاریکی ہو سکتی یا روشنی ہو سکتی ہے۔ ایک فرشتہ اللہ کے تعلق سے تاریکی ہے جبکہ ایک پتھر نیستی کے مقابلہ میں منور ہے۔ دنیا میں ہر شے روشنی اور تاریکی دونوں ہے اور یہ براہ راست تنزیہ اور تشبیہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم اللہ پر غور کریں جو ایک غیر متعین فاصلہ کا لامتناہی نور ہے تو تمام چیزیں تاریکی ہیں لیکن اگر ہم اللہ کو مماثل اور قریب خیال کریں تو تمام چیزیں روشنی ہیں۔

دنیا میں اشیاء کے مختلف رتبہ کو ظاہر کرنے کے لئے کئی روایتی انداز بیان ہیں۔ مثلاً رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ دنیا منحوس ہے، اس کی ہر چیز منحوس ہے سوائے ذکر الٰہی"۔ مختصراً ذکر اور ہر کوشش جو وہ اللہ کو یاد کرنے کے لئے کرتے ہیں وہ سب کچھ ہے جو لوگوں کو اللہ کی یاد دہانی کا مفاد دیتا ہے۔

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز، جس کا لوگ زندگی میں تجربہ کرتے ہیں بذات خود کوئی قیمت نہیں رکھتی کیونکہ یہ تاریکی ہے۔ جہاں تک کہ چیزیں تاریکی ہیں لوگوں کو ان پر توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ تاہم تمام چیزیں روشنی بھی ہیں یعنی وہ اس حد تک منور ہیں جس حد تک لوگ انہیں اللہ کی نشانیاں سمجھتے ہیں اور ان کی اہمیت کو قیام توحید کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ حدیث ایسی آیات قرآنی کی ذاتی اور وجودی اہمیت کی تشریح کرتی ہے

وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَO (البقرہ۔۲۲۱)

ترجمہ: وہ اپنی آیات لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَO (الانعام۔۱۲۶)

ترجمہ: یہی تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کے لئے ہم نے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔

اگر لوگ آیات کو اللہ کی روشنی کی تنویر نہیں سمجھتے تو وہ حقیقت سے رابطہ گم کر چکے ہیں۔ ان کے لئے یہ دنیا ایک تاریک اور منحوس جگہ ہے کیونکہ یہ اللہ کی کوئی خبر نہیں دیتی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق سے منقطع کر دی گئی ہے۔ اگر دنیا

لوگوں کو قیام توحید میں مدد نہیں دیتی تو وہ ان کو صرف شرک میں رکھتی ہے۔

ہم فرشتوں کی طرف واپس چلتے ہیں۔ قرآن ان کے متعلق بہت سے بیان دیتا ہے جو ان کی ماہیت کے متعلق اشارے فراہم کرتے ہیں لیکن لوگوں کو قرآنی آیات میں تفکر کرنا ضروری ہے پیشتر اس کے کہ ان اشاروں کے معنی واضح ہوں۔ مثال کے طور پر یہ آیت پڑھیے۔

الحمد للہ فاطر السموت والارض جاعل الملئکۃ رسلا اولی اجنحۃ مثنی و ثلث و ربع ط (فاطر ۱)

ترجمہ سب تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے جن کے دو دو تین تین اور چار چار پر ہیں۔ وہ اپنی مخلوقات میں جو چاہتا ہے بڑھاتا ہے۔

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے پر ہیں۔ اسلامی مصوری میں عیسائی مصوری کی طرح ان کو خاص انداز میں دو پروں کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔ انہیں چار پروں کے ساتھ نقش کرنا زیادہ مشکل نہیں کیونکہ ہمارے پاس تتلیوں اور دوسرے کیڑوں کی مثال موجود ہے۔ لیکن آپ ایک فرشتہ کو تین پروں کے ساتھ کیسے نقش کریں گے۔ ہمیں پہلے ہی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے ان پروں والی مخلوقات کی طرح نہیں جن کو ہم روزمرہ زندگی میں جانتے ہیں۔

آخر فرشتوں کے لئے پروں کی کیا ضرورت ہے؟ ظاہر ہے، اڑنے کے لئے۔ اگر قاصد کا کام کرتے ہیں اور اللہ کو کہیں دور رہتے بتایا جاتا ہے اور اسے پیام بھیجنا پڑتے ہیں تو انہیں آنے جانے کے لئے پروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ان کے پر ہیں ہمیں بتاتی ہے کہ وہ ہم سے زیادہ تیز حرکت کرتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس صرف پاؤں ہیں۔

اس آیت کے اور معنی بھی ہیں۔ ایک پرندے یا کیڑے کو اڑنے کے لئے پروں کی ضرورت ہے کیونکہ وہ وزن دار ہے۔ بغیر پروں کے وہ زمین نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر وہ نیچے آنا چاہے وہ اپنے پر ہلانا چھوڑ دیتا ہے اور زمین پر اتر آتا ہے۔ لیکن فرشتے منور ہیں اور آسمان یا اللہ کے قریب رہتے ہیں۔ فطرتاً وہ اللہ سے نزدیک ہیں۔ پرندوں کی طرح انہیں اوپر اڑنے کے لئے پروں کی ضرورت نہیں لیکن نیچے آنے کے لئے ہے۔ پھر اپنا پیام پہنچانے کے بعد وہ اپنے قدرتی گھر کی طرف چلے جاتے ہیں۔

ہم اس بات کا اظہار اسلامی فلسفہ کی زبان میں یہ کہہ کر کر سکتے ہیں کہ پر فرشتوں کی استعداد اور قوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، وہ ذرائع جن سے وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔ فرشتوں کی کئی قسمیں ہیں کچھ سادہ فرائض ادا کرتے ہیں اور دوسرے پیچیدہ مناصب بجا لاتے ہیں۔ انہیں اپنے علم اور سرگرمی کے مطابق کم از کم دو پروں کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ان کی سرگرمی کو بہت سی مختلف اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ غور کیجئے محولہ بالا آیت کہتی ہے "اللہ اپنی مخلوقات میں جو چاہتا ہے بڑھاتا ہے"۔ بعض مفسرین کہتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ اللہ اپنے فرشتوں کے پروں میں ان کے فرائض کے مطابق اضافہ کرتا ہے۔ اس کی شہادت میں وہ ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ نے حضرت جبرائیل کو سات سو پروں کے ساتھ دیکھا۔ یہ اللہ کے سب سے اہم فرشتوں کے لئے فرائض کے لحاظ سے معقول تعداد کا اظہار ہے۔

گارا: (آب و گل)

قرآن میں جس طرح لفظ گارا استعمال ہوا ہے وہ اشارہ کرتا ہے کہ اسے ایسے ہی سمجھا جا سکتا ہے جیسے تاریکی کو روشنی کی ضد خیال کیا جا سکتا ہے۔ گارا مٹی اور پانی کا مرکب ہے۔ فرشتے نور سے پیدا کئے گئے لیکن انسانی جسم گارے سے بنایا گیا۔ اگر ہم سوچیں

کہ قرآن نے جدید مٹی میں سائنسی معلومات فراہم کی ہیں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جسم خوراک سے بنتا ہے اور خوراک بنیادی طور پر پانی اور مٹی ہے جو ہم تک پودوں اور جانوروں کی وساطت سے پہنچتی ہے۔ پس جسم گارا ہے۔ بے شک جو تعلیم دی گئی ہے اس کا یہ ایک مطلب ہے لیکن یہاں اس سے کہیں زیادہ مقصود ہے۔ ہمیں دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن اور عالم اسلامی کے عام تصور نے پانی، مٹی اور گارے سے جو ان کی نمائندگی کرتا ہے کیا سمجھا ہے۔

ہم چیزوں کی ماہیت کو ان کی خصوصیات سے سمجھتے ہیں۔ گارے کی خصوصیات وہی ہیں جو مٹی اور پانی کی اور مزید کوئی چیز جو دونوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ مٹی بھاری، تاریک، خشک اور لامحدود طور پر قابل تقسیم ہے۔ پانی بھی بھاری ہے لیکن یہ روشنی کو اپنے اندر داخل ہونے دیتا ہے پس وہ اتنا تاریک نہیں جتنی مٹی۔ پانی بھی لامحدود طور پر قابل تقسیم ہے لیکن یہ قدرتاً ایک واحد جسم کی طرح اکٹھا رہتا ہے۔ اگر آپ مٹی اور پانی کو ملا دیں تو ایک مادہ ملے گا جو بھاری اور تاریک ہو گا لیکن اس میں موجود پانی کی وجہ سے اس میں روشنی حاصل کرنے کی صلاحیت ہو گی اور جو بہتر طور پر یکجا رہ سکے گا خصوصاً اگر اسے پکا لیا جائے۔ ایک آیت میں قرآن کہتا ہے

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ (الرحمٰن:۱۴)

ترجمہ اس نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔

مٹی اور پانی کی بہت سی خصوصیات ہیں جو گارے سے بنی چیزوں میں منعکس ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً اجسامی چیزیں متنوع رنگوں میں آتی ہیں اور نوع انسان مستثنیٰ نہیں۔ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق پانی اور مٹی سے ہے۔ درج ذیل قرآنی آیت ملاحظہ فرمایئے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ۗ (فاطر: ۲۷۔۲۸)

ترجمہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے مینہ برسایا تو ہم نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے میوے پیدا کئے اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں اور بعض کالے سیاہ ہیں۔ انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے زمین اور لوگوں کے رنگ کے اس تنوع کو ایک معنی خیز انداز سے ملایا ہے۔ انہوں نے کہا جب اللہ نے آدم کو پیدا کرنا چاہا تو اس نے اسرافیل فرشتہ کو زمین پر بھیجا تاکہ کچھ مٹی لائے۔ زمین نے احتجاج کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنا کوئی جزو دے (زمینی مخلوق بالخصوص انسان کی بھی یہی خصلت ہے، وہ اپنا اور اپنی سالمیت کا بہت خیال رکھتے ہیں)۔ زمین نے اسرافیل سے آہ و زاری کی جسے اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اللہ کے پاس دریافت کرنے گیا کہ کیا کیا جائے۔ اللہ نے کہا کوئی بات نہیں، ہم دوسرا فرشتہ بھیجیں گے پس اس نے میکائیل کو بھیجا۔ مگر وہی کچھ ہوا اور میکائیل خالی ہاتھ لوٹے۔ پھر اللہ نے جبرائیل کو بھیجا لیکن بات وہی رہی۔ آخر کار اللہ نے عزرائیل کو خاص ہدایات کے ساتھ بھیجا۔ عزرائیل زمین پر آئے اور زمین کو سمجھایا کہ وہ تھوڑی سی مٹی کچھ مدت کے لئے ادھار لے رہے ہیں اور وہ اسے واپس کرنے کی ذاتی ذمہ داری لیتے ہیں۔ یہ ضمانت لے کر زمین راضی ہو گئی اور عزرائیل نے زمین کے چار کونوں سے مٹھی مٹھی بھر مٹی لی اس میں کچھ سرخ تھی کچھ

سفید، کچھ سیاہ اور کچھ پیلی۔ اللہ نے مٹی لی اور اس کو پانی میں خوب ملایا اور آدم کا گارا تیار کیا۔ یہ نوعِ انسانی کے رنگ کے تنوع کی تشریح کرتی ہے اور یہ بھی واضح کرتی ہے کہ کیونکہ عزرائیل موت کا فرشتہ ہے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ مٹی کو اس کی اپنی جگہ واپس کرے۔ پس وہ انسانی روح لے جاتا ہے اور مٹی زمین کو واپس کر دیتا ہے۔

روحیں اور اجسام:

فرشتے نور سے بنے ہیں اور اجسام گارے سے۔ اس کا مطلب ہے کہ فرشتے منور، نورانی مخلوق ہیں جو ربانی نور کی خصوصیات ہیں۔ زندگی، علم اور قوت۔ اس کے مقابلہ میں اجسام تاریک، آشفتہ چیزیں ہیں جو فرشتوں کی نسبت ربانی درخشندگی کی کوئی خصوصیات نہیں رکھتے۔ وہ مردہ، لاعلم اور کمزور ہیں۔

اگر اجسام مردہ ہیں تو ہم ان میں سے بہت سوں کو ادھر ادھر چلتے پھرتے کیوں دیکھتے ہیں؟ نوعِ انسان کے متعلق قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ نے آدم کے گارے کو اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک کر زندگی بخشی

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍO ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍO ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (الم السجدہ ۷ ـ ۹)

ترجمہ جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا (یعنی اس کو پیدا کیا) اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا، پھر اس کی نسل خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی پھر اس کو درست کیا پھر اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونکی۔

انسانی اجسام ربانی نور کی وجہ سے زندہ ہیں جو ان میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ بغیر روح وہ پانی اور مٹی ہوتے۔ جب عزرائیل روح قبض کر لیتا ہے تو جسم اپنی اصل حقیقت ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ واپس مٹی میں چلا جاتا ہے۔ مسلمان مفکرین متفق ہیں کہ انسان کے علاوہ جانوروں اور پودوں میں بھی ایسی خصوصیات جیسے زندگی اور خواہش روح سے متعلق ہیں نہ کہ خود اجسام سے۔

پھر روح کیا ہے؟ ہمیں کچھ اشارہ خود عربی لفظ "روح" سے ملتا ہے جو اسی مصدر سے مشتق ہے جس سے "ریح" جس کے معنی "ہوا" ہیں۔ ہوا ایسی چیز ہے جس کی موجودگی کا احساس صرف اس کے اثرات سے ہوتا ہے۔ یہ درخت کی شاخوں کو جنبش دیتی ہے یا گرد اڑاتی ہے یا چہرہ پر دباؤ ڈالتی ہے۔ ہم جان جاتے ہیں کہ وہ موجود ہے لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، ہم صرف اس کے اثرات دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح روح (سپرٹ لاطینی سپرٹس سے ہے جس کے معنی بھی ہوا ہیں) نہیں دیکھی جا سکتی لیکن وہ اپنی موجودگی کا احساس اپنے اثرات سے دلاتی ہے۔ ایک جسم جو پانی اور مٹی ہے زندگی کی تمام علامتیں ظاہر کرتا ہے۔ سویا ہوا اور مردہ جسم بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فرق اس نہ دکھنے والی شے کا ہے جو روح کہلاتی ہے۔

ارواح فرشتوں کی طرح ہیں۔ قرآن اس کی وضاحت بعض اوقات جبرائیل کو "پاک روح" کہہ کر کرتا ہے۔ وہ "الروح" کا ذکر بھی کرتا ہے جسے مفسرین سب سے بڑا فرشتہ کہتے ہیں۔ بیشتر علماء وثوق سے کہتے ہیں کہ فرشتے ایک قسم کی ارواح ہیں۔ لیکن لفظ "روح" وسیع معنی کا حامل ہے کیونکہ تمام ارواح فرشتے نہیں۔ ایک طریقہ ارواح اور فرشتوں میں تفریق کا یہ کہنا ہے کہ تمام ارواح اجسام سے منسلک ہیں لیکن تمام اجسام ایک ہی مادہ سے نہیں بنے۔ اگر روح ایک ایسے جسم سے منسلک ہے جو نور سے بنا ہے تو دونوں کی تجسیم فرشتہ کہلاتی ہے۔ لیکن اگر جسم گارے سے بنا ہو تو یہ کسی جانور یا انسان کی روح ہے۔ بعض علماء کا پختہ یقین ہے کہ پودے اور غیر جاندار چیزوں کی بھی روح ہوتی ہے۔ جبکہ بعض کہتے ہیں کہ خاص فرشتے ان پر مقرر

ہیں۔ ہر دو صورت میں بنیادی نقطہ یہ ہے کہ جسمانی چیزیں بغیر کسی روحانی اصلیت کے جو اللہ اور ان کے درمیان ایک وسیلہ کا کام کرے کوئی وجود نہیں رکھ سکتیں۔

روح کا بنیادی کام جسم پر حکومت کرنا اور اسے قابو میں رکھنا ہے۔ کوئی جسم چیز مجتمع نہیں رہ سکتی جب تک ایک روح یا فرشتہ اسے تکمیل اور یکجہتی نہ دے۔ جسم والی چیزیں گارے سے بنی ہیں جو آسانی سے ٹوٹ جاتا ہے اور کوئی داخلی وحدانیت نہیں رکھتا۔ پکی ہوئی مٹی جامد نظر آسکتی ہے لیکن یہ ٹکڑے ٹکڑے کی جا سکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ارواح نور سے بنی ہیں جو واحد حقیقت ہے۔ سورج کی تابانی، نور ایک ہے، جیسا کہ قرآن ہمیں بار بار یاد دلاتا ہے، لیکن تاریکیاں متعدد ہیں۔ متعدد یکجا نہیں رہ سکتیں کیونکہ ان میں وحدانیت کی حقیقت نہیں۔

قرآن اس خیال کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کائنات میں ہر سطح کی حیات خاص ارواح کے تابع ہے۔ مثال کے طور پر یہ واضح ہے کہ انسانی حیات روح کی چمک کا نتیجہ ہے۔ روح خلیوں کے مجموعہ، اعضاء اور جسم کے حصوں کو کلیت اور سالمیت بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر حصہ کچھ خود مختاری رکھتا ہے جو انفرادی اعضا کی ارواح سے قائم رہتی ہے۔

قرآن اس خود مختاری کا حوالہ متعدد آیات میں دیتا ہے جن میں وہ یوم قیامت سے بحث کرتا ہے جب لوگوں سے ان کے اس دنیا میں اعمال کی پرسش ہوگی۔ چونکہ یہ ایک فیصلہ کا دن ہے جیسے کسی قانونی عدالت میں گواہ طلب ہوتے ہیں۔ ان گواہوں میں فرشتے ہوں گے لیکن جسم کے اعضاء اور انگ انگ اپنے مالک کے خلاف گواہی دیں گے۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ ہر ایک خود مختار ہے اسلامی عقائد میں اس کی تشریح کرنا مشکل ہے تاوقتیکہ ہر عضو کی اپنی حاکم روح نہ ہو۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ (النور ۲۴)

ترجمہ (یعنی قیامت کے روز) جس دن ان کی زبانیں اور ہاتھ اور پاؤں سب ان کے کاموں کی گواہی دیں گے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝ (یس ۶۵)

ترجمہ۔ آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور جو کچھ یہ کرتے رہے تھے ان کے ہاتھ ہم سے بیان کر دیں گے اور ان کے پاؤں (اس کی) گواہی دیں گے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ تمام روحوں میں کس طرح امتیاز کیا جا سکتا ہے اور ساتھ ہی ایک بڑی روح کے ذریعہ انہیں یکجا رکھا جا سکتا ہے۔ اس سوال کے جواب کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ خود انسان کے اندر کی نشانیوں کا مطالعہ کیا جائے۔

وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ۝ وَ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۝ (الذٰریٰت ۲۰-۲۱)

ترجمہ اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہارے نفوس میں، تو کیا تم دیکھتے نہیں"؟

جیسے ہم تمام دنیا کا تقابل ایک کتاب سے کر سکتے ہیں اسی طرح ہم انسان کا تقابل بھی حروف لفظوں اور جملوں وغیرہ سے بنی کتاب سے کر سکتے ہیں۔

جسم کے ہر خلیہ کا تقابل ایک حرف سے کیا جا سکتا ہے۔ حرف ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے تاکہ وہ ایک معنی ظاہر کر سکے، وہ ایک بے ربط سطر نہیں اس حرف کی روح اسے شکل دیتی ہے۔ اگلی سطح پر حروف آپس میں ملتے ہیں الفاظ بنانے کے لئے، جن کی اپنی ایک سالمیت اور کلیت ہے جو ان کی حاکم ارواح نے انہیں دی ہے۔ ان الفاظ کا مقابلہ ان متعدد ذیلی اکائیوں سے کیا جا سکتا ہے جو جسمانی اعضاء کو بناتی ہیں۔

جسم کا ہر عضو خاص فرائض ادا کرتا ہے۔ انسانی جسم کے اندر ان میں سے ہر ایک ایک جملہ ہے جبکہ جسم بذات خود ایک پیراگراف ہے۔ لیکن پیراگراف باب کے سیاق و سباق میں معنی دیتا ہے جس کو ہم ایک خاندان تصور کر سکتے ہیں۔ پھر باب کتاب کے سیاق و سباق میں ایک کردار ادا کرتا ہے جو ایک انسانی قوم ہے۔ حروف، الفاظ، جملے، پیراگراف، ابواب اور کتب کا مطالعہ ان کی اپنی سطح پر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر سطح کے مطالب اس وقت واضح ہوتے ہیں جب وہ ایک وسیع سیاق و سباق میں واقع ہوں۔ بذات خود حروف صرف ابجد کا شوربہ ہیں۔ لیکن جب الفاظ بنتے ہیں تو وہ کوئی مطلب ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ الفاظ جملوں کے سیاق و سباق سے باہر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اور جملے بھی مفہوم مکمل نہیں کر سکتے جب تک وہ ایک وسیع تر اکائی میں واقع نہ ہوں مثلاً پیراگراف اور ابواب۔

اسلامی تناظر میں سالمیات جو اجزا کو یکجا رکھتے ہیں تسلیم نہ کرنا مضحکہ خیز ہے۔ اگر ہم کسی سطح پر رک جائیں تو ہم وسیع معنی تک پہنچنے میں ناکام رہیں گے۔ صرف ایک حرف کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے ہمیں پوری کتاب پڑھنے کے قابل ہونا چاہئے اور کتاب کا مصنف اللہ ہے گویا توحید کتاب کے آخری معنی مہیا کرتی ہے۔ ہم حرف، الفاظ اور جملوں کو کتاب کے مصنف کے مدعا سے ہٹ کر سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن اگر ہم ایسا کریں تو ہم پیام تک رسائی نہ پا سکیں گے۔ ہم ان فرضی کیمیاگروں کی طرح ہوں گے جو کہتے ہیں کہ مونالیزا کا مفہوم رنگوں کے امتزاج میں ہے۔

ربط اور معنی کی ہر سطح (جیسے حروف، الفاظ اور جملے) وجود کے ڈھانچے میں بنی ہے، جو انسانی عقل کی گرفت میں آ سکتی ہے۔ جو ارواح میں سب سے بڑی روح کی ساخت سے حصہ پاتی ہے یعنی اللہ کی روح جو آدم میں پھونکی گئی تھی۔ یہ اہم بات ہے کہ متعدد الفاظ میں سے جو اسلامی کتب میں روح کے مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، ایک لفظ معنی ہے۔ روح وہ ہے جو کسی چیز کو بامعنی، مربوط اور قابل فہم بناتی ہے۔ لیکن ارواح کی بہت سی سطحیں ہیں جو ان حدود سے ممیز ہیں جن تک وہ ادنیٰ حقائق کو سمجھتی اور گلے لگاتی ہیں۔ ایک خلیہ کی روح ایک چیز ہے اور عضو کی کوئی اور شے اور خود انسان کی روح ــــ ناطق یا رہانی روح ــــ اعلیٰ ترین انتظامی اصول ہے جو چھوٹی روحوں کو اکٹھا رکھتا ہے۔

ارواح اجسام کے سیاق و سباق سے باہر کوئی مفہوم پیدا نہیں کرتیں۔ رواجی اسلامی کتب میں "جسم کہنے سے مراد روح" ہے اور اس کے برعکس بھی۔ جیسے ہم تاریکی کی بات صرف نور کے رشتہ سے کر سکتے ہیں اور جیسے نور کو تاریکی کے وجود کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا، اسی طرح جسم و روح غیر منفک ہیں۔ حتیٰ کہ ایک مردہ جسم یا غیر ذی روح بھی ایک روح کے تابع ہے اور روح جو موت پر جسم سے رخصت ہو جاتی ہے ایک لطیف جسم کی شکل میں چلی جاتی ہے۔

روح کی اولین خصوصیت عموماً زندگی کہی جاتی ہے۔ اگر ایک طرف روح کا ذکر جسم کا خیال پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف یہ زندگی کی یاد دلاتا ہے۔ فارسی زبان میں جان کے معنی روح اور زندگی دونوں ہیں۔ وجہ ظاہر ہے بغیر روح جسم مردہ یا محض گارا ہے۔

گارے میں زندگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ اس کو نہ گوندھے، اسے شکل نہ دے، اپنی روح اس میں نہ پھونکے۔ اللہ کو براہ راست اسے گوندھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنا کام کرنے کے لئے دوسروں کو استعمال کرتا ہے۔ ایک جاندار کے معاملہ میں وہ عموماً اس کا گارا اس کی ماں کے رحم میں گوندھتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق انسانی بچہ روح کو سہارنے کے لئے حمل کے چوتھے مہینہ تک کافی شکل میں نہیں آتا۔ چوتھے مہینہ کے بعد ہی اللہ جنین میں اپنی روح پھونکتا ہے۔

روح اللہ کی ملکیت ہے جیسے روشنی اور زندگی اسی کی ہے۔ سوائے اللہ کی زندگی کے کوئی زندگی نہیں اور اس کے نور کے سو کوئی نور نہیں۔ اسی طرح روح کے تمام اوصاف ربانی اوصاف ہیں، ورنہ اللہ انسانی روح کو "میری روح" نہ کہتا۔ تاہم بیشتر مفسرین قرار دیتے ہیں کہ روح خلقی حقیقت ہے۔ یہ اللہ کی ملکیت ہے اللہ نہیں۔ اسی طرح فرشتوں کا نور اللہ کی ضوفشانی ہے خود اللہ نہیں۔

روح کے خواص پر معرفت ضروری ہے۔ بغیر جانے کہ روح کیا ہے ہم نہیں جان سکتے کہ جسم کیا ہے کیونکہ جسم اور روح کی تعریف ایک دوسرے کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ روح درخشندہ اور زندہ ہے اور روشنی اور فرشتوں کی طرح نظر نہ آنے والی ہے۔ یاد رہے کہ نور بطور اللہ کے نام عام طور سے اللہ کے نام کا جوہر اور خود اس کی ذات کہا جاتا ہے۔ اللہ کیا ہے؟ نور۔۔۔ ایک مرتبہ جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ نے اللہ کو دیکھا ہے؟ آپ نے جواب دیا: "وہ نور ہے میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں"؟

اگر روح نور ہے، یعنی تشبیہ کے لحاظ سے، یہ اللہ کے جوہر کے تمام خواص کا حامل ہے وہ تمام خواص جو اس کے ناموں سے ظاہر ہیں۔ پس روح بذات خود زندہ، علیم، قوی، ناطق، سخی، منصف، رحمن، محبت کرنے والا وغیرہ ہے۔ اگر آپ اعتراض کریں کہ بیشتر لوگ، گو ذی روح ہیں، ایسی صفت جیسے سخاوت و عدل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ سادہ سا جواب ہوگا کہ لوگ صرف روح نہیں اجسام بھی ہیں۔ اللہ نے گارے میں اپنی روح پھونکی۔ نتیجہ نوع انسان تھا۔ کیا لوگ روح ہیں؟ ہاں اور نہیں۔ کیا وہ نور ہیں؟ ہاں اور نہیں۔ کیا وہ گارا (مٹی) ہیں؟ ہاں اور نہیں۔ کیا ان کے پاس علم ہے؟ ہاں اور نہیں۔ کیا وہ سخی اور عادل ہیں؟ ہاں اور نہیں۔

مختصراً جب ہم انسانوں اور دوسری مخلوقات میں نور اور مٹی کے اتصال کی بات کرتے ہیں تو ہم ایک اور ہی زبان میں محض دو اصولوں تنزیہ اور تشبیہ کی تشریح کرتے ہیں۔ اپنی روحوں کے لحاظ سے لوگ اللہ کے مماثل ہیں۔ لیکن اپنے اجسام کے لحاظ سے وہ اللہ سے ناقابل موازنہ ہیں۔ بے شک دوسرے لحاظ سے روح بھی ناقابل موازنہ ہے اور جسم بھی ویسا ہی ہے۔ لیکن یہاں ہم دونوں طرف کی نمایاں خصوصیات پر بحث کر رہے ہیں۔

روح تشبیہ سے متعلق خواص سے مغلوب ہے۔ پس اس کا قریبی تعلق رحم، شرافت، حسن اور فیاضی سے ہے۔ اس کے برخلاف جسم تنزیہ کے خواص سے مغلوب ہے۔ پس اس کا تعلق فاصلہ، غضب، سختی، جاہ اور عدل سے ہے۔

یہ حقیقت کہ جسم رحم کے مقابلہ میں غضب کی علامت کے طور پر زیادہ عمل پیرا ہے جسم کی بدنامی نہیں ہے۔ جسم سے وابستہ یہ تمام خواص بہر حال ربانی خواص ہیں۔ یہ درست ہے کہ رحم غضب پر فوقیت رکھتا ہے اور یہی تشریح کرتا ہے کہ کیوں روح ایک معنی میں جسم سے بہتر ہے۔ لیکن ارواح کو خواص رحم اور حسن کے اظہار کے لئے اجسام کی ضرورت ہے۔ اگر انسانی اجسام گارے کے بجائے نور سے بنے ہوتے یعنی اگر اجسام خود روحانی نوعیت کے ہوتے تو لوگ انسان نہیں فرشتے ہوتے۔ اگر وہ فرشتے ہوتے تو وہ وہ بلندی حاصل نہ کر سکتے جس کے لئے انہیں پیدا کیا گیا تھا۔ (ہم جلد اللہ کے مشابہ تخلیق آدم کی طرف پلٹیں گے)۔

آگ:

پیدا کردہ نور پیدا کردہ تاریکی کی ضد ہے، کہا جا سکتا ہے کہ روح کے خواص مٹی کے خواص کی ضد ہیں۔ روح کے خواص

ربانی خواص ہیں۔ اللہ کی اولین صفات، جب مخلوق کے تعلق سے دیکھی جائیں، اکثر زندگی، علم، طلب، قوت اور نطق کہی جاتی ہیں۔ یہ صفات روح میں جبلی ہیں لیکن وہ جسم میں کسی معقول حد تک نہیں پائی جاتیں۔

روحانی اشیاء جیسے فرشتے فطرتاً زندہ، علیم، طالب، قوی اور ناطق ہیں۔ مگر یہ صفات واجب نہیں کیونکہ اللہ کے مقابلہ میں ارواح مردہ اور لاعلم ہیں۔ جب ہم ارواح کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ان کا مقابلہ اجسام سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا روح اور جسم کے الفاظ ایک خیالی جوڑا بناتے ہیں پس آپ ایک دوسرے کے کامل حوالہ کے بغیر زیر بحث نہیں لاسکتے۔

ارواح کے مقابلہ میں اجسام مثلاً پتھر اور لاشیں مردہ، جاہل، بے طلب، کمزور اور گونگے ہیں۔ جہاں تک زندہ اجسام کا تعلق ہے وہ محض اجسام نہیں کیونکہ زندگی کا وجود ثابت کرتا ہے کہ جسم کے اندر ایک روح موجود ہے تاہم زندگی اور زندہ اجسام کا علم خالص زندگی اور ارواح کے علم کے مقابلہ میں کم اور بے رونق ہے۔ روح اور جسم کا ملاپ ایک تیسری چیز پیدا کرتا ہے جو نہ روح ہے نہ جسم بلکہ کوئی درمیانی چیز ہے۔ اس تیسری چیز کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے نور اور مٹی کے تقابل کی طرف پلٹنا مفید ہوگا۔

فرشتے نور سے بنے ہیں جبکہ اجسام مٹی سے۔ قرآن بعض ایسی موجودات کا ذکر کرتا ہے جو نہ نور سے بنی ہیں نہ مٹی سے بلکہ آگ سے۔ یاد رہے آگ بیک وقت منور اور تاریک ہے۔ آگ آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے پھر بھی زمینی ہے۔ آگ کو مٹی سے جدا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسے جلنے کے لئے ایندھن کی ضرورت ہے۔ آگ اوپر اٹھتی ہے جیسے نور کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہو لیکن وہ اپنی مٹی سے نہیں بھاگ سکتی۔ اگر ہم مٹی (گارے) کا مرکب بدل دیں ــــ مادی ایندھن ــــ ہم آگ کی ماہیت بدل سکتے ہیں۔ گیلی لکڑی خشک لکڑی یا تیل سے مختلف طرح جلتی ہے۔ اگر ہم مختلف نمکیات اور زمین سے ماخوذ دوسری چیزیں ملائیں تو ہم آسانی سے آگ کا رنگ بدل سکتے ہیں۔

قرآن آگ سے بنی مخلوقات کو "جن" کہتا ہے جسکے لغوی معنی پوشیدہ، چھپا ہوا ہیں۔ وہاں جنات کے متعلق بہت کچھ کہتا ہے۔ کوئی شخص صرف ان قرآنی بیانات پر تحقیق کرکے ایک کتاب لکھ سکتا ہے۔ یہاں ہم صرف یہ کہیں گے کہ جنات ایک مبہم مخلوق ہے کسی قدر انسانوں جیسی اور کسی قدر فرشتوں جیسی۔

جنات کی قوم کا سب سے مشہور فرد ابلیس ہے جو شیطان بھی کہلاتا ہے۔ اس کا کردار جنات کے ابہام کا خلاصہ ہے۔ بہت سے بیانات کہتے ہیں کہ وہ پہلا جن تھا جو پیدا کیا گیا۔ لہٰذا وہ جنات کے لئے اسی طرح ہے جیسے آدم بنی نوع انسان کے لئے۔ آدم کی تخلیق سے ہزاروں سال قبل ابلیس انتہائی پرہیزگار تھا اور اپنا تمام وقت عبادت میں صرف کرتا تھا۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ فرشتے وہی کرتے ہیں جس مقصد کے لئے اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ وہ کبھی اللہ کے حکم کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت اس کی عظمت و جلال کے حضور قیام، رکوع اور سجدوں میں اس کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔ جب ابلیس کی تخلیق ہوئی اس کی خوشنما فطرت نے اس کو فرشتوں سے قریب کر دیا اور وہ ان کی عبادتوں میں شریک ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس کے انتہائی زہد نے اسے خادموں کے ایک منتخب گروہ میں شامل کرا دیا۔ گو وہ آگ سے بنا تھا۔ اللہ نے اسے اس مخلوق سے آزادانہ گھل مل جانے کی اجازت دیدی جو نور سے تخلیق ہوئی تھی۔ ہر معاملہ درست چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ نے آدم کو تخلیق کیا۔ ابلیس سارا عمل دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا کس طرح آدم کی مٹی جمع کی گئی اور کس طرح

اللہ نے اس کو چالیس دن تک وندھا۔ لیکن لگتا ہے کہ وہ اس فیصلہ کن لمحے سے چوک گیا جب اللہ نے آدم میں اپنی روح پھونکی۔ بہر حال روح نادیدنی ہے اور اللہ اس سے بھی زیادہ نہاں ہے بس محتاط مشاہدین بھی بعض نزاکتیں دیکھنے سے چوک جاتے ہیں۔

آدم کو تخلیق کر کے اللہ نے تمام فرشتوں سے کہا۔ بے شک ابلیس بھی اس وقت انہی کی صف میں کھڑا تھا۔۔۔

اسجدوا لادم (البقرہ ۳۴، الاعراف ۱۱ وغیرہ)

ترجمہ آدم کے آگے سجدہ کرو۔

ان سب نے فرمانبرداری کی کیونکہ فرشتے

یفعلون ما یؤمرون○ سجدہ (النحل ۵۰)

ترجمہ جو ان کو حکم دیا جاتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔

لیکن ابلیس فرشتہ نہ تھا، جن وہ نافرمانی کر سکتا تھا اگر چاہتا۔ اس موقع پر اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے نافرمانی کا فیصلہ کیا۔

اللہ نے ابلیس سے کہا

قال یٰابلیسُ ما منعک ان تسجد لما خلقتُ بیدیّ ؕ (ص ۷۵)

ترجمہ کس چیز نے تجھے اس کو سجدہ کرنے سے باز رکھا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا؟

ابلیس نے جواب دیا۔

قال انا خیرٌ منہ ؕ خلقتنی من نارٍ و خلقتہ من طینٍ○ (الاعراف ۱۲، ص ۷۶)

ترجمہ میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے بنایا۔

فارسی کے عظیم شاعر اور صوفی مولانا رومی اشارہ کرتے ہیں کہ ابلیس کی صرف ایک آنکھ تھی اور اس سے اس نے آدم کی مٹی دیکھی لیکن وہ دوسری آنکھ سے محروم تھا، دوسری قسم کی آنکھ، جو آدم کی ربانی روح کو دیکھتی۔

اس سے آگے واقعہ خوب جانا ہوا ہے۔ اللہ نے ابلیس کو ذلت کے ساتھ آسمان سے نیچے اتار دیا اور ابلیس آدم کی اولاد کو دھوکا دینے میں مصروف ہو گیا۔ ہم ان واقعات کی طرف پھر پلٹیں گے کیونکہ یہ اسلامی علم الانسان کو سمجھنے کے لئے اہم ہیں۔ فی الحال یہ غور کرنا کافی ہے کہ ابلیس فرشتوں کی ضوفشانی اور ایک تاریک، گمراہ کن اور کج رو فطرت کا حامل ہے جو روشنی کی کمی سے واقع ہوتی ہے۔ یہ تاریک فطرت مٹی کی تاریکی میں شریک ہے لیکن یہ کسی اور چیز کی بھی حامل ہے جس کی مٹی حامل نہیں۔

مٹی بہر حال غیر جانبدار ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ (اگر آپ کمہار ہیں) یہ برتن بنانے کے لئے ایک اچھا مادہ ہے، لیکن عام جسم والی چیزیں بنانے کے لئے مٹی کی کچھ خامیاں بھی ہیں۔ یہ تاریک اور گاڑھی ہے لہٰذا جب آپ سیال روشنی برتن میں انڈیلتے ہیں تو روشنی چھپ جاتی ہے اور بعض لوگ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ برتن خالی ہے لیکن بغیر برتنوں کے آپ کے پاس روشنی رکھنے کا کوئی ظرف نہ ہو گا۔ مٹی نہ کج رو ہے نہ گمراہ کن یہ محض کند ہے۔

جب روحانی ضوفشانی مٹی کی غیر جاذبیت میں مدغم ہوتی ہے تو ایک گمراہ کن نتیجہ روشنی اور سایہ کا دھوکا دہ کھیل ہو سکتا ہے، ایک کھیل جو تاریکی کی دنیا میں مزید آگے لے جا سکتا ہے۔ ابلیس اسی امکان کی نمائندگی کرتا ہے۔ تاہم آگ بری نہیں

بن سکتی۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ ایسے جن ہیں جو انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور عموماً روایت صاحب ایمان جنوں اور سچ چھپانے والے جنات میں تفریق کرتی ہے۔ مؤخرالذکر شیاطین کہلاتے ہیں جن کا سردار ابلیس ہے جو عربی میں الشیطان کہلاتا ہے۔

آگ مبہم ہے۔ اگر اس کی فطرت پر نور حاوی ہو تو یہ فرشتوں کی طرح ہے اور اللہ کے رحم و نجابت میں شریک ہوتی ہے۔ اگر تاریکی حاوی ہو تو یہ دور ہے جیسے اجسام اور غضب اور شدت کے ناموں کے تحت آ جاتی ہے۔

بہر طور آگ نجابت کے بجائے غضب کی طرف زیادہ مائل رہتی ہے۔ یہ اوپر اٹھتی ہے اور اپنی طاقت جتاتی ہے اور ہر شے کو جو اس کی راہ میں ہو مٹا دینا چاہتی ہے۔ ایک انسان (یا شیطان) کی خصلت میں آگ خود نمائی کا غرور بن جاتی ہے۔ ابلیس کہتا ہے "میں اس سے بہتر ہوں"۔ شیطان کا کھیل، میں، میں، میں، ہے۔ اپنا کام کرو۔ اپنی خواہشات کی پیروی کرو اللہ کی دی ہوئی عقل کو پس پشت ڈال دو۔

آگ کی منفی خصوصیات خوبصورت انداز میں قرآنی لفظ استکبار میں مجتمع ہیں جس کے معنی "بڑائی، کروفر یا توقیر حاصل کرنا ہے۔ اسی مصدر سے لفظ اکبر یعنی دوسروں سے بڑا ہے۔ "اللہ اکبر" ایک بہت عام مروجہ ترکیب ہے جو مسلمانوں کی زبان سے سنی جاتی ہے اور یہ صلوٰۃ کی ہر حرکت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے سادہ معنی یہ ہیں کہ "کوئی بڑائی نہیں سوائے اللہ کی بڑائی کے "ہر چیز جو آپ کی آنکھوں کو بڑی نظر آتی ہے اللہ کے مقابلہ میں چھوٹی ہے۔

اسی مصدر سے ہمیں اللہ کا نام متکبر ملتا ہے "وہ جو اپنی ذات میں بڑا ہے" یا "عظیم ہے۔ ایک انسانی صفت کے طور اس لفظ کے معنی "مغرور" ہیں کیونکہ اللہ کے سوا کوئی عظیم نہیں۔

ابلیس اور وہ انسان جن میں آگ کی صفات ہیں اپنے لئے بڑائی اور عظمت تلاش کرتے ہیں۔ آگ کی طرح وہ اپنی حقیقت منوانا چاہتے ہیں اور دوسروں کی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن بڑائی کے دعویٰ کی اس صفت کو شیطان، فرعون اور اس کی کو نسل اور عموماً سچ چھپانے والوں سے منسوب کرتا ہے۔ یہ سب جہنم واصل ہوں گے جو صحیح صحیح آگ ہے اور ان کی اپنی فطرت سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہ حقیقت کہ فرعون سمندر میں غرق ہو گیا تھا آتشیں دعووں کا مناسب دنیاوی انجام ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ○ۙ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○(ص ۷۳۔۷۴)

ترجمہ۔ تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ مگر شیطان اکڑ بیٹھا اور کافروں میں ہو گیا۔

وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ○فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ○وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ

(القصص: ۳۹۔۴۱)

ترجمہ۔ اور وہ (فرعون) اور اس کے لشکر ملک میں ناحق مغرور ہو رہے تھے اور خیال کرتے تھے کہ وہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ تو ہم نے ان کو اور ان کے لشکروں کو پکڑ لیا اور دریا میں ڈال دیا۔ سو دیکھ لو کہ ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا تھا وہ (لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○(الاعراف:۳۶)

ترجمہ۔ اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے سرتابی کی وہی دوزخی ہیں کہ ہمیشہ اسی میں (جلتے) رہیں گے۔

جیسا کہ قرآن استکبار کو ابلیس اور اس کے پیروکاروں سے منسوب کرتا ہے اسی طرح وہ بہت سی آیتوں میں فرشتوں میں اس کی نفی کرتا ہے۔

إنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِه (الاعراف۔۲۰۶)

ترجمہ جو لوگ تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے گردن کشی نہیں کرتے۔

وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ ۩ السجدۃ (النحل: ۴۹۔۵۰)

ترجمہ اور فرشتے بھی (سجدہ کرتے ہیں) اور وہ ذرا غرور نہیں کرتے۔ اور اپنے پروردگار سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے ہیں اور جو ان کو ارشاد ہوتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔

نفس:

روح میں نور کی صفات ہیں اور جسم میں مٹی کی۔ روح اور جسم آگ نہیں ہیں کیونکہ آگ میں نور اور مٹی کی صفات جمع ہیں۔ اس لئے ہمیں نوع انسان کی تصویر مکمل کرنے کے لئے، جو اس وقت وجود میں آیا جب مٹی میں روح پھونکی گئی، ہمیں کسی آتشیں شے کی ضرورت ہے۔ یہ وہی ایسی چیز جو نہ روح ہے نہ مٹی لیکن ایسی چیز جو اس وقت بنتی ہے جب روح اور مٹی کو یکجا کیا جائے۔ یہ چیز خاص طور پر نفس کہلاتی ہے جس کا ترجمہ Soul یا ذات کیا جا سکتا ہے۔ روح کے جسم سے اتصال سے پہلے کوئی انسانی ذات یا نفس انسانی نہیں ہوتا۔ دونوں کے اتصال کے بعد ہی شخص وجود میں آتا ہے، ایک شخص جو اپنا ادراک نہ روح اور نہ جسم سے کرتا ہے بلکہ صرف ذات سے کرتا ہے۔

عربی میں لفظ نفس اسی طرح لکھا جاتا ہے جیسے نفس جس کے معنی سانس ہیں (عبرانی کے ایک ہم جنس لفظ نیفش سے تقابل کریں)۔ جیسے ایک روح ہے جو جسم کو زندگی دیتی ہے، اسی طرح نفس یا ذات ایک نہاں قوت ہے جو کسی چیز کو زندگی کا سانس لینے دیتی ہے۔ جب اصطلاح کے اس معنوی رخ پر غور کیا جائے تو نفس اکثر روح کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جسم کے تعلق سے نفس میں روح کی تمام بنیادی صفات ہیں مثلاً زندگی، علم، طلب اور قوت۔

اکثر نفس کو اس کے اور روح کے فرق کے نظریہ سے دیکھا جاتا ہے اس کا جسم میں دخول اور اس کی اس حقیقت سے ناواقفیت کہ اس کی اصلیت جسم میں مضمر نہیں بلکہ روح اور اللہ میں ہے۔ اصطلاح کے اس مفہوم سے لفظ نفس ایک منفی تعبیر میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کے اندر کی تمام ظلمت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو انہیں اللہ سے ناواقفیت اور فاصلہ کے مدار میں بھٹکاتی رہتی ہے۔

مختصراً اسلامی کتب میں لفظ نفس آگ اور جن سے اپنی رشتہ داری کے لحاظ کی بنا پر ابہام سے پُر ہے۔ لیکن اگر ہم پوری تصویر دیکھنا چاہیں کہ نفس انسان کس کی نمائندگی کرتا ہے تو ہمیں نفس کے دونوں رخ سامنے رکھنے ہوں گے۔ اگر نفس کا مقابلہ منور روح سے کیا جائے تو یہ تاریک، مردہ، ناواقف اور کمزور نظر آئے گا۔ روح کی طرح نفس کی بھی خواہشات ہیں لیکن یہ گمراہ کن اور مسخ شدہ خواہشات ہیں۔ فرشتے اللہ کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے اور یہ بھی اللہ کے سوا کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا، لہٰذا اس کی خواہش اچھی ہے۔ لیکن منفی معنی میں نفس اللہ سے غافل اور اللہ کے سوا ہر شے کا طالب ہے۔ یہ تناظر جو نفس کو منفی شے بناتا ہے تجزیہ سے متعلق ہے۔ دوسرے الفاظ میں نفس کو ربانی حقیقت سے بے شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔

تاہم اگر نفس کا مقابلہ جسم سے کیا جائے تو نفس منور، عاقل، طالب، قوی، خبیر و متکلم آئے گا۔ ربانی صفات اس کے اندر موجود ہیں لیکن جسم سے غائب۔ یہ تناظر تشبیہ سے متعلق ہے۔

اگر ہم کسی منفرد فرد کو لیں تو تصویر کچھ یوں نظر آتی ہے۔ سوائے معمولی فرق کے مٹی سے بنا جسم دوسرے انسانی اجسام کی طرح ہے۔ نور سے بنی روح، آخری تجزیے میں، بعض پُراسرار طریقوں سے ہو بہو تمام انسانی ارواح جیسی ہے۔ کیونکہ انسانی ارواح اجسام میں پھونکی گئی ربانی روح ہے۔ ربانی روح صرف ایک ہے لیکن یہ فرد کا نفس دوسرے افراد کے نفوس کے مماثل بھی ہے اور مختلف بھی۔ جو چیز انسان کو ایک منفرد شخصیت بناتی ہے وہ روح ربانی کا ایک غیر معمولی امتزاج ہے۔ بعض لوگوں میں ربانی صفت علم (دانش مندی اور واقفیت) کم ہوتی ہے جبکہ دوسروں میں زیادہ۔ کوئی دو شخص یکساں نہیں۔

مثال کے طور پر صفتِ گویائی (کلام) کو لیجئے۔ سب سے مکمل کلام اللہ کا ہے جس کا احساس ہمیں ایک آیت کی طرح ہوتا ہے یعنی عالم اور الہامی کتب۔ لیکن انسانوں کے درمیان لوگ گویائی کی تکمیل مختلف مدارج اور اسالیب سے کرتے ہیں۔ مزید برآں، ہر فرد اپنی زندگی کے مختلف مدارج اور سطحوں پر اس ربانی صفت کا حامل ہے۔ ایک نوزائیدہ بچہ انسانی نطق کے متعلق کچھ نہیں جانتا لیکن رفتہ رفتہ سیکھتا ہے۔ کوئی بالیقین کبھی نہیں جان سکتا کس قسم کی پیش رفت ہو سکتی ہے۔ کسے خبر! ہمیں ایک شاعر، ناول نگار، دوسرا شیکسپیئر یا اجڈ ہاتھ آ سکتا ہے؟

قدرتاً نطق کی علم سے گہری وابستگی ہے۔ دراصل تمام ربانی صفات ایک دوسری سے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ جتنا زیادہ آپ تحقیق کریں آپ کو پتہ چلے گا کہ بعض صفات دوسریوں پر منحصر ہیں اور بالآخر وہ سب اللہ کی ذات پر انحصار کرتی ہیں۔ یہ توحید ہے یہ اعلان کہ تمام حقیقت ایک واحد ذات میں جو حق ہے جڑ پکڑے ہوئے ہے کیونکہ حقیقت ایک ہے لہٰذا حقیقت کی صفات بھی ایک ہیں۔

تخیل:

بہت سے مسلم مفکرین آگ یا نفس کے درمیانی حصہ کو بیان کرنے کے لئے تخیل کے لئے عربی الفاظ خیال اور مثال استعمال کرتے ہیں۔ قرآن اور حدیث ان الفاظ کے استعمال کے لئے کافی تائید فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً جب قرآن حضرت مریمؑ سے جبرائیل کی شبیہہ بیان کرتا ہے تو ابتداء میں ہی کہتا ہے "وہ ان کے سامنے ایک آدمی کی شکل میں آیا" یا بہتر لغوی انداز میں "اس نے ان کو اپنا تخیل ایسا پیش کیا جیسے۔

بَشَرًا سَوِيًّا O (مریم ۱۷)

ترجمہ ایک ٹھیک آدمی کی شکل۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تخیل کی اصطلاح بہت سی احادیث میں استعمال فرمائی ہیں۔ ان میں سب سے مشہور میں فرمایا: شیطان کبھی اپنے کو میری شکل میں پیش نہیں کر سکتا۔ اکثر لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ جب کوئی خواب میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہہ دیکھتا ہے وہ دراصل آپ ہی کی شبیہہ ہوتی ہے اور شیطانی دھوکا نہیں ہوتا۔ ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا: "جنت اور آگ میرے لئے دیوار کی شکل میں پیش کی گئی"۔

جب کسی چیز کا تخیل کیا جاتا ہے تو وہ کسی چیز ایک شبیہہ کی طرح نظر آتی ہے۔ اس شکل کو تخیلی سمجھا جاتا ہے فرضی نہیں۔ گویا اس کی کوئی حقیقت ہے جس پر غور ضروری ہے۔ ہم محض یہ نہیں کہہ سکتے "تم چیزوں کو فرض کر رہے ہو" اور شبیہوں

کو مزید غور کے لئے نظر انداز کرتے ہیں۔

تخیلی چیزیں دونوں طرف کی صفات میں شریک ہیں جیسے نفس روح اور جسم کی صفات میں حصہ لیتا ہے۔ سب سے عام جامد مثال، تخیلی شے کی شیشہ میں عکس ہے۔ شیشہ میں آپ کا عکس خود آپ اور آپ نہیں بیک وقت دونوں ہیں۔ بعض صورتوں میں اور بعض اغراض سے، مثلاً ایک رہنما کے طور پر جب آپ اپنے بالوں میں کنگھی کر رہے ہوں تو آپ اپنے عکس کو اپنا آپ سمجھ سکتے ہیں تاہم عکس آپ نہیں کیونکہ یہ محض روشنی کی شعاعیں ہیں جو آئینہ کے ایک ٹکڑے سے منعکس ہو رہی ہیں۔

اگر ہم اپنے اندر دیکھیں تو تخیلی چیزیں دریافت کرنے کی بہترین جگہ ہمارے خواب ہیں۔ یہاں ہمیں چیزوں اور لوگوں کا بڑا تنوع ملتا ہے جو وہ ہوتے ہیں اور نہیں بھی ہوتے یا ہم ہوتے ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ درخت جسے آپ خواب میں دیکھتے ہیں درخت ہے ایک مفہوم میں ہاں نہیں۔ یہ بھی وہ ایک درخت نہیں بشرطیکہ ہم درخت سے مراد کوئی ایسی چیز لیں جو عملی دنیا میں زمین میں اگی ہوئی ہو۔ یہ بھی درخت جسے آپ خواب میں دیکھ رہے ہیں آپ ہی ہیں یا آپ نہیں ہیں۔ یہ آپ نہیں کیونکہ یہ ایک درخت ہے اور یہ آپ ہی ہیں کیونکہ یہ محض درخت کی ایک تصویر ہے جس کا تصور آپ نے کیا۔

خیال رہے کہ خواب دیکھنے کا دائرہ نفس ہے۔ پس نفس کو اکثر قوت متخیلہ کی دنیا کا آئینہ کہا جاتا ہے جبکہ دنیا جس میں جن اور شیطان رہتے ہیں کائناتی دنیا کا تصور ہے۔ آئینہ انسانی فرد ہے جبکہ کائنات پوری کہکشاں ہے۔

تخیلی وجود کی خصوصیت میں سے ایک مسلسل تبدیلی ہے۔ تصور مسلسل دو لمحے بھی وہی نہیں رہتا۔ عملی دنیا میں کوئی چیز مستحکم نہیں۔ ہر خواب کی شبیہ مسلسل دوسری شبیہوں میں بدلنے کے عمل سے گزر رہی ہے۔

استحکام کی کمی اس وقت پیش نظر رکھنا اہم ہے جب ہم نفس پر بحث کریں۔ لوگوں کا رجحان ہے کہ نفس کو جامد اور متعین تصور کریں، اسی طرح جیسے جسم کو جس کے ساتھ عموماً وہ جڑا ہوا ہے۔ بے شک جسم بھی متعین نہیں لیکن یہ نسبتاً جامد، مستقل ہے خصوصاً جبکہ خواب کی تصویر سے تقابل کیا جائے۔

نفس نسبتاً متعین جسم اور ربانی سانس کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے جو خالص، غیر متغیر تابانی ہے۔ پس نفس کے دونوں رخ نسبتاً مستقل ہیں۔ لیکن نفس خود ایک سیل ہے، تصورات کا ایک مسلسل بہتا دریا، شعور اور آگاہی کا ایک ابلتا چشمہ۔ مسلم علماءِ کائنات اکثر کہتے ہیں نفس ایک بے کنار سمندر ہے۔ نفس سمندر کی مانند ہے کیونکہ سمندر پوشیدہ گہرائیاں رکھتا ہے اور مسلسل حرکت کرتا ہے جیسے اس کی سطح پر لہریں واضح کرتی ہیں۔ تاہم سمندر کے برخلاف نفس کی کوئی حدود، کوئی مقررہ سرحد نہیں۔ جب ہم مراجعت پر بات کریں گے ہم دیکھیں گے کہ نفس کی غیر تعین انسان بننے میں اہم نتائج کی حامل ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نوع انسان یہ یا وہ نہیں وہ کچھ بھی ہو سکتے ہیں اور وہ اس دنیا میں کیا بنتے ہیں طے کرتا ہے کہ وہ دوسری دنیا میں کیا شکل اختیار کریں گے۔

خلاصہ:

ہم ان حدود سے کہ فرشتے اللہ کے پیامبر ہوتے ہیں بہت دور نکل آئے ہیں لیکن ہم ان تصورات اور نظریات سے نہیں بھٹکے جن کا تصور مسلمان اس وقت کرتے ہیں جب وہ فرشتوں پر ظاہری ایمان سے قدرے زیادہ غور کرتے ہیں اور ہم نے بمشکل ان تصورات کا کھوج لگانا شروع کیا ہے۔ ان میں سے بعض ذیل میں پھر اٹھیں گے اور یہ قدرتی ہو گا کیونکہ توحید تمام چیزوں کے آپس کے رشتہ کی متقاضی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے جو کچھ ہم نے فرشتوں کے متعلق سیکھا

ہے اس کا خلاصہ کر لینا چاہیے۔

فرشتے مادی دنیا اور اللہ کے درمیان وسیلہ کا کردار ادا کرتے ہیں چونکہ وہ نور سے بنے ہیں لہٰذا وہ اللہ سے نزدیک ترین اشیاء کی نمائندگی کرتے ہیں جو خود نور ہے۔ فرشتوں کے نور کی صفات وہی ہیں جو اللہ کے نور کی ہیں سوائے اس کے فرشتوں کا نور پیدا کردہ اور عارضی ہے جبکہ اللہ کا نور پیدا کردہ نہیں اور ابدی ہے۔ نور کی صفات کو ظلمت جو نور کی عدم موجودگی ہے کی صفات کے تقابل سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے۔ پیدا کردہ نور کی ضد پیدا کردہ ظلمت ہے۔ ایک قسم کی پیدا کردہ ظلمت مٹی (گارا) ہے جو وہ مادہ ہے جس سے تمام مادی چیزیں مثلاً پتھر، پودے اور جانوروں کے جسم بنے ہیں۔

فرشتے ایک قسم کی روح ہیں۔ روح آخر کار اللہ کا نفس ہے، جیسے ہم نور کو ظلمت کے حوالے سے سمجھتے ہیں اسی طرح ہم روح کو جسم کے حوالے سے سمجھتے ہیں۔ دونوں موجودہ اشیاء کے آئینہ میں دو مخالف قطبین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ جو اللہ سے نزدیک ہیں اور وہ جو اللہ سے دور ہیں۔ گو اجسام دور ہیں وہ اچھے ہیں کیونکہ وہ [illegible] متعلق ہیں اور اس کی صفات کے مظہر، باوجودیکہ ان میں سختی اور غضب کے اوصاف زیادہ واضح طور پر نمایاں ہیں بمقابلہ لطف و رحم کی صفات کے۔ ارواح کی خصوصیات مضبوطی سے، لیکن خالصتاً نہیں، تشبیہ سے متعلق ہیں، جبکہ جسم کی خصوصیات قوت سے، لیکن خالصتاً نہیں، تنزیہ سے متعلق ہیں۔

اگر ہم نور اور مٹی کی متضاد خصوصیات کا کھوج لگائیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ [illegible] دونوں قسم کی خصوصیات رکھتی ہے۔ ہم سے باہر کی دنیا میں ایسی مخلوقات موجود ہیں جو نہ روح ہیں نہ جسم جو جن کہلاتی ہیں۔ ہماری اپنی اندرونی دنیا میں ہمارا ایک رخ ہے جو نہ روح ہے نہ جسم جو ذات یا نفس یا تصور کہلاتا ہے۔ ہمارے نفوس مبہم ہیں اور ہر وقت بدلتے رہنے والے جیسے آگ یا خواب کی شکلیں۔ ہمارے نفوس کی خصوصیات نہ ہمارے جسم والی ہیں نہ ہماری روح والی۔ بلکہ دیگر وہ دونوں طرف کی خصوصیات کا مرکب ہیں۔ جب بھی تصور پر بات ہوتی ہے بحث کا زور صورتحال کے ابہام پر ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کہ نور اور ظلمت ملے جلے ہیں اور تشبیہ و تنزیہ آپس میں گتھے ہوئے ہیں۔

قدر

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایمان میں "نیکی اور بدی کا حساب شامل ہے"۔ یہ حساب (قدر) اکثر تقدیر کہلاتی ہے اور بعض سیاق و سباق میں یہ اچھا ترجمہ ہے۔ اس سیکشن میں ہم اس اصطلاح کے اثرات کے ان دائرۂ عمل پر چلتے ہوئے جن پر مسلم تصور تقدیر کے برتاؤ میں خال خال بات ہوتی ہے اس کے وسیع معنی پر زور دیں گے۔ اس تصور کے ساتھ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اس کی منطق کس طرح توحید سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

قوتِ تخلیق:

لفظ قدر اسی مصدر سے ہے جس سے قادر جو ایک ربانی اسم ہے جس کا ترجمہ ہم طاقتور کرتے رہے ہیں۔ اسم قدرہ جو ربانی صفت قوت کو ظاہر کرتا ہے بھی نسب اور معنی دونوں اعتبار سے قدرے قریب ہے۔ طاقت رکھنے کا مطلب کوئی چیز بنانے کی اہلیت اور صلاحیت کے ہیں، کوئی کام کرنا، کوئی منزل حاصل کرنا۔ قرآن ہمیں بار بار کہتا ہے "اللہ سب چیزوں پر قادر ہے" پس اس کی قوت لامحدود ہے۔

قدر بعض اوقات قدرۃ کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اسکے معنی بھی قوت اور اہلیت ہیں۔ لیکن لفظ قدر مصدر کے بنیادی معنی پر زور دیتا ہے جو کسی چیز کو ناپنا یا اس کی قامت یا مقدار مقرر کرتا ہے۔ عملاً یہ ناپنے کے فیتے سے کیا جا سکتا ہے یا یہ ذہنی طور پر گنتی و شمار سے کیا جاسکتا ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب صرف "کسی چیز کا ناپ لینا" ہی نہیں بلکہ "اس کا پیمانہ طے کرنا" بھی ہے۔ اس معنی میں "کسی چیز کی پیمائش کرنا" اس کو قابو میں رکھنا اور اس پر حکم چلانا، اس پر قدرت رکھنا بھی ہے۔ لہٰذا ہم واپس قوت پر آ جاتے ہیں۔

اللہ ہر شے پر قادر ہے جبکہ انسان اللہ کی عطا کردہ حدود کا پابند ہے۔ انسان اللہ پر کوئی قدرت نہیں رکھتا جس طرح ایک شعاع کا سورج پر کوئی قدرت نہیں۔ لہٰذا وہ اللہ کو بغیر اس کی رہنمائی کے صحیح معنی میں سمجھنے کے قابل نہیں ہے۔

وَ لَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ (البقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ: وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے۔

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ (الانعام: ۹۱، الحج: ۷۴، الزمر: ۶۷)

ترجمہ: اور ان لوگوں نے خدا کی قدر جیسے جانی چاہیئے تھی نہ جانی۔

لفظ قدر قرآن میں دس آیات میں استعمال ہوا ہے اور یہ اس بنیاد کا جزو فراہم کرتی ہیں جس پر بعد کا نظریہ جسے مناسب طور پر تقدیر کہا جاسکتا ہے، تعمیر ہوا۔ لیکن قدر کی دینی فہم میں بہت کم اہمیت ہے یہ طے کرنے کے لئے کہ مسلمان عام طور پر قدر کا قرآنی آیات کی روشنی میں کیا فہم رکھتے ہیں۔ ہم ان میں سے چند آیتوں کا جائزہ لیں گے کیونکہ وہ ان بنیادی اسلامی نظریات کے لئے ایک آسان تعارف فراہم کرتی ہیں جو اللہ اور کائنات اور اللہ اور انسان کے رشتہ سے متعلق ہیں۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَٰهُ بِقَدَرٍ ۝ (القمر: ۴۹)

ترجمہ: ہم نے ہر چیز اندازہ مقررہ کے ساتھ پیدا کیا۔

وَ إِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَ مَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝ (الحجر: ۲۱)

ترجمہ: اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو بمقدار مناسب اتارتے رہتے ہیں۔

یہ دو آیات قرآن کے بنیادی موضوع کی توضیح کرتی ہیں کہ اللہ علیم، قادر اور خالق ہے۔ وہ ہر چیز کا منبع ہے پس تمام چیزیں اس کے پاس پائی جاتی ہیں خواہ وہ ہم سے پوشیدہ ہیں یا ہمارے پاس ظاہر ہیں وہ ان کو جانتا ہے۔

وَ عِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَ مَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَ لَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ (الانعام: ۵۹)

ترجمہ: اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اسے جنگلوں اور دریاؤں کی سب چیزوں کا علم ہے اور کوئی پتہ نہیں جھڑتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ اور کوئی ہری یا سوکھی چیز نہیں ہے مگر کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔

جب اللہ کوئی چیز تخلیق کرتا ہے اور اسے وجود میں لاتا ہے، وہ ان خزانوں کو اپنے پاس رکھتا ہے جن سے وہ اس کے وجود کے لئے ضروریات فراہم کرتا ہے۔ یہ خزانے اچھے اور اصل کی نمائندگی کرتے ہیں جو صرف اللہ کی ملکیت ہیں۔ "کوئی چیز اصل

نہیں سوائے اصل کے"۔ زیادہ تفصیل سے خزانِ ربانی صفات کی نمائندگی کرتے ہیں جو دنیا میں تمام اچھائی اور اصلیت کا منبع ہیں۔ لہٰذا ہر شے کی زندگی اللہ کے خزانہ حیات سے اس کی قوت اس کے خزانہ قوت سے اور اس کا جذبہ رحم اس کے خزانہ رحم سے فراہم ہوتا ہے۔

کون فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے خزانوں سے کیا حاصل کریں؟ خزانوں کا مالک۔ اس کا فیصلہ کیا کہلاتا ہے؟ قدر ــــ وہ علم، طاقت، رحم، اچھائی وغیرہ کا ناپ تول رکھتا ہے۔ کوئی تخلیق شدہ چیز ان صفات میں اپنے حصہ پر اختیار کی اہل نہیں۔ ہر چیز وجود کی اصل صفات میں صرف اس حد تک شرکت کرتی ہے جس حد تک مشیت انہیں شرکت کی اجازت دیتی ہے۔ اللہ دینے والے ایک سرے پر ہے اور تخلیق کردہ چیزیں لینے والے دوسرے سرے پر۔ تنزیہ کا تقاضہ ہے کہ صرف اللہ ہی اصلیت کا مالک ہے لیکن تشبیہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی اصلیت میں سے مخلوق کو دے جتنا کہ وہ چاہے۔ یہ قدر اس کا کام ہے ہمارا نہیں:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ○(الشوریٰ ۲۷)

ترجمہ: اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے رزق میں فراخی کر دیتا تو زمین میں فساد کرنے لگتے۔ لیکن وہ جس قدر چاہتا ہے اندازے کے ساتھ نازل کرتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جانتا اور دیکھتا ہے۔

بہت سی اہم قرآنی اصطلاحات کی طرح "بندہ" کے بھی بہت سے معنی ہیں۔ وسیع مفہوم میں یہ "مخلوق" کا ہم معنی ہے۔ ہر چیز کلیۃً اللہ کا بندہ ہے کیونکہ اللہ نے اسے اپنا کام کرنے کے لئے پیدا کیا اور وہ اس کا کام کرتی ہے خواہ وہ اس سے آگاہ ہے یا نہیں یا وہ اسے کرنا چاہتی ہے یا نہیں۔ جیسے آسمان اور زمین کی ہر چیز مسلم ہے کیونکہ وہ اللہ کے تابع ہے، ویسے ہی ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا○(مریم ۹۳)

ترجمہ: بے شک جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کے روبرو مخلوق ہو کر آئیں گے۔

ایک محدود معنی میں ایک بندہ وہ شخص ہے جو دانستہ پیغمبر کی پیروی کر کے اللہ کی خدمت کرتا ہے۔ اس سے بھی محدود مفہوم میں بندہ وہ انسان ہے جو مکمل آگاہی اور پوری آزادیٔ انتخاب کے ساتھ اللہ کی پوری پوری اطاعت کرتا ہے۔ اسی آخری معنی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اونچا لقب بندہ ہے۔

محولہ بالا آیت (الشوریٰ: ۲۷) کہہ رہی ہے کہ اللہ جو کچھ اپنی مخلوق کو دیتا ہے اس کی پیمائش اپنے معیار مصلحت سے کرتا ہے۔ ورنہ وہ اپنے حدود سے نکل جائیں گے اور نظم عالم میں فساد پھیلا دیں گے۔ ایک وسیع تناظر میں آیت کا مطلب ہے کہ مخلوق کی خلقی صفات پر عائد پابندیاں ان کو ان کی شناخت دیتی ہیں۔

اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ (طٰہٰ:۵۰)

ترجمہ: اس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی۔

اگر چاند میں بہت زیادہ روشنی ہوتی تو رات کا وقت ایک نادر چیز ہوتی۔ اگر بلیوں میں بہت زیادہ توانائی ہوتی ہم ان کو نہ پال سکتے اور چوہوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ اللہ کی حکمت یہ طے کرنے کے لئے کہ مخلوق کے لئے کیا بہتر ہے

پس پردہ ہوتی ہے۔

انسانی سیاق و سباق میں اس قرآنی آیت کا مطلب ہے کہ غربت، حاجت اور مصیبت سماجی توازن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اگر سب امیر ہوتے تو روٹی کون اگاتا؟ اسی طرح فصلیں کون اگاتا؟ سماجی بہبود کے لئے لوگوں کے درمیان فرق انتہائی ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اگر اللہ نے ہر ایک کو امیر اور خود کفیل بنایا ہوتا تو یہ ان کو بنیادی انسانی فرائض سے دور کر دیتا جو قیام توحید ہے۔ اور اللہ نے وہی سب عطا کر دیا ہوتا جو ان کی ادنیٰ فطرت کا تقاضا تھا تو وہ اپنی ضروریات کے لئے کیوں اللہ سے رجوع کرتے؟ وہ اس دنیا و میں جنت تصور کرتے اور توحید کو فراموش کر بیٹھتے۔

مختصراً قدر سے متعلق آیت کا یہ مقصد ہے کہ لوگوں کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں اس کے اپنے مقاصد ہیں۔ اس کی مسائل کے پس پردہ حکمت اور رحمت ہے خواہ ہم اس کی حکمت محسوس کرنے میں ناکام رہیں، خواہ ہمیں تکلیف پہنچے کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ... کیا گیا ہے

وعسىٰ ان تكرهوا شيئا و هو خيرٌ لّكُمْ ۚ و عسىٰ ان تحبُّوا شيئا وّ هو شرٌّ لّكُمْ ؕ و اللهُ يعلمُ و انتُم لا تعلمُونَ ۝ ؏ (البقرہ ۲۱۶)

ترجمہ عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مضر ہو۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مخلوق کو ساری بھلائی اللہ کی قدر سے ہی پہنچتی ہے۔ قرآن اکثر یہ نکتہ پانی کے حوالے سے بیان کرتا ہے جس کو اللہ آسمانوں سے برساتا ہے۔ ایسی آیات کو پڑھتے ہوئے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آسمان فرشتوں اور ارواح کی رہائش گاہ ہے۔ یہ خلق کردہ منبع ہے نور، پاکی، پرورش اور ہر اس چیز کا جو زمین سے پیدا ہوتی ہے۔ بغیر پانی کوئی زندگی نہیں ہے۔ بغیر آسمان زمین مردہ ہے اور بغیر زمین، آسمان کے لئے اپنی فیاضیوں کے اظہار کی کوئی جگہ نہیں۔ آیات بتاتی ہیں کہ پیدا کردہ دنیا میں ہر برکت اور فیض جو ہمیں زمین میں پہنچتا ہے اللہ کا مقرر کردہ ہے

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ ۗ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ ۚ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ (المومنون ۱۸ ـ ۱۹)

ترجمہ اور ہم ہی نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی نازل کیا۔ پھر اس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم اس کے نابود کر دینے پر بھی قادر ہیں۔ پھر ہم نے اس سے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ بنائے۔

وَ الَّذِىْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ (الزخرف ۱۱)

ترجمہ (اللہ ہی ہے) جس نے ایک اندازے کے ساتھ آسمان سے پانی نازل کیا پھر ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ ۢ بِقَدَرِهَا (الرعد ۱۷)

ترجمہ اسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہہ نکلے۔

دریاؤں کے خشک پاٹ زمین کی مخلوق ہیں جن میں کوئی زندگی، علم، طلب، قوت، جذبہ یا کوئی اور مثبت خوبی بغیر آسمانی پانی کے نہیں جو ان پر برسنا اور بہنا چاہیئے۔ پھر دریا کا ہر پاٹ اپنے اندازے کے مطابق بہتا ہے۔ یہاں زور اللہ کی قدر پر نہیں۔ گو لفظ وہی استعمال ہوا ہے بلکہ اس پر ہے کہ ایک مرتبہ اللہ نے کسی شے کی شناخت مقرر کر دی ہے کہ وہ صرف

اتنا پانی سمو سکتا ہے۔

أَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ (طٰہٰ:۵۰)

ترجمہ اللہ نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط (الروم: ۳۰)

ترجمہ۔ خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

ہاتھی شہد کی مکھیاں نہیں بن سکتے۔ تاہم انسان زیادہ پیچیدہ مخلوق ہے۔ تو قدر سے متعلق یہ ساری گفتگو یہ واضح کرتی معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔ لیکن صورت حال اتنی سیدھی سادی نہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ خود مختاری بھی مقرر کرتا ہے اور وہ اس کا بڑا حصہ انسانوں کو دیتا ہے۔

اچھائی و برائی / خیر و شر:

قدر پر ایمان کسی استثنا کی اجازت نہیں دیتا۔ جبرائیل کے متعلق حدیث کہتی ہے "قدر اس کی اچھائی کی اور اس کی برائی کی"۔ جو مقرر ہے، خواہ اچھا یا برا وہ اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ جدید قرائتیں اکثر اس نکتہ کو خاص طور پر ناپسندیدہ پاتی ہیں۔ ایک اللہ جو اچھا سمجھا جائے کیسے برائی دے سکتا ہے؟ یہ رد عمل قابل فہم ہے لیکن قدر سے قبل از وقت۔ پیشتر اس کے کہ ایسا فیصلہ صادر کیا جائے ہمیں اس تعلیم کو قرآنی سیاق و سباق میں دیکھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اچھائی اور برائی، جو زیر بحث ہیں، کی فطرت کا ادراک کرنا ہوگا۔

اچھائی کے لئے عربی لفظ خیر ہے جبکہ برائی کے لئے لفظ شر ہے۔ انگریزی میں خیر و شر بہت وسیع الفاظ ہیں لیکن وہ اخلاقی فیصلہ کا خاص انداز رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں خیر و شر کے قرآنی سیاق و سباق عموماً صحیح اور غلط کا اظہار نہیں کرتے بلکہ کسی چیز سے پہنچنے والے نفع و نقصان کو ظاہر کرتے ہیں۔

لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ○ (حٰم السجدہ ۴۹)

ترجمہ: انسان بھلائی کی دعائیں کرتا کرتا تو تھکتا نہیں اور اگر تکلیف پہنچ جاتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے اور آس توڑ بیٹھتا ہے۔

وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِىَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ط (یونس ۱۱)

ترجمہ: اور اگر اللہ لوگوں کی برائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلب خیر میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی (عمر کی) میعاد پوری ہو چکی ہوتی۔

خیر و شر جو مقرر ہیں ان کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو لوگ حاصل کرنا یا ان سے بچنا چاہتے ہیں یہاں مسئلہ اخلاقی خیر و شر کا نہیں بلکہ ایسے خیر و شر کا ہے جو اس آدمی کے نظریہ سے متناسب ہے جو ان کو حاصل کر رہا ہے۔ لہٰذا جبرائیل سے متعلق حدیث میں جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر و شر دونوں کی قدر کا ذکر فرمایا تو آپؐ کے پیش نظر موقع سے متعلق انسانی فیصلہ تھا۔ ہم نقصان اٹھاتے ہیں تو وہ ہمارے لئے شر ہوتا ہے۔ ہمیں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے تو وہ خیر ہے۔

خصوصاً آپ کا نقصان کسی اور کا نفع ہے۔ جو آپ کے لئے شر ہے کسی دوسرے کے لئے خیر ہے اور اس کے الٹ بھی۔ اسی طرح جو آج شر نظر آتا ہے عرصہ بعد خیر ظاہر ہوتا۔ ہم سب کو ایسے حالات سے واسطہ پڑتا ہے جو فی الوقت مشکل اور آزمائشی ہوتے ہیں لیکن جب ہم پیچھے نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لئے خیر تھے۔ موت بھی جو فرد کے

لئے شر معلوم ہوتی ہے، گو یہ جاننا مشکل نہیں کہ وہ مجموعی طور پر دنیا کیلئے خیر ہے، لوگوں کے لئے دراصل خیر ہی ہو۔

قرآن اکثر نشاندہی کرتا ہے کہ لوگ اپنے فیصلوں میں خیر و شر کے متعلق غلطی پر ہو سکتے ہیں۔ آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ لاٹری جیت جانا آپ کے لئے فائدہ مند ہے حالانکہ دراصل وہ شر ہو۔ جب لوگ خیر و شر کو اپنے معیار پر پرکھتے ہیں وہ اکثر غلطی کرتے ہیں

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ (آل عمران: ۱۸۰)۔

ترجمہ جو لوگ مال میں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو عطا فرمایا ہے بخل کرتے ہیں وہ اس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں (وہ اچھا نہیں) بلکہ ان کے لئے برا ہے۔

لوگ خیال کرتے ہیں کہ جس کی وہ خواہش کرتے ہیں اچھا ہے اور جسے وہ ناپسند کرتے ہیں برا ہے۔ بیشتر لوگوں کے لئے اس کا مطلب ہے کہ اس دنیا کے فائدے اچھے ہیں۔ لیکن قرآن اصرار کرتا ہے کہ یہ چیزیں لازماً لوگوں کے لئے اچھی نہیں، خصوصاً اگر ایسی چیزیں، انہیں اپنے انسانی فرائض فراموش کرادیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ (آل عمران:۱۴)

ترجمہ لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی باڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔

اس فہرست میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے تا حال کوئی خاص ردوبدل نہیں ہوا۔ اسے جدید بنانے کے لئے ہمیں پہلی چیز کو عاشق کہہ کر معدوم کرنا پڑے گا اور آخری تین کو "کاروں" الیکٹرانک آلات اور جائداد سے بدلنا ہوگا۔ لوگوں کی نظر میں یہ ساری چیزیں اچھی ہیں اور اللہ اگر عقل مند والدین کی خوبیوں کا حامل نہ ہوتا وہ اس دنیا کے نادان بچوں کو جو وہ چاہے عطا کردیتا۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات سے یہی معلوم ہوتا ہے جو اللہ کے رحم پر بات کرتی ہے جو بہت سے طریقوں سے خیر کا ہم معنی ہے۔ پس لوگوں میں رحم کی تقسیم قدر خیر ہے

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَ لَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝ وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (الزخرف: ۳۲۔۳۵)

ترجمہ: کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟ ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کردیا اور ایک دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تمہارے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے۔ اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی جماعت ہو جائیں گے تو جو لوگ اللہ سے انکار کرتے ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں (بھی) جن پر وہ چڑھتے ہیں۔ اور ان کے گھروں کے دروازے بھی اور تخت بھی

جن پر تکیہ لگاتے ہیں۔ اور (خوب) تجمل (آرائش کردیتے) اور یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے اور آخرت تمہارے پروردگار کے ہاں پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ قرآن بہت سی مختلف اصطلاحات استعمال کرتا ہے جن کا ترجمہ خیر وشر کیا جاتا ہے بالخصوص حسن وسوء کا جوڑا جس کا ایک مستحکم اخلاقی مفہوم ہے۔ ان دو اصطلاحوں کو جزوی طور پر خیر و شر سے ممیز کرنے کے لئے ہم ان کا ترجمہ حسین اور کریہ المنظر کریں گے۔ قرآن میں حسین اور کریہ المنظر کا استعمال انسانی اعمال کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ ظاہر کرتا ہے بجائے اس احساس کے کہ آدمی کس نفع یا نقصان کا تصور رکھتا ہے۔ خیر وشر کے معنی بعض اوقات حسن وقبح پر منطبق ہوتے ہیں۔ کیونکہ آخرکار نفع اور نقصان صحیح اور غلط عمل پر منحصر ہے۔

خیر وشر جو مقرر ہو چکی ہے اس کی فطرت کے معنی کو سمجھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم گفتگو کو واپس شہادۃ کے سیاق وسباق میں لے جائیں۔ ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں کہ اصل (حق) جو اچھائی سے منطبق ہے اور ہمارے ذہن میں عربی لفظ خیر تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر حقیقی شر، برائی سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خیر نور ہے اور شر ظلمت۔ جیسے ظلمت کچھ نہیں سوائے نور کی عدم موجودگی کے، اسی طرح شر کچھ نہیں سوائے خیر کی عدم موجودگی کے۔ "کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ کے" یعنی "کوئی خیر نہیں سوائے اللہ کے"۔ ہم لفظ شر کو شہادۃ میں نہیں رکھ سکتے کیونکہ شر کوئی شے نہیں۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر وشر کا تعلق اللہ سے اپنی چھوٹی سی حمد میں ظاہر کیا ہے "خیر تمام کا تمام آپ کے ہاتھوں میں ہے مگر شر تیری طرف نہیں جاتا"۔ پھر شر کس کی طرف جاتا ہے؟ خیر کی کمی، نور کی کمی، حق کی کمی، ربانی صفات کی کمی کی طرف۔ دوسرے الفاظ میں شر اللہ کے سوا ہر شے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ خیر صرف اللہ سے نسبت رکھتا ہے۔ "کوئی خیر نہیں سوائے اللہ کے"۔ یہی بات حضرت عیسیٰ نے انجیل میں فرمائی "تم کیوں مجھے خیر کہتے ہو؟ کوئی شخص خیر نہیں سوائے صرف اللہ کے"۔ (انجیل مارک ۱۸:۱۰)

تنزیہ کے لحاظ سے شر کائنات کے اندر داخل ہے لیکن تشبیہ کے لحاظ سے خیر کائنات کے اندر داخل ہے۔ جہاں تک اللہ کائنات سے قطعاً علیحدہ ہے کائنات میں کوئی خیر نہیں کیونکہ صرف اللہ ہی خیر ہے۔ لیکن جس حد تک اللہ اپنی آیات اور سرگرمیاں کائنات میں ظاہر کرتا ہے وہاں تک کائنات اللہ کے خیر کے ذریعہ خیر ہے۔

دھیان دیجئے، گفتگو کی اس سطح پر خیر وشر کا اخلاقی اہمیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ، جیسے اوپر کہا گیا، خیر و شر کے بنیادی معنی میں بھی درست ہے۔ یہ کہنا کہ کوئی چیز اچھی ہے یہ کہنا ہے کہ وہ ربانی صفات میں کسی قدر حصہ دار ہے۔ یہ کہنا کہ کوئی چیز بری ہے یہ کہنا ہے کہ وہ کسی حد تک ربانی صفات سے بے بہرہ ہے۔ اس لحاظ سے تمام چیزیں اچھی اور بری ہیں۔ صرف اللہ ہی خیر ہے پس اللہ کے علاوہ ہر شے شر ہے۔ لیکن چیزیں سراسر اللہ سے جدا نہیں جیسا کہ تشبیہ ہمیں بتاتی ہے۔ پس جہاں تک وہ الگ نہیں وہ خیر ہیں۔ سب چیزیں خیر و شر، نور وظلمت، بلندی و پستی، علم وجہل، قوت وناتوانی کا مرکب ہیں۔

جب بعض مسلم مفکرین کہتے ہیں کہ تمام دنیا خیال آرائی ہے تو ان کے ذہن میں چیزوں کی ذو معنویت ہوتی ہے جو اس حقیقت کی وجہ سے ہے کہ نہ تو حق مکمل طور پر مخلوق میں غائب ہے اور نہ اس میں مکمل طور پر موجود ہے۔ کائنات کی ہر شے

ہمارے آئینہ میں ایک عکس کی طرح ہے۔ جو چیز عکس ڈالتی ہے ربانی حقیقت ہے، بہ حیثیت خوبی کا منبع، وہ جو آیات کی نمائش کرتا ہے۔ آئینہ کوئی وجود نہیں رکھتا، جو اپنی جگہ موجود نہیں وہ ایک قیاس کے سوا کچھ نہیں جو ہمیں سوچنے میں مدد دیتا ہے۔ آئینہ میں عکس ہو بہو حق ہے اس حد تک کہ وہ حق کی صفات منعکس کرتا ہے۔ لیکن وہ حق سے علیحدہ ہے جہاں تک اس کو غیر موجودگی سے مماثلت ہے۔

حق اور اس کے عکس کی صورتحال ہمارے اپنے تجربہ میں اس وقت اچھی طرح آتی ہے جب ہم خود کو آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ کا عکس کس قدر اصلی ہے؟ کیا آپ پروا کریں گے اگر آئینہ ٹوٹ جائے اور عکس غائب ہو جائے؟ کیا آپ کو عکس پر افسوس ہو گا؟ یہ تنزیہ کا تصور ہے، یہ توضیح کرتا ہے اللہ کس قدر مکمل اصل ہے اور ہم کس قدر قطعی بے حقیقت ہیں۔ لیکن ابھی تمام داستان نہیں بیان ہوئی۔ یہ بڑا فرق وہ ہے جس کو تشبیہ کا نظارہ ظاہر کرتا ہے۔ اللہ اپنی شبیہوں کی فکر کرتا ہے اور آئینہ ٹوٹنے نہ دے گا۔ وہ بہر حال، جیسے قرآن بیان کرتا ہے "جو رحم رکھتے ہیں ان میں سب سے زیادہ رحیم ہے"۔

یہاں اس قریبی تعلق پر زور دینا ضروری ہے جو قرآنی تصورات خیر و رحم (رحمت) میں ہے۔ لفظ خیر انگریزی میں گڈ(Good) ایک اسم اور صفت دونوں طرح کام آتا ہے۔ لیکن اس کا ایک تقابلی معنی بھی ہے۔ جب قرآن کہتا ہے

و رحمت ربك خير مما يجمعون○(الزخرف ۳۲)

ترجمہ جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تمہارے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے۔

تو یہ اللہ کے رحم کی شناخت خیر سے کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہمیں یہ بھی یاد دلا رہا ہے کہ اللہ کے خیر کے سوا کوئی خیر نہیں۔ چیزیں جنہیں لوگ زندگی میں خوشی کے حصول کے لئے اکٹھا کرتے ہیں، مثلاً دولت اور املاک، سوائے عارضی اور فریبی چیزوں کے کچھ بھی نہیں۔ درج ذیل آیت پر غور کیجئے جو اس آیت کی تشریح کرتی ہے جس کا حوالہ ہم خیر کے سلسلہ میں پہلے دے چکے ہیں

وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ○(ہود ۹)

ترجمہ اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں پھر اس سے اس کو چھین لیں تو نا امید (اور) ناشکرا ہو جاتا ہے۔

لوگوں کو نعمت بخشنے دی جاتی ہے، اسے ذخیرہ کرنے کے لئے نہیں۔ دوسرے الفاظ میں رحمت ان کو بانٹی جاتی ہے یہ ان کی ملکیت نہیں یہ اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی نعمت میں سے دیتا ہے۔

امتحان:

قرآن اکثر کہتا ہے کہ اللہ نے خیر اور رحم (نعمت) لوگوں کے ایمان کا امتحان لینے کے لئے مقدر کر دیا ہے اور لوگوں کو اپنی فطرت ثابت کرنے کا موقع دینے کے لئے۔۔۔ اللہ کو نہیں، کیونکہ بے شک وہ تو ان کی فطرت سے واقف ہی ہے۔ وہ اپنی فطرت کا مظاہرہ خود پر کر رہے ہیں تاکہ انہیں اس وقت کوئی اعتراض نہ ہو جب وہ دوسری دنیا میں اپنی منزل پر پہنچیں۔

جو لوگ قدر پر ایمان رکھتے ہیں، خیر اور شر دونوں کی قدر وہ پہچانتے ہیں کہ اللہ جو کچھ کر رہا ہے وہ اس کے علم میں ہے، خواہ ان کی ذاتی خواہشیں مستقلاً پامال ہو رہی ہوں۔ وہ اللہ کے لئے اپنی شکر گزاری اس وقت ظاہر کریں گے جب وہ انہیں دے گا اور صبر کریں گے جب وہ ان سے روک لے گا۔ ایسے رد عمل ان کا ایمان ثابت کریں گے۔ لیکن وہ اپنے ایمان کا مظاہرہ نہیں کریں گے اگر وہ اس طرح عمل کریں گے جس پر قرآن بار بار تازیانہ لگاتا ہے (خیر و شر، رحم اور غضب کے الفاظ کے استعمال

ہے)۔

وَ اِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَی الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِہٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ یَـُٔوۡسًا O (بنی اسرائیل۔۸۳)

ترجمہ اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو روگرداں ہو جاتا اور پہلو پھیر لیتا ہے اور جب اسے سختی پہنچتی ہے تو نا امید ہو جاتا ہے۔

خیر، رحم اور نعمت کا درست جواب شکر گزاری ہے جبکہ شر، غضب اور نقصان کا درست جواب صبر اور امید ہے۔

جب قرآن خیر و شر کے فوائد کا جائزہ لیتا ہے تو وہ بعض اوقات لفظ امتحان (بلا) اور آزمائش (فتنہ) استعمال کرتا ہے۔

وَ نَبۡلُوۡکُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَیۡرِ فِتۡنَۃً ؕ وَ اِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ O (الانبیاء۔ ۳۵)

ترجمہ اور ہم تم کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں اور تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے۔

قرآن کہتا ہے کہ انسانوں کو زمین پر خود کو ثابت کرنے اور اپنی خام جنس ظاہر کرنے کے لئے رکھا گیا ہے۔ ایک بار جب وہ آزمائش سے گذر جائیں ان کو اپنی اپنی آخری آرام گاہ معلوم ہو جائے گی۔

وَ قَطَّعۡنٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اُمَمًا ۚ مِنۡہُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَ مِنۡہُمۡ دُوۡنَ ذٰلِکَ ۫ وَ بَلَوۡنٰہُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ O (الاعراف۔۱۶۸)

ترجمہ اور ہم نے ان کو جماعت جماعت کر کے ملک میں منتشر کر دیا، بعض ان میں سے نیکو کار ہیں اور بعض اور طرح (یعنی بدکار) اور ہم آسائشوں اور تکلیفوں (دونوں) سے ان کی آزمائش کرتے رہے تاکہ ہماری طرف رجوع کریں۔ (توحید کی طرف)

وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ O ۙ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ O ؕ (البقرہ ۱۵۵،۱۵۶)

ترجمہ: اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (اللہ کی) خوشنودی کی بشارت سنا دو۔ ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

آزمائش میں صرف شر، تکلیف اور مصیبت ہی شامل نہیں۔ فائدے اور راحتیں بھی آزمائش ہیں۔ اگر لوگ اللہ کو بھول جائیں، خواہ مصیبت میں یا خوشی میں، وہ آزمائش میں ناکام ہو جائیں گے۔ اللہ کی یاد بھی درست طریقہ سے ہونا چاہیئے۔ صرف اللہ کی نعمتوں کا اعتراف ہی کافی نہیں۔ بہر حال شکر ایمان سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ایمان کا تقاضا شرع کی پابندی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں قرآن لوگوں کی دونوں آزمائشوں میں ناکامی پر تنقید کرتا ہے آسائشوں کی آزمائش اور مصائب کی آزمائش۔ دیکھئے کس طرح بہت سے اچھے اعمال کے ذکر سے جو انہیں اپنا ایمان ظاہر کرنے کے لئے کرنا چاہیں عبارت فوراً آزمائش میں ناکام ہونے والوں پر تنقید کی طرف مڑ جاتی ہے۔

فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ رَبُّہٗ فَاَکۡرَمَہٗ وَ نَعَّمَہٗ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَکۡرَمَنِ O ؕ وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ فَقَدَرَ عَلَیۡہِ رِزۡقَہٗ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَہَانَنِ O ۚ کَلَّا بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ O ۙ وَ لَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ O ۙ وَ تَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا O ۙ وَّ تُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا O ؕ (الفجر: ۱۵ تا ۲۰)

ترجمہ مگر انسان (عجب مخلوق ہے) جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ (آہا) میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی۔ اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے (ہائے) میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا۔ نہیں، بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے ہو اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو آزماتا ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ ان میں سے کون صاحب ایمان ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اور کون سچ چھپاتے اور کفر کو پھیلاتے ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ○ (الکہف: ۷)

ترجمہ جو چیز زمین پر ہے ہم نے اس کو زمین کیلئے آرائش بنایا ہے تاکہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک: ۱۔۲)

ترجمہ وہ (خدا) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے۔

قرآن کا بار بار دہرایا جانے والا مضمون جس کی طرف اوپر کی آیات میں اشارہ ہے یہ ہے کہ لوگ اپنے صحیح مقام کو پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔ اگر انہیں اچھائی ملتی ہے وہ سوچتے ہیں یہ ان کا حق تھا اور اگر انہیں تکلیف پہنچتی ہے یعنی خیر کی کمی۔۔۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کیساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ کفر ہے (سچ چھپانا اور ناشکری) کیونکہ یہ ایمان اور شکر کی دونوں ضرورتوں کی تردید کرتا ہے۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الزمر: ۴۹)

ترجمہ جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے (میرے) علم (و دانش) کے سبب ملی ہے۔ (نہیں) بلکہ وہ آزمائش ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔

توحید کا مطلب ہے کہ لوگوں کے پاس کوئی چیز مثبت نہیں جو ان کی اپنی ہو۔ اس کے برخلاف تمام خیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر لوگوں کو نعمت ملتی ہے وہ اس کو اللہ کی مرضی سے پاتے ہیں اپنی کسی ذاتی فضیلت کی بنا پر نہیں۔ اگر انہیں نعمت نہیں ملتی تو وہ وہی ہے جس کے وہ حقدار ہیں کیونکہ اللہ کی مہربانی اور رحم کے بغیر وہ حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا قرآن انسانی خیر کے متعلق ان کے دعووں کی تصویر کشی چیزوں کی اصلیت کو مسخ کرنے سے کرتا ہے۔

انسانی ادعا سے کوئی مجروح نہیں ہوتا سوائے ان کے جو دعوے کرتے ہیں۔ انصاف ایک ربانی صفت ہے جس کی تعریف کسی چیز کو اس کی درست جگہ رکھنا ہے۔ عدل کی عام ضد ظلم ہے جس کا قرآنی سیاق و سباق میں ہم غلط کاری ترجمہ کرتے ہیں۔ غلط کاری ایک انسانی صفت ہے جس کی تعریف عام طور پر کسی چیز کو اس کی جگہ پر نہ رکھنے سے کی جاتی ہے۔ قرآن بار بار انسانی غلط کاریوں کو برا گردانتا ہے۔ اہم بات ہے کہ جب وہ ان کا ذکر کرتا ہے جن کو غلط کاری سے نقصان پہنچا ہے تو وہ قریباً ہر مرتبہ لفظ

نفس استعمال کرتا ہے۔ کوئی اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ایک مچھر سورج کو ڈنک نہیں مار سکتا۔ لیکن لوگ خود کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور پہنچاتے ہیں، ہر مرتبہ جب وہ کسی چیز کو غلط جگہ رکھتے ہیں، وہ اپنی فطرت سے تجاوز کرتے ہوئے خود کو گمراہی میں ڈالتے ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

مندرجہ ذیل ایک خاص آیت ہے جس میں غلط کاری کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک گذشتہ قوم کی تباہی کے بیان میں وارد ہوئی ہے جس نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا تھا۔ یاد رہے معبود کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے جس کی خدمت اور پوجا کی جائے سوائے اللہ کے۔ آخری حد غلط کاری کی شرک ہے، ان چیزوں کی خدمت جو اس کی اہل نہیں، اللہ کے بجائے جھوٹے معبود بنا لینا۔

و ما ظَلَمْنٰهُمْ و لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ○ (ہود:۱۰۱)

ترجمہ اور ہم نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا، غرض جب تمہارے پروردگار کا حکم آ پہنچا تو جن معبودوں کو وہ اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اور تباہ کرنے کے سوا ان کے حق میں کچھ نہ کر سکے۔

خلاصہ یہ کہ جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قدر اس کی خیر کی اور اس کے شر کی" تو آپ کو لوگوں کے ادراک کو مد نظر رکھنا پڑا کہ بعض چیزیں جو ان کے ساتھ پیش آتی ہیں خیر ہیں اور بعض چیزیں جو پیش آتی ہیں شر ہیں۔ انسان کا ایمان ہونا چاہیے کہ جو کچھ اسے ملتا ہے اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ خواہ وہ اسے شے سمجھیں یا نقصان انہیں اسے شکر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے ہر وقت یہ یاد رکھتے ہوئے کہ اللہ کا رحم و کرم اس کے غضب پر غالب ہے۔ ہر چیز جو وقوع پذیر ہوتی ہے ان کے ایمان کا امتحان لیتی ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ (العنکبوت ۲)

ترجمہ کیا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ (صرف) یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

خود مختاری:

قدر پر ایمان کا مطلب یہ سمجھنا ہے کہ تمام خیر اللہ کی ملکیت ہے۔ اللہ کے سوا ہر شے کسی نہ کسی بابت سے وجوہ سے خیر سے عاری ہے۔ جو لوگ یہ ایمان رکھتے ہیں وہ اس خیر کے لیے جو انہیں حاصل ہے شکر گزار ہوں گے اور جس خیر کی ان میں کمی ہے اس کے لئے وہ اللہ پر بھروسا کریں گے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ حق، جو رحیم ہے، اپنی حکمت سے تمام چیزوں کے انتہائی خیر کو مد نظر رکھ کر چیزیں ٹھیک ٹھیک مقدر کرتا ہے۔

وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ یَئُوْسًا ○ (بنی اسرائیل ۸۳)

ترجمہ جب اسے سختی پہنچتی ہے تو وہ نا امید ہو جاتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآىٕهٖۤ اُولٰٓىٕكَ یَىٕسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ (العنکبوت:۲۳)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں سے اور اس کے ملنے سے انکار کیا وہ میری رحمت سے ناامید ہو گئے اور ان کو درد دینے والا عذاب ہو گا۔

اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ (الزمر ۵۲۔ ۵۳)

ترجمہ: کیا ان کو معلوم نہیں کہ خدا ہی جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ اے میرے بندو) جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے اور وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔

قدر کے مختلف پہلو بظاہر منطقی تضاد ظاہر کرتے ہیں۔ اگر تمام چیزیں، خواہ اچھی ہوں یا بری، مقدر ہیں تو کیا یہ درست نہیں کہ ہمارا انجام مقدر اور پورا ہو چکا؟ آخر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کا آخری ٹھکانا جنت یا دوزخ، پہلے ہی اس کے لئے اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھ دیا گیا ہے۔ پھر مذہب کس کام کا جبکہ ہر چیز کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے؟

یہ آزاد مرضی اور تقدیر کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک عقدہ ہے جس نے بہت سے مذاہب کے بیر وکار علماء کو صدیوں سے پریشان کر رکھا ہے۔ ہم اس عقدہ کے مسلم حل پیش نہیں کریں گے گو بہت سے تجویز کئے گئے ہیں۔ اس کے بجائے ہم چیزوں کی صرف قرآنی سطح تک محدود رہیں گے اور تجویز کریں گے کہ جس طرح تمام اہم مسائل میں، لیکن کوئی واضح اور سادہ جواب نہیں ہے۔ جیسے اکثر قرآن تصدیق کرتا ہے کہ اللہ نے چیزیں مقرر کر دی ہیں اور وہ تمام چیزوں کو ان کے وقوع سے پہلے ہی جانتا ہے۔ وہ یہ بھی تصدیق کرتا ہے کہ انسانی سعی بامعنی ہے۔

وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَ سَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۹)

ترجمہ: اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَ اَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی ۝ (النجم: ۳۹۔۴۰)

ترجمہ: اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

قرآن کچھ نہیں مگر لوگوں کی طرف ایک کتاب ہے انہیں اللہ کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دینے کے لئے جس طرح وہ آفاقی اور لازمی اسلام کے بجائے اسلام بالقصد کا مقتضی ہے اسی طرح وہ جہاد اور مجاہدہ کا مطالبہ کرتا ہے یعنی اللہ کی راہ میں مشقت۔ اگر انسان محض پتلیاں ہوتے، بغیر کسی قسم کے خود پر قابو کے تو قرآن ایک بے معنی کتاب ہوتی۔ آزاد مرضی اور تقدیر کو انسانی حالت کے امدادی اظہار کے طور پر سمجھنا چاہئے۔ دونوں میں سے کوئی بھی صورتحال کی مکمل تشریح نہیں کرتی۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ دونوں تصورات کس طرح مربوط ہیں ایک مفید طریقہ پھر سے تنزیہ اور تشبیہ کے حوالے سے سوچنا ہو گا۔

تنزیہ کے لحاظ سے انسانی حقیقت محض غیر حقیقی ہے کیونکہ صرف اللہ ہی حقیقت ہے۔ انسانوں کو کوئی علم، قوت، طلب یا آزادی حاصل نہیں کیونکہ یہ ربانی صفات ہیں اور صرف اللہ کی ملکیت ہیں۔ لیکن تشبیہ کے لحاظ سے انسان ان ربانی صفات کو منعکس کرتا ہے صفات تو اللہ کی ہیں مگر وہ انسانوں کے ذریعہ کارفرما ہیں۔ اللہ [illegible] چاہے [illegible] سکتا ہے" تو تشبیہ کے لحاظ سے انسان بھی محدود حد تک کچھ کر سکتے ہیں۔

بہرحال انسانی آزادی کی بہت سی قدغنیں ہیں جیسا کہ ہر شخص پہچانتا ہے۔ [illegible] پیدائش، اپنے والدین، اپنی قوم، اپنی ثقافت، اپنی مادری زبان، اپنے بنیادی جسمانی خصائص وغیرہ کا انتخاب نہیں [illegible] سب ودیعت ہوتی ہیں۔ لیکن اس ودیعت کے سیاق و سباق میں انتخابات باقی رہتے ہیں۔ جس حد تک یہ انتخابات [illegible] آزاد ہیں۔

ملاحظہ کیجئے تقدیر کا تعلق تنزیہ اور غضب کی صفات سے ہے۔ ایک انتہائی [illegible] اصطلاح جو تقدیر کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے جبر ہے۔ اور اللہ کا ایک قرآنی نام الجبار (سب سے زبردست) [illegible] اور سختی کے ناموں کی قسم میں صحیح بیٹھتا ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اللہ کا رحم اس کے غضب پر حاوی ہے۔ اسماء جمال [illegible] جلال و قہر پر برتری حاصل کرلیں گے۔ الطاف و رحم جبر پر فتح پالیں گے۔ اسماءِ جمال اللہ سے قربت پیدا کرتے ہیں۔

جدید سوسائٹی میں ہم آزادی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اسے زندگی کی اچھی [illegible] دیتے ہیں۔ بے شک آزادی کے دو اسلوب ہیں، "سے آزادی" اور "کے لئے آزادی"۔ ہم ظلم سے آزادی چاہتے ہیں اور [illegible] کے لئے آزادی چاہتے ہیں اور ان چیزوں کے لئے جن سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انسانی معاملات میں یہ دو قسمیں [illegible] اکثر ٹکرا جاتی ہیں۔ جب ہمیں مثلاً اشیاءِ صرف کی بہتات سے لطف اندوز ہونے کی آزادی ملتی ہے ہم دنیا کے دوسرے حصوں کے باشندوں کے لئے استحصال، ماحولیاتی تباہی کے شدید آلام و مصائب لاتے ہیں۔ آزادی کے سکے کا گھومتا ہوا رخ غلامی ہو سکتا ہے۔ جو آپ کے لئے خیر ہے کسی اور کے لئے شر ہو سکتا ہے۔ آپ کی آزادی کسی دوسرے کی غلامی ہو سکتی ہے یا یہ خود آپ کی اپنی غلامی بھی ہو سکتی ہے۔ ان تمام لوگوں پر نظر ڈالئے جو اس خواہش میں ہیں کہ وہ خوش وقتی کے لئے آزاد ہوں۔

مسلم مفکرین "سے آزادی" اور "کے لئے آزادی" دونوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کا تصور آزادی جدید تصور سے ممتاز ہے کیونکہ اس کی بنیاد شہادۃ پر استوار ہے۔ "کوئی آزاد نہیں سوائے اللہ کے" اللہ ہر قسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ہے:

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ○ (ہود:۱۰۷)

ترجمہ: بے شک تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ○ (البروج:۱۶)

ترجمہ جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

لیکن کسی مخلوق میں یہ صفت نہیں ہو سکتی۔ اللہ کے تقابل میں تمام مخلوقات مکمل غلامی میں رہتی ہیں۔ انسانوں کی آزادی کے لئے ان کو اللہ کی آزادی سے حصہ لینا ہوتا ہے۔ اللہ ہر چیز سے آزاد ہے سوائے اپنی ذات کے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ○ (آل عمران: ۹۷)

ترجمہ: بے شک اللہ عالمین سے بے نیاز ہے۔

انسان کبھی اللہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝ (فاطر:۱۵)

ترجمہ لوگو! تم (سب) اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے پروا سزاوار حمد (و ثنا) ہے۔

تمام قوت، حق و حمد تنہا اللہ کے لئے ہے کیونکہ انسان کبھی بھی اللہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، وہ مسلم اور فطرتاً عبد ہیں۔ انہیں اس حقیقت کو پہچاننا چاہیے اور رضاکارانہ اپنے کو اس کے حوالہ کر دینا چاہیے۔ وہ اصلیت کے سامنے محو پرواز نہ ہوں گے۔ خود کو اللہ سے [illegible] ہوئے وہ خود کو ہر چیز سے بے نیاز کر لیتے ہیں۔ خود کو اللہ کے لئے آزاد کرتے ہوئے وہ ہر دوسری شے سے بے نیاز [illegible]۔ اللہ کے سوا ہر چیز سے بے نیازی اور ہر بے حقیقت شے سے آزادی حقیقت میں آزادی ہے، یہ ہر طرح سے [illegible] اور توحید قائم کرنا ہے۔

پس اسلامی [illegible] "سے آزادی" ان پابندیوں سے آزادی ہے جو ہم پر پیدا کی ہوئی چیزیں عائد کرتی ہیں اور اللہ کی خدمت کرنا ہے۔ [illegible] آزادی" ہر معاملہ میں ناحق کے مقابلہ میں حق کا انتخاب ہے۔ ناحق کے لئے آزاد ہونا بے معنی ہے کیونکہ ناحق کا وجود نہیں۔ [illegible] آزادی کی خواہش علم، طلب، قوت، خیر اور ہر مثبت اور اصل چیز کیلئے کرنا چاہیے۔ کوئی چیز اصل نہیں سوائے حق [illegible] ناحق سے آزادی وہیں آجاتی ہے جہاں حق کے لئے آزادی ہے۔ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ دونوں توحید ہیں۔

کیا ہم آزاد ہیں؟ [illegible] ہاں اور نہ ہے۔ ہم اس حد تک آزاد ہیں جس حد تک ہم اللہ سے مماثل ہیں۔ لیکن ہماری مماثلت ہمیشہ لاثانیت سے [illegible] ہوتی ہے۔ توحید تنزیہ اور تشبیہ دونوں کا تقاضا کرتی ہے۔ آزادی ایک حقیقت ہے جس کے مدارج ہیں، لوگ جوں جوں اللہ سے نزدیک تر ہوتے جاتے ہیں وہ زیادہ آزاد ہوتے جاتے ہیں۔ اسلام کی غرض توحید کی راہ دکھانا ہے جہاں تنزیہ و تشبیہ صحیح توازن سے برقرار ہیں۔ انسان ہونا نسبتاً آزاد ہونا ہے۔ مگر اتنا آزاد ہونا جتنا انسان کے لئے ممکن ہے اس وقت واقع ہو سکتا ہے جب حقیقت (اللہ) کی مکمل اطاعت اور سپردگی حاصل ہو جائے۔

ایک آخری نکتہ آزاد مرضی اور تقدیر کے مسئلہ پر بیان کرنا ضروری ہے۔ جب لوگ ان تضادات پر تنقید کرتے ہیں جو اللہ کی کامل قوت سے متعلق ہیں تو ان کی نیتوں کو ذہن میں رکھنا اہم ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں سوال کرنا چاہیے کہ لوگ کیوں اعتراض کرتے ہیں۔ اکثر نیت صرف دوسروں کو مطمئن کرنے کی ہوتی ہے کہ یہ سوچنے میں کہ اللہ یا پیغمبر کی ہدایت کا تصور کوئی معنی بھی رکھتا ہے وہ احمق اور نا سمجھ ہیں۔

جدید بولی میں جب لوگ تقدیر کے تصور پر احتجاج کرتے ہیں وہ اکثر شک کی تاویل سے متحرک ہوتے ہیں۔ احتجاج کرنے والے بدترین صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی نظر میں اصل مسئلہ قوت کا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ دراصل ہوا یہ ہے کہ بعض لوگوں نے مذہبی تعلیم کو جوڑا توڑا تاکہ اپنی ذاتی قوت برقرار رکھ سکیں اور دوسروں کو تابع کر سکیں۔

اس چیز سے انکار کئے بغیر کہ ایسے جوڑ توڑ والے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ہمیں پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ صورتحال کو سمجھنے کے اور بھی طریقے ہیں اور اسلامی طریقہ ہمیشہ یقین کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہے۔ یہ یقین انسانوں کی طرف راجع نہیں بلکہ اللہ کی طرف ہے۔ قرآن یقین (توکل) کا چالیس آیات میں ذکر کرتا ہے اور ہر مرتبہ مطمح نظر اللہ ہے۔

وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران ۱۲۲)

ترجمہ اللہ ان کا مددگار ہے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔

اِنِّی تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَ رَبِّکُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍO(ہود: ۵۶)

ترجمہ: میں اللہ پر جو میرا اور تمہارا (سب کا) پروردگار ہے بھروسا رکھتا ہوں (زمین پر) جو چلنے پھرنے والا ہے اس کو وہ چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے بے شک میرا پروردگار سیدھے رستے پر ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ ۚ وَ عَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَO (یوسف: ۶۷)

ترجمہ بے شک حکم اسی (اللہ) کا ہے میں اسی پر بھروسا رکھتا ہوں اور اہل توکل کو بھی اسی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔

وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَہُوَ حَسْبُہٗ ؕ (طلاق:۳)

ترجمہ جو اللہ پر بھروسا رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔

اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَO(النحل: ۹۹)

ترجمہ: جو مومن ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں ان پر اس (شیطان) کا کچھ زور نہیں چلتا۔

ایک مشہور حدیث قدسی توجہ دلاتی ہے کہ اللہ پر توکل کا مطلب ہے کہ لوگ ہمیشہ اس کے متعلق حسن ظن رکھیں۔ انہیں کبھی بھی اللہ کی وعدے پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ "میں اپنے بندے کی میرے متعلق رائے کے ساتھ ہوں"۔ انہیں اس کے متعلق اچھی رائے رکھنا چاہیے تاکہ وہ اسے ملیں اس کی پوری رحمت، شفقت اور شرف کے ساتھ۔

مسلمان اللہ کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہی برحق ہے اور یہ کہ حقیقت کا اپنا تقاضا ہے کہ رحم کو غضب پر لازماً غالب رہنا چاہیے۔ انہوں نے ہمیشہ یقین کیا ہے کہ قرآن نازل کرنے میں اللہ کی طرف کی خیر واضح ہے۔ وہ لوگوں کی آخرت کی خوشیوں کی طرف رہنمائی کرنا چاہتا ہے یا تقدیر کی تکمیل کی طرف۔ اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ تمام چیزیں اندازے کے مطابق ہیں قرآن صرف یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ نگران ہے یا یہ کہ حقیقت وہی کچھ ہے جو ہے اور اسے بدلنے کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

ان چیزوں میں جنہیں اللہ اندازے سے مقرر کرتا ہے خود مختاری اور رہنمائی شامل ہیں۔ پس انسان پیش کردہ ہدایت کو قبول یا رد کرنے کے لئے خود مختار ہے۔ وہ ذمہ داری کا ایک بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے اپنی خود مختاری کو جو انہیں دی گئی تھی کیسے استعمال کیا اور ہدایت پر جو انہیں دی گئی ان کا رد عمل کیا تھا۔ ان کی ذمہ داری کی حد بھی ہے۔ جہاں وہ خود مختار نہیں تھے اور ہدایت انہیں نہیں دی گئی تھی وہ ذمہ دار نہ ٹھیرائے جائیں گے۔

تخلیق کا تنوع:

اللہ تمام چیزیں مقرر کرتا ہے۔

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ ۫ وَ مَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍO(الحجر:۲۱)

ترجمہ. اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو بمقدار مناسب اتارتے رہتے ہیں۔

مقدار مقرر کرنے کا تعلق صرف اس بات سے نہیں کہ لوگوں میں آزادانہ انتخاب کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ اس کے کہیں زیادہ وسیع اثرات ہیں، کیونکہ یہ خود تخلیق کا ایک اصول ہے۔ خواہ وجود میں کچھ بھی ہو، اللہ نے اس کی مقدار مقرر کر دی ہے اور اس کی فطرت طے کر دی ہے۔

أَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى O(طٰہٰ : ۵۰)

"اس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر ہدایت دی"۔ (۵۰:۲۰)

اس تمام قدر کا نتیجہ ہے کہ اللہ ایک ناقابل تصور بے اندازہ کائنات تخلیق کرتا ہے جس میں مخلوق کا بے شمار تنوع ہے۔ اگر ہم مخلوقات کی یکے بعد دیگرے تحقیق کریں تو کام کبھی مکمل نہ ہو۔ لیکن اگر ہم عام گفتگو کریں تو مخلوق کی درجہ بند تقسیم ممکن ہے۔ ایسی تقسیم ممکن نہیں۔ صرف عام انداز میں بتانا کہ لوگ کیا دیکھتے ہیں یا دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں ضروری بصیرت حاصل ہو۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کائنات دو بنیادی دنیاؤں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پنہاں اور عیاں انہیں بعض اوقات آسمان اور زمین یا روحانی دنیا اور جسمانی دنیا کہا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ ایک تیسری دنیا بھی ہے جو ان دونوں دنیاؤں سے مماثل اور مختلف ہے جو تصور کی دنیا ہے۔ ہم نے یہ بھی نشاندہی کی تھی کہ اگر یہ تینوں دنیائیں کل کائنات کی عام ساخت کی نمائندگی کرتی ہیں تو انسان کو ایک عالم اصغر کہا جا سکتا ہے کیونکہ ہر ایک انسان کے اندر تین متوازی عملی دائرے ہیں روح، نفس اور جسم۔

اس نکتہ پر ہم دوسری جسمانی مخلوق پر بھی نظر ڈالنا چاہیں گے یعنی وہ مادی چیزیں جو عیاں کائنات کو پُر کرتی ہیں۔ مسلمان علماء یونانی درجہ بندی کے معیار کی پیروی کرتے ہوئے عیاں چیزوں کو تین بڑے درجوں میں تقسیم کرتے ہیں: غیر ذی روح، پودے اور حیوان۔ ہمارے لئے جو بات دلچسپی کا باعث ہے یہ ہے کہ یہ تین اقسام کی مخلوق کس طرح اپنا آیات الٰہی ہونا ظاہر کرتی ہیں۔

ہم نے پہلے تجویز کیا تھا کہ آیات کے مطالعہ کا ایک طریقہ ان ربانی صفات پر تفکر ہے جو ان کے ذریعہ عیاں ہوتی ہیں۔ غیر ذی روح اشیاء میں کونسی صفات عیاں ہوتی ہیں؟ غالباً اس سوال کے جواب کا بہترین طریقہ یہ کہنا ہے کہ کسی اور چیز سے زیادہ غیر ذی روح اشیاء اللہ کی صفات کو ظاہر کرنے کے بجائے چھپاتی ہیں۔ وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ کیا نہیں ہے، بمقابلہ اس کے کہ وہ کیا ہے۔ بے شک کائنات کی ہر چیز کچھ چیز ہونے کی وجہ سے اللہ کے علاوہ کچھ ہے پس ہم ہر چیز سے سیکھتے ہیں کہ اللہ ایسا نہیں ہے۔ یہ تنزیہ کا پیش منظر ہے۔

تمام چیزیں تشبیہ کے لحاظ سے بھی کچھ کہتی ہیں اور غیر ذی روح چیزوں میں تشبیہ کمزور ترین ہے۔ کسی پتھر میں ربانی صفات دیکھنا انتہائی مشکل ہے۔ حالانکہ پتھر بھی اللہ کی ہمیشگی اور ابدیت کے متعلق کچھ اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن بیشتر حد تک پتھر ہمیں بتاتے ہیں کہ اللہ لامتناہی فاصلہ پر ہے اور ان سے مختلف ہے۔ تاہم پتھر، خصوصاً بڑے پتھر، جیسے سیارے، ہمیں سکھاتے ہیں کہ اللہ قوی ذوالجلال اور جبار بادشاہ ہے جو بڑے پتھر ادھر ادھر پھینکتا ہے جیسے کہ وہ ریت ہوں، سورجوں اور کہکشاؤں کی بات ہی اور ہے۔

غیر ذی روح اشیاء کے مقابلہ میں پودے بہت سی نمایاں ربانی صفات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ دیکھنا آسان ہے کہ پودے زندہ ہیں اور زندگی سات پیشواؤں میں اول ہے، سات ربانی صفات جو کائنات پر غالب ہیں۔ پودے کسی قدر علم رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہاں غذا تلاش کی جائے اور کہاں دھوپ۔ یقیناً وہ خواہش (طلب) بھی رکھتے ہیں: انہیں پانی چاہیئے، دھوپ، کھاد، عناصر کا کھوج درکار ہے۔ اگر آپ ان کا ٹھیک خیال رکھیں اور انہیں وہ دیں جس کی انہیں واقعی ضرورت ہے مثلاً عمدہ اور زرخیز کھاد،

وہ بھی اپنی شکر گزاری کا اظہار بہتات سے فصل پیدا کر کے کرتے ہیں۔ وہ ناشکرے اور حقیقت چھپانے والے نہیں۔ پودوں میں طاقت ہے وہ پتھروں اور کنکریٹ کو تباہ کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے انہیں وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن یہ تمام ربانی صفات پودوں میں کمزور پائی جاتی ہیں۔ پس تنزیہ تشبیہ پر حاوی آجاتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں حیوانات میں پائی جانے والی ربانی صفات بہت زیادہ شدید ہیں۔ مزید برآں حیوانات دیگر صفات کا اضافہ کرتے ہیں جو پودوں میں پانا مشکل ہے۔ جانوروں میں پایا جانے والا علم نہایت [illegible] ہوتا ہے تو یہ ہمیشہ منفرد ہوتا ہے۔ شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کے ساتھیوں کو ٹھیک بتا سکتی ہیں کہ بہترین شہد [illegible] لیکن انہیں سرکہ کے متعلق ایسا کچھ معلوم نہیں۔ بڑی تتلیاں میکسیکو میں اپنی واپسی کا صحیح مقام جانتی ہیں لیکن [illegible] نہیں بتا سکتا کہ وہ آپ کو نیویارک سٹی لے جائیں۔ جانوروں کی سلطنت ناقابل یقین علمی تنوع اور مہارت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ [illegible] بڑی تعداد میں اجرام پر منقسم ہے۔ طلب (خواہش) بھی جانوروں میں واضح طور پر موجود ہے لیکن ہر نوع مختلف چیزیں چاہتی ہے اس طرح ایک بڑی قدرتی ہم آہنگی وہاں پیدا ہو جاتی ہے جہاں بقول مولانا روم "ہر چیز کھا رہی ہے اور کھائی جا رہی ہے۔"

پودے اور جانور دونوں مخصوص آیات کے ایک وسیع تنوع کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پودوں اور جانوروں کی ہر نوع ربانی صفات کی ایک خاص تشکیل ہے جو کسی دوسری نوع میں پیدا نہیں ہوئی۔ لہٰذا شاہ بلوط کے درخت شاہ بلوط پیدا کرتے ہیں اور ہمیں بھی تعجب نہیں ہوتا کہ ان میں سیب نہیں لگتے۔ اگر ہمیں شاہ بلوط سے سیب حاصل ہوتے تو ہمیں پتا چل جاتا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو گیا ہے۔

جانوروں کی ہر نوع ایک خاص علم، خواہش، قوت اور دیگر ربانی صفات سے متعارف ہوتی ہے جو اس کو جانوروں کی دوسری انواع سے ممیز کرتے ہیں۔ کیونکہ صفات مقررہ ہیں ہمیں ہمیشہ علم ہوتا ہے کہ موروں، ہاتھیوں اور بلیوں سے کیا توقع کرنا چاہیئے۔ اس میں تعجب کا ایک عنصر شامل ہو سکتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ انواع سے [illegible]، یا بعض خارجی اوامر سے اس کا پتا چلتا ہے جیسے کوئی بیماری جو تصویر کو گنجلک بناتی ہے۔

انسان بھی جانوروں کی ایک نوع ہے اور ان کی بہت سی خصوصیات میں شریک ہے۔ لیکن ایک نادر خصوصیت جو انہیں تمام دوسرے جانوروں سے ممیز کرتی ہے ہر جانور وہی کچھ ہے جو کچھ وہ بغیر کسی الجھن کے ہے۔ ہم ایک جھینگری کو عقاب سمجھنے کی غلطی نہیں کرتے یا بلی کو کتا۔ لیکن انسان ان جانے عناصر ہیں، ہمیں کبھی پتا نہیں چلتا کہ انسان کیا ہے کیونکہ عملاً ایک انسان کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ایک کتا کتا ہی ہے لیکن ایک انسان کتا یا سور ہو سکتا ہے۔ ہم یہ الفاظ تحقیر کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن ان میں بڑی دانش ہے جو ہر ثقافت نے قبول کی ہے۔ جانوروں کی ہر نوع پر کسی ایک یا چند خصلتوں کا غلبہ ہے۔ جانور کے لئے یہ تمام خصلتیں اچھی ہیں کیونکہ وہ اس کی اصل فطرت بتاتی ہیں۔ لیکن اگر وہی خصلتیں انسانوں پر غالب ہوں وہ اچھی یا بری ہو سکتی ہیں۔

ایک کتے میں بہت سی صفات ہو سکتی ہیں۔ وہ وفادار ہے جو ایک اچھی صفت ہے جب انسانوں میں پائی جائے۔ لیکن کتے ایک شدید حرص اور خباثت بھی رکھتے ہیں اور یہی عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہوتا ہے جب وہ کسی کو کتا کہتے ہیں۔

انسان بے انتہا لوچدار ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ جب ہم کرہ بھر لوگوں کا سامنا کریں تو ہمیں کیا پیش آئے۔ ہمیں پاکباز یا قاتل مل سکتے ہیں اور ہم آسانی سے امتیاز نہیں کر سکتے۔ جب ہمارا سامنا ایک کتے یا شیر یا گھونگے سے ہوتا ہے ہمیں معلوم

ہوتا ہے کہ کیا توقع کرنا چاہیے اور کیا ردعمل دکھانا چاہیے، لیکن انسانوں کے متعلق ہمیں اکثر حتمی علم نہیں ہوتا۔

نوع انسانی:

آخر نوع انسانیت کیا ہے؟ نوع انسان اور جانوروں میں کیا چیز بنیادی فرق پیدا کرتی ہے؟ مسلمان ان سوالوں کا جواب کئی طرح دیتے ہیں۔ ہماری موجودہ بحث میں براہ راست انسانوں اور ربانی صفات کے تعلق کی نوعیت کی تحقیق ہے۔ انسان کے علاوہ ہر مخلوق اللہ کی ایک آیت ہے جس میں ربانی صفات کی ایک مقرر، محدود اور معروف تشکیل جھلکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان اللہ کو بطور اللہ منعکس کرتا ہے۔ دوسری مخلوق میں بعض ربانی صفات مستقلاً عیاں ہیں جبکہ بعض مستقلاً نہاں ہیں۔ انسانوں میں تمام ربانی صفات موجود ہیں اور ان میں سے ہر ایک مناسب حالات میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عجیب انسانی خصلت کی طرف اشارہ کیا جب آپؐ نے انجیل کا وہ مشہور قول دہرایا۔۔۔ ایک قول جس نے یہودی اور عیسائی فہم میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے کہ انسان ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ گو ہم قرآنی متن کے مطابق شبیہ کے بجائے صورت کا لفظ استعمال کریں گے۔ بہت سے علماء قرآنی آیت کے ایسے ہی معنی خیال کرتے ہیں۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرہ ۳۱)

ترجمہ: اور اس (اللہ) نے آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔

ذہن میں یہ رکھنا اہم ہے کہ آدم پہلے انسان کی نشاندہی کرتا ہے اور وسیع تناظر میں کسی بھی اور ہر انسان کی۔ قرآن اور اسلامی روایت عام طور پر لفظ آدم انسان (نوع انسان) کے مترادف کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ لفظ زن کے مقابلہ میں مرد کا حوالہ نہیں دیتا جب تک خاص متن میں حوا کا ذکر نہ ہو اور یہ آدم کی صفات سے مختلف صفات کی نشاندہی سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ آدم و حوا کا مطلب صرف تمام انسان، (مرد و زن) ہو گا۔ ہم آدم و حوا کے رشتہ کی طرف پھر واپس آئیں گے جب ہم جنت سے نکال دیے جانے کا ذکر کریں گے۔

آدم کی تخلیق سے متعلق قرآنی بیان انسانی فطرت کے اسلامی نظریہ کو سمجھنے کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ بیشتر قرآنی قصوں کی طرح یہ قرآن میں ایک جگہ بیان نہیں ہوا لہٰذا ہمیں مختلف سورتوں سے ٹکڑے جمع کرنا پڑتے ہیں۔ یہاں ہم بعض اہم واقعات کی تلخیص کر سکتے ہیں۔

اللہ نے فیصلہ کیا کہ وہ زمین میں اپنا گورنر اور نمائندہ بنائے گا۔ گورنر کے لئے عربی لفظ یہاں خلیفہ ہے جس سے انگریزی لفظ Caliph بنا ہے۔ اللہ نے فرشتوں کو اپنا منصوبہ بتایا۔ اللہ جو کچھ کہتا ہے اس کی خاموش تسلیم و رضا کے خلاف اس معاملہ میں معلوم ہوتا ہے فرشتے قدرے پریشان ہوئے۔ ان کے بہتر علم نے انہیں اس گورنر کے بعض خصائص پر عبور بخشا جو انہیں اچھا نہ لگا۔ انہوں نے کہا:

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (البقرہ ۳۰)

ترجمہ: انہوں نے کہا کیا؟ آپ زمین میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتے ہیں جو خرابیاں پیدا کرے اور کشت و خون کرتا پھرے۔

اللہ نے جواب دیا:

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَO(البقرہ:۳۰)

ترجمہ: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

فرشتے صاحب ادراک ہو سکتے ہیں لیکن ان کا علم اللہ کی لامتناہی حکمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

پھر اللہ نے آدم کا قالب اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھالا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ اس نے اسے تمام اسماء سکھائے۔ پھر اس کو فرشتوں کے سامنے لایا، اپنی کاریگری دکھانے کے لئے۔ لیکن وہ مٹی کے اس تودے سے متاثر نہ ہوئے۔ بلاشبہ اللہ کو پتا تھا ان کا ردعمل کیا ہوگا اور یہ سب اس کے منصوبے کا حصہ تھا۔ اب اللہ نے کائنات کی تمام مخلوق فرشتوں کو دکھائی اور ان جوق در جوق گروہوں نے بے شک انہیں متاثر کیا۔ یہاں فرشتوں نے سمجھنا شروع کیا کہ [illegible] کے پاس کچھ راز ہے۔ پھر اللہ نے فرشتوں سے کہا:

اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَO(البقرہ ۳۱)

ترجمہ: اگر سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔

فرشتے بوکھلا گئے۔

لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ (البقرہ:۳۲)

ترجمہ: جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

دوسرے الفاظ میں آپ کو علم ہے کہ آپ نے ہمیں صرف چند چیزوں کے نام سکھائے ہیں۔ ہم کائنات کی تمام مخلوقات کے نام کیونکر جان سکتے ہیں؟

پھر اللہ آدم کی طرف متوجہ ہوا:

یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ (البقرہ:۳۳)

ترجمہ: آدم! تم ان کو ان (چیزوں) کے نام بتاؤ۔

اور آدم نے سب کے نام یکے بعد دیگرے بیان کر دیئے۔ مفسرین اس بیان کو قدرے زیادہ حسین بنا کر ہمیں بتاتے ہیں کہ آدم کو تمام چیزوں کے نام تمام اولاد آدم کی قیامت تک کی زبانوں میں معلوم تھے۔ پھر اللہ نے کہا:

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ (البقرہ ۳۳)

ترجمہ: کیوں میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) پوشیدہ باتیں جانتا ہوں۔

فرشتوں کو قرار واقعی تنبیہ ہوئی۔ اللہ نے فرشتوں کو آدم کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ ان سب نے بلا عذر تعمیل کی۔ وہ اس کے افضل علم کو تسلیم کر کے خوش ہوئے۔ صرف ابلیس نے، جیسا کہ ہم پہلے سن چکے ہیں، اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا۔

بہت سی داستانوں کی طرح یہ داستان بھی بہت سے انداز میں سمجھی جا سکتی ہے اور مختلف سیاق و سباق میں انسانی حالات پر منطبق کی جا سکتی ہے۔ ہم اس بیان کے معنی چاہیں بھی تو مکمل نہیں کر سکتے۔ وقتی ضرورت کے لئے متعدد اسباق خصوصاً اہم معلوم ہوتے ہیں۔

آدمؑ کو تمام مخلوق کے نام سکھائے گئے۔ ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ قرآن میں لفظ اسم خاص مفہوم ادا کرتا ہے۔ یہ

تسلیم کرتے ہوئے کہ قرآن کا بنیادی موضوع ہے کہ:

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (الاعراف: ۱۸۰)

ترجمہ: اللہ کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں۔

اللہ کا ہر نام اس کی حقانیت ظاہر کرتا ہے۔ ناموں سے واقف ہو کر ہم اللہ کی صفات اور خصوصیات جاننے لگتے ہیں۔ لہٰذا کسی چیز کا نام اس کی فطرت و حقیقت متعین کرتا ہے خصوصاً جب وہ نام اللہ نے خود سکھایا ہو۔

واضح طور پر آدمؑ کو صرف نام ہی نہیں سکھائے گئے تھے ان کے معنی بھی بتائے گئے تھے۔ تمام چیزوں کے ناموں کے علم کے ذریعہ آدمؑ جان گیا کہ چیزیں کیا ہیں اور وہ کس کام آسکتی ہیں۔ جب اللہ نے فرمایا یہ ایک بادام کا درخت ہے۔ آدم کو یقین ہو گیا کہ یہ بادام پیدا کرتا ہے اور بادام کھانے کے لئے اچھے ہیں اور ایک تیل پیدا کرتے ہیں اچھی شافی خوبیوں والا۔ جب اللہ نے کہا "مگرمچھ" آدمؑ نے مگرمچھ کی اصلیت کو سمجھ لیا۔

آدمؑ کو نام سکھانے کے عمل نے .... موسوم چیزوں پر قوت بخشی۔ اب بھی، طویل نسلوں کے بعد جس میں الفاظ کے معنی زیادہ سے زیادہ دھندلا گئے ہیں اس قوت میں سے کچھ ناموں کے علم کے ذریعہ باقی ہے۔ (زبانی یا ذہنی طور پر) کہنے کے بعد "یہ ایک درخت ہے" ہم جانتے ہیں کہ ہم اسے کاٹ سکتے ہیں اور ایندھن کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ نام جاننا چیز کی شناخت اور اصلیت جاننے کے برابر ہے اور اس علم کے بغیر ہم چیزوں پر قابو نہیں رکھ سکتے نہ انہیں صحیح استعمال ہی کر سکتے ہیں۔ علم قوت ہے اور وہ ہمیشہ سے یونہی ہے۔

مخلوق پر آدمؑ کی قوت شروع سے ہی مسئلہ تھا کیونکہ اللہ کہتا ہے کہ وہ زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہے۔ ایک نائب وہ ہوتا ہے جسے کسی کی جگہ حکومت کرنے کا اختیار اور ذرائع دیئے جائیں۔ جب اللہ نے آدمؑ کو نام سکھائے اس نے اس کو اپنی حاکمیت کا حصہ عطا کیا۔

اللہ کے علم اور قوت کا رشتہ اہم ہے اور یہ براہ راست اس علم سے وابستہ ہے جو ہمیں ربانی صفات کے متعلق حاصل ہے۔ اللہ کائنات پر اپنے علم کے ذریعہ قابو رکھتا ہے۔ تمام چیزوں کو جانتا ہے۔ ان چیزوں کو بھی جو اس نے ابھی پیدا بھی نہیں کیں۔ اپنے علم سے وہ ان کی مقدار مقرر کرتا ہے۔ سات رہنماؤں (سات اولین صفات ربانی) کی خاص فہرست میں علم دوسرے نمبر پر ہے۔ پہلے زندگی ہونا چاہیے۔ مردہ چیزیں کچھ نہیں جانتیں۔ تمام چیزوں کو جاننا اللہ کی خواہش ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہر چیز کی شناخت اور اصلیت جانتا ہے اور وہ اسے وقت معین پر مقررہ جگہ وجود بخشنا چاہتا ہے۔ اپنی خواہش کی بنا پر وہ اپنی قوت استعمال کرتا ہے۔ بغیر چاہے قوت استعمال نہیں کرتا۔ کوئی قوت محرکہ ہونا چاہیئے۔ پھر اللہ بات کرتا ہے مثلاً وہ چیز سے کہتا ہے "ہو جا" اور وہ وجود میں آجاتی ہے۔ نوع انسان بھی اسی طرح کام کرتی ہے۔ کیونکہ وہ زندہ ہیں وہ جانتے ہیں، ایک بار جب وہ کسی چیز کو جان جاتے ہیں تو وہ اس سے اپنا رشتہ تبدیل کرنا چاہ سکتے ہیں مثلاً اسے نزدیک لا کر یا دور بھیج کر اپنی خواہش کی بنیاد پر وہ اپنی قوت استعمال کرتے ہیں۔

دوسری ذی حیات چیزیں بھی علم رکھتی ہیں اور اپنے علم کی بنیاد پر عمل کرتی ہیں۔ لیکن وہ صرف چند نام جانتی ہیں یعنی اپنے ماحول کے بارے میں ان کا علم جبلی طور پر محدود ہے۔ وہ بعض مقررہ طریقوں سے بعض مقررہ اہداف کے لئے کام کرتی ہیں۔ فرشتے بھی، کائنات کی سب سے منور چیز اور اللہ سے نزدیک ترین صرف بعض مقررہ چیزوں کے نام جانتے ہیں۔ پس جب انہوں

نے دیکھا کہ وہ تمام اشیاء کے نام جانتا ہے وہ آدم کی برتری تسلیم کر کے خوش تھے۔

قرآن باقی مخلوق پر انسانی اقتدار کا ذکر اس طرح کرتا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اقتدار کوئی معمولی بات نہیں۔ آخر انسان ہی اللہ کی نیابت کے لئے پیدا کیا گیا۔ تمام مخلوق میں صرف اسے ہی اسماء ربانی سکھائے گئے۔ صرف وہی اللہ کی وضع پر تخلیق کیا گیا۔ پس کائنات میں تمام چیزیں اس کے لئے مسخر کر دی گئیں۔ قرآن انسانی اقتدار کا مخلوق کے تابع ہونے کے حوالے سے کرتا ہے۔ ایک تابعداری جو بلاشبہ اللہ نے قائم کی تھی۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ (الحج: ٦٥)

ترجمہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جتنی چیزیں زمین میں ہیں سب اللہ نے تمہارے زیر فرمان کر رکھی ہیں۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ (لقمان: ٢٠)

ترجمہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اللہ نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے۔

اللّٰہُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ وَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهٰرَ ۝ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۝ۚ وَ اٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ ؕ وَ إِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ۚ (ابراہیم: ٣٢-٣٤)

ترجمہ اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے تمہارے کھانے کے لئے پھل پیدا کئے اور کشتیوں (اور جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کیا تاکہ دریا (اور سمندر) میں اس کے حکم سے چلیں اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔ اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا دونوں (دن رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں اور رات اور دن کو بھی تمہاری خاطر کام پر لگا دیا۔ اور جو کچھ تم نے مانگا سب میں سے تم کو عنایت کیا اور اگر اللہ کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو، کچھ شک نہیں انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

جب مسلمان یونانی فلسفے سے واقف ہوئے تو انہوں نے کائنات صغیر اور کائنات کبیر کی اصطلاحیں مستعار لیں تاکہ انسان اور باقی دنیا کے تعلق کی تشریح کر سکیں۔ اصل میں تمام چیزیں انسانوں میں موجود ہیں کیونکہ اللہ نے انہیں تمام چیزوں کے نام اور حقیقت سکھا دی۔ کسی چیز کی پوری اور مکمل آگاہی کا تقاضا ہے کہ اس چیز کی حقیقت متعلقہ انسان کے اندر موجود ہو۔ افلاطون کے ذہن میں اسی قسم کی چیز تھی جب اس نے کہا تھا کہ فضیلت اسے یاد کرنے سے آتی ہے جو ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ ہم چیزوں کو صرف ان کی ایک شناخت سے جان سکتے ہیں۔ محاورہ "کسی کو جاننے کے لئے کسی کی ضرورت ہے" میں گہری حکمت پوشیدہ ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہر چیز انسانوں کے اندر ہے تو یہ لغوی معنی میں نہیں ہوتا۔ یہاں اس اصول کو سمجھنا آسان ہے اگر ہم پھر ربانی اسماء کی گفتگو پر نظر ڈالیں۔ اللہ نے کائنات اپنی نشانیوں کے مجموعہ کے طور پر تخلیق کی۔ آیات اللہ کی فطرت کی تشریح کرتی ہیں اس حد تک جس حد تک وہ اپنے کو ظاہر اور آشکارا کرتا ہے۔ وہ کیا ظاہر کرتا ہے؟ وہ اپنی صفات جیسے حیات، علم، قوت، اور نطق ظاہر کرتا ہے۔ یہ صفات مل کر کام کرتی ہیں اور مخلوق کا ایک لاانتہائی تنوع پیدا کرتی ہیں لیکن تمام اشیاء ایک ہی

ذات کی نشانیاں ہیں جو اپنی جگہ حق کی ملکیت ہیں۔ کائنات اپنی مکمل زمانی اور فضائی توسیع میں ـــــ اللہ کے علاوہ ہر شے ـــــ اللہ کی تمام عیاں صفات کی توضیح کرتی ہے۔ پس کائنات بہر اللہ کی ایک تصویر یا وضع ہے۔

انسان بھی اللہ کی وضع پر پیدا کیا گیا اللہ کی تمام صفات کو سینے سے لگانے۔ کائنات اور انسان کے درمیان فرق یہ ہے کہ کائنات میں آیات منتشر ہیں جبکہ دوسری صورت میں وہ ایک واحد، شاید مرکز نگاہ فرد میں یکجا ہیں۔

انسانوں کے اندر صفات کی ایک جگہ جامعیت اسے اللہ کا خلیفہ بناتی ہے یعنی مخلوق وہی کام کر سکتی ہے جو اللہ، تنزیہ کی نسبت سے [illegible] کرتا ہے۔ نوعِ انسان اللہ کی تمام صفات عیاں کرتی ہے لیکن ایک کمزور اور مدھم طریقے سے جو اس حقیقت [illegible] ہے۔ ... وہ اللہ کی وضع پر پیدا کئے جانے کی وجہ سے اس سے مماثل ہیں مگر زمنی و فضائی حد بندیوں کے باعث مختلف ہیں۔

خلیفہ کے طور پر انسان ان چیزوں پر اقتدار رکھتے ہیں جن پر وہ اللہ کی جگہ حکومت کرتے ہیں۔ یہ چیزیں عالم کی مخلوقات ہیں۔ تمام چیزوں پر یہ اقتدار [illegible] سے واضح کرتا ہے کہ لوگ زمین کو تباہ کر سکتے ہیں اور اس کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔ جدید دور کا ماحولیاتی [illegible] خلفشار [illegible] نہیں سوائے نیابت کے غلط استعمال کے۔

عبد اور خلیفہ:

ہم نے ذکر کیا تھا کہ اللہ کی اطاعت دو طرح کی ہے کائناتی اطاعت جس کا تعلق تمام پیدا کردہ چیزوں سے ہے اور رضاکارانہ اطاعت جو ان انسانوں سے متعلق ہے جنہوں نے پیغمبروں کی پیروی کا انتخاب کیا۔ اسی طرح دو بنیادی قسم کی خلافتیں ہیں ایک تمام مخلوقات سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری صرف ان سے متعلق ہے جنہوں نے رضاکارانہ اللہ کی خدمت کا انتخاب کیا۔

انسانوں میں فطری نیابت ہے کیونکہ انہوں نے اللہ کی اطاعت کی۔ اس نے انہیں اپنی وضع پر تخلیق کیا اور وہ اس کی صفات کا دنیا میں مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہیں تمام اسماء کی تعلیم دی گئی تھی لہٰذا انہیں تمام چیزوں پر اقتدار حاصل ہے۔ لوگ دوسری قسم کی نیابت تک صرف رضاکارانہ طور پر اللہ کی اطاعت کے بعد رسائی پا سکتے ہیں۔

چونکہ لوگ خود مختار ہیں وہ آسانی سے اپنی فطری نیابت کا غلط استعمال کر سکتے ہیں۔ صرف اپنی خود مختاری سے اللہ کا انتخاب کر کے ـــــ پیغمبرانہ رہنمائی کی پیروی کرتے ہوئے اس کی اطاعت قبول کرنے سے ـــــ وہ زمین پر اس کے صحیح نائب کا کام کر سکتے ہیں۔ کسی کا نمائندہ ہونے کے لئے بہر حال آپ کو اس شخص کے احکامات اور ہدایات کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔

اسلام کی انتہائی عالی سطح پر ہر چیز اللہ کی ہدایات کی پیروی کرتی ہے۔ پکھوے، بھوت، بچھو اور چوہے بالکل اسی طرح اللہ کی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں جیسے انہیں ہدایت دی گئی ہے، لیکن نیابت ایک منصب ہے۔ اللہ نے آدم کو زمین پر واضح طور سے اپنا خلیفہ ہونے کے لئے ابھارا:

وَ اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً ؕ (البقرہ ۳۰)

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں۔

لہٰذا خلافت کا تعلق ہدایات سے ہے جو انسانوں کو دی گئیں (یہاں جنات کو ہم الگ رکھتے ہیں)۔ یہ ہدایات وہ

پیغامات ہیں جو انبیاء لائے۔ انسانوں کا نبیوں کو مناسب جواب اسلام ہے یعنی انبیاء کے پیغام کی روشنی میں اللہ کی اطاعت۔

بظاہر اللہ کی ہدایات کی پیروی، تنی آسان نہیں۔ اسلام ان کو اعلیٰ درجہ دیتا ہے جو اس امتحان میں کامیاب رہتے ہیں۔ ایسا شخص اللہ کا بندہ کہلاتا ہے اور بندگی کو ایک اعلیٰ ترین اور سب سے زیادہ قابل تعریف انسانی حیثیت خیال کیا جاتا ہے۔ یہ نیابت اور پیغمبری کی بنیاد ہے کیونکہ اللہ کا نمائندہ یا پیغمبر ہونے کا انحصار اس کے بندہ ہونے پر ہے۔ سب سے اہم القاب جو مسلمان، حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیتے ہیں ـــ یہ القاب جو ہر نماز میں پڑھتے ہیں ـــ "عبدہ ورسولہ" ہیں۔ یہ حادثاتی نہیں کہ عبدیت پہلے آتی ہے۔

اسلامی لغت میں لفظ عبد اہم ترین اصطلاحات میں سے ایک ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم احتیاط سے اس کے معنی اور معنویت پر غور کریں۔ عام طور سے یہ لفظ غلام اور خادم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ... اس لحاظ سے استعمال ہوتا جو اس قرآنی آیت میں ہے جو پہلے بیان ہو چکی:

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا○

ترجمہ تمام شخص جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کے روبرو بندے ہو کر آئیں ـــ۔

تو بندہ ہی مناسب ترجمہ ہوگا۔ اس لحاظ سے عبد ہونے میں کوئی رضاکاری نہیں یہ اسی تناظر میں مسلم ہونے کے مساوی ہے۔ یوں عبد کی وسعت کے لحاظ سے ہر شے اپنا تخلیقی کام کرتے ہوئے اللہ کی غلام ہے۔ لیکن ایک محدود معنی میں جو یہاں ہماری دلچسپی کا باعث ہے انسان اللہ کی عبدیت قبول یا مسترد کرنے کے لئے خود مختار ہے۔ لہٰذا خادم غالباً بہتر ترجمہ ہے۔

مختصراً اللہ کا خادم ہونا اس کے احکام کو ماننا ہے اور اس کے احکام صحائف اور نبیوں کی تعلیمات میں درج ہیں۔ لہٰذا اللہ کا خادم ہونے کے لئے خود کو بلا جبر و اکراہ (بارضا) اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ ایک ماننے والا یا مسلم ہونا ہے۔

اللہ کا ایک خادم اللہ کی خدمت کرتا ہے۔ عربی لفظ عبادۃ ہے، لغات ہمیں بتاتی ہیں کہ اس کے معنی خدمت کرنا، عبادت کرنا، احترام کرنا، حکم ماننا، عاجزی ظاہر کرنا، اطاعت گزار ہونا ہیں۔ لیکن اصطلاح میں لفظ عبادۃ تمام فرائض اور مؤکدہ سنن (اعمال) کی طرف اشارہ کرتا ہے جو مسلمان ادا کرتے ہیں: لہٰذا سارے کے سارے پانچ ارکان عبادۃ ہیں جن کا ترجمہ پرستش کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کا خادم ہونے کے لئے پانچوں ارکان اور بقیہ شریعت کی پیروی ضروری ہے اور یہ رسولؐ کی سنت ہے جس کی بہت سی صورتیں ہیں۔

کسی اور سے زیادہ رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کے خادم (عبداللہ) ہیں اور قرآن خود انہیں یہ لقب دیتا ہے:

وَ أَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا○ (الجن 19)

ترجمہ اور جب خدا کے بندے (محمدؐ) اس کی عبادت کو کھڑے ہوئے تو کافر ان کے گرد ہجوم کر لینے کو تھے۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات کا حوالہ دیتا ہے۔

إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا○ (مریم 30)

ترجمہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

پس مسلمان عیسیٰؑ کو اللہ کا مکمل بندہ گردانتے ہیں۔

غور کیجئے کہ لقب "عبداللہ" جو قرآن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا ہے اسلامی دنیا میں سب سے عام مردانہ نام بن گیا ہے۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی کو عبداللہ (اللہ کا بندہ) پکارے جاتے سنا ہے۔ عام طور پر مسلمانوں کے ذاتی ناموں کی طرح یہ نام والدین کی بڑی امیدیں ظاہر کرتا ہے۔ بچوں کو اپنے ناموں کے مطابق بننا چاہیئے لہٰذا بیشتر عام نام ہمیشہ نبیوں کے ناموں پر ہوتے ہیں۔ خصوصاً محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ نام رکھنے کا ایک اور عام طریقہ عبداللہ کے نمونہ کی پیروی ہے لیکن لفظ اللہ کی جگہ کوئی دوسرا ربانی نام استعمال کیا جاتا ہے جیسے عبدالحیٔ (زندہ جاوید کا بندہ)، عبدالعلیم (علم رکھنے والے کا بندہ)، عبدالقدیر (قادر کا بندہ)، عبدالخالق (پیدا کرنے والے کا بندہ) وغیرہ۔ یہاں یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شخص ربانی نام کی برکات سے فیضیاب ہوگا۔

اسلام کی تیسری جہت میں بندہ کا تصور ایک مرکزی کردار ادا کرتا ہے جس کی تعریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی "اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو"۔

مختصراً آدم اللہ کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن اللہ کا خلیفہ ہونے کے لئے اسے پہلے اللہ کا بندہ ہونا ضروری تھا۔ بالفاظ دیگر وہ زمین پر اللہ کی نمائندگی کے لئے پیدا کئے گئے۔ اس فرض کو صحیح طرح ادا کرنے کے لئے انہیں اللہ کی مرضی کا تابع ہونا چاہیئے جیسے کہ رسولوں کے ذریعہ منکشف کیا گیا۔ جب لوگ ایک مرتبہ اللہ کا بندہ بن جائیں تو وہ اس کے نمائندے بن سکتے ہیں۔ اللہ کا بندہ بننے سے پہلے وہ اپنے ذاتی مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ کی رہنمائی کے بغیر وہ پوری کائنات کے مفادات نہیں دیکھ سکتے اور جو کچھ وہ کریں گے وہ ان لوگوں کے لئے باعث ضرر ہوگا جن پر ان کی نیابت تصور کی جاتی ہے۔ تاریخ کا مسلسل مشاہدہ یہ واضح کرتا ہے کہ انسان محض اپنی بصیرت پر چلتے ہوئے سماجی اور کائناتی مسائل حل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کا چیزوں کا مطالعہ کافی وسیع نہیں لہٰذا وہ حقیقت سے منقطع رہتا ہے جو حق ہے۔

خدمت گزاری کو نیابت سے پہلے آنا چاہیئے۔ آپ کسی کی نمائندگی اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک اس کے احکام نہ بجالائیں۔ کوئی بادشاہ کسی اجنبی کو اپنا سفیر مقرر نہیں کرتا۔ وہ کسی ایسے شخص کو مقرر کرتا ہے جس کو وہ پرکھ چکا اور جانتا ہے کہ وہ اس بھروسے کے اہل ہے۔

رحیم بادشاہ:

بندہ اور نائب کے تعلق کے بعض مقاصد کا ادراک کرنے کے لئے ہم مفید طریقے سے تنزیہ اور تشبیہ کا حوالہ دے سکتے ہیں۔ تنزیہ کے خواص کا تقاضا اللہ کی لاثانیت، بعد اور نارسائی ہے۔ ہم نے پہلے تجویز کیا تھا کہ ربانی نام الملک ایک نسبتاً جامد صورت میں ان اسماء کے مجموعی منشاء کو ظاہر کرتا ہے جو تنزیہ پر زور دیتے ہیں۔ الملک۔۔۔۔ مشرقی جابر حکمران، اگر آپ پرانی ڈگر کو ترجیح دیں۔۔۔۔ اپنی رعایا پر کامل اقتدار رکھنے والا۔ وہ اصل میں اس کے غلام ہیں۔ الملک جلیل القدر، جاہ و جلال والا، مہیب، جلیل، بادشاہ قوی ہے، رعایا انتہائی حقیر ہے۔

فرض کیجئے یہ بادشاہ سچا اور اہل ہے تو مروجہ اصطلاح ایسی بری نہیں اور فرض کیجئے یہ بادشاہ رحیم و کریم اللہ ہے جس کے سوا کوئی حقیقت نہیں تو ہر کوئی ادراک کر سکتا ہے کہ لوگ دراصل اللہ کے غلام ہیں کیونکہ کوئی اور حاکم نہیں۔ انسان دراصل مسلم ہیں خواہ وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ لیکن چاہیئے کہ فطری تقاضے کے تحت وہ اصل صورتحال کو قبول نہ کریں اور اپنی صلاحیتوں کو یہ یقینی بنانے کے لئے یوں استعمال کریں کہ وہ اپنی جائز حدود سے تجاوز نہ کریں یہ رضاکارانہ اسلام ہے،

پیغمبروں کے پیام کو تسلیم کرنا اور ان کی ہدایت پر عمل۔ لوگ بخوشی اللہ کا بندہ بنیں۔

مختصراً غلامی سے منسلک خصوصیات تنزیہ کے ساتھ قریبی تعلق رکھتی ہیں یعنی صفات فرمانروائی، ہیبت اور نارسائی۔ اس کے مقابلہ میں نیابت پر گفتگو تشبیہ کے دائرہ میں انسان کے اللہ سے تعلق پر زور دیتی ہے۔

خلیفہ اللہ کا نمائندہ ہے۔ اللہ کی نمائندگی کرنے کے لئے آدمی اللہ کا منتخب [illegible] ہوتا ہے۔ کوئی بادشاہ گلی میں سے کسی گنوار کو سفیر بنانے کے لئے نہیں چن لیتا بلکہ وہ ان کو منتخب کرتا ہے جنہوں نے دربار میں [illegible] خصوصی خدمت کے بعد اپنی اہلیت ثابت کر دی ہو۔

بندہ ہونا ایک وقتی عمل نہیں، آج کے باغی، حق سے انحراف کرنے والے کل کے وفادار غلام نہیں ہو سکتے۔ گمراہیوں میں بھٹکنے سے حق کی پیروی کی طرف آنا ایک لمبا اور تدریجی سفر ہے۔ [illegible] دربار کی تصویر کے لحاظ سے سوچنا مددگار ہوگا۔ لوگ بادشاہ کی خدمت کی ابتدا کسی ایسے چھوٹے ملازم کے طور پر کی [illegible] ہیں جس نے غالباً کبھی بھی بادشاہ کی شکل تک نہ دیکھی ہو۔ وہ درجہ بدرجہ ہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے وہ معاملہ فہمی اور خدمت سے درست عملی طریقے سیکھتے ہیں۔ صرف نادر خصوصیات رکھنے والے افراد ہی شاہی خدمت کے زینے پر اپنا راستہ [illegible] منظور نظر بن پاتے ہیں۔ صرف وزیر اعظم ہی ہر وقت بادشاہ تک رسائی پا سکتا ہے۔ چیزوں کا یہ منظر اس صورت [illegible] واضح ہے جو تنزیہ ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ ایک بندہ سے خلیفہ بننے تک کا عمل بڑا لمبا ہے۔ کسی مقررہ مرحلہ پر وہی شخص اپنی بندگی کے ذریعہ بعض مراعات حاصل کر لیتا ہے۔

غور فرمایئے سب سے مشکل کام سب سے اچھے خادم کے سپرد ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر بندگی کے ابتدائی مراحل نسبتاً آسان ہوتے ہیں اور ان سے نیابت کی کم ہی ذمہ داریاں وابستہ ہوتی ہیں۔ بے شک تمام مسلمان کسی نہ کسی درجہ میں نائب ہوتے ہیں، جیسا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے ہر ایک گڈریا ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی بھیڑوں کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے گا۔ سپہ سالار جو لوگوں کو ہدایات دیتا ہے وہ بھی گڈریا ہے اور وہ اپنی بھیڑوں کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے گا۔ مرد اپنے خاندان کے افراد کا گلہ بان ہے اور وہ ان کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے گا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر بار اور بچوں کی گلہ بان ہے اور وہ ان کی ذمہ دار ٹھیرائی جائے گی۔ ملازم اپنے آقا کی املاک کا گلہ بان ہے اور وہ اس کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے گا۔ سچ، تم میں سے ہر ایک گڈریا ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی بھیڑوں کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے گا"۔

جیسے جیسے لوگ اللہ کا بندہ ہونے میں ترقی کرتے جاتے ہیں ان کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شادی آدھا دین ہے"۔ تو وہ ان ذمہ داریوں کی طرف اشارہ فرما رہے تھے جو ایک خاوند اور بیوی پر ان کے نئے رشتہ کے باعث عائد ہوتی ہیں۔ دوسرے دینی فرائض کے ساتھ سماجی نوعیت کا ایک پورا سلسلہ ان کی زندگی میں بڑھ جاتا ہے۔ شادی سے پیشتر انہیں صرف اپنی اپنی ذات اور اپنے والدین کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اب ان پر ایک زوج اور اس کے خاندان، بچوں وغیرہ کی ذمہ داریاں آن پڑتی ہیں۔

خلافت کا بلند ترین درجہ جو اللہ کی جگہ تمام کائنات کی فرمانروائی کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ سب سے مکمل بندہ کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ لہٰذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سب سے مکمل انسان سب سے اعلیٰ خلیفہ اور سب سے بڑا بندہ خدا

(عبد) تسلیم جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ کو دو بنیادی نکتہ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ بُعد اور قرب، غیر حاضری اور حاضری، تنزیہ و تشبیہ۔ انسان دو بنیادی کرداروں کا حامل ہے، اللہ کا عبد ہونا اور اس کا خلیفہ ہونا۔ خلیفہ بننے کے لئے، جو اللہ سے قربت ظاہر کرتا ہے، انہیں پہلے اپنی عبدیت تسلیم کرنا چاہیے — اللہ سے اپنا بُعد — اور اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اللہ اپنے رحم و کرم سے چاہتا ہے کہ انسان اس سے دور نہ رہے بلکہ قربت حاصل کرے لیکن انہیں اپنے طور پر قربت کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ آزادانہ انتخاب کا راستہ شریعت کی پابندی میں ہے۔ ایک چوڑی سڑک جو آب حیات کی طرف لے جاتی ہے۔

مخلوق کے مراتب

تنزیہ کے ضمن میں صرف اللہ ہی ازلی و ابدی اور حق ہے جبکہ باقی ہر شے فنا ہو جانے والی اور غیر حقیقی۔ تشبیہ کے ضمن میں تمام چیزیں کسی نہ کسی حد تک حقیقی ہیں۔ لیکن بعض بعض سے زیادہ حقیقی ہیں۔ حق ہونا اللہ کی حقانیت میں حصہ دار ہونا ہے یا اللہ سے قربت ہے۔ یہ فضائی قربت نہیں کیونکہ اللہ صرف فضا میں نہیں نہ انسان فرشتے ہی ہیں۔ جو حقیقی ہیں وہ صفاتی قربت کے ہیں۔ صفاتی قربت کے ضمن میں ہم نے کہا تھا کہ زمین کے مقابلہ میں آسمان اللہ سے قریب تر ہے، کیونکہ آسمان منور ہے اور زمین تاریک۔ اسی طرح انسانی جسم کی نسبت فرشتے اور جسم کی نسبت روح اللہ سے نزدیک تر ہیں۔ حقیقتیں مثلاً آگ اور نفس اپنی گنجلک فطرت کے باعث احتیاط سے غور کے قابل ہیں پیشتر اس کے کہ ہم ان کے مقام کا تعین کریں۔

ہم پہلے تجویز کر چکے ہیں کہ انسان مراتب میں چوٹی پر ہے اور غیر ذی روح چیزیں پیندے میں ہیں۔ جانوروں، پودوں اور معدنیات کے مقابلہ میں انسانوں میں ربانی صفات زیادہ شدید ہیں۔ بلکہ موجود بھی ہیں جبکہ دوسری چیزوں میں وہ بیشتر معدوم ہیں۔

فرشتے منور ہیں اور پہلی نظر میں انسان تاریک۔ پس کوئی یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں۔ مسلم علماء نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور بیشتر اس سے اختلاف کیا ہے۔ عموماً جواب ان معیارات پر منحصر ہے جو ان میں تقابل کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مزید برآں مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے کیونکہ انسان مختلف قسم کے ہیں جیسے مختلف قسم کے فرشتے ہیں۔ اصل میں ہر متنفس انسان ربانی صفات کا ایک علیحدہ مرکب پیش کرتا ہے۔

فرشتوں کی طرح انسان کو بھی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عموماً پانچ بڑی قسم کے انسان بتائے جاتے ہیں جو یہاں اللہ سے صفاتی قربت میں صعودی لحاظ سے دیئے گئے ہیں۔ کافر، مومن، خلیل اللہ، نبی اور پیغمبر۔

کافر اللہ کے غیر رضاکار بندے ہیں جبکہ مومن اس کی عبدیت بخوشی قبول کرتے ہیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ مومن اللہ کا سچا نائب ہو کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ نائب آخری تین اقسام میں آتا ہے خلیل، نبی اور پیغمبر۔ جب مسلم علماء اصرار کرتے ہیں کہ انسان فرشتوں سے افضل ہیں تو ان کے ذہن میں یہی تین قسم کے انسان ہوتے ہیں یا شاید صرف آخری قسم کے۔ ان کے ذہن میں عام انسان نہیں ہوتے جو پہلی دو اقسام میں آتے ہیں۔

قرآن اور حدیث سے انسانی فضیلت کی وافر شہادت پیش کی جاتی ہے۔ ہم پہلے فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنے کا ذکر کر چکے ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "قیامت کے روز اولاد آدم سے بڑا کوئی نہ ہو گا"۔ لوگ اس پر حیران ہوئے اور کسی نے دریافت کیا "اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا فرشتے بھی نہیں"؟

آپؐ نے جواب دیا: "فرشتے بھی نہیں، وہ سورج اور چاند کی طرح مجبور ہیں"۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، فرشتوں کو کوئی آزادیٔ عمل حاصل نہیں۔ وہ اگر چاہیں بھی تو اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ پس وہ وہی کچھ ہو سکتے ہیں جو وہ ہیں۔ لیکن بنی نوع انسان اپنی پابندیوں پر قابو پا سکتا ہے اور بعد (تنزیہ) سے قرب (تشبیہ) کی طرف اور عبدیت سے نیابت کی طرف آ سکتا ہے۔ ایک اور حدیث بھی ایسا ہی نکتہ بیان کرتی ہے

"اللہ نے فرشتوں کو دانش سے، جانوروں کو اشتہا سے اور بنی نوع انسان کو دانش اور اشتہا دونوں سے پیدا کیا۔ جب کسی شخص کی دانش اس کی اشتہا پر غالب آ جاتی ہے وہ فرشتوں سے بلند ہو جاتا ہے لیکن جب اس کی اشتہا اس کی دانش پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو وہ جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے"۔

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ انسان جانوروں سے بدتر ہو سکتا ہے۔ کوئی بلی کو چوہے مارنے پر مورد الزام نہیں ٹھیراتا! کتے کو بلی پر حملہ کرنے پر خواہ بلی کا مالک پریشان ہی کیوں نہ ہو جائے، پھر بھی یہ کتے کی فطرت ہے اور کتے تو کتے ہوتے ہی ہیں۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ انسانوں کو کتوں کی طرح نہیں کرنا چاہیئے اور جب وہ کرتے ہیں تو وہ کتوں سے بدتر ہو جاتے ہیں۔

نوع انسان فرشتوں سے افضل ہو سکتی ہے لیکن یہ عام مشاہدے کی بات نہیں بلکہ بہت ہی مخصوص صورت ہوتی ہے اور اس کی بنیاد خیر اور شر کو قبول کرنے کے لئے انسان کے اپنے اختیار کا صحیح استعمال ہے۔ اور پھر خیر کے راستے پر استقامت کا غیر معمولی مظاہرہ۔ جبکہ فرشتے معصوم ہوتے ہیں اور باطل کی طرف میلان ہی نہیں رکھتے۔ اللہ کے کسی بھی حکم سے انحراف کی صلاحیت ان میں ہوتی ہی نہیں۔ وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس پر مامور ہیں۔

توجہ فرمایئے کہ انسانی برتری کا تعلق اس حقیقت سے ہے کہ ان کے جسم مٹی سے بنے ہیں اسی لئے زمینی (مٹی کے) خواص ان کے نفس پر اثر انداز ہیں۔ ہاروت و ماروت نے گناہ نہیں کیا۔ اور گناہ کر بھی نہ سکتے تھے جب تک ان کے جسم نہ ہوتے۔ ایک مرتبہ جب مٹی کے خواص نور میں مل گئے تو تاریکی، بعد اور غضب کا خیال رکھنا پڑے گا۔ مٹی اپنے وجود کی ساخت کے باعث اللہ کا غضب سہتی ہے جو نور کی کمی پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اللہ سے دور ہونا تنزیہ کے تعلق میں رہنا ہے۔ پس اس کا مقابلہ اللہ کی شان و شوکت، سختی اور غضب سے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں فرشتے جن کی ساخت میں کوئی مٹی نہیں خالص نور ہیں وہ اللہ سے اتنے دور نہیں ہو سکتے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے فرشتے اللہ کی صفات فرمانروائی اور عظمت ظاہر کرتے ہیں لیکن یہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ اس مخلوق سے جس سے ان کا رابطہ کیا جاتا ہے، بہت بلند ہیں۔ مثلاً فرشتے جو دوزخ کے نگران ہیں ایسے فرشتے ہیں جو غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن یہ اللہ کا غضب ہے جو ان میں چمکتا ہے اور غضب اور اللہ سے فاصلہ ناقابل فصل صفات ہیں۔

پہلی نظر میں جسم منفی معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ تاریکی کو انسانی ساخت میں جگہ بنانے کی اجازت دیتا ہے اس لئے نافرمانی اور گناہ ہوتا ہے۔ لیکن دوسری نظر میں یہی تاریکی نور کی شان کا نظارہ ممکن بناتی ہے۔ جیسے سفید روشنی کو بغیر تاریکی ان گنت رنگوں میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ (ہر رنگ کے لئے بعض لہروں کی لمبائی دور کرنا) اسی طرح ربانی روح جو آدم کی مٹی میں پھونکی گئی تھی اس کے ان گنت اخلاف کی خصوصیات میں بغیر جسمانی تاریکی کے منعکس نہیں کی جا سکتی۔ اگر جسم نہ ہوتا تو لوگ فرشتے ہوتے۔ اگر وہ فرشتے ہوتے تو وہ اللہ سے نہ دور ہو سکتے تھے نہ نزدیک۔ وہ اپنی جگہ جامد ہوتے جیسے فرشتے آسمان میں، اور مینڈک، انجیر اور پتھر زمین میں۔ قرآن میں فرشتے کہتے ہیں:

وَ مَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ O (الصّٰفّٰت ۱۶۴)

ترجمہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے۔

فرشتے اور تمام دوسری مخلوقات کا سوائے انسانوں کے ایک معلوم مقام اور جامد شخصیتیں ہیں۔ صرف انسان ان جانی مقداریں ہیں جن کو اپنی شخصیتیں تشکیل کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔

انسانوں کی نادر صورت حال کا ذکر قرآن کی آیت میں بھی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ جب ابلیس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا تو اللہ نے اس سے پوچھا

یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ط (صٓ ۷۵)

ترجمہ جس شخص کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا؟

بہت سے مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ کے "دونوں ہاتھ" جن کا ذکر یہاں ہے دو بنیادی ربانی صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں رحم اور غضب یا تشبیہ اور تنزیہ۔ پس آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آدم اللہ کی شبیہ پر پیدا کیا گیا۔ یہ تجویز کرتی ہے کہ دوسری چیزیں ایک ہاتھ سے بنائی گئیں یا اللہ کے ہاتھوں کے بجائے لفظ سے۔ اس تاویل کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے

"فرشتوں نے اللہ سے عرض کیا "اے ہمارے پروردگار! آپ نے اولاد آدم کو پیدا کیا اور ان کے لئے موجودہ دنیا مقرر کی تو ہمارے لئے آئندہ دنیا مقرر فرما"۔ اللہ نے جواب دیا "میں اپنے عبد رشید کو جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ویسا نہیں بناؤں گا جیسے میں نے کہا "ہو جا" اور وہ ہو گئی"۔

گویا فرشتے اللہ کے لفظ "ہو جا" سے پیدا کئے گئے جیسے دوسری چیزیں پیدا کی گئیں۔ بعض مفسرین دعویٰ کرتے ہیں کہ رحم کے فرشتے اللہ کے دائیں ہاتھ سے پیدا کئے گئے اور غضب کے فرشتے اس کے بائیں ہاتھ سے۔ اسی طرح اللہ نے ابلیس یعنی شیطان کو اپنے بائیں ہاتھ سے بنایا۔ تاہم یہ ہو سکتا ہے ایسی بحث کا مقصد انسان کے نادر مقام کو نمایاں کرنا ہے ایک ندرت جو اس امر سے پھوٹتی ہے کہ انہیں تمام اسماء سکھائے گئے تھے۔ ان کی ندرت کے باعث اللہ ان کے پاس رسول بھیجتا ہے لیکن فرشتوں کے پاس نہیں اور نہ جانوروں کے پاس (جن ہمیشہ کی طرح متذبذب مسئلہ اور انسانی رسولوں کی پیروی کے اہل ہیں)۔ نبوت کی بحث دراصل بنیادی حقوق اور انسانی فطرت کی ذمہ داریوں کی بحث ہے۔

اللہ

تحریر: حسن البنا
ترجمہ: محمد مسعود عبدہ
نظرثانی: ۔ ۔ سین جاوید طفیل

مرکزِ عقیدہ آیہ کریمہ ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ھُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (الحشر ۲۲)

ترجمہ: وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔ وہ بڑا مہرباں نہایت رحم والا ہے۔

موضوعِ گفتگو کا عنوان کن الفاظ میں ہو؟ اس سوال کا جواب فراہم کرنے میں ذہن کافی تردد کا شکار رہا۔ کیا "الدین" کے عنوان سے بات کی جائے؟ پھر عقیدہ کیا ہے؟ اس کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے اثر و رسوخ کا انسان کی داخلی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر و تخریب میں کتنا عمل دخل ہوتا ہے؟ کیا اس کی وضاحت کی جائے یا اس کے خارجی اسباب اور محرکات پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے عقیدہ کے نقش و نگار کو نکھار دیا جائے؟ یا "اسلام میں عقائد کی تاریخ" کا عنوان دے کر یہ مفصل بتایا جائے کہ اسلام کے حقیقی عقیدۂ الوہیت کو باطل نے کیسے کیسے غلط مفہوم دینے کی کوششیں کیں؟ مختلف ادوار میں سیاسی، فکری اور اجتماعی انقلابات نے اس کو کس کس رنگ میں پیش کیا؟ غرض اچھی خاصی ذہنی کشمکش کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ اس کا عنوان "العقیدہ فی اللہ" رکھا جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ کیا معنی رکھتا ہے اور اس کا مقصد و مفہوم کیا ہے؟

عقیدہ عربی کے لفظ "عقد" سے ماخوذ ہے۔ عَقَدَ باب فَعَلَ سے ہے۔ عقد کے معنی ہیں پکی مضبوط گانٹھ لگانا۔ جیسے عربی میں کہتے ہیں۔ "عَقَدَ الْبَیْعَ یا عَقَدَ الْیَمِیْنَ" یعنی "بیع" یا "قسم" کو پکا کرنا۔ (دیکھیے المنجد)

ان لغوی معنوں کی روشنی میں العقیدہ فی "اللہ" کا واضح مطلب ہوا اللہ جل شانہ پر پکا اعتماد رکھنا۔ اس کی ذات و صفات پر پورے یقین کا التزام کرنا اور عقل و زبان اور فکر و عمل کی ہم آہنگی کے ساتھ اللہ کی عظمتوں کا اعتراف کرنا۔

جس طرح علم الکلام کے ماہرین اپنے خیالات کی حمایت میں اپنی وضع کردہ اصطلاحات کا سہارا لیتے ہیں اور فلسفی اپنے نظریات کی تائید میں اپنے فلسفیانہ جملوں سے کام لیتے ہیں، اور ماہرین منطق اپنے اصول، قاعدوں اور کلیوں کو ذریعہ استدلال بنا کر اپنے مقدمات کو موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے موقف کی بنیاد

اور عقیدہ کی مرکزی فکر، تفصیل اور مقصود و مفہوم کی پہلی اساس قرآن حکیم اور دوسری سنت مطہرہ ہے جو اولین مومن اور مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے اور جو اس دین کی روحانی معرفت کے منارۂ نور ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے موقف کی تائید میں اسی سرچشمۂ علم سے الفاظ بھی لیں گے۔ اصطلاحیں بھی اور جملے اور تراکیب بھی۔ وہ ایسا سرچشمہ علم و حکمت ہے جس کی لذت سے آشنا دل ہی جانتے ہیں کہ اس علم کا ہر لفظ معانی و حکمت کے انتہائی حسن و جمال سے آراستہ ہے۔

مرکزی موضوع استدلال کے مختصر تعارف کے بعد میں اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کا آغاز فریقین (دو گروہوں) کی مثال سے کرنا چاہتا ہوں۔ ہر دو فریق کا دعویٰ ہے کہ وہ مومن ہیں۔ لیکن ایک فریق وہ ہے جس کے عقل و شعور میں ایمان کا مفہوم حرف بحرف وہی ہے جو دین اسلام کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بیان فرمایا اور جو براہ راست سننے والوں کے دلوں میں ایسا اترا کہ ان کی زندگی کی دھڑکتی نبضیں بن گیا۔ دل جمال ایمان اور وجدان یقین سے معمور ہو گئے اور صالح اعمال ان کے محور سعی و جہد بن گئے۔

ان کے دل و دماغ پر مرتسم ایمان کی صورت کی تائید و تشریح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمائی

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ۙ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ۙ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ۙ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ۙ (المومنون ۱۔۴)

ترجمہ: بے شک ایمان والے رستگار ہو گئے۔ جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں۔ اور جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

عقیدۂ ایمان کے صحیح ہونے کے بعد مومن کے کردار میں نمایاں تبدیلی آتی ہے، جس کا اظہار اس کے عمل سے نمایاں ہوتا ہے۔ اسے اپنی زبان سے دوسروں پر جتانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ مومن ہے بلکہ جو اس کے اعمال کو دیکھتا ہے وہ خود اس کے مومن ہونے کا یقین کر لیتا ہے۔

دوسرا فریق وہ ہے جس کا تعلق آخری دور کے مسلمانوں سے ہے۔ اس فریق کا دعویٰ تو یہی ہے کہ وہ مومن ہے، مگر اس کا ایمان فلسفہ کی اصطلاحات میں لپٹا ہوا اور علم الکلام کی فنی باریکیوں میں سجا ہوا ہے۔ جس کو سمجھنے کے لئے ذہن کو محنت درکار ہونے کے علاوہ عقل کو تھکن، روح کو گھٹن اور فکر کو الجھن ہونا لازمی امر ہے غرض ایمان کی معنوی تفصیل گویا خیالوں کی ایک وادی اور بحث و تمحیص کا لامتناہی سلسلہ ہے جس میں بھٹکنا مقدر ہو اور ایمان کی منزل کے واضح نشان ہویدا نہ ہوں۔

اس فریق کو اپنے علم، اپنی سوچ اور اپنے فکر کی راہنمائی پر اعتماد ہے۔ اس لئے وہ اللہ جل شانہٗ کے عقیدہ ہی کے بارے میں اپنی توضیحات پیش کرتا ہے۔ لیکن ہمارا یقین ہے کہ اسلام وہ نہیں جسے کوئی فلسفی یا منطقی بیان کرے بلکہ اسلام اور اس کا ہر ایک اصلی جزو وہی ہے جس کی تعلیم و تدریس اور تفہیم و تذکیر ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی عقیدہ، کوئی عمل، کوئی فکر چاہے انسانی عقل اسے کتنا ہی پسند کرے یا سراہے، انسان کے دل کو عرفانِ ربانی کی لذت نہیں بخش سکتا۔ وہ نہ روح کے اندھیروں کو

اجالوں میں بدل سکتا ہے اور نہ اعمال صالحہ کے حسن سے آراستہ کر سکتا ہے۔

لہٰذا ہمیں بلا تاخیر اپنے اسلاف کی مانند اپنے عقیدہ کی آبیاری قرآن و حدیث سے کرنی چاہیے۔ اپنے اعمال کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو اسلاف کے اعمال سے جوڑ لینا چاہیے۔ اپنے دل و دماغ و عقیدہ کو انہی کے اسی صاف و شفاف چشمے سے سیراب کر لینا چاہیے۔ جس میں نہ ہی کوئی ملاوٹ ہے، نہ عدمِ یقین ہے اور نہ کھوٹ ہے۔ وہ صاف ستھرا ہے اور جس کے خالص ہونے پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مہرِ تصدیق ان الفاظ میں ثبت فرمائی ہے

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ماتمسکتم بهما.

ترجمہ: میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے تم گمراہ نہ ہو گے۔

ان میں ایک "کتاب اللہ" ہے جو قرآن مجید و فرقان حمید ہے اور دوسری رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت مطہرہ ہے۔ گویا ہمیں دوسروں کے علوم کی چرب زبانی یا معانی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بلکہ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اپنے فکر، اپنے ایمان اور اپنے اعمال کے لئے رہنمائی انہیں دونوں قرآن مجید اور سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حاصل کریں جو ہماری دین و دنیا کے فلاح و کامیابی کی ضامن ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھ کو بھی، آپ کو بھی اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو ان دونوں کی نعمتوں سے مالا مال کرے۔ آمین۔

لہٰذا ہم اسی سرچشمہ علم و حکمت سے جس نے اسلام میں عقیدۂ الٰہی کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت کی ہے، اس بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

اسلام میں عقیدہ کے ترکیبی عناصر

سب سے بڑا اہم اور بنیادی عنصر اس ذات حق کی موجودگی کا یقین ہے۔ وہ ذات جو حی و قیوم ہے۔ اس کی صفتِ اعلیٰ ہمہ پہلو ایسے کمالات کی حامل ہیں۔ جو ہر قسم کی کمی بیشی سے پاک و صاف ہیں۔ غرض اللہ جل شانہٗ کی تعریف مسلمان یا مومن کے دل و دماغ میں بالکل ویسی ہی ہونی چاہیے جیسی خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ اور جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تصدیق فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ یقین ہونا چاہیئے کہ اللہ کی ذات پیکر علم و حیات ہے۔ وہ "سمیع" ہے۔ یعنی ایسا سننے والا جس کے سننے پر نہ کوئی شور اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ دوری سے کوئی فرق پڑ سکتا ہے۔ اسی طرح وہ "بصیر" ہے، یعنی ایسا دیکھنے والا ہے، جس کو نہ کوئی حجاب روک سکتا ہے نہ دوری یا نزدیکی یا اندھیرا اجالا مخل ہو سکتا ہے۔ غرض وہ ایسا دیکھنے والا ہے جو اپنی ہر صفت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح اس ذات برحق کی ہر حال میں موجودگی کا یقین ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسے ہم اپنی آنکھوں سے دوسری اشیاء کو دیکھ کر ان کی موجودگی کا یقین رکھتے ہیں۔ اسی طرح اس کا صانع و حکیم یعنی صاحبِ تدبیر و امر ہونا، اپنی نوعیت میں سب سے بالکل الگ اور بے مثل ہونا۔ مثلاً وہ فرماتا ہے کہ میری ایک صفت ہے "الباری" یعنی پیدا کرنے والا۔ میں وہ پیدا کرنے والا ہوں جو کسی دوسرے کے مشورے سے یا کسی دوسرے کے تصور کی مدد سے نہیں بلکہ مخلوق کے جسم کی ساخت میری اپنی سوچ کے مطابق طبعزاد و اصلی ہے۔ میں "المصور" ہوں اور تصویر بناتا ہوں۔

لیکن میری تصویر کے نقش و نگار اور اس کے سارے رنگ و روپ میرے اپنے ہوتے ہیں۔

اسی طرح اسلام میں عقیدۂ الٰہی کی ترکیب میں یہ عنصر بھی ضروری ہے کہ اس ذات برحق پر یہ بھی پورا پورا یقین ہو کہ وہ اپنی مخلوق کی خالق بھی ہے۔ اس کی پالنہار بھی ہے۔ اس کی حاکم بھی ہے۔ مکمل مختار بھی ہے۔ مکمل ارادہ کی مالک بھی ہے۔ اس کے علم کی کوئی حد نہیں، اس کے اختیار و اقتدار پر کسی کی روک ٹوک نہیں۔ اس کے ارادہ و تحکم نہیں۔ اس کے اختیار کی مٹھی میں ساری کائنات ہے۔ اس کی قدرت کی گرفت میں زمین و آسمان اور ان دونوں کے درمیان ہر چیز ہے۔ اللہ جل شانہٗ اپنی یہ تعریف قرآن مجید میں کئی مقامات پر فرماتے ہیں مثلاً سورۂ حشر کی آخری آیت میں فرماتے ہیں

هُوَ اللهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۖ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ ○ هُوَ اللهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحَانَ اللهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○ هُوَ اللهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى ۚ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○ (حشر ۲۲۔۲۴)

ترجمہ: وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔ وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بادشاہ (حقیقی) پاک ذات (ہر عیب سے)، سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست بڑائی والا۔ خدا ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔ وہی خدا (تمام مخلوقات کا) خالق، ایجاد و اختراع کرنے والا، صورتیں بنانے والا، اس کے سب اچھے سے اچھے نام ہیں۔ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

وہی اللہ خالق ہے۔ (یعنی پیدا کرنے والا ہے) "لیکن بے مثال اور مکمل ہے" وہ اپنی مرضی کی ساخت عطا کر کے پیدا کرنے والا ہے۔ اپنی مرضی سے صورت اور رنگ دینے والا ہے۔ اس کے اور بھی بہت اچھے اچھے نام ہیں (اور یاد رکھو) زمین، آسمان اور ان کے درمیان ہر موجود ہر وقت اس کی تسبیح بیان کرتا ہے"۔ غرض ہر ایک کی زبان پر اس کی مدح و ثنا ہے۔ عقیدہ میں اللہ تعالیٰ کی مذکورہ تعریف ہی ہونا چاہیے۔ اب ایک دوسری صورت بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔

مومن کا عقیدہ ایسے تمام شبہات سے پاک و صاف ہونا چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کو کسی صورت میں بھی مخلوقات میں سے کسی سے مشابہت دی جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کو کسی مادی ٹھوس وجود کی صورت میں تصور کرنا یا اس کی کوشش کرنا بھی غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "مادہ" تغیر پذیر ہوتا ہے۔ مادہ سکڑتا ہے پھیلتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی صفات و کمالات میں دائم و قائم اور تغیر و تبدل کے عمل سے پاک و صاف ہے۔

مومن کے عقیدہ کو اللہ جل شانہٗ کی عددی الوہیت سے بھی پاک و صاف ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہیں۔ وہ "احد" ایک ہیں۔ کسی عدد کا صفت میں، ذات میں شائبہ میں غرض کسی پہلو سے بھی دوئی سے کوئی تعلق ہرگز نہیں۔ نہ وہ خود کسی کا بیٹا ہے، نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔ اس کے جسم سے نہ ہی کوئی حصہ خارج

ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی خارجی چیز اس کی ذات میں تحلیل ہوتی ہے اور نہ دخول کرتی ہے۔ نہ ہی اس ذات کا تجزیہ ممکن ہے۔ غرض اسلام میں اللہ جل شانہٗ کی ذات کے بارے میں کسی قسم کی تقسیم، تحلیل کا تصور بھی غلط ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اللہ تعالیٰ "نفی مشابہت" کا اظہار کن الفاظ میں فرماتے ہیں۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○ (الشوریٰ ۱۱)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا (وہی ہے)۔ اسی نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے اور چارپایوں کے بھی جوڑے (بنائے اور) اسی طریق پر تم کو پھیلاتا رہتا ہے۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ اور وہ سنتا دیکھتا ہے۔

وہ ہمیں بکھیر کر نعوذ باللہ بھول نہیں گیا۔ وہ سب کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے سب کی ہر بات سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ایک اور جگہ واضح فرمایا

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ○ ۙ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○ ۧ (اخلاص: ۱۔۴)

ترجمہ: کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ (ہے) ایک ہے۔ (وہ) معبود برحق بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے معبود ہونے کے بارے میں ہمارے عقیدہ کی اصلاح کے لئے صاف صاف الفاظ میں فرماتے ہیں:

اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ○ لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ (الانبیا: ۲۱۔۲۲)

ترجمہ: بھلا لوگوں نے جو زمین کی چیزوں سے (بعض کو) معبود بنا لیا ہے (تو کیا) وہ ان کو (مرنے کے بعد) اٹھا کھڑا کریں گے؟ اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں خدائے مالک عرش ان سے پاک ہے۔

اسی طرح خاندان اور رشتوں کی نفی کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ ۙ (المومنون: ۹۱)

ترجمہ: خدا نے نہ تو کسی کو (اپنا) بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر غالب آ جاتا۔ یہ لوگ جو کچھ (خدا کے بارے میں) بیان کرتے ہیں خدا اس سے پاک ہے۔

بار بار اللہ جل شانہٗ اسلام میں عقیدہ کو ملاوٹوں سے پاک و صاف رکھنے کے لئے ہدایت دے رہے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دین اسلام میں عقیدہ کی بنیاد اللہ کی صفات پر ہے۔ ویسی صفات جو خود اللہ تعالیٰ نے

بیان فرمائی ہیں۔ سابقہ امم میں بار بار اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی ہی آمیزشوں نے ان کو برباد کر دیا۔ لہٰذا ایسی تمام آلائشوں سے عقیدہ کو پاک رکھنا بھی اہم جزو ایمان ہے۔

(۳) ایسی جستجو یا تجسس جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفت کی حقیقت و ماہیت کو جاننا ہو۔ اس سے دل و دماغ بالکل مبرا، پاک اور صاف ہونا ضرور ہے۔ بلکہ ان حوالوں سے ہر قسم کے مباحث اور مناظروں سے گریز کرنا ضروری ہے۔ حکم ربانی ہے

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○(الانعام ۱۰۲)

ترجمہ یہی (اوصاف رکھنے والا) خدا تمہارا پروردگار ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (وہی) ہر چیز کا پیدا کرنے والا (ہے) تو اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا نگراں ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ○(انعام ۱۰۳)

ترجمہ (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتی اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اور وہ بھید جاننے والا خبردار ہے۔

اس حکم کی وضاحت دین قیم کے معلم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی۔

"تفكَّرُوا فی خلق الله ولا تفكَّرُوا فِيْ ذَاتِهٖ فَتَهْلِكُوْا . (صحیحین)

ترجمہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس پر غور و فکر کرو۔ اس کی ذات کو مرکز فکر بناؤ گے یا اپنے فکر کو اس کی ذات کو سمجھنے پر مرکوز کرو گے تو نتیجہ ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں ہو گا"۔

اس ہلاکت سے ذہنی توازن کے بگڑنے کا امکان بھی ہے۔ اس ہلاکت سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ انسان اس کی ذات کے عقل کے دائرہ میں نہ آنے کے سبب اس کے وجود ہی سے انکار کر دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی ذات کے بارے میں یقین کی نعمت سے محروم ہو کر شبہ یا تذبذب کا شکار ہو جائے۔

مذکورہ حدیث کے الفاظ میں تو اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر معنی سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ مثلاً حافظ العراقی نے اپنی کتاب "فی تحریج احادیث الاحیاء" میں ابونعیم کے حوالے سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ لیکن بیہقی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں روایت کی ہے۔ "تَفَكَّرُوْا فِی آلاءِ اللهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِی اللهِ" اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی الفاظ کو ابوالشیخ نے یوں لکھا ہے: "تفكروا فی الحلق ولا تفكروا فی الخالق فانكم لا تقدرون قدره"۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں روایت کی ہے "تفكروا فی خلق الله و لا تفكروا فی الله" ۔ اکثر روایات اور احادیث کی کتب میں انہیں الفاظ کو حمایت حاصل ہے۔ حافظ سخاوی نے بھی سید رشید علی کے "رسالۃ التوحید" کے حوالہ سے اسی کی تائید کی ہے۔

اس حکم نبوی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے خود بھی اور ان کے رسول امن و سلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہمیں تدبر و تفکر کے آداب بھی سکھا دیئے ہیں۔ ہو سکتا ہے بعض آزادی پسند مفکرین اسے عقل و شعور پر پابندی کے مترادف قرار دیں لیکن انہیں عقل و شعور کی اپنی قابلیت یا صلاحیت کو

بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ اس کا بار بار امتحان لیا گیا تو پتہ چلا کہ آثار و قرائن یعنی محسوس کی حد تک تو اسے علم حاصل ہو سکتا ہے، یا اس کی نظر کام کر سکتی ہے، مگر اس وجود کی حقیقت و ماہیت کا ادراک کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا عقل و فکر سے اس کی طاقت اور صلاحیت کے مطابق کام لینے کی تاکید کر دی گئی ہے۔ آپ اپنی عقل سے ہی پوچھئے اگر آپ اپنی منزل مقصود کے لئے اسے راہبر و معاون بنائیں جس میں خود اس سفر میں چلنے کی نہ سکت ہو اور نہ ہی علم تو اس پر مکمل اعتماد، خود فریبی کے مترادف ہو گا یا نہیں۔

لہٰذا کسی چیز کی حقیقت یعنی اس کی استعدادکار کی وضاحت کو حقیقت آگہی کا عمل تو کہا جا سکتا، اس پر قید کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

(۴) عقل و فکر کی استعداد کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی تصدیق کرنے والے صادق و مصدوق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اس پر پختہ یقین و عقیدہ کی بنیاد ہے۔ لہٰذا اسی عقل و فکر کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی صفات کے مظاہر کی طرف توجہ کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے عرفان الٰہی کی دولت پا سکیں اور ایمان کو مزید یقین سے پختہ تر کر سکیں۔ عقیدہ جتنا پختہ ہو گا اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنا ہی آسان ہو گا۔ نگاہوں سے اندھیروں کے حجاب ہٹنے شروع ہوں گے۔ اعمال میں پختگی آنے کے بعد دل منور ہو گا اور وجدان لذتِ عرفان سے آشنا ہو گا۔ ارشاد ربانی ہے

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ص وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَO (البقرہ: ۱۶۴)

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کے لئے رواں ہیں اور مینہ میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز) کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لئے (خدا کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔

اسی بات کو تھوڑے سے مزید اشاروں کے ساتھ یوں بیان فرمایا

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِO ج صلے الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِO (آل عمران: ۱۹۰ - ۱۹۱)

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے) ہیں کہ اے پروردگار تو نے اس (مخلوق) کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ تو

پاک ہے۔ تو (قیامت کے دن) ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو۔

ایک اور جگہ انسان کی عقل کو دعوت تدبر ان الفاظ میں دی

الم تر ان اللہ انزل من السماء ماءً ج فاخرجنا بہ ثمرٰتٍ مختلفا الوانھا ط و من الجبال جددٌ م بیضٌ و حمرٌ مختلف الوانھا و غرابیب سودٌO و من الناس والدوآب والانعام مختلفٌ الوانہٗ کذالک ط انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤا ط (فاطر ۲۷۔۲۸)

ترجمہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے مینہ برسایا تو ہم نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے میوے پیدا کیے۔ اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔ اور بعض کالے سیاہ ہیں۔ انسانوں اور جانوروں اور چارپایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں۔ خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

یہ ہیں وہ آثار، قرآن جن پہ بار بار غور و تدبر ہمارے عقیدہ ایمان کی آبیاری کرتا ہے۔ اور ہر لحہ، ہر پل ہم اس کی عظمتوں کو دل اور دماغ میں تابندہ پانے لگتے ہیں۔ ہمارے اعمال کا رشتہ اسلاف سے جڑ جاتا ہے جن کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک اور دولت و نعمت سے نوازا ہے۔ اس کا نام وجدان ہے۔ اس کے ذریعہ روح معرفت کے انوار سے آشنا ہوتی ہے۔ مادی دنیا کے اُس پار جہاں عقل و دانش کا گذر نہیں ہوتا، یہ ان وادیوں کے پراسرار محلوں میں سیر کر سکتا ہے۔

جب عقیدہ پختہ ہو جائے تو وجدان سے ایسے نورانی دھارے پھوٹتے ہیں جو تمام اندھیروں کو دور کر دیتے ہیں۔ یہی وہ وجدان ہے جو انسان کو مکمل اطمینان و سکون دیتا ہے۔ انسان میں اعلیٰ و ارفع روحانی اقدار جاگنے لگتی ہیں۔ اسی لئے اللہ جل شانہٗ ہمیں بار بار آگاہ فرماتے ہیں:

الذین اٰمنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ ط (الرعد ۲۸)

ترجمہ (یعنی) جو لوگ ایمان لاتے اور جن کے دل یاد خدا سے آرام پاتے ہیں۔

مومنوں کی اس کیفیت کو اس آیہ کریمہ کے پہلے حصہ میں بیان فرمایا۔ اور آخری حصہ میں خاص طور پر آگاہ کرنے کے انداز میں حکم فرمایا

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُO ط (الرعد:۲۸)

ترجمہ: اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔

یہ ایمان کی وہ حدیں ہیں اور عقیدہ کی وہ مضبوطی ہے جس میں داخل ہوتے ہی انسان کے فکر و عمل کا مرکز صرف اللہ جل شانہٗ کے حکم کی تعمیل بن جاتا ہے۔ دل شبہات اور خطوات سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ وساوس قریب نہیں پھٹکتے۔ شدید سے شدید خطرات متاثر نہیں کر سکتے۔

مومن اگر ڈرتا ہے تو صرف اللہ کی ذات سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ناراضگی سے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کاملہ کا یقین ہر وقت رکھنا چاہئے، جس یقین کی کیفیت کو

اللہ تعالیٰ اس آیہ کریمہ میں یاد دلاتے ہیں:

وَ اِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاہُ ج (الاسراء ۶۷)

ترجمہ اور جب تم کو دریا میں تکلیف پہنچتی ہے (یعنی ڈوبنے کا خوف ہوتا ہے) تو جن کو تم پکارا کرتے ہو سب اس (پروردگار) کے سوا گم ہو جاتے ہیں۔

اسی قسم کے حالات اور انسان کے دل کی کیفیت اور دعا کا منظر اللہ تعالیٰ یوں بھی بیان فرماتے ہیں:

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ط حَتّٰی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ ج وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ لا دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ج لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ○ (یونس ۲۲)

ترجمہ وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں (سوار) ہوتے ہو اور کشتیاں پاکیزہ ہوا (کے نرم نرم جھونکوں) سے سواروں کو لے کر چلنے لگتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں تو ناگہاں زناٹے کی ہوا چل پڑتی ہے اور لہریں ہر طرف سے ان پر (جوش مارتی ہوئی) آنے لگتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (اب تو) لہروں میں گھر گئے۔ تو اس وقت خالص خدا ہی کی عبادت کر کے اس سے دعا مانگنے لگتے ہیں۔ (اے خدا) اگر تو ہم کو اس سے نجات بخشے تو ہم (تیرے) بہت ہی شکرگذار ہوں۔

آپ ان حالات اور اپنے دل کی کیفیات کا خود تجزیہ کر لیجئے اور اپنے ایمان و یقین کو ویسا ہی خالص بنا لیجئے جیسا کہ سمندر کے طوفانی ماحول میں دعا مانگتے وقت تھا۔

(۲) سابقہ اجزاء عقیدہ، اعتقاد، عہد اور ایمان کے خیال اور زبان سے متعلق اجزاء ترکیبی تھے۔ یعنی ان کا تعلق خیال، تصور، دماغ اور شعور سے تھا۔ دل کی کیفیت سے تھا، لیکن آپ کو اگر اپنے عقیدے اور ایمان کو خود جائزہ لینا ہو تو کیسے لیں گے۔

اپنے عقیدہ کا محاسبہ خود کرنا ہو تو کیسے کریں گے۔ قرآن مجید آپ کو اس کا پیمانہ بھی عطا فرماتا ہے۔ غور فرمایئے۔ پختہ ایمان والوں کی صفات:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ج○ لا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ○ج (الانفال ۲۔۴)

ترجمہ۔ مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔ اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں اور وہ جو نماز پڑھتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔ یہی سچے مومن ہیں اور ان کے لئے پروردگار کے ہاں بڑے بڑے درجے اور بخشش اور عزت کی روزی ہے۔

غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں ایمان کے ثبوت میں کن اعمال کے اظہار کی مانگ کر رہے ہیں اور پھر۔۔۔ ان اعمال کے مالکوں کو اللہ تعالیٰ کن نعمتوں سے نوازنے کا اعلان کرتے ہوئے اسے ان کا بنیادی حق قرار

دیتے ہیں۔

الغرض انتہائی اختصار کے ساتھ مگر واضح طور پر اسلام میں عقیدۂ الوہیت کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے متعلق یقین کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے؟ تصور کیا ہونا چاہیئے؟ اس عقیدہ کی پختگی کے بعد انسان کے اعمال میں کیسے بہترین صالح اعمال کا غلبہ نصیب ہوتا ہے۔ انسان میں داخلی تبدیلیاں کیسی آتی ہیں۔ خدائی شخصیت پہ کیا رنگ غالب آتا ہے۔ یہ بتانے کے بعد ایک خصوصی مشورہ دے رہا ہوں۔

فلسفیوں کی اس جماعت سے انکار سے بچیں (جو صفات الٰہی کو الگ الگ مستقل خدا مانتے ہیں) ان کی تعداد تیرہ (۱۳) بتاتے ہیں جن کو انہوں نے اپنی مخصوص اصطلاحات کے نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً

(۱) الوجود۔ (۲) القدم۔ (۳) البقاء۔ (۴) مخالف الحوادث۔ (۵) قیام۔ (۶) بنفسہ۔ (۷) القدرۃ۔ (۸) الواحدنیہ۔ (۹) العلم۔ (۱۰) السمع۔ (۱۱) البصر۔ (۱۲) الکلام۔۔ فلسفیوں کا ایک گروہ دوسرا بھی ہے جس نے اکیس صفات وضع کر رکھی ہیں۔ جو مذکورہ صفات کی ضد ہیں۔ ہم ان کی مزید تفصیل میں نہیں جاتے۔ ہم ان کو سمجھنے کے لئے وقت ضائع نہیں کریں گے۔ فلسفیوں کی ایک اور جماعت ہے جو صفات کو مختلف حصوں میں بانٹ کر ایک اور بحث کے دروازے کھولتی ہے۔ مثلاً اسماء اور صفات الٰہی توفیقی ہیں یا قیاسی؟ صفات عین اسم ہیں یا کچھ اور؟ ایمان کے لئے عمل شرط ہے یا نہیں؟ یا انسان جس عمل کو پسند کرے وہی جائز ہے، جسے ناپسند کرے وہ ناجائز ہے؟ اس قسم کے تمام نظریات و عقیدۂ اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

ایمان کو حقیقت کے قریب تر کرنے میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اس کی تلاوت۔ اس پر تدبر اور تفکر ہی ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ اس کو جتنا بار بار پڑھیں گے بار بار غور کریں گے آپ کے دل کو اتنے ہی انوار میسر آئیں گے۔ آپ ان ایمانی لذتوں سے آشنا ہوں گے جو لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتیں۔

اب ہم اپنی گفتگو کا رخ ان کی طرف موڑ رہے ہیں جو اللہ جل شانہٗ کی نفی میں اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے ہم سے اختلاف کرتے ہیں۔

عقیدہ الوہیت اور مخالفین

مذہب کی مخالفت کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ اللہ کا تصور انسان کی کمزوری کی پیداوار ہے۔ بقول ان کے انسان نے جب اس اجنبی دنیا کی حیرت ناک پنہائیوں اور وسعتوں میں اپنے آپ کو تنہا پایا تو وہ سہما ہوا کبھی غاروں کبھی گپھاؤں میں پناہ گزین ہوا۔ کبھی حیوانات اور درندوں کی مہیب صورتوں کو دیکھ کر لرزا، کبھی آفاقی بادلوں کی گرج چمک سے کانپا۔ کبھی زلزلوں اور سیلابوں سے دوچار ہوا۔ سمعی اور بصری مشاہدوں نے اسے حیرت زدہ کر دیا۔ اسے ذاتی تحفظ اور فائدوں کی فطری جستجو ہوئی۔ طبعی ضرورتوں، بھوک، پیاس اور پناہ گاہوں کی تلاش میں وہ مختلف رستوں سے گزرا۔ ذرائع خور و نوش کے حصول اور اپنے بچاؤ کی تگ و دو نے اسے راحتوں اور لذتوں سے بھی آشنا کیا۔ رنج و غم کے ساتھ خوشی بھی محسوس ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے سے زیادہ ہر طاقتور کو اپنا خدا مان لیا۔ اسی بناء پر جہاں سے اسے آرام ملا یا جہاں اسے حیرت ہوئی یا جس نے اسے پچھاڑ لیا وہ اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کو غیبی طاقت تسلیم کر لیا۔

انسان کی اس جاہل اور خوف زدہ ذہنیت نے پرستش یا عبادت کے تصور کو جنم دیا۔ اس کے ساتھ ہی قطار در قطار خدا پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ کہیں جانور، کہیں آگ، کہیں سمندر، کہیں ستارے، کہیں موسم، کہیں بادل اور کہیں طوفان اور آندھیاں، سانپ اور گدھ خدا کی صورت میں پوجے جاتے تھے۔

ثوابت و سیار کے علاوہ نیکی اور برائی کے خدا، اہرمن دیزداں، تعمیر و تخریب کے دیوتا اور دیویاں۔۔۔ بتوں میں ڈھلیں، معبد خانے بنے اور یوں یہ سلسلہ چلا اور پھر بتول ن ے ۔ مذہب نام کے لوگ دنیا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایک خاص طبقہ کے فائدے کے لئے خدا کا تصور بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اس کا نام عقیدہ رکھ دیا گیا اور ایک غیر موجود اللہ لوگوں کے دماغوں میں بٹھا دیا جسے کبھی کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک وہم ہے اور وہم پرستوں، کمزور انسانوں اور جاہلوں نے اسے مان لیا۔ اس طرح مذہب کی بنیاد پڑی تھی۔ لیکن ہر زمانے میں جو لوگ ٹھوس علم رکھتے تھے، دانشور تھے۔ انہوں نے اسے کبھی نہیں مانا اور آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کو انسان کا دیا ہوا سب سے بڑا فریب مذہب ہے۔

ان کا موقف یہ بھی ہے کہ مذہب یا خدا کی وجہ سے دنیا میں اجتماعی تنزل پر فساد پھیلا ہے۔ مذہب کے بانی خدا کو ماننے کی تعلیم دینے والے، انسانوں کو کاہل بنا دیتے ہیں۔ عوام و معدوم چیزوں پر بھروسہ کرنے کا عادی بنا دیتے ہیں۔ استحصال کا شکار ہونے والوں کو تشدد اور اذیت پر صبر کرنے کا درس دیتے ہیں۔ تقدیر اور قسمت کا نشہ ان کے رگ و ریشہ میں انڈیل کر انہیں سامراجی ظالموں کے ہاتھوں کھلونا بنا دیتے ہیں۔

اور ہم عقل و دانش کی سلطنت کے بادشاہوں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ہم بے انسانوں کو مذہب کے چنگل سے نجات دلائیں گے، ہم جب تک مذہب کے فریب خوردہ انسانوں کے دماغوں سے خدا کے تصور کو کرید کرید کر باہر نہ پھینک دیں چین نہیں لیں گے۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ الفاظ کی بنیاد یا علم و طاقت کی دھونس سے تو بات نہیں مانی جا سکتی۔ جس طرح آج ایسے انسان بھی ہیں جو طاقت یا لالچ کے دباؤ میں غلط بات تسلیم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہر دور میں ایسے انسان موجود رہے ہیں۔ آپ ہمیں اس بات کے دلائل دے کر قائل کیجئے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حواس کے ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ ادراک اس معاملہ میں بے بس ہے لیکن ہم دلائل کے دوسرے ذرائع استعمال کرتے ہیں اور یہ وہ ذرائع ہیں جو آج علم کے پھیلاؤ کے ساتھ زیادہ مضبوط اور ٹھوس حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ایسی ان گنت اشیاء کی موجودگی مانی جا چکی ہے جو نظر نہیں آتی۔ لیکن آثار و قرائن کا توارد انہیں منوا چکا ہے۔ بلکہ خدا کی مخالفت میں جتنی شدومد کے ساتھ دانشور کام کر رہے ہیں اتنی ہی شدومد کے ساتھ اللہ کے وجود کو ماننے والوں کی تعداد اور ان میں ذوقِ خدا پرستی بڑھ رہا ہے۔ علاوہ ازیں وہ خود بھی لاشعوری طور پر اس ذات کے وجود کی اہمیت کو تسلیم کر رہے ہیں۔ رہا وہ زمانہ جہاں سے اللہ کے وجود سے انکار کرنے والے اپنی مفروضہ کہانی کا آغاز کرتے ہیں، ان کی کہانی حرف بحرف نہ سہی، کسی حد تک بھی صحیح ثابت کرنے کے لئے کوئی عقلی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔ لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ کو مادہ پرست جہاں سے چاہیں پڑھ لیں۔ انہیں انسانی زندگی کے ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے ماننے والوں کا باب

جلی عنوان میں اور ضخیم اوراق میں ملے گی۔ اور ان میں اکثریت ان افراد یا اقوام کی ملے گی جن کی گردنوں پر تلواریں خدا کی ذات سے منحرف کرنے کے لئے چلائی گئیں۔

اسلامی عقیدہ جو دین حق کی اولین تعلیم ہے جو آدم علیہ السلام کی اولاد کی آفرینش کے ساتھ ہی دی گئی اور ارضی سفر کے ساتھ چلی آ رہی ہے

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (بقرہ، ۳۸)

ترجمہ: ہم نے فرمایا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے (تو اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔

اس ہدایت کا بنیادی درس یہی تھا کہ انسان اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ انسان کو موت کے بعد اپنے اعمال کے بارے میں جواب دہ ہونا ہو گا۔ اسی تعلیم کی روز اول کی روح آج بھی باقی ہے اور تاریخ اور تعلیم کا ایک ایک حرف بتاتا ہے کہ دین اسلام کا عقیدۂ الٰہی انسانوں کو فساد نہیں بلکہ محبت و مودت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ اسلام الفت و رحمت، رحم و خطا پوشی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام ظلم کی موافقت نہیں بلکہ مخالفت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اس کا علم بلند رہا ہے۔ اور تمام باطل نظریات اس کے مقابلہ میں پاش پاش ہوتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ○ (الانبیاء، ۱۸)

ترجمہ: (نہیں) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے اور جھوٹ اسی وقت نابود ہو جاتا ہے۔ اور جو باتیں تم بناتے ہو اس سے تمہاری ہی خرابی ہے۔

سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ (رعد، ۱۷)

ترجمہ: سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھیرا رہتا ہے۔

رہی وہم کی بات تو......

وہم اور فطرت

اللہ کی ذات سے انکار کرنے والے ہمیشہ اللہ کو ماننے والوں سے بحث و تکرار کرتے وقت یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ انسان کی اپنی بے بسی اور بے چارگی کی بے چینیوں سے پیدا ہونے والے وہم کا نام ہے۔ وہ ایک خیال ہے جو مذہبی راہنماؤں کی تراشیدہ اصطلاحات، غیبی طاقت، غیبی راہنمائی، غیبی اطمینان و سکون کے گورکھ دھندے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس کا سب سے پہلا جواب تو یہ ہے کہ انسان کو وہم کا ملکہ بھی اللہ نے دیا ہے اور یہی ملکہ جہاں انسان کی خرابی کا سبب ہے وہاں اس کی کامیابیوں کا زینہ بھی ہے۔ یہ سائنس دان یا موجد بڑے سے بڑے کارنامے کی ابتدا وہم سے ہوتی ہے۔ جو توانا ہو کر خیال میں منتقل ہے اور خیال سے تجربوں میں منتقل کر ایجاد کا روپ اختیار کرتی ہے۔

ایجاد یا تحقیق و انکشافات کا نقطہ آغاز وہم ہی کا مرہون منت ہے جو انسان کو فطرت میں ملا ہے جیسے دوسرے ملکات و محرکات اور مہیجات ملے ہیں۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ اللہ کا تصور یا بقول ان کے وہم یا احساس کسی خارجی داعیہ کی تخلیق ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کے اندر موجود ہے۔ اسے وہم و گمان نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح انسان کے مادی تقاضوں کے لئے انسان کا مادی وجود ضروری ہے۔ اسی طرح اس مادی جسم کی داخلی کائنات، جوانسان کے ظاہری اور باطنی کے لئے روح ضروری ہے۔ روح کا تحفظ (یعنی جان کا تحفظ) فطری امر ہے اور جس طرح روح ہمیں نظر نہیں آتی مگر آثار و قرائن اس کا ثبوت بن کر ہمیں منواتے ہیں کہ انسان کے وجود کے اندر کوئی فطری چیز ہے جسے روح کہتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی فطرت کے اندر "اللہ" کا اقرار۔۔۔ اس کی موجودگی کا احساس لاشعور میں فطرتاً موجود رہا ہے۔ اور رہے گا۔ گویا دوسرے فطری ملکات کی طرح ایک ملکیت اللہ تعالیٰ سے متعلق ہونے کی خواہش بھی ہے اور یہی وہ خواہش ہے جس میں کامیابی پانا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسانی اعمال میں شرافت اور فضیلت والے اعمال پرورش ہی نہیں پا سکتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لوگوں (انسان) کو اللہ تعالیٰ نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے اور اس فطرت کی مہک اعلیٰ ارفع افکار گفتار اور کردار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝
(الروم: ۳۰۔۳۲)

ترجمہ: تو تم ایک طرف کے ہو کر دین (خدا کے رستے) پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ (اور) خدا کی فطرت کو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (اختیار کئے رہو) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (مومنو) اسی (خدا) کی طرف رجوع کئے رہو اور اس سے ڈرتے رہو اور نماز پڑھتے رہو اور مشرکوں میں نہ ہونا۔ (اور نہ) ان لوگوں میں (ہونا) جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقے فرقے ہو گئے سب فرقے اسی سے خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔

آیہ کریمہ کے الفاظ پہ غور فرمایئے ہم اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اپنے اندر اور آس پاس دلیل کے طور پہ وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں یا نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ میں فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ہم نے فطرت انسانی میں انسان کا اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے کا داعیہ پیدا کیا ہے۔ یہ ایک دوسری بات ہے

کہ وہ اپنی ناعلمی کی وجہ سے اس کا رخ دوسری طرف پھیر لے۔ تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے جس طرح ارشاد سچے ہیں۔ اسی طرح وہ خود بھی سچے ہیں۔ ثابت ہوا کہ نفوس بشریہ میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال سے ڈرنا بھی انسان کی فطرت میں ہے۔ اسے ماننا بھی، اس کی تلاش بھی انسان کی فطرت میں ہے اور تلاش کرنے والا پا لیتا ہے سوائے ان لوگوں کے جنہیں انحراف کرنے کی پختہ عادت ہو گئی ہے۔ اور یہی پختہ عادت ان کی فطرت بن گئی ہے (یہ ایک نفسیاتی اصول ہے)۔ عرفان ربانی کے دروازے انہوں نے خود اپنے لئے بند کر دیئے اور اللہ نے انہیں مقفل کر دیا۔ ارشاد فرمایا:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ ع (البقرہ:۷)

ترجمہ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے۔ اور ان کے لئے بڑا عذاب (تیار) ہے۔

اپنی اپنی نظر ہے۔ ورنہ انسان کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تصور میں اختلاف سہی، لیکن "اللہ جل شانہٗ" دل اور دماغ یا فطرت سے کبھی محو نہیں رہا۔ کسی نہ کسی صورت اس کا وجود تابندہ نظر آتا ہے۔ امتوں کی زندگی کا کوئی دور بھی ایسا نہیں جس کے سانسوں میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی موجودگی نہ ملتی ہو۔

اور ایسا کیوں ہے؟ کس لئے ہے؟ اس کا جواب بھی خود اللہ جل شانہٗ دیتے ہیں

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ (الاعراف ۱۷۲)

ترجمہ اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی تو ان سے خود ان کے مقابلے میں اقرار کرا لیا (یعنی ان سے پوچھا کہ) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ وہ کہنے لگے کیوں نہیں، ہم گواہ ہیں (کہ تو ہمارا پروردگار ہے)۔

یہی وہ آیہ کریمہ ہے جس سے یہ بات ثابت کہ انسان کی روح ہر دور میں انسان کی عقل سے احتجاج کرتی رہی ہے کہ تم اللہ سے کئے ہوئے عہد کو مت توڑو۔

انسان کی روح کا شعور اور اپنے عہد کا پاس ہی انسان کو ہمیشہ "معبود" یا اپنے رب کی تلاش پر اکساتا اور آمادہ کرتا رہا ہے۔ اور آج بھی انسان چاہے کتنا ہی اپنے آپ کو ترقی پسند کہتا رہے اور مختار و مقتدر سمجھتا رہے، مگر اس کی روح اس کو اپنا عہد یاد دلاتی ہے اور دلاتی رہے گی۔ اسی وجہ سے اللہ کے حوالہ سے خود دانشور بہت زیادہ پریشان ہے۔ اس کی یہ پریشانی اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ ہے اور اللہ کی ذات سے انکار کرنے والا جس قدر زیادہ قوت سے انکار کرتا ہے اس کی اپنی روح اتنا ہی قوی احتجاج کرتی ہے کہ اللہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا انسان اپنی داخلی مخالفت سے اتنا پریشان ہو جاتا ہے کہ اسے سکون کے لئے اپنے اعصاب کو تھکانا پڑتا ہے۔ وہ زیادہ شراب پیتا ہے۔ وہ زیادہ جسمانی تلذذ میں اپنے آپ کو ڈبونا چاہتا ہے۔ اور پھر وہ تھک کر بستر پر گر پڑتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ عقلمند کہتا ہے۔ اور صرف انہیں کو عقلمند سمجھتا ہے جو

اس کے ہم خیال ہوں۔

ایک دفعہ حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے کسی نے اللہ جل شانہٗ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے اس شخص سے پوچھا تم نے کبھی کشتی میں سوار ہو کر سمندر کا سفر کیا ہے؟ کہنے لگا جی ہاں! سوال کیا، اس سفر کے درمیاں کبھی تمہیں سرکش ہواؤں کا سامنا کرنا پڑا؟ کہنے لگا جی ہاں، پھر پوچھا کیا ایسا بھی ہوا کہ ملاحوں اور دوسرے وسیلوں سے امیدوں کا ناطہ بالکل ٹوٹ گیا ہو؟ جواب دیا جی ہاں۔ جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے پوچھا ان لمحوں میں بے ساختہ تمہیں کس ہستی کا خیال آیا جو تمہیں اس مصیبت سے نجات دے سکتی ہے۔ اس نے جواب دیا ہاں وہ کوئی ہستی ہے جس کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بس وہی ذات، وہی ہستی اللہ جل جلالہٗ ہے۔

قرآن کریم میں اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ط حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ج وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ لا دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ج لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ O (یونس ۲۲)

ترجمہ وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں (سوار) ہوتے ہو اور کشتیاں پاکیزہ ہوا (کے نرم نرم جھونکوں) سے سواروں کو لے کر چلنے لگتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں تو ناگہاں زنانے کی ہوا چل پڑتی ہے اور لہریں ہر طرف سے ان پر (جوش مارتی ہوئی) آنے لگتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (اب تو) لہروں میں گھر گئے۔ تو اس وقت خالص خدا ہی کی عبادت کر کے اس سے دعا مانگنے لگتے ہیں۔ (اے خدا) اگر تو ہم کو اس سے نجات بخشے تو ہم (تیرے) بہت ہی شکر گذار ہوں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو انسان کی داخلی کیفیت کے حوالے سے سمجھاتے ہیں جو اپنی جگہ ناقابلِ انکار ثبوتِ وجودِ الٰہی ہے۔

ایک اور واضح دلیل

جیسے کہ گذشتہ سطور میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اللہ جل شانہٗ کا عقیدہ انسانی فطرت میں موجود ہے۔ بعض فلسفیوں نے بھی اس ذات سبحانہٗ و تعالیٰ کے وجود کو اس کی عظمتوں اور واضح آیات کی موجودگی کے بعد کسی دلیل کی ضرورت کو بے معنی قرار دیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ خود انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ثبوت میں انبیاء کرام کے بیان کردہ دلائل کی وضاحتیں کی ہیں۔ اور اللہ جل شانہٗ کی تمام صفات عالیہ کو ہر قسم کی تنقیص سے پاک و صاف ثابت کیا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ انسانی فطرت میں یہ بھی شامل ہے کہ عقل اور قلب انسانی دونوں دلیل کے بغیر کسی بات کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ تمام علوم جن کا تعلق حیات سے ہے۔ اس بات میں دلائل بنیادی ہیں لیکن بعض حقیقتیں ایسی ہیں جن کی دلیل دینا بے معنی ہوتا ہے۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں "الواحد نصف الاثنین" یعنی دو کا آدھا ایک ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے، ایک دو کا آدھا ہوتا ہے۔ یہ ایسی واضح حقیقت ہے جس پر نہ تو سننے والا دلیل مانگے گا نہ کہنے والا دلیل کی ضرورت سمجھے گا۔ اسی طرح عربی میں دوسری مثال ہے

و النّقیضان لا یجتمعان و لا یرتفعان "دو متضاد سمتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی بلند ہو سکتی ہیں"۔

ظاہر ہے مشرق اور مغرب جمع نہیں ہو سکتے۔ اس کی دلیل مانگنا حماقت ہے دانشوری نہیں۔ تو ہماری یہ معروضات تو ان سے تھیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی ذات برحق کو ماننے میں تکلف محسوس ہوتا ہے۔ اب ہمارا رخ پھر مسلمانوں سے ہے۔ جس میں ہم عقیدہ کے بارے میں کچھ اور باتیں عرض کریں گے۔

سچے عقیدہ کی وضاحت

اللہ تعالیٰ سے سچے عقیدہ کی نکھری ہوئی صورت یہی ہے کہ اسے تمام نقائص سے پاک یقین کیا جائے۔ اس کی ہستی اور اس کے وجود کا جمال ہمیں کائنات کے ہر ذرہ میں نظر آتا ہے۔

تامل سطور الکائنات فانها

من الملاء الاعلیٰ رسائل

کائنات کی سطور پر نگاہیں جما کر غور تو کرو، تمہیں ہر حرف میں اسی کی عظمتوں کے نشاں اس کی طرف بلاتے نظر آئیں گے۔

وقد خط فیها لوتاملت سطرها

الاکل شیٔ ماخلا اللہ باطل

وہ تمام خط جو تمہیں ان سطور کے درمیان نظر آتے ہیں۔ اگر ان پر تدبر کرو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ جتنا غور و تدبر کرو گے اتنا معلوم ہو گا کہ اس کائنات کے وجود کی مختلف صورتیں، طبیعتیں، ماہیتیں، خصوصیتیں اس خالق حقیقی کی دلیل ہیں۔ کائنات میں باہمی ربط و تناسب، نظم و نسق اس کی قدرت و عظمت کا گواہ ہے۔ عناصر و ذرات کے عوامل میں فرق، تحلیل و تراکیب میں اختلاف اس کے وسیع تر علم اور ارادہ کا مداح ہے۔ کائنات کے ہر وجود میں موجود مقصد اس بات کی تکذیب کر رہا ہے کہ یہ سب کچھ اندھے مادے کے اتفاقی دھماکے کی وجہ سے ہے۔ زندگی کی دھڑکتی نبضیں، حیات اور حرکات و سکون کا نپاتلا حساب اپنے صانع اور اپنے خالق کی تعریف کرتے ہوئے کہہ رہا ہے:

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ.

کائنات تو اپنی خاموش زبان سے اللہ جل شانہٗ کی تسبیح و تہلیل کر ہی رہی ہے مگر وہ اہلِ علم جنہوں نے اس کائنات کا مطالعہ کیا ہے ان کی آراء ملاحظہ فرمایئے۔

سربراہان علم و دانش کی گواہیاں

زمین و آسمان اور خلاء کے اسرار و رموز کے علم سے آشنا مشہور سربراہان علم و دانش کی اللہ جل شانہٗ کے بارے میں قابل اعتماد شہادتوں کے ذکر سے پہلے خود خالق کائنات اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں، ان پر غور فرمالیجئے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَاؕ وَ مِنَ

الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌO وَ مِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ط اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (فاطر: ۲۷۔۲۸)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے مینہ برسایا تو ہم نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے میوے پیدا کئے۔ اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔ اور بعض کالے سیاہ ہیں۔ انسانوں اور جانوروں اور چارپایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں۔ خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

میں نے پھر اس آیہ کریمہ اس لئے دہرایا ہے کہ اس میں ان تمام علمی نشانیاں جمع کر دی گئی ہیں جن میں آج کے ماہرین علوم بہت زیادہ تحقیق اور بے گنت انکشافات کر رہے ہیں جب کہ نزدیک اللہ جل شانہٗ کی اپنی دلیل سب پر بھاری ہے۔ علمی تحقیق و تفکر کو دین الٰہی نے کبھی بھی ممنوع نہیں دیا بلکہ خود دعوت غور و فکر دی ہے اور حصول علم لازمی قرار دیا ہے۔ تحقیق و تفکر کو ہی نتیجہ عرفان الٰہی دیا گیا ہے۔ ملحدین کی یہ غلط فہمی کہ دین اسلام میں اللہ تعالیٰ کو ماننے کا عقیدہ بے دلیل ہے۔ یا عقل و شعور سے بالاتر ہے۔ درست نہیں۔ صاحبان علم و دانش کی تحریروں میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کا اعتراف اور شہادتیں موجود ہیں۔

مشہور مفکر ڈیکارٹ کہتا ہے۔ ان بے چین لمحات میں جب حیرتیں میرے شعور کو گھیر لیتی ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری ذات کے اندر شعور کا درخت اگانے والی ذات تمام صفات سے مزین "اللہ" ہی ہے۔ اسحٰق نیوٹن کہتا ہے جس طرح اس تمام عالم وجود میں رواں دواں عقل کی موجودگی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس کے خالق کے بارے میں بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہرشل لکھاہے علم جتنا پھیلتا جاتا ہے، خالق ازلی کے وجود کی ٹھوس گواہیاں اتنی ہی بولتی سنائی دیتی ہیں۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی قدرت بے انتہا و بے حساب ہے۔ اسی طرح ارضیات، ریاضی، فلکیات اور طبعیات کے بڑے بڑے مفکرین و دانشور علوم کی جتنی شمعیں روشن کرتے ہیں ان سب کی روشنی میں ایک ذات وحدہ لاشریک کی عظمتیں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ ہربرٹ سپنسر اسی مفہوم کو اپنے ایک رسالے تربیت میں یوں بیان کرتا ہے۔

علم خرافات کی تردید تو کر سکتا ہے لیکن "دین" کی تردید نہیں کر سکتا۔ گو ہمیں علماءِ طبعیات کی اکثر تحریروں میں واجب الوجود سے انکار کی روح نمایاں نظر آتی ہے لیکن ہمارا یقین ہے کہ جبعلم سطحی حدود سے گزر کر حقائق کی گہرائیوں میں پہنچتا ہے تو پھر اس قسم کے خیالات کے اثرات سے نکل جاتا ہے۔ ہماری ذاتی رائے میں علم طبعیات دین کے منافی نہیں بلکہ علم طبعیات ایک خاموش عبادت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشیاء کی پہچان کرنا، ان کی ماہیت کو جاننا، اس کے فوائد سے آگاہی کی تعلیم دینا خاموش عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس علم پر قدرت حاصل ہونے کے بعد اس پر تصرف کرنا عملی عبادت ہے۔ دوسرے لفظوں میں تعلیم حاصل کرنا وہ تسبیح خوانی یا اللہ کی عظمتوں کا وہ انداز بیان ہے جسے ہمارے ہونٹ زبان سے ادا کرتے ہیں۔ اور علم کا استعمال اللہ کی جلال و جمال کی وہ تسبیح ہے جس کی زبان ہمارا عمل ہے۔ علم انسان کو اپنی ذات کی پہچان کرواتا ہے۔ اور جہاں اپنی پہچان کا راستہ ملتا ہے وہیں عرفان ربانی کے راستے کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور پھر ان کیفیات کے عالم میں عقل مردہ نظر

آنے لگتی ہے۔

ایک عالم جب پانی کا قطرہ دیکھتا ہے تو اسے اس کے اجزائے ترکیبی کا علم ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس پانی کے قطرہ میں آکسیجن اور ہائیڈروجن ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کو ان کی نسبتِ مقدار کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں عظمتِ خالق بھی ابھرتی ہے۔ اور وہ اس کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کی وسعتوں کا احساس جتنا علم طبعی کا ماہر عالم کر سکتا ہے اتنا ایک عام آدمی نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ آسمان سے برستے ہوئے اولوں کو عام آدمی دیکھ کر انہیں سفید جما ہوا ٹھنڈا پانی کہہ سکتا ہے۔ لیکن ماہر علم طبعیات بخارات سے لے کر اس کی صورت میں ڈھلنے اور برسنے تک استعمال ہونے والی اللہ کی حکمت و قدرت سے واقف ہونے کی وجہ سے اس قادرِ مطلق کی عظمتوں کو سلام اعتراف پیش کرے گا۔

عقل انسانی کی حدود

تمام مفکرین اور دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ عقل جو کچھ وجود کی صورت میں دیکھتی ہے۔ اس کی مکمل حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے اختیار و عمل کی اپنی حدود ہیں۔ انہیں حدود کے اندر رہ کر وہ اپنا کام سرانجام دیتی ہے۔ اس کائنات میں بہت سی حقیقتوں کے وجود بحث و نظر کی پہنچ سے بہت دور ہیں ان کی اہمیت اس کائنات کا جزوِ لاینفک ہیں۔

مجرد یا غیر مجرد اسی طرح بسیط یا غیر بسیط عناصر کے مزاج، خصوصیات اور صفات کا ادراک ناممکن ہے۔ لیکن علم ان کی تصدیق یا توثیق کرتا ہے۔

عناصر کے علم کی پیشوائی کا دعویٰ کرنے والا عالم ہو یا کائنات کی حقیقتوں کی شناسائی کا علم رکھنے والا، زندگی اور اس کے اسرار کی وضاحتیں کرنے والا ہو یا غیر مرئی اشیاء کا جان کار، اس کو اس بات کا اقرار ہو گا کہ ابھی اسے بہت کچھ جاننا ہے، ابھی بہت سے اندھیروں سے گزرنا ہے۔ عقل کو ابھی جہالت کی نہ معلوم کتنی مسافتیں اور کتنی منزلیں طے کرنی ہیں۔

سلسلہ جذب و کشش، برق پاروں اور جوہروں کے علوم اور اصطلاحات و اختراعات کے پیچھے نہ معلوم کتنی حقیقتیں اب بھی پوشیدہ ہیں جنہیں مکمل جاننا انسان کے بس کی بات نہیں۔ فرمان عزو جل ہے۔

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ○ (بنی اسرائیل:۸۵)

ترجمہ اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔

تمام دانشوروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعض حقیقتوں کی موجودگی آثار و قرائن اور خصوصیات کی بنا پر یقین کی جاتی ہے۔ فطرت کی خاموش آواز ہے اس کو انسان دیکھ نہیں سکتا۔ عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی مگر اسے انسان کا دل بار بار سنتا ہے۔ موجودات اور کائنات کے تمام مظاہر اللہ کے وجود اور اللہ جل شانہٗ کی عظمتوں کے ایسے واضح گواہ ہیں کہ عقل کو انکار کی مجال ہو ہی نہیں سکتی۔ ان دلائل کی خاموش گفتگو جب انسان کے دل کو شبہات سے پاک کر دیتی ہے۔ دل میں اجالوں کا بسیرا ہو جاتا ہے اور دل یقین و ایمان کی لذت سے آباد ہو جاتا ہے۔ کسی نے ایک عارف کامل سے سوال کیا: کیا تمہیں اللہ پہ پکا یقین ہے؟ وہ بزرگ مسکرائے اور کہا: اس سراپا نور

نے میرے دل کو ایسا منور کیا ہے جیسے دن روشنی کی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا اسی طرح ایمان نے مجھے غنی کر دیا ہے۔ اب میں کسی اور کا محتاج نہیں ہوں۔

الغرض، جب ثابت ہو چکا کہ عقل اور حواس انسانی اللہ جل شانہ کی ذات تو ایک طرف کائنات میں بہت سی موجود و مسلمہ حقیقتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے، تو پھر بہتر ہے کہ ہم رب العالمین کی ذات کو تسلیم کر لیں۔ اس لئے عقیدۂ الوہیت ہی انسان کی عظمت کا نشان ہے اور یہی عقیدہ اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پوری تاریخ حیات کا اثاثہ ہے جس کے لئے دلائل کی ضرورت ہی نہیں۔

فساد یا امن و سکون؟

میری معروضات کی ابتدا میں ملحدین کے اس پروپیگنڈے کا ذکر تھا جس میں ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ دین ہی اس دنیا میں وجہ فساد ہے۔

انہیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور حق و صحیح بات کرنی چاہئے۔ اس دنیا میں فساد کی جڑ الحاد ہے یا ایمان؟ الحاد کی بنیاد یہ ہے کہ انسان پیدا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اس پر کوئی حساب نہیں۔ جبکہ ایمان کا پہلا درس یہ ہے کہ اے انسان تیرا خالق وحدہ لا شریک ہے، وہ عظیم ہے، وہ تمہیں ہر حال میں دیکھتا ہے اور تمہاری ہر بات سنتا ہے۔ وہ اس پوری کائنات کا خالق ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی صاحب قدرت نہیں۔ کوئی صاحب کمال نہیں اور صاحب امر نہیں۔ اس کا حکم ہے تم اپنے لئے بھی بھلا سوچو اور جو بھلا اپنے لئے سوچو وہ دوسروں کے لئے بھی سوچو۔ تم ایک باپ آدم اور ایک ماں حوا کی اولاد ہو۔ اگر کوئی میری ذات سے انکار کرے تو تم اسے کچھ نہ کہو میں خود اس سے نپٹ لوں گا البتہ تمہیں اس وقت ضرور بولنا ہو گا اور مدافعت کرنا ہو گی جب کوئی تمہیں مجھ سے اور میرے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے تعلق توڑنے پہ مجبور کرے۔ وہ انسان کو عام حکم و تعلیم دیتے ہوئے بیویوں اور اولاد سے حسن اخلاق کے صلہ میں سعادتوں کی جنت دینے کا یقین دلاتا ہے۔

ایمان اس اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک ماننے اور اس پر پکا یقین رکھنے کا نام ہے۔ یہی یقین انسان کے ضمیر کی زندگی ہے۔ اس کے شعور کی بیداری ہے وجدان کا نور ہے۔ اخلاق کا ستون ہے اور معیار فضیلت کی دستار ہے۔ اور اسی ایمان کے چشمہ سے پھوٹنے والی شاخیں انسان کے اجتماعی معاشرہ میں ایثار و وفا، محبت و رحمت حسن اخلاق، رواداری اور مروت نیکی اور انفاق سے تعاون کے مضبوط رشتوں کی طرح پھیل جاتی ہیں۔

اسی ایمان کے چشمہ سے غیرت و حمیت اور برائی کے خلاف جہاد کے جذبوں کے سمندر ابلتے ہیں۔ اسی ایمان کے چشمہ سے اللہ کے لئے مالی اور جانی قربانی کا جذبہ پھوٹتا ہے اور اس زمین پہ بھلائیوں اور نیکیوں کے باغ اگانے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ انسانی صفات ہیں جو اس انسانی معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں امن و سکون کی ضامن ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو یہ دنیا فساد کی بدبو کے سوا کچھ بھی نہیں۔

انسانی تاریخ میں "ایمان" سے خالی جتنے بھی انقلاب وجود میں آئے ہیں ان میں قتل و غارت گری کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا لیکن انبیاء علیہ السلام جتنے بھی انقلابات لائے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی پیشانی پر انسان کے خون کا ایک معمولی قطرہ بھی کوئی مورخ دکھا سکے۔

تمام انبیاء علیہم السلام کے انقلابات ان تمام اخلاقی اقدار سے مزین تھے جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب کی تعلیم و تدریس میں یہی اصول، قواعد تھے جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان سب کا عنوان جلی تھا۔ "الایمان باللہ"۔

قضا و قدر

اب کچھ گفتگو ان کے اس اعتراض کے بارے میں ہو جائے جس کے مطابق یہ معلوم ہوتا ہے ایمان کا عقیدہ انسانوں کو مست بنا دیتا ہے۔ قضا و قدر کا نام دے کر انہیں اذیت سہنے اور اپنے حقوق غصب کئے جانے پر صبر و قناعت کرنا سکھاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قضا و قدر پر ایمان رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے اعمال کے نتیجہ کے بارے میں اللہ کے فیصلہ پر یقین رکھا جائے۔ یعنی انسان کو اللہ کی ذات پر یقین ہونا چاہئے کہ وہی ذات مطلق تمام معاملات کے انجام پر قادر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ مسلسل عمل اور اسباب سے کام لینا بھی فرض قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح ظلم کرنا گناہ قرار دیا گیا ہے اسی طرح دین میں ظلم سہنا بھی گناہ قرار دیا گیا ہے۔

قضا و قدر اور مخصوص حالات

ہاں ایمان کے عقیدہ توحید میں مخصوص حالات میں قضا و قدر کے معانی کا اسباب سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ ان حالات میں عمل کا نام جہاد ہے اور اس کا انجام صرف اللہ تعالیٰ کے رضا پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ زندہ رہے تو غازی، جان گئی تو شہید۔۔۔ یہ وہ حالات ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کے عقیدۂ ایمان کو بدلنے کی سازشوں کا جال بچھ رہا ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سے ایک (یعنی حسین رضی اللہ عنہ) نے دین اسلام کی مٹتی ہوئی قدروں کو بچانے اور ایمان کے متزلزل ایوان کو سنبھالا دینے کے لئے اسباب و حالات سے بے نیاز ہو کر جہاد کیا اور اس کا فیصلہ قضا و قدر کے حوالے کر دیا۔ بقول شاعر

ای یوم من الموت افر

یوم لا یقدر او یوم قدر

زندگی کا بااختیار دن ہو یا بے اختیار دن، کوئی دن بھی ایسا نہیں ہوتا جب انسان موت سے فرار حاصل کر سکے۔

یوم لا یقدر لا ارهبه

و من المقدور لاینجی الحذر

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ایک دن بھی اس بات پر قادر نہیں کہ موت کے خوف سے بچ سکیں۔

انہوں نے آنے والی نسلوں کو شجاعت بطالت اور عقیدہ قضا و قدر کے مفہوم کو بڑی شان سے سمجھایا۔ باطل کے سامنے حق کی استقامت، اسباب و وسائل سے بے نیازی اور انجام کے خوف و خطر سے لاپرواہی کا کس شان سے مظاہرہ کرنا چاہئے اس کی مثال قائم کر دی۔ اور توکل اور کسل کے معانی کی تفسیر اپنے عمل اور مقدس خون کی زبان میں پیش کر دی۔

ہلاکت اور بربادیوں سے حفاظت

آج تمام دنیا کو ہلاکت اور بربادی سے اگر کوئی قوت بچا سکتی ہے تو وہ اللہ کی ذات برتر ہے۔ گمراہیوں کے بدبودار اندھیروں میں تڑپتی ہوئی انسانیت کو اگر کوئی صحت مند خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے معاشرہ میں اٹھا کر لا سکتا ہے تو وہ اللہ کی ذات پر یقین و ایمان ہے۔ یہی تمام بیماریوں کی دوا ہے۔ ایک مغربی فلسفی نے کیا خوب کہا ہے۔ اگر ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے موجود نہ ہونے کا تصور آ گیا ہے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے عقیدہ میں پیدا کریں۔ مختصر یہ کہ دین کا مکمل مفہوم اللہ پر ایمان لانا ہے۔ اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہمارے دلوں کو اگر کوئی اجالے دے سکتا ہے تو وہ اللہ پر ایمان و عقیدہ کا نور ہے۔ جس کی روشنی میں عرفان ربانی کی نعمت سے بہرہ ور کر سکتی ہے۔

قرآن کے عقیدۂ الوہیت کا مختصر تاریخی جائزہ

قرآن حکیم کا نزول لوگوں کے دلوں میں عقیدۂ الوہیت (ایمان باللہ) کو پختہ تر کرنے کے لئے ہوا۔ ہماری بھی سابقہ تمام معروضات اسی سے ماخوذ تھیں۔ جس فرد نے اس کتاب حکمت سے اپنے ایمان کی آبیاری کر لی اس کے لئے اطاعت الٰہی آسان ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت اگر بخوشی کسی عمل کو خود قبول کر لے تو کٹھن محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح اس سے بعد اور دوری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اطاعت الٰہی کا عمل مشکل اور عقیدہ بہت دشوار محسوس ہوتا ہے۔ عقیدۂ الوہیت کو ماضی میں مختلف قبائل کے اوہام نے جن خطاؤں غلطیوں اور خرافات کے اندھیروں کا شکار بنایا تھا، قرآن مجید نے ان اندھیروں کو اپنے واضح اور روشن بیان سے مٹا کر اس کی مستحکم حدود کی مکمل نشاندہی کر دی تاکہ یہ کمی اور زیادتی کی دستبرد سے محفوظ رہے۔

قرآن حکیم کے حوالے سے عقیدۂ الوہیت میں لوگ جس سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں اسے چند سطور میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

شرک کرنا، متعدد خدا بنانا، انسانوں کو خدائی رتبہ دینا اور حیوان، شجر و حجر اور ستاروں کو خدا ماننا۔ اصل میں یہ سب غلطیاں صرف اس لئے انسان کو اپنی پکڑ میں لے لیتی ہیں کہ اسے حقیقت کا علم نہیں ہوتا۔ اور الوہیت کے حقیقی تصور سے ناواقفیت کے سبب تعظیم و محبت میں غلو و مبالغہ آرائی، الوہیت کے بارے میں خود تراشیدہ صفات، اپنی لذت حس کو مطمئن کرنے کے لئے خود ساختہ بت اور ان کی خصوصیتوں کو خود ہی معین کر کے ان کی عبادت و پرستش انسانوں میں رائج ہوتی رہی ہے۔ اسی کو دین میں تحریف یا تغیر و تبدل کہا جاتا ہے۔ اس تحریف اور تغیر و تبدل میں بعض فلسفیوں کے نظریات اور عقلی مفروضوں نے بڑے دوررس اثرات ڈالے ہیں۔ کہیں اللہ کو انسانوں کے جسم میں حلول پذیر ہونے کا تصور دیا ہے تو کہیں اس جل و علا ذات کو مختلف تصورات کے اتحاد کا مجموعہ بتایا اور کہیں عجیب و غریب آراء میں بانٹ دیا ہے۔ سابقہ امتوں میں اکثر ایسے ہی غلط افکار کا شکار ہو کر صحیح عقیدۂ الوہیت سے محروم ہو گئے، مثلاً:

قومِ نوح علیہ السلام

قرآن حکیم نوح علیہ السلام کی بت پرست قوم کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس کے کئی بت معبود تھے۔ ہر قبیلہ کا بت یعنی معبود الگ تھا مثلاً دومۃ الجندل کے قبیلہ بنوکلب کے بت کا نام ود تھا۔ قبیلہ ھذیل کے بت کا نام سواع تھا۔ غطیف کا بت یغوث تھا۔ قبیلہ ہمدان کے بت کا نام یعوق تھا۔ حمیر کے علاقے ذی کلاع کے بت کا نام نسر تھا۔ ان بتوں کے تذکرے کے بارے میں بعض مفسرین نے تفصیل و وضاحت سے لکھا ہے۔ دراصل وہ ان لوگوں کے بت تھے جو اپنی زندگی میں بہت نیک تھے یا بڑے کارہائے نمایاں کر کے مرے تھے۔ ابتدا میں تو ان کو بطور یادگار احتراماً رکھا جاتا لیکن طویل عرصہ گزرنے کے بعد ان کو خداؤں کا درجہ دے دیا گیا۔ اس قوم کو اس گمراہی سے نکالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو ان میں پیدا کیا۔ انہوں نے ان کو اللہ بزرگ و برتر کی طرف بلایا انہیں بہت سمجھایا کہ تمہارا اللہ ایک ہے مگر انہوں نے نہ ہی بات سنی نہ ہی ان کی اطاعت کی۔ جس کا نتیجہ کیا ہوا؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتے ہیں:

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًاۚ۝ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًاۚ۝ وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا یَغُوْثَ وَ یَعُوْقَ وَ نَسْرًاۚ۝ وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا ۚ۬ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا۝ مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ۬ فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا۝ (نوح:۲۱۔۲۵)

ترجمہ (اس کے بعد) نوح نے عرض کی کہ میرے پروردگار! یہ لوگ میرے کہنے پر نہیں چلے اور ایسوں کے تابع ہوئے ہیں جن کو ان کے مال اور اولاد نے نقصان کے سوا کچھ فائدہ نہیں دیا۔ اور وہ بڑی بڑی چالیں چلے۔ اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا۔ (پروردگار) انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے تو تُو ان کو اور گمراہ کر دے۔ (آخر) وہ اپنے گناہوں کے سبب (پہلے) غرقاب کر دیئے گئے پھر آگ میں ڈال دیئے گئے۔ تو انہوں نے خدا کے سوا کسی کو اپنا مددگار نہ پایا۔

اس آیہ کریمہ میں دو باتوں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ دولت مندوں اور طاقتوروں کی تابعداری کرنے والے ہی نوح علیہ السلام کے مخالف تھے۔ دوسرے خود دولت مندوں نے نوح علیہ السلام کی مخالفت صرف اس وجہ سے کی کہ انہوں نے ان کے بنائے ہوئے نقلی خداؤں کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

ان دونوں باتوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ کے دین کا کوئی پیغمبر اور کوئی نبی کسی بادشاہ، طاقتور یا ظالم کی حمایت میں نہیں آیا بلکہ صرف اللہ جل شانہٗ کی عظمتوں سے بھولے بھٹکے انسانوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرنے کے لئے آیا۔

قوم ابراہیم علیہ السلام

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے بارے میں اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید میں ان کی بت پرستی، مظاہر پرستی اور سورج و چاند کی پرستش کے علاوہ بتوں کی پوجا کا مفصل بیان فرمایا ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام

کے موقف توحید اور دعوتِ توحید کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خلیل علیہ السلام نے اپنے دلائل سے ان کو جتنا سمجھانے کی کوشش کی ان لوگوں نے اتنی ہی مخالفت کی۔ اتنا ہی ان کو پریشان اور تنگ کیا۔ تکلیفیں دیں۔ بحث مباحثہ کیا۔ جب لاجواب ہو گئے تو بوکھلا کر خود جرم عائد کرتے ہوئے کہا اس نے ہمارے بتوں کو توڑا ہے۔ اسے سخت سے سخت سزا دو۔ اسے بھڑکتی آگ کے شعلوں میں پھینک دو! انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں۔ اسی وقت ہم نے آگ کو حکم دیا

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ۝ۙ (الانبیاء ۶۹)

ترجمہ۔ ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب) سلامتی (بن جا)۔

چنانچہ قرآن مجید میں پچیس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے

۱۔ سورہ البقرہ ۲۔ آلِ عمران، ۳۔ النساء، ۴۔ الانعام، ۵۔ التوبہ، ۶۔ ہود، ۷۔ یوسف، ۸۔ ابراہیم، ۹۔ الحجر، ۱۰۔ النحل، ۱۱۔ مریم ۱۲۔ الانبیاء، ۱۳۔ الحج، ۱۴۔ الشعراء، ۱۵۔ العنکبوت، ۱۶۔ الاحزاب، ۱۷۔ الصفات، ۱۸۔ ص، ۱۹۔ شوریٰ، ۲۰۔ الزخرف، ۲۱۔ الذاریات، ۲۲۔ النجم، ۲۳۔ الحدید، ۲۴۔ الممتحنہ، ۲۵۔ الاعلیٰ۔ ہر مقام پر کہیں تفصیل کے ساتھ، کہیں مختصر، لیکن ہر بار بنیادی ذکر قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ توحید کے مقابلہ ان لوگوں کی کج بحثی کا ہے۔

سورہ الانبیاء کی بیس آیات (۵۱ تا ۷۱) میں ابراہیم علیہ السلام کا قوم کو بت پرستی سے روکنے اور بت پرستوں کے جھگڑنے کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان کو ڈرانے کا ذکر ہے۔ سورہ انعام میں ۷۵ سے لے کر ۸۳ آیات تک ستاروں کی پرستش کرنے والوں سے مدلل گفتگو کا ذکر ہے۔ اور سورہ بقرہ کی ۲۵۸ آیات سے آگے تک ان کے معاصر جابر بادشاہ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سوال و جواب اور آخر میں اس کے لاجواب ہو کر جھنجلانے کا ذکر ہے جس میں فرمایا:

فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ۚ (البقرہ ۲۵۸)

ترجمہ: (یہ سن کر) کافر حیران رہ گیا اور خدا بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

سورہ مریم کی ۴۱ سے ۵۰ تک کی آیات میں ابراہیم علیہ السلام کی (اپنے باپ) آزر سے بالمشافہ گفتگو اور دعوت توحید کو انتہائی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ مدلل پیغام، سچائی کا انداز گفتگو اس کی شان، حق بات کا اعلان کرتے ہوئے جرأت، شجاعت کا مظاہرہ سب کا ذکر ہے۔ بعض مفسرین سورۂ انعام میں مذکور آزر نام کے بت تراش و معبد کے بڑے پجاری کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں بلکہ اسے چچا تسلیم کرتے ہیں۔ اور بعض تو بالکل ہی کسی رشتے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہمارے خیال میں رشتہ کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم نے یوں ذکر فرمایا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ٘ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَیْكَ

اَنَبْنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ○(الممتحنہ ۴)

ترجمہ   تمہیں ابراہیم اور ان کے رفقاء کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں۔ (اور) تمہارے (معبودوں کے کبھی) قائل نہیں (ہو سکتے) اور جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کھلم کھلا عداوت اور دشمنی رہے گی۔ ہاں ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ (ضرور) کہا کہ میں آپ کے لئے مغفرت مانگوں گا اور میں خدا کے سامنے آپ کے بارے میں کسی چیز کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہمارا بھروسا ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ کر آنا ہے۔

آیہ کریمہ میں ابراہیم علیہ السلام کا محبت بھرا انداز ملاحظہ کیجئے کہ ان لوگوں کی تمام مخالفتوں اور سختیوں کے باوجود ان کے خلاف برا نہیں سوچا، سازش نہیں کی بلکہ بارگاہ الٰہی میں اپنی بے کسی کا اظہار کیا۔

اب اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کی اس مانگ کا جواب کس مدلل انداز میں دیتے ہیں یہ بھی دیکھئے۔

وَ مَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ○(توبہ ۱۱۴)

ترجمہ   اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے بخشش مانگنا تو ایک وعدے کے سبب تھا جو وہ اس سے کر چکے تھے لیکن جب ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے۔ کچھ شک نہیں کہ ابراہیم بڑے نرم دل اور متحمل تھے۔

ایک اور جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر یوں فرمایا

وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ یَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ○ق صلے(عنکبوت:۲۵)

ترجمہ: اور ابراہیم نے کہا کہ تم جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو لے بیٹھے ہو تو دنیا کی زندگی میں باہم دوستی کے لئے (مگر) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے (کی دوستی) سے انکار کر دو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہو گا اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہو گا۔

ان کی تبلیغ اور محنت کے نتیجہ میں جو امت تیار ہوئی اس کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَ لَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ○ ۙ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ○(النحل:۱۲۰۔۱۲۱)

ترجمہ: بے شک ابراہیم (لوگوں کے) امام (اور) خدا کے فرمانبردار تھے۔ جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اس کی نعمتوں کے شکرگزار تھے۔ خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا۔ اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا۔

اسی دن سے مسلمانوں کا یہ مقدر بن چکا ہے کہ وہ اپنی پیشانیوں کو صرف اللہ کے حضور میں جھکانے کے

لئے مخصوص کر دیں۔ اور شرک کی تمام اقسام سے اپنے دل و دماغ کو پاک و صاف کر لیں۔

ارشاد ہوتا ہے

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ (الحج ۷۸)

ترجمہ (اور تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے تو جہاد کرو) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلے میں شاہد ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اللہ سے وفاداری اور اطاعت کے مقام پر معیار اعلیٰ پر فائز ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک تاریخی عہد لیا۔

"ابراہیم کعبہ کی منہدم بنیادوں کو استوار کرو ہمارے گھر کی دیواریں از سر نو تعمیر کرو تاکہ لوگ جوق در جوق اس گھر میں آئیں۔ عبادت کے لئے قیام کریں۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر اس حرم میں بار بار رب کائنات سے التجائیں کریں اور ہم نے حرم کے شہر کو دارالامن قرار دے دیا"۔

حکم کی تعمیل شروع ہوئی۔ ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر وفائے عہد میں اللہ کے گھر کی بنیادیں استوار کرنے لگے۔ پھر دیواریں چنی گئیں۔ شعائر الٰہی کی نشاندہی ہوئی۔ یہ گھر خالص رب کائنات کی وحدت و توحید کا گھر، بڑی شانوں والا گھر اور بڑی برکتوں والا گھر تھا جس کی دیواروں کی تعمیر کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کے ہونٹوں پہ دعا تھی

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ؑ وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرہ ۱۲۷۔۱۳۱)

ترجمہ اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما بے شک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیو۔ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بناتے رہیو اور (پروردگار) ہمیں ہمارے طریقے عبادت بتا اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما۔ بے شک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے۔ اے پروردگار ان (لوگوں) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان (کے دلوں) کو پاک صاف کیا کرے بے شک تو غالب (اور) صاحب حکمت ہے۔ اور ابراہیم کے دین سے کون روگردانی کر سکتا ہے بجز اس کے جو نہایت نادان ہو ہم نے ان کو دنیا میں بھی منتخب کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ (زمرۂ) صلحاء میں ہوں گے۔

اپنے پروردگار سے بڑے ہی عظیم المرتبہ پکے اور سچے مسلمان ہونے کی سند لینے کے بعد

ابراہیم علیہ السلام نے دل سے چاہا کہ اسلام کی تجلیاں میری اولاد کے حصہ میں بھی آ جائیں۔ اور ان کے بعد آنے والی نسلوں میں بھی۔

و جعلها کلمة باقیة فی عقبه لعلهم یرجعون ○(زخرف ۲۸)

ترجمہ اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے تا کہ وہ (خدا کی طرف) رجوع رہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر پھر دعا تھرتھرائی

و اذ قال ابرٰهیم رب اجعل هذا البلد امنا و اجنبنی و بنیّ ان نعبد الاصنام ○ (ابراہیم:۳۵)

ترجمہ اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لئے) امن کی جگہ بنا دے اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں بچائے رکھ۔

سلام ہو ابراہیم علیہ السلام پر ان کی اولاد پر۔ اور اس دارالامن پر اور اس کے عظیم الشان پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر (آمین)۔

اب ایک اور قوم کی بھی ملاحظہ فرمائیے جس کو عقیدۂ توحید ملا مگر انہوں نے اس سے کیا سلوک کیا۔

قوم موسٰی علیہ السلام

قرآن حکیم میں موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے اسرائیلیوں اور مصریوں کا کئی بار ذکر آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصر کی سرزمین میں کئی بار توحید کی آواز گونجی۔ لوگوں نے وحدہٗ لاشریک کی تسبیح و تقدیس کی، لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں بھی شرک کا سیلاب آیا۔ ایسا سیلاب آیا کہ بت خدا بنے۔ دودھ دینے والی اونٹنیاں دیویاں بنیں۔ گائے، بچھڑا، ردھ، ستارے، سورج، آدمی، بادشاہ اور فراعین، غرض خداؤں کی ایک قطار پوجی جانے لگی۔ اسرائیلیوں پر فرعونِ مصر کے مظالم کی روداد مشہور ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے خروج اور پھر آیات الٰہی کے ساتھ واپسی، فرعونِ مصر کے ساتھ مکالمہ، اپنی قوم کے ساتھ خروج۔ اسرائیلی قوم کا دریا سے بچ کر نکلنا اور فرعون کا اپنی فوجوں سمیت غرق ہونا۔ مشہور واقعات ہیں۔

ان تمام واقعات میں ایک ہی دعوت — دعوتِ توحید — کارفرما تھی، لیکن اسرائیلیوں کی ذہنیت دیکھئے۔ ابھی ان کے پاؤں سے دریائے نیل کا پانی بھی خشک نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے پھر بتوں کو پوجنا شروع کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام کا جب ان پر گزر ہوا تو انہیں کس حال میں پایا؟

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ج قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ط قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○(اعراف:۱۳۸۔۱۳۹)

ترجمہ اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتارا تو وہ ایسے لوگوں کے پاس جا پہنچے جو اپنے بتوں (کی عبادت) کے لئے بیٹھے رہتے تھے۔ (بنی اسرائیل) کہنے لگے کہ موسیٰ جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں ہمارے لئے بھی ایک معبود بنا دو۔ موسیٰ نے کہا تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں سب بیہودہ ہیں۔

یہ واقعہ تو اسرائیلیوں کا فرعون سے نجات پانے کے متصلاً بعد رونما ہوا لیکن اس کے بعد بنی اسرائیل جنہیں فرعون سے نجات دلا کر موسیٰ علیہ السلام نے آزاد زندگی اللہ سے ہدایت میں ان کی مدد کی۔ دریا سے بچا کر نکالا۔ انہیں اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی نگرانی میں کوہ طور کے دامن میں چالیس دن کے لئے چھوڑ کر مخصوص مقام پر چلے گئے تو اسی اسرائیلی قوم نے بعد میں سامری کے ساتھ مل کر ایک بچھڑے کا مجسمہ بنایا اور اسے معبود بنا لیا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں ہے:

وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَ لَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ O (اعراف: ۱۴۸)

ترجمہ: اور قوم موسیٰ نے موسیٰ کے بعد اپنے زیور کا ایک بچھڑا بنا لیا۔ (وہ) ایک جسم (تھا) جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔ ان لوگوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ نہ ان سے بات کر سکتا ہے۔ نہ ان کو رستہ دکھا سکتا ہے۔ اس کو انہوں نے (معبود) بنا لیا اور (اپنے حق میں) ظلم کیا۔

اس کے علاوہ بھی اس قوم کے کئی واقعات قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کئی نشانیاں (آیات الٰہیہ) بھی دکھائیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے بہت سے احسانات بھی کئے۔ جو اس سے پہلے کسی اور قوم پر نہیں کئے گئے تھے۔ ان کو وہی محل اور وہی شہر جس میں ان کا جینا مشکل تھا عطا کئے، لیکن ان سے جو کہا گیا انہوں نے اس کے الٹ کیا۔ وہ اللہ کی تمام نعمتوں کا کفر کرتے رہے۔ ان اسرائیلیوں پہ مظالم ڈھانے والے فرعون کا قرآن حکیم میں ایک جگہ ان الفاظ میں ذکر ہے:

ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی O ز صلے فَحَشَرَ قف فَنَادٰی O ز صلے فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی O د صلے فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰی ط (النزعات: ۲۲۔۲۵)

ترجمہ پھر لوٹ گیا اور تدبیریں کرنے لگا۔ اور (لوگوں کو) اکٹھا کیا اور پکارا۔ کہنے لگا کہ تمہارا سب سے بڑا مالک میں ہوں۔ تو خدا نے اس کو دنیا اور آخرت (دونوں) کے عذاب میں پکڑ لیا۔

اصل میں یہ اس مقام کی بات ہے جب اس کے جادوگر بھی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تو اس نے جھنجھلا کر ان کو بھی ڈانٹا۔ اور ان کو اپنی خدائی کا پھر یقین دلایا۔

فرعون کے اپنے ظالمانہ رویہ کے علاوہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو اس کی فوج اور کارکنوں سے نجات دلانا بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم تھا۔ لیکن اس قوم نے کئی بار موسیٰ علیہ السلام کو پریشان کیا۔ اور ہر بار ان کے عقیدہ میں بگاڑ ہوتا۔ اور موسیٰ علیہ السلام ان کو توحید کی دعوت دیتے۔

قوم الیاس

جس طرح موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں۔ اسی طرح الیاس علیہ السلام کی قوم کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ یہ بھی اسرائیلیوں کے ہی پیغمبروں میں سے تھے۔

یہ قوم ۔۔۔ بعل نام بت کو پوجتی تھی۔ جو ان کے شہر کے وسط میں تھا اور جس کا نام ہی "بعلبک" رکھا

گیا تھا۔ بعض کا خیال ہے یہ ایک عورت کا بت تھا۔ چنانچہ الیاس علیہ السلام کی سب سے بڑی مہم یہی تھی کہ وہ اس قوم کو توحید کی دعوت دے کر اس بت کی پوجا چھڑوائیں۔ قرآن حکیم میں اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا گیا ہے:

وَ اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ؕ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ۝ۙ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ۙ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (الصافات:۱۲۳ـ۱۲۸)

ترجمہ اور الیاس بھی پیغمبروں میں سے تھے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں۔ کیا تم بعل کو پکارتے (اور اسے پوجتے ہو) اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو۔ (یعنی) خدا کو جو تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادا کا پروردگار ہے۔ تو ان لوگوں نے ان کو جھٹلا دیا سو وہ (دوزخ میں) حاضر کئے جائیں گے۔ ہاں خدا کے بندگانِ خاص (ہرگز مبتلائے عذاب نہیں ہوں گے)۔

اب آپ ہی اندازہ کریں کہ بنو اسرائیل کی اکثریت کتنی باطل پرست اور ضدی قوم تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہی الیاس علیہ السلام اس قوم کو عقیدہ توحید کا پیغام دے کر بھیجے گئے مگر اس قوم کی اکثریت نے ان کی نافرمانی کی۔ اب آیئے بلادِ عرب پر ایک نظر ڈالیں کہ وہاں عقیدۂ توحید کا کیا حال تھا۔

بلادِ عرب

دین کی تاریخ میں مکہ معظمہ اور اس کے قرب و جوار کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ملت ابراہیمی خالص اللہ جل شانہٗ کی عبادت کرنے کا اعزاز اور مخلص ہونے کی تعریفی سند بھی حاصل کر چکی تھی۔ اور مکہ معظمہ حضرت اسمٰعیل کا وطن مالوف بن چکا تھا۔ مگر وقت نے پھر طویل سفر طے کیا۔ پھر انقلابات زمانہ نے توحید کی اس سرزمین کو بتوں کی پوجا کا مرکز بنا دیا۔ مشہور مصنف کلبی اپنی کتاب "الاصنام" میں لکھتا ہے "ان لوگوں کے بت پتھر کے تراشے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کی ابتدا آس پاس میں یوں ہوئی کہ جو بھی مکہ معظمہ میں آتا تو وہاں سے واپسی میں احتراماً پتھر ساتھ لے جاتا۔ اور پھر یہی پتھر خدا بن گئے۔ بیت اللہ شریف کی طرح وہاں ان کے اردگرد بھی طواف کیا جانے لگا۔ صرف اس لئے کہ یہ پتھر کعبۃ اللہ یا مکہ مکرمہ سے لائے گئے ہیں۔ محبت و عقیدت کے طور پر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ دین جو خالص توحید کا دین تھا اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے انہیں دیا تھا۔ اسے چھوڑ کر بتوں کی پوجا شروع ہو گئی اور بالکل اسی طرح جس طرح نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی سابقہ قوموں نے بت پرستی شروع کر دی تھی انہوں نے بھی شروع کر دی"۔

دین ابراہیم و اسمٰعیل علیہ السلام میں سے اگر کوئی عبادت کے آثار باقی رہ گئے تو وہ صرف بیت اللہ شریف کا طواف تھا۔ باقی سب مٹ چکا تھا لوگوں کے دل و دماغ سے توحید کا تصور نکل چکا تھا۔

سب سے پہلے جس شخص نے مکہ معظمہ میں بت پرستی کا آغاز کیا۔ وہ قبیلہ خزاعہ کا سردار عمرو بن ربیعہ بن لحی تھا۔ وہ ایک طویل مدت تک تپ محرقہ میں جلتا رہا۔ علاج کے سلسلہ میں وہ گھومتے گھماتے ہوئے بت پرستوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ ایک پتھر اس کے جسم سے لگایا گیا جسے وہاں کے لوگ پوجتے تھے۔ بخار کی مدت ختم ہو چکی تھی لہٰذا اتر گیا مگر اس نے اسے خدا مان لیا اور وہاں سے ویسا ہی ایک پتھر ساتھ لے آیا۔ اسے بیت اللہ شریف

میں رکھ دیا اور اس کی پوجا ہونے لگی۔ اس کے بعد بیت اللہ شریف میں ایک [illegible] بت سے بتوں کی تنصیب ہو گئی۔ ان میں سے کچھ تو پتھروں سے تراشے گئے تھے، کچھ لکڑیوں سے بنائے گئے تھے۔ اب ہر قبیلہ کا الگ بت تھا جو اس کا خدا بن چکا تھا۔

(۱) مناۃ: سب سے قدیم یا پہلا بت۔۔۔۔ اسی بت کو پوجنے والے اپنے نام سے [illegible] تھے عبد مناۃ یعنی مناۃ کے غلام یا بندہ، یا زید مناۃ۔ اس پتھر کو دریائے احمر کے ساحل سے نسبت دی جاتی ہے کیونکہ یہ وہیں سے لایا گیا تھا۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے درمیان کے علاقے میں اس کے پجاری [illegible]۔ وہ سب اس پر چڑھاوے چڑھاتے۔ قربانیاں کرتے تھے۔ خصوصاً اوس اور خزرج کے قبیلے اس بت کے [illegible] عقیدت مند تھے۔ وہ حج کے بعد اس وقت تک نہ سر منڈاتے نہ احرام کھولتے جب تک وہ اس بت پر اپنا چڑھاوا [illegible]۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس حوالے سے ان کی عقیدت مندی کی کیفیت اپنے شعر میں یوں بیان کی ہے۔

انی حلفت یمین صدق برۃ

بمناۃ عند محل الی الخزرج

میں نے خزرج کے نصب کردہ بت مناۃ کی قسم کھا کر اس کی تصدیق کی ہے۔

(۲) لات: یہ طائف والوں کا بت تھا۔ جو مربع صورت میں پتھر کا ٹکڑا تھا۔ بنو ثقیف اور بنو عتاب بن مالک نے اس کے اردگرد عمارت بنا دی تھی۔ قریش اور دوسرے عرب بھی اس کی بہت ہی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اس کے پوجنے والے عبد اللات کہلاتے تھے۔ یہی وہ بت ہے جس کے بارے میں عمرو بن اسید لکھتا ہے

فلئی و ترکی وصل کاس لکا لذی

تبرّأ من لات و کان یدینھا

اور میں نے اسے چھوڑ کر اس شخص کا ساتھ دیا جو اس سے پہلے لات کو خدا مان کر اس دین کا دعویدار تھا گویا میں نے توحید کو تھام لیا۔

اور یہ وہی بت ہے جس کو فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان بن حرب اور مغیرہ بن شعبہ کے ذریعہ مسمار کرایا تھا۔

(۳) عزیٰ: یہ بھی لات و منات کے بغل میں نصب کیا گیا تھا۔ اسے ظالم بن اسعد شام میں واقع کھجوروں کے ایک باغ سے لایا تھا۔ اسے بادلوں کا خدا کہا جاتا تھا۔ قریش اور عرب اس پر بھی چڑھاوے چڑھاتے، اس کا طواف کرتے اور منتیں مانتے تھے۔

اس سے نسبت رکھنے والے اپنے آپ کو عبدالعزیٰ کہلاتے تھے۔ مثلاً عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب جو دراصل ابولہب کا نام تھا۔ قریش اس کا طواف کرتے تھے۔ لات، مناۃ اور عزیٰ تینوں کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ وہ بڑے رب سے ان کی سفارش کرتے ہیں۔ بنو شیبان بن جابر بن مرق اور بنو سلیم نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے بارے میں عربوں کے عجیب و غریب عقائد تھے۔ جب خالد بن ولیدؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے توڑنے کا حکم دیا تو خالد بن ولید نے یہ شعر پڑھتے ہوئے اسے توڑا:

یاعز کفرانک لا سبحانک

انی رءایت اللہ قد اہانک

اے عزیٰ! میں کہتا ہوں کہ تو جھوٹا ہے اور تو اللہ پاک کی طرح پاک نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تیری مٹی پلید کر دی ہے۔

لات، منوٰۃ اور عزیٰ تینوں کو عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

سورۂ نجم میں اللہ تعالیٰ انہی بتوں کا ذکر فرماتے ہیں:

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰی O لا وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی O اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَ لَہُ الْاُنْثٰی O تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی O اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ ط سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَھْوَی الْاَنْفُسُ ج وَ لَقَدْ جَآءَھُمْ مِّنْ رَّبِّھِمُ الْھُدٰی O ط (النجم ۱۹۔۲۳)

ترجمہ: بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسرے منات کو (کہ یہ بت کہیں خدا ہو سکتے ہیں) (مشرکو) کیا تمہارے لئے تو بیٹے اور خدا کے لئے بیٹیاں، یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔ وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لئے ہیں خدا نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ لوگ محض ظن (فاسد) اور خواہشات نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔

آیات پر غور فرمایئے۔ یہ لوگ ان بتوں کو خدائے برتر کی جگہ خدا کی بیٹیاں یعنی چہیتیاں مانتے تھے۔ اس لئے عقیدہ میں کسی انسان کو یہ سمجھ لینا کہ یہ اللہ کا چہیتا ہے اس لئے اس کی تعظیم و تکریم اس طرح کی جانے لگے جیسے اللہ جل شانہٗ کی کی جاتی ہے تو یہ بالکل غلط اور عقیدۂ توحید کے منافی ہو گا۔

اسلام کے عقیدۂ توحید کی روشنی میں ذرا غور کیجئے اور عربوں کے اس دور کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ وہ طواف کرتے وقت کہتے تھے:

لَبَّیکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیکَ، لَبَّیکَ لاشریکَ لَکَ یہاں تک تو چلتے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ٹکڑا جوڑتے تھے۔

الاشریک ھولک، تملکہ وما ملک.

ترجمہ: اے اللہ ہم حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہم حاضر ہیں۔ مگر یہ بت تیرے شریک ہیں تو ان کا اور ان کے مملوک کا مالک ہے۔

اسی طرح وہ اپنی عبادت میں اور دعاؤں میں عقیدہ توحید کو بگاڑتے تھے لیکن اس وقت بھی ایک جماعت ایسی تھی جو نہ ان بتوں کو خدا مانتی تھی نہ ہی ان کو اللہ کی ذات میں شریک کرتی تھی۔ بلکہ خالص توحید کی علمبردار تھی۔

زید بن نفیل اپنے اشعار میں کہتے ہیں:

عزلت الات والعزی جمیعا

کذلک یفعل الرجل الصبور

میں نے لات اور عزیٰ سب سے علیحدگی اختیار کر رکھی ہے اور یہ صاحب جرأت یہی کرتا ہے۔

فلا العزیٰ ادین و لا ابنیها

ولا صنمی بنی عمرو ازور

میں نہ بنی عمرو اور ازور کے خداؤں کو مانتا ہوں نہ ہی عزیٰ اور اس کی موہومہ بیٹیوں کو۔

ولکن اعبد الرحمن ربی

لیغفر ذنبی الرب الغفور

میں رحمن کی عبادت کرتا ہوں جو میرا رب ہے تا کہ وہ پروردگار بخشندہ میرے گناہ بخش دے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا اسلامی عقیدہ میں جو بنیادی، اجتماعی اور خصوصی تصور ہے یا ہونا چاہیے اسے قرآن اور حدیث کی روشنی میں پیش کر دیا گیا۔ اللہ ہم سب کے دلوں کو حق اور سچ بات قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین!

فکرِ الہامی اور ذکرِ انسانی

اسلام کا تصورِ توحید

حامد علی خاں

اللہ ہی خالق ہے

کائنات اگر پیدا ہوئی ہے اور یقیناً پیدا ہوئی ہے کیونکہ وہ ازلی و ابدی نہیں ہے تو بہر حال اس کا ایک خالق ہونا چاہیے۔ اسپر ان تمام لوگوں کا اتفاق ہے جو کائنات کی تخلیق کے قائل ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کی مخلوقات نے اس کی تخلیق کی ہے؟ عقل پہلی بات کی شہادت دیتی ہے کیونکہ ایک موجود بالذات ہستی ہی دوسرے کو وجود بخش سکتی ہے۔

بعض مشرکانہ مذاہب کسی عقلی ثبوت کے بغیر اس بات کے قائل ہیں کہ مخلوقات نے کائنات کی تخلیق کی ہے۔ منوسمرتی میں ہے:

> "یہ سب جگت پہلے پرکتی میں لین تھا۔ اس کا کچھ نشان نہ تھا۔ پرماتما کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ اپنے بدن سے ایک قسم کی خلقت پیدا کرنی چاہیے تو اس نے پہلے پانی کو پیدا کیا۔ پھر اس پانی میں بیج ڈالا۔ تب وہ بیج مثل طلا و آفتاب کے بصورت بیضہ بن گیا۔ پھر اس بیضہ سے برہما جو تمام مخلوقات کے پیدا کرنے والے ہیں، آپ سے آپ پیدا ہوئے۔ برہما نے اس انڈے میں ایک برس تک رہ کر اور پرماتما کا دھیان کر کے انڈے کے دو ٹکڑے کیے۔ ان ٹکڑوں سے برہما نے سورگ اور پرتھوی کو بنایا، پھر ان دونوں کے بیچ آکاش، آٹھوں سمت اور ساکن سمندر بنایا۔ پھر برہما نے اپنے قالب کے دو حصے کیے، نصف سے صورتِ مرد اور نصف سے صورتِ عورت ہوئی۔ ان دونوں کے ملانے سے براٹ شخص کو پیدا کیا۔ منوجی کہتے ہیں کہ اس شخص براٹ نے عبادت کر کے جس کو بنایا وہ میں جی ہوں اور میں ہی سب کا پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر میں نے دنیا کو پیدا کرنے کی خواہش میں سخت عبادت کر کے دس رشیوں کو جو پرجاپتی ہیں، پیدا کیا۔ ان رشیوں نے سات پُرجلال منوؤں کو دیوتاؤں کو اور دیوتاؤں کے مقامات یعنی سورگ اور مہاپرتاپی بڑے بڑے رشیوں کو بنایا۔ برہماجی سے جو منو پیدا ہوئے ان کی نسل سے چھ منو اور بھی ہیں۔ ان مہاتجسوی مہاتماؤں نے اپنے اپنے اختیار سے اپنی اپنی خلقت کو پیدا کیا۔" (ادھیائے ۱)

اس اقتباس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق بہت سے ہیں لیکن یہ بالکل واضح نہیں ہوتا کہ کس خالق نے کیا پیدا کیا۔ بہرحال منوسمرتی کی رو سے خدا تنہا خالق نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ صحیح تر تخلیق میں خدا کا برائے نام ہی دخل ہے۔ یہ ایک نقطۂ نظر ہے، دوسرا نقطۂ نظر سوامی دیانند سرسوتی کا ہے، فرماتے ہیں

"اس کائنات کو اس علت فاعلی یعنی پرماتما نے بنایا ہے مگر اس کی علت مادی پرکرتی ہے۔ ایشور، جیو اور کائنات کی علت مادی پرکرتی) یہ تین چیزیں ازلی ہیں"۔ (ستیارتھ پرکاش، باب ۸)

معلوم ہوا کہ تین چیزیں ازلی ہیں، مگر آگے چل کر وہ فرماتے ہیں

"اسی طرح پیدائش عالم سے پیشتر پرمیشور، پرکرتی، کال اور آکاش اور نیز جیو، جو ازلی ہیں، موجود ہوتے ہیں، ان سے دنیا کی پیدائش ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو دنیا نہیں بن سکتی۔"

(ستیارتھ پرکاش باب ۸ صفحہ ۲۳۴، ۲۳۵)

گویا پانچ چیزیں ازلی ہیں جن سے کائنات بنی ہے، مزید فرماتے ہیں

"علت فاعلی دو قسم کی ہے، ایک تمام کائنات علت سے معلول بنانے والا اور مقدم علت فاعلی پرماتما ہے، دوسرا پرمیشور کی کائنات میں سے اشیا کو لے کر کئی طریقے سے مختلف چیزیں بنانے والا عام علت فاعلی جیو ہے"۔ (باب ۸ صفحہ ۲۲)

گویا خدا لاشریک صانع بھی نہیں۔

"کسی معلوم کو ابتدا میں تین (فاعلی مادی یا علت آلی) ضرور ہوتی ہیں جیسے کپڑا بنانے سے پہلے جولاہا، روئی کا سوت اور نلی وغیرہ موجود ہوں تو کپڑا بنا جاتا ہے۔ اسی طرح پیدائش عالم سے پیشتر پرمیشور، پرکرتی۔۔۔ الخ (عبارت مذکورہ بالا باب ۸ صفحہ ۲۳۴)

اس نقطہ نظر میں خدا کو مجبور و محتاج مخلوق پر قیاس کیا گیا ہے۔ سامان اور آلات کے بغیر انسان کچھ نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح خدا بھی نہیں بنا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ازلی و ابدی ماننا تو ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر وجود کا یہ سارا ہنگامہ عدم محض ہو جاتا ہے، اس کے ماسوا اور کسی کو ازلی ماننے کی ضرورت اور نہ اس کا کوئی ثبوت۔ پھر یہ سلسلہ کہیں رکنے میں نہیں آتا۔ تین ازلی وجود مانیے پھر انہیں پانچ کر لیجئے اسی طرح بڑھاتے چلے جایئے اسلام کی رو سے خدا ہر شئے کا خالق ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ (انعام ۱۰۱)

ترجمہ اور (خدا) نے ہر شے کو پیدا کیا"[۸]

یعنی خالق صرف وہ ہے، باقی سب مخلوق ہیں۔

بدیعُ السّموات والارض ۚ واذا قضی امراً فانّما یقول لہٗ کن فیکون O (بقرہ ۱۱۷)

ترجمہ آسمانوں اور زمین کا بدیع (موجد) اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔

"آسمانوں اور زمین کا بدیع" یعنی اس نے کسی ذریعے اور نمونے کے بغیر کائنات بنائی، وہ کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے، یعنی وہ کسی ذریعے یا مادہ کا محتاج نہیں اور وہی تخلیق کے لیے کافی ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کانَ اللہُ ولَمْ یکنْ معَہٗ شئی

ترجمہ اللہ تھا اور اس کے ساتھ کچھ نہ تھا۔

یعنی ازل سے صرف وہ ہے۔ مادہ، روح اور کائنات کی ہر چیز حادث ہے۔

والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئاً وّ ھم یخلقون O (نحل ۲۰)

ترجمہ اور جنہیں وہ (مشرکین) اللہ کے سوا پکارتے (پوجتے) ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں"۔

یعنی جن کو لوگوں نے دیوتا بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی خالق نہیں، سب مخلوق ہیں۔ کائنات میں جو کمال صنعت، غیر معمولی حکمت، جو ہمہ گیر منصوبہ بندی اور جو اعلیٰ نظم و ربط ہے اور ان امور کا اعتراف کرنے پر سائنس کا ہر طالب علم مجبور ہے، وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ کائنات ایک ہی قادر مطلق خلاق کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے۔

اللہ ہی مالک ہے

کائنات اور اس کی ہر شے اللہ کی تخلیق ہے اس لیے وہی کائنات اور اس کی تمام اشیاء کا مالک ہے، نہ کوئی شئے کسی اور کی تخلیق ہے، نہ کوئی کائنات اور اس کی کسی شے کا مالک۔

لِلّٰہِ مَا فِی السَّموٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۭ (بقرہ، ۲۸۴)

ترجمہ اللہ ہی کی ملک ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O (فاتحہ: ۱)

ترجمہ: شکر و ثنا اللہ کے لئے جو رب ہے کائنات کا۔

"رب" مالک، پروردگار اور فرماں روا کو کہتے ہیں۔ اللہ کائنات کا رب ہے۔ اس مفہوم کی آیت سے قرآن مجید کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہی بات قرآن مجید میں بار بار بہت زیادہ دہرائی گئی ہے۔ اللہ کے لیے سب سے زیادہ "رب" ہی کی صفت کا ذکر ہوا ہے۔

مشرکین جن ہستیوں کو پوجتے ہیں ان میں سے کوئی ذرہ برابر چیز کی مالک نہیں ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۚ لَا یَمْلِکُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّموٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ O (سبا ۲۲)

ترجمہ: (اے نبی) کہو جن کو تم اللہ کے سوا (خدا) گمان کرتے ہو انہیں پکار دیکھو، وہ آسمان و زمین میں ذرہ برابر چیز کے مالک نہیں۔

مشرکانہ مذاہب میں اللہ کو واحد یک مالک نہیں مانا جاتا۔ ان کی دیومالا کے مطابق زمین کا دیوتا کوئی ہوتا ہے اور آسمان کا کوئی اور، سورج کا دیوتا کوئی اور ہوتا ہے اور بارش کا کوئی اور۔ یہ بات تمام مشرکانہ مذاہب میں مشترک ہے۔ البتہ ہر مذہب میں الگ الگ دیوتا ہوتے ہیں۔ نئے نئے بنتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ سوامی شردھانند ویدک دیوتاؤں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"ان تین دنیاؤں میں تین سردار دیوتا ہیں۔ ساوتری یا سوریہ (سورج) مادی دنیا کا خدا ہے۔ اندر یا وایو (ہوا) درمیانی خلا کا خدا ہے اور اگنی (آگ) عالم عقل کا خدا ہے۔ یہ تین خدا پھر ضرب پا کر تینتیس (۳۳) بن جاتے ہیں، ہر دنیا میں گیارہ خدا۔ یہ تینتیس (۳۳) دیوتا پھر بڑھ کر تین ہزار تین سو تینتیس دیوتا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ تعداد تینتیس کروڑ تک پہنچ جاتی ہے"۔

(Cultural Hentage of India) P: 9,8)

ان دیوتاؤں کے مالک ہونے کا ثبوت آپ چاہیں تو کوئی ثبوت آپ کو نہ مل سکے گا۔ یہی نہیں آپ ان کے وجود کا پتہ بھی نہ پا سکیں گے۔

اللہ ہی فرماں روا ہے

اللہ کائنات کا خالق ہے اور وہی کائنات کا مالک ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں صحیح ہیں اور ان کے سچ ہونے میں کوئی شبہ نہیں تو پھر یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہی کائنات کا فرماں روا ہے اور اسی کو فرماں روائی کا حق پہنچتا ہے جو اس کائنات کا خالق ہے اسی میں اتنی قدرت ہو سکتی ہے اور ہے کہ وہ اس ناپیدا کنار کائنات کا نظم سنبھال لے اور کائنات کی اعلیٰ تدبیر، اس کا محکم نظم اور اس کی بے مثال منصوبہ بندی اس بات کی شاہد ہیں کہ اس کا انتظام ایک ہی علیم و قدیر ہستی کے مضبوط ہاتھ میں ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (اعراف: ۵۴)

ترجمہ: یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا، پھر تخت (فرمانروائی) پر متمکن ہوا، وہ رات کو دن سے ڈھانپ دیتا ہے کہ دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے اور سورج، چاند اور تاروں کو پیدا کیا وہ سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ سنو! اسی کے لیے ہے تخلیق اور اسی کے لیے حکمرانی ہے۔ بہت خوبیوں اور عظمت و قدرت والا ہے اللہ کائنات کا رب۔

"تختِ فرمانروائی پر متمکن ہوا"۔ یعنی وہ کائنات کو پیدا کر کے نہ گوشہ نشین ہو گیا نہ اسے دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اس نے فرمانروائی کی زمام اپنے ہاتھ میں لی اور کائنات کا نظم فرمانے لگا۔ "سنو! اسی کے لیے ہے تخلیق اور اسی کے لیے ہے حکمرانی"۔ یعنی خالق وہی ہے اس لیے وہی فرمانروا ہے اور فرمانروائی اسی کو زیب دیتی

ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ۝ (سجدہ ۵)

ترجمہ   وہ تدبیر امر (انتظام) فرماتا ہے آسمان سے زمین تک۔

یعنی کائنات کا فرماں روا صرف اللہ ہے اس کے علاوہ یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ ۔۔۔ (اسراء ۱۱۱)

ترجمہ   اس کے اقتدار میں کوئی شریک نہیں، نہ وہ کمزور ہے کہ اس کا کوئی دستگیر ہو۔

یعنی وہ کمزور نہیں ہے کہ کسی کو اپنے اختیارات میں شریک کرے اور اس سے مدد لے۔۔۔۔ خدا کائنات ہی کا نہیں، نوعِ انسان کا بھی مقتدرِ اعلیٰ و فرماں روا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ (الناس ۱ تا ۳)

ترجمہ   کہو! میں پناہ لیتا ہوں انسانوں کے رب کی، انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے خدا کی۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔۔۔۔ (یوسف: ۴۰)

ترجمہ   حکم (حاکمیت) اللہ ہی کے لیے ہے اس کے سوا کسی کے لیے نہیں۔

علم سیاست کی رو سے مقتدرِ اعلیٰ (Sovereign) میں جو اوصاف ناگزیر ہیں وہ سب کے سب خدا میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ کا اقتدار ذاتی ہے، غیر محدود ہے، ناقابلِ انتقال ہے، اس کی دانش بے خطا اور اس کا علم کامل ہے۔ یہ خدا کی صفات ہیں اور ان میں سے کوئی صفت خدا کے علاوہ کسی فرد یا مجموعہ افراد میں نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ ان صفات کے بغیر اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

جن انسانوں کو دنیا میں حکومت کرنے کا موقع ملتا ہے اللہ کے دینے سے ملتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے انہیں تختِ فرمانروائی سے اتار دیتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۝ (آل عمران ۲۶)

ترجمہ: کہو! اے اللہ! اقتدار و بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے حکومت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے۔

انسان کی حیثیت زمین میں مالک و فرماں روا کی نہیں، اللہ کے نائب کی ہے، اللہ نے خلافت بخش کر اس کا امتحان لیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (انعام: ۱۶۵)

ترجمہ   اور وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تمہیں زمین پر (اپنا) خلیفہ (نائب) بنایا اور تم میں سے ایک کا درجہ دوسرے پر بلند کیا تا کہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہیں آزمائے، یقیناً تمہارا رب (باغیوں کے لیے) جلد عذاب دینے والا اور (وفاداروں کے لیے) مغفرت فرمانے والا مہربان ہے۔

مشرکانہ مذاہب میں خدا کو کائنات کا فرمانروا مانا جاتا ہے مگر لاشریک فرمانروا نہیں، زمین سے آسمان تک

بے شمار دیوتا ہوتے ہیں جو کائنات کے مختلف حصوں کے فرماں روا سمجھے جاتے ہیں اور ان کی فرمانروائی سے خدا کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ ڈاکٹر جادوناتھ سنہا فرماتے ہیں:

"وید مذہبی فکر کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فطرت کے عظیم و برتر، خوب صورت اور نفع بخش پہلوؤں کو شخصی اور مجسم خیال کر لیا گیا اور انہیں دیوتا قرار دے دیا گیا۔۔۔ یہ دیوتا ہیں جو فطرت کے مختلف مظاہر پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ فطرت سے متمیز نہیں ہیں۔ یہ مؤثر فوق الفطری ہستیاں ہیں جو فطرت کے مظاہر پر حکمراں ہیں"۔

(A history of Indian Philosophy Vol-I, P 1)

سوامی شروانند کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ حوالے کے آخر میں وہ فرماتے ہیں

"یہ تینتیس (۳۳) دیوتا پھر بڑھ کر تین ہزار تین سو انتالیس دیوتا بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم رگ وید میں پڑھتے ہیں، اس کے بعد یہ تعداد بڑھ کر تینتیس کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔ جس سے مطلق یہ ہیں کہ دیوتاؤں کی بے شمار تعداد زندگی اور فطرت دونوں پر حکومت کر رہی ہے"۔

(The cultural Heritage of India) P B 9)

دیوتاؤں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور ان کے حدود اقتدار گڈمڈ ہوتے جاتے ہیں۔ پھر ان خداؤں کی آپس میں ہولناک جنگیں ہوتی ہیں جن کی تفصیلات سے ہر مشرکانہ مذہب کی دیومالا پر ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کچھ اور دیوتا ہوتے اور ان کے ہاتھ میں کائنات کا نظم ہوتا تو ان کے اختلافات سے نظام کائنات درہم برہم ہو جاتا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَO(الانبیاء ۲۲)

ترجمہ اگر اُن (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو زمین و آسمان تباہ ہو جاتے پاک و برتر ہے اللہ تخت فرماں روائی کا مالک اس شرک سے جو یہ کہتے ہیں۔

اللہ ہی پروردگار ہے

اللہ نے کائنات کو پیدا کیا ہے، وہی ہر چیز کا مالک ہے، وہی کائنات کا منتظم و فرماں روا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں تو یہ بات بھی صحیح ہے کہ اللہ ہی ہر شے کا پالنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی پالنے والا نہیں، کوئی پالنہار نہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَO(جاثیہ۔۳۶)

ترجمہ: تو اللہ ہی کے لیے حمد ہے جو آسمانوں کا رب، زمین کا رب، کائنات کا رب ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہے خدا کا پیدا کیا ہوا اور اسی کی ملک ہے، اس لیے جس کسی کو جو کچھ ملتا ہے اسی کے دینے سے ملتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝ۙ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ (بقرہ ۲۱_۲۲)

ترجمہ: اے انسانو! اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا، اور تم سے پہلے کے لوگوں کو بھی۔ امید ہے کہ تم تقویٰ اختیار کرو گے۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے پھلوں کو پیدا کیا اور انہیں تمہارا رزق بنایا تو تم اللہ کی (ربوبیت) میں کسی کو شریک نہ بناؤ جانتے بوجھتے۔

اللہ کائنات کا نظم چلا رہا ہے اور اس نے یہ نظام اس طرح بنایا ہے کہ اس سے انسان کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ۝ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ۝ۚ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ (ابراہیم ۳۲_۳۴)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے پھل پیدا کیے اور انہیں تمہارا رزق بنایا اور جہاز کو تمہاری منفعت کے لیے مسخر کیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے رواں دواں ہو اور تمہاری منفعت کے لیے دریاؤں کو مسخر کیا اور سورج اور چاند کو تمہاری منفعت کے لئے مسخر کیا جو مسلسل اپنے کام میں لگے ہیں اور رات اور دن کو تمہاری منفعت کے لیے مسخر کیا اور تمہیں وہ سب کچھ بخشا جو تم نے مانگا اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔

اللہ ہی ہے جو انسان کو سامانِ زیست فراہم کرتا ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ ..... (یونس ۳۱)

ترجمہ: پوچھو! کون ہے جو تمہیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے۔ اور کون ہے جو (کائنات) کا نظم چلاتا ہے وہ یقیناً کہیں گے، اللہ۔

رزق کی کمی بیشی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّىْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ۝ (سبا ۳۶)

ترجمہ: کہو! یقیناً میرا رب جس کو چاہتا ہے، رزق کشادہ فرماتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے۔

دولت و خوش حالی وہی دیتا ہے:

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى ۝ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۝ (نجم ۴۸، ۴۹)

ترجمہ: اور بے شک اسی (خدا ہی) نے دولت بخشی اور سرمایہ والا بنایا اور یقیناً وہی شعریٰ کا رب ہے۔

عرب کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ شعریٰ ستارے کے طلوع سے زرخیزی و خوش حالی وابستہ ہے جس طرح ہندوستان کے مشرکانہ عقیدہ رکھنے والے ستاروں اور نچھتروں کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ

دولت و خوش حالی اللہ کے ہاتھ میں ہے جو کائنات کا اور خود شعری کا مالک ہے۔ ستاروں اور نچھتروں کے ہاتھ میں نہیں۔ اگر وہ نہ دے تو سامان زیست بخشنے والا کوئی نہیں۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ (ملک: ۲۱)

ترجمہ یا کون ہے جو تمہیں رزق دے گا اگر وہ (خدا) اپنا رزق روک لے۔

بارش، جس سے زندگی و زرخیزی وابستہ ہے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ ○ (انعام ۹۹)

ترجمہ: اور وہ (خدا) وہ ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا تو ہم (خدا) نے اس سے ہر چیز کی روئیدگی و سرسبزی پیدا کی۔

زمین میں پانی کے ذخیرے اسی نے بنائے جن سے نباتات کی زندگی وابستہ ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ○ (زمر ۲۱)

ترجمہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا تو اسے چشموں اور سوتوں کی شکل میں زمین میں رواں دواں کر دیا پھر اس سے وہ رنگ برنگی کھیتی پیدا کرتا ہے۔

عزت اور حکومت بھی وہی بخشتا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ؕ (آل عمران:۲۶)

ترجمہ کہو! اے اللہ! حکومت و فرماں روائی کے مالک! تو جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے، تمام نعمتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔

اولاد بھی وہی دیتا ہے:

یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ؕ (شوریٰ: ۴۹،۵۰)

ترجمہ وہ (خدا) جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے یا انہیں لڑکے اور لڑکیاں دونوں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔

صحت و تندرستی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے:

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ○ (شعرا: ۸۱)

ترجمہ: اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے۔

علم کا سرچشمہ بھی وہی ہے، جسے جو کچھ علم ملتا ہے اسی سے ملتا ہے۔

اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ○ (احقاف:۲۳)

ترجمہ: علم تو صرف اللہ کے پاس ہے۔

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ۝ (علق: ۵)

ترجمہ: اس (خدا) نے انسان کو سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔

غرض انسان کے پاس جو نعمت بھی ہے اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔

وَ مَابِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۝ (نحل: ۵۳)

ترجمہ: تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے، اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

اسلام کے عقیدے کے برعکس مشرکانہ مذاہب میں خالق کوئی ہوتا ہے، پروردگار کوئی، دولت کسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے بارش کسی اور کے ہاتھ میں، خوش حالی و زرخیزی کا دیوتا کوئی اور ہوتا ہے، اولاد اور صحت کا کوئی اور، غرض جتنے کام اور جتنی ضرورتیں اتنے ہی دیوتا۔ ہندومت کی رو سے کائنات کا خالق برہما ہے۔ ہلاکت کا دیوتا شیو ہے اور پالنہار وشنو، دولت کی دیوی لکشمی ہے۔ بارش کا دیوتا اندر ہے اور علم کی دیوی سرسوتی۔ اس طرح وشنو کو پالنہار ماننے کے باوجود ہر ضرورت کے لیے الگ الگ دیوتا ہیں۔ منوسمرتی میں ان سب سے الگ ہے:

"برہما جی سے جو منو پیدا ہوئے ان کی نسل میں چھ منو اور بھی ہیں۔ ان مہا تیجسوی مہاتماؤں نے اپنے اپنے اختیار سے اپنی اپنی خلقت کو پیدا کیا، ان کے نام یہ ہیں سواروچش، اوتم، تامس، ریوت، چاکشش، ویوسوت، سوایمبھو وغیرہ۔ ساتوں منو جو بڑے تیجوان ہیں، وہ اپنے اپنے اختیار سے تمام مخلوقات ساکن و متحرک کو پیدا کر کے پالنے لگے۔"

(ادھیائے: ا۔۶۲، ۶۳)

گویا بہت سے خالق ہیں اور وہ سب کے سب پروردگار ہیں۔

اللہ ہی حاجت روا ہے

اللہ خالق ہے، وہی مالک ہے، وہی فرماں روا ہے، وہی پروردگار ہے اور سب کچھ اسی کے پاس ہے، اس لئے وہی حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ (نمل: ۶۲)

ترجمہ: یا کون ہے جو مصیبت زدہ (کی پکار) کا جواب دیتا ہے، اور مصیبت دور کر دیتا ہے اور تمہیں زمین میں (اپنا) خلیفہ بناتا ہے؟ کیا ہے کوئی اور خدا اللہ کے ساتھ؟

اللہ کے سوا سب بندے اور اللہ کے محتاج ہیں، اس لیے حاجت روائی اللہ ہی کر سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (اعراف: ۱۹۴)

ترجمہ: اللہ کے سوا جنہیں تم پکارتے (اور پوجتے) ہو وہ سب کے سب تمہیں جیسے (اللہ کے) بندے (اور محتاج) ہیں تو تم انہیں پکار کر دیکھو وہ تمہاری پکار پر لبیک کہیں اگر تم سچے ہو۔

جو مخلوق ہیں، خالق نہیں، وہ اپنی زندگی تک کے لیے خدا کے محتاج ہیں۔ وہ تمہاری کیا، خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔

اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ ۝ وَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَآ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ۝ (اعراف: ۱۹۱، ۱۹۲)

ترجمہ: کیا (خدا کے ساتھ) ان کو شریک کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود ہی پیدا کیے جاتے ہیں، وہ ان (پرستاروں) کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی۔

خدا تک اپنی آواز کو پہنچانے کے لیے کسی واسطے یا سفارش کی ضرورت نہیں، وہ ہر انسان سے قریب ہے اور خود ہر ایک کی دعا سنتا اور خود ہی حاجت روائی کرتا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۝ (بقرہ ۱۸۶)

ترجمہ: اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو بے شک میں (ان سے) قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔

اس کے برعکس فرضی معبودوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ کون انہیں پکار رہا ہے۔

وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (احقاف: ۵)

ترجمہ: اور ان سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے سوا ایسے معبودوں کو پکارتے ہیں جو قیامت تک ان کی پکار پر لبیک نہیں کہہ سکتے، وہ تو ان کی دعا سے بے خبر ہیں۔

اللہ کے سوا دوسرے فرضی معبودوں کو پکارنے کا کوئی حاصل نہیں۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۝ (رعد ۱۴)

ترجمہ: اللہ ہی کی پکار حق ہے، اس کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی پکار پر ذرا بھی لبیک نہیں کہہ سکتے مگر اتنا ہی جیسے کوئی شخص پانی کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے کہ پانی اس کے منہ میں پہنچ جائے، لیکن پانی اس کے منہ میں پہنچنے کا نہیں، اور کافروں کی دعا تو اکارت ہی جاتی ہے۔

رہے بت تو ان کی طرف حاجت روائی کے لیے رجوع کرنا تو حماقت کے سوا کچھ نہیں

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ (حج ۷۳)

ترجمہ: اللہ کے سوا تم جنہیں پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سب اس کے لیے جمع ہو کر زور لگا لیں اور اگر مکھی ان (کے چڑھاوے میں) سے کچھ چھین لے تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔

مختصر یہ کہ کائنات میں جو کچھ ہے، اللہ کا ہے، اسی کے پاس زمین و آسمان کے خزانے ہیں۔

وَ لِلّٰهِ خَزَآىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۝ (منافقون: ۷)

ترجمہ اور اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے۔

یہ ہے اسلام کا نقطۂ نظر۔ اس کے برخلاف مشرکانہ مذاہب میں بے شمار حاجت روا و فرمانروا ہوتے ہیں۔ خیالی و فرضی دیوتاؤں کا تصور تخلیق ہوتا ہے جسے حاجت روائی کے لیے گھڑ لیا جاتا ہے۔ سورج، چاند، تارے، آسمان، زمین، دریا، پہاڑ، جانور، سانپ، بچھو، درخت، پیر، فقیر، قبر، استھان، بُت، سادھو، غرض دنیا کی ہر چھوٹی بڑی اور حقیر و ذلیل شے کے ہاتھ میں انسان کی قسمت ہوتی ہے اور وہ ان سے ڈرتا، حاجت روائی کے لیے ان کی طرف رجوع کرتا ہے، ان کے آگے ہاتھ جوڑتا، منت سے ان کے سامنے ناک رگڑتا ہے، آہ انسان کی قسمت!

اللہ ہی خدا ہے

خدا یا معبود کسی ہستی کو کہتے ہیں جو

- فوق الفطری طاقت کا مالک ہو۔
- کائنات یا اس کے کسی حصہ کا نظم اس کے ہاتھ میں ہو۔
- حاجت روا اور مشکل کشا ہو۔
- اس سے دعائیں مانگی جاتی ہوں۔
- پرستش و بندگی کا مستحق ہو۔
- معبود یا الٰہ کے مفہوم کے ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے اللہ ہی خدا ہے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؕ (نساء:۸۷)

ترجمہ: اللہ ہی خدا ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

اللہ خالق ہے، باقی سب مخلوق اور محتاج و بے بس ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخلوق و محتاج خدا نہیں ہو سکتا۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِہٖ فَتَشَابَہَ الْخَلْقُ عَلَیْھِمْ ؕ قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ ھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ○ (رعد ۱۶)

ترجمہ یا کیا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنہوں نے خدا کی طرح تخلیق کی ہے تو تخلیق ان پر مشتبہ ہو گئی۔ کہو اللہ ہر شے کا خالق ہے اور وہ واحد خدا ہے، ہر ایک پر کنٹرول کرنے والا۔ ہر چیز اللہ کی مملوک اور تابع فرمان ہے۔

وَ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ ○ (روم ۲۶)

ترجمہ اسی کی ملکیت میں ہیں آسمانوں اور زمین کی ساری ہستیاں، ہر ایک اسی کے تابع ہیں۔

اور مملوک و محکوم مالک و خدا نہیں بن سکتا۔

ضَرَبَ لَکُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ ؕ ھَلْ لَّکُمْ مِّنْ مَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِّنْ شُرَکَآءَ فِیْ مَا رَزَقْنٰکُمْ فَاَنْتُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَھُمْ کَخِیْفَتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ ؕ (روم ۲۸)

ترجمہ اللہ نے تمہارے (سمجھانے کے) لیے ایک مثال دی ہے خود تمہاری ذات کی، کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی ان چیزوں میں جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں تمہارا شریک ہوتا ہے کہ وہ اور تم ان میں برابر ہو

اور ان سے اس طرح ڈرتے ہو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے ڈرتے ہو۔

اللہ کائنات کا فرماں روا ہے، اس کے سوا کائنات کے نظم میں کسی کو دخل نہیں۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ؕ (زمر۔۴۴)

ترجمہ: اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی فرماں روائی۔

اللہ ہی کے ہاتھ میں زمین و آسمان کے خزانے ہیں، اس لیے وہی حاجت روا ہے

لَهُ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ؕ (زمر:۶۳)

(اسی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین (کے خزانوں) کی کنجیاں ہیں)۔

ذاتی زندگی اسی کی ہے، دوسروں کی زندگی، اسی کے سہارے قائم ہے۔ اس لیے وہی خدا ہے۔

اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ (بقرہ:۲۵۵)

ترجمہ اللہ ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ (بذاتِ خود) زندہ ہے، قیوم ہے (کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے)۔

آسمان ہو یا زمین، ہر جگہ ایک ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ (زخرف ۸۴)

ترجمہ اور وہ (اللہ) وہ ہے جو آسمانوں میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے۔

لوگوں نے خداؤں اور دیوتاؤں کی جو لمبی چوڑی فہرست تیار کر رکھی ہے وہ وہم و تخیل کی کارسازی ہے، یہ حقیقی ہستیاں نہیں ہیں اور ہیں تو خدا نہیں ہیں:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (یوسف ۴۰)

ترجمہ اللہ کے سوا جنھیں تم معبود بناتے ہو وہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان (کی خدائی) کی کوئی سند نہیں اتاری۔

کائنات کے چپہ چپہ پر اللہ کی نظر ہے مگر خدا تک کو معلوم نہیں کہ اس کا کوئی شریک بھی ہے:

قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ (یونس:۱۸)

ترجمہ۔ کہو کیا تم اللہ کو ایسی ہستیوں کا پتہ دے سکتے ہو جن کے آسمانوں اور زمین میں موجود ہونے کا خدا تک کو علم نہیں، پاک و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔

انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، اس کا سر خدا کے آگے تو جھکنا چاہیے:

وَ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ○ (جن ۱۸)

ترجمہ: اور یہ کہ سجدے (سب کے سب) اللہ کے لیے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔

سجدہ مخلوقات کو نہیں، مخلوقات کے خالق کو کرنا چاہیے:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ ۝ (حٰمٓ سجدہ: ۳۷)

ترجمہ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔

انسان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں۔ اس لیے اسے اللہ ہی کی بندگی کرنی چاہیے یہی اس کا حکم ہے:

وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۝ (اسراء:۲۳)

ترجمہ اور تمہارے رب نے قطعی حکم دیا ہے کہ اس کی بندگی کرو اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

مشرکانہ مذاہب میں خداؤں کی کمی نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے آسمان تک دیوتا ہی دیوتا ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی چیز دیوتا بنائی جاتی ہے اور مشرک انسان بے تامل اس کے آگے سر جھکا دیتا ہے حتی کہ خود اپنے ہاتھ سے بت تراشتا ہے اور خود ہی ان مجبور و بے بس پتھر کے ٹکڑوں کو خدا سمجھ کر ان کے آگے سربسجود ہو جاتا ہے۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ (صافات ۹۵)

ترجمہ: (ابراہیم نے) کہا کیا تم پوجتے ہو انہیں جن کو خود گھڑتے ہو؟

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (اعراف:۱۹۵)

ترجمہ کیا ان (بتوں) کے پیر ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہوں یا آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟

ہاتھ ہی سے نہیں، انسان نے اپنے وہم و خیال سے بھی بے شمار دیوتا گھڑ لیے۔ ان کے نام قوتیں، اختیارات، معجزانہ کرشمے، زندگی کے حالات شکلیں، سب تصنیف کر ڈالیں اور پھر پورے اطمینانِ قلب اور خشوع کے ساتھ اپنی خیالی مخلوقات کو پوجنے لگا۔ ڈاکٹر جادوناتھ سنہا ویدک دیوتاؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "فطرت کی عظیم و برتر، خوبصورت اور نفع بخش پہلوؤں کو شخصی اور مجسم خیال کیا گیا اور انہیں دیوتا قرار دے دیا گیا۔ یہ مظاہر فطرت نہیں ہیں، یہ مؤثر فوق الفطری ہستیاں ہیں جو مظاہر فطرت پر حکمران ہیں۔ انہیں بھجن، پوجا پاٹ، چڑھاوے، نذر و نیاز اور قربانی سے بہ آسانی خوش کیا جا سکتا ہے۔ یہ دنیوی خوشحالی، دانائی اور اخلاقی اوصاف بخشتے ہیں۔ جنگوں میں ان سے فتح ملتی ہے، یہ دولت، طویل عمر، بیٹے پوتے اور مسرت دیتے ہیں (ان دیوتاؤں میں) آگ کا دیوتا (اَگنی) ہے۔ سورج (سوریہ) ہے۔ پو (اوشا) ہے، زمین (پرتھوی) ہے، آسمان (دیاؤس) ہے، روشن آسمان اور دن (مترا) ہے، تاریک آسمان اور رات (وَرُن) ہے، برسنے والا بادل (پرجنیہ) ہے، طوفان (ماروت) ہے، ہوا (وایو، وات) ہے، صبح کا سورج (ساوتری) ہے، یہ اور اسی طرح کے دوسرے دیوتاؤں

کی (ویدوں میں) نشان دہی کی گئی ہے"۔

(A History of Indian Philosophy vol 1 P P 1,2)

سوامی وویکانند "ویدوں کا ہندومت" کے زیر عنوان فرماتے ہیں

> "ویدوں کے بالکل آغاز میں ہی ہم بہت سے خدا تصور پاتے ہیں۔ یہ منتر بہت سے دیوتاؤں کی شان میں گائے گئے ہیں۔ دیوتا انہیں دیو درخشاں ہستی کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد بہت ہے ایک کا نام اندر ہے دوسرے کا نام ورن، ایک اور مترا ہے، پرجاپتی ہے اور اسی طرح اور متعدد دیومالائی و مجازی صورتیں ایک دوسرے کے بعد دیگرے ابھرتی ہیں"۔

(Hinduism) P 19

یہ لے یہاں تک بڑھتی ہے کہ حقیر و ذلیل چیزیں بھی خدا بنا لی جاتی ہیں۔ مردانہ اور زنانہ اعضائے تناسل کی پرستش مذہب کا جزو بن جاتی ہے اور اعضا کی فوق الفطری قوتوں اور معجزانہ کارناموں کی داستانیں تک تصنیف ہو جاتی ہیں۔[1] حقیقت یہ ہے کہ شرک میں مبتلا ہونے کے بعد انسان جہالت، وہم پرستی اور ذلت کے عمیق گڑھے میں گر جاتا ہے اور اس کی گراوٹ کسی حد پر نہیں رکتی۔

وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (حج ۳۱)

ترجمہ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ (دوسروں کو) شریک کرے تو گویا وہ آسمان سے گرا تو یا تو پرندے اسے اچک لے جائیں گے یا آندھی اسے دور دراز اور گہری جگہ میں پھینک دے گی۔

اللہ ہی قانون دینے والا ہے

اللہ کائنات کا اور انسان کا مالک و فرمانروا ہے اس لیے اسے انسان کو حکم دینے اور اس کے لیے قانون بنانے کا حق ہے اس کے سوا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (یوسف ۴۰)

ترجمہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے کسی اور کے لیے نہیں اس نے حکم دیا ہے کہ اس کی بندگی کرو، کسی اور کی نہ کرو۔

عبادت یا بندگی کے مفہوم میں پرستش و غلامی دونوں داخل ہیں۔ اللہ کی پرستش بھی کرنی ہے اور اس کا بندہ بن کر بھی رہنا ہے۔ بندہ و غلام کا کام یہ ہے کہ مالک کی مرضی پر چلے، اس کا حکم مانے اور کسی کا حکم نہ مانے۔ گویا خود اللہ کی عبادت کے اندر یہ مفہوم شامل ہے کہ اللہ ہی کا قانون صحیح ہے جس کی انسان کو پیروی کرنی چاہیے۔ باقی سارے قوانین غلط ہیں۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (اعراف ۳)

ترجمہ تمہارے رب کی طرف سے جو (قانون) اترا ہے اس کی پیروی کرو، اس کے سوا دوسرے کارسازوں

(خداوں) کی پیروی نہ کرو۔

گویا خدا کی اطاعت سے بے نیاز ہو کر کسی قانون کو ماننا اور اس کی پیروی کرنا شرک ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ (شوریٰ ۲۱)

ترجمہ   یا کیا ان کے لیے (خدا کی خدائی میں) کچھ شریک ہیں جنہوں نے تمہارے لیے وہ دین بنایا جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔

زمین کی نعمتیں اللہ نے بنائی ہیں اور انسان کے لیے بنائی ہیں، اللہ تو ان نعمتوں کے استعمال کے سلسلے میں پابندی لگا سکتا ہے اور یہ بھی بتا سکتا ہے کہ کون سی چیز قابلِ استعمال نہیں ہے، اس کے سوا کسی کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ انسان پر اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر پابندی لگائے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ (اعراف:۳۲)

ترجمہ   (اے نبی!) کہو کس نے اللہ کی زینت کو حرام کر دیا جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھی اور کس نے (خدا کی بخشی ہوئی) پاک چیزوں کو حرام کر دیا۔

قرآن نے یہود و نصاریٰ کی فردِ جرم سناتے ہوئے کہا

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰــهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (توبہ ۳۱)

ترجمہ   انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی۔ حالانکہ انہیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، پاک ہے وہ اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔

عدی بن حاتمؓ نے جو مسیحیت سے اسلام لائے تھے، اس آیت کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، ہم نے علماء و مشائخ کی کبھی پرستش نہیں کی۔ آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے جسے حلال قرار دیا تم نے اسے حلال سمجھا اور جسے انہوں نے حرام قرار دیا تم نے بھی اسے حرام سمجھ لیا۔ انہوں نے کہا، ایسا تو ہے، آپ نے فرمایا بس یہی انہیں رب بنانا ہے۔ (ترمذی) حقیقت یہ ہے کہ کسی کو قانون سازی کا حق دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے مقتدرِ اعلیٰ مان لیا اور خدا کے علاوہ کسی کو مقتدرِ اعلیٰ (sovereign) ماننا شرک ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ ءٰۗللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَي اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ (یونس: ۵۹)

ترجمہ   (اے نبی!) کہو، ذرا بتاؤ تو اللہ نے تمہارے لیے جو سامانِ زیست اتارا تم نے اس میں سے کچھ کو حرام قرار دیا اور کچھ کو حلال، کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو؟

البتہ جو قانون سازی خدا کو قانون ساز مان کر اس کے قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے اس کے قانون کے تحت ہو، وہ شرک کی تعریف میں نہیں آتی اور جائز ہے کیونکہ اس کی حیثیت قانونِ الٰہی کی تشریح یا انطباق کی ہے۔

مشرکانہ مذاہب ہوں یا ملحدانہ اور لادین نظام ہائے حیات ان سب میں انسان کو مقتدر اعلیٰ اور قانون ساز تسلیم کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے۔

زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے

اللہ خالق، مالک، فرماں روا، پروردگار اور خدا ہے اور ان صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں، اگر یہ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے، تو اس میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں کہ زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں۔

اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ○ (اعراف ۱۵۸)

ترجمہ اللہ وہ ہے جس کے لیے فرماں روائی آسمانوں اور زمین کی، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔

موت کا وقت مقرر ہے اور وہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آ سکتی۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ (آل عمران ۱۴۵)

ترجمہ اور کسی شخص کو موت نہیں آ سکتی جب تک اللہ کا حکم نہ ہو، یہ موت ایک مقدر شے ہے جس کا وقت مقرر ہے۔

انسان اللہ تعالیٰ سے بغاوت کی جرأت کرتا ہے حالانکہ اس کی زندگی اور موت دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ۚ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (البقرہ: ۲۸)

ترجمہ تم اللہ کی اطاعت سے کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم معدوم تھے تو اس نے تمہیں زندگی بخشی پھر وہ تمہیں موت دے گا، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

توحید کا یہ تصور اگر ذہن میں بیٹھ جائے تو انسان کی طاقت ناقابل تسخیر ہو جاتی ہے وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے، اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ○ (آل عمران ۱۷۳)

ترجمہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے (اوپر حملہ کرنے کے) لیے (بہت ساز و سامان) جمع کیا ہے تو تم ان سے ڈرو تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

اسکے برعکس شرک انسان کو بزدل بناتا ہے، مشرک دنیا کی چھوٹی بڑی ہر چیز ہی سے نہیں، وہمی و خیالی چیزوں سے بھی ڈرتا ہے۔ موت اسے ہر طرف ناچتی نظر آتی ہے۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ

سُلْطٰنًا ۚ (آل عمران ۱۵۱)

ترجمہ: ہم اہل کفر کے دلوں میں خوف پیدا کر دیں گے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک بنا لیا ہے جن کی (خدائی) کی سند اللہ نے نہیں اتاری۔

نفع اور نقصان اللہ کے ہاتھ میں ہے

اللہ کے مالک، فرماں روا، پروردگار، حاجت روا اور خدا ہونے کا کھلا مطلب یہ ہے کہ نفع اور نقصان سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، کسی اور کے ہاتھ میں نہیں۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ (مائدہ ۷۶)

ترجمہ: کہو کیا اللہ کے سوا تم ایسی ہستیوں کی بندگی کرتے ہو جن کے ہاتھ میں تمہارا نفع نقصان کچھ بھی نہیں ہے۔

ان معبودان باطل کے ہاتھ میں اپنا نفع و نقصان بھی نہیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝ (فرقان:۳)

ترجمہ: اور انہوں نے اللہ کے سوا (دوسرے) خدا بنا رکھے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں اپنا نفع و نقصان بھی نہیں ہے، نہ موت، زندگی اور دوبارہ اٹھایا جانا ان کے بس میں ہے۔

انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر اللہ کا مقرب بندہ اور کون ہو سکتا ہے، مگر وہ بھی کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ سردار انبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کہلوایا گیا:

قُلْ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ (جن:۲۱)

ترجمہ: (اے نبی!) کہو میرے ہاتھ میں تمہارا نفع ہے نہ نقصان۔

اپنا نفع و نقصان بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے:

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ (اعراف.۱۸۸)

ترجمہ: کہو! میرے اختیار میں میرا نفع ہے نہ نقصان، بجز اس کے جو اللہ چاہے (کہ وہی ہو گا)۔

اللہ مصیبت دے تو کوئی اور دور کرنے والا نہیں اور نعمت دے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ (یونس:۱۰۷)

ترجمہ: اور اگر وہ تمہیں کوئی مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس دور کر سکے اور اگر وہ کوئی نعمت دینا چاہے تو اس کی بخشش کو کوئی ہٹانے والا نہیں۔

اللہ کی گرفت سے کوئی بچانے والا نہیں، سرور انبیاء کی زبانی کہلوایا گیا:

قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ (جن.۲۲)

ترجمہ (اے نبی!) کہو! بے شک مجھے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا نہیں اور اس کے سوا میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔

جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

وَاِذَا سَاَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰهَ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَنْفَعُوْكَ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكَ وَلَوِاجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَضُرُّوْكَ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ

ترجمہ: اور جب مانگو تو اللہ سے مانگو اور مدد چاہو تو اللہ سے چاہو اور یقین رکھو کہ اگر سب لوگ مل کر تمہیں کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں تو ہرگز نہ پہنچا سکیں کے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے حق میں لکھ دیا ہے اور اگر سارے لوگ اکٹھا ہو کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں کے مگر جتنا کہ اللہ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے۔

اس لیے مومن کو صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے، کسی اور سے نہیں۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران ۱۷۵)

ترجمہ یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو خوف میں مبتلا رکھتا ہے تو تم ان (شیطان کے دوستوں) سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

یعنی مومن اللہ سے ڈرتا ہے اور کسی سے نہیں ڈرتا، اس کے برعکس شیطان کے فریب میں آ کر شرک کرنے والا ہر چیز سے ڈرتا ہے اور مستقل طور پر خوف کا شکار رہتا ہے۔

اللہ ہی عالم کل ہے

اللہ نے دنیا میں ہر شئے کو پیدا کیا ہے، اس لے وہ ہر شئے کو جانتا ہے

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○ (ملک ۱۳، ۱۴)

ترجمہ: اور تم بات آہستہ سے کرو یا زور سے (وہ سب سنتا ہے) یقیناً وہ دل کے ارادوں سے باخبر ہے، کیا نہ جانے گا وہ جس نے پیدا کیا اور وہ باریک بین اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

اللہ کا اقتدار کائنات کی ایک ایک شئے پر ہے، اس لیے اس کے علم سے کوئی شئے مخفی نہیں، وہ نہ سوتا ہے، نہ تھکتا ہے کہ نظم حکومت میں خلل پڑے یا کوئی چیز نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ (بقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ اللہ ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، زندہ ہے، قیوم (کائنات کو سنبھالے ہوئے) ہے اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند، اسی کی ملکیت میں ہیں زمین و آسمان کی تمام چیزیں، کون ہے جو اس کے حضور سفارش کرے، اسکی اجازت کے بغیر وہ جانتا ہے ان تمام چیزوں کو جو ان کے سامنے ہیں اور انہیں بھی جو ان

کے پیچھے ہیں اور وہ اللہ کے علم میں سے کچھ بھی نہیں پا سکتے مگر جتنا اللہ چاہے۔ اس کی کرسی (اقتدار) آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے اور وہ اس کی نگہبانی سے نہیں تھکتا وہ بلند اور صاحب عظمت و کبریائی ہے۔ وہی سب کی پرورش کرتا ہے، ضروریات پوری کرتا ہے اس لیے وہ سب کچھ جانتا ہے۔

و ما من دابة في الارض الا على الله رزقها و يعلم مستقرها ومستودعها ؕ كُلٌّ فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ O (ہود ۲)

ترجمہ: زمین پر جو بھی چلنے والا ہے۔ اللہ کے ذمے اس کا سامانِ زیست ہے اور وہ اس کے مستقل اور عارضی ٹھکانے کو جانتا ہے سب کچھ (اللہ کے) واضح ریکارڈ میں ہے۔

انسانیت محدود ہے ان کا علم بہت تھوڑا ہے، کائنات کی بے شمار اشیاء ان کے حواس اور علم سے ماوراء ہیں، یہ ان کے لیے غیب کی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں صرف خدا جانتا ہے۔

و عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الغَيْبِ لا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي البَرِّ وَ البَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الاَرْضِ وَ لا رَطْبٍ وَّ لا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ O (انعام ۵۹)

ترجمہ: اور اس کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں انہیں کوئی نہیں جانتا مگر صرف وہ۔ وہ خشکی اور تری کی ہر شے کو جانتا ہے، جو پتہ بھی گرتا ہے اسے جانتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ گرتا ہے اور جو تر یا خشک چیز گرتی ہے وہ سب (اللہ کے) واضح ریکارڈ میں ہے۔

علم غیب انبیاء کو بھی حاصل نہیں، سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کہلایا گیا:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الغَيْبَ وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ (انعام ۵۰)

ترجمہ: (اے نبی!) کہو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔

وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الخَيْرِ ۚ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ (اعراف ۱۸۸)

ترجمہ: اور اگر میں غیب کا علم رکھتا ہوتا تو بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

علم غیب کی چند خاص باتوں کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ O (لقمٰن ۳۴)

ترجمہ: یقیناً اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل فرماتا ہے، ماں کے پیٹ میں کیا ہے، اسے بھی جانتا ہے، کسی شخص کو نہیں معلوم کہ وہ کل کیا کرے گا اور نہ یہ معلوم کہ کس سرزمین میں اسے موت آئے گی۔ یقیناً اللہ علیم و خبیر ہے (سب کچھ جانتا ہے)۔

صحیح بخاری میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا:

مَنْ اَخْبَرَكَ اَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَعْلَمُ الخَمْسَ الَّتِيْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الْاٰيَةَ فَقَدْ اَعْظَمَ الفِرْيَةَ ۔

ترجمہ جو شخص تم سے یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ پانچ چیزیں جانتے تھے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے انّ اللہَ عِندَہٗ عِلمُ السّاعۃ (مذکورہ بالا آیت) میں کیا ہے تو اس نے بہت بڑا جھوٹ بولا۔

اور صحیح بخاری ہی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

وَاللہِ لاَ اَدْرِیْ وَاللہِ لاَادْرِیْ وَاَنَارَسُوْلُ اللہِ مَا یَفْعَلُ بِیْ وَلَابِکُم ۰

ترجمہ بخدا میں نہیں جانتا، بخدا میں نہیں جانتا حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا؟

مشرکانہ توہمات میں مبتلا لوگ خیال کرتے ہیں کہ قسمت، مستقبل بالفاظ دیگر غیب کا علم نجومیوں، پیروں، فقیروں اور سادھوؤں کو ہے حالانکہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے، البتہ وہ اس علم میں سے اپنے نبیوں کو جتنا چاہے دے دیتا ہے۔

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ ۝ (جن: ۲۶، ۲۷)

ترجمہ۔ اللہ عالم الغیب ہے، وہ اپنے غیب سے کسی کو باخبر نہیں کرتا بجز رسولوں کے جنہیں وہ منتخب فرماتا ہے۔

لیکن سارا علم غیب کسی کو بھی حاصل نہیں۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللہُ ؕ (نمل ۶۵)

ترجمہ (اے نبی!) کہو، آسمانوں اور زمین میں جو ہستیاں ہیں ان میں سے کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا بجز اللہ کے۔

اللہ کا کوئی ہمسر نہیں

اللہ خالق ہے، سب مخلوق ہیں، اللہ مالک ہے، سب مملوک ہیں، اللہ فرماں روا ہے سب رعیت ہیں۔ اللہ پروردگار ہے، سب پروردہ ہیں۔ اللہ حاجت روا ہے، سب محتاج ہیں، اللہ خدا ہے، سب بندے ہیں۔ اللہ عالم کل ہے، اوروں کا علم بہت تھوڑا ہے اس لیے کائنات کی کوئی شے اللہ کی ہمسر ہو سکتی ہے اور نہ ہے

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ (اخلاص:۴)

ترجمہ: اور کوئی اس کے برابر کا نہیں۔

اللہ کی مانند کوئی نہیں، وہ اپنی شان میں یکتا ہے:

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ۚ (شوریٰ: ۱۱)

ترجمہ: اس کی طرح کوئی شئے نہیں۔

قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ ۝ (اخلاص ۱)

ترجمہ۔ کہو، وہ اپنی شان میں یکتا ہے۔

شرک کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ خدا کو مخلوق پر قیاس کرتا ہے اور مخلوق کو خدا پر، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا میں مخلوق کی صفات مان لی جاتی ہیں اور مخلوق میں خدا کی۔ مخلوق کی طرح دیوتاؤں کے بھی ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، منہ، سر، پیٹ، اعضائے تناسل فرض کر لیے جاتے ہیں، اس فرق کے ساتھ ان کے بہت سے ہاتھ پیر اور

سر وغیرہ ہوتے ہیں۔ مخلوق کی طرح ان کی بھی شہوانی خواہش ہوتی ہے۔ البتہ ان کی خواہش بہت زبردست ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے حسد، بغض، کینہ اور عداوت رکھتے ہیں، آپس میں لڑتے بھی ہیں، دھوکا بھی دیتے ہیں، جیتتے بھی ہیں اور ہار بھی جاتے ہیں۔ نشے کے بھی شائق ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ پی کر بہک بھی جاتے ہیں۔ سوامی دویکانند فرماتے ہیں

"یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سوم رس نشہ آور ہوتا ہے۔ اس رس کو آریہ اندر اور دوسرے دیوتاؤں پر چڑھاتے ہیں اور یہ دیوتا خود بھی اس کو پیتے تھے۔ بعض اوقات آریہ اسے کچھ زیادہ پی جاتے تھے اور اسی طرح ان کے دیوتا بھی۔ اندر بھی بعض وقت نشے میں پایا گیا۔ ایسی عبارتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر نے ایک بار سوم رس اتنا زیادہ پی لیا کہ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا"۔ (Hinduism, P-21)

اسی طرح مخلوقات میں خدائی طاقت، خدائی علم اور خدائی صفات فرض کر لی جاتی ہیں۔ حالانکہ خدا خالق ہے اور باقی سب مخلوق اور خالق و مخلوق اور مخلوق کو خالق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا:

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ (نحل ۱۷)

ترجمہ: تو کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو پیدا نہیں کرتا۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ (نحل ۷۴)

ترجمہ: اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو (اللہ کو) اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔

اللہ کے بیوی نہیں

میاں بیوی کا تعلق وہاں ہوتا ہے جہاں کم از کم تین باتیں ہوں۔

۱۔ ایک ہستی دوسری ہستی کی محتاج ہو۔

۲۔ شہوانی خواہش موجود ہو اور اس نے ازدواجی تعلق کے لیے مجبور کر دیا ہو۔

۳۔ میاں بیوی دونوں ہم جنس ہوں۔

اللہ تعالیٰ میں ان میں سے کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اللہ کسی کا محتاج نہیں، نہ احتیاج اس کے شایانِ شان ہے، نہ خالق مخلوق کا محتاج ہو سکتا ہے۔

وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ (محمد:۳۸)

ترجمہ: اللہ (ہر چیز سے) بے نیاز ہے اور تم سب (اس کے) محتاج ہو۔

اللہ میں شہوانی خواہش نہیں، اللہ ہر خواہش سے ماورا ہے اور شہوانی خواہش تو بہت بڑی کمزوری ہے، جب تک اس خواہش کی تسکین نہیں ہوتی، صاحبِ خواہش کو چین نہیں آتا۔ اس میں بسااوقات صاحب خواہش اندھا ہو جاتا ہے اور عقل و خرد کھو بیٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کمزوری سے پاک ہے، کمزوری اس کے شایانِ شان نہیں:

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ ۝ (ذاریات: ۵۸)

ترجمہ: یقیناً اللہ ہی رزاق ہے، صاحبِ قوت ہے، محکم ہے۔

هُوَاللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ (حشر ۲۳)

ترجمہ: وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی خدا ہے فرمانروا ہے (تمام عیوب سے) پاک ہے، سراپا سلامتی ہے۔ پناہ دینے والا ہے، نگراں ہے (سب پر) غالب و زبردست ہے۔ رسائی سے بالاتر ہے۔ عظمت و کبریائی والا ہے۔ اللہ شرک سے پاک ہے جو یہ کرتے ہیں۔

کوئی شے اللہ کی ہمسر نہیں، مخلوق خالق کی ہم جنس نہیں اس لیے اللہ کے بیوی نہیں

وَ اَنَّهٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ○ (جن ۳)

ترجمہ: اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے اس نے کسی کو بیوی بنایا نہ بیٹا۔

مشرکانہ مذاہب کی میتھالوجی میں دیوتاؤں کے ازدواجی تعلقات کی تفصیلات ملتی ہیں۔ کیونکہ تقریباً ہر دیوتا کی بیوی ہوتی ہے، لیکن دیوتاؤں کی بے پناہ شہوانی خواہش بیوی سے تسکین نہیں پاتی، وہ پوری دنیا میں دوڑ لگاتے ہیں اور عیاشی کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے حتیٰ کہ بیٹی اور بہن کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اس سلسلے میں خدائی طاقت ان کے کام آتی ہے اور اس سے بھی کام نہیں چلتا تو دھوکہ اور مکر و فریب کے ہتھیاروں سے کام نکالا جاتا ہے۔ اس طرح کے قصوں سے ہر مشرکانہ مذہب کی میتھالوجی بھری ہے۔ شاید ہی کوئی دیوتا ہو جس کی زندگی اس کمزوری سے پاک[۲] ہو۔

اللہ کے بیٹا بیٹی نہیں

بیٹا بیٹی کا تصور بیوی اور شہوانی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا نہ شہوانی خواہش رکھتا ہے نہ اس کے بیوی ہے، اس لیے اولاد کیسی؟ پھر وہ خالق ہے اور سب مخلوق، مخلوق اس کی اولاد نہیں ہو سکتی۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ (انعام ۱۰۱)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین کا موجد اس کے اولاد کہاں سے ہو گی۔ جب کہ اس کے کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

اللہ کی اولاد خدا ہو نہیں سکتی کیوں کہ جو پیدا ہوا وہ خدا نہیں ہو سکتا اور مخلوق بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اولاد کا ہم جنس ہونا ضروری ہے اور مخلوق خالق کی ہم جنس نہیں۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ (انعام: ۱۰۰)

ترجمہ: اور انہوں نے اللہ کی خدائی میں جنوں کو شریک بنایا حالانکہ خدا نے انہیں پیدا کیا ہے اور علم کے بغیر خدا کے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیے، اللہ پاک و برتر ہے اس بات سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

"علم کے بغیر" یعنی خدا کی اولاد ہے، اس عقیدے کے پیچھے کوئی دلیل، سند یا علم نہیں۔ یہ اٹکل پچو کی باتیں ہیں۔ "اللہ پاک و برتر ہے" یعنی اولاد کا ہونا تصور الوہیت کے منافی ہے، اولاد مخلوق کو زیب دیتی ہے، خدا کو

نہیں۔

سب لوگ خدا کے بندے ہیں، بندے اولاد کا مقام کیوں کر حاصل کر سکتے ہیں۔

و ماینبغی للرحمن ان یتخذ ولدًا ○ان کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ○ (مریم ۹۲، ۹۳)

ترجمہ اور یہ بات رحمٰن (خدا) کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ اولاد اختیار کرے، آسمانوں اور زمین میں جو ہستیاں بھی ہیں سب بندہ بن کر (خدا) کے حضور حاضر ہوں گی۔

انسان کو اولاد کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی نسل باقی رہے۔ اس کے نامکمل کام پورے ہوں اور اس کے مال و جائداد کا کوئی وارث ہو۔ اللہ زندہ جاوید ہے، اسے نسل چلانے کی ضرورت، نہ وارث کی حاجت، نہ مددگار کی ضرورت وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے

قالوا اتخذاللہ ولدًا سبحانہ ؕ ھوالغنیُّ ؕ (یونس ۶۸)

ترجمہ انہوں نے کہا، اللہ نے اولاد بنائی ہے، پاک و برتر ہے اللہ (اس سے) وہ بے نیاز ہے۔

وہ قادر مطلق ہے، اس کا ہر ارادہ ہی ہر کام کی تکمیل کا ضامن ہے اسے اولاد کی ضرورت نہیں۔

مَاکَانَ لِلّٰہِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَہٗ ؕ اِذَاقَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۔ (مریم ۳۵)

ترجمہ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو اولاد بنائے وہ پاک و برتر ہے (اس سے) جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس سے بس یہ کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

اللہ بھی کسی کی اولاد نہیں۔ کیونکہ جو پیدا ہوا ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۔ (اخلاص: ۳)

ترجمہ: اس (اللہ) کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد۔

تمام مشرکانہ مذاہب میں باپ خدا، اور بیٹا اور بیٹی خدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی دیوتا کے اولاد نہیں ہوتی تو وہ کسی کو متبنٰے بنا لیتا ہے یا کسی اور طریقے سے اولاد حاصل کر لیتا ہے، شری گنیش کا قصہ اس کی واضح مثال ہے، یہ کیسے پیدا ہوئے۔ اس کے متعلق ہندو میتھالوجی میں متعدد روایتیں ہیں، لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ انہیں پاربتی جی نے اپنے بدن کے میل سے بنایا تھا جب ان کے شوہر شیوجی نے غلطی سے ان کا سر کاٹ دیا تو ایک ہاتھی کے بچے کا سر ان کی گردن سے جوڑ دیا گیا۔

اللہ اوتار نہیں لیتا

جب لوگ مذہبی پیشواؤں کی عقیدت میں حد سے بڑھ جاتے ہیں تو انہیں خدائی صفات کا حامل بنا دیتے ہیں۔ یہ غلو جب کچھ اور بڑھتی ہے تو انہیں عین خدا قرار دے دیتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنے لگتے ہیں کہ خدا نے انسانی شکل میں اوتار لیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے بیٹے نے انسانی روپ دھارن کر لیا۔ سری رام چندرجی اور سری کرشن جی کے بارے میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ وشنو کے اوتار ہیں، انسانی روپ میں خدا کے آنے کا نظریہ جب عام ہو جاتا ہے تو

بات اور آگے بڑھتی ہے اور خدا حیوانات کا روپ دھارن کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ شیر، [illegible] کچھوے کی صورت میں خدا کا اوتار لینا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ اوتار دنیا سے ظلم، فساد اور لامذہبیت و [illegible] آتے ہیں۔ یہ ہے اوتار واد کا عقیدہ۔

کیا یہ بات خدا کے شایانِ شان ہے کہ مخلوقات کی طرح ماں کے پیٹ میں رہے، پیدا ہو، پرورش کیا جائے، اس کا جسم ہو، کھائے پیئے، پیشاب پاخانہ کرے، اس کے بیوی بچے ہوں، [illegible] اور مصیبتیں سہے، اس کے انسانی یا حیوانی جذبات ہوں۔ پھر وہ مر جائے یا مار دیا جائے یا خودکشی [illegible]۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی خالق کائنات کے شایانِ شان نہیں۔ خدا مخلوق کی طرح نہیں کہ اس میں اسی کی طرح کی باتیں ہوں)

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ○ (شوریٰ:۱۱)

ترجمہ: اس جیسی کوئی چیز نہیں۔

وہ نہ پیدا ہوا ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا اور سب سے بے نیاز ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ ○ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○ (اخلاص)

ترجمہ: کہو وہ اللہ یکتا ہے، اللہ صمد ہے (سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج) نہ اس کے اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کے برابر کا نہیں۔

عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا یا خدا کے بیٹے کا اوتار مانتے تھے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ؕ (مائدہ ۱۷)

ترجمہ: یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح بن مریم ہے۔

قرآن مجید نے اس شرک پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ (مائدہ ۱۷)

ترجمہ: کہو! تو کون اللہ کو روک سکتا ہے۔ اگر وہ ارادہ کرے کہ مسیح بن مریم، ان کی ماں اور زمین کے سب افراد کو ہلاک کر دے اور اللہ ہی کے لیے ہے اقتدار آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے مابین ہے ان سب کا۔

یعنی کہاں خدا جو مسیح بن مریم اور تمام افراد کو ہلاک کر سکتا ہے اور کہاں مسیح بن مریم جو خود ہلاک ہونے والے ہیں، پھر خدا مسیح بن مریم کی شکل میں اوتار کیسے لے سکتا ہے۔ پھر اللہ ساری کائنات کا فرمانروا اور خالق ہے، اسے اس طرح کی حرکتیں نہ زیب دیتی ہیں، نہ اسے اس کی ضرورت ہے۔

عیسیٰ بن مریم کھاتے پیتے تھے اور جو کھاتا پیتا ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا:

مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ ؕ كَانَا یَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (مائدہ ۷۵)

ترجمہ: مسیح بن مریم اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک رسول ہیں ان سے قبل بھی رسول گزر چکے ہیں، ان کی ماں

صدیقہ تھیں اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔

اوتار اس لیے آتے ہیں کہ دنیا سے ظالموں کا ظلم ختم کر دیں، لیکن اتنے سے کام کے لیے کائنات کے مالک و فرماں روا کو انسان یا حیوانوں کی شکل اختیار کرنے کی کیا ضرورت؟ وہ کائنات کی کسی بھی قوت کو حکم دے سکتا ہے اور وہ ظالموں کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ وہ آئے بغیر ایسے شخص یا اشخاص کو ان کی ساری فوج اور طاقت کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے، پھر جب یہ کام وہ بہت آسانی سے اوتار لیے بغیر کر سکتا ہے اور کرتا ہی رہتا ہے تو اس کام کے لیے اسے ایسے کام کرنے کی کیا ضرورت جو کسی طرح اس کے شایانِ شان نہیں۔ آخر کون شخص بہ سلامتی ہوش و حواس یہ باور کر سکتا ہے کہ خالق کائنات مخلوق کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

اوتار کے آنے کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسانوں کی اصلاح ہو۔ لیکن اس کام کے لیے کائنات کے مالک و فرماں روا کے انسانی روپ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ بہت سے انسان موجود ہیں، ان میں سے کسی کو منتخب فرما سکتا ہے کہ وہ لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچائے اور ان کی اصلاح و تربیت کا کام کرے اور یہی وہ کرتا بھی رہا ہے، اس نے لوگوں کی اصلاح کے لیے رسول بھیجے، یہ سارے رسول انسان تھے، خدا نہ تھے:

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوحِيْٓ اِلَيْهِمْ ◦ (انبیاء، ۷)

ترجمہ ہم نے تم سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب کے سب آدمی تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان تھے

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف ۱۱۰)

ترجمہ کہو میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہیں جیسا انسان ہوں۔ میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا ایک ہی خدا ہے۔

اللہ کے حضور کوئی سفارشی نہیں

سفارش عام طور سے اس لیے کی جاتی ہے کہ مجرم کو جرم کی پاداش سے بچا لیا جائے یا کسی شخص کو وہ چیز دلوا دی جائے جس کا وہ مستحق نہیں ہے۔ یہ کھلی ہوئی بددیانتی ہے اور کسی باضمیر شخص سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ اس طرح کی سفارش کرے گا یا قبول کرے گا، لیکن مشرکین اپنے دیوتاؤں کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے حضور ان کی بے جا سفارش کر دیں گے یا خدا کی گرفت سے انہیں بچا لیں گے۔ حالانکہ خدا کے یہاں اس طرح کی کسی سفارش یا سفارشی کا گزر نہیں ہے، وہ نہ کسی کا دباؤ قبول کرتا ہے، نہ غلط فیصلے کرتا ہے، نہ اسے دھوکا دیا جا سکتا ہے، وہ اپنے علم کامل کی روشنی میں صحیح فیصلے فرماتا ہے

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ○ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ ○ وَ اللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○ (مومن: ۱۸ تا ۲۰)

ترجمہ (اللہ کے حضور) ظالموں (باغیوں) کا نہ کوئی دوست ہو گا، نہ سفارشی جس کی بات مان لی جائے، وہ آنکھوں کی بجرلتہ حرکتوں اور دلوں کے پوشیدہ ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ اور وہ صحیح فیصلہ ہی فرماتا ہے اور جنہیں یہ

اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یقیناً اللہ (ہر بات کا) سننے والا اور (ہر بات کو) دیکھنے والا ہے۔

اس آیت کا تعلق اصلاً کفار و مشرکین سے ہے۔ اب ان آیات پر غور کیجئے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ (البقرہ: ۲۵۴)

ترجمہ: اے ایمان لانے والو! جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس سے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی (کہ پیسہ کام دے) نہ دوستی ہو گی (کہ کام آئے) نہ سفارش چلے گی۔

❖..❖..❖

حواشی

۱۔ شیولنگ کی مجوزہ قوتوں کی داستانیں اور اس کی پوجا اسی ذیل کی چیزیں ہیں۔

۲۔ ہندومت کی سیہ کاری کو جاننے کے لیے مختلف "پرانوں" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ پران دیوتاؤں کی شہوانی حرکات کی تفصیلات سے بھرے ہیں۔

ذاتِ الٰہی کی حقیقت

امام غزالی

پہلا دعویٰ

۱۔ خدا کی ہستی کے ثبوت سے متعلق ہے

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ ہم دنیا میں ہزارہا اشیاء موجود دیکھتے ہیں اور یہ اشیاء ایسی وضع اور تناسب سے بنائی گئی ہیں کہ ان کی موجودگی میں کوئی کسی قسم کا شک نہیں۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ اگر ان کی ماہیات کی طرف غور سے دیکھا جائے تو یا تو کسی نہ کسی چیز اور مکان خاص کا تقاضا کرتی ہیں۔ مثلاً ہوا اور آگ اوپر جانے کی مقتضی ہیں اور پانی اور خاک نیچے کی طرف مائل ہیں اور بعض ان کے برعکس ہیں۔ ان کی ماہیات مکان مخصوص کے اقتضاء یا عدم اقتضاء سے خالی ہیں۔ جیسے سیاہی، سفیدی، سرخی، خوشبو، بدبو، غم و خوشی، شجاعت، بزدلی وغیرہ وغیرہ۔ پہلی قسم کی موجودات میں سے بعض ایسی ہیں جو بالکل بسیط ہیں اور مختلف اشیاء کی یکجائی سے ان کی ترکیب نہیں۔ اس قسم کی چیزوں کو جواہر فرد یا اجزاء لاتتجزیٰ کہتے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کی ماہیات مختلف اشیاء کے میل جول سے پیدا ہوئی ہیں جیسے انسان، گھوڑا، گدھا، کتا، خچر وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں اجسام کہلاتی ہیں۔

دوسری قسم کی موجودات غیر متجزی میں سے بعض ایسی ہیں جو بدوں کسی محل کے موجود نہیں ہو سکتیں جیسے سیاہی، سفیدی، سرخی، سبزی وغیرہ وغیرہ۔ یہ اشیاء اعراض کہلاتی ہیں اور بعض خود بخود موجود ہیں۔ وہ صرف ایک ہے جس کو ہم خدا کہتے ہیں۔ اگرچہ جواہر فرد کی موجودیت اور عدم موجودیت میں متکلمین اور فلاسفہ کا مدت سے سخت اختلاف چلا آتا ہے مگر اجسام اور اعراض کی موجودیت کا ہر ایک ذی عقل قائل ہے۔ موٹی سے موٹی سمجھ والا آدمی بھی اگر تھوڑی دیر کے لئے غور و فکر کرے تو اجسام و اعراض دونوں کی موجودیت میں اس کو کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔

ہمیں ان لوگوں پر سخت تعجب آتا ہے جو دیدہ و دانستہ اعراض کی موجودیت سے انکار کر بیٹھے ہیں اور علمی دعویٰ کی یہ حد ہے کہ دنیا بھر میں اپنی نظیر کسی کو نہیں سمجھتے۔ ہم ان کے مقابلہ میں دیگر اعراض کی موجودیت پر دلائل قائم کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ہم صرف ان کے اس انکار اور شور و شغب کی نسبت پوچھتے ہیں کہ یہ موجود ہے یا معدوم۔ اگر معدوم ہے تو اعراض کی موجودیت ثابت ہو گئی اور اگر موجود ہے تو اجسام کے قبیلہ میں سے ہے یا اعراض سے؟ پہلی شق کو باطل ہے تو اب آپ کا یہ شور و شغب اعراض میں سے ہوا جو اعراض کی موجودیت کا اعلیٰ ثبوت ہے۔

جب دنیا کی چیزوں کی تقسیم اور ان کی موجودیت ناظرین کو معلوم ہو گئی ہے تو اب ہم اپنے مدعا کے اثبات کے

درپے ہونا چاہتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ زمین و آسمان وغیرہ دنیا کی سب چیزوں کا کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے اور اسی کا نام خدا ہے۔ کیونکہ دنیا حادث ہے اور ہر حادث کے لیے کوئی سبب اور پیدا کرنے والا ہونا ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے لیے بھی سبب اور خالق ہے جو خدا کہلاتا ہے۔ یہ دلیل ہے جس کے دو مقدمے ہیں (۱) دنیا حادث ہے (۲) ہر حادث کے لیے سبب اور خالق کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے دونوں مقدموں پر ردّ و قدح ہو سکتی ہے۔ جب خصم نے دوسرے مقدمہ میں کلام کیا تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ ایسا بین اور ظاہر امر ہے جس میں کسی شخص کو بھی انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اگر کسی کو اس کے تسلیم کرنے میں رکاوٹ ہے تو یہ صرف حدوث اور سبب کے معنی نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ حدوث کے معنی ہیں ایک وقت میں کسی چیز کا معدوم ہونا اور دوسرے وقت میں اس کا موجود ہونا۔ اب ہم کہتے ہیں کہ جس وقت ایک چیز معدوم تھی تو اس وقت اس کا موجود ہونا محال تھا یا ممکن۔ اگر محال تھا تو اب موجود نہ ہو سکتی۔ کیونکہ محال وہ چیز ہوتی ہے جو کبھی عالم شہود میں نہ آسکتی ہو اگر ممکن ہے تو اس کے امکان کے یہ معنے ہیں کہ یہ لحاظ اس کی ماہیت کے اس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ اگر معدوم ہے تو محض اس وجہ سے ہے کہ اس کی علت معدوم ہے اور اب موجود ہوئی ہے تو اس واسطے کہ اس کی علت موجود ہوئی ہے۔ الغرض ممکن کی اگر ماہیت کو ٹٹولا جائے تو وہ وجود اور عدم دونوں سے تقاضے سے خالی ہوتی ہے اور اس کی ماہیت میں اس قدر استعداد ضرور ہوتی ہے کہ اگر کوئی مرجح وہاں پر موجود نہ ہو تو وہ بھی پردۂ عدم میں مستور رہتی ہے اور اگر مرجح موجود ہو تو عالم شہود میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ جب ممکن کی ماہیت اس وضع کی ہے کہ بذاتہ نہ وہ معدوم ہے اور نہ موجود تو اب اس کی موجودیت کے لیے کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جو اس کو عدم ازلی کے پنجرے سے نکال کر وجود کے دلفریب میدان میں لے آئے اور اس کا ذلیل اور ناپاک پٹہ اس کے گلے سے اتار کر وجود کا دلربا ہار پہنا دے اور یہ بات اس قسم کی ہو گی جو ممکنات کے قبیل سے بالکل علیحدہ ورنہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار والا مقولہ اس پر صادق آئے گا۔ کیونکہ جب وہ خود ممکن ہے اور اس کا وجود عدم اور دونوں اس کے حق میں یکساں ہیں تو دوسری چیز کے لیے وہ کیونکر علت اور مرجح کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ بس اسی کو ہم خدا کہتے ہیں۔

اور اگر خصم دلیل کے پہلے مقدمہ (حدوث دنیا) پر گفتگو شروع کرے گا تو اس کے جواب میں ہم یوں کہیں گے کہ دنیا بے شک حادث ہے اور اس کے حدوث پر ہمارے پاس دلیل موجود ہے۔ مگر اقامت دلیل سے پیشتر ہم صرف اتنا جتانا آپ کو ضروری سمجھتے ہیں کہ دنیا کی اشیاء میں سے صرف اجسام ہی کو ہم لے کر ان کا حدوث کریں گے اور جب اجسام کا حادث ہونا ثابت ہو جائے تو اعراض کے حدوث میں بالکل کوئی اشتباہ نہ رہے گا۔ کیونکہ اجسام اور اعراض امکان میں دونوں برابر ہیں اور جب ایک قسم کی ممکن چیزیں حادث ثابت ہو گئیں تو دوسری قسم کی ممکنات کا حدوث کیونکر ثابت نہ ہو گا۔ نیز پہلے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اجسام اعراض کے محل ہیں اور اعراض کو ان میں حلول کا تعلق ہے تو جب محلول کا حادث ہونا روز روشن کی طرح ظاہر ہو جائے گا تو حلول کردہ چیزوں کے حادث ہونے میں کونسا خفارہ جائے گا۔

اب ہم اصل دلیل کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سب کے سب اجسام حادث ہیں۔ کیونکہ یہ محل حوادث ہیں اور جو چیز محل حوادث ہوتی ہے وہ خود حادث ہوتی ہے۔ نتیجہ ہوا اجسام حادث ہیں۔

اس دلیل کے دو مقدمے ہیں (۱) اجسام محل حوادث ہیں۔ (۲) جو چیز محل حوادث ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے۔ ان دونوں مقدمات پر حجت موقوف ہے۔ اس لیے ان دونوں کے اثبات کے لئے ہم کوشش کرتے ہیں۔ پہلے مقدمہ (اجسام محل حوادث ہیں) کے ثبوت میں ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ دنیا میں جس قدر اجسام ہیں، ان میں سے بعض متحرک اور بعض ساکن ہیں اور حرکت و سکون دونوں حادث کے قبیل سے ہیں۔ اس لیے اجسام محل حوادث ہیں۔

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حرکت اور سکون اعراض میں سے ہیں اور اعراض کا نہ ہم وجود مانتے ہیں اور نہ حدوث، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ بحث نہیں چھیڑنا چاہتے کیونکہ متقدمین میں بہت طول سے اعراض کے وجود پر اعتراضات اور ان کے جوابات کا سلسلہ بیان کیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس بحث کا نتیجہ بجز تضیع اوقات کے اور کچھ نہیں اعراض کا وجود نظریات میں سے نہیں ہے تاکہ ان سے دلیل کی ضرورت محسوس کی جائے۔ ہر ایک آدمی تکالیف، بیماریاں، بھوک، پیاس، سردی، گرمی، خوشی اور غم وغیرہ وغیرہ محسوس کرتا ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ یہ سب چیزیں یکے بعد دیگرے موجود ہوتی ہیں۔ پہلے تکلیف ہوتی ہے تو پھر راحت آجاتی ہے۔ ایک وقت بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسرے وقت میں صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے اعراض میں بھی حدوث کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان تمام چیزوں کا نام اعراض ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اعراض موجود بھی ہیں اور حادث بھی ہیں۔ یہ بات مطلق اعراض کے متعلق تھی۔ اب خاص کر حرکت و سکون کی موجودیت اور حدوث کی نسبت ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ (وحید)

ہمارا روئے سخن زیادہ تر فلاسفہ کی طرف ہے۔ یہ لوگ عالم کے اجسام کو دو قسم پر منقسم کرتے ہیں۔ (۱) آسمان اور (۲) عناصر اربعہ یعنی پانی، مٹی، آگ اور ہوا۔ آسمانوں کی نسبت ان کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ ہمیشہ یعنی ازل سے اپنی اپنی وضع پر متحرک چلے آتے ہیں۔ ان کی مجموعی حرکت قدیم ہے اور حرکت کا ایک ایک فرد حادث ہے۔

اربعہ عناصر کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ فلک قمر کے نیچے کی سطح کے اندر لیے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان سب کا مادہ ایک ہے اور ہے بھی قدیم۔ ان کی صورت اور اعراض سب حادث ہیں مادہ پر ان کا توارد ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر پانی کی طبیعت پر حرارت کا غلبہ ہو جائے تو ہوا بن جاتا ہے اور ہوا حرارت سے آگ بن جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہوا کا پانی بن جانا، آگ کا ہوا ہو جانا، پانی کا پتھر بن جانا، پتھر کا پانی بن جانا وغیرہ وغیرہ فلاسفہ کے نزدیک مسلم ہے۔ فلاسفہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان چار عنصروں کے ملنے سے کانیں، نباتات اور حیوانات پیدا ہوتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ فلاسفہ کے نزدیک حرکت و سکون موجود بھی ہے اور حادث بھی ہے۔ تقریر بالا سے کسی قدر آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اجسام حرکت اور سکون کے محل ہیں اور حرکت و سکون ان میں حلول کئے ہوئے ہے مگر ہم صرف اسی قدر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس پر مزید روشنی ڈالنی چاہتے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک یہ پہلو بہت تاریکی میں پڑا ہوا ہے۔

ہر جسم یا متحرک ہے یا ساکن اور حرکت و سکون دونوں حادث چیزیں ہیں۔ حرکت کا حادث ہونا تو ایسی چیز ہے جو مشاہدہ سے معلوم ہو سکتی ہے مگر سکون کی نسبت یہ بات دل میں کھٹکتی ہے کہ ممکن ہے کہ ایک چیز ابتداء سے ساکن چلی آتی ہو۔ اس کو حرکت کرنے کی نوبت ہی نہ آئی ہو۔ اب اس چیز کا سکون قدیم ہو گا۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے غور کیا جائے تو یہ شبہ فوراً رفع ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اس ہمیشہ سکون کی حالت میں رہنے والی چیز کا حرکت کرنا ممکن ہے یا محال ہے۔ دوسری شق تو باطل ہے۔ کیونکہ ہر ایک جسم میں حرکت و سکون دونوں کی استعداد ہوتی ہے۔ بعض جسموں

کا ہمیشہ حرکت کرنا اور بعض کا ساکن رہنا محض خارجی علتوں کی وجہ سے ہے۔ تو جب یہ چیز نہ وجود سے بری ممکن ہوا تو یہ قاعدہ ہے کہ ممکن وہ چیز ہوتی ہے جس کے وجود سے کوئی محال امر لازم نہ آئے۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ وہ سکون کی حالت کو چھوڑ کر متحرک ہو گئی ہے تو جب حالتِ سکون کو اس لیے خیرباد کہہ دیا تو معدوم ہو گیا۔ سکون بھی حادث تھا کیونکہ ہم آگے کسی موقع پر ثابت کریں گے کہ جو چیز قدیم ہوتی ہے وہ معدوم نہیں ہو سکتی۔ قدیم ازل سے موجود چلی آئی ہے ویسے ہی ابد تک موجود رہتی ہے۔

اس تقریر پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ تب ثابت ہو سکتا ہے جب یہ بات معلوم ہو جائے کہ جسم اور حرکت و سکون میں باہم تغایر ہے۔ یعنی جسم اور چیز ہے اور اس کا حرکت کرنا یا ساکن ہونا اور شے ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جسم متحرک ہے تو اس سے پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ جسم اور چیز ہے اور حرکت ایک وصف ہے جو جسم کو عارضی ہے۔ ورنہ ہمارا یہ کہنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ یہ جسم متحرک نہیں ہے۔ جب جسم اور حرکت میں اتحاد ہے تو حرکت کی نفی بعینہٖ جسم کی نفی ہونی چاہیے۔ سکون اور جسم کا باہم متغایر ہونا بھی اسی پر قیاس کر لو۔ الغرض جسم کا اور چیز ہونا اور حرکت کا اور شے، یہ ایسا کھلا اور واضح امر ہے جو کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ جسم اور حرکت و سکون کی باہم مغائرت تو ہم نے تسلیم کر لی مگر ان دونوں وصفوں کا حدوث ہمارے نزدیک مسلم نہیں۔ ممکن ہے کہ جسم متحرک کے اندر وصف حرکت ابتدا ہی سے چلی آتی ہو۔ صرف اس کا ظہور اب ہوا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ہم دلائل کے ذریعہ سے ثابت کر سکتے ہیں کہ وصف حرکت کا ابتدا سے چلا آنا اور بعد میں اس کا ظاہر ہونا یہ دونوں امر خلاف واقعہ ہیں، مگر ہم اس طول طویل قصے کو چھیڑنا نہیں چاہتے۔ ہم معترض کی بات مان کر کہتے ہیں کہ وصف حرکت کا ظہور حادث ہے بس صرف اسی سے اجسام کا محل حوادث ہونا ثابت ہو گیا۔ جیسے حرکت و سکون اجسام کی صفتیں ہیں ویسے ہی ان کا جسموں میں ابتدا سے چلا آنا اور پھر کسی وقت ان کا ظاہر ہونا بھی ان کی بالواسطہ صفتیں ہیں اور جیسے حرکت اور سکون کے حادث ہونے سے اجسام کا محل حوادث ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ویسے ہی ان دونوں صفات مذکورہ بالا کے حدوث سے ان کی مخلوقیت پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتی ہے۔

یک اور اعتراض بھی وارد ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ حرکت کا حدوث قابل تسلیم نہیں، جب تک آپ اس امر کو ثابت نہ کر لیں کہ وصف حرکت کسی دوسرے جسم سے انتقال کر کے اس خاص جسم میں نہیں آتی۔ ممکن ہے کہ وصف حرکت قدیم ہو اور خاص خاص وقتوں میں مختلف جسموں میں اس کا دورہ ہو۔ یعنی ایک وقت میں مثلاً زید میں حرکت تھی، کچھ دیر رہ کر اس سے علیحدہ ہوئی اور اب عمر میں آ گئی، کسی وقت میں اس سے علیحدہ ہو کر بکر خالد وغیرہ میں جا رہے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اعراض اور اوصاف اپنے محلول سے علیحدہ نہیں ہو سکتیں۔ ہر ایک عرض کا بقاء اور فنا محل کے بقاء اور فنا پر موقوف ہوتا ہے۔ مثلاً زید کے بالوں میں جو خاص سیاہی ہے اس میں یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی وقت عمر کے بالوں میں جا پہنچے۔ زید پر جب پیری کا زمانہ آئے گا تو اس کے بالوں کی سیاہی بالکل نیست و نابود ہو جائے گی۔ اس امر کے ثبوت پر بڑے بڑے باوقعت اور نامی گرامی علماء نے مختلف مقامات میں دلائل قائم کئے اور اپنی طرف سے اس کے ثبوت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر وہ اپنی اس غرض میں کامیاب نہ ہو سکے کوئی ایسی زبردست اور نہایت مضبوط دلیل پیش نہ کر سکے، جس سے مخالفین کے دانت توڑ ڈالے جاتے اور وہ ہمیشہ کے لیے سر نہ اٹھاتے۔ اس امر کے اثبات کے لیے ایک دلیل ہم پیش کرتے ہیں جو امید

ہے کہ بہت مفید ثابت ہوگی۔ (ھو ھذا)

جن لوگوں کا اعراض کے انتقال کی طرف خیال گیا ہے، ہماری سمجھ میں ان کو عرض اور انتقال کے معنی سمجھنے میں سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر ان چیزوں کی ماہیت کی تہ تک ان کو پہنچنا نصیب ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ ایسے دور از عقل امر کی نسبت زور لگاتے۔

انتقال کے معنی ہیں جسم کا ایک مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں جانا۔ اس کی حقیقت دریافت کرنے میں ہمیں تین چیزوں کا جاننا ضروری ہے۔ جسم کی ماہیت کو جاننا۔ مکان کا تصور کرنا۔ جسم کو مکان سے جو خاص تعلق ہے اس کا معلوم کرنا۔ یہ تعلق جسم اور مکان دونوں سے جدا ہے۔ نہ اس کو جسم کی حقیقت کے ساتھ اتحاد ہے اور نہ مکان کے ساتھ عینیت، درحقیقت یہ جسم اور مکان کا ایک امتیاز ہے جس کی وجہ سے ان دونوں میں ایک خاص ربط اور لگاؤ ہے۔

جیسے ہر ایک جسم کو مکان کی ضرورت ہے ویسے ہی ہر ایک عرض اور صفت کو محل کی ضرورت ہے اور سرسری نظر سے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو نسبت جسم کو اپنے مکان کے ساتھ ہے وہی نسبت عرض کو اپنے محل کے ساتھ ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کو یہ گمان ہو گیا کہ جیسے جسم باوجودیکہ اس کو اپنے مکان کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے، مکان سے علیحدہ ہو کر دوسرے مکان میں جا سکتا ہے۔ ویسے ہی عرض کا اپنے ایک محل سے علیحدہ ہو کر دوسرے محل میں جانا درست ہے۔ بس انتقال اعراض کے قائلین کے اس قول کی بنا صرف اسی بات پر ہے۔

عرض کا جو تعلق محل کے ساتھ ہے اس کو جسم کے تعلق مکانی پر قیاس کرنا سراسر حماقت اور کم ظرفی ہے۔ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ جسم کا تعلق مکانی جسم کی حقیقت سے مغائر ہے اور عرض کا تعلق محل اس کی حقیقت کا عین ہے۔ کیونکہ اگر اس تعلق کو جسم کے تعلق کی مانند عرض کی حقیقت سے جدا مانا جائے تو جیسے عرض کو اپنے محل کے ساتھ جو ایک خاص ربط اور تعلق ہے ویسے ہی اس تعلق کو عرض کے ساتھ ایک خاص ربط اور تعلق ہوگا۔ ویسے ہی اس تعلق کے تعلق کو تعلق کے ساتھ ایک خاص ربط اور تعلق ہوگا۔ (وھلم جرا)

یہ تسلسل ہے جو محال ہونے کے علاوہ اس امر کو چاہتا ہے کہ جب تک غیر متناہی اعراض ایک وقت میں مجتمع نہ ہوں تب تک کسی عرض کا پایا جانا ممکن نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ عرض کے لیے محل کا ہونا ضروری ہے جیسے جسم کے لیے مکان کا ہونا ضروری ہے مگر ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

جو چیز کسی دوسری شے کے لیے لازم ہوتی ہے وہ دو طرح پر ہوتی ہے۔ لازم ذاتی اور لازم عرضی۔ لازم ذاتی وہ ہوتا ہے کہ اگر وہ خارج یا ذہن میں موجود نہ ہو تو دوسری شے (ملزوم) بھی موجود نہ ہو۔ جیسے دن کے واسطے سورج کا ہونا، جب آسمان سے سورج غروب ہو جاتا ہے تو دن بھی اس کے ساتھ ہی رفوچکر ہو جاتا ہے اور جب سورج افق شرقی سے نمودار ہوتا ہے تو دن بھی اس کے ساتھ ہی آ جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جب ذہن میں سورج کا ملاحظہ کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی دن کا خیال بھی آ جاتا ہے۔ لازم عرضی اس کے بالکل خلاف ہے۔

جسم کے لیے مکان لازم عرضی ہے اور عرض کے لیے محل لازم ذاتی ہے۔ جسم کے لیے مکان کا لازم عرضی ہونا اس وجہ سے ہے کہ پہلے ہم جسم کی ماہیت کو معلوم کرتے ہیں اور اس کے بعد مکان کی نسبت سوچتے ہیں کہ مکان کوئی واقعی اور مستقل

حقیقت ہے یا محض ایک ہی چیز ہے۔ آخر بڑے بڑے دلائل قائم کرنے کے بعد [illegible] نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مکان بھی جسم کی طرح مستقل حقیقت رکھتا ہے۔ جسم کو ہم مشاہدہ سے دیکھ سکتے ہیں اور مکان [illegible] میں نہیں آتا۔ اسی لیے جسم کے لیے کبھی خاص مکان کا ہونا ضروری نہیں ہے اور اگر جسم ایک خاص مکان میں [illegible] سے اس کا بالکل معدوم ہونا لازم نہیں آتا۔ زید اگر مسجد میں نہ ہوگا تو اس وقت ہم زیادہ سے زیادہ [illegible] مسجد میں نہیں۔ مگر یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ مسجد میں موجود نہ ہونے سے وہ بالکل ہی نیست و نابود [illegible] ہوا کہ جسم کے لیے مکان لازم عرضی ہے نہ لازم ذاتی۔

عرض کے لیے محل لازم ذاتی ہے۔ عرض بغیر خاص محل کے نہ خارج میں [illegible] ہو سکتی ہے اور نہ ذہن میں اس کا تصور آ سکتا ہے مثلاً زید کا طول یعنی لمبائی۔ زید کا طول خارج میں تب [illegible] متحقق فی الخارج ہو لے گا۔ اور ذہن میں بھی اس کا تصور جب ہی آ سکتا ہے جو اس کے ساتھ زید کا تصور کر لیا جائے۔ زید کے مرنے سے اس کے طول کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

زید کے طول کے لیے بغیر زید کے نہ خارج میں استقلال ہے اور نہ ذہن میں [illegible] بدوں اس اختصاص کے جو اس کو زید کے ساتھ ہے، محال ہے اب اگر یہ مانا جائے کہ زید کے طول کا زید سے [illegible] ممکن ہے تو اس کی علیحدگی اختصاص مذکور کے رفع ہو جانے کو مستلزم ہوگی اور یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ اختصاص کے رفع ہو جانے پر [illegible] ہی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بس ثابت ہوا کہ اعراض کا اپنے محلول سے علیحدہ ہو جانا محال ہے۔

اب تک تو ہم نے اپنی دلیل کے پہلے مقدمہ کے اثبات پر زور دیا ہے اور ہمارے مخالفین فلاسفہ کسی حد تک اس کو مانتے بھی ہیں۔ مگر اب ہم دلیل کے دوسرے مقدمہ کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ بات کرتے ہیں کہ دنیا چونکہ محل حوادث ہے اس لیے یہ خود بھی حادث ہے۔

اگر عالم کو جو حوادث کا محل ہے، قدیم مانا جائے تو اس کے ساتھ ہی آسمان کے دورات بھی غیر متناہی تسلیم کرنے پڑیں گے۔ لیکن آسمان کے دورات کی عدم تناہی کی بنا پر تین محال امر لازم آتے ہیں

ا۔ آسمان کے دورات اگر غیر متناہی ہیں تو آج سے پہلے کے دورات کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ پورے ہو چکے ہیں کیونکہ زمانہ ماضی میں جو چیز ہوتی ہے، زمانہ حال کی نسبت اسے یہ کہنا کہ یہ گزر چکی ہے بالکل درست ہوتا ہے تو جب وہ غیر متناہی ہیں اور پورے ہو چکے کا لفظ بھی ان پر صادق آتا ہے تو گویا وہ غیر متناہی بھی ہوئے اور متناہی بھی ہوئے اور یہ اجتماع نقیضین ہے۔

۲۔ آسمان کے غیر متناہی دورے چونکہ عدد کی حقیقت سے باہر نہیں اس لیے وہ جفت ہوں گے یا طاق یا دونوں کے علاوہ کوئی اور چیز ہوں گے یا دونوں یعنی جفت بھی ہوں گے اور طاق بھی۔ پچھلی دو شقیں تو باطل ہیں کیونکہ جفت وہ عدد ہوتا ہے جو دو یا کئی ایک برابر حصوں پر منقسم ہو سکے جیسے دس، اب دس دو پر تقسیم کرنے سے پانچ پانچ کے دو عددوں پر منقسم ہو سکتا ہے اور طاق وہ ہے جو جفت کے خلاف ہو۔ یعنی برابر حصوں پر منقسم نہ ہو سکے جیسے نو۔ سو ہر ایک عدد یا برابر حصوں پر منقسم ہو گا یا نہ ہوگا۔ یا یوں سمجھیے کہ ہر ایک عدد یا جفت ہوگا یا طاق۔ مگر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی ایسا عدد بھی ہو جو نہ جفت ہو نہ طاق۔ یا جفت اور طاق دونوں ہو ورنہ پہلی صورت میں اجتماع النقیضین قبول کرنا پڑے گا۔

ان کا جفت ہونا بھی غلط ہے کیونکہ جو عدد جفت ہوتا ہے اس میں صرف ایک عدد کی کمی ہوتی ہے۔ اگر یہ کمی پوری ہو جائے

تو وہ عدد طاق ہو جاتا ہے مگر جب آسمان کے دورے غیر متناہی ہیں تو اس میں ایک کی کمی کیا ہے۔

اس کا طاق ہونا بھی باطل ہے۔ کیونکہ طاق میں بھی صرف ایک کی کمی ہوتی ہے اور یہ کمی پوری ہو جائے تو طاق جفت ہو جاتا ہے۔ لیکن جب دورے غیر متناہی ہیں تو ان میں سے ایک کیونکر کم ہو سکتا ہے۔ سو جب آسمان کے دورے عدم تناہی کی صورت پر نہ جفت ہو سکتے ہیں اور نہ طاق اور نہ دونوں سے خالی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان دونوں کا مجموعہ ان پر صادق آ سکتا ہے تو ثابت ہوا کہ یہ متناہی ہیں۔

۳۔ اور آسمان کے دورے غیر متناہی ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ دو عدد غیر متناہی بھی ہیں اور پھر ان میں سے ایک کم اور ایک زائد ہے حالانکہ جب دونوں عدد غیر متناہی ہیں تو ایک کا دوسرے سے کم و بیش ہونا ممکن نہیں ہو سکتا کیونکہ عدد کم وہ ہوتا ہے جس میں دوسرے کی نسبت کمی ہو اور جب یہ کمی پوری ہو جائے تو دونوں برابر ہو جاتے ہیں مگر جب عدد کم غیر متناہی ہے تو اس میں کمی کیسے ہو سکتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دورے غیر متناہی ہیں تو دو غیر متناہی عددوں کا ایک دوسرے سے کم و بیش ہونا کیونکر لازم آتا ہے سو دیکھیے اور غور سے دیکھیے۔

تمام فلاسفہ اس امر پر متفق ہیں کہ زحل تیس سال کے بعد ایک دورہ کرتا ہے اور شمس ہر سال میں ایک دورہ کرتا ہے۔ سو اگر تیس سال کے بعد زحل کے دوروں کو شمس کے دوروں سے نسبت لگائی جائے تو زحل کے دورے شمس کے دوروں کے تیسویں حصہ پر برآمد ہوں گے کیونکہ تیس سال میں زحل نے صرف ایک دورہ کیا ہے اور شمس تیس دورے کر چکا ہے اور ایک تیس کا تیسواں حصہ ہوتا ہے اور ساٹھ سال میں زحل کے صرف دو دورے ہوں گے اور شمس کے دوروں کی تعداد ساٹھ تک پہنچ جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس قمر ان دونوں سے زیادہ یعنی بارہ بارہ دورے کرتا ہے سو سال کے بعد شمس کے دوروں کو قمر کے دوروں سے نسبت لگانے سے شمس کے دورے قمر کے دوروں کا بارہواں حصہ برآمد ہوں گے اب دیکھیے زحل، شمس اور قمر کے دورے غیر متناہی بھی ہیں اور شمس کے دورے زحل کے دوروں اور قمر کے دورے شمس کے دوروں سے کئی حصے بھی زائد ہیں۔

اس جگہ پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ متکلمین کے نزدیک خدا کے مقدورات اور معلومات دونوں غیر متناہی ہیں حالانکہ خدا کے معلومات بہ نسبت مقدورات کے زائد ہیں کیونکہ خدا کی ذات قدیمہ اس کی صفات قدیمہ۔۔۔ شریک الباری اجتماع النقیضین ارتفاع النقیضین وغیرہ وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جو خدا کو معلوم ہیں مگر ان کے پیدا کرنے پر خدا کو مطلق قدرت نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں ہم خدا کے معلومات کو غیر متناہی کہتے ہیں وہاں خدا کے مقدورات کو غیر متناہی کہنے سے ہمارا وہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا جو معلوم کو غیر متناہی کہنے سے ہے بلکہ مقدورات کو غیر متناہی کہنے سے مراد یہ ہے کہ خدا کی ایک صفت قدرت ہے جس کی وجہ سے خدا دنیا کی مختلف چیزوں کے پیدا کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور وہ ایسی صفت ہے جس کی وجہ سے خدا میں یہ بات نہیں ہوتی ہے کہ اس کی ایجاد قدرت کسی حد پر ٹھہر جائے اور آگے مخلوقات کے ایجاد پر اس کو قدرت نہ رہے۔

ہمارا یہ کہنا کہ خدا کی ایک صفت قدرت ہے جس کی وجہ سے وہ ایجاد پر قدرت رکھتا ہے اور نہ اس امر کی طرف مشعر ہے کہ یہاں بہت سی غیر متناہی چیزیں ہیں اور نہ ہی اس میں سے یہ پایا جاتا ہے کہ وہ متناہی ہیں۔

جن لوگوں نے ہمارے اس لفظ مقدورات اللہ تعالی و معلوماته غیر متناهیه سے خدا کی مقدورات کا غیر متناہی ہونا سمجھ لیا ہے زیادہ تر ان کی غلطی کی بنا مقدورات اور معلومات سے تشابہ لفظی پر ہے۔ چونکہ یہ دونوں الفاظ جمع مونث سالم کے صیغے ہونے میں برابر تھے اس لیے ان کو یہ مغالطہ لگا مگر یہ قاعدہ ہے کہ الفاظ و معانی سے تابع ہوتے ہیں نہ معانی الفاظ کے۔

دوسرا دعویٰ

۲۔ کائنات عالم کے لیے جو سبب اور خالق (خداوند تعالیٰ) ہم نے ثابت کیا ہے اس کا قدیم ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر وہ حادث ہے تو اس کے لیے کسی اور خالق کا وجود ماننا پڑے گا اور اگر وہ بھی حادث ہے تو اس کے لیے ایک تیسرا خالق تلاش کرنا پڑے گا علیٰ ھذا القیاس۔ اگر یہی سلسلہ الی غیر النہایۃ چلا گیا تو تسلسل کا وجود لازم آئے گا جو محال ہے۔ اور اگر یہ سلسلہ کسی ایسے خالق پر ختم ہو گیا جو قدیم ہے اور اس سے آگے اور کوئی خالق تجویز نہیں ہو سکتا تو کائنات عالم کا خالق (خداوند تعالیٰ) بھی وہی ہو گا جس پر یہ سلسلہ منقطع ہوا ہے اور راستے میں جو اسباب نظر آتے ہیں وہ سب کے سب وسائل اور وسائط کے درجے میں ہوں گے اور بس۔

خدا کو قدیم کہنے سے ہمارا یہ مطلب ہے کہ اس کے وجود سے پہلے نیستی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ سے اس کا وجود چلا آیا ہے۔ جہاں تک ہمارا امکان ہے ہم نظر دوڑائیں مگر اس سے بھی آگے خدا کا وجود تھا۔ اس پر یہ سوال پیدا نہ وارد ہو سکے گا کہ قدیم کے ساتھ قدم کی صفت بھی آپ ثابت کر رہے ہیں تو جیسے خدا کی ذات قدیم ہے ویسے ہی یہ صفت بھی قدیم ہو گی۔ جیسے خدا کے قدیم ہونے کے لیے قدم کی صفت کی ضرورت ہے ویسے ہی اس صفت کے قدیم ہونے کے لیے ایک اور صفت قدیم کی ضرورت ہو گی وَهَلُمَّ جَرًّا اور تسلسل ہے جو محال ہے۔

تیسرا دعویٰ

۳۔ جیسے کائنات عالم کا خالق ازلی اور قدیم ہے ویسے ہی اس کے واسطے ابدی ہونا بھی ضروری ہے۔ یعنی وہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے لیے کبھی فنا اور اس کے وجود کے لیے کبھی زوال نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس پر زوال کا عارض ہونا جائز ہو تو جیسے ایک معدوم شے کے وجود کے واسطے سبب اور خالق کا ہونا ضروری ہوتا ہے ویسے ہی اس کے وجود کے زوال کے لیے بھی کسی سبب اور خالق کا ہونا ضروری ہو گا۔ کیونکہ اس صورت میں خالق کے وجود کا زوال ایک حادث چیز ہے اور ہر حادث کے لیے کسی مرجح کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اب مرجح یا فاعل ہو گا یا خالق کے وجود کے شرائط میں سے کسی شرط کا معدوم ہو جانا۔ مرجح کا فاعل ہونا ناجائز ہے کیونکہ فاعل اس چیز کو پیدا کر سکتا ہے اور اس کے فعل کا ثمرہ وہی شے ہو سکتی ہے جو مستقل ہستی رکھتی ہو اور اس کے وجود پر مختلف قسم کے آثار مرتب ہو سکیں یا یوں کہیے کہ اس پر شے کا لفظ بولا جا سکتا ہو۔ مگر یہاں پر فاعل کے فعل کا ثمرہ خالق کا عدم ہے جو لاشے ہے معتزلہ کے نزدیک اگرچہ معدوم پر بھی شے کا لفظ بولا جا سکتا ہے مگر ایسی شے ان کے نزدیک بھی ثمرہ قدرت نہیں بن سکتی۔ اگر فاعل کی نسبت پوچھا جائے کہ هَلْ فَعَلَ الفاعِلُ شَيْئًا کیا فاعل نے کوئی شے پیدا کی تو اس کے جواب میں یہی کہنا پڑے گا۔ مَا فَعَلَ شَيْئًا کسی شے کو پیدا نہیں کیا۔ اگر خالق کے زوال کا مرجح اس کی ضد قرار دی جائے تو وہ دو باتوں سے خالی نہ ہو گی، حادث ہو گی یا قدیم۔ اگر حادث ہوئی تو ایک قدیم شے (خالق) کے زوال کا سبب کہلانے کی کیوں کر مستحق ہو گی اور اگر قدیم ہوئی تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ازل سے یہ چیز خالق کے ساتھ چلی آئی ہے مگر پہلے کبھی اس نے اس کے نیست و نابود کرنے کا قصد نہیں کیا اور اب اس کی بیخ کنی کے درپے ہو گئی۔

خالق کے وجود کی شرطوں میں سے کسی شرط کا معدوم ہو جانا بھی خالق کے زوال کا مرجع نہیں ہو سکتا، کیونکہ شرط اگر حادث ہے تو حادث چیز کی معدومیت تو محال قرار دیتا ہے اور اس شرط قدیم کے زوال کو کیوں تسلیم کرے گا۔

سو جب خالق کے زوال کا مرجع ان تین چیزوں میں سے کوئی بھی نہ ہو سکا تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ خالق جیسا ازلی ہے ویسا ہی ابدی بھی ہے۔

چوتھا دعویٰ

۴۔ کائنات عالم کا خالق جیسا کہ ازلی و ابدی ہے ویسا نہ وہ جوہر ہے اور نہ اس کو کسی مکان کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ قدیم ہے۔ اب اگر اس کا کسی مکان کے ساتھ تعلق ہو تو اس کو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اپنے مکان میں سے حرکت کر کے کسی اور مکان کی طرف چلا جاتا ہے یا اپنے مکان میں ساکن ہے۔ الغرض اس صورت میں حرکت یا سکون کے ساتھ اس کو موصوفیت کا رابطہ ہو گا اور حرکت و سکون دونوں حادث چیزیں ہیں اور یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ حادثات کا محل بھی حادث ہوتا ہے۔ لہٰذا خالق حادث ہو گا۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ متکلمین ان لوگوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں جو جوہر کے لفظ کو خداوند تعالیٰ پر بولتے ہیں اور اس سے تحیز کی اور واقعیت کی امکان سے مقدس اور منزہ سمجھتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ کا خدا تعالیٰ پر اطلاق کرنا چونکہ عقل کے نزدیک ممنوع نہیں مستحسن امر نہیں مگر ہم کو ایسے اطلاقات سے دو چیزیں روکتی ہیں لغت اور شرع۔

لغت تو اس لئے کہ مثلاً جوہر کو خدا پر اطلاق کرتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لفظ بہ نسبت خداوند کریم کے حقیقت ہے یا استعارہ۔ حقیقت تو صراحتاً باطل ہے اور استعارہ بھی اس لئے ناجائز ہے کہ مشبہ بہ میں بہ نسبت مشبہ کے وجہ شبہ کی جہت غالب ہوتی ہے تو جب خدا میں (جو مشبہ ہے) بہ نسبت مشبہ بہ کے وجہ شبہ کی کمی ہوئی تو اس کی ذات اقدس میں بڑا بھاری نقص لازم آئے گا۔

شرع اس لئے کہ شرع کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جن جن لفظوں کو خدا پر اطلاق کرنے کی ہمیں اجازت دی گئی ہے ان کے بغیر کسی دوسرے لفظ کا خدا پر اطلاق کرنا ناجائز ہے۔ اسی واسطے شرع کی اصطلاح میں خدا تعالیٰ کے جس قدر ذاتی اور صفاتی اسماء ہیں ان کا نام اسماء توقیفی قرار پایا ہے۔

پانچواں دعویٰ

۵۔ خدا تعالیٰ جسم بھی نہیں کیونکہ جسم کی ترکیب ایسے دو جوہروں کے ملنے سے ہوتی ہے جن کو ایک دوسرے کی طرف احتیاج اور ان میں ایک خاص تعلق و ربط ہو۔ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خداوند تعالیٰ جوہر نہیں تو جسم کیسے ہو سکے گا، کیونکہ جس پر جسم صادق آتا ہے اس پر پہلے جوہر کا اطلاق ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے جوہر کا مفہوم جسم سے کسی قدر وسیع ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو مفہوم وسیع اور عام ہوتا ہے یہ خاص کے سب افراد پر بھی بولا جاتا ہے اور علاوہ ان کے اور بھی کئی ایک افراد پر اس کا اطلاق صحیح ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی اصطلاح میں خداوند کریم کو جسم کے لفظ سے پکارتا ہے اور اس اطلاق میں جسم کے حقیقی معنے اس کے

ذہن میں نہیں ہوتے تو عقل کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ہاں لغت اور شرع میں یہ [illegible] ثابت نہ ہوگا۔ نیز اگر خداوند کریم کا جسم ہوتا تو کسی خاص شکل اور مقدار میں ہوتا اور جس شکل اور مقدار میں [illegible] قطع نظر کی جائے تو اس سے چھوٹا یا بڑا ہونا بھی اس کا ممکن ہے تو اب اس کو خاص شکل اور مقدار [illegible] جس نے اس کو خاص انداز پر پیدا کیا ہے تو اب خدا مخلوق ہوگا نہ کہ خالق۔

چھٹا دعویٰ

۶۔ کائنات عالم کا خالق عرش بھی نہیں کیونکہ عرش ہماری اصطلاح میں [illegible] اپنے موجود ہونے میں دوسری چیز کی محتاج ہو۔ وہ چیز یا جسم ہوگی یا جوہر اور یہ دونوں حادث چیزیں ہیں اور [illegible] محل حادث ہو تو اس میں حلول کردہ چیز بھی حادث ہوتی ہے۔ لہٰذا خالق عالم بھی حادث ہوگا حالانکہ [illegible] یہ قدیم اور ازلی و ابدی ہے۔

اگر کوئی عرش سے یہ مراد لے کہ یہ ایسی صفت کا نام ہے جو دوسری چیز [illegible] دوسری چیز مکان اور جہات کی تقلید سے منزہ اور مقدس ہو تو ایسے عرش کے وجود سے ہم بھی منکر نہیں۔ [illegible] صفات اسی قبیل میں سے ہیں مگر نزاع اس میں ہے کہ صانع اور خالق کہلانے کا استحقاق وہ ذات رکھتی ہے جو [illegible] صفات کی موصوف ہے یا صفات۔

جب ہم کہتے ہیں کہ صانع اور خالق صفت نہیں تو اس کہنے سے ہماری غرض یہ ہوتی ہے [illegible] صانعیت اور خالقیت یہ دونوں صفتیں اس ذات کی طرف منسوب ہیں جس کے ساتھ جملہ صفات قائم ہیں، [illegible] طرف جیسے ہم کہتے ہیں کہ بڑھئی عرض اور صفت نہیں تو اس وقت ہماری یہ غرض ہوتی ہے کہ نجاریت بڑھئی کی طرف منسوب ہے نہ اس کی صفات کی طرف یوں کہیے کہ بڑھئی وہ خود ہے نہ اس کی صفات۔

اگر کوئی شخص ان مذکورہ بالا معانی کے بغیر عرش کا کوئی اور معنی لے کر اس کو خدا پر اطلاق کرتا ہے تو اس کو لغت اور شرع جواب دے گی۔ عقل کے نزدیک یہ کوئی محال امر نہیں۔

ساتواں دعویٰ

۷۔ خداوند تعالیٰ اوپر ہے نہ نیچے، نہ دائیں، نہ بائیں، نہ آگے نہ پیچھے۔ الغرض جہات ستہ میں سے کسی جہت کے ساتھ اس کو اختصاص اور تعلق نہیں۔ جہات ستہ یہ ہیں اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے۔ عربی زبان میں
ان کے یہ نام فوق، تحت، یمین، شمال، قدام، خلف۔ جہت اور اختصاص کے معنی سمجھ لینے سے ہر ایک آدمی کو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ جہات ستہ کے ساتھ مناسبت اور تعلق والا معاملہ صرف اجسام اور اعراض ہی کے ساتھ خاص ہے جو ذات جسمیت اور عرضیت سے بالاتر ہو۔ اس کو ان میں سے کسی جہت سے کوئی سروکار نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جہات کی قید میں وہی شے آسکتی ہے جو کسی خاص مکان کی متمنی ہو۔ ہر ایک چیز جو کسی جہت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ پہلے مکان کا لحاظ کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کی خصوصیت کا ادراک ہو سکتا ہے۔

کسی چیز کے اوپر ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ ایسے مکان میں ہے جو سر کی جانب ہے اور نیچے ہونے کے یہ معنی ہیں

کہ وہ ایسے مکان میں ہے جو پاؤں کی جانب ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دائیں یا بائیں جانب ہونا یا آگے ہونا یا پیچھے ہونا۔ تو اب ہر ایک چیز کے کسی جہت میں ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ وہ کسی مکان میں ہے مگر کسی اور خصوصیت کو لیے ہوئے۔

کسی شے کا تحقق فی الجہت دو طرح پر متصور ہو سکتا ہے ایک یہ کہ اس کو جہت کے ساتھ ایسا ربط ہو کہ اس کے بغیر اس کا تحقق محال ہو۔ یہ بات جواہر میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس کی سرشت اور جبلت میں یہ بات داخل ہے کہ جب ہستی کا لباس پہنے تو اوپر ہو یا نیچے، دائیں جانب ہو یا بائیں، آگے ہو یا پیچھے۔ دوسرے یہ کہ کسی اور چیز کے ذریعے سے جہت میں اس کا پایا جانا ہو۔ جیسے اعراض ان کی بھی جہت معین ہوا کرتی ہے مگر اس لیے کہ یہ جواہر میں حلول کئے ہوتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی جہت کے بغیر متحقق نہیں ہوتے۔

اعراض کو جو جہت سے تعلق ہے وہ ایسی نہیں جو جواہر کو ان کے ساتھ ہے۔ جواہر کو ان کے ساتھ جو تعلق ہے وہ ان کا ذاتی مقتضٰی ہے اور اعراض کو جو جہت کے ساتھ نسبت ہے وہ محض عارضی طور پر ہے۔

جب جہت کے ساتھ منسوب ہونے کی یہ دو صورتیں آپ کے ذہن نشین ہو گئیں اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا کہ پہلی صورت صرف جواہر ہی کے ساتھ خاص ہے اور دوسری محض اعراض ہی میں پائی جاتی ہے تو اب آپ نہایت آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کو کسی جہت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ خدا نہ جوہر ہے اور نہ عرض اور کسی جہت کے ساتھ منسوب ہونا یہ صرف جواہر اور اعراض ہی کے ساتھ خاص ہے۔

اگر کوئی یوں کہے کہ خداوند تعالیٰ کو جہت کے ساتھ منسوب کرنے کے معنے کچھ اور ہیں جن کی رو سے ہم اس کے لیے کوئی نہ کوئی جہت مقرر کر سکتے ہیں تو اس کے جواب میں ہم یوں کہیں گے کہ جواہر اور اعراض میں جو طریقہ جہت کے ساتھ منسوب کرنے کا ہے اگر اسی قسم کی منسوبیت کے خداوند کریم میں آپ قائل ہیں اور جس طرز کی ان کے لیے جہت مقرر ہیں، اسی طرز پر آپ بھی اس کے لیے جہت مقرر کرتے ہیں تو اس کے تسلیم کرنے کے لیے ہم ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی جہت کا مقرر ہونا صرف جواہر اور اعراض کے لیے ہے۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور معنے کے لحاظ سے آپ اس کے لیے کوئی جہت مقرر کرتے ہیں تو جب تک آپ اس کو بیان نہ کریں ہم اس پر رائے زنی نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کی مراد جہت سے قدرت اور علم ہے اور آپ کے نزدیک اس کے لیے کسی جہت کے مقرر ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ ہر ایک امر پر قادر اور ہر ایک چیز کا عالم ہے تو اس بات میں ہم آپ کے ساتھ متفق ہیں۔

اگر یہ مذموم طریقہ اختیار کیا جائے کہ لفظ حقیقی اور اصلی معنی چھوڑ کر جو جی میں آیا اس میں سے مراد لے لیا اور جب کسی ایک معنی کی کسی نے تردید کی تو جھٹ پٹ کہہ دیا کہ میری مراد کچھ اور تھی تو اس کا علاج ہمارے پاس کوئی نہیں۔

ایک اور دلیل بھی ہمارے پاس ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ خداتعالیٰ کے لیے کوئی جہت مقرر نہیں۔ وہ یہ کہ اگر وہ کسی جہت میں ہو تو یہ ظاہر ہے کہ منجملہ جہات ستہ کے کسی ایک جہت کے ساتھ خاص ہو گا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان جملہ جہات کو اس کی ذات کے ساتھ برابر نسبت ہے تو اب خداتعالیٰ کا کسی ایک جہت کے ساتھ خاص ہونا واجب بالذات نہ ہو گا بلکہ ممکن ہو گا اور یہ قاعدہ ہے کہ ہر ایک ممکن کے لیے سبب اور مرجح کا ہونا ضروری ہے، سو اب یہاں بھی کوئی سبب اور مرجح ضرور ماننا پڑے گا جو خدا کے لیے کسی ایک جہت کو مقرر کر دے یا یوں کہنا چاہیے کہ خداتعالیٰ اپنی جہت کے تقرر میں کسی غیر کا محتاج ہو گا۔ یہ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی بات میں کسی اور کی محتاج ہو وہ قدیم نہیں ہو سکتی کیونکہ قدیم کہلانے کی وہی چیز مستحق ہو سکتی ہے جو تمام وجوہات میں

واجب الوجود بغیر کسی کی محتاج نہ ہو۔ حالانکہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ قدیم ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ ممکن ہے کہ خدا کے لیے جہت مقرر ہو جو شرف اور عظمت [illegible] تو اس کا جواب یہ ہے کہ فوق، تحت وغیرہ جہات اس وقت مقرر ہوئی ہیں جب سے خدا تعالیٰ نے عالم کو اس ترتیب خصوصی پر پیدا کیا ہے۔ پیدائش عالم سے پہلے نہ فوق تھا نہ تحت نہ یمین نہ شمال، نہ قدام نہ خلف۔ الغرض کوئی جہت نہ تھی [illegible] فوق و تحت میں سر اور پاؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تو جب سر پاؤں والے ہی مفقود تھے تو فوق اور تحت کہاں۔

ایک اور دلیل سے بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ خدا کے لیے کوئی جہت مقرر نہیں [illegible] کسی جہت میں ہو تو خواہ مخواہ کسی جسم سے محاذی ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جو شے کسی جسم سے محاذی ہو وہ جسم [illegible] ہوتی ہے یا اس سے بڑا یا مساوی، کمی بیشی اور مساوات کے ساتھ وہی چیز موصوف ہو سکتی ہے جو کسی خاص مقدار [illegible] خدا تعالیٰ بھی کسی خاص مقدار اور حجم پر ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کا اپنے مقدار خاص [illegible] ممکن ہے تو ایسے خدا کا اس کے خاص مقدار اور اندازہ پر ہونے کے لیے کسی مخصص اور مرجح کو تلاش کرنا پڑے گا۔ [illegible] اپنے وجود میں کسی اور کا محتاج ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ آپ کی تقریر سے پایا جاتا ہے کہ جو چیز کسی جہت میں [illegible] ہوتی ہے وہ ضروری مقداری ہوتی ہے اور آپ پہلے لکھ آئے ہیں کہ اعراض بھی جہات کی طرف منسوب ہوتی ہیں [illegible] اعراض بھی مقداری چیزیں ہیں حالانکہ مقداری ہونا صرف اجسام ہی کا خاصہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں ہم نے اعراض [illegible] جہات کی طرف منسوب ہونے والی چیزیں کہا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اعراض کا جہات کی طرف منسوب ہونا عارضی طور پر ہے۔ جیسے جہات کی طرف ان کی منسوبیت عارضی ہے ویسے ہی ان کے عارضی طور پر مقداریت کو تسلیم کرنے میں بھی ہمیں کوئی عذر نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دس اعراض دس جواہر میں ہی حلول کر سکتی ہیں بیس میں نہیں، سو جیسے جواہر [illegible] دس کا لفظ بولا جا سکتا ہے ویسے اعراض پر بھی اس کا اطلاق درست ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جواہر پر اس لفظ کا اطلاق ذاتی طور پر ہے اور اعراض پر عارضی۔

اس جگہ پر ایک سوال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر خدا تعالیٰ جہت فوق میں استقامت پذیر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ جب خدا سے کوئی دعا مانگی جاتی ہے تو ہاتھ اور منہ اوپر کو اٹھا کر مانگی جاتی ہے۔ نیز حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک لونڈی کو آزاد کرنا چاہا اور اس کے ایمان کی بابت استفسار کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ اَیْنَ اللّٰہ۔ خدا کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا تو آپؐ نے فرمایا: اِنَّھَا مُؤْمِنَةٌ بے شک یہ مومنہ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ آسمان پر نہ ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف اشارہ کرنے پر اس کے ایمان کی تصدیق کیوں کرتے۔

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال بعینہٖ ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ جب خدا تعالیٰ کعبہ میں موجود نہیں تو ہم حج کرنے کیوں جاتے ہیں۔ نماز میں رو بقبلہ کیوں ہوتے ہیں۔ جب خدا زمین میں نہیں تو اس پر سجدے کیوں کرتے ہیں اور نہایت عجز و انکساری سے ماتھے کیوں رگڑتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر ایک امر میں ترتیب کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ دنیا کے کاموں میں سے کوئی کام لو جب اس میں ترتیب نہیں تو وہ کام بالکل مقبولیت کی نظر سے گرا ہوا ہوگا۔ نماز چونکہ دین کے کاموں میں سے نہایت اہمیت رکھتی ہے اور سب سے زیادہ ضروری ہے لہٰذا اس میں بھی کسی خاص ترتیب کی پابندی ضروری ہونی چاہیے۔ اگر نماز میں عام اجازت ہو کہ جدھر

چاہو منہ کر لو اور کوئی مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جائے کوئی مغرب کو، کوئی جنوب کو رخ کیے نماز گزار رہا ہو کوئی شمال کی جانب ہاتھ باندھے کھڑا ہو، تو یہ نماز کیسی بری معلوم ہو گی، ہر کوئی یہی کہے گا کہ یہ ایسا عظیم الشان دینی کام اور یہ اس کی بے ترتیبی۔۔۔ نماز میں روبقبلہ ہونے کی اصل غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں یکجہتی پیدا ہو اور اس سے ان کے نور عرفان اور خلوص محبت اور روحانیت میں بے حد ترقی ہو۔ نیز جب جملہ جہات اس بات میں برابر ہیں کہ ان میں سے جس کی طرف رخ کر کے ہم نماز ادا کریں، ادا ہو سکتی ہیں تو خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار قائم رکھنے کے لیے کعبہ والی سمت کو ہمارے لیے مقرر کر دیا اور اس کی بزرگی و عظمت ظاہر کرنے کے لیے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے بیت اللہ کا لفظ اس پر اطلاق کر دیا۔

الغرض جیسے روبقبلہ ہونے میں صدہا حکمتیں ہیں ویسے ہی دعا مانگنے کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اور منہ کو اٹھانا بھی خالی از حکمت نہیں۔ اس کی ایک ظاہری وجہ یہ ہے کہ جیسے کعبہ نماز کا قبلہ ہے ویسے آسمان دعا کا قبلہ ہے اور خدا تعالیٰ نماز اور دعا ان دونوں صورتوں میں جہت یا آسمان میں موجود ہونے سے پاک اور منزہ ہے۔ نماز کی حالت میں سر بسجود ہونا، اپنی پیشانی کو نہایت حقارت و تذلیل کی صورت میں خدا تعالیٰ کے سامنے رکھ دینا اور دعا مانگنے کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اور منہ کو اٹھانا ایک ایسی باریک حکمت بھی ہے جو ہر ایک صوفی میں سے بے حد بھید اور معارف اور عجائبات باطنی کا سرچشمہ ہے۔ وہ یہ کہ انسان کی ابدی نجات کا دارومدار اس بات پر ہے کہ خدا کے آگے نہایت انکساری اور فروتنی سے اپنے آپ کو پیش کیا جائے اور اس کی تعظیم کی بے حد ہو کر بغیر اس کے کوئی چیز نظر نہ آئے اور تعظیم، انکساری، فروتنی اپنے آپ کو ہیچ سمجھنا یہ سارے دل کے افعال ہیں۔ قوت، قبلہ اور اعضا، یہ سب اس کے آلات و اسباب ہیں۔ دل اور اعضاء میں ایسا باہم ربط ہے کہ اعضا کے متعلق جو جو عبادت کے کام ہیں، ان کو بار بار عمل میں لانے سے دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے اور دل میں جوں جوں روحانیت کے اصول قرار پذیر ہوتے جاتے ہیں، اعضاء میں صفائی اور راستی کا نور چمکنے لگتا ہے۔ جب انسان کی پیدائش کا مقصود بالذات یہ امر ہے کہ اپنی ہستی کو پہچانے اور یہ معلوم کرے کہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور جاہ و جلال کے آگے یہ ایک ذرہ کے مقدار کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ وہ محض نورانی چیز ہے اور اس کی پیدائش خاک سے ہے لہذا انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے چہرہ کو جو تمام اعضاء میں سے خاص شرف رکھتا ہے، زمین پر رکھے تاکہ اس کا بدن، عقل الغرض اس کی ہر ایک چیز خدا کی طرف جھک جائے۔

تعظیم دو طرح پر ہوتی ہے۔ دل کی تعظیم اور اعضاء کی تعظیم۔ دل کی تعظیم کا طریق یہ ہے کہ دل میں خدا تعالیٰ کی توحید کا پورا پورا اعتقاد ہو اور دل کے ذریعہ خدا کی علو مرتبہ کی طرف اشارہ کیا جائے۔

اعضاء کی تعظیم کی صورت یہ ہے کہ ان کے ذریعہ اس جہت کی طرف اشارہ کیا جائے کہ جو منجملہ اور جہات کے ایک خاص اہمیت اور شرف رکھتی ہو اور وہ جہت فوق ہے۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے کمالات اور فضائل ظاہر کرنا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ اس کی بات تو ساتویں آسمان سے بھی بلند ہے۔ اس جگہ آسمان کے حقیقی معنے ہرگز مراد نہیں ہوتے بلکہ آسمان سے استعارہ کے طور پر اس کی بلندی مرتبہ مراد ہوتی ہے۔ ایسے ہی دعا مانگنے کے وقت ہاتھ اور منہ کو آسمان کی طرف اٹھانے سے آسمان مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ خدا تعالیٰ کی علو اور رفعت شان کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور بس۔

دعا کی حالت میں اوپر کو ہاتھ اور منہ اٹھانے کی ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے دعا مانگنے

والے نفوس کی اصل غرض اس سے نعمتوں کا حصول مراد ہوتا ہے اور [illegible] ثابت شدہ بات ہے کہ خدا کی نعمتوں کے خزانے آسمانوں پر ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے رزق فرشتوں کو عطا کرتے ہیں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے

وفی السمآء رزقکم وما توعدون ۞ (الذریات ۲۲) اور آسمان میں [illegible] داخل ہے کہ جب خدا تعالیٰ سے کوئی چیز مانگے تو جہاں اس کے رزق کا خزانہ ہے اس کی طرف دیکھے۔

لونڈی کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] کی تصدیق کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ آپ خدا کو آسمان پر سمجھتے تھے بلکہ اصل بات یوں ہے کہ وہ لونڈی گونگی تھی [illegible] کے اظہار کرنے کی اور کوئی وجہ نظر نہ آئی بجز اس کے کہ آسمان کی طرف اشارہ کرے آپ نے سمجھا [illegible] خالق پر ایمان لائی ہوں دوسرے یہ کہ وہ لونڈی پہلے بت پرست تھی اور بت پرستوں کے خدا [illegible] تھے۔ اس نے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جتلایا کہ میں ان معبودوں سے بیزار ہو کر جو گھروں میں رہتے ہیں اس خدا تعالیٰ پر ایمان لائی ہوں جو گھروں میں رہنے سے پاک اور بالاتر ہے۔

اس جگہ پر ایک سوال وارد ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اگر خدا تعالیٰ جہت میں [illegible] ہونے سے پاک اور مقدس ہو تو خدا تعالیٰ کو ایک ایسی چیز ماننا پڑے گا جو ان چھ جہات سے [illegible]۔ نہ وہ جہان سے باہر ہے نہ اندر نہ جہان کے ساتھ متصل ہے نہ اس سے منفصل۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ایک چیز جس میں اتصال اور انفصال کی استعداد ہو اور کسی نہ کسی جہت کے ساتھ اس کو تعلق ہو، اتصال و انفصال اور دخول و خروج سے خالی نہیں ہو سکتی مگر [illegible] اس بات کو ہے کہ جس میں نہ اتصال کی استعداد ہو نہ انفصال کی صلاحیت اور نہ اس کو کسی جہت سے کوئی واسطہ ہو، [illegible] مفاہیم مذکورہ بالا صادق نہ آئیں تو کون سی قباحت لازم آتی ہے اس کی بعینہ نظیر یہ ہے کہ کوئی کہے کہ ایسی چیز کا پایا جانا محال ہے جو نہ قادر ہو نہ عاجز، نہ جاہل ہو نہ عالم۔ سو اگر اس چیز میں قدرت، عجز، جہل، علم کی قبولیت کی استعداد ہے تو اس کا قادر، عاجز، جاہل، عالم نہ ہونا، بے شک ناجائز اور ارتفاع النقیضین کا باعث ہے لیکن جن چیزوں میں بالکل وہ استعداد ہی نہیں مثلاً جمادات ان پر ان مفاہیم کا صادق نہ آنا کون سی خرابی کا موجب ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اتصال و انفصال اور جہات میں قرار پذیر ہونے کے قابل وہ چیزیں ہوتی ہیں جو متحیز ہوں یا کسی متحیز بالذات کے ساتھ قائم ہوں اور خدا تعالیٰ میں چونکہ متحیز اور متحیز بالذات کے ساتھ قائم ہونے کی شرط مفقود ہے لہٰذا خدا تعالیٰ نہ متصل ہے نہ منفصل، داخل ہے نہ خارج۔

اب خصم سے یہ پوچھنا چاہیے کہ بتلاؤ ایسی چیز کا موجود ہونا محال ہے یا ممکنات سے جو نہ متحیز ہو اور نہ کسی متحیز شے میں حلول کرتی ہو۔ یا یوں کہو کہ نہ وہ اتصال و انفصال کے قابل ہے اور نہ وہ کسی جہت کے ساتھ مخصوص ہو سکتی ہے اگر وہ بھی ممکن ہے ـــ تو ہمارا دعویٰ ثابت ہے، اگر انکار کرے تو ہم کہیں گے کہ یہ بات پہلے ثابت ہو چکی ہے کہ ہر متحیز (مکانی چیز) حادث ہے اور یہ کہ ہر حادث کے لیے کسی ایسے سبب کا ہونا ضروری ہے جو حادث نہ ہو۔ اس پر اگر وہ یہ کہے کہ اس قسم کی شے کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ نہ وہ کسی جہت میں نہ قابلِ اتصال و انفصال ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ سمجھ میں نہ آنے کا اگر یہ مطلب ہے کہ اس کی حقیقت کو ہماری قوت خیالیہ اور قوت متوہمہ ادراک نہیں کر سکتی تو بے شک یہ

بات درست ہے کیونکہ ہماری قوت خیالیہ اور متوہمہ میں وہی شے آسکتی ہے جو جسمانی ہو یا اجسام سے کسی قسم کا تعلق رکھتی ہو۔

اور اگر یہ مطلب ہے کہ اس قسم کی شے کے ثبوت پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں ہو سکتی تو یہ غلط ہے۔ ہم نے دلیل عقلی قائم کر دی ہے اور جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اس کے ہر ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

اور کوئی یہ کہے کہ جو چیز خیال اور وہم میں نہ آسکے واقع میں اس کی کوئی حقیقت اور ہستی نہیں ہوتی۔ وہ محض وہمی اور فرضی ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ قاعدہ درست ہو تو آپ کے خیال کی بھی کوئی ہستی نہ ہوگی، یہ بھی ایک موہوم اور اختراعی چیز ہوگی کیونکہ خیال خود خیال میں نہیں آسکتا ورنہ طرءیۃ الشیء لنفسہ کا اقرار کرنا پڑے گا۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں کہ قوت خیالیہ میں ان کا انتقال نہیں ہو سکتا۔ مگر وہ اپنے اندر واقعیت اور ثبوت کا مادہ رکھتی ہیں۔ مثلاً علم، قدرت، ارادہ، محبت، عداوت، حسد اور غصہ، خوشی، غمی وغیرہ وغیرہ۔ الغرض صفات نفسانی سب اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ خدا تعالیٰ بھی ان چیزوں میں ہی قیاس کر لو۔ تمہاری قوت خیالیہ اس کو ادراک نہیں کر سکتی مگر وہ نہایت زبردست اور سب سے اعلیٰ واقعی ذات ہے۔۔۔۔

آٹھواں دعویٰ

۸۔ خدا تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ عرش پر یا کسی اور جسم پر متمکن ہو۔ یعنی جس طرح بادشاہ کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے یا ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے۔ خدا کی نسبت یہ بات کہنی جائز نہیں کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کسی جسم پر متمکن ہو تو اس کو مقداری تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جو چیز جسم پر متمکن ہوتی ہے وہ یا اس سے بڑی ہوتی ہے یا اس کے برابر اور کمی بیشی اور مساوات کے ساتھ وہی شے موصوف ہو سکتی ہے جو مقداری ہو۔ الغرض جسم پر متمکن ہونا جسم یا عرض ہی کے ساتھ خاص ہے اور خدا تعالیٰ کا وجود نہ جسم ہے نہ عرض لہٰذا کسی جسم پر متمکن نہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ خدا تعالیٰ کا قول ہے الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى○ (طٰہٰ ۵) خدا عرش پر متمکن ہوا اور حدیث میں آیا ہے ينزل الله كل ليلة الى سماء الدنيا خدا ہر رات نیچے کے آسمان پر اترتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ عرش پر متمکن نہیں تو خدا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے کیا معنی۔

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ لوگ دو گروہ ہیں۔ عام لوگ اور علماء۔ پہلے گروہ کو اس قسم کے مسائل میں ہرگز دخل نہ دینا چاہیے۔ ان کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ وہ اس قسم کی باتوں پر ایمان لے آئیں۔ ان کی حقیقت میں ان کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ ان کے عقول ایسے امور کو بہت سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ سکتے۔ خدا کی طرف سے ان میں اتنی استعداد پیدا کی گئی ہے کہ وہ شریعت کے موٹے احکام کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں اور بس۔ مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے کسی شخص نے استوا کے معنے پوچھے تو آپ نے کہا

الاستوا مَعْلُوْمٌ وَ الكيفيةُ مجهولةٌ وَالسُّوَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ وَالْإِيْمَانُ وَاجِبٌ ۔

(استوا کے معنے معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مجہول۔ اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے اور اس پر ایمان لانا واجب)۔

علماء کے گروہ کو اس قسم کی باتوں میں توغل کسی حد تک جائز ہے مگر فرض عین نہیں۔ کیونکہ ضروری قدر صرف یہ ہے کہ خدا کی نسبت جمیع عیوب سے پاک ہونے اور ممکنات کی جملہ صفات سے منزہ ہونے کا اعتقاد رکھا جائے۔ قرآن مجید کے

سب معانی سمجھنے کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی۔

ایسی باتوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا کہ یہ بھی مقطعات قرآنی کی مانند متشابہات کے قبیل سے ہیں، بالکل ناجائز ہے کیونکہ مقطعات قرآنی ایسے حروف یا الفاظ ہیں جو اہل عرب کی اصطلاح میں کسی معنے کے لیے موضوع نہیں۔ اگر کسی اہل لغت کے کلام میں یہ حروف پائے جاتے تو ان کو لغو اور مہمل ہونے کا خطاب دیا جاتا۔ مگر چونکہ باری تعالیٰ کے کلام میں جو فصاحت و بلاغت کے مراتب میں سب سے انتہائی مرتبہ میں شمار کیا جاتا ہے مقطعات وارد ہیں لہٰذا ان کو متشابہات کا خطاب دیا گیا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان۔

یَنْزِلُ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلٰی سماءِ الدُّنْیَا الخ، حیثیت سے صحیح معنے اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ اس سے اس کے حقیقی معنے مراد لیے جائیں یا مجازی مگر کوئی اہل لغت اس کلام کو مہمل اور بے معنی نہیں کہہ سکتا۔

اس وضع کے جس قدر اقوال ہیں جاہل لوگ ان سے ایسے معنی سمجھتے ہیں جو عقل کے خلاف واقع ہوتے ہیں مگر علماء اپنی خداداد لیاقت کے ذریعہ ان کے اصلی اور صحیح معانی کو پا لیتے ہیں۔

خداتعالیٰ فرماتا ہے وَ ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ط (الحدید ۴) (جہاں تم ہو خدا تمہارے ساتھ ہے)۔ جاہل لوگ تو مَعَکُمْ کو حقیقی معنے پر محمول کرتے ہیں جو استوا علی العرش کے مخالف ہے مگر علماء سمجھ جاتے ہیں کہ اس سے مراد خدا کی رفعت علمی ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے قَلْبُ الْمُؤمِنِ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ (مومن کا دل خدا کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے)۔

جہلا تو انگلیوں کے وہی معنے سمجھتے ہیں جو متعارف ہیں مگر علماء یہاں بھی اصلیت کو پا جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ جیسے انگلیوں کے درمیان میں آئی ہوئی شے کو جدھر چاہیں پھیر سکتے ہیں ویسے ہی خداتعالیٰ مومن کے دل کو جدھر چاہے پھیر سکتا ہے۔ الغرض اس سے مراد قدرت علی التقلیب ہے۔

حدیث قدسی میں آیا ہے:

مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَ مَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً (جو مجھ سے ایک بالشت بھر قریب ہوتا ہے میں اس سے ایک ہاتھ کے قدر قریب ہوتا ہوں، اور جو میرے پاس چل کر آتا ہے اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں)۔ جہلا اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً سے وہی معنے سمجھتے ہیں جو متبادر اور معروف ہیں مگر اہل علم یہ معنے کرتے ہیں کہ جو شخص ذرا سی توجہ بھی میری طرف مبذول کرے میں اس پر اپنی رحمت نازل کرتا ہوں اور اس پر انعامات و اکرامات کا مینہ برسا دیتا ہوں۔

حدیث قدسی ہے لَقَدْ طَالَ شَوْقُ الْاَبْرَارِ اِلٰی لِقَائِیْ وَ اَنَا اِلٰی لِقَائِهِمْ اَشَدُّ شَوْقًا • (نیک کار لوگوں کو میرے ملنے کا بہت شوق ہے مگر مجھے ان سے بھی زیادہ ان کے ملنے کا اشتیاق ہے)۔

جہلا لفظ شوق سے وہی معنے لیتے ہیں جو مشہور ہیں۔ یعنی ایسی کیفیت جو انسان کو حصول مطلوب پر مجبور کردے۔ مگر اہل علم کہتے ہیں کہ جس چیز کا شوق ہوتا ہے، شوق اس کی طرف متوجہ ہونے اور اس کے حاصل کرنے کا سبب ہوتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ کبھی کبھی سبب کا لفظ بول کر اس سے مسبب کے معنے مراد لیے جاتے ہیں۔ سو اسی قاعدہ کے مطابق یہاں بھی لفظ شوق سے مراد طرح طرح کے انعامات اور قسم قسم کے درجات ہیں جو انہیں قیامت میں خاص طور پر عطا کیے جائیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس جہاں قرآن شریف میں خداتعالیٰ نے غضب اور رضا کو اپنی طرف منسوب کیا ہے وہاں عذاب و ثواب مراد

ہوتا ہے جو غضب اور رضا کا ثمرہ ہے۔

حدیث میں حجر اسود کے بارہ میں آیا ہے انه یمین الله فی الارض ، جہلا لفظ یمین کے معنے دائیں ہاتھ کے کرتے ہیں۔ مگر جب وہ اپنے اس مذہب کی طرف خیال کرتے ہیں کہ خداتعالیٰ عرش پر ہے تو گھبرا جاتے ہیں کیونکہ ایک طرف تو خداتعالیٰ عرش پر ہے اور ایک طرف کعبہ میں حجر اسود اس کا دایاں ہاتھ حدیث سے ثابت ہو رہا ہے مگر علماء یہاں بھی اصلیت کو پا جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ لفظ یمین مصافحہ کے معنے میں بطور مجاز کے مستعمل ہوا ہے۔ یعنی جب بادشاہ کے ہاتھ کو اس کی تعظیم کے لیے بوسہ دیا جاتا ہے ایسے حجر اسود کو بھی بوسہ دیا جاتا ہے۔

جب آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ اس قسم کے اقوال کو مقطعات قرآنی کی طرح متشابہات میں داخل کرنا درست نہیں تو اب ہم اصل بات کی طرف رجوع کر کے استواء کے متعلق بیان کرتے ہیں اور معترض کے اعتراض کا جواب دیتے ہیں۔

خداتعالیٰ نے الرحمٰن علی العرش استوی (طٰہٰ ۵) میں استواء کو جو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے، اس میں چار احتمال ہو سکتے ہیں ا۔ خدا عرش پر غالب ہے۔ ۲۔ خدا عرش پر ہر طرح سے قادر ہے۔ ۳۔ عرض کی مانند خدا نے عرش میں حلول کیا ہوا ہے۔ ۴۔ جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے ویسے خدا بھی عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔

پہلا معنی عقل کے نزدیک بالکل درست ہے مگر الفاظ کے لحاظ سے یہ معنی اس جگہ نہیں چسپ سکتا۔ کیونکہ اس جملہ میں کوئی بھی ایسا لفظ نہیں جو غلبہ پر دلالت کرے۔ تیسرا اور چوتھا معنی اگرچہ لفظی حیثیت سے صحیح ہے مگر عقل کے نزدیک بالکل غلط ہے۔ دوسرا معنی عقل اور لغت دونوں کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔ بس یہی معنے اس آیت کے ہیں کہ خداتعالیٰ عرش پر قادر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول ینزل الله الی السماء الدنیا کے دو معنی ہو سکتے ہیں. ا۔ عربی زبان میں یہ عام طور پر قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ کلام میں سے ایک لفظ کو حذف کر دیا جاتا ہے اور اس کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر کے اس کا حکم مضاف الیہ کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً خداتعالیٰ کے قول واسئل القریة (یوسف ۸۲) میں ہر شخص جانتا ہے کہ نفس قریہ سے سوال کرنا بالکل لغو اور بیہودہ ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اس جملہ میں لفظ اہل کا محذوف ہے۔ اصل میں یوں عبارت ہے واسئل اهل القرية ، اسی طرح عرب کا عام محاورہ ہے نزل الملك على باب البلد یہاں بھی عسکر کا لفظ محذوف ہوتا ہے جس کے ملانے سے ترجمہ یہ ہوگا۔ بادشاہ کا لشکر شہر کے دروازہ میں اترا کیونکہ جو شخص بادشاہ کے اترنے کی خبر دیتا ہے اگر اس سے پوچھا جائے کہ اس کے استقبال کے لیے کیوں نہیں کیا گیا تو وہ کہہ سکتا ہے کہ بادشاہ تو شکار کھیلنے گئے ہیں۔ ابھی تو صرف ان کا لشکر ہی اترا ہے۔ اگر عسکر کا لفظ محذوف نہ ہوتا تو مخبر کے کلام میں سخت تناقض واقع ہوتا ہے اور اس کا یہ جواب بالکل غلط ہوتا۔

سو اسی قاعدہ کے مطابق ہم کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں ملک (فرشتہ) کا لفظ محذوف ہے جو اللہ کی طرف مضاف ہے۔ اصل عبارت کے معنی یہ ہوا "پچھلی رات میں خداتعالیٰ کا ایک فرشتہ رحمت نیچے آسمان پر اترتا ہے"۔

۲۔ لفظ نزول کا ایک معنے تو مشہور ہے یعنی بلند مقام سے نیچے کی طرف انتقال کرنا۔ مگر کبھی کبھی یہ لفظ دو اور معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ (۱) مہربانی کرنا مخلوق پر رحم کرنا، بندوں کے گناہوں کو معاف کرنا اور طرح طرح کے انعامات انہیں عطا کرنا۔ (۲) انحطاط۔ اپنے مرتبہ سے گرنا۔ (تنزل) اب دیکھنا یہ ہے کہ ان معنوں میں سے کون کو نسا معنی خداتعالیٰ میں پایا جاتا

ہے۔ پہلا معنی تو نہیں پایا جاتا کیونکہ ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف نقل و حرکت ۔۔۔ جسمانی کے ساتھ خاص ہے۔ تیسرا معنی بھی خداتعالیٰ میں نہیں پایا جاتا کیونکہ وہ واجب الوجود ہے، قدیم ہے اور ۔۔۔ میں حائل ہے۔ دوسرا معنی بے شک باری تعالیٰ میں پایا جاتا ہے سو اس معنی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ فرماتے ہیں ۔۔۔ "خداتعالیٰ رات میں اپنے بندوں پر رحمت نازل کرتا ہے اس وقت اگر کوئی اس سے بخشش مانگے تو ۔۔۔

ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ جب خداتعالیٰ کا یہ قول رفیع الدرجت ذو العرش (غافر ۱۵) نازل ہوا تو صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم کے دلوں میں خداتعالیٰ کی عظمت، ہیبت اور دہشت ۔۔۔ اس سے سوال کرنے اور اپنی حاجتوں کے لیے دعا مانگنے سے ان کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ سمجھنے لگے کہ اتنی بڑی تجلی ۔۔۔ ہماری کیا ہستی ہے اور اتنی جرأت ہمارے دلوں میں کہاں ہے کہ اس کے روبرو کھڑے ہو کر اپنی حاجتیں ۔۔۔ دنیا کے کسی زبردست اور جلیل القدر فرمانروا کے آگے کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اس کے دربار میں قرب حاصل ۔۔۔ انگلی تک اٹھائے بلکہ عموماً دنیا کے بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب ان کے درباروں میں معمولی حیثیت کے ۔۔۔ ممکن ذرائع سے ان کی توصیف کرتے ہیں تو وہ ان کو سخت زجر و توبیخ سے اپنے درباروں سے نکال دیتے ہیں۔ الغرض جب صحابہ پر ایک سخت مایوسی کا عالم طاری ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ ان کو تسلی دی اور کہا کہ میں باوجود اس عظمت و بے نیازی کے انتہائی درجہ کا رحیم اور مہربان ہوں۔ میرے دربار میں جو آتا ہے خالی نہیں جاتا۔ میں امیر ۔۔۔ غریب ۔۔۔ نظر سے دیکھتا ہوں۔ کسی مفلس کا افلاس اس کی وقعت کو میرے نزدیک کم نہیں کرتا اور نہ کسی امیر کی وجاہت میرے نزدیک اس کی وقعت کا موجب ہو سکتی ہے۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ خداتعالیٰ کا اپنے بندوں کو تسلی دینا اور رحمت و برکت نازل کرنے کا وعدہ فرمانا بہ نسبت اس کی باعظمت شان کے نہایت تنزل ہے ان شفقت اور نوازش بھرے وعدوں و عفو و نزول کے ساتھ ظاہر کرنے سے یہ غرض ہے کہ اس کی اس قدر اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی کرنا اس کی شان و عظمت کے بالکل خلاف ہے۔

اور نیچے کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ جیسے یہ فلک جملہ افلاک سے نیچے ہے۔ اور اس کے نیچے اور کوئی فلک نہیں ویسے ہی اس کی رحمت و کرمت بھی بندوں پر انتہائی درجہ کی ہے یا یہ کہ جیسے یہ فلک بہ نسبت دیگر افلاک کے بندوں کے نزدیک ہے۔ ویسے ہی خداتعالیٰ کی رحمت اور شفقت بھی بندوں کے قریب ہے۔ رات کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ رات کو عامہ خلائق سوتے ہیں اور عشاق کو اپنے حقیقی معشوق (خدا) کے ساتھ باتیں کرنے کا اچھا موقع ہوتا ہے، خلوت میں جو لطف وصل کا آتا ہے جلوت میں اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوتا۔

نواں دعویٰ

۹۔ جس طرح دنیا کی چیزیں، مثلاً پانی، آگ، آسمان، خاک، گدھا، گھوڑا وغیرہ دیکھنے میں آسکتی ہیں ایسے ہی خداتعالیٰ بھی دکھائی دے سکتا ہے۔

ہمارے اس کہنے سے کہ وہ دکھائی دے سکتا ہے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہر وقت دیکھا جا رہا ہے یا جس وقت اسے کوئی دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات اور ماہیت میں اس امر کی قابلیت اور صلاحیت ہے کہ اس کے ساتھ رویت متعلق ہو سکے اور اس کی جانب سے کوئی چیز ایسی نہیں جو ہمیں اس کو دیکھنے سے روکے۔ اگر ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے تو یہ

ہمارا تصور ہے جو جو شے ظاہر ہو سکتی ہیں اور وہ ہم میں پائی جائیں تو فوراً ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

جب ہم کہتے ہیں کہ پانی پیاس بجھاتا ہے اور شراب مستی لاتی ہے تو اس کے کہنے سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ پانی بغیر پینے کے پیاس بجھا دیتا ہے اور شراب بغیر پینے کے مستی لاتی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ پانی پینے سے پیاس بجھا دیتا ہے اور شراب پینے سے مستی لاتی ہے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ خدا دیکھا جا سکتا ہے، اس سے ہماری مراد کیا ہے تو اب ہم آپ کو ثابت کر دیتے ہیں کہ خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم اس مدعا پر عقلی اور نقلی دونوں طرح کے دلائل قائم کریں گے۔ عقلی دلائل دو مسلکوں میں ختم کر لیتے ہیں۔

پہلا مسلک

اس میں یہ مضمون ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا بھی دیگر موجودات کی مانند اپنے اندر ایک وجود رکھتا ہے۔ اس کی بھی ذات اور حقیقت ہے جیسے دیگر موجودات کی۔ حقائق پر مختلف قسم کے ثمرے مترتب ہوتے ہیں۔ اس کی ماہیت بھی اس بات سے خالی نہیں۔ اگر اس میں اور دیگر موجودات میں فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ سب کے سب حادث ہیں اور یہ قدیم ہے۔ ان کی صفات بھی حادث ہیں اور اس کی صفات قدیم۔ ان کی صفات سے ان کے حدوث کا پتہ چلتا ہے مگر خدا تعالیٰ ایسی صفتوں سے پاک ہے جو شان الوہیت کے خلاف ہوں اور اس کے حدوث پر دلالت کریں تو اب ایسی چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کرنے میں کوئی ممانعت نہ ہوگی جو اس کی شان الوہیت میں رخنہ ڈالیں اور اس کے قدم کے منافی نہ ہوں۔

یہ یقینی بات ہے کہ جیسے دیگر موجودات کو ہم جانتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی ہمارا علم متعلق ہے اور اس کو بھی ہم جانتے ہیں اور اس کو جاننے سے نہ اس کی ذات میں کچھ تغیر لازم آتا ہے اور نہ اس کی صفات میں کچھ کمی اور نہ ہی کوئی چیز وہاں نظر آتی ہے جو اس کے حدوث پر دلالت کرے۔

رویت بھی علم کی ایک قسم ہے۔ سو جیسے دیگر موجودات کے مرئی ہونے سے ان کی حقیقتوں اور صفتوں میں کوئی کسی قسم کی کمی لازم نہیں آتی۔ خدا کے مرئی ہونے میں بھی کوئی کسی قسم کا نقص لازم نہیں آئے گا۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اگر خدا تعالیٰ مرئی ہوا تو ضرور کسی جہت میں ہوگا اور یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ جہات میں ہونا اجسام اور اعراض کے ساتھ خاص ہے۔ بس لازم آیا کہ خدا تعالیٰ بھی اجسام یا اعراض کے قبیل میں سے ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کے مرئی ہونے کے لیے یہ ضروری امر نہیں کہ وہ کسی جہت میں ہو کر مرئی ہو۔

بہرحال یہ ایک نظری مقدمہ ہے کہ مرئی ہونے کے لیے جہت میں ہونا ضروری ہے جب تک اس پر فریق مخالف سے دلیل قائم نہ ہو یہ مقدمہ قابل تسلیم نہیں۔ زیادہ سے زیادہ فریق مخالف یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نے جس چیز کو دیکھا ہے جہت ہی میں دیکھا ہے۔ لیکن کوئی چیز ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی جو کسی خاص جہت میں قرار پذیر نہ ہو۔

یہ سخت حماقت اور جہالت ہے جو یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ ہم نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جو جہت میں نہ ہو۔ لہٰذا خدا بھی مرئی نہیں ہو سکتا۔ کسی کے نہ دیکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں بھی جو چیز کسی جہت سے تعلق نہ رکھتی ہو وہ مرئی نہ ہو سکے۔ اگر دیکھنے اور مشاہدہ پر ہی دار و مدار ہے تو خداوند کریم کو جسم کہہ دینے میں کیا تامل ہے کیونکہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ خدا فاعل ہے اور ہم جس فاعل کو دیکھتے ہیں وہ جسم ہی ہوتا ہے۔ پس خدا بھی جسم ہونا چاہیے۔ علیٰ ہذا القیاس دنیا میں جو چیز موجود ہے وہ عالم سے خارج ہے یا اس کے اندر۔ اس میں اتصال کی قابلیت ہے یا انفصال کی استعداد ہے۔ ہمارے دیکھنے میں

کوئی شے چھ جہتوں میں سے کسی نہ کسی جہت سے خالی نہیں۔ پس صاف ظاہر ہو گیا کہ خدا تعالیٰ عالم سے خارج ہے یا اس کے اندر، اس میں بھی اتصال یا انفصال کی قابلیت ہے۔ کسی نہ کسی جہت میں بھی ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ ان سب باتوں سے پاک اور منزہ ہے۔

فریق مخالف کے نزدیک مسلمہ قاعدہ ہے کہ جس طریق پر ایک مشاہدہ ہو اسی طریق پر تمام اشیاء کا مشاہدہ کرنا بھی ضروری ہے مگر یہ ان کا قاعدہ خود ان پر بالکل غلط ہے۔ اور اس میں ذرا بھی راستی نہیں ورنہ اعراض کے وجود سے انکار لازم آئے گا کیونکہ ہم جسموں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے احیاز میں متحیز بالذات ہیں اور ہر ایک اپنی خاص شکل اور ہیئت کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر اعراض میں یہ بات مفقود ہے۔ پس لازم آنا چاہیے کہ اعراض موجود ہی نہیں۔

خدا تعالیٰ اپنے آپ کو بھی دیکھتا ہے اور کائنات عالم کو بھی دیکھتا ہے۔ حالانکہ وہ بذات خود نہ کسی جہت میں ہے اور نہ ہی کائنات عالم کی نسبت سے اسے کوئی جہت حاصل ہے۔ پس اگر مرئی ہونے کے لیے جہت میں ہونا ضروری ہے تو لازم آئے گا کہ خدا تعالیٰ اپنے آپ کو نہیں دیکھتا وَهُوَ صَرِيحُ الْبُطْلَانِ۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ مرئی وہ چیز ہو سکتی ہے جو کسی جہت میں ہو۔ ان کے نزدیک مرئی ہونے میں یہ بھی شرط ہے کہ مرئی آنکھ کے مقابل ہو۔ ان کی یہ شرط بھی غلط ہے شیشہ میں آدمی اپنے آپ کو دیکھتا ہے حالانکہ یہ بات وہاں نہیں ملتی کیونکہ مقابلہ تب ہو جب آدمی اپنے آپ کے سامنے کھڑا ہو یا یوں کہیے کہ ایک چیز کی دو چیزیں بن جائیں۔ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ شیشہ میں آدمی کی تصویر منقش ہو جاتی ہے جو دکھائی دیتی ہے اور آنکھ کے مقابل بھی ہوتی ہے۔ یہ جواب بالکل غلط ہے کیونکہ فرض کرو ایک شیشہ دیوار میں لگا ہوا ہے۔ تم بقدر دو گز اس سے پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ تو تم کو اپنی صورت شیشہ سے دو گز پرے نظر آئے گی۔ اگر ایک گز اور پیچھے ہٹ جاؤ تو وہ بھی ایک گز اور پیچھے نظر آئے گی۔ پس اگر شیشہ کے اندر تمہاری صورت منقش ہوتی تو تمہارے شیشہ سے پیچھے ہٹنے پر صورت شیشہ سے الگ ہو کر یوں دکھائی دیتی۔ شیشہ کے پیچھے جو چیز ہے وہ شیشہ کے بیچ میں حائل ہونے کے باعث دیکھنے والے سے پوشیدہ ہوتی ہے اور شیشہ کے روبرو یا نیچے اس کے دائیں یا بائیں بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو شیشہ میں منقش ہو سکے۔

یہ قاعدہ ہے کہ روزمرہ کے مشاہدات کے خلاف جو چیزیں ہوتی ہیں، جب تک ان کا پتی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کر لیا جائے، ان کے ممکن الوقوع ہونے کو عقل ہرگز تسلیم نہیں کرتی۔ اگر کسی ایسے شخص سے جس کو اپنی صورت کبھی دیکھنے اور شیشہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو تو پوچھو کہ کیا تم اپنی شکل شیشہ میں دیکھ سکتے ہو تو وہ صاف کہہ دے گا کہ ایسا ہونا محال ہے کیونکہ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں شیشہ کے اندر داخل ہو کر اپنے آپ کو دیکھ لوں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی شکل کی مثل کو شیشہ کے جسم میں یا شیشے کے پیچھے کسی جسم میں دیکھوں۔ نیز کسی چیز کو دیکھنے کے لیے اس کا آنکھ کے مقابل ہونا شرط ہے جو اس صورت میں مفقود ہے۔ اس شخص کی اور تقریر تو بالکل درست ہے مگر اس کا یہ کہنا کہ دیکھنے کے لیے مقابلہ شرط ہے، غلط ہے کیونکہ اگر مقابلہ ضروری ہوتا تو شیشہ سے اپنا منہ ہرگز نظر نہ آتا۔

دوسرا مسلک

جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کے مرئی ہونے کا انکار کیا ہے انہوں نے رویت کے معنی نہیں سمجھے۔ اگر سمجھے بھی ہیں تو سرسری طور پر۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ خدا تعالیٰ کے مرئی ہونے کی وہی کیفیت ہے جس کیفیت سے ہم جسموں، شکلوں اور

رنگوں وغیرہ کو دیکھتے ہیں اس حیثیت کے ساتھ خدا کا مرئی ہونا ہمارے نزدیک بھی باطل ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مطلق رویت کے معنی بیان کر کے ان امور کو وضاحت کے ساتھ کھول دیں جن کا پایا جانا رویت کے لیے ضروری ہے اور پھر یہ بھی بیان کر دیں کہ ان امور میں سے کون کون سا امر خدا میں پایا جاتا ہے اور کون نہیں پایا جاتا تاکہ آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے کہ خدا تعالیٰ مرئی ہو سکتا ہے اور رویت بھی اس میں حقیقی طور پر پائی جاتی ہے اگرچہ لفظی حیثیت سے رویت کا اطلاق مجازی طور پر ہو۔

رویت کے لیے دو چیزیں کا ہونا ضروری ہے ایک محل یعنی وہ چیز جس میں قوت باصرہ رکھی جائے جیسے آنکھ اور ایک وہ چیز جس پر رویت واقع ہو مثلاً رنگ، مقدار اور جسم وغیرہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں میں کس کو رویت میں زیادہ دخل ہے اور کس پر یہ بات صادق آتی ہے کہ اس کے ہونے سے رویت کی حقیقت موجود ہو گی۔

محل پر چنداں رویت کا مدار نہیں ہوتا۔ جس شے کے ذریعہ ہم اشیاء کو دیکھتے ہیں وہ آنکھ نہیں بلکہ وہ ایک قوت ہے جو آنکھ میں قدرت نے رکھ دی ہے۔ آنکھ تو ایک جسم مخصوص ہے جو دیکھنے کا ذریعہ اور آلہ ہے۔ اگر وہ قوت دل میں یا پیشانی میں یا کسی اور عضو میں رکھی جاتی تو اس وقت بھی یہ صحیح ہوتا کہ ہم نے فلاں چیز کو دیکھا ہے۔ یہ ایک اتفاقی بات ہے جو قدرت نے قوت باصرہ کو جرم مخصوص (آنکھ) میں رکھا ہے اور کسی عضو میں نہیں رکھا۔

اب رہی دوسری بات یعنی وہ چیز جس پر رویت واقع ہوتی ہے۔ سو کسی خاص چیز پر رویت موقوف نہیں یعنی رویت میں یہ بات نہیں ہوتی کہ اگر ہم زید کو دیکھیں تو دیکھنا متحقق ہو اور اگر عمر کو دیکھیں تو اس پر دیکھنا صادق نہ آئے۔ اگر رویت میں کسی خاص چیز کا دیکھنا شرط ہوتا تو سیاہی کو دیکھ لینے سے سفیدی کے دیکھنے پر رویت کا لفظ صادق نہ آتا اور رنگ کو دیکھنے سے کسی شے کی رفتار کو دیکھنے پر رویت کا لفظ صادق نہ آتا۔ کسی روشنی کو دیکھ لینے سے جسم کے دیکھنے پر دیکھنا اطلاق کیا جا سکتا۔ حالانکہ ہماری ہر ایک چیز دیکھنے پر دیکھنا صادق ہے اور سیاہی، سفیدی، رنگ، حرکت، شکل، جسم وغیرہ اشیاء پر ایک ہی طرح لفظ محسوسات اور مبصرات کا اطلاق ہوتا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ جس پر ہماری رویت واقع ہوتی یعنی جس کو محسوس و مبصر کہا جاتا ہے وہ کلیت اور عموم کے درجہ میں ہے۔ کسی خاص فرد میں اس کا پایا جانا ضرور نہیں مثلاً آگ، پانی، مٹی، لکڑی، سیاہی، سفیدی وغیرہ۔

اگر زیادہ غور اور تدبر سے کام لیا جائے تو رویت کی حقیقت میں ایک تیسری چیز کی جھلک بھی نظر آتی ہے، جس سے اس کی حقیقت کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کی رو سے رویت بے علم اور ادراک کا ایک قسم ہے جو تخیل سے کئی حصے زیادہ کشف تام کا موجب ہوتا ہے۔ تم آنکھیں بند کر کے اپنے کسی دوست کا خیال کرو تو اپنے خیال میں اس کی صورت موجود پاؤ گے۔ اس صورت میں اس کی شکل و شباہت اس کے نقوش، رنگت وغیرہ میں کسی قسم کا فرق نہ پاؤ گے۔ پھر تم آنکھیں کھولو تو فرض کرو کہ وہ دوست تمہاری آنکھ کے سامنے کھڑا ہے جب تم اس کو عالم واقع میں اپنی آنکھ سے دیکھو گے تو اس وقت دوست کی کوئی اور صورت جو اس کی پہلی صورت خیالیہ کے خلاف ہو تمہاری قوت خیالیہ میں ہرگز نہ اترے گی۔ بلکہ اس کی صورت جو تمہاری آنکھ کے سامنے ہے اس کی صورت خیالیہ کا بعینہ نقشہ ہو گی اور اس کے ساتھ مل کر کشف تام کا موجب ہو گی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تخیل بھی ادراک کی ایک قسم ہے مگر یہ منشاء ادراک بننے میں بہت بڑھا ہوا ہے اور رویت بھی اسی کی ایک قسم ہے لیکن یہ بہ نسبت تخیل کے منشاء ادراک بننے میں بہت بڑھا ہوا ہے۔

کائنات عالم میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا ادراک تعقل اور تخیل دونوں کے ذریعہ ہم کر سکتے ہیں مثلاً آسمان،

زمین، سورج، چاند، پانی، مٹی وغیرہ اور بعض ایسی ہیں کہ تعقل کے ذریعہ [illegible] سکتے ہیں لیکن وہ ہماری قوت خیالیہ میں نہیں اتر سکتیں مثلاً خداتعالیٰ اس کی صفت قدرت، علم، عشق، [illegible]، تالیف۔ الغرض جن چیزوں کے لیے رنگ اور مقدار نہیں وہ سب کی سب دوسری قسم میں داخل ہیں۔ [illegible] کی قسم کی چیزوں کو جب ہم تعقل کے ذریعہ ادراک کر سکتے ہیں تو یہاں اس طرح بھی ہم ان کو ادراک کرتے ہیں [illegible] (تعقل) سے وہ نسبت ہو جو رویت کو تخیل کے ساتھ نسبت ہو یعنی جیسے رویت میں یہ نسبت تخیل کے [illegible] ادراک میں یہ نسبت ادراک تعقلی کے اعلیٰ درجہ کا کشف ہو۔ اس قسم کا ادراک نفس [illegible] موٹی بات ہے جس پر استدلال پکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی ادراک کا نام ہم رویت رکھتے ہیں [illegible] ہم خدا کو مرئی کہتے ہیں۔ یعنی خدا کو ہم دو طرح جان سکتے ہیں۔ تعقل کے ذریعہ جو تعقل سے بہت بڑھ [illegible]۔

ہاں اتنا ضرور کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں چونکہ نفس ظلمات حیوانی اور [illegible] میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اور دنیاوی کاروبار میں اس کو یہاں تک مصروفیت ہوتی ہے کہ زہد و مجاہدہ اور ریاضت [illegible] موقع ملتا ہے اس لیے دنیا میں اس کے اندر وہ صفائی اور نورانیت نہیں ہوتی جس سے خداتعالیٰ کی نورانی ذات [illegible]۔ [illegible] پلکیں اور آنکھ کی پتلی دیکھنے سے نہیں روکتی ویسے ہی نفس کے یہ چند روزہ مشاغل اور بدنی تعلقات اس [illegible] خدا [illegible] مشاہدہ کرنے میں سدراہ نہیں ہوتے۔ آخرت میں جبکہ نفس جسمانیت کی کدورتوں سے پاک و صاف ہو جائے گا اور [illegible] اس میں جھلک مارنے لگے گی تو خداتعالیٰ کو دیکھ لینا ایسا سہل امر ہو جائے گا جیسے دنیا کی چیزوں کو دیکھنے کے وقت [illegible] نہیں ہوتی اور جیسے دنیا کی چیزوں کو ہم آنکھ کے ذریعہ دیکھتے ہیں ویسے ہی ممکن ہے کہ قیامت کے روز آنکھ ہی میں ایسی استعداد [illegible] جس سے خدا کو دیکھ لینا ممکن ہو سکے۔

نقلی دلیل

شریعت میں خدا کے مرئی ہونے کے متعلق اس کثرت سے روایات آئی ہیں [illegible] ان کی رو سے خدا کے مرئی ہونے پر اجماع کے انعقاد کا دعویٰ کیا جائے تو ہرگز مبالغہ پر محمول نہ ہوگا۔ جس قدر اہل علم اور بزرگان دین گزرے ہیں وہ اپنے اپنے زمانہ میں خدا سے یہی دعائیں مانگتے گئے کہ ہمیں اپنا آپ دکھلا۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ ان کو خدا کے دیکھنے کی امید تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ ہر وقت خدا سے دیدار کا سوال کرتے تھے۔ آپؐ کے اس بارہ میں اس کثرت سے اقوال ہیں جن سے ہر ایک آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ خدا کو دیکھنا ممکن ہے۔

سب سے بڑھ کر ہمارے اس دعویٰ کا بین ثبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ہے

رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ط (اعراف۔ ۱۴۳) اے اللہ مجھے اپنا آپ دکھا میں تجھے دیکھ سکوں۔

موسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا کہ ان کو معاذ اللہ یہ خبر نہ تھی کہ خدا کا مرئی ہونا محال ہے سراسر جہالت اور حماقت ہے۔ یہ کس قدر غضب کی بات ہے کہ معتزلہ کو تو معلوم ہو گیا کہ خداتعالیٰ مرئی نہیں ہو سکتا اور اس کا مرئی نہ ہونا اس کی ذاتی صفت ہے، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو جن کی یہ شان ہے کہ خداتعالیٰ کے ساتھ باتیں کرنے کا درجہ حاصل ہے۔ اس بات کا علم نہ ہو۔ جب معتزلہ کے نزدیک خدا کا مرئی نہ ہونا اس کی صفت ذاتی ہے اور جیسے دیگر صفات کو جاننا موجب ایمان اور نہ جاننا موجب کفر ہے ویسا ہی اس صفت کا بھی حال ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام (معاذ اللہ) کافر اور ملحد

ٹھہریں گے۔

معتزلہ سے ہم پوچھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو خدا کے کسی خاص جہت میں ہونے کا اعتقاد تھا یا یہ تو جانتے تھے کہ اس کو جہت سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر آپ کو اس بات کا علم نہ تھا کہ جس چیز کو جہت سے کوئی سروکار نہ ہو وہ مرئی نہیں ہو سکتی۔ اگر پہلی بات ہے تو خدا کی نسبت جہت میں ہونے کا اعتقاد رکھنا اور شرک اور بت پرستی دونوں برابر ہیں اور اگر موسیٰ علیہ السلام کو اس بات کا علم نہ ہو تا کہ جو چیز کسی جہت میں نہ ہو وہ مرئی نہیں ہو سکتی تو یہ بات شان نبوت کے بالکل خلاف ہے۔ معتزلہ تو کہتے ہیں کہ جو چیز کسی جہت میں نہ ہو اس کا مرئی نہ ہونا بدیہی امر ہے۔ نہایت تعجب ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس معمولی سی بات کا بھی علم نہ تھا۔ سخت حیرت کا مقام ہے کہ معتزلہ اس بات کو تاڑ گئے مگر بہت جلیل القدر پیغمبر اس سے لاعلم ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے چاہے معتزلہ کو جھوٹے اور جاہل تسلیم کر لیں اور چاہے ایک مقتدر پیغمبر کو جاہل اور صفات باری تعالیٰ سے ناواقف مان لیں۔

اس جگہ ایک اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ کے نزدیک خدا تعالیٰ کو دیکھنا قیامت کے روز ہو گا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام دنیا میں خدا کو دیکھنے کی خدا سے درخواست کرتے ہیں۔ جس سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ نیز موسیٰ علیہ السلام کے سوال کے جواب میں خدا تعالیٰ کا یہ جواب لن ترانی۔ (تم اسے ہرگز نہیں دیکھ سکتے)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو دیکھنا ممکن نہیں نیز معلوم ہوتا ہے لاتدرکہ الابصار (اس کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں خدا کو دیکھنے کے متعلق خدا سے سوال کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کو دیکھنا ممکن ہے مگر آپ کو اس کا وقت معلوم نہ تھا یعنی ان کو یہ علم نہ تھا کہ خدا کو دیکھنا قیامت کے روز ہو گا۔ دنیا میں اس کو دیکھنے کی استعداد آپ میں نہیں ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو غیب کی چیزیں صرف اتنی ہی معلوم تھیں جتنی خدا نے ان کو بتلا دیں۔ ہر ایک بات کا علم خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے۔

کئی دفعہ یہ بات ہوئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے خدا تعالیٰ سے دعائیں مانگیں اور ان کو اپنی دعائیں قبول ہونے کا بھی یقین تھا۔ مگر خدا نے کسی مصلحت کی وجہ سے ان کو قبول نہ کیا۔

موسیٰ علیہ السلام کے جواب خدا کے قول لن ترانی کے یہ معنی ہیں کہ تو مجھے دنیا میں نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جواب سوال کے موافق ہوتا ہے۔ آپ کا سوال بھی دنیا میں خدا کو دیکھنے کے بارہ میں تھا اور آپ کو جواب بھی اسی پہلو پر دیا گیا ہے۔ یعنی آپ خدا کو دنیا میں نہیں دیکھ سکتے، ہاں اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام آخرت میں خدا کو دیکھنے کے بارہ میں خدا سے درخواست کرتے اور اس کے جواب میں خدا فرماتا لن ترانی تو بے شک معتزلہ کا قول درست تھا۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (انعام ۱۰۳) کے یہ معنے ہیں کہ آنکھیں پورے طور پر اور جملہ اطراف سے خدا کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ جیسے جسم کو دیکھنے سے اس کی سب خصوصیات کا اندازہ ہو سکتا ہے ویسے خدا کا ٹھیک ٹھیک احاطہ آنکھوں کی استعداد سے باہر ہے۔ وہ چونکہ نورانی ذات ہے لہٰذا آنکھیں اس کو دیکھنے کے وقت ٹھہر جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کے مرئی ہونے میں لوگوں میں عجیب کھلبلی مچ گئی۔ فرقہ حشویہ نے خدا تعالیٰ کے لیے جہت کا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اس خیال پر کہ کسی نہ کسی جہت میں ہونے کے بغیر کوئی چیز جہاں میں موجود نہیں ہو سکتی جو چیز موجود ہو گی اس کو ضرور کسی نہ کسی جہت کے ساتھ خصوصیت ہو گی۔

معتزلہ نے جہت سے تو خدا تعالیٰ کو مقدس و منزہ تسلیم کیا مگر اس کے ساتھ ہی اس کے مرئی ہونے کا بھی انکار کر دیا۔ محض اس بنا پر کہ مرئی ہونے کے لیے کسی نہ کسی جہت میں ہونا ضروری ہے اور خدا کو کسی جہت سے کوئی تعلق نہیں۔

حشویہ نے تو یہاں تک تفریط کی کہ خدا کو اجسام و اعراض کے ساتھ ملا دیا۔ معتزلہ نے یہاں تک افراط سے کام لیا کہ نصوص شرعیہ کو بالائے طاق رکھ کر خدا کی تنزیہ و تقدیس میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا۔ لیکن اہل السنۃ والجماعۃ نے جنہوں نے جہت کا تو اس بنا پر انکار کر دیا کہ یہ خدا کے جسم ہونے کو مستلزم ہے مگر رویت کو جائز قرار دیا۔ اس لیے کہ رویت علم کا اعلیٰ درجہ اور قسم ہے جس کے ذریعہ خدا کی حقیقت کا کامل طور پر انکشاف ہو جاتا ہے۔

انہوں نے اس بات کو سمجھ لیا کہ خدا کا جسم نہ ہونا جہت کی نفی کو مستلزم ہے۔ لیکن اس کا معلوم ہونا اس کے مرئی ہونے کو مستلزم ہے کیونکہ رویت بھی علم کا ایک شعبہ ہے۔

دسواں دعویٰ

۱۰۔ خدا واحد ہے۔ لفظ واحد کئی معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ کبھی اس کے معنی ہوتے ہیں: وہ چیز جو مقداری نہ ہو، اپنے اندر کمیت نہ رکھتی ہو، قابل قسمت نہ ہو۔ اس معنی کے مطابق کئی ایک اشیاء پر لفظ واحد کا اطلاق ہو سکتا ہے مثلاً علم، شجاعت، بزدلی، غمی، خوشی وغیرہ۔ الغرض جو چیزیں نہ اجسام ہیں نہ اجسام کے ساتھ قائم ہیں، اس معنی کے لحاظ سے وہ واحد کہلاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ بھی اس معنی کے مطابق واحد ہے کیونکہ نہ اس میں کمیت ہے نہ مقدار، نہ یہ جسم ہے نہ عرض اور کبھی اس کے معنی ہوتے ہیں وہ چیز جس کے ہم مرتبہ کوئی اور چیز نہ ہو۔ آفتاب کو اس معنی کے مطابق واحد کہہ سکتے ہیں اور بھی جو جو چیزیں کسی نہ کسی کمال میں یکتا ہیں، واحد کا لفظ ان پر بولا جا سکتا ہے۔ خدا بھی اس معنی کے مطابق واحد ہے کیونکہ نہ اس کی کوئی ضد ہے اور نہ اس کا کوئی شریک۔ ضد تو اس لیے کہ ضد اس چیز کا نام ہے جو دوسری چیز کے ساتھ ایک محل پر علیٰ سبیل البدل وارد ہو سکے۔ جیسے سفیدی سیاہی کی ضد ہے اور خدا کے لیے چونکہ محل نہیں لہٰذا اس کی ضد بھی نہیں اور شریک اس لیے کہ اس کا کوئی شریک ہو تو وہ جملہ کمالات میں یا اس کا ہم پلہ ہو گا یا اس سے اعلیٰ ہو گا یا کم، یہ تینوں باطل ہیں۔ پہلی شق تو اس لیے باطل ہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ جن دو چیزوں پر دو کا لفظ صادق آتا ہے ان کا باہم متغائر ہونا ضروری ہے ورنہ ان کو دو کہنا جائز نہ ہو گا۔ ایک سیاہی دوسری سیاہی سے محض اس لیے ممتاز ہوتی ہے کہ ان میں سے ایک مثلاً زید کے بالوں کے ساتھ قائم ہے اور دوسری بکر کے بالوں کے ساتھ یا ایک ہی محل کے ساتھ ان میں سے ایک صبح کے وقت قائم ہوئی ہے اور ظہر کے وقت وہ چلی گئی اور دوسری اس کی جگہ قائم ہو گئی ہے۔ اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہ ہو تو ان کو دو کہنا درست نہ ہو گا۔

جو چیزیں باہم متغائر ہوتی ہیں یا تو ان میں تغائر حقیقی ہوتا ہے مثلاً حرکت اور رنگ۔ یہ دو چیزیں ایک وقت میں ایک محل کے ساتھ قائم ہوں مگر ان کی حقیقتوں کا باہم تباین ان کے امتیاز کے واسطے کافی ہے۔ ان کے امتیاز کے لیے اس بات کی ضرورت نہیں کہ الگ الگ محلوں کے ساتھ قائم ہوں یا ایک محل کے ساتھ مختلف وقتوں میں قائم ہوں اور کبھی دو چیزوں میں اعتباری تغائر ہوتا ہے مگر یہ تب ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ الگ الگ محلوں کے ساتھ قائم ہوں یا ایک محل کے ساتھ مختلف وقتوں میں قائم ہوں ورنہ ان کو دو کہنا اور ان میں امتیاز قائم کرنا بالکل غلط ہو گا۔ سو اگر خدا تعالیٰ کا شریک اس کے ہم پلہ ہو اور ان دونوں کی حقیقت ایک ہو تو ان کو دو کہنا اور ایک دوسرے سے الگ الگ خیال کرنا تب جائز ہو جب خدا تعالیٰ اور محل کے ساتھ قائم ہو۔ مگر مختلف وقتوں میں یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کے لیے نہ کوئی محل ہے نہ مکان نہ اس کو کسی جہت سے تعلق ہے نہ زمانہ سے

دیگر۔ پس ثابت ہوا کہ اس کا کوئی شریک نہیں جو اس کے ہم پلہ ہو اور اس کی ماہیت میں مشترک ہو۔

خدا کا شریک اس لیے بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ خدا اس کو کہا جاتا ہے جو جملہ موجودات سے کمالات میں فائق ہو۔ کسی صفت میں کوئی موجود اس کے مساوی نہ ہو تو جس کا نام آپ خدا کا شریک رکھتے ہیں حقیقت میں خدا وہی ہے جس کو آپ خدا بتاتے ہیں۔ دوسرا نہیں کیونکہ خدا کی تعریف اس پر صادق نہیں آسکتی اور اگر اس کا شریک اس سے کم ہو تو وہ تعریف نہیں ... اس صورت میں خدا ایک ہی رہے گا۔

اس جگہ پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ کا یہ کہنا کہ اللہ کے لفظ کے یہ معنے ہیں وہ ذات جو جملہ موجودات سے کمالات میں فائق اور برتر ہو یہ ایک اصطلاحی بات ہے۔ آپ کی اصطلاح میں فریق مخالف کو کوئی کلام نہیں۔ فریق مخالف تو صرف یہ کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ تمام عالم ایک خالق کا مخلوق نہ ہو بلکہ آسمان وما فیہا کا خالق اور ہو اور زمین وما فیہا کا خالق جدا ہو۔ یا جمادات ایک خالق کی مخلوق ہوں اور حیوانات اور نباتات دوسرے کی۔ یا خالق شر اور ہو اور خالق خیر کوئی اور ہو یا جواہر کا خالق اور ہو اور اعراض کا خالق اور ہو۔ حاصل یہ ہے کہ آپ کے من گھڑت معنی کے مطابق صرف ایک ہی خالق پر بولا جائے اور دوسرے خالقوں پر اس کا اطلاق درست نہ ہو۔ لیکن ان ایک خالقوں کے بطلان پر جب تک آپ استدلال نہ قائم کریں خدا تعالیٰ کی توحید ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ فریق مخالف کے نزدیک اللہ کے معنی خالق ہیں اور ممکن ہے کہ خالق کئی ایک ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کائنات تمام کی تمام ایک خالق کی مخلوق نہ ہو تو دو بات سے خالی نہ ہوگا بالفرض جواہر اور بعض اعراض ایک خالق کے مخلوق ہوں گے اور بعض دوسرے کے پیدا کردہ ہوں گے یا تمام جواہر کا خالق الگ ہوگا اور جملہ اعراض کا پیدا کرنے والا الگ۔ یہ دونوں احتمال باطل ہیں۔ پہلا تو اس لیے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ خالق آسمان کو زمین پیدا کرنے کی بھی قدرت ہے یا نہ۔ اگر قدرت ہے اور خالق زمین کو بھی آسمان پیدا کرنے کی قدرت ہے تو دونوں خالق اس خاص قدرت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوں گے۔ اب زمین ان دو خالقوں کے درمیان ہوگی اور یہ ظاہر ہے کہ زمین کی ہر دو خالقوں سے نسبت برابر ہے اور خالقوں کی جانب سے بھی ایسا امر معلوم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے زمین کسی ایک کی طرف منسوب ہو سکے۔ دوسرے کی طرف اس کی نسبت جائز نہ ہو۔ سو زمین کا ایک خالق کا مخلوق ہونا اور دوسرے کی مخلوق نہ ہونا ترجیح بلا مرجح ہے اور یہ محال ہے اور اگر خالق آسمان کو زمین کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں تو یہ بھی محال ہے کیونکہ جملہ جواہر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ ایسی ذات جس کی قدرت قدیم ہے اگر ایک چیز پر قادر ہو تو اس کی مثل پر بھی ضرور قادر ہوتی ہے، خاص کر جب کہ وہ ذات ایک سے زیادہ چیزوں کے ایجاد پر قادر ہے۔ اس وقت ان چیزوں کی مثال پر اس کی قدرت ضرور تسلیم کرنی پڑے گی۔ سو جب خالق آسمان، آسمان کی کئی ایک اشیاء کی ایجاد پر قادر ہے تو زمین پر اس کی قدرت کیوں نہ ہوگی جو جوہر اور جسم ہونے میں آسمان کے مشابہ اور اس کی مثل ہے۔

دوسرے احتمال (یعنی خالق جواہر الگ ہو اور خالق اعراض جدا ہو) اس لیے باطل ہے کہ جوہر اور عرض یہ دو چیزیں ایک دوسری کی طرف کسی نہ کسی بات میں محتاج ہوتی ہیں۔ اب جوہر کا پیدا کرنا عرض پر موقوف ہوگا اور عرض کا ایجاد کرنا جوہر پر اور جب ان دونوں کا خالق الگ الگ ہے تو خالق جوہر کسی خاص جوہر کو تب ایجاد کر سکے گا جب خالق اعراض اس کے سابقہ عرضی کے پیدا کرنے میں متفق ہو اور خالق اعراض کسی خاص عرض کو تب ایجاد کر سکے گا جب جواہر کا خالق اس کے ساتھ جوہر کے ایجاد میں متفق ہو۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے اپنی اپنی ایجادات پر دوسرے کا متفق ہو جانا ضروری امر نہیں اور نہ ایسا بدیہی امر ہے جس کے

تسلیم کرنے پر ہم مجبور ہوں۔ کیونکہ ہر ایک خالق کے ایجاد پر دوسرے خالق کا متفق ہو جانا واجب ہے یا ممکن۔ اگر واجب ہے تو اس کی دلیل بیان کرنی چاہیے نیز اس صورت میں ان کی قدرت معدوم ہو جائے گی کیونکہ جب یک خالق کے ایجاد پر دوسرے خالق کو جبراً اس کے ساتھ متفق ہونا پڑتا ہے تو دوسرے خالق کا فعل اضطراری ہو گا نہ اختیاری۔ حالانکہ قدرت میں اختیاریت شرط ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ شر اور خیر کا خالق الگ الگ ہے جواہر اور اعراض کے خالق میں ہم کچھ نہیں کہتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شر اور خیر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ ایک ہی چیز کی ایک حیثیت سے شر کہلاتی ہے اور دوسری حیثیت سے خیر ہوتی ہے اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جو ذات ایک شئے کی ایجاد پر قادر ہو وہ اس کی مثل کی ایجاد پر بھی قادر ہوتی ہے۔ مسلمان کو آگ میں جلا دینا شر ہے اور کافر کا آگ میں جلا دینا خیر ہے۔

جو شخص پہلے کافر ہو اگر مومن ہو جائے تو پہلے اس کو آگ میں جلا دینا خیر تھا مگر اب اسی شخص کو آگ میں جلا دینا شر ہے۔ دیکھئے احراق صرف ایک ہی مفہوم ہے مگر مختلف اعتبارات سے کبھی شر ہو جاتا ہے، کبھی خیر۔ تو جب جو ذات اس مسلمان کو کفر کی حالت میں آگ میں جلا دینے پر قادر تھی، اس کے اسلام لانے کے وقت بھی ضرور اس کو اس کے احراق پر قدرت ہو گی۔ کیونکہ اسلام لانے سے نہ بدن میں فرق آیا ہے، نہ آگ میں اور نہ کوئی اور امر ہے جو اس کی قدرت میں خلل انداز ہو۔ پس ثابت ہوا کہ شر اور خیر کا خالق ایک ہی ہے جو جملہ موجودات، جواہر اور اعراض وغیرہ کا خالق ہے۔ وھو المدعا

وجود باری تعالیٰ

علامہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

توحید باری تعالیٰ کا مسئلہ ایمانیت کے باب میں ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے جسے بجا طور پر دین اسلام کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت نفس الامری ہے کہ جب تک اس گتھی کو نہ سلجھایا جائے اور اس بنیادی عقیدے کو حل نہ کیا جائے انسان پر اس کائنات کے سربستہ راز وا نہیں ہو سکتے۔ اس چیستاں کو حل کئے بغیر کوئی ذات و کائنات اور خالق کی تفہیم کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ اس ضمن میں قرآن مجید کا استدلال اور اسلوب بیان واعظانہ اور متکلمانہ ہونے کی بجائے انتہائی دل نشین، حکیمانہ اور بصیرت آموز ہے جو قلب و روح کے تار چھیڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے مخاطبین کی انسانی نفسیات اور سائیکی کو سامنے رکھ کر اس طرح بات کرتا ہے کہ ان کے دلوں کی کجی اور ژولیدگی ان پر آشکارا ہو جائے اور حق کو حق سمجھ کر قبول کریں اور منکرین حق کا انکار سوائے بے شرمانہ ڈھٹائی اور حمیت جاہلانہ کے اور کسی چیز پر محمول نہ ہو۔

اس مضمون میں اثبات وجود باری تعالیٰ کے باب میں ہم سب سے پہلے بالترتیب پورے شرح و بسط کے ساتھ پانچ بنیادی دلائل پر اظہار خیال کریں گے۔

وجود باری تعالیٰ ایک ایسی لافانی حقیقت (Eternal Reality) ہے جو کائنات کے ہر ذرّے سے آب و تاب اور پوری شان و شوکت کے ساتھ آشکار ہو رہی ہے۔ خواہ اس کا تعلق عالم انس و جن سے ہو یا عالم حیوانات و نباتات سے، عالم جمادات و مائعات سے ہو یا ہماری اس متغیر و بوقلموں دنیائے رنگ و بو اور کرۂ ارضی سے ماوراء بسیط کائنات سے جس کے تمام مظاہر خالق کائنات کے وجود پر شاہد عادل ہیں۔

کائنات میں وجود باری تعالیٰ پر بے شمار عقلی و نقلی دلائل ذہن انسانی پر دستک دیتے ہیں جنہیں پانچ بنیادی اقسام میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ آفاقی دلائل (Universl Reasons)

۲۔ فطری دلائل (Natural Reasons)

۳۔ عالم حیوانات (Animal Kingdom) سے متعلق دلائل

۴۔ عالم نباتات (Vegetable Kingdom) سے متعلق دلائل

ﮦ۔ عالم جمادات و مائعات (Mineral + Liquid States) سے متعلق دلائل

ا۔ آفاقی دلائل

توحید باری تعالیٰ کے آفاقی دلائل پر غور کرنے سے پہلے ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس وسیع و بسیط کائنات میں کون سے ایسے آفاقی شواہد موجود ہیں جو وجود باری تعالیٰ کے اثبات پر کافی و شافی دلائل مہیا کرتے ہیں۔ نیز اس سلسلے میں قرآن حکیم ہمیں کیا رہنمائی عطا کرتا ہے۔

وجود کائنات سے وجود باری پر استدلال

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اس کائنات ارض و سماء کا وجود (Existance) بذات خود اپنے خالق اور صانع کے موجود ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

ایک لمحہ کے لئے غور کیجئے کہ یہ کائنات کس قدر عظیم ہے جس کے نجوم، شمس اور کہکشاں کے وسیع و عریض سلسلوں پر مشتمل نظام فلکی میں ہماری زمین کو اپنی جسامت (Size) کے اعتبار سے شاید اتنی بھی اہمیت حاصل نہ ہو جتنی ساحل سمندر پر تاحد نظر پھیلی ہوئی ریت کے ایک ذرے کو۔۔۔ اور پھر اس عظیم کائنات میں ایٹم کے باطن میں پوشیدہ متحرک اجزاء (الیکٹرون، نیوٹرون اور پروٹون) سے لے کر نظام شمسی تک اور اس سے ماوراء بے حد و حساب اپنے مقررہ راستوں اور مداروں پر گردش کرنے والے سیارگان تک جن کی باہمی ترکیب اور حرکت کا ایک خاص انداز۔۔۔ معین قاعدوں سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے اور وہ اس قدر پیچیدہ اور حیرت انگیز ہے کہ ایک ایٹم میں متحرک اجزاء اور نیوکلیس کی ساخت میں واقع ہونے والا خلل ہیروشیما جیسے جاپان کے شہر کو کھنڈرات میں بدلنے کے لئے کافی ہو۔ اگر ایک بھی سیارہ اپنے مدار سے ہٹ جائے تو پوری کائنات کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے لیکن خالق موجودات کی شان خلاقی اور عظیم تدبر و حکمت کا کرشمہ دیکھیے کہ آج تک اس گردش میں سر مو فرق نہیں آیا۔ کبھی الیکٹرون اور پروٹون کی ترکیب کسی ایٹم میں الٹ نہیں ہوئی۔ اتنی وسیع و عریض کائنات کا اس قدر عظیم منصوبہ کارسازی و کارکشائی محیر العقول باہمی مربوط نظام انسانی عقل کو دنگ کر دیتا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا، کب ہوا اور کیونکر ہوا؟ کیا اس کی کوئی ابتداء ہے؟ اور کیا اس کا کوئی خالق اور صانع موجود ہے؟

سائنس کا ایک طالب علم جانتا ہے کہ اگر ایک خلیے سے نیوکلیس نکال دیا جائے تو خلیہ مردہ (Dead) ہو جاتا ہے گویا منتظم نہ رہے تو ایک ذرے کا بھی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عظیم نظام کائنات بغیر کسی منتظم اور مدبر ہستی کے از خود قائم ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس کا کوئی خالق موجود ہے؟ اس طرح نہاں خانہ دماغ میں یہ سوال جنم لیتے ہیں کہ وہ کون سی طاقت ہے جو ان سیارگان افلاک اور ستاروں کو باہم ٹکرانے نہیں دیتی بلکہ انہیں اپنے محور میں متحرک رکھے ہوئے ہے؟ وہ کونسی ہستی ہے جس نے ابتداء اس نظام کو وجود عطا کیا اور پھر آج تک اپنے تدبر اور علم و حکمت سے اس عظیم نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے؟

رات کو آسمان پر چمکنے دمکنے والے چاند ستاروں سے دریافت کریں یا دن کو روشن کرنے والے سورج سے سوال کریں یا ایٹم میں گردش کرنے والے ذرات اور لاکھوں اجرام سماوی پر مشتمل نظام فلکی سے استفسار کریں یہ سب بزبان حال ایک پروردگار، ایک مدبر، ایک منتظم اور ایک خالق کے وجود پر شاہد عادل ہیں اور سب اپنے حال کی مناسبت سے ایک ہی خدا کی تسبیح کر

رہے ہیں اور اس بات کی شہادت فراہم کر رہے ہیں کہ وہی علیم وخبیر ہستی اس کائنات کا خدا ہے۔

۲۔ فطری دلائل

توحید کے نفسی دلائل میں یہ دلیل بھی ہے کہ انسان کے نفس کے اندر فطری طور پر ایک خالق ومالک حقیقی کا شعور واضح طور پر ودیعت کر دیا گیا ہے۔ کائنات کے مظاہر فطرت (Natrual Phenomina) سے پیدا ہونے والا خوف زمانہ قدیم ہی سے انسان کے اندر ایک ان دیکھے معبود کی پرستش کا تصور پیدا کئے ہوئے ہے۔ اس ضمن میں زندگی اور اسباب زندگی کے نعمت ہونے کا احساس اس کے نہاں خانہ قلب و دماغ میں ازل سے موجود رہا ہے اور یہ احساس ایک منعم حقیقی کے وجود کو مستلزم ہے۔ نعمت پا کر ممنون ہونے کا جذبہ اتفاقی طور پر حیوانوں اور انسانوں میں مشترک ہے اور اس کی بہتر سے بہتر اور ترقی یافتہ صورت انسان میں موجود ہے۔ اسی جذبے نے فطری عدل کے تقاضے کو پیدا کیا جو خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ہے۔

خدا کی ہستی اور اثبات توحید پر قرآن حکیم کا طرز و اسلوب استدلال اس کے ہمہ گیر ربوبیت کے نظام میں تعقل و تفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے جو اس کائنات بسیط میں ایک خاص نظم و قانون میں منسلک ترتیب و قاعدے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید جابجا انسان کو عالم انفس و آفاق میں تدبر کی دعوت دیتا ہے اور اس سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی اور اس کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کرے اور دیکھے کہ یہ کارخانہ حیات کس نظم و انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ انسان اگر غور کرے تو خود اس کی اپنی پیدائش اور عالم گرد و پیش کے مشاہدات اس پر عرفان ذات اور معرفت توحید باری کے بہت سے سربستہ راز وا کر دیں گے۔

قرآن حکیم نے اس کائنات ارض و سماء کی بے کراں وسعتوں کو وجود باری تعالیٰ پر ایک روشن اور واضح دلیل قرار دیتے ہوئے اس میں غور و تدبر کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۖ مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۖ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ○ (الملک ۳،۴)

ترجمہ۔ وہی ہے (اس کائنات کا خالق و مالک) جس نے اوپر نیچے سات آسمان بنائے۔ تو (خدائے) رحمٰن کی کاریگری (اور نظام) میں کوئی فرق نہ دیکھے گا۔ ذرا دوبارہ آنکھ اٹھا کر دیکھ، کیا تجھ کو کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ (ہاں) پھر بار بار آنکھ اٹھا کر دیکھ (ہربار) تیری نگاہ ناکام تھک کر تیری طرف لوٹ آئے گی۔ (نہ آسمان میں کوئی شگاف ہے نہ نظام عالم میں کوئی فتور نظر آئے گا)۔

الغرض اگر انسان بنظر غائر اس عظیم کائنات کے موجودات پر غور کرے تو اسے ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا وجود خلاق عالم کے وجود پر شاہد عادل دکھائی دے گا۔

تخلیق کائنات (Creation of Univers)

آج سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں ہر میدان میں جدت اور تنوع کے لحاظ سے فقید المثال ایجادات اور اکتشافات کی بدولت ایک انقلاب برپا کر دیا ہے وہاں عقائد کو بھی توہمات اور بے سروپا خیالات و تصورات سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کیا

ہے۔ آج انسانی ذہن عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر ہر چیز کی توجیہ معلوم کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کوئی چیز بلا سبب اور بغیر کسی فاعل کے از خود وجود میں نہیں آ سکتی۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو کائنات میں موجود حقیر ذرے سے لے کر عظیم ترین حقائق تک سب اپنے ضمن میں کئی توجیہات اور اسباب لئے ہوئے ہے۔ پھر اس کائنات کا وجود بھی فی نفسہ ایک امر واقع اور ٹھوس حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے دنیا و مافیہا کی کسی چیز کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو اس کے وجود کی کوئی نہ کوئی توجیہ ضرور موجود ہوگی۔

وجود کائنات کی مختلف توجیہات

مطالعہ کائنات سے دلچسپی رکھنے والوں نے مختلف ادوار میں اپنے نظریے اور سوچ کے مطابق وجود کائنات کی چار توجیہات پیش کیں جن کا تقابلی جائزہ درج ذیل ہے۔

پہلی توجیہ

اس دنیا کا وجود محض ایک فریب نظر (Optical Illusion) اور ایک واہمہ (Deception) ہے۔ اس کی اصل حقیقت ایک سراب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

دوسری توجیہ

یہ کائنات از خود (Spontaneously) عدم سے وجود میں آ گئی ہے اور اس کی پیداوار محض ایک حادثے (Accident) کے نتیجے میں ہوئی ہے۔

تیسری توجیہ

یہ کائنات ازلی و ابدی ہے۔ اس کا نہ تو کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام۔

چوتھی توجیہ

یہ کائنات ایک خالق کی تخلیق کا شاہکار ہے۔

ان چار مختلف توجیہات کا تجزیہ کریں تو پہلی توجیہ تو ایک ایسا مفروضہ (Hypothesis) ہے جسے آج سائنس، فلسفہ اور ہر شعبہ علم سے تعلق رکھنے والے ماہرین کلیتاً رد کر چکے ہیں۔

دوسرا تصور یہ کہ مادہ اور توانائی کی یہ دنیا از خود پردۂ عدم سے باہر نکل کر وجود میں آ گئی ہے۔ یہ ایک ایسا لغو مفروضہ اور بیہودہ بات (Absurdity) ہے جسے کسی طرح قابل غور قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کیونکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کائنات بغیر کسی خالق کے از خود پیدا ہو سکتی ہے تو اس کے معنی لامحالہ یہ ہوں گے کہ وہ تخلیق کی صفت سے بھی متصف ہے جسے ہم خدا کی صفت قرار دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں گویا اس خام خیالی کی بدولت ہم اس کائنات ہی کو خدا قرار دیں گے اور یہ ایک ایسا معمہ ہوگا جس کا کوئی حل نہیں۔ اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے لیکن وہ نہایت عجیب و غریب قسم کا خدا ہوگا۔ جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور تابع فطرت بھی۔ اس طرح کے مہمل اور لغو تصور کو اپنانے سے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ایسے خدا کے وجود پر عقیدہ رکھیں جس نے ایک عالم مادی کی تخلیق کی ہے اور وہ خود

اس کا جزو نہیں بلکہ ماورائی ہستی ہونے کے ناطے اس کائنات کا خالق، فرمانروا اور مدبر و متصرف ہے۔

تیسری توجیہ کائنات کے ازلی و ابدی ہونے سے متعلق ایک ایسا خیال (Myth) ہے جس پر کئی فلاسفر عرصہ دراز تک اعتماد کئے رہے لیکن آج سائنس نے اس مفروضے کو بھی احمقانہ قرار دے کر یکسر رد کر دیا ہے۔

حرکیات حرارت (Thermo Dynamics) کے دوسرے قانون "ضابطہ ناکارگی" (Law of Entropy) کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ کائنات ہمیشہ سے نہیں بلکہ اس کی ایک ابتداء (Origin) ہے۔ اسی طرح یہ کائنات بتدریج انحطاط پذیر ہے اور ایک وقت اس پر ایسا آنے والا ہے جب تمام موجودات اپنی حرارت کھو کر اپنے وجود سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ توانائی و قوت فنا ہو جائے گی اور زندگی ناممکن ہو جائے گی ویسے تو آغاز کے ساتھ ساتھ یہ کائنات اپنا ایک انجام بھی رکھتی ہے۔ جس کی سمت یہ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی ہے اور اس کی یہ تقدیر (Destiny) ٹل نہیں جا سکتی۔

لہٰذا ذہن خود بخود پہلی تینوں توجیہات کی صرف ماننے ہوتے ہوئے یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ یہ تمام کارخانہ عالم کسی زبردست خالق، منتظم اور مدبر کا وہ شاہکار ہے جو ایک سوچی سمجھی سکیم اور منصوبہ بندی (Well thought out plan) کے تحت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔

ہمارا عقلی مشاہدہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ جب کوئی شخص ایک انتہائی چھوٹے ذرے کے وجود کو بھی بغیر توجیہ کے ماننے کے لئے تیار نہیں تو اتنی بڑی کائنات بغیر کسی خالق اور صانع حقیقی کے کیسے وجود میں آ سکتی ہے۔ اگر صحرا میں دیکھے جانے والے نشانات قدم اور نقوش پا وہاں کسی مسافر کے گزرنے پر دلالت کرتے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس عظیم کائنات کے عظیم منصوبے اور اس کے حیرت انگیز نظام کو دیکھ کر بھی ہمارا ذہن، اس کے صانع اور خالق کی طرف متوجہ نہ ہو اور اسے تسلیم نہ کرے۔ کیا اس کائنات اور اس کے نظام کی حیثیت ہمارے صحرا نوردوں کے نقوش پا سے بھی کم ہے؟ اس سوال جواب ہمارے وجدان اور باطن سے یہ آئے گا کہ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ اگر ہم صاحبان عقل سلیم ہیں اور ہمارے ہوش و حواس قائم ہیں تو معمولی غور و فکر و تدبر سے ہمارے حواس خمسہ، تحت الشعور اور باطن بھی ہمیں یہ کہتے سنائی دیں گے کہ اس کائنات زیریں و بالا کا خالق لازماً وجود ہے جس سے انکار کرنے کی کوئی مادی و غیر مادی توجیہ ہمارے پاس موجود نہیں۔

۳۔ عالم نباتات (Vegitable Kingdom) سے متعلق دلائل

کائنات کے مناظر اور مظاہر فطرت (Phenomena of Nature) میں جو تنوع و بوقلمونی (Diversity) پائی جاتی ہے وہ زمین کی قوت نامیہ کی مرہون منت ہے۔ بے شمار انواع و اقسام کی نباتات، رنگارنگ کے پھول اور مختلف شکل و صورت، رنگ و بو اور ذائقہ رکھنے والے پھل ایک ہی زمین سے پیدا ہو رہے ہیں اور ان کی نمود ایک ہی قسم کے پانیوں اور موسموں سے ہو رہی ہے۔ صاحبان عقل و دانش غور و فکر کے نتیجے میں یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ایک ایسی متصرف الوجود ہستی موجود ہے جو کمال ربوبیت اور رحمت سے اس کارخانہ عالم کا نظام چلا رہی ہے یہ ہستی خدائے وحدہ لاشریک کے سوا اور کون ہو سکتی ہے۔

اس کائنات رنگ و بو میں دیگر گوناگوں مناظر و مظاہر قدرت کے علاوہ عالم نباتات بھی وجود باری تعالیٰ پر ایک روشن دلیل ہے۔ عالم نباتات میں موجود تفاوت و تنوع (Variety & Diversity) پر ہی غور کیا جائے تو عقل انسانی یہ سوال کرتی نظر آتی ہے کہ:

یہ دلکش و جاذب نظر پھول کی نشوونما اور اس میں رنگ و خوشبو کہاں سے آئی؟ جواب ملے گا ہوا، زمین اور آفتاب سے۔ اگر جوابات درست ہیں کہ پھول کا اگنا، اس میں خوشبو اور رنگ یہ سب چیزیں زمین کا مرہون منت ہے یا ہوا اور آفتاب کا کمال ہے؟ تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ گلاب کا رنگ سرخ، چنبیلی کا سفید، موتیا، نرگس کا زرد ہے اور ان سب کی خوشبو بھی باہم مختلف ہے، افادیت و تاثیر میں بھی اختلاف ہے، آخر کس نے؟ حالانکہ ان سب کو کاشت کرنے والا انسان (باغبان) بھی ایک ہے، زمین اور ہوا بھی ایک ہی ہے تو پھر ایک ہی سورج کی تمازت سے ایک ہی زمین میں سے نتائج مختلف کیوں ظاہر ہو رہے ہیں؟ یہی زمین ہے جس میں سے "تھوہر" بھی پیدا ہوتا ہے اور گلاب و سوسن بھی۔ عوامل میں بھی سر مو فرق نہیں تو پھر تھوہر کے ساتھ گلاب اور سمن کے پھول کیوں نظر آتے۔

کسان ایک ہی زمین میں آم اور سنگترے کا بیج بوتا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ آم کے بیج سے سنگترہ اور سنگترے کے بیج سے آم کا درخت پیدا ہوا ہو بلکہ آم سے آم اور سنگترے سے سنگترہ ہی پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ آم کے درخت کی ٹہنی لے کر چبائیں تو وہ کڑوی ہوگی۔ اسی کی ڈالی کا رس ترش ہوگا لیکن اس ڈالی سے پیدا ہونے والا پھل شیریں، خوشبودار، لطیف اور خوش ذائقہ ہوتا ہے اور اس کی تاثیر دیکھیں تو وہ گرم تر ہوتی ہے۔ اگر یہ سب چیزیں خود بخود ہوتی ہیں تو پھر گھڑوں میں پایا جانے والا پانی اور بچوں کے ہاتھوں کھیلا جانے والا گیند از خود کیوں شہد اور مالٹا نہیں بن جاتے؟ اور سہانے نغموں اور مترنم آبشاروں کی جگہ تمہارے چہروں اور جسموں پر بے اور چشمے کیوں نہیں ابل پڑتے؟ اسی لئے خالق عالم قرآن میں منفرد طرز اسلوب کے ساتھ نباتات کو اپنی ہستی پر دلیل بناتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○ (الانعام ۹۵)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے وہ مردہ میں سے زندہ کو اور زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے یہ سب کچھ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے تو یہ لوگ کہاں بہکے جاتے ہیں"

قابل غور امر یہ ہے کہ زمین میں سے اناج اور پھلوں کے باغات کا پیدا ہونا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ گندم کے ایک دانہ کا بھی اس وقت تک پیدا ہونا ممکن نہیں جب تک کائنات میں پائے جانے والے بے شمار عوامل مل کر بڑے ہی نظم و ضبط کے ساتھ اپنی تمام تر صلاحیتیں اور توانائیاں ایک دانے پر صرف نہ کریں۔ زمین کی زرعی پیداواری صلاحیت، پانی، ہوا، آکسیجن اور نائٹروجن گیس، روشنی، سورج کی گرمی، بروقت بارش، خاص قسم کا درجہ حرارت، غرض کتنے ہی عوامل ہیں جن کو بروئے کار لانے کے بعد کہیں جا کر گندم کا ایک دانہ پیدا ہوتا ہے تو کیا یہ سب کچھ خود بخود عمل میں آ جاتا ہے؟ اسی لئے اللہ تعالیٰ سوالیہ انداز میں اپنے بندوں سے پوچھتا ہے:

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ○ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ○ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ○ (الواقعہ: ۶۳۔۶۷)

ترجمہ: کیا تم نے دیکھا ہے جو تم کاشت کرتے ہو؟ کیا تم اسے اگاتے ہو یا اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہتے تو اسے خاک کر ڈالتے اور تم ہاتھ ملتے رہ جاتے اور یوں کہو کہ ہم پہ تو تاوان پڑ گیا بلکہ ہم تو محروم ہیں۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ کاشت کار کا کام تو فقط نگرانی کرنا اور بیج ڈالنا ہے لیکن اس بیج کو سرسبز پودے میں بدل کر شگوفے، پتے اور پھل بنانا خدائے قادر و مطلق کا کام ہے۔ باری تعالیٰ یہی بات ایک دوسرے اسلوب میں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ○ (النمل ۶۰)

ترجمہ: بھلا کس نے (یہ سب کچھ) بنایا ہے؟ آسمانوں اور زمین بنائے آسمانوں سے پانی اتارا (ہم نے) پھر ہم نے اس کے ذریعہ پُررونق باغ اگائے (ورنہ اس زمین اور پانی سے پہلے) تمہارا کام نہ تھا کہ تم اس سے درختوں کو اگاتے۔ (اب سوچو) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (ہے تو بتاؤ مگر ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں) حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ راہ حق سے انحراف کرتے ہیں (دوسروں کو خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں)۔

ایک اور مقام پر عالم نباتات اور اس میں پیدا ہونے والے جڑی بوٹیوں اور پھول پھلواری کو اپنی ذات کی نشانی قرار دیتے ہوئے یوں فرمایا

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ○ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○ (یٰسین ۳۳-۳۵)

ترجمہ: ہماری ہستی پر ایک برہان یہ بھی ہے کہ ہم مردہ زمین کو بارش سے زندہ کرنے کے بعد اس سے انسانی غذا پیدا کرتے ہیں۔ پھر اس (زمین) میں سے پانی کے چشمے جاری کر دیتے ہیں تاکہ لوگ ایسا پھل کھائیں جو ان کے ہاتھوں نے تخلیق نہیں کیا (بلکہ یہ ہماری تخلیق ہے حیرت ہے کہ ہماری نعمتوں کا) پھر بھی شکر ادا نہیں کرتے۔

عالم حیوانات کی طرح نباتات میں بھی بھرپور زندگی کا نظام موجود ہے۔ ان میں نر اور مادہ تک پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید آج سے چودہ صدیاں قبل اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے یوں فرماتا ہے

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ○ (لقمان ۱۰)

ترجمہ: اور ہم نے آسمان میں سے پانی برسایا اور اس (زمین) میں نباتات اگائے جن میں ہر قسم کا عمدہ جوڑا موجود ہے۔

نباتات کا حیاتیاتی نظام (Biological System of Vegitation)

قرآن حکیم میں عالم نباتات کے حیاتیاتی نظام کے متعلق جس کی معلومات فراہم کی گئی ہیں اس کا اعتراف قرآن اور جدید سائنس کا علم رکھنے والے ماہرین نے بھی کیا ہے، اس ضمن میں درج ذیل امور توجہ طلب ہیں۔

۱۔ تنظیم و انتظام (Organisation+Arrangement)

علم نباتات (Botany) کے مطالعہ نے ہمیں بتایا ہے کہ پودوں کی نشوونما اور خلیوں کی نمو اور تقسیم (Cell: Growth+Division) کا عمل انتہائی مرتب، باقاعدہ اور حیرت انگیز طریقہ سے اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ تعقل و تفکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ سب کچھ بغیر کسی منصوبہ بندی کے از خود وجود میں نہیں آسکتا۔

۲۔ پیچیدگی (Complexity)

کسی معمولی اور سادہ سے پودے کی نشوونما (Growth) اور نظام تولید (Reproductive System) بھی ایک ایسا پیچیدہ عمل ہے کہ تسخیر کائنات کا دعویدار جدید ترین انسان بھی آج تک ایسی پیچیدہ مشین کی تخلیق سے عاجز رہا ہے۔

۳۔ تولید و توارث (Reproduction+Inheritance)

ایک پودے سے مزید پودے پیدا ہونے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور یہ تولید و توارث بے قاعدہ نہیں ہوتی بلکہ ایک بگے بندھے قاعدے اور کلیے کے مطابق ہر پودے سے اس کا ہم شکل (Homgenous) پودا ہی پیدا ہوتا ہے اور یہ ضرب المثل کہ

گندم از گندم بروید جو ز جو

ایک غیر متبدل عمل (Invariable Process) ہے جو ابتدائے آفرینش سے جاری و ساری ہے۔ یہ تمام خصوصیات اور عالم نباتات میں موجود پیچیدہ عوامل اور دیگر مظاہر فطرت کو دیکھ کر انسان اپنی عقل و فہم کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ہمارے شعور و ادراک کی حدود سے ماوراء ضرور کوئی ایسی مختار کل اور زبردست منتظم ہستی موجود ہے جو اس حیرت انگیز اور انتہائی پیچیدہ نظام کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اسی لئے قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر عالم نباتات میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (النحل : ۶۷)

ترجمہ: اور کھجور اور انگور کے میووں میں سے بھی (تم پینے کی چیزیں تیار کرتے ہو) تم ان سے نشہ کی چیزیں تیار کرتے ہو اور کھانے کی عمدہ غذائیں تیار کرتے ہو (لیکن سوچو کہ ان کا خالق کون ہے؟) بے شک اس میں عقل مندوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

پھر اسی مضمون کی توضیح مزید اس طرح فرماتا ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ○ۙ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ○ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ○ۙ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ○ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ○ۙ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ○ۙ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ○ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ○ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ○ؕ (عبس : ۲۴، ۳۲)

ترجمہ: پس انسان کو چاہیے اپنی غذا کی طرف غور کرے (کہ وہ کیونکر پیدا ہوئی) بے شک ہم ہی نے خوب پانی برسایا پھر ہم نے زمین کو جابجا پھاڑ دیا۔ پھر ہم نے اس میں غلہ پیدا کیا اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور گھاس (کو بھی پیدا فرمایا) جو تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے کام آتے ہیں۔

اوپر درج کردہ آیات مبارکہ میں بالخصوص غذا کی طرف انسان کو دعوت غور و فکر دینا گہری حکمت رکھتا ہے۔ اس حقیقت سے کون صرف نظر کر سکتا ہے کہ اپنی روزمرہ زندگی میں ہر فرد کا سب سے زیادہ واسطہ کھانے پینے کی چیزوں سے پڑتا ہے۔ ارضی زندگی میں مادی جسم کی بقاء کا دار و مدار پانی کے بعد جس قدر غذا پر ہے وہ چنداں محتاج بیان نہیں۔

لیموں سے استدلال

لیموں ہماری روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی ایک عام سی چیز ہے لیکن اگر انسان اپنے فہم و شعور سے کام لیتے ہوئے اس پر غور کرے تو یہ ایک چھوٹا سا پھل اپنے اندر اپنے خالق کی ہستی پر اتنی محکم دلیل ہے کہ سوچنے والوں کو اس سے استحکام ایمان کے ساتھ نور ایقان کی دولت بھی نصیب ہوتی ہے۔ اطباء یونان کی تحقیق کے مطابق لیموں کا چھلکا گرم خشک، اس کا گودا تر جبکہ اسی لیموں کا عرق سرد خشک ہوتا ہے۔ ایک ہی بیج سے پیدا ہونے والی چیز کے یہ مختلف اثرات کیوں ہیں، حالانکہ بیج تو ایک ہی ہے، اس کی طبیعت کا تقاضا بھی یہی ہونا چاہیئے لیکن فی الواقعہ ایسا نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ کائنات عالم میں پائی جانے والی چیزوں کے اثرات ان کے طبعی تقاضوں کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک قادر مطلق اور موثر حقیقی کی قدرت اور اثر آفرینی کا مرہون منت ہے اور وہ اپنی منشاء کے مطابق جس چیز میں جو بھی تاثیر رکھنا چاہے رکھ دیتا ہے۔

گلاب کے پھول سے استدلال

گلاب کا پھول خوبصورتی جاذبیت و کشش کے اعتبار سے تمام پھولوں کا سردار ہے۔ اس کی پتیاں اپنی تاثیر کے اعتبار سے خشک، ان سے حاصل کردہ عرق گلاب سرد جبکہ اسی گلاب سے بننے والی گلقند گرم تر ہوتی ہے۔ مزاج کے اعتبار سے ایک چیز کی یہ تین مختلف تاثیرات اپنے موثر پر روشن دلیل ہیں۔

اسی طرح پھول کی حیاتیاتی تحقیق اور اس کے ارتقاء کا عمل بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ پھول کا پودا بیج کے پردے کو پھاڑ کر باہر نکلتا ہے۔ بیج میں پودے کا پورا پلان اور نقشہ اسی طرح موجود ہوتا ہے جیسے معمار کے پاس کسی عمارت کا بلیو پرنٹ (نقشہ) ہو، جس کے مطابق وہ پوری عمارت کی تعمیر اینٹ پر اینٹ رکھ کر مرحلہ بہ مرحلہ عمل میں لاتا ہے۔ اسی طرح کوئی مرئی ہاتھ کائنات کی تعمیر نباتاتی خلیوں کی مدد سے ایک باقاعدہ پلان کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ خود خلیے اتنے شعور کے حامل نہیں ہیں کہ از خود ترتیب، نزاکت، رنگ اور خوشبو مستعار لے کر اپنے آپ گلاب کا پھول بن جائیں۔ گلاب کی نشوونما کے لئے سارا پلان بیج کے اندر رکھا گیا ہے۔ پھول کا پلان اسی طرح تکمیل پذیر ہوتا ہے جیسے اس عالم آب و گل کی تکمیل میں خالق کائنات کا ارادہ کار فرما ہے۔

پنسلوانیا کے ایک مشہور سائنسدان اور فلسفی "میرٹ سٹینلے کان ڈان (پی ایچ ڈی)" نے ایک لطیف و دلچسپ مثال کے ذریعے گلاب کے پھول سے وجود باری تعالیٰ پر استدلال قائم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

کئی سال ہوئے پنسلوانیا کے ایک غیر آباد اور سنسان راستے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے خوب صورت پھولوں سے لدا ہوا گلاب کا ایک پودا دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص نے بڑے اہتمام سے اسے لگایا ہے اور بڑی محنت سے اس کی کانٹ چھانٹ کی ہے۔ کچھ عرصے بعد پھر وہاں جانا ہوا تو پودے کے پاس جھاڑ جھنکار کھڑے تھے۔ قریب ہی ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جو غیر آباد تھا۔ اب اس بات کا تو کوئی امکان نہیں کہ یوں کہا جائے کہ اس گلاب کا بیج یا ٹہنی ہوا کے ذریعے اڑ کر پانی میں بہ کر خود بخود آ گئی ہو گی جس نے یہاں آ کر جڑ پکڑ لی تھی یا کسی پرندے کی بیٹ یا چوہے کی مینگنیوں کے ذریعے اس کی تخم ریزی ہو گئی ہو گی۔ میرے وجدان نے کہا کہ یقیناً کبھی یہاں کوئی خوش ذوق آدمی آ کر رہا ہو گا، اس نے اپنا مکان بنایا، گلاب کا پودا لگایا، اس نے دیکھ بھال اور کانٹ چھانٹ کی حالانکہ نہ تو یہ جھاڑیاں میرے سامنے اگیں نہ گلاب کا پودا میرے سامنے لگایا گیا

مگر ذوق شہادت دیتا ہے کہ کسی نے اس کو لگایا ضرور تھا۔ یہ کسی انسان نے زمین کی [illegible] نہیں ملتا
گلاب کا پودا خود بخود لگ گیا ہو اور خود بخود سنائی ہو اور پھر خود بخود سب [illegible] جو شخص ایسا کہے
میں اسے عقل و دانائی سے بے بہرہ سمجھوں گا۔

اس مثال سے یہ حقیقت خود بخود واضح (Self Evident) [illegible] خالق کائنات کے
وجود پر ایک مستقل اور روشن دلیل ہے اور اس میں گلاب کا پھول ہی [illegible]

اس کے علاوہ اگر انسان درختوں کی چھال، اس سے [illegible] ان کے مختلف رنگوں
اور ان کی کیفیات پر غور و فکر کرے تو وہ ساری اشیائے عالم میں اپنے خالق [illegible] کی وحدانیت کی کھلی اور
واضح نشانیاں پائے گا لیکن اگر وہ ان ساری شہادتوں کے بعد بھی خالق عالم [illegible] اپنی جبین نیاز نہ
جھکائے اور سر بسجود نہ ہو تو اس سے بڑھ کر ناشکری اور کفران نعمت کیا ہو گی؟

قرآن حکیم عالم فطرت میں جا بجا غور و فکر اور تدبر کی [illegible] توجہ منعطف کرتا
ہے کہ ایک ہی خطہ زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں میں اختلاف [illegible] روشن دلیل ہے۔
سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا گیا:

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ
وَّاحِدٍ ۟ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۭ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (الرعد ۴)

ترجمہ: زمین میں پاس پاس ایسے قطعات ہیں جن میں کہیں کھیتی، کہیں انگور [illegible] ہیں۔ ان میں سے
کچھ ایک جڑ سے نکلتے ہیں اور کچھ الگ الگ جڑوں سے۔ ان سب کی پرورش ایک ہی [illegible] لیکن ان کے ذائقے الگ
الگ ہیں۔ ان سب میں ارباب دانش کے لئے واضح نشانیاں ہیں (کہ وہ ان میں غور کریں [illegible])

۳۔ عالم جمادات و مائعات (Mineral + Liquid States) سے متعلق دلائل

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس عالم آب و گل کی تخلیق ورود آدم (Descent of Adam) سے پہلے عمل
میں لائی گئی اور اس بات کا خصوصیت کے ساتھ التزام و اہتمام کیا گیا کہ اس زمین کی آب و ہوا اور جملہ لوازمات بنی آدم کے لئے
موزوں اور سازگار ہوں اور یہ جہاں جسے ان کا مستقر بننا تھا ہر لحاظ سے ان کی رہائش اور بود و باش کے قابل ہو۔ اس کائنات میں
خود کرۂ ارضی اور اس پر پھیلا ہوا وسیع و عریض کوہستانی سلسلہ اپنی بلندیوں اور نہ ختم ہونے والی مسافتوں کے باوصف زبان حال سے
اعلان کر رہا ہے کہ ہمارا وجود بے مقصد نہیں بلکہ ہمارے پیدا کرنے والے خدا نے ایک خاص مقصد کے تحت اپنی قدرت کاملہ و
حکمت بالغہ سے تخلیق کیا ہے پھر اسی طرح ان بلند و بالا پہاڑوں کے دامنوں سے نکلنے والے چشموں کا پانی ہماری حیاتیاتی ضروریات کی
تکمیل کر رہا ہے۔ یہ پہاڑ اور موج در موج پانیوں کے سلسلے بھی ہمیں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر روشن دلیل فراہم کرتے ہیں۔ اسی لئے
قرآن مجید نے بھی ان دونوں کو وجود باری تعالیٰ اور قادر مطلق کی قدرت کی واضح نشانیاں قرار دیا ہے اور ارباب دانش و بینش کو
منفرد طرز اسلوب کے ساتھ مخاطب کر کے اپنی پہچان اور معرفت حاصل کرنے کا درس دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید پہاڑوں کی
تخلیق کا مقصد اول ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ (النبا ۲۰،۷)

لئے پانی جیسی ضروری چیز فراہم کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، تو پھر وہ اس عظیم ہستی پر ایمان لانے سے کیوں متامل کیوں ہو جس نے اس ساری کائنات کی تخلیق کی اور پوری دنیا میں زیر زمین اور تہ زمین سے اوپر پانی کا ایک وسیع نظام قائم کیا۔

زمین اور اس کی پیداوار (Productivity ofLand) سے استدلال

جدید سائنسی تحقیق نے یہ بات حتمی طور پر ثابت کر دی ہے کہ اس زمین کی تخلیق ایک سوچے سمجھے باقاعدہ منصوبے کے تحت وقوع پذیر ہوئی ہے۔ اس کا وجود ازلی نہیں بلکہ کسی عظیم خالق کی شان خلاقی کا مظہر ہے۔ انہی بنیادوں پر وہ سائنس نے ان تمام حقائق کو بھی تسلیم کر لیا ہے جو واضح طور پر چودہ سو سال قبل خالق کائنات نے قرآن حکیم میں بیان فرما دیئے تھے۔ گویا اس کی توثیق (Verification) جدید سائنسی تحقیق نے بھی کر دی ہے اور اس سے انسان کو اسی ایک خالق پر ایمان لانے کی دعوت ملتی ہے جس نے اپنی تدبیر اور حکمت و ارادہ سے اس تمام کائنات کو خلعت وجود عطا کیا۔

جدید سائنسی تحقیقات سے انسان اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ کرۂ ارضی آج سے تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک زبردست دھماکے کے نتیجے میں وجود میں آیا اور آج بھی اس میں توسیع کا عمل جاری ہے۔ یہی بات حکیم الامت علامہ اقبال

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید   کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

قرآن حکیم نے اس حقیقت کو آشکار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ O (الانبیاء ۳۰)

ترجمہ کیا جو لوگ کافر ہیں انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ یہ آسمان و زمین ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا اور ہم نے ہر جاندار شے کی تخلیق پانی سے کی۔ پھر یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔

ان آیات میں زمین و آسمان کی تخلیق کے واقعہ کو وجود باری پر بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ ان پیش پا افتادہ حقائق پر غور کرنے کے بعد ایک صاحب فہم و ادراک آدمی سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ اس کائنات کی تخلیق اور اس کے نظام کا (بالاستیعاب) مطالعہ کرے اور پھر بھی اس کے خالق کے تصور سے بے بہرہ و نابلد رہ جائے۔

نامور محقق کیمیا کا اعتراف

نامور محقق کیمیا ماس ڈیوڈ پارکس کہتا ہے کہ:

"میں اپنے گرد و پیش اور غیر نامیاتی عالم (Inorganics) میں ہر طرف ایک نظم اور ایک منصوبہ کار فرما پاتا ہوں اور یہ باور کرنا میرے لئے کسی صورت ممکن نہیں کہ یہ مختلف جوہروں کے کسی اتفاقی امتزاج و اتصال سے وجود میں آ گیا ہوگا۔ میرے نزدیک یہ نظم و ترتیب کسی حکیم کی گہری حکمت کا مظہر ہے اور اسی حکیم و علیم ذات کو میں خدا کہتا ہوں"۔ (بحوالہ "خدا موجود ہے" از جان کلوور مونزما)

اس بیان سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ صرف ذی روح اشیاء ہی وجود باری پر شواہد مہیا نہیں کرتیں بلکہ جمادات اور نباتات کا تا حد نظر پھیلا ہوا سلسلہ بھی خالق ارض و سماء کے وجود پر ناطق دلائل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر انسانوں کو عالم جمادات و نباتات پر مشتمل مناظر و مظاہر فطرت میں

غور کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

اللہ رب العزت کائنات ہستی اور اس کی حسین آفرینیوں کو اپنی ذات کی دلیل بیان کرتے ہوئے انسان سے اس کے مشاہدات کے حوالے سے سوالیہ انداز میں ارشاد فرماتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ O (الزمر، ۲۱)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر زمین میں پانی کے چشمے جاری ہو گئے۔ پھر اس (زمین) سے (پانی) کے ذریعے رنگ برنگ کی کھیتیاں اگائیں (جو بہت حسین ہیں) پھر انہوں نے مزید نشوونما پائی اور وہ پک کر تیار ہو گئی پھر (عروج کے بعد ضعف و زوال آیا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی پھر انہیں خشک کر کے ریزہ ریزہ کر دیا بے شک اس (پورے نظام) میں عقلمندوں کے لئے نصیحت ہے۔

انسانیت کی تخلیق زمین سے ہوئی ہے اور بالآخر واپس اسی کے اندر پلٹ کر جانا ہے۔ خواہ دنیا میں کوئی کیسے محلات اور مضبوط قلعوں میں سکونت پذیر رہے۔ قرآن حکیم اس حقیقت کی عجب نشاندہی یوں کرتا ہے

وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا O ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا O وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا O لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا O (نوح، ۱۷-۲۰)

ترجمہ: اور اللہ ہی نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا ہے۔ (پھر زمین ہی سے تمہاری نشوونما کی۔ تم مٹی سے بنے ہو تمہاری غذا بھی زمین سے مہیا ہوئی) پھر تم کو اسی زمین میں لے جایا جائے گا اور (اسی سے) تم کو دوبارہ اٹھائے گا اور اللہ تعالیٰ نے ہی تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا (یعنی تمہاری جولان گاہ ہے) تاکہ (زمین کے ہر شعبہ اور ہر منزل میں) تم اس کی کشادہ راہیں اختیار کرو (وہ راہیں جو حقائق واضح کرنے والی اور دنیا و آخرت میں فلاح کی ضامن ہیں)۔

نظامِ ربوبیت

قرآن حکیم میں ایسے بے شمار مقامات ہیں جن میں ایک وسیع البنیاد (Broad Based) نظام ربوبیت کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس سے ہستی و توحید باری تعالیٰ پر استدلال کیا گیا ہے۔

ہمارا شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ یہ ظلمت و نور کے مظاہر اپنی خصوصیات میں ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود کامل ہم آہنگی اور موزونیت کے ساتھ بشمول انسانوں اور حیوانوں کے ہر جاندار چیز کی پرورش کا سامان بہم پہنچانے میں لگے ہوئے ہیں۔ دن کے وقت سورج روشنی اور حرارت کا منبع ہے جو کرۂ ارض کو مناسب اور سازگار ماحول فراہم کرنے کا باعث ہے جبکہ رات کو نمودار ہونے والا چاند زمینی حیات کے لئے نور اور خنکی کا خزانہ ہوتا ہے۔ یہ سارا اہتمام از خود وجود میں آ گیا یا اس کے پیچھے کسی کارساز اور کارکشا ہستی کا ہاتھ کارفرما ہے جو ہر جاندار کو رزق فراہم کر رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان تعقل و تفکر سے کام لے کر اس کائنات میں کارفرما نظام ربوبیت کا مطالعہ کرنے بیٹھے تو اسے کائنات کا ذرہ ذرہ ایک ایسی ہستی کی خبر دے گا جو اسے بتدریج پستی و زوال سے ارتقاء و کمال کی طرف گرم سفر رکھے ہوئے ہے۔

آیئے ذرا غور کریں وہ کون سی ہستی ہے جو ایک ذرہ بے مایہ کو بیش بہا لعل و جواہر کا وجود عطا کر دیتی ہے؟ وہ کون سی

ذات ہے جو ہلال کو ارتقاء کے مراحل سے گزار کے بتدریج بدر کی صورت عطا کرتی ہے۔ وہ کون سی مدبر قوت ہے جو سمندر کی سرکش موجوں کو ایک خاص محیط میں پابند و محصور کئے ہوئے ہے؟ وہ کون ہے جو ایک مربوط اور منظم نظام سے زمین، سورج، چاند اور کائنات کے دیگر سیاروں کی مقررہ محوری گردش کو اپنے اپنے مداروں کے اندر [illegible] ہے؟ یہی صاحب عظمت و قوت اور منتظم و مدبر ہستی ہی تو اس کائنات کی خالق، مالک اور "رب" ہے۔

اللہ جل مجدہ نے قرآن حکیم میں نظام شمسی کے تحت گردش لیل و نہار کو اپنے رب ہونے کی نشانیاں قرار دیتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا ہے۔

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ O (یونس : ٦)

ترجمہ: بے شک راتوں کے بدلنے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے (سب میں) اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

اسی طرح سورہ اعراف میں بھی انسان کو زمین و آسمان اور کائنات کی تخلیق میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

أَوَلَمْ يَنظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّأَنْ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ فَبِأَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُوْنَ O (الاعراف : ١٨٥)

ترجمہ: کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی حکومت پر نظر نہیں کی۔ (یا وہ عالم ملکوت و عالم ناسوت کو نہیں دیکھتے) اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے (اس پر غور نہیں کرتے) اور اس بات پر کہ شاید ان کا مقررہ وقت (ان کی موت یا قیامت کا وقت) قریب آ چکا ہے۔ (اگر یہ واضح حقیقتیں وہ نہیں سمجھتے) تو اب اس کے بعد کونسی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے۔ (در حقیقت یہ لوگ ایمان سے محروم ہیں)۔

اسی طرح سورہ یونس میں حیات و موت پر مبنی نظام ربوبیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے اور اس کے باطن سے جواب طلب کرتا ہے

وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْأَمْرَ (یونس : ٣١)

ترجمہ: اور کون جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے اور (پھر) امور (کائنات) کی تدبیر کون کرتا ہے۔

اس ارشاد ربانی میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اس کائنات آب و گل میں موت و حیات کا جو ایک نظام چل رہا ہے وہ از خود (Spontaneously) نہیں چل رہا بلکہ ایک ایسی مدبر اور منتظم و منصرم ہستی اس سارے نظام کو چلا رہی ہے جو ہر چیز کو بتدریج اس کے کمال (Climax) کی راہ پر گامزن کئے ہوئے ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جسے پرورش کی احتیاج نہ ہو۔ جس طرح ہر چیز جو مخلوق ہے اپنے خالق پر دلالت کرتی ہے لہٰذا ہر وہ چیز جو مربوب ہے اس کے لئے لازمی و لابدی ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہو۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہر ایک کو پرورش مل رہی ہو اور پرورش کرنے والی کوئی ذات موجود نہ ہو۔ یہ ممکن ہی نہیں کوئی متصرف الوجود

ٹھہرا رہا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ۝ (الروم: ۸)

ترجمہ: کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کو (اپنی) مصلحت (اور حکمت) ہی سے ایک وقت معین کے لئے پیدا کیا ہے۔ (یہ مقصد حیات سمجھ لیتے تو ان کو دیدار الٰہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ کاش یہ لوگ آخرت کی اہمیت کو سمجھتے) اور اکثر لوگ تو اپنے پروردگار سے (ملاقات تک) ملنے ہی کے منکر ہیں (دیدار الٰہی کی تمنا کیا کریں گے اور کیا سمجھیں گے)۔

قرآن مجید ان سب نظام ہائے آفاق کو بیان کر کے دراصل اہل فکر و دانش سے یہ سوال کر رہا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ زمین و آسمان اور اس کے درمیان موجودات کی تخلیق کمال صحت و تدبیر سے ہو اور ان کا کوئی خالق اور مدبر نہ ہو؟ رات اور دن ہمیشہ خاص نظم اور سلیقے سے چل رہے ہوں، سورج اور چاند اپنے اپنے مدار میں باقاعدگی سے چل رہے ہوں مگر سلیقہ اور نظم سے آشنا کرنے والا کوئی نہ ہو؟

وجود باری تعالیٰ پر تین نظری دلائل

زمانہ قدیم سے انسان کے وجدان اور فطرت کے خمیر میں کسی ماورائی ہستی کا نیم شعوری تصور موجود تھا۔ یہ تصور اس جذبہ خوف کی پیداوار تھا جو شعوری یا لاشعوری طور پر انسان کو اس کائنات کی مہیب پہنائیوں میں مظاہر فطرت کے حوالے سے لاحق رہتا ہے۔ ان نظری اور تجریدی تصورات سے جو ازل سے انسان کے نہاں خانہ دماغ میں موجود تھے ذات باری تعالیٰ کے استدلال کی درج ذیل صورتیں پیش کی جاتی ہیں:

پہلی دلیل (انسانی فطرت کا تقاضا)

اس کارگہ حیات میں رہتے ہوئے ہر انسان کے کچھ فطری تقاضے ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ حیات جاوداں کا خواہاں ہے اس لئے موت سے خوف کھاتا ہے اور مرنا نہیں چاہتا۔ پھر ہر انسان خواہ خدا پر ایمان رکھنے والا ہو یا خدا کا منکر، وہ عدل وانصاف کا طالب ہے۔ عقل بھی فطرت انسانی کے ان تقاضوں کو درست تسلیم کرتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا اس چند روزہ زندگی میں اسے حیات جاوداں اور عدل وانصاف جیسی نعمتیں ابدی طور پر حاصل ہو سکتی ہیں؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ اس فانی دنیا میں جو کچھ منزل دارالعمل کی ہے انسان کو یہ دونوں چیزیں میسر ہو ہی نہیں سکتیں بلکہ ان کے حصول کے لئے ضرور ایک ایسی ابدی زندگی ہو جس کے بعد فنا نہ ہو اور پھر اس زندگی میں ایسی عدالت قائم ہو جہاں کسی ظلم اور بے انصافی کا شائبہ تک نہ ہو بلکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے تو ایسا ہونا اس کے سوا ممکن نہیں کہ ایک ایسی ہستی ہو جو عالم آخرت کی صورت میں ابدی زندگی کا موقع فراہم کرے کہ جس کے بعد فنا کا کوئی تصور تک باقی نہ رہے۔ اسی صورت میں انسان کی فطری خواہشات و مطالب کی تکمیل ممکن ہے اور بصورت دیگر محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ وجود باری تعالیٰ کا اقرار اور اس پر ایمان لانا انسانی فطرت کا ایک زبردست اور پرزور تقاضا ہے۔

دوسری دلیل (منکرین کا مصائب میں اسی کی طرف رجوع کرنا)

یہ انسان کی فطرتی کمزوری ہے کہ جب تک انسان خوشی اور مسرت کے لمحات میں فرحاں وشاداں ہو اس کی توجہ کا مرکز خوشی وشادمانی کی کیفیات رہتی ہیں اور اس کی نظر فقط حاصل شدہ نعمتوں میں الجھی رہتی ہے لیکن جب اسے کوئی مصیبت یا پریشانی لاحق ہوتی ہے تو اس کے احساسات مسرت کا عارضی بناوٹی پن ختم ہو جاتا ہے اور اس کی فطرت سلیمہ بیدار ہو جاتی ہے اور اس کے اندر کی سچی آواز باہر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ وہ تمام معبودان باطلہ سے صرف نظر کر کے بے اختیار اسی معبود حقیقی کو پکارنے لگتا ہے اور وہ دنیا ما سوا سے کٹ کر اپنی تمام امیدیں اسی سے وابستہ کر لیتا ہے۔

سٹالن کا اعتراف

دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ء کے انتہائی نازک حالات میں جب روس نازی جرمنی کے عتاب و قہر کا نشانہ ہونے کی وجہ سے موت و حیات کی کشمکش سے دو چار تھا اور ہٹلر سارے یورپ کے لئے اپنے جارحانہ عزائم اور روز افزوں جنگی کارروائیوں کی بنا پر خطرہ بنا ہوا تھا، چرچل نے سٹالن کو اتحادی فوجی منصوبوں کے متعلق اپنی جوابی فالی کارروائیوں کی تفصیلات بتائیں۔ جنگی اسکیم کی تشریح سن کر ایک عالم سرمستی میں جب سٹالن کی دلچسپیاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ اس کی زبان سے نکلا "خدا اس اسکیم کو کامیاب کرے"۔ (بحوالہ ونسٹن چرچل، مذاکرات "ہینڈ رز" ص ۹۴)۔ گویا اس امر کا غماز ہے کہ خدا کے وجود کا کلیتاً انکار کرنے والا مصیبت کے وقت خدا ہی کی بارگاہ میں دست بدعا نظر آتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان فطرتی طور پر کسی قادر مطلق، مشکل کشا اور مصائب سے نجات دلانے والی ہستی کا محتاج ہے اور پریشانی اور مصیبت کے وقت انسانی ضمیر اور وجدان اضطراری طور پر خود بخود کسی ایسی ہستی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اسے اس پریشانی سے نجات دلائے۔

قرآن مجید انسان کی اسی فطرت اور طبعی میلان کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوٓا إِلَيْهِ مِن قَبْلُ ۝ (الزمر : ۸)

ترجمہ: انسان جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے پھر جب خدا اسے نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے خدا کو پکار رہا تھا۔

ایک اور مقام پر بصورت سوال انسانی فطرت کے اس دعوے کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

قُلْ مَن يُنَجِّيكُم مِّن ظُلُمَٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ لَّئِنْ أَنجَانَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ (الانعام : ۶۳)

ترجمہ: اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ فرما دیجئے وہ کون ہے جو تمہیں جنگلات اور سمندروں کی مصیبتوں سے نجات دیتا ہے۔ جس کو تم آہستہ آہستہ اور گڑگڑا کر پکارتے ہو کہ اگر وہ اس دفعہ ہم کو مصیبت کے اس گرداب سے نکال لے تو ہم ضرور اس کے شکر گزار ہوں گے۔

انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کا ذکر کرنے کے بعد قرآن مجید خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے:

قُلِ اللَّهُ يُنَجِّيكُم مِّنْهَا وَمِن كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنتُمْ تُشْرِكُونَ ۝ (الانعام : ۶۴)

ترجمہ: فرما دیجئے اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تمہیں صرف اس مصیبت سے ہی نہیں بلکہ ہر تکلیف سے نجات دیتا

ہے لیکن صاحب سے چھٹکارا پانے کے بعد تم پھر (اس کے احسان و فضل کو فراموش کر کے) شرک [illegible] میں مبتلا ہو جاتے ہو۔

ان دونوں مذکورہ بالا آیات نے اس حقیقت کو روز روشن کی طرح [illegible] ہر [illegible] کا مالک [illegible] اور [illegible] نجات دہندہ صرف خدا ہی کی ذات ہے۔

تیسری دلیل (فطری ہدایت سے ایمان باللہ پر استدلال)

توحید باری تعالیٰ کے آفاقی دلائل سے قطع نظر اگر ایک محقق [illegible] فطری ہدایت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر جاندار کو فطری طور پر ایک خاص ہدایت ودیعت کی گئی ہے۔ [illegible] ہو جاتا ہے۔ ایک نومولود بچے کو تولد کے فوراً بعد یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں [illegible] ہدایت کے پیدائشی طور پر پستان مادر سے دودھ پینے کا طریقہ جان لیتا ہے۔ ایک اور مثال شہد کی مکھی کی [illegible] رس اکٹھا کر کے بالآخر شہد تیار کرتی ہے۔ کوئی غیبی طاقت اسے القاء کرتی ہے کہ وہ اس مقصد [illegible] حاصل کرے اور کیا کیا عمل کرے کہ اس سے شہد تیار ہو جائے۔ اسی طرح پرندے مختلف جگہوں سے تنکے [illegible] ہیں، حالانکہ انہیں کوئی سکھلانے اور تربیت دینے والا نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے [illegible] انہیں کس نے دی ہے اور وہ کونسی طاقت ہے جو ان کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ لازماً کوئی [illegible] ہدایت ارزانی فرماتی ہے۔ گویا ہر جاندار کی فطری و جبلی خواہشات، ضرورت، طبعی میلانات اور طرز عمل [illegible] وجود کا تقاضا کر رہی ہیں جو اسے لوازم حیات کی تکمیل کیلئے فطری ہدایت عطا کرتی رہے۔ اگر ہم [illegible] کریں تو ہمیں اس میں گناہوں سے نفرت، نیکی سے محبت، حاجت مندوں کی مدد اور خالق کائنات پر ایمان [illegible] ہدایت فطری کا مظہر نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان اس کائنات رنگ و بو میں چاروں طرف سے [illegible] اس کی دستگیری کو تیار نہ ہو تو فطرت سلیمہ اس کی انگلی پکڑ کر اسے اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں لا کھڑا کرتی ہے اور [illegible] بارگاہ خداوندی میں حرف التجا بن جاتا ہے۔

اور وہ صرف اسی بارگاہ میں سراپا التجاء بن جاتا ہے۔

قرآن کریم نے کس قدر فصاحت و بلاغت سے انسان کی اس بے چارگی و بے بسی کی کیفیت کو بیان کیا ہے جب سوائے اس پروردگار کے کوئی اس کا چارہ ساز اور پرسان حال نہیں ہوتا۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ○ (یونس ۲۲)

ترجمہ وہ وہ ہے جو تم کو بحر و بر میں چلاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم (سمندر میں) کشتیوں پر ہوتے ہو جو تم کو لے کر نرم نرم ہواؤں کے سہارے چلنے لگتی ہیں اور وہ مسرور رہتے ہیں۔ تو (اچانک) ایک تیز و تند (طوفانی) ہوا انہیں آ لیتی ہے اور (بپھرتی ہوئی موجیں) انہیں ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں تو ایسے سخت ابتلا کے موقع پر (اچانک) وہ پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارنے لگتے ہیں کہ اے اللہ اگر تو ہم کو اس مصیبت سے چھٹکارا عطا کر دے تو ہم یقیناً بڑے شکر گزار ہوں گے۔

عکرمہ بن ابوجہل کا ذہنی انقلاب

اس کائنات میں [illegible] کی فطرت میں یہ چیز قدرتی طور پر رکھ دی گئی ہے کہ وہ اس ذات حق کا اقرار کرے جس نے اس کو تخلیق کیا [illegible] اور [illegible] دنیا کے ایسے پردے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ سرکشی و نافرمانی کی زندگی [illegible] زندگی میں کوئی ایسا موقع ضرور آ جاتا ہے کہ جب کسی اچانک حادثہ سے کفر و شرک کے تمام حجابات [illegible] ہو کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی واقعہ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ [illegible] کے نتیجے میں اس کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ وہ اس کے لئے قبول اسلام کا ذریعہ بن گیا۔ [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو فتح کیا تو عکرمہ نے جدہ کا رخ کیا اور ایک کشتی میں سوار ہو کر حبشہ جانے [illegible] طوفان آیا اور کشتی طوفانی لہروں میں گھر گئی۔ پہلے پہل تو تمام بت پرست اپنے بتوں اور دیوتاؤں [illegible] جب طوفان کی ہولناکیاں بڑھنے لگیں اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو دیوتاؤں کی شکتی [illegible] سب بے ساختہ طور پر پکار اٹھے کہ اب سوائے اللہ کے اور کوئی بچانے والا نہیں ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ [illegible] پر مدد دی جائے۔ پھر سب نے مل کر یک آواز اس کی رحمت کو پکارا اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔

بس یہی واقعہ عکرمہ کی زندگی میں رجوع الی اللہ اور انقلاب کا باعث بنا اور اس نے ضمیر پر دستک دیتے ہوئے کہا کہ یہ سارے بت بے حقیقت ہیں اور حقیقی خدا تو وہی ہے جو خشکی و تری میں اپنے بندوں کی فریاد سنتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔ اس پر عکرمہ نے فیصلہ کر لیا کہ اگر کشتی اس طوفان سے بچ کر صحیح سلامت ساحل تک پہنچ گئی تو میں سیدھا (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر ان کی بیعت کر لوں گا اور اس خدائے واحد پر ایمان لے آؤں گا جو طوفان کے رخ پھیر سکتا ہے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو ٹال سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے عہد پر قائم رہے اور آخر کار بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور بقیہ عمر اسلام اور دین حق کی خدمت میں بسر کر دی۔

۵۔ عالم حیوانات (Animal Kingdom) سے متعلق دلائل

عالم حیوانات کے اندر ہزاروں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں حیوانات پائے جاتے ہیں جو اپنی نفسیات، اشکال اور رنگ کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ یہ سب حیوانات خواہ چرند ہوں یا پرند ان میں سے ہر ایک اپنے خالق کی موجودگی پر شاہد عادل ہے۔ ان کے اجسام کی ساخت اور ان میں الوان وطبائع کا اختلاف بھی اسی پر دلیل ہے کہ انہیں مختلف شکلوں میں پیدا کرنے والی کوئی نہ کوئی ہستی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے بھی مختلف جانوروں کو ہستی باری تعالیٰ اور توحید پر بطور دلیل پیش کیا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ (النحل:۶۶)

ترجمہ۔ اور تمہارے لیے چوپاؤں میں بھی بڑا سبق ہے (وہ زندہ ہیں مگر تمہارے فائدہ کے لئے) ان کے پیٹ میں سے گوبر اور خون کے درمیان سے ہم خالص دودھ (نکال کر) تم کو پلاتے ہیں۔ جو پینے والوں (بچے ہوں یا بوڑھے) کے لئے نہایت خوشگوار ہے

(خدا کا کام بھی دیتا ہے)۔

اسی طرح شہد کی مکھی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ O ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ O (النحل : ۶۸، ۶۹)

ترجمہ اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں القاء کیا (یوں تعلیم دی) [illegible] پہاڑوں اور اونچے ٹیلوں پر (یا عمارتوں پر جو لوگ بناتے ہیں) گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں میں سے کھا اور اپنے [illegible] کے (تعلیم کیے ہوئے) صاف راستوں پر (جو تیرے لئے آسان ہیں) چل۔

(دیکھو اس نے حکم مانا وحی پر عمل کیا، حکم پر عمل کیا تو اس سے کیا نکلا؟) [illegible] سے وہ پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں (لیکن ذائقہ یکساں، وہ آتش شیال نہیں جو منتقل [illegible]) [illegible] میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ بے شک اس میں (اللہ کی صفات ہیں) غور کرنے کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ سائنسی حقائق کا علم انسان کو آیات اللہ یعنی خدا کی نشانیوں [illegible] قریب لے آتا ہے اور اس پر معرفت الٰہی کے دروازے کھول دیتا ہے۔

ایک ماہر علم الحیوانات (Zoologist) محقق حیاتیات (Biologist) جب [illegible] غیر جانبداری سے ذی حیات مخلوق کی تخلیق پر غور کرے گا تو وہ خود خالق کائنات کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا۔

ایک ماہر عضویات کی شہادت

جیسا کہ ظاہر ہے کہ ایک سائنسدان اپنی تحقیق اور مطالعہ فطرت کے باعث خدائے واحد و لاشریک کی کشانیوں اور قدرتوں کا ادراک زیادہ بہتر اور واشگاف انداز سے کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ لیکن اقرار و اعتراف کی سعادت کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے کہ

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(جب خدا کی عطا کرنے والی ذات نہ عطا کرے یہ سعادت ہر کسی کو اپنی ذاتی استعداد کی بناء پر عطا نہیں ہوتی)

لیکن جب کسی کا بخت یاور ہوتا ہے تو اس کے وجدان کی کھڑکی یا باطنی آنکھ (Inward Eye) اچانک کھل جاتی ہے اور ایک لمحہ موجود اسے انکشاف ذات سے انکشاف حق کی منزل سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

ذیل کا واقعہ اسی حقیقت کی نقاب کشائی کر رہا ہے۔

ماہر عضویات ڈاکٹر اندریو کان وے اپنی خود نوشت تصنیف میں یوں رقم طراز ہے

"جب میری عمر بمشکل تین سال کی تھی تو میں نے صغر سنی میں اس عمر کے دوسرے بچوں کی طرح اپنے والدین سے اس قسم کے سوالات پوچھنے شروع کیے کہ ان پرندوں کو، ہماری گائے کو اور اس دنیا کی ہر چیز کو کس نے پیدا کیا۔ زندگی کے سیدھے سادے حقائق اور میرے ذاتی تجربات نے میرے ذہن میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ جس طرح کوئی مشین، مشین ساز کے بغیر

وجود میں نہیں آ سکتی۔ یہ ذہانت خیز بنانے والے کے کس طرح وجود پذیر ہو گئی۔ اس مقام پر میرے فکر نے میری تشفی کی اور میں ان ابتدائی معلومات سے ... اس نتیجہ پر ... کے بعد کہ ان تمام اشیاء کو جو کائنات میں وجود رکھتی ہیں اور ان میں پرندے اور گھاس بھی شامل ہے ... کس نے پیدا کیا ہے؟" اس نتیجے پر پہنچا کہ ان سب چیزوں کے وجود کی کوئی نہ کوئی علت الاصل (Ultimate Cause) ضرور ہونی چاہیے۔ غور و فکر سے یہ حقیقت کھل گئی کہ وہ علت اولیٰ خالق و مالک کی بلند و برتر ذات کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتی۔

عالم انسان کا اعتراف عجز و بے بسی

اسی طرح عالم حیوانات میں ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق (Creature) کے مطالعے میں دلچسپی رکھنے والا جب اس کی زندگی، نظام حیات اور ... کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ "کس قدر عظیم ہے وہ ہستی جس نے اس کی تخلیق کی"۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان چاہے علم و حکمت کی کتنی ہی ارفع و اعلیٰ منازل طے کر لے اور جدید سائنسی علوم میں چاہے کتنا رسوخ حاصل کر لے ... قدرت کی تقدیر اور شان خلاقیت کے سامنے خود کو بے بس، عاجز اور انتہائی کمزور محسوس کرے گا۔ آج سائنس ترقی یافتہ ... کوئی بڑے سے بڑا سائنسدان یا کوئی ادارہ تحقیق اپنی انتہائی کوشش کے باوجود ایک مکھی کو بھی وجود ... نہیں ... "ابداع" (عدم سے وجود میں لانا) ایسی خصوصی صفت ہے جو صرف اور صرف ایک مدبر الامر اور علیم و حکیم ہستی یعنی خالق کائنات کے لئے خاص ہے اور کوئی دوسرا اس صفت میں اس کا شریک نہیں۔ قرآن حکیم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ○ (الحج ۷۳)

ترجمہ: جن معبودوں کو وہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ ایک مکھی (تک) ہرگز پیدا نہ کر سکیں گے۔ اگرچہ اس (چھوٹی سی چیز کے پیدا کرنے) کے لئے سب کے سب جمع ہو جائیں۔

قرآن حکیم میں رب قدیر و علیم کی طرف سے یہ اتنا بڑا چیلنج ہے جس کا جواب آج کی سائنس باوجود جدید علوم کی فلک بوس بلندیوں اور پہنائیوں کے دینے پر قادر نہیں۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی ہر میدان میں فقید المثال ترقی وارتقاء کے باوصف مکھی جیسی حقیر چیز پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ مکھی تو بڑی بات ہے اس کے ایک ٹوٹے ہوئے پر کو جوڑنا بھی اس کے بس میں نہیں۔ اسی طرح سورہ ملک میں پرندوں کی تخلیق، ان کی حیات اور پرواز اور حرکات و سکنات کو بھی دلیل واجب الوجود قرار دیتے ہوئے اس میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

ارشاد فرمایا:

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ○ (الملک ۱۹)

ترجمہ: کیا انہوں نے اپنے سروں پر پرندوں کو پر پھیلائے (اڑتے ہوئے) نہیں دیکھا جو کبھی (اپنے پروں کو) سمیٹ بھی لیتے ہیں (دیکھو) ان کو (خدائے) رحمٰن کے سوا کوئی (فضائے بسیط پر) تھامے ہوئے نہیں ہے۔ بے شک وہ (اللہ) ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

کوئی بھی صاحب عقل اور ہوش مند انسان ان حقائق سے اپنی آنکھیں نہیں موند سکتا اور یہ ایک حقیقت ہے

کہاں پرندوں کی زندگی، تخلیق اور پرواز کے راستے اور حرکات و سکنات کے انداز یہ سب ایک منتظم اور مدبر خالق کے وجود کی دلیل مبین ہے۔

توحید کے نفسی دلائل جنہیں قرآن حکیم ذات باری تعالیٰ کی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے وہ انسان کے باطن سے جنم لیتے ہیں اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جس قدر انسان باطنی طور پر اپنے آپ سے قریب ہے کوئی خارجی چیز اس سے قریب تر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ لیکن اس حقیقت کا ادراک وہی کر سکتا ہے جسے حق نے نور بصیرت سے مالا مال کیا ہو۔

ذیل میں چند نفسی دلائل کا ذکر اختصار سے کیا جاتا ہے۔

شیر مادر سے دلیل واجب الوجود

جب ایک عورت ماں بن جاتی ہے اور اس کی گود میں نرم و نازک معصوم بچہ آتا ہے تو اس کے سینے میں دودھ اتر آتا ہے حالانکہ یہی غذا وہ پہلے بھی کھاتی تھی لیکن اس کی چھاتی میں دودھ نہیں اترا تھا۔ ماں بننے سے پہلے بھی اس کا کھانا اور غذا وہی ہے اور وہی چھاتی ہے لیکن ان سے میٹھے اور تازہ دودھ کے دو چشمے ہیں کہ غذا تو سب کھاتے ہیں مرد ہوں یا عورتیں ان کا اس میں کوئی فرق نہیں۔ تو پھر مردوں کی چھاتی میں دودھ کیوں نہیں آتا؟ نیز عورت کی چھاتی میں بھی بچہ کی پیدائش سے پہلے دودھ کیوں نہیں آتا؟ حالانکہ غذا بھی وہی کھاتی ہے۔ تو اس کا صاف اور واضح جواب یہ ہے کہ یہ سب اس مالک حقیقی کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ وہ مختلف النوع ترکاریوں اور غذاؤں کو خون کی رنگت عطا کرتا ہے اور پھر جب چاہتا ہے اس کو سفید، شفاف اور خوشبودار دودھ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی باعث حیرت ہے کہ جب ایک مرتبہ دودھ جاری ہو جائے تو پھر خارجی عمل کے ذریعے اس کو روکا بھی نہیں جا سکتا۔ قدرت کی عجیب کرشمہ سازی ہے کہ جب تک بچے کو دودھ کی ضرورت ہوتی ہے وہ جاری رہتا ہے اور جب بچے کو رضاعت کی ضرورت نہ رہے تو از خود خشک ہو جاتا ہے، تو کیا یہ سارا سلسلہ اور نظام کسی قادر مطلق ہستی کی خبر نہیں دیتا؟

جانوروں کے دودھ سے استدلال

اسی طرح ہم جانوروں سے جو دودھ حاصل کرتے ہیں وہ اس چارے سے بنتا ہے جو وہ کھاتے ہیں۔ یہ چارہ اوجھڑی میں پہنچتا ہے جہاں انہضام کا عمل شروع ہوتا ہے، اوجھڑی کے اوپر والے حصہ میں خون اور نچلے میں ناپاک و بدبودار گوبر ہوتا ہے جس کے درمیان صاف و شفاف اور سفید دودھ کا قوام تیار ہوتا ہے جو مختلف مراحل سے ہوتا ہوا تھنوں کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔

قدرت کی یہ عجیب کرشمہ سازی صاحبان عقل و دانش سے سوال کرتی ہے کہ آخر وہ کونسی ہستی ہے جو سرخ رنگ کے سیال خون اور بدبودار گوبر کے درمیان دودھ کی نہریں جاری کرتی ہے کہ اس میں گوبر کی بدبو کا شائبہ تک نہیں ہوتا بلکہ سرخ خون کا ایک قطرہ بھی اس میں شامل نہیں ہوتا۔ اسی لئے فرمایا

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۝ (النحل ٦٦)

ترجمہ۔ کیا وہ اونٹ پر غور نہیں کرتے (دیکھتے نہیں) کہ اسے کس طرح پیدا کیا گیا۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ کیا اتنی بڑی جسامت رکھنے والا جانور بغیر کسی خالق کے ہی عدم سے وجود میں آ گیا؟ تو جس ہستی

نے اونٹ کو پیدا کیا ہے وہ [illegible] ہی ہے۔

علاوہ ازیں [illegible] سے اندر زبان اور لہجوں کا فرق ہے اسی طرح عالم حیوانات سے متعلق افراد بھی آپس میں زبان، صورت، [illegible] مختلف ہیں۔ چیل، مرغ، کبوتر، کوے کی آوازوں میں فرق ہے۔ [illegible] کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ کوا کائیں کائیں کرتا ہے، کبوتر کی طرح غٹروں غوں نہیں کرتا؟ [illegible] ان طائران خوش نوا کو یہ بولیاں کس نے سکھائیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادر مطلق کی قدرت کاملہ [illegible]؟

دودھ کی پیداواری اشیاء سے ایک اور استدلال

دودھ [illegible] ہے جس نقطہ نظر سے اگر انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ یہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے وجود باری تعالیٰ پر دال ہے [illegible] اور اس سے بننے والی [illegible]، اسی طرح مکھن بھی اپنی تاثیر کے اعتبار سے سرد [illegible] ہوتا ہے۔ تو کیا ایک ہی چیز سے بننے والی اشیاء کی یہ مختلف تاثیرات کسی ایک موثر اعلیٰ کے ہونے [illegible] جو سب موجودات کا خالق ہے۔

الغرض [illegible] میں غور کرتا چلا جاتا ہے خالق و رب کائنات پر اس کا اعتقاد اور یقین اتنا ہی پختہ اور غیر متزلزل ہوتا چلا جاتا ہے۔

وجود باری تعالیٰ کے عقلی دلائل

سید حامد علی

کیا خدا انسانی کمزوری کی پیداوار ہے؟

خدا انسانی کمزوری کی پیداوار ہے، یہ ایک خیال ہے جسے ملحدین پوری شدت سے پیش کرتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک انسان قدیم ترین زمانے سے خدا کو صرف اس لئے مانتا رہا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کمزور محسوس کیا، اسے سہارے کی تلاش ہوئی اور اس نے ایک ہستی کو فرض کر کے اسے خدا کا نام دے دیا۔ دورِ حاضر کا انسان فطرت پر فتح پاچکا ہے اس لیے اسے ایسی ہستی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں، آج کا انسان خود اپنی طاقت پر بھروسہ رکھتا ہے، وہ آپ اپنا مشکل کشا ہے، وہ آپ اپنا خدا ہے۔

لیکن کیا یہ صورت واقعہ کی صحیح تصویر کشی ہے؟ کیا خدا کو صرف اس لیے مانا گیا کہ انسان کو ایک سہارے کی تلاش تھی اور اس نے کسی ٹھوس دلیل کے بغیر ایک خیالی ہستی کو سہارا بنالیا؟ کیا آفاق و انفس میں وجود باری تعالیٰ پر کوئی دلیل نہیں ہے؟ کائنات کے آثار، انسانی نفسیات اور مذاہب عالم کا وسیع اور مدلل لٹریچر اس کی تردید کے لیے کافی ہیں اور خود ہم "خدا کا انکار کیوں"؟ "خدا ہے"۔ اور "کیا خدا کی ضرورت نہیں"؟ میں اس مسئلہ پر فیصلہ کن بحث کر چکے ہیں۔

پھر کیا ہزاروں سال کی طویل مدت میں وہمیوں اور تھڑدلوں نے خدا کو مانا اور اربابِ علم و دانش اور اصحابِ شجاعت و عزیمت نے خدا کا انکار کیا ہے؟ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب کے غلبہ سے قبل نوعِ انسانی عموماً خدا کو مانتی رہی ہے اور جن اساطینِ علم اور اکابر رجال کے آگے انسانی سر اعترافِ عظمت سے جھک جاتا ہے اور جن اربابِ شجاعت و عزیمت نے دنیا سے اپنی بے خوفی و اولوالعزمی کا لوہا منوایا ہے تقریباً وہ سب کے سب خدا کو ماننے والے تھے۔

آج بھی، جبکہ الحاد کے ہاتھوں میں زمامِ اقتدار اور قیادتِ تہذیب و فن ہے، انسانوں کی عظیم اکثریت خدا کی قائل ہے اور مشرق و مغرب کے بہت سے مفکرین، فلاسفہ اور اربابِ علم و دانش خدا کی ہستی کے معترف ہیں۔ سائنس اور سائنس دانوں کا نام الحاد کی تائید میں خصوصیت سے لیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ جو شخص بھی سائنس اور اہلِ سائنس کے جدید ارتقا سے باخبر ہوگا وہ اس کا جواب نفی میں دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور الحاد کے مابین کوئی ربط نہیں، اس کے برعکس سائنس کے تمام انکشافات وجود باری تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اسی طرح جن سائنس دانوں نے سائنس کی دنیا میں گہرے اثرات چھوڑے ہیں، ان کی اکثریت خدا کی

معترف یا کم از کم اس مسئلہ میں خاموش ہے اور اس خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ہونے نہ ہونے کا مسئلہ اصلاً سائنس کا نہیں فلسفہ کا موضوع ہے۔ سائنس مادہ، مادی کائنات اور کائنات کے قوانین سے بحث کرتی ہے، کائنات کے ماورا کوئی طاقت ہے کہ نہیں، سائنس کا براہ راست اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس کی اسی خصوصیت کے باعث سطحی نظر رکھنے والوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ سائنس مادیت کی قائل اور خدا کی منکر ہے اور جب کچھ سائنس دانوں نے خدا کا انکار کر دیا تو لوگوں نے اس انکار کو سائنس اور اس کی تحقیقات کا نتیجہ سمجھ لیا، حالانکہ سائنس خدا کا انکار کرتی ہے، یہ کہنا سائنس اور اس کے موضوع سے عدم واقفیت کا نتیجہ یا سائنس کا غلط استعمال ہے۔ خدا ہے یا نہیں، یہ مسئلہ سائنس کے موضوع سے فی الحقیقت خارج ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ محض اس لیے مان لیں کہ قدیم ترین زمانے سے نوعِ انسانی اسے مانتی آئی ہے اور ان ماننے والوں میں بڑے بڑے سائنس دان ہیں۔ یقیناً خدا کا اقرار یا انکار دلائل ہی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ہم اسی کو صحیح سمجھتے اور ہم نے یہی راہ کو اختیار کیا ہے۔ منکرین سے بھی ہمارا مطالبہ یہی ہے کہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بجائے وہ اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کریں۔ خدا انسانی کمزوری کی پیداوار ہے، یہ کوئی دلیل نہیں، محض ایک دعویٰ ہے جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں اور اس کی تردید کے لیے یہی بات کافی ہے کہ تاریخی تسلسل کے ساتھ بہت سے ارباب علم و فکر اور اصحاب عزیمت و شجاعت خدا کے قائل رہے ہیں جنہیں وہمی اور کمزور دل نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں جو لوگ اپنے سوا تمام انسانوں کو وہمی اور بزدل سمجھتے ہیں، وہ جو چاہیں فرماتے رہیں، لیکن ایسے بر خود غلط لوگ ہم انسانوں کی قیادت و رہنمائی اور انسانی مسائل کو حل کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ "خدا انسانی کمزوری کی پیداوار ہے" اس طرح کی سطحی باتیں کر کے ملحدین خدا پرستی کے موقف کو تو کمزور نہیں کرتے البتہ خود اپنے موقف کو کمزور کر لیتے ہیں۔ وہ اس طرح اس بات کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں کہ ان کے پاس طنز و استہزا اور فضول بے بنیاد باتوں کے سوا کوئی بھی سنجیدہ دلیل نہیں ہے۔ کتنی حیرت انگیز ہے یہ حقیقت کہ جن لوگوں نے خدا پرستوں کا نفسیاتی تجزیہ کر کے انہیں وہمی اور کم عقل ثابت کرنا چاہا تھا انہوں نے اپنی اس حرکت سے خود اپنی نفسیاتی اور عقلی کمزوری پر سے پردہ اٹھا دیا۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

آج کا فریب خوردہ انسان اس تصور سے سرشار ہے کہ اس نے فطرت پر فتح پا لی ہے اور اسی لیے اس کا سر کبر و غرور خدا کے آگے جھکنے میں اپنی ذلت محسوس کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ فطرت پر فتح پانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان قوانین فطرت (Laws of Nature) کی غلامی سے آزاد ہو جائے اور ان کا محکوم ہونے کے بجائے ان کا حاکم بن جائے۔ لیکن اس میں انسان کو شمہ برابر بھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور آئندہ بھی کامیابی کا کوئی امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ انسان قوانینِ فطرت میں جس طرح پہلے جکڑا ہوا تھا، ٹھیک اسی طرح آج بھی جکڑا ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ پہلے انسان کو فطرت کے تھوڑے سے قوانین کا علم تھا اور اب اسے زیادہ قوانین کا علم ہو گیا ہے۔ لیکن اس سے انسان کی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ وہ پہلے بھی قوانینِ فطرت کا پابند اور فاطر کائنات کا تابعِ فرمان تھا اور آج بھی اس کی یہی حیثیت باقی ہے۔ پہلے بھی ذرائع و وسائل کی فراوانی، دولت کی بہتات اور اقتدار کے نشے میں انسان آپے سے باہر ہو

جاتا اور خدا کے آگے سر جھکانے میں اپنی ذلت محسوس کرتا تھا اور آج کا انسان بھی [illegible] تہذیب سے آراستہ ہو کر بھی غرور کی اسی جاہلی تاریخ کو دہرا رہا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہوا ہے [illegible] انسان خدا کی نافرمانی تو کرتا تھا مگر اس کا انکار نہ کرتا تھا لیکن آج کا متکبر انسان خدا کے وجود ہی سے انکار کر رہا ہے [illegible] غرور کے جاہلی جذبہ کی تکمیل کر دی ہے۔

انسان کی کمزوری

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ دولت و اقتدار [illegible] اپنے آپ کو بھول جاتا ہے، وہ صالح و مصلح بننے کے بجائے ظلم و فساد اور شیطنت کا پیکر بن جاتا ہے [illegible] اسباب اور علم و تہذیب سے سارے ارتقا کے باوجود انسان آج بھی اسی کمزوری کا شکار ہے اور پہلے سے [illegible] ظلم و فساد کے جو "اکھاڑے" قائم ہیں اور "دنیا کے بڑے" جس طرح ان اکھاڑوں [illegible] جا رہے ہیں جتنے مہیب ایٹمی جنگ کی طرف دھکیل رہے ہیں اس کے پیچھے انسان کی یہی کمزوری کار فرما ہے [illegible] کا انسان علم و سائنس کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود اس کمزوری کا، جو پوری انسانیت کو ڈبو دے [illegible] وہ جو خلا میں سفر کرنے، زمین کے گرد چکر لگانے اور چاند پر کمند ڈالنے کے قابل ہو گیا ہے، زمین پر انسان [illegible]

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

(اقبال)

اس کمزوری کا آزمودہ و کارگر علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسان پر اس کی اصل حیثیت واضح کر دی جائے۔ اس کے اندر اس بات کا یقین پیدا کر دیا جائے کہ وہ معدوم تھا، خالق کائنات نے اسے وجود بخشا، اسے بہترین صلاحیتوں سے نوازا اور اسی کی ربوبیت و پروردگاری کے سہارے اس کی زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔ وہ سراپا اس کا محتاج ہے، اس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اس کا بندہ اور اس کا محکوم ہے اور اپنے اعمال و اقوال میں اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ اگر اس نے خدا فراموشی، ظلم و فساد اور انسانیت کشی کی راہ اختیار کی تو وہ کائنات کے عظیم فرمانروا کے سخت عذاب سے بچ نہ سکے گا، حتیٰ کہ موت بھی اس عذاب کی راہ میں حائل نہ ہو گی۔ اس شدید اور ابدی عذاب سے نجات پانے کی اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہے کہ وہ خدا کا بندہ اور انسان بن کر رہے۔

خدا کے تصور اور اس کے حضور جوابدہی کے اس یقین نے دولت و اقتدار کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد انسان کو بہکنے سے بچایا ہے اور اسے ظالم اور خود سر بننے نہیں دیا ہے۔ اس ایک یقین کے علاوہ انسانیت کی پوری تاریخ، انسان کو قابو میں رکھنے کی کسی اور تدبیر سے ناآشنا ہے۔ کل بھی یہی نسخہ کارآمد تھا اور آج بھی یہی نسخہ کارآمد ہے، ملحدین اس نسخے کو پوری بے دردی سے ضائع کر دیتے ہیں مگر نوعِ انسانی کو کوئی اور نسخہ فراہم کر کے نہیں دیتے۔ اب اگر انسان ظالم، خود سر بنتا ہے اور دنیا تباہی و بربادی کے مہیب خندق میں جا رہی ہے تو ان کی بلا سے، وہ اس کے ذمہ دار تھوڑا ہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان پہلے کمزور تھا اس لئے خدا کو ماننے پر مجبور تھا، آج کا انسان کمزور نہیں ہے، وہ بے پایاں طاقت رکھتا ہے اس لیے اسے کسی ان دیکھی طاقت کے آگے سر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ آپ اپنے مسائل سے نمٹ سکتا ہے، وہ

...ب پر خدا ہے۔

یقیناً یہ بڑی ہی خوفناک [illegible] ہے جس میں کوئی انسان مبتلا ہو سکتا ہے۔ انسان پہلے بھی کمزور تھا اور آج بھی ہے، وہ پہلے بھی مخلوق اور محدود صلاحیتوں کا [illegible] اس کی اس حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ قدرت انسان کو جو جسم، جو صورت اور جو صلاحیتیں دے کر دنیا میں [illegible] وہ دنیا میں آ جاتا ہے، ان میں سے کسی چیز کو حسب منشا منتخب کرنے کی آزادی نہ انسان کو پہلے تھی، نہ [illegible] حاصل ہوگی۔ حالانکہ انسانی زندگی کی پوری تعمیر اسی بنیاد پر ہوتی ہے۔ انسان کو پہلے بھی یہ قدرت حاصل [illegible] کہ اپنے لیے خاندان، مقام، وقت اور حالات کا اپنی مرضی سے انتخاب کر لے۔

آج بھی اسے یہ قدرت [illegible] اور آئندہ بھی اس معاملے میں مجبور محض رہے گا، حالانکہ یہ سب امور انسان کی زندگی اور اس [illegible] فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ پیدائش کے وقت انسان ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے جس کی پرورش [illegible] صلاحیتوں کا ارتقا، در کنار، اس کا زندہ رہنا بھی ناممکن ہے۔ انسان کی یہ بے بسی بھی [illegible] ہوتا ہے، بچہ وہ کمزوری و بے چارگی کے عالم میں پیدا ہوتا ہے، پھر دور شباب میں قوتوں سے مالا مال [illegible] ہوتا ہے اور اس کی قوتیں ایک ایک کر کے جواب دینے لگتی ہیں، حتیٰ کہ موت کے مہیب پنجے [illegible] اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ انسان جس طرح اس معاملے میں پہلے بے بس تھا آج بھی بے بس ہے [illegible] کوئی امکان نہیں ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ (سورہ بقرہ ۲۸)

"تم کیوں کر اللہ کا [illegible] تم زندگی سے محروم تھے تو اللہ نے تمہیں زندگی بخشی۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا، پھر وہ تمہیں زندہ فرمائے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے"۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً ۚ (روم ۵۴)

"اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا پیدا کیا"۔

انسان پہلے بھی ہوا، گرمی، پانی اور غذا کا محتاج تھا اور ان کے بغیر زندہ نہ رہ سکتا تھا، آج بھی اس کی یہ کمزوری جوں کی توں باقی ہے۔ بیماریاں پہلے بھی انسان کو پریشان کرتی تھیں اور اس کی زندگی کے لیے خطرہ بن جاتی تھیں اور یہی صورت حال اب بھی برقرار ہے۔ بیماریوں پر قابو پانے کا جو غلغلہ ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کچھ پرانے امراض گھٹے ہیں تو کچھ دوسرے نئے اور پیچیدہ امراض نے جگہ لے لی ہے اور ٹی۔بی اور کینسر جیسے مہلک امراض عام ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جنگی اسلحہ انسان کے لیے پہلے بھی وجہ ہلاکت تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ اس فرق کے ساتھ کہ قدیم اسلحہ کے ساتھ بے شمار نئے اسلحہ کا اضافہ ہو گیا ہے جو پرانے اسلحہ سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں اور ان میں سے بعض بعض تو پوری انسانی دنیا کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہیں، مثلاً ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم، اور انسان [illegible] ہے کہ اپنی ہلاکت کے اس عظیم سر و سامان کے آگے بالکل بے بس ہے۔ پہلے انسان پر خشکی و تری اور ہوا سے موت اور ہلاکت کی بارش ہوتی تھی، اب یہ بارش ہلاکت خلا سے بھی ہو سکے گی۔ قدرتی حوادث کا شکار

انسان پہلے بھی ہوتا تھا مگر اب تیز رفتار سواریوں اور [illegible] مشینی ایجادات نے قدرتی [illegible] مشینی حوادث کا [illegible]
اضافہ کر دیا ہے۔ انسانی مسائل آج سے قبل بھی پیچیدہ تھے لیکن آج [illegible] تدبیر سے سلجھنے کا نام
نہیں لیتے۔ مختصر یہ کہ عام انسان آج بھی اتنا ہی کمزور و لاچار ہے جتنا پہلے کبھی تھا [illegible] زیادہ [illegible] ارباب
اقتدار اور ارباب ثروت، تو وہ پہلے کی طرح آج بھی دوسرے انسانوں سے مختلف ہیں۔ [illegible]
انسان بھی عام انسانوں سے زیادہ کوئی مقام نہیں رکھتا اور یہ [illegible]

امید اور بے خوفی کا راز

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان، اپنی بہترین صلاحیتوں اور [illegible] کمزور و بے بس ہے۔
اب یا تو آپ یہ مانیے کہ وہ کائنات کی اندھی بہری طاقتوں کے ہاتھ میں بے بس [illegible] توڑ پھوڑ کر رکھ
دیں اور اس کے سارے منصوبوں کو آن کی آن میں خاک میں ملا دیں یا آپ یہ مانیے [illegible] کا محتاج اور اس کے آگے
سراپا احتیاج ہے جس کے قوانین میں پوری کائنات جکڑی ہوئی ہے۔ [illegible] تسلیم کرنا ہوگی۔ اگر
آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو آپ کو ایک سوال کا جواب دینا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ [illegible] اندھی بہری طاقتوں
کے آگے کمزور و بے بس نظر آتا ہے اس طرح خود یہ قوتیں قوانین فطرت کے آگے [illegible] نظر آتی ہیں۔ پھر وہ کون
ہے جس کے مقرر کردہ قوانین میں یہ تمام قوتیں جکڑی ہوئی ہیں؟ جس ہستی کا قانون [illegible] نافذ ہے، اسی کے قانون
کی عملداری انسانی وجود پر بھی ہے، لیکن اس بات سے قطع نظر مادی تعبیرات کا یہ نقطہ نظر [illegible] کے عمیق غار
میں دھکیل دینے والا ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے، کوئی ایک طاقت نہیں، بے شمار طاقتیں ہیں جو انسان کو کھا جانے کے لئے ہر طرف
منہ کھولے کھڑی ہیں۔ یہ طاقتیں شعور نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی رحم یا انصاف کی توقع کی جا سکے یا انہیں راضی کر کے ان کے
غضب سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار کی جا سکے۔ اس نقطہ نظر کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان اپنے مستقبل سے مایوس ہو
جائے اور اس کی پوری زندگی خوف و ہراس کی نذر ہو جائے۔ برطانیہ کا مشہور ملحد فلسفی برٹرینڈ رسل کائنات کی مادی توجیہ کو ان
الفاظ میں بیان کرتا ہے

> "انسان اندھی بہری طاقتوں کے ہاتھ میں ایک ایسا بے بس کھلونا ہے جس کا کوئی مقصد نہیں۔ اس کی
> پیدائش اور ارتقاء اس کی آرزوئیں اور تمنائیں، اس کے اعتقادات و تصورات، سالمات کے تعامل کا نتیجہ
> ہیں۔ اس کی زندگی کی انتہا قبر ہے اور اس کے بعد کوئی احساس اور کوئی نظریہ اسے زندگی عطا نہیں کر سکتا۔
> صدیوں کی جدوجہد، نصب العین سے وابستگی عبقریت کے کارہائے نمایاں، سب نظام شمسی کے ساتھ
> ختم ہونے والی چیزیں ہیں۔ جب کائنات زیر و زبر ہو گی تو انسانی کمالات بھی اس کے ملبے کے نیچے دب کر رہ
> جائیں گے"۔

کس قدر بھیانک اور یاس انگیز ہے یہ نقطہ نظر جس کسی کو یہ نقطہ نظر اپیل کرتا ہو وہ بے تامل اسے اپنائے۔
ہمیں تو جو بات مبنی بر حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کائنات کی اندھی بہری طاقتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا
ہونے کے بجائے فرمانروائے کائنات کا محکوم ہے جو کامل شعور اور عمیق حکمت کے ساتھ کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ وہ اپنی
مخلوقات پر انتہائی مہربان ہے اور جو بندے اس کی مرضی پر چلتے ہیں ان کیلئے اس کی راحت و نصرت کے دروازے وا ہو جاتے ہیں

اور کائنات کی قوتیں ان کے ساتھ ... ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ایسے افراد کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ خدا پرستی کا یہ نقطہ نظر ... ہونے کے ساتھ ... خوف ... دنیوی ... ناامیدی سے بچانے والا اور امید اور بے خوفی کی راہیں اس پر کھولنے والا ہے۔

یہ ایک تاریخی ... حقیقت ہے کہ خوف اور مایوسی فرد اور قوموں کے لیے سم قاتل ہیں، اس کے برعکس بے خوفی اور امید ... تعمیری ... ہیں ... عزم و ہمت ... بخشتی ہیں، انہیں ارتقا کی بلندیوں پر پہنچاتی ہیں اور ان کے دکھوں کا مداوا ثابت ہوتی ہیں۔ ان ... قوتیں ... ہاتھ سے نہ چھوٹے تو حالات کے حد درجہ ناسازگار ہونے کے باوجود یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔ ... کسی قوم کو خوف یا مایوسی کا گھن لگ جائے تو کثرتِ تعداد اور ذرائع و وسائل کی فراوانی بھی ... تباہی سے نہیں بچا سکتی۔

اس بے رحم ... دنیا میں ... کائنات کی اندھی بہری طاقتیں منہ پھیلائے ہوئے انسان کو کھانے کے لیے ہر طرف موجود ہیں اور جہاں ارباب اقتدار ... ارباب دولت کے ہاتھوں ... ظلم و فساد کی گرم بازاری ہے، خدا کے جاں بخش تصور کے علاوہ کمزوروں کے لیے خوف ... مایوسی سے بچنے کی کوئی راہ نہیں۔ یہی وہ یقین ہے جو بے سہارا لوگوں کے لیے سہارا بنتا ہے، جو ذرائع و وسائل سے محروم ... انسان کو خوف اور مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیتا اور کمزوروں کی کمزوری کا مداوا ثابت ہوتا ہے۔

لا دینی و لا طینی، کس پیچ میں الجھا تو   دارو ہے ضعیفوں کا لاغالب الا ہو

اقبال

خدا پرستوں کو یقین ہوتا ہے کہ نفع و نقصان اور زندگی و موت نہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہیں، نہ دوسرے انسانوں کے اختیار میں، نہ کائنات کی اندھی بہری طاقتوں کے بس میں، بلکہ سب کچھ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے نہ اصحاب اقتدار و ارباب ثروت سے ڈرنے کی ضرورت ہے نہ کائنات کی قوتوں سے۔ ساری طاقت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ تنہا تمام قوتوں سے نمٹنے کے لیے کافی ہے۔

انّ القوّةَ لِلّٰه جميعًا ۙ (بقرہ ۱۶۵)

قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔

هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۝

وہی ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (آل عمران: ۱۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ لوگوں (دشمنوں) نے تمہارے (مقابلے) کے لئے (بہت ساز و سامان) جمع کیا ہے تو تم ان سے ڈرو تو اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا، اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

اسی طرح اگر حالات ناسازگار ہوں تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، فیصلہ کن چیز حالات نہیں، اللہ ہے۔ وہ ایک آن

میں حالات کو بدل سکتا اور بدلتا رہتا ہے۔ وہی ہے جو افراد و اقوام کو اقتدار و عزت سے نوازتا اور وہی ان سے عزت واقتدار سلب کر لیتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝ (آل عمران ۲۶)

کہو اے اللہ! اقتدار کے مالک، تو جسے چاہتا ہے اقتدار عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل وخوار کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ساری دولت و نعمت ہے، یقیناً تو ہر شے پر قادر ہے۔

اگر ہم اللہ کی مرضی پر چل رہے اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہتے ہیں تو ناسازگار حالات سے مرعوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، جب اللہ ہمارا پشت پناہ ہے تو کسی چیز سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۝ وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَ مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۝ (طلاق ۲-۳)

اور جو اللہ کی نافرمانی سے بچے گا، اللہ اس کے لیے راہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے مقام سے روزی دے گا جس کا اسے گمان تک نہ ہو گا اور جو اللہ پر بھروسا کرے گا اللہ اس کے لیے کافی ہو گا۔ یقیناً اللہ اپنے فیصلہ کو نافذ کر کے رہتا ہے، (البتہ) اس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

اللہ پر یقین اور مایوسی دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے، جہاں خدا پر یقین ہو گا وہاں مایوسی نہ ہو گی اور جہاں مایوسی ہو گی وہاں خدا پر یقین نہ ہو گا۔

لَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (یوسف۔۸۷)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً خدا کی رحمت سے صرف کافر و منکر مایوس ہوتے ہیں۔

خدا کا انکار کرتے ہی یہ عظیم طاقت ہم سے چھن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے منکر جب مادی ذرائع و وسائل سے محروم ہو جاتے ہیں تو دنیا ان کے لیے تاریک ہو جاتی ہے اور وہ خود کشی کر کے اپنی مصیبت بھری زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں یا ظلم و طغیان کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ جیسا کہ اشتراکیت کے امام حاضر خروشچیف* اور ان کے ساتھیوں نے خود ان کے اپنے اعتراف کے بموجب اشتراکیت کے سابق امام ــــ اسٹالن* ــــ کے ظلم وطغیان کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

خدا پرستی اور الحاد دو متضاد نقطہ ہائے نظر ہیں اور انسانی زندگی پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے کونسا نقطہ نظر صحیح ہے، اسے طے کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دونوں نظریات کے دلائل و براہین پر غور کیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زندگی پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ اس پہلو سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر زندگی پر متضاد اثرات ڈالتے ہیں۔ خدا کا منکر دولت و اقتدار پا کر ظلم و شیطنت کا پیکر بن جاتا ہے کیونکہ اسے اپنے سے بالاتر کسی ہستی کے آگے جوابدہی کا خوف نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس خدا کے حضور جوابدہی کا خوف خدا پرست کو ظالم ومفسد بننے سے باز رکھتا ہے۔ اسی طرح خدا کا منکر مادی سہاروں کے مفقود ہونے کی حالت میں خوف و ہراس اور مایوسی و

ناامیدی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ تمام مادی سہارے اس سے چھن چکے ہوتے ہیں اور ان سہاروں سے ماورا کسی سہارے کا وہ قائل نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف [illegible] مادی سہاروں کے عالم میں بھی خدا کا سہارا خدا پرست کو خوف و مایوسی میں مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ یہ نفع و نقصان کا موازنہ ہے جسے سامنے رکھ کر ہم بآسانی یہ طے کر سکتے ہیں کہ کون سا نقطۂ نظر حق اور انسانیت کے لیے موجب فلاح ہے اور کون سا نقطۂ نظر باطل اور انسانیت کے لیے مہلک۔

الحاد یا مظاہر فطرت سے مرعوبیت؟

ملحدین کا خیال ہے کہ مذہب مظاہر قدرت سے مرعوبیت کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ انسان نے ہوا، پانی، آگ، زمین، پہاڑ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی طاقت و قوت اور عظمت کو محسوس کیا، اسے خیال ہوا کہ یہ فوق الفطرت طاقت کی حامل ہیں۔ چنانچہ اس نے انہیں دیوتا مان لیا۔ وہ سورج، چاند [illegible] عظمت سے بھی متاثر ہوا اور بے تامل ان "دیوتاؤں" کے آگے بھی جھک گیا۔ اس نے اپنے سے پہلے [illegible] دیکھے۔ اسے خیال ہوا کہ یہ میری قسمت کے مالک ہیں اور وہ ان کی پرستش میں لگ گیا۔ اس نے بعض انسانوں [illegible] روحانیت [illegible] میں اپنے سے بلند تر پایا اور وہ بے تامل ان کے آگے جھک گیا۔ اس طرح خداؤں کی [illegible] فہرست [illegible] حالات کے تحت گھٹتی بڑھتی رہی، یہاں تک کہ حالات کے ارتقا ہی کے نتیجے میں یہ فہرست گھٹتے گھٹتے ایک خدا پر مشتمل ہو گئی اور اب جبکہ مظاہر فطرت سے مرعوبیت کا دور ختم ہو چکا ہے اور انسان نظام کائنات کو بخوبی سمجھ چکا ہے ایک خدا کو بھی ماننے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔

یہ بات یقیناً صحیح ہے کہ مظاہر قدرت سے مرعوبیت ہی کے نتیجہ میں مظاہر پرستی پیدا ہوئی۔ انسان نے بغیر کسی عقلی ثبوت کے، محض مرعوبیت کے تحت، یہ فرض کر لیا کہ مظاہر قدرت میں فوق الفطری اور خدائی طاقت موجود ہے حالانکہ یہ طاقتیں خود قوانین طبعی میں جکڑی ہوئی ہیں اور زبان حال سے اعلان کر رہی ہیں کہ وہ حاکم نہیں، محکوم، خدا نہیں، خدا کی تابع فرمان ہیں۔

لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں کہ مظاہر فطرت سے مرعوبیت ہی کے نتیجہ میں ایک خدا کا تصور پیدا ہوا ہے۔ توحید کی عظیم عمارت مظاہر فطرت سے مرعوبیت پر نہیں، اس کی نفی پر قائم ہوتی ہے۔ توحید کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان ہو، جن ہو، فرشتہ ہو یا اور کوئی زمینی و آسمانی مخلوق، کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں، زندگی و موت، نفع اور نقصان، قسمت اور رزق، ہر چیز صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پوری کائنات، مخلوق، محکوم، محتاج اور بے بس ہے۔ خالق، مالک، حاکم، معبود اور صاحب تصرف و اختیار صرف اللہ ہے۔۔۔ شرک خدا سے ماسوا طاقتوں کا اقرار و اعتراف ہے اور توحید ماسوا طاقتوں کی کلّی انکار، پھر بھی ملحدین کو اصرار ہے کہ توحید مظاہر قدرت سے مرعوبیت ہی کی پیداوار ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مظاہر پرستی اور شرک نے "ارتقاء" کر کے توحید کی شکل اختیار کر لی۔ ڈاروِن کا نظریہ ارتقاء (Evolution) ابھی تک محتاجِ ثبوت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں بڑے بڑے خلا ہیں جنہیں اب تک پُر نہیں کیا جا سکا ہے۔ لیکن یہ نظریہ اگر صحیح ثابت ہو بھی جائے تو اس کا تعلق طبعیات سے ہے نہ کہ انسان کی اختیاری زندگی اور اس کے افکار و خیالات سے۔ یہ علم و سائنس پر ایک صریح زیادتی ہوگی کہ ایک طبعی نظریہ کو کسی ثبوت کے بغیر انسان کی فکری و اخلاقی دنیا پر زبردستی چسپاں کر دیا جائے۔ حقیقتاً اس بات کا کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے کہ انسان کی فکری و

اخلاقی زندگی میں بھی اسی طرح ارتقاء ہوا ہے جس طرح ڈارون کے نقطۂ نظر سے متعلق [illegible] ہوا ہے۔ اس کے برعکس تاریخ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ جو برائیاں ہزاروں سال پہلے موجود تھیں وہ آج بھی موجود ہیں اور جو نیکیاں آج پائی جاتی ہیں ان کا وجود ہزاروں سال پہلے بھی تھا۔ اسی طرح توحید آج سے ہزاروں سال پہلے بھی پائی جاتی تھی اور آج بھی دنیا کی بہت بڑی آبادی شرک میں مبتلا ہے۔ بائبل اور قرآن کے بیان کو نظرانداز کیجئے تب بھی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ توحید کے ماننے والے کم از کم چار پانچ ہزار سال قبل موجود تھے اور آج بھی دنیا کے بہت سے لوگ مشرک ہیں۔ الحاد کو فکری ارتقاء کی آخری کڑی اور دور حاضر کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ [illegible] موجودہ دور ہی میں ہوا ہے۔ لیکن اب سے ہزاروں سال پہلے یہ نقطۂ نظر یونان اور ہندوستان میں موجود تھا اور ہندوستان میں تو شرک کے دوش بہ دوش الحاد کے داعی موجود تھے جن کی کوششوں سے الحاد کے ایک مکتب فکر (School of Thought) اور ایک ملحد فرقہ نے جنم لے لیا تھا۔ بہرحال انسانی تاریخ قطعیت سے اس بات کی تردید کرتی ہے کہ شرک نے ارتقاء کر کے توحید کی، اور توحید نے ارتقاء کر کے الحاد کی شکل اختیار کی ہے۔

ملحدین کا خیال ہے کہ مظاہر قدرت سے مرعوبیت کا دور ختم ہو رہا ہے اس لیے خدا پرستی کو بھی رخصت ہو جانا چاہیے اور اس کی جگہ الحاد کو لے لینی چاہیے۔ لیکن شاید وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں کہ شرک اور الحاد، یہ دونوں نقطہ ہائے نظر مظاہر فطرت سے مرعوبیت کی پیداوار ہیں جبکہ توحید کا تصور ہی وہ واحد تصور ہے جو مادی قوتوں سے مرعوبیت کا کلی خاتمہ کر دیتا ہے۔ علم سائنس اور مغرب کی تاریخ سے باخبر حضرات جانتے ہیں کہ اسلام کے تصور توحید اور مسلمانوں کے علمی و سائنسی ارتقاء ہی کی بدولت یورپ علم و سائنس کی موجودہ بلندیوں تک پہنچا ہے اور اسے مظاہر پرستی اور توہمات کی بیڑیاں کاٹنے میں دیر لگی ہے تو اس کے ذمہ دار عیسائیت کے وہ غلط رہنما ہیں جنہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت توحید میں شرک کی آمیزش کر دی۔ عیسائیت کو ایک مشرکانہ مذہب بنایا اور علم و سائنس کی ترقی کی راہ میں آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔

توحید اور مظاہر پرستی میں تضاد کی نسبت ہے۔ توحید مظاہر قدرت کی مرعوبیت دل و دماغ کے ایک ایک گوشہ سے نکال پھینکتی ہے۔ اس لیے اگر مظاہر قدرت سے مرعوبیت ختم ہو رہی ہے تو اس میں توحید کے لیے موت کا پیغام نہیں۔ یہ توحید کی عین کامیابی ہے۔ ایسے ماحول اور ایسے دور میں توحید کا تصور بہت تیزی سے پھیل سکے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علم و سائنس کے ارتقاء میں شرک اور الحاد دونوں کے لیے پیغام موت ہے اور توحید اور سچی خدا پرستی کے لیے نوید زیست و مژدۂ کامرانی۔

یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ شرک کی طرح الحاد بھی مظاہر فطرت سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے مگر کیا کیا جائے حقیقت نفس الامری یہی ہے اور غور کرنے پر آپ بھی اسے ماننے پر مجبور ہوں گے۔ مشرک مادی طاقتوں سے مرعوب ہو کر انہیں خدا کی خدائی میں شریک کر لیتا ہے جبکہ ملحد مادہ اور مادی طاقتوں ہی کو اول و آخر سب کچھ قرار دیتا اور مادہ کو خدائی مقام عطا کر کے خدا کا انکار کر دیتا ہے۔ ملحد کی نظر مادہ اور اس کے مظاہر میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور وہ مادہ کی نیرنگیوں میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ بالکل سامنے کی حقیقتیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچ پاتا کہ جب مادہ و کائنات ازلی و ابدی نہیں ہیں تو انہیں کسی ہستی نے ضرور پیدا کیا ہوگا۔ جب کائنات میں محکم نظام قائم ہے تو لازماً کوئی ہستی

کائنات کی منتظم ہوگی۔ جب عالم رنگ و بو میں بے مثال حکمت اور لاجواب منصوبہ بندی ہے تو لامحالہ اس کے پیچھے کسی
حکیم اور منصوبہ ساز ہستی کی حکمت و منصوبہ سازی کارفرما ہوگی اور جب کائنات کی ہر ہر شے قوانینِ طبیعی میں جکڑی ہوئی ہے
تو اس کا ایک مقنن و فرمانروا ہوگا جس نے قوانین بنا کر بزور انہیں نافذ کیا ہوگا۔ لیکن ان عریاں حقائق تک رسائی اسی وقت
ممکن ہے جب مادی حجابات سے نگاہیں تیز و تند ہو جائیں۔ لیکن ہوتا یہی ہے کہ مشرک و ملحد دونوں مظاہر قدرت
سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور انہیں یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ اس مادی طلسم سے نکل کر اس ہستی کا صحیح ادراک کر سکیں جس کی
تخلیق جس کی ربوبیت اور جس کی قدرت و حکمت کے مظاہر کائنات میں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ
مشرک خدا کا انکار نہیں کرتا بلکہ وہ مظاہر قدرت سے مرعوب ہو کر بہت سے خداؤں کو اس کی خدائی میں شریک کر لیتا ہے جبکہ ملحد مادہ کے
مظاہر اور ان کی بوالعجبیوں میں کھو کر سرے سے خدا ہی کا انکار کر دیتا ہے اور مادہ کو خدائی کے مقام جلیل پر بٹھا دیتا ہے۔ کتنی بڑی
ٹریجڈی ہے یہ کہ انسان تمام تر علمی ترقی کے باوجود بھی مظاہر قدرت کی مرعوبیت کے جال سے نکل نہ سکا بلکہ اس
"طلسم ہوش ربا" میں پہلے سے زیادہ پھنس گیا ہے۔ یہ ہے انسان کی بے خبری و سطح بینی!

کیا خدا کے لیے خالق چاہیے؟

کہا جاتا ہے کہ جب یورپ کے مشہور فلسفی "برٹرینڈرسل" کے سامنے یہ سوال آیا کہ "خدا کائنات کا خالق ہے
تو خدا کا خالق کون ہے؟" تو وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا چنانچہ اس نے خدا کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ شبہ نہ تو نیا ہے اور
نہ برٹرینڈرسل تک محدود ہے۔ اب سے چودہ سو برس پہلے یہ شبہ ذہنوں میں موجود تھا چنانچہ اللہ کے آخری نبی
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے اسے "وسوسۂ شیطانی" کی حیثیت دی ہے اور وہ طریقہ بتایا ہے کہ جس کے
ذریعہ اہل ایمان اس وسوسہ سے نجات پا سکیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کے ملحدین عام طور پر اس شبہ میں مبتلا ہیں یا کم از کم وہ اس سوال کو غیر معمولی اہمیت
دیتے ہیں، کیونکہ جب بھی کسی ملحد سے گفتگو ہوتی ہے اور وہ خدا کو ماننے پر مجبور ہونے لگتا ہے تو آخر میں وہ اس سوال کو اس
طرح سامنے لا کر رکھ دیتا ہے گویا خدا کے نہ ہونے کی یہ کوئی قطعی دلیل ہو۔

یہ سوال بظاہر پیچیدہ بلکہ لاینحل نظر آتا ہے مگر جب آپ اس پر غور کرنے بیٹھیں گے تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی
کہ یہ ایک لچر اور لایعنی بات ہے جس کی حیثیت فی الواقع شیطانی وسوسے سے زیادہ نہیں ہے۔

دراصل وہ ذہنیت اصلاح طلب ہے جس نے اس سوال کا سہارا لے کر خدا کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس
سوال کا خدا کے ہونے، نہ ہونے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کائنات کے آثار سے کائنات کے
خالق، منتظم اور فرمانروا کا پتا لگتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس سوال کا سہارا لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، اس سہارے کے
بغیر بھی خدا کو تسلیم نہ کیا جائے گا۔ لیکن کائنات کے آثار اگر صراحتہً کسی خالق و فرمانروا کا پتا دیتے ہیں اور خدا کے بغیر نہ
کائنات کی توجیہ ہو پاتی ہے اور نہ انسانی مسائل حل ہوتے ہیں تو خدا کو ماننے سے صرف اس بنا پر گریز نہ کیا جائے گا کہ اس کی ذات
سے متعلق ایک سوال حل نہیں ہو رہا۔ علوم کی دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ تمام متعلقہ سوالات حل ہو جائیں، نہ ایسا ہونا
ممکن ہے۔ بیشتر سوالات حل ہو جائیں، اسی کو عین کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ سائنس کے پیش کردہ نتائج کو قطعی سمجھ کر بے چون
و چرا قبول کر لیا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ ایک مغربی سائنس دان نے برٹرینڈرسل کے اس شبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔

سائنس کے تقریباً تمام کلیات کا یہی حال ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے ایسے سوالات کیے جا سکتے ہیں جن کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے، مگر ان سوالات کے باعث نہ ان کے ثبوت کا انکار کیا جاتا ہے اور نہ [illegible] ایک قدم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پھر اس کی کیا تُک ہے کہ صرف ایک سوال کا جواب نہ پا سکنے کی وجہ سے [illegible] کوئی جواب نہ ہو۔۔۔ اس حقیقت عظمیٰ کا انکار کر دیا جائے جس کی شہادت زمین و آسمان کی ہر ہر شے دے رہی ہے [illegible] رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وسوسۂ شیطانی سے تعبیر کیا ہے۔

لیکن کیا واقعۃً یہ کوئی لاینحل سوال ہے؟ سوال کا تجزیہ کیجیے تو آپ [illegible] کی حیثیت مغالطہ یا غلط فہمی سے زیادہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر خدا کائنات کا خالق ہے تو خدا کا خالق کون ہے [illegible] کہ خدا اور کائنات کو سوال میں ایک ہی سطح پر رکھ دیا گیا ہے۔ گویا پہلے سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ خدا اور کائنات [illegible] چیزیں ہیں اور کائنات کے لیے جن امور کی ضرورت ہے، خدا کو بھی انہی امور کی ضرورت ہے۔ [illegible] کوئی خالق ماننا ناگزیر ہو تو یہ بھی لازمی ہے کہ خدا کا کوئی خالق مانا جائے۔

مگر یہ بات اسی وقت صحیح ہوگی جب یہ معلوم ہو جائے کہ خدا اور کائنات [illegible] یکساں ہیں، لیکن اس یکسانیت کے لیے کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہی نہیں کوئی معقول اور سنجیدہ [illegible] اس بات کا قائل نہیں ہو سکتا کہ خدا اور کائنات بہ الفاظ دیگر خالق و مخلوق [illegible] ہیں۔ حقیقت میں یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ ہم اور زمین کی تمام [illegible] چیزیں زمین پر ٹھہری ہوئی ہیں تو زمین کس چیز پر ٹھہری ہوئی ہے؟ یہ سوال اسی لیے تو غلط ہے کہ سائل نے زمین کو اور ان چیزوں کو [illegible] ٹھہری ہوئی ہیں یکساں حیثیت دے دی، اس نے خیال کیا کہ جس طرح ہم ٹھہرے ہوئے ہیں اور ہمیں ٹھہرنے کے لیے زمین [illegible] سہارے کی ضرورت ہے اسی طرح زمین بھی ٹھہری ہوئی ہوگی اور اسے بھی سہارے کی ضرورت ہوگی۔ [illegible] صحیح نہیں ہے کہ زمین کی اور ان چیزوں کی جو زمین پر ٹھہری ہوئی ہیں یکساں حالت نہیں ہے حالانکہ زمین پر [illegible] تمام چیزیں زمینی مادے ہی سے بنی ہیں اور ان کا زمین سے شدید تعلق ہے۔ اس شدید تعلق کے ہوتے ہوئے بھی زمین [illegible] شدید تفاوت ہے تو خالق اور مخلوق کے درمیان کتنا عظیم فرق ہوگا اور دونوں کو یکساں حیثیت دے کر سوچنا اور سوال کرنا کس قدر غلط ہوگا۔

جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں، شاید انہوں نے کائنات، خدا اور فعل تخلیق کی [illegible] سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا ورنہ وہ اس طرح کی مہمل بات نہ کہتے۔ تخلیق کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ ایک شے کو جو پہلے موجود نہ تھی، پیرایۂ وجود بخشا گیا۔ جو شخص کہتا ہے کہ "خدا کائنات کا خالق ہے" دوسرے لفظوں میں وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ کائنات پہلے موجود نہ تھی۔ پھر خدا نے اسے پیدا کیا، اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ کائنات مخلوق نہیں، ازلی و ابدی ہے تو اس کے نقطۂ نظر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ کائنات کا کوئی خالق نہ ہو مگر اس نقطۂ نظر کے حامل کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ "خدا کائنات کا خالق ہے تو خدا کا خالق کون ہے" یہ سوال اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب آپ کسی درجہ میں اس بات کو تسلیم کر لیں کہ کائنات کا کوئی نہ کوئی خالق ہو سکتا ہے یعنی آپ تسلیم کر لیں کہ کائنات پہلے موجود نہ تھی، پھر وجود میں آئی۔ لیکن اگر آپ کائنات کو ازلی و ابدی مانتے ہیں تو اس طرح کا سوال کرنے کے بجائے آپ سیدھے سیدھے یہ کہیے کہ کائنات ازلی و ابدی ہے اس لیے اس کے لیے کسی خالق کا سوال خارج از بحث ہے۔

اسی طرح کائنات کسی ایک شے کا نام نہیں ہے۔ ہر چیز جو موجود تھی، موجود ہے اور موجود ہوگی اور وہ مخلوق ہے کائنات ہے۔ کائنات صرف زمین اور اس کی مخلوقات کا نام نہیں ہے۔ وہ صرف نظامِ شمسی پر بھی مشتمل نہیں ہے۔ جو تارے ہمیں ننگی آنکھ اور دوربین یا دوسرے ذریعے سے نظر آ رہے ہیں ان سب کے مجموعہ کا نام بھی کائنات نہیں ہے۔ جو نظام ہائے شمسی اور نظام ہائے فلکی خلا میں موجود ہیں (اور ایک نظامِ فلکی میں بہت سے شمسی نظام ہوتے ہیں) وہ اپنی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ موجودات سمیت کائنات کا محض ایک جزو ہیں۔ کائنات میں وہ تمام تارے بھی داخل ہیں جو ابھی تک زیرِ تشکیل ہیں اور ان سے وہ تارے بھی جو تشکیل پانے کے بعد وجود میں آئیں گے نیز وہ تارے بھی جو آئندہ کبھی تخلیق کیے جائیں گے۔ اسی طرح خلا کی تمام شعاعیں اور جو قوتیں موجود ہیں وہ سب بھی کائنات میں داخل ہیں۔ مختصر یہ کہ کائنات نام ہے گزشتہ، موجودہ اور آئندہ تمام مخلوقات کے مجموعہ کا، جس سے کوئی مخلوق باہر نہیں ہے۔

”خدا کائنات کا خالق ہے“ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس ہستی کا نام ہے جو ساری کائنات ـــ گزشتہ، موجودہ اور آئندہ تمام مخلوقات ـــ کی خالق ہے۔ وہ کائنات موجود نہ تھی اور وہ موجود تھا پھر اس نے اپنی قدرت سے تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ بہ الفاظ دیگر خدا کائنات سے پہلے ہے، خدا کائنات سے ماورا ہے، خدا کائنات کا جزو نہیں ہے، وہ تمام مخلوقات سے ماوراء ہے، وہ مخلوق نہیں ہے، وہ خالق ہے۔

اس تشریح کے بعد اس اعتراض کی معقولیت پر غور کیجیے کہ خدا کائنات کا خالق ہے تو خدا کا خالق کون ہے؟ کتنا حسین اور بامعنی سوال ہے یہ! کائنات تو ازلی و ابدی نہیں ہے، اس لیے اس کا خالق ہونا لازمی ہے لیکن خدا کے لیے یہ سوال کیوں پیدا ہو گیا کہ اس کا خالق کون ہے؟ کیا خدا ازلی و ابدی نہیں ہے؟ کیا وہ پہلے موجود نہ تھا اور بعد میں کسی کے پیدا کرنے سے پیدا ہوا؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً وہ خدا نہیں ہے، وہ مخلوق ہے اور کائنات ـــ مجموعہ مخلوقات ـــ کا ایک جزو، حالانکہ سوال کائنات یا اس کے کسی جزو کے بارے میں نہیں، خدا کے بارے میں تھا جو کائنات کا جزو نہیں، کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔

اگر خدا کائنات سے ماورا ہے اور مخلوقات کے دائرہ میں شامل نہیں ہے تو اس کے لیے خالق کا تصور آخر کہاں سے پیدا ہو گیا؟ خالق مخلوق کے لیے ہوتا ہے، خالق کے لیے نہیں جو مخلوق نہیں، خالق ہے، جو معدوم سے موجود نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ سے موجود ہے، اس کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ اس کا خالق کون ہے؟ صدر درجہ بے عقلی کی بات ہے۔

اس سوال کا مطلب تو یہ ہوا کہ خدا، جو مخلوق نہیں ہے اور جو کبھی پیدا نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ سے ہے، اسے پیدا کرنے والا اور عدم سے وجود میں لانے والا کون ہے؟ کیا یہ سوال تضادات کا مجموعہ نہیں ہے؟ کیا آپ اسے مہمل کے سوا اور لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں؟ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کائنات ـــ تمام گزشتہ، موجودہ اور آئندہ مخلوقات ـــ سے ماورا ہے یعنی وہ مخلوق نہیں ہے اور کبھی پیدا نہیں ہوا مگر اسی لمحہ آپ سنجیدگی سے یہ سوال جڑ دیتے ہیں کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟ اور جب کوئی شخص مہمل سمجھ کر سوال کو نظر انداز کر دیتا ہے تو آپ پکار اٹھتے ہیں کہ دیکھو خدا پرستوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے اور آپ پورے اطمینان کے ساتھ خدا کا انکار کر دیتے ہیں۔ یہ فلسفہ کی آخر کون سی قسم ہے؟ کیا فلسفہ الحاد کی عمارت اس قسم کی شاندار بنیادوں پر اٹھی ہے:

بریں عقل و دانش بباید گریست!!

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں خالقِ کائنات کو ازلی و ابدی تسلیم نہیں کرتا جس طرح کائنات مخلوق ہے اور خدا اس کا

خالق ہے، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خالقِ کائنات بھی مخلوق ہو تو اس کا پیدا کرنے والا اور خالق کون ہے؟

مندرجہ بالا تشریح کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی بحث و تحقیق کے بغیر یہ بات مان بھی لی جائے تب بھی ہم کسی لاینحل مسئلہ سے دوچار نہیں ہوتے۔ دو راستوں میں سے ایک راہ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی۔ خالقِ کائنات کو ازلی و ابدی مانیے، اس صورت میں اس کے لیے کسی خالق کا سوال خود بخود ختم ہو جاتا ہے یا اسے ازلی و ابدی نہ مانیے اور مخلوق تصور کیجیے۔ اس صورت میں خود آپ کے اپنے منطقی نظریے کے مطابق اس کا بھی خالق ہونا چاہیے کہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کوئی شے از خود عدم سے وجود میں نہیں آ سکتی جب تک اسے وجود میں لانے والا اس کا خالق موجود نہ ہو۔ اس "خالق" کا آپ جو نام چاہیں فرض کر لیں، بہر حال آپ کو خود اپنے منطقی طریقِ استدلال سے تسلیم کرنا ہوگا اور یہ آپ کی ذمہ داری ہوگی کہ آپ بتائیں کہ وہ کون ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟

پھر خالقِ کائنات کے اس "مزعومہ خالق" کے بارے میں سوال پیدا ہوگا کہ وہ ازلی و ابدی ہے یا مخلوق؟ اگر آپ اسے ازلی و ابدی مانتے ہیں تو خیر، یہ سوال پیدا نہ ہوگا کہ اس کا خالق کون ہے ورنہ اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی خالق آپ کو تسلیم ہی کرنا ہوگا۔ بہر حال اس طرح کے "فرضی خالقوں" کا جو خالق بھی ہوں اور مخلوق بھی ہوں آپ کتنا طویل سلسلہ کیوں نہ فرض کر لیں، آخر میں آپ کو ایک ہستی تسلیم کرنی ہی ہوگی جو مخلوق نہ ہو، جو عدم سے وجود میں نہ آئی ہو بلکہ ازلی و ابدی ہو، مختصر یہ کہ جس کا کوئی خالق نہ ہو بلکہ قائم بالذات ہو، اسی ہستی کو ہم اللہ کہتے ہیں۔ مخلوق کو ہم خدا نہیں کہتے خواہ وہ دوسروں کے لیے وجہ تخلیق ہی کیوں نہ ہو۔

رہے درمیان کے "فرضی خالق" تو آپ خود فرمائیں کہ ان کو ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے انہیں اسی لیے تو مانا تھا کہ خدا کے لیے خالق منوانے پر آپ مصر تھے مگر اس میں آپ کو کامیابی نہ ہو سکی۔ اس ضرورت کے علاوہ ان فرضی ہستیوں کو ماننے کی کوئی ضرورت تھی، نہ ان کے موجود ہونے کا کوئی ثبوت۔ اس طرح یہ "مزعومہ خالق" جنہیں کسی دلیل و ثبوت کے بغیر خواہ مخواہ فرض کر لیا گیا تھا آپ سے آپ پردۂ عدم میں مستور ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آپ کوئی نہ کوئی ازلی و ابدی اور موجود بالذات ہستی ماننے پر مجبور ہیں یا آپ کائنات کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات مانیں یا خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات تسلیم کریں۔۔۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ کائنات کو ازلی و ابدی مانتے ہیں اور جو لوگ کائنات کو مخلوق سمجھتے ہیں وہ خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات تسلیم کرتے ہیں۔۔۔ یہ قطعی ناممکن ہے کہ کائنات بھی مخلوق ہو اور خدا بھی۔ کسی شے کے مخلوق ہونے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ وہ پہلے موجود نہیں تھی، پھر کسی نے اسے وجود بخشا۔ اگر خدا اور کائنات دونوں کے دونوں مخلوق ہوں تو اس کا صاف و صریح مطلب یہ ہے کہ ایک وقت تھا جبکہ ان میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ پھر موجودات کیونکر پیدا ہو گئیں اور وجود کہاں سے آ گیا؟ عدمِ محض اور بالکلیہ عدم سے تو وجود نمودار نہیں ہو سکتا۔ کوئی چیز بھی نہ ہو اور سب کچھ موجود ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے؟ اب یا تو یہ کہیے کہ یہاں کوئی بھی موجود نہیں، نہ کائنات، نہ خدا، یا یہ کہیے کہ کوئی نہ کوئی ازلی و ابدی اور موجود بالذات ہستی موجود ہے جس سے سب کو وجود ملا ہے، تیسری کوئی شکل ممکن نہیں۔

اگر آپ ایک ازلی و ابدی وجود تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تو اس سارے ہنگامۂ وجود کا آپ کو انکار کرنا ہوگا جو کائنات کی شکل میں آپ کے گرد و پیش موجود ہے۔ آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہاں نہ وجود ہے، نہ کوئی موجود، عدم کے بھیانک خلا کے سوا

یہاں کچھ بھی نہیں۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

لیکن اگر آپ اپنے وجود اور اپنے گرد و پیش کی کائنات کو ایک ٹھوس حقیقت سمجھتے اور اس عالم کو عالم ہست و بود خیال کرتے ہیں تو آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا آپ کائنات کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات تسلیم کریں اور خدا کا انکار کر دیں یا خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات مانیں۔ پہلی صورت میں آپ کے لیے یہ راہ تو کھلی ہوئی ہے کہ آپ چاہیں تو خدا کا انکار کر دیں۔ لیکن اگر آپ خدا کو مانتے ہیں تو آپ کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ اسے ازلی و ابدی اور موجود بالذات مانیں۔ آپ کسی ایسی صورت کا تصور نہیں کر سکتے کہ خدا تو ہو مگر ازلی و ابدی اور موجود بالذات نہ ہو۔

"خدا کا خالق کون ہے؟" ان دونوں صورتوں میں یہ سوال مہمل قرار پاتا ہے۔ پہلی صورت میں اس لیے کہ آپ کائنات کو ازلی و ابدی مانتے ہیں اور سرے سے کسی خالق کے قائل نہیں۔ جب آپ کے نقطہ نظر سے خدا موجود ہی نہیں ہے تو اسے وجود بخشنے والے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اور دوسری صورت میں اس لیے کہ آپ خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات مانتے ہیں، جب خدا ہمیشہ سے ہے اور اپنی ذات سے موجود ہے تو یہ سوال کہاں سے پیدا ہو گیا کہ اسے کس نے وجود بخشا؟ دونوں ہی صورتوں میں یہ سوال بداہتہً غلط ہے۔ آپ خواہ ملحد ہوں یا خدا پرست، کسی بھی نقطہ نظر سے آپ کے لیے اس سوال کے کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

یہ شیطان کی وسوسہ اندازی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک مہمل و لایعنی سوال کی آڑ لے کر اس ہستی کا انکار کر دیا جائے جس کی نشانیاں پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں جبکہ اس سوال سے پھر بھی چھٹکارا نصیب نہ ہو جس کی خاطر خدا کا انکار کیا گیا تھا۔ اگر "خالق کون ہے؟" کا جواب نہ ملنے کے باعث آپ خدا کا انکار کر دیتے ہیں تو اس سوال کا جواب نہ ملنے کی وجہ سے آپ کائنات کا انکار کیوں نہیں کر دیتے؟ خالق کے بغیر آپ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے مگر خالق کے بغیر آپ کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ آپ خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے مگر خدا کا انکار کرتے ہی آپ کائنات ـــــ ہر دم تغیر پذیر کائنات ـــــ کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات مان لیتے ہیں۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

ان حضرات کے سوچنے کا انداز یہ ہے کہ جب خدا کو خالق کے بغیر ماننا ہی ہے تو کیوں نہ کائنات کو خالق کے بغیر مان لیا جائے اور اگر خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات تسلیم کرنا ہے تو کیوں نہ کائنات ہی کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات تسلیم کر لیا جائے، بہ الفاظِ دیگر خالقیت کے اس سلسلہ کو کیوں تسلیم کیا جائے جو خدا کے آگے کسی طرح نہیں بڑھتا۔

کیا کسی سلسلے کو اسی وقت ماننا چاہیے جب وہ لامتناہی چلتا رہے اور کبھی ختم نہ ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کائنات میں کوئی سلسلہ ایسا نہیں ہے جسے مانا جا سکے۔ یہاں کا ہر سلسلہ کہیں نہ کہیں جا کر ضرور ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً سب مانتے ہیں کہ کائنات کا پورا نظام علت (Cause) اور معلول (Effect) کے سہارے قائم ہے۔ ہر واقعہ، جو کائنات میں نمودار ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اور پھر اس سبب کا بھی سبب ہوتا ہے، مگر کائنات اور مادہ کی علت کیا ہے؟ ملحدین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے، تو کیا سلسلۂ علت و معلول کا اس لیے انکار کر دیا جائے کہ وہ کائنات یا مادہ کے آگے نہیں چلتا۔ ایک دوسری مثال کو لیجیے، کائنات کی ہر شے کیمیاوی عناصر سے مرکب ہو کر بنی ہے، پھر یہ کیمیاوی عناصر الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کا

مرکب ہیں مگر الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کس سے بنے اور کس سے مرکب ہیں؟ تو سائنسدان کے پاس اس کا جواب نہیں ہے تو کیا اس سلسلے کا بھی اس لیے انکار کر دیا جائے کہ یہ چند قدم بھی نہ چل سکا۔ اور آپ خدا اس لیے کائنات کا خالق نہیں مانتے کہ یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھتا اور خدا کا خالق اور پھر اس خالق کا خالق نہیں ہوتا تو آپ کو کائنات کے سلسلے، بہ الفاظ دیگر کائنات کے پورے نظام کا انکار کرنا ہوگا کیونکہ یہاں کا ہر سلسلہ چند قدم پر جا کر رک جاتا ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات ماننا ہے تو کیوں نہ کائنات ہی کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات مان لیا جائے؟ بلاشبہ اس طرح آپ خالق کائنات کو ماننے سے بچ جائیں گے، لیکن یہ کوئی علم و تحقیق ہے؟ کیا کسی شے کو فرض کر لینے سے وہ شے، ثابت شدہ حقیقت بن جاتی ہے؟ کیا محض آپ کے فرض کر لینے سے کائنات ازلی و ابدی اور موجود بالذات ثابت ہو جائے گی اور آپ یہ طے کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ کائنات کو کسی نے پیدا نہیں کیا بلکہ وہ ہمیشہ سے ہے اور آپ سے آپ موجود ہے؟ اور کیا آپ پورے یقین کے ساتھ اسی فرضی بنیاد پر علم و حکمت کی عمارت تعمیر کر سکیں گے؟

یہ ایک حقیقت ہے ــــ خواہ آپ اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں ــــ کہ کائنات کے ازلی و ابدی اور موجود بالذات ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ناقص تجربات کی بنیاد پر بعض سائنسدانوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ مادہ غیر فانی ہے اور اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ وہ ابدی ہونے کے ساتھ ازلی بھی ہے۔ لیکن مزید تجربات سے اس خیال کی غلطی واضح ہو گئی۔ سائنس کا عام رجحان اب یہ ہے کہ مادہ فانی ہے یعنی وہ ازلی ہے نہ ابدی۔ رہی کائنات تو اس کے بارے میں تو اب یہ بھی اندازہ کیا جا چکا ہے کہ کتنے ارب سال پہلے اس کی تخلیق (۱) ہوئی تھی۔ اس صورت حال کی موجودگی میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کائنات ازلی و ابدی ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اس کے برعکس عقل اور سائنس کی روشنی میں آپ جتنا آگے بڑھتے جائیں گے آپ کا یقین فزوں سے فزوں تر ہوتا چلا جائے گا کہ کائنات ازلی و ابدی نہیں، حادث ہے، موجود بالذات نہیں، مخلوق ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔

پھر سوال صرف کائنات کی تخلیق کا نہیں کہ کائنات کو ازلی و ابدی کہہ کر آپ خالق سے پیچھا چھڑا لیں، نظم، منصوبہ بندی اور حکمت و ربوبیت کے جو آثار کائنات میں ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں وہ ایک علیم، حکیم، مدبر و منتظم اور رحمان و رحیم ہستی کی موجودگی کی طرف کھلا ہوا اشارہ کرتے ہیں، تو کیا اندھے، بہرے اور بے شعور مادے میں آپ یہ صفات پاتے ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو خدا کو مانے بغیر چارۂ کار بھی کیا ہے؟ مادہ سے تو کائنات کے ان پہلوؤں کی توجیہ ممکن نہیں۔(۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ملحد و خدا پرست، دونوں ایک ایسی ہستی کو ماننے پر مجبور ہیں جو ازلی و ابدی ہو اور کسی خالق کے بغیر آپ سے آپ موجود ہو۔ ملحدین کے نزدیک یہ ازلی و ابدی ہستی، جو خالق کے بغیر موجود ہے، مادہ ہے اور خدا پرستوں کے نزدیک خدا۔ اس لحاظ سے دونوں کی پوزیشن یکساں ہے اور "خدا کا خالق کون ہے؟" یہ سوال اگر خدا پرستوں سے کیا جا سکتا ہے تو مادہ پرستوں سے بھی یہ سوال ہو سکتا ہے کہ "مادہ کا خالق کون ہے؟" فرق جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ملحدین جس مادہ کو ازلی و ابدی مانتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ازلی و ابدی نہیں ہے بلکہ اسے تسلیم کرنے سے کائنات کے مختلف پہلوؤں کی توجیہ بھی نہیں ہو پاتی اور نہ اسے بنیاد بنا کر سوچنے اور زندگی بسر کرنے سے انسانی مسائل حل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس خدا پرست جس ازلی و ابدی اور موجود بالذات ہستی، خدا، پر ایمان رکھتے ہیں اسے ماننے سے کائنات کے تمام پہلوؤں کی تشفی بخش توجیہ

ہو جاتی ہے۔ نیز اس اختلاف و تعبیر و بنیاد پر زندگی کی عمارت تعمیر کرنے سے انسانی زندگی کے سارے لاینحل مسائل یک ایک کر کے حل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ طے کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ الحاد و خدا پرستی میں سے کون سا مسلک حق و صداقت ہے جو موجب فوز و فلاح ہے اور کون سا مسلک باطل اور وجہ ہلاکت و خسران؟

کیا دُنیا میں اندھیر ہے؟

کہا جاتا ہے کہ خدا ہوتا تو دنیا میں اندھیر نہ ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سیلاب آتے ہیں اور نباتات، حیوانات اور انسانوں کے لیے عظیم تباہی لاتے ہیں۔ زلزلے آتے ہیں اور ایک بہت بڑی مخلوق پر سخت مصیبت ڈھاتے اور کثیر جانی و مالی نقصان کا موجب ہوتے ہیں۔ وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں اور بہت سے افراد ان کے ہاتھوں لقمہ اجل بن جاتے یا اپنی صحت گنوا دیتے ہیں۔ طبعی دنیا سے ہٹ کر انسانی دنیا میں دیکھیے تو یہاں بھی اندھیر نظر آئے گا۔ کمزوروں اور غریبوں کے لئے جینا دوبھر ہے اور ان کی جان و مال اور آبرو محفوظ نہیں ہے۔ ظالم، مفسد اور بدکار دنیا میں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں جو ان کا ہاتھ پکڑ سکے۔ نیکی، اخلاق اور انسانیت مفقود ہوتی جا رہی ہیں اور بدی، مکر و فریب اور حیوانیت و بربریت کا دور دورہ ہے۔ جنگیں ہوتی ہیں اور بے شمار انسان ان کی خون آشامی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ قوموں کی اقتصادی و سیاسی حالت زیر و زبر ہو جاتی ہے اور بسا اوقات ان سے کئی نسلوں کو اس کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ یہ سب اندھیر نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ اندھیر اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ کسی حکیم و رحیم اور دانا و بینا ہستی کے ہاتھ میں کائنات کا نظم نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہ خدا نہیں ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ جو واقعات خدا کے ہونے کی واضح دلیل ہیں انہی کو خدا کے نہ ہونے کی محکم دلیل سمجھا جا رہا ہے۔ یہ انسانی فکر کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی دو ہی توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں کا ہر واقعہ علت و معلول کے اصول کے تحت آپ سے آپ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی شعور اور کوئی ارادہ کارفرما نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ ایک باشعور اور ذی ارادہ ہستی اپنے ارادہ و منصوبہ کے تحت کائنات کا نظم کر رہی ہے۔ ان دو کے علاوہ تیسری کوئی توجیہ ممکن نہیں۔ پہلی توجیہ کے سلسلے میں ایک دقت تو یہ ہے کہ سائنس کے جدید ترین نظریات و انکشافات اس کا ساتھ نہیں دے رہے۔ علت و معلول کا یہ سلسلہ جس پر مادیت کی عمارت قائم تھی، سائنس کے نئے انکشافات کی روشنی میں بہت کچھ مشتبہ و متزلزل ہو گیا ہے۔(۳) لیکن اس سائنسی حقیقت سے قطع نظر ایک دقت یہ بھی ہے کہ اس اصول کے تحت طبعی حوادث کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ سمندر سے مان سون اٹھتا ہے اور خشکی کا رخ کرتا ہے، اس مان سون سے ایک علاقے میں اتنی بارش ہوتی ہے کہ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور سیلاب امڈ آتا ہے جبکہ اس سے متصل یا قریب دوسرے علاقے میں جو مان سون کی گزرگاہ میں واقع ہے بالکل بارش نہیں ہوتی ہے یا برائے نام ہوتی ہے۔ آپ علت و معلول کے اصول کے تحت اس کی کیا توجیہ کر سکتے ہیں؟ حالات بالکل پرسکون ہوتے ہیں کہ اچانک ساحلِ سمندر کے علاقے شدید سمندری طوفان سے دوچار ہوتے ہیں، سمندر کی تیز و تند موجیں خشکی میں بہت دور تک گھس آتی ہیں اور شدید جانی و مالی نقصان کے بعد یہ طوفان ختم ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ طوفان اس مقررہ وقت پر کیوں آیا، اس سے قبل یا اس کے بعد کیوں نہیں آیا؟ اور اس مخصوص

علاقے میں کیوں آیا؟ دور و نزدیک کے دوسرے علاقوں میں کیوں نہیں آیا؟ یہی سوال ہوائی طوفان اور برف باری سے بھی متعلق ہیں۔ سلسلۂ علت و معلول کے تحت ان سوالات کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ وبا کا ایک خاص علاقہ میں بہت زور ہوتا ہے، قریب کے دوسرے علاقوں میں وبا ہوتی نہیں یا بہت معمولی ہے۔ کیا آپ اس کی وجہ بیان کر سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پھر جہاں پر وبا کا زور ہوتا ہے وہاں پر بھی کچھ افراد پر وبا کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ اس کی لپیٹ میں آتے ہیں ان میں سے بھی کچھ ہلاک ہوتے ہیں اور کچھ چند دنوں بیمار رہ کر اچھے ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایک ہی شے کے یہ مختلف و متضاد نتائج کیوں نکلتے ہیں؟ بعض لوگ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ کمزور افراد وبا کا شکار ہو جاتے ہیں اور تندرست و طاقتور بچ جاتے ہیں۔ مگر واقعاتی لحاظ سے یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہ امر مشاہدہ میں [illegible] جن میں قوت مدافعت بہت زیادہ ہوتی ہے اور جوان اور طاقتور اشخاص ہلاک ہو جاتے ہیں اور [illegible] کمزور [illegible] بچ جاتے ہیں۔

آپ اتفاق کے ذریعہ ان واقعات کی توجیہ نہیں کر سکتے کیونکہ اتفاق کوئی معقول اور اطمینان بخش توجیہ نہیں ہے۔ یہ چند گنے چنے واقعات کا معاملہ نہیں کہ آپ اتفاق کہہ کر چھٹکارا حاصل کر لیں۔ بے شمار واقعات ہیں جن کی آپ کو توجیہ کرنی ہے۔

ان تمام واقعات کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ ایک ذی ارادہ اور با اقتدار ہستی، جو اسباب و علل سے بالاتر ہے، مادی قوتوں سے جس طرح چاہتی ہے کام لیتی ہے اور جس وقت، جس جگہ اور جس طرح جس واقعہ کو مناسب خیال کرتی ہے ظہور میں لے آتی ہے۔ اسی ہستی کا نام اللہ ہے۔

اور یہ توجیہ کچھ طبعی حوادث اور غیر معمولی واقعات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اگر آپ عمیق غور و فکر سے کام لیں گے تو کائنات کے ہر وجود اور عالم کون و فساد کے ہر واقعہ کی آخری اور اطمینان بخش توجیہ یہی ہے۔ علت و معلول کا جو سلسلہ آپ کو عام واقعات میں کار فرما نظر آتا ہے اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ فلاں واقعہ فلاں کے بعد ظہور پذیر ہوا یا بہت سے بہت یہ کہ فلاں واقعہ فلاں واقعہ کا نتیجہ ہے۔ مثلاً آگ روشن کرنے کے نتیجہ میں حرارت حاصل ہوئی۔ اگرچہ اس طرح کی تمام مثالوں میں یہ ثابت کرنا سخت مشکل ہے کہ بعد کا واقعہ حقیقتہً پہلے واقعہ کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ بات کہ ایک واقعہ دوسرے واقعہ کا نتیجہ کیوں ہے اور ان میں لازم و ملزوم کا رشتہ کیوں پیدا ہو گیا؟ علت و معلول کا اصول اس کا کوئی جواب فراہم نہیں کرتا۔ ہم جب مسلسل اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو ہم یہ قیاس کرتے ہیں کہ دوسرا واقعہ پہلے واقعہ کا نتیجہ ہے اور دونوں میں لازم و ملزوم کی نسبت ہے۔ مگر یہ جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ "ایسا کیوں ہوتا ہے؟" گویا علت و معلول کا اصول صرف "کیا" کا جواب ہے، "کیوں" کا نہیں، حالانکہ اصل اہمیت "کیوں" کے جواب کی ہے جس سے ملحدین بالکل عاجز ہیں۔

اس بنیادی سوال کا اس کے سوا کوئی جواب ممکن نہیں کہ ایک قادر مطلق اور حکیم خالق و مدبر نے اپنی مرضی اور اپنی حکمت سے قوانینِ فطرت وضع کیے اور اپنی قوتِ قاہرہ سے انہیں کائنات میں نافذ کیا۔ پھر وہی ہے جو اپنی مرضی اور حکمت کے مطابق ان قوانین سے کام لیتا ہے اور اپنی مشیت سے اس کائنات کا نظام چلاتا ہے۔ قوانین فطرت کی بلاشبہ اہمیت ہے مگر اصل اہمیت فرمانروائے کائنات کی مشیت و مرضی کی ہے۔ خدا نے ان قوانین کو وضع کیا ہے اور وہی ان قوانین کو نافذ کر رہا ہے۔ وہ نہ ان قوانین کا محکوم ہے، نہ ان کا پابند، وہ ان کا واضع و حاکم ہے اور ان سے بالاتر۔ وہ چاہے تو قوانینِ فطرت کے ذریعہ کائنات

کا نظم چلائے اور جب چاہے تو اس سے ہٹ کر [illegible] کائنات کا نظم و انصرام کرے۔

اس جواب سے کائنات کے تمام معمولی اور غیر معمولی واقعات کی توجیہ ہو جاتی ہے اور کائنات کے بنیادی "کیوں" کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ [illegible] یہ ہمہ گیری قائم رہے یا سائنس کے نئے نئے انکشافات سے وہ متزلزل ہو جائے دونوں صورتوں میں یہ توجیہ [illegible] قائم رہتی ہے کیونکہ اس توجیہ کی رو سے اصل چیز علت و معلول کا سلسلہ نہیں، اللہ کی قدرت و حکمت ہے۔ کائنات سے [illegible] سوال کا یہی ایک اطمینان بخش اور معقول جواب ہے۔ اس کے سوا کوئی جواب نہ اطمینان بخش ہے نہ معقول۔

طبعی حوادث کے پیچھے [illegible] نہیں اور وہ [illegible] ناانصافی و بے رحمی کا مظہر ہیں۔ اس طرح کا وسوسہ صرف اس شخص کے دل میں [illegible] طبعی [illegible] جو عجلت بازی سے نتائج اخذ کرنے کا عادی ہو۔ جو شخص بھی کائنات کا عمیق مطالعہ کرے گا وہ [illegible] یقین تک پہنچ کر رہے گا کہ یہ کائنات ایک عظیم حکیمانہ منصوبہ ہے جس کا ہر گوشہ اپنے اندر بے شمار حکمتیں [illegible] وہی یقین ہے جو سائنس کے ذریعہ ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ اس یقین تک پہنچنے والا انسان یہ کبھی بھی نہیں سوچ سکتا کہ طبعی حوادث کے پیچھے کوئی حکمت کارفرما نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حوادث نہ صرف طبعی دنیا کے لیے بے شمار فوائد رکھتے ہیں بلکہ انسانی دنیا کے لیے بھی ان کے فوائد عظیم ہیں اور فوائد سے قطع نظر [illegible] فائدہ یہ کیا کم ہے کہ ان کے باعث انسان کی بند آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ دنیا کی بے ثباتی اور اپنی بے بسی و بے چارگی کو [illegible] آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ دولت و اقتدار پا کر انسان دو حقیقتوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے، ایک یہ کہ متاعِ دنیا سخت بے ثبات ہے اور دوسرے یہ کہ انسان ایک کمزور و عاجز بندہ ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ حوادث انسان پر ان دونوں بنیادی حقیقتوں کو واشگاف کر دیتے ہیں

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا	یکسر وہ استخوان، شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل، راہ بے خبر!	میں بھی کبھو(۴) کسو(۵) کا سرِ پُر غرور تھا

(میر)

آج کا انسان دولت و اقتدار کے علاوہ سائنسی ترقیوں کے نشہ میں بھی مست ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس نے فطرت پر فتح پا لی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو طاقت خدا کی طرف منسوب کی جاتی تھی وہ سب اسے حاصل ہے۔ اشتراکیت کے علم بردار اور ان کے روسی امام اس طرح کی باتیں آئے دن کہتے رہتے ہیں۔ یہ طبعی حوادث اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں کہ ان دعووں کی حقیقت کیا ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ لیتی ہیں کہ طبعی حوادث کے مقابلہ میں روس اور امریکہ جیسے سائنسی ترقی کے مرکز ملک اسی طرح بے بس ہیں جیسے دوسرے ممالک، اور خروشچیف*، ماؤزے تنگ* اور چواین لائی* جیسے اکابر اشتراکیت و الحاد بھی ویسے ہی عاجز و بے بس انسان ہیں جیسے دوسرے انسان۔ اس حقیقت کا انکشاف کوئی معمولی انکشاف نہیں ہے، یہ انکشاف انسان کی پوری زندگی کا رخ بدل دیتا ہے اور اسے مغرور و خودسر اور ظالم و مفسد بننے سے بچاتا اور خداترس، مجسمہ اخلاق اور پیکر انسانیت بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک فائدہ بڑے سے بڑے نقصان پر بھاری ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حوادث بھی اللہ کی حکمت و رحمت ہی کا ایک پرتو ہیں۔

یقیناً ان حوادث کے باعث بہت سے لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور ان کی موت سے ہر صاحب احساس کو دکھ

ہوتا ہے،

لیکن اس دکھ سے بچنے کی صورت کیا ہے؟ حوادث اگر رونما نہ ہوں تب بھی لوگ موت کا شکار ہوں گے اور کوئی نہ کوئی چیز موت

کے لیے بہانہ بن جائے گی۔ موت انتہائی دردناک ہے [illegible] ذی حیات [illegible] خواہ کسی بھی شکل میں ہو، مرنے والے کے لیے یکساں حیثیت رکھتی ہے۔ انسان خواہ عزیزوں، متعلقوں [illegible] میں مرے یا اسے تنہا موت آئے، دونوں حالتوں میں اسے موت کی تلخی چکھنا پڑے گی [illegible] تنہا دنیا سے جانا ہو گا۔

چو آہنگ رفتن کند جان پاک [illegible] روئے خاک

([illegible])

یہ ہے طبعی دنیا کے اس "اندھیر" کی حقیقت جسے [illegible] پیش کیا جاتا ہے۔ اب انسانی دنیا کے "اندھیر" پر غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا کے جس [illegible] پیش [illegible] کیا یہ ہے؟ کیا انسان کا ظلم و فساد اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا نہیں ہے؟ کیا آپ کائنات [illegible] وقت تسلیم کریں گے جب انسان کو مجبورِ محض پائیں گے؟

کیا آپ خدا کو صرف اس وقت مانیں گے جب انسان اپنے اختیار سے [illegible] نیکی [illegible] آپ کا خیال یہ ہے کہ بدی کے عام ہونے کے باوجود دنیا میں اندھیر نہ ہو؟ کیا حکمت و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بدی [illegible] عام ہونے کا نتیجہ اچھا ہو اور نیکی کے عام ہونے کا نتیجہ برا یا دونوں کا نتیجہ یکساں ہو؟ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ انسانی دنیا کی موجودہ صورت حال ہرگز اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے۔ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان صاحب شعور اور صاحب اختیار ہے۔ وہ آزاد ہے، خواہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا بدی اور شیطنت کا مجسمہ بن جائے۔ آج کل کے انسانوں کی عظیم اکثریت نے اپنے آزاد ارادہ سے بدی اور ظلم و ستم کی راہ اختیار کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا شر و فساد سے بھر گئی۔ اگر انسانوں کی اکثریت نیکی کی راہ پر چلتی تو صورت حال اس کے برعکس ہوتی اور دنیا امن و سکون اور خیر و انسانیت کی نعمتوں سے مالا مال ہوتی۔

اگر انسان صاحبِ شعور اور صاحبِ اختیار نہ ہوتا تو وہ نیکی کی طرح بدی اور ظلم و فساد کی راہ بھی اختیار نہ کر سکتا تھا۔ اس صورت میں انسانی دنیا یقیناً "اندھیر" سے پاک ہوتی مگر پھر انسان انسان نہ ہوتا، پتھر، درخت یا جانور ہوتا اور انہی کی طرح فطرت کے لگے بندھے طریقہ پر مجبورانہ زندگی گزارتا۔ یہی نہیں، انسانی دنیا تمدن، علم اور سائنس کی تمام ترقیوں سے بھی محروم ہوتی کیونکہ علم، سائنس اور تمدن ان میں سے ہر شے کا وجود اور اس کا سارا ارتقاء اسی "اختیار" کا مرہونِ منت ہے۔

انسان کے صاحبِ فکر و شعور اور صاحبِ اختیار ہونے سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خدا موجود ہے۔ آپ خدا کا انکار کرنے کے بعد انسان کے صاحبِ شعور و ارادہ ہونے کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتے۔ بے شعور، بے ارادہ اور غیر ذی اختیار مادہ کے جبری نظام میں شعور، ارادہ اور اختیار کہاں سے نمودار ہو گئے؟ لیکن اگر آپ ایک صاحبِ شعور صاحبِ ارادہ اور صاحبِ اختیار و اقتدار ہستی کو کائنات کا خالق مانتے ہیں تو انسان کے صاحبِ اختیار و شعور ہونے کی آپ سے آپ توجیہ ہو جاتی ہے۔ انسان کا شعور، ارادہ اور اختیار اللہ کے شعور، ارادہ اور اختیار کا

پرتو اور عکس ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآنِ مجید ان لفظوں میں اشارہ کرتا ہے۔

فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ (ص۔ ۷۲)

ترجمہ: تو جب میں اسے ٹھیک طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں۔

اگر آپ خدا کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو ماننا ہو گا کہ انسان صاحب اختیار نہیں، مجبور محض ہے۔ وہ جو کچھ سوچتا اور جو کچھ کرتا ہے وہ مخصوص حیاتیاتی عناصر و عوامل کے خصوصی امتزاج کا نتیجہ ہے۔ "جبریت" کے اس فلسفہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس آزادی و اختیار کا انکار کر دیں جسے آپ اور ہر انسان بداہتہً محسوس کرتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس فلسفہ کی رو سے کوئی انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں رہتا۔ اور اس کے بعد آپ مجبور ہیں کہ مذہب، اخلاق، قانون، عدالت اور نظم ہر چیز کا انکار کر دیں، کیونکہ ان سب امور کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان آزادی و اختیار رکھتا اور اپنے اعمال کا ذمہ دار و جوابدہ ہے۔ تو کیا آپ ان سب چیزوں کا انکار کرنے کو تیار ہیں؟ اور کیا اس کے بعد انسانی سماج تباہی و بربادی سے محفوظ رہ سکے گا؟ نہیں، نہیں، بلکہ اس میں سماج کا کوئی امکان بھی باقی رہ جائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان بذاتِ خود خدا کے موجود ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ خدا کے انکار کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے انسان اور انسانیت، سب کا انکار کر دیا۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

(ڈاکٹر اقبالؒ)

انسان نیک یا بد جو اعمال بھی کرتا ہے، اس کے فوری نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ اس سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ خدا موجود نہیں ہے اور کائنات میں "اندھیر" ہے۔ یہ بات آپ اس وقت سوچ سکتے تھے جب نتائج بالکل نہ نکلتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظلم و فساد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو قدرت کا تازیانہ نمودار ہوتا اور مفسدین کا زور ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ بے شمار ظالم و مفسد گروہ دنیا میں ابھرے اور اپنی مہلتِ عمل ختم ہونے کے بعد صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹ دیے گئے کہ آج کوئی انہیں جانتا بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر صبر و استقلال سے کام لیا جائے تو نیکی اور انسانیت کا بہتر نتیجہ نکل کر رہتا ہے۔ یہ صورتِ حال اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک قادرِ مطلق اور منتظم ہستی موجود ہے جو حالات پر کنٹرول کرتی رہتی ہے اور انہیں ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔

جہاں تک نتائج کے دیر سے برآمد ہونے کا تعلق ہے یہ کچھ اخلاقی اقدار و امور تک محدود نہیں ہے۔ کائنات میں بہت سی چیزوں اور بہت سے واقعات کے نتائج دیر سے نکلتے ہیں۔ کائنات کو موجودہ حالت تک پہنچنے میں اربوں سال لگے ہیں۔ زمین کروڑوں سال کے پیہم انقلابات کے بعد اس قابل ہو سکی ہے کہ اس سے زندگی نمودار ہو اور حیوانات اور انسان اس پر بس سکیں۔ کاشتکار بعض فصلیں تین مہینوں میں کاٹ لیتے ہیں۔ بعض چھ مہینے میں، بعض سال بھر میں۔ اسی طرح اگر انسانی اعمال کی کھیتی کٹنے میں دیر لگے تو یہ عجیب کیوں ہے؟ اور یہ اس بات کا ثبوت کیونکر ہے کہ خدا نہیں ہے؟

بدی اور ظلم و فساد کے عام ہونے سے دنیا کا امن و سکون رخصت ہو گیا ہے اور وہ سخت مصائب و آلام کا شکار ہے۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ بے دینی و بداخلاقی انسانیت کے لیے مہلک ہیں اور انسانی ارتقاء کے لیے اصل اہمیت مادی ترقی کو نہیں، دینی و اخلاقی قدروں کو حاصل ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ خدا، مذہب اور اخلاق ثابت شدہ حقائق ہیں۔ ان کا اعتراف انسانیت کے لیے موجبِ فلاح ہے اور ان کا انکار موجبِ ہلاکت و خسران۔

حواشی

۱۔ "خدا ہے" میں اس پر تفصیلی بحث ملے گی۔

۲۔ "کیا خدا کی ضرورت نہیں" میں اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

۳۔ ملاحظہ ہو "خدا ہے"۔

۴۔ کبھی کا قدیم کتبہ۔

۵۔ کسی کا قدیم کتبہ۔

نوٹ یہ مضمون اس وقت لکھا گیا جب یہ اکابر زندہ تھے۔

کائنات کا جدید سائنسی تصور اور اثباتِ توحید

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے ہیں

"عالم کے حادث یا قدیم ہونے کی بحث جو ایک مدتِ دراز سے دہریوں اور خداپرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، اب جدید سائنس نے اس کا قریب قریب حتمی فیصلہ ہی خداپرستوں کے حق میں کر دیا ہے اور دہریوں کے لیے مادّے کو ازلی اور ابدی قرار دینے کی مشکل ہی سے کوئی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ پرانی مادہ پرستی کا سارا انحصار اس دعوے پر تھا کہ وہ فنا نہیں ہو سکتا، اس کی صرف صورت بدلی جا سکتی ہے مگر ہر تغیر کے بعد مادہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ عالم میں مادے کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے لیکن اب جوہری توانائی Atomic Energy نے اس پورے تخیل کی بساط الٹ دی ہے۔ اب مادہ قوت میں تبدیل ہوتا ہے اور قوت مادے میں۔ اب حرکیاتِ حرارت Thermo Dynamics کے دوسرے قانون نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ مادی عالم نہ ازلی ہو سکتا ہے اور نہ ابدی اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا چاہیے۔ اب مختلف علومِ طبیعی کی شہادتوں سے کائنات کا ایک وقتِ آغاز متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پھر کائنات کا جو نظریہ آج کل زیادہ تر مقبول ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کائنات یک لخت ایک ہی تخلیقی انفجار Explosion سے وجود میں آئی تھی نہ کہ کسی طویل تدریجی عمل سے۔ اس کا مادۂ تخلیق یکجا انتہائی کثافت اور انتہائی حرارت کی حالت میں تھا اور ابھی اس کی عمر پانچ منٹ کی تھی کہ ایک عظیم انفجار سے وہ پھٹی۔ تیس منٹ کے اندر اندر تمام کیمیاوی عناصر پیدا ہو گئے اور پھر مادے سے بے شمار فلکی نظام بنے۔ یہ گویا موجودہ سائنس کی زبان سے قرآن کے ارشادات کی تفسیر ہو رہی ہے، جن میں فرمایا گیا ہے۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (النحل ۴۰)

ترجمہ: ہم جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں اس کے لئے ہمیں بس یہ کہنا ہوتا ہے کہ ہو جا! اور بس وہ ہو جاتی ہے۔

أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء ۳۰)

ترجمہ: آسمان اور زمین ایک ڈھیر تھے، پھر ہم نے انہیں پھاڑ دیا۔

موجودہ سائنس نے دہریت اور مادہ پرستی کے ساتھ ساتھ شرک کی بھی پوری طرح کمر توڑ دی ہے۔

آج یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پوری کائنات ایک ہی مادے سے بنی ہے اور ایک سے قوانین اس میں کارفرما ہیں۔ یہ عظیم کارگہ ہستی جس میں کم از کم ایک ارب نظام فلکی Galaxies پائے جاتے ہیں اور جس کے صرف ایک نظام میں ہمارے سورج جیسے ایک ارب سورج اپنے اپنے نظام شمسی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے عناصر ترکیب سب جگہ یکساں ہیں اور وہ وہی عناصر ہیں جن سے ہماری زمین اور اس کی مخلوقات بنی ہیں۔ آج بعید ترین تاروں کا بھی جو مشاہدہ کیا گیا ہے اس میں وہ عناصر پہچانے گئے ہیں جو ہماری زمین میں پائے جاتے ہیں اور قوانین فطرت کی عالمگیری ہی انسان کو اس قابل بنا رہی ہے کہ وہ زمین سے اٹھ کر فضائے بسیط میں جائے اور دوسرے سیاروں پر پہنچنے کے لئے نقشے سوچ سکے۔ ان معلومات نے اس وہم و گمان کے لئے کوئی ادنیٰ سی گنجائش باقی نہیں چھوڑی کہ یہ کائنات مختلف خداؤں کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ آج یہ بات کھل گئی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ ○ (الزخرف: ۸۴)

ترجمہ: وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی اور وہی ایک حکیم و علیم ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ (الانعام: ۳)

ترجمہ: اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمینوں میں بھی ہے۔

وجود باری تعالیٰ اور پھر توحید کا کھلا کھلا ثبوت اس کائنات میں نظام کی وحدت ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی شے سے لے کر بڑی سے بڑی چیز جسے بھی دیکھیے ایک ہی نظام اور ایک ہی بندھن حتیٰ کہ حرکت کی ایک ہی شکل میں پروئی ہوئی ہے۔

ایٹم کو دیکھیے، اس کا الیکٹرون گھڑی کی سوئی کی حرکت کے برعکس Anti-Clock-wise گھومتا ہے۔ یعنی اوپر کی جانب دائیں سے بائیں کی طرف حرکت کرتا ہے۔ زمین بھی اسی طرح انٹی کلاک وائز طرز پر گھومتی ہے۔ سورج بھی گھڑی کی سوئیوں کے برعکس حرکت کرتا ہے۔ بالکل اسی طرز پر چاند بھی اور دوسرے اقمار بھی اسی طرح Anti-Clock-wise حرکت کرتے ہیں۔ پھر دیگر سب سیارگان، ان کا مجموعہ یعنی نظام شمسی سب کے سب اسی انداز پر حرکت کر رہے ہیں۔

اور دیکھیے، ایٹم میں الیکٹرون بیضوی (انڈے کی طرح) اہلیلجی طرز پر حرکت کرتا ہے۔ زمین سورج کے گرد بیضوی طرز پر چکر لگاتی ہے۔ بالکل اسی طرح زہرہ، نیپچون، مشتری اور دیگر تمام سیارگان اسی طرح بیضوی (Oval) اہلیلجی طرز پر چکر لگاتے ہیں۔

زمین کا محور سیدھا نہیں ہے، جھکا ہوا ہے۔ (ساڑھے تئیس کے زاویہ پر مائل ہے)۔ چاند کا محور بھی جھکا ہوا ہے۔ مریخ کا محور بھی جھکا ہوا ہے، خود سورج کا محور بھی جھکا ہوا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی نسبت زاویہ سے ایٹم کے اندر بھی نیوٹرون اور الیکٹران کے مابین وہی نسبت ہے جو سورج اور اس کے گرد چکر لگانے والے سیارگان کے مابین نسبت پائی جاتی ہے۔

پھر دیکھیے کہ دنیا میں موجود تمام ذرات، تمام ایٹم ایک زوجیت (جوڑا جوڑا ہونا) پر قائم ہیں۔ ایٹموں میں مثبت اور منفی برق پارے پائے جاتے ہیں۔ غرضیکہ دنیا کی ہر چیز منفی اور مثبت برق پاروں کی زوجیت کا مظہر ہے۔ نباتات کی طرف آیئے تو دور جدید میں پتا چلا ہے کہ یہاں بھی مادہ و نر کی زوجیت موجود ہے۔ حیوانوں میں،

انسانوں میں، حتیٰ کہ انسانوں کی تیسری جنس مخنثوں میں بھی نر اعضائے تناسل اور مادہ اعضائے تناسل صاف نظر آتے ہیں۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○ (یٰس: ۳۶)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے تمام متقابل قسموں کو پیدا کیا نباتاتِ زمین کے قبیل سے بھی اور (خود) ان آدمیوں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو (عام لوگ) نہیں جانتے۔

اسی طرح سے پوری زمین میں، سورج میں، تمام ستاروں میں یہی زوجیت، یہی الیکٹرون اور پروٹون کی زوجیت اور نیوٹرون جیسے مرکزے کا وجود پایا جاتا ہے۔

کیا یہ وحدت تمام اس بات کی حتمی شہادت نہیں کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق، ایک ہی مالک و منتظم اور ایک ہی رب ذوالجلال ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین

رابرٹ گرانٹ انگلیس سے بی۔ اے ایم۔ ایس سی ڈی اپنے مضمون "ستاروں کی دنیا میں" میں لکھتے ہیں:

"ان صدیوں کا پہیلیں سے ثابت شدہ تصور کائنات میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ اس وسعت میں ابھی تک اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس کی انتہا کہیں نظر نہیں آتی"۔

دوربین سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج، مشتری اور دیگر سیارے زمین کی طرح اپنے محور پر بھی گھوم رہے ہیں۔ ۱۷۸۸ء میں انگلستان کے ایک منجم ایڈمنڈ ہیلی (Edmund Halley) نے ثابت کیا کہ کچھ یا تمام ستارے آسمان میں اپنی پوزیشن بدل رہے ہیں، ساکن نہیں ہیں، بلکہ تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ سو سال بعد ہرشل نے اعلان کیا کہ سورج بھی خلا میں محو سفر ہے۔ اور اس کا راستہ ستاروں کے دو جھرمٹوں لیتر اور ہرقلیس کے قریب سے گزرتا ہے۔ تازہ مشاہدات سے ہرشل کی تائید ہوتی ہے۔

کائنات کا وہ قدیم تصور، کہ اس کے مرکز میں ایک تنگ سی زمین یا سورج ہے، ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک غیر محدود یا غیر معین کائنات کے تصور نے لے لی ہے جس کا ہر یونٹ غیر معمولی رفتار سے محوِ پرواز ہے۔ ہماری زمین نہ صرف اپنے محور اور مدار پر گھوم رہی ہے بلکہ سورج کے ہمراہ ستاروں کی دنیا میں خطِ مستقیم بھی سفر کر رہی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص خلا میں ایک نہایت پیچیدہ راستے پر جا رہا ہے۔ ہماری زمین بیک وقت تین سفر کر رہی ہے۔ اول: ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محوری گردش، دوم: اڑسٹھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مداری گردش، سوم چوالیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے ہمراہ سفر۔

اس رفتار کا اندازہ ہم ستاروں کی ان باقاعدہ یا بے قاعدہ بدلتی ہوئی پوزیشن سے لگاتے ہیں جنہیں صرف دوربین دیکھ سکتی ہے۔ اگر اس رفتار کو ہماری آنکھ دیکھ پائے تو بڑے سے بڑے شیر دل کا پتہ پانی ہو جائے اور اس کی عقل چکرا جائے۔ سورج کے علاوہ باقی ستارے اور ان کے چاند بھی اسی رفتار سے خلا میں محو سفر ہیں۔ جب ہم ستاروں کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت میں ڈوب جاتے ہیں، اس تیزی و تندی کے باوجود ان کی رفتار میں وہ توازن، ہم آہنگی اور آئین کی پابندی ہے کہ جوں جوں ہم اپنے مشاہدات کا تجزیہ کرتے ہیں تو نظم و نسق کی ایک ایسی واضح تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے جو بے جان سالمات کی اتفاقیہ ترکیب و رفتار کا نتیجہ نہیں ہو سکتی"۔

سر آلیورلاج، ڈاکٹر آف سائنس اپنے مضمون "کائنات کا منصوبہ و مقصد" میں لکھتے ہیں

سورج کی روشنی کا بہت بڑا حصہ خلا میں پھیل جاتا ہے اور اس کی ایک چھوٹی سی کسر زمین پر آتی ہے اسی سے ہوائیں چلتی، گھٹائیں بنتی، دریا بہتے، پودے اُگتے اور ذی حیات زندہ رہتے ہیں۔ نظام شمسی کب سے قائم ہے؟ ہمیں علم نہیں، ہمیں اتنا ہی معلوم ہے کہ زندگی کسی نہ کسی شکل میں زمانہ قدیم سے موجود تھی، البتہ ذہن و دماغ کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ بعض پُراسرار عوامل صدیوں مصروف عمل رہے تب کہیں فضا عقل و آگہی کے لیے ہموار پائی۔ یہ عوامل بدستور مصروف کار ہیں اور ایک عظیم تر ذہانت کے۔

اس کائنات کی تفسیر و تشریح صرف فزکس اور کیمسٹری کے اصولوں سے نہیں ہو سکتی۔ مثلاً حیوانات کو لیجئے، کیا ان کی عادات، حرکات اور سکنات کی کوئی توجیہ ان علوم کی روشنی میں ممکن ہے، کائنات میں غور و فکر ہمیں ایک ہی نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ یہاں کوئی تخلیق بے مقصد نہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی حادثے سے زمین کی تمام آبادی ختم ہو جاتی ہے اور سینکڑوں صدیوں بعد مریخ کا کوئی سائنس دان یہاں پہنچ آتا ہے، وہ ٹوٹی ہوئی تعمیرات، پلوں اور سڑکوں کو دیکھ کر یہ کبھی نہیں کہے گا کہ یہ چیزیں فزکس اور کیمسٹری کے عمل سے ظہور میں آئی تھیں، بلکہ یہ سمجھے گا کہ زمین پر کسی وقت کوئی صاحب عقل مخلوق آباد تھی جس نے یہ سب کچھ کسی نہ کسی مقصد کے لئے بنایا تھا۔

ایک سرجن اس اعتماد پر جسم کے کسی خراب حصے کو کاٹ دیتا ہے کہ یہ حصہ از خود از سر نو پیدا ہو جائے گا۔ اندمال و تلافی کا یہ عمل کیسے ہوتا ہے؟ بدستور ایک راز ہے۔ ہماری اس مادی دنیا میں ایک روحانی دنیا بھی موجود ہے جس کی طرف ہم امداد و تعاون کے لیے بار بار لپکتے ہیں۔ ہمارا بولنا، پڑھنا، لکھنا اور سوچنا، جسمانی اعمال ہیں اور روحانی بھی۔ جب ہم لکھ رہے ہوتے ہیں تو ہاتھ اور دماغ بیک وقت مصروف کار ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی ڈرائنگ روم میں حسین آرائشی اشیاء دیکھتے ہیں تو معاً ذہن ان کے دانش مند صانع کی طرف چلا جاتا ہے۔ نگارخانۂ فطرت بھی جمیل مناظر سے لبریز ہے، کیا ان کا کوئی صانع نہیں؟

قدیم کھنڈرات میں زمانہ قبل از تاریخ کے نقش و نگار دیکھ کر ذہن اس دانش مند آرٹسٹ کی طرف چلا جاتا ہے جس نے وہ نقش بنائے تھے۔ یہ نباتات، حیوانات اور جمادات نہ صرف آرٹ کے حسین نمونے ہیں بلکہ پلان و مقصد کے عظیم شواہد بھی۔ ان تمام کی تعمیر و تشکیل ایٹم سے ہوئی تھی۔ یہ انہیں کی ترتیب کا اعجاز ہے کہ نباتات، حیوانات و جمادات سے الگ ہو گئے اور ان کی اتنی انواع بن گئیں کہ انسانی ذہن ان کے تنوع اور تعداد کے تصور ہی سے سربسجود ہو جاتا ہے۔

"When we come to philosophize on existence, we must transcend the limitations of physical science and admit the working and operation of a super human guiding and directing power"

(آلیورلاج)

(جب ہم زندگی کی حقیقت پر غور کرنے لگیں تو ہمیں چاہیے کہ فزیکل سائنس کی محدود فضا کو پھلانگ کر اس مافوق البشری طاقت کو تسلیم کریں جو ہر شے کو تکمیل کی راہوں پہ ڈال کر اس کی رہنمائی کر رہی ہے)۔

آرتھر سٹوآرٹ ایو (ایف آر، ایس ڈی ایس سی) اپنے مضمون "تفسیر کائنات" میں لکھتے ہیں۔

"اس خلا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کروڑوں لہریں بیک وقت روشنی کی رفتار سے ہر سمت جاری ہیں اور ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ ان کا طول جدا جدا ہوتا ہے۔ اسی خلا سے روشنی بھی گزرتی ہے۔ اگر ہم ایک سو واٹ کا ایک بلب دس گھنٹے کے لئے جلائیں تو بجلی کا ایک یونٹ خرچ ہو گا اور اس کے لئے ہمیں کم از کم تیس پیسے ادا کرنے ہوں گے۔ بجلی کا کچھ وزن بھی ہوتا ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ ایک پونڈ بجلی خریدنے کے لیے ہمیں بیس کروڑ روپے خرچ کرنا پڑیں گے۔ سورج ہر روز ایک سو ساٹھ ٹن روشنی زمین کو دیتا ہے اس کی قیمت پندرہ کروڑ روپے بنتی ہے۔ سورج یہ کام پچھلے دس ارب سال سے کر رہا ہے اور نہ جانے کتنے ارب سال اور کرتا رہے گا۔ کوئی ہے جو اس روشنی کی قیمت کا اندازہ لگا سکے؟ اگر کسی دن آسمان والے اہلِ زمین کے سامنے روشنی کا بل پیش کر دیں اور ساتھ ہی دھمکی دے دیں کہ اگر فلاں تاریخ تک یہ بل ادا نہ ہوا تو کائنات کی تمام روشنیاں گل کر دی جائیں گی تو اے زمین والو! تم کیا کرو گے؟

یہ خلا جو ہر قسم کی روشنی اور توانائی کی لہریں زمین تک پہنچاتا ہے بالکل خالی نہیں بلکہ اثیری مواد سے پُر ہے۔ یہ مواد مادی اشیاء کی طرح ٹھوس نہیں اور نہ بالکل روحانی ہے۔ سر دست کائنات کے متعلق ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ مادہ اور اثیر سے مرکب ہے اور یہ توانائیوں کی گذرگاہ ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ دس لاکھ نوری سال تک کی مسافتیں ماپی جا چکی ہیں اور فلک شناس ایسی مسافتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو دس کروڑ نوری سال سے بھی زیادہ ہوں۔

اس کائنات میں ایک طرف سدیم کہکشاں، ستاروں کی بے کراں مسافتیں اور توانائی کی بے شمار لہریں ہیں اور دوسری طرف مہین برقی ذرات اور بنیادی عناصر مثلاً ہیلیم، سوڈیم، کرومیم وغیرہ ہیں، جن سے اشیاء کی تشکیل ہوئی۔ انہیں سے زمین بنی اور انہی سے سورج، چاند اور کواکب تیار ہوئے۔ ایٹم (جوہر) بجلی کے مثبت و منفی ذرات کا مجموعہ ہے۔ یوں تو ایٹم کی ساخت بہت سادہ ہے لیکن نباتات و حیوانات میں یہ بہت پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ ایک پودا بظاہر ایک سادہ سی چیز نظر آتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک نہایت پیچیدہ فیکٹری ہے جس میں پتے شاخیں پھول اور خوش ذائقہ پھل ڈھل رہے ہیں۔ اور عجیب تر یہ کہ اس کے پاس اپنے جیسی مزید فیکٹریاں بنانے کا سامان (بیج) بھی موجود ہے۔ آم کی گٹھلی سے آم، مالٹے کے بیج سے مالٹا اور گائے کے پیٹ سے بچھڑا پیدا ہونا تخلیق کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔ وہ کونسی قوت ہے جو شیر کے بچے کو شیر بناتی اور آم کے پودے کے ساتھ آم لگاتی ہے۔ نو روئیدہ نہال اور نو مولود بشر کا رابطہ اپنی نوع سے قائم رکھتی ہے۔ اس سوال کا جواب ابھی تک ہمیں نہیں مل سکا۔

ایٹم، مثبت و منفی ذراتِ برق سے ترکیب پاتا ہے۔ مثبت کے گرد ایک سے لے کر بانوے تک منفیے (الیکٹران) اسی طرح چکر کاٹتے ہیں جیسے سورج کے گرد سیارے۔ ہر منفیہ ایک مدار سے کود کر دوسرے میں جا سکتا ہے۔ اس کی خصوصیات میں سے ایک یہ کہ یہ وائرلس سٹیشن کی طرح توانائی لیتا بھی ہے اور دیتا بھی ہے۔

اللہ کا کمالِ تخلیق دیکھنا ہو تو اونٹ اور ہاتھی کو دیکھیے بلکہ ان باریک، رنگین اور اڑتی ہوئی مکھیوں کو دیکھیے جو پھولوں اور پھلوں کے پاس ملتی ہیں۔ ان کی نہ ٹانگیں نظر آتی ہیں، نہ منہ اور نہ سر، بایں ہمہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہیں۔ یہی کیفیت کائنات کے ان مہین ذرات کی ہے کہ چھوٹا ہونے کے باوجود یہ تخلیق کا شاہکار ہیں۔

اللہ جل جلالہ

مصنف — سعید حوی

مترجم — محمد مسعود عبدہ

نظر ثانی — ادارہ

میری تحریر ایسے بنیادی اصولوں پہ مبنی ہے۔ جن کے مکمل عرفان اور ایمان کے بغیر کوئی مسلمان کہلانے والا سچا مسلمان نہیں ہو سکتا۔

ان تینوں اصول پہ میری جامع تحریریں الگ الگ بھی شائع ہو چکی ہیں۔ میرے علاوہ بھی بہت جید علماء نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ سبھی میں ان اصول ثلاثہ کی بذاتہ وضاحت کی بجائے ان کے ضمنی مباحث پر زور دیا گیا ہے۔

لہٰذا میں نے ان "اصولِ ثلاثہ" کو مرکزی فکر بنا کر پیش نظر مجموعہ تحریر میں اپنے علمی انا یا مدح و ذم سے بے نیاز ان کی تحریروں کے کچھ حصے بھی شامل کر لیے، میرے پیش نظر، تمام باتوں سے اہم ان اصولِ ثلاثہ کی جامع وضاحت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَالَ: رضیت باللہِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نبیاً وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّة

(جس نے بھی کہا: میں نے اللہ کو اپنا رب مان لیا۔ دین اسلام قبول کر لیا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نبی تسلیم کر لیا اس کے لئے جنت مقدر ہو گئی)۔

دوسری جگہ رسولِ رحمت و شفقت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یوں فرمایا:

ذَاقَ طَعْمَ الْاِیْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا.

(وہ ایمان کی لذت سے آشنا ہو گیا جس نے اللہ کو رب مان لیا، دین اسلام کو قبول کر لیا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول تسلیم کر لیا)۔

ان تین اصولوں سے پہلا اصول اللہ کو رب ماننا ہے۔ لہذا ہم اس پہلے اصول یعنی ذات الٰہیہ جلالتہ کیا ہے اس سے متعلق ایسی مدلل بحث پیش کی ہے جو قاری کے ذہن سے اللہ جل شانہٗ کے بارے میں تمام شبہات اور بدگمانی پیدا کرنے والی تمام باتوں کے اثرات کو بالکل مٹا دے گی اور اللہ تعالیٰ کو اپنا رب ماننے کی حقیقی تعریف پا جائے گا۔

اصول نمبر ۲

اس گفتگو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثل شخصیت کو اجاگر کرتے ہوئے ٹھوس اور واضح دلیلوں کے ساتھ ثابت کریں گے کہ آنحضرت صلی اللہ وآلہ وسلم کی ذات تمام انسانی کمالات کی ہمہ پہلو معراج تھی۔ جس پر ان کی رسالت کی حیات طیبہ بذات خود اٹل دلیل موجود ہے۔ پھر بھی اس کی اصلی حقیقت سے شناسائی ایمان کے ذریعہ تو حاصل ہو سکتی ہے مگر عقل کو وسیلہ بنانے سے نہیں۔

اصول نمبر ۳

اس کے بعد راقم تیسرے اصول "اسلام" میں عقائد، عبادات اور اوامر و نواہی کو ایسی ٹھوس واضح اور روز روشن کی طرح ناقابل انکار دلیلوں کی روشنی میں ان کی افادیت پیش کرے گا کہ عقل سلیم کا مالک انسان ان سے راہ فرار حاصل ہی نہیں کر سکے گا۔

ارشاد ربانی ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ج (آل عمران:۸۵)

ترجمہ۔ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور مجھے یقین ہے کہ اس تحریر کو پڑھنے والوں کے بے چین دلوں کو قرار بھی ملے گا۔ یقین کے اطمینان کی ٹھنڈک بھی نصیب ہو گی۔ بھٹکی ہوئی عقل کو صحیح راستے سے آگاہی بھی نصیب ہو گی۔ ان تحریروں کو پڑھنے والے کو اللہ جل شانہٗ کی ذات کے ہونے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے مثل شخصیت کے بارے میں بے ہنگم اعتراضات کی تردید میں ایسے مدلل جوابات ملیں گے جن سے عقل کو مانے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔ "دین اسلام" کی افادیت اس انداز سے ثابت کی جائے گی کہ قاری دین و شریعت کی عظمت کو مانے بغیر رہ ہی نہیں سکے گا اور قاری بے ساختہ کہے گا، اللہ ہی میرا رب ہے، میں اُس کی مخلوق اس کا بندہ ہوں اور اُسی نے مجھے وہ علم جس سے میں ناواقف تھا اس علم کی نعمت سے نوازا۔ ان شاء اللہ!

اپنی اصلی معروضات سے پہلے میں نے یہ طویل گفتگو اس لئے کی ہے کہ اس دور میں ایک بہت بڑی جماعت بڑے منظم طریقہ سے انسانوں کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی تعلیمات دین اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلا رہی ہے۔ نتیجہ یہ نظر آرہا ہے کہ روزبروز انسانی ذہن ان سے متاثر ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس الحاد کے سیلاب کو روکنے کے لئے اہل علم دین اسلام کے بنیادی اصولوں و حقائق کی روشنی میں پشتے تعمیر کریں۔ عوام الناس کو علم ایمان اور علم شریعت سے آگاہ کریں۔ اللہ تعالیٰ [illegible] کی مدلل وضاحت از بس ضروری ہے۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّ شِفَآءٌ ط وَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَیْهِمْ عَمًی ط (حٰمٓ السجدۃ:۴۴)

ترجمہ: کہہ دو کہ جو ایمان لاتے ہیں ان کے لئے (یہ) ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہرا پن) ہے۔ اور یہ ان کے حق میں (موجب) نابینائی ہے۔

راقم نے اپنے موقف کی تائید میں ہر ممکن دلائل پیش کیے ہیں۔ اپنی تحریروں میں اللہ کے وجود برحق سے انکار کرنے والوں کی آراء اور دین اسلام سے انحراف کرنے والوں کی تحریریں بھی پیش کی ہیں۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ان الحکمة ضالة المؤمن۔ "حکمت و دانش مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے" جہاں ملے اسے حاصل کر لینا چاہیے۔

مجھے یقین ہے میرے ارادے اور کوشش میں اللہ کا فضل و کرم شامل ہے۔ وَ هُوَ حَسْبِیْ وَ وَلِیِّیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَ نِعْمَ الْوَکِیْل۔

سعید حوی

اللہ جلّ جلالہٗ

مصنف: سعید حوی

مترجم: محمد مسعود عبدہ

نظرثانی: ادارہ

(آیات قرآنی کا ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری صاحب کا ہے)

معرفتِ الٰہی

معرفتِ الٰہی "یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے وجود کا یقینِ راسخ" اسلام کا بنیادی مرکز ہے۔ اگر یہی نہ ہو تو اسلام میں ہر عمل بے روح اور بے قیمت ہو جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا یہ مقام حاصل ہو تو کیسے ہو۔ جس طرح کسی منزلِ مقصود کو معین کرنے کے بعد اس تک پہنچنے کے لئے راہ کا صحیح انتخاب نہ ہو کامیابی ناممکن ہے۔ اسی طرح اس منزلِ معرفت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں صحیح راستے کا انتخاب کرنا ضروری ہو گا۔

اب ہم اللہ جل شانہٗ کی ازلی و ابدی ہستی سے انکار کرنے والوں نے جس راستے کو اپنایا اس پر غور کرتے ہیں۔ تو ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے حواس نے بہت تلاش کے باوجود اسے نہیں پایا۔ صاف ظاہر ہے، ان کی نظر میں "حواس" ہی ایک راستہ ہے جس کا سفر طے کرنے کے بعد حقیقت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے اس راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی ذات برحق پر یقین رکھنے والے مومن وہمی، گمراہ، پراگندہ خیال، جاہل اور بے وقوف ہیں ان کا مذاق اڑانا، تذلیل کرنا اپنی دانشوری کا فرض تصور کرتے ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے انہیں کے ذہن کی ترجمانی ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

خوگرِ پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر؟

لیکن مادہ پرستی کے اندھے پن میں حواس کو ہی حقیقتوں کی پہچان کا حتمی معیار کا دعویٰ کرنے والوں پہ غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ خود ان کے اپنے ہی فیصلے ان کے اس دعویٰ کی تردید کرتے ہیں۔

مثلاً علم کشش ـــــ اور اس کے قوانین کو ماننے والے اس کی حقیقت کو دیکھے بغیر کس طرح مان لیتے ہیں۔ اس عمل میں صرف لوہے کا لوہے کی طرف کھینچ کر جانا تو نظر آتا ہے لیکن اس عمل کا محرک مقناطیس نظر نہیں آتا۔ بلکہ صرف اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ایتھر [illegible] کا وجود بھی صرف آثار عمل سے ہی مان لیتے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بہت سی حقیقتیں صرف اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہیں۔ نظر نہ آنے کے باوجود موجود ہوتی ہیں اور دانشور ان کے وجود پہ یقین رکھتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ حواس ہی کو حقائق کی پہچان کا حتمی ذریعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عقل کو ہی لیجئے۔ حواس اس کا بھی محسوس احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ حواس ہی اس تک نظر آنے والی اشیاء کا تصور پہنچاتے ہیں اور عقل ان کے بارے میں شناخت کا حکم صادر کرتی ہے۔

حواس لاتعداد زندہ اشیاء یا بے جان اشیاء کو دکھا تو سکتے ہیں مگر ان کی حقیقت کی پہچان عقل کے ذریعہ ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

غور فرمائیے متوازی خطوط کے درمیانی خطوط، غیر متوازی نظر آتے ہیں۔ سفید نقوش سیاہ نقوش کے مقابلہ میں بڑے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح راستہ چلتے ہوئے شعور، ہماری راہنمائی کرتے ہوئے، قطب شمالی، جنوبی، یا خطِ استواء کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عقل نہ ہوتی تو ہم حواس کی رہنمائی میں بھٹکتے ہی رہتے۔ اب آپ ہی فرمائیے، کیا حواس کے ذریعہ اشیاء کی حقیقتوں کا ادراک ہونے کا دعویٰ درست ہے یا غلط؟ اور دانشوروں کی یہ منطق کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا حواس ادراک نہیں کر سکتے اس لئے اس پہ ایمان لانے والے ملحد ہو جائیں، جبکہ وہ خود، بہت ساری اشیاء کے وجود پہ یقین صرف معینہ آثار کو قرار دیتے ہیں۔

انسانی زندگی کی طویل تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ زمانہ قدیم میں بھی اکثر لوگوں نے "معرفت الٰہیہ" کو حواس کی گواہی نہ پا کر اس کی ذات سے انکار کیا۔ عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مادہ کو پیدا کیا۔ وہ خود مادہ سے نہیں ہے۔ کلیہ قاعدہ ہے کہ مادہ سے مادہ پیدا نہیں ہوتا۔ حواس کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ کسی ٹھوس وجود کو دیکھ سکے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا یا محسوس ادراک اس کے بس کی بات ہی نہیں۔ لیکن آج کے اس دور میں ہم نے اکثر لوگوں سے یہ سنا ہے کہ ہم اس اللہ کو نہیں مانتے جو نظر نہیں آتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ فضاؤں میں اڑان بھرنے والوں کے چاند پہ قدم رکھنے کے بعد عالمی نشریاتی ادارے نے تو باقاعدہ اعلان کر دیا، کائنات کا کوئی خالق نہیں۔

اس سلسلۂ حواس کی بدحواسی پہ مبنی ایک لطیفہ سنیے چھٹی جماعت کے مدرس نے بچوں سے سوالات کرتے ہوئے کہا:

کیا میں تمہیں نظر آ رہا ہوں؟

بچے: جی ہاں۔

معلم: اس کا مطلب ہے میں موجود ہوں! اب بتاؤ یہ تختی تمہیں نظر آ رہی ہے؟

بچوں نے کہا: جی ہاں۔

معلم: اس کا مطلب ہے کہ یہ تختی موجود ہے۔ اب یہ بتایئے یہ تولیہ تمہیں نظر آ رہا ہے؟

بچوں نے کہا: جی نظر آ رہا ہے۔

معلم: اس کا مطلب ہے تولیہ موجود ہے۔ اب بتاؤ اللہ تمہیں نظر آتا ہے؟

بچوں نے کہا: نہیں۔

معلم نے کہا: تو ثابت ہوا اللہ موجود نہیں۔

اس کے فوراً بعد ایک ذہین طالب علم نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

طالبعلم: کیا تمہیں استاد کی عقل نظر آتی ہے؟

بچوں نے کہا: نہیں۔

تو طالب علم نے فوراً کہا اس سے ثابت ہوا کہ استاد میں عقل موجود نہیں۔ ثابت ہوا یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جو زمانہ قدیم سے ذہنوں میں تھی اور آج بھی بہت سے ذہن اور دل اس بیماری میں مبتلا، عقل سلیم کو اس حقیقت کی پہچان کے لئے استعمال ہی نہیں کرتے۔

معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ سے کلام خود سن کر یا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اسے ماننے کی شرط یا ضد کا ذہنی مرض قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ ورنہ تندرست عقل اور فکر کا کام "اڑنا" نہیں بلکہ مسلسل تحقیق کرنا ہے۔

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ ہر دور میں۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ماننے کی یہی ایک شرط کافروں کا بنیادی موقف رہی ہے۔ ہم اللہ کو دماغ، آنکھ یا حواس کی تصدیق کے بغیر نہیں مانیں گے نہیں مانیں گے۔

اللہ تعالیٰ۔۔۔ ان کی اس ضد۔۔۔ کو نفسیاتی بیماری قرار دیتے ہوئے اس بیماری کی علامتوں کا تجزیہ یوں فرماتے ہیں۔

سب سے پہلی علامت:	جہالت۔
نمبر ۲:	تکبر و گھمنڈ۔
نمبر ۳:	ظلم و بے انصافی
نمبر ۴:	انحراف و روگردانی

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل ہونے کے وہم میں مبتلا ہوتے ہیں۔

دیکھیے:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۝ (بقرہ ۱۱۸)

ترجمہ: اور جو لوگ (کچھ نہیں جانتے (یعنی مشرک) وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی انہی کی سی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان

لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں جو لوگ صاحب یقین ہیں ان کے (سمجھنے کے) لئے ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں۔

اب غور کیجئے، اکثر لوگ دنیا کے ایک حکمران کے معمولی کارندے کے سامنے بات کرتے ہوئے تھرتھرا جاتے ہیں۔ حکمران کی آنکھ سے آنکھ ملاتے ہی پانی ہو جاتے ہیں۔

کسی حکمران کی آواز سن کر لرزنے لگتے ہیں۔ لب اپنی عقل سے [illegible]۔ ان کی یہ ضد — نادانی — یہ جس بات کی ان میں قوت برداشت ہی نہیں اس پہ اڑنا جہالت [illegible] نہیں؟

اللہ تعالیٰ انہیں بار بار اس کے جواب میں اپنے اثبات کو "آیات" [illegible] سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں مگر قدیم زمانے سے لے کر آج تک جہالت کا یہی مرض ان کی مماثلت کا [illegible] رہا ہے۔

مرضِ کبر و تکبر

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ (الفرقان ۲۱،۲۲)

ترجمہ اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کئے گئے یا ہم آنکھ سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں۔ یہ اپنے خیال میں بڑائی رکھتے ہیں اور (اسی بنا پر) بڑے سرکش ہو رہے ہیں۔ جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن گنہگاروں کے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہو گی۔

جہالت کے مریضوں کی شرط — اللہ جل شانہٗ کی آواز سن کر اسے ماننا۔

کبر کے مریض آگے بڑھے۔ اور کہا یا تو رب ہمیں نظر آئے یا فرشتے۔ ہم سے ہمکلام ہوں۔

انبیاء ہی اس کے مستحق کیوں ہیں؟ ہم سے بڑھ کر اس اعزاز کا مستحق کون ہے؟

ان کے اس موقف کا ہر ایک جملہ ان کی خودسری اور احساس کمتری کا مظہر ہے۔

جب کہ انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ موت کے بعد کے عالم کا مزاج اور قوانین اور اس مادی کائنات کے قوانین الگ فطرت الگ۔ تمہاری عقل و ہوش اس کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔ اس طرح فرشتوں کی مخلوق الگ، اصولی طور پر تمہاری نظریں انہیں دیکھنے کے قابل ہی نہیں۔ تم اپنی کمزوری پر غور کرو۔

اپنی اصلاح کرو۔ اگر تم نہیں دیکھ سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہے ہی نہیں۔

مگر یہ معقول بات ان کے دماغ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھنے کے سبب قبول ہی نہیں کرتے اور اسی فکری گمراہی نے ہمیشہ، انسان کو سچائی سے دور رکھا، ان کی عقل و فکر، خیال اور تصور اللہ کے عرفان کا صحیح راستہ اختیار ہی نہ کر سکے۔

۳۔ انحراف و روگردانی

اب ہم فراعین مصر میں سے ایک فرعون کے اندازِ فکر کو قرآن پاک کی زبان میں پیش کرتے ہیں۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَO لا اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ط وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ط (المومن : ۳۶-۳۷)

ترجمہ: اور فرعون نے کہا کہ ہامان میرے لئے ایک محل بناؤ تا کہ میں (اس پر چڑھ کر) رستوں پر پہنچ جاؤں۔ (یعنی) آسمانوں کے رستوں پر [illegible] خدا کو دیکھ لوں اور میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔ اور اسی طرح فرعون کو اس کے اعمال بد اچھے معلوم ہوتے تھے اور وہ رستے سے روک دیا گیا تھا۔

فرعون کے انداز [illegible] میں تو انحراف کی تعریف صاف واضح نظر آتی ہے۔ اس کی دانشوری فکر کی بیماری ہے۔ بات کے اصل [illegible] کرنے کے بجائے وہ حتمی فیصلہ دے دیتی ہے کہ یہ یعنی (موسیٰ علیہ السلام) تو ہیں ہی جھوٹے ان کی [illegible] کیا؟

آپ کو بھی اپنی زندگی [illegible] کی بزعم خود دانشوری کے مریضوں سے واسطہ پڑا ہو گا جو آپ کی بات کو ناقابل اہمیت تصور کرتے [illegible] طرف پلٹ کر آپ کو خاموش کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا وہ اصل بات کے مفہوم سے [illegible] پھیر لیتے ہیں۔ یہی فکری گمراہی ان کے لئے ایک عزیز بنا دی جاتی ہے کہ پھر وہ سچائی کی حقیقت تک رسائی حاصل کر ہی نہیں سکتے۔

۳۔ ظلم و بے انصافی

آل یہود میں اس بیماری کی نشاندہی اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ O (بقرہ: ۵۵)

ترجمہ: اور جب تم نے (موسیٰ سے) کہا کہ موسیٰ جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے تو تم کو بجلی نے آ گھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔

اور دوسری جگہ فرمایا

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ج (النساء ۱۵۳)

ترجمہ: تو یہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑی بڑی درخواستیں کر چکے ہیں (ان سے) کہتے تھے ہمیں خدا کو ظاہر (یعنی آنکھوں سے) دکھا دو سو ان کے گناہ کی وجہ سے ان کو بجلی نے آ پکڑا۔

انہوں نے (یہودی قوم) نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہمیں اللہ اعلانیہ صاف صاف دکھا۔ اُن پر بجلی ٹوٹ پڑی۔

اسی طرح اس سے پہلی آیت کریمہ (بقرہ ۵۵) میں ظلم کے مفہوم کو یہودی قوم کے مطالبہ کا ماحصل بیان فرماتے ہوئے اللہ جل شانہٗ نے فرمایا

جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہر گز یقین نہیں کریں گے جب تک اپنی آنکھوں سے تم کو اللہ سے باتیں کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں گے۔ اس وقت ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کو بجلی نے پکڑ لیا۔

ظلم کے مفہوم کی مزید وضاحت کے لئے عرض ہے:

تمام علماء لغت کے نزدیک ظلم کا مطلب ہے کسی شے کو اس کی مخصوص جگہ سے ہٹا کر نقصان کے ساتھ یا زیادتی کے ساتھ بدل کر بے جا جگہ رکھ دینا۔ یہ زیادتی لوگ اپنے آپ سے بھی ایسے کرتے ہیں اس کا مشاہدہ آپ اپنی زندگی میں بھی کر چکے ہوں گے۔

تو یہ تھی وہ چوتھی بیماری۔۔۔ چنانچہ حقیقت کو پہچان کر بھی اور دوسی شخص اس سے انکار کرے تو وہ بھی ظلم ہی کہلائے گا۔ ماضی بعید ماضی قریب یا حال سبھی میں اللہ کی ذات سے انکار کے منفی نظریہ رکھنے والوں کے خیال ہوں یا الفاظ بالکل ایک سے ہی ہیں۔ اور مذکورہ بیماریاں بھی ایسے افراد میں مشترک ہیں۔ ایک اور مثال قرآن حکیم میں دیکھیے:

قَالَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ز وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ O بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ج صلے م (الانبیاء: ۴۔۵)

ترجمہ (پیغمبر نے) کہا کہ جو بات آسمان اور زمین میں (کہی جاتی) ہے میرا پروردگار اسے جانتا ہے۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ بلکہ ظالم کہنے لگے کہ یہ قرآن پریشان باتیں ہیں جو خواب میں دیکھ لی ہیں (نہیں) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے۔ (نہیں) بلکہ یہ شعر ہے جو اس شاعر کا (نتیجہ طبع) ہے۔

ان کے انہیں جملوں کو آج بھی مادہ پرست اللہ کی ذات سے انکار کرنے والے ان الفاظ میں دہرا تے ہیں۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے وہم میں مبتلا ہیں۔ ایک جھوٹی بات پہ اڑے ہیں۔ رجعت پسند ہیں، جاہل ہیں۔ اللہ کے احکام مان کر روزے رکھنے والے صبر اور قناعت کر کے خود کو اذیت دینے والے دکھی سورہا ہیں۔ خود فریبی میں مبتلا ہیں۔

ایسے گمراہ لوگوں کے ہجوم سے گزرتے ہوئے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کے اثرات سے اپنے دل کو بچائے اور اللہ تعالیٰ کی تنبیہ کو ہمیشہ یاد رکھے۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ط وَ مَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ O(البقرہ: ۱۰۸)

ترجمہ: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے اسی طرح کے سوال کرو جس طرح کے سوال پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے۔ اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر لیا وہ سیدھے رستے سے بھٹک گیا۔

مطلب یہ کہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ ان ذہنی مریضوں کے ایسے سوالات اور ایسی سوچ سے اپنے دل کو محفوظ رکھے۔

اللہ جل شانہٗ تک پہنچنے کا راستہ

اس کی آیات ہیں جیسے کہ ہم نے استدلالی بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ہمیں حواس کے ذریعہ منزل مقصود کا ملنا ممکن نہیں۔ تو پھر وہ کون سا راستہ ہے جس کو اختیار کرنے کے بعد ہمیں اپنی منزل مقصود (اللہ

تعالیٰ کا عرفان) نصیب ہو سکتا ہے۔ تو وہ راستہ صرف وہی ہے جس کی نشاندہی خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ آیات الٰہیہ یا آثار! مگر اس راستے کا زاد راہ یا معاون عقل، تدبر و تفکر اور علم لازم ہے۔ اس لئے کہ عقل کے بغیر آیات الٰہیہ کی تمیز ناممکن ہے۔ تدبر و تفکر کے بغیر ان آیات سے متعلق ہستی کا تعین نہیں ہو سکتا اور علم کے بغیر آیات الٰہیہ اور صاحب آیات کا عرفان دونوں حاصل نہیں ہو سکتے۔

ہماری یہ بات یقیناً اللہ کی ذات سے انکار کرنے والوں کو عجیب و غریب محسوس ہو گی کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے لئے ہی عالم، عاقل، دانشور، مفکر اور مدبر کے القاب مخصوص سمجھتے ہیں لیکن علم کی عدالت میں دعویٰ ثبوت دلیل کے بغیر بے معنی قرار دے دیا جاتا ہے۔

ہم اپنی ہر بات کے ثبوت بھی دیں گے اور ان شاء اللہ ان کو چیلنج کرنے والوں کو سرنگوں کر دیں گے۔

وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الشوریٰ. ۱۶)

ترجمہ: اور جو لوگ خدا (کے بارے) میں، بعد اس کے کہ اسے (مومنوں نے) مان لیا ہو جھگڑتے ہیں ان کے پروردگار کے نزدیک ان کا جھگڑا لغو ہے۔

آج بھی مسلمانوں کو اللہ سے بدظن کرنے کے لئے ایک بہت بڑا گروہ سرگرم عمل ہے۔ اس کی تفصیل تو ہم بعد میں بیان کریں گے لیکن ابھی ہم تھوڑی دیر کے لئے قرآن حکیم کے بارہ میں کچھ باتیں کریں گے۔ قرآن حکیم پر نظر ڈالیں تو اس کا ہر مطلب واضح شکل کے ساتھ ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔

عقل کو وسعتیں بخشتا ہے۔ تدبر و تفکر علم و دانش اور آثار (آیات الٰہیہ) کا بے پایاں سمندر نظر آتا ہے۔

اسی بنا پر ہمارے نزدیک معرفت الٰہیہ کی بنیاد یہی قرآن حکیم ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (الاحقاف ۴)

ترجمہ: کہو کہ بھلا تم نے ان چیزوں کو دیکھا ہے جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو (ذرا) مجھے بھی تو دکھاؤ کہ انہوں نے زمین میں کونسی چیز پیدا کی ہے۔ یا آسمانوں میں ان کی شرکت ہے۔ اگر سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب میرے پاس لاؤ یا علم (انبیاء میں) سے کچھ (منقول) چلا آتا ہو (تو اسے پیش کرو)۔

آج ہم بھی ..... اللہ کی ذات سے انکار کرنے والوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس کائنات کے ایک ذرہ کو بھی پیدا کرنے والا کوئی ہے تو اپنے علم سے ثابت کریں۔ ہمیں یقین ہے اللہ تعالیٰ کی ذات سے انکار کرنے والوں کے پاس علم کے حوالے سے کوئی دلیل نہیں۔ ہاں جہالت میں اڑ جائیں تو اور بات!

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ۙ (سورہ حج.۸)

ترجمہ: اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا (کی شان) میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے۔

قرآن حکیم کو بنظر غائر دیکھنے والوں کے لئے علم و فکر اور عقل و دانش بیکراں خزانے نظر آتے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (رعد:۴)

ترجمہ: اور اس میں سمجھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ O(الانعام ۱۰۰)

ترجمہ: ان میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں (قدرت خدا کی بہت سی) نشانیاں ہیں۔

ترجمہ: اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ O(نحل:۱۱)

غور کرنے والوں کے لئے اس میں (قدرت خدا کی بڑی) نشانی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ O(روم:۲۲)

ترجمہ: اہل دانش کے لئے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط (یونس ۱۰۱)

ترجمہ: (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔

گویا قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ باربار تاکید کر رہے ہیں کہ اسلام سے ہر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے پر قرآن مجید پر تفکر تدبر کرنا انتہائی ضروری ہے۔ علم حاصل کرنا فرض ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کی شخصیت علم و دانش تفکر و تدبر کی وحدت کا دوسرا نام ہے۔

جبکہ غیر مسلموں کے ہاں علم و دانش کا مقصد سامان زندگی کا حصول ہے۔ فروغِ رزق اور ذاتی مفاد کا اکتساب ہے۔ اس وبا میں ہمارے مسلمان بھائی بھی شریک ہو چکے ہیں۔ حالانکہ دینِ اسلام میں حصول علم کا بنیادی مقصد دل اور دماغ کو "حق" سے آشنا کرنا ہے اور حصولِ دنیا ضمنی!

وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ هُوَ الْحَقَّ لا (سبا ۶)

ترجمہ: اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو (قرآن) تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ حق ہے۔

اس روشن حقیقت، مبینہ سچائی اللہ کی آیات کے بارے میں ہم آگے چل کر تفصیلی بات چیت کریں گے۔ آیات کے اثرات گمراہ نفوس پہ منفی اور مومنین کے لئے مثبت ثابت ہوتے لازمی ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

وَ مَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ط (التغابن : ۱۱)

ترجمہ: اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔

(تکفیر کرنے والوں نے اپنی عقل کو آیات الٰہی سمجھنے کے لئے کبھی استعمال ہی نہیں کیا۔ ان کے علم کی مثال اس مال بردار سواری کی سی ہے جس کی پشت پہ چاہے کتنا ہی قیمتی مال لدا ہو اسے اس کی قیمت کا علم ہی نہیں ہوتا)۔

منفی اثرات کے اسباب متضاد رد عمل کیوں؟

قرآن مجید میں ان کی وضاحت کرتی ہوئی بے گنت آیات موجود ہیں۔ درحقیقت ان آیات الٰہیہ سے اعراض۔۔۔۔ ان کی اپنی ذات کے مزاج پر مبنی ہوتا ہے۔ مثلاً تکبر۔۔۔۔ اسے حق کی بڑھائی ماننے سے روکتا ہے۔ حق اور باطل میں فرق کی قوت تمیز جو علم سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے محرومی اور مسلسل انحراف کی عادت ان کے

دل اور دماغ کو خود پسندی اور خودسری میں منتقل کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ قدرت الہیہ ہی معجزاتی طور پہ اسے کھول دے تو اور بات ورنہ تمام دلائل کے باوجود انکار کی عادت سے انہیں نجات ملنا محال ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کی مثال قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:

وَ لَوْفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝ لا لَقَالُوْآ اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝ ع (الحجر ۱۴، ۱۵)

ترجمہ: اور اگر ہم آسمان [illegible] ان پہ کھول دیں اور وہ اس میں چڑھنے بھی لگیں تو بھی یہی کہیں کہ ہماری آنکھیں مخمور ہو گئی ہیں [illegible] جادو کر دیا گیا ہے۔

آج آپ کے [illegible] کی نہیں جو اسلام کے نام سے بدکتے ہیں۔ انہیں یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ اسلام کے بارے میں بات [illegible] ہمیں چودہ سو سال پیچھے دھکیل رہا ہے۔

دوسری جگہ ان [illegible] کی

وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ (القمر ۲)

ترجمہ اور اگر (کافر) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے۔

تیسری مثال

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ (یوسف۔۱۰۵)

ترجمہ اور آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ گزرتے ہیں اور ان سے اعراض کرتے ہیں۔

ان آیات کی مزید وضاحت سے پہلے ہم آپ سے ایک سوال کی اجازت چاہتے ہیں۔ کیا اللہ جل شانہٗ کی ذات اس بات کی محتاج ہے کہ ہم اس پر ایمان لائیں۔ یا ہم اللہ جل شانہٗ کے محتاج ہیں کہ وہ ہمیں ہماری اپنی ذات کو اس نعمتِ ایمان سے سرفراز فرمائے)؟

اللہ تعالیٰ کا صاف اعلان ہے:

وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آلِ عمران۔۹۷)

ترجمہ: اور جو اس کے حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو خدا بھی اہلِ عالم سے بے نیاز ہے۔

اب آیئے ان تمام نفسیاتی امراض کی تفصیل ذہن نشین کر لیں جن کی وجہ سے انسان سعادت ایمان سے محروم قرار دے دیا جاتا ہے۔

(۱) تکبر و گھمنڈ

اللہ تعالیٰ متکبر انسانوں کے دلوں کو اپنی آیات دیکھنے کی قوت سے محروم کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِىَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ج وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ج وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ (الاعراف: ۱۴۶)

ترجمہ: جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔ اگر یہ سب نشانیاں بھی

دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر راستی کا رستہ دیکھیں تو اسے (اپنا) رستہ نہ بنائیں۔ اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے رستہ بنالیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غفلت کرتے رہے۔

آج بھی لوگ اچھائیوں کی طرف آنے سے گریزاں اور برائی کے سے تیدائی ہیں مقامِ غور ہے!

(۲) جھوٹ اور ظلم

ہم جھوٹ اور ظلم کے ہاتھوں خود ہی اپنی ذات کے قاتل بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ○ (الصف:۷)

ترجمہ: اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ○ (الزمر:۳)

ترجمہ: بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا، ناشکرا ہے ہدایت نہیں دیتا۔

(۳) اپنے کئے ہوئے عہد کو توڑ کر زمین میں فساد برپا کر کے باہمی رضامندی سے طے شدہ عہد و پیمان کی دستاویزوں کی دھجیاں اڑا کر ہم اپنے قتل کا خود ارتکاب کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَ مَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ○ۙ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ ۠ وَ یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ (البقرہ ۲۶۔۲۷)

ترجمہ: اور گمراہ بھی کرتا ہے تو نافرمانوں ہی کو۔ جو خدا کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کو جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو قطع کئے ڈالتے ہیں اور زمین میں خرابی کرتے ہیں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

(۴) اپنی غفلت کے ہاتھوں ہم اپنے قاتل آپ۔۔۔ غرض قرآن حکیم کی بے گنت آیات ہماری عقل اور بہت سی آیات ہمارے تدبر و تفکر کو دعوت عمل دیتی ہیں۔ ان کی تکرار اہمیت کی نشان دہی کرتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (الرعد:۳)

ترجمہ: غور کرنے والوں کے لئے ان میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○ (الرعد:۴)

ترجمہ: اور اس میں سمجھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

ایک اور اصول یاد رکھیے کہ آیات الہیہ کے اسرار دل پر اس وقت تک منکشف نہیں ہوتے جب تک آپ کے فکر میں یکسوئی کے ساتھ ذکر نہ ہو۔ اللہ تبارک تعالیٰ اس اصول کی وضاحت ان آیات میں فرماتے ہیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ○ ۚۙ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (آل عمران: ۱۹۰۔۱۹۱)

ترجمہ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔

یاد رکھیے ہماری غفلت ہی ہمیں اللہ سے دور کر دیتی ہے اور اس بیماری کا دوسرا نام ہے لہو و لعب بلکہ یوں کہیے زندگی اور دنیا کی باتیں محبت کا دوسرا نام لہو و لعب ہے۔

إِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ط (محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم):۳۶)

ترجمہ: دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور تماشا ہے۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝ ج مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ لا لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ط (الانبیاء ۱۔۳)

ترجمہ لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آ پہنچا ہے اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں۔ ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہمارے اپنے مسلسل جرم ہی ہمارے قاتل ہیں۔ ارشاد ہے

كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (المطففین:۱۴)

ترجمہ: دیکھو یہ جو (اعمال بد) کرتے ہیں۔ ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لا لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (الحجر: ۱۲:۱۳)

ترجمہ اسی طرح ہم اس (تکذیب و ضلال) کو گنہگاروں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں سو وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور پہلوں کے روش بھی یہی رہی ہے۔

سچائی کی روشن دلیلوں کو سن کر دیکھ کر بھی انہیں تسلیم نہ کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔

وَ نُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ ع (الانعام:۱۱۰)

ترجمہ۔ اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے (تو) جیسے یہ اس (قرآن) پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے (ویسے پھر نہ لائیں گے) اور ان کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں بہکتے رہیں۔

یقین جانیے اللہ تعالیٰ کی آیات تمام اطراف سے اپنی پوری تابانیوں سے آپ کے دل کو منور کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن برائی پسند دل، شیطان دوست دل اپنے آپ ہی رحمٰن الرحیم اللہ کی ہدایت کا اہل ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے گہرے بادل سورج کی شعاعوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ آنکھوں کی بیماری ناخنہ دیکھنے سے معذور کر دیتی ہے، کانوں کی خرابی سننے سے محروم کر دیتی ہے۔ اسی طرح کثرت گناہ دل کا حال کر دیتی ہے۔ اب آپ ہی بتایے آپ کے منہ کا ذائقہ خراب ہونے کے سبب فرات کا پانی کڑوا لگے تو اس میں فرات کا کیا قصور؟ اللہ تعالیٰ اس بیماری کی نشاندہی یوں فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ج وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ج سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لا لَمْ يَاْتُوْكَ ط يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ج يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ط وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ط لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ صلے وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (المائدہ ۴۱)

ترجمہ: اے پیغمبر جو لوگ کفر میں جلدی کرتے ہیں (کچھ تو) ان میں [illegible] جو منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں لیکن ان کے دل مومن نہیں ہیں اور (کچھ) ان میں سے جو یہودی [illegible] کی وجہ سے غمناک نہ ہونا یہ غلط باتیں بنانے کے لئے جاسوسی کرتے پھرتے ہیں اور ایسے لوگوں ([illegible]) کے لئے جاسوس بنے ہیں جو ابھی تمہارے پاس نہیں آئے (صحیح) باتوں کو ان کے مقامات (میں ثابت [illegible]) بعد بدل دیتے ہیں اور (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ اگر تم کو یہی (حکم) ملے تو اسے قبول کر لینا اور [illegible] (اس سے) احتراز کرنا اور اگر کسی کو خدا گمراہ کرنا چاہے تو اس کے لئے تم کچھ بھی خدا سے (ہدایت کا اختیار) نہیں رکھتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے پاک کرنا نہیں چاہا۔ ان کے لئے دنیا میں بھی ذلت ہے [illegible] آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ خرابی انسان کے اپنے ہی اندر چھپی ہوتی ہے۔

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ط (الصف ۵)

ترجمہ تو جب ان لوگوں نے کج روی کی خدا نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ○ ع (الانعام ۵۵)

ترجمہ اور اسی طرح ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں (تاکہ تم لوگ ان پر عمل کرو) اور اس لئے کہ گنہگاروں کا رستہ ظاہر ہو جائے۔

آیاتِ الٰہی کے تین مرکز

(۱) کائنات، (۲) قرآن عزیز، (۳) معجزات و کرامات۔ قرآن حکیم نے بھی انہی تینوں کو آیات الٰہیہ کی راہنمائی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اب آیئے ان تینوں کا الگ الگ جائزہ لیں۔ سب سے پہلے کائنات کے بارے میں اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ○ لا وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (الذاریات: ۲۰۔۲۱)

ترجمہ: اور یقین کرنے والوں کے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (یوسف: ۱۰۵)

ترجمہ: اور آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ گزرتے ہیں اور ان سے اعراض کرتے ہیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ج صلے نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ○ لا وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ط

ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ۭ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ (یٰسٓ ۳۷۔۳۹)

ترجمہ اور ایک نشانی ان کے لئے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو اس وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ (خدائے) غالب (اور) دانا کا (مقرر کیا ہوا) اندازہ ہے۔ اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ (گھٹتے گھٹتے) کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ۝ (الروم ۲۲۔۲۳)

ترجمہ اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا۔ اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جداجدا ہونا۔ اہل دانش کے لئے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے تمہارا رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل کا تلاش کرنا جو لوگ سنتے ہیں ان کے لئے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے

وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۝ اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ۭ (العنکبوت ۵۰۔۵۱)

ترجمہ: اور (کافر) کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوئیں کہہ دو کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔ اور میں تو کھلم کھلا ہدایت کرنے والا ہوں۔ کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

اور سنیے ارشاد ہے:

بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ (العنکبوت ۴۹)

ترجمہ: بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں (محفوظ)

وَ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَ فِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ (آل عمران: ۱۰۱)

ترجمہ: اور تم کیونکر کفر کرو گے جب کہ تم کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تم میں اس کے پیغمبر موجود ہیں۔

معجزات کے حوالے سے سنیے!

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝وَ اِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَ یَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ (القمر: ۱۔۲)

ترجمہ: قیامت قریب آ پہنچی اور چاند شق ہو گیا اور اگر کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے۔

وَ یٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً (ھود:۶۴)

ترجمہ: اور (یہ بھی کہا کہ) اے قوم! یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی (یعنی معجزہ) ہے۔

وَ رَسُوْلاً اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ۙ۬ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ۝ (آل عمران ۴۹)

ترجمہ: اور (عیسیٰ) بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر (ہو کر جائیں گے اور کہیں گے) کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں وہ یہ کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بشکل پرند بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے (سچ مچ) جانور ہو جاتا ہے۔ اور اندھے اور ابرص کو تندرست کر دیتا ہوں۔ اور خدا کے حکم سے مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اور جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو سب تک تم کو بتا دیتا ہوں اگر تم صاحب ایمان ہو تو ان باتوں میں تمہارے لئے (قدرت خدا کی) نشانی ہے۔

قرآن حکیم کا اعلان ہے کہ ذرا کائنات کے ظاہر نقش و نگار پر غور تو کرو تمہیں اس میں ایک نہیں بے گنت دلیلیں ملیں گی۔

خود قرآن مجید اس بات کی دعوت دیتا ہے ذرا تفکر سے کام لو تو تمہیں مجھ میں ایک نہیں لاتعداد دلیلیں ملیں گی۔ تاریخی معجزات کہہ رہے ہیں، ذرا آنکھ کھول کر ہم میں جھانکو تو تمہیں ایک نہیں بلکہ بے شمار دلیلیں ملیں گی اور یہ دلیل کائنات کے حوالے سے ہو یا قرآن مجید کے حوالے سے تاریخی معجزات کی روشنی میں ہو یا باطنی اشاروں کی زبان میں ہر ایک سے یہ ثابت ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ ہر ایک دلیل آپ کو اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کی نشاندہی کرے گی اور حقیقت یہ ہے اللہ تعالیٰ نے لوگوں پہ اپنی حجت تمام کر دی ہے تاکہ قیامت کے دن کوئی یہ نہ کہے کہ ہم تک تیری بات پہنچی نہیں تھی۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ (النساء ۱۶۵)

ترجمہ: (سب) پیغمبروں کو (خدا نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر بھیجا تھا) تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو خدا پر الزام کا موقع نہ رہے۔

دوسری جگہ فرمایا

قَالُوْٓا اَوَ لَمْ تَكُ تَاْتِیْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰی ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۝ؑ (المومن:۵۰)

ترجمہ: اور کہیں کہ تمہارے پاس تمہارے پیغمبر نشانیاں لے کر نہیں آئے تھے۔ وہ کہیں گے کیوں نہیں۔ تو وہ کہیں گے کہ تم ہی دعا کرو۔ اور کافروں کی دعا (اس روز) بیکار ہو گی۔

اس دور الحاد میں ہماری کوشش بھی اس حجت کو علم، عقل اور استدلال کے ساتھ قائم کرنا ہے۔ ہم اپنی پوری کوشش کریں گے کہ کائنات، قرآن اور معجزات میں موجود۔۔۔۔ نشانیاں اس بات کا اٹل ثبوت ہیں کہ اللہ جل شانہٗ کی ذات اپنے جمال و جلال اور کمال کے ساتھ قدیم ہے۔ اول ہے حی القیوم ہے۔

لیکن اب ہم آپ کا رخ ان معروضات کی طرف موڑتے ہیں جن میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ کائنات کے باطنی اسرار تو ایک طرف ظاہری آثار ہی بزبان حال پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم ایک عظیم خالق کی عظیم مخلوق ہیں۔

کائنات کے خد و خال کا ظہور
کب؟ کیسے؟ مخلوق یا لاوارث

یہی تین سوال ہیں جو کائنات کے بارے میں انسان کے دماغ میں ہمیشہ ابھرتے رہے ہیں۔ ہمارے علم، عقل اور وجدان کے مطابق سے ہمیشہ یہی جواب ملتا رہا کہ اس کائنات کا ہر نقش و نگار اور اس میں پوشیدہ حکمت پُرکار نہ صرف اللہ جل شانہ کے خالق و صناع ہونے کی دلیل ہے بلکہ اس کی مطیع مخلوق ہونے کا بیّن ثبوت بھی ہے۔ قدیم سے قدیم دور میں بھی علماء نے یہی بات کہی ہے۔ مگر ان کا اسلوب بیان آج کے لوگوں کے لئے پیچیدہ اور مشکل نظر آتا ہے یا ان میں سے اکثر نے اس مسئلہ کو سطحی نگاہ سے ہی پیش کرنے پر قناعت کی ہے۔

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

جدید علم (Science) جو آج تمام علوم کے سرفہرست ہے۔ اس کی حیرت ناک دریافتیں (Discoveries)اور انکشافات (Revelations) ان سوالوں کا جواب مختلف سمتوں سے لے کر ابھرے اس علم کے ایک شعبہ کا جواب ہی نہیں بلکہ دعویٰ ہے کہ کائنات حرکت حرارت کا تانا بانا ہے۔ کائنات الیکٹران (Electron)اور نیوٹران (Neutron) کے حیرت ناک پھیلے ہوئے جال کا نام ہے۔ تو دوسرے کا کہنا ہے کہ شمسی توانائی ہی اس کائنات کے جسم و جان کی مالک ہے۔ غرض دور جدید کے بعض ماہرین سائنس کی کائنات کے بارے میں جو بھی تحقیق و تشریح ہو اسکے منوانے کے لئے وہ اپنے مشاہدات اور دلائل پیش کرنے میں ایک دوسرے سے چاہے کتنا بھی اختلاف رکھتے ہوں ایک بات میں بنیادی طور پر وہ ایک دوسرے سے نہ صرف مکمل اتفاق رکھتے ہیں بلکہ دوسروں کو اسے منوانے کے لئے اپنی تمام علمی اور فکری کاوشوں کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کائنات لاوارث ہے۔ اس کا کوئی مالک و خالق نہیں ہے۔

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر؟

لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ان کے اپنے موقف کے اثبات میں پیش کی گئی دلیلوں سے جو انہوں نے اللہ جل شانہ کی نفی میں استعمال کی ہیں۔ انہیں سے "اللہ جل شانہ" کا ثبوت فراہم کریں بالکل اسی طرح جس طرح ہر زمانے میں عرفانِ ربانی کے علم سے آگاہ علمائے کرام نے عقلی، فطری اور قطعی دلیلوں کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کائنات ازلی نہیں حادث ہے یہ لاوارث نہیں مخلوق ہے۔ اس کا خالق و مالک اللہ رب السموات والارض ہے۔ چنانچہ ماہرینِ سائنس کے خیالات کو یکے بعد دیگرے آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ ان کے الحاد یا

لاادریت میں کتنی معقولیت ہے۔ اس پر آپ کو فکر کی دعوت دی جائے گی۔ کائنات کی توجیہات بیان کرنے والے ایک گروہ کا نظریہ ہے۔

قوانین حرات حرکیہ

مشہور ماہر فلسفہ و فزکس (Physics) پروفیسر لی کانٹ اپنی کتاب [illegible] (Destination of Man) میں لکھتا ہے ہماری سب سے عظیم کامیابی جسے ہم کائنات شناسی [illegible] نہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ حرکیات حرارت کے قانون ثانی (Law of Thermodynamic) تھرمودائنامک [illegible] ہے۔

اس قانون کی رو سے کائنات کے ظہور کے وقت بے جان مادہ [illegible] صورت میں فضائے بسیط میں یکساں پھیلا ہوا تھا۔ گویا انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا۔ [illegible] جری ہوئی تھی۔ اس میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ ریاضی کے نقطہ نگاہ سے یہ توازن ایسا تھا [illegible] ذرا سے خلل ڈال دیا جائے تو یہ قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مادے کے اس بادل میں خفیف سے خلل [illegible] پرسکون دنیا میں بے پناہ اضطراب پیدا کر کے ایک لاانتہائی سلسلہ پیدا کر دیا۔ رفتہ رفتہ گردش کی تیزی [illegible] خط استوا کے قریب مادہ باہر نکلنے لگا اور ٹوٹ ٹوٹ کر ستاروں کی صورت اختیار کرنے لگا، ہر ستارہ نے اپنی زندگی [illegible] کر لی۔

کائنات کی یہ توجیہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی ہے اس پر غور کرنے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے اگر کائنات میں ان مادی ذرات کے غبار کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا تو پھر یہ حیرت [illegible] کائنات کن اسباب کی بنا پر مسلسل حرکات کا ثمر بنی؟ اور پھر مادے میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض حرکت ہی نہ رہے بلکہ ایک سوچی سمجھی ارتقائی حرکت بن جائے۔ خود اپنا توازن کھونے والی حرکت ایسا متوازن اور مربوط سلسلہ کائنات کا تانا بانا بننا شروع کر دے۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنی طرف سے مزید بات چیت کریں ہم آپ کی خدمت میں ایک مشہور امریکی عالم ایڈورڈ لوتھر کیسل (Edward Luther Kessel) کی کتاب "The Evidence of God" "اللہ کی ذات کا ثبوت" میں سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ لکھتا ہے "اسی قانون ثانی کی تفصیل کی پوری اساس اس نظریہ پہ ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز رکھتی ہے جسے ہم وقت خاص میں تخلیق "Creation at a Time" کہہ سکتے ہیں اور جس کی ابتدا ثابت ہو وہ خود بخود شروع نہیں ہو سکتی اس کے لئے یقیناً ایک محرک اول، ایک خدا کی محتاج ہے۔

اب ایک اور ماہرین سائنس کا گروہ اس کائنات کے بارہ میں ان الفاظ میں انکشاف کرتا ہے۔

"یہ کائنات آپ ہی آپ پیدا ہو گئی"۔

اور دوسرا گروہ اس کائنات کو ازلی قرار تو دیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ازلی ہونے کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ جن کا کہنا یہ ہے کہ کائنات خود بخود پیدا ہوئی ہے۔ ان کے اس نظریہ کی تردید حرارت حرکیات کے قانون ثانی Law of Thermodynamic میں واضح الفاظ میں موجود ہے اور اپنے تمام دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کائنات ازلی نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ قانون جسے ضابطہ ناکارگی "Law of Entropy" کہا جاتا ہے۔ اس سے

ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہ تھی۔ ضابطہ کارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل با حرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ مگر اس چکر کا الٹا نہیں چلایا جا سکتا کہ یہ حرارت خودبخود کم حرارت کے وجود سے زیادہ حرارت کے جسم میں منتقل ہو جائے۔ اس کا مقصد یہ ہوا کہ کائنات ناکارگی اور دستیاب توانائی "Available Energy" اور غیر دستیاب توانائی (Unavailable Energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے اور ایک وقت آئے گا جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی دستیاب نہیں ہو گی۔ جسکے نتیجہ میں کیمیاوی اور طبعی عمل جس کی وجہ سے زندگی کے ہنگاموں کا عمل جاری ہے ختم ہو جائے گا۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اگر کائنات ازل سے موجود ہوتی تو اخراج حرارت کا سلسلہ کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی نظر نہ آتی۔

اب آپ ہی غور فرمائیے کہ سائنس دانوں کی اپنی ہی دلیلیں غیرارادی طور پر خالق کائنات کی ذات کو کالعدم قرار دینے کی کوشش میں کس طرح ذاتِ برحق کی تصدیق کرتی ہوئی نظر آتی ہیں یا نہیں؟

ایک اور ماہر طبعیات "Physics" اور بائیولوجی "Biology" فرانک آلان (Frank Alan) نے بھی قانون ثانی کے دلائل کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے "تھوڑی دیر کے لئے ہم نے مانا کہ یہ مادی کائنات خالق کی محتاج ہی نہیں تو پھر اس کے ساتھ ہی متعدد ذہن میں دوسرا سوال ابھرتا ہے کہ پھر اس کا وجود اور نمو کیسے ہوئی؟ اس سوال کے ذہن میں آتے ہی اس کے ممکنہ احتمالات یا صورتوں پہ غور کریں تو چار صورتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ کائنات صرف وہم و گمان ہے اور اس کے وسیع تر پھیلاؤ کا نام ماحول اور وجود کائنات ہے۔ دوسری صورت یہ کہ کائنات آپ ہی آپ عدم سے وجود میں آ گئی۔ تیسری صورت یہ کہ کائنات ہمیشہ سے تھی اس کی ابتدا یا نشوونما پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔

اب ہم ان مفروضات پر علی الترتیب غور کرتے ہیں۔ علمی اور عقلی میزان پہ تولتے ہیں پھر جو رائے قائم ہو گی وہ درست ہو گی۔

اس کائنات کا بالفعل کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف ہمارے ذہن پہ چھائی ہوئی صورت ہے۔ ہم سب وہم کے خول میں جی رہے ہیں۔ یہ ماننے کے بعد کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔

بقول غالب:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دوسری متصورہ صورت یہ ہے کہ یہ کائنات مادہ ہے اور مادہ میں ایک قوت "Energy" موجود ہے۔ اور یہی قوت "Energy" اس کی پیدائش کا بنیادی سبب بنی۔ اس نظریہ کو پیش کرنے والوں کے پاس عقل و دانش کو منوانے والی کوئی دلیل نہیں اس لئے مزید بحث بے سود!

تیسری صورت یہ ہے کہ یہ کائنات ازل سے ہے۔ اس کی ابتدا یا پیدائش ناقابل بحث ہے۔ یہ تیسری صورت ہمارے اس موقف کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے جو ہم اللہ جل شانہٗ کے بارہ میں یقین رکھتے ہیں۔ اب

تقابلی جائزہ کیجیے سائنس دان کائنات کو ازلی مانتے ہوئے اس کے محدود ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم کائنات کے خالق کو اللہ کہتے ہیں جس کی صفت ہے حی، قیوم یعنی بغیر کسی کی مدد کے زندہ ہستی بغیر کسی کی مدد کے قائم دائم ہستی۔ تھرموڈائنمک قانون اپنے قانون حرارت کی تفصیل میں یہ بھی کہتا ہے کہ اس مادی کائنات کا ہر حصہ آہستہ آہستہ حرارت سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور حرارت کی آہستہ آہستہ کمی ایسے آخری نقطہ برودت کو پہنچ کر پوری کائنات کو زندگی سے محروم کر دے گی، سورج کی کرنیں مستعار ہیں۔ ستاروں کی چمک اور زمین میں بے گنت زندگی بخش خزانے سب کے سب اپنی معینہ مدت حیات کا اظہار کرتے ہوئے ختم ہو رہے ہیں جس کی انتہا ہے اس کی ابتدا بھی ہے اور اگر کائنات کی ابتدا ہے تو اس کی ابتدا کا کرنے والا بھی ایک ذات ہے جو علیم ہے، جس کی قدرت کی گرفت میں ہر موجود ہے۔

الیکٹران کا قانون حرارت

اس نظریہ کائنات کی عمارت تعمیر کرنے والوں کی دلیلیں بھی سن لیجئے۔ ان کا کہنا ہے برق پارے یعنی ذرات کے آپس میں ملنے سے کائنات کا وجود بنتا ہے۔ ان ذرات (Atom) کے اجزائے ترکیبی برقی سالبات اور موجبات پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ مثبت برق پاروں کو پروٹان (Proton) کہا جاتا ہے۔

انہی منفی برق پاروں کو الیکٹران (Electron) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض ذرات (Atoms) ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان پر محافظ نگہبان کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کو نیوٹران (Neutron) کہا جاتا ہے نیوٹران اور پروٹان ایٹم کے نیوکلیس حصہ میں محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ برق پارے جو روشنی کے موہوم نقطہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے یہ برق پارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان ایک طویل خلائی حجم ہوتا ہے۔ یہ سب اپنے مرکز کے اردگرد اس طرح گردش کرتے ہیں جیسے زمین اپنے مدار کے اردگرد گردش کرتی ہے۔ مگر ان کی گردش اتنی تیز ہوتی ہے کہ الیکٹران کا کسی ایک جگہ تصور ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورے مدار پر ایک ہی وقت میں ہر جگہ موجود ہے۔ یہی حرکت ایک کے بعد دوسرے برق پاروں کو مسلسل حرکت کا سبب بنی اور پھر ذرات ایک دوسرے سے ملتے ہوئے مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر اجرام سماوی کی صورت اختیار کر گئے۔ انہیں میں سے ایک ہماری زمین ہے جو بیضوی صورت کے کرہ کی صورت نمودار ہوئی۔

ذرات (Atoms) کے عمل کی مختصر روداد جاننے کے بعد چند حقیقتیں ذہن میں سوال بن کر ابھرتی ہیں:

(۱) یہ کہ الیکٹران ہر ایٹم کے خارجی ہالے میں موجود ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے یا ایک دائرے میں دائمی گردش نہ ہوتی؟

(۲) الیکٹران کا موجودہ عمل جو ہمیں معلوم ہوا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ ابتدا ہی سے اسی حالت میں گردش میں تھا۔ اور اگر ہم اس کی متحرک حالت کو آغاز سے ہی ثابت نہیں کر سکتے تو پھر اس کا ابتدائی دورانیہ کسی حرکت دینے والے کا محتاج ہونا لازمی امر ہو گا جو اس سلگتے ہوئے مادہ کو بھڑکا کر چھوٹی سی دنیا سے قابل حیرت وسیع کائنات میں بدل دے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم پھر اسی فیصلہ پہ لامحالہ پہنچتے ہیں کہ اس تمام کائناتی عمل میں متحرک عوامل اجرام ہوں یا الیکٹران۔ ان کے عمل کو دائرہ کی صورت میں گردش کرنے کی تہذیب سکھانے والا کوئی ہے اور وہ

وہی قدرت و ذات ہے جس نے ذرات اور اجسام کو یہ صفات دی ہیں وہی اس کا خالق و مالک ہے۔

شمسی توانائی

اس سے پہلے کہ ہم سائنس دانوں کے کائنات کی تخلیق میں شمسی توانائی کے عمل و دخل کا جائزہ لیں۔ ہمیں لفظ "ازلی" کے معنی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئیں۔ اور وہ یوں ہے کہ ہم (1) لکھتے ہیں تو ایک سے پہلے کیا ہے۔ صفر۔۔۔ صرف ایک صفر نہیں بلکہ سوال کرنے والا جب بھی سوال کرے گا اس سے پہلے کیا؟ تو جواب یہی ہو گا صفر۔ اسی صورت میں اور وقت کو بھی ابتدا اور انتہا کے حوالے سے سوچیں گے جواب ایسا ہی ہو گا۔ چنانچہ ۔۔۔ اسی جواب میں جو آپ بھی تصور کر سکتے ہیں اسی کو ہم ازل کہیں گے۔ وہ لوگ جن کا کہنا ہے کہ مادہ ہی ابتدا ہے، ان کے ذہن میں ازل کے معنی یہی ہیں اور یہ وہی نظریہ ہے جو مادہ کی نظر آنے والی مختلف حالتوں کو جس طرح دیکھتا ہے اسی طرح اس کے بارہ میں بات کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سورج کو توانائی بخشنے والی قوت کون ہے۔ اور پھر اس کے اندر موجود حرارت کو تحفظ دینے والی کون سی ذات ہے اور جیسے کہا جاتا ہے کہ سورج کائنات کے تمام سیاروں کی اعانت کرتا ہے اور یہ بھی کہ ستارے اصل میں اسی کائنات کے بذات خود سورج ہیں۔ مگر ان کی دوری یا نزدیکی کے تناسب سے ہمیں وہ چھوٹے نظر آتے ہیں۔

یہاں پھر وہی سوال کیا یہ ایک سورج یا بہت سے سورج اپنے اپنے مقام پر اس وقت جس حالت میں ہیں کیا ان کی یہ حالت دائمی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر کون ہے جو ان کی شعاعوں کو حرارت کی توانائی بخشتا ہے۔ اگر جواب یہ ہو کہ ان میں بذات خود یہ موجود ہے تو پھر ان تمام سورجوں میں توانائی کی موجودگی کے اسباب کیا ہیں؟ یہی وہ سوال ہے جس کا تسلی بخش جواب اب تک کوئی نہیں دے سکا اور اگر کوئی غیر تسلی بخش جواب ہے تو وہ یہ کہ اس سورج کے ذرات اس کے رقبہ میں ہر لحظہ بھڑکتے رہتے ہیں۔ اور یہی آگ اس طاقت کو ہر لحظہ پیدا کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ برق پارے جو بھڑک کر ٹوٹتے ہیں۔ پھر اپنے محافظ نیوکلیس سے الگ ہو کر خود فنا ہو جاتے ہیں تو ایسی صورت میں وہ اپنے آپ کو طاقت کا ایک حصہ کیسے بنا سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا خالق کون ہے؟

انسان کے ذہن میں یہ سوال اکثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا خالق کون ہے؟ اس کے جواب میں ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ بھی خالق ہے اور کائنات بھی خالق ہے۔ اس لئے کہ جو خود مخلوق ہو وہ خالق نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر اشرف المخلوقات انسان تمام امکانی اختیارات اور استطاعت کے حاصل ہونے کے باوجود کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتا۔ یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ مخلوق یعنی پیدا شدہ اشیاء کو استعمال میں لا کر ان کی مدد سے کوئی مشین کوئی چیز ایجاد کر سکے لیکن یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اسے پیدا کرنے کے قابل ہو جس کا وجود ہی نہیں ہے۔

ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ اس سوال کا جواب یوں دیا کرتے تھے۔ فرض کیجئے ہم نے اپنی کتاب مکتب کے

ایک کمرہ میں رکھی اور خود کمرہ سے باہر نکل گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہم جب واپس آئے تو دیکھا کمرہ میں رکھی ہوئی کتاب میز کے خانہ (Drawer) میں ہے لہذا یہ بات حتمی طور پر ماننے پڑے گی کہ اس کمرہ میں کوئی دوسرا شخص تھا یا آیا جس نے اسے میز کے خانہ "Drawer" میں رکھ دیا ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کتاب میں بذات، خود یہ قدرت نہیں کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جائے فرض کیجئے ہم ایک شخص کو کمرہ چھوڑ کر جاتے وقت کرسی پہ بیٹھا ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد واپس آ کر ہم اسے فرش پہ بیٹھا ہوا دیکھیں تو ہمارے دماغ میں یہ خیال کبھی نہیں آئے گا کہ اس شخص کو کرسی سے فرش پہ بٹھانے کے لئے کسی دوسرے شخص کی موجودگی یا عمل ضروری ہے۔ ان نقاط کو ذہن نشین کرنے کے بعد میری بات کو بگوش ہوش سنئے!

جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کاملہ سے اس بات کو منواتے ہیں کہ انہیں کسی کے احتیاج کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی ذات قائم بالذات حیٔ بالذات، انسانی عقل ان دونوں نقاط کو مدنظر رکھے تو گمراہی کی ہلاکت سے بچ سکتا ہے۔

بعض علمائے توحید نے ایسا سوال کرنے والوں جنہوں نے ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا تو ان کی عقل کے مطابق ان کو جواب دیا۔ کسی اور نے' پھر انہوں نے پوچھا کہ اس کو کس نے پیدا کیا؟ کسی دوسرے نے۔ چنانچہ جب یہی جواب اور سوال یوں ہی چلتا رہا جہاں سوال کرنے اور جواب دینے والے کی سکت نہ رہی تو وہ اس انتہا کو پہنچ جائیں گے جہاں اس کی ذات کا نہ ہی آغاز اور نہ ہی اس کے خالق کا نام و نشان بلکہ اللہ تعالیٰ کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ مختار کل ذات جس کی ابتدا بھی نہیں اور جس کا کوئی خالق بھی نہیں وہی اول وہی آخر اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی مخلوق اپنے خالق کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اسی کائنات میں انسان ہی وہ عظیم المرتبہ مخلوق ہے جو روبوٹ، کمپیوٹر غرض حیرت سے بھرپور ایجاد کر سکتا ہے۔ اس کو اپنی ایجادات کا پورا علم ہوتا ہے۔ اس کے طریقِ کار، اسکے فائدے، اس کے نقصان سے پوری واقفیت تو ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ایجادات کو اپنے موجد انسان کے بارہ میں شعور ہونا ناممکن ہے۔ اول تو اس قسم کا سوال کرنے والے سے اعراض ہی بہتر ہے۔ ہمارے نزدیک ایسا شخص وہم کے مرض میں مبتلا ہے۔ ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ اس کے وہم کو اسی طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح کسی صانع کی مصنوعات اپنے صانع کی خالق نہیں ہو سکتیں اسی طرح اللہ تعالیٰ خالق و صناع ہے اور ہر موجود جو بھی کائنات میں جس صورت میں بھی ہے۔ اس کی مخلوق ہے۔ اسے اس کائنات میں اس کی صناعی میں سے مختلف مخلوقات کی مثالیں دیجئے۔ مثلاً انسان اپنی خوشی سے چل سکتا ہے۔ انسان ارادہ کا مالک ہے۔ علم حاصل کر سکتا ہے، ادراک اور تفکر کا مالک ہے، کھا سکتا ہے، پی سکتا ہے، سو سکتا ہے، بھوک کو محسوس کر سکتا ہے۔ گویا یہ اپنی خصوصیات کے سبب سے مخلوق سے الگ پہچانا جانا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری مخلوقات بھی اپنی صفات سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح ذات مطلق اللہ تعالیٰ بھی اپنی صفات سے پہچانے اور جانے جا سکتے ہیں۔

عام طور پہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارہ میں ایسے سوال کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ پہ ایمان لانا نصیب نہیں ہوتا ہے۔ ان کا جواب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ ہم اور آپ اس بات پہ متفق ہیں

کوئی شے ہے۔ جو قدیم ہے، اس کی کوئی ابتدا نہیں، اس کا کوئی خالق نہیں۔ آپ اس قدیم شے کو مادہ کہتے ہیں۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ قدیم ہستی اللہ جل شانہٗ ہے۔ لہٰذا جب ہم علم سے ثابت کر لیں کہ مادہ اپنی تمام صفات کے تجزیہ سے قدیم ثابت نہیں ہوتا تو اس کے بعد خود بخود ایک ہی ذات کا وجود قدیم اور خالق ثابت ہوتا ہے۔ وہ ہے اللہ جل شانہٗ! چنانچہ سابقہ صفحات میں ہم نے مختلف علوم کے مختلف علماء نے کائنات اور مادہ کے بارہ میں جو کچھ بھی معلومات ہمیں دی ہیں انہیں [illegible] یوں کے مفہوم کی روشنی میں اس کائنات کے ہر جز کا روبزوال ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس زوال اور فنا کی رفتار میں اختلاف ضرور ہے۔ کسی کے خیال میں مادہ، انرجی، ایٹم، غرض ہر مفروضہ کا سبب اس عمل میں تیز تر ہے اور [illegible] خیال میں یہ عمل یا فنا کی طرف سفر سستی کا شکار ہے۔

علم کیمیا کے بعض ماہرین [illegible] نظریہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مادہ کا ظہور نہ ہی کسی تدریجی عمل کا نتیجہ ہے نہ ہی [illegible] ایک اچانک حادثہ اس کا مظہر ہے گویا بہت ہی قدیم سہی مگر اس کی ابتدا کو تسلیم کرتے ہوئے یہ [illegible] اس کا سفر کسی مقرر شدہ نہایت کی طرف ضرور ہے۔

ماہر فلکیات "امیر [illegible]" [illegible] ہیں اجرام سماوی کے مطالعہ سے اسی کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس کائنات کی ابتدا انتہائی قدیم ہے [illegible] اس بات سے بھی شواہد موجود ہیں کہ یہ اپنی کسی انتہا کی طرف زوال پذیر ہے۔ بہر نوع مختلف علوم کے ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کائنات ازلی نہیں اس کی انتہا کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر اس کی بنیاد "تغیر" قرار دیتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ماننے سے بچ کر نکلتے ہوئے ایسی تعبیر کر جاتے ہیں جس میں معقولیت سے زیادہ ان کی اپنی علمی انا ان کو اس کفر پہ مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے والے قوانین کائنات کی روشنی میں اپنی تندرست عقل کے ساتھ ان سے اتفاق رائے نہ رکھنے میں حق بجانب ہیں۔ اللہ جل شانہٗ ان سے سوال فرماتے ہیں۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ○ ط اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج (الطور: ۳۵-۳۶)

ترجمہ: کیا یہ کسی کے پیدا کئے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں۔ یا یہ خود (اپنے تئیں) پیدا کرنے والے ہیں۔ یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔

یہ اس ہستی کے سوالات ان دانشوروں سے کئے گئے جنہوں نے قوانین فطرت یا مادہ ہی کو مادر پدر آزاد مان کر انبیائے اکرام کی تکذیب کی۔

اگر ہم تمام سورجوں کو ازلی مان لیں تو پھر مذکورہ عوامل سے گزارنے کے بعد ان کا اصلی حالت میں رہنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ سورج اپنی موصولہ طاقت (Energy) کو مادہ کی تحویل میں دیتے ہوئے اسکا تیسرا حصہ ضائع کر دیتا ہے۔ اسکے علاوہ ہمارا مقصود کائنات کے جزوی عوامل پر بحث نہیں بلکہ اجتماعی طور پہ اس کائنات کی حقیقت کا علم حاصل کرنا ہے۔ یہ تمام اٹل قانون جن کو سائنس کے ماہرین قانون نے مرتب کئے ہیں بلکہ ساری دریافتوں کی اساس ہی پہلے سے موجود قوانین ہیں جنہیں "Law of Nature" کہا جاتا ہے۔ وہ کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟

انہیں کس نے ترتیب دیا ہے کیا یہ سوال اتنی ہی اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت کائنات میں کارفرما قوانین کے علم کی اہمیت ہے؟

بعض سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس پوری کائنات کی اصل ہی قوت یعنی "Energy" ہے اور یہی انرجی مادہ میں تحلیل ہوئی جس سے یہ مادہ بذاتِ خود طاقت "Energy" کی صورت میں ڈھل گیا۔ بس یہیں سے فکری مغالطوں کی ابتداء ہوتی ہے سوال یہ ہے کہ طاقت اگر مادہ میں تحلیل ہو گئی تو پوری طاقت نہ رہی مادہ کہلائے گی اور مادہ اگر طاقت میں تحلیل ہو گیا تو پھر اسے کالعدم قرار دینا لازمی امر ہو گا۔ اب اگر طاقت اپنی ذات کے وجود سے قائم ہے تو پھر اسے مادہ کے احتیاج کی ضرورت نہیں رہتی۔ قدیم فلسفہ کے مطابق "Energy" اپنے اظہار کے لئے ظرف کی محتاج ہے۔ جس طرح سورج کی شعاعیں خود زمین کے اندر گرمی پہنچاتی ہیں۔ مادی اجسام گرمی جذب کرتے ہیں۔ لیکن ان ذرات میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ خود سورج کی شعاعوں سے گرمی حاصل کر سکیں۔ اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات قدیم نہیں بلکہ اس کا آغاز ہے اور اگر اس کے خالق کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کائنات کا وجود بھی نہیں مانا جائے گا جو خلاف عقل و شعور ہے۔

قدیم علمائے توحید نے کائنات کی تخلیق اور اس کی ابتدا کو اللہ جل شانہٗ کی قدرت کاملہ سے ثابت کرتے ہوئے جو صورت بیان کی ہے وہ اس طرح ہے۔

ذرا کائنات پر گہری نظر ڈالئے تو آپ کو اس میں دو اقسام نظر آئیں گی۔ ایک وہ قسم ہے جو اپنی بقا کے لئے، دوسری ذات کی محتاج ہے۔ مثلاً جسم بذاتہٖ قائم رہتا ہے۔ لیکن مرض بغیر جسم کے قائم نہیں رہ سکتی۔ ذرات (Atoms) اپنی ذات میں باقی رہتے ہیں لیکن گرمی اپنی ذات میں باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح جوہر کو عرض کی ضرورت ہے۔ تو اس طرح آپ یوں کہیے کہ ذرات (Atoms) جوہر ہیں اور حرارت اس کا عرض ہے۔ جسم جوہر ہے اور صحت عرض۔ مطلب یہ کہ صحت کے لئے جسم ضروری ہے۔ اس لئے کہ عرض کہتے ہی اسے ہیں جو بذاتہٖ قائم نہ رہے۔ ثابت ہوا کہ جوہر عرض کا جزو لاینفک ہے۔ آج تک کسی جوہر کو عرض کے بغیر دریافت نہیں کیا جا سکا۔ اور ہر عرض حادث ہے۔ اندھیرا حادث ہے۔ اکثر دن سے پہلے اس کی آہستہ آہستہ نمو اس کی گواہ ہے کہ دن پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح رات ہونے سے پہلے آہستہ آہستہ اندھیرے کا ارتقائی عمل رات کے حادث ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح ذرات "Atoms" میں حرارت ہی اس کی ابتدا ہے۔ برودت زدہ اجسام کی برودات ہی ان کی ولادت کا ثبوت ہے۔ اس طرح عرض کا وجود اس کے آغاز کا محتاج ہے۔ جب عرض بغیر جوہر کے نہیں رہ سکتا اسی طرح جوہر بغیر آغاز کے ناممکن، لہٰذا یہ کائنات جوہر ہے اور اس کے تمام اعراض حادث ہیں اور ان پر ازلی ہونے کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔

ارادہ ـــــ یا اتفاق

ہمارے سامنے تین قابلِ غور مفروضے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کائنات اللہ تعالیٰ کی صناعی کا شاہکار ہے؟ دوسرا مفروضہ یہ کہ مادی ذرات اور عناصر کے اجزاء نے مقصد، ارادہ اور باہمی ربط کو زندگی دی ہے۔ مادہ کے کون سے عناصر ہیں جنہوں نے بڑے فکر، تدبر اور اتفاق کے ساتھ دنیائے رنگ و بو کو مختلف اشکال اور صورتوں سے

حسین بنا دیا؟

تیسرا مفروضہ یہ ہے۔ کیا یہ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے وہ اچانک اتفاق کا کرشمہ ہے؟ اس کائنات میں برق پاروں کے ٹکڑے باہم ملے ہوئے ذرات کسی حسنِ اتفاق کا نتیجہ ہے؟ کیا اتفاق کی کارفرمائی ہے کہ اس نے برق پاروں کو، مثبت، منفی اور معتدل خانوں میں مقید کر دیا ہے؟ کیا منفی برق پاروں (Eelectron) کو مثبت برق پاروں (Proton) کے ارد گرد گھومتے رہنے کے آداب اتفاق نے سکھائے ہیں؟ کیا ان کی ایک سے ۲۳۸ کی تعداد تک سالمات کی شکلیں محض اتفاق ہے؟ اور پھر ان برقی لمعات کا اپنے مرکز نیوکلیس کے اردگرد گردش کا سلسلہ صرف اتفاق؟ ایٹم اور نیوکلیس کے درمیانی خلا زمین کی طرح مخصوص بیضوی شکل کا ظہور صرف اتفاق؟ تمام ثوابت و سیار کا اپنا مخصوص مدار محض اتفاق؟

مختلف عناصر کا باہمی اتصال اور اس سے مختلف شکلوں اور نت نئے مرکبات برق پاروں کی مسلسل ٹوٹ پھوٹ اور بعض ذرات کی عنصروں میں حفاظت بھی اتفاق؟ عناصر کا سورجوں کے درمیان متحدہ دیر پردہ اتفاق؟ برق پاروں کی مانند تمام سورج اور ستارے اپنے اپنے مدار ہی میں چکر کاٹنا اتفاق؟ ان سورجوں کی گرمی اور ان کی شعاعوں کی ترتیب اتفاق؟ زمین کی ساخت اور فضا کا زندگی کے لئے سازگار ہونا۔ اس میں موسموں کا تغیر و تبدل، ہواؤں کا سلسلہ، پانی، پہاڑ اور اس کی پرتوں کا حجم۔۔۔ صرف اتفاق؟ اور سب سے زیادہ حیرت ناک اتفاق تو دیکھئے انسان کی پیدائش اس میں سوچ، سمجھ، ارادہ، تدبر، روح، اخلاق، تصور اور خیال کی لامتناہی قوت، علم اور ہر موجود کو تسخیر کرنے کی طاقت کیا یہ سب اتفاق ہے؟

یہی وہ تین مفروضے ہیں جو اس کائنات کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں۔چنانچہ سب سے پہلا مفروضہ بانظریہ عقیدہ تو ان لوگوں کا ہے جو مومن ہیں، دوسرا مفروضہ عالم تشکیک کا شکار ہے، تیسرا عقیدہ رکھنے والوں کا تعلق مادہ پرستوں سے ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے۔ لیکن ہمارے زیرِ غور دو عقیدوں کا تجزیہ ہے۔ ایک تو وہ جو یہ کہتا ہے کہ کائنات خود ایک شعور ہے اور اس کا پھیلاؤ سبب حرکت کے بعد ابتدا پذیر ہوا۔ اور دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ سب کچھ ایک اچانک حادثے یا اتفاق کا نتیجہ ہے۔

ہماری کوشش کا مقصد افہام و تفہیم ہے۔ ہم مخلصانہ طور پر ان نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے معقول دلائل جس کے حق میں زیادہ جائیں۔ ہمیں اس کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اور اگر عقلی اور فکری دلیلوں سے درست ثابت نہ ہو تو اسے ترک کر دینا چاہیئے۔ لہذا ہم ایک بار پھر "اتفاق" کے آئینے میں کائنات کی زندگی اور اس میں مختلف کارفرما عوامل پر غور کرتے ہیں۔

دلیل نمبر ا

یوں کیجئے! ایک سیاہ تختہ لے کر اس میں ایک سوئی پیوست کر دیجئے اس کے بعد ایک دوسری سوئی لے کر اس پہلی سوئی کے سوراخ میں داخل کر دیجئے۔ اب کسی ایسے انسان کو جو اس عمل کے وقت وہاں موجود نہ تھا۔ اسے بلوایئے تختہ اور سوئیوں کی حالت دکھا کر پوچھئے کہ تختے میں سوئی کیسے پیوست ہوئی اور پھر ایک سوئی کے بعد

دوسری سوئی پہلی سوئی کے سوراخ میں پیوست کیسے ہوئی؟ تو وہ شخص اس کا یہی جواب دے گا۔ یہ سارا عمل کسی انسان کا ہے۔ جس نے اپنے ہاتھ سے سوئی کو تختہ میں چبھویا اور پھر پہلی سوئی کے سوراخ میں دوسری سوئی کو پیوست کر دیا۔ اب ایک اور سوال ہم ایک چھوٹے بچے کو کسی کے سامنے [illegible] کرتے ہیں کہ یہ بچہ ماں کی اولاد ہے۔ بتاؤ اس کی پیدائش اتفاقاً ہے یا شادی، نکاح اور پھر وظیفہ زوجیت کا [illegible] ہے، اس کا جواب بھی یہی ہو گا کہ شادی کا منصوبہ اور اس پر عمل! ہو سکتا ہے کسی کے ذہن میں [illegible] دینے کا خیال آئے لیکن۔۔۔ عقل و شعور کے استعمال کے ساتھ ہی اتفاق کے مقابلہ میں (مقصد [illegible]) کا پلہ بھاری ہو گا۔ اگر کسی کو ہم تختۂ سیاہ میں دو سوئیوں کی بجائے دس سوئیوں کو علی الترتیب چبھو [illegible] سوئی کو دوسری سوئی سے منسلک کیا ہوا دکھائیں تو پھر بغیر کسی توقف کے "قصد اور ارادہ" کو [illegible] کا ووٹ ملے گا۔ بعض کیا بلکہ اکثر حالات، شواہد و واقعات کا مسلسل ظہور اتفاقی دھماکہ کے خلاف [illegible] دکھائی دیتا ہے۔ ایک اور مثال لیجیے۔

دلیل نمبر۲

ہم دس کاغذ کے ٹکڑوں پہ دس سوئیاں چبھو کر ہر ایک کاغذ پر ایک سے دس تک کا عدد لکھتے ہیں اور ان کو اندھے لڑکے کی جیب میں ڈال کر اسے ان کو نکالنے کے لئے کہتے ہیں۔ تو واقعہ ہی وہ بالترتیب انہیں نکال لیتا ہے۔ تو یہ یقیناً اتفاق کہلائے گا۔ لیکن جوں ہی آنکھوں سے دیکھ کر علی الترتیب انہیں جیب سے نکالیں گے تو یہ اتفاق نہیں بلکہ "قصد و ارادہ" کا کمال ہو گا۔ بالکل اسی طرح منظم مربوط، کسی عمل کو دیکھ کر اس کے پیچھے ناظم یا رابطہ کا ارادہ اتفاق کے مقابلہ میں زیادہ قابل ترجیح ہو گا یا نہیں۔ یہ آپ فیصلہ کیجیے! ہاں اتفاق کو اگر ترجیح کا مقام نصیب ہوتا ہے تو وہ ان حالات میں ہوتا ہے جب کسی واقعہ یا کسی عمل میں کسی کمی یا نقص کے سبب تصادم کا ظہور ہو!

دلیل نمبر۳

آپ ایک پریس کے مالک ہیں آپ کے پاس آدھا ملین کے قریب حروف مقطعات الگ الگ صندوقوں میں موجود ہیں۔ زلزلہ حروف کے صندوق الٹ دیتا ہے۔ حروف بکھر جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے سے مخلوط ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص آپ کو اطلاع دیتا ہے کہ ان حروف میں سے مجھے بے ربط جملوں کی صورت پر کلمات ملے ہیں۔ آپ کی عقل بلاتردد اس کو تسلیم کر لے گی۔ لیکن ایک اور اطلاع ملتی ہے کہ ان بکھرے ہوئے حروف میں سے ایک ایسے مجموعے کی صورت دستیاب ہوئے ہیں جو مربوط بامعنی کلمات سے عبارت ہیں تو یہاں کچھ ہچکچاہٹ اور اس خبر کی تصدیق کا تجسس فطری عمل ہو گا۔ آپ نے ان حروف کو واقعہ ہی اسی جامع صورت میں مرکب پایا۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور خبر آپ کو دی جاتی ہے کہ زلزلہ سے گرا کے بکھیرے اور بے ربط حروف کے باہمی اختلاط سے ۵۰۰ صفحہ کی کئی کتابیں، جن میں قصائد کا مجموعہ بھی ہے، نثر ہے تو ہر جملہ فن تحریر کا

شاہکار، شعر ہے تو اس میں بھی شاعری کے محاسن مکمل ہیں۔ تو اس خبر کے واقعہ کو آپ اتفاق کے ضمن میں کس حد تک تسلیم کریں گے۔ آپ کو اس کا جواب اپنی عقل دے گی۔ اس تحقیق و تجسس میں ایک مرحلہ یہ بھی ہوتا کہ آپ کو اپنی زندگی میں رونما ہونے والے ان واقعات کی تلاش کرنا پڑے گی جن پر اتفاق کے عمل کا اطلاق ہو سکتا ہے یا امکان ہو سکتا ہے؟

اس سوئیوں کی مثال میں جو واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں ۱۰ ملین میں سے ایک فی صد تک اتفاق کے امکان کا خیال آتا ہے۔ اور اگر اسی سوئیوں کی مثال پر حسن الترتیب اعداد کے حوالے سے بیان کی گئی مثال میں ایک ہزار ملین کے ہزار حصوں میں سے ایک فی صد تک اتفاق کا امکان ہو گا۔

اپنی معروضات کی وضاحتیں

عناصر کا یہ ترتیب، جو سب تارا بار، ستارے، سورج ایک نہیں، بہت سی خلاؤں کا سلسلہ اور زمین یوں عناصر (Element) کی تعداد ۱۰۵ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان عناصر سے میری مراد برق پارے "Atoms" ہیں۔ ان میں سے بعض کا عمل مثبت، بعض کا منفی اور بعض کا معتدل ہے۔ انگریزی میں انہیں الیکٹران "Electron"، پروٹان "Proton" اور نیوٹران "Neutron" کہتے ہیں۔

ایٹم کے گرد گردش کرنے والے الیکٹران تعداد میں اتنے ہی ہوں گے جتنے کہ مالیکیول میں پروٹان ہوں گے گویا اگر پروٹان ایک ہو تو الیکٹران بھی ایک ہی ہو گا۔ جیسے کہ ہائیڈروجن کا تناسب بھی یہی ہے۔ یہ سادہ ایٹم ہے جس کے نیوکلیس میں ایک پروٹان پایا جاتا ہے۔ تو اس کے گرد الیکٹران بھی ایک ہی چکر لگاتا ہے۔ چنانچہ پروٹان کی جتنی تعداد بڑھے گی اتنی ہی الیکٹران کی تعداد بھی بڑھے گی۔ لیکن سب سے زیادہ الیکٹران یورانیم "Uranium" میں ہوتے ہیں جن کی تعداد ۹۲ ہوتی ہے۔ اصول سے آپ واقف ہو چکے ہیں کمی اور بیشی اسی اصول کی روشنی میں طے کی جا سکتی ہے مگر ہائیڈروجن اور یورانیم میں بنیادی فرق کی وضاحت پھر ذہن نشین کر لیجئے۔ اگر یورانیم میں ۲۳۸ پروٹان ہوں گے تو الیکٹران بھی ۲۳۸ ہی ہوں گے۔

چنانچہ یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جن کی ترتیب سے کائنات کا وجود بنا۔ یہی عناصر تمام اجرام میں موجود، سورج میں موجود، ستاروں میں موجود، فضاؤں میں موجود، خلاؤں میں موجود، غرض انہیں سے مختلف اجرام بنے اور ہر ایک کا ایک مدار طے پایا۔ کسی کی رفتار میں بے پناہ تیزی، کسی کی رفتار میں سستی، مگر اپنے اپنے مدار سے کوئی نکل جائے ناممکن، سرک جائے ناممکن، آپس میں ٹکرا جائے ناممکن۔ کواکب ہوں یا ثواقب، سورج ہوں یا اجرام فلکی غرض سب کے سب ایک قانون کے پابند، ایک نظام میں تسبیح میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح سرگرم عمل۔ انہیں میں سے ایک زمین بھی ہے جس کے سینے پر ہم بستے ہیں، ہم زندہ ہیں۔ ذرا اس کے بارے میں بات ہو جائے!

زمین

سب سے پہلے زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے پوری کائنات میں ذرے کے برابر سہی لیکن اس کی اہمیت سب سے زیادہ اس لئے ہے کہ اس وسیع کائنات میں زندگی کے لئے سازگار حالات جس قدر اس میں پائے

جاتے ہیں اور کہیں نہیں پائے جاتے۔

زمین کے اوپر کی پرت اگر صرف دس فٹ ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا نام و نشان نہ ہوتا جو زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔ اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے، نتیجہ یہ ہوتا کہ زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں۔

اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہی وہ زمین کے ہر حصہ میں گرتے ہیں۔ یہ شہابیے چھ سے چالیس میل تک فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے جھلسا دیتی۔ کون ہے وہ جس نے یہ اصول قائم کیا؟

۳۔ اگر سورج کا فاصلہ جو زمین سے تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور یہ فاصلہ مسلسل قائم ہے۔ اگر یہ گھٹ جائے تو سورج کی گرمی سے کاغذ جلنے لگیں اور اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہو جائے تو زمین اتنی ٹھنڈی ہو جائے کہ زندگی سردی میں دم توڑ دے۔ کون ہے وہ جس نے یہ فاصلہ ترتیب دیا اور دوام بھی دیا؟

۴۔ اور اب چاند۔۔۔ ہماری دنیا کا حسین چاند۔۔۔ بچوں کا محبوب چندا ہر زمانے میں شاعروں کے جمالیات کا مرکز چاند۔۔۔ جس کی دوری ۲۰۰،۰۰۰ میل ہے۔ اگر اس دوری کو کم یا زیادہ کر دیا جائے تو دن میں بار بار زمین پر بادل اتنا پانی برساتے کہ تمام پہاڑ تک غرق ہو جاتے۔ اس فاصلہ کو کس نے قائم کیا ہے؟

۵۔ اگر زمین کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی۔ مثلاً اگر کرۂ ارض چاند اتنا چھوٹا ہوتا یعنی اس کا قطر موجودہ قطر کی نسبت سے ۱/۴ ہوتا۔ تو اس کی کشش ثقل زمین کی موجودہ کشش کا ۱/۶ رہ جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری دنیا پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک سکنے کی طاقت سے محروم ہو جاتی اور ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے رات کے وقت سرد اور دن کو تنور کی مانند جلنے لگتا ہے۔ اس توازن کو قائم کرنے والا کون؟

۶۔ زمین کی اوپر کی فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں تقریباً ۷۸ فی صد نائٹروجن اور ۲۱ فیصد آکسیجن ہے۔ باقی گیسز بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں۔ اس فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ مربع انچ ہے۔ موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور وہ دنیا کے تمام پانی کا ۸/۱۰ حصہ بناتا ہے یہی آکسیجن خشکی میں رہنے والے جانوروں کی زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔

سوال یہ ہے کہ انتہائی متحرک گیس آپس میں کس طرح ٹھیک انداز اور مقدار میں مہیا ہوئیں۔ اگر ان کے تناسب میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو زندگی بے نشان ہو جائے۔ مثلاً اگر آکسیجن ۲۱ فصد کی بجائے ۵۰ فیصد یا اس سے زیادہ فضا کا جز ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزیں جہنم کی طرح بھڑک اٹھیں۔ ایک درخت کو آگ لگتے ہی تمام درخت جل کر راکھ ہو جائے۔۔۔ یہ تناسب یہ انداز مقدار۔۔۔ کیوں، کیسے؟ اور کس نے قائم کیا؟

۷۔ بارش نہ ہوتی تو تمام زمین بنجر صحرا ہوتا۔ دریا، سمندر اور ابخرات کا سلسلہ نہ ہوتا۔ ہواؤں کو اپنے کندھوں پہ ابخرات لے کر اڑانا نہ آتا تو اس زمین کا کیا حشر ہوتا؟ کون ہے وہ جس نے ہواؤں کو دریاؤں اور سمندروں سے

اٹھتے ہوئے بخارات کو ادھر سے ادھر بلند و پست اڑنے کی فطرت عطا کی؟ کیا یہ سب آپ ہی آپ ہے؟

۸۔ اگر ہواؤں اور پانی کو یہ اوصاف نہ ملتے تو زمین میں پھیلنے والی بدبو ہر جاندار کو بیمار کر کے ہلاک کر دیتی۔ اگر پانی نمکین ہوتا تو انسانی زندگی ناممکن ہو جاتی۔

۹۔ طہارت اور فضاؤں کو بدبو کی آلودگی سے بچانے کے یہ اصول اگر نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟ ان اصولوں کا بانی کون؟ ان اوصاف کا دینے والا کون؟ اتفاق یا کوئی اور؟

۱۰۔ اگر زمین کے محور کا موجودہ تناسب بدل جائے، اس کا ۲۳ درجہ کا زاویہ اپنے جھکاؤ میں تبدیلی کر دے تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہے۔ سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی طرف سفر شروع کر دیں تو زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوں یا صحرائی میدان اس طرح فضائی اثرات میں اور بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہو کر زندگی کو ناممکن بنا دیں۔ اس مادہ کو آداب و قوانین کس نے سکھائے؟

۱۱۔ اگر زمین عطارد سیارے کی طرح ہوتی تو اس پر زندگی کا نقشہ ایک ہی ہوتا۔ سورج کا گزر ایک بار ہی ہوتا۔ اس وقت ہمیشہ کے لئے دن ہوتا۔ اگر سورج کے گزرنے سے یہ کرہ محفوظ ہوتا تو ہمیشہ کے لئے رات کے اندھیروں میں ڈوب کر ہر جاندار کو فنا کی گود میں سلا دیتا۔

۱۲۔ اگر قوانین جذب سے موجودات محروم ہوتے تو پھر ان ذرات اور ذرات کی جزئیات کی کارکردگی کا کیا حشر ہوتا۔ یہ سورج کس کا سورج ہوتا۔ زمین کس کائنات کی زمین ہوتی؟ اگر سورج اور زمین ہی نہ ہوتے تو پھر زندگی کہاں رہتی، کہاں بسیرا کرتی؟

۱۳۔ اسی قانون جذب کی روشنی میں اگر زمین چاند سے چھوٹی ہوتی تو ہوا کے غلاف سے محروم ہو کر درجہ حرارت کو قاتل زندگی بنا دیتی۔

۱۴۔ اگر الیکٹران نیوکلس میں داخل ہو کر پروٹان آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے اور ایٹم ـــــ دوسرے ایٹم کے درمیانی خلاؤں کو ختم کر کے ایک دوسرے سے مل جاتے تو انسان کا باقی رہنا ناممکن ہو جاتا۔ مشاہدات اسی بات کے گواہ ہیں کہ اجرام اور ایٹم کا درمیانی خلا کائنات کے توازن میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے ـــــ اس کلیدی توازن کے کل پرزے کس نے بنائے؟

۱۵۔ اگر عناصر ایک دوسرے پہ بغاوت کر کے حملہ آور ہو جائیں تو نہ مٹی کا وجود رہے، نہ پانی کا وجود، نہ درخت رہیں نہ چرند پرند۔ الیکٹران اگر ذرات کے غلاف پھاڑ دیں تو تمام ترتیب فنا ہو جائے۔ وہ اصول جن کی رو سے جتنے پروٹون ہوں اتنی ہی الیکٹران کی تعداد ہو گی ختم ہو جائے۔ اور پھر عناصر کے اتحاد باہمی کا معاہدہ ٹوٹ جائے۔ عناصر کے خارجی اور داخلی نظام میں ہلچل مچ جائے تو اس کا انجام کار کیا ہو؟ اور وہ کون ہے جس نے ان سب عناصر کو آداب و قواعد کا پابند بنا کر فضائے بسیط میں چھوڑا ہے۔

۱۶۔ قوانین حرارت میں اگر توازن نہ ہو تو زمین ایسی سرد خاصیت پیدا کرتی جو انسانی صحت کی ضامن ہو۔

۱۷۔ اگر اس زمین میں ہمارا رزق نہ ہو تو ہم کبھی زندہ نہ رہ سکتے۔

تو جناب یہ ہیں ہمارے ماحول، ہمارے اردگرد کے احوال، ان پر غور کرنے کے بعد تمام عناصر کا تانا بانا

قوانین کا پابند اور باقاعدگی سے عمل پیرا، کیا اتفاق سے ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ [illegible] ذی شعور، کسی مکمل صفات کے مالک قانون ساز کے ہاتھ نظر آتی ہے۔ کسی ایسے حکمران [illegible] پر غالب اور محیط نظر آتا ہے جس سے کوئی عنصر بال برابر بھی سرتابی نہیں کر سکتا۔۔۔ یا اتفاق کا [illegible]

یقیناً ارادہ

ہمارے علمائے قدیم نے اس ارادہ کے مالک کو اپنی [illegible] سے ثابت کر کے انسان کو فکری مغالطوں کی ہلاکت سے بچایا ہے۔ اس کائنات کا کامل نظام، [illegible] امتزاج، حیران کن ساخت اور ناقابل تردید شواہد، یہی کہتے ہیں کہ یہ ساری کائنات کسی بہت ہی [illegible] ارادہ کی جلوہ گری ہے۔ اور وہ لوگ جن کا یہ کہنا ہے کہ یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کی پیداوار ہے [illegible] تمام ذہین اور عقل مند افراد کو جمع کر کے ان ٹھوس دلائل کے مقابلہ میں "اتفاق" کے حق میں [illegible] دلائل پیش تو کریں۔ ہم سائنس کے ماہرین یا موجودہ دور کے انسان کی دریافتوں انکشافات یا [illegible] مخالف ہیں نہ ہمیں ان کی اہمیت سے انکار ہے۔ اس لئے کہ ہمیں ہمارے خالق اور کائنات کے خالق نے [illegible] حکم دیا ہے کہ ہم کائنات کے ہر مظاہر پر غور کریں، فکر کریں، تدبر کریں تو یہ بات صاف صاف سمجھ میں آجائے گی کہ اس کائنات کی تخلیق میں مکمل علم، سوچا سمجھا ارادہ، قدرت اور زندگی ہے۔ اس میں جتنی صفات [illegible] ان سب صفات کو بخشنے والی وہ ذات برتر ہے جو تمام صفات کی خود مالک ہے۔

قلم کو دیکھتے ہی انسان کے شعور میں اس سے متعلق خصوصیات ابھر [illegible]۔ اسے لکھنے کے لئے خصوصی شکل دی گئی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی سیاہی یا دوات کا تصور لازمی جز [illegible] اس کے بعد اس سے لکھنے کے لئے انسان کے ہاتھ ضروری ہیں جو اس سے لکھیں اور اپنے دماغ میں پوشیدہ افکار کو کاغذ پر حروف کو مربوط کر کے منتقل کرے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ یہ اجتماعی نتیجہ اتفاق کہلائے گا یا انسان کے علم، ارادے، قدرت زندگی اور شخصیت کی دلیل تجاہل و حالت عارفانہ میں جو چاہے کہہ لیں لیکن ایک [illegible] کی انسان کائنات کے اس پھولے ہوئے غبارے میں عظیم کارناموں کا کارخانہ ہے۔ سختیوں کو ہضم کرنے والا اور گردشوں پہ غالب آنے والا مجموعہ ہے اور اسی کائنات میں ایک درخت کو دیکھیے جس کی جڑیں زمین میں گڑھے ہوئے تنے میں ہیں۔ پتے، شاخیں، ٹہنیاں جو سوکھتی ہیں ٹوٹتی ہیں۔ اس کے سانسوں میں کون؟ اس کے اس پورے عمل میں، صورتوں میں پھل، پھول اور کلیوں میں کون ہے؟ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور انسانی عقل و دانش میں نہ آنے والے مظاہر سے بھرپور یہ کائنات اور اس کی ترتیب و ترکیب کے انتہائی مشکل ترین عمل، ذرات کا پھیلاؤ جس میں بے پناہ قوت بھی ہے، مسلسل حرکت بھی اور بے خطا ترتیب پانے کے بعد اس کے نتائج۔۔۔ ایک نہیں سینکڑوں نہیں بلکہ لاتعداد مظاہر کی مثالیں "اتفاق" کی دلیل ہیں یا کسی ارادہ کی؟ وہ عقل جو اپنی علمی دریافتوں کو اپنی عظیم کامیابیوں کا نام دیتی ہے اور علم کی صفات اور اصول و ضوابط کی حدود بھی قائم کرتی ہے اس سے پوچھئے یہ سب کس کی دلیل ہے؟

قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۝ (عبس۔ ۱۷)

ترجمہ: انسان ہلاک ہو جائے کیسا ناشکرا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ O (یٰسین ۷۷)

ترجمہ: کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو نطفے سے پیدا کیا پھر وہ تڑاق پڑاق جھگڑنے لگا۔

قرآن پاک کی یہ آیات انسانی عقل کو معقولیت کی حدود میں رہنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ عقل ہو... فکر ہو... تدبر ہو... ان کی حد ہے۔ اگر یہ اپنی مخصوص حدود سے گزر جائے یا اس کا دورانیہ حد سے زیادہ ہو جائے تو انسان کا دماغی توازن متاثر ہونا یقینی امر ہو جاتا ہے۔

زندگی کے نقش و نگار

ہماری سابقہ معروضات کا مقصد آپ کو کائنات کے نقش و نگار سے ہر لمحہ موصول ہونے والے ایک پیغام کی طرف توجہ دلانا ہے، وہ پیغام جس کو عقل کے تمام قواعد و ضوابط کی معاونت حاصل ہے اور پیغام ہے اللہ جل شانہٗ خالق ہے مالک ہے!

ہمارے نیچے اوپر، سامنے اور پیچھے، شمال اور جنوب پھیلی ہوئی کائنات کے بے حد و حساب نقش و نگار یک زبان کہہ رہے ہیں کہ ہم اس ذات والا صفات کی عظمت الوہیت کے گواہ ہیں۔ ثبوت ہیں لیکن انسانوں میں سے بعض کا علمی گمان ہمارے نتائج سے... ان کا کہنا ہے۔ ہم نے کائنات کا مطالعہ بڑے غور و تدبر سے کیا ہے۔ ہم نے زندگی کے ہر نقش کو بنظر عمیق دیکھا ہے۔ ہم نے اس کائنات کے وجود میں طبعی اور کیمیاوی ترکیبوں، اس کی اشکال اور نتائج کا علم حاصل کیا ہے۔ ہم نے جو حقیقتیں دریافت کی ہیں ان کو تجربوں کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ ہمیں اس بات سے اتفاق نہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے۔

انسان کی ان فکری گمراہیوں اور مذاہب باطلہ کے غلط فیصلوں سے دین حق پر کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ صحیح اور غلط حق اور باطل حقیقت اور گمان کے چہروں سے پردے اٹھ جانے چاہئیں۔

ہمیں ہر دو کے دعووں کو تعصب اور تنگ نظری سے الگ ہو کر ان کے اپنے اپنے دلائل کی روشنی میں سننا اور غور کرنا چاہئیے۔ ٹھوس دلائل کا پلہ جدھر بھاری ہو ہمیں اس کو قبول کر لینا چاہئیے۔ جس طرح کائنات کے ہر نقش و نگار کے بارے میں تجربے نے ثابت کیا ہے کہ اکثر جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ حقیقت میں نہیں اور جسے ہم دیکھ نہیں سکتے وہ "ہے"۔

لہذا اسلام کی حقیقی صورت کی پہچان کے لئے چند بنیادی قواعد و ضوابط کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہو گا تاکہ حق کا چہرہ دیکھتے وقت وہم و گمان کی گرد و غبار آڑے نہ آئے۔ لیکن خیال رہے ہماری اس بات کا تعلق شواہد کائنات کے اللہ جل شانہٗ کے اثباتی دلائل سے کوئی تعلق نہیں۔

(۱) سب سے پہلا اصول جسے اپنانا ہر مسلمان کا فرض ہے وہ یہ کہ تفکر سے کام لے علمی مباحث کی قدرت حاصل کرے چنانچہ قرآن مجید میں اس اصول کو اپنانے کا متواتر حکم کئی آیات میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (اعراف ۱۸۵)

ترجمہ: کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں اور جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں ان پر نظر نہیں کی۔

قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (یونس ۱۰۱)

ترجمہ: (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔

اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (الروم:۸)

ترجمہ: کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا۔ کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کو حکمت سے اور ایک وقت مقرر تک کے لئے پیدا کیا ہے۔

قرآن حکیم کا یہ ارشاد اس بات کا گواہ ہے کہ وہ تمام حکمتیں جن کو سائنس دان قانون فطرت کہہ رہا ہے اس کا خالق اللہ جل شانہٗ ہی ہے۔

(۲) حصول علم انسان پر فرض ہے۔ احادیث اور قرآن حکیم میں علم حاصل کرنے کی اکثر تلقین موجود ہے اور مندرجہ ذیل آیات کائناتی علم کے حوالے سے عرفان الٰہی حاصل کرنے والوں کی مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ (الروم:۲۲)

ترجمہ: اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا اہل دانش کے لئے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ (فاطر ۲۷-۲۸)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے مینہ برسایا تو ہم نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے میوے پیدا کئے۔ اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔ اور (بعض) کالے سیاہ ہیں۔ انسانوں اور جانوروں اور چارپایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں۔ خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

(۳) اس کے بعد ایک اور واضح اصول یہ ہے کہ ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ علم و فکر کے بعد جس فیصلہ پہ پہنچے صرف وہی بات وہ دوسروں سے کہے۔ کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ بغیر تحقیق اور علم حاصل کئے دوسروں کو دین اسلام کے بارے میں حکم دیتا پھرے۔ جیسے کہ عام طور پہ یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ بعض جاہل مسلمان اپنی باتوں کو علم سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ علمی حقائق سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لہذا ایسی صورت میں ایسے شخص کی بات اس کی ذاتی رائے تو کہلا سکتی ہے لیکن دین اسلام کے علم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن ایسے اشخاص کا مواخذہ یا محاسبہ عام مسلمانوں اور علماء کو کرنا چاہیئے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" میں علمائے دین کو اس بارے میں بڑی تاکید کی ہے۔ علمی حقائق سے حصول معرفت کی اہمیت سے انکار۔۔۔ کسوف و خسوف (سورج اور چاند گرہن) کے اوقات

کے اسباب کی لاعلمی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آپ فکری گمراہیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں کی جانے والی علمی بحث کو دین اسلام کے منافی سمجھے تو یہ اس کا دین اسلام پہ اتہام ہو گا اس لئے کہ اس سورج گرہن اور چاند گرہن کے اسباب کے بارہ میں علم ہندسہ اور علم الحساب میں مدلل بحث موجود ہے۔

فرض کیجئے آپ کو اس بارے میں تمام علمی بحث اور دلائل کے بعد یہ کہا گیا کہ اب آپ اپنے ذہن کو شک و شبہ کی گرفت سے نکال دیں اس سے مسلمان کو سب سے زیادہ نقصان اس اپنے علم میں (شریعت کے حوالے سے) شک ہے۔ یاد رکھیے یہ نقصان صرف آپ کی ذات سے متعلق نہیں بلکہ اس کے برے اثرات اجتماعی طور پر پوری امت مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ ہمیں چاہیے علم حاصل کریں اور دلائل سے حقائق کی معرفت کے اصول کو پیش نظر رکھیں۔ تدبر، تفکر سے معاملات کے نتائج حاصل کریں۔

(۳) دین اسلام کامل علم ہے۔ مسلمان کو چاہیئے کہ وہ تفکر و تدبر سے علم کی بلند سے بلند تر چوٹیاں سر کرے۔ مسلمان کی منزل مقصود "حقیقت کی کامل پہچان" مہیا کرنے والے علم کے بنیادی مرکز تک پہنچنا ہے۔ کسی علم، نظریے یا مفروضہ کی پکار پر لبیک کہنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ اسے اپنے تفکر و تدبر سے پرکھے تب کوئی فیصلہ کرے۔ اس زمین پر اپنے آپ کو ہر لحہ سربفلک چٹان کے چوٹی پہ بیٹھا ہوا مفکر سمجھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کسی حقیقت کی اندھی تابعداری حرام قرار دے رہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اور اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور تعلیم کو زبردستی یا کسی لالچ سے نہیں بلکہ غور و تدبر کے بعد تسلیم کرنے کا اصول پیش کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ○ (الاسراء: ۳۶)

ترجمہ: اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہو گی۔

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ○ ۚ (النجم ۲۸)

ترجمہ: وہ صرف ظن پر چلتے ہیں اور ظن یقین کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔
یعنی مفروضوں سے زیادہ کسی بات کی حقیقت سے آگاہی زیادہ اہم ہے۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○ (النمل: ۶۴)

ترجمہ: کہہ دو کہ (مشرکو) اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔

اِئْتُونِي بِكِتَابٍ مِنْ قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِنْ عِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○ (الاحقاف: ۴)

ترجمہ: اگر سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب میرے پاس لاؤ۔ یا علم (انبیاء میں) سے کچھ (منقول) چلا آتا ہو (تو اسے پیش کرو)۔

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ ۖ وَ لَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ ○ ۚ (النجم۔ ۲۳)

ترجمہ: یہ لوگ محض ظن (فاسد) اور خواہشات نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔

جب مسلمان اسلام کے علم سے اپنی عقل کو سیراب کر لے گا تو اس بات سے پہلے قطعی دلائل کے اصول کو اپنا شعار بنا لے گا۔ تو پھر وہ خود اسلام کے علم کا مدلل جواب ... اپنے ادھورے علم کو مکمل علم سمجھنے کے گمان میں مبتلا ہو کر جئے گا تو ہر کمزور دلیل اور نظریہ اسے آسانی سے اپنا شکار بنا لے گا۔ جبکہ مسلمان کی عقل کو شک اور وہم کسی وقت بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین بوس ... سکتے ہیں۔

قیامِ اسلام

قیامِ اسلام کا دوسرا نام دین ہے۔ دین اسلام کے معنی لغت میں یہ ہیں۔ غلبہ، ملکیت، قدرت، حکم، مذہب، ملت، حال، عادت، سیرت، تدبیر، نافرمانی، گناہ، مجبوری، پرہیزگاری، ... مدد، قہر، غلبہ، ذلت لیکن دین کے مجموعی معنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی فرماں برداری کو قبول کرنا ہے۔ ... فرمانبرداری کو قبول کرتے ہی مسلمان کی عقل کے دروازے زندگی کے اسرار سمجھنے، علم حاصل کرنے اور تجربات کی روشنی میں حقائق کی دریافت کے لئے کھل جاتے ہیں۔ اب اس کی عقل کا فرض ہے کہ وہ کائنات سے ... اسرار کی حقیقت سے اپنے آپ کو آشنا کرے۔ نہ صرف ہر موجود شے کی حقیقت کا علم حاصل کرے بلکہ اپنے تجربوں سے اس کو اپنا مطیع کرے۔ کائنات کو ودیعت کردہ قوانین کو دیکھ کر اس سے نتائج اخذ کرے۔ اس کے بعد اپنے علم، تجربے اور عقل کی تمام توانائیاں لئے ہوئے ملت اسلامیہ کی خدمت کے لئے سرگرم عمل ہو جائے۔ قیام اسلام یا قیام دین سے یہی مراد ہے۔

نگاہ عبرت سے دیکھئے عقل اور تجربے سے آراستہ علم مغرب سے چلا تو وہ ہر اس قوم اور ذہن کو مسخر ہی نہیں بلکہ مسمار کرتا ہوا پھیل رہا ہے۔ اسی عناصر کی دنیا کا ایک اور عالم گروہ جو آج دنیائے افلاک کی رازدانی کا اعلان کر رہا ہے، ہمارے سامنے ہے لیکن جن کو اللہ تعالیٰ کے قرآن عظیم میں پیش کردہ علوم سے آگہی ہے وہ نہ ہی مرعوب ہو سکتے ہیں نہ مسخر و مسمار! حقیقت کبھی حقیقت سے متصادم نہیں ہوتی حق کبھی حق سے دست و گریباں نہیں ہوتا۔ مغرب نے کائنات کے بارے میں جو علمی انکشافات کئے ہیں، ان میں جتنی سچائیاں ہیں، جتنی حقیقتیں ہیں وہ رہیں گی مگر ہم آپ کی توجہ تمام علوم کے سرچشمہ قرآن حکیم کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے انتہائی اختصار کے ساتھ جن علوم اور حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے وہ اپنے دامن میں بے حد و حساب وسعتیں سمیٹے ہوئے ہے۔

اعجاز قرآنی اپنی بیشتر آیات میں واضح اور صریح الفاظ میں اس بنیادی اصول کا اعلان کرتا ہے کہ قرآن حکیم وہ کتاب ہے جس میں مندرج تمام علوم کسی علم کے تابع نہیں بلکہ دیگر تمام علوم اس کے تابع ہیں۔ اس کی تمام حکمتیں کسی دائرے کی متبع نہیں بلکہ وہ تمام حکمتوں کی حاکم ہیں۔ قرآن مجید کی آیات اور معانی سے عقل آشنا ہو جائے تو کائنات کے سربستہ اسرار کی معرفت کا حصول آسان سے آسان تر ہو جائے۔

کائنات کے خدوخال کا ظہور کیسے ہوا اس کے بارے میں مختلف نظریات کے مباحث اور ان سے متعلق

صحیح رائے بھی پیش کر دی گئی۔ اب ہمارا موضوع نظریہ ارتقاء (Evolution) ہے۔ جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسان بندر ہی کی مختلف ارتقائی صورتوں سے گزر کر نمودار ہوا۔ یعنی پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فرق کا پشت با پشت میں ترقی کر کے مکمل ہو جانا، جس نظریہ کا بانی "ڈاروِن" ہے۔ ہمارا کہنا ہے کہ موجودہ انسان ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہے۔ اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ خطاکار گھٹیا بندر کی نسل سے ہے۔ بلاشبہ انسان سے بہت سے خطاکار انسانوں کی صورتوں کا بندروں کی صورت میں مسخ کئے جانے کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے لیکن اصل انسان کے بارے ہی تمام علوم سے جامع تر علم لغت قرآن میں اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ O (آل عمران: ۵۹)

ترجمہ: عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا تو وہ (انسان) ہو گئے۔

وہ فرماتا ہے:

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ O (الم السجدہ: ۷)

ترجمہ: اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

فَجَاءَ بَنُوْ آدَمَ عَلٰى قَدْرِ الْاَرْضِ، فَجَاءَ مِنْهُمْ الْاَحْمَرُ وَالْاَسْوَدُ۔

ترجمہ: (اس کے بعد اسی کی اولاد زمین پر پھیلی۔۔۔ ان میں سے بعض سرخ بعض کالے)۔۔۔

وَبَيْنَ ذٰلِكَ، وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالطَّيِّبُ وَالْخَبِيْثُ ۔ (ترمذی)

(اور بعض ان کے درمیانی رنگ والے۔ ان میں بعض آسانیوں کے مالک بعض غموں کے، بعض نیک سعادت والے بعض گندے بدبخت)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فلما خلق اللہ آدم و نفخ فیہ الروح عطس، فقال الحمد للہ، فحمدُ اللہ باذنہ فقال لہ ربہٗ رحمک اللہ یاآدم۔

(اور جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ ان میں روح پھونکی تو ان کو چھینک آئی تو پہلا جملہ زبان پر آیا "اللہ تیرا شکر"۔ یہ جملہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ان کے ہونٹوں پر آیا جس کے جواب میں اللہ نے فرمایا اللہ کا رحم ہو تم پر آدم۔:

اذھب الیٰ اولئک الملائکۃ الیٰ مھم جلوس۔ فقل السلام علیکم۔

(اللہ کا رحم ہو تم پر آدم۔ جاؤ ہمارے فرشتوں کے پاس جو اپنے مقام پہ بیٹھے ہیں۔ اور ان سے کہو اللہ کی سلامتی ہو تم پر)۔

فقالوا وعليكم السلام ورحمة الله، ثم رجع الى ربه فقال ان هذه۔

(چنانچہ آدمؑ نے یہی کیا تو انہوں نے جواباً کہا۔ اللہ کی سلامتی اور رحمت ہو تم پر۔ پھر آدمؑ اپنے رب کی طرف پلٹے تو اللہ نے فرمایا۔ یہ تمہارا سلام ہے)۔

تحيتك و تحية بنيك بينهم۔

(جو میری طرف سے تمہیں دیا گیا ہے تم نے فرشتوں کو اور انہوں نے تمہیں دیا۔ اب یہ تمہاری اولاد میں تحائف کے تبادلے میں تجویز کرتے ہیں)۔

اب جناب علم کی پوری تاریخ کے جس عمر اور حصہ کے بارے میں آج تک معلومات مہیا ہو گئیں ان سے یہی تصدیق ہوتی رہی کہ ہر زمانے میں پتھر پتھر ہی رہے۔ نباتات نباتات ہی رہیں اور یہ انسان ہر زمانے میں آدم علیہ السلام کی اولاد ہی کی پہچان سے ہی پہچانا جاتا رہا۔ اس کی ساخت میں تبدیلی ہونے کی کوئی شہادت یا گواہی نہیں ملی۔

(۲) انسان کی تخلیق ہیئت میں اور بندر یا حیوانوں کی ساخت جسمانی میں جو سب سے بڑا فرق ثابت ہوتا ہے وہ نہ صرف صورت قد یا ہیئت جسمانی کا فرق ہے بلکہ اخلاق (Manners) کے اعتبار سے بھی بالکل مختلف ہے۔ اس کا فکر اور اس کے اسوۂ اعلیٰ، اس کے علم کے شاہکار، بے گنت اور یہی وجہ ہے کہ خود ڈارون کے ہم فکروں نے اس پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا۔ کہ قانون ارتقاء کے طبیعی انتخاب کا حضرت انسان پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔

ایک اور ماہر طبیعیات کا کہنا ہے۔ ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اور بندر میں بے حد فرق ہے۔ ہمیں کوئی دلیل ایسی نہیں ملتی جس کی بنا پر ہم انسان کے بندر ہونے کا حتمی فیصلہ صادر کر دیں اور باقی مخلوقات کو چوپائے قرار دے دیں۔ جلد کے رنگوں کی مماثلت کی بنا پر بندر اور انسان کو ایک قرار دیا گیا۔ وہ بھی ٹھوس دلائل سے عاری دعوٰی ہے۔ اسی طرح بعض دانشوروں نے بندر اور انسان کے وقت تولید بر ہنگی کو اپنے دعوے کی تائید میں استعمال کیا ہے۔ وہ بھی بے وزن دلیل ہونے کے سبب بے کار ہے۔

علم ـــــ اور قرآن حکیم کے ارشاد میں ہم آہنگی بلااختلاف ثابت ہوتی ہے۔ کسی دور میں بھی علم و عقل نے قرآن مجید کے اس دعوے کی مخالفت نہیں کی۔ یقیناً وہ اس لئے کہ بلاشبہ اللہ تبارک و تعالیٰ انسان کے خالق ہیں اور ان سے بہتر انسان کی تخلیق کا علم کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم آج بھی صدا لگا رہا ہے:

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ (الکہف:۵۱)

ترجمہ: میں نے ان کو نہ تو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت۔

لیکن اس کے علاوہ دوسری مخلوقات کی تاریخ زندگی کے بارے میں بھی یہی ارشاد ہے۔ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ ابتدائاً ڈارون کے نظریہ سے اتفاق کرنے والے علماء کو بعد میں کئی پہلوؤں میں بے یقینی کی کیفیت تھی اور جنہوں نے اس نظریے کو قبول بھی کیا وہ اس سے آگے ٹھوس دلائل کے ساتھ بڑھ نہ سکے۔ ان کے علاوہ بھی وہ دانشور جنہیں اس موضوع پر مخصوص علم کا مالک کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے "ریڈ اور الامیر نس" "علم وراثت" کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے۔ علم الوراثت میں ابھی تک اس مفروضہ کی حمایت میں مضبوط اساس پر دلائل مہیا نہیں ہو سکے

جن کے سہارے ہم ڈاروِن "Darwin" کے نظریہ ارتقا "Evolution" کی پرزور تائید کر سکیں۔

قدیم سے قدیم تر زمانے کے لوگوں سے اب تک اپنی جنس کی عضویاتی تبدیلی یا اپنی جنس کی وراثت کو چھوڑنے کے ثبوت میں ہماری تحقیقات کے نتائج کی جھولی بالکل خالی ہے۔ ہمیں اپنے جسم کی ساخت میں بھی تبدیلی کے نشانات نہیں ملتے۔ اور نظریہ اساس کہ جسمانی تبدیلی ایک چھلانگ یا اینچ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ بے معنی ثابت ہوتا ہے۔

نباتات اور حیوانات میں ارتقائی تغیرات پر تحقیقات سے میسر شدہ معلومات جو ان کی نمو اور تربیت سے متعلق ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف تربیت کا طریقہ مٹی اور کیچڑ کا امتزاج ثابت ہوتا ہے۔ یا پیوندکاری اور درختوں کو پھل دار کرنے والی ہوائیں، یہ اصول ضرور کارفرما نظر آتے ہیں۔

حیوانات میں جوڑوں کی مماثلت یا باہم شادی بیاہ والا معاملہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ سلسلہ چھوٹے سے چھوٹے کمزور سے کمزور اور طاقتور سے ناطاقتور یا بڑے سے بڑے حیوان میں پایا جاتا ہے۔ انتہائی تحقیق و تلاش کے بعد حاصل کردہ معلومات "ڈاروِن" کے دعوی کی تصدیق نہیں کرتیں۔ ہاں انتہائی کم تر حالات (Rarely) میں کوئی قلوق متی ہو تو کہا نہیں جا سکتا۔ ماحول کے تغیرات کو اساس بنا کر ان منکرین نے اپنے نظریہ کی تشریح کی ہے۔

کیا کائنات میں ایسے تغیراتی ماحول کی کیفیات سے مطابقت پیدا کرتے ہو۔ حیوان کی جسمانی بناوٹ میں تبدیلی کی شہادتیں اتنی ہیں کہ ہم ان کو یقینی قرار دے دیں۔ ان حالات میں حیوان کے اندر کی تبدیلی جسے اگلی نسل وراثتاً قبول کر لیتی ہے۔ اس طرح حیوانات کی ایک قسم سے دوسری قسم پیدا ہو جاتی ہے۔ نظریہ ارتقاء کے حق میں پیش کئے دلائل جن کی روشنی میں کچھ دانشوروں نے اسے حقیقت تسلیم کر لیا ہے وہ یہ ہیں۔
حیوانات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ قسم پائی جاتی ہے۔ واحد الخلیہ جانوروں "Singale Cellular Animals" سے لے کر اربوں خلیات رکھنے والے جانور اسی طرح صلاحیتوں کے اعتبار سے حیوانات میں ادنیٰ اعلیٰ درجات کا فرق۔

(۲) ابتدائی مشاہدوں سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کی تہوں میں باعتبار زمانہ ارتقائی ترکیب پائی جاتی ہے کروڑوں برس پہلے زمین پر زندگی کی جو شکلیں آباد تھیں ان کے قدرتی عمل کے تحت پتھرائی ہوئی حالت میں اب بھی زمین کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ جس کو فاسل (Fassil) کہا جاتا ہے۔ یہ فاسل بتاتے ہیں کہ قدیم دور میں حیوانات کی جو قسمیں تھیں وہ سادہ قسم کی تھیں مگر بعد میں حیوانات کی قسمیں پیچیدہ ہوتی چلی گئیں۔ اس کا مطلب ہے کہ زندگی کی سب موجود چیزیں بیک وقت وجود میں نہیں آئیں بلکہ بتدریج ترقی کا نتیجہ ہیں۔

(۳) مختلف حیوانات کے درمیان نوعی اختلافات کے باوجود ان کے جسمانی نظام میں بھی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً مچھلی چڑے سے ملتی جلتی ہے اور گھوڑے کا ڈھانچہ انسان کے مشابہ ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ سارے ذی حیات ایک ہی خاندان کے پیداوار ہیں۔

(۴) اسی طرح ایک قسم سے دوسری قسم کے نکلنے کی دلیل میں کہا جاتا ہے کہ ایک جانور کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے یکساں نہیں ہوتے بلکہ ان میں عضویاتی فرق ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ اگلی نسلوں میں مزید ترقی کرتے

ہوئے انتخاب طبیعی "Selection of Mutation" کے زیر اثر آگے بڑھتے ہیں جو ہزاروں سال گزرنے کے بعد اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ ایک چھوٹی سی گردن والا جانور بکری، بڑی گردن والے (زرافہ) کی صورت میں بدل جاتا ہے۔ تدریجی ارتقاء کے تحت ہونے والی تبدیلیوں کو ہی "انتخاب طبیعی" کے قانون سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس قانون طبیعی کا تجزیہ یا اپنی رائے تو محفوظ رکھتے ہیں۔ پہلے ایک مشہور یورپین محقق لی کومٹ ڈی نوئی "Le comte Du Nouy) کی رائے پر غور فرمایئے! لکھتے ہیں "عضویاتی ارتقاء کے حوالے سے جو بات ثابت ہونے کے بارے میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں وہ منطقی تو ہو سکتی ہیں مگر براہ راست تجرباتی نہیں ہیں۔ حیوانات میں عضویاتی ارتقاء (Organic Evolution) کے مفروضہ نظریے کو تسلیم کرتے ہوئے حیوانات میں کسی زمانے، کسی مقام، کسی تحقیق، کسی مشاہدے نے بھی اس کی تصدیق مہیا نہیں کی۔ اس نظریے کی بنیاد دوسرا پہلو حیوانات میں عضویت یا صورتوں کی مماثلت ہے۔ ڈاروِن کے نظریہ کی یہ دلیل بھی ہو تی ہے کہ صورت یا عضویت کی مماثلت کا یہ مطلب نہیں کہ زمانہ قدیم میں لاکھوں سال پہلے گھوڑے کی صورت دوسری قسم کی تھی۔

اب آیئے اسی قانون تدریجی ارتقا کی روشنی میں اس کی صداقت کی بنیاد نباتات اور جمادات میں تلاش کریں اور بقول ڈاروِن ان کی ارتقائی صورت کا حیوان میں کھوج لگا کر دیکھیں کہ نباتات، جمادات اور حیوان میں ایک بنیادی واضح فرق نظر آتا ہے۔ حیوان کی زندگی کا انحصار خون کی گردش ہے۔ خون ہمیشہ سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ ایک کیمیاوی مادہ جو غذا کے معدہ میں جانے کے بعد وجود میں آتے ہی جوں ہی پھیپھڑوں میں داخل ہوتا ہے تو چھوٹے چھوٹے سرخ ذرات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس مادہ کا نام ہیموگلوبن (Heamoglobin) ہے۔ ان ذرات کی مقدار اعلیٰ یا کمتر میں فرق تو ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ گلوبن "سرخ ذرات" زرد ہوں یا ان کی رنگت کوئی اور ہو۔ مثلاً حیوانات کی ایک نوع میں ان ذرات کی مقدار ۳۰۰,۰۰۰ ہے تو دوسرے میں ۶,۷۰۰,۰۰۰ ہو۔ اس کے برعکس جمادات اور نباتات میں متناسب شدہ زندگی کے عنصر کی رنگت سبز اور دوسرے کی قبیل میں تانبے کی طرح سلگتی ہوئی چنگاریوں کی سی رنگت ملتی ہے۔ اسی طرح مختلف الانواع نباتاتوں میں یا زمین کی سطح سے چنی ہوئی گھاسوں میں اگر ایک کی رنگت نیلی ہے، سبز ہے یا بھوری ہے تو آج تک کوئی یہ نہیں ثابت کر سکا کہ نیلی گھاس کے بیج سے یا مادہ تولید سے سبز رنگ کی گھاس پیدا ہوئی۔ مشاہدہ تو ایک طرف منطقی دلائل سے بھی اس بات کو ثابت کرنا محال ہے۔ کئی ارب ہا سال میں بھی کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ وہ مادے جو اپنی رنگت میں اور کیمیاوی عمل میں مختلف اپنے اثرات میں مختلف ہیں۔ ان کے اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ گلوبین کی رنگت سرخ کیوں؟ سبزیوں اور نباتات میں "سبزینہ" (کلوروفیل) "Chlorophyll" کیوں؟ حالانکہ ان کی صورت سیال مادہ کی صورت ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہے۔

سائنس دانوں نے کائنات کی پیدائش تخمیناً ۱۰۰ ملین پہلے فرض کر لی۔ لیکن ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۰۰ ملین کو ۱۰۰ ملین سے ضرب دینے کے حاصل شدہ تعداد تک بھی انسان کوشش کر لے تو بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ حیوانات، جمادات، نباتات یا انسان کی صورت جو کسی زمانے میں پہلے دیکھی تھی آج وہ بدل چکی ہے۔ اس کی آنکھوں، اس کے کانوں یا دیگر اعضاء کی ترتیب میں ہی تبدیلی آئی ہو۔

ہمیں کسی کے علمی انکشافات کی تردید کا نہ ہی شوق ہے اور نہ ہی ہمارے دین نے ہمیں علم و حکمت کے اسرار کائنات کو کھنگالنے اور سمجھنے سے منع کیا ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ہمیں اپنے نظریہ کی تائید میں علمی، عقلی اور منطقی دلیل اور تجربہ چاہیے ہم پروپیگنڈے سے مربوط اور منظم نظام ابلاغ و تشہیر سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ ہم کسی علم کی بالادستی صرف نسل، رنگ یا مادی قوتوں اور مہلک ہتھیاروں کی زبان میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہماری عقل، علم اور حکمت جس جادہ کی متلاشی ہے وہ یہ کتاب ہے۔ اس کی تعلیم کا بنیادی درس یہی ہے کہ کسی علمی انکشاف، احتمال یا مفروضہ کو حتمی یا آخری سچ ماننے سے پہلے اس پر غور کرو، تحقیق کرو، تدبر و تفکر کرو، ٹھوس دلائل میسر ہوں تو دل و دماغ کو شک و شبہ سے صاف کر کے قبول کر لو۔

ہمیں ارشاد فرمایا

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (العنکبوت ۲۰)

ترجمہ کہہ دو کہ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے۔

خود علم بھی اسی اصول کے تحت کائنات کے آغاز کی تلاش میں ہیں۔ زمین کی تہ سے ہی اس راز کو کریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چاند یا دوسرے سیاروں سے حاصل کردہ ٹکڑوں، آثارات قدیمہ کی جانچ "Exploration" میں دریافت شدہ قدیم اشیاء اور ہڈیوں کے ڈھانچوں کے سہارے پیدائش کی مدت کا مفروضہ تو قائم کر سکتے ہیں لیکن یہ سب کیسے ہوا اور کیوں کر؟ اس معمہ کو کوئی بھی حل نہیں کر سکا۔

ایک اور آیہ کریمہ میں ارشاد فرمایا

اَوَ لَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ (العنکبوت: ۱۹)

ترجمہ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا پھر (کس طرح) اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔

اس وجود کا تصور بھی اس کا ذاتی، اس کو پیدا کرنے کی قدرت بھی اس کی ذاتی اور پھر اس پیدائش کے سلسلہ کو آگے بڑھنے کا نظام بھی اس کا ذاتی، اس مخلوق کی ہیئت، صورت، رنگ اور ڈھب سے اس کے اپنے سوچے ہوئے۔ ارشاد فرماتے ہیں

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ (الغاشیہ ۱۷)

ترجمہ یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں۔

صرف صورت اور جسم کی بناوٹ ہی عجیب نہیں بلکہ اس کی عادتیں اور کام بھی اپنی خصوصیت میں عجیب و غریب ہیں۔ یہ صحراؤں کا جہاز، یہ مالک سے وفاکا شاہکار، غصہ اور نفرت میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ایک اور خاص صفت جو انسان کو ہرگز حاصل نہیں ذرا وہ بھی سن لیجیے

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی ۝ (طٰہٰ ۵۲)

ترجمہ کہا کہ ان کا علم میرے پروردگار کو ہے (جو) کتاب میں (لکھا ہوا ہے) میرا پروردگار نہ چوکتا ہے

جب کہ آج تک بڑے سے بڑا نابغہ روزگار (Genius) بھول اور غلطی سے بے داغ نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھنے والے صرف اسی خبر، اسی علم کو دلیل کا محتاج نہیں سمجھتے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب فرشتوں یا وحی کے ذریعہ آدمؑ سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ختم المرسلین تک انبیاء کو دیا اور انبیاء علیہ السلام نے اسے اولاد آدم میں عام کیا۔

اس علم کی روشنی میں ہمیں کائنات کے ہر نقش نگار میں اللہ تعالیٰ کا جمال و جلال درخشندہ نظر آتا ہے۔ (۱) اس کی پیدائش کا مرحلہ۔ (۲) اس کی بے حد انواع و اقسام۔ (۳) سب سے اشرف اور برتر مخلوق انسان۔ (۴) اخلاق کے عجیب و غریب پہلو۔ ان سب پر ہم جب غور کرتے ہیں تو ہمیں ہر ایک شواہد و مظاہر کی زبان صرف اللہ صرف اس کی مدح و ثنا کرتی سنائی دیتی ہے۔

اب اگر ملحد برادری کو اپنے علمی انکشافات سے نسل انسانی کو آگاہ کرنے کا حق حاصل ہے تو ہمارا بھی تو یہ حق ہے کہ ہم ان کی علمی صداقتوں "Knowledge of truth" کا ثبوت مانگیں۔ ان کے فکری مغالطوں کا انہیں علم و عقل سے احساس دلائیں اور نہیں تو کم از کم تمام ملحد مل کر جن کو اپنی اس دریافت پر مکمل یقین ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں۔

یہ کائنات مادہ کی دلدل سے پیدا ہوئی۔ سارا سلسلہ ایک ازلی قانون سے بندھا ہوا چل رہا ہے جسے "Law of Nature" کا نام دینا چاہیئے۔ دوسری طرف سے آواز آتی ہے، کائنات از اول تا آخر ایک مادی کائنات ہے۔ کائنات کی ساری حرکتیں اور تمام مظاہر خواہ وہ ذی روح اشیاء ہوں یا بے روح اشیاء، اندھے مادی عمل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایک اور آواز آتی ہے، یہ کائنات جذب و کشش کا ایک عالمی نظام ہے جس کے تحت سورج، چاند ستارے حرکت کر رہے ہیں۔ اس لئے اب خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف "Reflection" سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا غلط ہے کہ آسمان پر کسی خدا کا نشان ہے۔ ایک اور نے کہا ایک عظیم ریاضی دان جو ابتدائی سحابیہ "Nebulae" میں ذرات کے انتشار کو جانتا ہو وہ دنیا کے مستقبل کی پوری تاریخ بتا سکتا ہے۔ ارک لو سرجیمز فرماتے ہیں، یہ کہنا صحیح ہو گا کہ علم کا دریا پچھلے چند سالوں میں ایک نئے رخ پر مڑ گیا ہے۔ تیس سال پہلے ہم نے کائنات کو اپنی نوعیت کی مشینی قسم کی چیز سمجھا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمران "Designing & Controlling Power" کی شہادت دے رہی ہے۔ مگر یہ سب ہمارے اپنے وہم کا پرتو، غرض یہ کہ تمام سائنس دان جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی پہلو سے انہوں نے کائنات اور زندگی جاندار خلیہ "Living Cell" کو بے جان مادہ کی طرح بعض کیمیاوی جوہروں سے بنا ہوا دیکھ لیا ہے تو پھر سارے سائنس دان مل کر ایک انسان بنا کر تو دکھائیں؟ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہماری اندرونی دنیا کے بہت ہی گہرے اور وسیع علاقے نامعلوم ہیں۔ خلیئے کے پیچیدہ اور عارضی اعضا کے بنانے کے لئے کس طرح کیمیائی مادوں کے سالمے آپس میں مل جاتے ہیں۔ تر و تازہ بیضہ کی نواۃ "Nucleus" کے اندر کے نسلی مادے کس طرح اس فرد کی خصوصیات کا فیصلہ کرتا ہے جو اس بیضہ سے پیدا ہوتا ہے۔ کس طرح خلیئے خود اپنی کوششوں سے نسیجوں اور اعضا جیسے گروہوں میں منظم ہو جاتے ہیں۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ان

خلیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے گروہ کو زندہ رکھنے میں انہیں کیا کام کرنا ہے جبکہ اس کے برعکس ان کا اصرار انسان اور کائنات کی مکمل تشریح کرتے ہوئے اس بات کو منواتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود نہیں، کوئی خالق نہیں۔ ہمارا پھر یہی کہنا ہے کہ اگر خالق کوئی نہیں تو پھر آپ ذرا اس ذات کے اس دعوے کی تردید ہی کر دو جو بار بار آیات اور دلائل کے ساتھ انسان کو یہ سمجھاتی ہے، میں اس کائنات کا خالق ہوں میرا نام اللہ ہے۔ اس کے ہر بے جان اور جاندار کا رب میں ہوں۔

ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ○ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ (الحج ۷۳۔۷۴)

ترجمہ۔ لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو کہ جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ اس کے لئے سب مجتمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب (یعنی عابد اور معبود دونوں) گئے گزرے ہیں۔ ان لوگوں نے خدا کی قدر جیسی کرنی چاہیے تھی نہیں کی کچھ شک نہیں کہ خدا زبردست (اور) غالب ہے۔

تو اللہ تعالیٰ کے اس اعلان سے پہلے بھی ایسے عقلمند موجود تو تھے جن کا نظریہ بھی وہی تھا جو آج ملحدوں کا ہے۔ وہ بھی اللہ کی ذات کو نہیں مانتے تھے۔ انسان کو خودرو پودا مانتے تھے یا پھر دوسرا گروہ تھا کہ جس نے اللہ کے بدلے اپنے خیال کے مطابق خدا بنا لئے تھے۔ ان میں سے ایسے انسان تھے جو علم میں عقل میں عمل میں ان کے مقابلے میں زیادہ شاندار اوصاف کے مالک ہوتے تھے، تو یہ عقل مند ان عقلمندوں کے بس میں اپنے تمام دکھوں کا علاج سمجھتے تھے۔ ان کا یقین یہ ہوتا تھا کہ ہماری خوشیاں ہمارے غم، سب ان کے ہاتھ میں ہیں یہ جو کہیں وہ ہمیں ماننا چاہیے۔ ہمیں آج کا سائنس دان اور ان کے پیروکار ذاتِ خداوندی کے حوالہ سے (خیال رہے ہمارا اختلاف اللہ تعالیٰ کی ذات تک ہے) اپنی عقل اور علم ہی کو انسان اور کائنات کا محیط تصور کرتے ہیں۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ انسان بیک وقت ایک لاش ہے جس کو تشریح کا عالم (ڈاکٹر سرجن) چیرتا پھاڑتا ہے تو وہاں وہ ایک شعور بھی ہے جس کا ماہرینِ نفسیات اور بڑے بڑے روحانی اساتذہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ انسان ایک شخصیت بھی ہے جس کے اندر جھانکنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ذات بے حد گہرائیوں کی زمین ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انسان کیمیائی مادہ بھی ہے جس سے جسم کی نسیں اور خلیں بھی بنتی ہیں۔ انسان خلیوں اور تغذیاتی رطوبتوں کا ایک حیرت انگیز گروہ ہے جس کے جسمانی قوانین کا مطالعہ ماہرین فلکیات کرتے ہیں۔ لہٰذا یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن کائنات اور انسان باہر اور اندر کارفرما قوانین کو جاننا اور بات ہے۔ ان قوانین کے اسباب کو سمجھ لینا بھی اور بات ہے۔ یہ حاصل شدہ وقوف انسان کا جزوی وقوف ہے۔ علم کے غرور میں اندھیرا ہے۔ جو علم کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس اعلان سے سائنس دانوں کا ایک گروہ یقیناً واقف ہے۔ اگر نہیں تو ہم اللہ تعالیٰ کے

اس اعلان کو ان کے گوش گزار کرتے ہیں۔ "اللہ کے سوا کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ جاندار تخلیق کر سکے"۔ لیکن ایک عرصہ ہوا ایک مشہور عالم حیاتیات ہیکل "Haeckel" نے یہ دعویٰ کیا تھا۔ میں نے زندگی کی حقیقت دریافت کر لی ہے۔ مجھے ہوا، پانی، کیمیائی اجزا اور وقت دے دو، میں انسان بنا دوں گا۔

اس اعلان کو کافی عرصہ ہو چکا ہے مگر رابوٹ مشینی آدمی تو بن گیا لیکن انسان نہیں بن سکا۔ حالانکہ ہیکل کے اس اعلان کو مغربی ممالک کے پریس، ذرائع ابلاغ، نشر و اشاعت کے تمام اداروں نے بڑا خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یوں شور مچایا جیسے ہیکل نے واقعی انسان پیدا کر لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان تو ایک طرف معمولی مکھی جیسی حقیر مخلوق بھی ابھی تک کوئی سائنس دان پیدا کر کے نہیں دکھا سکا۔ حقیقت صرف اتنی تھی کہ ہیکل اپنے کیمیاوی تجربوں میں ذرا سی کامیابی دیکھ کر خوشی سے اتنا بے قابو ہو گیا کہ اسے یہ خیال ہی نہ رہا کہ حرکت اور زندگی میں بہت فرق ہے۔

قرآن حکیم ایسے زمانہ میں اترا جب انسان عالم فطرت کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ اس وقت بارش کے متعلق یہ تصور تھا کہ آسمان میں کوئی دریا ہے جس سے پانی بہہ کر زمین پر گرتا ہے اور اسی کا نام بارش ہے۔ آج علم کی ترقی ہوئی، مشاہدے اور تجربے بڑھ گئے جس کی وجہ سے بے شمار نئی نئی معلومات حاصل ہوئیں مگر زندگی کا کوئی شعبہ اور علم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں پہلے درست مانی ہوئی باتیں بعد میں جزوی یا کلی طور پہ غلط ثابت نہ ہوئی ہوں۔ مگر قرآن حکیم کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ جس طرح ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے دور میں برحق تھا۔ آج بھی وہ اسی طرح برحق ہے۔ اس لئے کہ قرآن جس کا کلام ہے۔ وہ اس وقت بھی اس سے پہلے بھی نہ آج بھی اور ہمیشہ ہی حق ہے۔ کیا یہ اس بات کی علمی، عقلی دلیل نہیں کہ اگر یہ انسان کا کلام ہوتا۔ انسان کا فلسفہ ہوتا تو اس کو غلط ثابت کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔

مگر ہم ماضی کی تاریخ پر جہاں تک آگاہی کی نظر ڈال سکتے ہیں۔ وہاں تک جہاں ایک گروہ ہمیشہ اللہ کی ذات کو مانتا رہا ہے۔ وہاں اس اللہ تعالیٰ کے ہر دعوے کو غلط ثابت کرنے کی بڑی منظم کوششوں کا سلسلہ بھی چلا آ رہا ہے۔ لیکن آج تک نہ اسے کوئی جزوی طور پہ غلط ثابت کر سکا نہ کلی طور پہ۔ آج بھی اس کا یہ دعویٰ کہ ہمارے سوا کسی مخلوق میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ وہ ایک معمولی سی مکھی کو ہی پیدا کر سکے۔ اپنی جگہ اٹل ہے اور اٹل رہے گا۔

لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ (الحج۔ ۷۳)

ترجمہ: وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے اگرچہ اس کے لئے سب مجتمع ہو جائیں۔

لیکن علم کے فریب میں گرفتار ان عقلمندوں سے کیا کہیں جو اللہ تعالیٰ کے نہ ماننے کو ترقی کا تاج سمجھ کر پہننا فخر سمجھتے ہیں اور کسی ملحد کے نظریہ الحاد سے ذرا سی حمایت کرنے والے بیان کو سنتے ہی اتنا شور مچا دیتے ہیں جیسے ان کے ہاتھوں میں زندگی کی صبح کا سہرا آ گیا اور اب وہ خود انسان اور کائنات کی زندگی کے خالق بن گئے۔ چنانچہ جب ایک سائنس دان نے یہ اعلان کیا کہ زندگی کا جرثومہ "Germ" ایک سیارے سے فضا میں مدتوں رہنے کے بعد۔ کرۂ ارض پہ مستقر ہوا تو اس کے بعد زندگی کی بے گنت شاخیں پھوٹیں اور پھر وہ سب کچھ جو ہم

دیکھ رہے ہیں بتدریج نمودار ہو گیا تو اس انکشاف کو سنتے ہی ملحدوں کی دنیا میں جشن مسرت منایا گیا۔ لیکن کسی نے اس سوال پہ غور کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ جناب وہ کون سا کرہ تھا جہاں اس جرثومہ نے جنم لیا؟ یا پہلے ہی سے موجود تھا۔ تو فضا میں برق پاروں کی توڑ پھوڑ کی زد سے وہ کیسے بچا؟ وہ کرہ جہاں سے زندگی کے جرثومہ نے آپ کے علم سے اپنا تعارف کرایا۔۔۔ کیا اس میں خلیے کے زندہ رہنے کے لوازمات موجود تھے؟

کیا اس سیارہ میں، آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور کاربن گیس الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب زندگی کے اہم ترین عناصر وہاں موجود تھے؟ اگر ایسا تھا تو وہ سیارہ کون سا ہے؟ اسی قسم کا ایک اور اعلان بڑے زور شور سے سنایا گیا۔

اعلان یہ تھا کہ (Din) کی دریافت نے زندگی کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا۔ اب یہ ہمارے علم کی مضبوط گرفت میں آ گئی ہے۔ ہم بھی سن کر نتیجہ کا انتظار کرتے رہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ہی یہ شور جتنے جوش و خروش سے بلند ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے وہ خاموشی کے سردخانہ میں دفن ہو کر رہ گیا۔

اصل قصہ یوں تھا۔ ایک محقق نے "Nucleus" کے بارے میں اپنی علمی دریافت کا انکشاف کرتے ہوئے لکھا۔ نیوکلیس کے گرد ایک بہت ہی باریک جھلی ہوتی ہے جسے نیوکلیئر ممبرنس "Nuclear Membrance' بھی کہتے ہیں۔ مختلف چیزیں اس جھلی کے ذریعہ نیوکلیس کے اندر سے باہر جاتی ہیں اور باہر سے اندر نفوذ کرتی ہیں۔ نیوکلیس کے اندر ایک کثیف لیکن شفاف مادہ ہوتا ہے۔ جسے نیوکلی او پلازم "Nucleo Plasm" کہتے ہیں۔ اس کے اندر بہت سے نازک الجھے ہوئے دھاگے ہوتے ہیں جو آپس میں مل کر ایک جال بنا لیتے ہیں۔ ان دھاگوں کو کروموسوم "Chromosomes: کہتے ہیں۔ کروموسوم خلیئے "Cells" کی تقسیم کے درمیان واضح نظر آتے ہیں۔ کروموسوم کی ساخت ہی شیز (دریائی گھونگا) کی شکل جیسی ہوتی ہے اور ہر ہی شیز کے برخرد کے تمام کرموسوم "Cells" کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔ نیوکلیس میں ایک یا دو چھوٹے چھوٹے اجسام بھی ہوتے ہیں۔ انہیں "نیوکلی اولائی" کہتے ہیں ان میں سیل "Cell" کی ضرورت کے مطابق ایک ایسڈ "Acid" بھی ہوتا ہے جسے "Ribonucleic Acid" یا R.N.A. بھی کہتے ہیں۔ کروموسوم اپنی معینہ تعداد سے عموماً گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ کروموسوم ہمیشہ جوڑے کی صورت میں ہوتے ہیں۔ کروموسوم اپنی صورتوں کے لحاظ سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔ بعض کی شکلیں انگریزی حروف V J اور I جیسی ہوتی ہیں۔ کروموسوم کے دو دھاگوں کو خوردبین یا دوربین کے ذریعہ ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر کروموسوم ڈی او کسی رائبو نیوکلی اک ایسڈ "Deoxyribonucleic Acid" سے بنا ہوتا ہے جسے مختصر الفاظ میں D.N.A. کہا جاتا ہے جو ہر جاندار کی موروثی "Heredity' کی خصوصیات کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایک جین "Gen" عموماً کسی ایک جاندار کی خصوصیت کا نگران ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات بعض خصوصیات کے توارث میں ایک سے زیادہ جین "Gen" حصہ لیتے ہیں۔ یہ تھا وہ انکشاف جن پر صاحب مقالہ کو نوبل انعام ملا۔ چنانچہ ملحدین خوش ہوئے۔ زندگی کے ذورے، کرموسوم ہاتھ آ گئے۔ ہم نے ان انکشافات کی روشنی میں یہ سوچنا شروع کیا۔ یہ نیوکلیس کو جھلی کی حفاظت کے آداب کس نے سکھائے۔ یہ کثیف مگر شفاف سیال مادہ جس میں نازک باریک الجھے ہوئے دھاگوں کو جال بنانا کس نے سکھایا۔ کروموسوم پر Gens کو

جاندار کی موروثی خصوصیات کی حفاظت کے انداز سکھانے والا کون؟ کیا اتنا پیچیدہ، اتنا اہم سلسلہ حیات، آپ ہی آپ اتنا شعور یافتہ ہو گیا؟ یا کسی ہستی ایسی ہے جو مرئی اور غیر مرئی انسان کی داخلی اور خارجی اشیاء پر اپنی مکمل گرفت رکھتی ہے۔ ہر موجود چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا ہو یا بڑا سیال ہو ٹھوس اس کا مطیع ہے۔

تو ہماری سوچ اور عقل نے تو اس کے جمال کو اور درخشندہ دیکھا اور ملحدوں نے سمجھا کہ زندگی کا راز پا گئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ سب علمی سراب ثابت ہوا اور اب تک زندگی کے ذروں کے اردگرد کسی جسم کی دیواریں تعمیر نہ کر سکا۔ انسان کی اس جستجو اور شوق علم کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے آج سے چودہ سو سال پہلے ان الفاظ میں دیا:

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا O (الاسراء:۸۵)

ترجمہ: اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کے آخری اعلان کے حق ہونے کا یقین ہے۔ ارسطو سے لے کر آج تک "روح" کی حقیقت کو جاننے کی بڑی کوششیں ہوئیں۔ انسان کی عقل و دانش نے تحقیق کی بڑی وادیوں میں سر پٹکا لیکن آج تک "روح" کی حقیقت کا معمہ کوئی حل نہ کر سکا۔ اگر حل ہوا بھی تو اتنا ہی جس پر لفظ "قلیل" یعنی تھوڑے علم کا اطلاق ہو سکے۔

ایک سائنس دان لینز "Leens" نے بھی روح کے بارے میں تحقیق و تجربات کرتے ہوئے اپنی دریافت کا انکشاف یوں فرمایا: "پروٹین اور خلیہ، روح کے بنیادی عنصر ہیں۔ ایک نہایت چھوٹے اور پیچیدہ مرکب خلیے میں پانچ عناصر، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک پروٹینی مالیکیول "Molecule" ہوتے ہیں۔ یہ عناصر تقریباً ۴۰ ہزار جوہر "Atoms" پر مشتمل ہوتے ہیں۔ انہیں کے مرکب سے پروٹینی سالمہ وجود میں آتا ہے جس طرح حروف تہجی تعداد میں گنے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہی حروف جب جملوں اور عبارات میں تبدیل ہو جائیں تو پھر یہ لاتعداد ہو جاتے ہیں۔ اتنے ہی لاتعداد خوردبین کے بغیر نظر نہ آنے والے مالیکیولز پروٹین موجود ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد کسی میں زیادہ اور کسی میں کم بھی ہوتی ہے۔ ہم نے اس علمی انکشاف کو تسلیم کیا۔ اور اس تحقیق و تلاش علمی دریافت کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس لئے کہ اس عجیب و غریب نظام میں ہمیں اسی اب ذوالجلال کا جمال نظر آیا۔ عقل نے کہا۔ پروٹین زندگی کا بہت اہم جزو دریافت ہوا۔ مگر اس کا وجود تنہا زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے خلیے "Cell" کی ضرورت ہے اور خلیہ بھی تو اکیلا نہیں ہو سکتا اسے اعضا احتیاج ہے اور پھر اعضا بھی تو پورے جسم میں رگ و ریشے کا حصہ ہیں۔ یہی رگ و ریشے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ پورے جسم کا حصہ ہے۔ پروٹین نیم مائع شفاف شے (Protoplasm) کا جاری و ساری عمل تعمیر و تخریب "Metablosim" کارواں رواں سلسلہ۔ لمحہ بہ لمحہ ہر جاندار کے اندر ہونے والی مخفی تبدیلیاں قابل حیرت! ہمارے جسم میں عناصر کب ملتے اور بچھڑتے ہیں۔ اس وصال اور فراق سے کتنے ولولے جنم لیتے اور دم توڑتے ہیں۔ کتنی امیدیں بندھتی اور ٹوٹتی ہیں۔ کون ان کا

اندازہ کر سکتا ہے۔زندگی کا یہ پراسرار کارخانہ جس کی ابتدا بڑی مختصر "جنین" سے ہوتی ہے۔ جنین "Embryo-Foetus" ایک مختصر سا مرکب جس کو ہمارے مشاہدے اور تجربے آغاز زندگی کا نام دیتے ہیں۔ اس سے خلیوں کا کارواں چلتا ہے جس سے تذکیر و تانیث میں جسموں کی ساخت اور صورتیں ڈھلتی ہیں۔ اس پورے عمل میں کتنا نظم و ضبط ہے، تسلسل ہے، تناسب ہے، ترتیب ہے۔ اس ترتیب کو مرتب کرنے والا کون؟ نظم و ضبط کے خانوں میں تقسیم کرنے والا کون؟ بس اس کی دلیل تو اس انکشاف میں نظر آتی ہے۔ مگر روح کا اتہ پتا تو کہیں نہیں ملتا۔ اس لیے کہ روح کے بارے میں پورے علم کا حصول انسان کے مقدور میں نہیں ہے۔ مادہ ایک قانون کا پابند ہے لیکن ساخت قابل حیرت پیچیدہ اور مکینیکل نظام کو ترتیب دینا اس کے بس کی بات نہیں، آنکھوں اور دل کی حیرت ناک وادیوں کی تعمیر مادہ کے بس میں کہاں؟

حیاتیاتی مظاہر ایک طلسماتی جنگل ہیں۔ جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ مادی مظاہر کے برعکس حیاتی مظاہر کو جبرومقابلہ کی مساواتوں میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ انسان ایک انتہائی پیچیدہ ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ تو انہیں حرارت کی آگاہی ہو یا ریاضی کی کمیت و مساوات، طبیعی کیمیاوی مرکبات کے عمل اور ردعمل کے حیرت ناک نظام ہو یا عقل و دانش کی بصیرت، اس اکائی میں عنصر روح سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ صرف انسان ہی کیا حیوانات ہوں یا نباتات سب کی انواع و اقسام چرند و پرند اور تیرندے (دریائی مخلوقات) سب کے سب اس کی شان خلاقی کی منہ بولتی دلیل! اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ پھر انسان کی عقل و دانش سے مخاطب ہو کر خود کے خالق و پروردگار ہونے کا اعلان فرماتے ہیں:

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ۚ (الانعام:۳۸)

ترجمہ: اور زمین میں جو چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں۔

لیجیے، ڈارون نے جو انسان اور جانوروں کے اعضا، نظام تناسل و تولید کی مماثلت کو اپنے نظریۂ ارتقا کی حمایت میں دلیل پیش کی۔ اس دلیل کو اللہ تعالیٰ نے ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس جسمانی ساخت اور ان کی پیدائش سے تربیت کے آخری مرحلے تک جتنی بھی مماثلتیں ہیں وہ خود خلاق حقیقی ہی کی شان قدرت ہے۔ اس آیہ کریمہ کے آخری الفاظ "أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ" ـــ "تمہاری ہی طرح کے گروہ"ـــ بظاہر ان کی آنکھیں، کان، منہ، ہاتھ پاؤں نظامِ ہضم، اعضائے رئیسہ، اسی طرح نر اور مادہ ـــ اور اس سے متعلق تمام عوامل سب میں مماثلت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک نسل، ترقی کر کے دوسری نسل میں صدیوں بعد تبدیل ہو گئی۔

اپنی ذات برحق کی دلیل میں ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا:

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ○ (ھود:۶)

ترجمہ: اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمے ہے وہ جہاں رہتا ہے اسے بھی جانتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے اسے بھی۔ یہ سب کچھ کتاب روشن میں (لکھا ہوا) ہے۔

اور وہ اللہ ہر ایک کے مستقل ٹھکانے اور چند روز رہنے کی جگہ کو جانتا ہے۔ یہ سب باتیں کتاب مبین یعنی لوح محفوظ میں درج شدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے خالق ہونے کے ساتھ اس کی پرورش کی ذمہ داری کو اپنی ذات برحق کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ رزق ہی ہر جاندار کی بقا، خلیوں کی بقا، عناصر اور طبعی عوامل کے عمل کی اساس ہے۔ لہٰذا رزق دینا ہمارا کام ہے۔ ہاں کوشش اصولی طور پر ضروری ہے)۔

اس کے علاوہ اپنے خصوصی اختیارات اور قدرت کاملہ کا انسان کو احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا (ھود ۵۶)

ترجمہ: (زمین پر) جو چلنے پھرنے والا ہے وہ اس کو چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے۔

انسان کو ان سخت الفاظ میں چتاؤنی دی جا رہی ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ لاوارث ہو۔ تم ہماری مخلوق ہو اور ہمارے حق ملکیت نے تمہیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ کس کی مجال جو اس سے بچ کر نکل جائے۔

اپنی ذات برحق اور اپنی زبردست قدرت کی تفصیل بتا کر انسان کو خودسری سے بچنے کی ہدایت فرماتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰۤی اَرْبَعٍ ؕ یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ؕ (النور ۴۵)

ترجمہ: اور خدا ہی نے ہر چلنے پھرنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ تو ان میں سے بعضے ایسے ہیں کہ پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

اس آیہ کریمہ میں روئے زمین پر جیسی بھی مخلوق تمہیں (انسان) نظر آئے اسکے خالق ہم ہی ہیں چاہے وہ سمندر کی تہ میں ہو یا خشکی پر!

اور فرمایا:

وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ (البقرۃ:۱۶۴)

ترجمہ: اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلائے۔

ان تمام تعارفی ارشادات کے بعد انسان کی کم عقلی کا ذکر فرمایا:

وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ؕ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ۚ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ۙ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ۠ (النحل ۲۰۔۲۱)

ترجمہ اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی تو نہیں بنا سکتے بلکہ خود ان کو اور بناتے ہیں۔ (وہ) لاشیں ہیں بے جان، ان کو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ اٹھائے کب جائیں گے۔

اگر ہم عبادت کے صحیح معنوں سے واقف ہوں تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ عبادت سے مراد فقط۔ بتوں یا مذہبی پیشواؤں کی فرمانبرداری سے ہی نہیں بلکہ انسان جس کی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے اپنی مشکلات کو دور کرنے کی مانگ کرے۔ مثلاً اگر انسان آج کے اس دور میں علم کی حیرت ناک کامیابیوں سے مرعوب ہو کر اس علم کے ماہرین کے سامنے اپنی عقل اپنے شعور کے گھٹنے ٹیک دے۔

اسی حوالے سے انسان کی عقل و دانش سے فیصلہ کرنے کے لئے کہا گیا:

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ○ (النحل ۱۷)

ترجمہ: تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے؟

مطلب واضح ہے۔ انسان چاہے کتنی ہی ایجادات اور تخلیقات کا دعویٰ کرے لیکن اس کی ایجادات یا تخلیقات میں دو اساسی عنصر ضرور ہوتے ہیں۔ ایک تو نقالی اور دوسرے اللہ جل شانہٗ ہی کے پیدا کردہ مادی اسباب اور عطا کردہ عقل کی مدد۔ ان دونوں کے بغیر انسان اور مٹی کے بت میں کوئی فرق نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور روح کا خالق نہیں ہو سکتا۔

یہی دلیلیں جن لوگوں کی عقل قبول نہ کرے یا تعصب کے ذہنی مریض ہوں۔ ان کے بارے میں اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا٘ وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا٘ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (الاعراف ۱۷۹)

ترجمہ: اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں اللہ جل شانہٗ نے ایک مخصوص گروہ کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل حق بات سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ اس کا نام یا علامت بھی دیکھیں تو بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ حق نظر آئے تو آنکھ چرا کر نکل جائیں۔ حق بات کی آواز سنیں تو سنی اَن سنی کر کے کترا جائیں۔ ان کی فطرت ہی ایسی ہو چکی ہے، چوپایوں کی طرح ان میں حق اور ناحق کی تمیز ہی نہیں رہی۔ اپنے غرور علم میں اپنی زندگی کے انجام سے غافل ہیں۔ ورنہ کوئی نظر آنے والی مخلوق ایسی نہیں جس کو دیدۂ بینا دیکھے اور اس میں حسنِ پروردگار نظر نہ آئے۔ کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کی تخلیق کا حسن یہ نہ کہہ رہا ہو:

کون و مکاں شاہد وجود تو اند

جملہ اثبات وجود تو اند

ایک اور آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ انسانوں کے عقل و ہوش سے سوال فرماتے ہیں۔

اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ○ ۖ (الاعراف ۱۹۱)

ترجمہ: کیا وہ ایسوں کو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔

جدید دور میں انسان اللہ کی ذات کے سوا جس کو بھی صاحب اختیار یا اقتدار تسلیم کرلے وہ ہی شریک کہلائے گا۔ چاہے وہ مادہ ہو، انرجی ہو، جوہر ہو یا کوئی ایٹمی قوت!

اللہ جل شانہٗ بغیر ثبوت اور دلیل کے خود اپنی ذاتِ برتر کو بھی انسان کے سامنے پیش نہیں کرتے۔ خود

حجاب میں رہ کر انسان کو مکمل آزادی فکر و عمل دے رکھی ہے۔ انسان کی نافرمانیوں کے باوجود انسان کو اشرف المخلوقات کا دیا ہوا عہدہ چھینتے نہیں۔ قرآن مجید میں بار بار انسان کو اس کے خمیر میں پوشیدہ خرابیوں اور کمزوریوں کا نفسیاتی تجزیہ کر کے ان سے بچنے کے طریقے بتاتے ہیں۔ حق اور باطل میں مدلل فرق بتا کر اپنی محبتوں اور شفقتوں سے صحیح آداب زندگی کا درس دیتے ہیں۔ بار بار کائنات اور خود انسان کے اپنے اندر کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

عظیم شاہکار

اس ہیبت ناک بے حد و حساب وسیع کائنات، اس بیکراں دلکش و حسین کائنات کے واحد خالق و مالک کا سب سے عظیم شاہکار انسان اللہ جل شانہٗ کے جمال و جلال، اقتدار و اختیار کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کہتے ہیں جس نے انسان کو پہچان لیا اس نے اللہ کو پہچان لیا اور کہنے والوں نے یہ بات بھی بہت صحیح کہی کہ انسان جس قدر اپنی پہچان سے محروم رہتا ہے اسی قدر اپنے اللہ سے دور رہتا ہے۔ اور تمام سچائیوں کی ایک سچائی جس کو انسان کے عظیم محسن اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے شاہد و مبشر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے الفاظ کا تقدس بخشا ہے وہ یہ ہے:

من عرف نفسہٗ عرف ربہ۔

(جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا)۔

اور جس نے اس صادق و امین رحمت للعٰلمین کے ارشاد کی تصدیق اپنے عمل سے کی اس نے اپنے اللہ کو بھی اور اپنے آپ کو بھی پہچان لیا۔

انسان جس کو باقی تمام موجودات سے برتری کا مقام حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عزتیں ہیں، قوتیں ہیں جن کا نام ہے عقل، علم، ارادہ اور قدرت!

اس کے برعکس مادہ "Matter" کو نہ عقل میسر، نہ اسے خیر و شر سے کوئی نسبت ہے۔ صرف انسان ہی کو وہ عظمت ہے جسے علم حاصل کرنے کی استعداد، اپنے آس پاس شش جہات کے مظاہر و شواہد کی پہچان کی قدرت اور انسان ہی کو ارادہ کی بے پناہ قوت حاصل ہے۔ انسان ہی کو اپنے مدمقابل سے ٹکرانے کی سوجھ بوجھ حاصل ہے۔ انسان ہی ہے جو نفرت بھی کر سکتا ہے، محبت بھی، یہ انسان ہی ہے جس کا تصور ایک لمحہ میں صدیوں کا سفر طے کر کے حقائق کو معلوم کر سکتا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو جہالت کے اندھیروں میں علم کے روشن شہر آباد کر سکتا ہے۔

اس کائنات کا دولہا۔۔۔ اشرف المخلوقات انسان چاہے تو کائنات کے خدوخال بگاڑ دے، چاہے تو اس کے نقش و نگار سنوار دے۔ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دل کی بات کہنے کی وہ قدرت بخشی ہے، وہ اثر دیا ہے کہ پتھر کو موم بنا دے، فولاد کو پگھلا دے۔

فلسفہ اور کلام میں یہ مہکتا ہے، چاہے تو منطق کی محفلیں سجا دے، چاہے تو عقل و دانش کی روشنی میں

ماحول کو جگمگا دے۔ یہی حضرت انسان ہی تو ہے جو اپنے اللہ کی عظمتوں کی سب سے بڑی دلیل ناطق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس شاہکار اعظم پر اپنی عنایتوں کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○ (الرحمٰن۔ ۱۔۴)

ترجمہ (خدا جو) نہایت مہربان۔ اسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اسی نے اس کو بولنا سکھایا۔

رحمٰن، بے حد و حساب ہر وقت مہربان اللہ جس کا انسان پر سب سے بڑا احسان قرآن کی تعلیم ہے۔ اس تعلیم میں کیا کیا کمال ہیں۔ کیا کیا حکمتیں ہیں۔ ان سے فیض یاب ہونے کے بعد انسان کو کیسا عروج نصیب ہوتا ہے۔ ان کو الفاظ بیان کرنے سے عاجز ہیں۔ اس کے بعد تمام مخلوقات میں خلقت میں صورت میں جسم کے تناسب میں عقل میں غرض تمام خوبیوں میں یکتا اور اس کے بعد اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کی قدرت۔۔۔ ایسی قدرت کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے بول فضا میں امن کی خوشبو پھیلا دیں اور برے بول، فساد کی عفونت! انسان اللہ کی اس دی ہوئی نعمت پہ غور کرے تو یہیں گم ہو کر رہ جائے۔

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○ (العلق: ۳۔۵)

ترجمہ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا۔

انسان۔۔۔ اس فرمان پر غور کر لے تو وہ یہ بات ماننے پہ مجبور ہو جائے گا کہ علم اور قلم ہی انسان کے شرف کی بنیاد ہے۔ اور یہ اس اللہ تعالیٰ کا ہی احسان ہے کہ وہ انسان کو وہ تمام علم دیتا ہے جنہیں حاصل کرنے کے بعد وہ حیران کن ایجادات کی صلاحیتوں کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ اللہ ہی کا کرم ہے کہ انسان کو وہ تمام باتیں بتائی جاتی ہیں جس کا اسے پہلے علم نہیں ہوتا۔ بہت زیادہ علم حاصل کرنے کے بعد احسان فراموش انسان اس کی ذات ہی سے انکار کر دے! مادے کو اپنی عقل و دانش کا سرمایہ سمجھ بیٹھے۔۔۔ مادہ بھی کیا۔۔۔ اسکی حقیقت بھی کیا۔۔۔ نہ اسے عقل نصیب، نہ اسے ارادہ کی توفیق، نہ اسے اپنے تغیر و تبدل پہ اختیار۔ حیرت ہے کچھ عقلمندوں کا ٹولہ اس کی کیچڑ بھری گود کو اپنی ماں بنانے کے لئے کیوں مصر ہے جب کہ اس کے مقابلہ میں وہ خود عقل و دانش کی ایسی بے پناہ قوت کا مالک ہے کہ چاہے تو سورج کی شعاعوں کو مٹھی میں لے لے۔ دریاؤں، سمندروں اور طوفانوں کا رخ موڑ دے، چاند کو پاؤں کی دھول بنا کر دور کہکشاؤں کو راہگزر بنا کر بلندتر ثواقب و سیار تک پہنچ جائے۔ اس عالم محسوس کے ہر اندھیرے کو چاک کر کے اس میں دفن خزانے نکال لائے۔ اس کی نظر ایسی کہ پتھروں کو ریزہ ریزہ کر دے، اس کی زبان ایسی کہ تلوار سے زیادہ کاٹ کرے اور اکسیر سے زیادہ تریاق۔ یہ فن سخن میں ایسا ماہر کہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ منوا لے۔۔۔ اتنا دانا اور اپنے محسن حقیقی کو نہ پہچانے، حیرت ہے۔۔۔ اسے زندگی دینے والا، عقل دینے والا، فکر عطا کرنے والا، تدبیر اور تکمیل کا تصور بخشنے والا محسن۔ اپنی کھلی ہوئی نشانیاں بتا بتا کر کہہ رہا ہے۔۔۔ انسان تو میری عظیم مخلوق ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز پہ تیرا تصرف میں نے تیرا مقدر بنا دیا ہے۔ اس میں سے جو کچھ بھی تمہارے فائدے میں تمہیں نظر آئے اسے تو لے لے۔ میں نے

تیرے دل سے اس کی ہیبت علم کے ذریعہ نکال دی ہے۔ انسان ..... ذرا عقل سے کام لے، احسان فراموشی اچھی بات نہیں۔ احسان کرنے والے کا کچھ نہیں بگڑتا ہے، احسان فراموش خود اپنی نظروں سے آپ گر جاتا ہے۔ مجھ سے انکار کر کے تو آپ مشکل میں گھر جائے گا۔ میری ذات کا اعتراف ہی سچائی ہے اور سچ ہی کو عزت ہے۔

ایک بار پھر سن لیجئے۔ جب ہم مسلمان کسی انسان کو کسی بہت بڑی مہم میں کامیاب دیکھتے ہیں تو ہمارا ایمان اور طاقتور ہو جاتا ہے۔ وہ ذات جو ہمیں نظر نہیں آتی، جس کو ہماری نظریں دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتیں، اس نے اپنی موجودگی کے ثبوت میں جتنی باتیں قرآن حکیم میں کہی ہیں وہ آج ایک ایک کر کے ہمیں نظر آ رہی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسان کو پیدا کرنے والے نے اپنے خالق ہونے کی جتنی علامتیں بتائی ہیں وہ سب کی سب تابندہ و درخشاں موجود ہیں اور جنہیں یہ سب معلوم نہ ہوں اس انسان سے ہماری درخواست ہے کہ آ تھوڑی دیر کے لئے دل اور دماغ کو آزاد کر کے سن ذرا غور سے سن! اپنے محسن حقیقی کی بات بھی سن!

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ ۳۱)

ترجمہ: اور اس نے آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔

کیا یہ سچ نہیں کہ تمام انسانوں کے علم کی ابتدا اور انتہا کا انحصار اشیاء کے نام اور پہچان سے ہوتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اشیاء کی صفات کی یاد اشیاء کے نام رکھے بغیر ممکن ہی نہیں ..... اور سنو!

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ق (البقرہ ۲۹)

ترجمہ وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں۔

کیا سچ نہیں کہ انسان زمین کے سینہ کو چاک کرنے پہ قادر ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ انسان زمین پہ موجود صحرا ہو یا سمندر، پہاڑ ہوں یا بستیاں، میدان ہوں یا کھیت، انسان کو ان سب پر اختیار نہیں؟

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا (ھود ۶۱)

ترجمہ: اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا۔

کیا یہ سچ نہیں کہ انسان کا بدن، انہی عناصر کا مجموعہ ہے جو زمین میں موجود ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ انسان اسی زمین پہ آباد اور شاد رہ سکتا ہے۔

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ ط قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ O (الملک ۲۳)

ترجمہ: اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ (مگر) تم کم احسان مانتے ہو۔

کیا یہ سچ نہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھ اور دل جیسی وہ نعمتیں عطا کی ہیں کہ ان کے فوائد کا اعتراف نہ کرتے والا سب سے جھوٹا، ناشکرا اور ناانصاف ہے۔ ہمارے تمام علوم حاصل کرنے کے ذرائع کان آنکھ اور دل ہی تو ہیں، اگر نہیں تو ثابت کرو اور ثابت نہ کر سکو تو پھر مانو کہ اللہ جل شانہٗ ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ O لا وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیْنِ O لا وَ هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ O لا (البلد ۸-۱۰)

ترجمہ بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)۔ (یہ چیزیں بھی دیں) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیے۔

کیا یہ سچ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو آنکھیں دی ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ بات کہنے کے لئے زبان دی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں زبان ہوتے ہوئے بھی جس کی زبان کے اعصاب نکمے ہو جائیں تو وہ کتنی تکلیف دہ کیفیت ہوتی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو ہونٹ دیئے ہیں۔ ان ہونٹوں کے اوصاف پر کئی جلدیں لکھی جاسکتی ہیں اور ان تمام احسانات پر سب سے بڑا احسان انسان کو اچھے اور برے کا شعور بخشا ہے۔ کہنے والے کے یہ تمام دعوے سچے مانتے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا سچ ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق ہے۔

اس شہر کا نام انسان ہے

اس کا حدوداربعہ بڑا مختصر بھی ہے اور بے حد و حساب وسیع بھی، اس کی بنیادیں بہت ہی مضبوط بھی اور کمزور بھی۔ اس کی تقسیم و تقویم بڑی لاجواب بہت ہی انتہائی احسن۔ اس کے خانوں کی تقسیم "Distribution" بڑی ہی منفرد، ان کا باہمی اتصال "Sahre Between" اور دیواریں اس کے ستون "Pilars" اپنی صفات میں ممیّز!

اس کی نظر، اس کے سانس، اس کی ٹیلیوں کے منظر، اس کے محلوں کی فضائیں، روح افزا بھی روح فرسا بھی، یہ اپنے رویہ میں رحمت بھی زحمت بھی، ظلم و وحشت کا لاوا بھی شفقت و ترحم کا سایہ بھی۔ حلم کی شبنم جبر کا شعلہ بھی، شجاعت کی آبرو بھی، بزدلی کی رسوائی بھی۔ تکبر کی پھنکار بھی، تواضع کی بہار بھی۔ ہدایت کا نور بھی، گمراہی کا اندھیرا بھی۔ بخیلی کا سراب بھی، سخاوت سے شاداب بھی۔ پستی کا عاشق بھی، بلندیوں کا فاتح بھی۔ نفرتوں کی گرد آلود آندھی بھی اور محبتوں کا شفاف آب حیات بھی۔ بغض و عناد کا پیکر بھی، وفا و ایثار کا شاہکار بھی۔ احساس و جمال کا حرم بھی، حرص و ہوس کا زہریلا دھواں بھی، حمیت و مروت موج رواں بھی۔ یہ شہر جس کا نام انسان ہے یہ خود آگاہ، خودبیں بھی، خودفراموش بھی، خاموش بھی فغاں بھی، وصال بھی فراق بھی۔ یہ آشنائے اسرار و رموز بھی، یہ منکشف رازداں بھی۔ یہ عیار بھی، یہ راست گفتار بھی۔ یہ زاہد بھی، یہ رند بھی۔ یہ ھمہ انسان۔۔۔ یہ صاحب خطا بھی یہ منبع عطا بھی۔

اس کا معمار کون ہے؟

مادہ، بے جان، مردہ۔۔۔ مردے کیسے زندگی دے سکتے ہیں؟ نہیں عقل نہیں مانتی! اس کو نہ ارادہ کی قوت حاصل، نہ اچھے برے میں تمیز حاصل۔

کیا الیکٹران اور نیوٹران؟ یہ تو خود زندگی اور موت کی کشمکش کا شکار۔۔۔ تو کیا عناصر کی ترکیب مرکب، اس کی معمار ہے۔۔۔ یہ گوشت پوست تو دے سکتے ہیں۔ ان کو شعوری اوصاف سے کیا واسطہ! غصہ کیا؟ محبت کیا، وفا کیا، ایثار کیا؟ اور پھر زندگی ایک متلاطم طوفان۔ ایک متحرک حرارت، بس اسی کا کھوج توانسان خود لگا رہا ہے۔ انسان کے اس شہر کا مطالعہ کرنے والے حیران و پریشان۔۔۔ سب بھانت بھانت کی بولیاں۔۔۔ کسی کو اپنی دریافت پر یقین نہیں آتا۔ جب سے انسانی عقل کی کڑیاں ماضی کے محققوں سے ملتی ہیں بس یہی پتہ چلتا ہے کہ کچھ پتہ چلا بھی کچھ نہیں بھی۔۔۔ لیکن ایک صدا۔۔۔ بار بار فضاؤں میں گونجتی ہے۔ اس کی زبان عربی ہے۔ اس کی آواز میں صادق و امین نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقدس اور یقین ہے آواز آتی ہے:

وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (الاسراء ۸۵)

ترجمہ: اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے۔

حکم کے ساتھ --- اپنی خصوصی صفت ربوبیت یعنی "رب" کو جوڑ دیا۔ گویا اس روح کو سمجھنے کی کوشش کرنے والو! یہ میرا حکم ہے اور اس کی تفصیل کا نام روح ہے تم اسے اتنا ہی سمجھ سکتے ہو۔ اسی حد تک ہی تمہیں علم بھی دیا جائے گا۔

لیکن اس جواب سے غیر مطمئن انسان اور زیادہ پریشان ہوا ہے۔ تجسس کی وادیوں میں بھٹکا تو ارشاد ہوتا ہے۔ ادھر ادھر مت بھٹکو۔ میں ہوں یعنی اللہ جل شانہٗ جس نے ---

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَاO ص لا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَاO ص لا (الشمس ۷۔۸)

ترجمہ: اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے اعضاء کو برابر کیا اور پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔

اس شہر انسان کی آبادی اور رواں دواں رونق "جان" بہت ہی عظمت والی ہے۔ اس لئے اس کی قسم کھائی گئی اور اس جان کی اہمیت کے بعد اوصاف میں اس کا متوازن ہونا بھی اتنا ہی اہم ہے۔ فرض کیجئے آپ کے سانسوں میں ایک سانس جو اندر کی طرف جاتا ہے اور دوسرا جو باہر۔ ان دونوں میں سے ایک کا توازن بگڑ جائے تو آپ کا کیا ہوا؟ دمہ یا سانسوں کی بیماریوں کی نوعیت اور تفصیل امراض کی کتابوں میں پڑھ لیجئے۔ حضرت انسان اتنا ہی نہیں بلکہ ہم نے اسے پیدا کرنے کے بعد اچھی (Good) اور بُری (Bad) عادتوں "Habits" اور رویوں "Behaviours" کی پہچان کے اہل ہونے کا شرف بھی بخشا۔

اس اعلان نے انسان کے شہر کا معمار کون ہے۔ واضح کر دیا۔ اس شہر کا معمار صرف اللہ جل شانہٗ ہے اور اللہ جل شانہٗ اس کے خالق و معمار ہونے کا اعلان ان دلائل کے ساتھ فرماتے ہیں۔ جنہیں انسانی عقل، علم اور شعور تسلیم کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ آج تک انسان کے اچھائی اور برائی کا اہل ہونے کی تردید نہیں کر سکا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی دلیل، ناقابل تردید ہے۔

اس کے بعد اس شہر انسان کے مالک و خالق نے جہاں یہ شہر آباد ہے اس زمین کو جس پر اس کا وجود ہنگامہ خیز ہے۔ اس کو اپنے مالکانہ حقوق کے اثبات میں پیش کرتے ہوئے فرمایا:

وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَO لا (الذاریات:۲۰)

ترجمہ: اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

(یقین) یعنی یکسوئی سے موصوف علم جس میں شک و شبہ دُھند شامل نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا۔

وَ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَO (الذاریات:۲۱)

ترجمہ: اور خود تمہارے نفوس میں۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں۔

آج ماہرینِ نفسیات کی دریافتوں کو بڑی اہمیت دینے والے ذرا سوچیں۔ انسانی نفسیات کی اہمیت کا

اظہر..... انسان کے خالق کے سچا ہونے کا ثبوت ہے۔ کیا اس انسان کے اندر کے شہر اپنی اپنی خصوصیات میں، اچھائیوں اور برائیوں میں جس احسن طریقہ سے اپنے اپنے خانوں میں مقید ہیں۔ کیا مادہ میں یہ اہلیت ہے کہ وہ اس قسم کا کارنامہ انجام دے سکے۔ توازن صناخت و ثقل۔ عناصر اور انرجی۔ غرض جسے بھی اس انسان کی تخلیق کا بیج ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ اس کو اطلاق، رویہ، سلوک، برتاؤ، احساسات، جذبات، ملکات، میلانات، سے کوئی تعلق ہے کیا یہ انسان جسے صرف مٹی کا کھیل، فطرت کے قوانین، خودکار قوانین کا ثمر ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس مٹی میں، اتنے محاسن و معائب کی تقسیم کی صلاحیت ہے؟

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گذر جا
ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے ہیں اس قلزم خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے

انسان کی زندگی، اللہ کی دلیل، اس زندگی کے اسرار و رموز اللہ جل شانہٗ کی دلیل، رنگ و بو کی بکھری ہوئی اقسام اللہ جل شانہٗ کی دلیل، اس کائنات کی آبادیوں میں، وجودوں میں، سب سے اہم وجود، سب سے اہم آبادی انسان کے کارنامے اللہ کی دلیل..... اس کا عجیب و غریب اخلاق، عادات، رویے اور ان کی تنوعات اللہ جل شانہٗ کی دلیل، انسان کے اندر کی دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ کی دلیل۔ ان تمام دلائل کو دیکھ کر بھی سن کر بھی اس جل شانہٗ کی ذات کو تسلیم نہ کرنا، انسان کی عالمانہ سب سے بڑی گمراہی ہے اور انجام کار تباہی ہے۔

یہ ضد کیسی؟

سائنس دان بے گنت ان دیکھی حقیقتوں کا وجود تسلیم کرتے ہیں۔ بقول سر آرتھر ایڈنگٹن (Sir Arthur Eddington) اپنی کتاب "Nature of Physical World" کے صفحہ نمبر 8-7 میں لکھتے ہیں۔ "دورِ جدید کا سائنس دان جس میز پر کام کر رہا ہے وہ بیک وقت دو میزیں ہیں۔ ایک تو وہی جو ہمیشہ سے عام انسانوں کی میز رہی جس کو چھونا اور دیکھنا ممکن ہے اور دوسری میز اس کی وہ علمی میز "Scientific Table" ہے جس کا بیشتر حصہ خلا ہے۔ جس میں بے شمار ناقابل مشاہدہ الیکٹران دوڑ رہے ہیں۔ اسی طرح ہر چیز کے مثنّیٰ "Duplicates" ہیں جن میں سے ایک تو قابل مشاہدہ ہے اور دوسرا تصوراتی ہے جسے کسی بھی خوردبین یا دوربین سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

اس کا مطلب ہے۔ ایک ہی طریق استدلال سے اگر کوئی خالص طبیعیاتی نوعیت کا واقعہ ثابت ہو تو آپ اس کو فوراً قبول کر لیں۔ پھر اعلان ہو، پھر ان کی تائید مزید پہ مسلسل تحریر و تقریر کا سلسلہ چلتا رہے۔ لیکن الٰہی نوعیت کی حقیقت ثابت ہو جائے تو اسے آپ رد کر دیں اور اسے غیر ترقی پسندانہ ذہن کی اپج قرار دے دیں۔ ایں چہ بوالعجبی است؟ ..... ایسے ہی الٰہی نوعیت کے حقائق کی تفصیل ہے۔

یہ اس نوعیت کے واقعات ہیں جن سے صرف ہم ہی نہیں بلکہ آپ، آپ کے ساتھ سبھی کے سبھی ان حقائق سے آشنا ہیں۔ لیکن ان حقائق کے حجاب میں کون ہوتا ہے۔ اس کو تسلیم کرنے میں کچھ لوگ ہچکچاتے ہیں اور کچھ اسے "اتفاق" کا نام دے کر خود فریبی کی عادت دہرا کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ہیں۔

یہ ہستی کون ہے

یہاں تو تنہائی ہے، سناٹا ہے، حد نظر تک اندھیرا ہے۔ اندھیروں کی گھات میں جان لیوا خطرے ہیں۔ ہمت دم توڑ چکی ہے۔ دور تک آواز سننے والا کوئی نہیں۔ اضطراب، بے چینی نے بُری طرح گھائل کر دیا ہے۔

اب یہ کون ہے جس کی طرف انسان کی امید نے رخ پھیرا ہے۔ یہ کون ہے، جس کو ہماری آہوں، آنسوؤں اور کپکپاتے ہونٹوں نے بے کسی اور عاجزی کی زبان میں پکارنا شروع کر دیا ہے۔ یہ زبان کیسی اس میں آواز کیسی؟ لرزتی اور خاموش آواز کون ہے جس کو پکار رہی ہے؟ اسے پکارنے والے نے دیکھا تو نہیں۔ اس کو وہ اتنا جانتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے، وہ بااختیار ہے، وہ سب پہ غالب ہے اور وہی ہے جو ہماری مایوسیوں کے روح فرسا اندھیروں سے نکالے۔ اسی کا ہاتھ ہمیں بلاؤں کے جبڑوں سے نکال سکتا ہے۔ کون ہے وہ؟۔۔۔ اور کیا وہ نہیں ہے' وہ ہے، ہم سب نے ایسے لمحات میں زندگی میں ایک بار نہیں کئی بار اس کی مدد پائی ہے۔ وہ اپنی قدرت کے حجاب میں کئی بار ہماری روح کو چھو چکا ہے، وہ جو ہماری روح کو چھونے اور ورائے حجاب ہے، وہ اپنا تعارف یوں کرواتا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○
(الانعام:۴۰)

ترجمہ: کہو (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آ جائے یا قیامت آ موجود ہو تو کیا تم (ایسی حالت میں) خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ اگر سچے ہو (تو بتاؤ)۔

اگر تم سچے ہو؟

صداقت پسند اس شخص کی تعریف ہے جو حقائق کو چاہے وہ اس کے نظریات کے مخالف ہوں اس کی خواہش کے مخالف ہوں۔ اس کی شخصیت کو گرا دینے والے ہوں وہ ان کو تسلیم کر لے۔ اب اس حقیقت میں دو اختیار کارفرما ہیں۔

ایک تو وہ ۔۔۔اختیار۔۔۔ جو مصیبت میں پکار رہا ہے، مدد کے لئے فریاد کر رہا ہے۔ دوسری وہ ہستی! اختیار کل جو بظاہر تو نظر نہیں آتی ہے مگر مصیبت میں گرفتار اسے رو رو کر بلبلاتے ہوئے بچے کی طرح امداد کے لئے بلا رہا ہے۔

یہ ہستی نظر تو نہیں آتی لیکن مدد کی زبان میں مانگنے والے کو دینے کی زبان میں، رونے والے کو ہنسانے کی زبان میں، مایوس کو امید کے لفظوں میں، پریشان کو سکون کی عبارت میں، بتاتے ہیں وہ۔۔۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ○ ۶ (الانعام:۴۱)

ترجمہ: (نہیں) بلکہ (مصیبت کے وقت تم) اسی کو پکارتے ہو تو جس دکھ کے لئے اسے پکارتے ہو وہ اگر چاہتا ہے تو اس کو دور کر دیتا ہے اور جن کو تم شریک بناتے ہو (اس وقت) انہیں بھول جاتے ہو۔

اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا انسان کی تمام نفسیاتی کمزوریوں اور کیفیتوں کا تجزیہ سچائی کو قبول کرنے

والے عقلمندوں کو اللہ جل شانہٗ کی عظمتوں کو ماننے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو گی۔ لیکن وہ جنہیں ضد کی عادت نے گمراہی اور کج روی کو صحیح اور درست ماننا مرغوب بنا دیا ہو۔

یسے ہی حالات جن سے انسان کے مشاہدے اور تجربے کی دنیا کبھی انجان نہیں رہ سکتی اور ایسے حالات میں انسان ایسی ہی کیفیات کے علاوہ کسی دوسری کیفیت کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ ان میں بھی کس کی ہستی ہمدردی اور غمخواری کے جواب میں ہماری ریزہ ریزہ بکھری ہوئی شخصیت کو مجتمع کرتی ہے؟

غور فرمایئے اس غم گسار و ہمدرد ہستی، رحمٰن و رحیم ہستی کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ (یونس: ۱۲)

ترجمہ اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور کھڑا (ہر حال میں) ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں تو (بے لحاظ ہو جاتا اور) اس طرح گزر جاتا ہے۔

تکلیف کی نوعیت ناکامیاں ہوں یا مخالفتوں کے دکھ، بے چارگی یا بے سہارگی میں مظلومیت کا درد ہو یا بیماری کا اضطراب۔۔۔۔ غرض اللہ تعالیٰ (تکلیف) کی نوعیت کو اجتماعی طور پہ بیان فرما کر انسان کی فطرت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ اس نفسیاتی تجزیہ میں جتنی صداقتیں ہیں اس سے کہیں زیادہ یہ صداقت ہے کہ ان نفسیاتی تجزیوں کی زبان میں وہ ہستی مطلق بات کر رہی ہے جو بلاشبہ خالق کائنات اور خالق جن و انس ہے۔ اسی آیہ کریمہ میں اس کے بعد کے حصہ میں فرماتے ہیں:

كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝(یونس۔۱۲)

ترجمہ۔ کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے نکل جانے والوں کو ان کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے گئے ہیں۔

قرآن حکیم میں ایک اور جگہ واقعہ کی منظرکشی کے ساتھ عصبیت کی نوعیت اور انسانی رد عمل اور عمل کا نفسیاتی تجزیہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ (یونس: ۲۲۔۲۳)

ترجمہ وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں (سوار) ہوتے ہو اور کشتیاں پاکیزہ ہوا (کے نرم نرم جھونکوں) سے سواروں کو لے کر چلنے لگتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں تو ناگہاں زناٹے کی ہوا چل پڑتی ہے اور لہریں ہر طرف سے ان پر (جوش مارتی ہوئی) آنے لگتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (اب تو) لہروں میں گھر گئے۔ تو اس وقت خالص خدا ہی کی عبادت کر کے اس سے دعا مانگنے لگتے ہیں کہ (اے خدا) اگر تو ہم کو اس سے نجات بخشے تو ہم (تیرے) بہت ہی شکرگزار ہوں۔

لیکن جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔

پھر وہی سچائی

مشاہدے اور تجربے کی میز پر بیٹھا ہوا انسان اللہ کی ذات سے نہ صرف خود منکر ہے بلکہ دوسروں کو اپنے علم اور تجربوں سے منکر بنانے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ یا ایسا انسان ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کچھ دوسرے سہاروں کو اللہ تعالیٰ کے متبادل طاقت مانتا ہے۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اس اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے، اس پر یقین رکھتا ہے، اسے قادر مطلق تسلیم کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کسی خاص انسان کو نہیں بلکہ سبھی انسانوں کو اس مشاہدے اور تجربے کی میز کے اردگرد بیٹھے ہوئے ایسے واقعات اور کیفیات کی یاددہانی کراتے ہیں جو الیکٹران یا نیوٹران مشاہدے کی طرح سائنس دان کی ایجاد کردہ دوربین یاخوردبین کا محتاج نہیں یا اس مشاہدے اور تجربے کے ردعمل کی کیفیات کو چاند گاڑی یا راکٹ میں سوار ہو کر ہی محسوس کرنے کا ضرورت مند نہیں۔ اس تجربے مشاہدے واقعے اور حقیقت سے غریب، امیر، کالا، گورا، جاہل، عالم، غرض ہر انسان آشنا ہے یا ہو سکتا ہے۔ اب اسے خود دیکھ کر محسوس کر کے بھی اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ سے انکار کرنے کی ضد میں اس حقیقت کو "اتفاق" کا نام دے دے تو یہ عقلمندی ہے یا نادانی آپ ہی فیصلہ کیجئے!

ایک اور تجربے مشاہدے اور واقعہ کے حجاب میں اللہ جل شانہٗ کی دلیل۔

قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً ۚ لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ○قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ○(الانعام ۶۳۔۶۴)

ترجمہ: کہو بھلا تم کو جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں سے کون مخلصی دیتا ہے (جب) کہ تم اسے عاجزی اور نیاز پنہانی سے پکارتے ہو (اور کہتے ہو) اگر خدا ہم کو اس (تنگی) سے نجات بخشے تو ہم اس کے بہت شکرگزار ہوں۔ کہو کہ خدا ہی تم کو اس (تنگی) سے اور ہر سختی سے نجات بخشتا ہے پھر (تم) اس کے ساتھ شرک کرتے ہو۔

پھر وہی سوال ــــ اور پھر وہی جواب اے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ان سے کہئے کون ہے جو تمہیں خشکی یا سمندروں کے وحشت ناک اندھیروں سے نجات دلاتا ہے؟ (ذرا بتاؤ تو) کون ہے وہ جسے تم کسی بھی مفروضہ تصور معبودیت (Concept of Worshipped) کے ساتھ، سسکیاں لے لے کر، رو رو کر، پوشیدہ طور پہ۔ (یا یوں کہہ لیجئے جب انسان کی آواز انتہائی خوف سے گلے میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ انسان کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا) کہتے ہو۔ اگر تم نے ہمیں نجات دے دی تو ہم زندگی بھر تیرے شکرگذار رہیں گے؟

اس سوال کاجواب اگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس واقعہ اس تجربے اور مشاہدے میں میرے اختیار و اقتدار کی حقیقت کا صحیح نام نہیں آتا تو اس کا نام ہے اللہ جل شانہٗــــ وہی تمہیں ہر درد و کرب ہم مصیبت و غم سے نجات دیتا ہے۔ (اور تمہاری پہچان بھی میں تم سے کروا دوں) تم (اے انسان) کسی نہ کسی کو ہمارا شریک ٹھہراتے ہو! کبھی علم کو، کبھی عقل کو، کبھی مادہ کو، کبھی شمسی توانائی کو، کبھی مٹی کی دلدل کو، کبھی خود تراشیدہ بتوں کو، کبھی مظاہر کائنات کو!

ایک اور زاویہ

ارشاد ہے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ (النمل ۶۲)

ترجمہ بھلا کون بیقرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے۔

اب یہ ہر انسان کی زندگی کا وہ تجربہ اور مشاہدہ ہے یعنی یہ وہ علم کی میز ہے۔ جس کے لئے نہ ہی دریا، سمندر، ہوائی جہاز، پہاڑوں اور ریگستانوں کے اندھیروں اور دوسری بلاؤں میں گھرنے کی ضرورت ہے بلکہ ہم بھری دنیا میں ہیں۔ آپ بیمار ہیں۔ ڈاکٹر بھی موجود ہیں، اسباب بھی موجود ہیں، ہمدرد بھی خون دینے کو تیار، اپنی جان دینے کو تیار کھڑے ہیں، مگر درد و کرب ہے کہ اس کا کوئی مداوا ہی نہیں۔ نہ دوا کارگر، نہ ہم دردوں کی ہمدردی کام آ رہی ہے۔ سب سامنے ہیں، سب نظر آ رہے ہیں، سب سے مایوسی ہی ملی۔ اب وہ جو نظر نہیں آتا ہے وہ آرام اور راحت دینے والا کون؟ جسے آپ پکارتے ہیں وہ کون؟ آپ نہیں جانتے، نام نہیں آتا تو یاد رکھو اس کا نام اللہ جل شانہٗ ہے۔

کچھ اعلانات

اپنے مشاہدوں اور تجربوں کے حجاب میں اللہ جل شانہٗ کا جمال و کمال دیکھنے والوں کے چند اعلانات سنیئے:

اکتوبر ۱۹۴۴ء کو شائع شدہ ریڈر ڈائجسٹ میں اس اعلان کا عنوان تھا: (کیا تمہیں صلوٰۃ (نماز) اور دعا پہ یقین نہیں؟) یوں تو بے شمار ایسے مشاہدات اور تجربات ایسے ہیں جن سے دوچار ہونے کے بعد کوئی بھی صاحب ہوش صلوٰۃ اور دعا کی فضیلت اور قوت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ لمحے جب بڑے بڑے بہادروں کے اوسان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، جب کوئی سہارا، کوئی طاقت مددگار نظر نہیں آتی جس کی صحیح کیفیت اور نوعیت سے واقف یا تو میدانِ جنگ میں لڑنے والے سپاہی یا طوفانوں میں گھرے ہوئے سمندری بیڑوں کے مسافر واقف ہوتے ہیں۔ سچائی اور خلوص کے ساتھ صلوٰۃ و دعا کرنے والوں کو دیکھنا ہو تو اس ہوائی جہاز کے مسافروں کو دیکھو جنہیں انتہائی بلندی میں پرواز کرتے ہوئے طیارہ کا پائلٹ خبردار کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے۔ "طیارہ میں کسی نامعلوم فنی خرابی کی وجہ سے ہم سب خطرہ میں ہیں"۔ اس وقت جب زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے بچانے والا کوئی ذریعہ نہیں ہے ان لمحات میں بے چارگی کے یقین کے ساتھ ہی بے ساختہ باطنی شعور یا روح اُس اَن دیکھی قوت کو امداد کے لئے خود بخود پکارنے لگتی ہے۔

ایک ایسا ہی واقعہ جس میں میں ایک نہیں بلکہ ۹۰ افراد شامل تھے، اس وقت پیش آیا جب نیوجرسی جاتے ہوئے آسٹریلیا کے راستہ میں ہمارا طیارہ سمندر میں گرا۔ اس میں سے بمشکل ۹۰ افراد ایک ریتلے جزیرے پر پہنچ گئے جہاں نہ ہی کوئی سایہ، نہ سر چھپانے کی جگہ۔ ہمارے پاس نہ اناج کا ٹکڑا، نہ پانی کا قطرہ۔ چاروں طرف غضب ناک سمندر۔ رابطہ کے تمام ذرائع مفقود! ہم سب کے چہروں کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ بدحواسی دماغوں پہ مسلط ہو چکی تھی لیکن ایک شخص پر ہربرٹ نانذر انتہائی اطمینان کے ساتھ ہاتھ میں تسبیح لئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ دن

کو دھوپ کی سخت گرمی کی وجہ سے چہرے جھلس گئے۔ زبانیں متورم ہو گئیں۔ سب ایک دوسرے سے متنفر ہونے لگے لیکن ایک بار سب نے مل کر اس ان دیکھی ذات سے رو رو کر نجات پانے کی دعا مانگی۔ تیسرے دن سورج غروب ہونے سے پہلے تین کشتیاں اس جزیرے کے کنارے کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔ سب کے سب ان کے استقبال کے لئے بھاگے تو دیکھا۔ ان کشتیوں میں سوار آدمیوں کے رنگ کالے تھے، سر کے بال سفید اور گھنگھریالے تھے جو دریائی شکار کے لئے کئی میلوں کا سفر کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر ادھر نکل آئے تھے۔ اس طرح موت کے جبڑوں سے ہماری دعاؤں کی مقبولیت نے ہمیں نکال لیا۔ ان دعاؤں کا قبول کرنے والا کون تھا۔ ان شکاریوں کو انجانے طور پر اس جزیرے کی طرف دھکیلنے والا کون تھا؟

۱۰ جنوری ۱۹۶۵ء کو ظہر کی نماز کے بعد دمشق ریڈیو پر ایک اعلان ہوا۔ اس اعلان کا حوالہ دے کر "حادثات عالم" انگریزی روزنامہ نے اس واقعہ کو لکھا

ایک نوجوان جو عرصہ بارہ سال سے بستر علالت پر ہے اور تقریباً بڑے بڑے ڈاکٹر اس کے علاج میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اس وقت جبکہ مریض کو بھی شفایابی کی کوئی امید نہ رہی۔ آخر کار ایک ڈاکٹر کو اسے بلوایا، پوچھا:

ڈاکٹر میرے بچنے کی کوئی امید ہے؟ ڈاکٹر نے کہا

ہاں ایک علاج آسمان کے نیچے اور زمین پر تمہیں بچا سکتا ہے۔

مریض نے پوچھا: وہ کون سا علاج ہے؟

ڈاکٹر نے کہا: نماز اور دعا۔

مرتا کیا نہ کرتا۔۔۔ مریض نے اس دن سے تمام علاج چھوڑ کر صلوٰۃ و دعا کی پابندی شروع کر دی۔ ابھی چند ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ تمام ڈاکٹروں سے مایوس مریض۔۔۔ شفایاب ہو کر چلنے پھرنے لگا۔

شفا دینے والا کون؟۔۔۔ دعا قبول کرنے والا کون؟

منکرین اللہ جواب دیں!

(۳) ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک جنگ میں حصہ لینے والے مصر کے سپاہیوں میں سے کئی ایک نے انتہائی قابل حیرت تجربوں اور مشاہدوں کو بیان کیا ہے۔

ایک بار قناۃ السویس سے کافی دور ریل کی پٹریوں سے گزر کر اسٹیشن پہنچنے والوں نے اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے کہا۔ وہ رات چاند کی پندرھویں رات تھی، پورا صحرا چاند سے روشن تھا۔ جنگ کا زمانہ، دشمن تاک میں، چھپنے اور بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے اور ہم چاند کو سیاہ بادلوں سے ڈھانپ دینے کی دعا مانگ رہے تھے۔ اس ہستی سے جو چاند کا مالک ہے۔ وہ زندگی اور موت کا مالک ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ بادل نمودار ہوئے، انہوں نے چاند کو ایسا ڈھانپا کہ پورا صحرا سیاہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

مصر ہی کے شہر پورٹ سعید، ایک رات جب کہ ان پر دشمن نے بھرپور حملہ کر دیا، لوگوں کو اپنے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس وقت سب نے مل کر اس ان دیکھے اللہ جل شانہٗ کو پکارا۔ اس رات بادل برسے اور ایسے برسے کہ دشمن کو پسپا ہونا ہی پڑا۔ اس واقعہ کو ہر ایک بچے، بوڑھے، جوان مرد اور عورت نے بار بار بیان کیا اور

دعائیں قبول کرنے والی ذات اعلیٰ کی مدح و ثنا کی۔

یوں تو ہر مسلمان کے تجربوں اور مشاہدوں میں کئی ایسے لمحے اور وقت آئے اور گذر گئے اور دعاؤں کو قبول کرنے والی ہستی کی ثبت دلیلیں قائم کر گئے لیکن نماز استسقاء تو صدیوں سے اس بات کی گواہ چلی آ رہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے لے کر جب بھی خشک سالی میں باران رحمت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے سے بستی کے مسلم یا غیر مسلم لوگوں نے توبہ استغفار کی اور نماز استسقاء پڑھ کر دعا مانگی تو بارش کے ایک ایک قطرے نے خالق کائنات کے مستجاب الدعوات ہونے کی گواہی دی۔ خود دعائیں قبول فرمانے والے خالق کائنات نے اپنی ذات اعلیٰ کی دلیل میں اس علامت کو اپنے فصیح و بلیغ کلام قرآن حکیم میں یوں بیان فرمایا

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ○ (البقرۃ ۱۸۶)

ترجمہ اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیئے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک رستہ پائیں۔

انسان میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے ایک اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں فرمایا:

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (المومن ۶۰)

ترجمہ اور تمہارے پروردگار نے کہا کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری (دعا) قبول کروں گا۔

اللہ تعالیٰ میری اور آپ کی دعائیں قبول فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

دعا اور قبولیت کے حوالے سے اگر زیادہ واقعات اور حقائق چاہتے ہوں تو قاضی تنوخی کی کتاب "الفرج بعد الشدۃ" یعنی "دکھ کے بعد راحت" مطالعہ کیجئے۔

یہ راہنما کون؟

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے ذرات سے لے کر بڑے سے بڑے اجسام تک، بسیط یا مرکب سب کے سب قابل حیرت نظام کے پابند ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے مخصوص انداز میں یوں سرگرم عمل ہے جیسے اس کام کا طریقہ بتانے والا ہر لحہ ان کی نگرانی کے لئے بھی موجود ہے۔

پانی کا اژدہا

یوں تو اس کا اصل وطن امریکہ اور یورپی سمندر ہیں۔ ایک سے دوسرے دریا، سمندر اور نہروں میں منتقل ہو کر تمام دنیا میں پھیل چکا ہے۔ اس کی مادہ سمندر کی آخری گہرائی کی چٹانوں میں کئی پیچ دار سوراخوں سے ہوتے ہوئے آخر ایک خلا کو منتخب کر کے انڈے دیتی ہے۔ اگر وہ ایسی جگہ منتخب نہ کرے تو انڈے پانی کی لہروں سے بکھر کر فوراً ٹوٹ جائیں یا دوسرے جانور نگل جائیں۔ مثل مشہور ہے کہ مادہ سانپ بچوں کو کھا جاتی ہے۔ مگر یہ کام

خشکی کے سانپوں کی مادہ کرتی ہے۔ پانی کے اژدہا کی مادہ انڈے دیتے ہی خود مر جاتی ہے۔ انڈوں سے چند دنوں کے بعد بچے نکلتے ہیں اور ٹھیک انہیں سوراخوں کی بھول بھلیوں سے گزر کر سمندر میں پھیل جاتے ہیں جن سے ان کی ماں داخل ہوئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ان نوزائیدہ اژدھا بچوں کا راہنما کون؟

بھڑ اور نسل کاری

اسے عربی میں زنبور (Wasp) کہتے ہیں۔ اس کا نر کسی سخت اور محفوظ جگہ کو منتخب کر کے اس میں حسب منشاء ڈھنگ سے چھوٹا سا خلا بناتا ہے۔ پھر اس میں گلے سڑے گوشت کا ذخیرہ کرتا ہے تاکہ اس میں سمیت پیدا ہو جائے۔ اب کسی دوسری جگہ مٹی کا گھروندا تیار کرتا ہے۔ (وہ بھی اپنی صورت میں منفرد ہوتا ہے) اب وہ زہریلا گوشت اس میں منتقل کرتا ہے۔ نر کا کام ختم ہوا۔ اب مادہ گھر میں داخل ہوتی ہے بچوں کو پیدا کرتی ہے پھر خود اس گھر سے نکل کر خوشی سے گنگناتی ہوئی فضاؤں میں ہمیشہ کے لئے اڑ جاتی ہے۔ نر بھڑ بھی اس کے بعد اس گھر اور بچوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ بچے اسی زہریلے گوشت اور انتہائی تنگ سوراخوں میں پلتے ہیں۔ پر نکلتے ہی گھروندوں سے نکل کر فضا میں اڑ جاتے ہیں۔ اب اپنی عقل سے پوچھئے اس سارے عمل میں کس کی راہنمائی کارفرما ہے؟

ہر سترہ سال کے بعد ہی ٹڈیوں کا قابلِ حیرت حملہ

نیوانگلینڈ کے علاقہ میں ایک خاص قسم کی ٹڈیاں ٹھیک سترہ سال کے بعد ۲۴ مئی کو نمودار ہو کر حملہ آور ہوتی ہیں۔ اس اثناء میں اتنا طویل عرصہ زمین کے اس سخت حصہ میں چھپی رہتی ہیں جہاں کے درجہ حرارت میں ان کا زندہ رہنا قابل حیرت ہے اور اس سے زیادہ حیران کن۔ ان کا سترہ سالوں بعد ہی اور ۲۴ مئی کا پابند حملہ سوال یہ ہے کہ کیلنڈر اور تاریخ کے معاملہ میں کون ان کی راہنمائی کرتا ہے؟

مرغی اور انڈے

مرغی کو انڈے سہلانے کے عرصہ میں انہیں مختلف اطراف سے بدل بدل کر حرارت رسانی میں مساوات پیدا کرنا کون سکھاتا ہے؟ اسی کے اس سائنٹفیک عمل سے انسان نے درجہ حرارت دریافت کر کے چوزے نکالنے کی مشین بنائی۔

اسکیوکوب کیڑا

یہ ایک کیڑا (Worm) ہے جو موسم بہار میں ہی پیدا ہوتا ہے۔ موسم خزاں میں غائب ہو جاتا ہے۔ اس کیڑے کا اپنی نسل کی پیدائش کا انداز ملاحظہ فرمائیے:

اس کیڑے کی مادہ کسی پودے کی سخت ٹہنی میں مستطیل گھر بناتی ہے۔ پھر اس پودے کی نرم پھوٹنے والی کونپلوں پر حملہ آور ہو کر اس سے رس چوس کر اسے اپنے گھر میں منتقل کرتی رہتی ہے۔ اس کے بعد زرد پتوں کو چبا چبا کر گندھے ہوئے آٹے کی طرح بنا کر اس گھر کی چھت بناتی ہے۔ انڈے دیتی ہے اور خود یہاں سے چلی جاتی ہے۔ انڈے مقررہ ایام کے بعد سخت ہوتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، کیڑے نکلتے ہیں اور مکمل توانائی تک ماں کے جمع کردہ

خوراک کے ذخیرہ کو استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ ہی سوچئے اس سارے نظم و ضبط اور طریق کار کا معلم کون؟

جانوروں اور پودوں میں دوستی

بعض پھلی دار پودوں (Leguminous Plants) اور بیکٹریا (ایک کیڑا) میں دوستی کا قصہ یوں ہے۔ بیکٹریا مٹر کی جڑوں میں بستے ہیں جو نائٹروجن گیس کو پہلے نائٹرائٹس (Nitrites) اور بعد میں نائٹریٹس (Nitrates) میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ مٹر اس نائٹریٹس کو خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بیکٹیریا کو ان کی جڑوں میں رہنے کی وجہ سے تحفظ ملتا ہے۔ اس دوستی میں کس کی حکمت آموزی کام کر رہی ہے؟

لائی کنز (Lichens) پودے اور فنگس کی دوستی

پودوں کا ایک گروہ ایسا ہے جن کی ایک قسم کے فنگس لیگا (Alga) کے ساتھ گہری دوستی کا عالم یوں ہے۔ فنگس کے دھاگے لیگا کے سیل کے اندر دور تک چلے جاتے ہیں۔ لیگا فوٹو سنتھیسز کے ذریعہ خوراک تیار کرتا ہے اور فنگس لیگا کو پانی سمیت دوسرے مادے مہیا کرتا ہے اور لیگا اسے تحفظ دیتا ہے۔ ایسے بے گنت مطالعہ انسانی عقل سے پوچھتے ہیں:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے نور آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

(اقبالؔ)

زمانۂ قدیم میں ایک شخص مصر کے فراعین (بادشاہوں) میں سے ایک فرعون گزرا ہے۔ اس کی عقل بھی ان دیکھے اللہ کو نہیں مانتی تھی۔ جس طرح آج ایٹمی طاقتیں سپرپاور کہلاتی ہیں، اس وقت فرعون کے پاس بھی ایسی ہی طاقت فوجوں کی صورت میں موجود تھی۔ جب حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس سمجھانے کے لئے بھیجا تو فرعون نے اس سے کافی سوال و جواب کئے۔ ان مکالمات کے درمیان ایک مکالمہ ہمارے اوپر کے سوالوں کا جواب بھی تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سمجھا کر فرعون کے پاس بھیجا تھا اور وہ یہ تھا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰیO(طٰہٰ ۵۰)

ترجمہ: کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر راہ دکھائی۔

فرعون نے اللہ جل شانہٗ کو اس کی قدرت کے اس حوالے سے پہچان کر اس کی عظمت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کی مغرور عقل مانتی نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ہدایت سے ہر چیز محوِکار ہے، ورنہ

عقل اور علم اگر تکبر کے خول میں بند نہ ہو تو یہ حقیقت بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جائے، جیسے دوسرے معاملوں میں عقل اور علم کا یہ فیصلہ ہمیشہ سے انسان مانتا آ رہا ہے کہ علم کا حصول معلم کے بغیر اور راہنما کے بغیر راستے کا وقوف ناممکن ہے؟

لیکن حقیقت کو دیکھ کر بھی اس کو نہ ماننا کافر کا شیوہ بن جاتا ہے۔ اس کا گمراہ دل گمراہ عقل جن فکری مغالطوں میں خود مبتلا ہے اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی انہیں فکری مغالطوں میں مبتلا کر دے۔

اللہ جل شانہٗ نے تمام مخلوقات کی زندگی کے مقاصد کا ذکر کر دیا ہے اور جن کا ذکر نہیں کیا ان کے بارے میں جب بھی انسان کی عقل نے جانکاری کے لئے کوشش کی اس کا علم اسے دے دیا گیا۔ آج جدید علوم جو ہمارے سامنے آ رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے اسی اصول کے تحت ظہورپذیر ہو رہے ہیں۔ جس نے کوشش کی اس نے پالیا۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں انسان کو یہ بات بڑی واضح طور پہ سمجھاتے ہیں کہ انسان تمہیں پیدا کیا گیا ہے تو ارادے کا اختیار بھی دیا ہے، قول و فعل کی اچھائی اور برائی بھی سمجھ دی گئی ہے۔ ارشاد ہے

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس: ۷-۱۰)

ترجمہ اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے اعضاء کو برابر کیا۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔ کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

ایک اور جگہ انسان کو اچھائی اور برائی میں فرق کی واضح نشان دہی کر دی ہے تا کہ انسان دھوکا نہ کھائے۔ ارشاد ہے

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ (النّٰزعٰت: ۴۰)

ترجمہ: اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا کیا معنی؟ ذرا وضاحت سن لیجیے۔ الیکشن میں بہت سے امیدوار کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی شخصیت اور منشور کو انسانی بھلائی کے لئے اپنے مدمقابل سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیش کردہ دستور حیات کے مقابلہ میں اپنا نظریہ اپنا منشور اپنا نظام زندگی پیش کرتا ہے، وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری صورت یہ بھی ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنے والوں کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہے وہ بھی اسی عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس طرح الیکشن میں جب کوئی فریق مدمقابل کے حق میں دست بردار ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کے حق میں بیٹھ گیا، دست بردار ہو گیا۔ بظاہر بھی یہ بات "کھڑا ہونا" اور وہ بھی اللہ کے سامنے ایسے ہی ہے۔ جیسے کوئی ذہنی مریض ہاتھ سے سورج پلٹ دینے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس خطرناک اور ذہنی فتور سے بچنے کے ذرائع کی نشاندہی بھی فرما دی۔

وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ (النزعٰت: ۴۰)

ترجمہ اور جی کو خواہشوں کو روکتا رہا۔

بات واضح ہو گئی۔ احکامات الٰہیہ کے مقابلہ میں انسان اپنی عقل اور اپنی خواہش کو ترجیح دے لے تو اس کا مطلب ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کا سنگین جرم کیا۔ اگر اس قسم کے جرم سے انسان بچا رہا اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیش کئے ہوئے دستور حیات کی عملی حمایت کی تو اس کے نتیجے کی خوشخبری ان الفاظ میں لکھ دی۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىؕ (النازعات ۴۱)

ترجمہ: اس کا ٹھکانہ بہشت ہے۔

ارشاد ہے

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ٘ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الانبیاء ۴)

ترجمہ (پیغمبر نے) کہا کہ جو بات آسمان اور زمین میں (کہی جاتی) ہے میرا پروردگار اسے جانتا ہے۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہ شان الٰہی زمنہ قدیم کے لئے انسان کو جس کی عقل اللہ تعالیٰ کی اس شان کو تسلیم نہیں کرتی۔ فرشتوں اور انبیاء کی حیثیت، موت کے بعد کی زندگی قبول نہیں کرتی تو اس کا جواب سینہ تان کر وہ کافر یوں دیتا ہے:

بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۖۚ (الانبیاء ۵)

ترجمہ بلکہ (ظالم) کہنے لگے کہ (یہ قرآن) پریشان (باتیں ہیں جو) خواب میں دیکھ لی ہیں (نہیں) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے، (نہیں) بلکہ یہ (شعر ہے جو اس) شاعر کا (نتیجہ طبع) ہے۔

مطلب یہ کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ آسمان اور زمین میں جو کہا جا رہا ہو وہ سن سکتا ہو، جو ہو رہا ہو اسے جانتا ہو اور یہی اس کی بدبختی اور کم عقلی کا ثبوت ہے۔

آج کا انسان

آج کے بعض انسانوں کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے انکار کی بنیاد علم اور عقل کی بے انتہا کامیابیاں ہیں۔ آج کا انسان اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو "وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِۚ" البلد ۱۰ (ہم نے اسے اچھی بری دونوں راہوں کی حقیقت بتا دی)۔ دوسری جگہ فرمایا اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا الدھر ۷۶ (ہم نے اسے نیک و بد کی سوجھ بوجھ دے دی (اب یہ اس بات میں آزاد ہے) چاہے فرماں برداری سے کام لے کر شکر ادا کرے یا ہماری ذات کو پہچاننے سے ہی انکار کر دے)۔ یہ غور کرنے کی زحمت نہیں کر رہا۔

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی ذات پہ یقین پیدا کر لیتا ہے۔ ایمان لے آتا ہے تو اللہ کے اس فرمان کی تصدیق خود اس کا دل کرنے لگتا ہے۔ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ التغابن ۱۱ (جو بھی اللہ پہ ایمان لے آئے اللہ تعالیٰ اس کے دل کی راہنمائی ہر بات میں فرماتے ہیں)۔ اس ہدایت میں انسان کو اپنی ذات کی

پہچان اور خود کی موجودگی کا شعور بھی اللہ تعالیٰ مرحمت فرماتے ہیں۔ بصورت دیگر علم و عقل کی کامیابیاں حاصل کرنے کا طریقہ اور قوت تو اسے دے دی گئی ہے جو نافرمانی کے سبب چھینی نہیں جاتی۔

ہمارا یقین

ہر مسلمان کے ذہن کا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا احساس ہے۔ اس احساس کو اللہ تعالیٰ اتنی توانائی دے دیتے ہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ ہر تجاب میں اپنے جمال و کمال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اصل میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے انکار کرنے والوں یعنی کافروں کے کفر کا سبب صرف اللہ جل شانہٗ کا نظر نہ آنا ہی نہیں بلکہ اس کی موجودگی کی کھلی دلیلیں واضح علامات کو دیکھ کر بھی انہیں نہ ماننے کی ضد بھی ہے۔

کافروں کی اس قدیم ترین ذہنی بیماری کا نفسیاتی تجزیہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ۝(الاعراف ۱۴۶)

جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔ اگر یہ سب نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر راستی کا رستہ دیکھیں تو اسے (اپنا) رستہ نہ بنائیں۔ اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے رستہ بنا لیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غفلت کرتے رہے۔

ان میں سے بعض کی حجت بازی کی عادت کا یہ عالم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی معنویت کو سمجھے بغیر کہتے ہیں:

وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا (الم السجدہ: ۱۳)

ترجمہ: اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے۔

وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ ۝ (التکویر: ۲۷:۲۸)

ترجمہ۔ یہ تو جہان کے لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔ (یعنی) اس کے لئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے۔

چنانچہ ابوجہل نے جب اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو سنا:

وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (التکویر ۲۹)

ترجمہ: اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے۔

تو فوراً کہنا شروع کر دیا: مسلمانو! جب تمہارے رب نے خود ہی کہہ دیا کہ ہمارا ہدایت پانا یا گمراہ رہنا، سب اللہ کی چاہت سے ہی ہے تو پھر ہمارا گناہ کیسا؟ حالانکہ ایسی تمام آیات جو قرآن مجید میں آئی ہیں ان سب میں اللہ جل شانہٗ کی صفات کاملہ کے اس پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ذات قادر کل، مختار کل، اپنے ارادوں، اپنی چاہت کے اظہار اور تخلیق پہ مکمل گرفت کی مالک ہے۔ یہ بتانے کا مقصد انسان کی سوچ اور خیال کی تصحیح ہے۔ جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، اس کے بارہ میں واضح ارشاد ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَۙ (البقرہ۔۲۶)

ترجمہ: (خدا) بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے اور گمراہ بھی کرتا تو نافرمانوں ہی کو۔

بات واضح ہے کہ جس انسان کی فطرت میں بھی فسق و فجور ہو وہ اس (کلام پاک) سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے ہر بات کو ضد میں الٹ سمجھے گا الٹی تاویلیں کرے گا۔ جس کا لازمی نتیجہ اس کی گمراہی میں اضافہ ہو گا۔ ہمیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کامطلب سمجھتے وقت ان تمام ضابطوں کو سامنے رکھیں جو غیر متبدل ہیں۔ کافر اعتراض کرتا ہے

(۱) اگر اللہ کو اختیار ہے تو پھر وہ سب کو نیک کیوں نہیں بنا دیا۔

(۲) اللہ تعالیٰ اگر زمین و آسمان کی ہر بات سے واقف ہے تو وہ برائیوں کو ختم کیوں نہیں کر دیتا۔

(۳) یہ جنگیں کیوں ہوتی ہیں۔ انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہ کاریاں روکتا کیوں نہیں۔

ایسے تمام اعتراضات سے پہلے انسان ہے کیا، اس کے اختیارات کتنے ہیں اور کس نے دیئے ہیں۔ ان باتوں پہ غور کرنا لازمی ہے۔ عقل ہی کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کے اختیارات اور اس کے حیرت ناک کارناموں کو سامنے رکھے اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بھی سامنے رکھے کہ انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ہی اسے عقل، ارادہ، شعور، لاشعور، تصور، خیال اور بے پناہ باطنی قوتیں عطا کر دی گئی تھیں اور یہ ضابطہ بھی اسی دن طے کر دیا گیا تھا کہ انسان کو قول و فعل میں آزادی ہو گی۔ موت سے پہلے اس کو دیئے گئے حیرت ناک اختیارات واپس نہیں لئے جائیں گے۔

اسی قسم کے اعتراضات جو آج سے کروڑہا سال پہلے کا انسان کرتا تھا۔ اس کا ذکر اللہ جل شانہٗ نے قرآن حکیم میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ (النحل: ۳۵۔۳۶)

ترجمہ: اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم ہی اس کے سوا کسی چیز کو پوجتے اور نہ ہمارے بڑے ہی (پوجتے) اور نہ اس کے (فرمان کے) بغیر ہم کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔ (اے پیغمبر) اسی طرح ان سے اگلے لوگوں نے کیا تھا۔ تو پیغمبروں کے ذمے (خدا کے احکام کو) کھول کر سنا دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ خدا ہی کی عبادت کرو اور بتوں (کی پرستش) سے اجتناب کرو۔ تو ان میں بعض ایسے ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی اور بعض ایسے ہیں جن پر گمراہی ثابت ہوئی۔

یہی وہ انداز فکر تھا جو اس سے پہلے کے زمانے میں گزرنے والے کافروں نے بھی اختیار کیا تھا اور ہر زمانے میں ہم نے کافروں کی سوچ اور اعمال کی اصلاح، اپنے اور انسان کے تعلق کی وضاحت کے لئے رسول (پیغامبر) بھیجے۔ ان کا کام صرف پیغام کو وضاحت کے ساتھ پہنچانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے آدم کے

آغازِ سفر و قیام سے لے کر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک ہر امت میں اپنے رسول بھیجے۔ ہر ایک کا پہلا اور بنیادی پیغام یہ ہوتا تھا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور شیطان سے، بہکاوے سے بچو اس کا راستہ (تکبر) اختیار نہ کرو۔ ان میں سے بعض ایسے بھی نکلے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا اور انہیں میں سے بعض کے مقدروں میں گمراہی آئی)۔

اب اگر ہم آئینہ میں آج کی ذات پر حق سے انکار کرنے والوں کی سوچ اور اعتراضات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس دور میں جسے بہت زیادہ ترقی کا دور کہا جاتا ہے انسان نے علم اور عقل کی وسعتوں کو بے شک ترقی میسر ہوئی۔ اس ترقی کو دینے والا، علم، عقل کو وسعتوں کی قدرت بخشنے والا ۔۔۔ اللہ۔۔۔ اپنی صداقت کی واضح علامات کے باوجود اسے نظر نہیں آیا۔ جیسے کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ علم حاصل کرو اور اگر کوئی انسان دینِ الٰہی کے علاوہ کسی علم کو پیش کرنا چاہے تو اس سے کہو

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ۝

(الانعام ۱۴۹)

ترجمہ: کہہ دو کیا تمہارے پاس کوئی سند ہے (اگر ہے) تو اسے ہمارے سامنے نکالو۔ تم محض خیال کے پیچھے چلتے اور اٹکل کے تیر چلاتے ہو۔

ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارے سمیت پوری کائنات کا خالق ہے اور تم جو آج اپنی معلومات اپنی مصنوعات یا ایجادات پر اتراتے ہو، ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کی تردید نہیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو ارادے، عمل، تصور اور عقل کی جو بے پناہ طاقت دی ہے وہ غلط ہے بلکہ آج کے انسان کی تمام علمی، عقلی اور فکری فتوحات اللہ تعالیٰ کی صداقت کی ناقابلِ انکار دلیلیں ہیں، لیکن انسان کی زندگی کا وہ پہلو جس کا تعلق انسان کی باہمی زندگی سے ہے، اس معاشرہ سے ہے، اس کا نام اخلاق ہے۔ آپس کا رویہ ہے، برتاؤ ہے، سلوک ہے۔ اس حوالے سے اللہ جل شانہٗ نے انسان کی حیثیت کو اچھائی اور برائی کو اختیار کرنے میں دی گئی آزادی کی یاددہانی بھی صاف صاف بیان کرتے ہوئے اس کی وجہ بیان کر دی ہے

وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ (الانبیاء۔۳۵)

ترجمہ: اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

چاند پر پہنچنے کی ہمت دکھانے والے انسان، کہکشاؤں کے سینے چیرنے والے انسان راہوٹ، کمپیوٹر اور بے حساب حیرتناک ایجادات کا فخر حاصل کرنے والے انسان۔۔۔ تم۔۔۔ اچھائی اور برائی پر قابو پانے کی قدرت بھی رکھتے ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح مادی ترقی حاصل کرنے کی قوت ہم نے تمہیں دی ہے اسی طرح برائی کو فتح کرنے کی قوت بھی ہم نے تمہیں دی ہے۔۔۔ اور جب ہمارے ان دونوں دعووں کی تصدیق تمہارے ہی کارناموں سے ہو رہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارا دعویٰ سچ ہے۔ ناقابلِ انکار حق! ہمارے اس دعوے کی تصدیق: اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۝(طٰہٰ۔۵۰) (اس نے جو کچھ بھی پیدا کیا، اس کی پیدائش کے ساتھ اس کو زندگی کے آداب بھی سکھا دیے)۔ اللہ کے اس دعوے کا ثبوت کائنات کے ہر ذرے اور ہر جسم میں موجود ہے۔

دیکھنا، رُکنا اور غور کرنا شرط ہے

تصویر کو کچھ لوگوں نے دیکھا ہی نہیں اور گزر گئے۔ کچھ لوگوں نے دیکھا تو مگر سرسری نظر سے۔۔۔ مگر کچھ لوگوں کو ہر چیز کو ذرا ٹھہر کر دیکھنے کی عادت تھی۔ انہوں نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا تو آگے بڑھ ہی نہ سکے۔ رُک گئے اور تصویر کے خدوخال کو غور سے دیکھنا شروع کیا تو اس کے ہر نقش میں دلکشی دیکھی، شوق اور بڑھا، رنگوں کے امتزاج نے اور دلچسپی پیدا کر دی اور غور سے دیکھا تو تصویر کے خدوخال باتیں کرتے دکھائی دیئے۔ بے آواز باتوں کا مطلب سمجھنے میں تشنگی بڑھی تو بے ساختہ ایک خیال بے چینی سے ابھرا وہ سوال تھا "اس تصویر کا مصور کون ہے؟"

اسی اصول کو اپنایئے، نگاہ اٹھایئے، دیکھیے۔ آسمان پہ خراماں خراماں رنگ برنگے بادل ذرا بھرپور نظروں سے دیکھیے۔ سفید روئی کے گالوں کی طرح، کچھ سرمئی، کچھ گہرے، کچھ ہلکے رنگوں میں رواں دواں، کس طرف؟ کس منزل کے راہی؟۔۔۔ لیجئے ہلکی ہلکی پھوار برسنے لگی۔۔۔ ادھر تو دیکھو رنگوں کی لہر میں قوسِ قزح سورج کی کرنوں کا عکاسی جمال، ادھر تو دیکھو، پل بھر میں مطلع صاف نیلگوں آسمان۔۔۔ کتنا وسیع، کتنا حسین اور اس کے حسن میں اور اضافہ ہوا، ستاروں کے جھرمٹ ابھرے، کچھ مدھم، کچھ شوخ، کچھ بکھرے ہوئے، کچھ قطار میں سموئے ہوئے اور ہاں ادھر تو دیکھو یہ کیا۔ اسے بادل کہتے ہیں اس کا بھی اپنا ہی حسن ہے اور یہی حسن جب نکھرتا ہے تو چودھویں کا چاند کہلاتا ہے، پورے آسمان پہ جیسے ایک دولہا، اور ستارے لاتعداد ستارے باراتی۔۔۔ پوری سج دھج سے براتیوں اور دولہے کا سفر، صدیوں پرانا، کروڑہا سال پرانا مگر آج بھی دلکش آج بھی درخشاں۔۔۔ لیجئے، براتی اور دولہا نظروں سے غائب رات نے اپنی پلکوں کے روایتی گھونگھٹ میں سب کو چھپا لیا۔ اب کیا ہوا دیکھو تو پو پھٹنے لگی۔ افق کی طرف تو دیکھو رات نے اپنی پلکوں کا گھونگھٹ اٹھانا شروع کیا۔ کرنیں صبح کی حسین آنکھوں سے نکل کر مشرق و مغرب، شمال وجنوب پر چھانے لگیں۔ دیکھئے تو، سورج اپنے پُر جلال حسن کے ساتھ آپ کو دیکھ رہا ہے، مگر آپ کی کیا مجال جو اسے نظر بھر کر دیکھ سکیں۔۔۔ دیکھئے تو اس کی جلال بھری نظروں سے زندگی کی برسات ہو رہی ہے۔۔۔ زمین۔۔۔ کی گود ہری ہو رہی ہے۔ سورج مکھی نے مسکرانا شروع کر دیا۔ نباتات اور ننھی ننھی پودوں کی مخلوق کے چہروں پہ رونق تو دیکھو۔۔۔ اس سورج کے جمال میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔ کیسے کیسے حیرت ناک اثر ہیں، غور کیجئے تو۔۔۔ منظر بدلتا ہے۔۔۔ ظہر ہو گئی، اس وقت کا حسن بھی اپنی مثال آپ ہے۔ سائے بڑھنے لگے، دیکھو تو عصر نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا، دھوپ اور سائے کا حسن بھی اپنی جگہ لا جواب۔۔۔ یہ بھی ایک تصویر ہے کائنات کی تصویر۔ اس کی بھی زبان ہے۔ اس کی زبان پر کس کی مدح و ثنا ہے؟

تصویر کا ایک رخ یہ بھی تو ہے، ذرا رکئے نظر بھر کر دیکھئے، غور کیجئے۔ حسین رنگ برنگی پتوں کا لباس پہنے ہوئے درخت، ان کی قطاروں میں کتنا حیرت انگیز جمال ہے، ان کے رنگ، پتے، کلیاں، پھول، ان کے تنے، ان کی شاخیں، ان کی بیلیں، ان کے طویل اور پستہ قد، ان کی جھومتی شاخیں، نرم بھی، سخت بھی، یہ بھی تو کچھ کہہ رہے ہیں۔۔۔ بگوش ہوش سنیئے، کیا کہہ رہے ہیں؟ اپنے خالق کی مدح و ثنا؟ ان کا خالق کون ہے؟ انہیں سے پوچھو!

ادھر دیکھئے اس کائنات کی تصویر کا ایک اور گوشہ، یہ سرسبز وادیاں، لہلہاتے کھیت، نہریں اور ان کے

کنارے قطار در قطار سبز رنگ میں سرو ــــ ادہر دیکھئے نیلے، پیلے اور رنگ برنگی پرندوں کے گیت کتنے دلآویز ــــ ان کے ہونٹوں پہ نغمہ، کیسا نغمہ، اپنے خالق کے کمال کی مدح و ثناء!

تصویر کا ایک اور گوشہ ادھر دیکھئے، صحرا، ریت کے ٹیلوں سے بھرے ہوئے صحرا، بکھرے ہوئے ریت کے ذروں سے بھرپور ریگستان، آگے بڑھئے، نظر کو ذرا متوجہ کیجئے۔ یہ دریا، یہ سمندر، ان کی ہلکی لہروں کے گیت، سخت غضبناک موجوں کا شور، یہ لہروں پہ رقص کرتے ہوئے پرندے، تیز چلنے والی ہوائیں، مدھم چلنے والی ہوائیں، سرسراتی ہوائیں، طوفانی ہوائیں، ان کے نغمے ان کی دھنیں، ان کے رائے کس کے مداح، کس کے قصیدہ گو؟ پرندوں کی مختلف آوازیں، بجلی کی کڑک، پہاڑوں کی بلندیاں، وادیوں کی بستیاں، پانی کی رنگتیں، بے جان اشیاء کی صورتیں، جانداروں کی شکلیں، سب کی سب کچھ کہہ رہی ہیں ــــ کیا کہہ رہی ہیں، اپنے مصور کی شان!

تنہا عنصر ہو یا مرکب، سب کا اپنا اپنا کمال، ثواقب و سیار کا اپنا اپنا جمال۔ آسمان کی ہر مخلوق کا اپنا حسن، ان کی صورتوں کا اپنا پیارا پن ــــ زمین کی ہر مخلوق کا اپنا دلنشیں رنگ، سمندروں اور دریاؤں کی مخلوق کا اپنا پیارا پن۔ نسیم سحری اور بادبہاری کا اپنا نغمہ، اور پھر ان سب میں نظم و نسق کا اپنا کمال و جمال بھی تو زبان رکھتا ہے۔ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔ گوش ہوش سننے کی دعوت دے رہے ہیں۔ سب کے سب زبان حال سے اپنے خالق کی تعریف میں مشغول ہیں۔ لیکن ان کی زبان سمجھ میں نہیں آتی تو اس کائنات کا مصور اس کے بارہ میں اعلان فرماتا ہے:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (الم السجدہ: ۷)

ترجمہ: جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا۔ (یعنی) اس کو پیدا کیا۔

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ (البقرہ:۱۱۷)

ترجمہ: (وہی) آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ (فاطر:۱۳)

ترجمہ: یہی خدا تمہارا پروردگار ہے اسی کی بادشاہی ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ (لقمان:۲۰)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ (ابراہیم ۳۴)

ترجمہ: اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔

اس ساری کائنات کی تخلیق تمہارے ہی اعزاز "Honour" میں کی گئی۔ اس کے خالق کی پہچان اس کے اسماء حسنیٰ سے فراہم کرنے کی کوشش تمہارا فرض ہے۔ تمہیں اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس کی عبادت اور فرماں برداری انتہائی محبت سے کرنی چاہئے۔ یاد رکھو اس نے تمہیں احساس، ذوق جمال اور حیران کن قوت عقل اسی لئے

دی ہے۔ ذرا اپنی قوتِ فکر، تصور، شعور کی کارکردگی کے کمالات پہ غور تو کر۔۔۔ ان میں اتنی قوت ہے کہ آسمانی تجابات کو اپنی گرمی سے جلا کر راکھ کر دیں۔

اے ز آداب امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر
از رموز زندگی آگاہ شو
ظالم و جاہل زغیر اللہ شو
چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند

گر نہ بینی راہِ حق برما بخند
(اقبال)

وجودِباری تعالیٰ اور اس کے ثبوت

تمام دنیا میں مروجہ اور مسلمہ اقسامِ ثبوت "Evidence" میں سے (۱) بدیہی ثبوت "Obvious Proof"(۲) تائیدی ثبوت "Corroborative Evidence" (۳) تحریری ثبوت "Documentary Evidence"(۴) صریحی ثبوت "Direct Proof" (۵) ضمنی ثبوت "Collateral Evidence) (۶) قرائنی ثبوت "Circumstantial Evidence" (۷) قطعی ثبوت "Conclusive Proof" (۸) لسانی ثبوت "Verbal Evidence" ہیں ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اب تک وجودِباری تعالیٰ کے ثبوت میں جتنی معروضات پیش کی گئی ہیں انہیں میں سے چند قرائنی اور بدیہی اثبات کی جانچ پرکھ کے لئے خود رب کائنات اپنے کلام معجز نما الکتب میں انسان کو دعوت دیتے ہیں:

ارشاد ہے:

قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ O(یونس:۱۰۱)

ترجمہ (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ مگر جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے نشانیاں اور ڈراوے کچھ کام نہیں آتے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کے گروہ کا نفسیاتی تجزیہ بھی کر دیا جنہیں مخالفت کی عادت بہت پرانی پڑ چکی ہے۔ ان کا ہماری تخلیق میں مکمل حسن و کمال دیکھ کر بھی ہمیں تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ ایسے ہی ضدی انسانوں کے ایک اور گروہ (جو جاہل نہیں بلکہ ذہین بھی ہے پڑھا لکھا بھی ہے) کی نفسیات کا تجزیہ یوں فرمایا۔

اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ لا وَ اَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِاقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ج فَبِاَيِّ حَدِيْثٍم بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ O(الاعراف: ۱۸۵)

ترجمہ: کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں اور جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں ان پر نظر نہیں کی۔ اور

اس بات پر (خیال نہیں کیا) کہ عجب نہیں ان (کی موت) کا وقت نزدیک پہنچ گیا ہو۔ تو اس کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟

گویا رب کائنات نے اس ذات کے اثبات میں جہاں آسمانوں اور زمین کے ساتھ اپنی مجموعی مخلوق کی یاددہانی کرائی ہے وہں اپنے قادر مطلق ہونے کا ثبوت انسان کی موت کا تذکرہ بھی کر دیا۔ اس لئے کہ یہ وہ ثبوت ہے جس کے علم سے کوئی ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، کوئی بھی محروم نہیں اور یہ بھی تمام انسانوں کو یقین ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو بچاؤ کے جتنے اسباب بھی انسان مہیا کر سکتا ہو کر لے لیکن اس سے بچ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ثبوت میں تحریر دے رکھی ہے۔

"اس دنیا میں ہر انسان کی زندگی کا آخری وقت پہلے سے طے ہے اور جب یہ وقت آتا ہے تو ہم اسے ایک پل ادھر یا اُدھر نہیں ہونے دیتے"۔

اللہ تعالیٰ کے اس بدیہی اور تحریری ثبوت کی تردید آج تک نہ انسان کر سکا نہ کر سکے گا۔ لیکن اتنی بڑی سچائی یا اتنا صریح ثبوت بھی ان کو متاثر کیوں نہیں کرتا۔ اس کی اس نفسیاتی بیماری کا تجزیہ بھی اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَO (یوسف: ۱۰۵)

ترجمہ اور آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ گزرتے ہیں اور ان سے اعراض کرتے ہیں۔

یہاں ایسے ہی لوگوں کی مثال ملاحظہ ہو۔ ایک کافر وھٹکر چیمبرس (Whittaker Chambers) اپنی کتاب شہادت "Witness" میں لکھتا ہے۔ میں اپنی چھوٹی منی بچی کی طرف دیکھ رہا تھا، میری نظر بچی کے کان پر رک گئی اور میں غیر شعوری طور پر اس کی ساخت پر متوجہ ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایسی پیچیدہ اور نازک چیز محض اتفاق سے وجود میں آ جائے، یقیناً یہ پہلے سے سوچے سمجھے نقشہ کے تحت ممکن ہوا ہے۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر نکال دیا کیونکہ اس احساس کی روشنی میں اللہ جل شانہٗ کی ذات نظر آتی تھی۔

اسی طرح ایک اور سائنس دان نے اس واقعہ کو پڑھ کر Thomas David Parks لکھتا ہے کہ میں کئی پروفیسروں اور ریسرچ کے سلسلہ میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ علم کیمیا اور طبیعیت کے مطالعہ و تجربہ کے دوران انہیں کئی مرتبہ اسی طرح کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن گول کر گئے۔ ایسے ہی لوگوں کے ایک جم غفیر کے بارے میں اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے۔

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَO (الاعراف:۱۷۹)

ترجمہ: اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل)

چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

لوگوں کی نظروں میں وہ کتنے بڑے ماہر نفسیات ہوں یا طبیعیات، فلکیات ہوں یا معاشیات..... اللہ تعالیٰ ان کی اس ذہانت کو جہالت سے تعبیر فرماتے ہیں۔

ایک مقام پر ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یوں بھی ارشاد فرمایا

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ○(الحج ۴۶)

ترجمہ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے مجسم ہم درد و غم خوار رسولِ شفقت و محبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قطعی ثبوت ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس کو رب کائنات نے اپنا شاہد بنایا۔ اپنے کارخانہ کائنات کا مطالعہ کروایا۔ مشاہدہ کروایا۔ اللہ نے اپنے فرماں بردار بندوں پہ اپنی مہربانیوں کو بھی دکھایا اور نافرمان انسانوں کو اذیتوں میں تڑپتے ہوئے بھی دکھایا۔ یہی وجہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے لوگوں کے انجام کو سوچ کر اتنے غم زدہ اور متفکر ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کو انہیں کہنا پڑا

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا○(کہف ۶)

ترجمہ (اے پیغمبر) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم ان کے پیچھے رنج کر کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔

اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شاہد نہ ہوتے تو اتنے غم زدہ نہ ہوتے۔ آپ کا غم زدہ ہونا بذاتِ خود ہر عقلِ سلیم کے لئے اللہ جل شانہٗ کا ثبوت ہے۔ اب اگر ہم اپنی معروضات کا رخ مسلمان بھائیوں کی طرف موڑ لیں تو بے جا نہ ہو گا اس لئے کہ دلائل اور آیات پہ غور کرنے کا حکم ہمارے لئے بھی ہے۔ اسلام کا عقیدہ دلائل کی معاونت کے بغیر کمزور ہو گا۔ اس لئے ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آیاتِ الٰہیہ پہ ہمیشہ غور کرے اور اس کی عظمتوں کے اعتراف کی کوشش اپنا شعار بنا لے۔ بارگاہِ الٰہی میں اپنے مقام کو بلند پانے کے لئے ضروری ہے کہ عقل و ہوش کو زیادہ استعمال کرے، فکر اور ذکر پر زیادہ توجہ دے۔ اس کے بعد دل کی آنکھوں کو بصارت نصیب ہو گی، کان صداقتوں کو آسانی سے قبول کریں گے اور خود دل کو حضورِ حق کا سرور میسر ہو گا۔

اللہ کا حکم ہے۔ کائنات کے ہر گوشہ پہ توجہ مرکوز کرو۔ اس کی ساخت اس کی کارکردگی کی حکمتوں کا علم حاصل کرو جو انسان عقل کو استعمال نہیں کرتا۔ وہ بے جان مٹی کے پتلے سے بھی بدتر ہے۔

علم و عقل ہی انسان کی تمام مخلوقات پر برتری کا سبب ہے۔ اسے جو بھی استعمال کرے گا، چاہے وہ کافر ہو یا مومن، دونوں کو علم و عقل کے استعمال کا فائدہ یکساں دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار مسلمان کو اپنا حکم یاد دلاتے ہیں:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ○(الرعد:۴)

ترجمہ: اس میں سمجھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ عقل ہے۔ اس عقل کے استعمال

کے فائدوں کا حصول تو کافر اور مومن دونوں کو ہو گا اور بے شک فرق بھی واضح ہے۔ مومن کی عقل کو مادی اشیاء کی حقیقت سے آگاہی۔۔۔ عناصر۔۔۔ اور ان کے مرکبات کا علم عرفان الٰہی کی راہنمائی کرے گا اور کافر کی عقل اس رنگ و بو کے مظاہر سے آگے اندھیرے کے سوا کچھ نہ دیکھ پائے گی۔ مومن کو آیات الٰہی سے حضوری کا نور نصیب ہو گا اور کافر کو دلائل کا حجاب اور دوری کا اندھیرا۔

لیکن آج اس دور میں ہم مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کافر اپنے علم کو دلیلوں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مگر مسلمان اپنی کم علمی کی وجہ سے مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور ایمان کی بنیادیں جو علم و عقل سے مضبوط نہیں ان میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کائنات کے حوالے سے انسان کو دعوت فکر و تدبر دیں یا انسان کی اپنی داخلی کائنات کے حوالے سے دونوں میں اسی کی حکمتوں کی گرفت کارفرما ملے گی۔

آج مسلمانوں کو اپنی ہر بات کو دلیل کے ساتھ پیش کرنا ہو گا۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اللہ نے موت کیوں پیدا کی ہے تو اسے علم ہونا چاہیئے کہ وہ اس کی کوئی ٹھوس دلیل دے سکے۔ اسے علم کی اس تحقیق سے پوری واقفیت ہونا ضروری ہے۔ ایک دلیل اسی سلسلہ کی یہ ہے کہ اگر مکھیوں جیسی کثیر الاولاد حقیر مخلوق کو موت کے اندھیرے کنویں میں دفن نہ کیا جائے تو ۵ سال کے اندر اس کرۂ ارض سے ۵ گنا زیادہ حجم ان کی نسل وجود میں آ جائے۔ ان مکھیوں سے کتنی بیماریاں معرض وجود میں آ کر باقی مخلوق کے لئے عذاب بنتی ہیں۔ اس کا علم بھی اسے ہونا چاہیئے۔ یہ تو ایک مخلوق کے زندہ رہنے کی صورت میں صورت حال سامنے آتی ہے۔ باقی مخلوقات کا اندازہ بھی کیا جا چکا ہے جس کی تفصیل اس موضوع پر لکھی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

آج کے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح اسلام دشمن اپنے علمی دلائل اور افکار سے تردید اللہ کر رہے ہیں اسی طرح ان کے پاس بھی علمی عقلی اور فکری ٹھوس دلائل ہونے چاہئیں۔ دنیا سمٹ گئی ہے۔ علم نے آسمانی خلاؤں میں اپنی مجالس قائم کر لی ہیں۔ ہمارے ذرائع کم سہی لیکن ان میں وسعت سب مسلمانوں کے اتحاد سے ہو سکتی ہے۔

حکمت کیا ہے؟

حکمت کے معنی میں دانائی، دوراندیشی، قابلیت، منصوبہ بنانا "Device" اور بھی معانی ہیں اور جو ذات بھی ان اوصاف کی مالک ہو۔ وہ "حکیم" کہلاتی ہے تو اللہ جل شانہٗ کی ذات اعلیٰ سب سے بہترین حکیم ہیں۔ اگر ان کی حکمت کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو اس سے خود بخود عرفان الٰہی کی راہنمائی نصیب ہو گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ہر موجود کو جہاں جگہ دی ہے، جس صورت میں بنایا ہے اس کے پیچھے سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ ایک عام آدمی جب انہیں ناسمجھی سے دیکھتا ہے تو کہتا ہے یہ اگر یوں نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ بعض ناسمجھ بعض موجودات کو بے معنی سمجھتے ہیں، بعض کہتے ہیں ڈر اور خوف جیسی چیز نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔ غرض یہ سب باتیں انسان کے ذہن میں تب تک آتی ہیں جب تک اسے علم حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن جوں ہی علم کی روشنی نصیب ہوتی ہے تو اس کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے موجود سے لے کر بڑے سے بڑے اجسام کے وجود اور اس کے عمل میں حیرت ناک منصوبہ کار کا نظم و نسق اس کے عظیم سے عظیم تر حکیم ہونے کی

گواہی دیتا ہے۔

بعض کم علم انسان کہتے ہیں کہ شر میں کون سی حکمت ہے؟ اسی طرح دکھ غم اور مصیبتیں پیدا کر کے اس میں کیا حکمت دکھائی؟ کیا ظلم سے بہتر عدل نہیں؟ کیا بے رحمی سے بہتر رحم نہیں؟ کسی کی حفاظت اس کو لوٹنے سے بہتر نہیں؟ غرض اس قسم کے بہت سے نقائص گناتے ہوئے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس کائنات کو بے سود بنایا ہے۔

اس قسم کے سوالات کا جواب کم علم مسلمانوں سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہیں یہ ان کے اختیار کا ثبوت ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہیں جو چاہے پیدا کریں!

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے سوال بھی وہی کرتے ہیں جو علم و حکمت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور ایسے جواب بھی ایسے ہی لوگ دیتے ہیں۔ کسی موضوع پر مکمل علم تو انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ ارشاد ذوالجلال و الاکرام ہے:

وَ مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا○(الاسراء: ۸۵)

ترجمہ: اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔

لیکن سوال کی ایک نوعیت تو سوال کرنے والے کی لاعلمی یا نادانی ہوتی ہے۔ دوسری نوعیت ان سوال کرنے والوں کے ذہن کی ہوتی ہے جو دانشوری کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ اپنے علم پہ فخر بھی اور ایسے سوالات بطور تحقیر کرتے ہیں۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ○(الانبیاء ۲۳)

ترجمہ۔ وہ جو کام کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہو گی اور (جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی) ان سے پرسش ہو گی۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے جواب میں انہیں ان کی اوقات کا احساس دلاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر موجود کو اگر انسان خود سمجھنا چاہے تو ہر بات کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھنا چاہیں کہ "شر" کی حقیقت کیا ہے تو آپ کی اپنی عقل آپ کو جواب دے گی مثلاً۔ "زنا"۔ کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وبا کی بیماری سے تعبیر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت بڑا شر (گناہ) قرار دیا ہے۔ ایک صاحب نے سوال کیا اللہ نے یہ پیدا ہی کیوں کیا؟

عقل نے جواب دیا۔ بلاشبہ، اس کے آلات اعضائے تناسل تو اسی نے پیدا کئے۔ عورت اور مرد کو بھی اسی نے پیدا کیا اور ان دونوں میں جنسی خواہش بھی اسی نے پیدا کی۔ لیکن اس کا استعمال بھی تو بتایا۔ اس کی حکمت بھی سمجھائی۔ نکاح کے بعد یہ فعل افزائش نسل کے لئے مشروط ہے۔ اگر ان حدود میں رہ کر ان آلات کا استعمال کرو گے تو یہ شر نہیں بلکہ تمہیں اولاد کی محبت، بڑھاپے کا سہارا جیسے نعمت دے گا اور اگر ان حدود کو توڑ کر ان کا استعمال کرو گے تو جنسی جرائم اور قتل و غارت کی قطاریں لگ جائیں گی۔

اسی طرح شراب۔۔۔ اگر باعث "شر" یا ام الخبائث ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انگور

پیدا کئے جو انسانی صحت کے لئے بے حد مفید پھل ہے مگر انسان نے اس کو [illegible] اس سے شراب کشید کر لی۔ شر کا خالق کون اللہ یا انسان؟۔۔۔ تمام شرابوں کی کشید انسان کی اپنی ذہانت کا غلط استعمال ہے۔

لوہے کو لے لیجئے۔۔۔ "لوہا" انسان کے بے حد فائدوں کا ذریعہ ہے۔ لیکن انسان نے اپنی ذہانت اور اللہ کی دی ہوئی عقل کا غلط استعمال کر کے اس سے مہلک ہتھیار بنائے۔ یہ مثالیں تو انسان اور خارجی اشیاء کے حوالے سے ہیں۔ ذرا انسان کی داخلی کائنات کا تجزیہ کریں تو وہ ملکات "Instincts" جن سے شر اور خیر کے دونوں سوتے "Fountains" پھوٹتے ہیں ان پر بھی غور و تدبر کیجئے تو حقیقت اور حکمت بھی واضح نظر آئے گی۔

حسد۔۔۔ بہت برا عمل ہے۔ لیکن یہی جذبہ اگر انسان صحیح حد اور حالت میں استعمال کرے تو یہی انسان کو صحت مند مقابلہ کے لئے توانائی دیتا ہے۔

غصہ۔۔۔ غصہ اور غیرت دونوں کا مخرج و مصدر ایک ہی غدود "Gland" سے ہے۔ فرق صرف استعمال سے خیر و شر میں بدلتا ہے۔ انسان ایسے سوالات کرتے وقت بھول جاتا ہے کہ اس کو جو سب سے زیادہ طاقتور استعداد یا صلاحیت دی گئی ہے وہ عقل ہے، علم حاصل کرنے کا شوق ہے، جذبہ تجسس و تحقیق ہے اور پھر اسے یاد کے تہ خانے میں محفوظ رکھنے کی اہلیت بھی۔ جو کسی اور مخلوق کو نصیب نہیں ہے، یہ خصوصی اعزاز اگر حاصل ہے تو صرف انسان اور جن کو ہے۔ لہٰذا جزا و سزا بھی سوال بھی جواب بھی انہیں سے ہو گا۔ تمام محبت کے لئے اللہ جل شانہٗ نے انسان اور جنوں کو اپنی دی ہوئی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرنے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ "خلق العظیم" کے جامعہ میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے۔

انسان اور جنوں کو ان کی اس زندگی کے مقصد کی وضاحت اللہ جل شانہٗ نے اپنی کتاب بلاغت و صداقت قرآن حکیم میں یوں فرمائی ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (الملک ۲)

ترجمہ۔ اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے۔

اور دوسری جگہ یہ ارشاد فرمایا:

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَاO فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَاO قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَاO وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَاO ؕ (الشمس ۷۔۱۰)

ترجمہ اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے اعضاء کو برابر کیا۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیز گاری کرنے کی سمجھ دی۔ کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

مزید وضاحت فرمائی:

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىO فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰىO (النازعات: ۴۰۔۴۱)

ترجمہ اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔

زندگی اور موت کے درمیان امتحان کے کمرہ سے کامیاب نکلنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بھی خوشخبری دی

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الانعام ۱۲۷)

ترجمہ: ان کے لئے پروردگار کے ہاں سلامتی کا گھر ہے۔

اور اگر بدنصیب انسان نے اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال کیا۔ امتحان کے کمرہ سے ناکامیاں لے کر نکلا تو فرمایا

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ۝ (ابراہیم:۲۹)

ترجمہ (وہ گھر) دوزخ (ہے۔ سب ناشکرے) اس میں داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

انسان کی اس ساری بدنصیبی کی جڑ اللہ جل شانہٗ سے تعلق میں شک اور شبہ ہے۔ اس شک اور شبہ یا بے یقینی کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کائنات کو تدبر و تفکر سے دیکھے تو اسے چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے اجسام میں حکمت الٰہیہ نظر آئے گی۔ ایسی مکمل حکمت جس میں کسی قسم کا خلا یا کمی نہیں ملے گی ان کی ساخت میں اس کی پیدائش و موت میں، ان کی تاثیرات میں، ان کے عوامل میں، ان کے عمل اور رد عمل میں، مفرد میں، مرکب میں، کمال کا نظم و نسق ملے گا جو اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کی تصدیق ہو گی۔

الَّذِيْ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (الم السجدہ ۷)

ترجمہ جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا۔

اور ثواقب و سیار کی اپنے مدار پہ مسلسل بے نقص و تعطل گردش ہر عنصر میں ربط و تعلق، باقاعدگی اور ایسا نظم و نسق زبان حال سے گواہی دے گا۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۖ (النمل: ۸۸)

ترجمہ (یہ) خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔

اس کی مضبوطی کا یہ عالم، چاند، سورج، سیارے، کہکشائیں اور دوسرے بروج سب کے سب، بے ستون، محو گردش، سب کا ربط، حیران کن، آسمانوں اور زمینوں سے لہروں اور دیگر اثرات و عوامل میں اٹوٹ تعلق، اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کی تصدیق۔

(ا) ذرا دیکھو تو اس کی حسن کارکردگی، یہ آنکھیں۔۔۔۔ اگر انسان کے جسم کے کسی اور حصہ میں لگی ہوتیں تو کیا ہوتا؟ اپنی عقل سے سوال کرو اور اسے اپنے تصور سے کسی دوسری جگہ منتقل کر کے دیکھو کتنی حماقت نظر آئے گی اور اللہ کا انتخاب محل کتنا درست کتنا صحیح!۔۔۔۔ ذرا اپنے ہاتھ اور ان کی انگلیوں کی ساخت تو دیکھو۔۔۔۔ ان کے جوڑوں کو دیکھو، ہتھیلی کو دیکھو، پوروں کو دیکھو، ان کے تناسب کو دیکھو، ان سے جو کام لیتے ہو ان پر غور کرو، ناخنوں پر توجہ دو، قلم، کی گرفت، کاغذ پہ اپنے خیالات کے انتقال پہ تدبر کرو، اپنے دل اور دماغ سے الجھتے ہوئے

خیالات کے چشمے کیا کہتے ہیں؟۔۔۔ ذرا اونٹ کی ساخت تو دیکھو اس کے ہونٹوں کی کارکردگی تو دیکھو صحرا میں ریت میں لپٹی ہوئی جھاڑیوں کو ایک ہونٹ سے دور کرنے اور دوسرے سے اسے کھینچنے کا عمل، اس بہترین صناع کی کمال صناعی کی تصدیق!

ذرا نباتات اور جڑی بوٹیوں کے نظام نشوونما، نمو اور بالیدگی پہ توجہ تو دو۔۔۔ ان کی جڑیں کس طرح ان سے اپنی غذا حاصل کرتی ہیں اور پھر تنوں اور پتوں میں ان کی تقسیم کے درست اور مکمل طریق۔۔۔ اللہ جل شانہٗ کی بہترین سے بہترین منصوبہ کاری کی تصدیق ہے یا نہیں؟ ذرا کھیتوں میں اگی ہوئی اجناس اور پہاڑوں کے دامن میں سرسبز نباتات کے رنگ برنگی فرش کی نمو، پھر، موت اور زندگی کے نظام میں تجسس تو کرو!

ذرا آسمان کی طرف نگاہ اٹھاؤ۔۔۔ اڑتے ہوئے پرندے، طرح طرح کے حسین پرندے چھوٹے سے چھوٹے پرندے، بڑے سے بڑے جسم کے پرندے، فضاؤں میں ان کا پروں سے کام لینا، پروں کو کھولنا بند کرنا۔۔۔ بلندیوں تک اڑنا، مخالف ہواؤں سے لڑنا جھپٹنا۔۔۔ حیرت ناک کمال تخلیق کا منہ بولتا ثبوت!

سمندر کے کنارے یا اس کی گہرائیوں میں مچھلیوں کو عطا کردہ سوجھ بوجھ کا مشاہدہ تو کرو۔ موجوں کی رفتار سے انہیں خطروں کی اطلاع کے خودکار رڈار کس نے عطا کئے؟ کون ہے جس کے حسن عطا پہ انسان کی عقل ششدر؟

رات کی تاریکیوں میں اڑنے والی چمگادڑ۔۔۔ کی عادات و خصلات کا مطالعہ تو کرو، غرض جس طرف بھرپور نظر اٹھاؤ گے جس موجود پر توجہ دو گے جس نقطہ نگاہ سے تدبر و تفکر کرو گے اس میں تمہیں اللہ جل شانہٗ کی حکمت کے ابلتے سمندر نظر آئیں گے۔ اور تم اس کے جلال حکمت سے لرز کر رہ جاؤ گے۔ تمہاری عقل بے ساختہ کہے گی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کتنا سچا ہے:

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ○(یوسف ۱۰۵)

ترجمہ: اور آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ گزرتے ہیں اور ان سے اعراض کرتے ہیں۔

آپ کی عقل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تصدیق کرتے ہوئے کہے گی کہ واقعی ہی ایسے لوگ کتنے ناسمجھ ہیں، وہ علم و حکمت کے جمال سے محروم کتنے بد نصیب ہیں اور پھر ان کا انجام، پشیمانی کے یہ الفاظ:

وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ○(الملک ۱۰)

ترجمہ: اور کہیں گے اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

ان تمام دلائل کے ساتھ تعلیم کے باوجود بھی اگر انسان نافرمانی پہ اڑا رہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ○(فصلت ۴۰)

ترجمہ: (تو خیر) جو چاہو سو کر لو جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو جن اعمال کا مالک دیکھنا چاہتے ہیں وہ اعمال اس میں کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ اپنے اندر کی شخصیت "Internal Personality" کی برائیوں کو مؤدب کیسے بنا سکتا۔ اسکے لئے نگاہ و قلب کو شفا دینے والی تعلیم مکارم معراج محاسن کے جامعہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت طیبہ کا طالب علم بننا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمہ صفت موصوف معلمانہ صفات کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَO مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍO وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍO وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍO فَسَتُبْصِرُ وَ یُبْصِرُوْنَO بِاَیِّكُمُ الْمَفْتُوْنُO اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَO فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِیْنَO (القلم ۱۔۸)

ترجمہ   نٓ۔ قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔ کہ (اے محمدؐ) تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو۔ اور تمہارے لئے بے انتہا اجر ہے۔ اور تمہارے اخلاق بڑے (عالی) ہیں۔ سو عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور یہ (کافر) بھی دیکھ لیں گے۔ کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے۔ تمہارا پروردگار اس کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے بھٹک گیا اور ان کو بھی خوب جانتا ہے جو سیدھے رستے پر چل رہے ہیں۔ تو تم جھٹلانے والوں کا کہنا نہ ماننا۔

حضرت انسان ذرا سوچ

ہر نعمت کے پیچھے کسی نہ کسی کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً بیمار کے لئے دوا نعمت ہے۔ اس نعمت کے پیچھے ڈاکٹر کا ہاتھ ہے۔ بھوکے کے لئے غذا نعمت ہے۔ اس نعمت کے گلے سے اترنے تک کئی ہاتھ نظر آتے ہیں۔ کمزور نوزائیدہ بچوں کے سن بلوغت تک یا توانا عمر تک حفاظت اور کفالت نعمت ہے۔ اس نعمت کے پردے میں نہاں ماں، باپ، رقیب یا نگران کا ہاتھ یقینی ہے۔ گھر میں راحت و آرام کا سامان مہیا ہونا نعمت ہے۔ جس کے پیچھے جدوجہد کرتے ہوئے انسانی ہاتھ موجود۔۔۔ ایک شوہر کے لئے اچھی بیوی نعمت ہے اس کے پیچھے اچھی تعلیم و تہذیب دینے والے ہاتھ مسلمہ ہیں۔ اس مسلمہ مصدقہ اور مدلل حقیقت کی طرح انسان پر فضل و کرم رحمت و عطا کے پیچھے بھی ایک مختار کل ذات اللہ جل شانہٗ کا ہاتھ ہے۔

ایسی ذات برتر کا تعارف اپنے کلام حق و صداقت فرقان حمید میں ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌO (النحل ۱۸)

ترجمہ   اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہ سکو۔ بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌO (ابراہیم ۳۴)

ترجمہ   اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔ (مگر لوگ نعمتوں کا شکر نہیں کرتے) کچھ شک نہیں کہ انسان بڑا بے انصاف (اور) ناشکرا ہے۔

اس سے بڑھ کر اس کی ناحق شناسی (ظلم) اور ناشکری (کفر) کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری بے حد و حساب نعمتوں، احسانوں، مہربانیوں کی نسبت دوسروں سے جوڑ دیتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ستم بالائے ستم کہ اتنی محبتوں، شفقتوں اور بخششوں کے باوجود جب اللہ جل شانہٗ کا نام ان کے کانوں کو چھوتا ہے تو ان کے دلوں میں چھپی ہوئی کدورت اور نفرت ان کے چہروں پہ بیزاری کا اظہار بن کر ابھرتی ہے۔

اللہ جل شانہٗ ایسے انسانوں کے کردار کا تجزیہ فرقان حکیم میں یوں فرماتے ہیں۔

وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِیْنَ مِنْ

دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ O(الزمر ۴۵)

ترجمہ: اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں۔

یہ اور کون ہے؟

وہی جو اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں انسانوں کی بھلائی کا نظام پیش کرتے ہوئے سب کی خواہشات کے تابع بات کرتا ہے۔ ایسے لوگ ہر دور میں رہے اور ہیں! جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کو سن کر انتہائی متکبرانہ لہجہ میں کہتے ہیں۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ O(الانعام:۲۵، الانفال:۳۱، النحل:۲۴، المومنون:۸۳)

ترجمہ یہ (قرآن) اور کچھ بھی نہیں صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

ہماری تحقیقات اور انکشافات کے تحت مرتب کردہ نظامِ حیات قبول کرو۔ اس میں آزادی ہے۔ جبر نہیں،خدا تو جاگیرداروں، بادشاہوں اور طاقتوروں کی پیداوار ہے ورنہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ انسانوں کے اس رویہ کے باوجود اللہ تعالیٰ انسان کی عقل و فکر کو دلائل کے ساتھ فرض شناسی اور حقیقت آگاہی کی دعوت دیتے ہیں وہ انسان کو اپنے احسانات کی یاد دلاتے ہیں۔ اپنے خصوصی رحم و کرم کی یاد دلاتے ہوئے قرآن حکیم میں فرماتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O(البقرہ:۱۸۲)

ترجمہ: بے شک خدا بخشنے والا (اور) رحم والا ہے۔

انسان کو دلاسا بھی دیتے ہیں۔ امید بھی دلاتے ہیں، ہمت شکستہ نہ ہو، گناہ ہو گئے یا غلطیاں ہوگئیں تو ہماری بخششوں سے مایوس نہ ہو۔ تم اچھے بننے کا ارادہ کرو۔ کوشش کرو، ہم تمہارے سابقہ گناہ معاف کر دیں گے۔ ہم سے رحم کی بھیک مانگو تو سہی، ہم تم پر رحم کریں گے۔ اور دیکھو غور کرو، ہمارے احسان ہمارے انعامات پر توجہ دو، اپنے ہوش و حواس عقل و دانش کو تدبر و تفکر سے غور کرنے پہ لگاؤ تو، تم دیکھو گے

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرہ ۲۹)

ترجمہ وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں۔

یہ زمین، اس میں پوشیدہ خزانے تمہارے، دھاتیں تمہاری، قیمتی پتھر تمہارے، سونا چاندی، سب تمہارے۔ یہ پھل، پھول، صبح کا حسن، شام کا جمال، جو کچھ بھی تمہیں نظر آتا ہے، جو کچھ بھی تم اپنی جدوجہد سے ڈھونڈ لو، دیکھ لو سب تمہارا ہے۔

تمام اہلِ عقل و شعور اور علم و دانش کو اس بات کا علم ہے کہ اللہ جل شانہٗ کا یہ اعلان انسان کی موجودہ مادی یا علمی فتوحات کو دیکھ کر نہیں بلکہ اس وقت یہ اعلان فرمایا۔ جب انسان کی آنکھوں نے پہلی بار دیکھنا شروع کیا، کانوں نے سننا، جسم نے چھونے کا احساس اور زبان کو لذت سے آشنائی نصیب ہوئی۔

اللہ جل شانہٗ کا ایک اور اعلان سنیئے

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً

وَّ بَاطِنَةً ط (لقمان:۲۰)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

اللہ جل شانہٗ کا یہ اعلان بھی جس میں آسمان اور خلا میں موجود، مرئی یا غیر مرئی اشیاء کی تسخیر کو "اسبغ" یعنی تمام کر دی گئی۔ اس وقت کا فضاؤں میں گونج رہا ہے جب انسان کی تحقیق و تلاش کی مہمات کا شعور گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ اعلان اس وقت سے فضاؤں کی لہروں میں موجود تھا۔ جب انسان نے صبح و شام کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی اور انسان کو اشرف المخلوقات کا اعزاز دے کر مسجود ملائک بنایا گیا۔

کچھ انسانوں (ہیوم، مل، رسل) جنہیں دانشور تسلیم کیا جاتا ہے کے مکتبہ خیال کے مشہور فرانسیسی مفکر آگسٹ کامٹے (August Comte) انسان کے فکری ارتقا کے تین مراحل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آج کے مرحلہ کو "Positive Stagle" کا نام دیتے ہوئے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے۔

آج ہم واقعات اور حقائق کی توجیہ مطالعہ اور مشاہدہ کے عام قوانین کے تحت کرتے ہیں۔ یعنی آج کے اس دور میں وہ بات جو مشاہدہ اور تجربے میں نہ آئے اسے ہم ماننے کے لئے تیار نہیں۔ تو مشاہدہ اور تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کی تصدیق سائنس دانوں کی زمین سے لے کر خلا اور آسمانوں کے ثواقب و سیارے چاند اور سورج کی توانائی پر فتح و کامرانی اتنی واضح ہے کہ اس سے انکار ناممکن ہے۔ اسی اعلان کو تیسری بار پھر سنئے!

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط (الجاثیہ۔۱۳)

ترجمہ: اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (حکم) سے تمہارے کام میں لگا دیا۔

اگر آج کا انسان چاند پہ لونار اور چاند گاڑی دیکھ چکا ہے جیوپیٹر اور مریخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال چکا ہے، اگر الیکٹران، نیوٹران، برقی لہروں، شمسی توانائی، سمندروں اور دریاؤں کو اپنی عقل کا غلام بنانے کا انسانی اعلان سچ ہے، اگر انسان کی آفاقی مہمات میں کامیابی کا اعلان سچ ہے، مشاہدہ اور تجربہ اس کا گواہ ہے تو اللہ جل شانہٗ کا یہ اعلان بھی برحق ہے۔ تو اعلان کرنے والا اللہ جل شانہٗ بھی موجود حی القیوم ہے!

مختصر یہ کہ ان اعلانات کے علاوہ اللہ جل شانہٗ نے انسان پر اور کون کون سے انعام و اکرام کئے ہیں۔ ذرا اس پر بھی غور فرمایئے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہستی کے منہ بولتے دلائل ہیں:

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ع (الاسراء:۷۰)

ترجمہ: اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

اللہ جل شانہٗ کا انسان کا یہ اعزاز صرف قیاس نہیں حقیقت ہے جو نظر آتی ہے۔ مغرب، فرانس اور یونان کے محققین کی طرح کھنڈروں میں پائے جانے والے ڈھانچوں کو اساس تحقیق بنا کر گمان و قیاس میں اس کو جانور،

وحشی، بے وقوف، کمزور اور درندوں کی نسل کی ترقی یافتہ مخلوق کے دعوے کی تمام تر بے دلیل و بے ثبوت نہیں۔ مشاہدہ اور تجربہ گواہ ہے کہ انسان خشکی اور سمندروں میں یوں ہی رواں دواں ہے جیسے کوئی گھوڑے پر سوار سرگرم سفر، بلکہ اب تو ہواؤں پہ سوار خلاؤں پہ سوار---- اللہ تعالیٰ کے احسان کا محکم بصری ثبوت (Eye Witness)

الرَّحْمٰنُ Oۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ Oۗ خَلَقَ الْاِنْسَانَ Oۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ O(الرحمٰن ۱-۴)

ترجمہ۔ (خدا جو) نہایت مہربان۔ اسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اسی نے اس کو بولنا سکھایا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ O (التین ۴)

ترجمہ: کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

اللہ جل شانہٗ کے ان احسانوں سے فاترالعقل تو انکار کر سکتا ہے لیکن تندرست عقل کو اگر بصری گواہی ہی درکار ہے تو انسان کے حسن و جمال کے بے گنت واقعات کو اپنی یادوں کی روشنی میں دیکھ لے۔

اللہ تعالیٰ کے خالق انسان و کائنات ہونے کے ثبوت میں ترجمان رحمن و رحیم محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ۔

ترجمہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

اکابرین نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صورت سے مراد صفت ہے۔ مثلاً انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ارادہ کی قدرت بخشی ہے اور وہ خود بھی صاحب ارادہ ہے۔ وہ خود بھی سب سے بڑا صاحب علم ہے اور آدم کو بھی علم سے فضیلت بخشی ہے۔ اللہ خود زندگی عطا کرنے والے بغیر کسی کی مدد کی زندہ رہنے والے ہیں۔ انسان کو بھی زندگی کی صفت عطا فرمائی ہے اللہ تعالیٰ خود سننے والے ہیں۔ انسان کو بھی سننے کی صفت سے نوازا ہے۔ اللہ جل شنہٗ خود سب سے بہتر دیکھنے والے ہیں۔ انسان کو بھی بصارت بخشی ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ متکلم ہے تو انسان کو بھی قدرت کلام بخشی ہے۔ اگر وہ حلیم ہیں تو انسان کو حلم کی خو بخشی ہے۔ خود رحیم ہیں تو انسان کے دل میں رحم رکھا ہے۔ صفات میں ان تمام تعارفی خصائص کی مماثلت کے باوجود اللہ جل شانہٗ کی اپنی ذات بے مثل ہے۔ اپنی صفات اپنے کمالات اپنے اسماء اور اپنے عمل میں---- ان احسانات کے علاوہ اللہ جل شانہٗ نے انسان پر کیسی کیسی مبینہ کھلم کھلا نظر آنے والی مہربانیاں فرمائی ہیں۔ قرآن کریم میں سورۂ انعام اور سورۂ نحل میں ان کی تفصیل موجود ہے۔ اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ (یونس:۵)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور (کاموں کا) حساب معلوم کرو۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ (الانعام:۹۷)

ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں ان سے

رستے معلوم کرو۔

جو آج بھی ترقی کے بے شمار پیدا کردہ اسباب کے باوجود کناروں سے دور سمندروں میں اور خلا کی وسعتوں میں اڑتے ہوئے ستاروں کی راہنمائی کی اساس ہیں۔ اگر ان کی راہنمائی نہ ہوتی تو نہ جانے کتنے انسان سمندروں اور خشکی کی وسعتوں میں بھٹک کر دم توڑ دیتے۔

وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ○(النحل۔۱۵)

ترجمہ اور اسی نے زمین پر پہاڑ (بنا کر) رکھ دیئے کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے اور نہریں اور رستے بنا دیئے تاکہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک (آسانی سے) جا سکو۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الْاَنْهٰرَ○ ۚ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ○ ۚ وَ اٰتٰىکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ○ ۧ(ابراہیم ۳۲۔۳۴)

ترجمہ خدا ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور آسمان سے مینہ برسایا۔ پھر اس سے تمہارے کھانے کے لئے پھل پیدا کئے۔ اور کشتیوں (اور جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کیا تاکہ دریا (اور سمندر) میں اس کے حکم سے چلیں اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔ اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں (دن رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں اور (رات) اور دن کو بھی تمہاری خاطر کام میں لگا دیا۔ اور جو کچھ تم نے مانگا سب میں سے تم کو عنایت کیا اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو (مگر لوگ نعمتوں کا شکر نہیں کرتے) کچھ شک نہیں کہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان پر اپنے انعام و اکرام کی ایک اور فہرست یاد دلاتے ہیں۔

اَوَ لَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ (الانبیاء۔۳۰)

ترجمہ کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے جدا جدا کر دیا۔

اب آپ اپنی عقل سے کام لیجئے۔ مغرب کے جن سائنس دانوں کے علم سے آپ مرعوب ہیں۔ اگر ان کا اور قرآن حکیم کا غور سے مطالعہ کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ تمام مغربی سائنس دانوں نے ہمارے ہی لوٹے ہوئے علمی ذخیروں کو اساس بنا کر اس میں تھوڑی سی غلط تبدیلیاں کر کے اپنی دریافت کا نام دے دیا ہے)۔

سائنس دانوں کا یہ دعویٰ کہ دھماکے کے ساتھ کرہ ارض اور دوسرے کرات وجود میں آئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو اساس بنا کر (ملے ہوئے آسمان اور زمین کو ہم نے کھول دیا۔ الگ الگ کر دیا۔ تو پیش نہیں کیا)؟

آگے سنیئے اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں:

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ (الانبیاء:۳۰)

ترجمہ: اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

(اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا برسات کے بعد زمین سے کیڑے مکوڑوں کے علاوہ، نباتات کو زندگی عطا کی۔

(ملحد برادری پانی اور عناصر کے باہمی ملاپ کے بعد ایک مخلوق کو پیدا کر کے کائنات کے آغاز کی اساس" جرثومہ اور دلدل بنا کر نظریہ کی عمارت تعمیر کرتا ہے)۔ یقیناً اللہ جل شانہٗ ایسے انسانوں کی ہٹ دھرمی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہماری علامات کو دیکھ کر بھی ایسے لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ۝۔ (الانبیاء ۳۰)

ترجمہ ہماری ان تمام علامات کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی (پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے؟) اللہ اپنے احسانات کا تذکرہ جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں

وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ (الانبیاء ۳۱)

ترجمہ اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تاکہ لوگوں (کے بوجھ) سے ہلنے (اور جھکنے) نہ لگے۔

(اور ہم نے اس زمین میں کشادہ رستے بنائے تاکہ تم ان کے ذریعہ اپنی منزلوں کی رہنمائی حاصل کر سکو)۔

اب آپ غور فرمایئے اگر زمین بالکل چٹیل ہوتی، پہاڑی بلندیاں اور چوٹیوں کی رکاوٹیں (Barriers) نگاہوں کے لئے نہ ہوتیں تو نفسیاتی طور پہ انسانی ذہن پر کیا اثر ہوگا؟

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ (الانبیاء ۳۱)

ترجمہ: اور آسمان کو محفوظ چھت بنایا

وَ هُوَالَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۝(الانبیاء ۳۳)

ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو بنایا (یہ) سب (یعنی سورج اور چاند اور ستارے) آسمان میں (اسطرح چلتے ہیں گویا) تیر رہے ہیں۔

انعام و اکرام کے سلسلہ کا ذکر سورۂ "النحل" میں یوں فرماتے ہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ۝(النحل ۴)

ترجمہ: اسی نے انسان کو نطفے سے بنایا مگر وہ اس (خالق) کے بارے میں علانیہ جھگڑنے لگا۔

وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ (النحل:۵)

ترجمہ: اور چارپایوں کو بھی اسی نے پیدا کیا۔

لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۝ (النحل ۵)

ترجمہ ان میں تمہارے لئے جڑاول اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو۔

بھیڑ بکریوں کی اون سے بنائے جاتے والے لباس اور جسمانی صحت کے لئے لحمیات کا حصول کیا انسان پر اللہ کی نعمت نہیں؟

وَ لَكُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَ حِیْنَ تَسْرَحُوْنَ۝ (النحل ۶)

ترجمہ: اور جب شام کو انہیں (جنگل سے) لاتے ہو اور جب صبح کو (جنگل) چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت و شان ہے۔

کیا یہ لمحات، دل و دماغ کو سرور دینے والے نہیں ہوتے؟ آگے اور انعام و اکرام کی فہرست ارشاد ہے:

وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌO (النحل۔۷)

ترجمہ: اور (دور دراز) شہروں میں جہاں تم زحمت شاقہ کے بغیر پہنچ نہیں سکتے وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار نہایت مشفقت والا (اور) مہربان ہے۔

کیا یہ سچ نہیں کہ ایسے ایسے جانور اللہ تعالیٰ نے ہمارے فرماں بردار بنائے ہیں کہ ان میں سے اگر ایک بھی کبھی کسی وجہ سے پاگل، یا باغی ہو جاتا ہے تو اس کے سامنے ہم کتنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ یہ بات تو کئی بار مشاہدوں میں آ چکی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں؟

وَ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً ؕ وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَO (النحل۔۸)

ترجمہ: اور اسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور (وہ تمہارے لئے) رونق و زینت (بھی ہیں) اور وہ (اور چیزیں بھی) پیدا کرتا ہے جن کی تم کو خبر نہیں۔

غور فرمایئے۔ گھوڑے سے لے کر برق رفتار طیاروں تک جب انسان ان پر سوار ہوتا ہے تو اپنے اندر ایک خاص قسم کی کیفیت، اپنی شخصیت میں محسوس نہیں کرتا، کیا اللہ جل شانہٗ کا یہ نفسیاتی تجزیہ سچ نہیں؟

وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَO (النحل۔۹)

ترجمہ: اور سیدھا راستہ تو خدا تک جا پہنچتا ہے اور بعض رستے ٹیڑھے ہیں (وہ اس تک نہیں پہنچتے) اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے رستے پر چلا دیتا۔

یعنی زندگی میں راہیں اختیار کرتے وقت تم میں سے ہی چنے گئے راہنماؤں (انبیاء پیغمبروں) کی تعلیم سے فائدہ اٹھاؤ۔ حسن معاشرت یہی ہے۔ ہم نے بعض کو تمہاری راہنمائی سونپی ہے۔ نبی اور رسول راہ کے تمام پہلوؤں سے آگاہ کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کا پہلو یہ ہے کہ اگر ہر ایک کو براہِ راست راہِ حق کی تعلیم دے دی جاتی تو انسان کی ذہنی تربیت کے لئے کوئی گنجائش نہ رہتی۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَO (النحل۔۱۰)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جسے تم پیتے ہو اور اس سے درخت بھی (شاداب ہوتے) ہیں جن میں تم اپنے چارپایوں کو چراتے ہو۔

يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ النَّخِيْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَO (النحل۔۱۱)

ترجمہ: اسی پانی سے وہ تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور (اور بے شمار درخت) اگاتا ہے۔ اور ہر طرح کے پھل (پیدا کرتا ہے) غور کرنے والوں کے لئے اس میں (قدرت خدا کی بڑی) نشانی ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَO (النحل:۱۲)

ترجمہ: اور اسی نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا اور اسی کے حکم سے ستارے

بھی کام میں لگے ہوئے ہیں سمجھنے والوں کے لئے اس میں (قدرت خدا کی بہت سی) نشانیاں ہیں۔

وَ مَا ذَرَاَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ○(النحل:۱۳)

ترجمہ: اور جو طرح طرح کے رنگوں کی چیزیں اس نے زمین میں پیدا کیں (سب تمہارے زیرفرمان کر دیں) نصیحت پکڑنے والوں کے لئے اس میں نشانی ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَی الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ○(النحل ۱۴)

ترجمہ اور وہی تو ہی جس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور (موتی وغیرہ) نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں اور اس لئے بھی (دریا کو تمہارے اختیار میں کیا) کہ تم خدا کے فضل سے (معاش) تلاش کرو تاکہ اس کا شکر کرو۔

وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ○ ۙ (النحل ۱۵)

ترجمہ اور اسی نے زمین میں پہاڑ (بنا کر) رکھ دیئے کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے اور نہریں اور رستے بنا دیئے تاکہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک (آسانی سے) جا سکو۔

دنیا کی سیاحت کرنے والوں نے ان دریاؤں اور راستوں کی اہمیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ انہیں پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان پر یہ انعام بھی بہت ہی جلیل القدر ہے۔

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ○(النحل ۱۷)

ترجمہ: تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے۔ کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے؟

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○(النحل ۱۸)

ترجمہ. اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہ سکو بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

ابھی سلسلۂ انعام و اکرام اور سنیئے

اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ○(النحل:۴۸)

ترجمہ کیا ان لوگوں نے خدا کی مخلوقات میں سے ایسی چیزیں نہیں دیکھیں جن کے سائے دائیں سے (بائیں کو) اور بائیں سے (دائیں کو) لوٹتے رہتے ہیں (یعنی) خدا کے آگے عاجز ہو کر سجدے میں پڑے رہتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ○ (النحل:۶۵)

ترجمہ: اور خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کیا بے شک اس میں سننے والوں کے لئے نشانی ہے۔

وَ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا

سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَO(النحل ۶۶)

ترجمہ: اور تمہارے لئے چارپایوں میں بھی (مقام) عبرت (و غور) ہے کہ ان کے پیٹوں میں جو گوبر اور لہو ہے اس سے ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے۔

وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَO(النحل ۶۷)

ترجمہ: اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی (تم پینے کی چیزیں تیار کرتے ہو) کہ ان سے شراب بناتے ہو اور عمدہ رزق (کھاتے ہو) جو لوگ سمجھ رکھتے ہیں ان کے لئے ان (چیزوں) میں (قدرت خدا کی) نشانی ہے۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَO ۙ
(النحل ۶۸)

ترجمہ: اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور (اونچی اونچی) چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنا۔

اور اس کے بعد

ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَO(النحل ۶۹)

ترجمہ: اور ہر قسم کے میوے کھا۔ اور اپنے پروردگار کے صاف رستوں پر چلی جا۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں (کے کئی امراض) کی شفا ہے۔ بے شک سوچنے والوں کے لئے اس میں بھی نشانی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے انعام و اکرام کے ذرائع اور اسباب کی وضاحت فرماتے ہوئے بار بار انسان سے عقل، فکر، ذکر اور استعداد علم کو استعمال کرنے کی تاکید فرماتے ہوئے سلسلہ کلام بڑھاتے ہیں:

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَO ۙ (النحل ۷۲)

ترجمہ: اور خدا ہی نے تم میں سے تمہارے لئے عورتیں پیدا کیں اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور کھانے کو تمہیں پاکیزہ چیزیں دیں تو کیا بے اصل چیزوں پر اعتقاد رکھتے اور خدا کی نعمتوں سے انکار کرتے ہیں؟

اس آیت کریمہ میں اللہ جل شانہٗ نے بیوی کے حوالے سے انسان کی عائلی زندگی میں بیوی، بیٹے اور پوتوں جیسے رشتوں، محبتوں اور خاندانوں کے تسلسل کا ذکر کر کے نفسیاتی کیفیات اور سکون کی نعمت یاد دلائی ہے۔ اسی قبیل کے دوسرے انعامات کی تفصیل کی یاددہانی کرواتے ہوئے فرمایا:

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَO(النحل ۷۸)

ترجمہ: اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تم کو کان اور آنکھیں اور دل (اور ان کے علاوہ اور اعضاء) بخشے تاکہ تم شکر کرو۔

غور کیجئے کہ کوئی جو یہ دعویٰ کرے کہ ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہی وہ کچھ جانتا تھا۔ یقیناً کوئی ایسی دلیل نہیں ملے گی۔

یہاں بھی عجب بات ہے کہ زندگی کے بعد سب سے پہلی وہ نعمتیں ہیں جس کی فکر ماں باپ اور رشتہ داروں کو ہوتی ہے۔ بچہ، اللہ کرے سن سکتا ہو، دیکھ سکتا ہو اور دل رکھتا ہو۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ یہ دلیل اور انعام تو تمہاری اپنی ذات کے حوالے سے ہے۔ اب ذرا اپنی خارجی دنیا پہ توجہ کی نظر ڈالو۔ اور

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ (النحل ۷۹)

ترجمہ: کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی ہوا میں گھرے ہوئے (اڑتے رہتے) ہیں۔ ان کو خدا ہی تھامے رکھتا ہے ایمان والوں کے لئے اس میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

اب انسان کی تمدنی زندگی پہ کئے ہوئے انعام و اکرام کی یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں

وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَھَا یَوْمَ ظَعْنِکُمْ وَ یَوْمَ اِقَامَتِکُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِھَا وَ اَوْبَارِھَا وَ اَشْعَارِھَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ ۝ (النحل ۸۰)

ترجمہ: اور خدا ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا اور اس نے چوپایوں کی کھالوں سے تمہارے لئے ڈیرے بنائے جن کو تم سبک دیکھ کر سفر اور حضر میں کام میں لاتے ہو اور ان کی اون اور ریشم اور بالوں سے تم اسباب اور برتنے کی چیزیں (بناتے ہو جو) مدت تک (کام دیتی ہیں)۔

عقلمند انسان غور کرا یہی وہ بنیادی سامان ہے جو ہماری تمدنی زندگی پر محیط ہے۔ ان سب انعامات کا تعلق دنیا میں ٹھہرنے سے ہے اس لئے ساتھ ہی یاد دلا دیا۔ خیال رہے انسان تمہاری زندگی میں ہم نے تمہیں جتنے بھی سامان راحت دے رکھے ہیں جیسے بھی دے رکھے ہیں وہ بیوی کے حوالے سے ہیں اولاد اور پوتوں کے حوالے سے ہیں۔ خارجی اسباب تعیش کے حوالے سے ہیں۔ تمام کے تمام کو ہمیشہ کے لئے نہ سمجھ لینا۔ تمہاری زندگی کے سانس گنتی کے ہیں۔ جہاں یہ گنتی پوری ہوئی یہ سامان بھی تمہارے نہیں رہیں گے۔ اور ہاں اپنے اللہ جل شانہٗ کی اس شانِ سخا اور عنایت کو پیش نظر رکھو:

وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَکْنَانًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ ؕ کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا وَ اَکْثَرُھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۝ (النحل ۸۱۔۸۳)

ترجمہ: اور خدا ہی نے تمہارے (آرام کے) لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے اور پہاڑوں میں غاریں بنائیں اور کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں۔ اور (ایسے) کرتے (بھی) جو تم کو (اسلحہ) جنگ (کے ضرر) سے

محفوظ رکھیں۔ اسی طرح خدا اپنا احسان تم پر پورا کرتا ہے تاکہ تم فرمانبردار بنو۔ اور اگر یہ لوگ اعراض کریں تو (اے پیغمبر) تمہارا کام فقط کھول کر سنا دینا ہے۔ یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں۔ مگر (واقف ہو کر) ان سے انکار کرتے ہیں۔ اور یہ اکثر ناشکرے ہیں۔

یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں، پھر بھی انکار کرنا ان کی عادت ہے اور یوں بھی انسانوں کی اکثر تعداد کو کفر سے ہی دلچسپی رہی ہے)۔

رحمت اور انعام و اکرام کی تفصیل

الَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًاO وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًاO وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًاO وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًاO وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًاO وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًاO وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًاO وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًاO وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًاO لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًاO وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًاO (النبا۔ ۶۔۱۶)

ترجمہ کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو (اس کی) میخیں (نہیں ٹھہرایا؟) (بے شک بنایا) اور تم کو جوڑا جوڑا بھی پیدا کیا۔ اور نیند کو تمہارے لئے (موجب) آرام بنایا۔ اور رات کو پردہ مقرر کیا۔ اور دن کو معاش (کا وقت) قرار دیا۔ اور تمہارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنائے۔ اور (آفتاب کا) روشن چراغ بنایا۔ اور نچڑتے بادلوں سے موسلادھار مینہ برسایا۔ تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں۔ اور گھنے گھنے باغ۔

نئے علوم کے انکشافات اس کی تصدیق میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں، مگر یہ بات تو خاص علم والوں کی سمجھ سے تعلق رکھتی ہے۔ اب انفرادی سوال ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

(یہ تو بتاؤ ہم نے تمہارے لئے نیند کو آرام کا سبب بنایا ہے یا نہیں)؟

اس آرام کی قدر ان سے پوچھو جنہیں نیند نہیں آتی تو دیواروں سے سر ٹکراتے پھرتے ہیں، خواب آور گولیاں کھاتے ہیں۔

(اور دیکھو ہم نے رات کو پردہ نما چیز بنایا ہے یا نہیں؟ اور دن کو تمہارے رزق کی تلاش کا وقت بنایا یا نہیں؟ اور تمہارے سروں پہ سات طبقات (مضبوط) سماوی بنائے یا نہیں؟ اور ہم نے آسمان (طبقات میں چراغاں) چمکتے روشن چراغ بنائے ہیں یا نہیں؟ اور بادلوں سے پانی بکثرت دھار کی صورت برساتے ہیں یا نہیں؟ ہم اس پانی سے غلہ، سبزی اور گھنے باغوں کو حسن رنگ دیتے ہیں یا نہیں)؟

سوچو! دانشورو، عقلمندو، اپنے علم و عقل سے پرکھو، یہ ساری دلیلیں سچی ہیں یا نہیں؟ ذرا اور بھی یاد کرو تو انسان کو ہمارے انعام و اکرام کی ایک قسم یہ بھی ملے گی:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖO اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّاO ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّاO فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّاO وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًاO وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًاO وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًاO وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّاO مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْO (عبس۔ ۲۴۔۳۲)

ترجمہ۔ تو انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے۔ بے شک ہم ہی نے پانی برسایا اور پھر ہم نے زمین

کو چیرا پھاڑا۔ پھر ہم ہی نے اس میں سے اناج اگایا اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارا (یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے چارپایوں کے لئے بنایا۔

آپ کو معلوم ہی ہو گا صرف گندم کے دانے اور بھوسے سے بعد اس کی پکی فصل کی کٹائی کے بعد خوشے الگ کر لئے جاتے ہیں پھر دانے الگ کر لئے جاتے ہیں۔ خوشے اناج سے الگ ہونے کے بعد گندم کے پودے خوشوں کے الگ ہونے کے بعد مویشیوں کے چارے میں کام آتے ہیں۔ اسی طرح دوسری جنس درختوں اور ترکاری کے پودوں سے بھی انسان کے فائدے کے لئے علاوہ چوپایوں کا سامان خوراک بھی مہیا کرتے ہیں۔

اس تمام "Process" کو اللہ تعالیٰ نے مرحلہ وار بتایا ہے۔ اس میں کوئی بات غلط ثابت کرو، اس کے نتائج کو غلط ثابت کر سکتے ہو تو کرو، ورنہ عقل سے کام لو سنو! ہوش کے کانوں سے سنو!

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ ۝ (فاطر ۳)

ترجمہ: لوگو! خدا کے جو تم پر احسانات ہیں ان کو یاد کرو کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق (اور رازق) ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تم کہاں بہکے پھرتے ہو۔

آسمان اور زمین کا اناج کے اگنے اور پکنے میں کیا تعلق ہے۔ علم زراعت کا مطالعہ کیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی صداقت کا پتہ چلے گا اور زمین و آسمان کو ایک ساتھ بیان فرما کر کتنا بلیغانہ انداز استعمال فرمایا۔ یہ علم اللسان سے پتہ چلے گا، اس دلیل کے بعد فیصلہ کس انداز میں فرمایا۔ کوئی الٰہ (عبادت کے لائق) نہیں بس اللہ ہی ہے! لیکن تم کیوں الٹے چکر میں پھنس رہے ہو۔ کھاتے اللہ کا ہو، اور گاتے دوسروں کا ہو)۔

انسانو! ذرا غور کرو، اللہ کی مہربانیوں پہ دھیان تو دو!

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ أَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ إِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝ (فاطر ۹)

ترجمہ۔ اور خدا ہی تو ہے جو ہوائیں چلاتا ہے اور وہ بادل کو ابھارتی ہیں پھر ہم اس کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں پھر اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح مردوں کو جی اٹھنا ہو گا۔

انسانو! اپنے اللہ کے اس انعام کو نہ بھولو، جو زندگی میں بار بار تمہیں مشاہدے اور تجربے سے آشنا کرتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۚ فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (فاطر ۲۷۔۲۸)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے مینہ برسایا تو ہم نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے میوے پیدا کئے۔ اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔ اور (بعض) کالے سیاہ ہیں۔ انسانوں اور

جانوروں اور چارپایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں۔ خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔ بے شک خدا غالب (اور) بخشنے والا ہے۔

انسان! ذرا حسین کائنات کو وجود میں لانے والے اللہ کے مظاہر پر غور تو کرو۔ اس ہستی کی پہچان کیا ہے؟

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۖؗ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۙ۝ وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۙ۝ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۙ۝ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ ؕ (الانعام ۱۴۱-۱۴۴)

ترجمہ اور خدا ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کئے چھتریوں پر چڑھائے ہوئے بھی اور جو چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی۔ اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور زیتون اور انار جو (بعض باتوں میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور (بعض باتوں میں) نہیں ملتے۔ جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو اور بے جا نہ اڑانا کہ خدا بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور چارپایوں میں بوجھ اٹھانے والے (یعنی بڑے بڑے) بھی پیدا کئے اور زمین سے لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) بھی (پس) خدا کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ (یہ بڑے چھوٹے چارپائے) آٹھ قسم کے (ہیں) دو (دو) بھیڑوں میں سے اور دو (دو) بکریوں میں سے (یعنی ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ) (اے پیغمبر ان سے) پوچھو کہ (خدا نے) دونوں (کے) نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں (کی) مادینوں کو یا جو بچہ مادینوں کے پیٹ میں لپٹ رہا ہو اسے اگر سچے ہو تو مجھے سند سے بتاؤ۔ اور دو (دو) اونٹوں میں سے اور دو (دو) گایوں میں سے۔

اگر اب بھی تمہاری سمجھ میں بات نہ آئی ہو تو سن لو اللہ تعالیٰ کی پہچان ان علامات میں بھی موجود ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ تم ان علامات پر غور تو کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّیْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ (انعام ۹۶-۹۷)

ترجمہ بے شک خدا ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ (کر ان سے درخت وغیرہ) اگاتا ہے۔ وہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور وہی بے جان کا جاندار سے نکالنے والا ہے۔ یہی تو خدا ہے پھر تم کہاں بہکے پھرتے ہو؟ وہی (رات کے اندھیرے سے) صبح کی روشنی پھاڑ نکالتا ہے اور اسی نے رات کو (موجب) آرام (ٹھہرایا) اور سورج اور چاند کو (ذرائع) شمار بنایا ہے۔ یہ خدا کے (مقرر کئے ہوئے) اندازے ہیں جو غالب (اور) علم والا ہے۔

اور ذرا اپنے بارے میں بھی اچھی طرح سمجھ لو۔

تمہاری پیدائش کس طرح ہوئی اور اس کا مختار کل کون ہے؟

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝ (الانعام ۹۸)

ترجمہ اور وہی تو ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا اور پھر (تمہارے لئے) ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی۔ سمجھنے والوں کے لئے ہم نے (اپنی) آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔

ایک وہ ہے جہاں تمہیں مستقل رہنا ہے اور ایک وہ جس میں تمہیں چند دن رہ کر اسے دوسرے کو سونپنا ہے۔ آپ نہیں سمجھے ہوں تو سعدی کا شعر سنئے:

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت
رفت و منزل بدیگرے پرداخت

ترجمہ اس دنیا میں جو بھی آیا اس نے اپنے لئے نئی عمارت تعمیر تو کر لی۔ لیکن ہوا یہ کہ اسے دوسروں کے سپرد کر کے خود اسے جانا ہی پڑا۔ گویا موت کے بعد جہاں رہنا ہے وہ دوامی منزل ہے۔

(اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں بڑی واضح طور پہ بیان کر دی ہیں)۔

وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع (الانعام ۱۶۶)

ترجمہ اور وہی تو ہی جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

اور ایسے طبقاتی جنگ میں مبتلا ہونے والے انسان یہ جان لے (اللہ تعالیٰ نے تم کو اس زمین پر اپنا نائب بنایا ہے اور ایک کو دوسرے سے بڑا رتبہ اس لئے دیا تاکہ ہم سب کو دیکھیں کون ہمارے دیے گئے اختیار کو ناجائز استعمال کرتا ہے اور کون جائز۔ اور بلاشبہ تیرا رب (اے رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جلد سزا دینے پہ قادر ہے۔ لیکن وہ بڑا ہی مغفرت کرنے والا اور مہربانی کرنے والا ہے)۔

ظاہری اور باطنی انعامات کا ماحصل اللہ جل شانہٗ کا انسان کو اپنا نیابت اعزاز اور اس میں فرق مراتب، چاہے آپ اقتصادی لحاظ سے سمجھ لیں، عقلی، فکری، علمی، غرض جو بھی فرق ہے، (لیکن یہ خیال رہے کہ ایک وہ فرق ہے جو اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات کی غرض یا آزمائش امتحان (جسے عربی میں ابتلا کہا جاتا ہے) کے لئے رکھا۔

جس کا ذکر فرما کر وجہ بیان کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ فرق مراتب انسان بحیثیت انسان نہیں بلکہ یہ فرقِ اعمال کے حوالے سے ہے۔ اگر انسان اللہ کے دیے ہوئے مقام اور مرتبہ اختیار اور قدرت کا عادلانہ استعمال کرتا ہے تو اللہ جل شانہٗ کی نظر میں وہ بلند تر ہے۔

یہ فرق یوں بھی نظام کائنات معاشرے اور تہذیب و تمدن کے پھلنے پھولنے کے لئے ضروری ہے۔

فرض کیجئے اگر سب کے سب ایک سی طاقت، اختیار، فراست، حکمت، غرض ہر لحاظ سے مساوات کے حامل ہوتے تو بتایئے زمین کی صفائی کرنے کے لئے کوئی جھاڑو ہاتھ میں لینا گوارا کرتا؟

یو۔ین۔ او (U N O) (اقوام متحدہ) میں جن طاقتوں کے پاس (Vito Power) ہے ان کا رویہ دیکھ لیجئے۔ یک اپنے صیہونی ساتھی کی حمایت میں تمام دنیا کے انسانوں کے مطالبے کی گردن ویٹو کی تلوار سے کاٹ دیتا ہے تو دوسری طاقت اپنے تشخص کی حد میں (Vito) کے اختیارات رکھنے والی طاقتوں کا باہمی قومی اور نسلی انا (Ego) آپس میں کس رویہ کا مظہر ہے۔ اس تجزیہ یا مشاہدہ کے آئینہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے قائم کردہ تفاوت کو دیکھیں تو اس کی مصلحت و حکمت صاف نظر آتی ہے۔ اس تفاوت میں عقلی، فکری اور عملی بہتری ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی عنایات، احسانات، ملکات، امکانات اور قدرت و ارادہ کا تعلق ہے، عقل و فکر کا واسطہ ہے، وہ سب انسانوں کو یکساں دیئے گئے ہیں۔ انسان اپنے اعمال سے جدوجہد سے بلند مقام خود حاصل کر سکتا ہے۔ اب اللہ جل شانہ اپنے تمام مذکورہ انعامات کی مختصر مگر جامع یاددہانیوں کے ساتھ اپنے ایک اور سب سے بڑے احسان کا ذکر یوں فرماتے ہیں

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍO (آل عمران: ۱۶۴)

ترجمہ: خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجے جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا) کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

(درحقیقت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں (مومنوں) پر احسان کیا، جب کہ ان میں ان ہی کی جنس میں سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان لوگوں کی اندرونی شخصیت "Internal Personality" کو مؤدب بناتے ہیں، خرابیوں سے پاک کرتے ہیں، اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں بتاتے ہیں اور بالیقین اس سے پہلے یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے)۔

اس خصوصی انعام و احسان کا تعلق اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے وابستہ کر کے ان میں نفسیاتی طور پہ احساسِ دینی کا تشخص پیدا کیا ہے مومن کا یہ یقین و ایمان ہونا چاہئے کہ ان کا معلم ان کا راہنما ان کو تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ان کی داخلی شخصیت کا بہترین مصلح بے مثال حکیم جو دنیا کے تمام ماہرینِ نفسیات سے بہتر ہے۔ اس خصوصی اعزاز کے انسان (مومن) کی معاشرت، تہذیب، عبادت، اخلاق، گفتگو، سیاست، غرض ہمہ پہلو دوسرے انسانوں کی قیادت اور تہذیب کے مقابلہ میں عمدہ ہے یا اس لئے کہ اس کی تربیت اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی درس گاہ میں ہوئی ہے۔

کچھ لوگ کہلاتے تو مسلمان ہیں لیکن اللہ کے اس احسان کو فراموش کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ہر مذہب یا راستہ صحیح ہے۔ انسان جس راہ پر بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ منزل کا تعین اور اس کی وضاحت شناخت پہلی شرط، پھر راہ کی سمت کا تعین، دونوں لازم و

ملزوم ہیں۔ مغرب کی طرف چلنے والا اگر سمجھے کہ وہ مشرق میں مطلوبہ منزل کو پہنچے گا تو ہرگز ناممکن ہو گا۔ انجام کار افسوس تو ہو سکتا ہے مگر مقصود نہیں مل سکتی۔ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راہنما کی حیثیت سے انتخاب اللہ تعالیٰ کا نسل انسانی پر اس بے مثال اور بے کراں عظیم سے عظیم تر احسان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا

وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ O(الانبیاء ۱۰۷)

ترجمہ اور (اے محمدؐ) ہم نے تم کو تمام جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

دین قیم کے ہادیٔ برحق کا یہ اعزاز بھی بلاثبوت نہیں اور اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انتخاب رسالت بھی اس امت پر سب سے اعلیٰ، ارفع اور مکمل انعام و احسان بھی بلا دلیل نہیں ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ پہلی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے آخری پیغمبر کو تم میں سے ہی منتخب کیا۔

(۲) ان کی زندگی کی صبح و شام، دن رات تمہارے سامنے ہے۔ ہر لمحہ تمہاری بھلائی اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو تمہارے سامنے تلاوت کرنے میں گذارتا ہے۔ تم ہو کیا؟ تمہاری اپنی پہچان کیا ہے؟ تم کس کی تخلیق ہو؟ تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ تمہارے خالق کی پہچان کیا ہے؟ تمہاری منزل کیا، راستہ کیا ہے؟ اس کی سمت یا رخ کیا ہے؟ یہ بہت ہی محبت اور پیار سے سمجھاتا ہے۔

(۳) تمہارے دل کو خیالات کو بیماریوں اور خرابیوں سے پاک کرتا ہے تاکہ تم کو ایسی بیماریاں جن سے تمہارے وقار انسانیت کی گردن کٹتی ہو بچنا سکھا دے۔

(۴) اللہ کے ارشادات اور اوامر و نواہی کی تعمیل کیسے کرنا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ (Demonstration) کرتا ہے تاکہ تمہارے لئے ویسا کرنا آسان ہو۔ سمجھ میں آ جائے۔

(۵) تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا ہے۔

گویا ایسے انعام و اکرام کا مجموعہ کہ اس کی مثال نہ اس سے پہلے کبھی تھی نہ ہی قیامت تک اس کی کوئی اور مثال انسان کے حوالے سے ہو سکتی ہے علیہ التحیہ والسلام۔ اسی انعام و اکرام نے انسان کو اپنی صلاحیتوں، ہمتوں، ارادوں کو تسخیر کائنات کا علم عطا فرمایا۔ غرض اس عظیم تر احسان کے دلائل بیان کرنے کے لئے زندگی درکار ہے ایک نہیں بلکہ قیامت تک جتنی بھی ممکن ہو سکیں۔ پھر بھی اس انعام کی تفصیل ادھوری رہنے کا یقین ہے۔

انسان کو اپنے مقام بلند سے آگاہ کرنے والا احسان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی وہ سراپا رحمت ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ علیہ التحیہ والسلام نے ہی تو بتایا کہ اس عظیم کائنات کی وسعتوں میں چھوٹے سے وجود معزز انسان تو اس پوری کائنات کا ایک جز "Part" ہونے کے باوجود اس کل کی تسخیر اور تصرف پہ قادر ہے۔ اس نے ہی انسان کو حقیقی علم سے نوازتے ہوئے گرے ہوئے انسان کو اٹھایا اور اٹھنا سکھایا اور فرمایا دیکھو، یہ نباتات، جمادات، شجر، ثمر، پھول کلیاں، سب تیرے لئے ہیں۔ دیکھ یہ شہد تمام پھلوں کا رس چوس کر اسے کئی رنگوں میں منتقل کرنے کی خدمت ایک مکھی کو سونپی گئی، جس میں شفا ہے، رحمت ہے، برکت ہے۔ جانوروں اور پرندوں کا گوشت تمہاری جسمانی اور ذہنی توانائی کے لئے، پروٹین، نشاستہ اور روغنیات جیسی نعمتیں تمہارے لئے۔۔۔ یہاں تک

کہ بظاہر تضاد یا جسے تو دیکھ کر اس کو اپنے لئے نقصان دہ سمجھے حقیقت میں وہ بھی تمہارے لئے مفید۔۔۔

مثلاً اس صدی کا ایک واقعہ ہے۔ ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا کے کھیتوں کی باڑ کے لئے بوئی گئی۔ وہ بہت تیزی سے ملک میں پھیلی اور اتنی پھیل گئی کہ شہروں اور دیہاتوں میں گھس گئی۔ کھیتوں کو ویران کر دیا، زراعت کو ناممکن بنا دیا۔ روکنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ناگ پھنی آسٹریلیا پر ظالم فوج کی طرح مسلط ہو گئی۔ بالآخر ماہرین حشرات الارض کو ایک ایسے کیڑے کی دریافت حاصل ہو گئی جس کی خوراک ہی ناگ پھنی تھی۔ چنانچہ اس کیڑے کو لا کر چھوڑا گیا تو اس سے نجات حاصل کی گئی۔۔۔ گویا قدرت کے نظام میں ضبط و توازن (Checks and Balances) بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ جہاں شدید گرم موسم ہوتے ہیں وہاں ایسے عام پھل پیدا کر دیے گئے جس کے استعمال سے انسان گرمی کے مضر اثرات سے بچ جائے۔ جس ملک میں سردی زیادہ ہو وہاں بھی ایسی غذائیں اور پھل پیدا کر دیئے جن کا استعمال سردی کے اثرات سے محفوظ رہنے میں مدد دے۔ مصر کے دریائے نیل کا ایک حصہ ایسا ہے جس کے کنارے ایک خاص قسم کی جونک (Leech) بکثرت پائی جاتی ہے۔ راستہ چلتے آدمی کے ٹخنوں سے چپک کر عرق النسا رگ (Vein) سے خون چوستی ہے۔ یہ رگ پورے جسم کی رگوں سے خصوصاً دل کی رگوں سے تعلق ہونے کی وجہ سے زندگی کا اہم جز ہے۔ اگر جونک زیادہ دیر چپکی رہے تو جلد ہی بے ہوش ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا توڑ وہاں ہی ایک ایسی جڑی بوٹی (Herb) پیدا کر دی ہے کہ اس کا پتہ توڑ کر اس پہ نچوڑتے ہی جونک (Leech) نیم مردہ ہو کر الگ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا شمار تو ناممکن ہے۔ بات تو اقرار کی ہے۔ سچائی کے اعتراف کی ہے۔ لوہا، تانبا، یورینیم، سونا، چاندی، ربڑ اور تمام معدنیں فائدوں کی زبان میں انسان سے یہ تقاضا کرتی ہیں کہ اس کے انعام کی تصدیق کرو۔ اجناس سے غذا حاصل کرتے ہو۔ کپاس سے لباس حاصل کرتے ہو۔ مناظر کے جمال سے لطف اندوز ہوتے ہو۔ غرض کوئی بھی تمہارے استعمال اور نگاہ میں آنے والی شے ایسی نہیں جس سے یہ ثابت نہ ہو کہ یہ اللہ کی نعمت نہیں ہے۔ انسان کو ایجادات کی عقل و فراست اللہ کا انعام۔۔۔ ساری زمین پہ بکھرے ہوئے سامان عیش، اس کے رہنے اور قرار کی جگہیں۔ آسمان کی طرف نظر اٹھے تو چاند کی چاندنی، جذبوں اور مسرتوں کو وفور بخشے، سورج کو دیکھو تو حرارت، روشنی اور زندگی بخشے! ستاروں پہ نگاہ ڈالو تو اندھیروں میں راہ دکھائیں۔ سمندروں کا مدوجزر، ہواؤں کا مختلف اوقات میں مسرتوں کو پھیلانے کی خدمت، انسان نے اپنے علم اور حکمت سے جو بھی کام لینا چاہا، اس کی فرماں برداری کے لئے ہمہ وقت تیار۔۔۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کا اعلان برحق ہے۔ اس نے انسان کو افضل بنایا، اشرف المخلوق بنایا ہے۔

کائنات کو اس کا مسخر بنایا ہے۔ اس اعلان کی تصدیق مشاہدہ اور تجربہ کر رہا ہے۔ ثابت ہوا کہ اللہ جل شانہٗ ہے۔ ان تمام انعام و اکرام کے ہجوم میں ہر جگہ نگاہ حق بین سے دیکھو گے تو اسی کی کارفرمائی کے جلوے پاؤ گے۔ اب اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِيْدٌ ○ وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِيْدٌ ○ (ابراہیم: ۷۔۸)

ترجمہ: اور جب تمہارے پروردگار نے (تم کو) آگاہ کیا کہ اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب (بھی) سخت ہے۔ اور موسیٰ نے (صاف صاف) کہہ دیا کہ اگر تم اور جتنے اور لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ناشکری کرو تو خدا بھی بے نیاز (اور) قابل تعریف ہے۔

وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُO (سبا، ۱۳)

ترجمہ: اور میرے بندے شکر گزار تھوڑے ہیں۔

احسان فراموش خود اپنی نظروں سے آپ گر جاتا ہے۔ لیکن احسان کرنے والے کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی۔

آفاقی وحدت میں ٹھوس ثبوت

پوری کائنات کا مطالعہ کر لو ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ شاہد ہے کہ اس میں مکمل وحدت (Unity) ہے۔ اسکے علم میں وحدت ہے ایجادات میں وحدت، ظاہر اور باطن میں وحدت ہے۔ اس کا خالق واحد (Alone) ہے۔ ارادہ واحد، قدرت واحد، مظاہر اور باطن میں ہم آہنگی، نظم و ضبط میں مربوط و مضبوط تسلسل؛ جس کی دلیلیں بے انتہا مگر سمندر سے ایک قطرے کے ارب ہا حصہ سے بھی کم!

ملاحظہ فرمایئے۔ دنیا کے ہر خطہ میں کسی "موجود" کا تجزیہ کیجئے، اجزائے ترکیب میں وحدت ملے گی۔ رنگت میں صورت میں تناسب میں وحدت پائیں گے۔ ہوا پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہو۔ زمین کی پستیوں میں دریاؤں میں ہو چٹیل میدانوں صحراؤں میں مشرق و مغرب یا جنوب و شمال کی پستیوں میں ہو۔ اپنے مزاج اور اجزائے ترکیبی میں ایک ہی اثر ایک ہی چلن، آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی اوکسائیڈ اور مختلف گیسوں کا عمل دخل ایک ہی سا۔۔۔ مکمل ہم آہنگی۔ اگر کسی کو اس کے خلاف علم ہو تو اس علم کو ثبوت کے ساتھ پیش کرے جو کوئی نہیں کر سکتا۔ اب غذا کو لے لیجئے۔ آپ جہاں کہیں کے بھی ہیں، کسی رنگت کے مالک ہیں، کسی زبان یا کسی ملک کے باشندے ہیں، غذا کھانے، اس کے حلق سے اترنے اور معدے (Stomach) میں داخل ہونے کے بعد تک سارے عوامل میں ایک ہی نظم و ضبط۔۔۔ معدہ غذا سے پروٹین، نشاستہ، لحمیات، خون، سودا، صفرا اور خون بنا کر جسم کے جس جس حصہ میں جو کچھ بھی منتقل کرتا ہے، اس کی ترکیب و ترتیب میں وحدت! دل، پھیپھڑے، جگر اور دوسرے اعضاء کے طریق کار میں، وضع میں، رنگت میں وحدت، گوشت پوست اور ہڈیوں کی ساخت میں وحدت! یہی نہیں، کلیوں، کونپلوں کو دیکھئے۔ نباتات کے نشوونما کے نظام کو دیکھیے، کلیوں میں، بیجوں کا سلسلہ، کلیوں کے پتوں کی ساخت، ان سب میں یگانگت۔۔۔ ایک ہی خاندان کے جس ملک کے خطہ میں ہوں گے وہ ملک الگ ہو سکتا ہے لیکن ان کی جو ہم آہنگی ہے اس میں فرق نہیں آئے گا۔

اب گلاب کے پھول ہی کو لیجئے۔ اس کے کئی خاندان ہیں، سفید، سرخ، سیاہ، گلابی، سب کی خوشبو اور جاذب نظر ہونے میں عالمی وحدت۔۔۔ تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہے اور یہی ثبوت اس کو وحدت بخشنے والی ذات برتر کا ثبوت ہے۔ دن اور رات کے عمل میں وحدت۔۔۔ آسمان اور زمین کی صورت میں وحدت، سیرت میں وحدت، سورج کی شعاعوں، چاند کی کرنوں میں وحدت، حرارت اور برودت میں وحدت۔۔۔ مونث اور مذکر کے

افزائش نسل کے طریق کار میں اکائی، ہم آہنگی حیران کن وحدت اعضا کے استعمال میں وحدت ۔۔۔ آنکھ کے عمل میں وحدت، کانوں کی شنوائی میں وحدت، غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ مشرق کے انسان کی آنکھ دیکھنے کے بجائے سننے کا کام دے رہی ہو۔ کان سننے کی جگہ دیکھنے کا کام دے رہے ہوں۔ غرض جو کچھ بھی ہماری معلومات میں آج تک آیا، جتنے انکشافات ہوئے، جتنی دریافتیں انسان کے حصہ میں اب تک آئیں، ان کا اجتماعی تاثر ایک اور وہ یہ کہ یہ تمام عالم، تمام کائنات ارضی اور سماوی، خلا اور اس میں موجود جتنے بھی خاندان ہیں ان میں وحدت، ہم آہنگی، ربط و تعلق ناقابل فہم و ادراک انتہائی حیران کن ہے اور انسان بے ساختہ کہنے پہ مجبور۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان وہم

(اے ذات برحق تو ہمارے خیالوں سے بلند، ہمارے قیاس و گمان سے بلندتر، ہمارے وہم سے بھی بہت دور!)

مشاہدے اور تجربے میں یہ دعویٰ غلط ہے تو ثابت کرو اور کوئی بھی اسے ثابت نہیں کر سکتا۔ ثابت ہوا اللہ کی ذات ہے، انکار کرنے والو! اللہ جل شانہٗ ہے ۔۔۔ اس کی عظمتوں سے آنکھ بند کر کے گزرنے والو۔ وہ اپنی تمام عظمتوں اور کمالات کے ساتھ موجود۔ تم مر جاؤ گے۔ تمہارا اس کا آمنا سامنا ہو گا ۔۔۔ یقیناً ہو گا، پھر کیا کرو گے؟

اس کائنات کے ہر متحرک، غیر متحرک وجود میں نظم و نسق، عمل اور رد عمل، ترتیب و ترکیب، مضر اور غیر مضر اثرات کی ہم آہنگی اور ربط کو اپنے تخلیقی کمال و جلال اور اختیار و اقتدار کے ثبوت ہونے کا اعلان اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کی بہت سی آیات میں یوں فرماتے ہیں:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ؕ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (النمل:۵۹۔۶۴)

ترجمہ۔ کہہ دو کہ سب تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے اور اس کے بندوں پر سلام ہے جن کو اس نے منتخب فرمایا۔ بھلا خدا بہتر ہے یا وہ جن کو یہ (اس کا) شریک بناتے ہیں۔ بھلا کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور (کس نے) تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا۔ (ہم نے) پھر ہم نے اس سے سرسبز باغ اگائے تمہارا کام تو نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگاتے تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔ بھلا کس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے بیچ نہریں بنائیں اور اس کے لئے پہاڑ بنائے اور (کس نے) دو دریاؤں کے بیچ اوٹ بنائی (یہ سب کچھ خدا نے بنایا) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟

(ہرگز نہیں) بلکہ ان میں اکثر دانش نہیں رکھتے۔ بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے۔ جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے۔ اور (کون) تم کو زمین میں (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے۔ (یہ سب کچھ خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ہرگز نہیں مگر) تم بہت کم غور کرتے ہو۔ بھلا کون تم کو جنگل اور دریا کے اندھیروں میں رستہ بتاتا اور (کون) ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے۔ (یہ سب کچھ خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ہرگز نہیں) یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خدا (کی شان) اس سے بلند ہے۔ بھلا کون خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا۔ پھر اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے اور (کون) تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ (یہ سب کچھ خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ہرگز نہیں) کہہ دو کہ (مشرکو) اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔

اللہ جل شانہٗ کی صداقت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ تمام سوالات تمام دنیا کے انسانوں سے کئے جا رہے ہیں اور تقریباً چودہ سو سال پہلے کئے جا رہے ہیں۔ مخاطب تمام دنیا کے انسان ہیں جو اللہ کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے یقین و ایمان کو توانائی ملتی ہے اور جن کو شبہ ہے شک ہے۔ دوسروں کی عقل و ہوش کو غور و تدبر کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں صداقت کی قوت موجود ہے۔

آج تک کوئی بھی ان سوالات کا جواب نہ دے سکا۔۔۔ خطاب کرنے والی ہستی کی نگاہ میں پوری کائنات ایک نقطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ہی بستی ہے اور اس بستی کے رہنے والے ایمان و کفر میں بٹے ہوئے دو ہی گروہ ہیں۔ کائنات پر اپنی واحد حکمرانی اور ملکیت کل میں وحدت و ہم آہنگی کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔

أَمِ اتَّخَذُوٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَOلَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَOلَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَOاَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَOوَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِO(الانبیاء ۲۱۔۲۵)

ترجمہ۔ رات دن (اس کی) تسبیح کرتے رہتے ہیں (نہ تھکتے ہیں) نہ تھمتے ہیں۔ بھلا لوگوں نے جو زمین کی چیزوں سے (بعض کو) معبود بنا لیا ہے (تو کیا) وہ ان کو (مرنے کے بعد) اٹھا کھڑا کریں گے؟ اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں خدائے مالک عرش ان سے پاک ہے۔ وہ جو کام کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہو گی اور (جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی) ان سے پرسش ہو گی۔ کیا لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود بنا لئے ہیں کہہ دو کہ (اس بات پر) اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ (میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے اور جو مجھ سے پہلے (پیغمبر) ہوئے ہیں۔ ان کی کتابیں بھی ہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان میں اکثر حق بات کو نہیں جانتے اور اس لئے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔

ثابت ہوا کہ معبودیت "Object of Worship" کے حوالے سے بھی وحدتِ حکم موجود ہے جو ہر

زمانے، ہر وقت اور ہر لمحہ میں ایک ہی حکم کا حامل ہے۔ حکم وحدہٗ لاشریک ـــــ اور فرمایا:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ○قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ○سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ○قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ○بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ○مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ○ۧ(المومنون ۸۴۔۹۲)

ترجمہ: کہو اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ کہ) زمین اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) کس کا مال ہے۔ جھٹ بول اٹھیں گے کہ خدا کا۔ کہو کہ پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟ (ان سے) پوچھو کہ سات آسمانوں کا کون مالک ہے اور عرش عظیم کا (کون) مالک (ہے)؟ بے ساختہ کہہ دیں گے کہ (یہ چیزیں) خدا ہی کی ہیں۔ کہو کہ پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟ کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ کہ) وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے؟ اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ فوراً کہہ دیں گے کہ (ایسی بادشاہی تو) خدا ہی کی ہے۔ کہو پھر تم پر جادو کہاں سے پڑ جاتا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہم نے ان کے پاس حق پہنچا دیا ہے۔ اور یہ (جو بت پرستی کئے جاتے ہیں) بے شک جھوٹے ہیں۔ خدا نے نہ تو کسی کو (اپنا) بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر غالب آ جاتا۔ یہ لوگ جو کچھ (خدا کے بارے میں) بیان کرتے ہیں خدا اس سے پاک ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے اور (مشرک) جو اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں (اس کی شان) اس سے بلند ہے۔

وہ اللہ حاضر و غائب سے آگاہ، اس کا علم سب پر محیط ہے۔ (انسان اس کی حاکیت یا الوہیت میں شرکت موہوم تصورات کی شمولیت تو ایک طرف) اس کی ذات برتر کے تصور اور ادراک کی رسائی سے بھی بہت بلند ہے۔

اللہ جل شانہٗ ایسے انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا○سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا○(الاسراء ۴۲۔۴۳)

ترجمہ: کہہ دو کہ اگر خدا کے ساتھ اور معبود ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ ضرور (خدائے) مالک عرش کی طرف (لڑنے بھڑنے کے لئے) رستہ نکالتے۔ وہ پاک ہے اور جو کچھ یہ بکواس کرتے ہیں اس سے (اس کا رتبہ) بہت عالی ہے۔

اس کامل دلیل کے بعد، اللہ جل شانہٗ اپنی تخلیق اور صناعی کے کمال کو تنقیدی مشاہدے کی روشنی میں غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے ہیں:

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ○ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ

كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌO(الملک ۳۔ ۴)

ترجمہ: (اے دیکھنے والے) کیا تو (خدائے) رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

اب آیئے اس دور میں جسے سائنس دان "Logical Positivism" یعنی منطقی ثبوتیت کا دور کہتے ہیں۔ اس کی اساس مشاہدے اور تجربے پر قائم ہے۔ اس مشاہدے اور تجربوں سے حاصل شدہ علوم اللہ تعالیٰ کے خالق کائنات ہونے کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ کائنات ایک "Force" کی مکمل وحدت ہے۔ دوسرا کہتا ہے: "Energy" کا منظم کارخانہ ہے۔ تیسرا کہتا ہے قانون فطرت کا بے نقص نظام ہے۔ چوتھا کہتا ہے کائنات ریاضیاتی قطعیت کا نام ہے۔ غرض کائنات کے خالق کا یہ دعویٰ کہ اس پر غور تو کرو، اس میں تمہیں ہمارے حسن کار، حسن تخلیق، حسن فن، حسن تدبیر و تقدیر، سبھی بے نقص ملے گا۔

چنانچہ انسان نے دیکھا الیکٹران ایک مقررہ قانون کے تحت گردش میں ہیں۔ زمین، سورج، کواکب، سیارے سب کے سب ضابطے کے تحت چکر لگا رہے ہیں۔ اور پھر دیکھا کہ آج تک ایک چاند آنکھوں نے دیکھا تھا مگر اس چاند کے علاوہ چاند بھی مقررہ سمت میں مسلسل رواں دواں ہیں۔ کتنا مکمل اور کتنا حیرت ناک بے نقص نظام کیسی ترتیب، کیسی تدبیر، ستاروں کا جھرمٹ، اپنی جگہ سورج اپنے مدار پر الیکٹران اپنے مدار پر، زہرہ، مشتری، عطارد، زحل سب کے سب اپنے اپنے مقام اور مدار، فاصلے کے پابند مسلسل گردش میں ہیں۔ ان میں نہ رفتار میں کمی آتی ہے، نہ کوئی اپنے مدار سے فرار کرتا ہے، نہ اپنے مقررہ فاصلوں کی حدوں سے! یہ مشاہدہ کہہ رہا ہے، ایک کا نہیں بہت سارے سائنس دانوں کا، جن میں روسی بھی ہیں، امریکن بھی، جرمن بھی، فرانسیسی بھی، سب کے سب اللہ جل شانہٗ کی اس صداقت کی شہادت دے رہے ہیں۔ اے خالق کائنات تیرا نظام تیری تخلیق میں کوئی بھول چوک نہیں ہے۔

تجربے اور مشاہدے کی زبان اللہ جل شانہٗ کے واحد مدبرالامور ہونے کے یقین کو توانائی ملی اور مادہ پرست نے اسے اتفاقی چکر کا نام دے دیا۔ مربوط نظام اور وحدت مقصد و امر کو ایک پہلو سے دیکھیں تو ہر وجود کا قیام اپنے جوڑے مذکر اور مؤنث سے ہے۔ برق پاروں کو دیکھا تو اس میں بھی مثبت اور منفی کا جوڑا نظر آیا۔ ہم نے زمین سے اگنے والی جڑی بوٹیوں کا مشاہدہ کیا تو اس میں بھی مذکر اور مونث موجود، حیوانوں اور انسانوں میں زوج، جوڑے کا نظام اللہ جل شانہٗ کے اس اعلان کی صداقت کرتا نظر آیا۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَO(یٰس:۳۶)

ترجمہ: وہ خدا پاک ہے جس نے زمین کی نباتات کے اور خود ان کے اور جن چیزوں کی ان کو خبر نہیں سب کے جوڑے بنائے۔

اور اسی حقیقت کے حوالے سے زمین کے بہت سے عناصر کی حیات سورج کی حرارت اور بعض عناصر

کی زندگی ستاروں کی تاثیر، کائنات میں پھیلے ہوئے بہت سے عناصر کی زندگی کا انحصار پروٹین اور الیکٹرانوں (برق پاروں) پہ ہے۔ نیوٹرن کے مرکزی مدار کے سہارے بہت سے عناصر کا امکان۔ ساری کائنات میں جہاں بھی ان کا وجود ہے سب ایک ہی اصول کے پابند ہیں۔ اس مشاہدے سے مومن کے ایمان میں پختگی اور مادہ پرست اسے اتفاق کہہ سکتا ہے۔

مشاہدے اور تجربے کے علم نے کائنات میں ایک اور زاویہ سے وحدت کا نظام دیکھا اور وہ ہے قوت اور قدرت کے ان ابلتے ہوئے چشموں کا مطالعہ جو تمام کائنات میں ایک ہی قانون کی گرفت میں ہیں۔

قدرت اور قوت ان چشموں کا نام ہے۔ جیسے روشنی (Light) حرارت (Heat) بنفشی شعاعیں (Altraviolet Rays) سرخ شعاعیں (Infrared Rays) ، سفید شعاعیں، زیادہ تعدادی شعاعیں (X-Rays) غیر مرئی شعاعیں، لیکن ان سب کا اصل منبع و مرکز برقی قوت حرارت یا شمسی توانائی ہے۔ اس توانائی کی ہلکی سے ہلکی بر بھی ساری کائنات میں اپنی صفت کے اعتبار سے اور خود کے طریق کار کے اعتبار سے ایک ہی قانون کے تحت کاربند ہے۔

اور ملاحظہ فرمائیے ایک قانون جاذبیت "Law of Gravitation" جس کی پکڑ میں چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑا (مادی) جسم پایا جاتا ہے۔ صرف ایک ہی جگہ نہیں بلکہ کائنات میں جس وجود پر اس قانون کا اطلاق ہو گا اس کا عمل بھی ایک ہی ہو گا۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو ٹھوس ہو اور وہ ضخامت میں بڑی ہو وہ اس قبیل کے دوسرے ٹھوس مادہ کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔ اور دو اجسام کے درمیان ایک ایسی قوت کشش موجود ہوتی ہے جو ان جسموں کی کمیتوں کے حاصل ضرب کے متناسب ہوتی ہے اور ان کے مرکزوں کے درمیانی فاصلے کے مربع کے بالعکس ہوتی ہے۔

غور و فکر سے ہمیں اس بات کا بھی علم ہوا کہ قوتیں "Forces" دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک کا تعلق "Gravitation" سے ہے اور دوسری کا تعلق برقی قوت کشش سے۔۔۔ جن کے بارے میں "آئن سٹائن" کا کہنا ہے کہ علم نظری سے ان حقیقتوں کا تعلق ہے جو محسوس شکل میں نظر نہیں آ سکتیں۔ گویا وہ غیر مرئی ہوتی ہیں، مثلاً برق کی کشش نظر نہیں آتی۔ صرف کوئی چیز اس طرف کھنچ کر جا رہی ہے وہ نظر آتی ہے۔ مقناطیس اور لوہے کو تناسب کے ساتھ دور دور رکھیں، لوہا اور مقناطیس جب ایک دوسرے سے گلے ملیں گے تو درمیان میں کشش کی قوت نظر نہیں آئے گی، صرف کشش کا عمل دیکھا جا سکے گا۔

اس قانون کو آپ خلا میں جانچیں۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، صحراؤں، دریا، زمین کے لاکھوں میل نیچے یا اوپر پرکھیں، ایک ہی قانون پائیں گے۔ گویا یہ دونوں قوانین بھی وحدہ لاشریک کے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہم تنہا، اکیلے بغیر کسی شرکت کے اس کائنات کے تمام نظام اور قوانین کے ناظم اور مقنن ہیں۔

مومن کے لئے یہ قطعی دلیل ایمان کی قوت اور مادہ پرست اسے قانون فطرت "Law of Nature" کہتا ہے۔

ہاں عناصر کی حقیقت میں اختلاف ضرور ہے۔ کیمیا کے میدان میں سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (Mendeleev) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا جس کو دوری نقشہ

(Pfriodic Chart) کہا جاتا ہے۔ اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے جو عین اندازے کے مطابق بعد میں پر کر دئے گئے۔ ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے مخصوص گروپوں میں درج کئے جاتے ہیں۔ جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں (Protons) کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے۔ یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے۔ اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے۔ ہیلیم میں دو اور لیتھیم میں تین۔ یہی اصول مختلف عناصر کی جدول تیار کرنے میں مدد دے سکا کیوں کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے۔ چنانچہ مندلیف کے قانون کی روشنی میں نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے کہ عنصر نمبر ۱۰۱ کی شناخت محض اس کے ۱۷ پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی۔ قدرت کی اس حیرت ناک تنظیم کو ہم دوری اتفاق (Penodic Chance) نہیں کہتے بلکہ اسے "Periodic Law" کہتے ہیں۔ مگر یہ ضابطہ اور نقشہ منصوبہ ساز کے بھول چوک سے بغیر تکمیل کا مواد ہے۔۔۔ غور فرمائیے، قانون تجاذب کے تحت دو جسموں کی کمیتوں اور ان کے درمیانی فاصلہ پر تجاذب کا انحصار ہوتا ہے۔ یعنی اگر فاصلہ کم ہو تو کشش کی قوت زیادہ ہو گی، اور فاصلہ زیادہ ہو تو قوت کشش کم ہو گی۔

مندلیف نے اسی اصول کے تحت جدول تیار کی۔ مریخ اور مشتری کے درمیانی فاصلے (یا دوری) کا تعین کیا اور اسی کا تتبع بعد میں ہوا۔ مثلاً سورج کے قریب ترین سیارہ عطارد ہے جس کی دوری ۳۶ ملین میل ہے۔ زہرہ کا متوسط فاصلہ ہے۔ ۶۷ ملین اور زمین ۹۳ ملین، مریخ ۱۴۲ ملین، مشتری ۴۸۳ ملین، زحل ۸۸۷ ملین، فلورانوس ۱۷۸۲ ملین، نیپچون ۲۷۹۳ ملین اور اب ہم اس نسبت سے دوری کیسے دریافت کریں گے۔ تو جناب اصول یہ ہے کہ سورج سے آغاز صفر اور اس کے بعد اسے ۹ منازل کا تعین دیا گیا۔ ۹ کو تین پر تقسیم کریں تو ۳، حاصل تقسیم کو ۹ بار اس طرح لکھیں کے کہ ہر بار اس کو ڈبل کریں مثلاً ۳ کا ڈبل ۶ اور ۶ کا ڈبل ۱۲۔۔۔ اس اصول کے ماتحت اب دیکھئے

۳۔ ۶۔ ۱۲۔ ۲۴۔ ۴۸۔ ۹۶۔ ۱۹۲۔ ۳۸۴۔۔۔ اب اگر ان سب ۹ حصوں میں ۴ کو جمع کریں، مثلاً ۳ میں ۴ ملایا ۷ ، اب سابقہ ۶ میں ۴ ملایا تو ۱۰۔۔۔ اسی طرح اب ترتیب دیکھئے ۳۔ ۷۔ ۱۰۔ ۱۶۔ ۲۸۔ ۵۲۔ ۱۰۰۔ ۱۹۶۔ ۳۸۸۔۔۔ اب ہم نے ہر ایک منزل کے اعداد کو ۹ ملین سے ضرب دیا تو جو حاصل ضرب ہو گا وہی سورج اور اس سیارے کے درمیان دوری کہلائے گی۔ فرض کیجئے ہم پہلی منزل کو ۴ ملین دوری فرض کر لیتے ہیں تو اسے ۹ سے ضرب دیں گے ۴×۹ = ۳۶ ملین جواب دوری کی نسبت سمجھا جائے گا۔ بالکل اسی طرح باقی سیاروں کے درمیان دوری کا فرق معلوم کیا جاتا ہے لیکن جب ہم ۲۸ کے زاویہ پہ منزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہاں ہمیں کوئی سیارہ نظر نہیں آتا بلکہ ہمیں ۲۶ ملین میل پر مریخ اور ۵۲ ملین میل پر مشتری ملتا ہے۔ آخر اس دوری میں یا خلا میں کیا راز ہے۔ معلوم ہوا یہ سیارے اگر سورج کی ۲۵۲ ڈگری کے زد میں آتے تو ان کا وجود ہی نہیں رہ سکتا تھا اس لئے وہاں ہم بڑے وجود کے سیاروں کی جگہ چھوٹے چھوٹے سیارچے ٹمٹماتے ہوئے پاتے ہیں اور وہ مشتری اور مریخ کی آڑ میں گھومتے رہتے ہیں اور یہ وہی سیارچے ہیں جو مسلسل ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔

مشاہدہ نے ثابت کیا کہ قوانین میں وحدت کی حکمرانی وجود ہو عنصر جز ہو یا کل سب پر ہے اور یہ حکمرانی اللہ جل شانہٗ کی حکمرانی ہے۔۔۔ انسان نے ستاروں کے مقامات کو پہچانا، ان کی چمک سے ان کی راہوں کو پہچانا، ان کی قربتوں سے، ان کی تعداد کو پہچانا۔۔۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ماضی میں چھ ستاروں (ثریا) کی تعداد دریافت کی ہو اور اس جدید ترقی یافتہ کہلانے والے زمانے میں ۲۰ کی تعداد کا انکشاف ہوا ہو۔ پھر ۲۱ کی تعداد اور ہو سکتا ہے جوں جوں زیادہ طاقت کی دوربین یا دوسرے آلات ایجاد ہوتے جائیں تو اور بھی بہت سے انکشافات ہوتے جائیں۔ لیکن ان کی اصلیت نور، روشنی کبھی نہیں بدلے گی اور ان کی چمک اور حقیقت وجود میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

زمین کے کسی کونے میں، بلندی ہو یا پستی، جہاں سے بھی نگاہ اٹھائیں گے ستاروں میں وحدت، ان کی چمک میں وحدت، ان کی رفتار میں وحدت اس وحدت [illegible] واحد و تنہا حکمران و خالق ہونے کا ثبوت مومن کے لئے ایمان کو تابانی دے اور [illegible] یہ اتفاق ہے۔۔۔ کائنات کے مشاہد و مظاہر میں حیوانات کا افق ایک، نباتات کا افق ایک، انسان کا افق ایک، نزدیکی اور دوری ایک، ذرے اور بڑے اجسام کا افق ایک۔۔۔ پرندوں کا افق ایک، انسان کی دریافتوں میں ردوبدل ہوتے رہے۔ فیصلوں میں اختلاف ہوتے رہے ہوتے رہیں گے مگر اللہ کا جلال ایک، اللہ کا نور ایک، اللہ کا حکم ایک۔ ارشاد ہے

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ط (الانعام ۳۸)

ترجمہ۔ اور زمین میں جو چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں۔

اور۔۔۔ کائنات کے مظاہر میں ایک وحدت کی مثال یہ مادہ ہے۔مادہ کے عناصر ذرات اور برق بدلتے ہیں اور پھر ان کے انشقاق سے شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ ان شعاعوں کی رنگت میں وحدت۔۔۔ اسی کائنات میں آئین کی وحدت ایک اور ثبوت۔۔۔ جنوں، انسانوں اور حیوانوں میں حمل، اور تولید، ہر زمانے میں وحدت عمل کا پابند۔۔۔ قوانین و ضوابط کی یہ آفاقی ناقابل تردید وحدت اس بات کا ثبوت کہ اس کا مقنن ایک، اس کا ناظم ایک، اس کا خالق ایک، اس کا حاکم ایک، اس میں ایک ہی علم، ایک ہی ارادہ، ایک ہی قدرت، ایک صناع کارفرما ہے۔ اب اس حقیقت کو ہم تین حصوں میں منقسم کر کے (۱) ہیئت، (۲) طبیعت، (۳) توحید، ان تینوں کے آئینہ میں ڈاکٹر حسن ہویدی کی کتاب (وجود الحق) سے ماخوذ (واجب الوجود) اللہ جل شانہٗ کے جلال و جمال کو ثابت کریں گے۔

میری ابتدا کیا؟ انتہا کیا؟

انسان کا ادراک اور عقل اکثر یہ سوال کرتی ہے کہ میری ابتدا کیا ہے؟ میری انتہا کیا ہے؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ اور کہاں جانا ہے؟ اس کا جواب اسے یہ دیا جائے کہ تمہارا آغاز پانی کا قطرہ (نطفہ) اور ماں کا رحم ہے اور پھر موت! تو یہ سطحی جواب اسے کبھی مکمل تسلی نہیں دیتا، تشنگی عمر کے ساتھ بڑھتی ہے اور پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ اس اسباب سے بھری دنیا میں مجھے منتقل کرنے والا کون؟ کیوں؟ اور پھر اس کا انجام کیا؟

اصل میں یہ پیاس بشری تقاضوں کے تحت انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے لیکن ہر شخص یہ سوال تو

کر سکتا ہے جواب اس کا مخصوص لوگ ہی دے سکتے ہیں۔ اور اب تک جتنے جواب دیے گئے ان میں اختلاف ہے، مبہم نظریات ہیں۔ اس میں بعض جواب تو واضح طور پہ فکری مغالطوں کا شکار نظر آتے ہیں اور بعض ادھورے —— جیسے اندھیرے میں تیروں کی بارش!

ایک جماعت نے اس سوال پہ غور کیا تو کائنات میں رونما ہونے والے واقعات اور حالات کے حقائق کی جھلکیاں ایک ایک کر کے ان کے تصورات میں ابھرنا شروع ہوتے ہیں۔ انہیں نظر آتا ہے کہ بادل بارش کا سبب ہیں۔ پھل درختوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ درخت پانی اور مٹی میں نشوونما پاتے ہیں اور پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مجموعہ ہے۔ غرض یہ کہ انسان نے آج تک کسی وجود کے ظہور کو سبب کے بغیر نہیں دیکھا۔ کوئی چیز اسے ایسی نظر نہیں آتی جس کی تخلیق یا ایجاد میں کسی خالق یا موجد کا ہاتھ نہ ہو۔ لہٰذا عقل کا اس کے خلاف کوئی تصور ہی ناممکن ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم اس بچے کی طرح جو کمسنی کم عقلی میں کسی برتن کو توڑنے کے بعد، برتن کیوں توڑا؟ کا جواب یہ دیتا ہے میں نے نہیں توڑا خود ہی ٹوٹ گیا ہے۔ تو ایسا جواب مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہر واقعہ کا "سبب" کیا ہے۔ اس کا تجسس انسان کا فطری عمل ہے۔ اس نتیجے پہ سوچتے ہی عربی کا ایک محاورہ کانوں میں گونجتا ہے۔ اونٹ کا بچہ مکمل اونٹ کی دلیل ہے! وقت کے سفر کی دلیل رات کا اندھیرا، دن کا اجالا اور آسمان پہ بروج کی گردش۔ لیکن بظاہر اس کا وجود نظر نہیں آتا۔ کیا یہ اس کائنات کے صناع کے کمالِ فن کی دلیل نہیں؟

روشنی کا اصول، انعکاس، انعطاف اور آواز کا لہروں میں ارتعاش، ابر کا برسنا، برق کا کڑکنا، ان کے اسباب کا "آج کا؟ ہر انکشاف، تری سچائی کا ٹھوس اور واضح نشان ہے —— سبب کے حوالے سے کیا ہوا یہ سوال، سبب کے اس آخری نقطہ پہ پہنچتا ہے کہ سبب کی ابتدا کیا ہے؟ جسے فلسفہ کی کتابوں میں "مبدءِ سبب" کا نام دیا گیا ہے۔ اس تلاش میں سب سے پہلے عقل ہی اسباب فہمی کے لئے ابتدا قرار پاتی ہے۔ اس کے ہی فیصلوں کو منطقی اور قطعی قرار دیا جاتا ہے۔ عقل کہتی ہے جس طرح صبح و شام ہماری باتیں کسی نہ کسی سبب کا اظہار کرتی ہیں اسی طرح کوئی حادثہ یا واقعہ زندگی کے داخلی حوالہ سے ہو یا خارجی حوالے سے سبب کے ابتدا کی غمازی ضرور کرتا ہے۔

لہٰذا یہ بات بنیادی طور پہ عقل اور منطقی نقطۂ نظر سے بالکل درست ہے کہ ہر پیدا ہونے والی شخصیت کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ ہر ایجاد کا کوئی نہ کوئی موجد "Creator" ضرور ہے۔ اگر اس کے برعکس جواب دیا جائے گا تو عقل اسے بالکل قبول نہیں کرے گی۔ یہی سوال خالق کائنات جس نے انسان کو پیدا کیا، عقل و ادراک، فہم و ذکا سے نوازا، اسی سے کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۝ؕ (الطور ۳۵)

ترجمہ: کیا یہ کسی کے پیدا کئے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود (اپنے تئیں) پیدا کرنے والے ہیں۔

جواب صاف ہے کہ کوئی بھی نہ خود پیدا ہوا ہے نہ اللہ کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا ہے۔ اس اصول کے تحت ہم اس نتیجہ پہ پہنچے کہ زمین اور پہاڑ، درخت اور گھاس ستارے اور بہت سے سورج یقیناً ان سب کا ایک ہی خالق اللہ ہے۔ اسی مستند قانون کے حوالہ سے لامحالہ ہم تمام اشیاء کے ابتدائی خالق کو ماننے پہ مجبور ہوں گے اگر اس حقیقت سے انکار کریں گے تو فاطر العقل کہلائیں گے ہی نہیں بلکہ ہوں گے۔

مشہور حکیم ابن سینا نے تو صاف طور یہ کہا کہ جو شخص کسی مولود کے والد کو نہیں مانتا، کسی ایجاد کو مان کر اس کے موجد سے انکار کرتا ہے، اس کی عقل میں یقیناً کوئی نقص ہے۔ واجب الوجود۔۔۔ اللہ جل شانہٗ کو کائنات میں ہر موجود کا خالق ماننا ہی عقل کا اپنا وقار ہے۔ اگر کوئی انکار کرتا ہے تو مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسے انسان جو زمانہ قدیم سے چلے آتے ہیں وہ کسی قسم کی ذہنی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔

ایک اور گروہ ہے جس کا دعویٰ ہے، وہ نہیں تین خدا۔۔۔ ۱۔ خدا آسمانی بادشاہ، ۲۔ مقدس باپ یسوع مسیح، ۳۔ مریم۔۔۔ اس عقیدے کے حاملین سے قرآن مجید نے کئی بار غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہوئے خطاب فرمایا:

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَاۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○(الانبیاء ۲۲)

ترجمہ اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں خدائے مالک عرش ان سے پاک ہے۔

اس کے بعد ایک اور جگہ وضاحت کرتے ہوئے فرمایا

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ○(المومنون ۹۱۔۹۲) هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ○(الحدید ۳)

ترجمہ خدا نے نہ تو کسی کو (اپنا) بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر غالب آ جاتا۔ یہ لوگ جو کچھ (خدا کے بارے میں) بیان کرتے ہیں خدا اس سے پاک ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے اور (مشرک) جو اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں (اس کی شان) اس سے بلند ہے۔

(اللہ کی شان یہ ہے) کہ وہی اول وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن ہے اور اسے ہر چیز کا انتہائی اچھی طرح علم ہے)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنی صفات کی پہچان ان الفاظ میں کرواتے ہیں۔

اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْؕ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ○ۧ(فصلت ۵۴)

ترجمہ دیکھو یہ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے سے شک میں ہیں۔ سن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

ایک اور جگہ اپنی پہچان اور واضح بیان کرتے ہوئے فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ○ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ○ۚ لَمْ يَلِدْ۬ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ○ۙ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ○ۧ(الاخلاص:۱۔۴)

ترجمہ کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ (ہے) ایک ہے۔ (وہ) معبود برحق بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

یوں اللہ جل شانہٗ نے اپنی پہچان کی پوری علامتیں بیان فرما کر شک و شبہ کے تمام امکانات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے بعد بھی انسانوں کا وہ گروہ جو تین خداؤں کا پرستار ہے اس کی سمجھ میں بات نہ آئے تو اس سے حقیقت بدل نہیں سکتی، وہ الگ بات ہے جو ہمیشہ رہے گی۔

معلم انسانیت و محسن رحمت دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے تمام انبیاء نے انسانوں کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی انسان اور جن کو کائنات کے خالق سے متعارف کرایا اور امت مسلمہ پر یہی ہم دین کو قیامت تک لے جانے کا فریضہ سونپا تاکہ نسل انسانی کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر حقیقت کی منور دنیا میں لے آئیں۔ ان کی ان کوششوں کو ناکام بنانے میں جتنی بھی رکاوٹیں آئیں انہیں علمی استدلال سے بے اثر بنا دیں۔

انسان کے آغاز سفر سے لے کر آج تک ایسے موڑ آئے جب رب العالمین نے اپنے انبیاء کے ذریعہ استفہامیہ انداز میں دریافت فرمایا

قالت رسلهم افی الله شك فاطر السموت والارض (ابراہیم ۱۰)

ترجمہ: ان کے پیغمبروں نے کہا کیا (تم کو) خدا (کے بارے) میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

گویا اللہ جل شانہٗ کی طرف سے پیش کئے گئے دلائل کے باوجود ہر دور میں بعض انسان مرض تشکیک میں مبتلا رہے۔ اس سے پہلے اس "حقیقت کبریٰ" کے اثبات میں تفصیلی معروضات پیش کی جا چکی ہیں لیکن چلتے چلتے مختصر سا ایک جائزہ

علت العلل

انیسویں صدی کے بعض مفکرین نے کائنات کو علت اور معلول (Cause and Effects) کے ایک نظام کا نتیجہ ثابت کرتے ہوئے کہا

کائنات کے تمام واقعات کسی خارجی مداخلت کے بغیر محض مادی اسباب کے تحت واقع ہوئے ہیں۔ اس طرح پوری کائنات علت و معلول کی مسلسل زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے۔ انتہائی آسان سمجھ میں آنے والی مثال یوں ہو گی کہ مختلف اجزاء جڑی بوٹیاں، معدنیات، نشاستہ، لحمیات اور کئی مختلف اجزا کا بھرا ہوا کونڈا آپ ہی آپ گرا، ٹوٹا اور تمام اجزا آپس میں ایسے خلط ملط ہوئے کہ ان سے ایک معجون مرکب تیار ہو گئی۔ ایسی قابل حیرت کہ اس میں دوائی قوام بھی پیدا ہو گیا۔ مادہ جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہیں بلکہ ابتدائی ذروں یعنی برقیے اور پروٹونوں کی شکل میں پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا۔ اسی میں اچانک ہلچل مچی اور بس ـــــ پھر سلسلہ چل نکلا ـــــ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں، بلکہ ناقابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ماقبل کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس کے بارے میں آپ خود اپنی عقل سے پوچھئے کیا اسے وہ آسانی سے قبول کرتی ہے؟

دوسرا مکتبہ فکر کہتا ہے کائنات کی سچی کہانی یہ ہے کہ زمین کی تہوں سے جو نقش ملتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ کروڑوں برس پہلے زمین پر زندگی جس شکل میں موجود تھی ان کے پنجر قدرتی عمل یعنی "Law of Nature"

کے تحت پتھرائی ہوئی حالت میں زمین کے نیچے دبے ہوئے ہیں ان کو فاسل (Fossil) کہا جاتا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کے بہت زیادہ قدیم دور میں حیوانات کی جو قسمیں یہاں آباد تھیں وہ سادہ قسم کی تھیں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ قسمیں آباد ہوئیں۔ مختلف حیوانات کے نوعی اختلاف کے باوجود ان کے جسمانی نظام میں مشابہتیں پائی جاتی ہیں کہ سارے ذی حیات (جاندار) ایک ہی خاندان کے پیداوار ہیں۔ اس پر بھی تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ علم الطبیعیات اور نفسیات کے ماہرین و مفکرین دونوں تھوڑے اختلاف کے ساتھ کائنات کی اس تشریح کو تسلیم کرتے ہیں۔

گویا تیسرا مکتبہ فکر بھی اس کائنات کی تشریح میں اللہ جل شانہٗ کے خالق ہونے کو خارج قرار دیتا ہے لیکن ان تینوں ملحد مفکرین کے پاس ایسے دلائل نہیں ہیں جو اپنے اپنے فلسفہ کو منوا سکیں۔ بہرحال ہماری معروضات ان دلائل کو پیش کرتی ہیں جن کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ہم جس اللہ جل شانہٗ کی ذات کو پوری کائنات کا خالق مانتے ہیں، کیوں مانتے ہیں اس کے دلائل پیش کئے ہیں۔ اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ہم پھر ان دلائل کو دہراتے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ وہ ہستی ہے جو انسان کو پیدا کرنے اور اس کو دیئے گئے اختیارات کو تسخیر کائنات کے حوالے سے ثابت کر چکا ہے۔ تسخیر کائنات اور انسان کی صلاحیتوں کی وضاحت اس وقت کی گئی جب کہ انسان نے اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کو سنا:

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ (البقرۃ:۲۵۵)

ترجمہ: اس کی بادشاہی (اور علم) آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے۔

تو اس وقت کے انسان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی اس نادان نے اپنی عقلمندی کے زعم میں اس بات کو شاعرانہ مبالغہ قرار دیا۔ لیکن آج اللہ جل شانہٗ کی ہستی سے انکار کرنے والا خود کہتا ہے کہ مشتری ایک ایسا سیارہ ہے جس میں ہماری کئی دنیائیں سما سکتی ہیں۔

اللہ جل شانہٗ نے جب آج سے ۱۴۰۸ (سال تصنیف کتاب) سال پہلے اپنے تعارفی اعلان میں فرمایا کہ میں نے تمہیں آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ان سب کو تمہاری خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔ تم اسے اپنے تصرف میں لا سکتے ہو۔ تو اس وقت زمین میں موجود اشیاء پہ تصرف انسانی تو سمجھ میں آ سکتا تھا۔ کسے یقین تھا، کون انسان کہہ سکتا تھا کہ آسمانوں پر انسان کا تصرف یوں ہو گا کہ وہ سکائی لیب بنائے گا۔ چاند میں بسیرا کرے گا، خلا میں مصنوعی سیاروں اور زمین کے گرد گاڑیوں کا موجد ہو گا، مختلف تابکار اور غیر تابکار لہروں پہ تسلط جمائے گا۔ مگر آج اللہ جل شانہٗ کی ذات برحق کا انکار کرنے والا ملحد، اس کے اعلان کی خود ہی دلیل ناطق بن رہا ہے۔ جو آج انسان معرکے مار رہا ہے۔ انہیں کے بارے میں چودہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا تھا۔ مگر انسان کو اللہ تعالیٰ نے جن عظمتوں کا مالک بنایا تھا وہ عظمتیں پا کر اپنے آپ کو لاوارث جانور، بے معنی مخلوق ثابت کر کے اللہ تعالیٰ کے انسان کے بارے میں ہی کہے ہوئے اس ارشاد کی تصدیق کر رہا ہے کہ ہم نے انسان بہترین موزونیت کے ساتھ بنایا۔ بلندیوں سے نوازا اور پھر پستیوں میں بھی گرایا۔

ذرا غور کریں تو آپ دنیا میں ہی سے بالشت بھر مٹی اٹھا کر پوچھیں تجھے کس نے بنایا ہے تو وہ اپنی

صفات کی زبان سے کہے گی اللہ جل شانہٗ میرا خالق ہے۔

نباتات، جمادات، اشجار و انہار (کامیاں) سے دنیا کے کسی خطہ میں یہ سوال کریں۔ تم کس کی مخلوق ہو؟ تو بیک زبان، تمام اطراف سے مشرق، مغرب، شمال، جنوب بلند و پست، صحرا و دریا، سب سے ایک ہی جواب سنائی دے گا۔ اللہ جل شانہٗ ۔۔۔ ہماری وحدت صورت، وحدت رنگ، وحدت جنس، سب کی سب اس وحدہٗ لاشریک کی دلیل ہے۔ کسی پرندے، کسی جانور، کسی وادی، کسی صحرا کے حسن سے پوچھو تمہارا صانع کون ہے، خالق کون ہے؟ تو وہ کہے گا، اللہ جل شانہٗ۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان درست ہے کہ میں نے طرح طرح کے پرندے اور خوبصورت سے خوبصورت کائنات میں رنگ بکھیرے ہیں۔

اگر ہم کسی خوبصورت نقش کو دیکھ کر نقش کی تعریف تو کریں لیکن نقاش سے انکار کریں؟ کسی صنعت کے کمال کو دیکھیں لیکن صانع کو تسلیم نہ کریں۔ نظام کا بہترین چلن دیکھیں مگر ناظم کے تصور کو بھی رد کر دیں۔ مخلوق کو دیکھ کر خالق، منفعل کو دیکھ کر فاعل کو تسلیم نہ کریں تو آپ ہی بتائیے ہمارا عقل و دانش اور ترقی کا دعویٰ کتنا صحیح ہو گا۔

در جہان کیف و کم گردید عقل   پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجا است   کشتی ادراک را ساحل کجا است
اہل حق را رمز توحید ازبر است   در آتی الرحمٰن عبداً مضمر است
تا ز اسرار تو بنماید ترا   امتحانش از عمل باید ترا
دیں ازو و حکمت ازو آئیں ازو   زور ازو قوت ازو تمکیں ازو

اقبال

آثار، اوصاف اور پہچان

ایک مشہور کہاوت ہے عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ کہاوت مشہور بھی ہے اور مشاہدے کی روشنی میں تسلیم شدہ ایک اصول بھی کہ علامات (آثارات) کسی خاص نام کی راہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً کسی ریاضی کی کتاب پر ریاضی کی علامتیں دیکھ کر آپ اس کتاب کا نام تصور کر لیں گے۔ سائنس کی کتاب کے سرورق پر سائنسی آلات دیکھ کر آپ کا ذہن فوراً اس کتاب کو پہچان کر کہے گا یہ سائنس کے علم سے متعلق کتاب ہے۔ یہ علامات نہ صرف نام کی دلیل کہلائیں گی بلکہ وہ نام اس علم کی صفت کا ثبوت بھی کہلائے گا۔ ثابت ہوا کہ علامات صفات کی دلیل اور صفات نام کی دلیل ہوتی ہیں۔

کتاب کو آپ نے پڑھا تو اس سے لکھنے والے یا اس علم کے ماہر کی قابلیت کے معیار کا تعین ہوا اگر کتاب کی تحریر میں آسانی، روانی، فصاحت، بلاغت کے ساتھ علم کی حقیقتوں پہ بھی مہارت موجود ہے تو اس تحریر کی تمام صفات اس کے مصنف (خالق) کی منہ بولتی دلیل ہوں گی۔ مصنف کو ہم بالمشافہ دیکھیں یا نہ دیکھیں، تحریر کو دیکھ کر جو رائے ہماری عقل و دانش نے دی ہے اس پر ہمیں پورا یقین ہو گا اور پورے اعتماد کے ساتھ ہم اس تخلیق کار کی ذات کی مداحی کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ ثابت ہوا کہ صفات ہی کسی "ذات" کے عرفان کی

دلیل ہوتی ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھیے اور ذہن میں سابقہ صفحات کے اوراق پہ پیش کردہ مضامین کا اعادہ کیجئے تو ایک ہی ذات ان کا محور ہے۔ کی وہ ہے اس کتاب کائنات کی خالق ہستی، جس کا نام ہے اللہ جل شانہ۔

اس کتاب کائنات کے ہر ورق پہ جتنی علامتیں، جتنے آثار، جتنی نشانیاں ہمیں نظر آتی ہیں ان کے بارے میں مختلف آراء آپ کے گوش گذار ہوئیں۔ مخالف آراء کے بارے میں دلائل کے ساتھ اپنی رائے پیش کر دی گئی۔ اب ہم براہ راست اس کتاب کائنات کے خالق نے اپنا تعارف کس طرح کروایا ہے، کن الفاظ میں کروایا ہے۔ اپنی پہچان کروانے میں اس کا انداز کتنا مدبرانہ، کتنا حکیمانہ، کتنا پیار بھرا ہے۔ ہم اس ذات کے اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ سنیے! اس کتاب کائنات کا خالق کہہ رہا ہے

فَانظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ (الروم:۵۰)

ترجمہ تو (اے دیکھنے والے) خدا کی رحمت کی نشانیوں کی طرف دیکھ۔

اس خطاب میں مضمر انداز تکلم کی عظمت ذات کا گواہ ہے۔ وہ جو اس کائنات کی عظیم کتاب کا خالق ہے۔ جسے اپنے اس شاہکار کے ہر نقش پہ فخر کا حق حاصل ہے۔ عظمتوں کا جلال جس کی دلیل ہے۔ اس کا انسان سے محبت بھرا خطاب تو دیکھیے۔ اس کتاب کائنات کے مقاصد اور مخاطب انسان سے اس کے تعلق کو بیان کرنے والے نے اپنے مقدس اعلیٰ ارفع کلام میں بھی اپنا تعارف ان الفاظ میں فرمایا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ○

ترجمہ شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بات صاف ہے۔ مجھے پانا چاہتے ہو تو میری مہربانیوں میں مجھے تلاش کرو، میری پہچان چاہتے ہو تو میرے رحم میں ڈھونڈو۔ میری پہچان کی دلیل، میری ذات کا تعارف میری مہربانیاں اور میرے احسانات ہیں، رحم ہے محبت ہے۔

اس کتاب کائنات کو آنکھیں کھول کر دیکھو تو ان کا حسن میری گواہی دیتا ہوا پاؤ گے۔ ان کا جمال میری شہادت دیتا ہوا، ان کا کمال میری ذات کا ثبوت اور فائدے میری زبردست دلیل۔۔۔ کتاب کائنات کے ہر ورق پہ ابھرے ہوئے آثارات، علامات میرے نام کی دلیل، میرے نام، میرے اوصاف کے ترجمان اور میرے اوصاف، میری ذات کی شہادت کبریٰ۔

سنو! بگوش ہوش سنو! بگوش عقل و دانش سنو! میرا ذاتی نام ہے اللہ اور میرے صفاتی نام بے گنت، بے شمار، مگر ان میں سے بعض پہ غور و فکر کرو۔ ان کے معانی پہ پوری توجہ دو۔ جتنا غور کرو گے، جتنا تفکر و تدبر سے کام لو گے میرے اور تمہارے درمیان حجاب اٹھیں گے۔ میرا ایک اور صفاتی نام ہے الرحمٰن، یعنی بڑا ہی مہربان!

اللہ الاول۔ مطلب یہ کہ میں اس کتاب کائنات کو وجود دینے سے پہلے بھی تھا۔ تنہا، بالکل تنہا۔

اللہ الخالق اللہ ہی خالق (Creator) کائنات ہے۔ یہ میری ہی تخلیق ہے۔ اس کا ہر نقش زندہ اور مردہ تمہاری نظروں کے سامنے ہے جو میری اس صفت کی دلیل ہے۔

اللہ المحی والممیت: زندگی دینے کی قدرت رکھنے والا اللہ۔

اَلْبَارِیُٔ زندگی دے کر اسے اپنی مرضی سے اپنی پسند کی صورت دینے والا اللہ۔ اور زندگی کو موت سے بدل دینا بھی میرے اختیار میں ہے۔

میری صفات پر غور کرو۔ میں اپنی ہر مخلوق کو زندگی دینے کے بعد اس کو ہدایات بھی دیتا ہوں۔ اس کو اپنے بتائے ہوئے طریق کار سے عہدہ برآ ہونے کی قوت (یہ صفات بھی عطا کرتا ہوں) اسے اچھائی اور برائی سے غیر حاضر ہونے کے انجام سے آگاہ بھی کرتا ہوں۔ خاص کر تمہیں۔۔۔ اے میرے عظیم شاہکار، انسان تمہیں۔۔۔ تو ہی وہ ہے جسے میں نے خود ہی سب کچھ دیا ہے، انکار اور اقرار کی جرأت دی ہے۔ اختیار دیا ہے!

تمہیں ہوشیار رہنا چاہیئے۔ میں نے تمہیں خیر اور بھلائی سے غیر حاضر پایا تمہاری غیر حاضری لگ گئی تو پھر۔ ہمارے سوا۔۔۔ اس غیر حاضری سے تمہیں نکالنے والا کوئی نہیں ہوگا اس لئے ہمارا نام ہے۔

اللہ الہادی والمُضِلُّ اللہ ہی ہدایت دینے والا راہنمائی کرنے والا ہے اور اللہ ہی نیکی سے غیر حاضر کی غیر حاضری لکھنے والا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ میرے اس نام کا مطلب ذہن نشین رکھو۔ اس کتاب کائنات کی جس تحریر، جس نقش میں کوئی اصول دیکھو، مقصد دیکھو، اس میں اسے فعال پاؤ تو سمجھ لو یہ میری ذات کا عطا کردہ ہے۔ اور جب اس کتاب کائنات میں تمہاری نظریں نئی نئی مخلوقات حیران کن مخلوقات دیکھیں تو یاد رکھو یہ میری ہی صفت ہے۔ یہ میرے ہی اختیار کا ایک رخ ہے۔

اللہ البَدِیعُ اللہ ہی تمام نئی نئی چیزیں پیدا کرنے والا ہے۔ نئے نئے واقعات کا ظہور کنندہ ہے اور ہاں انسان جب بھی تمہاری بے قراری میں مانگی ہوئی دعا کے قبول ہونے کے اثرات دیکھو تو فوراً سمجھ لو یہ میرے ہی نام کی صفت ہے اور میرا ہی نام ہے۔

اللہ المُجِیبُ: اللہ ہی دعائیں قبول کرنے والا ہے۔

کتاب کائنات جیسے ہی تمہیں اپنے فیض سے نوازے، نعمتیں تمہاری جھولی میں ڈالے تو یہ بھی میرے ہی نام کی صفت ہے۔

اللہُ المُنْعِمُ وَالمُعْطِیُ اللہ ہی کی ذات نعمتوں کی خالق بھی ہے اور نعمتوں کی سخاوت کرنے والی بھی ہے۔

اللہُ الوَاحِدُ: یعنی اللہ "واحد" ہے۔ اکیلا ہے، تنہا ہے۔ لیکن یہ تنہائی صرف مجھی کو جچتی ہے۔ تنہائی اور اکیلے پن کا اعزاز صرف میرا ہی حق ہے۔ تم کو تنہائی راس بھی نہیں آئے گی۔ اور انسان تم تنہا کبھی نہیں ہوتے، تمہارے ساتھ میں ہوتا ہوں۔

اللہ الحَکِیمُ اللہ صاحب حکمت ہے۔ وہ بہترین منصوبہ ساز ہے اسے ترتیب دینے میں حیرت ناک حد تک قابل کامل "Deviser" ہے۔ اس لئے میرا دعویٰ ہے کہ اس کتاب کائنات میں ہر حرف، ہر نقطہ جہاں کہیں جلایا گیا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں۔ لہٰذا جس جگہ تمہیں حکمت و دانائی حیران کردے سمجھ لو وہ ہماری صفت کا شاہکار ہے۔

غرض اس کتاب کائنات میں جس موضوع کا ذکر ہم نے کیا یا نہیں کیا، ہر موضوع کی روح ہمارے ہی نام اور صفات کی ترجمان ہے۔ جہاں کہیں رزق کی فراوانی دیکھو تو فوراً ہمارا نام یاد کر لو۔

ھُوَاللہُ الرَّزَّاقُ: اللہ ہی رزق دینے والا ہے۔ لہٰذا کسی پہ نہ حسد کرو نہ کسی کو رازق سمجھ کر اس سے جھگڑا اور

عہد کرو۔ ہم سے مانگو ہم رزق دینے والے ہیں۔ کسی کو اگر عزت کی بلندیوں پہ بالانشیں دیکھو، کسی کو ذلتوں کی پستی میں گرا ہوا دیکھو تو اس میں بھی ہمارے ان ناموں کی صفات کا تصرف سمجھو۔ اللہ ہی عزت دینے والا اور ذلت دینے والا ہے۔ تمام کائنات کے مطالعہ میں جہاں تمہیں سکون ملے قانون میں پر سکون تسلسل ملے تو سمجھ لو یہ ہماری ہی صفت اور نام کا ثبوت ہے۔

اللہ المُہیمنُ (تمام کائنات کا نگران اللہ) گویا ہمیں نگران و محافظ ہیں اور جب کہیں تمہیں مختلف طاقتوں کے مظاہر نظر آئیں تو یہ بھی ہمارے ہی اوصاف کے مظہر ہیں۔

اللہ القادرُ والمُقتدرُ اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ ہی اقتدار کا مالک ہے۔ اور جہاں بھی تمہیں مضامین میں ترتیب نظر آئے۔ اول و آخر کا حسین ترین قرینہ نظر آئے تو یقین کر لو، ہمارے نام کا ہی اثر ہے۔

اللہ المُقدِّمُ وَالمُؤخِّرُ. اللہ ہی مقدم و موخر، پہلے اور بعد کو ترتیب دینے والا ہے۔۔۔ اور اگر کہیں کسی کو پشیمان دیکھو تو اس کو فوراً احساس دلاؤ۔

اللہ التوّابُ اللہ تعالیٰ پشیمانوں پہ محبت بھری توجہ کرتا ہے۔ غلطیوں کو بخش دیتا ہے گناہوں کو معاف کر والغفّارُ والعفوُّ دیتا ہے۔۔۔ اگر کسی شخص کو اس کے گناہوں کی گرفت میں پاؤ تو یاد رکھو یہ بھی میری ہی صفت ہے جس کی نمائندگی میرا نام ہی کرتا ہے۔

اللہ المُنتقمُ اللہ ہی گناہوں پہ سخت گرفت کرنے والا ہے۔ اور ہاں اپنی زندگی میں نفع کی سرخوشی پاؤ یا نقصان کا غم، تو ہم سے ناطہ قائم کرو، ہمیں نفع دینے والے اور ہمیں نقصان دینے والے ہیں۔

اللہ النّافعُ وَالضّارُ ہمیں نفع دینے والے اور ہمیں نقصان دینے والے ہیں۔۔۔ اللہ ہی نفع دینے والا اور اللہ ہی نقصان دینے والا ہے۔۔۔ اگر کہیں اللہ جل شانہٗ کے حکم سے سرکشی کرتے ہوئے انسانوں کو دیکھو تو انہیں آزاد یا بے لگام دیکھ کر ہمارے اختیارات اور قوتوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہ ہو جانا، ہمارا نام ہے۔

اللہ الصّبُورُ اللہ جو صبر کرنے والا ہے۔ اور جانتے ہو صبر کے معنی یہ کہ کسی پر قابو اختیار اور غالب قدرت رکھتے ہوئے بھی ضبط سے کام لینا۔۔۔ اسی طرح ہمارے ہر نام میں مضمر صفات ہی ہماری ذات کی معرفت بھی ہیں اور دلیل بھی۔

صفات کی اقسام:

آئندہ دلائل کی مزید تفصیل سے پہلے ایک بات ہمیں ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ صفات کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ صفات کا اظہار بالفعل۔

۲۔ صفات ذات الوجود۔

۳۔ صفات ذات السلبیہ۔

مثلاً ہم نے کسی انسان کے بارے میں کہا: وہ قاتل ہے۔ تو یہ اس افعال میں سے ایک فعل کی صفت کہلائے گی۔ اسی کا نام ہے صفت فعلی۔۔۔ ایک انسان کے بارے میں ہم نے کہا: وہ سن سکتا ہے۔ تو یہ اس کی بالذات صفت ہو گی۔ گویا یہ صفت اس کے وجود کا حصہ ہے۔۔۔ اب ایک انسان کے بارے میں ہم نے کہا: وہ

انسان شراب نہیں پیتا۔ تو اس کی یہ صفت سلبیہ کہلاتی ہے۔

ان اقسام صفات میں اختلاف نوعیت تو ہے لیکن کسی ذات کے فعل سے ہی اس کی صفات پہچانی جاتی ہیں اور صفات سلبیہ سے فعل کی صفات کا تعین ہوتا ہے اور ذات موصوف تمام صفات سے پہچانی جاتی ہے۔

اس حوالے سے بات کو ختم کرکے اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے میں اس بات کی وضاحت کر دینا پسند کروں گا کہ اللہ جل شانہٗ کی پہچان (معرفت) سے متعلق ہماری گفتگو میں یہ تینوں صفات (۱۔ صفات وجودیہ، ۲۔ صفات فعل، ۳۔ صفات سلبیہ) کیا معنی رکھتی ہیں۔

ہمارے نزدیک صفت سلبیہ اللہ جل شانہٗ کی ذات کے حوالے سے وہ صفت ہے جس میں نفی کسی صورت بھی اللہ تعالیٰ کے نام سے وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اس کی صفت وحدانیت اور ذات الٰہی کے حوالے سے صفات الوجود سے مراد وہ صفات ہیں جو ذات الٰہی کے عرفان کی واضح یا مزید قربت کا سبب بنتی ہیں۔ مثلاً علم، سمع وغیرہ اور صفات فعل سے ہماری مراد اللہ جل شانہٗ کی قدرت تخلیق سے متعلق ہے۔ یعنی ذات الٰہیہ مکمل اختیار، قدرت اور قوت ہے جو اس کے نام، اس کی صفات اور اس کے افعال کی دلیل ہیں۔

اللہ جل شانہٗ کی فی الذات صفات اور وہ صفات جن کا ذات ذوالجلال و الاکرام سے کوئی تعلق ہے وہ صفات سلبیہ جیسے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ جل شانہٗ سے سننے کی صفت کو الگ کر دیا جائے یا اس کی نفی "Negation" کی جا سکے۔ صفات فعل سے مراد صفات علیا ہیں۔ عقل سلیم انہیں جتنا بھی بہتر سے بہتر، اعلیٰ سے اعلیٰ تصور کر سکے، اس نکھرے ہوئے شعور اور تندرست عقل کی آنکھ جب کائنات پہ نظر ڈالتی ہے تو اللہ جل شانہٗ کی چار صفات وجودیہ بنیادی طور پہ نظر آتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا علم، مشیت (ارادہ) قدرت، اور زندگی، کائنات اسی صفت کی دلیل ہے کہ اگر اس اللہ میں قدرت بالذات نہ ہوتی تو یہ عالم وجود میں ہی نہ آتا۔ مختلف النوع اشیاء کی تخلیق اس کے ذاتی ارادہ کی عظمت کی مدح خواں ہیں۔ کتاب کائنات میں مختلف ابواب و اقسام مختلف النوع موضوع اور ضمنی تخلیقی شہکار اس کے بے پناہ علم کا بیّن ثبوت ہیں۔ اسی طرح ارادہ، قدرت اور علم کے تمام حیرت ناک مظاہر اس ذات کی "حیات" کی دلیل ناطق ہیں۔

کتاب کائنات کا ہر عنوان جلی اس کے علم، اس کے ارادہ، اس کی قدرت کے بے نقص ہونے، بے ہمسر ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میرے خالق اول و انتہا ہیں۔ وہ واحد ہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ خالق ہے مخلوق نہیں، اس کی کسی سے مماثلت و تشبیہ نہیں، وہ اپنی ذات میں قیام ہی قیام ہے۔ وہ اپنی ذات میں حیات ہی حیات ہے۔ اس کی حیات اس کا قیام کسی کی احتیاج و تعاون سے پاک ہے۔ اس کی نگاہ نقص سے پاک، اس کا کلام بے نقص، انسان کی عقل اور شعور کی زبان سے نکلا ہوا سب سے بڑا سچ یہی ہے کہ وہ اپنی ان صفات میں یکتا ہے۔ ھوالاول۔۔۔ وہ اول ہے۔ اس کی کوئی انتہا نہیں، وہ آخر ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں، وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

ھُوَالْقُدُّوْس ۔۔۔ وہ تمام نقائص سے پاک ہے۔

ھُوَالْقَیُّوْم۔۔۔ وہ ہمیشہ بلا مدد غیرے قائم و دائم ہے۔ اس نے اپنا ذاتی نام جسے خود بتایا اللہ ہے۔ اللہ جل

جلالہ۔۔۔ اس کے جلال کا اعتراف کوئی نہیں کر پایا۔ یہ وہ نام ہے جس کا اعلان وحی معزز و محترم علیہ السلام نے کیا۔ انبیاء علیہم السلام نے کیا اور وہ نام جس کو مہبط وحی صادق و مصدوق محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا تمام بھلائیاں تجھ سے ہے اور شر کو تیری کوئی نسبت نہیں اور اپنی پہچان کروانے کے لئے وہ نام جو تم نے خود اپنے سے منتخب کیے ان سے بہتر کوئی نام نہیں۔ وہ نام جس کو تو نے خود اسماء الحسنیٰ کے نام سے مزین کیا ہے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ط لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰیO(طٰہٰ:٨)

ترجمہ (وہ) معبود (برحق) ہے (کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کے (سب) نام اچھے ہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ج (الاسراء:١١٠)

ترجمہ کہہ دو کہ تم (خدا کو) اللہ (کے نام سے) پکارو یا رحمٰن (کے نام سے) جس نام سے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں۔

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا ص وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ ط (الاعراف۔١٨٠)

ترجمہ۔ اور خدا کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اس کو اس کے ناموں سے پکارا کرو۔ اور جو لوگ اس کے ناموں میں کجی (اختیار) کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو۔

اور ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسماء حسنیٰ میں سے اللہ جل شانہٗ کا کوئی ایسا اسم اعلیٰ نہیں جس میں موجود معنوی صفت پہ کائنات کا ہر مظاہر دلیل ثابت نہ ہو۔ اور وہ تمام اسماء الحسنیٰ جو قرآن مجید اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود ہیں تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ، صفات وجودیہ اور صفات فعل کا زندہ ثبوت ہیں اور ان تمام صفات کا مجموعہ صفات کی ماں کا مقام رکھتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں اللہ جل شانہٗ کے صفاتی نام بہت سے ہیں۔ لیکن جیسے کہ اس اللہ جل شانہٗ کی معرفت کے سب سے بڑے امین نے یوں فرمایا ہے:

الھم انی اسئلک بکل اسم ھولک، سَمَّیْتَ بہ نفسِکَ او نزلتہ فی کتاب اواستاثرت بہ فی علم الغیب عندک۔ (حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

(اے میرے اللہ میں آپ کے ہر اس نام سے آپ کو پکارتا ہوں جو نام بھی آپ کا ہے۔ یا اس نام سے جسے آپ نے خود اپنی ذات اعلیٰ و افضل کے لئے اپنی کتاب میں نازل فرمایا۔ یا اس نام سے جس کو اپنے علم غیب میں اپنے پاس محفوظ رکھا)۔

ہمارے استاد مکرم ان صفات کو "صفات اللہ اور صفات الخلق" کے زیرعنوان یوں بیان کیا کرتے تھے: عالم اور علم دونوں صفات کی نسبت انسان سے بھی ہوتی ہے اور اللہ جل شانہٗ سے بھی، جہاں تک ترکیب لفظی کا تعلق ہے دونوں ایک ہی ترکیب کے حامل ہیں۔ لیکن معنوی اعتبار سے اللہ جل شانہٗ کے علم یا عالم ہونے کی نہ کوئی حد ہو سکتی ہے نہ انتہا۔ اس طرح زندگی، قوت سماع، قوت بصر، علی ہذالقیاس۔ لفظی مناسبت میں تو وحدت ہے لیکن معنوی لحاظ سے یہ تمام صفات اللہ جل شانہٗ کے حوالے سے اپنی برابری اپنی مشابہت سے بالاتر اور خصوصیات

میں اتنی افضل، اتنی کامل، اتنی عالی کہ ان کی تعریف انسان کے حد قدرت سے باہر ہے۔

اسی طرح انسان بھی خالق کہلاتا ہے، لیکن اللہ جل شانہٗ کی یہ صفت معنوی اعتبار سے اس سے کہیں بہتر اور اعلیٰ ہے۔ غرض یہ کہ معرفت الٰہیہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کی کسی ایک صفت کی معرفت کا مکمل حصول ناممکن ہے۔

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اسی طرح ہمارے استاد۔ (التفکر فی ذات اللہ) یعنی اللہ جل شانہٗ کی ذات میں غور و فکر کے حوالے سے کہا کرتے تھے: اللہ کے بندو جب بھی کبھی اللہ جل شانہٗ کی ذات اعلیٰ کی معرفت کے لئے اپنے غور و فکر کو تحرک پڑ تو حضور اکرم رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث یاد کر لیا کرو

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما، انّ قومًا تفکروا فی اللہ عزّ وجلّ، فقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "تفکروا فی خلق اللہ، ولا تفکروا فی اللہ، فانکم لن تقدروا قدرہ"۔

(ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کو اللہ جل شانہٗ کی ذات کے بارے میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے سنا تو فرمایا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور و فکر کرو، اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر نہ کرو تم اس کی صحیح قدر و منزلت نہیں کر سکو گے کیونکہ وہ تمہارے بس کی بات نہیں)۔

کتنی سچی بات فرمائی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔ جس طرح ایک مشین اپنے مشین ساز کا ادراک نہیں کر سکتی، ایک تخلیق اپنے خالق (مجازی) کو احاطہ نہیں کر سکتی تو انسان اپنے اس خالق کو جس نے اس کے علاوہ بھی بہت ہی حیرت انگیز اور عظیم الشان کائنات کی تخلیق کی ہے اپنے محدود ذرائع دماغ سے کیسے سمجھ سکتا ہے؟ بلکہ بعض دفعہ تو انسان کی عقل (اگر اللہ کا فضل و کرم شامل حال نہ ہو) تو گمراہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ البتہ انسان کے لئے بہتر یہی ہے کہ اس ذات جل جلالہٗ کی معرفت پر توجہ دینے کے بجائے اس کی عظمتوں اور مخلوق پر توجہ کرے، غور کرے، فکر کرے۔ اس کی صفات کو اپنے دل و دماغ میں سمو لے۔

ایک ہی منبع دو نام

قرآن و سنت ـــــ ایک ہی مصدر کے دو نام۔ دونوں نے وحی صادق جبریل امین کی مکمل تصدیق کے ساتھ اللہ جل شانہٗ کی جن صفات کو قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے ہم ان کو براہ راست آپ تک منتقل کرتے ہیں۔

(۱) وجود اللہ تعالیٰ

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا اپنا کلام ہے، گویا اللہ جل شانہٗ نے اپنی پہچان کے بارہ میں انسان کو جو سمجھایا اور پھر اسے تحریری شکل میں اپنی الکتاب قرآن حکیم میں محفوظ رکھا تاکہ قیامت کے دن سند رہے۔ کوئی انسان یہ نہ کہہ سکے کہ یہ بات میں نے سنی نہ تھی۔ یا میرے پاس تحریری ثبوت نہیں آیا تھا۔ یا انبیاء علیہم السلام کے زمانہ

میں میرا وجود اس دنیا میں نہیں تھا۔ اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں۔ انسانوں اور جنو! میری پہچان میری صفات یاد رکھو:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۝ وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۝ (الرعد ۲۔۴)

ترجمہ اور وہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا پیدا کئے۔ اور ہر طرح کے میووں کی دو دو قسمیں بنائیں۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور زمین میں کئی طرح کے قطعات ہیں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت۔ بعض کی بہت سی شاخیں ہیں اور بعض کی اتنی نہیں ہوتیں۔ (باوجودیکہ) پانی سب کو ایک ہی ملتا ہے۔ اور ہم بعض میووں کو بعض پر لذت میں فضیلت دیتے ہیں اور اس میں سمجھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وہ عرش پر متمکن ہوا اور سورج، چاند کو کام سونپ دیا گیا۔ اور وہ ہمارے حکم کے مطابق اپنی اپنی معینہ مدت اور رفتار میں مصروف گردش ہوئے۔ اور یاد رکھو، تمام امور کو ہمیں نے ترتیب دیا ہے اور ہم اپنے کارناموں کی نشاندہی صاف صاف کر رہے ہیں تا کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ اللہ کے حکم اور فیصلہ کے مطابق تمہاری ملاقات اس اللہ سے ضرور ہونے والی ہے)۔

آج سائنس دانوں نے جتنے انکشاف کئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اس دعوے کیخلاف کسی کو نظر آئے ہوں تو بتایئے۔ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

(اور اللہ ہی نے زمین کو پھیلایا۔ اس میں نہریں جاری کیں اور پہاڑ بنائے۔ (پہاڑوں سے چشموں کا تعلق ہے اور چشموں کا نہروں سے)۔ غور کیجئے زمین ایسی بنائی ہے کہ پانی اپنی راہوں کو اسی کو چیر کر پیدا کرتا ہے۔ اگر اس میں کھلنے اور پانی کو راہ دینے کی صلاحیت اللہ نے نہ دی ہوتی تو پانی تمام جگہوں پر پھیلا رہتا۔ اس کے بعد فرمایا:

(اور اس میں سے ہر قسم کے پھلوں کو دو قسم میں پیدا کیا اور دیکھو شب کی تاریکی سے دن کی روشنی کو ڈھانپ دیتا ہے)۔

جدید علم نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ہر درخت پودا اور نباتات میں تذکیر و تانیث موجود ہے اور جنس کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے رات کی تاریکی سے دن کو ڈھانپنے کا عمل اور پھر صبح کی پیدائش میں کمال بلاغت پہ غور فرمایئے۔

(اس میں سوچنے والوں کے لئے اللہ جل شانہٗ کی توحید و اختیار کو ثابت کرنے والی دلیلیں موجود ہیں۔ اور

زمین کے قطعات میں پاس پاس انگوروں کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجوریں ہیں جن میں بعض تو ایسے ہیں جن کے تنے اوپر جاکر دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں اور بعض کا ایک ہی تنا رہتا ہے۔ حالانکہ ایک ہی زمین میں ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ (غور کرو) ان سب پھلوں میں سے بعض پھلوں کو ہم نے دوسرے پھلوں پر ذائقہ میں بہتر بنایا ہے (کھانے میں زیادہ لذیذ ہیں) یہ تمام ناقابل تردید دلیلیں عقلمند قوموں کے لئے ہماری صداقت پر ایمان لانے کے لئے کافی ہیں)۔

اور اپنی خصوصی صفت جس کا تعلق کسی اور سے نہ ہے نہ ہو سکتا ہے نہ ہوگا، اس کی تفصیل بیان فرمائی.

وَ هُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ لَهُ اخْتِلَافُ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ (المومنون ۷۸۔۸۰)

ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ (لیکن) تم کم شکر گزاری کرتے ہو۔ اور وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں پیدا کیا اور اسی کی طرف تم جمع ہو کر جاؤ گے۔ اور وہی ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور رات اور دن کا بدلتے رہنا اسی کا تصرف ہے کیا تم سمجھتے نہیں؟

اور اللہ کی ذات وہ ہے، زندگی دیتی ہے، اور زندگی واپس لیتی ہے۔ (گویا یہ شکست و ریخت کا سلسلہ بتانے والے تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ دنیا آپ ہی آپ ٹوٹتی پھوٹتی اور پھر بنتی سنورتی چلی آ رہی ہے۔ نہ اس کی زندگی کے پیچھے کوئی مقصد، نہ ہی مرنے کے بعد کوئی مقصد (مقصد اگر ہے تو بقول ان کے جو ان کی دانش یہ کہتی ہے کہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ یا پھر زندگی اور موت کے درمیانی عرصہ کا مقصد انسان کو وہ سمجھ لینا چاہئے تو ان لوگوں نے طے کر رکھا ہے)۔

لیکن—— اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں کہ یہ جو دن رات میں اختلاف تم دیکھتے ہو، وہ بھی ہمارا ہی قائم کردہ ہے۔ (غور کیجئے تو رات اور دن میں صرف اندھیرے اور اجالے کا خارجی فرق ہی نہیں ہوتا بلکہ آپ کے جسم کی داخلی دنیا میں بھی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کا تعلق آپ کے جذبات حسیات اور اعصاب سے ہوتا ہے)۔ ان دلائل کے ہوتے ہوئے آپ حقیقت فہمی کے لئے عقل کیوں استعمال نہیں کرتے)؟

اور یہ وہ آیات ہیں جن میں حق تعالٰی نے اپنی ذات کے غیر فانی یعنی ہمیشہ قائم دائم رہنے کی صفت سے انسان کو آشنا کیا ہے۔ یاد رکھو، انسانو!

(۱) هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۝ (الحدید ۳)

ترجمہ: وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) پچھلا اور (اپنی قدرتوں سے سب پر) ظاہر اور (اپنی ذات سے) پوشیدہ ہے اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

(۲) وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ ع (القصص ۸۸)

ترجمہ: اور خدا کے ساتھ کسی اور کو معبود (سمجھ کر) نہ پکارنا اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات (پاک)

کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

ایک اور جگہ فرمایا

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍO وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِO (الرحمٰن:۲۶۔۲۷)

ترجمہ جو (مخلوق) زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے۔ اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت) جو صاحبِ جلال وعظمت ہے باقی رہے گی۔

اپنی وحدانیت کی وضاحت یوں فرمائی

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌO اَللّٰهُ الصَّمَدُO لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْO وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌO (الاخلاص ۱۔۴)

ترجمہ کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ (ہے) ایک ہے۔ (وہ) معبود برحق بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اے ہمارے رسول! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سے کہہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ احد ہے، ایک ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ (نہ خارجی اور نہ ہی داخلی احتیاج سے اس کا تعلق ہے) یعنی نہ بھوک نہ پیاس، نہ تھکن، غرض جو بھی داخلی احتیاج انسان جانتا ہے ان سب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں) اس کو کسی نے جنا نہیں اور نہ ہی اس نے کسی کو جنا ہے۔ اور نہ ہی کسی صفت میں کسی نوعیت سے اس کا ہم پلہ، نہ اس کی ذات کے حوالے سے کوئی اس سے برابری کر سکتا ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُO (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا (وہی ہے)۔ اسی نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے اور چارپایوں کے بھی جوڑے (بنائے اور) اسی طریق پر تم کو پھیلاتا رہتا ہے۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ اور وہ سنتا دیکھتا ہے۔

اور انسانو! یاد رکھو...... میری ذات:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُO (فاطر:۱۵)

ترجمہ لوگو! تم (سب) خدا کے محتاج ہو اور خدا بے پروا سزاوارِ حمد (وثنا) ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مانگنا ہو تو اللہ سے فقیروں کی طرح عاجزی سے مانگو، اگر نہ مانگو۔

مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًاO (الکہف: ۵۱)

ترجمہ: میں نے ان کو نہ تو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت۔ اور میں ایسا نہ تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو مددگار بناتا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ (فاطر:۴۱)

ترجمہ۔ خدا ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے کہ ٹل نہ جائیں۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ(البقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ۔ خدا (وہ معبود برحق ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ ہمیشہ رہنے والا۔

دو خدا

ایک بڑی ترقی یافتہ قوم میں آج بھی دو خداؤں کا تصور موجود ہے۔ وہ قوم جس کا کردار آج کی تاریخ میں انتہائی سفاکانہ ہے۔

وَ قَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـھَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ○وَ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَہُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَتَّقُوْنَ○وَ مَابِکُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ثُمَّ اِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْہِ تَجْـَٔرُوْنَ○ ۚ (النحل:۵۱۔۵۳)

ترجمہ۔ اور خدا نے فرمایا ہے کہ دو دو معبود نہ بناؤ معبود وہی ایک ہے تو مجھی سے ڈرتے رہو۔ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور اسی کی عبادت لازم ہے تو تم خدا کے سوا اوروں سے کیوں ڈرتے ہو؟ اور جو نعمتیں تم کو میسر ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں۔ پھر جب تم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کے آگے چلاتے ہو۔

ان آیات میں اللہ جل شانہٗ انسان کی داخلی کیفیت کو اپنی دلیل بنا کر انسان کو تعلیم دیتے ہیں۔ اب ایک اور انسانوں کی جماعت اس کا تعلق بھی ترقی یافتہ قوموں سے ہے، اس کا کہنا ہے تین خدا ہیں۔

لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّآ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ یَنْتَھُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ○اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَی اللّٰہِ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَہٗ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○(المائدہ ۷۳۔۷۴)

ترجمہ۔ وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے۔ حالانکہ اس معبود یکتا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اگر یہ لوگ ایسے اقوال (و عقائد) سے باز نہیں آئیں گے تو ان میں جو کافر ہوئے ہیں وہ تکلیف دینے والا عذاب پائیں گے۔ تو یہ کیوں خدا کے آگے توبہ نہیں کرتے اور اس سے گناہوں کی معافی نہیں مانگتے اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے۔

ان تین خدا ماننے والوں میں ہی آج کل ایسے بھی پیدا ہوئے جو ایک خدا کو بھی نہیں مانتے بلکہ دوسروں کو بھی اپنی دلیلوں سے کفر پہ آمادہ کرتے ہیں۔

(جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین نہیں ایک ہے (یعنی ایک افضل ہے اور دوسرے درجہ میں کم مگر ہیں خدا ہی) تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد لاشریک ہے۔ اور اگر یہ لوگ اس قسم کی باتوں سے باز نہ آئے تو ایسے کافروں کو ہماری طرف دردناک عذاب دیا جائے گا۔ حیرت ہے (دلائل سن کر حقیقت دیکھ کر بھی) توبہ نہیں کرتے، ہم سے بخشش نہیں مانگتے۔ اگر ایسا کریں اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے۔اور رحم کرنے والے ہیں)۔

دوسری جگہ فرمایا

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱ انبیاء، ۲۲۔۲۵)

ترجمہ: اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں خدائے مالک عرش ان سے پاک ہے۔ اور جو کام کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہو گی اور (جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی) ان سے پرسش ہو گی۔ کیا لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود بنا لئے ہیں کہہ دو کہ (اس بات پر) اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ (میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے اور جو مجھ سے پہلے (پیغمبر) ہوئے ہیں۔ ان کی کتابیں بھی ہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان میں اکثر حق بات کو نہیں جانتے اور اس لئے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔

اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں کہ (دلائل کے باوجود عجیب انسان ہیں یہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ بالخصوص زمین کی چیزوں میں سے کسی کو زندہ کرتے ہوں۔ (وہ عقل سے کام نہیں لیتے) اگر دو خدا ہوتے تو اب تک پورا نظام عالم درھم برہم ہو گیا ہوتا۔ اللہ جل شانہٗ کسی کی شراکت سے پاک ہے۔ اور وہ ذات ایسی بااختیار ہے کہ وہ جو کرے اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا۔ اور اس ذات (اللہ کو) دوسروں کے اعمال کا محاسبہ کرنے اور سوال کا حق ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا رکھے ہیں۔ (وہ ان کو جس نام سے بھی پکارتے ہیں) ان کی خدائی کے ثبوت میں کوئی دلیل ہو تو پیش کریں۔ (یہی وہ بات تھی جس کا مطالبہ کافروں سے پہلی کتابوں سے متعلق کیا گیا، مثلاً توراۃ، زبور اور انجیل اور اس کتاب میں بھی ہمارا یہ مطالبہ تحریری طور پر تاقیامت کافروں کے لئے رہے گا۔ اکثر ہمارے اختیار اور اقدامات کا علم نہیں رکھتے۔ اسی جہالت کی وجہ سے وہ ہماری الوہیت کا ذکر سن کر ہی منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ لیکن ہم نے تم سے (رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پہلے بھی کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس کو ہم نے وحی کے ذریعہ یہ حکم نہ بھیجا ہو کہ انسانوں کو اس حقیقت سے اچھی طرح شناسا کرا دو) کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ تم میری ہی عبادت کرو۔

سوالات اور جواب

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ

فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَO (المومنون ۸۴۔۹۲)

ترجمہ: کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ کہ) زمین اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) کس کا مال ہے۔ جھٹ بول اٹھیں گے کہ خدا کا۔ کہو کہ پھر تم سوچتے کیوں نہیں۔ (ان سے) پوچھو کہ سات آسمانوں کا کون مالک ہے۔ اور عرش عظیم کا (کون) مالک (ہے)؟ بے ساختہ کہہ دیں گے کہ (یہ چیزیں) خدا ہی کی ہیں۔ کہو کہ پھر تم ڈرتے کیوں نہیں۔ کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ کہ) وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ فوراً کہہ دیں گے کہ (ایسی بادشاہی تو) خدا ہی کی ہے۔ کہو کہ پھر تم پر جادو کہاں سے پڑ جاتا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہم نے ان کے پاس حق پہنچا دیا ہے اور (جو بت پرستی کئے جاتے ہیں) بے شک جھوٹے ہیں۔ خدا نے نہ تو کسی کو (اپنا) بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر غالب آ جاتا۔ یہ لوگ جو کچھ (خدا کے بارے میں) بیان کرتے ہیں خدا اس سے پاک ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے اور (مشرک) جو اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں (اس کی شان) اس سے بلند ہے۔

حیرت ہے، اس وقت بھی ایک جماعت ایسی تھی جو آج کی طرح ہر بات پہ اللہ ہی مالک ہے، اللہ ہی سب کچھ کرتا ہے، کہتی ہے مگر اطاعت میں اس کی بھی وہی حالت ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ اللہ معاف کرے، آمین۔

اللہ جل شانہٗ پھر انسان کو سمجھاتے ہیں

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَO ؕ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَO ؕ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَO ؕ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَO ؕ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَO ؕ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَO (النمل ۵۹۔۶۴)

ترجمہ: کہہ دو کہ سب تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے اور اس کے بندوں پر سلام ہے جن کو اس نے منتخب فرمایا۔ بھلا خدا بہتر ہے یا وہ جن کو یہ (اس کا) شریک بناتے ہیں۔ بھلا کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور (کس نے) تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا۔ (ہم نے) پھر ہم نے اس سے سرسبز باغ اگائے تمہارا کام تو نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگاتے تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔ بھلا کس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے بیچ نہریں بنائیں اور اس کے لئے پہاڑ بنائے اور

(کس نے) دو دریاؤں کے بیچ اوٹ بنائی (یہ سب کچھ خدا نے بنایا) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ہرگز نہیں) بلکہ ان میں اکثر دانش نہیں رکھتے۔ بھلا کون بیقرار کی التجا قبول کرتا ہے۔ جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے۔ اور (کون) تم کو زمین میں (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے۔ (یہ سب کچھ خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ہرگز نہیں مگر) تم بہت کم غور کرتے ہو۔ بھلا کون تم کو جنگل اور دریا کے اندھیروں میں رستہ بتاتا اور (کون) ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے (یہ سب کچھ خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ہرگز نہیں) یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خدا (کی شان) اس سے بلند ہے۔ بھلا کون خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا۔ پھر اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے اور (کون) تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے (یہ سب کچھ خدا کرتا ہے) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ہرگز نہیں) کہہ دو کہ (مشرکو) اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔

ان آیات ابدیہ میں انسان کو عقلی اور علمی استدلال کے ساتھ اللہ جل شانہٗ کی معبودیت بلاشرکت غیرے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ اللہ ہم سب کو اخلاص عطا فرمادے، آمین۔

قدرت الٰہی

ان آیات میں اللہ جل شانہٗ نے انسان کی تخلیق میں اپنے احسان و اکرام اور قدرت کاملہ کے دلائل پیش کیے ہیں:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْــٴًـا ؕ وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ یُحْیِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ ○ (الحج ۵۔۷)

ترجمہ: لوگو اگر تم کو (مرنے کے بعد) جی اٹھنے میں کچھ شک ہو تو ہم نے تم کو (پہلی بار بھی تو) پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر۔ پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر۔ پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی تاکہ تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کر دیں۔ اور ہم جسکو چاہتے ہیں ایک میعاد مقرر تک پیٹ میں ٹھیرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر تم جوانی کو پہنچتے ہو۔ اور بعض (قبل از پیری) مر جاتے ہیں۔ اور بعض (شیخ فانی ہو جاتے اور بڑھاپے کی نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ (بہت کچھ) جاننے کے بعد بالکل بے علم ہو جاتے ہیں۔ اور (اے دیکھنے والے) تو دیکھتا ہے (کہ ایک وقت میں) زمین خشک (پڑی ہوتی ہے) پھر جب ہم اس پر مینہ برساتے ہیں تو وہ شاداب ہو جاتی اور ابھرنے لگتی ہے اور طرح طرح کی بارونق چیزیں اگاتی ہے۔ ان قدرتوں سے ظاہر ہے کہ خدا ہی (قادر مطلق ہے جو) برحق ہے اور یہ کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور یہ کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے۔ اس میں

کچھ شک نہیں اور یہ کہ خدا سب لوگوں کو جو قبروں میں ہیں جلا اٹھائے گا ○

(اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ جی اٹھنے کی قدرت سے انکار ہے یا تمہیں شک ہے تو سوچو کہ موت کے بعد ہم تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھائیں گے کیسے؟ تو اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل پر غور کرو۔

پہلا مرحلہ...... ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ (یہ آغاز تخلیق تھا۔ اور اس کے بعد کا سلسلہ چل رہا ہے)۔ دوسرا مرحلہ...... تمہیں نطفہ سے پیدا کیا۔ (نسل انسانی کا یہ سلسلہ تخلیق کوئی غلط ثابت نہیں کر سکتا ہے)۔ تیسرا مرحلہ...... پھر ہم نے اسے جمے ہوئے لہو کا لوتھڑا بنا دیا۔ (اس مرحلہ کو بھی سائنس دان مانتے ہیں)۔ چوتھا مرحلہ...... گوشت کی بوٹی، جو کسی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ جن میں بعض مکمل اور بعض ادھوری رہ جاتی ہیں تا کہ ہم تمہارے سامنے اپنی قدرت ظاہر کریں۔ اور ہم (اس نطفہ کو) ماں کے رحم میں مقررہ مدت تک ٹھہراتے ہیں، جسے چاہتے ہیں...... پھر ہم تمہیں رحم مادر سے نکالتے ہیں، "بچہ" کی صورت تا کہ تم بھری جوانی تک پہنچ جاؤ۔ اور بعضے تم میں سے ایسے ہی ہیں جو جوانی سے پہلے مر جاتے ہیں۔ اور بعضوں کو ہم بہت بڑھاپے تک کی عمر تک پہنچا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تجربوں سے آشنا ہو کر پھر بھول جاتا ہے، کھانے کی لذت بھول جاتا ہے، صحت کی لذت بھول جاتا ہے، حسین لمحات کی یادیں بھول جاتا ہے۔ (کیا یہ ہماری قدرت کی دلیل نہیں، کیا اسے کوئی جھٹلا سکتا ہے)؟

اور سنو لوگو! دیکھتے ہو زمین خشک پڑی ہے پھر جب ہم بارش برساتے ہیں تو یہ زمین ابھرتی ہے، پھولتی ہے اور ہر طرح کی خوش رنگ پر رونق نباتات اگاتی ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ہستی کامل کا مظہر ہے دلیل ہے ثبوت ہے۔ لوگو! یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگی دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور موت دینے کی قدرت بھی۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ تمام قدرتوں کے مالک ہیں۔ ان دلائل کی روشنی میں ثابت ہوا کہ قیامت آنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ قبروں سے مردوں کو زندہ کر کے اٹھائیں گے)۔

ان دلائل کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کائنات کی ترتیب و تدوین، تصنیف و تخلیق کے زمانے سے مطلع کیا ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ○ (ق:۳۸)

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو (مخلوقات) ان میں ہے سب کو چھ دن میں بنا دیا اور ہم کو ذرا بھی تکان نہیں ہوا۔

اس خطاب میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے دنوں کی گنتی کی بنیاد رکھی، ہمیں وقت سے آشنا کیا۔ ذہن کو ریاضی سے متعارف کرایا۔ اور انسان کی اوقات بھی بتا دی کہ تم تو تھک جاتے ہو مگر ہم ان کمزوریوں سے پاک ہیں۔ اب اور سنیے: ۔

وَ هُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ؕ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ○

(الفرقان: ۵۳_۵۴)

ترجمہ اور وہی تو ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا۔ ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری چھاتی جلانے والا اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔ اور وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا۔ پھر اس کو صاحب نسب اور صاحب قرابت امادی بنایا۔ اور تمہارا پروردگار (ہر طرح کی) قدرت رکھتا ہے۔

اب آپ ہی غور فرمائیے کہ انسان کو نسب و خاندان کے حوالے سے کتنی نفسیاتی قوتیں میسر آتی ہیں۔ گو آپ نے جدید علوم سے مرعوب ہونا سیکھ لیا ہے۔ انسانو! اللہ تعالیٰ کی ان دلیلوں پہ غور کرو۔ خارجی دلائل کے علاوہ اس کی اپنی واردات جن سے ہر انسان دوچار ہوتا ہے۔

اب اللہ جل شانہٗ انسان کو اس کتابِ کائنات کے مخصوص ابواب کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَہٗ ثُمَّ یَجْعَلُہٗ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِہٖ ج وَ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَصْرِفُہٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ ط یَکَادُ سَنَا بَرْقِہٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ O ط یُقَلِّبُ اللّٰہُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ O وَ اللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِہٖ ج وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ج وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰۤی اَرْبَعٍ ط یَخْلُقُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ O (النور ۴۳_۴۵)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا ہی بادلوں کو چلاتا ہے پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے۔ پھر ان کو تہ بتہ کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل (کر برس) رہا ہے۔ اور آسمان میں جو (اولوں کے) پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا رکھتا ہے۔ اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو (خیرہ کر کے بینائی کو) اچکے لئے جاتی ہے۔ خدا ہی رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے۔ اہلِ بصارت کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے۔ اور خدا ہی نے ہر چلنے پھرنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ تو ان میں سے بعضے ایسے ہیں کہ پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

کون ہے اس دنیا میں جس نے یہ منظر اپنی زندگی میں نہ دیکھا ہو؟ وہ کون سا علم ہے جو بادلوں کے حوالے سے بارش اور اس کے بارے میں اللہ جل شانہٗ کے بیان کئے ہوئے مراحل کی تردید کرتا ہو؟

غور فرمائیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ان بادلوں میں چمکنے والی بجلی کو دیکھو، کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ وہ تمہاری بینائی مفلوج کر دے؟ (یقیناً ایسا ہی محسوس ہوتا ہے)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ اپنی نعمت کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

اللہ ہی کی شانِ قدرت ہے جو رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے۔ (غور کیجئے اگر دن رات میں نہ بدلے اور رات دن میں نہ بدلے تو آپ کی ذہنی کیفیت کتنی اذیت ناک ہو؟) اس کے بعد ایک اور مظہر قدرت پہ تفکر کی دعوت دی۔ ان تمام دلائل میں ان کے لئے اثرانگیزی ہے جو صاحب بصیرت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جانور کو پانی سے پیدا

کیا ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں اور ان میں سے بعض دونوں پاؤں پر اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ (یہی نہیں بلکہ) اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، جیسا چاہتا ہے بناتا ہے۔ (غرض یہ کہ اس کے علاوہ بھی بہت سی اقسام ہیں اور آخری فیصلہ کن بات یہ ہے) کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قادر ہے۔

تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کتاب کائنات میں موجود نظر آنے والے دلائل کے ساتھ انسان کو اپنی ذات کے اعتراف اور اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

مشیت الٰہیہ

اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کی نوعیت کے چند پہلو انسان کی عقل و دانش کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ○(یٰسین ۸۲)

ترجمہ: اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْیَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا فِیْهَا فَحَقَّ عَلَیْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِیْرًا ○(الاسراء ۱۶)

ترجمہ: اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (فواحش پر) مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے پھر اس پر (عذاب کا) حکم ثابت ہو گیا۔ اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑے خطرے، بہت بڑی ہلاکت اور اپنے جلال کے اسباب کی نشاندہی کی ہے۔ فرمایا:

(ہم جب کسی بستی کو برباد کرنا چاہتے ہیں (بستی والوں کے اعمال کی بنا پر تو واضح نشانی یہ ہے کہ ہم) اس بستی کے دولت مندوں کی بے ہودگیوں کو عام کر دیتے ہیں۔ (یعنی ان میں تمام خرابیوں کا "Trend" عام ہو جاتا ہے۔ عیاشی عام ہو جاتی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں ان کا فساد عام ہو جاتا ہے۔ تب اس بستی کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد اپنے ارادہ کی ایک نوعیت اور ملاحظہ ہو:

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ یَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ یَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖۗ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا○ؕ (الکہف ۸۲)

ترجمہ: تو تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائیں (پھر) اپنا خزانہ نکالیں۔ یہ تمہارے پروردگار کی مہربانی ہے اور یہ کام میں نے اپنی طرف سے نہیں کیے۔ یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر تم صبر نہ کر سکے۔

یہ مکالمہ موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے درمیان ہے۔ اس میں اللہ جل شانہٗ اپنے ارادے کو دوسروں سے کس طرح استعمال فرماتے ہیں اس کی مثال پیش کی ہے۔

اس آیہ کریمہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہمارے دلوں پر ہمارے دوستوں اور دشمنوں کے دلوں پر چلتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اپنے حکم کے لئے اس دل کا انتخاب ہو سکے۔

اس کے بعد ارادہ کی ایک اور مثال بیان فرمائی:

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۝ (النساء، ۲۶۔۲۸)

ترجمہ: خدا چاہتا ہے کہ (اپنی آیتیں) تم سے کھول کھول کر بیان فرمائے اور تم کو اگلے لوگوں کے طریقے بتائے۔ اور تم پر مہربانی کرے۔ اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ اور خدا تو چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے۔ اور جو لوگ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے رستے سے بھٹک کر دور جا پڑو۔ خدا چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان (طبعاً) کمزور پیدا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنی محبت اور رحمت کا اس کے ارادوں میں کتنا عمل دخل ہوتا ہے اس کا اظہار فرمایا ہے۔ اب ایک اور صورت یہ بھی ہے جس کا اظہار اللہ جل شانہٗ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۝ ۧ (التکویر ۲۹)

ترجمہ: اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے۔

اس آیہ کریمہ میں انسان کو پھر اپنے قریب بلانے اور اپنے سے تعلق جوڑنے کی ترغیب دی ہے۔ اگر تم اپنی چاہتوں کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہو، اپنی چاہتوں کا رخ صحیح سمت رکھنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی چاہت کا سہارا مانگ لو۔

اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی نوعیتیں آپ کی نظر سے گزر چکیں اب اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے حوالہ سے آپ کو کیسی تعلیم دی ہے، اس کے حوالے سے چند آیات پیش خدمت ہیں:

علم الٰہی

اللہ تعالیٰ اپنے علم کی وسعتوں اور حدود کی وضاحت ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ۝ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَ هُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ۝ (سبا،۱۔۲)

ترجمہ: سب تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے (جو سب چیزوں کا مالک ہے (یعنی) وہ کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور آخرت میں بھی اسی کی تعریف ہے۔ اور وہ حکمت والا (اور) خبردار ہے۔ جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو اس میں سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس پر چڑھتا ہے سب اس کو معلوم ہے۔ اور وہ مہربان (اور) بخشنے والا ہے۔

انسان (حمد و ثنا) یعنی جتنی تعریف کر سکتا ہے اس سے بھی بہت زیادہ حمد و ثنا کی حق دار صرف اللہ جل شانہٗ کی ذات ہے۔ انسان کیا، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لئے تمام تعریف ہے اور وہ حکمت والا بھی ہے اور ہر بات سے آگاہ بھی۔

اور وہ اللہ تعالیٰ (سائنس دان تو اب جاننے لگے، اللہ تعالیٰ تو ابتدا سے اس کائنات کے

حوالے سے جانتا ہے) کہ زمین میں سورج کے اثرات کیسے داخل ہوتے ہیں) اور زمین سے کتنی گیس اور کیا کچھ نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے جو کچھ اترتا ہے۔ روشنی، برقی لہریں اور جن کی تفصیل کی خبر انسان کو دی گئی ہے) ان سب کا علم رکھتے ہیں، لیکن ان تمام صفتوں کے باوجود (وہ تمہیں مرعوب کرنے کے بجائے انسان سے محبت کا اظہار فرماتے ہیں) وہ بڑا ہی مہربان اور بخشنے والا ہے۔

یہ وہ دلائل ہیں جن کی تصدیق سائنس دان کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک گروہ اس سب سے بڑی حقیقت خالق کائنات کی ذات کا منکر بھی ہے۔ اس میں دلائل کا قصور ہے یا ذہنی کج روی؟ فیصلہ آپ کیجئے۔

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (التغابن ۴)

ترجمہ: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب جانتا ہے اور جو کچھ تم چھپ کر کرتے ہو اور جو کھلم کھلا کرتے ہو اس سے بھی آگاہ ہے۔ اور خدا دل کے بھیدوں سے واقف ہے۔

یہی نہیں بلکہ انسان اپنے سینوں میں جو سینے اور چھپائے ہوئے ہیں ان کا بھی اچھی طرح علم رکھتا ہے۔

اب دیکھیے، حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرنے والے اللہ تعالیٰ کے علم کے بارہ میں یوں کہتے ہیں

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ (لقمان:۱۶)

ترجمہ: (لقمان نے یہ بھی کہا کہ) بیٹا اگر کوئی عمل (بالفرض) رائی کے دانے کے برابر بھی (چھوٹا) ہو اور ہو بھی کسی پتھر کے اندر یا آسمانوں میں (مخفی ہو) یا زمین میں خدا اس کو قیامت کے دن لا موجود کرے گا۔ کچھ شک نہیں کہ خدا باریک بین (اور) خبردار ہے۔

اب اللہ تعالیٰ انسان کی ان نفسیاتی خرابیوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝ (الاعراف: ۸۸-۸۹)

ترجمہ: تو ان کی قوم میں جو لوگ سردار اور بڑے آدمی تھے وہ کہنے لگے کہ شعیب (یا تو) ہم تم کو اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنے شہر سے نکال دیں گے۔ یا تم ہمارے مذہب میں آ جاؤ۔ انہوں نے کہا خواہ ہم (تمہارے دین سے) بیزار ہی ہوں (تو بھی)۔ اگر ہم اس کے بعد کہ خدا ہمیں اس سے نجات بخش چکا ہے تمہارے مذہب میں لوٹ جائیں تو بے شک ہم نے خدا پر جھوٹ (افتراء) باندھا اور ہمیں شایاں نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں۔ ہاں خدا جو ہمارا پروردگار ہے وہ چاہے تو (ہم مجبور ہیں) ہمارے پروردگار کا علم ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہمارا خدا ہی پر بھروسا ہے۔ اے پروردگار ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے

اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَ لَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَ لَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (المجادلہ:۷)

ترجمہ: کیا تم کو معلوم نہیں کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا کو سب معلوم ہے۔ (کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع اور) کانوں میں صلاح و مشورہ نہیں ہوتا مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور نہ کہیں پانچ کا مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں ہوں۔ پھر جو جو کام یہ کرتے رہے ہیں قیامت کے دن وہ (ایک ایک) ان کو بتائے گا۔ بے شک خدا ہر چیز سے واقف ہے۔

اس آیہ کریمہ میں اللہ جل شانہٗ نے اپنے علم اور اپنے ہر جگہ حاضر ناظر ہونے کی علامتی انداز میں انسان کو سمجھایا ہے۔

(کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمین میں موجود سب کا علم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر کہیں تین آدمی سرگوشی کر رہے ہیں تو چوتھی ہماری ذات ہے۔ اگر مشورہ کرنے والے پانچ ہیں تو چھٹی ہماری ذات ہے۔ اسی طرح اس سے کم یا زیادہ افراد کا تصور کر لو (ان کی رازداری اور سرگوشیاں تصور کر لو) سب میں ہم کو موجود پاؤ، وہ کہیں بھی ہوں۔ (آسمانوں کی بلندیوں میں، خلا میں، زمین کی تہ میں، غاروں میں، سمندروں کے نیچے، غرض جہاں کہیں بھی ہیں ہمیں اس کا علم ہے)۔ اس کی آنکھوں دیکھی گواہی ہم اس کے اعمال کی صورت قیامت کے دن اسے دکھا دیں گے۔ اسے ایک ایک کر کے بیان کریں گے۔ یاد رکھو، اللہ تمام اشیاء کا علم رکھتا ہے)۔

اس کے علاوہ دوسری جگہ رب ذوالجلال اپنا تعارف یوں فرماتے ہیں:

وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (یونس:۶۱)

ترجمہ: اور تم جس حال میں ہوتے ہو۔ یا قرآن میں سے کچھ پڑھتے ہو یا تم لوگ کوئی (اور) کام کرتے ہو۔ جب اس میں مصروف ہوتے ہو ہم تمہارے سامنے ہوتے ہیں اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے یا بڑی مگر کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی نگاہ اور علم کی گرفت کو واضح کرتے ہیں:

(آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جس حال میں بھی ہوں۔ منجملہ حالات کے تم قرآن مجید کی جہاں سے بھی تلاوت کر رہے ہو (اور اسی طرح اور تمام دنیا کے انسان جو بھی کام کر رہے ہوں، ہمیں سب کی خبر رہتی ہے، بلکہ تم اپنے کام کے آغاز سے ہی انتہا تک ہماری نگاہ میں رہتے ہو۔ (غرض تم جہاں بھی ہو جو کچھ بھی کر

رہے جو ہماری آنکھوں میں ہو) ہماری نگاہ سے کائنات کی ذرہ برابر چیز غائب نہیں رہتی چاہے وہ چھوٹی سی چھوٹی ہو۔ مطلب یہ کہ (الیکٹران ہو یا نیوٹران) سب ہماری نگاہ میں ہی نہیں بلکہ لوح میں تحریراً موجود ہیں)۔

حیات الٰہی

اللہ تعالیٰ اپنا تعارف اپنی لافانی حیات کے بارے میں یوں فرماتے ہیں

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ○ (البقرہ ۲۵۵)

ترجمہ: خدا (وہ معبود برحق ہے) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ ہمیشہ رہنے والا۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔

ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو یوں سمجھاتے ہیں:

الٓمّٓ ○ۚ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ○ؕ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ○ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۚؕ (آل عمران، ۱۔۴)

ترجمہ: الم۔ خدا (جو معبود برحق ہے) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں زندہ ہمیشہ رہنے والا۔ اس نے (اے محمدؐ) تم پر سچی کتاب نازل کی جو پہلی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل نازل کی۔ (یعنی) لوگوں کی ہدایت کے لئے (تورات اور انجیل اتاری) اور (پھر قرآن جو حق اور باطل کو) الگ الگ کر دینے والا ہے نازل کیا۔

الم (حروف تعلقات) اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور صرف ہی ہے جو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والی ہستی ہے اور اسی ذات لافانی نے سچائیوں سے بھرپور کتاب نازل کی۔ ایسی عظیم کتاب جو اس سے قبل کتابوں کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ ہمیں نے تورات اور انجیل اس سے پہلے نازل کی انسانوں کی راہنمائی کے لئے اور ان کے ساتھ فرقان بھی۔۔۔ (معجزات سے بھرپور کتاب)۔۔۔ اب اللہ تعالیٰ اپنے احسانات کی نشاندہی فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (غافر:۶۴۔۶۵)

ترجمہ: خدا ہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے ٹھیرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی اچھی بنائیں اور تمہیں پاکیزہ چیزیں کھانے کو دیں۔ یہی خدا تمہارا پروردگار ہے۔ پس پروردگار عالم بہت ہی بابرکت ہے۔ وہ زندہ ہے (جسے موت نہیں) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو اس کی عبادت کو خالص کر کر اسی کو پکارو۔ ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔

انسانو! میری پہچان ذہن نشین کر لو۔

(اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ٹھہرایا۔ آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورتوں کو بہترین صورت سے نوازا اور تمہیں پاکیزہ رزق دیئے۔ (کھاؤ ڈالو، گندگی ڈالو مگر اللہ جو غذا دیتے ہیں اس کو ایسا

گردپوش بنا دیتے ہیں کہ گندگی غذا کو چھو تک نہیں سکتی)۔۔۔ اور ہاں غور سے سن لو، انسانو یاد رکھو، انہیں صفات کا مالک تمہارا رب ہے۔ یعنی وہ جو تم کو پیدا کرتا، پھر بتدریج تمہاری نشوونما کا مختار ہے۔ کہو رب العالمین اللہ بڑی ہی برکتوں کا مالک ہے۔ انسان! اعتراف کرو اپنی یقین کو اس حقیقت سے مالا مال کر لو۔۔۔ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس کے سوا کوئی اللہ (معبود) نہیں۔ اسے خلوص نیت اور (پورے احترام، پورے یقین اور اعتماد کی آواز سے پکارو اور کہو کہ تمام خوبیاں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی سماعت و بصارت

اب آپ سے اللہ تعالیٰ قوت سماعت کے حوالے سے اپنی پہچان ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ O (المجادلہ:۱)

ترجمہ (اے پیغمبر) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث و جدال کرت ہے اور خدا سے شکایت (رنج و ملال) کرتی تھی خدا نے اس کی التجا سن لی اور خدا تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ خدا سنتا دیکھتا ہے۔

انسانو! یہ ہے اللہ جل شانہٗ کی شان سماعت و بصارت اور ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا:

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰیO ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰیO ؕ اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓیO ۙ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰیO ؕ اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰیO ؕ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰیO ؕ (العلق ۹۔۱۴)

ترجمہ. بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے (یعنی) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے۔ بھلا دیکھو تو اگر یہ راہ راست پر ہو یا پرہیزگاری کا حکم کرے (تو منع کرنا کیسا)۔ اور دیکھ تو اگر اس نے دین حق کو جھٹلایا اور اس سے منہ موڑا (تو کیا ہوا)۔ کیا اس کو معلوم نہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے۔

اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنی نگاہ کا تعارف فرماتے ہیں:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰیO ۚ ۖ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰیO قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰیO قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰیO (طٰہٰ: ۴۳۔۴۶)

ترجمہ: دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو رہا ہے اور اس سے نرمی سے بات کرنا شاید غور کرے یا ڈر جائے۔ دونوں کہنے لگے کہ ہمارے پروردگار ہمیں خوف ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرنے لگے یا زیادہ سرکش ہو جائے۔ (خدا نے) فرمایا کہ ڈرو مت میں تمہارے ساتھ ہوں (اور) سنتا اور دیکھتا ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے جواباً کہا:

اللہ جل شانہٗ ڈر لگتا ہے کہیں وہ ہم پر زیادتی نہ کرے یا اس سے بھی زیادہ حد سے بڑھ جائے۔ (تو اللہ جل شانہٗ نے فرمایا) ڈرو مت، ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہماری پہچان یہ ہے کہ ہم سب کچھ سنتے بھی ہیں اور دیکھتے بھی ہیں)۔

ایک اور وضاحت سنیے:

یعلمُ خائنۃَ الاعیُنِ و ما تخفی الصُّدُورُO و اللہ یقضی بالحقِّ ؕ و الذین یدعُونَ مِن دُونہ لا یقضُونَ بشیءٍ ؕ انَّ اللہ ھُو السَّمیعُ البصیرُO ؒ (غافر ۱۹۔۲۰)

ترجمہ وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو (باتیں) سینوں میں پوشیدہ ہیں (ان کو بھی) اور خدا سچائی کے ساتھ حکم فرماتا ہے اور جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی حکم نہیں دے سکتے۔ بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

انسانو! اپنے اللہ کے بارے میں جان لو اس کی ذات و صفات کو دل میں بٹھا لو۔۔۔ وہ اللہ جل شانہ۔۔ ایسی شاندار قدرت کا مالک ہے کہ وہ کسی ایک کی چوری کو بھی جانتا ہے۔ اور سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ درست فیصلہ کرتا ہے۔ حق کے فیصلے کرتا ہے۔ حاکم بااختیار ہے اور جنہیں بعض لوگ اپنا معبود بنا کر مشکل کشا سمجھ کر پکارتے ہیں انہیں تو کوئی فیصلہ کرنے کی قدرت ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی سب چیزوں کو دیکھتا اور باتوں کو سنتا ہے۔

لہٰذا۔۔۔ میرے دلائل کو ذہن میں رکھو۔

کلام الٰہی

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت کلام میں بیان فرمایا:

وَ کلّمَ اللہُ مُوسٰی تکلیمًاO ؏ (النساء ۱۶۴)

ترجمہ: اور موسیٰ سے تو خدا نے باتیں بھی کیں۔

اَفتطمَعُونَ اَن یُّؤمِنُوا لکُم وَ قد کانَ فریقٌ مِّنھُم یسمعُونَ کلامَ اللہ ثُمّ یُحرِّفُونَہٗ مِن ۢ بعدِ ما عقلُوہُ وَ ھُم یعلمُونَO (البقرہ ۷۵)

ترجمہ (مومنو) کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے (دین کے) قائل ہو جائیں گے (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے سمجھ لینے کے بعد اس کو جان بوجھ کر بدل دیتے رہے ہیں۔

مسلمانو! کیا تم یہودیوں سے یہ امید رکھتے کہ (یہ ان کا ذکر ہے جو صاحب علم ہیں) کہ وہ تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ پہ ایمان لے آئیں گے؟ (ہمارے رسول اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اطاعت قبول کریں گے) یہ تو وہ لوگ ہیں جن ہی سے بعض اکام ہی یہی تھا کہ وہ اللہ کا کلام سن کر اس کو بدل ڈالتے تھے۔ بدلنے سے پہلے وہ ان کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ حقیقت کو جانتے تھے۔ اس آیہ کریمہ میں اسلام دشمن پڑھے لکھے کس طرح اللہ کی آیات اور فرمان کے معانی بدل کر پیش کرتے ہیں ان کی نشاندہی کی ہے۔

و اِن اَحدٌ مِّنَ المُشرِکینَ استجارکَ فاَجِرہُ حتّٰی یسمعَ کلامَ اللہِ ثُمَّ اَبلِغہُ مأمنَہٗ ؕ (التوبہ ۶)

ترجمہ اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ کلام خدا سننے لگے پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو۔ اس لئے یہ لوگ بے خبر ہیں۔

اس کتاب کائنات کے تخلیق کار نے اپنے نام اور صفات کا مختلف انداز میں ذکر فرمایا۔۔۔ اور انسانی ذہن د

گمراہی سے بچنے، معبود سے قریب تر جانے کے لئے بے عیب یقین و ایمان کی نشاندہی فرمائی۔ اس کے علاوہ بھی اللہ جل شانہٗ نے قرآن حکیم میں اپنی ذات کا تعارف بہت سی آیات میں فرمایا۔ جن میں سے اکثر کا ذکر ہم نہیں کر پائے، مگر اسماء حسنیٰ سے متعلق چند آیات لیے جن میں اللہ جل شانہٗ نے اپنے اسماء کا ذکر یوں فرمایا ہے، وہ یہ ہیں:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ

ترجمہ (اللہ کی ذات وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ غیب کا علم جانتا ہے)۔

وَالشَّهَادَةِ ۚ (وہ ہر جگہ حاضر ناظر ہے)۔

هُوَ الرَّحْمٰنُ (وہ بے حد مہربان ہے)۔

الرَّحِیْمُ ○ (وہ بے حد رحم کرنے والا ہے)۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ (وہ اللہ وہ جس کے سوا کوئی اور "الہ" معبود نہیں۔ مگر صرف وہی ذات برحق ہے۔

اَلْمَلِكُ (وہ صاحب ملک ہے)۔

الْقُدُّوْسُ (وہ تمام نقائص سے پاک ہے)۔

السَّلٰمُ (وہ امن و سلامتی ہے)۔

الْمُؤْمِنُ (وہ سکون و اطمینان بخشنے والی ذات ہے)۔

الْمُهَیْمِنُ (وہ سچّا نگہبان ہے)۔

الْعَزِیْزُ (وہ پیارا بھی ہے اور سب پر غالب بھی ہے (اس کے غلبہ میں پیار ہے تباہی نہیں)۔

الْجَبَّارُ (وہ جبار ہے)۔

الْمُتَكَبِّرُ ؕ (اس کو ہی اپنی ذات پہ فخر کرنے کا حق ہے)۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ (اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے۔ مشرکوں کے الزامات سے پاک ہے)۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ (اللہ وہ ہے جو سب کا خالق ہے پیدا کرنے والا ہے)۔

الْبَارِئُ (اللہ وہ ہے جو اپنی مرضی اپنی پسند کی زندگی کو صورت دیتا ہے)۔

الْمُصَوِّرُ (اللہ وہ ہے جو بہترین نقش کار مصور ہے)۔

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ

ترجمہ۔ اس کے بڑے اچھے اچھے نام ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز اس کی تقدیس بیان کرتی ہے۔

وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ ع (الحشر ۲۲۔۲۴)۔

(اور وہ اللہ سب پر غالب ہے اور وہ سب سے بڑا (دانا اور حکیم ہے)۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ○ (الاعلیٰ: ۱)

(اپنے سب سے بلند رب کی تسبیح پڑھا کرو۔ کہیے: "سبحان رَبِّیَ الْاَعْلٰی"

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ○ ع (الواقعہ: ۹۶)

(اپنے عظیم رب کے نام کے اوصاف بار بار دہرایا کرو)۔

اللہ جل شانہٗ کے عظیم الصفات اسماء

اللہ جل شانہٗ کی صفات اور نام مختلف زاویوں سے قرآن حکیم میں جس طرح اللہ جل شانہٗ نے متعارف فرمائے، وہ آپ کی نظروں سے گزر چکے۔ اب ہم پھر ایک بار مذکورہ اساسی اصول کو دہرا دیں۔

آثار، علامات یا آیات، (Symbols) اپنے نام کی دلیل اور "نام" اپنی "صفات" کی دلیل۔۔۔ اور "صفات" اپنی ذات کی دلیل۔۔۔

آپ اللہ جل شانہٗ کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کی آنکھ میں اتنی تاب ہی نہیں۔ لہٰذا اللہ جل شانہٗ نے اپنی دلیل میں اپنی آیات کی طرف بار بار توجہ دلائی۔ جب آیات پہ تفکر و تدبر "Meditation" اور "Careful Thought" کو کام میں لاؤ گے تو تمہیں میرے نام کی صفات سے آگاہی ہو گی اور یہی آگاہی میری ذات کے حوالے سے میری الوہیت اور حاکمیت اعلیٰ "Divinity" اور "Ultimate Authority" کا یقین تمہیں ایمان کمل سے آشنا کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے سب سے زیادہ رازدان رحمت للعٰلمین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر مسلمان کو اس دولت کے حصول کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا:

عن ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم:

"اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَ تِسْعِیْنَ اِسْمًا مَنْ حَفِظَھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ"۔ (ترمذی، مسلم شریف، بخاری)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا:

اللہ جل شانہٗ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں، جس نے ان کو حفظ کر لیا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

یاد سے مراد، صرف طوطے کی طرح رٹنا نہیں بلکہ ان الفاظ کے اسماء و صفات سے عقل و شعور کو سیراب کرنا ہے۔ جب عقل و شعور سیراب ہو جائے گی تو اعمال بھی وہی سرزد ہوں گے جو اللہ جل شانہٗ اور رسول امن و سلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مسلمان سے مطلوب و مقصود ہیں۔ اور مسلمان اعمال صالحہ سے متصف ہو کر مومن کی صفات سے متصف ہوتا ہے اور یہی وہ صفات ہیں جو انسان کو اس دنیا میں باوقار اور آخرت کی دائمی زندگی میں وارثِ جنت بناتی ہیں۔ ان اسماء میں سب سے پہلا نام جسے اسم ذاتی کہا جاتا ہے وہ ہے: اللہ۔۔۔ جل شانہٗ، اللہ۔۔۔ کون؟

خود اللہ جل شانہٗ اپنی الکتاب مبین قرآن حکیم میں اس کا جواب کئی بار ان الفاظ میں دیتے ہیں:

ھواللہُ الَّذِیْ (اللہ وہ ہے) لاَ اِلٰہَ اِلاَّ ھُوَ۔ (کہ اس کی ہستی کے سوا کوئی اور 'اِلٰہ' نہیں)، یعنی معبود "Object of Worship" نہیں ہے، کائنات کی ہر مخلوق اس کی فرمانبردار ہے، انسان اور جنوں کو بھی صرف اسی کی عبادت کرنا چاہیئے۔

اس تعارف کے حوالے سے، معبود۔۔۔ اللہ جل شانہٗ کی ذات برتر، جس کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا۔۔۔ عبادت کیا ہے؟ اس کا مفہوم ہمیں علم شریعت کتاب و سنت کے حوالے سے ہی صحیح ملے گا۔ اس کی دلیل

یہ ہے کہ دنیا میں انسانی دماغوں سے جتنے علوم کے چشمے ابلے ہیں ان کے موجدوں یا انکشاف کرنے والوں نے اپنے مافی الضمیر کو سمجھانے کے لئے مخصوص اصطلاحات "Terms" یا علامات "Symbls" ایجاد کیں اور ان کے معانی و مطالب کا تعین بھی کیا۔ مثلاً کیمیا "Chemistry" میں جیسے کاربونا ئیٹریڈ + اور سلور کلورائیڈ کے لئے Ag C1+No No۔ ریاضی میں جمع کے (+) اور منفی کے لئے (-) ہے۔ اگر ہم ان کے معینہ مطالب سے ہٹ کر ان اصطلاحات و علامات کے معانی و مطالب کا تعین کرنے میں اپنی علمی یا عقلی خودسری استعمال کریں گے تو فکری گمراہی میں مبتلا ہو کر رہ جائیں گے۔

تجربے اور مشاہدے کی رو سے ثابت شدہ اس اصول کے تحت ہمیں دین الٰہی، اسلام کی اصطلاحات اور علامات کا مفہوم و مطلب وہی لینا ہوگا جو دین کے معلّم محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے معین فرمایا۔ آیئے اس دین قیم کے محققین سے اس کا مفہوم سمجھیں۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں۔

عِبَادَةٌ۔ مصدر ہے عبد، عبید، عباد، عابد اور معبود سب اسی سے مستخرج ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے عبادت کی شرعی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ وفی الشرع عبادة عمایجمعُ کمال المحبة والخضوع والخوف۔ (شرع میں عبادت وہ ہے جس میں عاجزی، محبت اور خوف شامل ہو)۔ عبادت کے معنی ابن کثیر اپنی کتاب "نہایہ" میں یوں بیان کرتے ہیں۔ العبادة فی اللغة الطاعة مع الخضوع۔ (یعنی لغت میں عبادت اس اطاعت کا نام ہے جو انتہائی عاجزی کے ساتھ کی جائے)۔ علامہ علاء الدین علی بن محمد خازن بغدادی اپنی تفسیر "لباب التاویل" میں یوں لکھتے ہیں۔ عبادت اس فعل کا نام ہے جس کے ذریعہ تعظیم الٰہی کے لئے فرض کی ادائیگی عمل میں آتی ہو۔ علامہ مخدوم علی مہائمی اپنی تفسیر تبصیر الرحمن و تیسیر المنان میں لکھتے ہیں۔ العبادةُ تذلّلٌ للغیر عن اختیار لغایة التعظیم۔ یعنی عبادت کے معنی اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے (یعنی بجبر و اکراہ نہیں) بلکہ اپنی خوشی سے انتہائی عاجزی کے ساتھ تعظیم بجا لانا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ (کسی کی عبادت میرے سوا نہ کرو)۔ اُعْبُدُوْا رَبَّکُمُ (اپنے پروردگار کی عبادت کرو)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: کُلّ مَاوَرَدَ فی القرآن مِنَ الْعِبَادَةِ معناہُ التوحید۔ (یعنی قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی عبادت کا ذکر آیا ہے وہ اللہ جل شانہٗ کی توحید ہے)۔

عبد—— کے معنی بندے کے ہیں۔ قاموس نے اس کے معنی قوسین میں انسان کے بھی لکھے ہیں۔ جیسے اردو میں آدمی اور انسان ایک شخصیت کے دو نام ہیں۔ عربی میں عبد کے معنی غلام کے بھی ہوتے ہیں لیکن اللہ جل شانہٗ ہر آدم اور حوا کی اولاد کو عبد کے ہی نام سے پکارتے ہیں، جیسے اس آیہ کریمہ میں ارشاد ہے:

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا○

ترجمہ۔ تمام شخص جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدا روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔

(زمین و آسمان کی ہر شئے رحمن کے پاس بندہ بن کر آنے والی ہے)۔ عام طور پہ "عبد" کو دو قسموں میں بانٹا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ایک بندہ وہ ہے جو "عبداللہ" یعنی اللہ کا بندہ ہے۔ اطاعت گذار ہے، دوسرا عبدالدنیا۔ دوسرا دنیا کا بندہ ہے جس کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔

"تعس عبدالرھم تعس" (برباد ہوا درہم و دینار کا بندہ برباد ہوا)۔ اللہ معاف کرے۔ یعنی اسماء حسنیٰ تو ان کے لئے ہیں جو اس ذات وحدہ لاشریک کو اللہ مانتے ہیں۔۔۔ وہ اللہ جو اپنے ذاتی نام اللہ کے بعد اپنا نام اللہ الرّحمٰن متعارف کرواتے ہیں۔ یعنی وہ اللہ جس کی بخشش بے حد و حساب ہے۔ ایسی بخشش و کرم کرنے والا کہ کافر ہو، ملحد ہو مرتد ہو، اس کی رحمت اسی طرح ہوتی جس طرح مسلمان پر ہوتی ہے۔

اس کے بعد۔۔۔ تیسرا نام ہے اللہ الرّحیم۔۔۔ (وہ اللہ جو بے حد رحم کرنے والا ہے)۔ غور کیجئے ساری کائنات کا خالق اپنا تعارف اپنی بخشش و محبت، رحمت و محبت کی صفت سے کروا رہے ہیں۔ چھوٹا حکمران یا دنیا کا حکمران چھوٹا ہو یا بڑا اپنا تعارف اپنی طاقت سے کرواتا ہے، فوجوں کی قوت کے حوالے سے، اپنی مادی طاقت کے حوالے سے کرواتا ہے۔ مگر سچا اور عظیم سے عظیم بادشاہ۔۔۔ اپنے ان دونوں ناموں کے بعد پھر تیسرا نام اللہ الملکُ۔۔۔ (اللہ بادشاہ ہے)۔۔۔ اپنی بادشاہی کا ذکر کرتے ہوئے مسلمان اور مومن کو یقین ہونا چاہئے کہ وہ بادشاہ کا بندہ ہے۔ سب سے بڑے بادشاہ کا۔ دنیا کے کسی بادشاہ سے مرعوب نہ ہو، تمہارا معبود۔۔۔ بادشاہ ہے۔

اَللّٰہُ الْقُدُّوْسُ: (اللہ بہت ہی پاک ذات ہے)۔

اَللّٰہُ السَّلَامُ: (اللہ تعالیٰ ہر آفت اور ہر عیب سے مبرا ہے)۔

اَللّٰہُ الْمُؤْمِنُ: (وہ اللہ جو اپنے بندوں اور اپنے وعدوں کی تصدیق کرتا ہے)۔ اگر ایمان سے مشتق ہے تو یہی معنی ہوں گے اور اگر امان سے مشتق ہے تو قیامت کے دن اپنے بندوں کو عذاب سے امان دینے والا۔

اَللّٰہُ الْمُھَیْمِنُ: (اللہ ہی سچا نگہبان ہے)۔

اَللّٰہُ الْعَزِیْزُ: (اللہ ہی غالب ہے)۔

اَللّٰہُ الْجَبَّارُ: (اللہ اپنے بندوں پر جبر و قہر سے حکم نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہے)۔

اَللّٰہُ الْمُتَکَبِّرُ: (اللہ جل شانہٗ تکبر کرنے والوں سے تکبر کرتا ہے)۔ بعض نے اس کے معنی متکبر نہیں بلکہ کبریا سے مشتق کیا ہے اور اس کے معنی بے پناہ عظمت کا مالک لکھا ہے۔

اَللّٰہُ الْخَالِقُ: (اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے)۔

اَللّٰہُ الْبَارِئُ: (اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے مخلوقات کو بغیر کسی نمونہ کے پیدا کیا)۔

اَللّٰہُ الْغَفَّارُ: (اللہ ہی اپنے بندوں کے گناہ بار بار بخشتے ہیں)۔

اَللّٰہُ الْمُصَوِّرُ: (اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے اپنی تمام مخلوقات کے خدوخال کی تصویر بنائی، مختلف شکلیں بنائیں۔

اَللّٰہُ الْقَھَّارُ: (اللہ ہی کی ذات وہ زبردست غالب ہے کہ اس کے سامنے سب پست ہیں)۔

اَللّٰہُ الْوَھَّابُ: (اللہ ہی انسان کو پیدائشی بخششوں سے نوازتا ہے۔ یعنی بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کے دودھ پینے کی سوجھ بوجھ دیتا ہے، انداز دیتا ہے)۔

اَللّٰہُ الرَّزَّاقُ: (اللہ ہی کی ذات سب کو رزق دیتی ہے)۔

اللهُ الفتّاحُ (اللہ ہی اپنے بندوں پر رزق اور رحمت کے دروازے کھولتا ہے)۔

اللهُ العلیمُ (اللہ بہت دانا اور خوب جاننے والا ہے یعنی تمام علم رکھنے والوں سے زیادہ علم کا مالک ہے)۔

اللهُ القابضُ (اللہ ہی اپنی حکمت سے بندوں کے رزق کے ذرائع بند کر دیتا ہے)۔

اللهُ الباسطُ (اور اللہ ہی بندوں کے رزق میں وسعتیں پیدا کرتا ہے)۔

اللهُ الخافضُ (اللہ تعالیٰ ہی مغرور اور متکبر لوگوں کے غرور و تکبر کو توڑ دیتا ہے)۔

اللهُ الرّافعُ (اللہ ہی پست لوگوں کو بلند کرتا ہے۔ تمام لوگوں کے نام کو بلند کرتا ہے)۔

اللهُ المعزُّ (اللہ ہی عزت عطا کرنے والا ہے)۔

اللهُ المذلُّ (اللہ ہی عزت پانے کے بعد اپنی اوقات بھولنے والوں کو ذلیل بھی کر سکتا ہے)۔

اللهُ السّمیعُ (اللہ تعالیٰ ہی سب کی سب جگہ سننے والی ذات ہے)۔

اللهُ البصیرُ (اللہ تعالیٰ ہی ہر جگہ ہر لمحہ ہر ایک کو دیکھنے والے ہیں)۔

اللهُ الحَکَمُ (اللہ ہی حقیقی حاکم ہے)۔

اللهُ العدلُ (اللہ تعالیٰ ہی کی ذات تمام کی تمام عدل ہے)۔

اللهُ اللطیفُ (اللہ ہی کی ذات بندوں کی ضرورتوں کو بڑی نرمی اور مہربانی سے پورا کرتا ہے۔ بعض نے اس کا ترجمہ یوں بھی کیا ہے کہ اتنی لطیف تر ذات کہ اس کی کیفیت کا انسان ادراک نہ کر سکے)۔

اللهُ الخبیرُ (اللہ کی ذات ہر بات سے قبل از وقت آگاہ ہے)۔

اللهُ الحلیمُ (اللہ بڑا ہی بردبار اور تحمل کرنے والا ہے)۔

اللهُ العظیمُ (اللہ بڑی ہی عظمتوں کا مالک ہے)۔

اللهُ الغفورُ (اللہ ہی انسانوں کے گناہوں کو ڈھانپنے والا ہے)۔

اللهُ الشّکورُ (اللہ ہی اپنے بندوں کو ان کے اچھے افعال کا ثواب دیتا ہے اور حوصلہ افزا اعتراف فرماتا ہے)۔

اللهُ العلیُّ (اللہ تعالیٰ مرتبہ کے لحاظ سے بہت ہی بلند مرتبہ ہے)۔

اللهُ الکبیرُ (اللہ کی ذات بڑے ہی جلال و شان کی مالک ہے)۔

اللهُ الحفیظُ (اللہ ہی بہترین حفاظت کرنے والا ہے)۔

اللهُ المقیتُ (وہی اللہ تمام انسانوں کو قوت عطا فرماتا ہے)۔

اللهُ الحسیبُ (اللہ جل شانہٗ ہی حساب لینے والا ہے)۔

اللهُ الرّقیبُ (اللہ ہی نگہبان ہے)۔

اللهُ الجلیلُ (اللہ ہی سب سے زیادہ بزرگی کا مالک ہے، مرتبہ کا مالک ہے، وقار کا مالک ہے، رعب و

دبدبہ کا مالک ہے)۔

اَللّٰہُ الْکَرِیْمُ: (اللہ ہی سب سے زیادہ کرم کرنے والا ہے)۔

اَللّٰہُ الْمُجِیْبُ: (اللہ ہی زیاد کرنے والوں کی دادرسی کرنے والا دعائیں مانگنے والوں کی دعائیں قبول کرنے والا ہے)۔

اَللّٰہُ الْوَاسِعُ: (اللہ تعالیٰ ہی بڑی وسعتوں کا مالک ہے)۔

اَللّٰہُ الْحَکِیْمُ: ۔ (اللہ تعالیٰ سب سے دانا اور ہر کام پر حکم میں مقصد کا مناسب اور درست مقصد رکھنے والا ہے)۔

اَللّٰہُ الْوَدُوْدُ: (اللہ تعالیٰ بہترین دوست نواز، دوست رکھنے والا ہے)۔

اَللّٰہُ الْمَجِیْدُ: (اللہ تعالیٰ ہی اپنے مقام و مرتبہ میں سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ یعنی اس کی کرسی بے حد و حساب مضبوط ہے)۔

اَللّٰہُ الْبَاعِثُ: (اللہ تعالیٰ ہی ہر واقعہ اور ہر حالت کو سبب سے منسلک کرنے والے ہیں۔ سب کو موت کے بعد اٹھانے والے ہیں)۔

اَللّٰہُ الشَّہِیْدُ: (وہ تمام اشیاء عالم کا مشاہدہ کر رہا ہے)۔

اَللّٰہُ الْحَقُّ: ۔ اللہ تعالیٰ ہی محقق ہے)۔

اَللّٰہُ الْوَکِیْلُ: (اللہ ہی کی ذات بہترین کارساز ہے)۔

اَللّٰہُ الْقَوِیُّ: (اللہ جل شانہٗ سب سے زیادہ قدرت کا مالک ہے، قوت کا مالک ہے)۔

اَللّٰہُ الْمَتِیْنُ: (اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس کو اپنے کاموں میں دقت پیش نہیں آتی)۔

اَللّٰہُ الْوَلِیُّ: (اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ناصر و مددگار ہے)۔

اَللّٰہُ الْحَمِیْدُ: (اللہ جل شانہٗ تمام تعریفوں کا مستحق ہے)۔

اَللّٰہُ الْمُحْصِی: (اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں سب کائنات کو گھیرے میں لے رکھا ہے)۔

اَللّٰہُ الْمُبْدِئُ: (اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس جس نے اپنی پسند سے ہر چیز کی زندگی کو ابتداء دی)۔

اَللّٰہُ الْمُعِیْدُ: (اور اللہ ہی کی ذات کو اسے موت کے بعد اپنی طرف پلٹانے کی قدرت حاصل ہے)۔

اَللّٰہُ الْمُحْیِی: (اللہ ہی زندگی عطا کرتا ہے)۔

اَللّٰہُ الْمُمِیْتُ: (اللہ ہی زندگی کو موت میں بدلتا ہے)۔

اَللّٰہُ الْحَیُّ: (اللہ کی ذات بغیر کسی اعانت کے زندہ ہے اور زندگی بخش ہے)۔

اَللّٰہُ الْقَیُّوْمُ: (اللہ کی ذات کی حیات ہمیشہ لازوال ہے)۔

اَللّٰہُ الْوَاجِدُ: (اللہ ایسا غنی ہے جو کبھی محتاج نہیں ہوتا)۔

اَللّٰہُ الْمَاجِدُ: (اللہ ہی کی ذات بزرگی والی ہے خوش خلق ہے)۔

اَللّٰہُ الْوَاحِدُ: (اللہ کی ذات واحد ہے۔ ہمیشہ واحد)۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ: (اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے)۔

اَللّٰهُ القَادِرُ: (اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز پر قادر ہے)۔

اَللّٰهُ المُقْتَدِرُ (اللہ ہی کی ذات صاحب اقتدار ہے ہے، لازوال اقتدار کی مالک ہے)۔

اَللّٰهُ المُقَدِّمُ (اللہ ہی کی ذات سب سے پہلے ہے)۔

اَللّٰهُ المُؤَخِّرُ (اللہ ہی کی ذات آخر میں بھی ہیں)۔

اَللّٰهُ الآخِرُ (اللہ جل شانہٗ جہاں تک تم شمار کر سکو، اس کا آخر بھی اللہ ہی ہے، جہاں سب ختم ہو گا وہاں بھی اللہ ہی ہے)۔

اَللّٰهُ الظَّاهِرُ (اللہ ہی کی ذات کائنات کے ہر مظہر میں ہے، ہر خدوخال میں ہے)۔

اَللّٰهُ البَاطِنُ (اور اللہ ہی کی ذات اس کائنات کی حیات میں پوشیدہ ہے)۔

اَللّٰهُ الوَالِيْ (اللہ کی ذات ہی بہترین رکھوالا ہے)۔

اَللّٰهُ المُتَعَالِي (اس کی ذات انسان کی قدرت توصیف و ثنا سے بہت بلند صفات ہے)۔

اَللّٰهُ البَرُّ: (اللہ ہی اپنے لطف و کرم میں بے حد مہربان ہے)۔

اَللّٰهُ التَّوَّابُ (اللہ تبارک و تعالیٰ ہی گناہگاروں کی توبہ قبول کرنے والا ہے)۔

اَللّٰهُ المُنْتَقِمُ: (اللہ جل شانہٗ کی ذات اپنے مظلوم بندوں کا ظالموں سے انتقام لینے پہ قادر ہے)۔

اَللّٰهُ العَفُوُّ (وہی اللہ گناہوں پہ درگذر کرنے والا ہے)۔

اَللّٰهُ الرَّؤُفُ: (اللہ تعالیٰ ہی بے حد مہربان ہے)۔

اَللّٰهُ مَالِكُ المُلْكِ: (اللہ تعالیٰ ہی ملک کا مالک ہے)۔

ذُوالجَلَالِ وَالاِكْرَامِ: (اللہ تعالیٰ ہی صاحب جلال و اکرام ہے)۔

اَللّٰهُ المُقْسِطُ: (اللہ تعالیٰ ہی منصف حقیقی ہے)۔

اَللّٰهُ الجَامِعُ (اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کو جمع کرنے والا ہے)۔

اَللّٰهُ الغَنِيُّ (اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ بے نیاز ہے)۔

اَللّٰهُ المُغْنِيْ (اللہ تعالیٰ ہی غنا اور تونگری عطا کرنے والا ہے)۔

اَللّٰهُ المَانِعُ (اللہ تعالیٰ ہی کسی کو تکلیف پہنچنے سے روکنے والے ہیں)۔

اَللّٰهُ الضَّارُّ (اللہ تعالیٰ ہی جسے نقصان پہنچانا چاہیں اسے نقصان پہنچانے والے ہیں)۔

اَللّٰهُ النَّافِعُ (اللہ تعالیٰ ہی جسے نفع پہنچانا چاہے اسے نفع پہنچانے والا ہے)۔

اَللّٰهُ النُّوْرُ (اللہ تعالیٰ روشنی ہی روشنی ہیں نور ہی نور ہیں)۔

اَللّٰهُ الهَادِيُ (اللہ تعالیٰ ہی راہنما ہیں)۔

اَللّٰهُ البَدِيْعُ (اللہ تعالیٰ ہی فوراً قابل حیرت اشیاء کو پیدا کرنے والا واقعات کو رونما کرنے والا ہے)۔

اَللّٰهُ الوَارِثُ: (اللہ ہی سب کا وارث ہے)۔

اللہ الرَّشِیدُ (اللہ تعالیٰ ہی مخلوق کو نیک کام سمجھاتا ہے)۔

اللہ الصَّبُورُ (اللہ تعالیٰ ہی بندوں کو سزا دینے میں صبر کرتا ہے جلدی نہیں کرتا)۔ اور چند نام بھی احادیث میں آئے ہیں۔ وہ یہ ہیں

اللہ الحَنَّانُ (بہت زیادہ مہربانی کرنے والا اللہ)۔

اللہ المَنَّانُ (بہت زیادہ احسان کرنے والا اللہ)۔

اللہ المُغِیثُ (اللہ ہی فریاد سننے والا ہے۔ ہمدرد، فریاد سننے والا اور ہر مدد بھی کرنے والا اللہ ہی ہے)۔

اللہ الکَفِیلُ (اللہ کفالت کرنے والا ہے)۔

اللہ و ذُوالطَّول: (اللہ ہی بخشش کرنے والا ہے)۔

اللہ ذُوالمعارج (بے حت بلندیوں کا مالک اللہ)۔

اللہ ذُوالفضل (سب سے زیادہ افضال و اکرام کا مالک اللہ)۔

اللہ الخلاق (سب کو پیدا کرنے والا، ہر لمحہ پیدا کرنے والا، حقیقی پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے)۔

ابو بکر بن عربی نے شرح ترمذی میں ان اسماء کے علاوہ علامہ شوکانی کی کتاب "تحفۃ الذاکرین" کا حوالہ دیتے ہوئے اللہ جل شانہٗ کے ہزار ناموں کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ اس سے بھی کئی زیادہ ہیں لیکن ہمارا مقصد یہ تھا کہ آپ اسماء پہ غور کریں اور دیکھیں کہ کس طرح ہر اسم اللہ جل شانہٗ کے کمال کی دلیل ہے۔ اس کے وجود کی دلیل ہے۔ صفت فعل اور صفت سلب بھی موجود ہے بلکہ تمام صفات کی "ہاں" نہیں تو بے جانہ ہو گا۔ لیکن ایک بار ہم پھر اس بات کو قارئین کے سامنے دہرائیں گے کہ خالق غیر مخلوق ہے، اللہ کی کوئی مثال نہیں۔

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۝(الشوریٰ ۱۰)

ترجمہ: اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سنتا دیکھتا ہے۔

اعتقاد کے حوالے سے بہت سے انسان اللہ جل شانہٗ کی صفات کو کسی کی مشابہت کا مقام دے کر گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس طرح یہود نے کہا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور خود ساتویں دن آرام کرنے لگا۔ یہی گمراہ عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ صاف فرماتے ہیں:

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۝(ق ۳۸)

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو (مخلوقات) ان میں ہے سب کو چھ دن میں بنا دیا اور ہم ذرا بھی تکان نہیں ہوا۔

انسانوں میں سے بعض انسان ہی کو لوگ اللہ جل شانہٗ کی صفات کا شریک بنا لیتے ہیں جن کی نشاندہی اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ۝ؕ(الزخرف ۱۵)

ترجمہ: اور انہوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لئے اولاد مقرر کی بے شک انسان صریح ناشکرا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات اور ذات کی پہچان میں خود قرآن حکیم میں اور اللہ کے صادق و امین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے جتنے اسماء نکلے ہیں وہی اس ذات وحدہٗ لاشریک کی ذات اور صفات کے صحیح ترجمان بھی ہیں اور دلیل وجود بھی۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ○ (الصافات ۱۵۹۔۱۶۰)

ترجمہ یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں، خدا اس سے پاک ہے۔ مگر خدا کے بندگان خالص (مبتلائے عذاب نہیں ہوں گے)۔

وہ درست ہے اور مخلص بندوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع یعنی سننے تو ہیں لیکن ان کا سننا بے مثال ہے۔ وہ دیکھتے تو ہیں مگر ان کی بصارت بے مثال ہے۔ اور قرآن میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وہ تمام خامیوں سے پاک ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ جل شانہٗ کی تعریف جن الفاظ میں فرمائی وہ کسی قسم کی کمی بیشی سے بالکل پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ موجود ہیں لیکن ان کے وجود کی کوئی مثال نہیں۔ وہ قریب ہیں بہت ہی قریب لیکن ان کی کوئی مثال نہیں۔ وہ زندگی دیتے ہیں مگر زندگی دینے کی کوئی مثال بنظر محسوس نہیں۔ اسی طرح اللہ جل شانہٗ اپنی ہر صفت میں بے مثال ہیں۔ جیسے کہ وہ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں

وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ○ (طٰہٰ:۱۱۰)

ترجمہ اور وہ (اپنے) علم سے خدا (کے علم) پر احاطہ نہیں کر سکتے۔

یہی اعتقاد صحابہ کرام رضی اللہ عنہما اجمعین کا بھی تھا۔

سلمان بن یسار نے دارمی کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک شخص مدینہ منورہ میں آیا اور اس نے قرآن مجید کی "متشابہات" (آیات) کے بارے میں اپنی تاویلات پیش کر دیں، اس کی خبر حضرت عمر فاروقؓ کو دی گئی۔ ملاقات پر حضرت عمر فاروقؓ کو پتہ چلا کہ یہ شخص لنگڑا ہے۔ اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: میرا نام عبیداللہ صبیغ ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس لنگڑے کو پکڑا اور اس کے سر پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا: مجھے اللہ کا بندہ عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کہتے ہیں۔ (عمر فاروقؓ کی نسبت اس لئے دی کہ وہ دین کے معاملہ میں سخت تھے)۔ اس شخص کے سر سے لہو بہنا شروع ہوا تو اس نے کہا: میرے دماغ میں جو فتور پیدا ہوا تھا، وہ نکل گیا۔۔۔ مطلب یہ کہ اس نے فوراً "متشابہات آیات" کی تاویلات میں اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے معاملے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے سے محفوظ رکھے۔

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اب ہم ایک اور اہم جستجو کے بارے میں قارئین کو اپنی معلومات کے مطابق بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کچھ اسم اعظم اور کچھ اسماء الحسنٰی کے بارے میں۔

اسماء الحسنٰی کے خواص و اسرار

ہمارے استاد مکرم حسن البناء فرمایا کرتے تھے۔ بعض لوگ اسماء حسنیٰ سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر بعض ان سے معجزہ چاہتے ہیں۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں کچھ ایسے خیال بھی رکھتے ہیں کہ اسماء حسنیٰ اور ان کو روزانہ پڑھنے والوں کے ہمزاد کے اعداد سے مطابقت ہو تو بہت فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کے سارے خیال

غلط ہیں۔ انہیں صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے اسماء حسنٰی کے معانی اور مطالب کو اپنے ایمان اور یقین میں سمو دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس سے روحانی ارتقاء بھی نصیب ہو گا اور خوشنودی اللہ جل شانہٗ کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پہ اعتماد اور یقین کا ثواب بھی حاصل ہو گا۔

اسم اعظم اور اللہ جل شانہٗ

ہر مسلمان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی دعا کی مقبولیت کے لئے اللہ جل شانہٗ کے اسم اعظم کا سہارا لے، لیکن اب تک اس کا علم کسی کو بھی نہیں ہو سکا۔ اللہ جل شانہٗ کو سب سے زیادہ قریب سے جاننے والے اللہ جل شانہٗ کے محبوب منتخب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلے میں جو فرمایا وہ آپ بھی پڑھ لیجئے:

عن بریدہ رضی اللہ عنہ قال. سمع النبیّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رجُلاً یدعو وَھُو یقولُ: اَللّٰھُمّ انی اَسالُک، بِاَنّی اَشھدانک انت اللہ لا الہ الا انت، الاحد الصمد، الذی لم یلد ولم یولد، ولم یکن لہ، کفوًا احد. قال . فقال والذی نفسی بیدہٖ لقد سال اللہ باسمہ الاعظم الذی اذ دعی بہ احیاب و اذا سئل بہ اعطی (رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی و ابن ماجہ و تال المنذری. قال شیخنا ابوالحسن المقدسی ھواسناد لا مطعن فیہ و لا علم انہٗ روی فی ھذالباب حدیث اجود اسنادمنہ).

(حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک آدمی کو دعا کرتے سنا جو کہہ رہا تھا: "اے اللہ میں آپ سے مانگتا ہوں، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ ہیں اور آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ کے سوا کوئی عبادت کا حقدار نہیں۔ اور تو ہی ایک ہے واحد ہے تنہا ہے، بے نیاز ہے او تیری ذات کو کسی نے نہ ہی جنا ہے اور نہ ہی تو نے کسی کو جنا ہے اور کسی کو تم سے برابری حاصل نہیں ہے"۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مجھے اس ذات اعلیٰ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے اسم اعظم کے حوالے سے دعا مانگی ہے۔ اور اس نام سے جس نے بھی دعا مانگی وہ لازماً قبول ہوتی ہے اور جو کوئی جو کچھ مانگتا ہے وہ اسے عطا کر دیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، سب کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے)۔

(ہمارے شیخ ابوالحسن مقدسی فرمایا کرتے تھے کہ مذکورہ کتب احادیث اور روایت میں کوئی شبہ نہیں اور ہمارے نزدیک اس راوی کی صحت بھی مستند ہے)۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اسم اعظم کے بارے میں ایک اور حدیث کا متن یہ ہے:

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ، قال دخل النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم المسجد و رجل قد صلی وھویدعو ویقول فی دعائہٖ اَللّٰھُمّ لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اَنْتَ، اَلْمَنَّانُ بَدِیعَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ، ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم. اتدرون بم دعا اللہ؟ دعا اللہ باسمہ الاعظم الذی اذ دعی بہ اجاب و اذسئل بہ اعطیٰ۔ (رواہٗ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)۔

(انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے اور

آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے نماز پڑھی اور دعا مانگی۔ اس کی دعا کے الفاظ یوں تھے:

"اے اللہ آپ کی ذات کے سوا کوئی بھی عبادت کا مستحق نہیں، آپ ہی احسان کرنے والے ہیں۔ آپ نے ہی آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ آپ بے حد جلال و اکرام کے مالک ہیں"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس شخص نے دعا میں کس کو وسیلہ بنایا؟ اس نے اسم اعظم کی وساطت سے دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ اس اسم اعظم کے نام سے جو دعا کرے اسے قبول فرماتے ہیں اور جو مانگے اسے عطا کرتے ہیں۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ کی روایت ہے)۔

عن اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال اسم اللہ الاعظم فی ھاتین الایتین والٰھکم الٰہ واحدٌ لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیمO (البقرہ: ۱۶۳) و فاتحہ الٰ عمران. الٓمّٓO اللّٰہ لا الٰہ الا ھو الحی القیومO رواہ احمد، داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔

(اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، اسم اعظم ان دو آیت میں ہے "تمہارا اللہ ایک ہی ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر وہ جو رحمٰن ہے اور رحیم ہے۔ (البقرہ ۱۶۳)

اور آل عمران کی ابتدا (الٓمّٓ اللہ) وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ حی و قیوم ہے۔

عن سعد بن مالک رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول. ھل ادلکم علیٰ اسم اللہ الاعظم الذی اذدعی بہ اجاب واذسئل بہ اعطیٰ، الدعوۃ التی دعابھا یونس، حیث نادی فی الظلمات الثلاث لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین. فقال رجل یا رسول اللہ ھل انت یونس خاصۃ ام للمومنین عامۃ؟ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "الاتسمع قول اللہ عز و جل، ونجیناہ من الغم و کذالک ننجی المؤمنینO(الانبیاء: ۸۸) (رواہ الحاکم)

سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

میں تمہیں بتاؤں "اسم اعظم" کیا ہے؟ اللہ جل شانہٗ اس نام کی وساطت سے دعا قبول فرماتے ہیں اور جب سوال کیا جائے تو اللہ تعالیٰ عطا کرتے ہیں اور وہ ذریعہ، وہ دعا ہے جو یونس علیہ السلام نے اپنایا اور جو انہوں نے تین اندھیرے طبقوں میں پکارا۔ اے اللہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں میں تسلیم کرتا ہوں، آپ کی ذات پاک ہے اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

تو ایک صحابیؓ نے پوچھا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! کیا یہ صرف یونس علیہ السلام کے لئے مخصوص تھی یا عام مومنین کے لئے بھی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جواب میں فرمایا: تم نے سنا نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "تو ہم نے ان کی دعا قبول کر لی اور ان کو غم سے نجات بخشی اور ایمان والوں کو ہم اسی طرح نجات دیا کرتے ہیں"۔ (حاکم کی روایت ہے)۔

دیکھا آپ نے احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں اسم اعظم کا تعین ہمیں نہیں ملتا بلکہ اختلاف الفاظ بھی ہے اور روایت بھی۔ صاف اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ آپ اسماء الحسنیٰ جتنے بھی یاد کر سکیں ان کو پڑھئے اور دعا مانگئے۔ اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمائیں گے۔ بعض لوگ جو اپنے آپ کو صاحب اسرار ثابت کرنے کی کوشش

کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ قرآن حکیم میں:

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ (النمل ۴۰)

ترجمہ۔ ایک شخص جس کو کتاب (الٰہی) کا علم تھا کہنے لگا کہ میں آپ کی آنکھ کے جھپکنے سے پہلے پہلے لے آپ کے پاس حاضر کئے دیتا ہوں۔

یہ اسم اعظم ہے اور بعض کہتے ہیں "حیٌ و قیومٌ" اسم اعظم ہے۔ بعض کا خیال ہے اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اسم اعظم ہے اور بعض کے نزدیک سریانی زبان کے ایک لفظ (اہیا۔ شراہیا) اسم اعظم ہے لیکن ان کی صداقت کا کوئی ثبوت ہمیں نہیں ملا۔ ہمارا خیال ہے کہ دعائے ماثورہ بہتر ہیں۔

اس کے بعد ہم اپنے اختتامیہ پہ پھر عرض کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے عرفان کے لئے اس کے اسماء الحسنٰی کے معانی پر غور کیجئے۔ حضوری قلب اور عاجزی کے ساتھ انہیں بار بار تلاوت کرنے اور ان کی وساطت سے دعا مانگیے اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔ اور آپ کو غور و تدبر سے اللہ جل شانہٗ کی صفات ذاتی صفات فعلی اور صفات سلبی کا ادراک ہونے لگے گا اور انسان جب یہاں پہنچ جائے تو اس کی سمجھ میں یہی بات آتی ہے کہ کائنات کا ہر نقش و نگار اللہ کے خالق ہونے کی دلیل ہے، اللہ جل شانہٗ اپنے علم میں انتہائی مکمل ہے، ارادہ، قدرت، حیات، سماعت، بصارت، کلام، وحدانیت، بقاء، اول اور قیام دوام میں مکمل استغناء کا مالک ہے۔ ذلت، عزت، رزق و عطا سب اس کا کرم ہے۔ مختصر یہ کہ جب ہماری عقل اللہ جل شانہٗ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات پہ صاف اور مکمل یقین کی دولت سے مالا مال ہو جائے تو اس کے بعد اس کائنات میں اس سے بلند کوئی ہستی نہیں ہو سکتی۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

فلسفیوں کے خدا ..... سرابی عقیدے

اب تک ہم مادی ارتقاء اور عقلی و علمی فتوحات کی بلندیوں سے اللہ جل شانہٗ کی ذات برحق کی نفی کرنے والوں کے دلائل سے اپنے دلائل کا موازنہ کرتے ہوئے عقلی، فکری اور علمی بنیاد پہ خالقِ کائنات کا تعارف کروا رہے تھے، اب ہم ان فلسفیوں کی بات کریں گے جن کو اللہ جل شانہٗ کی ذات سے انکار تو نہیں لیکن اللہ کی ذات برحق کا تصور ان کے اذہان میں اپنی سوچ کے مطابق کیا ہے؟ کیسا ہے؟ حقائق سے اسے کیا واسطہ ہے؟

ان کے عقائد کی حیثیت

مشہور مفکر عباس محمود عقاد اپنی کتاب "حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ" "اسلام کی صداقتوں سے انکار باطلہ کی جنگ" میں لکھتے ہیں۔ ہر زمانے میں انسانوں میں سے کچھ انسانوں نے دین حق کے داعیوں نبیوں، پیغمبروں کے مقابلہ میں اپنے خفی مذاہب کی بنیادیں رکھنے کی کوششیں کیں۔ وہ سلسلہ تعلیم و تربیت جو سفر ارضی کے

ساتھ اللہ جل شانہٗ نے آدم و حوا کی نسل کو تاجیات مہیا کرنے کا خود ذمہ لیا تھا اور حسب وعدہ دنیا میں جہاں کہیں بھی نسل آدم پھیل کر پہنچی ان میں انہیں کی زبان ان ہی کی زمین ان ہی کی رنگت اور نسل میں اپنے نبی اور پیغمبر اپنی تعلیم وحی کے ذریعہ دے کر پیدا کئے۔ انہوں نے اللہ کے اس سپرد کردہ عظیم کام کو اپنی تمام زندگی پوری توانائی اور ان تھک محنت و مشقت سے سرانجام دیا۔ لیکن ان سب انبیاء اور رسولوں کی بنیادی تعلیم اللہ جل شانہٗ کے بارے میں ایک ہی ہے، ایک ہی تھی۔ اللہ کی وحدانیت ہی داؤد علیہ السلام کی تبلیغ کا سرچشمہ تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کا منبع تبلیغ تھی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کی اساس تھی اور ان سب کی صداقت اور تصدیق کی آخری مہر جناب رسالتمآب رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلان بھی یہی تھا لا الٰہ الاّ اللہ۔ اللہ جل شانہٗ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ وحدہٗ لاشریک ہے، وہ حی القیوم ہے۔

تفہیم دین

تفہیم دین کی اساس اللہ جل شانہٗ کی وحدت پہ یقین ہے اور اس یقین کے ساتھ اللہ جل شانہٗ کا عرفان بھی ہونا ضروری ہے جس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اس لئے کہتے ہیں جس کو اس عقیدہ کا عرفان نصیب ہو گیا اس کو دین عرفان بھی حاصل ہو گیا۔

ایک واضح فرق

دین اسلام اور دوسرے مذاہب میں جو واضح فرق ہے وہ یہ کہ مسلمان جوں ہی لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللهُ ـــــ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں معبود نہیں، مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے رسول ہیں، اس کا اقرار کر لیتا ہے اس کے ساتھ ہی اس کو ایک ضابطہ حیات کو تسلیم کرنا لازم ہوتا ہے۔ وہ ضابطہ حیات جسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترتیب دے کر تحریراً اور عملاً پیش کیا۔ اطاعت رسول مسلمان کے اقرار یا عہد کی سچائی کا ثبوت قرار پاتی ہے۔ اور اطاعت کا مسلسل عمل اسے مادی اور روحانی ارتقاء سے فیض یاب کرتا ہے۔ اس طرح مسلمان کی زندگی کا سفر خیر و شر سے آگاہ، نیکیوں کا انتخاب کرتے ہوئے شروع ہوتا ہے۔ مسلمان جدھر جاتا ہے اپنے اچھے اعمال کی خوشبو پھیلاتا ہے۔ نیکیوں اور بھلائیوں کے کھیت بوتا ہوا جاتا ہے۔ مسلمان اپنی نفی اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زندگی قرار دیتا ہے۔ اس کی نگاہ، اس کی سوچ، اس کا فکر، اس کا عمل پابند دین ہوتا ہے۔

دوسرے مذاہب کے مفکرین نے خدا کے تصورات کو اپنی سوچ، عقل کے ذریعہ جو صورتیں یا اختیارات دیئے ہیں ان کے ساتھ کوئی ایسا ضابطہ نہیں ہوتا۔ خیر و شر، اول تو ہے ہی نہیں، اگر ہے بھی تو وہ انسان کی اپنی صوابدید پر ہے جسے چاہے اسے قبول کر لے جسے چاہے مسترد کر دے۔

آج بھی جن لوگوں نے اللہ جل شانہٗ کی ذات سے انکار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ہم نے کائنات کے تمام ورق الٹ ڈالے ہیں۔ آسمان کا کونہ کونہ چھان مارا ہے ہمیں وہاں خودکار نظام تو ملا ہے لیکن خدا نہیں ملا۔ کچھ ماہرین سائنس نے بڑے متکبرانہ انداز میں کہا۔ اللہ کو مان بھی لیا جائے تو اس کے ایک نمائندے کا غلام بنا ہمیں

پسند نہیں۔ گویا خودسری اور آزادی کے انکار، اقرار حقیقت کے سامنے دیوار بن گئے ہیں۔

صدیوں پہلے یونان کے ایک فلسفی ارسطو نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا

"اللہ کی ذات اتنی منزہ اور لطیف ہے کہ ہمارے غور و فکر اور عقل و ادراک کی رسائی سے باہر ہے۔ لہٰذا اس کا خیال ہی دل سے نکال دینا چاہیے"۔

ارسطو کے اس فلسفہ میں ہمیں یونان کے سب سے بڑے مفکر فلسفے کے پیشوا افلاطون کے فلسفہ کی روح نظر آتی ہے جو آخری صدی تک فرق باطنیہ کے افکار پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے طویل مباحث میں اللہ کی اس پاکیزگی کی صفت کو کم اور اپنی تاویلات پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنے نظریہ کی استعانت میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی تردید خود ہی کر دیتے ہیں۔ مثلاً وہ اللہ کو بالائے ادراک کہہ کر اور اس پر غور و تدبر نہ کرنے کا اظہار کر کے اس کے تمام اختیارات کو بے معنی قرار دے دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی وحدانیت کی تردید یوں نہیں کرتا کہ وہ نہیں ہے بلکہ وہ حرف یا ہندسہ واحد کو اپنے فلسفہ کے گرداب میں ڈال دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے وہ واحد تو ہوتا ہے یعنی ایک ایک تو رہتا ہے۔ مگر اسے ایک نہیں کہا جا سکتا ۱۔ ۲۔ ۳ تا ۱۰ یعنی ایک سے شروع تو ۱۰ پر پہنچا تو وہی ایک سب اعداد کی روح ہے۔ یہ تمام ہندسوں کی تعداد میں غوطہ لگاتے ہوئے ۱۰ پر پہنچا تو پھر وہی ایک یعنی صفر، تو صفر ہے ہی۔۔۔

ارسطو آگے چل کر کہتا ہے کہ اللہ ازلی ہے ابدی ہے۔ مطلق الکمال بھی ہے۔ اس کا اول و آخر بھی نہیں۔ لیکن نہ ہی اس کا کوئی مقام ہے، نہ ہی اس کا کوئی ارادہ ہے، اس لئے کہ کسی عمل کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ خواہش ہوتی ہے اور اللہ خواہش اور مقصد سے پاک ہے۔ اسی طرح کوئی کام بھی ہو اس کا اچھا اور برا پہلو، اعلیٰ اور کمتر کا معیار لازمی ہوتا ہے، مگر اللہ ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس پر جدید و قدیم، اول و آخر کے تصور کا اطلاق بھی بے معنی ہے۔

اور اللہ چونکہ مطلق الکمال ہے، یعنی اس کو پوری پوری قدرت حاصل ہے، اس لئے اس کو پوری کائنات کو پیدا کرنے کی زحمت اٹھانے کی ضرورت کیا تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مادہ (ہیولیٰ) جو پہلے سے موجود تھا اور اس کی فطرت میں (فلسفہ والے اس کی طبیعت یعنی سرشت میں کہتے ہیں) ایک مسلسل عمل تھا۔ اس عمل کے نتیجہ میں یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ چونکہ اللہ کی ذات کثافت سے پاک تھی اس لئے اس نے اس مادہ کو اپنے سے دور کیا تو اس سے یہ عالم سفلی وجود میں آ گیا۔ اور وہ کمال مطلق (یعنی اللہ) نہ ہی کوئی عمل کرنے پر قادر ہے، نہ اس میں ارادہ کی قوت ہے۔ گویا اس حالت میں کمال مطلق کا ہونا یا نہ ہونا ایک سے ہیں۔ اس کے بعد ارسطو کہتا ہے اصل میں سب کچھ جو نہیں نظر آ رہا ہے ان سب سے پہلے جو کارفرمائی ہے، اس کی محرک عقل ہے یہی وہ عقل ہے جو جب تک بے نقاب نہ ہوئی اسے جہالت کا اندھیرا کہا گیا اور جب یہ بے نقاب ہو گئی تو کائنات اپنے پورے ماحول کے ساتھ ابھر آئی۔ گویا اس طرح وہ کائنات کے صانع دو قرار دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ ایک فاعل خیر جو نور ہے اور دوسرا فاعل شر جو ظلمت ہے، نور ہی عقل ہے۔ اللہ موجود تو رہتا ہے مگر اس کو کسی عمل کی قدرت نہیں ہے۔ مگر نور اور عقل دونوں کے چار جسم ہیں اور پانچویں روح

ہے۔ نور کے چار جسم ہیں۔ نار، نور، پانی، ہوا اور پانچویں روح جو روشنی ہے۔ اور ان بدنوں میں ہمیشہ متحرک رہتی ہے۔ اسی طرح ظلمت کے چار جسم ہیں، سوزش، تاریکی، بادِ سموم، غبار اور روح جو دھواں ہے۔ نور کے اجسام کا نام ملائکہ ہے اور ظلمت کے اجسام کا نام شیاطین یا عفاریت ہیں۔ لیکن نور ناقابلِ تحلیل و تقسیم ہے، اسے نہ ہی فنا کی ہے نہ ہی سقم ہے یا بیماری ہے بلکہ یہی تمام ، رات اور عناصر میں کار فرما ہے۔

مختصر یہ کہ خدا ایک علت قدیمہ تو ضرور ہے لیکن اس کا تعلق کائنات کی تخلیق جس میں خود انسان نہ ہی حکمرانی ہے نہ ہی اس سے تعلق ہے، انسان مادر پدر آزاد ہے۔

اسی مکتبہ فکر کے لوگ جو جسمانیہ کہلاتے ہیں، وہ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اپنا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اس عالم کی طینت (سرشت) بہت سخت تھی، وہ تھی ایک مدت تک خدا کے وجود میں حلول "Transmigration" کر گئی۔ کچھ مدت کے بعد خدا نے اس سے تکلیف محسوس کی تو اسے اپنے آپ سے الگ کرنا چاہا تو وہ طینت خدا کے جسم میں خلط ملط ہو گئی۔ یعنی "Dissolve" ہو گئی تو اس سے ہی یہ عالم پیدا ہو گیا جو نوری بھی ہے اور ظلمی بھی ہے۔ اب جو کچھ اصلاح کی قسم سے ہوتا ہے وہ نور کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس عقیدے کے لوگ آدمیوں کو قتل کرتے ہیں جس میں ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ نور کو ظلمت سے الگ کرتے ہیں۔

یونانیوں کے قدیم فلسفے میں خدا کے تصور یا کائنات کے بارے میں ان کے خیالات کو اس لئے ہم نے پیش کیا تاکہ آپ اس پر غور کریں کہ آج جدید علم، سائنس جو کچھ ہمیں کائنات کے حوالے سے معلومات فراہم کرتی ہے، ان پر ان کی زبان انگریزی کی چھاپ ہٹا دیں تو ان سب کا بنیادی فکر انہیں یونانیوں سے متاثر نظر آتا ہے۔ سقراط کا خیال ہے کہ اشیاء کے تین اصول ہیں علت، فاعل، عنصر اور صورت۔ خدا عقل ہے، عنصر کون و فساد، صورت جسم نہیں بلکہ جوہر ہے، عقل نے اشیاء کو اس ترتیب سے مرتب کیا ہے جو ہمیں نظر آتا ہے۔ اس کی علاوہ بھی دوسرے نظریات جو قدیم زمانے سے اسلام کے مقابلہ میں ہمیشہ حملہ آور ہوتے رہے ان کا مزید ذکر کرنے سے پہلے آپ غور کیجئے۔

فلسفہ کی زمین بھی عمارت بھی اور نقش و نگار بھی ملتے ہیں۔ یہ بات ہم نہیں کہہ رہے بلکہ فلسفیوں اور سکالر "Scholars" کی تصنیفات اور اقوال میں موجود ہمارے اس بات کی دلیل ہیں۔ لیکن اس کے برعکس دین اسلام کے داعی نبی محترم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام ارشادات اللہ جل شانہٗ کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت قرآن مجید کی ہر آیہ کریمہ ہے اور اس کے بارے مستشرقین، ملحدین اور یورپ کے تمام اسلام دشمن یہ کہتے ہیں کہ یہ کلام اللہ کا نہیں بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنا ہے۔ اور دنیا کے تمام مسلمان اس بات کے گواہ ہیں کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے بلکہ اس کے خلاف تصور کرنا بھی کفر ہے۔

اللہ جل شانہٗ کا کلام جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام انسانوں کو پہنچایا، پوری امانت داری اور صداقت سے پہنچایا۔ ان کی صداقت اور امانت داری کی قسمیں اپنے تو اپنے بیگانوں نے کھائیں۔ دشمنوں نے تصدیق کی۔ اسلام میں اللہ جل شانہٗ کی ذات کو واضح طور پہ پیش کرتے ہوئے فرمایا:

اللہ صَمَد لا اول و لا آخر، فَلَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَ ھُوَ مُحِیْطٌ بِکُلِّ شَیْءٍ۔

(اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں، باعتبار انسانی شمار کے اس کی ابتدا اور انتہا لامحدود ہے۔ اس کی مثل کوئی شے نہیں، اس کی قدرت کاملہ کی ہر چیز پر محیط ہے)۔

اسلام اللہ تعالیٰ کی تعریف یوں کرتا ہے اللہ علیم و قدیر ہے "فعالٌ لمایرید۔ (وہ وہی کرتا ہے جو اس کی مشیت ہو)۔ وہ کریم ہے رحیم ہے۔ ہاں وہ جہالت، عاجزی، بے بسی، تخمین اس قسم کی دوسرے خامیوں سے مبرا ہے، پاک ہے۔ اس کو اپنے پورے ارادوں اور احسن صفات میں بے نقص کمال "Perfection" حاصل ہے۔ اسلام کے معلم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ جل شانہٗ کا تعارف بڑا واضح اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا کرایا ہے۔ اسلام نے جس اللہ کو متعارف کروایا ہے وہ معلم اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اپنے دماغ کا فلسفہ نہیں کہ وہ اس میں کلابازیاں کھائے۔ کبھی اس سے افلاطون اور ارسطو کی طرح انکار بھی کرے۔ اس کے وجود کو تسلیم بھی کرے اور اس کو مجبور محض بھی مانے۔ اس کو کائنات کی علت بھی کہے اور بے ارادہ، بے عمل اور بے عقل بھی قرار دے۔

معلم اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اللہ جل شانہٗ کے نظام کو معراج کی رات دیکھا اور پھر تصدیق کی

☆ وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ (سورۂ یونس ۶۱)

ترجمہ: اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

☆ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌO (سورہ یٰسین: ۷۹)

ترجمہ: اور وہ سب قسم کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

☆ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِيْنَO (سورہ مومنون ۱۷)

ترجمہ: اور ہم خلقت سے غافل نہیں ہیں۔

☆ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (سورہ اعراف:۸۹)

ترجمہ: ہمارے پروردگار کا علم ہر چیز پر احاطہ کیا ہوئے ہے۔

کلام اللہ جل شانہٗ کا اور زبان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترجمان بن کر اللہ تعالیٰ کے کمالات و اختیارات کا اعلان کرتی ہے۔

☆ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (سورہ اعراف:۵۴)

ترجمہ: دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے)۔

☆ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِO (سورہ فاطر:۳۸)

ترجمہ: وہ تو دل کے بھیدوں تک سے واقف ہے۔

☆ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُO (ہود ۱۰۷)

ترجمہ: بے شک تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

ہاں یہودیوں نے ایک زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا جو قرآن

مجید میں تحریراً موجود ہے

وَ قَالَتِ الْیَھُوْدُ یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ ؕ غُلَّتْ اَیْدِیْھِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ ؕ (المائدہ:۶۴)

ترجمہ اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے۔ (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ باندھیں جائیں اور ایسا کہنے کے سبب ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں یہودیوں کی زبان سے ارسطو کی تردید پیش کرنا مقصود تھا اور یہ بھی کہ یہ جواب یہودیوں نے زکوٰۃ اور صدقات کا حکم نافذ ہونے کے بعد دیا تھا۔ گویا وہ زکوٰۃ اور صدقات کو حجت بنا کر نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو کنجوس ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فلسفہ ارسطو (ارسطاطالیس) افلاطون کے پیرکار اور ان کی مثل پوری برادری کے بارہ میں اپنا حکم سناتے ہوئے سورۃ الحج میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَ الصّٰبِئِیْنَ وَ النَّصٰرٰی وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰہَ یَفْصِلُ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ ۝ (الحج ۱۷)

ترجمہ جو لوگ مومن (یعنی مسلمان) ہیں اور جو یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک خدا ان (سب) میں قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا بے شک خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔

بہت سے اسلام دشمن اس حکم پر اعتراضاً کہتے ہیں کہ قیامت کس نے دیکھی ہے۔ عقل مندوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ فوری طور پہ اپنی قدرت استعمال کر دیں تو پھر اس پہلے دن کے اصول کا کیا ہو گا۔ جب انسان کو پیدا کرتے ہی اعزاز خلافت دیتے ہوئے باہم طے پا گیا تھا ہم تمہیں ایک خاص مدت تک زندگی دے کر آزمائیں گے۔ خلافتِ ارضی کے آغاز میں رخصت کرتے وقت فرمایا تھا۔ تحریری ثبوت سورہ البقرہ:

وَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝ (البقرہ ۳۶)

ترجمہ اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانہ اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے۔

اب یہ کوئی دنیا کے بڑے سے بڑے حکمران انسان کا معاہدہ نہیں جو ہٹلر کی طرح اتحادیوں کے معاہدہ کو غصہ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے پھاڑ کر پھینک دے۔ یہ اللہ جل شانہٗ کا عہد ہے جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ دہریہ لوگوں "Athists" کا موقف بھی قرآن حکیم میں موجود ہے

وَ قَالُوْٓا اِنْ ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝ (سورۃ انعام ۲۹)

ترجمہ اور کہتے ہیں کہ ہماری جو دنیا کی زندگی ہے بس یہی (زندگی) ہے اور ہم (مرنے کے بعد) پھر زندہ نہیں کئے جائیں گے۔

مطلب یہ کہ ہم آپ ہی آپ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ نہ ہمارا کوئی مالک ہے نہ موت کے بعد کوئی پوچھنے والا ہے اس لئے کہ ہماری زندگی اتنی ہی ہے۔

دوسری جگہ ان کے موقف کو ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے:

وَ قَالُوْا مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ ۚ وَ مَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ

عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ۝ (جاثیہ ۲۴)

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ (یہیں) مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔ اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں۔ صرف ظن سے کام لیتے ہیں

وہ جملے جو آج دنیا کا ہر مادہ پرست کہتا ہے کہ یہ کائنات شکست و ریخت کا ایک غیر متناہی سلسلہ ہے اور اس سلسلہ کا ایک حلقہ جو ٹوٹتا ہے ختم ہو جاتا ہے اور پھر دوسرا حلقہ مادی اشتراک سے بن جاتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ انسان کی یہ غلط فہمی کہ وہ بے مقصد پیدا ہوا ہے اور اس کی زندگی اسی دنیا تک محدود ہے۔ لہٰذا اسی زندگی کے لئے اسے سوچنا چاہئے۔ اسی زندگی کے لئے اسے نسلی اور ملی وطنی تعصب سے زندہ ہونے چاہئیں۔

اگر یہ ہیوم (Hume) سے لے کر ماضی میں جائیں تو یونانی مفکرین تک اور آج تک جتنے بھی انسان زندگی کو اتنا ہی سمجھتے ہیں تو پھر یہ سب ہنگامے کیوں؟ ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اللہ تعالیٰ برحق فرماتے ہیں کہ موت کے بعد ہی تمہاری زندگی ہے۔ جسے انسان کی روح تسلیم کرتے ہوئے لاشعوری طور پہ انسان سے وہ کام کرواتی ہے جو اسے اس زندگی میں اپنے اختیارات کے تحت کرنے ہیں۔

یونانی خدا کے تصور کو بھی سامنے رکھیے، دیکھئے کہ وہ خدا کو ابدی قرار دیتا ہے۔ پھر زمانے کو بھی ابدی قرار دیتا ہے جسے ایک شعوری آغاز و سفر سے مراد، قرار دے کر اسے بھی ابدی قرار دیتا ہے۔ یونانی خدا کا تصور پیش کرنے والا انسان ہی اپنے تصور یا اپنی عقل کو بے بس پاکر یہ کہہ دیتا ہے کہ حیات و موت کا یہ سلسلہ شکست و ریخت کا یہ قافلہ یوں ہی چلتا رہے گا، اس کا کوئی انجام نہیں۔ یہی بات آج کا وہ ذہن جسے مادی علوم میں کامیابیاں حاصل ہو گئی ہیں اور انسانوں نے ان کو سراہا ہے انسانوں کی اس تعریف نے ان کو ہمہ دانی کا غرور دے کر لوگوں کے ذہن سے اللہ کے یقین کو مٹا کر وہ اپنی اپنی ذات کی عقلمندی کا بت بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جس میں وہ کسی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں، لیکن اسلام کا معلم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی زبان سے نہیں اپنے دماغ سے نہیں اپنی عقل اور فکر سے نہیں بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کے انجام اور اس کے خالق اللہ کی ہستی کو پیش کرتا ہے۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (سورۂ فرقان ۵۸)

ترجمہ: اور اس (خدائے) زندہ پر بھروسہ رکھو جو (کبھی) نہیں مرے گا۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (سورۂ المومنون: ۸۰)

ترجمہ: اور وہی ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔

كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سورۂ القصص ۸۸)

ترجمہ: اس کی ذات (پاک) کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

لیکن یونانیوں کے وہ خدا جو اس نے ایک خدا کو معطل کر کے (یعنی فلسفیوں نے) کئی خدا پیدا کئے ذرا ان کی تفصیل پر غور کیجئے۔ اجرام فلکی کو پوجنے والوں کا عقیدہ ہے۔ علوی روحانیت کے لئے ایک پیکر ہے جسم ہے، اس کی صورت ہے، ہر ایک کی روحانی صفت الگ الگ ہے۔ ثوابت و سیار انہیں میں شامل ہیں۔ ان میں ایک فرقہ

نے تین صورتیں بتائیں ہیں۔ ایک مشتری (Jupiter) کو نیکی کا دیوتا مانتا ہے۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس کی صورت سے ملتا جلتا شیطان ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان عبادت کے ذریعہ پاکیزگی یا بلندی کا مقام حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

ان کا عقیدہ ہے کہ جیوپیٹر (مشتری) اپنے کھانے پینے میں مشغول رہتا ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ وہ بادشاہوں [illegible] ہے اور مصائب سے ان کو نکلنے میں مدد دیتا ہے۔ مشتری کو طب کے خدا (اسقلاب) پر غصہ [illegible] کر اچھا کرتا ہے۔ جن کی روحیں ہاویہ کے جہنم سے نکل کر زمین میں نمودار ہوتی ہیں اور فساد بپا کرتی ہیں۔

جیوپیٹر (مشتری) [illegible] معرفت اور صناعت کے خدا "پرومیتھوس" پر بھی غصہ ہے اس لئے کہ یہ وہ انسان کو معرفت اور صنعت سے [illegible] آشنا کر کے انسان [illegible] کے دوست خدا کے مقابلہ پر تیار کرتا ہے۔ اس لئے اس پر عتاب کو مسلط کر دیا۔ عتاب نے اس کو حاصل کیا۔ [illegible] اس کے یکلخت مار دینے پر بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک خوفناک پہاڑ کی غار میں قید کر دیا اور ایسے خطرناک پرندوں کو اس کا جگر نوچ نوچ کر کھانے کو مامور کر دیا کہ وہ سارا دن اس کو نوچ کر کھاتے رہتے ہیں اور جب رات کا اندھیرا چھاجاتا ہے تو رات بھر میں پھر اس کا جسم سلامت ہو جاتا ہے تاکہ صبح سورج کے طلوع ہوتے ہی اس پر پھر جانور جھپٹ پڑیں۔ چنانچہ خداؤں میں سے کوئی خدا نہ ہی اس کی سفارش کر سکتا ہے نہ دعا دے سکتا ہے۔ جیسے کہ یونان کا ایک فلسفی شاعر (ہزیود) اس کے بارے میں وجہ غضب بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے

(پرومیتھوس) پر غضبناک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مشتری نے ایسے دوستوں کی خاص دعوت میں طعام کے لئے پسند کیا لیکن دیکھا، اس کے جسم پر گوشت پوست کم ہے اور ہڈیاں زیادہ ہیں۔ جیوپیٹر (مشتری) کا خیال ہے کہ اس کو معرفت (یعنی علم اور صنائع) کا خدا ہونے کی وجہ سے اس بات کا پہلے سے علم تھا۔

اس نے میرے دوستوں کے سامنے جان بوجھ کر میری توہین کی ہے۔ یہ تمام واقعات ہم نے اس فلسفی شاعر (ہزیود) کی تصنیف سے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی یونانیوں کے کئی خدا جو اجرام فلکی کی صورت میں مشہور اور ان کی مذہبی کتابوں میں مندرج ہیں۔ ان کے بتوں کی شکلیں اور نام سے آپ بھی آشنا ہوں گے۔ مشتری، زہرہ، عطارد، مریخ، جوزہ، شمس (سورج) زحل، غرض سیارے اور بروج کو پوجنے والوں کے عقیدہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ سات ستارے اس کائنات کے مدبر ہیں۔

(۱) زحل: سیسے کا اندھا بت ہے۔ اس پر ایک بوڑھا بیل چڑھایا جاتا ہے۔ اس بیل کو اس گڑھے کے پاس لاتے ہیں۔ اس گڑھے کے اوپر لوہے کا جال اس طرح بنا ہوتا ہے کہ بیل کے پاؤں اس میں جکڑے جاتے ہیں۔ جوں ہی بیل جکڑا جاتا ہے اس کے نیچے آگ جلاتے ہیں، وہ راکھ ہو جاتا ہے اور پجاری کہتے ہیں۔ اے معبود نابینا تو پاک ہے۔ تیری طبیعت میں وہ شر ہے جو کبھی نیکی نہیں کرتا۔ ہم سے چڑھاوا قبول کر کیونکہ یہ بھی تمہارا مشابہ ہے اور ہمیں اپنی ارواح خبیثہ سے بچا۔

(۲) مشتری: پر ایک شیر خوار بچہ چڑھاتے ہیں۔ ایک لونڈی خریدتے ہیں۔ اس سے سات مجاور وطی

رہتے ہیں۔ جب وہ حاملہ ہو جاتی ہے تو اس کو بڑے آرام سے رکھتے ہیں۔ بچہ جننے کے آٹھ روز بعد اس بچہ کو یہ اس خدا کا چڑھاوا بنا کر لاتے ہیں۔ بچے کو سوئیاں چبھو چبھو کر مارتے ہیں۔ بچہ اور لونڈی روتی ہے تو یہ کہتے ہیں اے بدی کے خدا! ہم نے یہ معصوم چڑھایا ہے یہ بھی پاک ہے تو بھی پاک ہے، قبول کر۔

(۳) مریخ، شمس، زہرہ، عطارد اور قمر پہ انتہائی اذیت ناک چڑھاوے چڑھا کر اپنی عبادت بجا لاتے ہیں۔
یونان کی طرح دنیا کے باقی حصوں میں بھی انسان ذہن سے تراشے ہوئے خداؤں کے نام کہیں دیوتا کے نام سے اور کہیں اور نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں قدیم زمانے سے تین خدا، یعنی تین دیوتا مشہور ہیں:

۱۔ (برہما) ہندوؤں کا معبود ـــــ جسے وہ کائنات کا خالق مانتے ہیں۔
۲۔ وشنو (فشنو) جسے وہ ہر مخلوق کا پالنہار یا رکھشک (یعنی حفاظت کرنے والا) مانتے ہیں۔
۳۔ شیوا (سیفا) یہ وہ دیوتا ہے جس کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے یہ بربادیاں پھیلاتا ہے تباہیاں لاتا ہے۔

وہ اپنے ہر دیوتا کے ساتھ ایک اور صفت کا اطلاق کرتے ہیں وہ ہے (شکتی) جس کے معنی قوت کے ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت بھی۔ بعض لوگوں میں، ایک دوسرے کو پوجتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ان کے خدا، یعنی بھگوانوں کی تعداد میں شیاطین اور خبیث روحوں کا نام دے کر انہیں پوجتے ہیں۔ ان پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور ان کے عقیدہ میں جب پاکیزگی کا مقام حاصل کرنا ہو تو اور پاپ سے الگ ہونا ہو تو اس کا نام "کرما" اور "نروانا" رکھا گیا ہے۔ کرما سے مراد یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ بھگوان کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ "نروانا" وہ خاص صفت ہے جس کو پانے کے بعد انسان کی آتما (روح) آسمانی خداؤں کی ہم نشیں ہو سکتی ہے۔ کرما سے مراد یہ ہے کہ پہلے انسان اپنے اعمال میں پاکیزگی پیدا کرے پھر "نروانا" کا مقام حاصل کرے تو اسے دیوتا کا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اس مقام کے بعد آتما (روح) کسی دوسرے انسان کے جسم میں داخل ہو کر نیا جنم یعنی نئی زندگی پا سکتا ہے۔ اس طرح کے اور کئی مذاہب جن میں انسان کے ذہن سے اپنی عقل سے تراشیدہ خدا دیئے گئے ہیں، ان کی تفصیل تو بہت ہی طویل ہے۔ مصر کے عہد قدیم میں فراعنہ کے مصری خداؤں میں بھی کئی عجیب و غریب روایات ان کی مذہبی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ان میں کچھ خدا ارواح خبیثہ، کچھ شیاطین کے نام سے پوجے جاتے رہے۔ ایران میں اہرمن ویزداں، نیکی اور برائی کا خدا مشہور ہے۔ اسی طرح مصر میں فرعون مصر (بادشاہ) کو "اخناتون" کے نام سے نسبت دے کر پوجا جاتا تھا۔ مصر کے قدیم مذاہب میں سے ایسی کتابیں بھی ہمارے سامنے ہیں، جن میں ایک معبود (خدا) کا اقرار موجود ہے لیکن اس کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں یا خداؤں کی عبادت سب سے بڑے خدا سے سفارش کروانے کے لئے کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی پیشوا برہمن "اعتقاد اور ایمان" کے نام نہیں جانتے۔ ان کے ہاں دیوتا اور اوتار کا تصور ہے۔ مگر دو اصطلاحیں بڑی اہم ہیں۔ کرما اور نروانا۔ کرما کا مطلب ہے، اعمال اور نروانا کا مطلب ہے "نجات"۔ ہندوؤں کے ہاں کرما کے ذریعہ نجات پانے کا مطلب ہے فانی زندگی سے بقا حاصل کر لینا۔ ان کا عقیدہ ہے، جب تک انسان اپنے اعمال کے ذریعہ عذاب سے نجات نہیں پاتا تب تک وہ کئی بار پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے۔ اسی کو ہندی میں آواگون کہتے ہیں۔ یعنی بار بار مرنا اور پیدا ہونا۔ لیکن وہ

موت جس سے انسان کو نروان نصیب ہو جاتا ہے تو وہ خود خدا کا وجود یا خود خدا بن جاتا ہے۔ وہ امر ہو جاتا ہے۔ یونان کے فلسفی ارسطو کا فلسفہ بھی اسی کے قریب قریب ہے۔ اس کے ہاں بھی کمال مطلق سے عدم مطلق کے الحاق کی اصطلاح انہیں معانی کی حامل ہے۔

دین اسلام جس طرح واضح اور مدلل انسان کے فرائض حقیقت پیدائش اور اللہ جل شانہٗ کے مقام الوہیت (معبود) کو بیان کرتا ہے اس طرح انسانی عقل کے پیش کردہ خدا اپنی کسی حیثیت سے واضح نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی انسان کا تعلق ان سے واضح ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں مذہب کے بارے میں مذہب بیزار لوگوں کے جتنے دلائل ہیں ان کی بنیاد ایسے ہی خود تراشیدہ خداؤں کی پرستش کرنے والوں کے عقائد کا مطالعہ ہے۔ انسانوں نے خود جو مذہب یا عقائد ترتیب دیے ان سے قطع نظر وہ مذہب جو حقیقت میں دین اسلام کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں وہ دین جس کا مرتب، جس کا معلم خود اپنی ذات کی واضح حیثیت بتاتا ہے اور انسان کی پیدائش، خلافت ارضی اور اعمال کی وضع تشریح کرتا ہے اس کی تعلیم و تدریس کے مجموعے آسمانی کتابوں میں بھی ذہین اور خود غرض انسانوں نے ایسی تبدیلیاں کر دی ہیں کہ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد عقل بیزار ہونا لازمی امر ہے۔ مثلاً زبور، توریت اور انجیل میں مندرج احکامات الٰہیہ کو اس طرح بدلا گیا کہ اسے پڑھنے کے بعد ان احکامات کے جاری کرنے والی ذات بھی مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔ دین موسوی (موسیٰ علیہ السلام) کے نام سے منسوب کتاب ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ القادرین علی نے اسے عبرد زبان سے عربی میں منتقل کیا ہے۔ اس کا نام ہے "التورۃ والتملود" ہے۔ اسرائیلی جماعت کی اس مذہبی کتاب میں الہٰ (معبود) کے حوالے سے جو تصور ملتا ہے۔ اس کا نام ہے (یہولو)۔ اس کے بارے میں ان کی مقدس کتابوں میں کیا لکھا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"اسے بھونے ہوئے گوشت کی خوشبو بہت پسند ہے۔ اسے اندھیرے میں باغ کی ٹھنڈی ہواؤں سے محظوظ ہونے کی عادت ہے۔ وہ اپنے بندوں کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ وہ پہاڑوں کی وادیوں سے یوں ڈرتا ہے جیسے اس سے اس کے لشکر ڈرتے ہیں۔ وہ زمانے کے تناؤ سے پیدا ہونے والی غبار ہے۔ عزرائیل اور یہوا کے درمیان شیطان کے اختیارات کا بٹوارہ ہے۔ اسرائیلی دونوں کو خوش کرنے کے لئے الگ الگ ذبیحہ کی قربانی دیتے ہیں"۔

عبرانی یہودیوں کے عقیدہ میں الہٰ کا تصور یوں ہے۔ "یہوا" سایہ ہے جس کی نشاندہی یعقوب بن اسحاق کے بیٹوں نے کی لیکن کسی نے خلوص کے ساتھ ان کی معاونت نہ کی، ان لوگوں کے سوا جو تختِ داود (علیہ السلام) کے سایہ میں آگئے اور ان کی اولاد......"۔ غرض یہ کہ اس قسم کے اعتقاد اسرائیلیوں میں مدتوں رہے یہاں تک کہ ان میں یہودی دین کی اصلاح کے لئے عیسیٰ بن مریم صلوٰت اللہ علیہ والسلام کا نزول ہوا۔ جس پر بعض یہودیوں نے مراقی (بیماری کا نام ہے) ہونے کا الزام لگایا اور بعض نے ان کو اپنے غصے کا نشانہ بنایا۔

ابتدا میں عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خصوصی طور پر اپنی تعلیم و تبلیغ کا مرکز بنایا۔ ان کی اناجیل میں ایک بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ ایک کنعانی عورت حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس اپنے بیٹوں کو شیطان کی گرفت سے نجات دلوانے کی فریاد لے کر حاضر ہوئی۔ (یہ واقعہ انجیل کے ساتویں باب میں ہے)۔ ایک نحس روح کی بڑھیا سیدھی قدموں پہ گر پڑی۔ (یہ قبیلہ امیہ سے تھی۔ یعنی اسرائیلی قبیلہ کے علاوہ کسی دوسرے قبیلہ سے)۔ یہ

قبیلہ شام کے علاقہ میں آج بھی پایا جاتا ہے) اور کہا میرے بیٹوں و شیطان سے نجات دلوایئے۔ یسوع نے کہا ان دونوں بیٹوں کو میرے پاس لانے سے پہلے بہتر یہ ہو گا کہ تم خمیرہ دو روٹیاں لاؤ اور ان کے چھوٹے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلاؤ۔ اس عورت سے کہا بہت اچھا۔ پھر اس نے یہی کیا۔ خمیرہ تازہ موٹی روٹیوں کو چورہ چورہ کر کے کتوں کو کھلایا۔ اس کے ساتھ ہی یسوع نے کہا جاؤ تمہارے بیٹوں کو شیطان سے نجات مل گئی۔

اسی قسم کی ایک اور روایت انجیل کے پندرھویں باب میں مسیح علیہ السلام سے یوں منسوب و مرقوم ہے:

سید مسیح علیہ السلام ایک دن شکار کے سلسلہ میں نواحی علاقہ سے گزر رہے تھے کہ ایک کنعانی عورت چیختی چلاتی دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی سیدی مجھ پر رحم فرمایئے۔۔۔ اے ابن داؤد! مجھ پر رحم فرمایئے، میرا بیٹا پاگل ہو گیا ہے۔ اس کا جواب دیئے بغیر مسیح آگے بڑھ گئے۔ شاگردوں نے بڑھیا کو روکا مگر وہ پھر چلائی، اب مسیح رُکے۔۔۔ بڑھیا نے آگے بڑھ کر سجدہ کیا اور کہا سیدی میری مدد کیجئے۔ مسیح نے اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے کہا کہ دو خمیرہ موٹی روٹیاں چھوٹی چھوٹی کر کے کتوں کو کھلاؤ۔ بڑھیا نے حکم کی تعمیل کی اور لڑکا اچھا ہو گیا۔ مسیح سے ملی تو اس نے کہا تمہارا ایمان پختہ ہے، تمہارے بیٹے کو بیماری سے نجات مل گئی"۔

اس قسم کے واقعات مختلف اناجیل میں اور بھی ملتے ہیں۔ لیکن اس میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس وقت کا ہر عقیدت مند جب مسیح سے خطاب کرتا ہے تو کہتا ہے۔ اے ابن داؤد بن یعقوب بن اسحاق اس سے ثابت ہوتا ہے۔ عبرانی یہودی سلسلہ نبوت کو خاندان داؤد علیہ السلام سے مخصوص سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ عبرانیوں میں ایک اور عقیدہ پوری شدومد کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ان کے خیال میں نبوت روحانی قسم کی شے ہے۔ اس کا جسم سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لئے کسی نبی کو ماننے سے گریز کرتے تھے۔

عبرانی یہودیوں کے جس گروہ سے عیسیٰ علیہ السلام مخاطب ہوتے سب ان سے ناروا سلوک کرتے۔ ایک قبیلہ سے مایوس ہو کر دوسرے قبیلہ کی طرف جاتے تو کوئی اپنی کاروباری مصروفیات کا بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ بعض نے تو عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے آوارہ بچوں کو ڈال دیا، جو ان کو طرح طرح سے پریشان کرتے۔ کبھی ان کو دعوت کے بہانے دور دراز علاقوں میں لے جا کر خود بھاگ جاتے۔ کبھی ان کو دعوت کے بہانہ گھروں میں ساتھ لے جاتے، مگر وہاں پہنچنے پر معلوم ہوتا کہ گھر خالی ہیں۔ بچے اس پر ہنسی مذاق کرتے۔

بعض نے نظریہ رسالت و نبوت کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی غلط عقاید پھیلتے اور مضبوط ہوتے چلے گئے۔ عبرانیوں کا ایک عقیدہ تو بہت ہی زیادہ مقبولیت کا حامل تھا۔ وہ یہ کہ "اللہ" صرف اس قبیلہ یہود ہی کا ہے۔ "رب العٰلمین یعنی تمام جہانوں کا رب نہیں ہے"۔ ظاہر ہے اس کا تعلق بظاہر تو توحید میں تھوڑا سا تصرف لگتا ہے۔ وہ اللہ جل شانہٗ کو وحدہٗ لاشریک بھی مانتے تھے، خالق بھی مانتے تھے مگر اسے محدود عقیدہ میں محصور کر کے حقیقت سے منحرف ہو گئے، اور اس طرح وہ اللہ جل شانہٗ اور انبیاء کا مطلوبہ عقیدہ اسلام مفقود ہوتا چلا گیا۔ عقیدہ توحید یا الوہیت سے انحراف کے بعد ایک اور موڑ آیا۔ اور انہوں نے اللہ جل شانہٗ کی الوہیت کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کے جسموں میں اور ایمان کے خدا کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی روحوں میں تقسیم کر دیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک اور فریب نے جنم لیا۔ جو مصر میں ایک

نے عقیدۂ الوہیت کے نام سے موسوم ہو کر ابھرا۔ اس عقیدہ نے تین خدا پیدا کر دیئے خدا (۱) باپ۔ خدا (۲) بیٹا۔ خدا نمبر (۳) روح القدس۔ اس کے ساتھ ہی سب سے بڑا مکارانہ ہمدردی کے نقاب میں عیسیٰ علیہ السلام کی پوری تعلیمات سے فرار کا راستہ کھولتے ہوئے یہ مشہور کرایا گیا کہ مسیح علیہ السلام نے آدم و حوا کے تمام گناہوں کا کفارہ دیتے ہوئے اپنی جان کی قربانی دے دی۔

یہی عقیدہ آج بھی تمام عیسائیوں میں موجود ہے۔ تین خداؤں کی تردید کرتے ہوئے اللہ جل شانہٗ نے قرآن حکیم میں وضاحت فرمائی

و قالوا اتخذ الرحمن ولداO لقد جئتم شیئا اداO تکاد السموت یتفطرن منه و تنشق الارض و تخر الجبال هداO ان دعوا للرحمن ولداO و ما ینبغی للرحمن ان یتخذ ولداO ان کل من فی السموت و الارض الا اتی الرحمن عبداO لقد احصهم و عدهم عداO و کلهم اتیه یوم القیمة فردا O (مریم۔ ۸۸۔۹۵)

ترجمہ اور کہتے ہیں خدا بیٹا رکھتا ہے۔ (ایسا کہنے والو یہ تو) تم بری بات (زبان پر) لاتے ہو۔ قریب ہے کہ اس (افترا) سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں۔ کہ انہوں نے خدا کے لئے بیٹا تجویز کیا۔ اور خدا کو شایاں نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے۔ تمام شخص جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔ اس نے ان (سب) کو (اپنے علم سے) گھیر رکھا اور (ایک ایک کو) شمار کر رکھا ہے۔ اور سب قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے۔

اس میں رب قدیر اپنے جلال و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھر انسان کو یاد دہانی کروا دیتے ہیں۔ اپنی محبت و شفقت کا اظہار انسان کی گستاخیوں پہ اسے تنبیہ کر کے توبہ کے لئے مہلت دیتا ہے۔ احسان فراموشی کو جتا کر پھر موقع فراہم کرتا ہے تاکہ موت سے پہلے کسی وقت بھی انسان اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ اس عقیدہ میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ عیسائیوں کا فرقہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک فرقہ عرب میں داخل ہو گیا۔ دوسرا عرب کے قرب و جوار میں۔ اسی عقیدے نے عرب میں رہنے والے قبائل کو نبی آخرزمان صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی صدائے حق لگانے سے پہلے کافی متاثر کر لیا تھا۔ "جارج سیل" نے قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے اس کے ابتدائیہ میں حجاز اور قرب و جوار میں عیسائیوں کے حالات پر مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں حجاز مقدس کے رہنے والے عیسائیوں کا عقیدہ کیا تھا۔ اور قرب و جوار میں بسنے والے عیسائیوں کے عقائد کیا تھے۔ اس کی تفصیل لکھی ہے۔ ایک گروہ کے عقیدہ کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآن مجید میں اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں۔

و اذ قال الله یعیسی ابن مریم ء انت قلت للناس اتخذونی و امی الهین من دون الله قال سبحنک ما یکون لی ان اقول ما لیس لی بحق (المائدہ ۱۱۶)

ترجمہ اور (اس وقت کو بھی یاد رکھو) جب خدا فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو؟ وہ کہیں گے کہ تو پاک ہے مجھے کب شایاں تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کا مجھے کچھ حق نہیں۔

اس آیہ کریمہ سے ثابت ہوا کہ عیسائیوں کا ایک گروہ مسیح اور مریم کی عبادت کرتے تھے۔ غرض حقائق گواہ ہیں کہ جس طرح سابقہ امتوں نے اللہ کی طرف سے انبیاء کے ذریعے پہنچی ہوئی تعلیم کے اسباق کا حلیہ بگاڑا اپنے اغراض کی خاطر تحریفات کیں، یہاں تک کہ وہ بنیاد جس کا تعلق انسان ملت انسانی اور محسن اللہ جل شانہ سے ہے، اس کو ایسا توڑ پھوڑ دیا کہ عام انسان مکمل طور پر حقائق سے لاتعلق ہو گیا۔

مغربی عیسائیوں اور روم میں عیسائی مذہب کے پیشواؤں نے بھی اسی طرح جس طرح اس سے قبل یہودی راہبوں نے عام انسانوں کے ساتھ یہ سب کیا تھا۔ انسانیت سوز حد تک انتہائی بدتر سلوک کیا۔ جس نے مذہب بیزاری کے لئے جواز پیدا کیا۔ اپنے طریقہ کار کے مطابق مثل . . دانش کی گمراہیاں جب اپنی انتہا کو پہنچ گئیں، مذہب کے نام سے نقلی مذہب کے پیشواؤں نے انسانیت کو اپنی فکری گمراہیوں کے اندھیروں میں ڈھانپ لیا تو اللہ جل شانہ نے اپنے پیغامات اور تعلیمات کی آخری قسط کی ترسیل کے لئے حجاز مقدس میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مامور و متحرک فرمایا اور سینکڑوں خودتراشیدہ خداؤں کے خلاف حجاز مقدس کی فضاؤں میں ایک آواز گونجی انسانو! تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ تم جو کچھ کہتے ہو یا سمجھتے ہو سب غلط ہے۔ اسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ سنو غور سے سنو! اللہ کسی ایک کا رب نہیں، وہ کسی ایک قبیلے کا اللہ نہیں، وہ رب العالمین ہے۔ اس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ اس نے ساری مخلوقات کو پیدا کیا۔ آؤ ہم تمہیں حقیقتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ آؤ ہم تمہارا تمہارے خالق سے ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑتے ہیں۔ آؤ ہمارے قریب آؤ۔ تم سب ایک باپ اور ماں کی اولاد ہو اور تمہاری بزرگی کا معیار بڑائی کا پیمانہ تمہارے اعمال میں تقویٰ کی شمولیت ہے۔۔۔۔ غلط ہے کہ قریشی کو غیر قریشی پر فضیلت ہے۔ غلط ہے کہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے۔ غلط ہے کہ قریشی کو حبشی پر برتری حاصل ہے۔ برتری کی دستار ہم اسے دیں گے جو سب سے زیادہ متقی ہو گا

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (سورہ الحجرات:۱۳)

ترجمہ: لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ (اور) خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌۚ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُۚ ○ لَمْ يَلِدْ ۙ۬ وَ لَمْ يُوْلَدْ ○ ۙ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○ ۚ (اخلاص: ۱-۴)

ترجمہ: کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ (ہے) ایک ہے۔ وہ معبود برحق بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اور ہاں اس کا اصول بگوش ہوش سن لو۔ وہ کسی ایک انسان کے بدلے کسی دوسرے کو گناہ کی سزا نہیں دیتے۔ کسی امت کی خرابیوں کا ذمہ دار اس سے پہلے کی امت یا بعد کی امت کو نہیں ٹھہراتے۔ گویا ان کا پکا اصول ہے کہ وہ کسی کے ذاتی یا انفرادی گناہ کی سزا کسی دوسرے فرد کو نہیں دیتے۔ ثبوت میں فرمان الٰہی سن لو:

وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ (فاطر ۱۸)

ترجمہ: اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

اسی فطری عمل کی روشنی میں اللہ تعالیٰ وضاحت کس طرح فرماتے ہیں یہ بھی سن لو۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (البقرہ ۱۴۱)

ترجمہ: یہ جماعت گزر چکی۔ ان کو وہ (ملے گا) جو انہوں نے کیا اور تم کو وہ جو تم نے کیا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہو گی۔

ایک بار ایک اور اصول کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا: کسی قوم کے بارے میں ہمارے اجتماعی فیصلہ کا وقت تب آتا ہے جب ہم کسی قوم یعنی انسانوں کے بہت بڑے اجتماع کے پاس پہلے اپنا نبی (خبر دینے والا) نہیں بھیج دیتے۔ جو انہیں ہماری تعلیمات اور پیغامات کا درس دیتا ہے۔ پھر اس سے وہ جیسا سلوک کرتے ہیں، ویسا ہی سلوک ہمارے فیصلہ کی بنیاد ہوتا ہے۔ اچھا سلوک ہو تو اچھا، برا سلوک ہو تو برا۔ ارشاد ربانی ہے

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝ (الاسراء ۱۵)

ترجمہ: اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔

اسی اتمام حجت کی آخری کڑی نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم ہے جس کا ایک ایک لفظ آج بھی اپنی خالص حیثیت میں فضاؤں میں موجود ہے۔ اللہ کا دین اسلام تمہارے لئے مکمل ضابطہ حیات ہی تمہارے لئے باعث رحمت ہے۔ آؤ اس اللہ کی حاکمیت تسلیم کر لو۔ اس اللہ کا تعارف جس طرح ہم کرواتے ہیں، اسے اسی طرح پہچانو، اور مانو۔ اس میں اپنے خیالوں کی ملاوٹ شامل نہ کرو۔ "بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ" اس اللہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ بہت ہی مہربان اور بے حساب (ترس کھانے والا) رحم کرنے والا ہے، اس کے تمام احکامات (سورتوں) کا آغاز ہی اسی تعارف سے ہوتا ہے اور سنو۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝ (فصلت ۴۶)

ترجمہ: اور تمہارا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۖ (الحدید ۳)

ترجمہ: وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) پچھلا اور (اپنی قدرتوں سے سب پر) ظاہر اور (اپنی ذات سے) پوشیدہ ہے اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

یہ پہچان اس کی ذات کے حوالے سے اپنے ایمان کی بنیاد بنا لو اور

وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ (انعام: ۸۰)

ترجمہ: میرا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ (یٰسین: ۷۹)

ترجمہ: وہ سب قسم کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

وہ از قسم نباتات ہو جمادات ہو، حیوانات ہو، غرض جو بھی وجود ہے، اس کا خالق وہ اللہ۔ اس سے آگے اللہ۔

ہر مسلمان کو سب سے پہلا یقین جو نصیب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا اللہ "ربّ العالمین" یعنی تمام دنیاؤں کا پالنے والا ہے۔ اور وہ اللہ جو اپنا تعارف غیر معمولی قوت ناقابل تسخیر جبروتیت سے نہیں کرواتا، اپنے تمام تر اقتدار تحکم کے باوجود اپنی وسیع تر رحمت کے سایہ میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔

چنانچہ اس صحیح عقیدہ اسلام، سچے معلّم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی منفرد شخصیت جس نے کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیے اور "امی" لقب پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام عقل و دانش کے معیار پہ پورا اترنے والے حیات و ممات کے جس علم سے انسانوں کو آگاہ کیا، اس کی شانِ امتیاز نے مغرب ہو یا مشرق جہاں جہاں بھی عقل و دانش نے تنقیدی نقطہ نظر سے اسے دیکھا تو اصل ذریعہ علم "وحی" سے انکار کر دیا مگر اس کی شہنشاہ مرعوب ۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیش کردہ کتاب "الفرقان" الشفاء، الرحمت، القرآن الکریم کی ایک ایک آیت بے مثال ہے۔ اور وہ دستور حیات جو امی لقب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا اس سے بہتر کسی دانشور یا دانش نے ایسا قابل عمل اصول کو جنم نہیں دیا۔ یہ بات ہم اس دور میں جبکہ کائنات سمٹی میں سمٹ گئی ہے پورے وثوق کے ساتھ کہہ رہے ہیں، پورے دلائل کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ پچھلی چند صدیوں میں انسان کی تمام مادی ترقیوں کے باوجود تمام وسائل کے باوجود کون سا نظریہ ہے جس کی گود میں امن اور سلامتی نصیب ہو سکتی ہے؟ اگر ہے تو دلیل سے ثابت کیجئے۔ تعصب کی زہریلی گیسوں سے نکلئے، اپنے اندر کے مغرور انسان کو احساس برتری سے نکال کر جائزہ لینے کی جرأت دیجئے تو حقائق بزبانِ حال پکارتے سنائی دیں گے کہ جس ضابطہ حیات کو ترتیب دیتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے فیض حاصل نہیں کیا گیا ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصول اور ضابطوں کا حسنِ عمل قبول نہیں کیا وہ آج اجتماعی طور پہ تمام دنیائے انسانیت کے لئے سوہان روح بنے ہوئے ہیں یا نہیں؟ وہ تمام دریافتیں اور کائناتی تسخیر جو انسان کو انسان کی بھلائی کے لئے مقدر کی گئی تھی وہ انسانی بربادی اور ہلاکت کی بنیاد بن گئی ہے یا نہیں؟

آسمانی خلاؤں میں جدید علوم کے حصول کے بعد اپنے غرور اور قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے پلیٹ فارم پہ نصب کی ہوئی انتہائی طاقتور دوربین ساری دنیا کو اپنی نگاہوں میں سمیٹنے کی کوشش میں ہے یا نہیں؟ مشرق اور مغرب کے انسانوں (کی دو جماعتیں) جنہیں جدید علوم پہ بے انتہا عبور نے اتنا مغرور و متکبر کر دیا ہے کہ ایک مشرق کے افق پہ اور دوسرا مغرب کے افق پہ، ہاتھوں میں بم لئے، تمام دنیا کو لرزہ براندام کر کے خود نیرو (روم کا وہ بادشاہ جو روم کو جلتے دیکھ کر ساز بجا رہا تھا) کی طرح قہقہہ لگا رہا ہے یا نہیں؟ وہ صرف اس لئے کہ ان کے علوم اور ضمیر کو رحمت دوعالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیضان نصیب نہیں ہوا، وہ فیضانِ تعلیم جس میں ایک انسان کی جان تمام دنیا کے انسانوں کی جان کے برابر کی قدر و قیمت رکھتی ہے

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ (المائدہ:۳۲)

ترجمہ: جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی پیدا کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا۔ اور جو اس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں

کی زندگانی کا موجب ہو۔

(جس شخص نے کسی کی جان بغیر وجہ (یعنی کسی دوسری جان کے بدلے کے بغیر) لی یا فساد کی غرض سے کسی ایک کو جان سے مار ڈالا تو اللہ جل شانہٗ کی نگاہ میں اس کا یہ جرم اتنا سنگین ہے گویا اس نے ساری دنیا کے انسانوں کو قتل کر دیا، فساد برپا کر دیا اور جس نے کسی ایک انسان کو زندگی دی (اس کو کسی ہلاکت سے بچایا) تو اللہ کی نظر میں یہ اتنا مستحسن ہے گویا اس نے تمام دنیا کے انسانوں کو زندگی عطا کر دی)۔

حاصل معروضات یہ ہے کہ علم و حکمت میں کامیابیوں پہ مغرور ہو کر اس خالق کائنات سے انکار کرنا اچھا نہیں۔

تم سے ظہور ہونے والے یہ کارنامے اسی ذات وحدہٗ لاشریک کے عطا کئے ہوئے اختیار، عطا کی ہوئی عقل کے سہارے عمل میں آئے ہیں۔ اگر یقین نہیں آتا تو سنو! ایسے حیرت ناک کارناموں کے مظاہرے وہ اپنے ایسے بندوں سے کروا چکا ہے جنہوں نے کھلم کھلا اس بات کا اعلان کیا کہ ہم اللہ کے مخصوص وہ انسان ہیں جن کو وحی کے ذریعہ علم و حکمت [illegible] (دیکھو ہم مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔ دیکھو ہم کوڑھیوں کو اچھا کر سکتے ہیں۔ دیکھو ہم پرندوں کو پھونک مار کر اڑا سکتے ہیں

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آلِ عمران ۴۸۔۴۹)

ترجمہ اور انہیں لکھنا (پڑھنا) اور دانائی اور تورات اور انجیل سکھائے گا۔ اور (عیسیٰ) بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر (ہو کر جائیں گے اور کہیں گے) کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں وہ یہ کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بشکل پرند بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے (سچ مچ) جانور ہو جاتا ہے۔ اور اندھے اور ابرص کو تندرست کر دیتا ہوں۔ اور خدا کے حکم سے مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اور جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو سب تم کو بتا دیتا ہوں اگر تم صاحب ایمان ہو تو ان باتوں میں تمہارے لئے (قدرتِ خدا کی) نشانی ہے۔

دیکھ لیجئے، عیسیٰ علیہ السلام مغرور ہو کر یہ نہیں کہتے کہ میں اپنی عقل اور اپنی حکمت سے مادہ پر ایسا کمال کر چکا ہوں یا میری دانست نے یہ کمال حاصل کیا ہے۔ بلکہ پہلا اعتراف یہ کیا ہے کہ میں پروردگار کی طرف سے یہ نشان لے کر آیا ہوں۔ وہ نشان کیا تھے؟

وہ یہ کہ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرندہ بن جاتا ہے اور میں پیدائشی اندھوں کو بینائی دے سکتا ہوں اور سفید داغ کے جذام (کوڑھی) کو اچھا کر سکتا ہوں۔ اور خدا کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔ اور تم کو بتا دیتا ہوں جو تم گھر میں کھا کر آتے ہو۔ اور جو تم ذخیرہ چھوڑ کر آتے ہو۔ سو اگر تم حقیقی ایمان رکھتے ہو۔ یہ تمام میرے اللہ کا سچا رسول ہونے کا ثبوت ہے۔

آج کے انسان تم تو ابھی مادہ کی ترتیبوں اور عوامل کی الف بے میں کھوئے ہوئے ہو۔ تم نے ابھی انسانی بیماریوں کی تشخیص بھی نہیں سیکھی، تم تو ابھی تابکاری کی لہروں کی حقیقت سے آشنا بھی نہیں، لیکن آج سے صدیوں پہلے، انجیل اٹھا کر دیکھو اور ان بستیوں کے کھنڈرات سے جا کر پوچھو جہاں عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا پیغام پہنچایا اور مٹی سے بنائے ہوئے پرندوں میں جان پھونکی۔ اندھوں کو آنکھیں دیں، جذام کے مریضوں کو شفا دی۔

اگر اس علم و حکمت میں اللہ تعالیٰ کی تربیت شامل نہ ہوتی تو عیسیٰ علیہ السلام کو اتنے بڑے علم و حکمت کے مظاہروں کے بعد "صلیب" کی طرف گھسیٹ کر لے جانا آسان نہ ہوتا۔ تاریخ گواہ ہے اتنا عظیم علم و حکمت کا مجسمہ اپنے محسن کی احسان فراموشی نہیں کرتا بلکہ وہ انسانوں کے اذیت دینے کے باوجود ان انسانوں کی بھلائی کی دعائیں دیتا ہے۔

ذرا غور و تدبر کو زحمت دے کر سوچو۔ تم یہودی النسل ہو یا عیسائی تم جو بھی ہو، تم سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کی علم و حکمت کے کارناموں سے آگاہ تو ہو گے۔ تم تورات، زبور اور انجیل کو آسمانی کتابیں [illegible] ان ہستیوں کے بارے میں تفصیل موجود ہے۔ لیکن قرآن حکیم میں ان کا تذکرہ یوں ہے

وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ۝ (الانبیاء ۷۹)

ترجمہ اور ہم نے پہاڑوں کو داؤد کا مسخر کر دیا تھا کہ ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور جانوروں کو بھی (مسخر) کر دیا تھا اور ہم ہی (ایسا) کرنے والے تھے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَ الطَّیْرَ ۚ (سبا۔۱۰)

ترجمہ اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے برتری بخشی تھی اے پہاڑو ان کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو (ان کا مسخر کر دیا)۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؗ (الانبیاء ۷۹)

ترجمہ: اور ہم نے دونوں کو حکم (یعنی حکمت و نبوت) اور علم بخشا تھا۔

اس علم اور حکمرانی کی تفصیل سن لیجیے:

وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ ۝ (الانبیاء: ۸۱)

ترجمہ: اور ہم نے تیز ہوا سلیمان کے تابع فرمان کر دی تھی جو ان کے حکم سے اس ملک میں چلتی تھی جس میں ہم نے برکت دی تھی۔ (یعنی) شام اور ہم ہر چیز سے خبردار ہیں۔

ہواؤں کے مرکب گیسوں کا تجربہ انسان تم نے آج کیا، ان پر کنٹرول کا کچھ قرینہ تمہیں آج آیا، مگر آج سے بہت پہلے نہ جانے وہ آج سے کتنی مدت پہلے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جسے اپنی حکمت و علم کی دولت سے نوازا

تھا۔ اس کو ہواؤں پر مکمل اختیار تھا۔

اور سنو میرے معزز مفکرو، دانشورو، سائنس دانو!

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ (سبا)

ترجمہ: اور ہوا کو (ہم نے) سلیمان کا تابع کر دیا تھا اس کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ ہوتی اور شام کی منزل بھی مہینے بھر کی ہوتی۔

تم نے بڑے تیز رفتار طیارے بنائے ہیں۔ بڑے فخر کی بات ہے لیکن یہ کام پہلے انسان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کروا چکے ہیں۔

ایک اور تحریری ثبوت۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۸۲)

ترجمہ: اور دیووں (کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ ان) میں سے بعض ان کے لئے غوطے مارتے تھے اور اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے۔

آج سمندروں کی تہ میں غوطہ لگانے والے انسان! اللہ کا ایک بندہ جس نے خود اقرار کیا اور اللہ نے گواہی دی، اس کو علم و حکمت کا وہ مقام دیا کہ اس کی نگاہوں میں وہ مخلوق رہتی جسے تم آج تک دیکھ نہیں پائے اس کو ایسا علم بخشا اور حکمت بخشی کہ وہ ان پر حکمرانی کرتا اور وہ مخلوق:

وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ (سبا ۱۲)

ترجمہ: اور جنوں میں سے ایسے تھے جو ان کے پروردگار کے حکم سے ان کے آگے کام کرتے تھے اور جو کوئی ان میں سے ہمارے حکم سے پھرے گا اس کو ہم (جہنم کی) آگ کا مزا چکھائیں گے۔

آج کے دانشور سائنس دان اور عام انسان غور کر تفکر سے کام لے۔ ابھی تک تو تو ان طشتریوں کے چکر سے نہیں نکلا اور اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کا ذکر کرتے ہیں جسے تیری آنکھیں نہ دیکھ سکیں، تیری حکمت اور تیرا علم ان کے بارے میں ابھی اندھا ہے۔

اور سنو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝ (السبا ۱۳)

ترجمہ: وہ جو چاہتے یہ ان کے بناتے یعنی قلعے اور مجسمے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب اور دیگیں جو ایک ہی جگہ رکھی رہیں۔ اے داؤد کی اولاد (میرا) شکر کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہیں۔

ہم نے آج ڈیم بنائے ہیں۔ اللہ نے یہ ڈیم پہلے ہی بنوا دیے۔ ہم نے آج مختلف قلعے اور عمارتوں کو تعمیر کیا ہے۔ اللہ نے یہ کام پہلے کروا دیے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بس علم و حکمت اور اختیار دیا گیا۔

ذرا غور و تدبر کو زحمت دے کر سوچو، تم یہودی النسل ہو یا عیسائی تم جو بھی ہو تم سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کے علم و حکمت کے کارناموں سے آگاہ تو ہو گے۔ تم تورات، زبور اور انجیل کو آسمانی کتابیں نہیں سمجھتے نہ سمجھو، لیکن ان حقائق پر مبنی ان سطور کو ضرور پڑھو جن میں ان ہستیوں کے بارے میں تفصیل موجود ہے۔ لیکن قرآن حکیم میں ان کا تذکرہ یوں ہے

وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ۝(الانبیاء: ۷۹)

ترجمہ اور ہم نے پہاڑوں کو داؤد کا مسخر کر دیا تھا کہ ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور جانوروں کو بھی (مسخر) کر دیا تھا اور ہم ہی (ایسا) کرنے والے تھے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ ۚ(سبا:۱۰)

ترجمہ اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے برتری بخشی تھی اے پہاڑو ان کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو (ان کا مسخر کر دیا)۔

اور اس علم اور حکمرانی کی تفصیل سن لیجیے:

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ۔ (الانبیاء:۸۱)

ترجمہ اور ہم نے تیز ہوا سلیمان کے تابع (فرمان) کر دی تھی جو ان کے حکم سے اس ملک میں چلتی تھی جس میں ہم نے برکت دی تھی (یعنی شام) اور ہم ہر چیز سے خبردار ہیں۔

ہواؤں کے مرکب گیسوں کا تجربہ انسان تم نے آج کیا۔ ان پر کنٹرول کا کچھ قرینہ تمہیں آج آیا۔ مگر آج سے بہت پہلے نہ جانے وہ آج سے کتنی مدت پہلے تھا، اللہ تعالیٰ نے جسے اپنی حکمت و علم کی دولت سے نوازا تھا اس کو ہواؤں پر مکمل اختیار تھا۔

اور سنو میرے معزز مفکرو، دانشورو، سائنس دانو!

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ(سبا:۱۲)

ترجمہ۔ اور ہوا کو (ہم نے) سلیمان کا تابع کر دیا تھا اس کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ ہوتی اور شام کی منزل بھی مہینے بھر کی ہوتی۔

تم نے بڑے بڑے تیز رفتار طیارے بنا لیے ہیں، بڑی فخر کی بات ہے لیکن یہ کام پہلے انسان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کروا چکے ہیں:

وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ۝ۙ(الانبیاء:۸۲)

ترجمہ اور دیووں (کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ ان) میں سے بعض ان کے لئے غوطے مارتے تھے اور اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے۔

آج سمندروں کی تہ میں غوطہ لگانے والے انسان۔ اللہ کا ایک بندہ جس نے خود اقرار کیا اور اللہ نے گواہی دی، اس کو علم و حکمت کا وہ مقام دیا کہ اس کی نگاہوں میں وہ مخلوق رہی جسے تم آج تک دیکھ نہیں پائے۔ اس کو ایسا علم بخش اور حکمت بخشی کہ وہ ان پہ حکمرانی کرتا اور وہ مخلوق

وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ مَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ (سبا:۱۲)

ترجمہ اور جنوں میں سے ایسے تھے جو ان کے پروردگار کے حکم سے ان کے آگے کام کرتے تھے اور جو کوئی ان میں سے ہمارے حکم سے پھرے گا ہم اس کو (جہنم کی) آگ کا مزا چکھائیں گے۔

آج کے دانشور سائنس دان اور عام انسان غور و تفکر سے کام لے۔ ابھی تک تو تو ان جیشریوں کے چکر سے نہیں نکلا اور اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کا ذکر کرتے ہیں، جسے تیری آنکھیں نہ دیکھ سکیں، تیری حکمت اور تیرا علم ان کے بارے میں ابھی اندھا ہے۔

اور سنو—— اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝ (السباء ۱۳)

ترجمہ. وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی قلعے اور مجسمے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب اور دیگیں جو ایک ہی جگہ رکھی رہیں اے داؤد کی اولاد (میرا) شکر کرو اور میرے بندوں میں شکرگزار تھوڑے ہیں۔

ہم نے آج ڈیم بنائے ہیں۔ اللہ نے یہ ڈیم پہلے ہی بنوا دیئے۔ ہم نے آج مختلف قلعے اور عمارتوں کو تعمیر کیا ہے۔ اللہ نے یہ کام پہلے کروا دیئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بس علم و حکمت اور اختیار دیا گیا۔

الله
الصمد
القادر
المقتدر
وُجودِ باری تعالیٰ اور مُسلم عُلماء و مُفکّرین

وجودِ باری اور مسلم علما و مفکرین

اثباتِ باری کا موضوع فکرِ انسانی کی ہمیشہ ہی سے جولاں گاہ رہا ہے۔ گذشتہ ہزار بارہ سو سال کے عرصے میں ہمارے مسلم فلاسفہ، علما اور دانشوروں نے بھی اس سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد ان تمام نگارشات کا احاطہ کرنا یا اس کی اشاریہ سازی نہیں ہے۔ البتہ بحث و گفتگو کے مختلف انداز و اسالیب اور اس سلسلے کی عہد بہ عہد کوششوں سے باذوق قارئین کو ایک حد تک واقف کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں جن علما و مفکرین کے رشحاتِ قلم کو پیش کر رہے ہیں اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔	ذاتِ الٰہی کی حقیقت	ابن مسکویہ (مترجم: حکیم محمد محسن فاروقی)
۲۔	ایمانیات	امام غزالی (مترجم: محمد حنیف ندوی)
۳۔	وجودِ باری تعالیٰ	ابن رشد (مترجم: مولانا عبدالسلام ندوی)
۴۔	اثباتِ باری تعالیٰ	فخرالدین رازی (مترجم عبدالسلام ندوی)
۵۔	وجودِ باری تعالیٰ	علامہ شبلی
۶۔	حدوثِ مادہ	خواجہ غلام الثقلین
۷۔	خدا کا وجود	مولانا شبیر احمد عثمانی
۸۔	عقل کا فیصلہ	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
۹۔	کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے	وحید الدین خان

ظفر احمد صدیقی

ذات الٰہی کی حقیقت

ابن مسکویہ
مترجم حکیم محمد محسن فاروقی

فصل اول

اس امر کے بیان میں کہ یہ مسئلہ ایک اعتبار سے بہت آسان ہے اور ایک اعتبار سے سخت دشوار ہے

اس لئے کہ یہ مقصود اعظم ہماری عادات سے حد درجہ بعید اور ہمارے معمولی مقاصد سے اعلیٰ تر ہے لیکن بایں ہمہ نہایت ظاہر و روشن ہے کہ اس سے زیادہ کوئی چیز واضح و جلی نہیں، اس لیے کہ حضرت حق تعالیٰ کی ذات پاک نہایت ہی منور و مجلی ہے۔ البتہ ہمارے ضعیف عقل و ادراک اس جناب کے مشاہدہ سے عاجز و معذور ہیں۔ پس اثبات صانع باعتبار ذات حق نہایت سہل اور باعتبار ضعف و عجز عقول انسانی سخت مشکل ہے۔ اس مطلب کو ایک حکیم نے ایک عمدہ مثال سے اس طرح واضح کیا ہے کہ مخلوق کو خالق سے وہ مناسبت ہے جو خفاش کو آفتاب سے کہ باوجود غایت روشنی و ظہور کے، چمگادڑ اس کے دیکھنے سے عاجز ہے ایسی ہی انسان کی عقل ذات باری کے ادراک سے قاصر ہے۔

اس لئے حکماء و عقلاء نے اس مطلوب شریف کے حاصل کرنے کے واسطے شدید ریاضتیں اور سخت تکلیفیں برداشت کیں اور ریاضتوں کا خوگر ہو کر بتدریج ترقی کی تب کہیں اس قدر مشاہدہ کر سکے جس قدر کہ مخلوق اپنے خالق کا کر سکتی ہے۔ حقیقت میں سوائے ان ریاضات اور تدریجی ترقیات کے اور کوئی طریقہ بھی حق شناسی کا نہیں ہے۔

اکثر آدمیوں نے یہ خیال کیا کہ وہ حکماء نے اس امر کو بخل کے سبب چھپایا اور یہ مقصد شریف عوام پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ اصل بات یہی ہے کہ عوام کی عقلیں اس کے ادراک سے بالکل عاجز و قاصر ہیں جیسا کہ تمثیل مذکور سے ظاہر ہے۔

نظر بریں وجوہ اس مقصود اعلیٰ کے حاصل کرنے کے واسطے ضروری ہے کہ آہستہ آہستہ پستی سے بلندی کی طرف ترقی کی جاوے اور اس دشوار گزار منزل میں جو صعوبتیں پیش آویں ان کو صبر و استقلال سے برداشت کیا جائے، تب کہیں کامیابی ہو گی جیسا کہ ہم آئندہ مختصر طور پر بیان کریں گے اور اس کے اصول و قواعد کی طرف اشارہ کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری عقلیں جو روحانیات و الٰہیات کے ادراک سے قاصر ہوتی ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ انسان تمام موجودات جسمانی کا انتہائی مرتبہ ہے اور جملہ ترکیبات عنصری خلقت انسانی پر آ کر ختم ہوتی ہیں اور کثرت حجابات

اور ترکیب ملایمت عقلی جیسے جیسے متفرق ہوتے جاتے ہیں پردے دور ہو جاتے ہیں اور یہ حیوانی اور مادی حجابات عقل نورانی کو ادراک معقولات سے باز رکھتی ہیں اس لیے کہ عناصر بسیط جب اپنی ابتدائی حالت سے اختلاط کثرت کی جانب ترقی کرتے ہیں تو ترکیب(۱) انسانی پر پہنچ کر ان کی ترقی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ امور جو فعلیت میں آتے ہیں ان کی ترکیب و تحلیل غیر متناہی ہونی تو ممکن نہیں۔ جب اس مرتبہ پر انسان عناصر بسیط کا ادراک چاہے تو جس ترتیب سے ترکیب عناصر ہو کر مرتبہ آخری میں انسان واقع ہوا ہے اسی طرح انسان اس ترکیب کو تحلیل کرے اور ترتیب اول کے خلاف چلے تب کہیں اسے آخری مرتبہ میں جا کر عنصر بسیط کا ادراک حاصل ہو گا۔ چونکہ یہ عناصر باعتبار انسان کے مرتبہ آخر میں ہیں اور اس کے لیے ان کا ادراک دشوار و دقت طلب ہے۔

اسی مضمون کو ایک حکیم نے اپنی کتاب فتح المبین(۲) میں نہایت بلیغ پیرایہ میں ادا کیا ہے

ماهو اول عند الطبيعة فهو آخر عند الطبيعة یعنی جو اجزاء طبیعت انسانی کی ترکیب کے وقت اول مرتبہ پر تھے وہ بعد ترکیب یعنی آخری مرتبہ پر ہو جاتے ہیں یعنی یوں کہو کہ جو اجزاء یا عناصر اس وقت قریب تر تھے وہ اب بعید تر ہو گئے اور ترکیب انسانی کے اعتبار سے غور کرو تو قریب بعید اور بعید قریب تر ہو جاتے ہیں۔ اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب انسان کو ان اشیاء تک کے ادراک میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں تو جو عام اجسام میں اس سے نہایت قریب ہیں اور خود انسان کی ترکیب کے اجزاء ہیں یعنی عناصر بسیطہ تو غور کرنا چاہیے کہ الٰہیات و مجردات کا ادراک انسان کو کس قدر سخت مشکل ہو گا کہ اس عالم نورانی سے اس کو ہر طرح کی علیحدگی و بے تعلقی بلکہ حد درجہ کی دوری ہے۔ ان تمام دقتوں اور صعوبتوں پر نظر کرنے سے ضروری ہوا کہ جب ہم اس مقصود اعظم یعنی علم مجردات کا قصد کریں تو اول طبیعیات کو پورے طور پر بریاضت حاصل کریں بعد ازاں ریاضت ہائے شاقہ کے ذریعہ سے تدریجی ترقی کر کے صبر و استقلال کے ساتھ اس مرتبہ اعلیٰ تک پہنچیں ورنہ اور کوئی طریقہ منزل مقصود تک رسائی کا نہیں ہے۔ افلاطون کا قول ہے کہ "جو شخص کسی مقصد اہم میں کامیابی چاہتا ہے اسے واجب ہے کہ اس کے حاصل کرنے میں جس قدر مشکلیں اور صعوبتیں پیش آویں ہمت کے ساتھ ان کو برداشت کرے"۔ اس عالی مرتبت حکیم نے اس لئے ایسا فرمایا کہ جب انسان حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہے گا تو اشیاء عالم کے اسباب و مبادی پر صبر و استقلال کے ساتھ غور کرے گا اور اثنائے غور و فکر میں جو دشواریاں پیش آویں گی ان کا تحمل کرے گا تو بلاآخر مبدء اول (جس کا کوئی اور مبدء نہیں ہے) اور سبب حقیقی (جس سے پہلے کوئی سبب نہیں) تک ضرور پہنچ جائے گا۔ **وذلك هو الفوز العظيم.**

جاننا چاہیے کہ انسان دو طریقوں سے حقائق اشیاء کو جان سکتا ہے۔ ایک تو حواس خمسہ(۳) کے ذریعہ سے۔ یعنی بوجہ قوت حیوانیہ کے جو مادہ و موضوع سے مستغنی ہے ادراک ہوتا ہے لیکن اس ادراک میں جملہ حیوانات و انسان مشترک ہیں۔ دوسرا طریقہ جو انسان کے لیے مخصوص ہے اور جس کی وجہ سے وہ تمام حیوانات پر فضیلت رکھتا ہے۔ بذریعہ عقل ادراک کرنے کا ہے لیکن بغیر امداد حواس ظاہری صرف عقل سے انسان کا ادراک کر لینا اس وقت تک ممکن نہیں کہ مسلسل ریاضتیں نہ کی جائیں اور سخت محنتیں گوارا نہ ہوں۔ کیونکہ آغاز ولادت سے حس ظاہری ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے نفس ناطقہ نے تمام عمر میں جتنی صورتوں کا ادراک کیا ہے ان میں کوئی ایسی صورت نہیں جس کو بلا استعانت حواس و اوہام ادراک کیا ہو۔ اسی وجہ سے جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی امر عقلی کی طرف توجہ کریں تو چونکہ ہمیں عادت پڑی ہوئی ہے۔ ہمارا وہم وہی صورت حسیہ پیش کر دیتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی امر عقلی اپنی خالص شکل میں بغیر شمول کسی صورت حسی کے ہمارے ذہن

میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ خیال کرو کہ جب تم عقل یا نفس ناطقہ یا کسی اور غیر مادی چیز کے ادراک کا قصد کرتے ہو تو بغیر اس کے کہ کسی ایسی صورت جسمانی کا تصور کرو جس کی تمہیں عادت اور اس سے انسیت ہے اور اس پر ان امور روحانی کو قیاس کرلو اور کسی طریقہ سے تم ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ایسا ہی حال ان تمام روحانیات کا ہے جو عام اجسام کے علاوہ ہیں کہ ہم ان کو کسی طرح پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ مثلاً جب ہم خیال کرتے ہیں کہ تمام اجسام سے آگے خلا ہے یا ملاء تو برہان قوی و دلیل عقلی صاف بتاتی ہے کہ نہ خلا ہو سکتا ہے نہ ملاء لیکن یہ بات کسی طرح ذہن میں نہیں بیٹھتی کیونکہ ہم عالم اجسام میں اس امر کے عادی ہیں کہ ہر جگہ یا خلا ہو گا یا ملاء حالانکہ عقل سلیم یقینی و حتمی طور پر ثابت کر رہی ہے کہ ایسا ہی ہے اور خود ہمارے سامنے دلائل موجود ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ امور عقلیہ کے ادراک کی عادت ہی نہیں اور ہمیشہ امور حسیہ ہی ہمارے مانوس و مالوف رہے ہیں لیکن باوجود ان سب باتوں کے جب ہم اتنی سخت ریاضتیں کرتے ہیں کہ بخلاف اپنی عادت و طبیعت کے معقولات و مجردات کی طرف توجہ مبذول کرتے رہتے ہیں اور حواس ظاہری سے زیادہ کام لینا بقدر امکان چھوڑ دیتے ہیں اور اس قدر غور و فکر امور عقلی میں کرتے ہیں کہ آخر کو اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ مشقت مالوف ہو جاتی ہے تو آنکھیں کھلتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ معقولات محسوسات سے کس قدر افضل واشرف ہیں، بلکہ اس وقت یہ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ جسم محسوسات بمقابلہ محسوسات متغیر و متبدل ہوتے رہتے ہیں اور کوئی ایک حال پر قائم نہیں رہتا، بلکہ تھوڑی مدت تک بھی اس کی ایک سی حالت نہیں رہتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ محسوسات میں کوئی بھی مادہ و جسم سے خالی نہیں اور مادہ میں ہمیشہ کمی و بیشی شدت وضعف ہوتا ہی رہتا ہے بلکہ حرکات و سکنات تک سے اس میں تغیر آتا رہتا ہے۔ پس ہم بوقت ادراک بجائے خود سمجھ لیتے ہیں کہ یہ محسوس بہمہ جہت ہمیں حاصل ہو گیا مگر کچھ عرصہ بعد اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ہو جاتی ہے اور ہماری تصویر ذہنی سے اصل شے میں ضرور بہت کچھ تغیر آجاتا ہے۔

اس مضمون کو مثال سے اس طرح ذہن نشین کرو کہ آنکھ نے کسی چیز کو ایک خاص حالت پر دیکھا ضرور، وہ چیز دوسرے وقت دوسرے حال پر ہو جائے گی کیونکہ مادہ میں تبدیلی ہونی ضروری ہے۔ مثلاً کسی نے زید کو آج کی تاریخ میں دیکھا تو آج زید کے لیے ایک مخصوص مقدار اعتدال کی اور ایک خاص کیفیت مزاج کی سمجھی جاتی ہے لیکن چونکہ زید کی حرارت غریزی اس کی اصلی رطوبت میں ہمیشہ اپنا عمل کر کے بصورت بخارات کچھ حصہ تحلیل کرتی رہتی ہے اور غذا و ہوا کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً اس کا بدل بدن کو پہنچتا رہتا ہے اور یہ کمی و بیشی ہمیشہ کارخانہ بدن میں جاری رہتی ہے لہذا ضروری امر ہے کہ پھر جو زید کو دیکھا جائے گا تو وہ یقیناً محسوس اول سے غیر ہے اگرچہ نظر اس تغیر کا اچھی طرح امتیاز نہیں کر سکتی۔ لیکن عقل ان نیرنگیوں کو خوب سمجھتی ہے جو عالم اجسام کی ہر چیز میں ہوتی رہتی ہیں اور ہونی ضرور ہیں۔

یہ حال تو محسوسات کا ہے مگر معقولات میں کبھی کسی قسم کا تغیر و تبدل کوئی حرکت و سکون نہیں ہوتا بلکہ وہ ازلی وابدی ہیں اور ہمیشہ ایک حال پر رہتے ہیں پس جو لوگ بعد محنت و ریاضت ادراک معقولات کرنے لگتے ہیں، انہیں یہ عالم محسوسات ایک ملمع کا زیور معلوم ہوتا ہے اور عالم روحانیات اصلی جوہر۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر افلاطون نے اس عالم کا نام عالم سوفسطائی (عالم ملمع) رکھا ہے اور ہمیشہ علما و حکما اس عالم کو رذیل و حقیر سمجھتے رہے کبھی اس کی طرف توجہ نہ فرمائی اور معقولات کو شریف و معظم سمجھ کر انہیں کی طلب و تحصیل میں مشغول رہے۔ بیان مذکورہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ جب ہم اس عالم محسوسات کے ادراک حقایق سے ترقی کر کے اس عالم روحانیات کے ادراک کا قصد کرتے ہیں تو ہمیں سخت مجاہدہ اپنی طبیعت

سے کرنا پڑتا ہے اور ان تمام سورتوں کو جو حواس ظاہری کی ادراک کردہ ہمارے دماغ میں بسی ہوئی ہیں اور معقولات صحیحہ کے ادراک میں مغالطہ و اشتباہ کا باعث ہوتی ہیں خیر باد کہنا پڑتا ہے اور تمام اوہام سے جو حواس سے حاصل کیے گئے تھے علیحدگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مگر یہ بے تعلقی بہت دشوار کام ہے اس لیے کہ اپنی ہمیشہ کی عادات کے خلاف کوئی کام اختیار کرنا اور عادۃ مخلوق سے علیحدگی حاصل کرنا کس قدر سخت دشوار ہے۔ جس قدر یہ علم مشکل ہے اس سے زیادہ یہ جدائی و بے تعلقی مشکل ہے کیونکہ انسان ایسے وقت میں گویا اپنے پہلے وجود سے قطع تعلق کر کے دوسرا وجود اختیار کرتا ہے مگر خدا کے خاص بندے اس مشقت کو اس لئے گوارا کرتے ہیں کہ اس علم اعلیٰ کی لذتیں غیر فانی اور انجام نہایت پر لطف و دلپسند ہوتا ہے۔ اس علم کی برکت سے ملک ابدی کی سیر میں اور دائمی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ انتہا یہ کہ جنت اعلیٰ اس کا مقام ہوتا ہے اور ملاء اعلیٰ جلیس و ہمدم اور جناب باری جل شانہ کے قرب مبارک سے فیض یاب ہوتا ہے۔

سرور و عیش و طرب بیش ازیں چہ خواہد بود
وفور نعمت رب بیش ازیں چہ خواہد بود

اس مضمون کو ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے۔

چونکہ یہ مقصود شریف نہایت دشواری سے حاصل ہوتا ہے اس لیے میں نے اس کے واسطے چند مراتب مقرر کئے جیساکہ پچھلے بیان میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ایک علم ادنیٰ، دوسرا علم وسط، تیسرا علم اعلیٰ اور علم ادنیٰ سے جو اپنی عادت و طبیعت سے زیادہ مناسب تھا ابتدا سے آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا تاکہ کوئی منزل درمیان میں رہ بھی نہ جائے اور جب ایک درجہ اچھی طرح طے ہو جائے اور اس کے علوم پر پوری قدرت ہو جائے تب دوسرا شروع کیا جائے۔

اس تدریجی ترقی سے میں منزل مقصود پر پہنچ گیا کیونکہ جو شخص علوم ریاضیہ سے شروع کر کے بتدریج ترقی کرتا جائے اور تحصیل منطق کے بعد جو فلسفہ کا آلہ ہے طبعیات حاصل کر کے ترتیب فلسفہ تک پہنچے اس کو فلسفی کہہ سکتے ہیں ورنہ جس شخص نے جس علم کی خدمت کی ہے اسی کا خطاب پانے کا مستحق ہوگا۔ مثلاً ریاضی دان کو مہندس کہا جائے گا اور نجوم کے عالم کو منجم، کسی کو طبیب، کسی کو منطقی، کسی کو نحوی وغیرہ۔ ان میں کسی کو فلسفی نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جو تمام علوم کو بتدریج حاصل کر کے غایت درجہ تک پہنچے اور ترقی کرے وہ فلسفی کے معزز خطاب سے مخاطب ہو سکتا ہے۔

فصل دوم

حکمائے متقدمین کا مسئلہ اثبات صانع پر اتفاق:

فصل اول کے مضمون کے موافق جو لوگ فی الواقع فلسفی و حکیم کا خطاب پانے کے مستحق تھے یعنی جنہوں نے حسب بیان سابق تدریجی ترقیات و شاقہ ریاضات کے بعد مسائل الٰہیات میں غور و فکر کیا اور ان میں سے کسی نے ثبوت صانع میں اختلاف نہیں کیا۔ نہ کسی نے اس امر سے انکار کیا کہ جو صفات انسان کی طرف بقدر طاقت بشری منسوب کی جاتی ہیں وہ بحد کمال جناب باری عزاسمہ میں پائی جاتی ہیں مثلاً جود و کرم و قدرت و حکمت وغیرہ۔ اصل میں یہ تمام صفات اسی جناب اقدس کی ہیں ہم انسانوں کے واسطے تو فقط مستعار ہیں۔

اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم فرفوریوس حکیم کا قول پیش کرتے ہیں: منجملہ ان امور کے جو عقل کے نزدیک

بدیہی ہیں ایک مسئلہ ثبوت صانع بھی ہے اور یونان کے تمام حق پسند و خوش فکر حکماء اس کی بداہت کے قائل ہوئے ہیں۔ جو لوگ ثبوت صانع کی بداہت کے قائل نہیں ہیں ہمارے نزدیک وہ قابل تذکرہ نہیں اور زمرہ حکماء میں شامل ہونے کے مستحق بھی نہیں۔ انہوں نے اس بات کی تحقیق کی وجہ سے بڑی غلطیاں کیں اور ان کو ایسے امور کا اقرار کرنا پڑا جو خلاف مشاہدہ و بداہت تھے اس لیے کہ جتنے لوگ گزرے ہیں کہ ثبوت صانع بدیہی نہیں ہے ان کا یہ قول کسی قاعدہ کلیہ پر مبنی نہ تھا اور نہ یہ بات پہلے پہل باغور و فکر ان کی عقل میں آئی جیسا کہ بدیہیات کا قاعدہ ہے۔ چنانچہ ان غلطیوں کا سبب یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے لیے کوئی صحیح شاہراہ اختیار نہ کی تھی اور کسی قاعدہ کلیہ کے پابند نہ تھے۔ اسی وجہ سے جب ان کے اقوال باہم متناقض ہوئے تو بالآخر پریشان ہو کر عقل سلیم کے خلاف اصول قائم کرنے لگے۔ میں ایسے لوگوں سے مباحثہ کرنا پسند نہیں کرتا بلکہ جن لوگوں کی عقلیں حد طبعی تک ہی محدود ہیں ان سے کلام کرنا بھی نہیں چاہتا تاوقتیکہ وہ محنت و ریاضت سے اپنی عقول کو مہذب نہ بنالیں اور حق باتوں کے سمجھنے کا مادہ نہ پیدا کریں۔"

دیکھو حکیم فرفوریوس کا یہ ارشاد کس قدر زوردار اور پرجوش ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی حکیم جو فکر سلیم رکھتا ہے اثبات صانع کا منکر نہیں۔

اگر غور کرو تو ظاہر ہو جائے گا کہ صانع حقیقی کے وجود پر صاحب عقل کا اتفاق ضروری و لازمی ہے اس لیے کہ جو انسان ریاضت و محنت کے ذریعہ سے (جس طرح ہم نے پچھلی فصل میں بیان کیا ہے) اپنی عقل کو خالص کرلے گا اور اس کو حسیات و اوہام سے جدائی حاصل ہو جائے گی۔ وہ یقیناً اسی نتیجہ پر پہنچ جائے گا جس پر اہل حکمت و بصیرت پہنچ گئے اور وہی کہنے لگے گا جو حکمائے عالی مقام و انبیاء علیہم السلام کہہ چکے ہیں۔ دیکھیے کہ جملہ بانیان سلف نے تمام عالم کو مسئلہ توحید کی تلقین فرمائی اور عدل و انصاف کی راہ بتائی۔ عوام کو بحکم ایزدی قوانین سیاست کا پابند کیا اور خواص کو عقل و تمیز کے طریقے سکھائے کیونکہ جس طرح اطباء بدن انسان کا علاج کرتے ہیں ایسے ہی انبیاء مرسلین مخلوق کے روحانی طبیب ہیں اور نفس انسانی کا معالجہ فرماتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بیماروں کو علاج کے وقت جبر اور تشدد کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ کبھی زدوکوب تک کی نوبت آجاتی ہے اس لیے کہ جو مفید دوا طبیب دینا چاہتا ہے اس کی منفعت کو تو مریض سمجھتا نہیں اور پینے میں تامل کرتا ہے تو زبردستی بلکہ سختی پلانی پڑتی ہے۔ اکثر مریضوں کو طبیب لوگ اس کا سبب نہیں بتلاتے کہ تمہیں کیوں ان مرغوب اشیاء سے پرہیز کرنے اور ایسی ناپسندیدہ غذاء و دوا کے استعمال کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اول تو اس میں وقت بہت ہے پھر نہ وقت کافی نہ ضرورت داعی۔ دوسرے اکثر مریض ان باریک باتوں کے سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ پس ہر تدبیر کی علت بتانے میں نفع کم ہوگا اور محنت زیادہ۔ ایسے ہی اکثر مریضوں کو دیکھا جاتا ہے کہ جب وہ طبیب کی محنت و علاج سے شفایاب ہو گئے تو محض جی چاہنے کی خاطر اپنی پسندیدہ اشیاء کو کھانے کے لیے تاویلیں کرنے لگتے ہیں اور اپنے نزدیک کوئی مفید ترکیب تجویز کر کے استعمال کرنی شروع کر دیتے ہیں اگرچہ وہ ترکیب سراسر مضر ہی کیوں نہ ہو۔

بالکل یہی حال روحانی مریضوں کا ہے کہ حکمائے ذوی الاحترام و انبیائے علیہم السلام طالبان حقیقت کو یہ تدبیر بتاتے ہیں کہ عالم اجسام کے مکدر عادات و حالات اور حواس و اوہام کے تعلقات کو قطع کر کے مجرد عقل سے غور کرو اور نظر عمیق سے کام لو تو مقصود حقیقی کا علم حاصل ہوگا اور تمہارے نفس کو صحت کلی اور راحت اصلی نصیب ہوگی۔

مگر چونکہ یہ تدبیر دشوار ہے (جیسا کہ ہم فصل گذشتہ میں بتفصیل بیان کر چکے ہیں) اس لیے کج فہم و

بدبخت لوگ تحکم شارع میں تاویلیں نکالنے لگے۔ کیونکہ ایک تو اس میں آسانی و آسائش بھی ہے کہ کون ریاضتوں کے جھگڑے میں پڑے اور تمام لذائذ دنیا کو ترک کرے۔ دوسرے ان کو خیال ہوتا ہے کہ ان تاویلوں کے تراشنے کی وجہ سے ہم بھی عوام میں اعتبار پیدا کریں گے اور ایک مستقل مذہب کے بانی ہو بیٹھیں گے۔ بس اپنے احوال و خواہشات کے موافق ایک نئی تاویل اور نیا مذہب ایجاد کرکے ایک دوسرے پر طعن و تشنیع اور رد و قدح کرنے لگے۔ چونکہ لوگوں کی طبیعتیں اور خواہشیں مختلف ہوتی ہیں اس سے اختلاف رائے بہت ہو گیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دوسرے کا دشمن ہو گیا۔ یہ ہے اصلی وجہ اختلاف مذاہب و مشارب کی۔

ہم آئندہ بالاختصار ایسے دلائل پیش کریں گے جن سے معلوم ہو جائے گا کہ جو شخص انصاف کے ساتھ غور و خوض کرے گا وہ توحید باری اور وجود صانع کا جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا ہے ضرور قائل ہو جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے ہمیں یہ دلائل بتائے ہیں وہ خود بھی اسی امر کے قائل و معتقد تھے۔

فصل سوم

اس بیان میں کہ ہم حرکت سے وجود صانع پر استدلال لاتے ہیں اور یہ کہ حرکت ہی اس استدلال کے لیے تمام اشیاء سے بہتر و اظہر ہے۔

فصل اول میں بیان ہو چکا ہے کہ چونکہ ہم خود اجسام طبعیہ رکھتے ہیں اور ہمارے احوال ان کے مناسب ہیں اس لیے ہم جن اشیاء سے بحث کر سکتے ہیں ان میں ہم سے قریب تر و مناسب ترین یہی اجسام طبعیہ ہیں۔ ان ہی کو ہم اپنے حواس خمسہ سے ادراک کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا بیان کی تفصیل یہ ہے کہ ہر قوت حاسہ ان چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو اس کے مناسب ہیں اس طور پر کہ ہر حاسہ کو ایک اعتدال مخصوص عطا فرمایا گیا ہے۔ پس جس وقت اس قوت پر اسی قسم کی کسی بیرونی چیز کا اثر پڑتا ہے اور وہ بیرونی چیز کسی کیفیت میں اس کی مخالف ہوتی ہے تو وہ قوت اس کو معلوم کر لیتی ہے۔ اسی کو ادراک و احساس کہتے ہیں۔

اس دقیق مسئلہ کو مثال سے ذہن نشیں کرنا چاہیے کہ قوت ذائقہ کو جو رطوبت عنایت کی گئی ہے اس کے ذریعہ سے وہ دوسری رطوبت کو جو فی الجملہ اس کی اپنی رطوبت سے اختلاف رکھتی ہے ادراک کرتی ہے۔ قوت سامعہ اپنی ہوائے معتدل سے ہوائے مخالف کو جو اس کے پاس آتی ہے احساس کرتی ہے۔ ایسے ہی قوت لامسہ کو اعتدال ارضی دیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی جنس کی کیفیت مخالف کو ادراک کرتی ہے اور قوت باصرہ اپنی شعاع ناری سے دوسری اور بیرونی شعاع ناری کا احساس کرتی ہے علیٰ ہذا القیاس قوت شامہ۔

لیکن اس میں ذرا سا فرق ہے کہ قوت شامہ مرکب ہے اس واسطے کہ یہ قوت بخارات کا ادراک کرتی ہے اور بخار ہوا اور پانی سے مرکب ہوتا ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوت کے ادراک کا طریقہ ذرا تفصیل سے بیان کر دیں تاکہ دوسری قویٰ کا حال اس پر قیاس ہو سکے۔

کان کی تجویف میں جو ہوا موجود رہتی ہے اس کو ایسا اعتدال حاصل ہے جو دوسری ہوا کے قبول کرنے کے لئے مناسب و موافق ہے۔ پس جب کوئی بیرونی ہوا اس اصلی ہوا کو حرکت دیتی ہے تو انسان معلوم کر لیتا ہے اور اسی کا نام ادراک و احساس ہے۔

ایسے ہی اس رطوبت کو قیاس کرو جو زبان میں رکھ دی گئی ہے۔ اب ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ "ہر جسم طبعی کے

لئے ایک حرکت ضروری ہے جو اسی کے واسطے خاص ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جسم کے دو حال ہو سکتے ہیں یا تو بالفعل موجود ہو یا وجود کے واسطے مستعد و تیار ہو اور جسم کا تعین و قوام اس صورت سے ہوتا ہے جو اس کے لیے خاص ہوتی ہے اور وہی صورت خاصہ ایسی چیز ہے جس سے کسی جسم کی ذات یا حقیقت بنتی ہے اور جو ذات ہے وہی طبیعت ہے۔ کسی جسم کی طبیعت ہی اس کی حرکت خصہ کا سبب ہوتی ہے اور طبیعت ہی جسم کو اس کے غایت کمال کی طرف حرکت دیتی ہے اور اس کو کامل کرتی ہے اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ہر شے کی غایت اس کے مناسب و موافق ہوتی ہے تو جس طرح ہر متحرک اپنی غایت کی طرف ضرور حرکت کرتا ہے اسی طرح یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر متحرک جب حرکت کرے گا تو ضرور ہے کہ اس کو اپنے متمم و غایت کی جانب شوق و رغبت ہوگی اور ظاہر ہے کہ جو چیز مشتاق الیہ و مطلوب ہوتی ہے وہ علت ہوتی ہے مشتاق و طلب کی اور ہر علت کا اپنے معلول سے بالطبع(۱) مقدم ہونا لازم و واجب ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جب تمام اجسام طبعی کا متحرک ہونا لازم ہے اور ان کے لئے محرک کا ہونا بھی ضروری ہے جو ان کی علت ہو گا تو صانع اول وعلت حقیقی کے وجود پر حرکت سے استدلال کرنا تمام چیزوں سے زیادہ صریح و اظہر ہے کیونکہ حرکت کا تمام اجسام کے لیے ضروری و ابدی ہونا ثابت ہو چکا۔ اب ہم بطور تمہید حرکت کے اقسام بیان کرتے ہیں جس کا نتیجہ اگلی فصل میں ظاہر ہوگا۔

اجسام طبعی کی حرکات چھ قسم کی ہو سکتی ہیں۔ حرکت کون، حرکت فساد، حرکت نمو، حرکت نقصان، حرکت استحالہ، حرکت نقل۔ اس لیے کہ حرکت ایک قسم کے تبدل یا نقل کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جسم میں تبدل تین صورتوں سے ممکن ہے یا اس کی کیفیت میں یا اس کے مکان میں یا خود اس کے جوہر وذات میں۔

اب تبدل مکانی یا کل مکان کی نقل و حرکت سے ہوگا یا جزوی۔ کل کے تبدل کا نام حرکت مستقیمہ ہے اور تبدل جزوی کو حرکت مستدیرہ کہتے ہیں۔ پھر حرکت مستدیرہ میں بھی دو صورتیں ہیں اگر مرکز سے محیط کی طرف حرکت ہوگی تو نمو کہلائے گا اور محیط سے مرکز کی طرف حرکت ہوگی تو ذبول نام رکھا جائے گا۔

وہ جسم جس کی کیفیت میں تبدل ہو اس کی بھی دو حالتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس جسم کی کیفیت بدل جائے لیکن اس کی ذات قایم و محفوظ رہے۔ دوسری کیفیت کے ساتھ جوہر بھی متبدل ہو جائے۔ پہلی صورت کو استحالہ کہتے ہیں اور دوسری کو فساد۔ اس شکل ثانی میں جب اس جوہر کی طرف قیاس کریں جس کی صورت میں بعد تبدل کیفیت و جوہر اس جسم نے استحالہ کیا ہے تو اس حرکت کو کون کہتے ہیں۔

فصل چہارم

اس بیان میں کہ محرک ہر متحرک کا اس کے سوا کوئی دوسری چیز ہے اور یہ کہ جو تمام اشیاء کا محرک ہے وہ خود متحرک نہیں۔

اس فصل میں دو باتیں ثابت کرنی مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ ہر متحرک کا (خواہ وہ مذکورۂ بالا حرکات میں سے کوئی حرکت رکھتا ہو) کوئی محرک ضرور ہے اور وہ اس متحرک کے سوا کوئی دوسری چیز ہے اور اس سے غیر ہے۔ دوسرے یہ کہ جو تمام اشیاء کا محرک ہے وہ خود متحرک نہیں بلکہ ان اشیاء کا متمم یا ان کی حرکت کی علت ہے۔

پہلا دعویٰ اس طور پر ثابت کیا جاتا ہے کہ ہر جسم جو حرکت کرتا ہے ضرور ہے کہ کوئی نہ کوئی اس کو حرکت دیتا ہوگا تو جسم متحرک دو حال سے خالی نہیں یا حیوان ہوگا یا غیر حیوان۔ اگر حیوان ہے اور کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس کی حرکت ذاتی ہے

کسی غیر کی طرف سے نہیں ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر اس حیوان کے اجزا میں سے کوئی جزو شریف ہم علیحدہ کرلیں تو بوجہ حرکت ذاتی وہ حیوان بھی متحرک رہنا چاہیے اور اس کا وہ جزو منتزع بھی (کیونکہ جزو اپنی حقیقت و ماہیت میں مثل کل کے ہوتا ہے) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ (بلکہ جزو کے علیحدہ کر لینے سے اس کی حرکت جاتی رہتی ہے) لہٰذا معلوم ہوا کہ جسم حیوان کی حرکت اس کی ذات سے نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی اور محرک ہے جو اس سے غیر ہے۔ اگر متحرک غیر حیوان ہو تو یا نبات ہو سکتا ہے یا جماد۔ نبات میں وہی حیوان کی دلیل جاری ہوگی اس لیے کہ اس میں بھی حرکت نمود وغیرہ اسی قسم کی ہوتی ہے۔

البتہ رہا جماد سو اس میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جماد یا تو عناصر میں سے ایک عنصر ہوگا یا عناصر کے مرکبات میں سے کوئی مرکب جمادی۔ اگر عنصر واحد ہو تو بحالت حرکت ذاتی فرض کرنے کے یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے مرکز و مقام خاص پر جا کر متحرک رہے اور ساکن نہ ہو کیونکہ حرکت اس کی ذات سے متعلق فرض کی گئی ہے اور اگر اپنے مرکز پر ٹھہر جاوے تو لازم آتا ہے کہ سوائے مرکز کے بھی جہاں کہیں چاہے مثل حیوان کے ٹھہر جایا کرے اور جب چاہے حرکت کیا کرے۔ حالانکہ یہ امر مشاہدہ و بداہت کے خلاف ہے) اس لئے کہ تمام عناصر جب تک اپنے مقام مخصوص پر نہیں پہنچتے متحرک رہتے ہیں اور مرکز پر پہنچتے ہی ساکن ہو جاتے ہیں)۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ عناصر و جمادات کی حرکت ان کی ذات سے نہیں ہے (بلکہ کسی محرک کی وجہ سے ہے جو ان کی ذات سے غیر ہے اور یہی ہمارا مقصود تھا)۔ اگر کوئی یہ کہے کہ عناصر اپنے مرکز کے طالب و مشتاق رہتے ہیں اور ان کی حرکت اپنے مکان خاص کے طلب و اشتیاق کی وجہ سے ہوتی ہے اور وہی مطلوب ان کا محرک ہے تو بھی ہمارا مقصود حاصل ہے کہ جو ان کا مطلوب ہے وہ طالب و متحرک سے لامحالہ غیر ہے۔

اس مضمون کو ہم دوسری طرز سے بیان کرتے ہیں کہ ہر حیوان کی حرکت دو وجہ سے ہو سکتی ہے یا تو وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور اس کی خواہش کرتا ہے تو اس کی جانب دوڑے گا یا اس سے نفرت کرتا ہے تو اس سے بھاگے گا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ وہ محبوب یا مکروہ جو باعث حرکت ہو اس متحرک حیوان سے ضرور غیر ہوگا۔

اب ہم اس محرک سے بحث کرتے ہیں کہ یہ کسی قسم کی حرکت رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر رکھتا ہے تو موافق دلائل مذکورہ اس کے لئے بھی کسی محرک کا ہونا لازم ہے۔ اسی طرح ہم اس محرک کو بھی دیکھیں گے اور یہی قاعدہ جاری کریں گے۔ پس خواہ مخواہ یہ ماننا پڑے گا کہ کوئی محرک ایسا نکلے جو کسی قسم کی حرکت نہ رکھتا ہو ورنہ تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے۔ یہی مقصود تھا۔ اسی دلیل سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ محرک (جو متحرک نہیں ہے) جسم نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ہر جسم کا متحرک ہونا ضروری ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ یہی محرک جو خود متحرک نہیں ہے تمام اشیاء کے وجود کا سبب اول اور علت العلل ہے اور اسی سے ہر جوہر موجودہ کا قوام و وجود عالم ظہور میں آیا۔ اسی بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تمام اشیاء میں جو وجود پایا جاتا ہے وہ بالعرض ہے اور خلاق کون و مکان میں بالذات۔ اس لیے کہ تمام حکماء اس امر پر متفق ہیں کہ جو چیز کسی شے میں بالعرض پائی جاتی ہے ضرور ہے کہ وہ کسی دوسری چیز میں بالذات پائی جاوے گی کیونکہ جو چیز کسی شے میں عارض ہوتی ہے وہ ایک اثر ہے اور ہر اثر حرکت ہے جس کے لئے موثر و محرک کا ہونا ضروری ہے۔ یہ سلسلہ اثر و موثر کا ایک ایسے موثر پر جا کر ختم ہونا واجب ہے جو خود کسی کا اثر قبول نہ کرتا ہو بلکہ بذاتہ موثر ہو جیسا کہ سابقاً بیان بھی کیا جا چکا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مبدع اول و خالق ازل کے واسطے وجود ذاتی ہے کہ اس نے کسی سے اس وجود کو حاصل نہیں کیا البتہ اس ذات پاک سے تمام عالم کی اشیاء کو وجود عنایت ہوا اور اس

کے وجود سے اپنا وجود [illegible] تمام موجودات [illegible] صورت پذیر ہوئی۔

مذکورہ بالا تقریر [illegible] یہ ثابت ہو [illegible] باری [illegible] جو چاہتی ہے کہ کوئی شخص اس کو معدوم نہیں خیال کر سکتا [illegible] وجود کا بھی تصور ساتھ ہی آتا ہے اسی واسطے واجب الوجود کہتے ہیں۔

اور جو واجب الوجود [illegible] جناب باری تعالیٰ شانہ کا واجب الوجود اور ازلی ہونا معلوم [illegible] ذات پاک میں درجہ اتم و اکمل نہ پایا جاوے کیونکہ اسی مبدء فیاض نے تمام موجودات [illegible] کمالات ازلی ہیں۔ وہ ذات اقدس اعلیٰ درجہ [illegible] تمام مخلوق [illegible] ادنیٰ درجہ کا ہے۔

اس دعوی پر کہ [illegible] متحرک [illegible] کوئی محرک اس سے [illegible] ہم ایک اور دلیل لاتے ہیں کہ ہر متحرک یا حرکت طبعی کرے گا یا غیر طبعی۔ اگر طبعی حرکت [illegible] طبیعت نے اس کو حرکت دی جو متحرک سے غیر ہے۔ جیسا کہ [illegible] (۵) [illegible] (۲) [illegible] اور حرکت غیر طبعی ہوگی تو وہ حال سے خالی نہیں یا بارادہ [illegible] یا بجبر۔ [illegible] صورت میں [illegible] (اس سے مراد) وہ باعث حرکت ہے جو یقیناً متحرک سے غیر ہے اور [illegible] جبر والا محرک اصل متحرک سے غیر ہے۔ غرض محرک کا متحرک سے غیر ہونا لازم ہے۔ اب اگر وہ محرک خود بھی متحرک ہوگا تو ہم یہی تقریر اس میں جاری کریں گے یہاں تک کہ سلسلہ ایسے محرک پر منتہی ہوگا جو خود متحرک نہ ہو اور تمام محرکین سے مقدم و اول ہو۔ وہی ذات واجب ہے۔ ایک دلیل اور پیش کی جاتی ہے کہ ہر جسم طبیعت ضرور رکھتا ہے اور طبیعت ہے تو حرکت بھی لازم ہے کیونکہ حرکت طبیعت کی دلیل و نشانی ہے۔ پس یہ ممکن نہیں کہ جو محرک اول ہے وہ متحرک [illegible] اگر متحرک ہوگا تو کوئی اس کا محرک ضرور ماننا پڑے گا اور جب کوئی محرک تھا تو اولیت جاتی رہی حالانکہ ہم نے فرض یہ کیا تھا کہ محرک اول ہے ھذا خلف یعنی یہ اس امر کے خلاف ہے جو پہلے فرض کیا گیا تھا)۔

اسی دلیل سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ محرک اول جسم بھی نہیں رکھتا اس لئے کہ جسم کے واسطے متحرک ہونا لازم ہے اور متحرک ہونے کی صورت میں وہی مذکورہ دلائل پیش ہوتے ہیں۔

فصل پنجم

اس امر کے بیان میں کہ ذات باری تعالیٰ واحد ہے۔

واحد ہونے کی یہ دلیل ہے کہ اگر پروردگار عالم اور فاعل حقیقی ایک سے زیادہ ہوں گے تو لازم ہے کہ وہ سب مرکب ہوں اس لئے کہ فاعل ہونے میں تو سب مشترک ہوں گے اور اپنی اپنی ذات میں مختلف ہوں گے۔ یہ ضروری بات ہے کہ جس چیز کی وجہ سے مخالفت ہے وہ غیر ہو اس چیز سے جو باعث اشتراک ہے۔ پس ہر فاعل مرکب ہوگا اپنے جوہر ذاتی سے اور زیادتی خاص سے اور ترکیب خود حرکت ہے کیونکہ ترکیب ایک اثر ہے جس کے لئے موثر کی ضرورت ظاہر ہے۔ (جیسا کہ سابقاً بیان کیا گیا) تو لازم آئے گا کہ فاعل مرکب کے لئے کوئی اور فاعل ہو اور ایسے ہی سلسلہ غیر متناہی حد تک جائے گا۔ پس ضروری ہوا کہ یہ سلسلہ کسی ایک فاعل پر ختم ہو جو واحد ہو ورنہ تسلسل محال لازم آئے گا۔

اس دلیل میں یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ فاعل واحد سے کثیر و مختلف افعال کس طرح سرزد ہو سکتے ہیں خصوصاً ایسے افعال جو ایک دوسرے کی ضد بھی ہوں کیونکہ واحد بسیط سے فعل بسیط ہی سرزد ہو سکتا ہے۔ یعنی واحد جو ہر حیثیت اور ہر جہت سے واحد ہی ہو اس سے ایک ہی فعل صادر ہو سکتا ہے۔

اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورتیں جن میں فاعل واحد افعال کثیر و مختلف کر سکتے چار ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ فاعل مرکب ہو اور اس میں چند اجزاء یا چند قوتیں پائی جائیں دوسرے یہ کہ اس فاعل کے افعال مختلف مادوں میں ہوں یعنی منفعل بہت سے ہوں۔ تیسرے یہ کہ فاعل کے افعال بذریعہ مختلف آلات (اوزار) کے ہوں۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ فاعل واحد سے افعال کثیر صادر ہوں لیکن صرف اس فاعل کی ذات سے ہی نہ صادر ہوں بلکہ دوسری اشیاء کے ذریعہ سے سرزد ہوں اور وہ اشیاء صدور فعل میں واسطہ ہوں۔ پہلی صورت کی مثال انسان ہے کہ بعض افعال قوت شہویہ کے اقتضا سے کرتا ہے اور بعض افعال قوت غضبیہ کی وجہ سے اور بعض عقل کی وجہ سے۔

تو گویا انسان مختلف قوتوں سے مرکب ہے اس وجہ سے اس سے افعال کثیر صادر ہوتے ہیں۔ دوسری صورت کی مثال نجار (بڑھئی) ہے جو کھودنے کا کام بسولے سے کرتا ہے اور سوراخ کرنے کا کام برمے سے۔ وغیرہ۔

تیسری شکل آگ کی مثال میں پائی جاتی ہے کہ آگ لوہے کو نرم کر دیتی ہے اور مٹی کو سخت۔ یعنی ایک ہی فاعل مختلف مادوں میں مختلف اثر کرتا ہے۔

چوتھی صورت کو کہ فاعل بعض افعال بذاتہ کرے اور بعض دیگر اشیاء کے توسط سے بالعرض صادر کرے اس مثال سے سمجھنا چاہیے کہ برف بالذات تبرید کرتا ہے اور بالعرض و بتوسط گرمی پیدا کرتا ہے اس طرح کہ برف بدن انسان میں اپنی تبرید کے سبب تکثیف مسامات کرتا ہے جس سے قبض ہو جاتا ہے اور حرارت گھٹ کر بدن انسان کو گرم کر دیتی ہے۔ برف کا گرم کرنا بالذات نہیں ہے بلکہ کسی دوسری چیز کے توسط سے ہے۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ ان چاروں صورتوں میں سے کونسی صورت فاعل اول تعالیٰ و تقدس کی نسبت صادق ہو سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ فاعل اول میں چند قوتیں پائی جانی ممکن نہیں، اس لیے کہ اس صورت میں ذات فاعل میں کثرت و ترکیب لازم آئے گی جس کو ہم باطل کر چکے ہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ آلات کثیر کے ذریعہ افعال صادر فرمادے کیونکہ وہ آلات دو حال سے خالی نہیں ہو سکتے یا مفعول ہوں گے یا نہ ہوں گے۔ اگر اتنے بہت سے آلات مفعول مانے جائیں تو کیسے ممکن ہے کہ ایک فاعل سے اسقدر اشیاء صادر ہوں کیونکہ الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد مسئلہ مسلمہ ہے یعنی ایک سے نہیں پیدا ہو سکتا مگر ایک۔ یا یوں کہو کہ ایک سے صرف ایک چیز صادر ہو سکتی ہے۔ شق ثانی میں لازم آئے گا کہ اثر بغیر موثر کے پایا جائے یہ بھی محال ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ بہت سے مادوں کی وجہ سے افعال کثیر ہوں کیونکہ اس صورت میں بھی ہم یہ پوچھیں گے کہ مادے مفعول ہیں یا غیر مفعول اور دونوں شقوں میں وہی محال لازم آئیں گے جو بیان ہو چکے۔

پس سوائے اس کے کوئی صورت باقی نہ رہی کہ فاعل واحد بعض افعال بذات خاص صادر فرمادے اور بعض بتوسط دیگران۔ یہ مذہب سب سے پہلے ارسطاطالیس نے اختراع کیا جیسا کہ حکیم فرفوریوس فرماتا ہے "افلاطون اس کا قائل ہے کہ حضرت باری سے ہر موجود کی صورت مجردہ صادر ہوئی اور اسی کے ذریعہ سے وہ ادراک موجودات کرتا ہے۔ لیکن افلاطون کے اس مذہب پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ واحد بسیط سے اشیاء کثیرہ کا صدور لازم آتا ہے لہٰذا افلاطون کا یہ مذہب

تعدد امثال کا مردود ہے اور ارسطاطالیس کا مذہب مذکور صحیح ہے"۔

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ جناب باری واحد ہے اور فعل اول ہے۔

(اس فصل کے تمام مضامین فرفوریوس سے منقول ہیں)

فصل ششم

اس فصل میں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ جناب باری جسم نہیں رکھتا۔

ہمارے گزشتہ بیانات سے ظاہر ہو چکا ہے کہ جسم کے لیے ترکیب اور کثرت اور حرکت لازم و ضروری ہے اور ممکن نہیں کہ ان میں سے کوئی بات واحد اول کی ذات پاک میں پائی جائے۔

ترکیب کا اطلاق تو اس لئے اس ذات پاک پر نہیں ہو سکتا کہ ترکیب ایک اثر ہے اور ہر اثر کے لئے موثر کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اثر امور اضافی میں سے ہے۔ (جو بغیر دوسرے کے پائے نہیں جا سکتے۔ بلکہ ان کا سمجھنا بھی دو چیزوں کے تصور بغیر ممکن نہیں۔ پس یہ محال ہے کہ موثر اول کی ذات میں کوئی ایسا امر پایا جائے جس کے واسطے کسی دوسرے موثر کی ضرورت ہو)۔

رہی کثرت وہ خود وحدت کی ضد ہے (اور واحد کی ذات میں اس کا پایا جانا محال ہے) ایسی ہی حرکت کسی دوسرے محرک کی محتاج ضرور ہو گی جیسا کہ ثابت کیا جا چکا ہے۔ (لہذا اس کا اطلاق بھی ذات باری تعالیٰ پر محال ہے)۔ دوسرے حرکت خود ایک اثر ہے اور اثر خود ایک حرکت ہے (پس اثر و حرکت دونوں واحد اول کی ذات میں پائے جانے ممکن نہیں)۔

خدا تعالیٰ کے جسم نہ ہونے کی ایک منطقی دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ "محرک اول متحرک نہیں ہے"۔ چونکہ سالبہ(۷) کلیہ کا عکس کلیہ ہی ہوتا ہے لہذا اس قضیہ کا عکس یہ ہوگا "کوئی متحرک محرک اول نہیں ہے"۔ اس قضیہ کے ساتھ ہم ایک اور ثابت شدہ قضیہ ملاتے ہیں کہ "ہر جسم متحرک ہے"۔ ان دونوں قضیوں میں سے موخر الذکر کو اول رکھو یعنی صغریٰ بناؤ اور مقدم الذکر کو آخر میں رکھو یعنی کبریٰ بناؤ اور حد اوسط گرا دو تو بقاعدہ شکل اول یہ نتیجہ برآمد ہو گا کہ "کوئی جسم، محرک اول نہیں ہو سکتا"۔ اسی نتیجہ کا عکس کیا تو صاف نکل آیا کہ محرک اول جسم نہیں ہو سکتا۔ (یہی دعویٰ عنوان فصل میں کیا گیا تھا)۔

فصل ہفتم

اس فصل میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جناب باری تعالیٰ ازلی ہے یعنی ہمیشہ سے ہے۔ (ازل وہ وقت جس کی ابتدا نہ ہو)۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ وجود موجد اول کے لیے ذاتی ہے اور وہ مبدع اول یعنی خدا واجب الوجود ہے۔ (پس ثابت ہوا کہ خدائے تعالیٰ ازلی ہے) کیونکہ لفظ ازلی سے یہی مراد ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ محرک اول متحرک نہیں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر متحرک متکون یعنی جو عالم وجود امکان میں آیا حادث (نو پیدا) اور محدث (پیدا کردہ شدہ) ہے لہذا صاف ظاہر ہو گیا کہ جو ذات محدث نہ ہو گی وہ متکون بھی نہ ہو گی کیونکہ تکون بغیر حرکت کے نہیں ہو سکتا۔ پس جو ذات متکون و محدث نہ ہو گی اس سے اول بھی کوئی نہ ہو گا اور وہی ازلی ہو گی۔ انہیں مقدمات مذکورہ کو جو ثابت شدہ ہیں تم ترتیب دے کر شکل سابق قیاس کی صورت میں لا سکتے ہو

جس سے نتیجہ مقصود حاصل ہو جائے گا۔

اب ہم ناظرین کی توجہ ایک مسئلہ لطیف کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ جن صاحبوں نے ہمارے گزشتہ بیان کو توجہ کامل اور نظر غور سے مطالعہ کیا ہوگا ان پر ظاہر و ثابت ہو گیا ہوگا کہ جناب باری عزاسمہ واحد ہے اور اپنی ذات و صفات میں منفرد ہے۔ تمام مادوں سے جو ہمارے مد و پیش ہیں اس کی ذات پاک بری ہے۔ کوئی کثرت کسی قسم کی اس جناب کی وحدانیت سے کسی طرح اور کسی طور پر نہیں مل سکتی۔ انتہا یہ ہے کہ اس کی ذات اقدس جن چیزوں کو ہم تصور کر سکتے ہیں ان میں سے بھی کسی چیز کے مشابہ نہیں ہو سکتی۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان ضعیف البیان و قاصر اللسان ایسی منزہ و مبرا ذات کا بیان و اظہار کس طرح کرے اور اس کی ذات و صفات کی طرف اشارہ کس طرح کرے کہ لوگ سمجھ سکیں۔

سوائے اس کے کیا صورت ہو سکتی ہے کہ یہی الفاظ جن کو فانی انسان ان ہی گوشت کی زبان و دہان سے استعمال کرتا ہے اس مقصود عظیم کے واسطے کام میں لائے جاویں اور جو صفات ممکن و فانی مخلوق میں پائے جاتے ہیں (جن کو ہم جانتے پہچانتے ہیں) استعارہ کے طور پر ذات واجب الوجود کے لیے ان ہی کا استعمال کریں۔ اس واسطے کہ اس سے بہتر اور کونسا طریقہ ہم اختیار کر سکتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں مناسب یہ ہے کہ بہتر سے بہتر الفاظ جو ہم کو مل سکیں ذات واجب کے لیے استعمال کریں۔ مثلاً جب دو لفظ متقابل المعنی ہمارے سامنے ہوں تو ہم پر واجب ہے کہ ان دونوں میں سے جس کو بہتر اور اعلیٰ پاویں جناب باری کے لیے استعمال کریں جو تمام اسماء و صفات سے برتر ہے۔ مثلاً موجود و معدوم، قادر و عاجز، عالم و جاہل، جیسے الفاظ متقابل المعنی میں سے بہتر لفظ (یعنی موجود، قادر، عالم استعمال کرنا چاہیے)۔

بایں ہمہ ہم کو یہ بھی مناسب و ضروری ہے کہ تمام الفاظ پر وسعت کے ساتھ نظر ڈالیں اور تلاش و تفتیش کامل کر کے اس جناب کے واسطے صرف وہی الفاظ استعمال کریں جن کو شرع شریف میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے استعمال فرمایا ہے اور عوام و خواص حسب عادت ان کو اس مقصود شریف کے لیے بولتے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد انسان جب کسی صفات کا اطلاق ذات واجب پر کرے تو یہ بھی اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ وہ ذات مقدس ان تمام صفات سے اعلیٰ و اشرف ہے اس لیے کہ ان صفات کو خود اس نے پیدا کیا ہے۔ پس خالق مخلوق سے بہرحال اشرف و افضل ہوگا۔

اب یہ سمجھنا چاہیے کہ ممکن نہیں کہ کسی طرح اور کسی طریقہ سے کسی شخص کا علم جناب باری کی ذات کو احاطہ کر سکے اور اس میں سے کسی چیز کو پہچان سکے کیونکہ وہ ذات مقدس ان تمام اشیائے موجودہ سے جن کو انسان جانتا پہچانتا ہے جدا ہے اور خدا تعالیٰ ان تمام کا موجد و خالق ہے۔

اسی مقدمہ مذکورہ کی بنا پر ہم فصل آئندہ میں ثابت کریں گے کہ جناب باری کے متعلق کوئی دلیل بطور ایجاب و اثبات نہیں لائی جا سکتی بلکہ جو دلیل پیش کی جا سکتی ہے وہ بہ طریق سلب و نفی ہوگی۔

فصل ہشتم

جناب باری عز و جل بطریق سلب (۸) پہچانا جا سکتا ہے نہ کہ بطور ایجاب (۹)

جو لوگ قوانین منطق سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ جن دلائل میں بطور ایجاب کوئی امر ثابت کیا جاتا ہے ان میں مبرہن علیہ (جس پر دلیل لانی مقصود ہے) کے واسطے ایسے مقدمات اولیہ (۱۰) جو اس کے ذاتی ہوں ثابت کرنے پڑتے

ہیں۔ ضروری ہے کہ وہ مقدمات جو کسی شے کے لیے ذاتی ہوں ایسے ہوں کہ اگر وہ پائے جائیں تو وہ شے بھی پائی جائے اور وہ مقدمات نہ پائے جاویں تو وہ شے بھی نہ پائی جائے۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات پاک ان تعلقات سے مبرا و منزہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام موجودات سے اول ہے۔ جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں، سب کا فاعل و خالق ہے۔ پس ایسی کوئی چیز جو اس کے مقدمات اولیہ میں داخل ہو سکے اور اس کی ذات سے اول ہو اس میں پائی نہیں جا سکتی۔

نیز وہ واحد ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہو سکتی جو اس میں یعنی اس کی ذات میں پائی جائے کیونکہ یہ بات اس کی وحدانیت کے منافی ہے اور نہ اس کا کوئی وصف ذاتی ہے یعنی اس کی ذات میں داخل۔ کیونکہ وہ ذات مرکب نہیں۔

اور نہ اس کا کوئی وصف غیر ذاتی ہے یعنی اس کی ذات کا نہ ہو اور استعارۃً اس کو متصف کر دیا ہو۔ پس ایسی حالت میں اس حضرت اقدس کے لئے برہان مستقیم نہیں قائم کی جا سکتی یعنی بطریق ایجاب ہم اس کے لیے کوئی امر ثابت کریں یہ ممکن نہیں۔ البتہ اس مقصد کے لئے برہان خلف استعمال کی جا سکتی ہے جس میں یہ بیان ہوتا ہے کہ فلاں شے کی نقیض باطل ہے لہذا وہ شے ثابت ہے۔

اس طریقہ میں اسباب و معانی کا اس ذات پاک سے سلب و عدم صدق ثابت کرنا پڑتا ہے مثلاً یوں کہیں کہ خدائے تعالیٰ جسم نہیں ہے نہ وہ متحرک ہے نہ متکثر نہ پیدا شدہ ہے۔ یا یوں کہیں کہ "ممکن نہیں کہ اسباب عالم کا سلسلہ سبب واحد پر منتھی نہ ہو"۔ پس ثابت ہوا کہ امور الٰہیہ کے بیان کرنے کے لیے سب سے زیادہ مناسب برہان سلبی ہی ہے۔ ایک مسئلہ اور قابل ذکر ہے کہ انسان جناب باری عزاسمہ کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہے تو وہی الفاظ و عبارات استعمال کر سکتا ہے جو عالم میں موجود ہیں اور مختلف انواع و اشخاص عالم میں استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان الفاظ و عبارات متداولہ سے اس مقصد عظیم کے پورا کرنے کا کام نہ لیا جاوے تو نئے عنوان و تعبیرات کہاں سے لائی جاویں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ اس جناب کی ذات پاک ان موجودات عالم کی مشابہت سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے اور دنیا کی کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ چیز بھی حضرت عزت سے کسی امر میں شرکت نہیں رکھتی کہ تشبیہ دی جا سکے لہذا ہمیں بہ مجبوری اس جناب کا ذکر کرتے وقت یا اس کے اوصاف بیان کرتے وقت صرف سلب اختیار کرنا پڑتا ہے اور بعبارات ذیل تعبیر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ "وہ ایسا نہیں ہے یا ایسا ہے لیکن بالکل ایسا نہیں ہے بلکہ اس سے بہتر ہے"۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ خدائے عز وجل عقل نہیں ہے یا کہتے ہیں کہ عالم ہے لیکن مثل دنیا کے عالموں کی نہیں ہے۔ یا قادر ہے۔ مگر اسی عالم کے صاحبان قدرت کی مانند نہیں ہے۔ اسی قسم کے دیگر عنوان اختیار کرتے ہیں۔

فصل نہم

کل اشیاء کا وجود جناب باری عزوجل کے ذریعہ سے ہوا ہے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ وجود تمام اشیاء میں بالعرض پایا جاتا ہے اور ذات باری میں بالذات۔ اور اسی سے ہم نے ثابت کیا تھا کہ وہ ذات پاک ازلی ہے۔ تمام اشیاء نے اسی سے وجود حاصل کیا ہے۔ اور اسی اعتبار سے کل اشیاء اس کی ذات سے ناقص ہیں کیونکہ معلول کسی طرح علت کے برابر نہیں ہو سکتا۔ نیز ہم نے یہ بھی ذکر کر دیا ہے کہ بعض اشیاء کو واجب سے بلا توسط وجود حاصل ہوا ہے اب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلا وجود جو ذات واجب سے کسی کو عنایت ہوا وہ عقل اول ہے جس کا دوسرا نام عقل فعال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل اول کا وجود مکمل اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اور ایک حالت پر قائم رہنے والا ہے جس میں تغیر

تبدل نہیں ہو سکتا کیونکہ مفیض حقیقی کا فیضان ہمہ وقت اور ہمیشہ کے لیے اس پر طاری و جاری رہتا ہے۔ اسی وجہ سے عقل ابدی الوجود ہے اور اپنے سوا باقی تمام موجودات سے وجود میں تام و مکمل ہے۔ البتہ ذات واجب کی طرف نسبت کر کے دیکھو تو سر بسر ناقص ہے کیونکہ علت و معلول کسی حال میں مساوی ہو ہی نہیں سکتے، جیسا کہ بیان کیا گیا۔

اس کے بعد عقل اول کی وساطت سے نفس کا وجود ہوا۔ اور چونکہ نفس معلول ہونے کی وجہ سے عقل سے ناقص الوجود تھا اس لیے اپنے کمال و اتمام اور مشابہت علت (عقل) کی ضرورت سے حرکت کا محتاج ہے اور ہمیشہ حرکت و تبدل میں مصروف رہتا ہے۔ مگر اجسام طبعی کی طرف نسبت کر کے دیکھو تو نفس کو مکمل و اعلیٰ مرتبہ میں پاؤ گے۔

نفس کے بعد اس کی وساطت سے افلاک کا وجود ہوا اور چونکہ افلاک بہ نسبت نفس کے ناقص الوجود ہیں اس لیے اسی حرکت کے محتاج ہیں جس کی ان کے جسم طاقت رکھتے ہیں یعنی حرکت مکانی۔

اب چونکہ افلاک کی علت کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور کبھی سکون و وقوف نہیں کرتا اس لیے افلاک کے واسطے حرکت دوری (جس میں سکون نہیں ہے اور کل تبدل مکانی نہیں کرتا بلکہ اجزا کرتے رہتے ہیں) مقرر ہوئی جو بحکم خداوندی اس کی تکمیل کا باعث ہو گی جس طرح اس کی مرضی ہو۔

ان تمام مخلوقات کے پیدا ہونے کے بعد افلاک و نجوم کی وساطت سے ہمارے اجسام کا وجود معرض ظہور میں آیا۔ اور چونکہ ہمارے اجسام کی علت وجود و سبب تخلیق یعنی افلاک و کواکب فانی تھے۔ بلکہ اس قدر غیر ثابت کہ ایک حال پر کسی آن بھی قائم نہیں رہتے۔ لہٰذا ہم کو جو وجود ان سے حاصل ہوا وہ انتہا درجہ کا تغیر پذیر اور ضعیف و ناقص حاصل ہوا۔ بلکہ ایسا وجود ملا کہ اس میں حرکت بھی ہے اور زمانہ بھی کہ ہمیشہ بد لتا رہتا ہے اور کبھی نہ تھا۔ ایک وقت موجود ہوا اور دوسرے وقت معدوم ہو گیا۔ اس بیان سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ کل موجودات ہر قسم کے جناب باری کے عنایت و کرم سے وجود میں آئے۔ اسی جناب کے وجود باجود سے نظام عالم قایم ہے، اسی کی قوت و قدرت تمام مخلوقات پر حاوی و ساری ہے۔

جب علت اول و سبب حقیقی کو تمام عالم سے اس قسم کا تعلق ہے تو غور کرنا چاہیے کہ خالق بے نیاز اپنا فیض ایک لحہ کے لیے بھی مخلوق سے اٹھا ئے تو تمام دنیا اسی وقت معدوم ہو جاوے۔ اس واسطے کہ جواہر کو اعراض کے ساتھ نسبت کر کے دیکھو تو پاؤ گے کہ جوہر بذاتہ قایم ہوتا ہے اور مختلف بلکہ متضاد اعراض کو قبول کرتا ہے مگر اعراض کے معدوم و متلاشی ہونے سے خود معدوم نہیں ہوتا۔ بخلاف عرض کے کہ وہ ہر طرح سے ناقص و ضعیف ہے۔

ایسے ہی جب ہم جواہر عالم کو ان کے خالق و مبدع اول کے مقابلہ میں لا کر دیکھتے ہیں تو ان جواہر کو بھی قایم بنفسہ نہیں کہہ سکتے بلکہ ان کی شان بھی اعراض کی طرح فانی و غیر قایم معلوم ہوتی ہے کہ اگر جناب باری کا فیض ایک آن کے واسطے بھی ان جواہر سے منقطع فرض کر لیا جاوے تو سب یک لخت معدوم ہو جائیں۔

اس مقام پر ہم ایک اور دقیق مسئلہ بیان کرتے ہیں:

یہ تو ثابت شدہ اور معلوم ہے کہ ہر جوہر مرکب کی ترکیب ہیولیٰ و صورت سے ہوتی ہے اور صورت ہیولیٰ پر بذریعہ ترکیب کے فائز ہوتی ہے۔ ترکیب خود ایک قسم کی حرکت ہے جس کا محرک اس کی ذات کے سوا کوئی دوسرا ہے جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں۔

اور یہ بھی فن الہٰیات میں اپنے موقع پر ثابت ہو چکا ہے کہ (یہاں اس کی تفصیل ہمارے مقصود و عزم اختصار کے

منافی ہے) کہ صورت ہیولیٰ کے بغیر اور ہیولیٰ صورت سے علیحدہ پایا جانا ممکن نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں کسی ایسے موجد کے محتاج ہیں جو ان کو ایک وقت میں وجود میں لائے۔ [illegible] کی ضرورت ہے جو ہنگام تخلیق ہی دونوں کو ملا کر پیدا کرے اور یہ تو بیان ہی ہو چکا ہے کہ ترکیب حرکت سے ہے جس کے لیے بوجہ استحالہ تسلسل ایسے محرک کی ضرورت ہے جو خود متحرک نہ ہو۔ پس وہی محرک اول واحد و ازلی ہے۔ دوسرے یہ سمجھنا چاہیے کہ ہیولیٰ اول کے سوا ایک ہیولیٰ ثانیہ بھی ہے جو اجسام میں مختلف صورتیں پیدا ہونے کی استعداد رکھتا ہے اور تمام صور طبعیہ و اجسام میں پایا جاتا ہے اور طبیعت اس (ہیولیٰ ثانیہ) پر مشتمل و حاوی ہے۔ اور طبیعت ہی خداداد قوت ہے کہ تمام اجسام میں نافذ ہوتی ہے اور وہی ان اجسام کو کمال حاصل کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہے اور چونکہ طبیعت کو کسی وقت اور کسی حال میں عجز و تکان لاحق نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کو قوت مجردہ والہیہ سے ہمیشہ فیض پہنچتا رہتا ہے اس لیے اجسام ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں اور اپنے نقصان کی تکمیل میں مصروف رہتے ہیں۔ ہیولیٰ ثانیہ خود جسم ہے۔

فصل دہم

اس بیان میں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو پیدا کیا مگر کسی چیز سے نہیں پیدا کیا

جو لوگ امور نظریہ میں غور کرنے کے عادی و مشتاق نہیں ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی چیز بغیر کسی چیز کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ وہ ایک انسان کو دیکھتے ہیں کہ دوسرے انسان سے پیدا ہوتا ہے اور ایک گھوڑا دوسرے گھوڑے سے۔ ایسے ہی سب جانور چرند پرند وغیرہ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں۔

اس خیال نے اس قدر ترقی کی کہ جالینوس بھی اسی کا قائل ہو گیا۔ مگر حکیم اسکندر نے ایک مستقل کتاب اسی خیال کے خلاف لکھی اور ثابت کیا کہ جو ممکنات وجود میں آئے وہ کسی چیز سے پیدا نہیں ہوئے ہم اس مضمون کو مختصر مگر صاف طور پر بیان کرتے ہیں۔

جملہ مخلوقات عالم میں جو تغیر و تبدل، موت و حیات، فنا و بقا ہوتی رہتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ان مخلوقات کی صرف صورت بدلتی رہتی ہے اور ہیولیٰ جو صورت کا موضوع و محل ہے بالکل نہیں بدلتا۔ جیسا کہ حکما نے صاف طور پر تشریح فرمادی ہے کہ اجسام میں صورت ایک ایسے امر ثابت کی تابع ہوتی ہے جو متغیر نہیں ہوتا اور یکے بعد دیگرے صورت اختیار کرتا رہتا ہے۔ پس کل اشکال یا تمام صور ہیولانیہ اجسام میں حلول کرتی یا ان میں پائی جاتی ہیں۔ جسم جو ان صورتوں کے حامل ہوتے ہیں اپنی کیفیت اور صورت بدلتے رہتے ہیں خود وہ جسم جس کو ہیولیٰ ثانیہ کہنا چاہیے متبدل نہیں ہوا کرتا۔ اب غور کرنا چاہیے کہ جس جسم نے ایک صورت بدل کر دوسری صورت اختیار کی ہے اس میں تین احتمال ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پہلی صورت بھی اس جسم میں باقی رہی اور اس نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ دوسرے وہ صورت کسی اور جسم میں منتقل ہو گئی۔ تیسرے یہ کہ وہ بالکل جاتی رہی اور معدوم ہو گئی۔ پہلا احتمال اس لیے باطل ہے کہ مختلف صورتیں اور باہم متضاد شکلیں ایک جسم میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

دوسرا احتمال اس دلیل سے باطل ہے کہ نقل مکانی اجسام میں ہوتا ہے اور صورتیں اعراض ہیں۔ ان کا نقل و تبدل مثل اعراض کے اپنے اجسام و جواہر کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جو ان کے حامل ہوں خود بذاتہا منتقل نہیں ہو سکتیں۔

پس خواہ مخواہ تیسرا احتمال باقی رہ گیا کہ جب جسم کوئی صورت اختیار کر لیتا ہے تو پہلی صورت باطل ہو جاتی ہے۔ یعنی

پہلی صورت حالت وجود سے حالت عدم میں چلی جاتی ہے۔ اور جب صورت اول میں عدم کے بعد وجود تسلیم ہوا تو یہی حال صورت ثانیہ کا بھی ماننا پڑے گا (جو اب لاحق ہوئی ہے) کہ اس وقت عدم سے وجود میں آئی۔ کیونکہ اس (صورت ثانیہ) کا اس جسم میں پہلے سے ہونا یا کسی دوسرے جسم میں ہونا اور وہاں سے اس میں منتقل ہونا۔ دونوں صورتوں کا بطلان ظاہر ہو چکا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ جملہ اشیاء متلونہ و متغیرہ یعنی صورت اور خطوط اور نقش و نگار اور تمام اعراض و کیفیات کسی چیز سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ عدم سے وجود میں آئی ہیں۔

حکیم جالینوس نے جو بیان کیا ہے کہ ہر موجود کسی موجود سے پیدا ہوا یہ سراسر غلط ہے اور اس کا باطل ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر موجود سے کسی موجود کو وجود میں لاتا تو ابداع کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ ابداع کے معنی میں ایجاد الشیء لا من شیء یعنی کوئی چیز ایجاد کی جائے لیکن کسی چیز سے نہ پیدا کی جائے۔ قول جالینوس کی بنا پر لازم آتا ہے کہ کوئی موجود ابداع سے پہلے موجود تھا۔

اس مسئلہ کے متعلق اگر ہم ان امور پر غور کریں جو ہماری فہم سے قریب تر ہیں یعنی عالم اجسام کی باتیں، تو ہمارا مقصد زیادہ آسانی سے ثابت ہو جائے گا کہ ہر شے موجود عدم سے وجود میں آئی ہے اور وہ شے پہلے نہ تھی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ہر حیوان غیر حیوان سے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ حیوان منی سے پیدا ہوتا ہے اور منی اپنی اصلی صورت چھوڑ کر حیوان کی صورت بتدریج قبول کرتی ہے اور آہستہ آہستہ مختلف صورتیں اختیار کرتی ہوئی حیوان بنتی ہے، اسی طرح منی خون سے بنتی ہے اور خون غذا سے اور غذا نباتات سے اور نباتات استقصات(۱) یا عناصر سے اور عناصر بسائط سے اور بسائط ہیولیٰ و صورت سے بنتے ہیں۔ یعنی وہی منی پہلے ان صورتوں میں تھی اور ہیولیٰ و صورت چونکہ اول موجودات ہیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ پائے نہیں جا سکتے، اس لیے ان کا انحلال کسی شے موجود کی صورت میں ممکن نہیں۔ بلکہ خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ عدم سے وجود میں آئے۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ ہر جسم کی انتہائے انحلال عدم تک پہنچتی ہے اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔

حواشی

۱۔ ظاہر ہے کہ فی نفسہٖ عناصر حسب اپنی وحدت و بساطت و یکسانی رکثرت ترکیب اختیار کرنے میں تو پہلی مرتبہ اختلاط میں جمادات بنتے ہیں۔ دوسرے میں نباتات۔ تیسرے درجہ میں حیوانات کو سب اور آخری درجہ جس میں تمام ترکیب و اختلاط کی حد ہو جاتی ہے اور تغیر بالکل ختم ہو جاتا ہے ترکیب انسانی ہے کہ آخر جملہ اشیاء و موجودات ہے۔ (مترجم)

۲۔ کشف الظنون میں لکھا ہے کہ سمع الکیان کتب طبیعیات میں تیسرا اسکندر افرودیسی کی کتاب ہے اس نے اس کتاب میں ارسطو کی کتاب کا خلاصہ کیا ہے جو ملوک طوائف کے زمانہ میں اسکندر بن فیلقوس کے بعد موجود تھے۔ سمع الکیان کے آٹھ مقالے ہیں۔ پہلے مقالہ کی ابو روح صابی نے تفسیر کی ہے اور یحییٰ بن عدی نے اس تفسیر کی اصلاح کی ہے۔ تیسرے مقالہ کو حنین بن اسحاق نے یونانی سے سریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ بن عدی نے سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ چوتھے مقالہ کی یحییٰ بن عدی نے تین مقالوں میں شرح کی جن میں سے پہلا اور دوسرا اور تیسرے کے بعض حصے موجود ہیں۔ پانچویں مقالہ کی قسطا بن لوقا نے تفسیر کی اور ساتویں مقالہ کو بھی اسی نے ترجمہ کیا۔ پھر اس کتاب کی شرح چند فلاسفہ نے کی جن میں سے مقالات اول، دوم، سوم اور چہارم کی شرح ثامسطیوس کی جو نہایت سہل ہے اب صرف پائی ملتی ہے اور تفسیر ثامسطیوس جو سریانی میں تھی اس کا ترجمہ ابی بشر بن متی نے کیا۔ اور ابو احمد بن کرسنت نے بعض مقالہ اول و چہارم کی تفسیر کی۔ یہ تفسیر زمانہ کی بحث تک ہے۔ اور ثابت بن قرہ نے مقالہ اول کے بعض حصہ کی تفسیر کی اور ابراہیم بن صلت نے مقالہ اول کا ترجمہ کیا۔ ابو الفرج قدامہ بن جعفر بن قدامہ نے بھی مقالہ اول کے بعض حصہ کی تفسیر کی ہے۔ اس کتاب کی شرح تمام و کمال حکیم ثامسطیوس نے بطور ایک جامع کتاب کے لکھی مگر چونکہ مفصل و مشرح نہ تھی اس لئے یحییٰ نحوی نے اس کی شرح کی اور اس کو زبان رومی سے عربی میں لایا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کی دس جلدیں ہیں۔ ابن باجہ نے بھی اس کتاب کی ایک مکمل شرح لکھی ہے۔ ان حکما کے بعد اسلام کے چند علمائے فلسطین نے بھی اس کی شرح کی ہے اور ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی تفصیل سے۔ اندیشہ طوالت ہے اس لیے اسی قدر کافی سمجھا گیا۔ از نور الاخبار (ترجمہ حاشیہ اصل کتاب)

۳۔ حواس خمسہ یہ ہیں: قوت باصرہ، قوت سامعہ، قوت شامہ، قوت ذائقہ، قوت لامسہ اور حواس خمسہ باطنی کی تفصیل و تعریف مسئلہ ثالثہ کی فصل سوم میں خود مصنف نے بیان کی۔

۴۔ ہر دو چیزیں ان میں سے جو مقدم و موخر ہیں اگر مقدم کی ذات تقدم کو چاہے اور متاخر کی تاخر کو تو تقدم بالذات کہتے ہیں۔ پھر اگر ایسی حالت ہو کہ محتاج الیہ کا تقدم تام ہو یعنی بغیر محتاج کے نہ پایا جائے تو تقدم بالعلیت کہتے ہیں اور اگر ناقص ہو کہ بغیر موخر کے بھی پایا جائے تو تقدم بالطبع جیسا کہ واحد و اثنین کہ واحد بغیر اثنین کے پایا جا سکتا ہے۔ (ترجمہ)

۵۔ طبیعت کی تعریف یہ ہے کہ آثار خاص اور تغیر اجسام کا مصدر و سبب ہو۔ اس تعریف سے ظاہر ہو گیا کہ طبیعت کے لئے حرکت ضروری ہے کیونکہ حرکت کسی قسم کے تغیر و تبدل کو کہتے ہیں جس سے کوئی جسم بلکہ کوئی مخلوق خالی نہیں۔ (ترجمہ)

۶۔ ما بعد الطبیعی اس فن کو کہتے ہیں جس میں امور عامہ سے بحث کی جاتی ہے جیسے شکل و صورت وغیرہ۔

۷۔ فن منطق میں ثابت کیا گیا ہے کہ سالبہ دائمہ کا عکس بھی سالبہ کلیہ ہی ہوتا ہے کیونکہ جن دو چیزوں میں تباین کلی و دائمی ہو ان میں سے جو چیز لی جاوے دوسرے پر اس کا صادق نہ آنا لازم ہے پس ہر دو قضیہ اصل و عکس کا سالبہ ہونا ضروری ہے۔ (ترجمہ)

۸۔ سلب یعنی نفی کرنا اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص کی تعریف کریں کہ وہ ایسا نہیں ہے۔

۹۔ ایجاب یعنی ثابت کرنا اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کی بابت کہیں کہ وہ ایسا ہے۔

۱۰۔ مقدمات اولیہ وہ ہیں جو بغیر کسی واسطہ اور تعلق کے فوراً اور اولاً ذہن میں آ جائیں جیسے الواحد نصف الاثنین، یعنی ایک دو کا نصف ہے اس میں ایک اور دو کا تصور کرتے ہی تنصیف کا تصور ہو جاتا ہے کسی علاقہ و واسطہ کی حاجت نہیں پڑتی۔ (ترجمہ)

۱۱۔ اسطقس عنصر کو کہتے ہیں۔ چونکہ ہر عنصر جو کسی جسم کا جزو ہوتا ہے مرکب ہے لہٰذا اس کے اجزاء بسائط کہلاتے ہیں۔ اور ہر بسیط کے اجزاء اولی ہیولی و صورت ہیں جو ہر جسم کے انحلال کے انتہائی مرتبہ پر ہیں۔ (ترجمہ)

(ماخوذ از "القول الاظہر" (ترجمہ "الفوز الاصغر" از ابن مسکویہ) مترجم حکیم محمد حسن فاروقی، مطبع مفید عام، آگرہ ۱۹۰۹ء، ص ۲۲)

ایمانیات

امام غزالی
تعبیر وترجمانی: مولانا محمد حنیف ندوی

پہلا رکن، توحید:

خدائے تعالیٰ کی معرفت کے سلسلہ میں پہلا قدم اس کی توحید ہے اور یہ دس اصولوں پر مبنی ہے:

اصل اول:

جہاں تک اس کے نفس وجود اور اس کے اثبات کا تعلق ہے اس میں جس روشنی سے استفادہ ممکن ہے اور جو طریق منزل مقصود تک پہنچانے والا ہے، وہ آیات تکوین پر غور و فکر اور ان سے عبرت پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں اثبات باری کے لیے یہی طریق اختیار کیا گیا ہے اور خدا سے بڑھ کر اور کون اپنے طریق اثبات سے واقف ہو سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ (النبا:۶۔۱۶)

ترجمہ: کیا ہم نے زمین کو تمہارا فرش اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا، اور ہم ہی نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا، اور ہم ہی نے تمہاری نیند کو راحت بنایا، اور ہم ہی نے رات کو پردہ پوش ٹھہرایا، اور ہم ہی نے دن کو روزی کے دھندوں کا وقت بنایا، اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنا کھڑے کیے، اور ہم ہی نے آفتاب کی روشن مشعل بنائی، اور ہم ہی نے بادلوں سے زور کا پانی برسایا تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے غلہ اور روئیدگی اور گھنے گھنے باغ نکالیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (بقرہ:۱۶۴)

ترجمہ: اور رات دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں اور مینہ میں

جس کو اللہ آسمان سے برساتا پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے مرنے پیچھے زندہ کرتا ہے اور ہر قسم کے جانوروں میں جو خدا نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان خدا کے حکم سے گھرے رہتے ہیں ان سب میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۝ۙ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۝ وَاللّٰہُ اَنْۢبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۝ۙ ثُمَّ یُعِیْدُکُمْ فِیْهَا وَ یُخْرِجُکُمْ اِخْرَاجًا۝ (نوح ۱۵۔۱۸)

ترجمہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسے تہ بہ تہ سات آسمان بنائے ہیں اور ان میں چاند کو بنایا ہے کہ وہ ایک نور ہے اور سورج کو بنایا ہے کہ وہ ایک روشن مشعل ہے اور اللہ ہی نے تم کو ایک طرح پر زمین سے اگایا۔ پھر لوٹا کر اسی مٹی میں تم کو ملا دے گا، اور پھر اسی سے تم کو نکال کھڑا کرے گا۔

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ۝ؕ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ۝ (الواقعہ ۵۸۔۵۹)

ترجمہ بھلا دیکھو تو یہ مادۂ تولید جو تم رحم میں پہنچاتے ہو اس کو انسانی شکل و صورت میں تم پالتے ہو یا ہم اس کو پالنے والے ہیں؟

اللہ کا اقرار پہلے سے دلوں میں موجود ہے:

جس شخص کے دماغ میں تھوڑی سی بھی عقل ہے وہ جب کائنات کے ان عجائبات پر غور کرے گا اور فطرت کے ان بدائع اور محیرات پر نظر ڈالے گا بے اختیار پکار اٹھے گا کہ عالم تکوین و تخلیق کی یہ عجوبہ کاریاں اور کارخانۂ عالم کا یہ منضبط و استوار نظام بے سبب نہیں۔ ضرور اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے بلکہ یہ عقیدہ ایسا فطری بدیہی اور ظاہر و باہر ہے کہ خود فطرت انسانی کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ اس کو دل سے مانے اور تسلیم کرے اور یہ کہے کہ یہ سب کچھ اسی کی تسخیر کا نتیجہ ہے اور اسی کی قوت تدبیر کا کرشمہ ہے۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ (ابراہیم ۱۰)

ترجمہ: کیا اللہ میں بھی کوئی شبہ ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اسی لیے مبعوث کیے گئے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی توحید و تفرید کی طرف بلائیں۔ ان کا یہ منصب نہیں کہ یہ ثابت کرنے کی تکلیف اور کوشش کریں کہ اس کارخانہ حکمت کا کوئی چلانے والا بھی ہے؟ کیوں؟ محض اس بنا پر کہ یہ عقیدہ ابتدا ہی سے انسانی فطرت و جوہر میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ انکار ممکن نہیں۔ قرآن اس عقیدہ کو یوں پیش کرتا ہے کہ گویا بدء آفرینش سے یہ حقیقت دلوں میں جاگزیں ہے اور یہ فکر و تصور انسانوں کے لیے کچھ جانا بوجھا سا ہے یہی وجہ ہے قرآن حکیم میں انسانوں سے یوں خطاب کیا گیا ہے:

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ ؕ (زمر ۳۸)

ترجمہ: اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے بنایا ہے؟ تو وہ پکار اٹھیں گے کہ اللہ نے بنایا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ (الروم)

(۳۰:

ترجمہ: تم تو ایک خدا کے ہو کر اس کے دین کی طرف اپنا رخ کیے رہو یہ خدا کی بنائی ہوئی سرشت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی بنائی چیز میں رد و بدل نہیں ہو سکتا یہی دین سیدھا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ فطرت انسانی کے شواہد اور قرآن کے انداز بیان میں تسکین و طمانیت کا اتنا وافر سامان موجود ہے کہ اس خصوص میں مزید دلیل آرائی کی قطعی ضرورت نہیں۔ لیکن اتمام حجت کی خاطر علماء متکلمین نے استدلال و بحث کی جو طرح ڈالی ہے اس کے تتبع کے پیش نظر ہمیں بھی اس انداز میں کچھ کہنا ہی پڑے گا۔

اثبات باری پر مشہور دلیل:

اس سلسلہ کی مشہور دلیل اثبات باری پر یہ ہے کہ یہ کارخانہ عالم حادث ہے اور حادث کا مزاج چونکہ ایسا ہے کہ وہ اپنے حدوث میں لامحالہ ایک سبب کا محتاج ہوگا لہٰذا اس عالم کو ایک سبب، ایک علت اور چلانے والے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ جو ہم کہتے ہیں کہ حادث کو لامحالہ ایک سبب کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تو وہ اس بنا پر ہے کہ نفس حادث کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ کسی وقت بھی لباس وجود سے آراستہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس میں تقدیم کی گنجائش بھی ہوئی اور تاخیر کی بھی۔ اب ایک وقت خاص پر دو گونہ امکانات کو تخلیق و ظہور کا لبادہ اوڑھنے کے لیے ایک مخصص کی ضرورت پیش آئی۔ یہی مخصص ذات خداوندی ہے جو خاص خاص اوقات میں اشیاء کو کتم عدم سے معرض ظہور میں لاتی ہے، رہی یہ بات کہ یہ کیونکر ثابت ہوا کہ عالم حادث ہے تو اس پر یہ دلیل ہے کہ یہ کارخانہ دو حال سے خالی نہیں یا تو اس کے تمام اجسام متحرک ہوں گے یا ساکن اور حرکت و سکون دونوں حدث کا مظہر ہیں۔ لہٰذا یہ عالم حادث ٹھہرا جو حوادث سے محفوظ نہیں اس کا حادث ہونا قطعی ہے۔

غور کیجیے گا تو اس دلیل میں آپ کو تین دعاوی ملیں گے:

۱۔ یہ کہ کوئی جسم بھی حرکت و سکون کی صفات سے خالی نہیں۔ یہ ایسا بدیہی دعویٰ ہے کہ مطلق غور و فکر کا محتاج نہیں اور جو شخص اس پر بھی یہ سمجھتا ہے کہ بعض اجسام ایسے ہو سکتے ہیں جو نہ متحرک ہوں اور نہ ساکن ہوں تو ان کو اپنی عقل کا علاج کرانا چاہیے۔

۲۔ حرکت و سکون حادث ہیں۔ اس کا ثبوت حرکت و سکون کے تعاقب و توالی سے ملتا ہے اور اس کو تمام اجسام میں دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ ہر ہر ساکن ایسا ہے کہ عقلاً متحرک ہو سکتا ہے اور ہر ہر متحرک ایسا ہے کہ عقل اس کو ساکن فرض کر سکتی ہے۔

۳۔ جو حوادث سے خالی نہیں یعنی جس کو حوادث سے بہر حال دوچار ہونا پڑتا ہے وہ خود بھی حادث ہے اس دعویٰ پر یہ دلیل ہے کہ اگر یہ نہ جانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر ہر حادث سے پہلے غیر منتہی اور غیر مختتم سلسلہ حوادث موجود ہے اور اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تب جو اس وقت موجود ہے حادث ہے۔ اس کے لیے عقلاً کوئی وجہ جواز پیدا نہیں ہوتی کیونکہ نہ انقضاء مالانہایہ ہو جائے گا، نہ کوئی حادث معرض وجود میں آئے گا۔ اس کو فلکیات کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ اگر دورات فلک کو غیر تہائی فرض کیا جائے اور کہیں حدوث کی دخل اندازی کو نہ مانا جائے تو اس کی حسب ذیل صورتیں ہی متصور ہو سکتی ہیں:

اس کی حرکات یا تو بصورت شفع (زوج) ہوں گی یا بصورت وتر (طاق) یا شفع و وتر دونوں۔ اور یا نہ شفع اور نہ وتر۔ شفع و وتر دونوں تو اس لیے نہیں ہو سکتیں کہ اس میں نفی و اثبات دونوں کو بیک وقت ماننا لازم آتا ہے جو محال ہے۔ شفع و وتر دونوں نہ ہوں یہ بھی محال ہے کیونکہ اس کے معنی رفع ضدین کے ہوئے۔

اب تیسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ بصورت شفع ہو لیکن یہ اس لیے صحیح نہیں کہ بقدر ایک حرکت کے اضافہ کے یہ شفع پھر وتر میں تبدیل ہو جاتا ہے اسی طرح وتر فرض کرنے میں بھی یہ قباحت ہے کہ ایک اور حرکت بڑھانے سے یہی وتر پھر شفع کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔

اس مخمصے سے نپٹنے کے لیے یہ جاننا پڑے گا کہ کائنات حوادث اور نئی نئی تخلیقات سے خالی نہیں اور چونکہ حوادث سے خالی نہیں اس لیے اس کو محدث و مخصص کی ضرورت لاحق ہوئی اسی کو ہم اللہ کی ذات اقدس سے تعبیر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ازل سے موجود ہے اور ابد تک موجود رہے گا:

اصل ثانی۔ اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ قدیم وازلی ہے اس سے پہلے کسی چیز کا وجود نہیں بلکہ وہی کائنات کا نقطہ آغاز ہے اور ہر مردہ و زندہ اور بے جان و جاندار سے پہلے موجود ہے کیونکہ اگر اس کی ذات حادث ہوتی تو اس سے پہلے ایک حادث فرض کرنا پڑتا جو اس کا سبب ہو سکتا اور پھر یہ حادث ایک دوسرے حادث کا محتاج ہوتا اور اس طرح یہ سلسلہ علل و معالیل کا چل نکلتا اور اس کے لیے کہیں ٹھہراؤ نہ ہوتا اس لیے اگر اس تسلسل لامتناہی کو دور کرنا ہے تو لامحالہ ایک ایسا سبب قدیم و ازلی ماننا پڑے گا کہ جہاں یہ سلسلہ آکر رک جائے اور جو پہلے سے موجود ہو یہی شرائع کی اصطلاح میں صانع عالم ہے اس کا پیدا کرنے والا اور اس کو معرض وجود میں لانے والا ہے۔

اصل ثالث: جس طرح یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ازلی و قدیم ہے اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ذات والا صفات ابدیت سے بھی متصف ہے پس وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کی ابدیت پر دلیل کیا ہے تو اس کو مختصراً یوں سمجھیے کہ اگر ذات باری پر عدم طاری ہو سکتا ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو یہ ہو گا کہ اس کی ذات بغیر کسی دوسرے معدوم کے خود بخود ختم ہو جائے اور لباس وجود اتار کر جامہ عدم پہن لے یا پھر کوئی معدوم ایسا ہو جو اس کے وجود کو عدم سے بدل دے۔

پہلی صورت میں اشکال یہ ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ باوجود اتصاف ابدیت کے کوئی شے خود بخود فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نفس عدم کے لیے کسی سبب اور علت کی ضرورت ہی نہیں حالانکہ جس طرح وجود شے کا ایک سبب ہوتا ہے یعنی ہر شے جب خلعت وجود سے آراستہ ہوتی ہے تو اس کے پیچھے ایک سلسلہ اسباب ہوتا ہے۔ اسی طرح عدم شے کو اسباب و علل پر مبنی ہونا چاہیے۔ یہ خود بخود کسی چیز کا بغیر اسباب و موثرات کے ختم ہو جانا تو سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی دوسرا خارجی موثر ہو جو اس کی ذات کو ختم کر دے جیسا کہ بیان ہو چکا اس صورت میں یہ دشواری ہے کہ یہ معدوم دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ قدیم ہو گا یا حادث۔ قدیم تو یوں نہیں ہو سکتا کہ پہلے ہم اللہ تعالیٰ کو قدیم بالذات کہہ چکے ہیں اس لیے اس کے ساتھ کوئی دوسرا قدیم جمع کیونکر ہو سکتا ہے۔ حادث ہونے میں یہ قباحت ہے کہ حادث قدیم کے پائے ثبات و قدم میں لغزش کیونکر پیدا کر سکتا ہے۔

اس کی ذات مکانیت سے بالا ہے:

اصل رابع اللہ کی ذات گرامی ہر طرح کے تحیز اور مکانیت سے ماوراء ہے، وہ کوئی جگہ نہیں گھیرتی اور نہ کوئی مکان اس کے احاطہ پر قادر ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ جو چیز کسی چیز یا مکان میں ہو گی وہ یا تو سکون سے متصف ہو گی یا حرکت سے اور دونوں صورتوں میں چونکہ وہ محل حوادث قرار پاتی ہے اس لیے اس کا حادث ہونا لازم آتا ہے جو محال ہے، اس لیے اس کے بارے میں یہی صحیح عقیدہ ہے کہ وہ مکان و حیز سے بالا و وراء ہے کیونکہ اگر یہ ممکن ہو کہ اس کو متحیز ہونے کے باوجود جو ہر قدیم مانا جائے تو ایسی صورت میں دوسرے جواہر عالم کے قدم کا بھی قائل ہونا پڑے گا اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ جوہر ہے اور اس سے جوہر مراد نہیں لیتا تو اس میں صرف یہ غلطی ہو گی کہ اس نے غلط لفظ چنا ہے، معنوں کے اعتبار سے یہ اطلاق صحیح ہو گا۔

خدا کا کوئی جسم نہیں:

اصل خامس یہ جاننا چاہیے کہ اللہ کا کوئی جسم نہیں اور اس کی ذات تالیف و ترکیب جواہر سے پاک و منزہ ہے کیونکہ مرکب کے یہی معنی تو ہیں کہ اس میں مختلف جواہر مجتمع ہوں، پھر یہ ثابت ہو چکا کہ وہ جوہر متحیز نہیں ہے نہ کوئی جگہ اس کو گھیرتی ہے اور نہ وہ کسی مکانیت سے متصف ہے تو اس کے لازمی معنی یہی ہوئے کہ وہ جسم نہیں ہے کیونکہ بصورت دیگر اسے حرکت و سکون، جمع و افتراق اور ہیئت و مقدار ایسی صفات سے متصف ہونا پڑتا جو سراسر جسم کی خصوصیات ہیں۔

علاوہ ازیں اگر کوئی شخص خدا کو جسم مانتا ہے اور اس پر مصر ہے تو پھر جو لوگ چاند، سورج اور کواکب کو خدا مانتے ہیں ان کی تردید کیونکر ہو سکے گی۔ ہاں کچھ لوگ البتہ ایسے جسور ہیں جو اس کو جسم مانتے ہیں لیکن یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اس میں ترکیب و تالیف کی دخل اندازیاں بھی ہیں۔ ہم اس موقف کو درست سمجھتے ہیں لیکن یہ کہیں گے کہ انہوں نے معنی جسم کی تو نفی کی ہے جو صحیح ہے مگر اس حقیقت کو جسم کے لفظ سے تعبیر کرنے میں انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔

خدا جیسے جوہر نہیں ہے ایسے عرض بھی نہیں:

اصل سادس۔ اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ایسی عرض نہیں ہے جو کسی جسم کے ساتھ قائم ہو یا کسی جسم میں حلول کیے ہوئے ہو۔ کیونکہ جسم تو حادث ہے۔ لہٰذا اس کے عوارض بھی حادث ہوں گے کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ جسم سے الگ عوارض کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ وہ ازل سے موجود ہے اور اسی نے تمام جواہر و اعراض کو وجود بخشا ہے تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کو عرض فرض کیا جائے۔ مزید برآں علم، قدرت اور حیات جو اس کی صفات ہیں اسی ذات میں پائی جا سکتی ہوں جو مستقل بالذات ہو۔

ان اصولوں سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات قائم بنفسہ ہے جو نہ جوہر ہے نہ عرض ہے اور نہ جسم ہے۔ حالانکہ یہ تمام کارخانۂ قدرت انہیں تین صفات پر مشتمل ہے۔ یہاں یا جواہر ہیں یا اعراض کی بوقلمونی ہے اور یا اجسام کی رنگا رنگی ہے جو تالیف و ترکیب کا نتیجہ ہیں اور اس کی ذات گرامی ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی تشابہ نہیں رکھتی، تشابہ ہو بھی تو کیونکر! خالق مخلوق کے مشابہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ مقدر و مقدور میں برابری کا تصور کیسے ممکن ہے اور یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ جس نے اس سارے نقشہ کو ترتیب دیا ہے وہ اس نقشہ کی جزئیات سے مختلف نہیں؟

خدا جہات سے متصف نہیں کیونکہ جہات کا تصور اضافی اور حادث ہے جو انسان کی تخلیق سے پیدا ہوا ہے

اصل سابع اللہ تعالیٰ کی ذات جہت اور سمتوں کے اتصاف سے منزہ اور پاک ہے کیونکہ جہات اضافی ہیں۔ فوق(۱)، تحت(۲)، یمین(۳)، یسار(۴)، قدام(۵)، خلف(۶)، یہ جہات کیونکر پیدا ہوئیں؟ یہ ہے ایک سوال جس میں اس کا جواب پنہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کو پیدا کیا، پھر چونکہ اس کا ایک سر ہے اور ایک پیر، اس لیے جو جہت اس کے سر کی طرف واقع ہوئی وہ فوق کہلائی۔ جس نے اس کے پاؤں چھوئے اسے تحت کہا گیا۔ ہاتھوں کی نسبت سے بھی جہت کا تصور پیدا ہوا۔ اس کا ایک ہاتھ نسبتاً قوی ہے اسے یمین کہا گیا، دوسرا قدرے کمزور ہے یہ یسار کہلایا۔ اب جو جہت داہنے ہاتھ پڑی وہ یمین ہوئی اور جو بائیں ہاتھ پڑی وہ یسار کہلائی۔ اس کے چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے بھی سمت اور جہت کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اس کی حرکت بھی چونکہ ہمیشہ آگے کی طرف ہوتی ہے کیونکہ آنکھیں آگے ہی کی طرف دیکھتی ہیں اس لیے اس کو قدام کہا گیا اور پیچھے کی طرف نہیں ہوتی اس لیے اس کو خلف کہا گیا۔ یہ تمام سمتیں انسان کی تخلیق سے معرض وجود میں آئیں ورنہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں کیا چیونٹی کو نہیں دیکھتے کہ جب وہ چھت کی نچلی طرف، چھت سے لگی ہوئی چلتی ہے تو اس کے حق میں فوق و تحت کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے۔ جس کو آپ فوق کہتے ہیں وہ اس کا تحت ہے اور جو حصہ اس کے پاؤں تلے ہے وہ آپ کے حق میں فوق کے حکم میں ہے۔

فرض کیجئے انسان کروی شکل کا ہوتا تو کیا اس صورت میں بھی جہات اور سمتوں کا یہ تصور قائم رہتا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اس صورت میں جہت کا سرے سے کوئی تصور ہی نہ ہوتا۔

اگر یہ بات صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ ازل میں ان جہات سے کیونکر متصف ہو سکتا ہے جبکہ ان جہت کی عمر انسانی عمر سے زیادہ نہیں اور پھر چونکہ وہ اعضاء، جوارح کے اتصاف سے بھی پاک ہے اس لیے سمت و جہت کے ظہور کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں جہت کا اختصاص اس صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم اس کو جوہر یا عرض مانیں جو جگہ اور تحیز کے مقتضی ہیں اور ان دونوں باتوں کی چونکہ ذات باری کے بارے میں ہم نفی کر چکے ہیں اس لیے اس کے حق میں ان جہات کا اتصاف کوئی معنی نہیں رکھتا۔ زیادہ سے زیادہ جہت فوق سے ہم اس کو متصف کر سکتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ کسی جسم کے بالمقابل واقع ہے جو اس کے برابر بھی ہو سکتا ہے اور اس سے چھوٹا بڑا بھی۔ تینوں صورتوں میں لامحالہ ایک مقدار کی ضرورت محسوس ہو گی جو تقدیر و اندازہ کی اس نسبت کو پیدا کرے۔ ظاہر ہے اللہ کی ذات اس سے پاک اور منزہ ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی اللہ کے لیے جہات یا جہت کو تو ثابت کرے لیکن اس سے مراد ایسی جہت نہ ہو جو عضویت و جسمانیت کا نتیجہ ہو تو ہم اس سے اتفاق کریں گے کہ معناً یہ صحیح ہے۔ اگرچہ اس کے لیے جو پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ اس سلسلہ میں کہا جائے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ جہت فوق سے متصف نہیں ہے تو دعاء کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ کیوں اٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ جہتِ علو دعا کے لیے بمنزلہ قبلہ کے ہے اور اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس ذات گرامی کو پکارا جا رہا ہے وہ جلال و کبریاء اور مجد و علاء کے اعتبار سے بالا اور بلند ہے اور اس کا علو اس بنا پر ہے کہ اس کی پادشاہت و اقتدار اور قہر و استیلا کے علم ہر ہر شے پر گڑے ہیں۔

استواء کی تاویل:

اصل تاسمن استواء علی العرش سے مراد ایسا استواء ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ نے استواء قرار دیا ہے۔ اور جو اس کی کبریائی کے منافی نہیں اور جس میں حدوث و فنا اور جہت و سمت کی دخل اندازیوں کا کوئی امکان نہیں۔ یہی معنی ہے اس آیت کا

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ ۔ (حم السجدہ:۱۱)

ترجمہ پھر وہ آسمان کی طرف مستوی ہوا اور وہ اس وقت کہر کی طرح کا تھا۔

یعنی یہ استواء بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اس کی شان قہاری و اختیار کا ایک کرشمہ ہے۔ ایک عرب شاعر نے استواء کو انہیں معنوں میں استوی کہا ہے

قد استوی بشر علی العراق من غیر سیف و دم مہراق

بشر نے عراق پر قبضہ جمایا بغیر کسی لڑائی اور خون ریزی کے۔

استواء کے بارہ میں اہل حق تاویل کے اس انداز پر اس طرح مجبور ہوئے ہیں جس طرح اہل باطن مثلاً مندرجہ ذیل آیات و احادیث کی تاویل پر مجبور ہوئے ہیں:

وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (الحدید:۴)

ترجمہ: اور وہ تمہارے ساتھ ہے چاہے تم کہیں بھی ہو۔

یہاں بالاتفاق معیت اور ساتھ ہونے سے مراد علم و احاطہ کی معیت ہے، جسم و اعضا کی نہیں۔

قلب المومن بین اصبعین من اصابع الرحمٰن۔

ترجمہ: مومن کا دل رحمٰن کی دو انگلیوں میں ہوتا ہے۔

مقصود اللہ کی انگلیاں نہیں بلکہ اس کی قدرت و قہر کو بیان کرنا مطلوب ہے۔

الحجر الاسود یمین اللہ فی الارض۔

ترجمہ: حجر اسود زمین میں اللہ کا داہنا ہاتھ ہے۔

غرض محض تشریف و اکرام کا اظہار ہے:

ان مقامات پر اگر تاویل کا یہ انداز اختیار نہ کیا جائے تو کئی محالات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہی حال استوا علی العرش کا ہے۔ اگر اس کی تاویل نہ کی جائے اور استقرار و تمکن ہی کے معنی یہاں لیے جائیں تو پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم کی طرح سطح عرش کو چھو رہا ہے جو اس سے بڑا بھی ہو سکتا ہے اور اس سے چھوٹا بھی۔ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کے برابر ہو۔ یہ تینوں صورتیں بداہتہً غلط ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے باب میں کیت و مقدار کا یہ وصف محال ہے۔ لہٰذا یہی ماننا پڑے گا کہ استواء سے جہات و سمات کا استواء نہیں بلکہ کبریا و جلال کا استواء ہے۔

رویت باری برحق ہے رویت دراصل علم ہی کے ایک مرتبہ کا نام ہے:

اصل تاسع: اگرچہ اللہ تعالیٰ جہات و افکار اور صورت و مقدار سے پاک اور بالا ہے تاہم یہ عقیدہ برسرِ حق ہے کہ عقبیٰ میں اس کی رویت اور دید سے مسلمان مشرف ہو سکیں گے۔ اگرچہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ج (الانعام ۱۰۳)

ترجمہ: نظریں اس کو معلوم نہیں کر سکتیں اور نظروں کو وہ خوب جانتا ہے۔

یا جیسا کہ حضرت موسیٰ سے خطاب کر کے فرمایا ہے:

لَنْ تَرٰىنِىْ (الاعراف ۱۴۳)

ترجمہ: تو ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکے گا (یعنی دنیا میں)۔

آخرت یا عقبیٰ میں البتہ دیدار سے مسلمان مشرف ہو سکیں گے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ لا اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ ج (القیمۃ ۲۲۔۲۳)

ترجمہ۔ اس دن بہت (لوگوں کے) منہ تر و تازہ اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ رویت باری فی نفسہ ممکن ہے اور اسی بنا پر حضرت موسیٰ نے اس کا مطالبہ بھی کیا تو تعجب ہے کہ معتزلہ نے کس بنا پر انکار کیا اور ان کو وہ بات کیونکر حاصل ہو گئی جو موسیٰ کی نظروں سے اوجھل رہی۔ بات یہ ہے کہ ان اغیار اور جاہلوں کو مطعون کرنا اس سے کہیں زیادہ مناسب ہے کہ انبیاء کے ذوق و علم پر حملہ کیا جائے۔

رہی یہ بات کہ کیا رویت باری کی آیات کو ظاہر پر محمول کرنے سے کوئی قباحت پیدا ہوتی ہے؟ نہیں! کیونکہ رویت باری کے معنی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ وہ علم و آگاہی کی ایک قسم ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہ علم و آگاہی زیادہ مکمل اور زیادہ واضح ہے۔ پھر جب علم کا انتساب اس کی طرف ہو سکتا ہے یعنی ہم اسے جان سکتے ہیں اور بغیر کسی جہت وست کے تصور کے تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ بغیر جہت وست کے تصور کے اس کا دیکھنا ممکن نہ ہو۔

مزید برآں اللہ تو اپنی مخلوق کو دیکھتا ہی ہے حالانکہ درمیان میں کہیں محاذات و مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس میں کیا استحالہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس ذات گرامی کو بغیر کسی مقابلہ و محاذات کا تصور کیے دیکھ سکیں۔

خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں:

اصل عاشر: اللہ تعالیٰ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ فرد و صمد ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں، خلق و ابداع اور تخلیق و تکوین میں یکہ و تنہا تمام تصرفات کا مالک ہے۔ نہ اس کے برابر کا کوئی ہے اور نہ اس کا کوئی خصم و مخالف ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ج (الانبیاء:۲۲)

ترجمہ: اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں کبھی کے برباد ہو گئے ہوتے۔

کیونکہ اگر اس کائنات کے دو خدا ہوتے تو اختلاف رائے کی صورت میں ایک غالب رہتا اور دوسرا مغلوب۔

وجود باری تعالیٰ

ابن رشد

تعبیر و ترجمانی: مولانا عبدالسلام ندوی

قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے اپنے وجود پر دو قسم کی دلیلیں قائم کی ہیں جن میں ابن رشد نے ایک کا نام دلیل عنایہ اور دوسری کا دلیل اختراع رکھا ہے۔ دلیل عنایہ کی بنیاد دو اصولوں پر ہے:

۱۔ ایک یہ کہ دنیا کی تمام چیزیں انسانی مصالح، انسانی ضروریات اور انسانی فوائد کے موافق ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ یہ موافقت بخت و اتفاق سے نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کو ایک ذی ارادہ ہستی نے پیدا کیا ہے۔

پہلے اصول کی بنا پر دنیا کی اہم چیزوں مثلاً رات، دن، چاند، سورج، جاڑے، گرمی، برسات اور مختلف قسم کے نباتات و جمادات پر غور و فکر کرنے سے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ وہ انسان کے لئے کس قدر مفید اور اس کی ضروریات کے لئے کس قدر موزوں ہیں، اس لئے جو شخص خدا کے وجود کا کامل علم حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے موجودات کے فوائد کی تحقیقات نہایت ضروری ہے۔

دلیل اختراع کی بنیاد بھی دو اصولوں پر ہے، ایک یہ کہ تمام کائنات مخلوق ہے اور دوسرا یہ کہ جو چیز مخلوق ہے اس کا کوئی خالق ہے، اس لئے اس دلیل کے ذریعہ سے جو شخص خدا کے وجود کا کامل علم حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے جواہر اشیاء کا علم ضروری ہے کیونکہ جس شخص کو کسی چیز کی حقیقت معلوم نہ ہوگی اس کو اختراع حقیقی کا علم نہ ہو سکے گا۔

خدا کے وجود کی یہی دو شرعی دلیلیں ہیں اور قرآن مجید میں اس پر جو دلیلیں قائم کی گئی ہیں وہ انہی دو میں محدود ہیں۔ بعض آیتیں صرف دلیل عنایہ پر مشتمل ہیں اور بعض آیتیں صرف دلیل اختراع پر اور بعض آیتوں میں دونوں دلیلیں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔ یہ دلیلیں جس طرح عوام کے لئے قائم کی گئی ہیں، بعینہٖ اسی طرح خواص یعنی علماء کے لئے بھی قائم کی گئی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ جمہور یعنی عوام کو اس کا علم صرف حس کے ذریعہ سے ہوتا ہے لیکن علماء اس حسی علم کے ساتھ برہان کے ذریعہ سے بھی اس کا علم حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض علماء کا قول ہے کہ علماء نے انسان اور حیوان کے اعضاء کے ہزاروں فوائد معلوم کئے ہیں، اس لئے یہ طریقہ شرعی بھی ہے اور طبعی بھی۔

بہر حال دلیل عنایہ کی بنیاد دو اصولوں پر ہے جس کو تمام لوگ تسلیم کرتے ہیں، ایک یہ کہ عالم کے تمام اجزاء وجود انسانی اور تمام موجودات کے موافق ہیں، دوسرے یہ کہ جو چیز اپنے تمام اجزاء کے ساتھ کسی کام کے موافق ہوتی ہے وہ مصنوعی

ہوتی ہے۔ مثلاً اگر انسان زمین پر ایک پتھر پڑا ہوا دیکھے جو اس طرح تراشا گیا ہے کہ اس پر بیٹھا جا سکتا ہے تو وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کو کسی شخص نے بیٹھنے کی غرض سے اس خاص شکل میں تراشا ہے، لیکن جو پتھر اس طرح تراشا ہوا نہ ہو اور جس سے اس پر بیٹھنے کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ وہ اتفاق سے یونہی زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اس کو کسی شخص نے کسی مقصد کے لئے زمین پر نہیں رکھا ہے۔ اسی طرح جب انسان دیکھتا ہے کہ تمام کائنات انسان ہی کے لئے بنائی گئی ہے اور تمام موجودات کے فوائد و مصالح سے موافقت رکھتے ہیں تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ یہ کائنات کسی نے پیدا کی ہے۔ یہی دلیل عنایت خدا کے وجود کی بہترین دلیل خیال کی جاتی ہے اور قرآن مجید نے اسی دلیل کو بار بار بیان کیا ہے۔ لیکن اشاعرہ نے خدا کے وجود پر جو دلیل قائم کی ہے وہ بالکل اس کے مخالف ہے۔ ان کے نزدیک خدا تعالیٰ کے وجود پر موجودات کی ساخت کی حکمت و مصلحت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد جواز پر ہے، یعنی دنیا کا جو موجودہ نظام قائم ہے، اس کے برعکس نظام بھی قائم ہو سکتا تھا۔ انسان کے اعضاء کی جو شکل و مقدار ہے اس کے خلاف شکل و مقدار بھی ہو سکتی تھی۔ اس لئے بالضرور کوئی ذات ہے جس ذات نے ہر چیز میں خاص خاص اوصاف پیدا کر دیے وہی خدا ہے۔ لیکن ابن رشد کے نزدیک دنیا کا جو نظام قائم ہے وہ ضروری ہے اور اس سے بہتر اور اس سے مکمل نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر انسان کے ہاتھ کی شکل، اس کی انگلیوں کی تعداد اور مقدار اگر ضروری نہ ہو یا اپنے مقصد یعنی پکڑنے کے لحاظ سے افضل نہ ہو بلکہ جانوروں کی طرح اس کے کھر ہوں یا اس میں جانوروں کے اور اوصاف پائے جا سکیں تو جو لوگ خدا کے وجود کے منکر اور بخت و اتفاق کے قائل ہیں ان کے خلاف کونسی دلیل قائم کی جا سکتی ہے۔ ایک اشعری یہ کہتا ہے کہ ہر چیز میں دونوں صورتیں جائز ہیں، یعنی وہ جس شکل و صورت میں موجود ہے، اس کے خلاف شکل و صورت میں بھی موجود ہو سکتی تھی۔ اس لئے ان دونوں صورتوں میں سے ایک صورت کی تخصیص کسی مخصص نے کی ہے اور وہی خدا ہے، لیکن ارادی چیزیں کسی مصلحت اور کسی سبب سے پیدا ہوتی ہیں، اور جب اس تخصیص میں کوئی مصلحت اور کوئی سبب نہیں تو وہ ایک اتفاقی چیز ہوگی۔

بہر حال اگر دنیا میں ترتیب و نظام ضروری نہ ہو تو موجودات سے ایک ایسے خالق کے وجود پر جو صاحب ارادہ اور عالم ہو استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ترتیب و نظام ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے علم و حکمت پر استدلال کیا جا سکتا ہے، اور دونوں صورتوں میں سے ایک صورت کا ممکن ہونا بخت و اتفاق سے بھی ہو سکتا ہے۔ ایک پتھر زمین پر اپنے طبعی ثقل سے ہر جگہ گر سکتا ہے، اس کے لئے کسی خاص وضع، کسی خاص جہت اور کسی خاص جگہ کی تخصیص نہیں، اس لئے اس دلیل سے یا تو خدا کے وجود ہی کا انکار ہو جاتا ہے یا اس کے حکیم ہونے کا ابطال ہوتا ہے۔

اشاعرہ نے قرآن مجید کی دلیل کو چھوڑ کر یہ دلیل تین وجوں سے اختیار کی ہے۔

ا۔ ایک تو قوی طبعیہ کے فعل کا انکار کیونکہ ان کے نزدیک خدا کے سوا کوئی چیز موثر نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے، لیکن اسباب کا خالق بھی تو خدا ہے، اور وہ اسی کے حکم سے اثر کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ان کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر وہ طبعی اسباب کو تسلیم کر لیں گے تو ان کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عالم طبعی اسباب سے پیدا ہوا ہے، حالانکہ اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ طبیعت بھی خدا کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اور وہ خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے تو وہ جانتے کہ طبیعت کے وجود کے انکار سے موجودات کے ایک بڑے حصے کا انکار کرنا پڑے گا۔ جن سے خدا کے وجود پر استدلال کیا جا سکتا تھا۔

۳۔ چونکہ خداوند تعالیٰ نے عالم کو بالارادہ پیدا کیا ہے، اور ان کے خیال میں صاحب ارادہ اسی شخص کو کہہ سکتے ہیں جو ایک چیز اور اس کی ضد دونوں کے پیدا کرنے پر قادر ہو، اس لئے انہوں نے یہ دلیل قائم کی کہ تمام موجودات جائز ہیں، یعنی جو چیز پیدا ہوئی ہے وہ مفید بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر دنیا کی یہ ترتیب اور یہ نظام بدل دیا جائے تو خدا کی حکمت کا انکار کرنا پڑے گا، کیونکہ جس چیز کا کوئی مقصد نہیں، وہ ایک عبث چیز ہوتی ہے اور وہ بخت و اتفاق کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔

بہر حال دنیوی چیزوں میں جو حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں انہی سے خدا کے وجود پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔
البتہ چونکہ عالم غیب میں جس چیز کی کوئی مثال موجود نہیں ہوتی اس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس کو عالم شہادت سے تشبیہ دے کر بتایا ہے۔ اس نے دنیا کو ایک زمانے میں اور ایک چیز سے پیدا کیا ہے، مثلاً یہ کہ تخلیق عالم سے پہلے اس کا تخت پانی پر تھا، اور اس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، اس لئے عوام کے لئے اس قسم کی آیتوں کی تاویل نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ عالم کسی چیز سے یا کسی زمانے میں پیدا نہیں ہوا تو عوام اس کو نہیں سمجھ سکتے۔

غرض اسی طریقے سے اس نے تمام اسلامی عقائد پر بحث کر کے نہایت تفصیل سے بتایا ہے کہ متکلمین نے ان عقائد کو جن دلائل سے ثابت کیا ہے وہ نہ تو قرآن مجید کے دلائل سے مطابق ہیں، نہ جمہور کے لئے موزوں ہیں۔ اس سے پہلے اس کا خاندان محدثین کے مسلک کا پیرو تھا اور ابن رشد نے در حقیقت اسی مسلک کی تائید کی ہے۔

(ماخوذ از "حکمائے اسلام حصہ دوم" مصنف مولانا عبدالسلام ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء، ص ۲۰۹۔۲۱۳)

اثبات باری

امام فخر الدین رازی
تعبیر و ترجمانی۔ مولانا عبدالسلام ندوی

علماء خداوند تعالیٰ کے وجود کو امکان سے ثابت کرتے ہیں اور امکان کے ذریعہ سے خداوند تعالیٰ کے وجود کے ثابت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں موجودات کا وجود یقینی طور پر پایا جاتا ہے، اب اگر ان موجودات میں کوئی موجود ایسا ہے، جس کے لیے عدم لذاتہ محال ہے تو اسی کا نام خدا ہے اور اگر کوئی موجود ایسا نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام موجودات عالم پر عدم طاری ہو سکتا ہے، لیکن عدم کی طرح ان کو وجود بھی لاحق ہو سکتا ہے ورنہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہوتے، اس لیے جب ان میں وجود اور عدم دونوں کی قابلیت موجود ہے تو ان کے وجود کو ان کے عدم پر ترجیح کسی موثر مرجح کے ذریعہ سے ہو گی۔ اس لیے تمام ممکنات کے لیے ایک ایسے موثر کا ہونا ضروری ہے جو بذات خود ممکن نہ ہو، ورنہ اگر وہ ممکن ہو گا تو اس کے لیے بھی ایک موثر ہو گا لیکن چونکہ وہ ممکن نہیں ہے اس لیے وہ واجب الوجود ہو گا۔ اس دلیل کی صحت چار مقدمات پر موقوف ہے۔

۱۔ ممکن کسی سبب کا محتاج ہوتا ہے۔

۲۔ اس سبب کو امر وجودی ہونا چاہیے۔

۳۔ دور محال ہے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز ایک چیز کی علت بھی ہو اور پھر اسی کی معلوم بھی ہو۔

۴۔ تسلسل محال ہے یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ علم و معلول کا سلسلہ غیر منقطع و غیر متناہی ہو۔

جن کو امام صاحب نے اپنے اپنے موقع پر دلیل سے ثابت کر دیا ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک اس دلیل کے اثبات کے لیے دور و تسلسل کے باطل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر موجودات عالم میں کوئی چیز واجب الوجود ہے تو مدعا ثابت ہے اور اگر نہیں ہے تو تمام موجودات ممکن الوجود ہوں گے اور ممکن الوجود کے وجود کا سبب ممکن الوجود چیز نہیں ہو سکتی، کیونکہ:

(۱) اگر ممکن کسی دوسری چیز کے وجود کی علت ہو تو علت ہونے میں اس کی ذات کو دخل ہو گا کیونکہ علم کے وجود کا لحاظ اس کی ایجاد میں ضروری ہے لیکن ممکن کی ذات فی نفسہ ممکن الوجود ہے، اس لیے اگر ممکن کسی چیز کے وجود کی علت ہو تو اس کا امکان اس کی علیت کا جزو ہو گا، لیکن امکان علیت کا جزو نہیں ہو سکتا کیونکہ جو چیز ممکن ہے واجب نہیں ہو سکتی اور علت ہونے کے لیے ایک چیز کا واجب ہونا ضروری ہے، اس لیے ایک ہی چیز ایک ہی حیثیت سے واجب اور ممکن نہیں ہو سکتی۔

(۲) دوسری یہ کہ ممکن کے وجود کا استناد اگر کسی سبب کی طرف ہو گا تو یہ استناد یا تو امکان کی وجہ سے ہو گا یا عدم امکان کی وجہ سے، عدم امکان کی وجہ سے تو نہیں ہو سکتا کیونکہ جس چیز میں امکان نہیں پایا جائے گا وہ یا تو واجب ہو گی یا ممتنع اور واجب اور ممتنع کسی دوسری چیز کے محتاج نہیں ہو سکتے، اس لیے ممکن کے وجود کا استناد ایک علت معینہ کی طرف امکان کی وجہ سے ہو گا۔ اس بنا پر امکان اس علت معینہ کی طرف احتیاج کی علت ہو گا، اس لیے اگر ممکن ممکن کی علت ہو تو خود وہ ممکن جس کو علت تسلیم کیا گیا ہے اپنی آپ علت ہو گا اور یہ محال ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ممکنات کے موجود کا استناد صرف واجب الوجود کی طرف ہو سکتا ہے۔

اس استدلال کی صحت کے لیے سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ عالم کو ممکن الوجود ثابت کیا جائے اور حکمانے عالم کے ممکن الوجود ہونے پر متعدد دلیلیں قائم کی ہیں

(۱) تمام اجسام ہیولی اور صورت سے مرکب ہیں اور جو چیز مرکب ہے وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہیولی اور صورت باہم ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور واجب الوجود محتاج نہیں ہو سکتا۔

(۲) عالم کا وجود اس کی ماہیت پر زائد ہے اور جس چیز کا وجود اس کی ماہیت پر زائد ہوتا ہے، وہ ممکن ہوتی ہے۔

(۳) عالم میں کثرت پائی جاتی ہے اور جس چیز میں کثرت پائی جاتی ہے وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتی، لیکن اس دلیل کے تمام مقدمات قابل بحث و تمحیص ہیں اور امام صاحب نے اپنے اپنے موقع پر ان پر بحثیں کی ہیں۔ سب سے مقدم بحث یہ ہے کہ جو چیز ممکن ہے یعنی اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہے۔ اس وجود اور عدم کے لیے کسی علت کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ حکماء اس کے عدم اور وجود کی ترجیح کے لیے ایک علت مرجحہ کی ضرورت سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ ایک بدیہی چیز ہے، لیکن بہت سے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ترجیح کے لیے کسی مرجح کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً خداوند تعالیٰ نے عالم کو ایک خاص وقت میں پیدا کیا حالانکہ اس وقت کو دوسرے اوقات پر کوئی ترجیح نہیں تھی۔ ایک شخص شیر کے حملے سے بچنے کے لیے بھاگنا چاہتا ہے اور اس کے سامنے دو راستے ہیں اور وہ جس راستے سے بھاگے شیر کے حملے سے محفوظ رہ سکتا ہے، لیکن وہ ان دو راستوں میں سے جو ہر حیثیت سے یکساں ہیں ایک راستے کو بغیر کسی مرجح کے اختیار کر لیتا ہے۔ غرض اس دلیل کے تمام مقدمات پر کسی نہ کسی حیثیت سے رد و قدح کی جا سکتی ہے۔ حکماء کا یہ استدلال امکان ذات پر مبنی ہے، یعنی عالم فی نفسہ ممکن ہے لیکن امام صاحب نے اربعین میں امکانِ صفات سے خداوند تعالیٰ کے وجود پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ تمام اجسام کی ماہیت ایک ہے اور اس صورت میں ایک جسم جس وصف کے ساتھ متصف ہو گا دوسرا جسم بھی اسی وصف کے ساتھ متصف ہو سکے گا، لیکن تمام اجسام کے اوصاف مختلف ہیں، اس بنا پر ہر جسم اپنے مخصوص اوصاف کے ساتھ متصف ہونے کے لیے ایک مخصص اور مرجح کا محتاج ہو گا اور اسی مخصص اور مرجح کا نام خدا ہے۔ یہ دلیل اگرچہ بذاتِ خود نہایت مختصر ہے لیکن

درحقیقت دو تین مقدمات پر موقوف ہے

(۱) ایک تو یہ کہ تمام اجسام کی ماہیت ایک ہے۔ امام صاحب نے اس پر جو دلیل قائم کی ہے سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ جسم کی مختلف قسمیں ہیں، فلکی، عنصری، کثیف، لطیف، نرم، سخت وغیرہ، اور یہ تمام قسمیں جسم کی ماہیت ان سب میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور ان میں باہم جو امتیاز ہے وہ صرف ان کے مختلف اوصاف سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اجسام کی حقیقت ایک ہے۔

(۲) چونکہ تمام اجسام کی حقیقت ایک ہے اس لیے جو چیز ایک جسم کے لیے جائز ہوگی وہ دوسرے جسم کے لیے بھی جائز ہوگی، کیونکہ کسی وصف کی قابلیت یا تو اس ماہیت کے لوازم میں سے ہے تو جہاں یہ ماہیت پائی جائے گی یہ قابلیت بھی پائی جائے گی۔ چونکہ تمام اجسام کی ماہیت ایک ہے اس لیے ایک جسم جس وصف کے ساتھ متصف ہے دوسرا جسم بھی اس وصف کے ساتھ متصف ہو سکے گا، لیکن اگر یہ قابلیت اس ماہیت کے لوازم میں سے نہیں ہے تو اس کے عوارض میں سے ہو گی۔ اب اس قابلیت کی قابلیت کے متعلق بحث ہوگی۔ اور وہ بھی ماہیت کے عوارض میں سے ہوگی تو اس کے متعلق بھی یہی سوال پیدا ہوگا۔ اب اگر یہ سلسلہ برابر اسی طرح چلا جائے گا تو تسلسل لازم آجائے گا، اور اگر اس کی انتہا کسی قابلیت پر ہوگی جو اس ماہیت کے لیے لازم ہوگی تو مدعا ثابت ہو جائے گا۔

(۳) ہر وہ جسم جو موجود ہوگا وہ کسی معین مقام میں ہوگا، اس کی ایک خاص شکل ہوگی اور وہ نرم یا سخت ہوگا اور ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہر جسم کی تخصیص اس کے خاص خاص اوصاف کے ساتھ ممکن ہے اور ممکن کے لیے ایک مرجح اور مخصص کی ضرورت ہے۔ اب اگر وہ مرجح اور مخصص بھی جسم ہوگا تو وہ بھی اپنے اوصاف کے لیے ایک مخصص و مرجح کا محتاج ہوگا۔ اس طرح ایک غیر متناہی سلسلہ قائم ہو جائے گا جس سے تسلسل لازم آئے گا، اس سے ثابت ہوا کہ تمام اجسام اپنے اوصاف میں ایک ایسے موجود کے محتاج ہیں جو نہ جسم ہے اور نہ جسمانی، اسی کا نام خدا ہے۔

یہ دلیل متکلمین کے نزدیک نہایت مقبول ہے، کیونکہ اس سے جس طرح مبدء یعنی خدا کا اثبات ہوتا ہے، اسی طرح معاد کا اثبات بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ جو عوارض عناصر پر طاری ہو سکتے ہیں وہی افلاک پر بھی طاری ہو سکتے ہیں، اس لیے وہ بھی خرق والتیام کو قبول کر سکتے ہیں اور جس طرح مٹی پانی، پانی ہوا اور ہوا آگ ہو سکتی ہے، اسی طرح آسمان زمین اور زمین آسمان ہو سکتی ہے، اسی بنا پر امام صاحب دوسرے مقدمہ کے بعد لکھتے ہیں۔

وهذه المقدمة كما انها عظيمة المنفعة فى معرفة المبداء فهى ايضا عظيمة النفع فى معرفة المعاد و تصحيح ماورد فى القرآن من احوال القيامة ۔

ترجمہ: یہ مقدمہ جس طرح مبدء یعنی خدا کے علم کے لیے بہت زیادہ مفید ہے اسی طرح معاد کے علم اور قرآن مجید میں قیامت کے جو حالات مذکور ہیں ان کی صحت کے لیے بھی بہت زیادہ مفید ہے۔

اسی دلیل سے معجزات کا امکان بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کی بنا پر آگ کے جو اوصاف ہو سکتے ہیں وہی پانی میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں اس لیے جس طرح آگ جلا سکتی ہے، پانی بھی جلا سکتا ہے اور اسی کا نام معجزہ ہے۔

اسی دلیل کو امام صاحب نے تفسیر کبیر میں اس طرح بیان کیا ہے۔ نباتات اور حیوانات، فطرت، آسمان اور ستاروں کے اثر سے نہیں پیدا ہو سکتے، کیونکہ ان چیزوں کا اثر سب پر یکساں پڑنا چاہیے، حالانکہ گلاب کی ایک پنکھڑی کے اوپر کا حصہ تو

نہایت زرد ہوتا ہے اور نیچے کا حصہ نہایت سرخ، حالانکہ یہ پنکھڑی نہایت نازک اور لطیف ہوتی ہے، ہم کو یہ بداہۃً معلوم ہے کہ اس نازک اور لطیف پنکھڑی کے ساتھ ستاروں اور آسمانوں کو ایک ہی نسبت ہے اور ایک طبیعت ایک مادہ میں صرف ایک ہی اثر رکھتی ہے۔ خود حکماء کا قول ہے کہ مفرد کی شکل کروی ہوتی ہے، کیونکہ ایک طبیعت کا اثر ایک ہی مادہ میں یکساں ہونا چاہیے اور صرف کروی شکل کے تمام اطراف و جوانب یکساں ہوتے ہیں۔ غرض طبیعت اور مادہ کے اتحاد کا اثر یکساں پڑنا چاہیے حالانکہ یہ تو یکساں نہیں ہے بلکہ پنکھڑی کا ایک حصہ نہایت زرد اور دوسرا حصہ نہایت سرخ ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان اوصاف کے پیدا کرنے میں طبیعت کو کوئی دخل نہیں بلکہ ان کا پیدا کرنے والا ایک فاعل، مختار اور حکیم ہے۔(۱)

اصل یہ ہے کہ عالم کے حدوث و قدم کے متعلق صرف پانچ احتمالات قائم ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ وہ بالذات و بالصفات قدیم ہے، یعنی اجسام فلکیہ کی ذات اور اس کے صفات سب قدیم ہیں۔ البتہ اس کی حرکت قدیم نہیں ہے بلکہ ہر حرکت کے پہلے ایک حرکت ہے۔ اسی طرح اجسام عنصریہ کا ہیولیٰ قدیم ہے۔ البتہ ان کے صور و اعراض قدیم نہیں ہیں بلکہ ایک صورت کے بعد دوسری صورت اور ایک عرض کے بعد دوسرا عرض اس کو لاحق ہوتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ الی غیر النہایہ چلا جاتا ہے۔ ارسطو کا یہی مذہب ہے اور متاخرین فلاسفہ میں فارابی اور ابن سینا نے یہی مذہب اختیار کیا ہے۔

(۲) عالم بالذات قدیم اور بالصفات حادث ہے، ارسطو سے پہلے جو حکماء موجود تھے، ان کا مذہب یہی تھا۔

(۳) عالم بالصفات قدیم اور بالذات حادث ہے، لیکن چونکہ یہ احتمال بداہۃً باطل ہے اس لیے اس کا کوئی قائل نہ ہو سکا۔

(۴) عالم بالذات و بالصفات حادث ہے اور ارباب مذاہب یعنی مسلمان، یہودی، عیسائی اور مجوسی سب کا یہی مذہب ہے۔

(۵) ان میں کوئی صورت یقینی نہیں ہے اس لیے اس مسئلہ میں توقف کرنا چاہیے۔ جالینوس کا یہی مذہب ہے۔

لیکن امام صاحب کے نزدیک آسمانی کتابوں میں صرف صفات کے امکان اور حدوث سے خداوند تعالیٰ کے وجود پر استدلال کیا گیا ہے۔(۲) امام صاحب نے تفسیر کبیر میں ہر ممکن طریقہ سے اس دلیل کو ثابت کیا ہے۔ اگرچہ اس دلیل کے ثبات کے لئے مادہ یا جسم کے حدوث کے ثابت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم چونکہ متکلمین کے نزدیک خود مادہ اور جسم بھی حادث ہیں اس لیے امام صاحب نے کتب کلامیہ میں مادہ اور جسم کے حدوث کا اثبات بھی کیا ہے، لیکن اس پر جو دلائل قائم کیے ہیں وہ نہایت طویل، پیچ دار اور پُر از مشکلات ہیں، اس کے لیے:

(۱) سب سے پہلے تو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ خود عالم کیا ہے؟ متکلمین کے نزدیک خدا کے سواہر موجود چیز عالم ہے، اس بنا پر تقسیم عقلی کے رو سے عالم میں صرف تین قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) ایک تو متحیز یعنی وہ چیزیں جو کسی حیز یا مکان میں پائی جائیں مثلاً اجسام اور جوہر فرد۔

(۲) وہ چیزیں جو متحیز یعنی جسم میں حال ہو کر پائی جائیں، مثلاً رنگ و بو وغیرہ۔ انہی کا نام عرض ہے اور پہلی قسم کو جوہر کہتے ہیں۔

(۳) وہ چیز جو نہ خود متحیز ہو اور نہ کسی متحیز میں حال ہو کر پائی جائے یعنی نہ وہ جوہر ہو نہ عرض۔ فلاسفہ کے

نزدیک اس قسم کا وجود ہے اور متکلمین کے نزدیک خدا کے سوا اس قسم کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک عقول، نفوس بلکہ خود مادہ بھی اسی قسم میں داخل ہے، اس لیے صرف اجسام و اعراض کے حدوث سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ خدا کے سوا ہر موجود حادث ہے، کیونکہ خود عقول و نفوس اور مادہ جسم و عرض نہیں ہیں۔ اس لیے جسم و عرض کے حدوث سے ان کا حدوث کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔

تمام متقدمین اور متاخرین، متکلمین حدوث عالم پر جو دلیل قائم کرتے تھے، وہ صرف اسی مقدمہ تک محدود تھی، یعنی خدا کے سوا وہ عالم صرف دو چیزوں کا مجموعہ سمجھتے تھے، جوہر اور عرض اور ان دونوں کے حدوث کو ثابت کر کے مجموعہ عالم کے حدوث کے قائل ہو جاتے تھے، لیکن امام صاحب کے نزدیک اس کے لیے ایک دوسرے مقدمہ کے ثابت کرنے کی بھی ضرورت ہے، یعنی یہ کہ خود حدث کی کیا حقیقت ہے؟ اگرچہ محدث کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن ان سب کا حاصل صرف دو تعریفوں کی صورت میں نکلتا ہے۔

(۱) محدث وہ ہے جو مسبوق بالعدم ہو، یعنی اس کا عدم اس کے وجود سے پہلے ہو، لیکن اس تفسیر پر فلاسفہ کا اعتراض یہ ہے کہ تقدم کی پانچ قسمیں ہے

(۱) علت کا تقدم معلول پر مثلاً سورج روشنی کی اور انگلی کی حرکت، کنجی کی حرکت کی علت ہے، لیکن اس تقدم کے لیے تقدم زمانی کی ضرورت نہیں، کیونکہ سورج روشنی سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر سورج اور سورج کی روشنی کے درمیان کوئی زمانہ حائل نہیں ہے۔ یہی حال انگلی اور کنجی کی حرکت کا ہے، کہ ان دونوں کے درمیان فصل زمانی نہیں ہے بلکہ دونوں کی حرکت ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور ایک دوسرے کی علت ہے۔

(۲) تقدم بالذات مثلاً دو کا وجود ایک پر موقوف ہے اور ایک کا وجود دو پر موقوف نہیں۔ اس لیے ایک دو پر مقدم بالذات ہے، البتہ تقدم بالذات میں یہ ضروری نہیں ہے کہ مقدم، موخر کی علت ہو، اس لیے وہ تقدم بالعلیۃ سے مختلف ہے۔

(۳) تقدم بالشرف جیسے حضرت ابو بکرؓ کا تقدم حضرت عمرؓ پر۔

(۴) تقدم بالرتبہ جیسے امام کا تقدم مقتدی پر۔

(۵) تقدم بالزمان یعنی مقدم پر ایک ایسا زمانہ گزرا ہو جس میں موخر نہ پایا جاتا ہو۔ پھر ایسا زمانہ پایا جائے جس میں موخر پایا جائے۔ مثلاً باپ کے وجود پر ایک ایسا زمانہ گزرا ہے جس میں بیٹا موجود نہ تھا۔ پھر اس زمانے کے گزرنے پر ایک ایسا زمانہ آیا جس میں بیٹے کا وجود ہو۔ اس بنا پر جب تک زمانے کا وجود نہ ہو تقدم زمانی کا وجود نہیں ہو سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ عالم کا عدم جو اس کے وجود پر مقدم فرض کیا گیا ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ تقدم بالعلیۃ ہے تو یہ محال ہے، کیونکہ اولاً تو عدم وجود کی علت نہیں ہو سکتا، دوسرے علت و معلول دونوں کا وجود ایک زمانے میں ساتھ ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر عالم کا عدم اس کے وجود کی علت ہو تو عالم کا عدم اور وجود دونوں ساتھ ساتھ پائے جائیں گے، اور یہ محال ہے۔

تقدم بالشرف اور تقدم بالرتبہ بھی نہیں ہو سکتا اور یہ ظاہر ہے، اسی طرح تقدم بالزمان بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ تقدم زمانی کے لیے زمانے کا وجود ضروری ہے۔ اس لیے اگر عالم کے عدم کو اس کے وجود پر تقدم زمانی ہو تو زمانہ بھی ازل

میں موجود ہوگا، لیکن زمانہ حرکت کے اور حرکت جسم کے عوارض میں ہے۔ اس لیے تقدم زمانی کی بنا پر زمانہ، حرکت اور جسم سب کو قدیم ماننا پڑے گا، حالانکہ مدعا جسم کا حدوث ثابت کرنا ہے۔

ان وجوہ سے یہ ماننا پڑے گا کہ عالم کا عدم اس کے وجود پر مقدم بالذات ہے، کیونکہ عالم بذات خود ممکن ہے اور ممکن بالذات کا وجود بذات خود نہیں ہوتا بلکہ دوسری ذات پر موقوف ہوتا ہے اور جو چیز بالذات ہوتی ہے وہ اس چیز پر مقدم ہوتی ہے جو بالغیر ہو، اس لیے عالم کا عدم اس کے وجود پر مقدم بالذات ہے مقدم بالزمان نہیں۔

(۲) محدث کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ وہ مسبوق بالغیر ہو یعنی اس سے پہلے غیر کا وجود ہو۔ اب پھر سوال پیدا ہوگا کہ یہ تقدم کس قسم کا ہے؟ اگر یہ تقدم بالعلیت ہے تو یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے، کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک عالم بذات خود ممکن اور اپنی علت کے وجوب کی وجہ سے واجب ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حوادثات عالم کی ابتداء کسی خاص حادثہ سے ہونا چاہیے، کیونکہ جب عالم کی علت یعنی خدا دائمی ہے تو اس کا معلول بھی دائمی ہوگا اور اگر یہ تقدم بالذات و بالشرف ہے تو اس سے بھی انکار نہیں، البتہ تقدم مکانی متفقہ طور پر نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حوادث کی ابتدا کسی خاص حادثہ سے ہونا چاہیے، کیونکہ اگر عالم کے اوپر دو موجود ایسے ہوں جو ازلی و ابدی ہوں تو اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ اس بنا پر موجودات عالم کے حدوث ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس تقدم کو تقدم زمانی تسلیم کیا جائے، لیکن اس سے دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس سے خدا کا زمانی ہونا لازم آتا ہے، دوسرے اس سے خود زمانہ کا زمانی ہونا لازم آتا ہے، اور یہ دونوں باتیں محال ہیں۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے عالم کا قدم ثابت ہوتا ہے جو مدعا کے خلاف ہے، کیونکہ اگر خدا کا تقدم عالم پر ایسا ہے جس کی ابتدا نہیں اور یہ تقدم زمانی ہے، اس سے ایسے زمانہ کا ثبوت ہوتا ہے جس کی ابتدا نہیں اور اس وقت بالترتیب زمانہ حرکت اور جسم سب کو قدیم ماننا پڑے گا۔

لیکن امام صاحب تقدم کے ان اقسام خمسہ کے علاوہ ایک اور قسم کا تقدم ثابت کرتے ہیں، مثلاً کل یعنی گذشتہ دن آج کے دن پر مقدم ہے لیکن یہ تقدم بالعلیہ نہیں ہے، کیونکہ علت اور معلول کا وجود ایک ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس لیے اگر کل کا دن آج کے دن کی علت ہو تو کل اور آج ایک ساتھ پائے جائیں گے، حالانکہ یہ محال ہے۔ اس کے علاوہ زمانے کے اجزاء بالکل یکساں ہیں۔ اس لیے ایک جزو دوسرے جزو کی علت نہیں ہو سکتا، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ تقدم بالذات و بالشرف اور بالمکان بھی نہیں، اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے یعنی یہ کہ یہ تقدیم بالزمان ہو، لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہے، ورنہ یہ زمانہ بھی کسی دوسرے زمانہ میں پایا جائے گا۔ پھر پہلے زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی یہی بحث ہوگی اور اس کا نتیجہ ہوگا کہ ایک ہی ساتھ غیر متناہی زمانوں کا وجود ہو جائے گا، اور ہر ایک زمانہ دوسرے زمانے کا ظرف ہوگا، اور یہ محال ہے۔ کیونکہ ان تمام غیر متناہی زمانوں کے مجموعہ کا گزشتہ کل بھی آج پر مقدم ہوگا۔ اس لیے یہ مجموعہ بھی دوسرے زمانے کا محتاج ہوگا، اور یہ محال ہے، کیونکہ جو زمانہ اس مجموعہ کا ظرف ہے اس کو اس مجموعہ سے الگ ہونا چاہیے، کیونکہ ظرف مظروف سے مختلف ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس سے الگ بھی نہیں ہے کیونکہ زمانے کے مجموعہ میں زمانے کے تمام افراد داخل ہیں، اور یہ زمانہ بھی زمانے کا ایک فرد ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ زمانہ اس مجموعہ سے الگ بھی ہو اور الگ بھی نہ ہو، اور یہ محال ہے، اس لیے یہ کیونکر ممکن نہیں ہے کہ عالم کا عدم اس کے وجود پر اور خدا کا وجود عالم کے وجود پر اسی طریقہ سے مقدم ہو، اس وقت یہ اعتراض دور ہو جائے گا۔

غرض اس قسم کے اور بہت سے مباحث کے بعد امام صاحب نے عالم کے حدوث پر متعدد دلیلیں قائم کی ہیں جن میں ایک دلیل یہ ہے کہ اجسام ازل میں ساکن تھے یا متحرک تھے یا نہیں، کیونکہ ہر جسم ایک متحیز چیز ہے، اس لیے وہ ایک معین چیز میں رہتا ہے۔ اب یہ حالت یا تو اس میں قائم رہے گی یا وہ دوسری چیز میں منتقل ہوگا۔ پہلی صورت کا نام سکون اور دوسری صورت کا نام حرکت ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر جسم ازلی ہوتا تو وہ ازل میں یا متحرک ہوگا یا ساکن۔ لیکن وہ ازل میں متحرک نہیں ہو سکتا، کیونکہ حرکت ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کا نام ہے، اس لیے دوسری حالت میں منتقل ہونے سے پہلے، پہلی حالت کا وجود ضروری ہے کیونکہ حرکت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک چیز کے بعد ہو اور جو چیز ازلی ہے وہ کسی چیز کے بعد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے حرکت اور ازل دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا محال ہے۔ اسی طرح جسم ازل میں ساکن بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر اس کا سکون ازلی ہوتا تو یہ سکون کبھی زائل نہ ہوگا، حالانکہ ہر متحیز چیز اپنے حیز سے نکل کر دوسرے حیز میں جا سکتی ہے اور جب وہ دوسرے حیز میں جائے گی تو اس کا یہ سکون زائل ہو جائے گا، لیکن یہ دلیل اس پر موقوف ہے کہ سکون ایک وجودی چیز ہے، ورنہ اگر اس کو عدمی تسلیم کر لیا جائے تو یہ دلیل قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ ازل میں عدمی چیز کا زوال ناممکن نہیں ہے بلکہ بالاتفاق جائز ہے، کیونکہ اگر اس کو جائز تسلیم نہ کیا جائے تو عالم کا حدوث ہی نہیں ثابت ہو سکتا، اور اس صورت میں ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اگر عالم حادث ہو تو اس کا عدم ازلی ہوگا۔ جب اس کا عدم ازلی ہوگا تو وجود کے طریان سے زائل نہ ہو سکے گا، لیکن چونکہ عالم موجود ہو چکا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عالم کا عدم ازلی نہ تھا۔ جب اس کا عدم ازلی نہ تھا تو اس کا وجود ازلی ہوگا، قدم عالم کے یہی معنی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر ازلی چیز ممتنع الزوال نہیں ہے بلکہ اس کا وجودی ہونا ضروری ہے، حالانکہ فلاسفہ کے نزدیک سکون ایک عدمی چیز ہے یعنی جس چیز میں حرکت کی صلاحیت ہو اور وہ حرکت نہ کرے تو اس کو ساکن کہیں گے، اس لیے سکون کی تعریف یہ ہوگی، عدم الحركة عما من شانه ان يتحرك اور جب سکون عدمی چیز ٹھہرا تو وہ عدم میں زائل بھی ہو سکے گا، اس بنا پر امام صاحب نے اس دلیل کی صحت کے لیے سب سے پہلے سکون کو ایک وجودی چیز ثابت کیا ہے لیکن اس دلیل پر اور بھی بہت سے اعتراضات ہیں۔

ان تمام باتوں کے ثابت کرنے کے بعد امام صاحب نے خدا کے وجود کے دلائل قائم کیے ہیں، لیکن یہ دلائل نہایت کثیر المقدمات، طویل الذیل اور پُر از مشکلات و اعتراضات ہیں، اس لیے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں، لیکن خداوند تعالیٰ کے اثبات کا ایک طریقہ اور ہے اور امام صاحب کے طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی رجحان اسی طرف ہے، چنانچہ مباحث مشرقیہ میں اس طریقے کی نسبت لکھتے ہیں کہ "بعض لوگوں نے (اثبات خدا) میں اس احکام و اتقان پر اعتماد کیا ہے، جو آسمان و زمین بالخصوص جسم انسانی کی ترکیب، ان کے عظیم الشان فوائد اور عجیب و غریب صنعت میں نظر آتا ہے، جن کو دیکھ کر ہر عاقل کی فطرت شہادت دیتی ہے کہ وہ ایک حکیم و علیم کے تدبر کے سوا اور کسی چیز سے پیدا ہی نہیں ہو سکتے، خداوند تعالیٰ کے اثبات کے اور جو فلسفیانہ طریقے ہیں ان سے صرف ایک ذات کا جو علۃ العلل ہو ثبوت ہوتا ہے، لیکن ان سے خدا کے علم و حکمت کا ثبوت نہیں ہوتا، لیکن اس طریقہ سے خداوند تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اس کے علم و حکمت کا ثبوت بھی ہوتا ہے، چنانچہ امام صاحب اس طریقے کی نسبت لکھتے ہیں۔ "یہ طریقہ ذات کے ساتھ اس ذات کے عالم ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے اور یہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ جو شخص اس پر غور کرے گا اور مقالات باطلہ کو چھوڑ دے گا وہ حیوانات کے اعضاء کی خلقت کو دیکھ کر ایک مدبر کے وجود کے اعتراف پر مجبور ہو جائے گا۔"(۲) مباحث مشرقیہ میں ایک دوسرے موقع پر اس

طریقہ کو فخرالدین رازیؒ نے اس صورت میں اس طرح بیان کیا ہے "حیوان کے جسم کا سبب فاعلی یا تو ایسی چیز ہوگی جو علم و ادراک سے خالی ہو یا صاحب علم ہوگی، پہلی صورت ایک تو اس وجہ سے باطل ہے جس کو ہم نے بیان کیا، دوسرے اس وجہ سے کہ جو فطرت سلیمہ رکھتا ہے یقین رکھتا ہے کہ ایسا وصف محکم اور ایسی عجیب و غریب ترتیب جن کے فوائد کی انتہا تک پہنچنے سے تمام عقلیں عاجز و درماندہ ہیں ایسی چیز سے نہیں پیدا ہو سکتے جو علم و ادراک سے خالی ہو۔ اس لیے لامحالہ ان بدنوں کا پیدا کرنے والا صاحب علم ہوگا، اب یا تو وہ

الف۔ خود نفس انسانی ہے۔

ب۔ یا نفس انسانی کی کوئی قوت ہے۔

ج۔ یا ان دونوں سے الگ کوئی اور چیز ہے۔

پہلی دونوں صورتیں تو بداہتہً باطل ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ نفس انسانی اور اس کی قوتیں بدن کے پیدا ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ بدن کی ترکیب و نظام کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے یہ کہ تکمیل علوم کے بعد بھی جب تک علم تشریح میں کامل مہارت حاصل نہ ہو ہم اعضاء کی کیفیت، ان کی شکل، مقدار اور وضع کو نہیں جان سکتے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اپنی پیدائش کے ابتدائی دور میں ہم ان چیزوں سے واقف ہوں اور جب ہم ان سے واقف نہیں ہیں تو ان کو اس طریقہ سے پیدا نہیں کر سکتے جس سے ان کے فوائد حاصل ہوں، تیسرے یہ کہ موجودہ حالت میں جب کہ ہماری قدرت مکمل ہو چکی ہے، ہم اپنے بدن کے کسی وصف میں تغیر نہیں پیدا کر سکتے، پھر ابتدائی حالت میں جبکہ ہم انتہا درجہ کے ضعیف ہوتے ہیں کیونکر اس قسم کے بدن کی ترکیب دے سکتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ بدن اور اس کی مختلف شکلوں کا پیدا کرنے والا ایک مدبر، حکیم اور قادر و علیم ہے، بعض لوگوں نے خود نفس انسانی کو اس ترکیب و احکام کا سبب قرار دیا ہے اور اس کی صورت یہ بتائی ہے کہ مادہ میں تو صرف نفس کے قبول کرنے کی استعداد پائی جاتی ہے لیکن خود نفس میں بہت سے آلات، لوازم اور مختلف قوتیں پائی جاتی ہیں جن میں باہم اتحاد پیدا ہو جاتا ہے، اس بنا پر بالقوی خود مادہ میں مختلف استعدادیں موجود ہوتی ہیں، جن میں ایک خاص قسم کا اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی اتحاد کا نام ترکیب و نظام ہے۔ لیکن امام صاحب اس کو رد کر کے لکھتے ہیں "بہتر تو یہ تھا کہ اس قسم کی رکیک باتوں کو ہم اس کتاب میں درج نہ کرتے، مجھ کو ان لوگوں پر بہت زیادہ تعجب آتا ہے جو اس قسم کی رکیک باتوں پر قانع و مطمئن ہو گئے ہیں بلکہ ان لوگوں کی عقلوں پر اور تعجب ہے جو ان باتوں کو لکھتے ہیں، ان کو پڑھتے ہیں اور ان کی طرف التفات کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ فاضل حکمائے قدیم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حیوانی بدنوں کا پیدا کرنے والا ایک مدبر حکیم ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو جالینوس کی کتاب منافع الاعضا یا اس کی کتاب "آراء بقراط و فلاطون" کی طرف رجوع کرو، اس وقت تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں کا اس پر اتفاق ہے تو اگر تم مقلد ہو تو تمہارے لیے ان علماء کی تقلید اور لوگوں کی تقلید سے بہتر ہے اور اگر تم کو علم کی تلاش ہے تو میرے خیال میں اس مسئلہ میں تم پر حق و باطل مشتبہ نہ ہوگا۔(۳)

اس دلیل کی بنیاد مادہ، صورت، جوہر اور عرض کے حدوث و قدم پر نہیں ہے، بلکہ اجسام عالم کی ترتیب، ترکیب اور ان کے نظام و احکام پر ہے، یعنی انسان کا یہ فطری خاصہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو غیر مرتب اور غیر منظم دیکھتا ہے تو اس کے اسباب و علل کی تلاش نہیں کرتا بلکہ یہ خیال کرتا ہے کہ کچھ قدرتی اسباب ایسے پیش آئے ہوں گے جنہوں نے چند

چیزوں کو ایک جگہ غیر مرتب طور پر جمع کر دیا ہو گا۔ ایک تند و تیز ہوا چلی ہو جس نے ایک جگہ خاک اور پتھر کا ایک ڈھیر لگا دیا ہو گا لیکن جب وہ ان چیزوں کو ایک منظم اور مرتب اصول کے مطابق دیکھتا ہے تو ان کو محض قدرتی اسباب کا نتیجہ نہیں سمجھتا بلکہ اس کو ایک ایسے وجود کی طرف منسوب کرتا ہے جو موجود ہونے کے ساتھ تمام اوصاف کمالیہ، مثلاً علم، قدرت اور حکمت کا مجموعہ بھی ہے۔ مجموعہ عالم کی بھی یہی حالت ہے کہ وہ خاک اور پتھر کا ایک غیر مرتب ڈھیر نہیں ہے بلکہ اس میں ایک خاص قسم کی ترتیب، ایک خاص قسم کا نظام اور ایک خاص قسم کی صناعی پائی جاتی ہے جو محض بخت و اتفاق یا کسی ایسی قوت کا فعل نہیں ہو سکتی جو علم و ادراک اور قدرت و حکمت سے خالی ہو بلکہ اس کے لیے ایک ایسی علت کی ضرورت ہے جو ان تمام اوصاف کے ساتھ متصف ہو اور اسی علت کا نام خدا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے اسی ترتیب و تنظیم کو موجودات عالم کا وصف قرار دیا ہے:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ط (نمل:۸۸)

ترجمہ: یہ خدا کی ایک کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو پختہ طور پر بنایا ہے۔

امام صاحب نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ پختگی صرف مرکبات میں پائی جاتی ہے۔(۴) اس بنا پر اس سے بحث نہیں کہ مادہ، صورت، جوہر اور عرض وغیرہ کیونکر پیدا ہوئے، کیونکہ ان مفردات کے پیدا کرنے میں بذات خود کوئی صنعت و احکام نہیں ہے، البتہ ان مفردات کی ترکیب و ترتیب سے جو گوناگوں چیزیں پیدا ہو گئیں وہ خود مادہ اور صورت کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں بلکہ ایک ایسی قوت کا نتیجہ ہیں جو علم و قدرت اور تدبیر و حکمت سے متصف ہے۔

نظام عالم کی اسی ترتیب و ہمواری کو خداوند تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں اپنے علم کی دلیل قرار دیا ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ○ (ملك:۳)

ترجمہ: جس نے تہ بہ تہ سات آسمان پیدا کیے بھلا تجھ کو خدا کی اس صنعت میں کوئی کسر دکھائی دیتی ہے، پھر دیکھ تجھ کو کوئی دراڑ نظر آتی ہے۔

تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے:

ان وجه الاستدلال بهذا على كمال علم الله تعالىٰ هو ان الحس دل على ان هذه السمٰوٰت السبع اجسام مخلوقة على وجه الاحكام والاتقان و كل فاعل كان فعله محكما متقنا فانه لا بدوان يكون عالما ،

ترجمہ: خدا کے کمال علم پر اس آیت سے اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ حس اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ ساتوں آسمان مضبوطی اور پختگی کے ساتھ پیدا کیے گئے ہیں اور جس فاعل کا فعل مضبوط اور پختہ ہو گا اس کا عالم ہونا ضروری ہے۔

اس آیت میں "تفاوت" کا جو لفظ آیا ہے اس کی نسبت اسی تفسیر میں لکھا ہے:

حقيقة التفاوت عدم التناسب و نقيضه متناسب ،

ترجمہ: تفاوت کی حقیقت تناسب کا نہ ہونا ہے اور اس کی نقیض تناسب ہے۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم میں ایک خاص قسم کا تناسب پایا جاتا ہے اور یہی تناسب مادہ وغیرہ جیسی غیر شاعرہ

قوت سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ شبلی "الکلام" میں لکھتے ہیں "میٹیریلسٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ مادہ خود بخود پیدا ہوا، مادہ کے ساتھ حرکت پیدا ہوئی، حرکت نے امتزاج پیدا کیا، پھر رفتہ رفتہ بہت سے قوانین قدرت پیدا ہو گئے، لیکن وہ اس بات کی وجہ نہیں بتا سکتا۔ ان سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں قوانین قدرت میں یہ توافق، تناسب اور اتحاد کہاں سے آیا؟ توافق اور اتحاد کا پیدا ہونا خود ان قوانین کی ذاتی خاصیت نہیں ہے، اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو محض ایک فرضی احتمال ہوگا، جس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہی بالاتر قوت جو تمام قوانین قدرت پر حاکم ہے اور جس نے ان تمام قوانین میں ربط اور اتحاد قائم کیا ہے، خدا ہے"۔

ابن رشد نے کشف الادلہ میں خداوند تعالیٰ کے وجود پر یہی دلیل قائم کی ہے اور لکھا ہے کہ شریعت نے جس طریقہ سے قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں جمہور کو یہ تعلیم دی ہے کہ عالم خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر ان آیتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ طریقہ عنایت کا ہے اور یہ طریقہ منجملہ ان طریقوں کے ہے جن کی نسبت ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ خدا کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان جب ایک محسوس چیز کو دیکھتا ہے کہ وہ ایک ایسی وضع، شکل اور مقدار میں بنائی گئی ہے جو اس فائدے کے موافق ہیں جو اس محسوس چیز میں موجود ہیں، یہاں تک کہ اگر وہ اس شکل، اس وضع اور اس مقدار میں نہ پائی جائے تو یہ فوائد بھی نہ پائے جائیں گے، تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ اس چیز کو کسی نے بنایا ہے۔ اس لیے اس کی وضع، شکل اور مقدار اس کے فوائد کے موافق ہے اور یہ موافقت محض بخت و اتفاق سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ مثلاً جب انسان زمین پر ایک پتھر کو دیکھتا ہے کہ اس کی وضع، شکل اور مقدار اس قسم کی ہے کہ اس پر بیٹھا جا سکتا ہے تو وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس پتھر کو ایک کاریگر نے بنایا ہے، لیکن اگر اس کی وضع شکل اور مقدار بیٹھنے کے لیے موزوں نہ ہو تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ اس جگہ یہ پتھر اس حالت میں محض بخت و اتفاق سے پڑا ہوا ہے، کسی شخص نے اس کو یہاں نہیں رکھا ہے، بعینہٖ یہی حالت تمام عالم کی ہے، کیونکہ جب انسان اجزائے عالم یعنی چاند، سورج اور تمام ستاروں کو جو چاروں زمانوں رات، دن، بارش، ہوا، زمین کی آبادی، انسانوں کے وجود اور تمام مخلوقات یعنی حیوانات اور نباتات کا سبب ہیں دیکھتا ہے اور اس کو نظر آتا ہے کہ زمین انسانوں اور خشکی کے تمام جانوروں کے رہنے کے لیے، پانی تمام آبی جانوروں کے لیے، اور ہوا اڑنے والے جانوروں کے لیے موزوں ہے۔ اگر اس نظام میں خلل واقع ہو جائے تو ان مخلوقات کے وجود میں بھی خلل پڑ جائے تو وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ انسان حیوان اور نباتات کے لیے اجزائے عالم میں جو موافقت پائی جاتی ہے وہ محض بخت و اتفاق سے نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ ایک وجود نے بالقصد و بالارادہ اس موافقت کو پیدا کیا ہے، اسی وجود کا نام خدا ہے۔

علامہ ابن رشد نے لکھا ہے کہ جمہور اور عوام کے لیے ایسے دلائل قائم کرنے چاہئیں جو سادہ اور بسیط ہوں، یعنی ان میں بہت کم مقدمات کی ضرورت ہو۔ شریعت نے اسی قسم کے دلائل سے کام لیا ہے، اگرچہ امام صاحب عموماً ایسے دلائل سے کام لیتے ہیں جن میں بہت زیادہ مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ کے ثبوت میں بھی انہوں نے اسی قسم کے دلائل سے کام لیا ہے، تاہم ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تمام دلائل کا استقصاء کر دیتے ہیں اور ان میں جو دلیل سب سے بہتر ہوتی ہے اس کی طرف اپنا رجحان ظاہر کر دیتے ہیں، یہ دلیل بھی اسی قسم کی ہے۔

توحید

حکماء و متکلمین دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ واجب الوجود یعنی خدا صرف ایک ہے لیکن دلائل دونوں کے مختلف ہیں۔

حکماء نے اس پر جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کو امام صاحب نے مباحث مشرقیہ میں بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اگر دو چیزیں وجوب وجود میں شریک اور ماہیت و تعین میں مختلف ہوں تو ایک کا وجوب وجود دوسرے کے تعین سے مختلف ہوگا۔ اب صرف دو صورتیں ہوں گی

١۔ ایک تو یہ کہ ان میں سے ایک کے وجوب وجود اور تعین میں تلازم ہو۔

٢۔ یا یہ کہ دونوں میں تلازم نہ ہو۔

اگر دونوں میں تلازم نہیں ہے تو ذات کا وجوب وجود اس تعین کا مقتضی نہ ہوگا۔ اس صورت میں وہ تعین بھی وجوب وجود کو چاہے گا۔ اس بنا پر اس وجوب وجود کو اس تعین کے ساتھ وجوب وجود کے ساتھ متصف ہونے کے لیے ایک سبب خارجی کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے جن دو ذاتوں کو واجب الوجود تسلیم کیا ہے وہ ممکن الوجود قرار پائیں گی۔ اور تعین میں دوسرے کی محتاج ہو جائیں گی۔ پہلی صورت میں یعنی جب وجوب وجود اور تعین میں تلازم ہو تو یہ تلازم یا تو وجوب وجود اور تعین کی نفس حقیقت کا نتیجہ ہوگا یا یہ کہ ان کی نفس حقیقت کا نتیجہ ہوگا۔ اگر ان کی نفس حقیقت کا نتیجہ نہ ہو تو اس کا کوئی خارجی سبب ہوگا۔ جو چیز خارجی سبب کی محتاج ہوتی ہے وہ ممکن ہوتی ہے، اس لیے جن دو ذاتوں کو واجب الوجود قرار دیا گیا ہے۔ وہ ممکن ہو جائیں گی، اگر یہ تلازم دونوں کی نفس حقیقت کا اقتضا ہو تو لازمی طور پر ایک دوسرے کی علت ہوگا اور دوسرا اس کا معلول ہوگا۔ کیونکہ اگر ہر ایک دوسرے کی علت ہو تو اس سے دور لازم آئے گا، لیکن تعین وجوب وجود کی علت نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں اگرچہ وجوب وجود اس ذات خاص میں داخل ہے، تاہم وہ اس تعین سے خارج ہے، کیونکہ وجوب وجود ان دونوں خداؤں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے، دونوں کو ایک دوسرے سے امتیاز صرف تعین سے ہوتی ہے، مابہ الاشتراک مابہ الامتیاز سے الگ ہوتا ہے، اس بنا پر وجوب بالذات دوسری ماہیت کا تابع ہوگا اور یہ محال ہے، اب لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ وجوب بالذات اس تعین کی علت ہے، اس لیے جہاں وجوب بالذات پایا جائے گا اس کا معلول یعنی یہ تعین بھی پایا جائے گا، اس لیے ہر واجب الوجود صرف ایک ہی ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ واجب الوجود صرف ایک ہے۔

امام صاحب نے حکماء کے طریقے کے مواق اور بھی بہت سی دلیلیں قائم کی ہیں لیکن حکماء کے تمام دلائل کا اثبات چھ مقدمات پر موقوف ہے:

١۔ وجوب ایک امر ثبوتی ہے۔

٢۔ وجوب بالذات ایسا وصف نہیں ہو سکتا جو واجب کی ذات سے خارج ہو۔

٣۔ وجوب وصف مشترک ہے۔

٤۔ تعین متعین کی ماہیت پر زائد ہے۔

٥۔ تعین ایک وصف ثبوتی ہے۔

٦۔ مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز باہم مختلف ہوتے ہیں۔

ان دلائل کے متعلق امام صاحب کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ حکماء نے ان مقدمات کو اچھے طور پر ثابت نہیں کیا تھا لیکن امام

صاحب نے ان مقدمات کو زیادہ مستحکم طور پر ثابت کیا۔(٦) متکلمین نے خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر جو دلیل قائم کی ہے اس کی بنیاد قرآن مجید کی اس آیت پر ہے

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ (انبیاء ٢٢)

ترجمہ اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور خدا ہوتے تو دونوں برباد ہو جاتے۔

اس دلیل کو خطابی دلیل مان لیا جائے تو اس کے لیے کسی طویل تقریر کی ضرورت نہیں، فارسی کا مشہور مقولہ ہے کہ دو بادشاہ در اقلیمے نگنجد اس لیے اگر آسمان و زمین میں متعدد خدا ہوتے تو ان میں، جیسا کہ دنیوی بادشاہوں میں ہوا کرتا ہے، باہم اختلاف ہوتا اور اختلاف سے جنگ و جدال کی نوبت پہنچتی اور دنیا کا یہ نظم و نسق قائم نہ رہتا۔ قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ ۚ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ (مومنون: ٩١)

ترجمہ اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، ورنہ ہر ایک خدا اپنی مخلوقات کو (الگ لیے) لیے پھرتا اور (آپس میں لڑتے اور آخر کار) ایک دوسرے پر غالب آ جاتا۔

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ○ (بنی اسرائیل: ٤٢)

ترجمہ (اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ) اگر خدا کے ساتھ جیسا (کہ یہ لوگ) کہتے ہیں (اور) معبود (بھی) ہوتے تو اس صورت میں ان معبودوں نے (کبھی کا) مالک عرش (یعنی خدا) تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہوتا۔

لیکن امام صاحب نے تفسیر کبیر اور علم کلام کی کتابوں میں اس دلیل کو برہانی قرار دیا ہے۔ اس کی جو تقریر کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر دو خدا کا وجود فرض کیا جائے تو ہر ایک تمام مقدورات پر قادر ہوگا۔ اس لیے ہر ایک زید میں حرکت اور سکون پیدا کر سکے گا۔ اب اگر ایک نے زید میں حرکت اور دوسرے نے سکون پیدا کرنا چاہا اور دونوں اپنے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گئے تو اس سے ضدین یعنی حرکت و سکون کا اجتماع لازم آئے گا، یہ محال ہے، اگر دونوں اپنے اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہے تو یہ بھی محال ہے، کیونکہ ہر ایک کی ارادہ کی کامیابی میں دوسرے کا ارادہ باہم متضاد ہونے کی وجہ سے مانع ہے۔ اس لیے ایک اپنے ارادہ میں اس وقت ناکامیاب ہوگا جب دوسرا اپنے ارادہ میں کامیاب ہو۔ اسی طرح جب دوسرا اپنے ارادہ میں ناکامیاب ہوگا تو پہلا کامیاب ہوگا۔ اس لیے اگر دونوں اپنے اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہیں تو دونوں اپنے اپنے ارادہ میں کامیاب بھی ہوں گے اور یہ محال ہے۔ اگر صرف ایک کا مقصد حاصل ہو اور دوسرا اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہے تو یہ صورت بھی محال ہے، کیونکہ اولاً تو دونوں خدا یکساں طور پر قدرت رکھتے ہیں اس لیے ایک کی قدرت کو دوسرے کی قدرت پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ جو خدا اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہا وہ عاجز ہوگا اور خدا کی ذات میں عجز ایک عیب ہے۔

اس دلیل کی صحت اس پر موقوف ہے کہ ان دونوں معبودوں میں اختلاف کا ہونا لازمی اور قطعی ہو، حالانکہ وہ قطعی و لازمی نہیں بلکہ ممکن ہے، اس لیے دو معبودوں کی موجودگی میں نظام عالم کی ابتری ممکن ہوگی، لازمی نہ ہوگی، حالانکہ آیت سے معلوم ہوتا ہے

کہ وہ لازمی اور قطعی ہے۔

امام صاحب نے اربعین فی اصول الدین میں اس اعتراض کی تقریر ان الفاظ میں کی ہے۔ "یہ تینوں قسمیں دونوں معبودوں کے درمیان اختلاف کے واقع ہونے سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن ایسے دو معبودوں کا وجود کیوں نہیں ممکن ہے جن کے درمیان اختلاف محال ہو۔ اختلاف کے واقع ہونے پر تو کوئی دلیل نہیں، البتہ اس قسم کی دلیل موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں معبودوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ایک تو یہ کہ خدا حکیم ہے اور حکیم وہ ہے جو ایسا کام کرتا ہے جو افضل و اولیٰ ہو، افضل و اولیٰ صرف ایک چیز ہوتی ہے، اس لیے یہ دونوں معبود جب حکیم ہیں تو وہی صورت اختیار کریں گے جو اولیٰ و افضل ہوگی، وہ صورت صرف ایک ہے، اس لیے ان میں اختلاف ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ دونوں معبودوں کو تمام معلومات کا علم حاصل ہوگا کہ کون سی چیز واقع ہو سکتی ہے اور کونسی چیز واقع نہیں ہو سکتی، اس لیے ان میں ہر ایک معبود صرف اسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرے گا جو واقع ہو سکتی ہے، کیونکہ جو چیز واقع ہی نہیں ہو سکتی اس کا ارادہ محال ہے اور یہ چیز صرف ایک ہے (مثلاً زید کی حرکت یا زید کا سکون)، اس صورت میں ان میں باہم اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

امام صاحب نے اس اعتراض سے بچنے کے لیے اس دلیل کی ایک دوسری تقریر کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک چیز کی دو علت تامہ نہیں ہو سکتیں، کیونکہ علت کی موجودگی میں معلول کا وجود ضروری ہو جاتا ہے، اس لیے اگر زید کا خالق ایک خدا ہے تو اس کے وجود کے ساتھ زید کا وجود ضروری ہو جائے گا، اس کو دوسرے خدا کی ضرورت نہ ہوگی، لیکن چونکہ یہ فرض کیا گیا ہے کہ زید کو دونوں خدا نے مل کر پیدا کیا ہے، اس لیے وہ دوسرے خدا کا بھی محتاج ہوگا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہر ایک خدا سے بے نیاز بھی ہوگا اور ہر ایک خدا کا محتاج بھی ہوگا، اور یہ محال ہے، لیکن اس دلیل پر بھی یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ صرف اس صورت میں کار آمد ہو سکتی ہے جب ان میں ہر ایک خدا چاہے کہ ایک چیز مثلاً زید کو صرف وہی پیدا کرے اور یہ استبداد و اختلاف کی صورت ہے، لیکن یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ہر ایک دوسرے خدا کی مخلوقات میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ مثلاً ایک زمین کو پیدا کرے، ایک آسمان کو، ایک حیوانات کو پیدا کرے، ایک نباتات کو، اس طرح تقسیم عمل کے اصول پر دونوں دنیا کے کاروبار کو چلائیں، نظام عالم میں نہ کوئی خلل ہو اور نہ ایک معلول کے لیے دو علتوں کی ضرورت ہو۔

امام صاحب نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ایجاد کے معنی اگر نفس قدرت و ارادہ کے ہیں تو اس سے موجد میں بھی اشتراک پیدا ہو جائے گا، کیونکہ دونوں یکساں طور پر قدرت و ارادہ رکھتے ہیں، اگر ایجاد کے معنی خود مخلوق مثلاً زید کے ہیں تو جبکہ دونوں معبودوں کو یکساں طور پر قدرت و ارادہ حاصل ہے تو اس ترجیح کی کیا وجہ ہے کہ وہ مخلوق صرف ایک کی قدرت و ارادہ سے پیدا ہو اور دوسرے کی قدرت و ارادہ سے پیدا نہ ہو، اگر ایجاد کے معنی کسی اور چیز کے ہیں تو وہ چیز یا قدیم ہوگی یا حادث، اگر قدیم ہے تو اس کے ساتھ ارادہ کا تعلق ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر حادث ہے تو یہ وہی دوسری صورت ہے۔

امام غزالی نے اس مسئلہ کو امام صاحب سے زیادہ صاف اور واضح پیرائے میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "دو خالق کے درمیان مخلوقات کی تقسیم کی صرف دو صورتیں ہیں'

۱۔ ایک تو یہ کہ بعض جواہر و اعراض کو ایک خدا پیدا کرے اور بعض کو دوسرا، مثلاً ایک زمین کو پیدا کرے اور دوسرا آسمان کو۔

۲۔ تمام جواہر کو ایک خدا پیدا کرے اور تمام اعراض کو دوسرا۔

پہلی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس خدا نے آسمان کو پیدا کیا ہے وہ زمین کے پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر وہ قادر ہے تو دونوں کی قدرت میں کوئی امتیاز نہیں، اس لیے ان کے مقدور میں بھی کوئی امتیاز نہ ہوگا۔ اس لیے جس خدا نے آسمان کو پیدا کیا ہے وہ زمین کو بھی پیدا کر سکے گا اور ایک کی ایجاد کو دوسرے کی ایجاد پر کوئی ترجیح حاصل نہ ہوگی۔ لیکن اگر وہ زمین کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے تو یہ محال ہے، کیونکہ تمام جواہر متماثل ہیں، یعنی ان کی حقیقت ایک ہے، اور ایک خاص حیز میں ان کا واقع ہونا بھی متماثل ہے، جو خدا ایک چیز پر قادر ہے وہ اس کے مثل پر بھی قادر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی قدرت قدیم ہے اور اس کا تعلق متعدد اجسام و جواہر سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ صرف ایک ہی جسم اور جوہر تک محدود نہیں ہے، جب قدرت حادثہ کے برخلاف اس کا تعلق متعدد مقدور سے ہو سکتا ہے تو بعض مقدور کو دوسرے مقدور پر ترجیح کی کیا وجہ ہے۔ بلکہ جب کہ اس کے مقدورات غیر متناہی ہیں تو ہر ممکن الوجود جوہر اس کی قدرت کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے۔

دوسری صورت میں جبکہ ایک جوہر اور دوسرا عرض کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو چونکہ یہ دونوں چیزیں مختلف الماہیۃ ہیں اس لیے یہ ضروری نہیں کہ جس خدا کو جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت حاصل ہو وہ عرض کے پیدا کرنے پر بھی قادر ہو، لیکن عرض جوہر کا اور جوہر عرض کا محتاج ہے۔ اس لیے ہر خدا کا فعل دوسرے کے فعل پر موقوف ہوگا، اس صورت میں وہ اس کو پیدا نہ کر سکے گا۔ مثلاً ایک خدا عرض کو پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن جو خدا جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہ جوہر کے پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس صورت میں جو خدا عرض کو پیدا کر سکتا ہے وہ عاجز ہو جائے گا اور عجز قدرت کے منافی ہے۔ یہی حالت جوہر کی بھی ہے کہ جو خدا جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جوہر کو پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن عرض کا پیدا کرنیوالا اس کی مخالفت کرتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں میں باہم اتفاق ہو یعنی جب ایک خدا جوہر کو پیدا کرے تو دوسرا عرض کے پیدا کرنے پر آمادہ ہو جائے یا دوسرا خدا جب عرض کو پیدا کرنا چاہے تو دوسرا جوہر کو پیدا کر دے۔ لیکن اگر یہ اتفاق واجب یعنی لازمی اور ضروری ہے تو یہ قدرت کے منافی ہے، کیونکہ اس صورت میں جب ایک خدا جوہر اور دوسرا عرض کو پیدا کرے گا تو ہر ایک عرض اور جوہر کے پیدا کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور مجبوری قدرت کے منافی ہے۔ اور اگر ممکن ہے یعنی اس قسم کا اتفاق ضروری اور لازمی نہیں ہے تو کوئی جوہر یا عرض پیدا ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایک خدا جب جوہر یا عرض کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو دوسرا عرض یا جوہر کے پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہو تا اور کوئی جوہر یا عرض بغیر عرض اور جوہر کے پیدا نہیں ہو سکتا۔

امام صاحب نے تفسیر کبیر میں توحید پر چودہ عقلی دلیلیں اور قائم کی ہیں، لیکن ان کی نسبت خود تصریح کر دی ہے کہ وہ ظنی اور خطابی ہیں۔(۶) البتہ انہوں نے اس دلیل کی جو دوسری تقریر کی ہے اس پر ان کو کامل اعتماد ہے۔ اس کی نسبت لکھتے ہیں:

واعلم انك لما وقفت على حقيقة هذه الدلالة عرفت ان جميع ما في هذا العالم العلوى والسفلى من المحدثات والمخلوقات فهو دليل علىٰ وحدانية الله تعالىٰ بل وجود كل واحد من الجواهر والاعراض دليل تام على التوحيد

من الوجه الذی بیناہ وھذہ الدلالۃ قد ذکرھا اللہ تعالٰی فی مواضع من کتابہ (۷)

ترجمہ: تم کو جاننا چاہیے کہ جب تم اس دلالت کی حقیقت سے واقف ہوئے تو تم کو معلوم ہو گیا کہ اس عالم علوی و سفلی میں جس قدر مخلوقات اور محدثات ہیں وہ خدا کی وحدانیت کی دلیل ہیں، بلکہ ہر ایک جوہر اور عرض کا وجود اس طریقے کے مطابق جس کو ہم نے بیان کیا، توحید کی دلیل تام ہے، اور اس دلیل کو خداوند تعالٰی نے اپنی کتاب کے متعدد مواقع میں بیان کیا ہے۔۔۔

لیکن ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کے نزدیک اس آیت سے صرف بت پرستی کا ابطال مقصود ہے۔ یعنی اس آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر آسمان و زمین میں جیسا کہ بت پرستوں کا خیال ہے اور بھی بہت سے معبود ہوتے تو نظام عالم خراب ہو جاتا کیونکہ یہ بت جمادات سے بنائے گئے ہیں اور ان میں مدبر عالم ہونے کی صلاحیت اور قدرت نہیں ہے۔ اس لیے وہ نظام عالم کو قائم نہیں رکھ سکتے کیونکہ اس آیت سے پہلے خداوند تعالٰی نے فرمایا ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ (انبیاء: ۲۱)

ترجمہ: کیا ان لوگوں نے ایسے معبود بنا رکھے ہیں جن کو یہ لوگ خود زمین (کی چیزوں مٹی پتھر وغیرہ) سے بنا کر کھڑا کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (انبیاء: ۲۲)

ترجمہ: اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور خدا ہوتے تو دونوں برباد ہو جاتے۔

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس دلیل سے صرف بت پرستوں کے خیال کی تردید مقصود ہے، عام طور پر شریک باری کی نفی مقصود نہیں ہے، لیکن امام صاحب نے اس گروہ کے خیال کی تردید نہیں کی بلکہ صرف اس قدر لکھا ہے کہ یہ مناظرہ اگرچہ بت پرستوں کے ساتھ ہوا ہے لیکن خدا نے جو دلیل بیان کی ہے وہ تمام مخالفین کے مقابلے میں استعمال کی جا سکتی ہے۔

(ماخوذ از امام رازی مصنف مولانا عبدالسلام ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء ص ۹۲۔۹۶)۔

حواشی

۱۔ تفسیر کبیر ج ۳ ص ۷۷۹۔

۲۔ مباحث مشرقیہ ج ۲ ص ۳۵۱۔

۳۔ مباحث مشرقیہ ج ۲ ص ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹۔

۴۔ تفسیر کبیر ج ۲، ص ۵۸۳۔

۵۔ مباحث مشرقیہ ج ۲ ص ۳۵۶۔

۶۔ تفسیر کبیر ج ۱ ص ۳۴۷۔

۷۔ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۴۳۔

وجود باری

علامہ شبلی نعمانی

وجود باری پر قدماء کا طریقۂ استدلال:

خدا کے اثبات پر قدماء اس طرح استدلال کرتے تھے کہ عالم حادث ہے اور جو چیز حادث ہے یعنی ازلی نہیں ہے وہ کسی علت کی محتاج ہے اور یہی علت خدا ہے۔ اس استدلال کا دوسرا مقدمہ بدیہی ہے۔ پہلے مقدمہ پر یہ استدلال کیا جاتا تھا کہ عالم میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور جو چیز تغیر پذیر ہے وہ حادث ہے، یہ استدلال بظاہر نہایت صاف اور واضح تھا اور اس لیے اس کی زیادہ چھان بین نہیں کی گئی۔ لیکن در حقیقت صحیح نہ تھا۔ تمام چیزیں جو عالم میں موجود ہیں دو چیزوں کا مجموعہ ہیں، مادہ(۱) اور ایک خاص صورت(۲) جو چیز بدلتی رہتی اور تغیر پذیر ہے وہ صرف صورت ہے، اصل مادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ کوئی چیز جب فنا ہوتی ہے تو صرف اس کی صورت فنا ہوتی ہے، اصل مادہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ایک کاغذ کو جلا دو کاغذ جل کر راکھ ہو جائے گا، اب کاغذ فنا ہو گیا، لیکن راکھ موجود ہے جو اصل مادہ کی ایک دوسری صورت ہے۔ راکھ کو برباد کرو، کسی نہ کسی صورت میں وہ قائم رہے گی۔ غرض جو چیز حادث ہے وہ صرف صورت ہے، اصل مادہ کے حادث ہونے پر نہ کوئی تجربہ پیش کیا جاسکتا ہے نہ کوئی استدلال قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس بناء پر عالم کو حادث کہنا صورت کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن مادہ کے لحاظ سے صحیح نہیں، جب عالم کا حدوث ثابت نہیں تو استدلال بھی صحیح نہیں۔ ارسطو نے اس اعتراض کے لحاظ سے استدلال کا دوسرا طریقہ اختیار کیا یعنی یہ کہ عالم کے تمام اجزاء میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت پائی جاتی ہے، کیونکہ تمام اجسام یا بڑھتے رہتے ہیں یا گھٹتے ہیں اور بڑھنا یا گھٹنا حرکت ہی کی ایک قسم ہے۔ جن چیزوں کو ہم بحال خود قائم دیکھتے ہیں ان کے اجزاء بھی بدلتے رہتے ہیں، یعنی پرانے اجزاء فنا ہوتے جاتے اور ان کے بجائے نئے آتے جاتے ہیں۔ اجزاء کا بدلتا رہنا بھی ایک قسم کی حرکت ہے۔ اس لئے تمام عالم متحرک ہے اور جو چیز متحرک ہے، ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی محرک ہو۔ اب دو صورتیں ہیں یا یہ سلسلہ کسی حد تک جاکر ٹھہر جائے گا یعنی اخیر میں ایک ایسی چیز ثابت ہو گی جو بالذات یا بواسطہ تمام اشیاء کی محرک ہے اور خود متحرک نہیں، یہی خدا ہے یا یہ سلسلہ کہیں ختم نہ ہوگا۔ اس صورت میں غیر متناہی کا وجود لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔

ارسطو کا اصل مذہب یہ ہے کہ عالم قدیم ہے اور وہ بذات خود پیدا ہوا لیکن اس کی حرکت حادث ہے اور خدا اسی حرکت کا خالق ہے۔ اس بناء پر ارسطو نے خدا کے ثبوت میں حرکت سے استدلال کیا، حکمائے اسلام میں سے ابن رشد کا بھی

یہی مذہب ہے۔

بو علی سینا کا طریقہ:

بو علی سینا بھی عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہے لیکن اسلام کے اثرات سے اس بات کا قائل نہ ہو سکا کہ عالم خدا کا پیدا کیا ہوا نہیں، اس لئے اس نے یہ رائے اختیار کی کہ عالم قدیم بھی ہے اور خدا کا مخلوق بھی ہے، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا تھا کہ جب عالم اور خدا دونوں قدیم اور ازلی ہیں تو ایک کو علت اور دوسرے کو معلول کیونکر کہا جا سکتا ہے، کیونکہ علت و معلول میں زمانہ کا تقدم و تاخر ضرور ہے۔ بو علی سینا نے اس کا جواب دیا کہ علت کے لئے صرف تقدم بالذات کافی ہے، زمانہ کے لحاظ سے مقدم ہونا ضرور نہیں، مثلاً کنجی کی حرکت قفل کے کھل جانے کی علت ہے۔ لیکن کنجی کی حرکت اور قفل کے کھلنے میں ایک لحظہ اور ایک آن کا بھی آگا پیچھا نہیں۔

متکلمین کے نزدیک چونکہ خدا کے سوا کسی چیز کا قدیم ہونا خدا کی یکتائی میں خلل انداز تھا، اس لئے انہوں نے عالم کے حدوث کا دعویٰ کیا اور حدوث ہی سے خدا کے وجود پر دلیل قائم کی۔ عالم کے حادث ہونے پر متکلمین کا جو استدلال ہے اس کے سمجھنے کے لئے پہلے مقدمات ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہیے

(۱) عالم میں دو قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں، یعنی جو چیزیں بذات خود قائم نہیں بلکہ جب پائی جاتی ہیں تو کسی دوسری چیز میں ہو کر پائی جاتی ہیں، مثلاً بو، رنگ، مزہ، رنج، خوشی، جوش، جوہر یعنی وہ چیزیں جو بذات خود قائم ہیں، مثلاً پتھر، مٹی، پانی۔

(۲) کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا، کیونکہ جس قدر جواہر ہیں کسی نہ کسی صورت اور ہیئت میں ہوتے ہیں اور صورت و ہیئت عرض ہیں، تمام جواہر میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت پائی جاتی ہے اور حرکت عرض ہے، غرض جوہر کے جس قدر افراد ہیں ان میں کسی نہ کسی عرض کا پایا جانا ضرور ہے اور اس بناء پر کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا۔

(۳) عرض حادث ہے، یعنی پیدا ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔

(۴) جو چیز عرض سے کبھی خالی نہ ہو سکتی ہو، ضرور ہے کہ حادث ہو، کیونکہ اگر وہ قدیم ہو تو لازم آئے گا کہ عرض بھی قدیم ہو، کیونکہ دو چیزیں جو لازم و ملزوم ہوں، ان میں سے ایک چیز اگر قدیم ہو گی تو ضرور ہے کہ دوسری چیز بھی قدیم ہو، ورنہ لازم و ملزوم میں فصل زمانی لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔

اب عالم کے حادث ہونے پر اس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے کہ عالم دو صورت سے خالی نہیں، جوہر ہو گا یا عرض، اور جوہر و عرض دونوں حادث ہیں، عرض کا حادث ہونا تو ظاہر ہے۔ جوہر اس لئے حادث ہے کہ کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جو چیز عرض سے خالی نہ ہو سکتی ہو وہ حادث ہے۔

جب یہ ثابت ہوا کہ عالم حادث ہے تو ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی علت ہو، اب اگر علت بھی حادث ہے تو اس کے لئے بھی کوئی علت درکار ہو گی۔ اس صورت میں اگر یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم ہو گا تو وہی خدا ہے اور نہ ختم ہو گا تو دور و تسلسل لازم آئے گا اور دور و تسلسل محال ہے۔

متکلمین کا یہ استدلال فرفوریوس (پارفیریس) سے ماخوذ ہے، جیسا کہ ہم نے تاریخ علم الکلام میں نقل کیا ہے، لیکن یہ استدلال اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زمانہ غیر متناہی کا وجود نہیں ہو سکتا ورنہ یہ

استدلال محض مغالطہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا، لیکن کسی خاص عرض کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی عرض کا وجود چاہیے اور جب زمانہ غیر متناہی ہے تو یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ عالم قدیم ہے اور علیٰ سبیل البدلیہ کسی نہ کسی عرض کے ساتھ متصف رہتا ہے۔ یہ اعتراض الگ الگ تو حادث ہیں لیکن ان کا سلسلہ جو علیٰ سبیل البدلیہ ہے، غیر متناہی اور قدیم ہے، عالم کے حادث ہونے پر استدلال یہ تھا کہ اگر عالم قدیم ہو تو اعراض کا بھی قدیم ہونا لازم آئے گا۔ ہم کہتے ہیں کہ اعراض کے ہر ہر فرد کا قدیم ہونا لازم نہیں آتا بلکہ اعراض کے سلسلہ علیٰ سبیل البدلیہ کا قدیم ہونا لازم آتا ہے۔ جب زمانہ متناہی ہے تو سلسلہ کا قدیم ہونا بھی ممکن ہے، متکلمین نے اور بھی بہت سی دلیلیں قائم کی ہیں لیکن سب کی صحت اس بات پر موقوف ہے کہ سلسلۂ غیر متناہی کا محال ہونا ثابت کیا جائے۔ غیر متناہی کے محال ہونے پر حکماء اور متکلمین نے بہت سے دلائل قائم کئے ہیں۔ لیکن وہ تمام دلائل اس صورت میں جاری ہوتے ہیں، جب یہ مانا جائے کہ یہ سلسلہ مرتب موجود ہے لیکن منکرین خدا علل کا سلسلہ اس طرح مانتے ہیں کہ ہر علت فنا ہو کر اس کے بجائے دوسری علت آ جاتی ہے۔ محقق دوانی نے رسالہ زوراء کی شرح میں دعویٰ کیا ہے کہ اس صورت میں بھی دلیل جاری ہو سکتی ہے۔ کیونکہ گو علتیں فنا ہوتی جاتی ہیں لیکن ان کا مجتمع و مرتب ہونا فرض کیا جا سکتا ہے کیونکہ علل کا مجتمع ہونا محال عقلی نہیں اور جو چیز محال نہیں وہ فرض بھی کی جا سکتی ہے لیکن محقق موصوف کا یہ قول صحیح نہیں، علتوں کا اجتماع گو محال بالذات نہیں، لیکن محال بالغیر ہو سکتا ہے اور محال بالغیر کے فرض کر لینے سے بھی محال آتا ہے، گو یہ محال، محال بالغیر ہوگا۔

ان دلائل میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ ان سے اگر خدا کا وجود ثابت بھی ہوتا ہے تو اس کا فاعل بااختیار ہونا ثابت نہیں ہوتا، ان دلائل سے صرف ایک علۃ العلل (کاز آف دی کازز) کا وجود ثابت ہوتا ہے، لیکن علت کے لئے یہ ضرور نہیں کہ اس سے معلول بہ ارادہ اور بہ اختیار صادر ہو۔ آفتاب روشنی کی علت ہے لیکن آفتاب کو نہ علم ہے نہ ارادہ، بلکہ روشنی اس سے خود بخود بلا علم و ارادہ صادر ہوتی ہے۔ اسی بناء پر بہت سے حکماء کا مذہب ہے کہ خدا نے عالم کو بہ اختیار نہیں پیدا کیا اور تعجب ہے کہ شیخ بو علی سینا بھی انہی کا ہمزبان ہے۔

ان تمام تقریروں سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ افلاطون اور ارسطو اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے اور متکلمین بھی چونکہ انہی کے نقش قدم پر چلے تھے اس لئے وہ بھی ناکام رہے۔

اب دیکھو قرآن مجید نے اس عقدہ کو کیونکر حل کیا:

وجود باری پر قرآن مجید کا طریقۂ استدلال:

خدا کا خیال انسان کی فطرت میں داخل ہے:

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا اعتراف، انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے۔ علم الانسان کے ماہروں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ انسان جب بالکل فطری حالت میں تھا یعنی علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کا بالکل وجود نہیں ہوا تھا، اس وقت اس نے سب سے پہلے اصنام کی پرستش کی تھی یا خدا کی؟ ملاحدہ (میٹیر لسٹ) کے سوا اور تمام محققین نے فیصلہ کیا ہے کہ انسان نے پہلے خدا کی پرستش اختیار کی تھی، مشہور محقق مکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے "ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکایا تھا، جب وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے۔ جسمانی خدا (بت) اس حالت کے بعد اس طرح پیدا ہوئے کہ

فطرت اصلی، مثالی صورت کے پردہ میں چھپ گئی"۔

یہی وجہ ہے کہ جس زمانہ سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے، دنیا کے ہر حصہ میں، خدا کا اعتقاد موجود تھا آشوری، مصری، کلدانی، یہود، اہل فینیشیا سب کے سب خدا کے قائل تھے۔

پلوٹارک کہتا ہے "اگر تم دنیا پر نظر ڈالو تو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جہاں نہ قلعے ہیں، نہ سیاست، نہ علم نہ صناعت، نہ حرفہ، نہ دولت، لیکن ایسا کوئی مقام نہیں مل سکتا، جہاں خدا نہ ہو"۔

والٹیر جو فرانس کا مشہور فاضل اور وحی و الہام کا منکر تھا، کہتا ہے کہ "زرواسٹر، منو، سولن، سقراط، سسرو، سب کے سب ایک سردار، ایک منصف، ایک باپ کی پرستش کرتے تھے۔(۱) یہی فطرت ہے جس کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ (اعراف۔ ۱۷۲)

اور جب کہ خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو نکالا، اور خود ان کو انہی پر گواہ کیا، کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں، سب بول اٹھے کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔

لیکن چونکہ خارجی اسباب سے اکثر یہ فطری احساس دب جاتا ہے، اس لئے خدا نے جابجا اسی فطرت کو متنبہ کیا ہے۔

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ (ابراہیم: ۱۰)

کیا خدا کی نسبت بھی شک ہو سکتا ہے؟ جو آسمان و زمین کا موجد ہے۔

چونکہ خارجی اسباب کی وجہ سے بعض اوقات یہ فطری احساس اس قدر دب جاتا ہے کہ محض اشارہ اور تنبیہ کافی نہیں ہوتی اس لئے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تجربی اور حسی مقدمات کے ذریعہ سے استدلال بھی کیا۔

وجود باری پر استدلال:

انسان کو آغاز تمیز میں جن بدیہی اور حسی مقدمات کا علم ہوتا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو مرتب، باقاعدہ اور منظم دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کسی دانشمند نے ان چیزوں کو ترتیب دیا ہے، اگر کسی جگہ ہم چند چیزیں بے ترتیب رکھی دیکھیں تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ آپ سے آپ یہ چیزیں اکٹھی ہو گئی ہوں گی، لیکن جب وہ اس ترتیب اور سلیقہ سے چنی گئی ہوں کہ ایک ہوشیار صناع بھی بہ مشکل اس طرح چن سکتا ہے تو یہ خیال کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ سے آپ یہ ترتیب پیدا ہو گئی ہو گی۔ اس کو ایک اور واضح مثال میں سمجھو، خواجہ حافظ یا نظامی کا کوئی شعر لو، اس کے الفاظ الٹ پلٹ کر کے کسی معمولی آدمی کو دو اور اس سے کہو کہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے، وہ سو سو طرح الٹ پلٹ کرے گا لیکن اتفاقیہ طور سے بھی کبھی یہ نہ ہو گا کہ حافظ اور نظامی کا شعر نکل آئے حالانکہ وہی الفاظ ہیں، وہی حروف ہیں، وہی جملے ہیں، صرف ذرا سی ترتیب کا پھیر ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ نظامِ عالم، جو اس قدر باقاعدہ، مرتب اور موزوں ہے، وہ خود بخود قائم ہو گیا ہو، قرآن مجید میں خدا کے وجود پر اسی سے استدلال کیا ہے

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ؕ (نمل۔۸۸)

یہ خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر شے کو خوب پختہ طور سے بنایا۔

ما تری فی خلق الرحمن من تفاوت ط فارجع البصر لا هل تری من فطور O (ملک ۳)

خدا کی کاریگری میں تم کو کہیں فرق نظر نہ آئے گا، پھر دوبارہ دیکھو کہیں دراڑ دکھائی دیتی ہے۔

خلق کل شیء فقدرہ تقدیرا O (فرقان ۲)

خدا نے ہر شے کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ متعین کیا۔

لا تبدیل لخلق اللہ O (روم:۳)

خدا کی بناوٹ میں رد و بدل ممکن نہیں۔

فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ۃ (فاطر:۴۳)

خدا کے طریقہ میں تم رد و بدل ممکن نہیں پا سکتے۔

ان آیتوں میں عالم کی نسبت تین اوصاف بیان کئے ہیں، کامل اور بے نقص ہے، موزوں اور مرتب ہے، ایسے اصول اور ضوابط کا پابند ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے۔ یہ دلیل کا صغریٰ ہے، کبریٰ خود ظاہر ہے یعنی جو چیز کامل، مرتب اور مستحکم النظام ہو گی وہ خود بخود پیدا نہیں ہوئی ہو گی بلکہ کسی صاحب قدرت اور صاحب اختیار نے اس کو پیدا کیا ہو گا۔

آج جبکہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا ہو گئی ہے، جبکہ کائنات کے سیکڑوں اسرار فاش ہو گئے ہیں، جبکہ حقائق اشیاء نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دیا ہے، بڑے بڑے فلاسفر اور حکما انتہائے غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہی استدلال پیش کر سکے جو قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا تھا۔

آئزک نیوٹن کہتا ہے "کائنات کے اجزاء میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان و مکان کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایک ذات کے پایا جا سکے، جو سب سے اول ہے اور صاحب علم اور صاحب اختیار ہے"۔

حکمائے یورپ کی شہادت:

اس زمانہ کا سب سے بڑا حکیم ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے "ان تمام اسرار سے جن کی یہ کیفیت ہے کہ جس قدر ہم زیادہ غور کرتے ہیں اسی قدر وہ اور غامض ہوتے جاتے ہیں۔ اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیاء صادر ہوتی ہیں"۔

کیمل فلامر (۳) کہتا ہے: "تمام اساتذہ اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر ہوا اور یہ کیونکر برابر چلا جاتا ہے۔ اسی بناء پر ان کو مجبوراً ایک ایسے خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے جس کا موثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قائم ہے"۔

پروفیسر لینی (Linne) لکھتا ہے "خدائے قادر و دانا، اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور میں بالکل دیوانہ بن جاتا ہوں۔ ہر چیز میں گو وہ کتنی ہی چھوٹی ہو، اس کی کس قدر عجیب قدرت کس قدر عجیب حکمت، کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے"۔

نوشل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے:

"علم طبیعیات کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ ہماری عقل کی پیاس بجھائے، بلکہ اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی

نظریں خالق کائنات کی طرف اٹھتی ہیں اور اس کے جلال و عظمت پر فریفتہ ہو جاتی ہیں"۔

(ماخوذ از "الکلام" مصنف علامہ شبلی نعمانی، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص ۳۰-۳۹)۔

حواشی

۱۔ دیکھو ماسیو ہوتیمہ کی کتاب الفصل، ترجمہ عربی مطبوعہ بیروت ص ۔ یہ مصنف فرانس کی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔

۲۔ محققین اور ارباب نظر نے اس آیت کے یہی معنی بیان کیے ہیں کہ خدا نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ خواہ مخواہ اس کو خدا کی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ دیکھو تفسیر کبیر۔

۳۔ فرانس کا ایک مشہور فاضل ہے۔

حدوثِ مادہ

خواجہ غلام الثقلین

تمہید

خدا کی ہستی:

جب سے انسانوں نے غور کرنا شروع کیا ہے قریباً سب لوگ مانتے آئے ہیں کہ اس دنیا کا کوئی خالق ضرور ہے کیونکہ آدمی جب اپنے دل میں سوچتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ میں جو موجود ہوں، میں نہ آپ سے آپ بلا سبب پیدا ہو گیا ہوں اور نہ خود میں نے اپنے تئیں پیدا کیا۔ بلکہ مجھ سے کوئی بڑی اور اعلیٰ قوت ہے کہ میں موجود ہوا ہوں۔

سب اس قوت کے وجود کو مانتے لیکن اس کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ وہی ہستی ہے جس کو اللہ، خدا، پرمیشور، خالق، واجب الوجود، علت العلل، روح عالم کہتے ہیں۔ جو لوگ دہریہ کہلاتے ہیں وہ بالکل ایسے ہیں جیسے انسانوں میں فاترالعقل اور مجنون ہوتے ہیں یا نابینا یا ایک آنکھ والے یا دو سر والے۔ ایسی ایسی شاذ مثالوں سے قاعدہ کلیہ میں فرق نہیں آتا۔

مادہ اور خدا:

زمانہ سابق اور نیز زمانہ حال کے حکماء میں باہم اس امر میں اختلاف رہا ہے کہ جس مادہ سے یہ دنیا بنی ہے وہ مادہ ہمیشہ سے خود بخود موجود ہے یا خدا نے اس کو موجود کیا ہے۔ جو لوگ قدامت عالم یا قدامت مادہ کے قائل ہیں ان میں دو فریق ہیں۔

اول: خالص مادیئین جو روح اور خدا کے وجود کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس واسطے وہ ہر چیز کو مادہ کی خاصیت قرار دیتے ہیں۔

دوم: وہ لوگ جو مادہ کو ایک بے حس و حرکت اور ناقابل عمل چیز سمجھتے ہیں یعنی مادہ خود بخود کچھ نہیں کر سکتا البتہ اثر قبول کرتا ہے اس مادہ کو ترکیب اور ترتیب دے کر خدا نے یہ عالم پیدا کیا ہے اور مادہ خدا کے برابر برابر ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔

ہم خالص مادیئین کے متعلق اس وقت بحث نہیں کرتے۔ ان کے عقیدہ کی بابت ہم جداگانہ رسالہ لکھیں گے

لیکن فرقہ دوم کے دلائل بیان کرتے ان سے متعلق رائے دینا چاہتے ہیں

باب اول

فصل اول

مادہ کو کیوں قدیم مانا جاتا ہے

حکیم ہربرٹ سپنسر کا خیال:

زمانہ حال کے اہل سائنس اور فلاسفہ محققین میں حکیم ہربرٹ سپنسر سب کا سرتاج ہے۔ اس نے بیان کیا ہے(۱) کہ مادہ ناقابل فنا چیز ہے۔ اس وجہ سے کہ انسانی خیال میں یہ بات نہیں آ سکتی کہ مادہ ہست سے نیست ہو جائے۔ اس بات کا تصور ایسا ہی محال ہے جیسے یہ امر محال ہے کہ ایک شخص سات کے عدد کا مفہوم بھی سمجھتا ہو اور پانچ کا مفہوم بھی۔ اور پھر بھی ان کے مجموعہ کو گیارہ سے تعبیر کرے۔ اول اول حکماء نے ایسا خیال کیا تھا کہ شاید مادہ فنا ہو سکے۔ لیکن جب سے علم کیمیائے مقداری دریافت ہوا ہے سیکڑوں طریقوں سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ مادہ صرف صورت بدلتا ہے۔ وزن نہیں بدلتا اور اس کے اجزاء کی مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔

آخر میں حکیم نے لکھا ہے کہ مادہ کے ناقابل زوال و فنا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مادہ کے جزو میں جس قدر قوت ہم محسوس کرتے ہیں اسی قدر قوت ہر حالت میں اس میں باقی رہتی ہے نہ ہو تو دنیا میں کسی علم اور کسی عمل کا اعتبار نہ رہے۔ سنار آج ایک باٹ سے سونا تولتا ہے، کل کو ممکن ہے کہ باٹ کا خود بخود وزن کم ہو جاوے۔" پس اسی عقیدہ اور یقین کی بنا پر ماپ تول اور آیندہ کی توقعات ممکن ہیں ورنہ دنیا ضائع ہو جاوے۔

آریہ سماج کا عقیدہ اور اس کے دلائل:

پنڈت دیانند سرستی بانی آریہ سماج جنہوں نے انیسویں صدی کے آخری چہارم حصہ میں خدا پرستی و دہریت کے بین بین ایک نیا فرقہ قایم کیا ہے۔ روحوں کو اور مادہ کو اور ان کے تمام خواص و افعال کو مثل خدا کے قدیم اور غیر مخلوق سمجھتے ہیں۔ مادہ کے قدیم ہونے کی دلیل اوروں کے نزدیک مفصلہ ذیل ہے، ہم ان کی عبارت کا ماحصل سلیس الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔(۲)

"دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ یعنی علت فاعل خدا ہے۔ مگر علت مادی دنیا کی پرکرتی (مادہ کی ابتدائی غیر مرتب شکل) ہے۔ پرکرتی ازلی ہے"۔ پنڈت موصوف نے اس کی تائید میں وید کا ایک اشلوک نقل کیا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس اشلوک کا یہی مفہوم ہے جو پنڈت جی نے سمجھا ہے مگر ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں ہے۔ اس لیے ہم ان کے ایک مرید کے عقلی دلائل اس موقع پر نقل کرتے ہیں:(۳)

(۱) چونکہ خدا غیر مادی ہے اس واسطے مادی دنیا اس سے نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ کسی چیز سے وہی چیز

نکلتی ہے جو اس کے اندر ہوتی ہے۔

(۲) دنیا صرف قدرت سے نہ بن سکتی ہے اور نہ حکم سے۔ قدرت صفت ہے وہ موصوف سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔

(۳) سائنس کے رو سے نیست سے ہست نہیں ہو سکتا۔ صرف ہست سے ہست نکل سکتا ہے عدم سے مادہ کا پیدا ہونا محال ہے۔

مصنف علم الکلام کا دعویٰ:

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب علم الکلام جلد ۲ (مطبوعہ ۱۳۱۳ فصلی) میں برخلاف متکلمین کے قدامت مادہ کے عقیدہ کی تائید کی ہے جس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ مادیین کے دلائل مولانا کو ناقابل تردید نظر آئے اور حکمائے زمانہ حال کے خیالات کا رعب ان پر پڑ گیا۔ حالانکہ فلسفی نظر سے دیکھا جائے تو وہ خیالات صرف توہمات ہیں نہ کہ قطعی استدلال۔ علاوہ ازیں مولانا نے علم الکلام میں اشعریوں کے سب عقیدوں کو غلط سمجھا ہے حالانکہ ان کے بھی بعض عقیدے صحیح ہیں۔ خلاصہ ان کی تحریر کا یہ ہے۔

"مسلمان متکلمین نے مادہ کو حادث (مخلوق) اس دلیل سے ثابت کیا تھا کہ مادہ میں ایک چیز صورت یعنی عوارض اور خاصیتیں ہیں اور ایک چیز ہیولے یعنی اصل شے ہے۔ کبھی مادہ صورت اور عوارض سے خالی نہیں پایا جاتا۔ صورت اور عرض فانی اور متغیر ہے لہٰذا حادث ہے۔ جو چیز (مادہ یا ہیولیٰ) بغیر کسی حادث اور مخلوق کے نہ پائی جا سکے وہ قدیم اور غیر مخلوق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا مادہ قدیم نہیں۔ اس کے متعلق مولانا نے یہ معقول جواب دیا ہے۔ دراصل مادہ کو عرض اور صورت کی ضرورت نہیں۔ مادہ قدیم ہے اور یہ صورتیں علی سبیل البدلیۃ پیدا ہوتی اور فنا ہوتی رہتی ہیں۔ اس بنا پر ان کے لئے ایک قدیم علت نہیں بلکہ لاکھوں حادث علتیں درکار ہیں"۔

"یہ امر قطعی ہے کہ کوئی شے عدم محض سے وجود میں نہیں آسکتی۔ اس بنا پر عالم کا مادہ قدیم ہے تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم ترکیبی صورت سے پہلے فضائے نامتناہی میں نہایت چھوٹے اجزاء پھیلے ہوئے تھے۔ ان اجزاء کو علمی اصطلاح میں ذی مقراطیسی کہتے ہیں۔ یہ اجزاء آپس میں ملے اور ترکیب پا کر رفتہ رفتہ عالم پیدا ہو گیا ہے۔(۴)

مولانا نے جہاں ملاحدہ کے اعتراضات کا جواب دیا ہے وہاں پھر مانا ہے کہ مادہ قدیم ہے۔(۵) اور خدا کی ضرورت کو محض صانع ہونے کی وجہ سے ثابت کیا ہے، اب ہم ان سب خیالات پر جداگانہ رائے دیتے ہیں۔

فصل دوم

مادہ کو ناقابل فنا ماننے سے کیا نتیجہ نکلتا ہے

فاضل حکیم ہربرٹ سپنسر کی یہ رائے کہ مادہ ضائع اور معدوم نہیں ہو سکتا صحیح ہے اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو چیز معدوم اور غائب نہیں ہو سکتی اور اس وقت موجود ہے اس لئے ضرور ہے کہ وہ ہمیشہ سے موجود ہو یعنی جب ہم مادہ کو ابدی مانتے ہیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ وہ ازلی بھی ہے یعنی قدیم اور غیر مخلوق ہے۔

مادہ میں صرف اس صفت کے موجود ہونے کی وجہ سے کہ ہمارے پاس کوئی قوت ایسی نہیں ہے جس سے اس کو ضائع یا فنا کر سکیں۔ اگر ہم مادہ کو قدیم اور غیر مخلوق مان لیں تو اس کے واسطے منفصلہ ذیل باتوں کو تسلیم کرنا پڑے گا:

ا۔ انسان کی قوت سے بالاتر کوئی قوت عالم میں موجود نہیں ہے۔

۲۔ انسان کا علم یقینی اور قابل وثوق ہے۔

۳۔ مادہ کی اصل ماہیت اور ترکیب ہم کو معلوم ہے۔

جب تک ان تینوں باتوں کو نہ مانا جاوے قدامت مادہ کا دعویٰ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کیونکہ اگر انسانی قوت سے کوئی بڑھ کر قوت موجود ہو تو ہم مادہ کے ناقابل فنا ہونے کا قطعی حکم نہیں لگا سکتے تاوقتیکہ اس اعلیٰ قوت کو حاصل کر کے تجربہ نہ کر لیں۔ اس وقت جو ہم کہتے ہیں کہ مادہ کے ذرات نہ گھٹتے ہیں اور نہ بڑھتے ہیں یہ بات انسانی طاقت کا تجربہ کرنے سے ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہے کیونکہ ہم میں صرف اتنی ہی قوت ہے کہ مادہ کی صورت اور ترکیب کو اکثر اوقات تبدیل کر دیں اور بعض حالتوں میں ہم مادہ کی ترتیب اور ترکیب کو بھی بدلنے سے قاصر ہیں۔

دوسرے اگر ہم یہ مان لیں کہ ہمارا علم اضافی ہے اور مختلف اور مخالف حالات موجود ہوں تو ہمارا علم و خیال بھی بالکل غلط ہو جاوے گا تو اس صورت میں بھی مادہ کو ناقابل فنا نہیں کہہ سکتے۔

تیسرے اگر یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ ہماری قوت سے بڑھ کر کوئی قوت نہیں اور ہمارا علم مادہ کے معاملہ میں قطعی ہے تب بھی یہ ماننا چاہیے کہ یہ علم درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے اور ہم واقف ہیں کہ مادہ کیا چیز ہے اور اس کے ضائع یا معدوم نہ ہونے کے کیا معنی ہیں۔ میں ثابت کروں گا کہ ہم ان تینوں باتوں کو نہیں مان سکتے۔

فصل سوم

انسانی قوت سے بالاتر قوت موجود ہے

یہ بات زیادہ بحث کی محتاج نہیں کہ انسان کا علم ہمیشہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور قوت کا تعلق علم سے ہے۔ پس انسان کی قوت مثل اس کے علم کے حد کمال کو نہیں پہنچی۔ غرض اگر مان بھی لیا جائے کہ انسان سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے اور اس وقت عالم میں ہماری قوت سب سے زیادہ ہے تو بھی یہ قوت نامکمل ہے اور اسی لئے اس کی بناء پر قطعی دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آئندہ خود ہماری قوت بڑھ سکتی ہے۔ زمانہ سابق میں از روئے سائنس ہم نے انسان کو کبھی اس قابل نہ سمجھا تھا کہ وہ پانچ ہزار میل پر پانچ منٹ کے اندر خبر بھی پہنچا سکتا ہے۔ مگر اب یہ قوت انسان میں موجود ہے۔ آج ہم انسان کو (از روئے علوم جسمانیات) اس بات کے قابل نہیں سمجھتے کہ وہ بلاوساطت مادہ محض اپنے ارادہ سے ایک پتھر کو حرکت دے یا سیارہ مریخ تک پیغام رسانی کر سکے۔ لیکن ممکن ہے کہ آئندہ یہ دونوں باتیں اسی طرح پوری ہو جاویں جس طرح اور ہزاروں باتیں پوری ہو گئی ہیں۔

پس کہنا یہ چاہیے کہ "جہاں تک اہل سائنس نے انسانی قوت کا تجربہ کیا ہے وہ مادہ کی مقدار میں کسی کمی یا زیادتی کو محسوس نہیں کر سکتے"۔

فصل چہارم

انسانی علم اضافی اور نسبتی ہے یقینی نہیں

حکماء سابق و حال کے نزدیک یہ امر بدیہی ہے کہ تمام انسانی علم اضافی یا نسبتی ہے۔ علم حواس خمسہ یا حواس ستہ (۶) کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ان کی جگہ حواس ثلثہ رہ جاویں یا حواس عشرہ ہو جاویں تو اس وقت جس قدر احکام علمی ہیں اور جس قدر سائنس ہے اس میں ایسا انقلاب ہو جاوے کہ وہ لوگ جن کے تین یا دس حواس ہوں۔ ہمارے خیالات اور تصانیف کو واہیات اور خیالی افسانوں کا مجموعہ سمجھیں۔

ان ہی حواس خمسہ میں ہزاروں پردے اس قسم کے ہیں کہ لایق سے لایق آدمی بھی اپنے علمی دعویٰ کو بیسیوں شرائط اور تامل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ خود حکیم سپنسر نے مادہ اور حرکت کے مباحث میں علم کے اضافی ہونے کی بابت لطیف بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ انسانی علم کی رو سے کسی بات کا قطعی جواب دینا محال ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک جہاز انگلستان سے ہندوستان آ رہا ہے، اس کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔ اب ایک شخص انجن کی طرف سے پشت جہاز کی طرف جا رہا ہے اور اس کی سرعت جہاز کی سرعت کے مساوی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی واقعی حرکت کس طرف کو ہے اگر یہ کہو کہ وہ مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے (جیسا بظاہر معلوم ہوتا ہے) تو یہ غلط ہے کیونکہ جہاز اس کو اسی تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ مشرق کی طرف جا رہا ہے کیونکہ اس کا رخ، ارادہ اور حرکت مغرب کی طرف ہے۔ پس بہ لحاظ جہاز کی اندرونی چیزوں کے اس کی حرکت جانب غرب ہے اور بہ لحاظ اشیائے خارج از جہاز وہ قایم ہے اس کی کوئی حرکت نہیں، گو بظاہر حرکت کر رہا ہے۔ مگر اب بھی یہ جواب صحیح نہیں ہے، وہ قائم بھی نہیں، زمین کی محوری حرکت کا حساب کرو تو یہ شخص ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے مشرق کی طرف جا رہا ہے۔ پس نہ اس شخص کا علم صحیح ہے جو جہاز کے اندر سے اس کو دیکھ رہا ہے، نہ اس شخص کا جو جہاز کے باہر سے اس کا معائنہ کرتا ہے۔

مگر یہ تیسرا جواب بھی غلط ہے کیونکہ زمین کی ایک حرکت آفتاب کے گرد مدار ارضی پر ہوتی ہے۔ یہ حرکت تخمیناً ۶۸۰۰۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ پس وہ ۶۷۰۰۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے مشرق کی طرف چل رہا ہے۔

مگر اب بھی حرکت (نقل مقام) کا اصلی پتہ نہیں چلا کیونکہ تمام نظام شمسی مجموعہ نجوم ہرکیولیز کی طرف بڑھتا جاتا ہے اور ان کے علاوہ جو حرکتیں ہوں وہ ہم جانتے نہیں۔

پس ہمارا علم محدود اور بقدر اپنی قدرت کے ہے۔ ہماری قدرت بہت کم ہے اس لئے علم بھی بہت کم ہے۔

پس یہ کہنا چاہیے کہ "جہاں تک اہل سائنس نے انسانی قوت کا تجربہ کیا ہے وہاں تک باعتبار اشیائے محسوسہ کے وہ مادہ کے مقدار میں کمی یا زیادتی محسوس نہیں کر سکتے"۔ مگر حقیقی حالت کی انہیں خبر نہیں۔

جب ہمارا علم اضافی اور نسبتی ہوا اور طاقت محدود تو یہ کہنا کہ مادہ کی بابت ہم کو سب کچھ معلوم ہے بالکل لغو ہے۔ مادہ کی نسبت جو کچھ انسانی خیال ہے وہ محض غلط اور واہمہ ہے۔ اس کی بابت میں آیندہ بحث کروں گا۔

اوپر کے بیان کا خلاصہ:

حکمائے طبعیین کا یہ خیال کہ چونکہ مادہ کم و بیش نہیں ہو سکتا، اس لئے قدیم ہے، غلط ہے۔ اس بات کے ماننے سے لازم آئے گا کہ انسان عقل کل اور علم قطعی رکھتا ہے اور جو کچھ اس کی قوت اور تجربہ اور علم ہے اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ پس مادہ انسانی طاقت یا مادہ کے تصادم سے بے شک فنا نہیں ہوتا اس سے زیادہ دعویٰ نہ کسی کا تھا اور نہ کسی معقول شخص کا ہو سکتا ہے۔

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں یا انسان سے بالاتر کسی صانع یا خالق کو، ان کو کسی قسم کی مشکل اس مسئلہ میں نہیں ہو سکتی۔

فصل پنجم

غیر مادی سے مادہ نہیں نکل سکتا

یہ دلیل ہم نے اوپر نقل کی ہے یعنی چونکہ خدا غیر مادی ہے اس واسطے مادی دنیا اس سے نہیں نکل سکتی۔ اس دلیل میں مفصلہ ذیل باتیں فرض کی گئی ہیں:

۱۔ ایک ہستی ہے جو خالق و صانع اور جس کو خدا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ وہ ہستی غیر مادی ہے۔

۳۔ ہر مخلوق کا اس میں سے اس طرح نکلنا ضرور ہے جیسا زمین میں سے درخت یا پانی میں سے بلبلے کا۔

۴۔ غیر مادی ہستی میں سے مادی چیز نہیں نکل سکتی۔

ان چاروں باتوں میں بعض صحیح ہیں اور بعض بالکل غلط

(۱) خدا کا وجود صحیح ہے لیکن اگر خدا کو قادر مطلق مانا جاوے یعنی ایسی قدرت والا جس کے لئے شرطیں مقرر نہیں ہیں تب تو قدامت مادہ کا دعویٰ ہی فضول ہے۔ اگر خدا کو قادر مقید مانا جاوے تب البتہ بحث کی ضرورت ہے۔

(۲) دوسری بات کہ خدا غیر مادی ہے صحیح ہے۔ اس معنی میں کہ مادہ میں جو امور خلاف درجہ کمال یا جو نقائص ہیں مثلاً اس کا بے حس و حرکت یا محدود ہونا ان ناقص صفتوں کو خدا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

(۳) تیسرا امر کہ ہر مخلوق کا خدا میں سے نکلنا لازم ہے محض لغو ہے۔ ہم ہزاروں علتیں دیکھتے ہیں اور قوتوں کو کام کرتا پاتے ہیں جو کسی شے کے اندر سے نہیں نکلتیں۔ مقناطیس دور سے لوہے کو کھینچتی ہے۔ انسان کا غضبناک چہرہ دیکھنے والوں کو خوف یا رنج پہنچاتا ہے۔ مگر اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ رنج جو ایک غیر مادی قلب فعل ہے وہ چہرہ کی ساخت میں سے نکلا ہے۔ یا فولاد کی حرکت جو مقناطیس میں سے نکل آئی ہے مادی چیز ہے۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ محض ہمارا ارادہ بڑے بڑے بوجھ کو حرکت دیتا ہے اور ہم سے لاکھوں کام کراتا ہے، حالانکہ ارادہ مادی نہیں۔ اگر ارادہ کو اور روح کو مادی مانا جاوے تب تو روح کو یا خدا کو ماننے کی ضرورت نہ ہوگی۔ صرف مادہ سب کے لئے کافی علت ہے۔

(۴) چوتھی بات کہ غیر مادی ہستی میں سے مادی ہستی نہیں نکل سکتی۔ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ صحیح اس معنی میں ہے کہ

مادہ غیر مادہ کا جزو نہیں ہو سکتا، غلط اس معنی میں کہ انسان یا حیوان کا ارادہ مادہ میں قوت یا حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ جو چیز حرکت یا قوت پیدا کر سکتی ہے وہ مادہ بھی پیدا کر سکتی ہے۔ ہم آگے چل کر اس بات کو بتائیں گے کہ مادہ محض قوت ہے۔

فصل ششم

مادہ کیا چیز ہے؟

دراصل جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "مادہ قدیم" ہے ان کا اول فرض یہ ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھا دیں کہ مادہ سے کیا مراد لیتے ہیں۔ بعض سطحی خیال والے منکر تو یہ کہہ کر رہ جاویں گے کہ جو چیزیں ہم کو نظر آتی ہیں یہ سب مادہ ہیں۔ مگر یہ جواب نقص علم یا جہالت پر مبنی ہے۔ دراصل ہم کو سوائے الوان (رنگوں) کے یعنی سوائے روشنی کی کرنوں کے مختلف انعکاس کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ جو لوگ زیادہ علم رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم کو جن چیزوں کا علم حواس خمسہ سے ہوتا ہے وہ چیزیں مادی ہیں۔

محسوسات:

حقیقت یہ ہے کہ حواس خمسہ سے ذہن میں چند احساس یا ادراک پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کاغذ کی نسبت جس پر ہم لکھتے ہیں ہم کو کیا معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ ایک شعاع آنکھ پر پڑتی ہے اور ذہن سپیدی کو محسوس کرتا ہے۔

۲۔ چھونے سے پایا جاتا ہے کہ ذہن کو ایک نرم اور صاف چیز کا ادراک ہوتا ہے۔

۳۔ ناک کے ذریعہ سے ایک خاص قسم کی حس پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ کان کے ذریعہ سے ذہن میں ایک خاص اثر یا ادراک پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ زبان کے ذریعہ سے ذہن کو ایک پانچویں چیز جس کو ذائقہ کہتے ہیں معلوم ہوتی ہے۔

غرض ذہن کی مختلف پانچ کیفیتوں کا کھوج لگا کر انسان کے تجربہ یا عقل نے جس چیز کی طرف ان خاص قسم کے اثرات کو منسوب کیا ہے اس کو مادہ کہتے ہیں۔

مادہ کی ترکیب:

قیاس نے اس مادہ میں دو چیزیں فرض کی ہیں۔ ایک مستقل اور ایک عارضی۔ عارضی چیزیں یہی رنگ و بو و ذائقہ، نرمی و سختی اور آواز ہے۔ جو در حقیقت ذہن کے اثرات ہیں لیکن ایک دوسری چیز جس کو ہیولا کہتے ہیں یعنی وہ مادہ جس میں اثرات اور اعراض مطلق نہ ہوں اور جو حواس سے پرے ہیں اس شے کو ہیولا کہتے ہیں۔

پس مادہ کی اصل ایک مفروضہ چیز ہے۔ یعنی اگرچہ وہ حقیقی ہو مگر ہم اس سے بالکل بے خبر ہیں اور کبھی اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔ شاید یہ کہا جاوے کہ مادے کی صورت اور ہیولا میں تقسیم فرضی ہے حال کی تحقیقات یہ ہے کہ مادہ نہایت چھوٹے اجزاء سے مرکب ہے جن کو سالمات (ایٹم) یا اجزائے لایتجزے یا اجزائے ذیمقراطی کہتے ہیں۔ یہ اجزاء چونکہ ناقابل فنا ہیں اس لیے غیر مخلوق ہیں۔

اجزائے ذیمقراطی یا سالمات جن پر موجودہ طبعیین نے دنیا کو قائم کیا ہے اس کے متعلق ہربرٹ جیسے محقق کے دلائل کا خلاصہ کافی ہوگا۔(۷)

وہ کہتے ہیں کہ قدیم سے یہ بحث چلی آتی ہے۔ مادہ کے لاتعداد اجزاء ہو سکتے ہیں یا نہیں، کیونکہ وہ حال سے خالی نہیں اور کوئی تیسری صورت ممکن نہیں۔

گر یہ کہو کہ مادہ کی تقسیم لامتناہی ہو سکتی ہے تو یہ بات عقل میں نہیں آتی۔ کیونکہ لامتناہی تقسیم کے لئے لامتناہی زمانہ چاہیے اور اس زمانہ کا صحیح ادراک محالات سے ہے ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تقسیم کرتے چلے جاؤ کہیں جزو ناقابل تقسیم نہ آئے گا۔ یہ ایک مفروضہ ہے۔

اجزائے اولیہ سالمات:

اگر یہ کہو کہ مادہ کی تقسیم لامتناہی نہیں ہو سکتی بلکہ ایسے اجزاء آ جاتے ہیں جس کی تقسیم کسی قوت سے ممکن نہیں تو یہ امر بھی خلاف قیاس ہے اور عقل میں نہیں آیا کیونکہ ان اجزائے لایتجزے (سالمات) میں ضرور ہے کہ ایک سطح بالا ہو ایک سطح زیریں۔ یہ خیال کہ دونوں سطحیں ایسی قریب ہو جاویں کہ ان کے وسط میں کوئی چیز آ کر فارق نہ ہو سکے محال ہے۔ الغرض عقل انسانی میں دونوں باتیں نہیں آ سکتیں۔

علاوہ ازیں مادہ کے اجزاء کو کیسا ہی مضبوط اور ٹھوس سمجھو، مثلاً فولاد کے ٹکڑے کو وہ بھی اجزاء سے مرکب ہے۔ آیا یہ اجزاء آپس میں بالکل متصل ہوں تو پھر سکڑنے کے قابل نہیں رہ سکتے کیونکہ ان کے درمیان فاصلہ مطلق نہ ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ مادہ ایسا ٹھوس ڈھیر نہیں جس کے اجزاء کے بیچ میں فاصلہ نہ ہو۔

نیوٹن کا مفروضہ:

اب نیوٹن کا ظن اور مفروضہ ماننا پڑا کہ مادہ ان سالمات سے مرکب ہے جو ایک دوسرے سے متصل نہیں بلکہ جدا جدا ہیں۔ لیکن بذریعہ قوت کشش اور قوت تنافر کے یہ اجزاء ایک دوسرے پر اثر کرتے ہیں۔ لیکن یہ مفروضہ بھی مشکل کو حل نہیں کرتا کیونکہ مان لیا کہ مادہ نہایت ٹھوس اجزاء سے مرکب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سامات کی ترکیب کیا ہے؟ کیونکہ یہ اجزاء بھی مادہ کا ایک چھوٹا ڈھیر ہیں اور دل کی خوردبین سے دیکھا جاوے تو ان میں اور دیگر مادہ میں فرق نہیں ہے۔ پس وہی سوال اور مشکل باقی رہے گی خواہ کسی قدر چھوٹا ابتدائی جزو مانا جاوے۔

بوسکووچ کا مفروضہ:

حکیم لیبنز کا یہ خیال تھا کہ مادہ کے اجزاء ایسے خوردبین نقطوں سے مرکب ہیں جن میں طول، عرض اور عمق نہیں۔ حکیم بوسکووچ فرانسیسی نے اس کی تردید کی ہے اور بجا تردید کی ہے کہ جب اجزاء میں مکان نہیں تو ان کے مجموعہ میں کہاں سے طول، عرض، عمق (ابعاد ثلثہ) پیدا ہوگئے۔ اس حکیم آخرالذکر نے بہ قاعدہ ریاضی ثابت کرنا چاہا ہے کہ مادہ نقاط قوت سے مرکب ہے۔ جن کے مرکز جدا جدا ہیں، ہر مرکز بذریعہ کشش و تنافر مادہ کے ٹکڑوں کو خاص فاصلہ پر رکھتا ہے۔ ریاضی کے قواعد سے اس نے قوت کے مرکزوں کا عمل بوجہ دوری یا قرب فاصلہ کے بتایا ہے۔ مگر حکیم ہربرٹ سپنسر کا خیال ہے کہ اس مفروضہ میں یہ عیب ہے کہ مرکز قوت جس میں ابعاد ثلثہ نہ ہوں خیال میں نہیں آسکتا تاہم نیوٹن نے جو مادہ کو

سالمات سے مرکب بتایا ہے اور بوسکووچ نے فقط قوت سے دونوں سے (بقول سپنسر) قوت کا وجود ماننا پڑے گا کیونکہ آخر کون سی چیز روکتی ہے کہ ہم آسانی سے مادہ کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرسکتے؟ جواب! قوت اتحادی۔

سوال: کون سی چیز روکتی ہے کہ مادہ کے اجزائے ڈیمقراطی یا سالمات کو ہم ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرسکتے؟

جواب: قوت اتحادی۔

پس ہر صورت میں قوت کا وجود محقق ہے۔ خواہ ابعاد ثلاثہ ہوں یا نہ ہوں۔ اس تمام بحث کا نتیجہ سپنسر نے یہ نکالا ہے کہ مادہ کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنا بھی مثل دیگر چیزوں کے عقل انسانی سے بالا ہے۔ نہوالمراد۔

فصل ہفتم

کیا قدرت مادہ کو پیدا نہیں کرسکتی؟

اوپر ملاحدہ اور آریہ سماجیوں کا یہ اعتراض ہم نے لکھا ہے کہ محض قدرت یا حکم الہٰی سے دنیا پیدا نہیں ہوسکتی۔ یعنی مادہ خلق نہیں ہوسکتا، کیونکہ قدرت صفت ہے، موصوف سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ اس اعتراض میں مفصلہ ذیل امور فرض کئے گئے ہیں:

۱۔ قدرت الٰہی مثل انسانی قدرت کے ہے اور قسم اور مقدار میں اس سے زیادہ نہیں ہے۔

۲۔ خدا کی پوری قدرت ہم کو معلوم ہے۔

۳۔ قدرت سے مادہ کا پیدا ہونا اس کے معنی ہیں کہ ایک مادی چیز دوسری مادی چیز یعنی قدرت سے نکل آئی۔

۴۔ قدرت خدا کی صفت ہے وہ خدا سے جدا نہیں ہوسکتی۔

۵۔ مادہ خدا سے جدا ہے۔

امر اول محض لغو ہے۔ خدا کی قدرت کو انسان کی محدود قدرت پر قیاس کرنا جہالت اور بدمذہبی کا پہلا زینہ ہے اور کوئی عاقل اس کا قائل نہیں۔ امر دوم بھی باطل ہے، انسان کی مختصر قوتیں جب معلوم نہیں تو خدا کی قدرت پر ہم کیسے حکم لگا سکتے ہیں۔ تیسری بات کہ قدرت کو ایک مادہ سمجھا گیا ہے، محض فضول ہے، مادہ خود ایک مخفی اور ناقابل فہم چیز ہے لیکن اس کے کچھ آثار انسان پر غور کرنے سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ چوتھی بات کہ قدرت خدا کی صفت ہے اور اس سے جدا نہیں ہوسکتی صحیح ہے، لیکن قدرت یا ارادہ الٰہی کسی چیز کو خلق کرے تو جزو الٰہی نہیں ہوسکتی۔ امر پنجم کہ مادہ خدا سے جدا ہے ایک معنی میں صحیح ہے لیکن دوسرے معنی میں غلط ہے، قدرت الٰہی ہر وقت اس پر حاوی اور اس کی محافظ اور قرین ہے۔ مگر یہ بحث بہت نازک ہے اس لئے یہاں ترک کی جاتی ہے۔

فصل ہشتم

نیست سے ہست نہیں ہو سکتا

آریا سماجی فرقہ اور مادیئین کی بڑی دلیل یہی ہے کہ نیست سے یعنی عدم سے کوئی چیز موجود نہیں ہو سکتی۔ اس دلیل کو تمام اہل مذاہب تسلیم کرتے ہیں بلکہ خدا کی ہستی کو اسی سے ثابت کرتے ہیں، لیکن یہ دلیل مادہ کی قدامت کو ثابت نہیں کرتی بلکہ مادہ کے حادث اور مخلوق ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ وجود ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے عدم سے وجود نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہمارا یا عالم کا وجود عدم سے نہیں آیا بلکہ کوئی کافی قوت ہونی چاہیے جس کی وجہ سے یہ عالم وجود میں آیا۔

کل مذاہب آسمانی اور اکثر حکما نے اس علت کو خدا قرار دیا ہے کیونکہ ایک چیز کا موجود ہونا لازمی ہے جس کو واجب الوجود کہتے ہیں۔ جس کے وجود سے دنیا خالی نہیں ہو سکتی اور جس نے باقی سب کو موجود کیا ہے۔ خالص مادیئین خدا کے وجود کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ صرف مادہ کو کافی طور پر خالق مانتے ہیں۔ ہم آئندہ ثابت کریں گے کہ ان کا دعویٰ کسی طرح سرسبز نہیں ہو سکتا اور مادہ میں بھی قابلیت نہیں کہ وہ خالق ہو سکے۔ خدا تعالیٰ میں یہ قدرت ہے اور عقل کی رو سے یہ محال نہیں ہے کہ وہ ایک قوت کو (مادہ کو) موجود کر دیوے۔ جب ایک کافی علت موجود ہے تو وہی علت مادہ کی ہے نہ کہ نیستی۔ اور ایک قدیم کے سوا دوسرے قدیم کو ماننے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ دوسری جگہ بیان کی جاویں گی۔

یہ دلیل کہ سائنس کی رو سے عدم سے وجود نہیں ہوتا اس کے یہی معنی ہیں کہ مادہ یا انسان کسی چیز کو معدوم سے موجود نہیں کر سکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا تعالیٰ یا قادر و صانع بھی مثل ہمارے مجبور ہے۔

ہم نے مختصر طور پر اس حصہ میں ان تمام دلائل کا جواب دے دیا ہے جو مادہ کی قدامت کے واسطے پیش کی جاتی ہیں۔ دوسرے حصہ میں ہم دوسرے طور پر ثابت کریں گے کہ مادہ میں قابلیت قدیم ہونے کی نہیں ہے۔

باب دوم

مادہ قدیم نہیں ہو سکتا۔

یہ بات سچ ہے کہ مابعد الطبیعیات یا الٰہیات میں جن مسائل کا ذکر ہوتا ہے ان کا ثبوت ایسا قطعی نہیں ہو سکتا جیسا ریاضی کے مسائل کا ثبوت قطعی سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جہاں ہم یہ ظاہر کریں گے کہ مادہ قدیم نہیں اس ثبوت میں ممکن ہے کہ خامیاں باقی رہیں۔

لیکن اول دلائل سے ہم نے ثابت کیا ہے کہ مادہ کے متعلق قدامت کا ثبوت ناکافی اور ناقص ہے۔ اب ہم ظاہر کرتے ہیں کہ مادہ کو قدیم ماننے سے نظام عالم میں کیا مفاسد لازم آتے ہیں۔

دنیا کی ساخت:

اگرچہ جان سٹورٹ مل نے اپنی کتاب "مضامین ثلثہ متعلق بہ مذہب" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کا خالق جو کوئی ہے وہ قادر مطلق نہیں ہے ورنہ نقائص اور خرابیاں باقی نہ رہتیں۔ لیکن یہ خود بڑی غلط فہمی ہے۔ نقص اور خرابیاں جو کچھ معلوم دیتی ہیں وہ محض اس وجہ سے ہیں کہ مخلوقات اور ممکنات مثل خالق اور واجب الوجود کے کامل نہیں ہو سکتی۔ اگر مخلوق کامل ہو تو اس میں اور خالق میں فرق نہ ہوگا۔ اور دو ضدین ایک جگہ جمع ہو جاویں گی اور یہ محال ہے۔

پس انسانی ساخت میں جو کچھ نقص ہے وہ محض اس وجہ سے ہے کہ انسان اپنے ارادہ سے بلاجبر و اکراہ کے اپنی فطرت کو سلیم اور انسانی حد کے اندر کامل کرے۔ یہی حال دیگر مخلوقات کا ہے۔ انسان بلاضرور توں اور نقائص کے یا فرشتہ ہوگا یا پتھر، مگر مقصود دونوں سے نہیں۔

دنیا کی ساخت سے خدا کا قادر مطلق ہونا معلوم ہو یا نہ ہو (اور ہمارے نزدیک یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے) تب بھی نظام عالم کا حاکم اور واحد ذات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ تمام مظاہر قدرت زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسری کے ساتھ وابستہ ہیں کہیں کسی دوسری طاقت کا اثر نظر نہیں آتا۔ لہٰذا یہ بات بطور موضوعہ مان لینی چاہیے کہ: "نظام عالم متحد اور ایک طاقت کے ماتحت ہے"۔

کیا محض خدا کا وجود عالم کے لیے کافی ہے:

تمام مادیتین اس واحد ذات کو مادہ قرار دیتے ہیں لیکن مادہ میں عقل اور تخیل اور تمام دیگر حرکات ارادی کے پیدا کرنے کی قابلیت نہیں ہے۔ اب لامحالہ خداتعالیٰ یعنی ایک حکیم، قدیم اور قدیر ہستی کو اس عالم کی علت ماننا جاوے گا، اس کی موجودگی میں بشرطیکہ قدرت الٰہی انسانی قدرت سے بالاتر ہو مادہ کی ضرورت نہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ سوائے خداتعالیٰ کے اس عالم کے خلق میں کسی اور علت کی شرکت ممکن ہو سکتی ہے یا نہیں۔

خداتعالیٰ قادر مطلق نہیں رہتا:

مادہ کو مثل ذات الٰہی کے قدیم اور واجب الوجود اور موجود بذاتہ ماننے سے پہلی خرابی یہ لازم آتی ہے کہ خداتعالیٰ کے ساتھ دنیا کے پیدا کرنے میں ایک دوسری اندھی طاقت شریک ہو جاتی ہے۔

اب اگر خدا نے مجبوری سے مادہ کو شریک کر لیا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ انتظام عالم اور جزا و سزا میں وہ ایک بڑی حد تک اس مادہ کے ہاتھ سے مجبور ہو جاوے گا اور جب وہ مجبور ہوگا تو نظام کل ایک غرض اور غایت کی طرف نہیں چلا سکتا۔ کیونکہ مادہ ایک قدیم واجب الوجود مستقل شے جو اپنے خواص قدیم اپنے ساتھ رکھتا ہے بعض اوقات عالم کو دوسری طرف کھینچے گا اور خدا ایک دوسری طرف۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ قوانین فطرت میں اتحاد باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا نظام عالم بحیثیت موجود محال ہوگا، مگر نظام عالم بحیثیت موجودہ باقاعدہ ہے۔ اس لئے یہ خیال کہ مادہ شریک خلقت ازلی میں ہے باطل ہوا۔

کیا مادہ قدیم ہو کر خدا کا محکوم ہو سکتا ہے؟

لیکن جو لوگ علاوہ خدا کے مادہ کے قائل بھی ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ مادہ بے شک قدیم اور واجب الوجود ہے، اس کے لئے ہمیشہ موجود رہنا لازم ہے، لیکن اس میں یہ طاقت نہیں کہ وہ خدا کے مقابل میں اپنا اثر ظاہر کر سکے۔ یعنی خدا اگر مادہ سے ایک خاص کام لینا چاہتا ہے تو مادہ میں یہ لیاقت نہیں کہ صانع کے خلاف حرکت سے انکار یا تخالف کرے۔

اگر مادہ بمقابل خدا مجبور رہے گا تو یہ دو حال سے خالی نہیں۔

۱۔ یا تو مادہ میں مستقل قوت اور خواص ذاتی نہیں۔

۲۔ یا وہ قوتیں اور خواص خدا کی طاقت کے سامنے معطل اور یا ضائع ہو جاتی ہیں۔

صورت اول میں مادہ دراصل ویسا مادہ نہیں رہتا جو واجب الوجود ہو یا جس میں عالم کا مصالحہ بننے کی ذاتی قابلیت ہو۔ کیونکہ ہم مادہ کو اس کے خواص سے جانتے ہیں جب خواص اس کے ذاتی نہیں ہیں بلکہ خدا کے عطا کیے ہوئے ہیں تو پھر مادہ میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اور اس کو مستقل بالذات نہیں مان سکتے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جب انسان میں سے عقل نکال لی جاوے، تب وہ صرف حیوان رہ جاوے گا۔ حیوان میں سے حیات نکال لی جاوے تو محض مادہ رہ جاوے گا۔ اسی طرح مادہ میں سے صفات و قویٰ نہ رہیں تو وہ عدم محض ہو جاوے گا۔ پس عدم باقی رہ گیا اور یہی ہماری مراد ہے کہ خدا نے موجود کر دیا، حالانکہ وہ موجود قبل ایجاد کے معدوم تھا۔

اگر مادہ کے خواص و قوتیں ذاتی ہیں لیکن وہ خدا کے ارادہ کا مقابلہ اس لیے نہیں کر سکتیں کہ اس کے سامنے معطل ہو جاتی ہیں تب بھی وہی اعتراض پیدا ہو گا جو ذات مادہ کی ایک قوت کو ایک عرصہ کے لئے بیکار کر سکتی ہے وہ مستقلاً بھی بیکار کر سکتی ہے۔ جب ایک قوت ضائع ہو سکتی ہے تو بہر صورت سے صانع کو جب کام پڑے گا تو وہ ایسا ہی کر سکتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ میں مادہ کے تمام خواص اور قوتوں کے ضائع کرنے کی قدرت ہو گی۔ مادہ بلا خواص، قدرت اور قوت وغیرہ کے عدم رہ جاوے گا۔ اس لئے خدا تعالیٰ میں مادہ کو معدوم کرنے کی قوت ماننی پڑے گی۔ جو چیز قابل فنا ہے اور فنا کر دی جاتی ہے وہ ازلی، قدیم اور واجب الوجود نہیں ہو سکتی۔

کیا خدا مادہ کا محکوم ہو سکتا ہے؟

اب صرف ایک صورت باقی رہی۔ وہ یہ کہ مادہ جو قدیم اور واجب الوجود ہے اس کی قوتیں اور خاصیتیں باقی اور قائم رہتی ہیں اور خدا ان کو معطل نہیں کر سکتا صرف ان کا استعمال کر سکتا ہے۔ جس طرح کمہار مٹی اور چاک کا استعمال کرتا ہے اور دونوں سے برتن بناتا ہے۔

اس صورت میں لامحالہ اگر خدا مادہ کو کسی مقصد کی طرف لے جانا چاہے تو مادہ اس کا ساتھ نہیں دے گا بلکہ اس کے مادہ کے ساتھ اور اس کے پیچھے جاتا ہو گا۔ اس سے خدا کا صرف قادر مطلق ہونا باطل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے علم اور ارادہ وغیرہ ہر چیز میں محدود اور مجبور مانا جاوے گا اور دراصل مادہ کا اسی طرح محکوم ہو گا جس طرح کمہار قوانین مادہ اور قوانین حرکت کا محکوم ہے۔

اس عالم کا خالق ایک بے جان اور غیر ذی عقل شے کے مقابل میں مجبور مانا جاوے تو نظام عالم کے ترتیب دینے یا جزا و سزا کے دینے کی قابلیت بھی اس میں سب سلب ہو جاوے گی۔ پس وہ خدا بھی ایک قسم کی نابینا یا کم بینا مخلوق ہو گی۔

کیا کروڑوں قدیم ہو سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ قدیم ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے اور نہ عقل انسانی میں آسکتا ہے۔ اگرچہ آریہ سماجی ارواح اور کرم کو بھی قدیم مانتے ہیں لیکن ہم کو اس وقت صرف مادہ کی قدامت سے بحث ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مادہ کروڑوں، اربوں لاانتہای ایٹم یا سالمات سے مرکب ہے جن میں سے ہر ایک تسلیم بالذات اور واجب الوجود ماننا پڑے گا کیونکہ کسی طرح ایک ایٹم دوسرے کا محکوم نہیں ہے۔ پس عالم میں لاتعداد قدیم یعنی ازلی وابدی واجب الوجود ماننے پڑیں گے۔ ایک ان میں سے خدا یا الٰہ ہوگا۔ جب اہل مذاہب نیز اہل فلسفہ دو خداؤں اور دو قدیموں میں مشکلات پاتے ہیں تو لاتعداد قدیموں سے تو عالم بھی مرکب ہو ہی نہیں سکتا۔

قدیم کے لئے مفصلہ ذیل امور لازم ہیں:

۱۔ کبھی کسی قوت کا تصرف اس کی ذات پر نہ ہو سکے۔

۲۔ قدیم کی ذات و صفات دونوں ایک متحد مجموعہ وجود کا ہوتی ہیں۔ یعنی صفات ذات سے الگ نہیں ہوتیں۔

۳۔ پس قدیم کی صفات پر بھی تصرف کسی کا نہیں ہو سکتا۔

۴۔ قدیم کی قوت سے وہ کام نہیں لیا جا سکتا جو اس میں نہیں ہے۔ اس قوت میں کمی یا بیشی نہیں ہو سکتی۔

مادہ میں برخلاف اس کے تصرف صفات اور قوتوں میں مانا جاتا ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ عالم کی ترتیب اور ترکیب کے لئے کسی دوسری قوت نے سالمات کو مجبور کر کے ملا رکھا۔ پس نہ مادہ قدیم ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اور شے سوائے ذات واجب الوجود کے یہ قابلیت رکھتی ہے۔

باب سوم

اسلام کا مذہب مادہ کے متعلق

اب تک ہم نے عقلی بحث کی تھی۔ اب ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس بارہ میں اسلام نے کیا تعلیم دی ہے۔ مسلمانوں میں اس مسئلہ میں بحیثیت مسلمان آج تک اختلاف نہیں ہوا۔ چنانچہ اول ہم صرف آیات قرآنی لکھتے ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

ترجمہ: وہ خدا آسمان اور زمین کا ابداع (ایجاد) کرنے والا ہے۔

وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ

ترجمہ: جب وہ کسی کام کے لئے پورا ارادہ کر لیتا ہے پس اس کی نسبت کہتا ہے کہ ہو وہ ہو جاتا ہے۔

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ

ترجمہ: اسی طرح خدا تعالیٰ جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے۔ جب وہ کسی کام کو ٹھان لیتا ہے پس فرما دیتا ہے کہ ہو تو وہ ہو جاتا ہے۔

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ O

ترجمہ: اس نے ہر چیز کو خلق کیا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعٰلِمِينَ O

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے ہے مخلوق کرنا آسمانوں کا اور زمین کا اور زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔ اس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے۔

يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

ترجمہ: خدا پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ

ترجمہ: یہ ہے تمہارا خدا ہر چیز کا پیدا کرنے والا۔

فَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

ترجمہ پس جب کوئی بات قطعی قرار دے لے پس وہ کہتا ہے کہ ہو تو وہ ہو جاتی ہے تا کہ تم جان جاؤ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا

ترجمہ۔ خدا ایسا نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز اس کو مجبور کردے کیونکہ وہ جاننے والا اور قدرت والا ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ O

ترجمہ۔ بے شک حکم الٰہی یہی ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرے کہ وہ ہو جاوے تو ہو جاتی ہے۔

یہ آیات قرآنی خلق عالم کے متعلق ہیں:

یہ آیات اور ان کے علاوہ دیگر بہت سی آیات سے خدا نے عدم سے پیدا کرنے کا ذکر کیا ہے۔ ان سے بہت زیادہ آیات صنعت الٰہی کے متعلق ہیں کیونکہ آدمی مثالوں کے ذریعہ سے صنعت اور کاریگروں کو جلد تر سمجھ سکتے ہیں اور عدم سے موجود کرنے کا خیال انسانی ذہن میں بہت مشکل سے داخل ہوتا ہے کیونکہ خود انسان میں ایسی قدرت نہیں ہے اسی وجہ سے بعض نے ملاحدین کے ظاہری دلائل اور صرف صنعت الٰہی کی آیات کو ملا کر یہ غلط نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام نے مادہ کی قدامت کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔

آیات مذکورہ سے مفصلہ ذیل نتیجے صاف طور پر نکلتے ہیں:

۱۔ جب ارادہ الٰہی کسی امر کے واسطے ہوتا ہے تو بغیر کسی واسطے یا توسط کے وہ چیز فوراً موجود ہو جاتی ہے۔

۲۔ ارادہ الٰہی اور چیز کے موجود ہونے میں کوئی توقف نہیں ہوتا۔

۳۔ ہر چیز کو خدا نے خلق یا موجود کیا ہے، آسمان، زمین، ہر شے، ہر امر کو۔

۴۔ باوجودیکہ بظاہر مادہ اور حرکت میں تمام عالم متحد ہے مگر رنگ اور زبان اور خواص کا فرق ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان چیزوں کو موجود کیا ہے نہ کہ بے جان مادہ نے جس میں تنوع نہیں ہو سکتا۔

۵۔ خلق میں خدا تعالیٰ کسی چیز یا مادہ سے مجبور نہیں ہے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

۶۔ اس کی قدرت کے لئے کوئی حد یا انتہا نہیں تاکہ مادہ کو صنعت عالم میں شریک کرنے کی اس کو ضرورت ہو۔

۷۔ خدا نے کن فیکون اسی واسطے فرمایا ہے تاکہ لوگ سمجھ جاویں کہ وہ قادر علی الاطلاق یعنی بلا لحاظ شرائط کے ہے۔ مادہ کی شرکت یا مدد کا، محتاج نہیں ہے نہ کسی اور چیز کا۔

تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ مادہ حادث یعنی غیر مخلوق ہے۔ فنا ہو جاتا ہے اور پیدا ہوتا ہے اور مادہ کا وجود اور ثر محض خدا کی رضا اور ارادہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بلا تشبیہ جس طرح گھڑی کے سپرنگ ٹوٹ جانے یا اس کی حرکت بند ہو جانے سے سب بند ہو جاویں گے بالکل اسی طرح اگر بفرض خدا چلا جاوے یا معدوم ہو جاوے تو مادہ اپنا عمل باطل کر دے گا۔

مادہ میں استقلال اور قیام اور عدم فنا ظاہری کی جو خاصیت ہے وہ (بقول سپنسر) بے شک ایسی لازمی ہے کہ بغیر اس کے نہ دنیا کو قیام ہو سکتا ہے نہ کسی چیز کا علم قابل بھروسا ہو گا۔ کیونکہ یہ امید نہیں رہ سکتی کہ جس چیز کو ہم لینے جاتے ہیں، جیسے کپڑے پہنتے ہیں وہ باقی بھی رہے گا یا فنا ہو جاوے گا۔ یہی حکمت بالغہ ہے کہ مادہ کو قیام ہے اس وقت تک کے لئے جب تک اس کے خالق اور مبدع کی مرضی ہے۔

قدیم متکلمین کا مذہب:

قال صاحب ملل والنحل فی کتاب النهاية الاقدام وصححه محقق طوسی مذهب اهل الحق من الملل كلها ان العالم محدث مخلوق له اول احدثه الباری تعالیٰ بعد ان لم یکن ۔ کان الله ولم یکن معه شیء ۰۰۰ وقال العلامه فی نهایة المرام قد اتفق المسلمین کافة علی نص قدیم غیرالله تعالیٰ وغیر صفاته ۔

ترجمہ: مصنف ملل والنحل نے کتاب نہایۃ الاقدام میں لکھا ہے اور اس کی تصحیح محقق طوسی نے کی ہے کہ تمام مذاہب کے اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ دنیا عارضی اور مخلوق ہے اور خدا نے اس کو پیدا کیا، بعد اس کے کہ وہ معدوم تھی خدا تھا اور اس کے ساتھ کچھ نہ تھا۔ نیز علامہ شہرستانی نے نہایۃ المرام میں لکھا ہے کہ سب اہل اسلام نے اتفاق کیا ہے کہ سوائے خدا کے کوئی قدیم نہیں ہے۔

باب چہارم

قدیم حکما کا مذہب:

ووافقهم جمعٌ من اساطین الحکمة و مرضاء الفلاسفة مثل ثالیس وانکساغورس والکسمالس و من اهل ملطیة و مثل فیثاغورس اینادقلوس و سقراط و افلاطن من اعل اثینه و یونان جماعة من الشعراء و الاوائل و النساك و قول بقدم العالم و ازلیة الحرکات بعد اثبات الصانع ظهر بعد ارسطالیس لانه خالف القدماء و ابدع هذه المقاله ۔

ترجمہ اور اہل مذہب کی موافقت کی بہت سے بڑے بڑے حکما اور فلاسفہ مثل تھیلز اور انکسگورس اور انکسمالیس و حکمائے جزیرہ مالٹا اور مثل فیثاغورث اور ایمپی ڈکلیز اور سقراط اور افلاطون نے جو ایتھنز کے تھے اور بہت سے شعرا نے اور داناؤں نے جو قدیم زمانہ کے تھے اور عالم کے قدیم ہونے کا اور حرکت کے ازلی ہونے کا قول بعد خدا کو صانع ماننے کے ارسطو کے

زمانہ سے ہوا ہے کیونکہ اس نے اس معاملہ میں قدما سے اختلاف کیا اور یہ بات پیدا کی ہے۔

جدید حکماء کا مذہب:

جدید حکما کا مذہب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مادہ کی حقیقت اور قوانین کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ انسان اس کو فنا نہیں کر سکتا۔ باقی خدا کی بابت اور اس کی قدرت اور مادہ کی حقیقت اور قدامت کا علم انسان کو نہیں دیا گیا۔ یہ خیال ان کا ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ و ما اوتیتم من العلم الا قلیلاً تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

نتیجہ:

پس جب عقلی دلائل مادہ کی قدامت کے جہل مرکب پر مبنی ہیں اور مادہ کی قدامت سے بڑے اعتراضات اور خرابیاں لازم آتی ہیں اور حال کے حکماء خاموش ہیں۔ تب مادہ یا عالم کو قدیم ماننا صریح غلطی ہے۔ خاص کر اہل مذاہب کے لئے جو خدا کے قائل ہیں اور جن کو تعلیم آسمانی ہدایت کر رہی ہے۔

ہم نے یہ مضمون اس واسطے بھی لکھا ہے تاکہ سب پر ظاہر ہو جاوے کہ اسلام کا کوئی عقیدہ صحیح عقل کے خلاف نہیں ہے، اور خدا کی توحید کا جو درجہ اور کامل صفات اسلام نے جو مقرر کئے ہیں اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔ ہم کو واقف رہنا چاہیے کہ ذات باری کمزوریوں سے بالا ہے۔ اور وہ مادہ کی محتاج نہیں ہے اور نہ دنیا کو بنانے میں مادہ کی شرکت ممکن ہے۔ پس جو مذہب ایسا اعلیٰ درجہ کا ہو اس کے احکام کی پابندی سے کوئی دنیاوی، تمدنی یا علمی نقصان نہیں ہو سکتا۔

اس وقت جو خرابیاں ہیں وہ ہماری سستی، غلط کاری اور بے راہ چلنے کی وجہ سے ہیں جب اسلام کا اصلی نور ظاہر ہوگا تو قومیں اس کی طرف دوڑیں گی جیسے پیاسا پانی کی طرف۔ فقط

حواشی

۱۔ فسٹ پرنسپلز (اصول اولیہ) صفحہ ۳۴ تا ۳۵ ایڈیشن ۱۹۰۴ء۔

۲۔ ستیارتھ پرکاش ایڈیشن ۱۸۹۹ء صفحہ ۲۷۴ و ۲۷۵۔

۳۔ کلیات آریہ مسافر صفحہ ۳۳۰ ایڈیشن ۱۹۰۴ء (تکذیب براہین احمدیہ)۔

۴۔ علم کلام جلد ۲ صفحہ ۳۴۔

۵۔ کتاب مذکورہ صفحہ ۳۵۔

۶۔ علم النفس کے بعض عالموں کی رائے ہے کہ حواس خمسہ کے علاوہ انسان میں ایک چھٹی حس بھی ہے جس کے ذریعہ سے وہ عضلات کی اعصابی حرکت محسوس کرتا ہے۔

۷۔ فسٹ پرنسپلز (اصول اولیہ) ایڈیشن ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۸۔

خدا کا وجود

از مولانا شبیر احمد عثمانی

یہی وہ مضمون ہے جس کی تائید تمام ادیان و مذہب نے یک زبان ہو کر کی ہے اور جس پر بلا نکیر اہل علم کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ ملاحدہ جس کا دوسرا نام منکرین مذہب بھی ہے، زور شور کے ساتھ اسی مضمون کی تردید پر تلے ہوئے ہیں اور مادیین (میٹیریلسٹ) کے گروہ سے ہماری سب سے بڑی معرکہ آرائی اسی میدان میں ہو سکتی ہے۔

یورپ میں مادہ پرستوں کی جو جماعت تیار ہوئی ہے اس نے آج کل مذہبی دنیا میں ایک عام الچل ڈال رکھی ہے اور نہایت بے باکی کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے کہ خدا کا وجود ہرگز کوئی واقعی وجود نہیں ہے بلکہ وہ بھی ان وہمی اشیاء میں سے ایک شے ہے جن کو انسانی تخیل نے قوانین طبعیہ سے مرعوب ہو کر اختراع کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس فرضی خدا نے لوگوں کے دماغوں پر ایسا کچھ قبضہ اور اقتدار حاصل کیا کہ انہوں نے اپنے تمام اعمال و افعال اور تمام ارادوں بلکہ تمام کائنات کی عنان حکومت اسی کے ہاتھ میں دے دی اور محض اپنی خوش اعتقادی سے یہ سمجھ لیا کہ دنیا میں جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے اور جس قدر حوادث پیش آتے ہیں یا واقعات کا ظہور ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر ایک پتہ بھی ہلتا ہے اور ایک تنکہ بھی اپنی جگہ سے سرک جاتا ہے تو بغیر اس کے حکم اور ارادہ کے نہیں ہو سکتا۔

مادہ پرست کہتے ہیں کہ اہل مذاہب سے کوئی پوچھے کہ تم کو ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی کے ماننے پر کس چیز نے مجبور کیا ہے کیا عالم میں جو حوادث واقع ہوتے رہتے ہیں یا زمانہ جو پلٹیاں کھاتا ہے یا وجود کی آمد و شد جو اکثر چیزوں میں مشاہدہ کی جا رہی ہے تمہارے اس فرضی خدا کے سوا اور کسی سبب سے ربط نہیں کھا سکتے یا مادہ جو مع اپنی حرکت کے ابدی و ابدی ہے ان ضرورتوں کو سرانجام نہیں دے سکتا یا خواہی نخواہی تم کو ایک موہوم خارج از عقل ہستی کے سامنے جبہ سائی ضروری معلوم ہوئی۔ اگر ہم سے پوچھو تو یہ سب خیالات ارباب مذاہب کی ناواقفیت اور کوتہ فہمی پر مبنی ہیں کیونکہ زمانہ حال کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے ـــــ کہ عالم کی تمام سماوی اور ارضی اشیاء کی اصل دو چیزیں ہیں، مادہ اور اس کی قوت (حرکت) اور ازل سے دونوں تلازم کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ مادہ اور اس کی حرکت میں جدائی اور انفصال ہو سکے اور ایک بغیر دوسرے کے پایا جاوے، مادہ سے وہی اجزا دیمقراطیسی مراد ہیں جو اس خلاء میں بھرے ہوئے ہیں اور جو اگرچہ ذہنی قسمت قبول کر سکتے ہیں لیکن خارجی تقسیم کا ان میں امکان نہیں۔ انہیں ذرات کو اثیر (ایتھر) سے تعبیر کرتے ہیں اور انہیں کی دوامی حرکت کی وجہ سے اجزا سماوی یعنی ستارے اور کائنات ارضی یعنی جمادات و نباتات اور حیوانات جو پہلے سے موجود نہ تھے

وجود میں آئے ہیں اور ان چیزوں کا مادہ اور اس کی حرکت سے بننا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ کوئی معلول اپنی علت سے بے اختیار بن جاتا ہے چنانچہ ان اشیاء کی پیدائش میں مادہ اور اس کی حرکت کو نہ کسی قسم کا ادراک ہوتا ہے اور نہ ان میں قصد و ارادہ پایا جاتا ہے اور جب ہم کرات عالم اور تمام مخلوقات کے وجود کو مادہ اور اس کی حرکت سے منسوب کر سکتے ہیں تو نہ ہم کو کسی فرضی خدا کی حکومت ماننی پڑتی ہے اور نہ اپنے کو مذہبی طوق و سلاسل میں پھنسانے کی ضرورت رہتی ہے۔ غرض ہمارے نزدیک مادہ بھی قدیم ہے اور اس کی حرکت بھی قدیم ہے اور جو سلسلہ صورتوں کا مادہ کے اندر قائم رہتا ہے وہ بھی قدیم ہے۔ اگرچہ صورت شخصیہ علیحدہ علیحدہ حادث ہے اس حالت میں ہم کو خدا کے وجود کی اصلا ضرورت نہیں بلکہ مادہ اور اس کے قوانین فطریہ ہی عالم کی ہستی اور بقا کی ضمانت ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ بے شک مادیین نے بزعم خود کائنات کے وجود کا ایک خاص سبب پیدا کیا لیکن ابھی تک جس منتظم اور مرتب کائنات کے سبب کی ہم کو تلاش تھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ انہوں نے ہم کو ایک نہایت علیم و حکیم اور ہمہ صفت موصوف خدا سے علیحدہ کر کے ایک ایسے خدا پر قناعت کرنے کی رائے دی جو بالکل اندھا، بہرہ، گونگا اور بے حس و بے شعور ہے جس کا کوئی کام نہ قصد و اختیار سے ہو سکتا ہے، نہ مصنوعات میں کسی قسم کی ترتیب اور تناسب پیدا کرنے پر قادر ہے، نہ اس میں سمجھ کا مادہ ہے نہ وہ کسی قاعدہ و قانون سے واقف ہے، نہ اس کو امور انتظامیہ کی اطلاع ہے، حالانکہ جس عالم کے فاعل کا ہم کو کھوج لگانا تھا وہ عالم کائنات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے ہر ہر جزو میں بیش قیمت حکمتیں ودیعت رکھی ہوئی ہیں جس کے عجیب و غریب اسرار کا مشاہدہ کرتے کرتے عقل انسانی تھک جاتی ہے اور جس کے بہت تھوڑے سے حصہ کا تتبع کرنے سے حکماء کو خصوصا ان مادیین کو یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ مظاہر فطرت کی جس قدر باریکیاں ہم معلوم کر سکے ہیں وہ اس سے بہت ہی کم ہیں جو اب تک معلوم نہیں ہو سکیں۔ علم تشریح، علم الافلاک، علم الحیوانات، علم نباتات اور علم طبقات الارض کے ماہرین سے دریافت کرا جو اسرار ہائے قدرت تم نے موجودات عالم میں آج تک دریافت کیے ہیں وہ کس قدر ہے، اور ان کی حفاظت کے واسطے کتنے دفتر اور کتنے کتب خانے تم کو درکار ہوئے ہیں۔

پھر عالم کے احوال میں جو تفاوت اور حاجت مندی کے آثار پائے جاتے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈالو اور ہر ہر شے کی پستی و ذلت کو (جس سے خدا تعالیٰ کی پر حکمت وجبروت کا سبق حاصل ہوتا ہے) بہ نظر تعمق ملاحظہ کرو تا کہ تم کو معلوم ہو کہ یہ کارخانہ یوں ہی بے سر اور بخت واتفاق سے پیدا ہونے کے قابل نہیں ہے۔

آسمان، چاند، سورج اور ستاروں کو دیکھئے کہ ایک حال پر قرار نہیں، کبھی عروج ہے، کبھی نزول، کبھی طلوع ہے کبھی غروب، کبھی نور، کبھی گہن۔ آگ کو دیکھئے کہ بے قرار ہے، تھامے نہیں تھمتی، ہوا کا یہ حال ہے کہ کبھی حرکت کبھی سکون اور حرکت بھی ہے تو کبھی شمال کبھی جنوب، کبھی پورب اور کبھی پچھم کو ماری ماری پھرتی ہے۔ ادھر پانی کا کرہ ہوا کے دھکوں سے کہیں کا کہیں نکلا جاتا ہے اور زمین کو بھی پستی کے سوا لاچاری اس درجہ کی ہے کہ اس پر کوئی دوڑتا ہے، کوئی بھاگتا ہے، کوئی کھودتا ہے، کوئی بھرتا ہے۔ اسی طرح نباتات کبھی چھوٹے ہوتے ہیں، کبھی بڑے، کبھی تر ہو جاتے ہیں، کبھی خشک ہو جاتے ہیں اور اس پر ایک زمین ایک پانی اور ایک آفتاب ہونے کے باوجود اس قدر مختلف پھول اور پھل لاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتے۔ علیٰ ہذا القیاس حیوانات خصوصاً بنی نوع انسان باوجودیکہ سب کے سب اربع عناصر ہی سے مرکب ہیں۔ شکل و شمائل، خو، بو اور خاصیت و مزاج میں اتنے مختلف معلوم ہوتے ہیں کہ حد ادراک سے باہر ہے، اس کے علاوہ

بھوک، پیاس، صحت، مرض، گرمی، سردی اور حرص و ہوا وغیرہ کے بہت سے موکل ان کے پیچھے ایسے لگا دیئے ہیں کہ جس سے شرف حیات بھی خاک میں مل گیا اور حضرت انسان کے پیچھے تو اتنا لشکر کا لشکر خواہشات اور حاجات کا متعین ہوا کہ جس نے اس کی فہم و دانش کو ناچار کر کے تمام شرافت و عزت کو ملیامیٹ کر دیا۔ دوسرے حیوانات تو صرف کھانے پینے ہی کے محتاج ہیں۔

لباس، مکانات، سواری، عزت، منصب، جاگیر، بیٹے، کھنے، نگین کی کچھ پروا نہیں رکھتے، لیکن انسان کو بغیر ان چیزوں کے بھی زندگی بسر کرنا محال یا دشوار ہے بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس میں کوئی خوبی اور کمال زیادہ تر تھا اسی کو اوروں کی نسبت زیادہ قیودات میں بند کر رکھا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بادشاہ اگر غریبوں کو قید کرتے تو کئی کئی قیدیوں کو ایک محافظ سپاہی کفالت کرتا ہے، اور اگر کوئی بادشاہ یا امیر ان کی قید میں آ جاتا ہے تو گو اسے تعظیم سے رکھیں لیکن اس پر بہت پہرے اور بڑے بڑے بہادر حفاظت کے لئے مقرر کیا کرتے ہیں۔

بہر حال جبکہ ایسے ایسے اشرف اجزائے عالم اس ذلت و خواری میں گرفتار ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا، ایسے مجبور ہیں کہ دم بھر کو بھی ان قیودات کے شکنجوں سے وہ علیحدہ نہیں ہو سکتے تو بلا شبہ ان کے سر پر کوئی ایسا منتظم حاکم ہے جو ان سے ہر وقت قیدیوں کی مانند یہ سب بیگاریں لیتا ہے اور چین سے نہیں رہنے دیتا تاکہ یہ مغرور نہ ہو جائیں اور اوروں کو ان پر بے نیازی کا گمان نہ پیدا ہو۔

بلکہ ان کو ایسا ذلیل و خوار دیکھ کر یہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی خدا کو پہچانیں اور سمجھ لیں کہ یہ اس کے انتظام کی خوبی ہے کہ ان سے طرح طرح کے کام لیتا ہے اور ان پر قسم قسم کے احوال بھیجتا ہے اور یہ ایسا قصہ ہے جیسا کہ ایک بیدار مغز اور مدبر حاکم اپنے ماتحتوں کو فارغ نہیں رہنے دیتا اور اس پر بھی کہیں، کبھی کہیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

یورپ کا ایک محقق راسین بھی انہیں مناظر قدرت کو دیکھ کر کہتا ہے کہ "اے آسمانو! مجھ کو خبر دو، اے دریاؤ! مجھ کو بتاؤ، اے زمین! مجھ کو جواب دے، اے بے انتہا ستارو! تم بولو کہ کون سا ہاتھ ہے جس نے تمہیں افق میں تھام رکھا ہے؟ اے شب چاردہ(۱) کس نے تیری تاریکی کو خوب صورت بنادیا ہے، تو کس قدر شان والی ہے اور کس قدر عظمت مآب ہے، تو خود بتا رہی ہے کہ تیرا کوئی صانع ہے جس نے تجھ کو بغیر کسی زحمت کے بنایا ہے، اس نے تیری چھت کو قبہ ہائے نور سے مرصع کیا ہے جس طرح کہ اس نے زمین پر خاک کا فرش بچھایا ہے اور گرد کو ابھارا ہے۔ او مژدہ رساں سحر! او نیر شگرف! او ہمیشہ روشن رہنے والے ستارے! او آفتاب درخشاں! سچ بتا تو کس کی ادائے طاعت کے لئے محیط کے پردے سے باہر آتا ہے اور نہایت فیاضی کے ساتھ اپنی روشن شعاعیں عالم پر ڈالتا ہے۔ اے پر رعب سمندر، اے وہ کہ غضب ناک ہو کر زمین کو نگل جانا چاہتا ہے کس نے تجھ کو محبوس کر رکھا ہے، جس طرح شیر کٹہرہ میں قید کر دیا جاتا ہے تو اس قید خانہ سے بے فائدہ نکل جانے کی کوشش کرتا ہے تیری موجوں کا زور ایک حدِ معین سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکتا"۔

ملین ڈورڈ کہتا ہے کہ "انسان اس وقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر اور ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے ایسے بھی موجود ہیں کہ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت و اتفاق نتائج کے ہیں یا دوسری عبارت میں یوں کہنا چاہئے کہ مادہ کی عام خاصیت کے نتائج کے ہیں یہ فرضی اعتقادات اور عقلی گمراہیاں جن کو لوگوں نے علم المحسوسات کا لقب دیا ہے، علم حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے، فزیکل سائنسدان بھی اس پر اعتقاد نہیں لا سکتا۔

ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ "یہ اسرار جو روز بروز زیادہ دقیق ہوتے جاتے ہیں جب ان پر زیادہ بحث کرتے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی، ابدی قوت ہے جس سے تمام اشیا وجود میں آتی ہیں"۔

پروفیسر لینا کہتا ہے "وہ خدائے اکبر جو ازلی ہے، جو تمام چیزوں کا جاننے والا ہے، جو ہر چیز پر قادر ہے اپنی عجیب و غریب کاری گریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میں مبہوت اور مدہوش ہو جاتا ہوں"۔

اب ان سب کے جواب میں مادہ پرست کہتے ہیں کہ یہ تمام عمدہ انتظام اور مضبوط قاعدے جو دنیا میں جاری ہیں یہ سب بھی "مادہ اور حرکت" ہی کی کارسازیاں ہیں اور مادہ اگرچہ خود نہیں جانتا مگر خود بخود اس سے بے سوچے ایسے ایسے حیرت انگیز قوانین اور اصول بن جاتے ہیں جن کی اس عالم کو ضرورت رہتی ہے اور جس پر نظام عالم کا دار و مدار ہے لیکن ان حضرات سے اگر کوئی یہ کہے کہ ہندوستان کے کسی گاؤں میں بچہ پیدا ہوا اور بچے پیدا ہوتے ہی اس نے نہایت فصیح و بلیغ تقریر شروع کی اور وہ علوم و معارف اس کی زبان سے ظاہر ہوئے ہیں جن کی خبر نہ ارسطو کو ہوئی تھی نہ افلاطون کو، نہ بیکن کا ذہن وہاں تک پہنچا تھا اور نہ نیوٹن کا۔ نہ رازی کو وہ مضامین خواب میں نظر آئے تھے نہ امام غزالی کو، تو یہ لوگ ہرگز اس کے بیان کی تصدیق نہ کرسکیں گے بلکہ جو شخص اس عجوبہ قصہ کی تصدیق کرے گا اس کو بھی ان لوگوں کے یہاں سے مجنون، دیوانہ اور خبطی و پاگل کا خطاب ملے گا۔

تو کیا اے عقلمند! مادہ کی وہ سحر کاریاں اس واقعہ کی ندرت سے کچھ کم حیرت افزا ہیں؟ وہ بچہ جو ایک نامکمل انسان ہے، ان امور کی قدرت نہ رکھے جن کو چند تعلیم یافتہ مرد انجام دے سکتے ہیں، اور ایک "جماد لایعقل" جس کو ذرہ برابر بھی ادراک و شعور نہیں، تمام مخلوقات کی حفاظت اور زینت کے ایسے محکم دستور العمل تیار کرے جن کو دیکھ کر دنیا کے عقلا حیران ہیں اور جن کے اسرار حکمت کی گہرائی کو سب مل کر بھی آج تک معلوم نہیں کر سکے، اگر اس پر بھی آپ یہی کہے جاویں کہ نہیں کچھ ہی ہو ان تمام قوانین کی واضع وہی مادہ کی بے اختیاری حرکت ہے تو بقول علامہ حسین آفندی "ہماری اور آپ کی مثال ٹھیک ان دو شخصوں کی سی ہوگی جو کسی نہایت رفیع الشان اور مضبوط کوٹھی میں داخل ہوئے جس میں متعدد ڈیوڑھیاں، کمرے اور نشست گاہیں پائی جاتی ہوں، وہ شاندار دروازوں اور مضبوط جنگلوں سے آراستہ ہے، اس کے برآمدے اور ڈیوڑیاں بہت استحکام کے ساتھ بنائی گئی ہوں اور کمروں میں اعلیٰ درجہ کے فرش بچھے ہوئے ہوں، بڑے بڑے بلند تخت لگے ہوں، نہایت بیش قیمت برتن اس کے چاروں طرف قرینے سے رکھے ہوں۔ مختلف گھڑیوں، متعدد "مقیاس الحرارۃ" اور مقیاس الہواء کے ذریعہ اس کی دیواروں کی زیبائش کی گئی ہو۔

غرض اس میں بود و باش کرنے کے لئے جتنے سامان ضروری ہوں سب ہی کچھ موجود ہوں، اس کے چاروں طرف نہایت خوب صورت سیر گاہیں نظر آتی ہوں۔ گرداگرد ایسی چمن بندی کی گئی ہو جن میں درختوں کا صف باندھ کر کھڑا ہونا نگاہوں کو بھلا معلوم ہوتا ہو، قسم قسم کے پھولوں کی کیاریاں موقع موقع سے بنائی گئی ہوں، اس کی نہروں اور جدولوں میں پانی بھرا ہوا ہو، اس کے مستحکم بنے ہوئے حوض لبالب بھرے ہوں۔

خلاصہ یہ کہ عیش و آرام کے سب سامان مہیا ہوں اور جو بھی انہیں دیکھے یہی کہے کہ فلاں شئے فلاں حکمت پر مبنی ہے، اس کی یہ ضرورت ہے، اس کا بنانے والا کیسا ذی اختیار اور خوش تدبیر تھا جس نے کہ جو چیز بنائی ایک قرینے سے بنائی اور جس شے کے لئے جو مقام تجویز کیا وہی مناسب تھا۔

اب ایسے مقام پر پہنچ کران دونوں شخصوں میں سے ایک تو یہ کہنے لگا کہ صاحب اس میں ذرا شک نہیں کہ اس کا بنانے والا ان ساری عجیب و غریب صناعیوں پر خوب ہی قادر تھا، اور ان کی تالیف و ترتیب کے طریقوں سے بھی بڑی واقفیت رکھتا تھا۔ جب ہی تو اس نے انتہا درجہ کی حکمت سے اس کو اس قدر مضبوط اور استوار بنایا اور خوبی یہ کہ اس کے تمام لوازمات کامل طور پر مہیا کر دیئے تاکہ یہاں رہنا اور کماحقہ عیش و آرام سے بسر کرنا ممکن ہو اور کوئی امر آسائش و راحت میں مخل نہ ہونے پائے۔ اس کے بنانے والے کو اگرچہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں مگر یہ بالکل یقینی امر ہے کہ اس میں علم و قدرت، تدبیر و حکمت وغیرہ اوصاف جن کی کہ اس کوٹھی کے بنانے میں ضرورت پڑتی ہے سب موجود تھے۔

باقی اس کوٹھی کے ساز و سامان میں اگرچہ بعض چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کی حکمت میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن ان میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ اگرچہ میں اس کو دریافت نہیں کر سکا کیونکہ جن اشیاء کی حکمت میری سمجھ میں آ گئی میں نے ان سے اطمینان کر لیا ہے کہ اس کا بنانے والا بڑا حکمت والا ہے تو اس نے ان کو بھی خارج از حکمت و مصلحت نہ بنایا ہوگا۔

اب دوسرا شخص اپنے ساتھی سے کہنے لگا کہ اس کوٹھی کے وجود کا سبب جو تم نے بتلایا یہ درست نہیں بلکہ ایک پہاڑی کی طرف (جو اس کوٹھی کے پاس استادہ تھی اور جس کی جڑ میں ایک پانی کا چشمہ جاری تھا) اشارہ کر کے کہا کہ اس پہاڑی کی چوٹی سے اس قطعہ زمین کی جانب جس میں یہ کوٹھی واقع ہے ہمیشہ زمانہ قدیم سے ہوا چلا کرتی ہے، یہی ہوا لاکھوں برس تک مٹی اور پتھروں کو پہاڑی سے منتقل کرتی رہی اور وہ سب چیزیں اس کی وجہ سے مختلف شکلوں پر اس قطعہ زمین پر جمع ہوتی رہیں اور بارش کا پانی ہمیشہ اس میں کچھ تصرف کرتا رہا۔ کبھی اس کی شکل کچھ ہو گی کبھی کچھ، اسی طرح کبھی وہ چیزیں مجتمع ہو گئیں اور کبھی پراگندہ اور ان کی اوضاع شکلوں میں ہوا اور بارش کی وجہ سے کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہوتی رہی یہاں تک کہ کروڑوں برس کا زمانہ گزرنے کے بعد اب اس کوٹھی کی باقاعدہ صورت بن گئی جس میں کمرے، نشست گاہیں دروازے جنگلے، برآمدے، راستے، حوضیں اور نہریں سبھی کچھ پائی جاتی ہیں۔ رہا نہروں کا جاری ہونا، اس کی یہ صورت ہوئی کہ اس چشمہ سے جو کہ اس پہاڑی کی تلی میں واقع ہے ہمیشہ پانی بہہ کر اس قصر کے صحن میں مختلف طریقوں سے جاری ہوا، اس لئے پانی سے اس کی مٹی گلتی رہی، ہوا اور بارش کا اثر اس کے راستہ میں ہوتا رہا، شدہ شدہ لاکھوں برس کا زمانہ گزرنے کے بعد باقاعدہ نہریں اور حوضیں جاری ہو گئیں اور اس میں پانی اس موجودہ انتظام کے ساتھ بہنے لگا۔

اب اس کے برتن، گھڑیوں، فرش اور مختلف قسم کے مقیاسوں کو لیجئے، ان کی یہ صورت ہوئی کہ مسافروں کا قافلہ جو کبھی اس پہاڑ پر اس زمین میں اترا تو قافلہ والوں کی یہ چیزیں اتفاق سے چھوٹ گئیں اور ہوا ان کو مختلف طرح پر ادھر ادھر منتقل کرتی رہی، حتی کہ سالہا سال کے بعد یہ نوبت پہنچی کہ فرش باقاعدہ بچھ گئے، برتن قطاروں میں آراستہ، گھڑیاں اور مقیاس دیواروں پر آویزاں ہو گئیں، یہی حالت ان درختوں اور پھولوں کی ہوئی جو یہاں کی سیرگاہوں میں باقاعدہ لگے ہوئے ہیں، ان کے بیج ہوا میں اڑ کر یہاں تک پہنچ گئے اور اس زمین پر جم کر اگ آئے اور ہوا کی وجہ سے ادھر ادھر منتقل ہوتے ہوتے باقاعدہ طور پر آراستہ ہو گئے اور موجودہ حالت پر نظر آنے لگے۔

اب وہ شخص جس کے دماغ میں کچھ بھی عقل اور سر میں کچھ بھی انصاف ہے، بے لاگ ہو کر ان دونوں بیانات کا فیصلہ کرے اور بے تعصبی کی راہ سے بتلا دے کہ اس کوٹھی کے تیار ہونے کا وہ سبب جو پہلے آدمی نے بتلایا ہے عقل کے نزدیک

ماننے کے قائل ہے یا دوسرے شخص کی بے ہودہ بکواس۔ اور اسی طرح عالم کی پر اسرار ہستی کے واسطے ایک قادر مطلق اور "علام الغیوب" خدا کا اعتقاد رکھنا زیادہ قرین قیاس ہے یا ایک جاہل اور اپاہج مادہ کا، اور ایسی صورت میں اربوں کھربوں انسانوں کی رائے (جو آدم علیہ السلام کے عہد سے اس وقت تک گزرے ہیں اور جن کے بڑے بڑے حکماء اور اولوالعزم انبیاء بھی شامل ہیں) صحت اور وقعیت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے یا ہزار دو ہزار غافل و بدمستوں کی۔

بلاشبہ ہمارے زمانے کے بعض عقلاء سے سخت غلطی ہوئی کہ انہوں نے ایسے ایسے اعلیٰ درجہ کے قوانین قدرت کو جن سے خدا تعالیٰ کی حکمتوں اور صناعیوں کی بوقلمونی ظاہر ہوتی ہے، خدائے برتر کی امداد کا محتاج نہیں سمجھا بلکہ صرف ان قوانین میں جو حرکت مادہ سے پیدا ہوئی ہیں باہم توافق تناسب ربط و اتحاد پیدا کرنے کے لئے خدا کے وجود کی ضرورت باقی رکھی حالانکہ اس تناسب و اتحاد کا باقی رکھنا بھی اسی مادہ اور حرکت کو کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا جس نے ایسے ایسے غامض اور غیر متغیر قوانین عالم میں جاری کر دیے ہیں۔

تماشے کی بات یہ ہے کہ جیساکہ مسلمانوں میں بعض علماء نے مادہ پرستوں کی دھمکی سے مرعوب ہو کر مادہ وغیرہ کو قدیم مان لیا اسی طرح بعض دوسری اقوام کے لیڈروں نے بھی یورپ کے ملحدوں سے ڈر کر قدامت کے مسئلہ کو جزو مذہب بنا لیا ہے اور اسی پر مسئلہ تناسخ کی بھی نیو جمانا شروع کر دی حالانکہ دنیا کی وہ پرانی کتاب جس پر یہ ہوئے نہایت زور و شور کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور جس کو اہل ہند کی عزت افزائی نے الہامی کتاب بھی بنا دیا ہے خوب پکار کر کہہ رہی ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے سوا کوئی قدیم نہیں ہے۔ چنانچہ رگوید منترا اشلوک ۱۸ ویبائے ورک ۱۷ کا جو ترجمہ خود سوامی دیانند جی مہاراج نے بھاشیہ بھومکا صفحہ ۷۵ میں کیا اس کی حرف بحرف نقل یہ ہے:

جس وقت ذروں سے مل کر بنی ہوئی دنیا پیدا نہیں ہوئی تھی اس وقت یعنی پیدائش کائنات سے پہلے است (غیر محسوس حالت) تھی یعنی شونیہ اکاش بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کا اس وقت کچھ کاروبار نہیں تھا اس وقت (ست پرکرتی) یعنی کائنات کی غیر محسوس علت جس کو ست کہتے ہیں وہ بھی نہ تھی اور نہ پرمانو (ذرے) تھے، وارث (کائنات) میں جو اکاش دوسرے درجہ پر آتا ہے وہ بھی نہ تھا بلکہ اس وقت صرف پربرہم کی سامرتھ (قدرت جو نہایت لطیف اور اس تمام کائنات سے برتر پرم (بے علت) ارکان ہے موجود تھی الخ۔

کیا رگوید کی اس صریح عبارت میں کوئی تاویل چل سکتی ہے؟ کیا کسی تاویل کرنے والے کے لفظی الٹ پھیر کچھ کام دے سکتے ہیں؟ کیا اس کے بعد بھی ان حضرات کے دو اہم اصول قدامت عالم اور تناسخ کی بیخ و بنیاد قائم رہ سکتی ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ اس قوم کے لیڈروں کی کوشش جو انہوں نے وید کی جدت طرازی میں کی تھی بالکل رائگاں گئی اور انہوں نے خدا کو لوہار، بڑھئی، کمہار کے ساتھ تشبیہ دینے میں فضول اپنا وقت ضائع کیا۔ انکا خیال ہے کہ جس طرح بڑھئی، لوہار وغیرہ ہر چیز کے بنانے میں مادہ کی احتیاج رکھتے ہیں اسی طرح خداوند کارساز کے لئے بھی یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ دنیا کے کارخانوں کو بغیر کسی مادہ کے بنا دے۔

لیکن ان صاحبوں کو یہ خیال نہیں رہا کہ بڑھئی، لوہار وغیرہ کو بغیر ہاتھ پاؤں، اعضاء جسمانی وغیرہ سامان اور اوزاروں کے بھی کسی چیز کا بنانا محال ہے، حالانکہ خدا کی نسبت خود بھومکا صفحہ ۹ میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس کو ان آلات کی ضرورت نہیں۔

بڑھئی، لوہار وغیرہ کو جیسا کہ کسی چیز کے بنانے میں مادہ کی ضرورت ہے ایسے ہی دیکھنے میں آنکھ کی اور سننے میں کان کی اور بولنے میں زبان کی ضرورت ہے حالانکہ ستیارتھ پرکاش کی تصریح کے موافق خدائے عز وجل بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے، بغیر کانوں کے سنتا ہے اور بغیر زبان کے کلام کرتا ہے۔

تو ایسی حالت میں نہ معلوم ان حضرات کو ویدک تعلیم کے برخلاف مادہ کو قدیم کہنے اور اس پر تناسخ کا خیال باندھنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ کیوں صاف طور پر وہی نہ کہہ دیا جو مسلمان وغیرہ کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کے سوا سب اشیاء فانی اور حادث ہیں اور سب چیزوں کا وجود خدائے تعالیٰ کے اعتبار سے ایسا ہی عرضی و مستعار ہے جیسا کہ زمین و آسمان اور در و دیوار کا نور آفتاب کے نور سے یا گرم پانی کی گرمی آگ کی حرارت سے، اس خدائے واحد نے اپنی قدرت کاملہ اور ارادۂ نافذہ سے ہر چیز کو نیست سے ہست کیا اور وہی اپنے اختیار سے جب چاہے گا نیست کر دے گا، نہ اس کو مادہ کا احتیاج ہے نہ اس پر روح کی حکومت ہے، نہ اس کے اختیارات محدود ہیں اور نہ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی ہے وہ تمام کمالات کے ساتھ موصوف اور جملہ نقصانات اور عیوب سے پاک ہے، کیونکہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں اور وجود ہی ان کا سرچشمہ ہے اور تمام نقصانات عدمی ہیں اور عدم ہی ان کا باعث ہوا ہے تو جب خدا کا وجود غیر محدود اور خانہ زاد ہے کسی دوسری جگہ سے آیا ہوا نہیں اور نہ ہی عدم کا قطعاً اس کے ساتھ اختلاط ہوا ہے تو جملہ کمالات بھی اس کے بے حد و بے پایاں اور غیر مستعار ہوں گے اور مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے اندر جو کوئی بھی خوبی اور حسن ہو گا وہ سب اس کے محاسن اور صفات کا پرتو ہو گا۔

پس جب ایسی ذات ستودہ صفات نے اپنے اختیار و قدرت سے دنیا کو بنایا ہے تو یقیناً اس کی ایجاد اور ابقاء میں بے انتہا حکمتیں صرف ہوئی ہوں گی اور بے شبہ بنانے سے پہلے ہی خدائے تعالیٰ کے علم میں اس کا مرتب نقشہ اور ابتداء سے انتہا تک ہر ہر چیز کا اندازہ اور پیمانہ موجود ہو گا، جس کو غالباً اہل اسلام لفظ تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ تعبیر اس اعتبار سے بالکل موضوع ہے کہ لغت میں اس لفظ کے معنے اندازہ ہی کرنے کے ہیں۔

بہرحال اب تک جو کچھ ہم نے لکھا اس میں اگرچہ اثبات صانع عالم کے متعلق وہ زبردست استدلال نہیں لکھے گئے جن کی تفصیل ہمارے متکلمین نے اپنی مبسوط تصانیف میں کی ہے یا جن کو ہم ان شاء اللہ اسی مفصل کتاب میں درج کریں گے، جس کا وعدہ پہلے ہو چکا ہے یہاں تو ایک سچے دلنشین اور عام فہم طریقہ سے جس قدر اس مختصر تحریر میں گنجائش تھی عالم کے واسطے ایک جامع الکمالات فاعل کا ہونا ضروری قرار پا گیا اور یہی وہ مدعا تھا جس کو ہم ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اب جو کچھ گفتگو باقی ہے وہ اس میں ہے کہ اتنی بڑی کائنات کے لئے کیا تنہا ایک ہی خدا کا وجود کافی ہو سکتا ہے اور اسی سے ہماری سب حاجتیں پوری ہو سکتی ہیں یا ہم کو مختلف ضروریات کے واسطے در در بھٹکنا پڑے گا اور بہت سے خود مختار بادشاہوں کے سامنے گردن جھکانا ہو گی۔

عقل کا فیصلہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

بڑے بڑے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں کارخانے بجلی کی قوت سے چل رہے ہیں۔ ریلیں اور ٹرام گاڑیاں رواں دواں ہیں۔ شام کے وقت دفعتہً ہزاروں قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔ گرمی کے زمانہ میں گھر گھر پنکھے چلتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے نہ تو ہمارے اندر حیرت و استعجاب کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ان چیزوں کے روشن یا متحرک ہونے کی علت میں کسی قسم کا اختلاف ہمارے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان قمقموں کا تعلق جن تاروں سے ہے ان کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان تاروں کا تعلق جس بجلی گھر سے ہے اس کا حال بھی ہم کو معلوم ہے۔ اس بجلی گھر میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے وجود کا بھی ہم کو علم ہے۔ ان کام کرنے والوں پر جو انجینئر نگرانی کر رہا ہے اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انجینئر بجلی بنانے کے کام سے واقف ہے، اس کے پاس بہت سی کلیں ہیں اور ان کلوں کو حرکت دے کر وہ اس قوت کو پیدا کر رہا ہے جس کے جلوے ہم کو قمقموں کی روشنی، پنکھوں کی گردش، ریلوں اور ٹرام گاڑیوں کی سیر، چکیوں اور کارخانوں میں نظر آتے ہیں۔ پس بجلی کے آثار کو دیکھ کر اس کے اسباب کے متعلق ہمارے درمیان اختلاف رائے واقع نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان اسباب کا پورا سلسلہ ہمارے محسوسات میں داخل ہے اور ہم اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

فرض کیجئے کہ یہی قمقمے روشن ہوتے، اسی طرح پنکھے گردش کرتے، یونہی ریلیں اور ٹرام گاڑیاں چلتیں، چکیاں اور مشینیں حرکت کرتیں، مگر وہ تار جن سے بجلی ان میں پہنچتی ہے ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتے، بجلی گھر بھی ہمارے محسوسات کے دائرے سے خارج ہوتا، بجلی گھر میں کام کرنے والوں کا بھی ہم کو کچھ علم نہ ہوتا اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کارخانہ کا کوئی انجینئر ہے جو اپنے علم اور اپنی قدرت سے اس کو چلا رہا ہے، کیا اس وقت بھی بجلی کے ان آثار کو دیکھ کر ہمارے دل ایسے ہی مطمئن ہوتے؟ کیا اس وقت بھی ہم اسی طرح ان مظاہر کی علتوں میں اختلاف نہ کرتے؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کا جواب نفی میں دیں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب آثار کے اسباب پوشیدہ ہوں اور مظاہر کی علتیں غیر معلوم ہوں تو دلوں میں حیرت کے ساتھ بے اطمینانی کا پیدا ہونا، دماغوں کا اس رازِ سربستہ کی جستجو میں لگ جانا اور اس راز کے متعلق قیاسات و آراء کا مختلف ہونا ایک فطری بات ہے۔

اب ذرا اسی مفروضہ پر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھائیے۔ مان لیجئے کہ یہ جو کچھ فرض کیا گیا ہے در حقیقت عالم واقعہ میں موجود ہے۔ ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہیں، لاکھوں پنکھے چل رہے ہیں، گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، کارخانے حرکت کر رہے ہیں اور

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان میں کونسی قوت کام کر رہی ہے اور وہ کہاں سے آتی ہے۔ لوگ ان مظاہر و آثار کو دیکھ کر حیران و ششدر ہیں۔ ہر شخص ان کے اسباب کی جستجو میں عقل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں آپ سے آپ روشن یا متحرک ہیں، ان کے اپنے وجود سے خارج کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں روشنی یا حرکت بخشنے والی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ چیزیں جن مادوں سے بنی ہوئی ہیں انہی کی ترکیب نے ان کے اندر روشنی اور حرکت کی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس عالم مادہ سے ماوراء چند دیوتا ہیں جن میں سے کوئی قمقمے روشن کرتا ہے، کوئی ٹرام اور ریلیں چلاتا ہے، کوئی پنکھوں کو گردش دیتا ہے اور کوئی کارخانوں اور چکیوں کا محرک ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو سوچتے سوچتے تھک گئے ہیں اور آخر میں عاجز ہو کر کہنے لگے ہیں کہ ہماری عقل اس طلسم کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی، ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور جو کچھ سمجھ میں نہ آئے اس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب۔

یہ سب گروہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ مگر اپنے خیال کی تائید اور دوسرے کے خیالات کی تکذیب کے لیے ان میں سے کسی کے پاس بھی قیاس اور ظن و تخمین کے سوا کوئی ذریعہ علم نہیں ہے۔

اس دوران میں کہ یہ اختلافات برپا ہیں، ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو! میرے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان سب قمقموں، پنکھوں، گاڑیوں، کارخانوں اور چکیوں کا تعلق چند مخفی تاروں سے ہے جن کو تم محسوس نہیں کرتے۔ ان تاروں میں ایک بہت بڑے بجلی گھر سے وہ قوت آتی ہے جس کا ظہور روشنی اور حرکت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس بجلی گھر میں بڑی بڑی عظیم الشان کلیں ہیں جنہیں بے شمار اشخاص چلا رہے ہیں۔ یہ سب اشخاص ایک بڑے انجینئر کے تابع ہیں، اور وہی انجینئر ہے جس کے علم اور قدرت نے اس پورے نظام کو قائم کیا ہے۔ اسی کی ہدایت اور نگرانی میں یہ سب کام ہو رہے ہیں۔

یہ شخص پوری قوت سے اپنے اس دعوے کو پیش کرتا ہے۔ لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں، سب گروہ مل کر اس کی مخالفت کرتے ہیں، اسے دیوانہ قرار دیتے ہیں، اس کو مارتے ہیں، تکلیفیں دیتے ہیں، گھر سے نکال دیتے ہیں، مگر وہ ان سب روحانی اور جسمانی مصیبتوں کے باوجود اپنے دعویٰ پر قائم رہتا ہے۔ کسی خوف یا لالچ سے اپنے قول میں ذرہ برابر ترمیم نہیں کرتا۔ کسی مصیبت سے اس کے دعوے میں کمزوری نہیں آتی۔ اس کی ہر ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قول کی صداقت پر کامل یقین ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ بھی بعینہٖ یہی قول اسی دعویٰ کے ساتھ پیش کرتا ہے، پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں آتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جو اس کے پیشرووں نے کہی تھی۔ اس کے بعد آنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز ہو جاتی ہے، اور یہ سب اسی ایک قول کو اسی ایک دعویٰ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ زمان و مکان اور حالات کے اختلاف کے باوجود ان کے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ سب کہتے ہیں کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ سب کو دیوانہ قرار دیا جاتا ہے، ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہر طریقہ سے ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے قول سے باز آ جائیں، مگر سب کے سب اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کو اپنے مقام سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتی۔ اس عزم و استقامت کے ساتھ ان لوگوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں

کہ ان میں سے کوئی جھوٹا، چور، خائن، بدکار، بد معاش، حرام خور نہیں ہے۔ ان کے دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ ان سب کے اخلاق پاکیزہ ہیں، سیرتیں انتہا درجے کی نیک ہیں اور حسن خلق میں یہ اپنے دوسرے ابنائے نوع سے ممتاز ہیں۔ پھر ان کے اندر جنون کا بھی کوئی اثر نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے برعکس وہ تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور دنیوی معاملات کی اصلاح کے لیے ایسی ایسی تعلیمات پیش کرتے اور ایسے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کے مثل بنانا تو در کنار بڑے بڑے علماء و عقلاء کو ان کی باریکیاں سمجھنے میں پوری پوری عمریں صرف کر دینی پڑتی ہیں۔

ایک طرف وہ مختلف الخیال مکذبین ہیں اور دوسری طرف یہ متحد الخیال مدعی، دونوں کا معاملہ عقل سلیم کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ جج کی حیثیت سے عقل کا فرض ہے کہ پہلے اپنی پوزیشن کو خوب سمجھ لے، پھر فریقین کی پوزیشن کو سمجھے اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کس کی بات قابل ترجیح ہے۔

جج کی اپنی پوزیشن یہ ہے کہ خود اس کے پاس امر واقعی کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ خود حقیقت کا علم نہیں رکھتا۔ اس کے سامنے صرف فریقین کے بیانات، ان کے دلائل، ان کے ذاتی حالات اور خارجی آثار و قرائن ہیں۔ انہی پر تحقیق کی نظر ڈال کر اسے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کا برحق ہونا اغلب ہے۔ مگر اغلبیت سے بڑھ کر بھی وہ کوئی حکم نہیں لگا سکتا، کیونکہ اصل پر جو کچھ مواد ہے اس کی بنا پر یہ کہنا اس کے لیے مشکل ہے کہ امر واقعی کیا ہے۔ وہ فریقین میں سے ایک کو ترجیح دے سکتا ہے، لیکن قطعیت اور یقین کے ساتھ کسی کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتا۔

مکذبین کی پوزیشن یہ ہے:

۱۔ حقیقت کے متعلق ان کے نظریے مختلف ہیں اور کسی ایک نکتہ میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے حتی کہ ایک ہی گروہ کے افراد میں بسا اوقات اختلاف پایا گیا ہے۔

۲۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ ان میں سے کوئی گروہ اس سے زیادہ کسی چیز کا مدعی نہیں ہے کہ ہمارے قیاسات دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ وزنی ہیں۔ مگر اپنے قیاسات کا قیاسات ہونا سب کو تسلیم ہے۔

۳۔ اپنے قیاسات پر ان کا اعتقاد، ایمان و یقین اور غیر متزلزل وثوق کی حد تک نہیں پہنچا ہے۔ ان میں تبدیلی رائے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ان میں ایک شخص کل تک جس نظریہ کو پورے زور کے ساتھ پیش کر رہا ہے، آج خود اسی نے اپنے پچھلے نظریہ کی تردید کر دی اور ایک دوسرا نظریہ پیش کر دیا۔ عمر، عقل، علم اور تجربے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اکثر ان کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔

۴۔ مدعیوں کی تکذیب کے لیے ان کے پاس بجز اس کے اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی صداقت کا کوئی یقینی ثبوت نہیں پیش کیا۔ انہوں نے وہ مخفی تار ہم کو نہیں دکھائے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ قمقموں اور پنکھوں وغیرہ کا تعلق انہیں سے ہے، نہ انہوں نے بجلی کا وجود تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا، نہ بجلی گھر کی ہمیں سیر کرائی، نہ اس کی کلوں اور مشینوں کا معاینہ کرایا، نہ اس کے کارندوں میں سے کسی سے ہماری ملاقات کرائی، نہ کبھی انجینئر سے ہم کو ملایا، پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ سب کچھ حقائق ہیں؟

مدعیوں کی پوزیشن یہ ہے:

۱۔ وہ سب آپس میں متفق القول ہیں۔ دعویٰ کے جتنے بنیادی نکات ہیں ان سب میں ان کے درمیان کامل اتفاق ہے۔

۲۔ ان سب کا متفقہ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

۳۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم اپنے قیاس یا گمان کی بنا پر ایسا کہتے ہیں بلکہ سب نے بالاتفاق کہا ہے کہ انجینئر سے ہمارے خاص تعلقات ہیں۔ اس کے کارندے ہمارے پاس آتے ہیں، اس نے اپنے کارخانے کی سیر بھی ہم کو کرائی ہے اور ہم جو کچھ کہتے ہیں علم و یقین کی بنا پر کہتے ہیں، ظن، تخمین کی بنا پر نہیں کہتے۔

۴۔ ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے اپنے بیان میں ذرہ برابر بھی تغیر و تبدل کیا ہو۔ ایک ہی بات ہے جو ان میں ہر شخص دعویٰ کے آغاز سے زندگی کے آخری سانس تک کہتا رہا ہے۔

۵۔ ان کی سیرتیں انتہا درجہ کی پاکیزہ ہیں۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جو لوگ زندگی کے تمام معاملات میں سچے اور کھرے ہوں وہ خاص اسی معاملہ میں بالاتفاق کیوں جھوٹ بولیں۔

۶۔ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ دعویٰ پیش کرنے سے ان کے پیش نظر کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ برعکس اس کے یہ ثابت ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے اس دعوے کی خاطر انتہائی درجہ کے مصائب برداشت کیے ہیں، جسمانی تکلیفیں سہیں، قید کئے گئے، مارے اور پیٹے گئے، جلاوطن کیے گئے، بعض قتل کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ بعض کو آرے سے چیر ڈالا گیا اور چند کے سوا کسی کو بھی خوش حالی و فارغ البالی کی زندگی میسر نہ ہوئی۔ لہٰذا کسی ذاتی غرض کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا بلکہ ان کا ایسے حالات میں اپنے دعویٰ پر قائم رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اپنی صداقت پر انتہا درجہ کا یقین تھا، ایسا یقین کہ اپنی جان بچانے کے لیے بھی ان میں سے کوئی اپنے دعوے سے باز نہ آیا۔

۷۔ ان کے متعلق مجنون یا فاترالعقل ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں وہ سب کے سب غایت درجہ کے دانشمند اور سلیم العقل پائے گئے ہیں۔ ان کے مخالفین نے بھی اکثر ان کی دانشمندی کا لوہا مانا ہے۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کو اسی خاص معاملہ میں جنون لاحق ہو گیا ہو؟ اور وہ معاملہ بھی کیسا؟ جو ان کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گیا ہو۔ جس کے لیے انہوں نے دنیا بھر کا مقابلہ کیا ہو جس کی خاطر وہ سالہا سال دنیا سے لڑتے رہے ہوں۔ جو ان کی ساری عاقلانہ تعلیمات کا جن کے عاقلانہ ہونے کا بہت سے مکذبین کو بھی اعتراف ہے، اصل الاصول ہو۔

۸۔ انہوں نے خود بھی یہ نہیں کہا کہ ہم انجینئر یا اس کے کارندوں سے تمہاری ملاقات کرا سکتے ہیں یا اس کا مخفی کارخانہ تمہیں دکھا سکتے ہیں یا تجربہ اور مشاہدہ سے اپنے دعویٰ کو ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ خود ان تمام امور کو "غیب" سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ہم پر اعتماد کرو اور جو کچھ ہم بتاتے ہیں اسے مان لو۔

فریقین کی پوزیشن اور ان کے بیانات پر غور کرنے کے بعد اب عقل کی عدالت اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ چند مظاہر و آثار کو دیکھ کر ان کے باطنی اسباب و علل کی جستجو دونوں فریقوں نے کی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ بادی النظر میں سب کے نظریات اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ اولاً ان میں سے کسی میں استحالہ

عقلی نہیں ہے، یعنی قوانینِ عقلی کے لحاظ سے کسی نظریہ کے متعلق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن ہے۔ ثانیاً ان میں سے کسی کی صحت تجربے یا مشاہدے سے ثابت نہیں کی جا سکتی۔ نہ فریق اول میں سے کوئی گروہ اپنے نظریات کا ایسا سائنٹفک ثبوت دے سکتا ہے جو ہر شخص کو یقین کرنے پر مجبور کر دے اور نہ فریق ثانی اس پر قادر یا اس کا مدعی ہے۔ لیکن مزید غور و تحقیق کے بعد چند امور ایسے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر تمام نظریات میں سے فریق ثانی کا نظریہ قابلِ ترجیح قرار پاتا ہے۔

اولاً، کسی دوسرے نظریہ کی تائید اتنے کثیر التعداد عاقل، پاک سیرت، صادق القول آدمیوں نے متفق ہو کر اتنی قوت اور اتنے یقین و ایمان کے ساتھ نہیں کی ہے۔

ثانیاً، ایسے پاکیزہ کیریکٹر اور اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں اس دعویٰ پر متفق ہو جانا کہ ان سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعہ علم ہے، اور ان سب نے اس ذریعہ سے خارجی مظاہر کے باطنی اسباب کو معلوم کر لیا ہے، ہم کو اس دعویٰ کی تصدیق پر مائل کر دیتا ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ اپنی معلومات کے متعلق ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو معلومات انہوں نے بیان کی ہیں ان میں کوئی استحالۂ عقلی بھی نہیں ہے اور نہ یہ بات قوانینِ عقلی کی بنا پر محال قرار دی جا سکتی ہے کہ بعض انسانوں میں کچھ ایسی معمولی قوتیں ہوں جو عام طور پر دوسرے انسانوں میں نہ پائی جاتی ہوں۔

ثالثاً، خارجی مظاہر کی حالت پر غور کرنے سے بھی اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فریق ثانی کا نظریہ صحیح ہو۔ اس لیے کہ قمقمے، پنکھے، گاڑیاں، کارخانے وغیرہ نہ تو آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کا روشن اور متحرک ہونا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، نہ ان کی روشنی و حرکت ان کے مادۂ جسمی کی ترکیب کا نتیجہ ہے، کیونکہ جب وہ متحرک اور روشن نہیں ہوتے اس وقت بھی یہی ترکیب جسمی موجود رہتی ہے نہ ان کا الگ الگ قوتوں کے زیر اثر ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بسا اوقات جب قمقموں میں روشنی نہیں ہوتی تو پنکھے بھی بند ہوتے ہیں، ٹرام کاریں بھی موقوف ہو جاتی ہیں اور کارخانے بھی نہیں چلتے۔ لہٰذا خارجی مظاہر کی توجیہ میں فریق اول کی طرف سے جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ سب بعید از عقل و قیاس ہیں۔ زیادہ صحیح یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام مظاہر میں کوئی ایک قوت کارفرما ہو اور اس کا سر رشتہ کسی ایسے حکیم و توانا کے ہاتھ میں ہو جو ایک مقررہ نظام کے تحت اس قوت کو مختلف مظاہر میں صرف کر رہا ہو۔

باقی رہا متشککین کا یہ قول کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اور جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے تو حاکم عقل اس کو بھی درست نہیں سمجھتا کیونکہ کسی واقعہ کا واقع ہونا اس کا محتاج نہیں ہے کہ وہ سننے والوں کی سمجھ میں بھی آ جائے۔ اس کے وقوع کو تسلیم کرنے کے لیے معتبر اور متواتر شہادت کافی ہے۔ اگر ہم سے چند معتبر آدمی آ کر کہیں کہ ہم نے زمین مغرب میں آدمیوں کو لوہے کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہوا پر اڑتے دیکھا ہے اور ہم اپنے کانوں سے لندن میں بیٹھ کر امریکہ کا گانا سن آئے ہیں تو ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ جھوٹے اور مسخرے تو نہیں ہیں؟ ایسا بیان کرنے میں ان کی کوئی ذاتی غرض تو نہیں ہے؟ ان کے دماغ میں کوئی فتور تو نہیں ہے؟ اگر ثابت ہو گیا کہ وہ نہ جھوٹے ہیں نہ مسخرے، نہ دیوانے، نہ ان کا کوئی مفاد اس روایت سے وابستہ ہے، اور اگر ہم نے دیکھ کر اس کو بلا اختلاف بہت سے سچے اور عقلمند لوگ پوری سنجیدگی کے ساتھ بیان کر رہے ہیں تو ہم یقیناً اس کو تسلیم کر لیں گے، خواہ لوہے کی گاڑیوں کا ہوا پر اڑنا اور کسی مادی واسطہ کے بغیر ایک جگہ کا گانا کئی ہزار میل کے فاصلہ پر سنائی دینا کسی طرح ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو۔

یہ اس معاملہ میں عقل کا فیصلہ ہے۔ مگر تصدیق و یقین کی کیفیت جس کا نام "ایمان" ہے اس سے پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے لیے وجدان کی ضرورت ہے۔ اس کے لے ضرورت ہے کہ اندر سے ایک آواز آئے جو تکذیب ، شک اور تذبذب کی تمام کیفیتوں کا خاتمہ کردے اور صاف کہہ دے کہ لوگوں کی قیاس آرائیاں باطل ہیں، سچ وہی ہے جو سچے لوگوں نے قیاس سے نہیں بلکہ علم و بصیرت کی رو سے بیان کیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب ۱۳۵۲ھ، دسمبر ۱۹۳۳ء)

کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے

وحید الدین خان

عرصہ ہوا کہ کیرالا کے عیسائی مشن نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس کا نام تھا

"Nature and science speak about God"

اس باب کے عنوان کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ موزوں ترین ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا سب سے بڑا ثبوت اس کی وہ مخلوق ہے جو ہمارے سامنے موجود ہے۔ فطرت اور اس کے بارے میں ہمارا بہترین علم پکار رہا ہے کہ بے شک اس دنیا کا ایک خدا ہے، اس کے بغیر ہم کائنات کو اور اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتے۔

کائنات کی موجودگی، اسکے اندر حیرت انگیز تنظیم اور اس کی انتہا معنویت کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی کہ اس کو کسی نے بنایا ہے اور یہ بنانے والا ایک لامحدود ذہن ہے، نہ کہ کوئی اندھی طاقت۔

ا۔ فلسفیوں میں سے ایک گروہ، نہایت مختصر گروہ، ایسا ہے جو کسی قسم کے وجود ہی میں شک کرتا ہے۔ اس کے نزدیک نہ یہاں کوئی انسان ہے اور نہ کوئی کائنات، بس ایک عدم محض ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر اس نقطہ نظر کو صحیح مان لیا جائے تو یقیناً خدا کا وجود مشتبہ ہو جاتا ہے، لیکن جیسے ہی ہم کائنات کو مانتے ہیں، ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔۔۔ کیونکہ عدم سے وجود کا پیدا ہونا ایک ناقابل قیاس بات ہے۔

جہاں تک اس مخصوص قسم کی تشکیک اور لاادریت کا تعلق ہے، وہ ایک فلسفیانہ نکتہ تو ہو سکتا ہے مگر اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارا سوچنا خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی وجود ہے۔ جب راستہ چلتے ہوئے کسی پتھر سے ٹکراتے ہیں اور ہمیں تکلیف ستانے لگتی ہے تو یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارے باہر کوئی دنیا ہے جس کا اپنا وجود ہے۔ اسی طرح ہمارا ذہن اور ہمارے تمام حواس ہر آن بے شمار چیزوں کو محسوس کرتے ہیں اور یہ علم واحساس ہر شخص کے لئے اس بات کا ایک ذاتی ثبوت ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جو واقعی طور پر اپنا وجود رکھتی ہے۔ اب اگر کسی کا فلسفیانہ تفکر اس کے لئے دنیا کے وجود کو مشتبہ کر دیتا ہے تو یہ ایک ایسی مستثنیٰ حالت ہے جو کروروں انسانوں کے تجربات سے غیر متعلق ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی مخصوص قسم کی ذہنی فضا میں گم ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا ہے۔

اگرچہ کائنات کا موجود نہ ہونا بذات خود اس بات کا کوئی لازمی ثبوت نہیں ہے کہ خدا بھی موجود نہ ہو، تاہم اپنی انتہائی

انویت کے باوجود یہی ایک نقطہ نظر ہے جس کے لئے خدا کا وجود مشتبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ نقطہ نظر خود اتنا بے معنی ہے کہ آج تک نہ تو عام انسانوں کے لئے وہ قابلِ فہم ہو سکا اور نہ علمی دنیا میں اس کو قبولِ عام حاصل ہوا ہے۔ عام انسان اور عام اہلِ علم بہر حال اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک وجود ہے اور کائنات بھی اپنا ایک وجود رکھتی ہے۔ سارے علوم اور زندگی کی تمام سرگرمیاں اسی علم ویقین کی بنیاد پر قائم ہیں۔

پھر جب ایک کائنات ہے تو لازماً اس کا ایک خدا ہونا چاہیے، یہ بالکل بے معنی بات ہے کہ ہم مخلوق کو مانیں مگر خالق کا وجود تسلیم نہ کریں، ہمیں کسی بھی ایسی چیز کا علم نہیں جو پیدا کئے بغیر وجود میں آ گئی ہو، ہر چھوٹی بڑی چیز لازمی طور پر اپنا ایک سبب رکھتی ہے۔ پھر اتنی بڑی کائنات کے بارے میں کیسے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ یونہی وجود میں آ گئی، اس کا کوئی خالق نہیں۔

جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) نے اپنی آٹو بایو گرافی میں لکھا ہے کہ میرے باپ نے مجھے یہ سبق دیا کہ یہ سوال کہ کس نے مجھے پیدا کیا (Who made me) خدا کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد فوراً دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا (Who made God) چنانچہ برٹرینڈ رسل نے بھی اسی اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے محرک اول کے استدلال کو رد کر دیا ہے:

(The age of analysis by Morton White, p.21 - 22)

یہ منکرین خدا کا بہت پرانا استدلال ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا اگر کوئی خالق مانیں تو اس خالق کو لازمی طور پر ازلی ماننا پڑے گا، پھر جب خدا کو ازلی ماننا ہے تو کیوں نہ کائنات ہی کو ازلی مان لیا جائے۔ اگرچہ یہ بالکل بے معنی بات ہے کیونکہ کائنات کی کوئی ایسی صفت ہمارے علم میں نہیں آئی ہے جس کی بنا پر اس کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے۔۔۔ تاہم انیسویں صدی تک منکرین کی اس دلیل میں ایک ظاہر فریب حسن ضرور موجود تھا، مگر اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون (Second law of thermo by Anmics) کے انکشاف کے بعد تو یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔

یہ قانون جسے ضابطہ ناکارگی (Law of entropy) کہا جاتا ہے، ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی، ضابطہ ناکارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل باحرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ مگر اس چکر کو الٹا چلایا نہیں جا سکتا کہ خود بخود یہ حرارت، کم حرارت وجود سے زیادہ حرارت کے وجود میں منتقل ہونے لگے۔ ناکارگی، دستیاب توانائی (Available energy) اور غیر دستیاب توانائی (Unavailable energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے اور اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آنا مقدر ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کار آمد توانائی باقی نہ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبعی عمل کا خاتمہ ہو جائے گا اور زندگی بھی اسی کے ساتھ ختم ہو جائے گی، لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ کیمیائی اور طبعی عمل جاری اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے ورنہ اخراج حرارت کے لازمی قانون کی وجہ سے اس کی توانائی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔

اس جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی عالم حیوانات ایڈورڈ لوتھر کیسل (Edward Luther Kessel) لکھتا ہے:

"اس طرح غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز (Beginning) رکھتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے کیونکہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہو وہ اپنے آپ شروع نہیں ہو سکتی، یقیناً وہ ایک محرک اول، ایک خالق، ایک خدا کی محتاج ہے۔"

(The evidence of God P 51)

یہی بات سر جیمز جینز نے ان الفاظ میں کہی ہے

"موجودہ سائنس کا یہ خیال ہے کہ کائنات میں حرارت کا عمل (Entropy) ہمیشہ جاری رہے گا، یہاں تک کہ اس کی توانائی بالکل ختم ہو جائے۔ یہ حرارت ابھی اپنے آخری درجہ کو نہیں پہنچی ہے، اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو ہم اس کے متعلق سوچنے کے لئے موجود نہ ہوتے، یہ حرارت اس وقت بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور اس بنا پر اس کا ایک آغاز ہونا ضروری ہے، کائنات میں لازماً اس قسم کا کوئی عمل ہوا ہے، جس کو ہم ایک وقت خاص میں تخلیق (Creation At a time) کہہ سکتے ہیں، نہ یہ کہ وہ لا متناہی مدت سے موجود ہے۔"

(The Mysterious Universe, P 133)

اس طرح کے اور بھی طبیعیاتی شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے، بلکہ وہ ایک محدود عمر رکھتی ہے، مثلاً فلکیات کا یہ مشاہدہ ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے، تمام کہکشائیں اور فلکیاتی اجسام مشاہدہ میں نہایت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال کی اس وقت نہایت عمدہ توجیہ ہو جاتی ہے۔ جب ہم ایک ایسے ابتدائی وقت کو تسلیم کر لیں، جب تمام اجزائے ترکیبی مجتمع اور مرکوز حالت میں تھے اور اس کے بعد ان میں حرارت و توانائی کا آغاز ہوا۔ اس طرح کے مختلف قرائن کی بنا پر عام اندازہ یہ ہے کہ لگ بھگ پچاس کھرب سال پہلے ایک غیر معمولی دھماکے سے یہ سارا عالم وجود میں آیا۔ اب سائنس کی اس دریافت کو ماننا کہ کائنات محدود عمر رکھتی ہے اور اس کے موجد کو نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ تو تسلیم کرے کہ تاج محل ہمیشہ سے موجود نہیں تھا بلکہ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں بنا، مگر اس کے باوجود اس کا کوئی معمار اور انجینئر تسلیم نہ کرے اور کہے کہ وہ بس اپنے آپ ایک مخصوص تاریخ کو بن کر کھڑا ہو گیا۔

۲۔ فلکیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں، شاید اسی قدر آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے۔ ان میں کچھ ستارے ایسے ہیں جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں، مگر بیشتر ستارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جا سکتی ہیں اور بعض ستارے تو اس قدر بڑے ہیں کہ اربوں زمینیں ان کے اندر آ سکتی ہیں۔ یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی ممکن حد تک تیز اڑنے والا ہوائی جہاز جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہو، وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے پھر اتنی وسعت کے باوجود یہ کائنات ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ ہر لحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر ۱۳۰ کروڑ سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار ہوائی جہاز بھی کائنات کا چکر کبھی پورا نہیں کر سکتا، وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا۔(۱)

آسمان گرد و غبار سے پاک ہو تو پانچ ہزار ستارے خالی آنکھ سے دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن معمولی دوربینوں کی مدد سے یہ تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے، اور وقت کی سب سے بڑی دوربین جو ماؤنٹ پیلومر پر لگی ہوئی ہے، اس سے اربوں ستارے نظر آتے ہیں، مگر یہ تعداد اصل تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ کائنات ایک بے انتہا وسیع خلا ہے، جس میں لاتعداد ستارے غیر معمولی رفتار سے مسلسل حرکت کر رہے ہیں، کچھ ستارے تنہا سفر کر رہے ہیں، کوئی دو یا زیادہ ستاروں کے مجموعوں کی شکل میں ہیں اور بے شمار ستارے ایسے ہیں جو مجامع النجوم کی صورت میں متحرک ہیں۔ روشن دان سے کمرے میں آنے والی روشنی کے اندر آپ نے بے شمار ذرے ادھر ادھر دوڑتے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ اسی کو اگر آپ بہت بڑے پیمانے پر قیاس کریں تو کائنات کے اندر ستاروں کی گردش کا آپ ہلکا سا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ذرے باہم ٹکراتے ہوئے حرکت کرتے ہیں اور ستارے تعداد کی اس کثرت کے باوجود بالکل یکہ و تنہا دوسرے ستاروں سے بے اندازہ فاصلے پر سفر کر رہے ہیں، جیسے وسیع سمندروں میں چند جہاز جو ایک دوسرے سے اتنی دوری پر چل رہے ہوں کہ انہیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو۔

یہ ساری کائنات ستاروں کے بے شمار جھرمٹوں کی صورت میں ہے، ہر جھرمٹ کو کہکشاں کہتے ہیں اور یہ سب کے سب مسلسل حرکت میں ہیں، سب سے قریبی حرکت جس سے ہم واقف ہیں، وہ چاند ہے، چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور رہ کر اس کے گرد مسلسل اس طرح گھوم رہا ہے کہ ہر ساڑھے انتیس دن میں زمین کے گرد اس کا ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری زمین جو سورج سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے، وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہوئی سورج کے گرد انیس کروڑ میل کا دائرہ بناتی ہے جو ایک سال میں پورا ہوتا ہے، اسی طرح زمین سمیت نو سیارے ہیں اور وہ سب کے سب سورج کے گرد مسلسل دوڑ رہے ہیں، ان سیاروں میں بعید ترین سیارہ پلوٹو ہے جو ساڑھے سات ارب میل کے دائرہ میں چکر لگا رہا ہے۔ یہ تمام سیارے اپنے سفر میں اس طرح مصروف ہیں کہ ان کے گرد اکتیس چاند بھی اپنے اپنے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان کے علاوہ تیس ہزار چھوٹے سیاروں (Asteroids) کا ایک حلقہ، ہزاروں دم دار ستارے اور لاتعداد شہاب ثاقب ہیں جو اسی طرح گردش میں مصروف ہیں۔ ان سب کے بیچ میں وہ ستارہ ہے جس کو ہم سورج کہتے ہیں اور جس کا قطر آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے اور وہ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

یہ سورج خود بھی رکا ہوا نہیں ہے بلکہ اپنے تمام سیاروں اور سیارچوں کو لئے ہوئے ایک عظیم کہکشانی نظام کے اندر چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہا ہے۔ اسی طرح ہزاروں حرکت کرتے ہوئے نظام ہیں، جن سے مل کر ایک کہکشاں وجود میں آتی ہے۔ کہکشاں گویا ایک بہت بڑی پلیٹ ہے جس پر بے شمار ستارے منفرداً اور مجتمعاً لٹوؤں کی طرح مسلسل گھوم رہے ہیں۔ پھر یہ کہکشائیں خود بھی حرکت کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ قریبی کہکشاں جس میں ہمارا شمسی نظام واقع ہے، وہ اپنے محور پر اس طرح گردش کر رہی ہے کہ اس کا ایک دور بیس کرور سال میں پورا ہوتا ہے۔

علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات پانچ سو ملین (ایک ملین برابر دس لاکھ) کہکشاؤں پر مشتمل ہے اور ہر کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یا اس سے کم و بیش ستارے پائے جاتے ہیں۔ قریبی کہکشاں جس کے ایک حصے کو ہم رات کے وقت سفید دھاری کی شکل میں دیکھتے ہیں، اس کا رقبہ ایک لاکھ سال نور ہے۔ ہم زمین کے رہنے والے کہکشاں کے مرکز سے

تمیں ہزار نوری سال کے بقدر دور ہیں۔ مجرہ کہکشاں ایک اور بڑی کہکشاں کا جزو ہے، جس میں اسی طرح کی سترہ کہکشائیں حرکت کر رہی ہیں، پورے مجموعہ کا قطر بیس لاکھ سال نور ہے۔

ان تمام گردشوں کے ساتھ ایک اور حرکت جاری ہے، اور وہ یہ کہ ساری کائنات غبارے کی طرح چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ ہمارا سورج ہیبت ناک تیزی کے ساتھ چکر کھاتا گھومتا ہوا بارہ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اپنی کہکشاں کے بیرونی حاشیے کی طرف مسلسل بھاگ رہا ہے اور اپنے نظام شمسی کے تمام توابع کو بھی لئے جا رہا ہے۔ اسی طرح تمام ستارے اپنی گردش کو قائم رکھتے ہوئے کسی نہ کسی طرف کو بھاگ رہے ہیں۔ کسی کے بھاگنے کی رفتار آٹھ میل فی سیکنڈ ہے، کسی کی ۳۳ میل فی سیکنڈ کسی کی ۸۴ میل فی سیکنڈ۔ اسی طرح تمام ستارے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ دور بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

یہ ساری حرکت حیرت انگیز طور پر نہایت تنظیم اور باقاعدگی کے ساتھ ہو رہی ہے، نہ ان میں باہم کوئی ٹکراؤ ہوتا اور نہ رفتار میں کوئی فرق پڑتا، زمین کی حرکت سورج کے گرد بر درجہ منضبط ہے، اسی طرح اپنے محور کے اوپر اس کی گردش اتنی صحیح ہے کہ صدی کے اندر بھی اس میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آنے پاتا، زمین کا سیارہ جس کو چاند کہتے ہیں اس کی گردش بھی پوری طرح مقرر ہے، اس میں جو تھوڑا سا فرق ہوتا ہے وہ بھی ہر ساڑھے اٹھارہ سال کے بعد نہایت صحت کے ساتھ دہرا دیا جاتا ہے۔ یہی تمام اجرام سماوی کا حال ہے، حتی کہ ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق اکثر خلائی گردش کے دوران ایک پورا کہکشانی نظام۔ جو اربوں متحرک ستاروں پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرے کہکشانی نظام میں حرکت کرتا ہوا داخل ہوتا ہے اور پھر اس سے نکل جاتا ہے۔ مگر باہم کسی قسم کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ اس عظیم اور حیرت انگیز تنظیم کو دیکھ کر عقل کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے آپ نہیں قائم ہے بلکہ کوئی غیر معمولی طاقت ہے جس نے اس اتھاہ نظام کو قائم رکھا ہے۔

یہی ضبط و نظم جو بڑی بڑی دنیاؤں کے درمیان نظر آتا ہے، وہی چھوٹی دنیاؤں میں بھی انتہائی مکمل شکل میں موجود ہے، اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے چھوٹی دنیا ایٹم ہے، ایٹم اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ کسی بھی خوردبین سے نظر نہیں آتا، حالانکہ جدید خوردبین کسی چیز کو لاکھوں گنا بڑھا کر دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایٹم کی حقیقت انسانی قوت بصارت کے اعتبار سے "لاشے" سے زیادہ نہیں۔ مگر اس انتہائی چھوٹے ذرے کے اندر حیرت انگیز طور پر ہمارے شمسی نظام کی طرح ایک زبردست گردشی نظام موجود ہے۔ ایٹم برق پاروں کے ایک مجموعے کا نام ہے۔ مگر یہ برق پارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان ایک طویل خلائی حجم ہوتا ہے۔ سیسہ کا ایک ٹکڑا جس میں ایٹمی ذرات کافی سختی اور مضبوطی کے ساتھ آپس میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہ برق پارے حجم کے سو کروڑ حصوں میں سے ایک حصہ بھی مشکل سے گھیرتے ہیں، بقیہ حصے بالکل خالی ہوتے ہیں، اگر الیکٹران اور پروٹون کی دو ٹکڑوں کی حیثیت سے تصویر بنائی جائے تو دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۳۵۰ گز ہو سکتا ہے یا ایٹم کا تصور گرد کے ایک غیر مرئی ذرہ کی حیثیت سے کیا جا سکے تو الیکٹران کی گردش سے جو حجم بنتا ہے اس کی مقدار ایک ایسے فٹ بال کی سی ہو سکتی ہے جس کا قطر آٹھ فٹ ہو۔

ایٹم کے منفی برق پارے جو الیکٹران کہلاتے ہیں، وہ مثبت برق پارے کے گرد گھومتے ہیں جن کو پروٹون کہا جاتا ہے، یہ برقیے، جو روشنی کی کرن کے ایک موہوم نقطہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے، اپنے مرکز کے گرد اسی طرح گردش کرتے

ہیں جیسے زمین اپنے مدار پر سورج کے گرد گردش کرتی ہے اور یہ گردش اتنی تیز ہوتی ہے کہ الیکٹران کا کسی ایک جگہ تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ پورے مدار پر ایک ہی وقت میں ہر جگہ موجود ہے، وہ اپنے مدار پر ایک سیکنڈ میں ہزاروں ارب چکر لگا لیتا ہے۔

یہ ناقابل قیاس اور ناقابل مشاہدہ تنظیم اگر سائنس کے قیاس میں اس لئے آجاتی ہے کہ اس کے بغیر ایٹم کے عمل کی توجیہ نہیں کی جا سکتی تو ٹھیک اسی دلیل سے آخر ایک ایسے ناظم کا تصور کیوں نہیں کیا جا سکتا جس کے بغیر ایٹم کی اس تنظیم کا برپا ہونا محال ہے۔

ٹیلی فون کی لائن میں تاروں کا پیچیدہ نظام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے ہم کو تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ لندن سے میورن کے لئے ایک کال چند منٹ میں مکمل ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں ایک اور مواصلاتی نظام ہے جو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ یہ ہمارا اپنا عصبی نظام (Nervous system) ہے، جو قدرت نے قائم کر رکھا ہے۔ اس مواصلاتی نظام پر رات دن کروڑوں خبریں ادھر سے ادھر دوڑتی رہتی ہیں جو دل کو بتاتی ہیں کہ وہ کب دھڑکے، مختلف اعضاء کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں، پھیپھڑے سے کہتی ہیں کہ وہ کیسے اپنا عمل کرے، اگر جسم کے اندر یہ مواصلاتی نظام نہ ہو تو ہمارا پورا وجود منتشر چیزوں کا مجموعہ بن جائے جن میں سے ہر ایک الگ الگ اپنے راستے پر چل رہا ہو۔

اس مواصلاتی نظام کا مرکز انسان کا بھیجا ہے، آپ کے بھیجے کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خانے (Nerve cells) ہیں، ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو عصبی ریشے (Nerve fibers) کہتے ہیں، ان پتلے ریشوں پر خبر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے۔ انہیں اعصاب کے ذریعہ ہم چکھتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اور سارا عمل کرتے ہیں۔ زبان میں تین ہزار ذائقے خانے (Taste Buds) ہیں جن میں ہر ایک اپنے علیحدہ عصبی تار کے ذریعہ دماغ سے جڑا ہوا ہے۔ انہیں کے ذریعہ وہ ہر قسم کے مزوں کو محسوس کرتا ہے، کان میں ایک لاکھ کی تعداد میں سامعی خانے ہوتے ہیں۔ انہیں خانوں سے ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعہ ہمارا دماغ سنتا ہے۔ ہر آنکھ میں ۱۳۰ ملین (Light Receptors) ہوتے ہیں جو تصویری مجموعے دماغ کو بھیجتے ہیں۔ ہماری تمام جلد میں حیاتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً ۳۰ ہزار "گرم خانے" اس کو محسوس کرکے فوراً دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں، اسی طرح جلد میں دو لاکھ پچاس ہزار خانے ایسے ہیں جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے ہیں۔ جب کوئی سرد چیز جسم سے ملتی ہے تو دماغ اس کی خبروں سے بھر جاتا ہے۔ جسم کانپنے لگتا ہے، جلد کی رگیں پھیل جاتی ہیں، فوراً خون ان رگوں میں دوڑ کر آتا ہے تاکہ زیادہ گرمی پہنچائی جا سکے۔ اگر ہم شدید گرمی سے دوچار ہوں تو گرمی کے مخبرین دماغ کو اطلاع کرتے ہیں اور تین ملین پسینہ کے غدود (Glands) ایک ٹھنڈا عرق خارج کرنا شروع کرتے ہیں۔

عصبی نظام کی کئی تقسیمیں ہیں۔ ان میں سے ایک (Autonomic Branch) ہے، یہ ایسے افعال انجام دیتی ہے جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ہضم، سانس لینا اور دل کی حرکت وغیرہ، پھر اس عصبی شاخ کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک کا نام مشارک نظام (Sympathetic System) جو کہ حرکت پیدا کرتا ہے اور دوسرا

(Parasympathetic) ہے جو روک کا کام کرتا ہے۔ اگر جسم تمام تر پہلے کے قابو میں چلا جائے تو مثال کے طور پر دل کی حرکت اتنی تیز ہو جائے کہ موت آ جائے اور اگر بالکل دوسرے کا قبضہ ہو جائے تو دل کی حرکت ہی رک جائے۔ دونوں شاخیں نہایت صحت کے ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتی ہیں، جب بھاگنے کے وقت فوری طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو (Sympathetic) کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے، دل اور پھیپھڑے تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح نیند کے وقت (Parasympathetic) کا غلبہ ہوتا ہے جبکہ وہ تمام جسمانی حرکتوں پر سکوت طاری کر دیتا ہے۔

اس طرح کے بے شمار پہلو ہیں اور اسی طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک زبردست نظام قائم ہے جس کے سامنے انسانی مشینوں کا بہتر سے بہتر نظام بھی مات ہے۔ اب تو قدرت کی نقل سائنس کا ایک مستقل موضوع بن چکا ہے، اس سے پہلے سائنس کا میدان صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ فطرت میں جو طاقتیں چھپی ہوئی ہیں ان کو دریافت کر کے استعمال کیا جائے، مگر اب قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کی میکانکی نقل کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس طرح ایک نیا علم وجود میں آیا ہے جس کو بایونکس (Bionics) کہتے ہیں، بایونکس، حیاتیاتی نظام (Biological Systems) اور طریقوں کا اس غرض سے مطالعہ کرتی ہے کہ جو معلومات حاصل ہوں انہیں انجینئرنگ کے مسائل حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔

قدرت کی نقل کرنے کی اس قسم کی مثالیں ٹکنالوجی میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کیمرہ دراصل بنیادی طور پر آنکھ کی میکانکی کی نقل ہے، کیمرے کا لنس (Lens) آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ ہے، ڈائفرام (Diaphragm) پردہ شبکی (Iris) ہے، روشنی سے متاثر ہونے والی فلم آنکھ کا پردہ ہے جس میں عکس دیکھنے کے لئے ڈورے اور مخروطی شکلیں ہوتی ہیں۔(۲) ماسکو یونیورسٹی میں زیر صوتی ارتعاش (Infrasonic Vibrations) معلوم کرنے اور اس کی پیمائش کرنے کا ایک نمونے کا آلہ تیار کیا گیا ہے جو طوفان کی آمد کی اطلاع ۱۲ سے ۱۵ گھنٹے پہلے تک دے دیتا ہے۔ یہ مروجہ آلوں سے پانچ گنا زیادہ طاقتور ہے، اس کا خیال کس نے پیدا کیا؟ جیلی مچھلی (Jelly Fish) نے، انجینئروں نے اس کے اعضاء کی نقل کی، جو زیر صوتی ارتعاش محسوس کرنے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔

(Soviet Land, Dec. 1963)

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، طبیعیاتی سائنس اور ٹکنالوجی درحقیقت نئے تصورات کی نقل قدرت کے زندہ نمونوں سے حاصل کرتی ہے۔ بہت سے مسائل جو سائنس دانوں کے تخیل پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، قدرت ان کو مدتوں پہلے حل کر چکی ہے۔ پھر جس طرح کیمرہ اور ٹیلی پرنٹر کا ایک نظام انسانی ذہن کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا، اسی طرح یہ بھی ناقابل تصور ہے کہ کائنات کا پیچیدہ ترین نظام کسی ذہن کے بغیر اپنے آپ قائم ہو۔ کائنات کی تنظیم قدرتی طور پر ایک انجینئر اور ایک ناظم کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی کا نام خدا ہے، ہم کو جو ذہن ملا ہے، وہ ناظم کے بغیر تنظیم کا تصور نہیں کر سکتا، اس لئے غیر معقول بات یہ نہیں ہے کہ ہم کائناتی تنظیم کے لئے ایک ناظم کا اقرار کریں، بلکہ یہ غیر معقول رویہ ہوگا کہ ہم اس تنظیم کے ناظم کو ماننے سے انکار کر دیں، حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذہن کے پاس خدا سے انکار کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔

۳۔ کائنات کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے مانند نہیں ہے بلکہ اس کے اندر حیرت انگیز معنویت ہے۔ یہ واقعہ صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق و تدبیر میں کوئی ذہن کام کر رہا ہے، ذہنی عمل کے بغیر کسی چیز میں ایسی معنویت پیدا

نہیں ہو سکتی۔ محض اندھے مادی عمل سے اتفاقی طور پر وجود میں آ جانے والی کائنات میں تسلسل نظم اور معنویت کے پائے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ کائنات اس قدر حیرت انگیز طور پر موزوں اور مناسب حال ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ یہ مناسبت اور موزونیت خود بخود محض اتفاقاً واقعہ میں آ گئی ہو۔۔۔ چاڈ واش (Chadvalsh) کے الفاظ ہیں:

"ایک شخص، خواہ وہ خدا کا اقرار کرنے والا ہو یا اس کا منکر ہو، جائز طور پر اس سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ دکھائے کہ اتفاق کا توازن اس کے حق میں کس طرح ہو جاتا ہے"۔(۳)

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لئے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہو جائیں، اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ مگر اس کے باوجود وہ ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے، کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں، جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجئے، اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی مثلاً کرۂ زمین، اگر چاند جتنا چھوٹا ہوتا، یعنی اس کا قطر موجودہ قطر کی نسبت سے ۱/۴ ہوتا تو اس کی کشش ثقل، زمین کی موجودہ کشش کا ۱/۶ رہ جاتی، کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری دنیا پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی، جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے، چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے، اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے، ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہو جاتا ہے، دن کے وقت تنور کے مانند جلنے لگتا ہے، اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، اسی بنا پر ایک سائنس داں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ (Great Balance Wheel)(۳) کا نام دیا ہے، ہوا کا موجودہ غلاف اگر فضا میں کم ہو جاتا تو اس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا۔ اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی، کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی، اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہو جاتا جس کا رد عمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتا۔ اگر زمین سورج کے اتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی۔ ہوا کے غلاف کی تمازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا۔ اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشوونما ممکن نہ رہتا، ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو جاتا انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہو جاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہو جاتی، کیونکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس سے نیچے کی طرف لٹکے ہوئے ہیں، زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے، جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں، ہم لوگ جو ہندوستان کی زمین پر ہیں تو امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے، امریکہ میں کھڑا ہو تو ہندوستان اس کے نیچے ہوگا، پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے، ایسی حالت میں زمین کی ہر چیز کو اچھل جانا چاہئے، جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیے کو تیزی سے گھمایا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں، زمین کے اندر ایک غیر معمولی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے، اسی دو طرفہ عمل نے ہم کو زمین کے اوپر چاروں طرف ٹھہرا رکھا ہے، ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑتا ہے وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے۔ یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ، آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا، کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے، دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے، اس لئے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا۔۔۔ جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے، اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں، اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا، وائٹ ہڈ (A. N. Whitehead) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے

"نیوٹن نے یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے تو وہ ہم کو توجیہ نہیں دے سکتی، ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا، تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں جبکہ مردہ کائنات میں کسی مقصدیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا"۔

(The Age of Analysis, P 85)

وائٹ ہڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحبِ شعور کے زیرِ اہتمام نہیں ہے، تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے، یا یوں کہیے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے۔ فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے۔ گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دے گا اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا۔ سورج جو اس وقت ہمارے لئے زندگی کا سرچشمہ ہے اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے۔ زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے، مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آ جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے۔ اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہو جائے تو اتنی

ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہو گی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آ جائے۔ مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے۔ یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے، اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آباد کاری کے قابل ہو گیا ہے، مختلف قسم کے نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا، سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان، اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا۔ اگر سائنس دانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداً زمین کا درجہ حرارت وہی رہا ہو گا جو سورج کا ہے۔ یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجہ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آ جائے، اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا، اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ غالباً ایک ملین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی۔ زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا ایک بڑا حصہ خلا میں چلا گیا۔ ایک حصہ نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی۔ ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا۔ ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزو آکسیجن اور نائٹروجن ہے یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصہ ہے۔۔۔ کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار بہت زیادہ ہوتی۔ دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا، یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشوونما پا سکے۔

زمین کی اوپری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا، جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے، اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں۔ اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہ زمین کے ہر حصے میں گرتے، یہ شہابیے چھ سے چالیس میل تک فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر ملبے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے۔ شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی۔ مگر ہوائی کرہ اپنی نہایت موزوں دبازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھاڑ سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیائی اہمیت رکھنے والی شعاعیں (Actinic rays) اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہنچتی ہیں۔ جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لئے ضرورت ہے جس سے مضر بیکٹیریا مر سکتے ہیں جس سے

وٹامن تیار ہو سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

گیس کا اس طرح ٹھیک ہماری ضرورت کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چند گیسوں کا مجموعہ ہے جس میں تقریباً ۷۸ فیصدی نائٹروجن اور ۲۱ فیصدی آکسیجن ہے، باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں۔ اس فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ فی مربع انچ ہے۔ موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہے، وہ دنیا کے تمام پانی کا ۱۰/۸ حصہ بناتا ہے۔ آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لئے سانس لینے کا ذریعہ ہے، اس مقصد کے لئے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہونے سے بچیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لئے ضروری تھی، مثال کے طور پر آکسیجن اگر ۲۱ فیصدی کے بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جز ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا۔ اسی طرح اگر اس کا تناسب گھٹ کر دس فیصدی رہتا تو ممکن ہے زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر زندگی قائم ہے، اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں۔ ایک عالم طبیعیات کے الفاظ ہیں

"Science has no explanation to offer for the facts, and to say it is accidental is to defy methematics" (P 33)

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہ کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔ ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (Density) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بقائے حیات کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے۔ دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کی تہ میں بیٹھ نہیں جاتا، ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے، یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے۔ اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں۔ اس کے بعد جونہی موسم آتا ہے برف فوراً پگھل جاتا ہے۔ اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ امریکہ میں انڈوتھیا (Endothia) نام کی بیماری شاہ بلوط

(Chestnut) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا "یہ شگاف اب پُر نہیں ہوں گے"۔ امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا، اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد کے لئے خاص تھے، یہاں تک کہ ۱۹۰۰ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا، مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پر ہو گئے، کچھ دوسرے درخت (Tulip trees) اپنی نشوونما کے لئے شاید انہیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے۔ شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی ساجزو تھے اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے، لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا، کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں۔ یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں۔ اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تختوں کے کام آسکتی ہے، ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے، ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لئے بوئی گئی آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی۔ وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی۔ کھیتوں کو ویران کر دیا اور زراعت کو ناممکن بنا دیا۔ کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی۔ ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لئے نکلے۔ یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا۔ اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی۔ وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا۔ آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابل تسخیر فوج پر قابو پا لیا اور اب وہاں سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو گیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط و توازن (Checks and balances) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آ جاتی ہیں؟

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی قطعیت پائی جاتی ہے۔ یہ جامد و بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے۔ "پانی" کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطے میں اور جس وقت بھی بولا جائے اس کا ایک ہی مطلب ہوگا — ایک ایسا مرکب جس میں ۱۱ء۱ فیصد ہائیڈروجن اور ۸۸،۹ فیصد آکسیجن۔ ایک سائنس دان جب تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطہ جوش ۱۰۰ درجہ سینٹی گریڈ ہے۔ جب تک ہوا کا دباؤ (Atmospheric Pressure) ۷۶۰ ایم ایم رہے۔ اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لئے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے۔ اس طرح نقطہ جوش سو درجہ سے کم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر ہوا کا دباؤ ۷۶۰ ایم ایم سے زیادہ ہو تو نقطہ جوش بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو جائے گا۔ یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے

کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جا سکتا ہے کہ پانی کا نقطہ جوش کیا ہے۔ مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لئے کوئی بنیاد نہ ہوتی، کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعیات کے لئے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریق عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نووارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے وہ عناصر میں نظم اور دوریت ہے۔ ۱۰۰ سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (Mendeleev) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا جس کو دوری نقشہ (Penodic chart) کہا جاتا ہے۔ اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے اس کے نقشہ میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے جو ان کے اندازے کے مطابق بعد کو پر ہوگئے۔ ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کئے جاتے ہیں۔ جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں (Protons) کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے۔ یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے، ہیلیم میں دو اور لیتھیم میں تین۔ مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لئے ممکن ہو سکا ہے کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے۔ نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ عنصر نمبر ۱۰۱ کی شناخت محض اس کے ۷ا پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی۔ قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق (Penodic chance) نہیں کہتے بلکہ اس کو دوری ضابطہ (Penodic law) کہتے ہیں، مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کرے گی۔

"۱۱ اگست ۱۹۹۹ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا جو کارنوال (Comwall) میں مکمل طور پر دیکھا جا سکے گا"—— یہ محض ایک قیاسی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے۔ جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں۔ وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جائے وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک فقید المثال نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔ ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریہ کشش فلکیاتی کروں کی گردش کی توجیہ کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں (A.C. Adams) اور لاویرے (U. Leverrier) کو وہ بنیاد ملی جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کر سکیں جو اس وقت تک نامعلوم تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۸۴۶ء کی ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے جس کو ہم اب نیپچون (Neptune) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ کائنات میں یہ ریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہو گئی ہو۔ کائنات کی حکمت و معنویت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے اندر ایسے امکانات رکھے گئے ہیں کہ انسان بوقت ضرورت تصرف کر کے اس کو اپنے لئے استعمال کر سکے۔ مثال کے طور پر نائٹروجن کے مسئلہ کو لیجئے۔ ہوا کے ہر جھونکے میں نائٹروجن ۷۸ فی صد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے کیمیائی اجزا ہیں۔ جن میں نائٹروجن شامل ہوتا ہے۔ ان کو ہم مرکب نائٹروجن کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ نائٹروجن ہے جس کو پودے استعمال کرتے ہیں اور جن سے ہماری غذا کا نائٹروجنی حصہ تیار ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان اور جانور بھوکوں مر جائیں۔

صرف دو طریقے ہیں جن سے قابل تحلیل نائٹروجن مٹی میں مل کر کھاد بنتا ہے۔ اگر یہ نائٹروجن مٹی میں شامل نہ ہو تو کوئی بھی غذائی پودا نہ اُگے۔ ایک طریقہ جس سے یہ نائٹروجن مٹی میں شامل ہوتا ہے وہ مخصوص بیکٹیریائی عمل ہے۔ یہ بیکٹیریا والے پودوں کی جڑوں میں رہتے ہیں اور ہوا سے نائٹروجن لے کر اس کو مرکب نائٹروجن کی شکل دیتے رہتے ہیں۔ پودا جب سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے تو اس مرکب نائٹروجن کا کچھ حصہ زمین میں رہ جاتا ہے۔

دوسرا ذریعہ جس سے مٹی کو نائٹروجن ملتا ہے۔ وہ بجلی کا کڑکا ہے۔ ہر بار جب بجلی کی رو فضا میں گزرتی ہے تو وہ تھوڑے سے آکسیجن کو نائٹروجن کے ساتھ مرکب کر دیتی ہے جو کہ بارش کے ذریعہ ہمارے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح سے نائٹریٹ نائٹروجن آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس کا اندازہ سالانہ ایک ایکڑ زمین میں پانچ پونڈ ہے جو کہ تیس پونڈ سوڈیم نائٹریٹ کے برابر ہے۔(۱)

یہ دونوں طریقے بہرحال ناکافی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کھیت جن میں عرصہ دراز تک کھیتی ہوتی رہتی ہے ان کا نائٹروجن ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کاشتکار فصلوں کا الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک ایسے مرحلے میں جبکہ اضافہ آبادی اور کثرت کاشت کی وجہ سے مرکب نائٹروجن کی کمی محسوس کی جانے لگی تھی، انسان کو مستقبل میں قحط کے آثار نظر آنے لگے تھے، یہ صرف اس صدی کے آغاز کی بات ہے کہ عین اس وقت وہ طریقہ دریافت ہو گیا جس سے ہوا کے ذریعہ مصنوعی طور پر مرکب نائٹروجن بنایا جا سکتا ہے۔ مرکب نائٹروجن بنانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ فضا میں مصنوعی طور پر بجلی کا کڑکا پیدا کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہوا میں بجلی کی چمک پیدا کرنے کے لئے تقریباً تین لاکھ ہارس پاور کی قوت استعمال کی گئی۔ اور جیسا کہ پہلے سے اندازہ کیا جا چکا تھا ایک قلیل مقدار نائٹروجن تیار ہو گئی مگر اب انسان کی خداداد عقل نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور انسانی تاریخ کے دس ہزار سال بعد ایسے طریقے معلوم کر لئے گئے ہیں جن سے وہ اس گیس کو کھاد میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کے بعد انسان اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی غذا کے اس لازمی جزو کو تیار کر سکے جس کے بغیر وہ بھوکوں مر جاتا۔ یہ نہایت عجیب "حسن اتفاق" ہے کہ زمین کی تاریخ میں پہلی بار عین وقت پر انسان نے قلت خوراک کا حل دریافت کر لیا۔ یہ المیہ ٹھیک اس وقت رفع ہو گیا جب کہ اس کے واقع ہونے کا امکان تھا۔

کائنات میں اس طرح کی حکمت و معنویت کے بے شمار پہلو ہیں۔ ہماری تمام سائنسوں نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ جو کچھ ہم نے معلوم کیا ہے، اس سے بہت زیادہ ہے وہ چیز جس کو معلوم کرنا ابھی باقی ہے۔ تاہم جو کچھ انسان معلوم کر چکا ہے وہ بھی اتنا زیادہ ہے کہ اس کے صرف عنوانات کی فہرست دینے کے لئے موجودہ کتب سے بہت زیادہ ضخیم کتاب کی ضرورت ہو گی اور

پھر بھی کچھ عنوانات بچ رہیں گے۔ انسان کی زبان سے آلاء رب اور آیات الٰہی کا ہر اظہار ناقص اظہار ہے۔ اسکی جتنی بھی تفصیل کی جائے، جہاں زبان و قلم رکیں گے وہاں یہ احساس ضرور ہو گا کہ ہم نے "بیان" نہیں کیا بلکہ اس کی "تحدید" کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سارے علوم منکشف ہو جائیں اور اس کے بعد سارے انسان اس طرح لکھنے بیٹھ جائیں کہ دنیا کے تمام وسائل ان کے لئے مساعد ہوں، جب بھی کائنات کی حکمتوں کا بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔

وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ۚ (لقمان : ۲۷)

ترجمہ اگر زمین کے تمام درخت قلم ہوں اور موجودہ سمندروں کے ساتھ سات اور سمندر ان کی سیاہی کا کام دیں، جب بھی خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

جس نے بھی کائنات کا کچھ مطالعہ کیا ہے وہ بلا شبہ اعتراف کرے گا کہ کتاب الٰہی کے ان الفاظ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں، وہ صرف ایک موجودہ حقیقت کا سادہ سا اظہار ہے۔

پچھلے صفحات میں کائنات کے حیرت انگیز نظم اور اس کے اندر غیر معمولی حکمت و معنویت کا جو حوالہ دیا گیا ہے، مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اس کی دوسری توجیہ کرتے ہیں۔ اس میں انہیں کسی ناظم و مدبر کا اشارہ نہیں ملتا، بلکہ یہ سب کچھ ان کے نزدیک محض "اتفاق" سے ہو گیا ہے۔ ٹی۔ ایچ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروروں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذ کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپیر کی ایک نظم (Sonnet) نکل آئے۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ کے اندھادھند گردش کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی ہے۔

(The Mysterious Universe, P:3-4)

یہ بات اگرچہ بجائے خود بالکل لغو ہے، کیونکہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے۔ بلاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں۔ مثلاً ہوا کا جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (Pollen) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے، مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک جزوی اور استثنائی واقعہ کی توجیہ کرتا ہے، وہ گلاب کے پورے وجود، کائنات کے اندر ایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی اور سارے نظام عالم سے اس کا حیرت انگیز ربط، ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ "اتفاقی واقعہ" کے لفظ میں ایک جزوی صداقت ہونے کے باوجود کائنات کی توجیہ کے اعتبار سے وہ ایک لغو بات ہے۔ پروفیسر ایڈون (Edwin Conklin) کے الفاظ میں "زندگی کا بذریعہ حادثہ (Accident) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پریس میں دھماکہ ہو جانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہو جانا"۔

(The Evidence of God, P:174)

کہا جاتا ہے کہ "اتفاق" کے حوالے سے کائنات کی توجیہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے بلکہ سر جینز کے الفاظ میں وہ خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق (Purely Mathematical Laws of Chance) پر مبنی ہے۔(۲) ایک مصنف

لکھتا ہے:

"اتفاق" (Chance) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی معلومات ممکن نہیں ہوتیں۔ اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح و غلط میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے۔(۳)

اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہو گیا، پھر یہ بھی فرض کر لیں کہ اس میں عمل اور رد عمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہو گیا۔ اگرچہ ان مفروضات کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔۔۔ جب بھی کائنات کی توجیہ حاصل نہیں ہوتی۔۔۔ کیونکہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفین مذاہب کی راہ میں حائل ہو گیا ہے، بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانونِ اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کر رہی ہے کہ قانون اتفاق، موجودہ کائنات کا خالق ہو سکتا ہے، کیونکہ سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر اور جسامت کیا ہے، جو عمر اور جسامت اس نے معلوم کی ہے وہ قانون اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔

"اگر تم دس سکے لو اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگا دو، اس کے بعد انہیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دو، اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ کو نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو۔۔۔ یہ امکان کہ نمبر ایک کا سکہ پہلی بار تمہارے ہاتھ میں آجائے، دس میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمہارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو اور تین نمبر سلسلہ وار تمہارے ہاتھ آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں دس ہزار میں ایک ہے، یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب تمہارے ہاتھ میں آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے"۔

یہ مثال نقل کرنے کے بعد کریسی مارسین (A. Cressy Monson) لکھتا ہے:

"The object in dealing with so simple a problem is to show
who enormously figures multiply against chance."
(Man Does Not Stand ALone, P:17)

یعنی یہ سادہ مثال اس لئے دی گئی تا کہ یہ امر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر سب کچھ محض اتفاق سے ہو گیا ہے تو اس کے لئے کتنی مدت درکار ہو گی۔ ذی حیات اشیاء کی ترکیب زندہ خلیوں (Living Cells) سے ہوتی ہے۔ خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم الخلیہ (Cytology) میں کیا جاتا ہے۔ ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں، ان میں سے ایک پروٹین ہے، پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔۔۔ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک، پروٹینی (Molecules) ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار جواہر (Atoms) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سو سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں، اب اس امر کا امکان کس حد تک

ہے کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے۔ مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو، اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جاسکتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے ایک ریاضی داں پروفیسر چارلس ایوجین گائی (Charles Eugene Gueye) نے اس کا حساب لگایا ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۶۰/۱۰ کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ (۱۶۰/۱۰) کا مطلب یہ ہے کہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے، دوسرے لفظوں میں دس کے آگے ایک سو ساٹھ صفر۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لئے پوری کائنات کے موجودہ مادہ سے کروروں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے۔ اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ۲۴۳/۱۰ سال بعد ہے۔

پروٹین، امینوایسڈ (Amino Acids) کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقہ کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جے۔ بی لیتھیز (J. B. Leathes) نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں (۴۸/۱۰) طریقے سے یکجا کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لئے محض اتفاق سے یکجا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ واقعہ ظہور میں آجائے گا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے ایسا ہو جائے، دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہرائے رہنے کے باوجود کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ ظہور میں نہ آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، پروٹین کے خلیہ کا جز بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرارت کیسے پیدا ہوئی۔ اس کا جواب اس توجیہ میں نہیں ہے۔ پھر یہ بھی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جز و پروٹین۔۔۔ کے صرف ایک ناقابل مشاہدہ ذرہ کے وجود میں آنے کی توجیہ ہے جب کہ صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ مہاسنکھ کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کامٹے ڈونوائے (Le Comte Du Nouy) نے اس پر بہت عمدہ اور منفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لئے جس وقت، جس مقدار مادہ اور جس پہنائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے تمام اندازوں سے ناقابل یقین حد تک زیادہ ہے، اس کے لئے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی ۸۲/۱۰ سال نور (دس کے آگے ۸۲ صفر) سفر کر کے اس کو پار کر سکتی ہو۔ یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے کیونکہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن نے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے وہ اس عمل کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سوٹریلین حرکت فی سیکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ۔ اتفاق سے وجود میں

آئے جو زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے۔ اس سارے عمل کے لئے جس مدت کی ضرورت ہے وہ ۲۴۳×۱۰ (دس کے آگے ۲۴۳ صفر) بلین سال ہے، مگر "ہمیں بھولنا نہیں چاہیے" ڈونوائے لکھتا ہے: "کہ زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جبکہ زمین ٹھنڈی ہوئی"۔

(Human Destiny, P:30-36)

سائنس نے اگرچہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطلوبہ پروٹینی سالمہ کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے ناکافی ہے۔ مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہے جس پر ہماری معلوم زندگی پیدا ہوئی اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کر لی گئی ہے۔

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی بڑے ستارے کی کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا۔ اس وقت زمین سورج کی مانند ایک مجسم شعلہ تھی جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو کر منجمد ہوئی۔ اس انجماد ہی کے بعد یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر عجب ہے کہ وہ ٹھوس ہوئی مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے۔ ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (Radio-Active elements) کی دریافت سے ہوا ہے، تابکار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں اسی لئے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں۔ اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتی رہتی ہے اور وہ دھیرے دھیرے غیر تابکار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یورینیم اسی قسم کا ایک تابکار عنصر ہے۔ وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک خاص اور متعین شرح سے سیسہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی ہم تبدیلی کی اس رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ یورینیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں میں پائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس وقت سے چٹان کا جزو ہیں، جب کہ یہ چٹان منجمد ہوئی یورینیم کے ساتھ ہم سیسہ پاتے ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورینیم کے ساتھ پایا جاتا ہے، وہ یورینیم کے انتشار (Disintegration of Uranium) سے وجود میں آیا ہے، کیونکہ یورینیم سے بنا ہوا سیسہ عام سیسے سے کچھ ہلکا ہوتا ہے، اس لیے سیسہ کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورینیم سے بنا ہے یا نہیں، اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورینیم جس چٹان میں ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہو رہا ہے اور چونکہ یورینیم چٹان میں اس وقت سے ہے جب کہ وہ چٹان منجمد ہوئی، اس لئے ہم اس کے ذریعے سے خود چٹان کے انجماد کی مدت معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طرح کے اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم از کم چودہ سو ملین سال گزر چکے ہیں۔ یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو ہمارے علم کے مطابق زمین کی قدیم ترین چٹانیں ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے زمین کی عمر اس سے بہت زیادہ مثلاً دگنا اور تگنا ہو، مگر ارضیاتی مشاہدہ کے دوسرے شواہد اس طرح کے غیر معمولی اندازوں کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ جے، ڈبلیو، این، سولیون نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے۔(۳) اب ظاہر ہے کہ جب صرف ایک

غیر ذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے سنکھ مہا سنکھ سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آ گئیں اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات و نباتات پیدا ہو کر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے۔ پھر انہیں ادنی درجہ کی ذی روح اشیاء سے اتنی قلیل مدت میں انسان جیسی اعلیٰ مخلوق اتفاقاً کیسے وجود میں آ گئی جب کہ نظریۂ ارتقاء انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے۔ ان میں سے ہر تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے۔(۵) اس سے اندازہ کیجئے کہ اگر محض ارتقاء کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے جدامجد کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہے تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہو گا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔بی کریڈر (Martin Broks Kreider) کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں:

"The mathematical probability of a chance accurence of all the necessary factors in the right proportion is almost nil."
(The Evedince of God, P:67)

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کے ساتھ اتفاقاً اکٹھا ہو جانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریے کی لغویت واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "اتفاق" سے نہ کوئی ایٹم یا مالے کیول وجود میں آ سکتا ہے، نہ وہ ذہن پیدا ہو سکتا ہے، جو یہ سوچ رہا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی، خواہ اس کے لئے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے۔ یہ نظریہ نہ صرف ریاضیاتی طور پر محال ہے، بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا، یہ ایسی ہی لغو بات ہے جیسے کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی فرش پر گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہو سکتا ہے۔ ایسے شخص سے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لئے فرش، کشش ارضی، پانی اور گلاس کہاں سے وجود میں آ گئے۔

علم حیاتیات کے مشہور عالم ہیکل (Haeckel) نے کہا تھا: "مجھے ہوا، پانی، کیمیائی اجزاء اور وقت دو، میں ایک انسان بنا دوں گا"۔ مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لئے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کر وہ خود اپنے دعوے کی تردید کر رہا ہے، بہت خوب کہا ہے ماریسن نے

"ہیکل نے یہ کہتے ہوئے جین اور خود زندگی کے مسئلہ کو نظر انداز کر دیا۔ انسان کو وجود میں لانے کے لئے اس کو سب سے پہلے ناقابل مشاہدہ ایٹم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر جین بنانا ہو گا، اس کو زندگی دینی ہو گی، پھر بھی اس کی اس اتفاقی تخلیق کا امکان کروروں میں ایک کا ہے، بالفرض اگر وہ کامیاب بھی ہو جائے تو اس کو وہ اتفاق (Accident) نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (Intelligence) کا ایک نتیجہ قرار دے گا"۔ (Man Dies Not Stand Alone, P:87)

اس بحث کو میں ایک امریکی عالم طبیعیات ارل ڈیوس (Earl Dawis) کے الفاظ پر ختم کروں گا۔

"اگر کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے۔ اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی۔ میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے اور اس عالم کا وہ خود کوئی جزو نہیں بلکہ اس کا فرمانروا اور ناظم و مدبر ہے"۔

(The Evidence of God, P-71)

(ماخوذ از "علم جدید کا چیلنج" مصنفہ وحید الدین خاں، مجلس تحقیقات و نشریات، لکھنؤ، ۱۹۷۹ء، ص ۵۷۔۸۸۔

حواشی

۱۔ یہ کائنات کی وسعت کے بارے آئن سٹائن کا نظریہ ہے، مگر یہ صرف ایک "ریاضی داں کا قیاس" ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان ابھی تک کائنات کی وسعت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

۲۔ کوئی ذی ہوش یہ کہنے کی غلطی نہیں کرے گا کہ کیمرہ اتفاق سے بن کر تیار ہو گیا ہے، مگر اس کے باوجود دنیا کے بھت سے ہوش مند یہ یقین رکھتے ہیں کہ "آنکھ محض اتفاق سے وجود میں آگئی ہے"۔

۳۔ The Evidence of God, P:88

۴۔ – do –

۵۔ Lyon, Bockman and Brady —— The Nature and Properties of Soils.

۶۔ Mysterious Universe, P:3

۷۔ The Evidence of God, P:23

۸۔ Limitations of Science, P:78

۹۔ The Evidence of God, P:117

اموی اور عباسی عہد کے

خلفاء و اکابر کا تصور اللہ

(خطبات و رسائل کے حوالے سے)

سرور عالم ندوی

حرف آغاز

فکر و علم کی دنیا میں تسلسل کا عمل جاری رہتا ہے، کبھی اس کا دھارا اوپر کی طرف ارتقاء کی سیڑھیوں پر چڑھتا ہے اور کبھی نیچے کی طرف زوال کے زینوں سے اترتا ہے۔ جمود و تعطل بھی کبھی کبھی طاری ہوتا ہے جب فکر و نظر کو بند باندھ کر قید کر دیا جاتا ہے۔ تاریخی عمل کا تسلسل بھی ایسا ہی ہوتا ہے، ادوار کے بدلنے سے اس کے بہاؤ میں موڑ تو آتے ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ فکر ماضی حرف غلط بن کر مٹ جائے اور اس کی جگہ خالص نئی فکر جنم لے کر تاریخ بن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نئی فکر اور نیا علم بھی پرانی فکر اور قدیم علم کا پروردہ بلکہ پرداختہ ہوتا ہے۔

مذاہب عالم میں تصورات الٰہ کی تمام تر گوناگونی کے باوجود ایک قدر مشترک نظر آتی ہے، اس سے صرف نظر کر کے خالص اسلام پر توجہ مرکوز کریں تو حضرت آدم علیہ السلام کے اولین دین سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین آخرین تک اشتراک و ارتقاء کا ایک مسلسل عمل ملتا ہے۔ وہ اللہ وحدہ لاشریک کا تصور و عقیدہ ہے۔ دوسری صفات ربانی میں جو ابہام، اجمال یا فرق نظر آتا ہے وہ محض اس بنا پر ہے کہ دین اسلام سے پہلے کے صحیفے ملیامیٹ اور مسخ کر دیے گئے۔ اس کا آخری محفوظ و مامون صحیفہ مکرم۔۔۔ قرآن مجید۔۔۔ موجود و متداول ہے۔ اس کے بیان کردہ تصورات الٰہ کو اگر بین الاقوامی تقابلی مطالعہ کا محور بنایا جائے تو کم از کم تمام آسمانی مذاہب میں اقدار مشترک ملیں گی کہ وہ سب واحد دین اسلام کے گوناگوں پرتو ہیں۔

قرآن مجید کلام الٰہی ہونے کے سبب ذات الٰہی اور اس کی صفات حسنٰی کا مستند ترین بیان ہے، اس کے اولین مخاطبوں، حرمین شریفین کے عربوں نے بالخصوص اور دوسرے عربوں نے بالعموم، قرآنی صفات و اسماء ہی کو اپنایا۔ وہ ان کے ایمان و ایقان کا جزو تو بنے ہی، ان کی تحریر و تقریر میں بھی پوری طرح سموئے گئے۔ یہ بالکل فطری تاثر پذیری ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں جو صفات ربانی بیان ہوتی ہیں ان پر

قرآنی زبان و بیان کا گہرا اثر ہے۔ آپؐ کے صحابہ کرام، خلفائے راشدین اور قرون خیر کے دوسرے علماء و اکابرین اور اہل بیاں و نگارش بھی قرآنی تعبیرات سے پوری طرح متاثر اور اپنے تصورات الٰہ اور ان کے بیان میں قرآنی رنگ و آہنگ کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ صرف اولین اسلامی صدیوں کی بات نہیں، بعد کے زمانے میں بھی قرآنی تعبیرات و تشریحات کی رنگ آمیزی نظر آتی ہے۔

قرون خیر یا بہترین اسلامی زمانوں کی تشریح ایک حدیث نبویؐ میں ملتی ہے جس کے مطابق عہد نبویؐ اور عہد صحابہ کے اولین دور کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین کا دور اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ زمانی اعتبار سے پہلی دو اسلامی صدیاں یا زیادہ سے زیادہ عباسی عہد کا اولین زمانہ اس کا حصہ بنتا ہے۔ یہی صدر اسلام کا زمانہ ہے اور یہی اسلامی خلافت کا عہد بھی۔ تاریخی عمل کے اعتبار سے اس کو تین زمانوں یا ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) خلافت راشدہ، (۲) خلافت امویہ، (۳) خلافت عباسیہ۔ ہمارے ظاہربین اور مظاہر پرست مورخین نے کم از کم عہد خلافت راشدہ کو عہد نبوی کا تسلسل تو مان لیا ہے اگرچہ بعض کے نزدیک خلافت راشدہ کا آخری زمانہ یکسر مختلف اور دوسرا تھا، اموی خلافت میں اسلام و دین کے تسلسل کو بھی مشتبہ بنا دیا جاتا ہے اور تیسرے دور یعنی، عباسی خلافت کو اموی خلافت سے بالکل جداگانہ نوعیت کا حامل بتایا جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حکمران افراد و طبقات، نظام حکومت، انصرام حکمرانی کے علاوہ مسلم معاشرے میں انقلاب بھی آیا تھا اور اختلاف بھی پیدا ہوا تھا۔ مراکز علم بدلے گئے تھے۔ مصادر حکمرانی نئے نئے بنے تھے۔ افراد و طبقات انسانی میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ اقدار بھی بدلی گئی تھیں۔ علوم و فنون میں ارتقاء ہوا تھا، تہذیبی اقدار و مظاہر میں فرق آیا تھا۔ اور بہت کچھ بدلا تھا، مگر اسلام بطور دین منقلب نہیں ہوا تھا۔ اسلامی تصورات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، قرآنی الٰہیات وہی رہی تھیں۔ پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام نے اپنی نسلوں کی نبوی انداز پر تربیت کی تھی۔ صحابہ کرام کے تربیت یافتہ تابعین نے اپنے پیشرو اساتذہ کی تعلیم و تربیت سے اپنے شاگردوں، نوجوانوں اور فرزندوں کو سجایا سنوارا تھا، اور ان سب سے بڑھ کر قرآن مجید کی تعلیمات، تعبیرات اور تصورات نے امت اسلامی کے تمام طبقات و افراد پر اپنی گرفت کم از کم اصول و مبادی کی حد تک پوری طرح برقرار رکھی تھی۔

فکری تسلسل بالخصوص صفات الٰہی کے بیان و اظہار میں مشابہت و مماثلت کا عمل ان تینوں ادوار اسلام کے اکابر کی تحریر و تقریر میں پوری طرح ہویدا ہے، وہی قرآنی تعبیرات و تشریحات کا رنگ الٰہی ان کے تصورات و بیانات صفات میں ملتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مقدسہ کے بعض الفاظ و تراکیب تک ان کے بیانات میں موجود ہیں۔ خلفائے راشدین کے خطبات و مکاتیب کے بعض فقرے اموی و عباسی خلفاء کے ہاں مشترک ہیں۔ اکابر صحابہ کرام اور ان کے خورد سال معاصرین کے ہاں زبان و بیان کی پوری مماثلت ہے۔ خلافت راشدہ کے اکابر علماء و امراء کے صفات الٰہی پر مشتمل بیانات کو اگر اموی دور کے خلفاء امراء صحابہ اور علماء کے بیانات کے پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے تو ان میں خط امتیاز کھینچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اموی دور کے نظریات و تصورات بلکہ تعبیرات و تشریحات کا موازنہ اس کے جانشین عباسی عہد کے خلفاء و اکابر کے خطبات و رسائل میں

بیان کردہ تفسیرات سے کیا جائے تو یکسانیت، تسلسل بلکہ کہیں کہیں توارد و توافق کا پورا پورا معاملہ ملتا ہے۔

اگر کچھ فرق ملتا ہے تو ہر عہد کے اکابر کے اپنے الفاظ و تعبیرات کا، اگرچہ وہ بھی بسااوقات مشترک نظر آتے ہیں، زمانہ کے امتداد کا اثر بھی ان میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے حالات و واقعات کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ فصاحت و بلاغت کے آثار و مظاہر میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ملتا ہے۔ کہیں سادگی ہے تو کہیں پرکاری، کہیں براہ راست بیان ہے تو کہیں بالواسطہ۔۔۔ الفاظ و تراکیب بھی بہت سی جگہ مختلف ہیں۔ رنگ و آہنگ بھی جدا ہے۔ اختصار و ایجاز کے پہلو بہ پہلو تفصیل و تفسیر بھی ملتی ہے۔ زمانہ کے تقاضوں کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ مخصوص حالات کا پرتو کہیں جادو جگاتا ہے۔ شخصیات کا مزاج بھی ان میں جھلکتا ہے۔ بعض بعض میں رنگ بہت مختلف، جداگانہ اور نیا ملتا ہے۔ اگرچہ بہت سی تعبیرات میں زمانہ و حالات کے اختلاف و فرق کے باوجود یکسانیت و مشابہت زیادہ ملتی ہے۔

خلافت اسلامی کے تینوں ادوار کے خطبات و رسائل اور دوسری نگارشات کے مطالعہ سے ایک اہم یکسانیت یہ نظر آتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت اور اس کے ذریعہ انسانوں بالخصوص صحابہ، خلفاء، امراء اور علماء کی ہدایت و فضیلت کو بھی اللہ تعالیٰ کی ایک اہم صفت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بیان میں ہدایت و ارشاد کی صفت ربانی، ہادی وغیرہ ہونے، کی تخصیص نہیں ہے بلکہ حمد الٰہی کے اس جزو لاینفک کے طور پر اس کو تقریباً ہر صفت یا مجموعہ صفات الٰہی کے ضمن میں پیش نظر رکھا گیا ہے اور ایسا قطعی طور سے فطری، منطقی اور لازمی تھا کہ خلف اور جانشین اپنے پیشرو اعظم کے احسانات سے نہ صرف گراں بار تھے بلکہ ان کا سارا وجود، تمام تر علم اور پورا کارنامہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطیائے خاص کا حصہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ بیان کرنے میں تقریباً تمام اکابر نے ہر دور میں کسی ایک صفت ربانی پر بالعموم اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ مجموعہ صفات کے حوالے سے اس کی حمد و ثنا کی ہے۔ البتہ موقع و محل اور صاحب بیان کے مزاج خاص کے مطابق ان میں سے کسی ایک صفت پر زور زیادہ دیا گیا ہے۔ دعوتی مکاتیب و خطبات میں اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت و انعام کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت اور اس کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی میں بھی اس صفت ربانی کا حوالہ منطقی اور حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ فتح و نصرت کے حوالے سے بالعموم قدرت و سلطان الٰہی کا ذکر زیادہ آیا ہے۔ اور اس کا اظہار سپہ سالاران اسلام کی فتوحات اور خلفائے کرام اور ان کے امراء عظام کی ان کے حریفوں اور دشمنوں پر فتح و غلبہ کے مواقع پر سب سے زیادہ ہوا ہے۔ اس باب میں ایک اہم نکتہ یہ نظر آتا ہے کہ ظالم و مظلوم دونوں اپنے اپنے موقف کے صحیح ہونے کی تائید میں سلطانی و نصرت الٰہی سے سند پکڑتے ہیں۔ جیسا کہ امویوں پر عباسیوں کی فتح سے متعلق خطبات و رسائل کا انداز ہے۔

خاندان ہاشمی کے افراد و طبقات نے بالعموم اور ان کے دو حریف خانوادوں بنو علی اور بنو عباس نے بالخصوص اپنے مکاتیب و خطبات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان ذی شان سے اپنی قربت و نسبت کے حوالے سے بعض صفات الٰہی کا ذکر کیا ہے۔ عباسی خلفاء کرام، السفاح، المنصور وغیرہ کے خطوط و مکاتیب میں

خاندان اموی پر عباسی خاندان کی فتح و غلبہ کو حجت الٰہی کے قائم ہونے سے تعبیر کرنے کے علاوہ قوت و شوکت و نصرت الٰہی کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے دشمنوں اور حریفوں کو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مخالفوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے زیادہ وہ دلچسپ خطوط وہ مکاتبات و خطبات ہیں جن میں خاندان عباسی کے دو خلفاء۔۔۔ المامون اور الامین، نے ایک دوسرے کو "عدواللہ" ثابت کر کے نصرت الٰہی کو اپنی تائید و تصدیق میں پیش کیا ہے۔ دراصل اس میں صرف ایک اصول کارفرما نظر آتا ہے اور وہ ہے اپنے موقف کی صداقت اور حریف و مقابل کے موقف کی غلطی ثابت کرنا اور فریقین میں سے جو فریق جیت جاتا ہے وہ اپنی جیت کو نصرت الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا تعلق خواہ واقعہ صفین کے فریقین سے ہو یا عباسی و اموی فریقوں سے یا خود عباسی خانوادہ کے اپنے دو سیاسی حریفوں سے یہی صورت حال خوارج کے خلاف اموی و عباسی مجاہدین کے خطوط و خطبات میں نظر آتی ہے کہ ان کے خلاف وہ اپنی کامیابی کو نصرت الٰہی سے مؤید قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بلکہ عبرت آمیز خلافت عباسی کے مبینہ حریفوں جیسے عیسیٰ بن موسیٰ، جعفر برمکی وغیرہ کے خطبات و رسائل میں ان کے ایک ہی سلسلہ سے بندھے ہونے اور ایک ہی رسی کو پکڑنے کی عجیب و غریب حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین، تابعین عظام اور سلف صالحین کی تحریر و تقریر کے محرکات و مقاصد جداگانہ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے جامعین اکثر و بیشتر ان حصوں کو جن میں خدا کی ذات و صفات کا ذکر ہوتا تھا چھوڑ کر اصل مقصد کو ضبط تحریر میں لے آتے ہیں تاہم اس کے باوجود بھی ان حضرات کے ارشادات عالیہ میں جو موضوعات کے تنوع، مسائل کی کثرت، حالات کے تقاضے اور واقعات کی زیادتی کی وجہ سے متنوع اور مختلف ہیں جہاں کہیں بھی صفات الٰہی کا ظہور ہوا ہے اس کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس بات کا ثبوت فراہم کیا جا سکے کہ یہ حضرات بزرگان دین کس درجہ قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا تھے اور قرآنی اعجاز بیان نے کس حد تک انہیں متاثر کر رکھا تھا۔

ان نفوس قدسیہ نے صفات الٰہی کے ذکر و تذکرے کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا۔ خواہ وہ نظام سلطنت کا معاملہ ہو یا عمال حکومت کی رہنمائی، سربراہان لشکر کو ہدایت دینا ہو یا عوام الناس کو پند و موعظت، سیاسی حالات و معاملات میں اختلاف رائے کا اظہار ہو یا سماجی اور معاشرتی اصلاح کا مسئلہ، ہر جگہ موقع اور محل کی رعایت و مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے اوصاف حمیدہ اور تصورات قدسیہ کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ بلکہ ہر جگہ زمانہ اور حالات کے تغیرات اور مزاج و انداز کے ساتھ ترغیب و ترہیب، ایجاز و اطناب، فصاحت و بلاغت اور شیرینی و سلاست کا عنصر شامل ہے۔ کہیں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت کا سیلاب نظر آتا ہے اور کہیں خوف و خشیت کا رعشہ، سیماب محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ان سب میں ایک چیز جو قدر مشترک نظر آتی ہے وہ ذات و صفات الٰہی کا اظہار اور الوہیت و ربوبیت کا اقرار ہے جس میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پایاں محبت و عقیدت اور آپ کی تعلیمات و فرمودات پر عمل کرنے کی تڑپ نمایاں ہے، کیونکہ اسی میں فلاح دنیوی اور نجات اخروی پوشیدہ ہے۔

ذیل میں عہد خلافت راشدہ کے دیگر تمام خطبات و رسائل میں جس حد تک بھی تصورات باری تعالیٰ کا

ذکر مل سکا ان کو صفات کے اعتبار سے جمع کرنے کے بعد عہد بنو امیہ اور بنو عباس کے خطبات و رسائل کا تجزیہ بالترتیب پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی تاکہ توحید پرستی اور شرک بیزاری کے ساتھ کتاب ہدایت سے ان کی وابستگی اور صفات ربانی کے استحضار و ایقان کا اندازہ لگایا جا سکے۔

خلافت راشدہ کے علماء و صحابہ کا تصور الٰہ

اکابر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضرات خلفائے راشدین کی مانند درس گاہ رسالت سے براہ راست تعلیم و تربیت کی سعادت نصیب ہوئی تھی اور بھرپور انداز میں نصیب ہوئی تھی، جبکہ اصاغر صحابہ کرام کو اپنی کم عمری کے سبب زیادہ اکتساب فیض کا موقع نہیں ملا۔ ان میں بہرحال چند ایسے خوش بخت و فرض شناس تھے جنہوں نے اپنی بساط بھر یہ دولت حاصل کی تھی اور اپنی طرف سے اس کے حصول میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اور جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی اس کا ازالہ اکابر صحابہ کرام سے استفادہ نے کر دیا تھا۔ طویل عمر پانے والے صحابہ نے حصول سعادت میں وقت و زمان کو الگ مات دی تھی۔ قرآن مجید کی تدوین و تکمیل اور سنت نبویؐ کی تشکیل و تعمیر کے عہد ساز اور فطرت ساز مراحل نے ان کے علم و آگہی میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی تھی۔ اسلامی علوم و فنون کے ارتقاء نے اس پر مزید جلا کی تھی۔ ان کے اپنے اور دوسروں کے تجربات و مشاہدات نے فکر و خیال کی حدود میں وسعت پیدا کی تھی۔ دوسری اقوام سے میل جول اور اختلاط نے انہیں فکر و فلسفہ کے دوسرے دھاروں سے بھی آشنا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان اسباب و عوامل نے انہیں کے تصور الٰہ اور فکر توحید کو مزید رنگ و نکھار بخشا۔ جنہیں خطبات و رسائل میں مختلف مواقع اور مناسبتوں سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مخاطبین کبھی تو خدا کے نیک اور برگزیدہ بندوں کی جماعت باصفا رہی اور کبھی امرا و سلاطین کا دربار خسروی۔ میدان کارزار کا کروفر رہا اور کبھی زہد و تقویٰ کی مجلسیں۔ حق و باطل کی ستیزہ کاریاں رہیں اور کبھی اجتہاد عمل کی غلطیاں۔ ان تمام موقعوں پر اللہ تعالیٰ کی جن صفات کریمہ کا ذکر ملتا ہے ان میں اللہ کے ہادی و قادر ہونے، حاکم و مالک ہونے، خالق و رازق ہونے، منعم و معبود حقیقی ہونے، نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کرنے اور ان کے ذریعہ سے ہدایت کو عام کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بعض دیگر صفات الٰہی کا بھی اچھا خاصا ذکر ملتا ہے۔ جن میں حامی و ناصر، رحمان و رحیم، غفار و عظیم، حی و قیوم، محسن و محتسب اور علام الغیوب اور ان جیسی بعض دوسری صفات الٰہیہ کا اس کثرت اور خوبی سے تذکرہ ملتا ہے جس سے ان کے ایمان و یقین کی پختگی، اعمال و افعال میں قدرت الٰہی کی کاریگری اور ان کے انداز بیان میں صفات باری کی رنگارنگی کا ایک مرقع تیار ہو جاتا ہے۔

ابتداء کی سہولت کی خاطر سب سے پہلے ان خطبات و مکاتیب کے اقتباسات سے کسب فیض کیا جاتا ہے جنہیں یا تو سلاطین مملکت کے ایوانوں میں پیش کیا گیا، یا پھر سربراہان حکومت کی محفلوں میں آراستہ کیا گیا۔

عہد فاروقی میں حضرت نعمان بن مقرن ۲۱ھ/۶۴۲ء نے آخری شہنشاہ ایران "یزدجرد سوم" کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"ان اللہ رحمنا، فارسل الینا رسولا، یدلنا علی الخیر، ویأمربہ، و یعرفنا الشر وینھا ناعنہ، و وعدنا علی اجابتہ خیر الدنیا والآخرۃ"۔

"بیشک اللہ نے ہم پر رحم فرمایا، ہماری طرف ایسا رسول بھیجا جو ہماری خیر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور اس کے کرنے کا حکم دیتے ہیں، برائی سے واقف کراتے اور اس سے روکتے ہیں، اور اس کو قبول کر لینے پر دنیا و آخرت کی بھلائی کا وعدہ فرماتے ہیں"۔

حضرت نعمان کے اس بیان کے بعد "یزدجر" نے اپنی نخوت شاہی اور غرور پادشاہی میں چور ہو کر کہا کہ روئے زمین پر مسلمان عربوں سے زیادہ بدبخت اور بدحال کوئی قوم نہیں۔ حضرت مغیرہ بن زرارۃ نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے اعتراف نعمت کرتے ہوئے کہا:

"تم نے جو ہماری بدحالی اور فاقہ مستی کا تذکرہ کیا ہے، ہم اس سے بھی زیادہ بدحال اور فقر و فاقہ کے شکار تھے، حلال و حرام کے درمیان تمیز کی صلاحیت نہیں تھی، قتل و غارت گری ہمارا شیوہ تھا، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا ہمارا شعار، انہیں حالات میں ہم زندگی گزار رہے تھے کہ اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں میں سے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جس کے حسب و نسب سے ہم واقف تھے۔ آپؐ نے ہمیں اللہ واحد کی عبادت کی طرف بلایا اور اللہ نے ہمارے دلوں کو ان کی تصدیق و تائید کے لئے کھول دیا۔ آپؐ ہی ہمارے اور سارے عالم کے پالن ہار کے درمیان وسیلہ و ذریعہ ہیں۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا پروردگار یہ کہتا ہے کہ میں یکتا و تنہا ہوں، میرا کوئی شریک نہیں، ازل سے ہوں اور رہوں گا، میرے علاوہ ہر چیز کو فنا ہونا ہے، میں نے ہر چیز کو پیدا کیا، میری ہی طرف ہر چیز کو لوٹ کر آنا ہے، میری رحمت کاملہ تم سب پر محیط ہے، میں نے ہی تمہاری طرف اس عظیم انسان کو بھیجا تا کہ وہ تم لوگوں کو ایسے راستے کی طرف لے جائے جو تم لوگوں کو موت کے بعد میرے عذاب سے بچا لے، اور میں تم لوگوں کو اپنے سلامتی کے گھر میں ٹھہراؤں۔ ہم سب نے جو کچھ وہ حق کی طرف سے حق بات لے کر آئے تھے اس کی تائید کی اور گواہی دی"۔ (تاریخ طبری جلد ۴، ص ۹۲)۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفی (۲۰ ق ھ - ۵۰ھ/۶۰۳ء - ۶۷۰ء) نے رستم کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایک دل گیر تقریر کی:

"بے شک اللہ ہی ہر چیز کا خالق و رازق ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں جو ایک ذرہ بھی بنا سکے۔ تمہارا یہ غلبہ و اقتدار، یہ شوکت و سلطنت جس کا تم نے اظہار کیا اور جس کا ہمیں اعتراف بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو تمہارے لئے بنایا ہے۔ اور ان پر تم کو تصرف عطا فرمایا ہے۔ جہاں تک ہماری مفلوک الحالی اور تنگ دستی کا تعلق ہے، جس کا تم نے ذکر کیا اور ہمیں اس سے انکار بھی نہیں، اللہ نے ہمیں ان چیزوں کے ذریعہ آزمایا ہے سب کو اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ دنیا کی تمام مصیبتیں اور راحتیں اسی کی طرف سے ہیں اور سب کو اسی کی طرف جانا ہے۔ اللہ نے جن چیزوں سے تم کو نوازا ہے اس کا حق یہ ہے کہ ان پر اس کا شکر ادا کیا جائے۔ کہیں ان نعمتوں پر تمہاری ناشکری تمہارے حالات کے بدلنے کا سبب نہ بن جائے"۔

(تاریخ الکامل، جلد ۳ ص ۲۲۸)

گہوارۂ رشد و ہدایت کے تربیت یافتہ صحابہ کرام کی زبان صداقت بیان اوصاف الٰہی کے ذکر سے کسی لمحہ رکتی نہیں تھی۔ ان کو خود بھی ہر آن باری تعالیٰ کا استحضار رہتا اور اس کے صفات کے شمار و اظہار میں دلوں کا

سکون اور روح کا اطمینان محسوس کرتے تھے۔ اپنی عبدیت کا اقرار اور اللہ کی حاکمیت کا اظہار ان کا وظیفہ حیات تھا جس میں اس بات کی فکر کی جاتی کہ اس کے زیادہ سے زیادہ اوصاف کو مستحضر رکھ کر شرک کے شائبہ سے بھی محفوظ رہا جائے۔ جس کی عمدہ مثال حضرت یزید بن اسد الجبلی (۵۵/۶۷۵ء) کا وہ خطبہ ہے جو صفین کے موقع پر دیا گیا تھا۔ اس خطبہ میں صفات حسنہ کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

الحمد لله الواحد الفرد، ذی الطول و الجلال، العزیز الجبار، الحکیم الغفار، الکبیر المتعال، ذی العطاء والفعال، والسخاء والنوال، والبهاء والجمال، والمنّ و لافضال، مالك الیوم الذی لابیع فیه و لاخلال، احمده علیٰ حسن البلاء و تظاهر النعماء، وفی کل حال من شدة اورخاء. احمده علیٰ نعمه التوام وآلائه العظام، حمد الیستیر باللیل والنهار، واُشهدان لااله الاالله وحده لاشریك له کلمة النجاة فی الحیاة الدنیا وعندالوفاة، و فیها الخلاص یوم القصاص، واشهدان محمداعبده و رسوله النبی المصطفیٰ، وامام الرحمة والهدیٰ، صلی الله علیه وآله . انا لله وانا الیه راجعون، الحمد لله رب العالمین ... فنستعین بالله العظیم۔

(جمرۃ خطب العرب: ۱/۲۶۸)

"ساری حمد اس یکتا و تنہا اللہ کی ہے جو صاحب قدرت و جلال ہے، غالب و جبار ہے، حکیم و غفار ہے، بزرگ و برتر ہے، صاحب جود و سخا ہے، والی حسن و جمال ہے، فضل و احسان جس کی شان ہے، جو اس دن کا مالک ہے جس میں نہ خرید و فروخت ہو سکتی ہے اور نہ ہی دوستی و یاری کام دے سکتی ہے، تنگی ہو یا کشادگی ہر حال میں حسن انجام اور خوبی انعام پر اس کی حمد کرتا ہوں، اور اس کی کامل و مکمل نعمتوں اور عظیم الشان انعامات پر جس کے ذریعہ رات اور دن میں روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں جو وحدہ لا شریک ہے، یہی دنیاوی زندگی اور موت کے وقت میں نجات کا کلمہ ہے۔ اسی میں قیامت کے دن چھٹکارا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں اور رحمت و ہدایت کے امام ہیں، خدا کی رحمتیں ہوں ان پر اور ان کی آل پر، بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، تمام حمد و ثناء اسی سارے عالم کے پالن ہار اللہ کے لئے ہے، اور ہم اسی عظیم و برتر اللہ سے مدد کے خواہاں ہیں"۔

صفات باری تعالیٰ کا ورد و تکرار جن کا شغل حیات ہو ان کو صفت کے اعتبار سے مرتب کرنا دشوار گزار عمل ہے، کیونکہ ان کی طبع شریف کسی خاص وصف پر اکتفا کرنے کی روادار نہ تھی بلکہ ان کے بیان میں سیل رواں بن کر تسکین قلب و نظر کا سامان فراہم کرتی۔ اور بیک وقت ایک ہی خطبہ اور رسالہ میں کثرت سے متعدد اوصاف کا استعمال کیا جاتا۔

تاہم کثرت و غلبہ کے اعتبار سے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان فرمودات و ارشادات کو صفت وار مرتب کر کے پیش کیا جائے تاکہ قارئی کے ذہن میں صفات الٰہی پر ان کا ایمان و ایقان مرتسم ہو کر عقائد کی اصلاح و درستگی اور قرآن حکیم سے ان کے تعلق و شیفتگی کا اندازہ لگایا جا سکے۔

قادر

اللہ رب العزت نے اپنی کتاب عظیم میں اپنے جن اوصاف حمیدہ کا تذکرہ فرمایا ہے ان میں ایک اہم وصف قادر بھی ہے۔ جس کے ذریعہ نسل انسانی کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ نظام کائنات سے لے کر وجود انسان تک ہر چیز پر جس ہستی کا تصرف ہے وہ صرف اللہ واحد کی ذات ہے، وہی قادر مطلق ہے، اس پر کسی کا قانون نہیں چلتا، کوئی قوت و طاقت اس کے حکم و اقتدار میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ سوء فہمی کی وجہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کوئی شئے اس کے تصرف و اقتدار سے باہر ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیتیں اس کی قدرت کاملہ پر شاہد ہیں۔ (سورۂ انعام: ۳۷، ۶۵، بنی اسرائیل، نمبر۹۹، یٰسین، نمبر۸۰، احقاف نمبر۳۳، قیامہ ۴۰، وغیرہ) حضرات صحابہ کرام اس وصف ربانی کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے، ایک پل کے لئے بھی اس کی قدرت و اقتدار سے نہ خود غافل ہوتے اور نہ دوسروں کو اس سے صرف نظر کرنے دیتے۔

ہجرت کے نویں سال بنو تمیم کا ایک وفد حضرت عطارد بن حاجب بن زرارۃ متوفی ۲۰ھ/۶۴۰ء کی قیادت میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر و تقاریر میں مقابلہ کی دعوت دی۔ آپؐ نے ان کی دعوت قبول فرمائی۔ اور ان کے نمائندہ خطیب حضرت عطارد بن حاجب کے مقابلہ میں حضرت ثابت بن قیس بن الشماس خزرجی متوفی ۱۲ھ/۶۳۳ء کو جواب کے لئے کھڑا کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

الحمد للہ الذی السمٰوٰت والارض خلقه، فقضی فیهن امره، و وسع کرسیُّ علمه و لم یك شیٔ قط الامن فضله، ثم کان من قدرته ان جعلنا ملوکا، واصطفی من خیر خلقه رسولا، اکرمهم نسبا، واصدقهم حدیثا، وافضلهم حسبا، فانزل علیه کتابه، وائتمنه علی خلقه (سیرۃ ابن ہشام جلد۲ ص ۳۶۳)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا، جس میں اپنے اختیارات سے فیصلہ کرتا ہے، اس کا علم اس کی کرسی کو محیط ہے، کوئی بھی شے اس کے فضل و کرم کے بغیر پنپ نہیں سکتی، اسی نے اپنی قدرت کاملہ سے ہم کو صاحب اقتدار بنایا، اور اپنی بہترین مخلوق میں سے ایک رسول منتخب فرمایا، جو نسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ محترم، قول کے اعتبار سے سب سے زیادہ سچے اور حسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ افضل ہیں، اسی نے ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور اپنی مخلوق پر ان کو امین بنایا"۔

مرتدین کی شکست اور ان کے سردار حُطم بن ضبیعہ کے قتل کے بعد حضرت العلاء بن حضرمیؓ متوفی ۲۱ھ/۶۴۲ء حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"بے شک اللہ جس کے تمام نام بابرکت ہیں اس نے ہمارے دشمنوں کی عقلیں سلب کر لیں۔ اور ان کی ہوا اکھاڑ دی ایسے پانی کے ذریعہ جو دن کے وقت ان کو پہنچا"۔ (تاریخ طبری جلد ۳، ص ۲۶۱)

حضرت ابوعبیدہؓ حضرت عمرؓ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ الذی اهلك المشرکین و نصر المسلمین، و قدیما تولی اللہ امرهم واظهر فلجهم و اعز دعوتهم، فتبارك اللہ رب العالمین۔ (فتوح الشام: ۲۲)

ترجمہ: تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مشرکوں کو ہلاک کیا اور مسلمانوں کی مدد فرمائی، اسی نے ان کی ٹکڑیوں کو غالب کیا اور ان کی دعوت کو عزت بخشی، تمام عالم کا پروردگار اللہ بابرکت و عظمت والا ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ ۲۱/۶۴۲ء نے اہل مدائن کے فارسی سردار کے نام جو خط تحریر کیا تھا اس میں اللہ کی قدرت کاملہ کو اس طرح بیان فرمایا:

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے تمہاری جماعت کو منتشر کر دیا، تمہارے ملک کو سلب کیا اور تمہاری چالوں کو کمزور کر کے رکھ دیا"۔ (العقد الفرید ۱/۴۰)

حضرت احنف بن قیس التمیمیؒ (۳ق ھ - ۷۲ھ/۶۱۹ء - ۶۹۱ء) نے حضرت عمرؓ کے سامنے اپنے وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا:

"امیرالمومنین! بے شک خیر کی کنجیاں اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں، حرص و طمع محرومیوں کا پیش خیمہ ہے، لہذا کمی اور ناکمی چیزوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو جو قیامت کے روز تمہاری کفایت نہیں کریں گے"۔
(نہایۃ الادب جلد ۷، ص ۲۳۹)

۶۵۲/۳۲ھ میں حضرت احنف بن قیس نے سردار فارس کا محاصرہ کرنے کے بعد امیر لشکر کے خط کے جواب میں جو خط لکھا تھا اس میں بھی اللہ رب العزت کی اسی شان کبریائی اور قدرت بے پایاں کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ "بے شک زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کو اس کا وارث بناتا ہے۔ (طبری جلد ۵، ص ۸۱)

حضرت صعصہ بن صوحان م ۶۵ھ/۶۷۶ء نے حضرت عقیل بن ابی طالب م ۶۰ھ/۶۸۰ء کے نام ایک خط میں اسی وصف قدرت کو اس انداز سے تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ذکر اللہ اکبر وبہ یستفتح المستفتحون۔ (مروج الذہب جلد ۳، ص ۷۶)۔

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے، اللہ کا ذکر بڑا ہے، اسی کے ذریعہ فتح مندی کے خواہاں فتح حاصل کرتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کی اسی قدرت بے کراں کا ظہور حضرت رسالت مآبؐ کی موجودگی میں حضرت ظبیان بن حدادؓ کی زبان سے اس طرح ہوا:

الحمد للہ الذی صدع الارض بالنبات وفتق السماء بالرجع۔ (العقد الفرید جلد ۱ ص ۱۱۰)

"تمام حمد اس ذات باری کے لئے ہے جس نے زمین سے پودے اگائے اور آسمان سے بارش برسائی"۔

عظیم

عظمت و رفعت اور بزرگی و برتری ایسا وصف ہے جس کے سچے اعتراف و اقرار کے بعد قدرت الٰہی کے سوا کسی غیر کے سامنے سر تسلیم خم کرنا بڑا دشوار گزار امر ہوتا ہے، اس کے ذریعہ ذات و صفات اور حقوق و اختیارات پر اس طرح مہر ثبت ہو جاتی ہے کہ پھر کسی دوسرے کو ہمسر و برابر ٹھہرانا ممکن نہیں ہوتا۔ قرآن مجید

میں اللہ تعالیٰ کے اس وصف کو بار بار دہرایا گیا ہے:

وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○ (البقرہ: ۲۵۵، شوریٰ: ۴)

ترجمہ: اور وہ بڑا عالی رتبہ (اور) جلیل القدر ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ○ (الحاقہ: ۳۳)

ترجمہ: یہ نہ تو خدائے جل شانہٗ پر ایمان لاتا تھا۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ○ (الحاقہ: ۵۲)

ترجمہ: سو تم اپنے پروردگار عز و جل کے نام کی تنزیہ کرتے رہو۔

صحابہ کرام کی زبان بھی اس وصف عالی سے اکثر معطر رہتی تھی۔

واقعہ صفین سے قبل اہل شام سے خطاب کرتے ہوئے حضرت عمرو بن العاصؓ (۵۰ق ھ - ۴۳ ھ/ ۵۷۴ء - ۶۶۴ء) نے جو خطبہ دیا اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت اور شان و قدرت کا اقرار و اظہار اس طرح کیا

"الحمد لله العظيم فى شانه، القوى فى سلطانه، العلىّ فى مكانه، الواضح فى برهانه، احمده على حسن البلاء و تظاهر النعماء، فى كل رزية، من بلاء أو شدة أو رخاء، و اشهدان لا اله الا الله وحده لاشريك له وان محمدا عبده و رسوله. (جمہرۃ خطب العرب ۱/ ۱۹۳)

"تمام حمد عظیم شان والے، مضبوط بادشاہت والے، بلند مرتبے والے، روشن دلیلوں والے اللہ کے لئے ہے، میں اس کی حمد کرتا ہوں تمام مصیبتوں اور آزمائشوں میں تنگی اور کشادگی میں اس کے حسن انجام اور خوبی انعام پر، اور گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ واحد کے جس کا کوئی شریک نہیں، اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں"۔

حضرت محمد بن ابی بکر مصر سے معاویہ کے نام ایک خط میں اللہ کی عظمت و قدرت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فان الله بجلاله وعظمته و سلطانه و قدرته خلق خلقه بلاعبث منه ولاضعف فى قوته، ولا حاجة به الى خلقهم، لكنه خلقهم عبيدا وجعل منهم غويا و رشيدا، وشقيا وسعيدا ثم اختار على علم، فاصطفى و انتخب منهم محمد صلى الله عليه وسلم، فاختصه برسالته، واختاره لوحيه، وائتمنه على امره و بعثه رسولا و مبشرا و نذيرا، مصدقا لمابين يديه من الكتب. (مروج الذہب ۳/ ۵۹)

"بے شک اللہ نے اپنی شان و عظمت اور غلبہ و قدرت کے ذریعہ اپنی مخلوق کو پیدا کیا، ان کی تخلیق سے اس کی ذات والا صفات کو نہ کچھ فائدہ ہے اور نہ ہی وہ اپنی طاقت و قوت میں کمزور ہے۔ لوگوں کو پیدا کرنے کی اس کو کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ ان کی تخلیق صرف اللہ کی غلامی اور بندگی کے لئے ہوتی ہے، اس نے ان میں سے کسی کو تو گمراہ کیا اور کسی کو ہدایت سے سرفراز فرمایا، کسی کو بدبخت بنایا اور کسی کو سعادت مند، پھر اپنے علم خاص سے انہیں لوگوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب فرمایا اور اپنی رسالت کے لئے خاص کیا،

وحی کے لئے اختیار کیا، اور اپنے معاملے پر ان کو امین بنایا، اور انہیں خوشخبری دینے والا ڈرانے والا، کتابوں میں سے جو کچھ ان کے سامنے ہے اس کی تصدیق کرنے والا اور شریعت کی طرف رہنمائی کرنے والا رسول بنا کر بھیجا"۔

ہادی

ہدایت توفیق الٰہی کا نام ہے۔ جس سے ہر مخلوق بہرہ مند نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتے ہیں اس نعمت عظمیٰ سے نوازتے ہیں۔ اور جس کو چاہتے ہیں اس سے محروم کر دیتے ہیں۔ توفیق و ہدایت صرف انہیں کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں جو ہادی برحق ہو۔ دنیا میں جیسے اور جتنے فکر و عمل کے راستے ہیں اس کی طلب و کوشش میں خدا کا ودیعت کردہ تصور ہی کارفرما ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ انسان اچھے اور برے میں تمیز کرتا ہے اور حق و باطل کے فرق کو محسوس کرتا اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد جگہ اس کو بیان فرمایا ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ (سورۂ اعراف:۱۸۶)

ترجمہ جس شخص کو خدا گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ (روم:۵۳)

ترجمہ: اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ راست پر لا سکتے ہیں۔

وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا○ (فرقان ۳۱)

ترجمہ: اور تمہارا پروردگار ہدایت دینے اور مدد کرنے کو کافی ہے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○ (الحج.۵۴)

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے ہیں خدا ان کو سیدھے رستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ○ (المومن:۳۳)

ترجمہ: اور جس شخص کو خدا گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

صحابہ کرام بھی اپنے خطبات و رسائل میں اس صفت الٰہی کا تذکرہ فرماتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کے وصال کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے مجلس شوریٰ میں تقریر کرتے ہوئے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۲۳ ق ھ ۔ ۵۵ھ/۶۰۰ء ۔ ۶۷۵ء) نے اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت کو اس طرح بیان فرمایا:

الحمد لله بلبدیاً کان و آخرا یعود، احمده لما نجانی من الضلالة و بصرنی من الغوایة، فبهدی الله فاز من نجا، و برحمته أفلح من زکا و بمحمد بن عبدالله صلی الله علیه وسلم انات الطرق و استقامت السبل و ظهر کل حق و مات کل باطل"۔ (الکامل:۳۰/۳۶)

"تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو ابتداء سے ہے اور انتہا تک رہے گا، (وہی اول ہے وہی آخر ہے)۔ گمراہی سے نجات دینے اور بے راہ روی سے راہ راست پر لانے کی وجہ سے میں اس کی حمد بجا لاتا ہوں۔ توفیق الٰہی سے وہ شخص کامیاب ہوا جس نے نجات پائی اور اس کی رحمت سے وہ شخص کامران ہوا

جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ اور حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ راہیں منور ہوئیں اور راستے سنورے حق ظاہر ہوا اور باطل فنا ہوا"۔

اسی نعمت عظمیٰ کا اعتراف حضرت سعید بن قیسؓ (م۵۰ھ/۶۷۰ء) نے شام کے علاقہ قنسرین میں اپنے رفقاء سے خطاب فرماتے ہوئے اس طرح کیا تھا:

الحمد لله الذی هدانا لدينه و اورثنا كتابه، وامتنّ علينا بنبيه، فجعله رحمة للعالمين، وسيد المرسلين و قائد المومنين وختا ما للنبيين و حجة الله العظيم على الماضين والغابرين۔ (جمہرۃ خطب العرب:۱/۱۷۸)

"تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اپنے دین کی طرف ہدایت بخشی اور ہم کو اپنی کتاب کا وارث بنایا، اور اپنے ایسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ احسان کیا جن کو سارے عالم کے لئے رحمت رسولوں کا سردار، مومنوں کا قائد اور نبیوں کا خاتم بنایا، وہی تمام اگلوں اور پچھلوں پر عظمت والے اللہ کی حجت ہیں"۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح (م ۱۸ھ) حضرت ابوبکرؓ کے نام ایک خط میں اللہ کی ہدایت و نعمت کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں:

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اسلام کی عزت بخشی، ایمان کی دولت سے نوازا، اور جب اختلاف کرنے والوں نے اس کی ذات کے سلسلہ میں اختلاف کیا تو اسی نے ہمیں سیدھی راہ دکھائی، بے شک وہی جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرح ہدایت دیتا ہے۔ (فتوح الشام ص ۲۴)

اسی طرح مشہور تابعی اور شاعر و خطیب حضرت اشترا نخعیؒ (م ۳۷ھ/۶۵۷ء) جو شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی شورش میں پیش پیش تھے۔ جن پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل ناحق کا الزام بھی ہے۔ صفات ربانی کے بیان و اظہار میں بے خود نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک خطبہ میں صفت ہدایت و قدرت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

الحمد لله الذی خلق السمٰوٰت العلیٰ، الرحمٰن على العرش استوى، له ما فى السمٰوٰت و ما فى الارض و ما بينهما و ما تحت الثرى، احمده على حسن البلاء و تظاهر النعماء حمدا كثيرا بكرة واصيلا، من هداه الله فقد اهتدى، ومن يضلل فقد غوى، ارسل محمدا بالصواب والهدى، فاظهره على الدين كله ولو كره المشركون، صلى الله عليه وسلم۔ (جمہرۃ خطب: ۱/۱۸۲)

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے بلند آسمانوں کو پیدا کیا، جو عرش اعظم پر بیٹھ کر رحم کرنے والا ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے مابین اور خاک کی تہوں میں ہے سب اسی کا ہے، حسن انجام اور خوبی انعام پر صبح و شام بے پناہ حمد بجا لاتا ہوں، جس کو اللہ نے ہدایت دی، وہ ہدایت یافتہ ہے اور جس کو گمراہ کیا وہ گمراہ ہوا، اس نے حضرت محمد کو ہدایت اور اصلاح کا تحفہ دے کر بھیجا، وہ اسے سب ادیان پر غالب کر کے رہے گا چاہے مشرکین ناپسند کریں۔ اللہ کی رحمتیں اور درود و سلام ہو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر"۔

خلیفہ سوم کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ بنت فرافصہؓ امیر معاویہ کے خط میں ان انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں تمہیں اس اللہ کی تذکیر کراتی ہوں جس نے تم پر بے شمار انعام فرمایا، اور تمہیں اسلام کی تعلیم سکھائی، گمراہی سے ہدایت کی توفیق بخشی، کفر سے نکالا، دشمنوں کے خلاف تمہاری مدد کی اور اپنی نعمت بیکراں سے سرفراز کیا"۔ (اغانی جلد ۱۵، ص ۶۸)

منعم و محسن

یوں تو اللہ تعالیٰ کی نعمت بے بہا ساری کائنات کو محیط ہے، لیکن انسان کا سراپا وجود اور اس وجود کا ہر نفس اللہ کی نعمتوں کا اعلیٰ مظہر ہے، اس کے لامحدود انعامات و احسانات سے ہر ذرہ فیض یاب ہے، مہد سے لحد تک کون سی گھڑی ایسی ہے جو اس کی نعمت و احسان سے خالی ہو۔ حضرات صحابہ کرام کے خطبات و رسائل کا معتدبہ حصہ اللہ تعالیٰ کی ان بے پایاں نعمتوں کے اظہار و اقرار پر مشتمل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۳ ق ھ - ۶۸ھ/۶۱۹ء - ۶۸۷ء) اللہ تعالیٰ کی نعمت و احسان کے تذکرے میں اس طرح رطب اللسان نظر آتے ہیں:

الحمد لله رب العالمين الذى دحاتحتنا سبعا، وسمك فوقنا سبعاً، وخلق فيما بينهن خلقا، وانزل لنا منهن رزقا، ثم جعل كل شئ قدرا، يبلى و يعنى غيروجهه الحى القيوم الذى يحيا ويبقى، ان الله تعالىٰ بعث انبياء و رسلا، فجعلهم حججا على عباده عذرا و نذرا، لا يطاع الا بعلمه و اذنه، يمن بالطاعة على من يشاء من عباده، ثم يثيب عليها، كل شئ عددا واحاط لكل شئ علما، واشهد الله لا الٰہ الا الله وحده لا شريك له واشهدان محمدا عبده و رسوله امام الهدى النبى المصطفى۔ (جمہرۃ خطب: ۱/۱۷۵)

"تمام حمد اس کے لئے ہے جو سارے عالم کا رب ہے، جس نے ہمارے نیچے زمین کی سات تہیں بچھائیں اور ہمارے اوپر آسمان کے سات طبق بلند کئے، اور ان کے درمیان مخلوق پیدا کی، اور ان سے ہمارے لئے رزق نازل کیا، پھر ہر چیز کے لئے ایک وقت متعین کیا، جس میں وہ بوسیدہ بھی ہوتی ہے اور فنا بھی، سوائے اس حی و قیوم ذات کے جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ و باقی رہے گی۔ اسی نے انبیاء و رسل بھیجے اور ان کو اپنے بندوں پر دلیل بنایا جو مدد کرنے والے ہیں اور ڈرانے والے، اس کے علم و اجازت سے اطاعت کی جاتی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے فرمانبرداری کی توفیق بخش کر اس پر احسان کرتا ہے اور وہی فرمانبرداری کا بدلہ دینے والا ہے۔ ہر چیز اس کی حد شمار میں ہے اور ہر شئ اس کے احاطہ علم میں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، جو ہدایت کے امام اور منتخب نبی ہیں"۔

فتح و کامرانی کا نشہ بڑے بڑوں کو مدہوش کر دیتا ہے، لیکن درس گاہ نبوت کے تربیت یافتہ جاں نثاروں کی جماعت فتح و کامرانی کے بعد بھی ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں اور عنایتوں کو ہی اپنی کامیابی کا سبب قرار دیتی ہے۔

۲۷ھ/۶۴۳ء میں افریقا کی فتح کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (اھ - ۷۳ھ/۶۲۲ - ۶۹۳ء) نے حضرت عثمانؓ کے حکم سے مدینہ منورہ میں جو خطبہ دیا تھا اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی اس قدرت و حاکمیت اور انعام و اکرام کا ذکر فرمایا تھا:

"تمام حمد اسی اللہ کے لئے ہے جس نے ہمارے دلوں کو جوڑا اور ہمیں نفرتوں کے بعد ایک دوسرے کا دوست و محبوب بنا دیا، جس کی نعمتیں ختم نہیں ہو سکتیں، اور جس کا ملک زائل نہیں ہو سکتا، اسی کے شایان شان اس کی حمد ہے، جس کو خود اسی نے بیان کیا ہے، اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے علم سے منتخب فرمایا، اور آپ کو اپنی وحی کا امین بنایا، اور لوگوں کو آپ کی اعانت کے لئے چنا، اور ان کے دلوں میں آپ کی تصدیق و محبت جاگزیں فرمائی..... (پھر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نوازشوں کے ذریعہ فتح کی داستان سنانے کے بعد فرمایا)۔ اللہ کے بندو! اللہ کی نعمتوں پر اس کی حمد کرو کہ اس نے اپنی اس زبردست قوت کے ذریعہ جس سے کوئی مجرم قوم بچ نہیں سکتی اپنے دشمنوں سے چھین کر پورا ملک تمہارے سپرد کیا۔ اس پر اس کی حمد و ثنا لازم ہے"۔ (العقد الفرید، ۲، ص ۱۴۹)

روم کی فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، حضرت عمر فاروقؓ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں،

"بے شک بڑی نعمتوں والے اور فضل و احسان والے اللہ نے مسلمانوں پر سرزمین روم کو کھول دیا اور اس پر فتح دی"۔ (فتوح الشام: ص ۱۴۳)

معبود حقیقی

جس پروردگار کے اپنے بندوں پر اس قدر احسانات و انعامات ہوں اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود و مسجود بننے کا مستحق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ فکر تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابہ کرام کے ذہن و دماغ میں پیوست ہو چکی تھی اور اس کی ذات بابرکت کے علاوہ کسی دوسرے کو معبود تسلیم کرنے کا شائبہ بھی ان کے ہاں پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس حقیقت کا اظہار بھی ان کے خطبات و رسائل میں جگہ جگہ ہوتا ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ (م ۲۱ھ/۶۴۲ء) حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"انی احمد الیک اللہ الذی لاالٰہ الاھو"۔ (سیرۃ ابن ہشام، ۳۸۳/۲) میں آپ کو گواہ بنا کر اس اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

حضرت ابوعبیدہؓ خلیفہ وقت حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں اہل حمص سے مصالحت کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں آپ کے سامنے اس اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ امیرالمومنین! تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے شام کا بہترین علاقہ ہمارے اور آپ کے سپرد کیا، ہم اس مالک الملک اور لشکروں کے مددگار اللہ کے سامنے اپنی مرادیں مانگا کرتے ہیں"۔ (فتوح الشام: ص ۱۲۱)

حضرت زید بن حصین الطائی عہد جاہلیت میں جن کی خطابت و شاعری کا شہرہ تھا۔ مشرف باسلام ہونے

کے بعد اپنے ایک خطبہ میں اللہ تعالیٰ کے معبود حقیقی ہونے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

"تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لئے ہیں، یہاں تک کہ وہ راضی ہو جائے، اور ہمارے پالن ہار اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں"۔ (جمہرۃ خطب العرب ۱/۱۴۶)

اسی وصف کا اظہار حضرت حسن بن علیؓ (۳ھ - ۵۰ھ/ ۶۲۴ء-۶۷۰ء) نے اپنے خطبہ میں اس طرح فرمایا:

الحمد لله لااله غيره، ولاشريك له، ثم قال! مماعظم الله عليكم من حقه و اسبغ عليكم من نعمه، ما ل ايحصى ذكره ولا يؤدى شكره، ولايبلغه قول ولاصفة (جمہرۃ خطب ۱/ ۱۵۳)

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور اس کا کوئی شریک نہیں اللہ نے تم لوگوں پر جتنے حقوق جتلائے اور جس قدر نعمتوں سے سرفراز کیا اس کو نہ تو شمار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کا شکر ادا کیا جا سکتا ہے۔ کوئی تعریف اور کوئی قول اس کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا"۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے بیت المقدس کے راہب و پادری کے نام جو خط لکھا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کے معبود خالص و منعم حقیقی ہونے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

سلام على من اتبع الهدى، وآمن بالله العظيم الذى لا اله الا هو، و محمد صلى الله عليه وسلم فالانثى على ربنا خيرا، و نحمده حمدا كثيرا كما رحمنا بنبيه و شرّفنا برسالته، واكرمنا بدينه واعزنا بطاعته، واكرمنا بتوحيده، والاخلاص بمعرفة ... تعالىٰ الله عما يقولون علوا كبيرا .. والحمد لله الذى قتل بطارقتكم، وسلب عزكم، وطرد من هذه البلاد ملوككم، واورثنا ارضكم و دياركم واموالكم۔ (فتوح الشام ص ۱۴۷)

"سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی اتباع کی، اور عظمت والے اللہ پر ایمان لایا، جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، ہم اپنے پروردگار کی بے پناہ حمد و ثناء بیان کرتے ہیں جیسا کہ اس نے ہم پر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ رحم فرمایا، اپنے پیغام سے ہمیں مشرف کیا، اپنے دین کے ذریعہ ہمیں عزت بخشی، اپنی طاعت و فرمانبرداری کے ذریعہ ہمیں معزز بنایا، اپنی توحید خالص اور شرک بیزاری کے ذریعہ مکرم کیا، ہم اس کے علاوہ کسی کو حاجت روا نہیں سمجھتے، اور اس کو چھوڑ کر کسی کو معبود نہیں بناتے، ہم اس اللہ کی تعریف کرتے ہیں جس نے تمہارے راہب و پیشوا کو ہلاک کیا، تمہاری عزت ختم کی، اور اس ملک سے تمہاری آمریت ختم کر کے ہم کو تمہاری دولت و ثروت اور علاقہ و زمین کا وارث بنایا"۔

ان کے علاوہ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی محاسب و نگراں ہونے، رزاق و وہاب ہونے، مالک و حاکم ہونے، رحمن و رحیم ہونے، ناصر و مددگار ہونے اور دیگر متعدد صفات ربانی ہیں جو حضرات صحابہ کرام کی زبان و قلم پر اکثر جاری رہتیں اور ان کے اقرار و اعتراف سے قرون خیر کے پاکیزہ نفوس کو یک گونہ سکون و اطمینان ملتا جو ان کے عقیدۂ راسخ اور ایمان کامل کا پتہ دیتا ہے، اور اخلاف کو یہ باور کراتا ہے کہ خداوند قدوس کی عظمت و کبریائی اور قدرت کاملہ کا اعتراف و اقرار اقوال و اعمال دونوں سے ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعہ قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملتا ہے، اور شیطان رجیم کے حوصلے پست ہوتے ہیں، مثلاً حضرت عقیل بن ابی طالبؓ (م ۶۰ھ/۶۶۸ء) حضرت علیؓ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"بے شک اللہ ہر برائی سے آپ کی نگرانی کرنے والا ہے، اور ہر ناپسندیدہ چیز اور حال پر آپ کی حفاظت فرمانے والا ہے"۔ (اغانی: ۱۵/ ۴۴)

حضرت بشیر بن عمروؓ بن محصن انصاری ۳۶ھ میں امیر معاویہ (۲۰ ق ھ - ۶۰ھ/ ۶۰۳ء - ۶۸۰) کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"بے شک اللہ عز و جل آپ کے ہر عمل کا محاسب اور کاموں کا بدلہ دینے والا ہے"۔ (طبری: ۵/ ۲۴۲)

حضرت ابو درداءؓ (م ۳۲ھ) حضرت سلمان فارسیؓ (م ۳۶ھ/ ۶۵۶ء) کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کے بعد مال و اولاد سے نوازا اور میں متبرک ملک پر فروکش ہوا"۔ (اسد الغابہ: ۲/ ۳۳۱)

حضرت ابوعبید بن مسعود ثقفیؓ حضرت عمر فاروقؓ کے نام ایک خط میں اللہ تعالیٰ کی رزاقیت کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں

"بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں کھانا کھلایا"۔ (طبری: ۴/ ۶۵)

حضرت یزید بن عاصمؓ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

"تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو ختم نہیں ہو سکتیں، وہی ہمارا رب ہے اس سے کوئی چیز بے نیاز نہیں کر سکتی"۔ (طبری: ۶/ ۴۱)

اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد بن ابی بکر امیر معاویہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"اللہ ہی کی طرف سارے معاملات کو لوٹ کر جانا ہے۔ وہی ارحم الراحمین ہے، اور اللہ ہی سے ان چیزوں کی فریاد کی جاتی اور مدد مانگی جاتی ہے جو آپ لوگ بیان کرتے ہیں"۔ (طبری: ۶/ ۵۸)

اس کی نصرت و مدد کا تذکرہ کرتے ہوئے قادسیہ کی فتح کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہا کو اس طرح لکھتے ہیں:

"بے شک اللہ نے اہل فارس کے خلاف ہماری مدد فرمائی اور طویل جنگ اور شدید بھونچال کے بعد ان کے دوسرے ہم مذہبوں کی مانند انہیں بھی شکست دی"۔ (طبری: ۴/ ۱۳۵)

سیدہ عکرشہ بنت الاطرشؓ نے اللہ کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"وہی غیبوں کا جاننے والا ہے، اس کے علاوہ کوئی غیب کا جاننے والا نہیں"۔ (صبح الاعشیٰ ۱/ ۲۵۴)

اموی خلفاء اور ان کے عہد کے صحابہ و علماء کا تصور الٰہ (۶۶۱ء-۷۴۹ء)

خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کا زمانہ تاریخی اعتبار سے سب سے زیادہ نازک، حساس اور اہمیت کا حامل ہے۔ جس کا آغاز شہر قیصرو قبرص کے فاتح، سیدنا عمر فاروقؓ کے سپہ سالار امیر معاویہ بن ابی سفیان کے عہد حکومت ۴۱ھ/ ۶۶۱ء سے ہوا۔

ہر چند کہ اس عہد میں نظام حکومت میں بعض اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں جو حالات و جغرافیائی سیاست

کے سبب تھیں، اور بعض سماجی اور سیاسی، تہذیبی اور مذہبی انقلابات و ارتقاقات بھی جلوہ گر ہوئے جن سے اسلامی آدرش معاشرہ پر زد بھی پڑی تاہم معاشرہ اپنی غالب اکثریت کے لحاظ سے اسلامی رہا۔ اور ان کے ذہین و فطین علمی طبقات و افراد کی اسلامی فکر میں خوبصورت ارتقاء ہی ہوا۔ ان کی فکر تو آئی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اللہ اور رسول پر جاں نثاری ان کا شعار، ایمان و عقیدہ کی پختگی ان کا شیوۂ حیات اور تزکیہ نفس ان کا مقصد زندگی بنا رہا۔ الٰہی تصورات کی جلوہ سامانی اپنی تمام تر صفائی اور پختگی کے ساتھ والیان حکومت اور سربراہان مملکت کے علاوہ اس عہد کی دیگر تمام مقتدر شخصیات پر سایہ فگن رہی، اور معبود حقیقی کی شان الوہیت و ربوبیت کا اظہار ان کے ہر قول و عمل سے ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز میں کسی غیر کی شرکت نہ صرف یہ کہ ناقابل قبول تھی بلکہ اس کے شائبہ کو بھی ذہن انسانی سے نکال پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی رہی۔ ان کے خطبات و رسائل اور تاریخی نگارشات میں ان کی فکر و عقیدہ کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہے جس میں اسماء حسنیٰ کی تفسیر اور صفات ربانی کی تذکیر کثرت سے کی جاتی۔ اور اس کے ذریعہ ایمان کی پختگی، عقائد کی اصلاح و درستگی، قرآن حکیم سے تعلق و شیفتگی اور الٰہی تصورات سے مسلمانوں کی وابستگی کو مضبوط و مستحکم بنانے کی فکر کرتے رہے کیونکہ صفات ربانی میں غیروں کی شمولیت ہی شرک کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

ذیل میں اس عہد کی تاریخی تحریرات بالخصوص خطبات و مکاتیب میں جہاں کہیں بھی صفات الٰہی کا ذکر ملا اس کو شخصیات و صفات کی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اور آغاز اس عہد کے بزرگ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے خطبات و مکاتیب میں بیان کردہ صفات حسنیٰ سے کیا جاتا ہے تاکہ اس عہد کے الٰہی تصورات واضح اور صاف شکل میں ہمارے سامنے آسکیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۳ ق ھ۔ ۶۸ھ/۶۱۹ء۔ ۶۸۷) کے خطبات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اپنے ایک خطبہ میں انہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت و جلال اور انعام و اکرام کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

الحمد لله الذی ألهمنا ان نحمده، واستوجب علینا الشکر علی آلائه و حسن بلائه، واشهد ان لا اله الا الله وحده لاشریك له، وان محمدا عبده و رسوله ... ان الله جل ثناء ه وتقدست آسماؤه اختار محمدا صلی الله علیه وسلم لرسالته واختاره لوحیه و شرفه علی خلقه ... وهو العلیم الخبیر، و استغفرالله لی ولکم. (جمہرۃ خطب العرب: ۲/۲۳۳)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے اپنی حمد و ثناء کی توفیق بخشی، اور اپنی نعمتوں اور نوازشوں پر شکر ادا کرنا لازمی بتایا، میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ وحدہ لاشریک کے کوئی معبود نہیں اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ بے شک وہ اللہ جس کی حمد و ثناء جلیل اور اسماء پاکیزہ اور مقدس ہیں اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رسالت کے لئے اختیار کیا، اور اپنی وحی کے لئے ان کو منتخب فرمایا، اور اپنی تمام مخلوقات پر انہیں عزت بخشی، وہی دانا و بینا اور علیم و خبیر ہے، میں اپنے لئے اور تم لوگوں کے لئے اسی اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں"۔

ایک موقع پر اس کی جلالت شان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"بے شک وہ اللہ جس کی حمد و ثنا جلیل، جس کے اسماء مقدس ہیں اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے اصحاب سے نوازا جو انہیں اپنی جانوں اور مالوں پر ترجیح دیتے ہیں، اور اللہ نے ان کے ذریعہ سے شرک کو ذلیل و رسوا کیا۔ اس کی روح کو بے نام و نشان اور اس کے نشانات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا"۔ (مروج الذہب: ۸۴/۲)

امیر معاویہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"بے شک سارے عالم کے پروردگار اللہ سے ہی امان کی دعا کی جا سکتی ہے"۔ (الامامة والسیاسة: ۱۳۱/۱)

حضرت عبداللہ بن عمر فاروقؓ (۱۰ ق ھ ۔ ۷۳ھ/ ۶۱۳ء۔ ۶۹۲ء) اپنے ایک خطبہ میں اللہ کی نعمت عظمیٰ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اپنے دین سے نوازا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سربلند و باعزت بنایا"۔ (جمہرۃ خطب العرب ۲۳۵/۲)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (اھ ۔ ۷۳ھ/ ۶۲۲ء ۔ ۶۹۲ء) نے اپنے ایک خطبہ میں انہیں اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اپنا دین سکھایا اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عزت بخشی۔ میں اس کی حمد بیان کرتا ہوں جو قدیم اور افضل ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں"۔ (جمہرۃ خطب العرب ۲۳۵/۲)

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ (اھ ۔ ۸۰ھ/ ۶۲۲ء ۔ ۷۰۰ء) اپنے خطبہ میں صفت ربانی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

الحمد لله اهل الحمد و منتهاه، نحمده الى الهامنا حمده، و نرغب اليه فى تادية حقه، واشهدان لا الہٰ الا الله واحدا صمدا، لم يتخذ صاحبة ولاولدا وان محمدا عبده و رسوله صلى الله عليه وسلم"۔ (جمہرۃ خطب العرب: ۲۳۴/۲)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو حمد کے لائق ہے، اور اسی پر حمد و ثناء کا منتہا ہے، ہم اس بات پر اس کی حمد بیان کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اپنی حمد و ثنا کی توفیق بخشی، اور اپنے حق کی ادائیگی میں اس کی طرف مائل کیا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو یکتا و تنہا اور پاک و بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ بیٹا۔ اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں"۔

خلافت بنو امیہ کے امیر معاویہ جو لشکر اسلامی کے سپہ سالار اور امت اسلامیہ کے امیر تھے ان کے خطبات و مکاتیب نسبتاً زیادہ ہیں جنہیں صفت وار پیش کیا جاتا ہے۔

عظمت و قدرت

عظمت و بڑائی اور قدرت و حاکمیت اللہ تبارک و تعالیٰ کا وہ وصف عالی ہے جس کا اعتراف و اقرار

اس کو معبود حقیقی تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے، امیر معاویہ اس کی عظمت و قدرت کا اعتراف اپنے ایک خطبہ میں اس طرح کرتے ہیں:

الحمد لله الذی دنا فی علوّه وعلا فی دنوّه، و ظهد و بطن، وارتفع فوق کل ذی منظر، هوالاول والآخر و الظاهر والباطن، یقضی فیفصل، ویقدرفیخفر، ویفعل مایشاء، اذا اراد امرا احصاه و اذا عزم علی شئ قضاه، لایؤامراحدا فیما یملك ولایسال عما یفعل، وهم یسئالون، والحمد لله رب العالمین علی ما وحبنا و کرهنا"۔ (جمہرۃ خطب: ۱۸۸/۸)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو اپنی رفعت و بلندی کے باوجود قریب اور قربت کے باوجود بلند ہے، موجود بھی ہے اور مخفی بھی، ہر نگاہ سے وہ بلند ہے، وہی اول و آخر ہے، وہی ظاہر و باطن ہے، دوٹوک فیصلہ کرتا ہے، غلبہ و قدرت کے باوجود مغفرت کرتا ہے، اپنے مرضی سے جو چاہے کرے، جب کسی معاملہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کر گزرتا ہے، اس کے عزائم کی تکمیل میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی، اپنے معاملات میں نہ تو کسی سے مشورہ کرتا ہے اور نہ ہی اس کے کئے پر اس سے سوال کیاجا سکتا ہے، جبکہ لوگوں سے سوال کیا جائے گا، ہم اپنی پسند اور ناپسند ہر چیز پر اسی سارے عالم کے پروردگار کی تعریف کرتے ہیں"۔

حضرت یعلیٰ بن امیہ (۳۷ھ/۶۵۷ء) کو خط لکھتے ہوئے اللہ کی عظمت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"عظیم الشان حمد و ثناء والا اللہ اپنے دین میں کوئی عذر پسند نہیں کرتا"۔

انتہائی شدید گرمی میں جمعہ کے خطبہ کے دوران لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"بزرگ و برتر اللہ نے تم لوگوں کو پیدا فرما کر فراموش نہیں کیا، اور نصیحت کرنے کے بعد غافل بھی نہیں ہوا ہے۔ پھر اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی:

یآ ایها الذین آمنوا اتقوالله حق تقاته، ولا تموتن الا وانتم مسلمون"۔

"اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور نہ مرو مگر صاحب ایمان ہو کر"۔ (العقد الفرید: ۱۴۰/۲)

امیر معاویہ نے ہی ایک موقع پر فرمایا:

"بے شک اللہ نے ہر چیز کے لئے اصل اور ہر خیر کے لئے اہل بنایاہے"۔ (مروج الذہب: ۱۳۲/۲)

منعم و محسن

اس قادر مطلق نے اپنے تمام ترغلبہ و قدرت کے باوجود انسانوں پر جو انعام و اکرام فرمایا۔ خاص طور سے مسلمانوں کو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نعمت دین اور دولت رشد و ہدایت سے سرفراز کیا، اس کا اظہار امیر معاویہ کے خطبات و مکاتیب میں کثرت سے ملتا ہے، ایک موقع پر خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

الحمد لله الذی امرنا بحمده، ووعدنا علیه ثوابه، نحمده کثیرا کما انعم علینا کثیرا واشهدان لا اله الا الله وحده لاشریك له وان محمدا عبده و رسوله.

"تمام حمد اس ذات باری تعالیٰ کے لئے ہے جس نے ہمیں حمد و ثنا کا حکم دیا، اور اس پر اپنے ثواب کا وعدہ فرمایا، جس طرح اسنے ہم پر بے پناہ انعام و اکرام فرمایا، اسی طرح ہم اس کی بہت زیادہ حمد بیان کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ بے شک کوئی پرستش کے لائق نہیں سوائے اللہ واحد کے جو یکتا و تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں"۔ (جمہرۃ خطب العرب ۲/۳۳۳)

حضرت علیؓ کے نام ایک خط میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انعامِ الٰہی کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

"بے شک اللہ بزرگ و برتر نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رسالت کے لئے منتخب فرمایا اور آپؐ کو اپنی وحی کے نزول اور شریعت کی سپردگی کے ذریعہ خاص کیا، جس کے ذریعہ شرک و جہالت کی تاریکی سے نجات دی اور ضلالت و گمراہی سے نکالا، پھر آپؐ کو انسانیت کی رہنمائی اور اپنی حمد بیان کراتے ہوئے اپنی طرف بلایا۔۔۔ پھر پاک بے نیاز اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے اصحاب سے نوازا جنہوں نے آپؐ کے ساتھ نصرت و تائید کا معاملہ فرمایا"۔ (جمہرۃ رسائل العرب: ۱/۳۳۳)

انہیں کے نام ایک دوسرے خط میں انہیں صفات و انعامات کا تذکرہ اس طرح کیا:

"بے شک اللہ نے اپنے علم خاص کے ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب فرمایا اور آپؐ کو اپنی وحی پر امین اور اپنی مخلوق کی طرف رسول بنایا، اور مسلمانوں میں سے ایسے مددگار و جاں نثار آپؐ کے لئے چنے جنہوں نے آپؐ کی مدد و تائید فرمائی"۔ (صبح الاعشیٰ: ۱/۲۲۸)

حضرت حسن بن علی (۳ھ ۔ ۵۰ھ / ۶۲۴ ۔ ۶۷۰ء) کے نام ایک خط کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے منعم حقیقی ہونے اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں تم سے اس اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اما بعد!"

پھر نبی کریمؐ کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ نے آپؐ ہی کے ذریعہ ہلاکت و تباہی سے نجات دی، تاریکی سے روشنی بخشی اور جہالت و گمراہی سے ہدایت کی طرف رہنمائی فرمائی۔ بے شک اللہ ہی سننے والا اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے"۔ (جمہرۃ رسائل: ۲/۱۰)

ایک موقع پر ذوالکلا حمیری کو ہدایت فرما کر اپنی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی نعمت بیکراں اور احسان عظیم کا تذکرہ ایک خطبہ کے ذریعہ اس طرح کرایا:

"صبح و شام بے حد و بے شمار تعریفیں ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے۔ میں اسی کی حمد بیان کرتا ہوں اور اسی سے مدد کا خواہاں ہوں، اسی پر ایمان رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسا کرتا ہوں، ذمہ داری و بھروسا صرف اللہ ہی کا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ عزوجل کے، تنہا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں جن کو اس نے علم و عرفان کا امام بنا کر ہدایت اور دین برحق کے ساتھ اس وقت بھیجا جبکہ معاصی کا غلبہ تھا۔ طاعت و فرمانبرداری ناپید تھی۔ پوری روئے زمین ظلم و جور اور گمراہی و ضلالت سے بھری ہوئی تھی اور فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، اور اللہ کا دشمن

ابلیس پوری روئے زمین پر اپنی عبادت کرانے پر قادر اور باشندگان عالم پر غالب ہو چکا تھا۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس آگ کو بجھایا۔ اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ختم کیا، ابلیس کی طاقت و قوت کو کمزور کر کے رکھ دیا اور غلبہ و سربلندی کی حرص و ہوس سے اس کو مایوس و ناکام بنا دیا۔ اور مشرکوں کی ناپسندیدگی کے باوجود آپؐ کے دین کو سب پر غالب فرمایا۔" (جمہرۃ خطب العرب ۱/۱۶۳)

معبود حقیقی

جس اللہ نے انسانوں پر اس قدر انعام و اکرام کا سلسلہ فرمایا سو وہی اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اس کی پرستش ہو۔ اس کے علاوہ کوئی معبود بننے کا حقدار نہیں۔ امیر معاویہ معبودان باطل سے اپنی بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے جگہ جگہ پر اللہ واحد کی بندگی کا ذکر فرماتے ہیں، اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

ان تمام نعمتوں پر جن سے اللہ نے ہمیں سرفراز کیا ہم اس کی حمد بجا لاتے ہیں، ہر خیر اسی کی جانب سے ہے، اور گواہی دیتا ہوں کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے ہر شے کو اسی کے آگے جھکنا ہے۔ (العقد الفرید: ۲/۱۴۰)

ایک موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

الحمد للہ ولی النعم و منزل النقم ، واشھد ان لا الہ الا اللہ المتعال عما یقول الملحدون علوا کبیرا۔

(عیون الاخبار: ۲/۲۱۰)

"تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو ساری نعمتوں کا والی اور سزاؤں کا مالک ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس بزرگ و برتر اللہ کے، ملحدین جو کچھ اس سلسلہ میں کہتے ہیں اللہ اس سے منزہ و ماوراء ہے"۔ امیر معاویہ ہی اپنے عمال کے نام ایک خط میں انعام خداوندی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے معبود حقیقی ہونے کا اعلان اس طرح کرتے ہیں:

"میں تم لوگوں سے اس اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے تم لوگوں کو تمہارے دشمنوں کے بوجھ اور حملے اور تمہارے خلیفہ کے قتل سے روکا"۔

(جمہرۃ رسائل العرب: ۲/۱۴)

حضرت حسنین رضی اللہ عنہما

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے نواسوں اور کمسن صحابیوں حضرات حسن اور حسین ابن علی رضی اللہ عنہم کے خطبات و مکاتیب بھی اوصاف باری کے ذکر و تذکرے سے خالی نہیں۔ تاریخ نے ان کے خطبات و رسائل کو کسی حد تک اپنے صفحات میں محفوظ کر رکھا ہے، حالانکہ سیاسی بحران کے باعث دیگر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کم ہیں، تاہم جس قدر بھی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے واحد و یکتا، مالک الملک، منعم و محسن، ہادی و رہبر، پناہ دینے اور معبود حقیقی ہونے کی صفات کا تذکرہ غالب نظر آتا ہے۔

حضرت حسن بن علیؓ (۳ھ - ۵۰ھ / ۶۲۴ء - ۶۷۰ء) نے ایک موقع پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے

اللہ تعالیٰ کی وحدت و ربوبیت اور منشا و قدرت کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

الحمد لله الذی توحّد فی ملکه و تفرد فی ربوبیته یؤتی الملك لمن یشاء وینزعه عمن یشاء، والحمد لله اکرم بنا مؤمنکم، واخرج من الشرك اولکم و حقن دماء آخرکم

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو اپنی بادشاہت میں یکتا اور ربوبیت میں منفرد ہے، جس کو چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے تمام تعریفیں اسی اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمارے ذریعہ سے تمہارے ایمان والوں کو مکرم بنایا، تمہارے اگلوں کو شرک سے نکالا اور بعد والوں کو خون بہانے سے بچا لیا"۔

ایک دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام اور اس کی رشد و ہدایت کو اس طرح بیان فرمایا:

"جب بھی کوئی تعریف کرنے والا اللہ کی حمد بیان کرے میری حمد اس کی تعریف کے ساتھ ہے، اور جب کوئی گواہی دینے والا اس کی وحدانیت کی شہادت دے تو میری شہادت بھی اس کے ساتھ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، جن کو اس نے حق کے ساتھ بھیجا اور اپنی وحی کا امین بنایا"۔ (جمہرۃ خطب: ۲/۴)

ایک موقع پر فرمایا:

"اے لوگو! بے شک اللہ نے ہمارے اگلوں کے ذریعہ تمہارے اگلوں کو ہدایت دی اور ہمارے بعد والوں کے ذریعہ تمہارے بعد والوں کو خون بہانے سے بچا لیا"۔ (طبری: ۱/۹۳)

حضرت حسین بن علی (۴ھ - ۶۱ھ / ۶۲۵ - ۶۸۰ء) امیر معاویہ کے نام ایک خط میں خداوند قدوس کی صفت ہدایت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

ان الحسنات لا یهدی ولا یسدد الیها الا الله تعالیٰ . واعلم ان لله کتابا لا یغادر صغیرة و کبیرة الا احصاها۔ (الامامۃ والسیاسۃ: ۱/۱۳۱)

"بے شک اللہ تعالیٰ ہی حسنات کی توفیق عطا فرماتا ہے، اور اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔۔۔ جان لیجئے کہ اللہ کی کتاب (نامہ اعمال) میں ہر چھوٹی اور بڑی چیز موجود و محفوظ ہے"۔

حضرت عمرو بن سعید کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہوئے حضرت حسینؓ لکھتے ہیں:

فانه لم یشاحق الله و رسوله من دعا الی الله عزوجل، و عمل صالحا وقال اننی من المسلمین، وقد دعوت الی الامان والبر والصلة، فخیر الامان امان الله، ولن یؤمن الله یوم القیامة من لم یخفه فی الدنیا، فنسال الله مخافة فی الدنیا توجب لنا امانة یوم القیامة۔ (طبری: ۶/۲۱۹)

"حمد و صلاۃ کے بعد! بے شک جس نے اللہ عز و جل کی طرف بلایا اور عمل صالح کیا اور کہا کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت نہیں کی، آپ نے امان، نیکی اور صلہ رحمی کی طرف دعوت دی، تو جان لیجئے کہ اللہ کی امان ہی بہترین امان ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہرگز اس شخص کو امان نہیں دے گا جس نے دنیا میں اس سے خوف نہیں کھایا، ہم دنیا میں اللہ سے ڈرنے کا سوال کرتے ہیں تاکہ قیامت کے دن ہمارے لئے اس کا امان واجب کر دیا جائے۔

ایک مرتبہ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"بے شک یہ لوگ مہربانی کرنے والے رحمٰن کی اطاعت کو چھوڑ کر شیطان کی فرمانبرداری سے چمٹے ہوئے ہیں"۔ (جمہرۃ: ۲/۴۰۲)

یزید بن معاویہ (۲۵ھ۔ ۶۴ھ/۶۴۵ء۔ ۶۸۳ء)

عہد اموی کے دوسرے امیر یزید بن معاویہ کے خطبات و رسائل میں بھی متعدد اوصاف ربانی کا تذکرہ ملتا ہے جس سے عقیدۂ توحید کی پختگی اور شرک بیزاری کا علم ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک خطبہ میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

الحمد لله احمده واستعينه واؤمن به، واتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا و سيئات أعمالنا، من يهدالله فلا مضل له، ويضلل فلا هادى له، واشهدان لا اله الا الله وحده لاشريك له، وان محمدا عبده و رسوله اصطفاه لوحيه واختاره لرسالة، بكتاب فصله وفضله، واعزه واكرمه، ونصره وحفظه، ضرب فيه الامثال و حلل فيه الحلال، و حرم فيه الحرام، وشرع فيه الدين اعذارًا وانذارًا، لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل.. اوصيكم عبادالله بتقوى الله العظيم الذى ابتداء الامور بعلمه، واليه يصير معادها . نسال الله ربنا والهنا وخالقنا ومولانا ان يجعلنا وآياكم من فزع يومئذ آمنين". (طبری ۶/۱۷۹)

"تمام تعریف اللہ کے لئے ہے، میں اس کی حمد بجا لاتا ہوں، اور اسی سے مدد چاہتا ہوں، اسی پر ایمان رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسا کرتا ہوں، اپنے نفس کے شر اور اعمال کی خرابی سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، جس کو اللہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ واحد کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اور نہ ہی اس کا شریک اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، جن کو اس نے اپنی وحی کے لئے منتخب کیا اور اپنی رسالت کے لئے اختیار کیا، ایسی کتاب کے ذریعہ جس کو مفصل بنایا اور فضیلت بخشی، معزز و مکرم کیا اور اس کی نصرت و حفاظت فرمائی، جس میں ہر طرح کی مثالیں دی ہیں، جس چیز کو اس میں حلال ٹھہرایا گیا وہ حلال ہے اور جس چیز کو حرام قرار دیا گیا وہ حرام ہے، اور دین کو بطور خوشخبری وانذار کے بیان کیا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر حجت بن جائے۔۔۔ اے اللہ کے بندو! میں تم لوگوں کو اس عظمت والے اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں جس نے معاملات کو اپنے علم سے شروع کیا اور انجام کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔۔۔ ہم اپنے پروردگار معبود حقیقی اور خالق و مالک اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور تمہیں قیامت کے دن خوف سے محفوظ رکھے"۔

اسی طرح اپنے والد امیر معاویہ کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اعتراف و اقرار کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں فرمایا:

الحمد لله اللذى ماشاء صنع، ومن شاء أعطى ، ومن شاء منع، ومن شاء خفض ومن شاء رفع، ان امير المومنين كان حبلا من حبال الله جده ماشاء ان يمده، ثم قطعه حين ارادان يقطعه، وكان دون من قبله و خيرا ممن

باقی بعدہ. (العقد الفرید:۲/۱۳۲)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے جو چاہا کیا، جس کو چاہا دیا اور جس سے چاہا روک لیا، جس کو چاہا پست کیا، جس کو چاہا بلند کیا، بے شک امیرالمومنین (معاویہ) اللہ کی رسیوں میں سے ایک رسی تھے جس کو جب تک چاہا پھیلائے رکھا اور جب کاٹنا چاہا کاٹ دیا، وہ اپنے اگلوں سے کمتر تھے اور بعد میں آنے والوں سے بہتر"۔

عامل مدینہ کے نام ایک خط میں اسی صفت ربانی کو اس طرح بیان کیا:

"ہم اللہ تبارک و تعالیٰ سے شکر کی توفیق چاہتے ہیں اور اس کی حمد بجا لانے کی استدعا کرتے ہیں، اور دنیا و آخرت دونوں جگہ خیر کا سوال کرتے ہیں، آخرت میں بہترین ٹھکانہ اور بدلہ کی فریاد کرتے ہیں، بے شک وہی اس کا ولی و مالک ہے، اور ہر چیز اسی کے قبضہ و قدرت میں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، طاقت و قوت صرف اللہ ہی کے لئے ہے"۔ (الامامۃ والسیاسۃ، ۱۳۹/۱)

خانوادۂ مروانی کے خلیفہ اور دوسرے حکمراں عبدالملک بن مروان (۲۶ھ ـ ۸۶ھ / ۶۴۲ء ـ ۷۰۵ء) کا تصوراللہ ان کے ایک خطبہ میں اس طرح ظاہر ہوا۔

"اے لوگو! بے شک اللہ نے حدود کو متعین کر دیا ہے، اور قانون کو فرض قرار دیا ہے"۔ (العقد الفرید:۴/۲۶۳)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خاندان مروانی کے گل سرسبد اور پانچویں خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (۶۱ھ ـ ۱۰۱ھ / ۶۸۱ء ـ ۷۲۰ء) نے اپنے خطبات و مکاتیب میں جن صفات الٰہیہ کو پیش فرمایا ان میں اللہ تعالیٰ کے خالق و قادر، حاکم و منعم، ملجا و ملاذ، حسیب و نگراں، اور معبود حقیقی جیسی صفات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

والیٔ بصرہ عدی بن ارطاۃ (م ۱۰۲ھ/ ۷۲۰ء) کے نام ایک خط میں پروردگار کی قدرت مطلقہ کے استحضار کو اس طرح بیان فرمایا۔

اذا امکنتك القدرة على المخلوق فاذكر قدرة الخالق القادر عليك واعلم ان مالك عند الله اكثر مما لك عندالناس". (العقد الفرید:۴/۲۷۹)

"جب کبھی بھی تم کو مخلوق پر غلبہ و قدرت حاصل ہو اس وقت اپنے اوپر قدرت رکھنے والے خالق کی قدرت کو یاد کرو، اور جان لو کہ تمہارے لئے جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہارا لوگوں کے پاس ہے"۔

مشہور تابعی فقیہ اور عالم حضرت سالمؒ بن عبداللہ بن عمرؓ (م ۱۰۶ھ/ ۷۲۵ء) کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بے شک میں تم سے اس اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ بلاشبہ بابرکت نام والے عالی مرتبت اللہ نے مجھے تمہارے معاملے کے ذریعہ آزمائش میں مبتلا فرمایا۔ کسی کے مشورے اور طلب کے

بغیر یہ نہایت رحم کرنے والے مہربان کا فیصلہ ہے"۔ (سیرۃ عمر لابن الجوزی ص ۱۲)

ایک موقع پر فرمایا:

"اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی زبان سے جس چیز کو حلال قرار دیا وہ قیامت تک حلال ہے اور جس چیز کو حرام قرار دیا وہ قیامت تک کے لئے حرام ہے"۔ (مروج الذہب ۲: ۱۹۶)

اپنے صاحبزادے عبدالملک (م ۱۰۱ھ / ۷۱۹ء) کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"بے شک قابل تعریف اللہ نے ہمارے اور عام لوگوں کے ساتھ اور تمام معاملات میں بے پناہ احسان فرمایا، اور باقی نعمتوں کا پورا کرنا بھی اسی کے ذمہ ہے۔ (سیرۃ عمر لابن الجوزی ص ۲۵۹)

عامل خراسان عبدالرحمن بن نعیم کے نام خط میں لکھتے ہیں

"بے شک اللہ کے علاوہ کوئی پناہ گاہ اور ٹھکانہ نہیں ہے"۔ (طبری ۸: ۱۳۵)

ایک موقع پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہی اپنے عمال کو خطاب کرتے ہوئے اس طرح فرمایا

فکان العباد قد عادوا الی اللہ، ثم ینبئهم بما عملوا، لیجزی الذین اساؤا بما عملوا و یجزی الذین احسنوا بالحسنی، فانه لا معقب لحکمه و لا منازع لامره وانی اوصیك بتقوی اللہ واحثك علی الشكر فیما اصطنع عندك من نعمه، وآتاك من كرامته، فان نعمه یمدها شكره، ویقطعها كفره"۔ (سیرۃ عمر لابن الجوزی، ص ۲۱۸)

"بندوں کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے، پھر وہ ان لوگوں کو ان کے اعمال سے باخبر کرے گا تاکہ جن لوگوں نے برے اعمال کئے ہیں ان کو ان کی کرتوت کا بدلہ دے اور جن لوگوں نے اچھے کام کیے ہیں ان کی اچھائی کا انعام دے، بے شک وہ اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹنے والا اور اپنے معاملے میں جھگڑنے والا نہیں ہے"۔ میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، اور اس نے اپنے جن انعامات سے تمہیں نوازا ہے ان پر اس کا شکر ادا کرنے کی تلقین کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے سے نعمتیں اور بڑھتی ہیں اور اس کی ناشکری نعمتوں کو ختم کر دیتی ہے۔

اپنے جانشین یزید بن عبدالملک (۷۱ھ - ۱۰۵ھ / ۶۹۰ - ۷۲۴ء) کے نام خط میں تحریر فرماتے ہیں:

بے شک میں تم سے اس اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، مجھے معلوم ہے کہ جن چیزوں کا مجھے والی بنایا گیا ہے اس کے سلسلہ میں میں ذمہ دار ہوں۔ دنیا و آخرت کا مالک اس پر مجھ سے محاسبہ کرے گا، اور میں اپنے عمل میں سے کچھ بھی اس سے چھپا نہیں سکتا۔ اگر مہربان آقا مجھ سے راضی ہو گیا تو میں کامیاب ہوں اور طویل غم (جہنم) سے نجات پا گیا اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہو گیا تو میری تباہی و بربادی ہے۔ میں اس اللہ سے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی رحمت کاملہ سے مجھے جہنم سے پناہ دے اور اپنی رضا و خوشنودی اور جنت کے ذریعہ مجھ پر احسان فرمائے۔ تمہارے لئے ضروری ہے کہ اللہ سے ڈرو، رعیت کا خیال رکھو، میرے بعد جلد ہی تم بھی لطف و کرم والے باخبر پروردگار سے جا ملو گے"۔ (سیرۃ عمر ص ۲۷۷)

مہلب بن ابی صفرہ ازدی

عہد اموی کی مشہور شخصیت، حضرت علیؓ کے مقرب، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے معتمد خاص اور خوارج

کے ممتاز حریف "مہلب بن ابی صفرہ" (۷ھ - ۸۳ھ / ۶۲۸ء - ۷۰۲ء) نے بھی اپنے رسائل میں متعدد صفات الٰہی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ حجاج بن یوسف ثقفی (۴۰ھ - ۹۵ھ / ۶۶۰ء - ۷۱۴ء) کے نام ایک خط میں اللہ رب العزت کی حاکمیت و ربوبیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ الکافی بالاسلام فقد ما سواہ المعجل النقمة لمن بغاہ، الذی حکم بان لا ینقطع المزید منہ حتی ینقطع الشکر من عبادہ والحمد للہ رب العالمین"۔ (الکامل للمبرد ۲/ ۲۳۲)

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے، تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوسری چیزوں سے کفایت کرنے والا ہے، جو اپنے باغیوں کو بہت جلد سزا دینے والا ہے جس کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کا فضل و کرم اس وقت تک بند نہیں ہو سکتا جب تک اس کے بندے شکر سے نہ رک جائیں۔۔۔ اور تمام تعریف سارے عالم کے رب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے"۔

امیر بصرہ "حارث بن عبداللہ (م ۵۰ھ / ۶۷۰ء) کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو سارے عالم کا پروردگار ہے جس کے حکم سے نصرت و حمایت کا فیصلہ ہوتا ہے، وہی غالب حکمت والا ہے"۔ (الکامل للمبرد ۲/ ۱۸۹)

انہیں کے نام دوسرے خط میں جسے سرزمین اہواز کے علاقہ میں خوارج کے ایک طبقہ "ازارقہ" پر فتح کے بعد لکھا تھا، اس میں اللہ کی قدرت اور اس کے معبود حقیقی ہونے کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"بے شک میں تم سے اس اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، تمام تعریف اسی اللہ کے لئے ہے جس نے امیر المومنین کی مدد فرمائی اور فاسقوں کو شکست دی، اور ان پر اپنا عذاب نازل فرمایا، اور بری طرح ہلاک کیا، تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے"۔ (طبری ۷/ ۸۹)

خطبات و مکاتیب کی روشنی میں اب تک جن تصورات الٰہیہ کو پیش کیا گیا ہے یہ وہ ہیں جو اموی عہد کی مقتدر شخصیات کی زبان و قلم سے ظاہر ہوئے، جو شخصیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے اس کے مستحق تھے کہ انہیں الگ الگ سلسلہ وار بیان کیا جائے۔ اب ذیل میں اس عہد کے دیگر علماء صلحاء، ادباء اور امراء کے خطبات و رسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے، جن میں سے ہر ایک اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے، لیکن خطبات و رسائل کے دفتر میں جامعین و مرتبین کے ذوق اور اصل موضوع اور مقصد سے دلچسپی کے باعث صفات الٰہی اور تحمید و تسلیم کا حصہ اکثر و بیشتر حذف کر دیا گیا، تاہم جس قدر بھی دستیاب ہو سکا اس سے ان کے الٰہی تصورات، توحیدی نظریات اور ربانی صفات کی تذکیر و تفسیر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، انہیں صفت کے اعتبار سے ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے۔

القادر

یہ وہ صفت ربانی ہے جس کا اعتراف و اقرار طاغوت کا انکار کر کے معبودان باطل کو یہ باور کراتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ غالب و قادر ہستی ہے جس کی منشاء و مرضی کا ہر چیز میں دخل ہے، کوئی طاقت و قوت اس کی قدرت کو محدود نہیں کر سکتی، اس کا غلبہ و اقتدار ہر ایک پر مستحکم ہے، کوئی اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتا، اس

عہد کے خطبات و رسائل میں اس وصف کا اظہار جابجا ملتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اموی خلافت کے اولین دور میں مدینہ منورہ کے گورنر اور خانوادۂ مروانی کے بانی حضرت مروان بن حکم (۲ھ - ۶۵ھ / ۶۲۳ء - ۶۸۵ء) جو اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے اس کے مستحق تھے کہ انہیں عبدالملک بن مروان سے پہلے بیان کیا جاتا اور اسی طرح زبیر معززین بھی جو اس فہرست میں شامل ہیں، مگر ان کے خطبات و رسائل کے ذخیرے سے تحمید کے حصہ کو حذف کر دینے کی وجہ سے تصورات الٰہیہ کا حصہ بہت مختصر رہ جاتا ہے، اس لئے انہیں اس ضمن میں شامل کیا گیا۔ حضرت مروان بن حکم کے ایک خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

"بے شک اللہ عظیم مرتبہ والا ہے۔ کوئی بھی صاحب اقتدار اس کی قدرت کاملہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اس کے مرتبہ کو پہنچ سکتا ہے۔ اپنی مخلوق میں سے اس نے نیک بندوں کو پیدا کیا، اور ان کو اپنے دین کی حفاظت کے لئے مضبوط ستون بنایا"۔ (عیون الاخبار: ۲/۲۱۰)

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ کے نام ایک خط میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں:

"بے شک عزت و جلال والے اللہ نے جب اس دنیا کو پیدا کرنا چاہا تو پیدا کیا اور اس کی مدت بہت مختصر رکھی، گویا اس کی پوری مدت دن کی ایک گھڑی ہے، پھر دنیا اور اس کے باشندوں پر فنا کا فیصلہ فرمائے گا، اس نے خود کہا ہے کہ ہر چیز کو ہلاک ہونا ہے سوائے اس صاحب ذوالجلال کے، اس کا فیصلہ اصل فیصلہ ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔ (سیرۃ عمر لابن الجوزی، ص ۱۲۷)

حضرت علیؓ کے غیر فاطمی فرزند اکبر اور وقت کے امام و فقیہ حضرت محمد بن حنفیہؒ (۲۱ھ - ۸۱ھ / ۶۴۲ء-۷۰۰ء) نے اپنے ایک خطبہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور قدرت و طاقت کا اظہار اس طرح فرمایا:

"تم لوگوں نے ہماری جن فضیلتوں کو جن سے اللہ نے ہمیں نوازا ہے بیان کیا ہے، تو جان لو کہ بے شک اللہ ہی جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے، وہ بڑا فضل و کرم والا ہے، تمام تعریف اسی اللہ کے لئے ہے، اور شہادت حسینؓ کے ذریعہ ہمیں پہنچنے والی تکلیف و مصیبت کو جو تم لوگوں نے بیان کیا تو یہ فیصلہ خداوندی ہے۔ اور یہ واقعہ عظیم جو ان کے ساتھ پیش آیا یہ باعزت و شرف ہے، جس کی طرف اللہ ہی نے ان کی رہنمائی فرمائی، اسی کے ذریعہ قوموں کے درجات اس کے نزدیک بلند اور پست ہوتے ہیں، اور اللہ کا معاملہ تو ہو کر ہی رہتا ہے، اس کا معاملہ تو اٹل ہے"۔ (طبری: ۷/۹۷)

صحابی رسولؐ حضرت شداد بن اوس الطائیؓ (م ۵۸ھ/۶۷۷ء) نے فرمایا:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے اپنی اطاعت کو اپنے بندوں پر فرض قرار دیا اور متقیوں کے لئے اس کو اپنی خوشنودی بنایا، اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں ہی اس کی رضا اور خوشنودی ہے اگلوں اور پچھلوں سب کے لئے، بے شک آخرت کا وعدہ سچا ہے کہ جب قادر مطلق بادشاہ کل فیصلہ فرمائے گا"۔ (البیان والتبیین: ۲/۲۲۰)

خالد بن صفوان (م ۱۳۳ھ/۷۵۰ء) نے امیر عراق یوسف بن عمر ثقفی (م ۱۲۷ھ/۷۴۵ء) کی موجودگی

میں داروغہ زنداں بلال بن بردہ بن ابی موسیٰ اشعریؒ (م۱۲۶ھ/۷۴۳ء) کو خطاب کرتے ہوئے کہا

"تمام تعریف اس اللہ کی ہے جس نے تمہارے غلبہ کو ختم کیا، تمہاری عزت و ناموس کو خاک میں ملایا، حسن و جمال کو برباد کیا اور تمہاری حالت بدل کر رکھ دی"۔ (زہر الآداب: ۲/۱۹۰)

والی حجاز ابوحمزہ یحییٰ بن مختار الشاری نے اہل مدینہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا

الحمد لله رب العالمين سمعنا داعيا يدعوا الى طاعة الرحمن . ان الله قدجعل لكل شئ سببا غالبا، بقادله ويطيع امره وجعل القلوب غالبة على الابدان، فاذا مالت القلوب ميلا، كانت الابدان لهاتبعا وان القلوب لاتلين اهلها الابصح تها، ولا يصحها الاالمعرفة بالله (اغانی ۲۰/۱۰۵)

"تمام تعریف رب العالمین کے لئے ہے، میں نے اس پکارنے والے کی آواز سنی جو مہربان آقا کی اطاعت کی طرف بلاتا ہے۔ بے شک اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک بڑا سبب بنایا ہے، اسی کے لئے جھگڑے ہوتے ہیں اور اسی کے معاملے کی اطاعت کی جاتی ہے، اس نے دلوں کو جسموں پر غالب بنایا، جدھر دل مائل ہوتے ہیں بدن اسی کی اتباع کرتے ہیں، لوگوں کی نرمی دلوں کی صحت پر منحصر ہے، اور اس کی صحت معرفت الٰہی اور نیت کی درستی سے حاصل ہوتی ہے"۔

مشہور ادیب و انشاء پرداز عبدالحمید الکاتب (م ۱۳۲ھ/۷۵۰ء) نے متعدد اوصاف ربانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو اس طرح بیان کیا

الحمد لله العلى مكانه المنير برهانه العزيز سلطانه، الثابته كلماته، الشافية آياته، النافذ قضاؤه، الصادق وعده، الذى قدر على خلقه بملكه و عزفى سمواته بعظمته، و دبرالامور بعلمه، وقدرها بحكمه، على ما يشاء من عزمه، مبتدعا لها بانشائه اياها لايعلم احد بخبايا ها و معادها الا هو، فانه يقول فى كتابه الصادق، وعنده مفاتح الغيب لايعلمها الاهو. ويعلم مافى البر و البحر وما تسقط من ورقه الا يعلمها، ولا حابة فى ظلمات الارض ولارطب ولايابس الا فى كتاب مبين۔ (جمہرۃ رسائل العرب ۲/۵۵۲)

"تمام تعریف اس بلند مکان والے، روشن دلیلوں والے، ثابت شدہ کلمات والے، بے پناہ نشانیوں والے، فیصلے صادر کرنے والے، سچے وعدوں والے اللہ کے لئے ہے جو اپنی مخلوق پر اپنے اختیارات سے فیصلہ کرتا ہے، جو اپنے آسمانوں میں اپنی عظمت کی وجہ سے باعزت ہے۔ اپنے علم خاص سے معاملات طے کرتا ہے اور اپنی حکمت خاص سے جس طرح چاہتا ہے اس کو مقدر کرتا ہے، اس کی تخلیق میں صرف اسی کا عمل دخل ہے، اس کے راز و معاد کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، وہ خود اپنی سچی کتاب میں کہتا ہے، "اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جس کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اس کو صرف وہی جانتا ہے، ایک پتہ بھی اس کے علم کے بغیر نہیں گرتا، زمین کی تاریکی میں ایک دانہ بھی ایسا نہیں اور نہ ہی معمولی سے معمولی چیز جو اس کی کھولنے والی کتاب میں موجود نہ ہو"۔

منعم و محسن

منعم حقیقی نے اپنے بندے پر اپنے انعام و اکرام کی جو بارش نازل فرمائی ہے اور جس طرح اپنی نعمتوں

سے اس کو سرفراز فرمایا ہے اس کا اظہار و شمار بندے کے بس اور اختیار سے باہر ہے۔ پھر بھی ان نعمتوں کو بیان کرنا مخلص و مومن بندے کا ایسا وظیفۂ حیات ہے جس کے ورد، تذکیر سے اس کے دل کو سکون اور روح کو اطمینان ملتا ہے، اس عہد کے خطبات و رسائل میں اس وصف کے بیان کرنے کا خاص اہتمام نظر آتا ہے، جو اکثر و بیشتر متعدد دیگر اوصاف باری مثلاً رحمت و رافت، جود و سخا، فضل و کرم، لطف، غنی اور داد و دہش کے جلو میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ وجود رحمۃ للعالمین اور دولت ایمان و دین کو سب سے بڑی نعمت گردانتے ہیں۔

صحابی رسول حضرت سلیمان بن صرد خزاعی (۲ ق ھ ۔ ۶۵ھ / ۶۲۰ء ۔ ۶۸۴ء) کے معاصر مصر کے مشہور داعی اور تابعی شیخ عبیداللہ بن عبداللہ المری لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اس وصف حقیقی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مخلوق پر اپنی نبوت کے لئے منتخب فرمایا، اور اپنے فضل و کرم سے انہیں سرفراز کیا اور تم لوگوں کو ان کی اتباع و تقلید کے ذریعہ عزت بخشی اور ان پر ایمان رکھنے کی وجہ سے تمہیں مکرم بنایا"۔ (طبری: ۵۷/۷)

والی عراق زیاد بن ابی سفیان (۱ھ ۔ ۵۳ھ / ۶۲۲ء ۔ ۶۷۲ء) امیر معاویہ کے نام ایک خط میں اللہ کے انعام و اکرام کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے تمہیں حق اور سچ سے آگاہ کیا اور صلہ رحمی کی طرف لوٹایا"۔ (جمہرۃ رسائل العرب: ۳۴۴/۲)

طویل وقفہ کے بعد بارش کے نزول پر والی عراق حجاج بن یوسف ثقفی (۴۰ھ ۔ ۹۵ھ / ۶۶۰ء۔ ۷۱۴ء) نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے نام خط میں تحریر فرمایا کہ:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے بارش نازل فرمائی اور مایوسیوں کے بعد اپنی رحمت کو عام کر دیا، وہی والی و حامی اور قابل تعریف ہے"۔ (البیان والتبیین: ۲۳۵/۳)

۸۶ھ میں جب قتیبہ بن مسلم الباہلی (۴۹ھ ۔ ۹۶ھ / ۶۶۹ء ۔ ۷۱۵ء) کو خراسان کا والی مقرر کیا گیا تو انہوں نے وہاں کے باشندوں کے سامنے جو پہلا خطبہ دیا اس میں ان کو جہاد پر ابھارتے ہوئے فرمایا:

"بے شک اللہ نے تم لوگوں کو اس جگہ کا وارث اس لئے بنایا تاکہ اپنے دین کو غالب کرے اور تم لوگوں کے ذریعہ محرمات کا خاتمہ ہو، مال میں اضافہ فرمائے اور دشمن ذلیل و رسوا ہوں، اور اس نے اس پر (جہاد پر) صحیح حدیث اور واضح کتاب کے ذریعہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت کا وعدہ فرمایا اور مجاہدین کے سامنے اپنے راستہ میں بہترین ثواب اور اپنے پاس جمع کئے ہوئے عظیم اجر کا وعدہ کیا"۔ (طبری: ۵۹/۸)

جرجان و طبرستان کی فتح کے بعد یزید بن مہلب ازدی (۵۳ھ ۔ ۱۰۲ھ / ۶۷۳ء ۔ ۷۲۰ء) نے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک (۵۴ھ ۔ ۹۹ھ / ۶۷۴ء ۔ ۷۱۷ء) کو لکھا:

"بے شک اللہ نے امیرالمومنین کو عظیم فتح عطا فرمائی اور مسلمانوں کو بہترین اور عمدہ تحفہ عطا کیا، ہمارے پروردگار کے لئے اس کے انعام و احسان پر بے پناہ حمد و تعریف ہے"۔ (طبری ۱۲۵/۸)

۱۲۵ھ میں خلیفہ ولید بن یزید (۸۸ھ ۔ ۱۲۶ھ / ۷۰۷ء ۔ ۷۴۳ء) نے اپنے فرزند حکم بن ولید کی بیعت کے لئے جو طویل خط مختلف شہروں کو بھیجا اس میں انعامات الٰہی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

بے شک بابرکت ناموں والے، اعلیٰ حمد و ثنا والے، بلند ذکر والے اللہ نے اپنی ذات کے لئے دین اسلام کو اختیار کیا اور اپنی خلقت میں سب سے بہتر اس کو بنایا، پھر ملائکہ اور انسانوں میں رسول منتخب کیا اور ان لوگوں کو اپنے دین اور پیغام کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا۔ وہ لوگ بہتر طریقہ کی طرف بلاتے رہے اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتے رہے، یہاں تک کہ اس کی نبوت کا اعزاز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے وقت میں ختم ہوا جبکہ علم مٹ چکا تھا۔ لوگ تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، خواہشات نفسانی کا دور دورہ تھا، انتشار و انارکی عام تھی۔ حق کے سارے نشانات مٹ چکے تھے، پھر اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہدایت کو ظاہر کیا، جس کے سبب تاریکی چھٹی، ہلاکت و گمراہی سے نجات ملی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین کا صحیح طریقہ سامنے آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے عالم کے لئے رحمت بنایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر اپنی وحی کو ختم کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے سارے نبیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جمع کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نقش قدم پر چلایا اور جو کچھ ان لوگوں پر نازل ہوا تھا ان کی تصدیق کرائی، تم لوگ اپنے رب اور بے پناہ شفقت فرمانے والے اللہ کی تعریف بیان کرو، جس نے تمہارے لئے تمہارے معاملات میں بہتری پیدا کی ہے"۔ (طبری ۲۹۴/۸)

مشہور صاحب بلاغت کمیت بن زید (۶۰ھ ۔ ۱۲۶ھ / ۶۸۰ء ۔ ۷۴۴ء) نے خلیفہ ہشام بن عبدالملک (۷۱ھ ۔ ۱۲۵ھ / ۶۹۰ء ۔ ۷۴۳ء) کے سامنے جو خطبہ دیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں اللہ کی ایسی تعریف بیان کرتا ہوں جس کو وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے اور واضح طور پر لوگوں کو بتلا چکا ہے اور اس کے لئے اس چیز کی گواہی دیتا ہوں جس کو اس نے خود اپنی ذات کے لئے فرمایا "قائما بالقسط" انصاف کا معاملہ کرنے والا ہے، یکتا و تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبد عربی اور رسول امی ہیں، جن کو اللہ نے اس وقت بھیجا جب لوگ حیران و پریشان تھے اور گھٹاٹوپ تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے"۔ (العقد الفرید: ۳۰/۴)

ان کے علاوہ بھی ایسے خطبات و رسائل ہیں جن میں ایک ہی جگہ اللہ تعالیٰ کی متعدد صفتوں کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے لئے جو عہدنامہ لکھا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت و خلاقیت، ہدایت و مغفرت اور علم و عفو کو اس طرح بیان کیا

"بے شک یہ (سلیمان بن عبدالملک) اللہ بزرگ و برتر کی ربوبیت و وحدانیت کی گواہی دیتا ہے۔ اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں جن کو اس نے اپنے بندوں کی طرف خوشخبری دینے والا اور نافرمان و گناہ گاروں کی طرف ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور بے شک جنت اور جہنم حق کے ساتھ پیدا کی گئی ہے، جنت کو اپنے مطیع و فرمانبردار بندے کے لئے بطور رحمت پیدا کیا اور جہنم کو اپنے نافرمان بندے کے لئے بطور

عذاب پیدا کیا۔ اس کے عفو و کرم کا دریا اس شخص کے لئے واجب ہو گیا جو اس سے معافی کا خواستگار ہوا۔ وہی ارحم الراحمین ہے، اسی سے مدد چاہی جا سکتی ہے، کوئی قوت و طاقت نہیں سوائے اللہ کے جو ازل سے احسان فرما رہا ہے"۔ (صبح الاعشیٰ ۹/۳۰۸)

عبدالحمید الکاتب اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"تمام تعریف اسی اللہ کے لئے ہے جو اپنے دین اور اولیاء و شیعہ کا مددگار ہے، حق اور اصحاب حق کو غالب کرنے والا ہے، اور اپنے دشمنوں اور بدعت و گمراہی کے وارثین کو ذلیل کرنے والا ہے"۔ (جمہرۃ رسائل العرب: ۲/۵۵۰)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے لئے اسلام کو منتخب کیا اور اپنے ملائکہ اور فرمانبردار بندوں کے لئے بطور دین اس کو پسند فرمایا، اور اپنی ہدایت یافتہ مخلوق کے لئے اس کو رحمت و کرامت اور نجات و سعادت کا سبب بنایا"۔ (جمہرۃ رسائل العرب: ۲/۵۵۳)

ایک موقع پر اس کی حمد و ثناء اس طرح فرمائی

"تمام تعریف اپنے دین کے ذریعہ عزت بخشنے والے اللہ کے لئے ہے جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی نصرت و حمایت کا ذمہ دار ہے، اور مخالفین اور دشمنوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے والا ہے"۔ (جمہرۃ رسائل العرب: ۲/۵۵۳)

والی عراق عبیداللہ بن زیاد بن ابی سفیان (۲۸ ـ ۶۷ھ/ ۶۴۸ـ ۶۸۶ء) نے اپنے ایک خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اس طرح بیان کی:

"میں تم لوگوں کے سامنے اللہ کی بے شمار نعمتوں پر اس کی حمد بیان کرتا ہوں اور شدت و مصیبت پر اس سے مدد چاہتا ہوں، اور گھٹاٹوپ تاریکی سے ہدایت کا خواہاں ہوں، اور گھات میں لگے دشمن سے اس کی مدد چاہتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں جس نے امین وصادق (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ ہلاکت و تباہی سے بچایا، اللہ کی رحمتیں ہوں پاک و صاحب رحمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر"۔ (العقد الفرید ۲/۱۴۰)

یہ عہد اموی اپنی دیگر خصوصیات و امتیازات کے ساتھ آپسی اختلافات سیاسی نظریات، شخصی رقابتوں اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے بھی کافی اہمیت رکھتا ہے، جس میں نت نئے افکار و عقائد کی حامل جماعتیں وجود میں آگئیں، مختلف پارٹیوں اور بغاوتوں کا ظہور ہوا، نیز اس عہد کے بعض عظیم حادثات نے اختلافات و ناچاقی کی ایسی خلیج قائم کر دی جو مرور زمانہ کے باوجود ختم نہ ہو سکی، جس کا اثر اس عہد کے خطبات و رسائل میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

لیکن ان سب میں جو چیز قدر مشترک اور باعث عبرت ہے وہ ان کے تمام تر نفرت و کدورت، جذبہ انتقام اور اظہار عداوت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات سے بے پناہ تعلق و وابستگی اور الٰہی تصورات کی پختگی ہے۔ ان

لئے آخر میں بعض ایسی شخصیات کے نمائندہ خطبات و رسائل کے ان حصوں کو بھی نقل کیاجاتا ہے جن سے ان کے الٰہی تصورات اور ربانی صفات پر یقین و استحکام کا علم ہوتا ہے۔

حضرت زین العابدین علی بن حسینؓ (۳۸ھ ـ ۹۴ھ / ۶۵۸ء ـ ۷۱۲ء) خلیفہ عبدالملک بن مروان کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"بے شک اللہ نے اسلام کے ذریعہ ذلت کو عزت میں بدل دیا اور خامیوں کی اصلاح کی اور بدذات کمینے اس سے باعزت و مکرم ہوئے"۔ (العقد الفرید: ۳/ ۲۳۳)

شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد مختار بن ابی عبیدہ ثقفیؒ (۱ھ ـ ۶۷ھ / ۶۲۲ء ـ ۶۸۷ء) نے اس کا انتقام لینے کا جو عہد کیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے۔

اما و رب البحار، والنخیل والاشجار والمهامة والقفار، والملائکة الابرار والمصطفین الاخیار، لاقتلنّ کل جبار بکل لدن خطار و مهند بتار"۔ (طبری: ۷/ ۶۵)

سمندروں، نخلستانوں اور درختوں، صحرا اور میدانوں، معصوم فرشتوں اور نیک و پاکباز انسانوں کے پروردگار کی قسم ہر ظالم و جابر کو نیزۂ دل فگار اور شمشیر آبدار سے ضرور قتل کروں گا۔

انہیں مختار بن ابی عبیدہ ثقفیؒ نے حضرت سلیمان بن صرد خزاعی کے رفقاء کے نام ایک خط میں قاتلین حسینؓ سے جنگ پر ابھارتے ہوئے لکھا ہے:

"اللہ تمہارے اجر کو بڑھائے گا، اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ تمہارے ہر قدم پر تمہارے درجات بلند کرے گا، اور تمہارے لئے اتنی نیکیاں لکھے گا جس کو سوائے اس اللہ ذوالجلال کے اور کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ اللہ کبھی بھی نافرمانی کرنے والوں اور منکروں کو معاف نہیں کرے گا"۔ (طبری: ۷/ ۹۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مختار بن ابی عبیدہ کی قید سے رہائی کے لئے عبداللہ بن یزید اور ابراہیم بن طلحہ کے نام سفارشی خط لکھا، ان دونوں حضرات نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے احترام میں ان کی رہائی کا فیصلہ فرما دیا، مگر رہائی سے پہلے جو قسم انہیں دلائی گئی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:

فحلفاه باللّٰه الذی لا اله الا هو عالم الغیب والشهادة الرحمٰن الرحیم"۔ (طبری: ۷/ ۹۳)

ترجمہ۔ ان دونوں نے ان کو اس اللہ کی قسم دلائی جس کے علاوہ کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ وہی غیب و حاضر کا جاننے والا نہایت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

"حاضر کا جاننے والا نہایت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے"۔

حضرت عبداللہ بن اہتم نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے انتقال کے بعد جو خطبہ دیا، اس میں اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کو اس طرح بیان کیا

"بے شک اللہ نے ہی ساری مخلوق کو پیدا کیا، وہ ان کی اطاعت سے بے نیاز اور ان کی معصیت و نافرمانی سے مامون ہے، تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے تمہارے ذریعہ سے اے عمر بن عبدالعزیز دنیا کے غم کو دور کیا اور ان کی مصیبتوں کو ختم فرمایا"۔ (عیون الاخبار: ۲/ ۳۲۳)

مطرف بن مغیرہ نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے خلاف بغاوت کرنے والے سوید بن سرحان ثقفی کے نام ایک خط میں اللہ کے تواب و رحمن ہونے کو اس طرح بیان فرمایا:

"بے شک اللہ نے مسلمانوں پر جنگ فرض کر دیا ہے اور اس کا نام "کرہ" (ناپسندیدگی) رکھا ہے، اللہ کی رضا اور خوشنودی کو اس کے دشمنوں سے جہاد اور اسکے معاملہ پر صبر کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، ہم پر اور تم لوگوں پر توبہ واجب ہے، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔ (طبری ۷/۲۳۶)

ان کے علاوہ متعدد خطبات و مکاتیب ہیں جن میں باہمی بغض و حسد، کینہ و کپٹ اور کدورت و عداوت کے جذبات کے اظہار کے باوجود اللہ کی ذات و صفات اور اس کی عظمت و کبریائی کو بیان کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے۔

آخر میں اس عہد کے بعد نئے رجحانات کی نمائندہ شخصیتوں کے تصورات ان کو پیش کرتے ہوئے خطبات و رسائل کے حوالے سے عہد اموی کے الٰہی تصورات پر اس مطالعہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

معتزلہ کے امام و شیخ واصل بن عطا (۸۰-۱۳۱ھ/۷۰۰-۷۴۸ء) اپنے خطبہ میں صفات الٰہیہ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

الحمد لله القديم بلاغاية، والباقي بلانهاية، الذى علا فى دُنوّه و دنافى علوه، فلايحويه زمان و يحيط به مكان ولايئوده حفظ ماخلق، ولم يخلقه على مثال سبق، بل انشأه ابتداعا، وعدله اصطناعا، فاحسن كل شئ خلقه، و تمّم مشيئة، واوضح حكمته، فدل على الوهية، فسبحانه لامعقب محكمه، ولا دافع لقضائه، تواضع كل شئ لعظمته، وذل كل شئ لسلطانه، ووسع كل شئ فضله لايعزب عنه مثقال حبة، و هو السميع العليم، والشدان لا اله الا الله وحده الٰها تقدست اسماؤه و عظمت آلاؤه، وعلا عن صفات كل مخلوق، و تنزه عن شبيه كل مصنوع فلاتبلغه الاوهام و تحيط به العقول والافهام، يعصى فيحلم، ويدعى فسمع، ويقبل التوبة عن عباده، ويعفوعن السيئات و يعلم ماتفعلون.

واشهد شهادة حق و قول صادق بالاخلاص نية وصحة كاملة، ان محمد بن عبدالله عبده و نبيه اعوذ بالله القوى من الشيطان الغوى ان الله هو السميع العليم. (جمہرۃ خطب ۲/۳۸۳)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو قدیم ہے جس کا کوئی آغاز نہیں، اور جو باقی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، جو اپنی قربت کے باوجود بلند ہے اور بلندی کے باوجود قریب ہے۔ کوئی زمانہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا، اور کوئی جگہ اس کو محیط نہیں کر سکتی، مخلوق کی حفاظت اس کے لئے کوئی بوجھ نہیں، اس نے مخلوقات کو کسی نقشہ اور نمونہ کی روشنی میں پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی تخلیق میں موجد ہے، حکمت و دانائی کے ساتھ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ہر چیز کو اچھی طرح پیدا کیا، پھر اپنی الوہیت کی طرف رہنمائی فرمائی، وہ پاک و بے نیاز ہے، اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اور اس کے فیصلہ کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اس کی بزرگی و عظمت کے آگے ہر چیز عاجز ہے اور اس کے غلبہ و اقتدار کے آگے ہر چیز پست اور حقیر ہے، اس کا فضل ہر چیز پر عام ہے، ایک ذرہ بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، وہ سمیع و علیم ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس یکتا و

تنہا اللہ کے، وہی معبود ہے اسکے نام مقدس ہیں، اس کی نعمتیں عظیم ہیں، مخلوقات کے اوصاف سے وہ بلند و برتر ہے، ہر شبیہ سے پاک ہے، فکر و خیال اس کے مقام تک رسائی نہیں پا سکتے اور عقل و فہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے، بندوں کی نافرمانیوں کے باوجود بردباری کا معاملہ کرتا ہے، پکارنے والے کی پکار سنتا ہے، اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے، ان کے گناہوں کو معاف کرتا ہے، اور جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں ان سے واقف ہے، میں صدق دل، اخلاص نیت اور صفائی کے ساتھ حق پر مبنی گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور نبی ہیں، میں گمراہ شیطان سے طاقت والے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

خوارج کے سردار صالح بن مسرح (م ۷۶ھ / ۶۹۵ء) نے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت و عظمت کا اپنے ایک خطبہ میں اس طرح اظہار کیا:

الحمد لله الذی خلق السموت والارض وجعل الظلمات والنور، ثم الذین کفروا بربهم یعدلون، اللهم انالانعدل بك، ولانحمد الاالیك، ولانعبد لااياك، لك الخلق والامر وملك النفع والضر، والیك المصير، ونشهد ان محمدا عبدك الذی اصطفيه و رسولك الذی اخترته وارتضيته لتبليغ رسالتك و نصيحة عبادك۔ (طبری: ۲۱۷/۷)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا، تاریکی اور روشنی بنائی پھر بھی کفار اپنے رب سے برابری کرتے ہیں۔ اے اللہ! ہم تجھ سے برابری نہیں کرتے، ہم تیری طرف ہی بڑھتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ خلق و امر تیری ہی شان ہے، نفع و نقصان تیرے قبضہ قدرت میں ہے، انجام کار تیرے ہی پاس ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کو تو نے منتخب فرمایا وہ تیرے بندے اور رسول ہیں، جن کو تو نے اپنی رسالت کی تبلیغ اور اپنے بندوں کی خیر خواہی کے لئے پسند فرمایا"۔

رفاعہ بن شداد (م ۶۶ھ/۶۸۵ء) اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں:

"فان الله قدهداك لاصوب القول و دعوت الى ارشد الامور۔ (طبری ۴۹/۷)

"بے شک اللہ نے تمہیں درست باتوں کی طرف ہدایت بخشی اور نیک و صحیح معاملات کی طرف بلایا"۔

اسی گروہ کے ایک شیخ عبدالرحمن بن شریح نے شیعوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"قداذهب الله منا الشك والغل والريب، واستقامت لنا بصيرتنا فى قتالنا عدونا"۔ (طبری ۹۷/۷)

"اللہ نے ہمارے دلوں سے شک و شبہ اور کھٹک کو دور کر دیا اور دشمنوں سے جنگ میں ہمارے لئے ہماری بصیرت کو پائدار و مستحکم کر دیا"۔

سلیمان بن صرد اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں:

"میں اللہ تعالیٰ کی بہترین ثناء بیان کرتا ہوں اور اس کے انعامات و احسانات کی تعریف کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے"۔ (طبری ۴۷/۷)

عہد عباسی کے خلفاء

امراء اور علماء کا تصور الٰہ

خاندان بنی امیہ کے دسویں خلیفہ ہشام بن عبدالملک (۱۲۵ھ/۷۴۳ء) کے بعد ضعف و انتشار کی جو آندھی چلی اس کو انحطاط و زوال کے علاوہ کوئی نہ روک سکا، اور ۹۵ سالہ دور اقتدار کے بعد خاندان بنی عباس کے مؤسس و بانی ابوالعباس عبداللہ بن محمد السفاح (م ۷۵۵ء) کے ہاتھوں ۷۴۹ء میں اس کا ستارۂ اقبال ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اندلس کو چھوڑ کر پوری مملکت اسلامیہ میں خلافت عباسیہ کا پرچم لہرانے لگا، جس کا سایہ پوری ملت اسلامیہ کو تقریباً پانچ سو سال تک محیط رہا۔

خلافت اسلامی کے تسلسل میں اموی خاندان کی جگہ عباسی خاندان کی تبدیلی محض حکمران خاندان یا فرمانروا طبقہ کی تبدیلی تھی، مسلم معاشرہ اور اسلامی تصورات و افکار کا تسلسل بلاکسی انتشار و افتراق کے جاری و ساری رہا۔ اموی خاندان کے زوال و انتشار کے اسباب سیاسی و معاشرتی، تہذیبی و اقتصادی کچھ بھی رہے ہوں حکمرانوں کی آمدورفت اور طبقۂ امراء کی تبدیلی میں بھی محض افراد و طبقات کا فرق نظر آتا ہے، ورنہ نظام و انصرام اور طریق کار میں بہت زیادہ جوہری فرق نہیں پیدا ہوا۔ سطح بیں حکمراں خاندانوں کی تبدیلی کو دو مخالف و متباین ادوار میں انقلاب لانے والا قرار دیتے ہیں۔

تاریخی تسلسل اور تہذیبی ارتباط کا سب سے شاندار ثبوت افکار و علوم کی دنیا میں ملتا ہے، جن افکار و نظریات، تصورات و خیالات، علوم و فنون اور اکتسابات و ارتقاقات کا آغاز عہد نبوی میں ہوا تھا ان میں ترقی، مسلسل ترقی، عہد خلافت راشدہ میں ہوئی اور خانداں حکمراں کی تبدیلی کے باوجود اموی دور میں ان کا ارتقاء بلا روک ٹوک جاری رہا۔ ظاہر ہے زمانہ، وقت، حالات اور مقامات کے اپنے اپنے تقاضوں کے سبب خالص سادہ اسلامی اور قرآنی نظریات و افکار میں علمی و فنی پیچیدگی اور گوناگونی پیدا ہوتی اور شامل ہوتی گئی، خالص بدوی عرب ماحول میں پروردہ عربوں کے ذہن و فکر میں عجمی افکار و فلسفہ کی تراوش بھی ہوئی جو محمود بھی تھی اور نامحمود بھی، عجمی نظریات و افکار میں فلسفیانہ اور عاقلانہ ارتقاء کا بلند بانگ پہلو تھا، تو بعض غیر اسلامی عناصر کی کاریگری کا ملمع بھی، الٰہی صفات و کمالات کے بیان و اظہار میں ان دونوں پسندیدہ و ناپسندیدہ عناصر کی کارفرمائی سب سے زیادہ عباسی عہد حکومت میں نظر آتی ہے جب ان کی تدوین کا عمل زیادہ تیز اور ان کی تشکیل و تعمیر کا معاملہ زیادہ پختہ بن جاتا ہے جو اس عہد کے ابتدائی ادوار (۷۴۹ء۔ ۸۶۱ء) پر محیط ہے۔

عہد اسلامی کا یہی وہ زریں دور ہے جس میں علوم و فنون کا ارتقاء عمل میں آیا اور نظام سلطنت نے امن و امان اور عزت و احترام میں جو ترقی حاصل کی، بعد کے عباسی خلفاء نے اپنے ضعف و کمزوری کے باوجود چار سو سال تک ساری مشرقی دنیا سے اس کا خراج وصول کیا۔

لیکن ہم ان تمام تاریخی مباحث سے صرف نظر کرتے ہوئے اس عہد کے تصور الٰہ کا خطبات و رسائل کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں، کیونکہ ان کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا تھا جس کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم

سے نسبت تھی اور ہاشمی و قرشی کا تمغۂ افتخار ان گردنوں میں بھی آویزاں تھا۔ اسی جذبۂ افتخار نے انہیں جہانبانی پر آمادہ کیا اور تاریخ نے ان کے کارناموں کو اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا، لیکن اسلامی تصورات الٰہی اور ان کے مخالف یا متصادم غیر اسلامی عناصر کا امتیاز اس دور زریں میں بھی قائم و دائم رہا اور بعد کے ادوار معاشرت اسلامی میں بھی۔

عباسی خلفاء اپنی دیگر تمام خصوصیات و امتیازات کے ساتھ عقیدۂ توحید میں غایت درجہ استحکام اور اس کی ذات بے نیاز پر یقین کامل رکھتے تھے، عظمت و جلال کے تصور کے ساتھ اس کی تقدیس و تبریک ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ ان کے مذہبی رجحانات و نظریات اور الٰہی تصورات کے غماز ان کے وہ القاب ہیں جو ان کے ناموں کا جز بن کر آج بھی تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً "المنصور"، المہدی، الرشید، المامون، معتصم باللہ، متوکل علی اللہ، مہتدی باللہ۔ مستعین باللہ، معتمد علی اللہ، معتز باللہ، مقتصر باللہ، مقتدی بامر اللہ، قادر باللہ، قائم بامر اللہ، اور مسترشد و مستعصم باللہ وغیرہ۔ یہ وہ القاب ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات سے ان کے تعلق و وابستگی اور شرک سے نفرت و بیزاری کے ساتھ انسانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ "خلیفۃ اللہ" اور "ظل اللہ علی الارض" کا خطاب پانے کے باوجود وہ سب کے سب اس یکتا و تنہا صاحب ذوالجلال کے آگے عاجز و مجبور اور اسی کی نصرت و رحمت کے طلب گار ہیں۔

مذکورہ القاب سے جہاں ان کے صفات الٰہیہ کے استحضار کا علم ہوتا ہے وہیں ان کے خطبات و مکاتیب کے ذریعہ ان کے تصورات ربانی کا اظہار بھی ہوتا ہے جن میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے حاکم و مالک، خالق و رازق، قادر و قاہر اور منعم و معبود حقیقی ہونے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

ابتداء میں اس عہد کے حکمرانوں کے خطبات و مکاتیب میں جہاں کہیں بھی صفات الٰہی کا ظہور ہوا بالترتیب پیش کرنے کے بعد اس عہد کے دیگر وزراء، امراء، صلحاء اور ادباء کے خطبات و رسائل سے الٰہی تصورات کو صفت وار پیش کیا جائے گا۔ جن میں صفات باری تعالیٰ کے استحضار اور تصورات الٰہیہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس عہد کی دیگر جملہ خاندانی رقابتوں اور ناچاقیوں کے بیان کے ساتھ لسانی، ادبی اور فنی خصوصیات، مزاج و انداز اور ایجاز کے بجائے اطناب کو پسند کرنے کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس عباسی حکومت کے بانی ابوالعباس السفاح (م۷۵۵ء) کا وہ خطبہ پیش کیا جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ہادی و رہبر اور منعم و معبود ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔

الحمد للہ الذی اصطفی الاسلام لنفسہ تکرمۃ، وشرفہ وعظمہ، واختارہ لنا وایدہ بنا، وجعلنا اہلہ وکہفہ وحصنہ والقوام بہ والذابّین عنہ والناصرین لہ والزمنا کلمۃ التقوی، وجعلنا احق بہا واہلہا وخصنا برحم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم .. جعلہ من انفسنا عزیزا علیہ، ما عنتنا، حریصا علینا، بالمومنین رؤفا رحیما، و وضعنا من الاسلام واہلہ بالموضع الرفیع و انزل بذلک علی اہل الاسلام کتابا یتلی علیہم .. واللہ ذوالفضل العظیم وہدی اللہ الناس بعد ضلالتہم وبصّرہم بعد جہالتہم، وانقذہم بعد ہلکتہم، واظہربنا الحق، وادحض بنا الباطل"۔
(طبری: ۳۴۵/۹)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے اسلام کو اپنی ذات کے سبب عزت و تکریم کی وجہ سے منتخب فرمایا۔ اور اس کو عزت و شرف بخشا، ہمارے لئے اس کو اختیار کیا اور ہمارے ذریعہ سے اس کو تائید کرائی، اور ہم کو اس کا اہل، ملجا و ماویٰ اور محافظ و نگراں بنایا اور اپنے خوف و خشیت کو ہم پر لازم کر دیا اور اس کا سب سے زیادہ مستحق اور اہل بنایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و قرابت سے نوازا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے لئے ان چیزوں پر فکرمند بنایا جس کے ذریعہ ہم دشواریوں میں پڑ جاتے اور رؤف رحیم ہستی پر ہمارے ایمان لانے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حریص بنایا، اور اسی اللہ نے ہم کو اسلام و اصحاب اسلام کے ذریعہ بلند مقام عطا کیا، اور مسلمانوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایسی کتاب نازل فرمائی جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔۔۔ اور اللہ بڑا فضل والا ہے اور اللہ نے لوگوں کو ان کی گمراہی کے بعد ہدایت بخشی، جہالتوں کے بعد راستہ دکھایا، اور ہلاکتوں کے بعد ان کو اس سے نکالا، اور ہمارے ذریعہ سے حق کو غالب کیا اور باطل کو خاک میں ملایا"۔

ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں مخالفین کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا

"تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کے ذریعہ اللہ نے ظلم و جور کو مٹایا اور بطلان کو ختم کیا۔ اب تم لوگوں کے انعامات و عطایا میں تاخیر نہیں کی جائے گی، اور کسی کا حق نہیں ضائع کیا جائے گا، ہماری تمام باتوں پر اللہ نگہبان و ذمہ دار ہے"۔ (جمہرۃ خطب: ۸/۳)

اسی خانوادے کے دوسرے فرمانروا سفاح کے بھائی ابوجعفر منصور (م۔۔۔۔) کے خطبات و رسائل میں بھی اللہ تعالیٰ کے متعدد اوصاف حمیدہ مثلاً منعم و مدبر، قادر و ہادی، علیم و خبیر اور معبود حقیقی ہونے کا جگہ جگہ تذکرہ ملتا ہے۔

اپنے برادر زادے عیسیٰ بن موسیٰ کے نام خط میں اللہ تعالیٰ کے انعام بیکراں اور قدرت کاملہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

الحمد لله ذی المنّ القدیم والفضل العظیم والبلاء الحسن الجمیل، الذی ابتداء الخلق بعلم وانفذ القضاء بامره، فلایبلغ مخلوق کنه حقه ولاینال فی عظمة کنه ذکره، یدبرما اراد من الامور بقدرته، ویصدرها عن مشیته، لاقاض فیها غیره، و لا نفاد لها الابه، یجریها علی اذلالها لایستاثر فیها وزیرا، ولایشاور منها معینا، ولایلتبس علیه شیٔ اراده، یمضی قضاء ه فیما احب العباد وکرهوا، لا یستطیعون منه امتناعا ولاعن انفسهم دفاعا رب الارض و من علیها له الخلق والامر، تبارك الله رب العالمین. اذن الله فی هلاك عدوّه وارتاح بالرحمة لاهل بیت نبیه صلی الله علیه وسلم فابعث الله لهم انصارا یطلبون بثارهم، ویجاهدون عدوهم فجمعهم الله علی طاعتنا، والف بین قلوبهم بمودتنا علی نصرتنا واعزهم بنصرنا" (طبری، ۲۶۹/۹)

"تمام تعریف اس قدیم احسان والے عظیم فضل والے، عمدہ انعام والے اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے علم ذاتی سے تخلیق کا آغاز کیا، اور اپنے اختیار سے قضاء کا فیصلہ کیا، کوئی مخلوق اس کے حقوق کی اصلیت کو نہیں پہنچ سکتی۔ اور اس کی عظمت و رفعت میں اس کے ذکر کی حقیقت کو نہیں پا سکتی۔ اپنی قدرت مطلقہ کے ذریعہ مرضی کے مطابق معاملات طے کرتا ہے، اور اپنی خواہش و ارادہ سے اس کو صادر کرتا ہے۔ اس کے معاملات میں

اس کے علاوہ نہ تو کوئی فیصلہ کرنے والا ہے اور نہ ہی نافذ کرنے والا، تمام امور کو ان کے مصالح کے مطابق حل کرتا ہے نہ تو کسی وزیر سے رائے لیتا اور نہ ہی کسی مددگار سے مشورہ کرتا ہے۔ اس کے ارادے میں کوئی چیز مشکوک نہیں ہوتی۔ اپنا فیصلہ کر گزرتا ہے، چاہے بندے اس کو پسند کریں یا ناپسند، کوئی اس کو اس کے فیصلہ سے روک نہیں سکتا، اور نہ ہی اپنی طاقت کے ذریعہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ وہی زمین اور روئے زمین کی ہر چیز کا رب ہے، خلق، امر، موت و حیات اسی کے اختیار میں ہے، سارے عالم کا پروردگار اللہ بڑا برکت والا ہے، اسی اللہ نے اپنے دشمن کی ہلاکت کا فیصلہ کیا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو مصیبت سے نجات دلائی، اور انؐ کے ایسے انصار و مددگار پیدا کئے جنہوں نے بدلہ کا مطالبہ کیا اور ان کے دشمنوں سے جہاد کیا، اللہ ہی نے ان لوگوں کو ہماری اطاعت پر متفق کیا اور ہماری محبت میں ہماری مدد کرنے پر ان کے لوگوں کو جوڑا اور ہماری مدد کے ذریعہ ان کو عزت بخشی۔"

یہی "المنصور" اموی والی کوفہ "یزید بن ہبیرہ" (۸۷ھ۔۱۳۲ھ/۷۰۶ء۔۷۵۰ء) کا کئی ماہ محاصرہ کرنے کے بعد صلح کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بے شک میں تم کو اس اللہ کی امان دیتا ہوں جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہی بندوں کے رازوں سے واقف ہے اور دلوں کی بات جانتا ہے، تمام معاملات کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔۔۔ اور اللہ کی نگرانی کافی ہے"۔ (الامامۃ والسیاسۃ ۲/۱۰۵)

ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"تمام تعریف اللہ کے لئے ہے، میں اس کی حمد بیان کرتا ہوں اور اسی سے مدد چاہتا ہوں، اسی پر ایمان رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسا کرتا ہوں، اور گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی عبادت کے لائق نہیں اور نہ ہی کوئی اس کا شریک ہے، اے لوگو! اللہ سے ڈرو"۔ (الکامل للمبرد ۱۲/۲)

ایک اور خطبہ میں فرمایا:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے اپنی حجت کو غالب کیا اور ظالم قوموں کے لئے ہلاکت و تباہی کو مقدر کیا"۔ (الکامل: ۱۲/۲)

اپنے بیٹے اور جانشین خلیفہ محمد المہدی کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

"ایاك والدم الحرام فانه حوب عند الله العظیم"۔

"حرام خون بہانے سے بچو، یہ عظمت والے اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے"۔ (طبری ۹/۳۲۲)

اسی عہد خلافت کے تیسرے فرمانروا "محمد المہدی" (م۱۶۹ھ/۷۸۵ء) نے اپنے ایک خطبہ میں خداوند قدوس کی شان کبریائی اور رحمت و رافت کے فیضان کو اپنی عاجزی و بندگی کے اظہار کے ساتھ نہایت مفصل طریقہ پر اس طرح بیان فرمایا جس میں زبان کی حلاوت و لطافت کے ساتھ رب کائنات کی عظمت و جلالت نمایاں نظر آتی ہے۔

الحمد لله الذی ارتضى لنفسه ورضی به من خلقه، احمده علی آلائه و امجده لبلائه، واستعین واؤمن به،

واتوكل عليه توكل راضٍ بقضائه وصابر لبلائه، واشهدان لا الٰه الا الله وحده لاشريك له وان محمدا عبده المصطفى و نبيه المجتبى، ورسوله الى خلقه، وامينه على وحيه، ارسله بعد انقطاع الرجاء وطموس العلم واقتراب من الساعة الى امة جاهلية مختلفة امية، اهل عداوة وتضاغن، و فرقات و تباين . يبشر من اطاعه بالجنة و كريم ثوابها و ينذر من عصاه بالنار واليم عقابها. اوصيكم عباد الله بتقوى الله، فان الاقتصار عليها سلامة، والترك لها ملامة، واحثكم على اجلال عظمته، و توقير كبريائه و قدرته، والانتهاء الى مايقرب من رحمته، وينجّي من سخطه، وينال به مالديه من كريم الثواب و جزيل المآب، فاجتنبوا ماخوّفكم الله من شديد العقاب واليم العذاب، و وعيدالحساب، يوم توقفون بين يدى الجبار

اوصيكم عبادالله بما أوصاكم الله به وانهاكم عما نهاكم عنه، وارضى لكم طاعة الله واستغفر الله لى ولكم". (العقدالفريد ۱۳۶/۲)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے اپنی ذات کے لئے حمد کو پسند فرمایا، اور اپنی مخلوق کے حمد بجا لانے سے راضی ہوا۔ میں اس کی تمام نعمتوں پر حمد بیان کرتا ہوں اور اس کے عطایا اور نوازشات پر اس کی تعریف کرتا ہوں اور مدد کا خواہاں ہوں اور اسی پر ایمان رکھتا ہوں، اور اس کے تمام فیصلوں پر راضی برضا ہو کر اور آزمائشوں پر صبر کرتا ہوا بھروسا کرتا ہوں، اور گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے منتخب بندے اور چیدہ نبی ہیں، جو اس کی مخلوق کی طرف اس کے رسول اور وحی کے امین ہیں، جن کو ساری امیدوں کے منقطع ہو جانے اور علم کے اٹھ جانے کے بعد قیامت سے قریب ترین وقت میں مبعوث فرمایا۔ ایسے وقت میں جبکہ جہالت و ناخواندگی عام تھی، نفرت و عداوت کا بازار گرم تھا، انتشار و افتراق شباب پر تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعہ جنت اور عمدہ ٹھکانے کی خوشخبری سنائی اور نافرمانی کے ذریعہ جہنم اور دردناک عذاب سے ڈرایا۔

اے اللہ کے بندو! میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ بے شک اللہ کے خوف میں سلامتی ہے، اور اس سے روگردانی میں شرمندگی ہے، میں تم کو اس کی عظمت و جلال اور قدرت و کبریائی کی توقیر پر آمادہ کرتا ہوں جس کے ذریعہ اس کی رحمت سے قریب اور ناراضگی سے دور ہوا جا سکتا ہے اور عمدہ ثواب اور بہترین بدلہ کو حاصل کیا جا سکتا ہے، بس اس چیز سے پرہیز کرو جس کے سبب اللہ نے تمہیں شدید گرفت دردناک عذاب اور حساب کی وعید سے ڈرایا، جس دن اس غلبہ و قدرت والے جبار کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔

اے اللہ کے بندو! میں تم کو اس چیز کی وصیت کرتا ہوں جس کی اللہ نے تمہیں وصیت فرمائی اور اس چیز سے روکتا ہوں جس سے اللہ نے روکا۔ اللہ کی فرمانبرداری کو تمہارے لئے پسند کرتا ہوں اور اپنے لئے اور تم لوگوں کے لئے اللہ سے مغفرت کا خواہش مند ہوں"۔

عہد عباسی کے ممتاز خلیفہ "ہارون الرشید" (۱۴۹ھ/ ۱۹۳ھ/ ۷۶۶ء/ ۸۰۹ء) نے بھی اپنے مکاتیب میں اوصاف باری تعالیٰ کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنے عمال کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فان اللہ ولی امیر المومنین و ولی ماولاہ الحافظ لما استرعاہ و اکرمہ بہ من خلافتہ وسلطانہ والصانع لہ فیما تقدم واخرمن امورہ والمنعم علیہ بالنصر و التائید فی مشارق الارض و مغاربھا، و الکالی والحافظ والکافی من جمیع خلقہ، وھو المحمود علی جمیع آلائہ والھام مایرضی بہ"۔ (طبری، ۱۰/۷۷)

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

بے شک اللہ [illegible] امیر المومنین اور اس کے والیوں کا ولی اور ذمہ دار ہے، جب وہ اس سے رکھوالی کی درخواست کرتا ہے تو وہ [illegible] حفاظت فرماتا ہے، اسی نے اس کو اپنی خلافت و سلطنت سے نوازا اور اپنے معاملات میں سے جو کچھ سونپا [illegible] والا ہے سب کا بنانے والا وہی ہے، اسی نے اس پر مشرق و مغرب میں اپنی نصرت و تائید کے ذریعہ [illegible] ہیں، وہی اپنی تمام مخلوقات سے کفایت و نگرانی اور حفاظت فرمانے والا ہے، اور اپنی تمام نعمتوں اور ان [illegible] پر جو اس کو پسند ہیں وہی قابل تعریف ہے"۔

ایک مرتبہ [illegible] کرتے ہوئے اللہ عز و جل کی حمد و ثنا اور انعام و اکرام کو اس طرح بیان کیا:

"تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، ہم اس کی تمام نعمتوں پر اس کی حمد بجا لاتے ہیں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری پر اس کی مدد چاہتے ہیں، اور اس کے دشمنوں کے خلاف اس کی نصرت کے خواہاں ہیں، اسی پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور اسی پر بھروسا کرتے ہیں، اور گواہی دیتے ہیں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ واحد کے جس کا کوئی شریک نہیں، اور گواہی دیتے ہیں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، جن کو اس سلسلہ رسالت کے ایک طویل وقفہ کے بعد جبکہ علم مٹ چکا تھا، باقی رہنے والی نعمتوں کی خوشخبری دینے والا اور دردناک عذاب سے ڈرانے والا بنا کر مبعوث فرمایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدے اور وعید کو پورا کا پورا پہنچایا، یہاں تک کہ موت آ پہنچی، اللہ کی رحمتیں اور سلامتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر"۔

اے اللہ کے بندو! میں تم کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ بے شک اللہ کا خوف و لحاظ برائیوں کو ختم کرتا ہے اور نیکیوں کو بڑھاتا ہے، جنت کی کامیابی اور جہنم سے نجات دلاتا ہے۔۔۔ پس توبہ کے ذریعہ اللہ کی مغفرت، تقویٰ کے ذریعہ اس کی رحمت اور امانت داری کے ذریعہ اس کی ہدایت کی طرف تیزی سے بڑھو، میں شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ (العقد الفرید ۲/۱۴۷)

عباسی عہد کے چھٹے حکمران "محمد الامین" (م ۸۱۳ء) نے جو اپنے باپ ہارون کے بعد مسند خلافت پر بیٹھے اپنی فوج سے خطاب کرتے ہوئے اللہ کے غلبہ و اقتدار اور حکم و اختیار کو اس طرح بیان کیا:

الحمد للہ الذی یرفع ویضع، ویعطی ویمنع، و یقبض و یبسط، و الیہ المصیر، احمدہ علی نوائب الزمان، وخذلان الاعوان، وتشتت الرجال، وذھاب الاموال، وحلول النوائب و توفدالمصائب، حمدا یدخرلی بہ أجزل الجزاء، ویرفدنی احسن العزاء، واشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، کما شھد لنفسہ، وشھدت لہ ملائکتہ، وان محمدا عبدہ الامین، و رسولہ الی المسلمین صلی اللہ علیہ وسلم۔ (طبری، ۱۰/۲۰۵)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس کے قبضہ میں عزت و ذلت ہے، وہی دیتا ہے وہی روکتا ہے، فقر و غنا کا مالک وہی ہے اور انجام کار اسی کی طرف لوٹنا ہے، گردش زمانہ، فقدان اتحاد، قلت اموال، کثرت مصائب

و حوادث کے باوجود میں اس کی حمد بیان کرتا ہوں جو میرے لئے مقدر ہو [illegible] گی اور اچھائیوں سے نوازے گی میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ واحد کے کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، جیسا کہ اس نے خود اپنی گواہی دی ہے، اور اس کے فرشتوں نے اس کی شہادت دی اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے امانتدار بندے اور مسلمانوں کی طرف اس کے رسول ہیں۔"

ساتویں خلیفہ عبداللہ المامون (م ۸۳۳ء) نے اپنے ایک خطبہ میں اللہ کی قدرت کاملہ اور انعام بے پایاں کو اس طرح بیان کیا:

الحمد لله مستخلص الحمد لنفسه، مستوجبه على خلقه، احمده واستعينه واومن به و توكل عليه و اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و اشهد ان محمدا عبده و رسوله ارسله بالهدى و دين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون انه سميع الدعاء و بيده الخير وانه فعال لما يريد۔ (عیون الاخبار ۲/۲۵۳)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس کی ذات کے لئے حمد مخصوص کر دی گئی، اور اس کی مخلوق پر اس کو واجب قرار دیا گیا، میں اس کی حمد بیان کرتا ہوں، اسی سے مدد طلب کرتا ہوں، اس پر ایمان رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسا کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ وحدہ لا شریک کے کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں جن کو اس نے ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ تمام دینوں پر اس کو غالب کرے چاہے مشرکین ناپسند کرتے رہیں اور وہی دعاؤں کا سننے والا ہے، اسی کے قبضہ قدرت میں سب خیر ہے، اور وہی اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

سربراہان مملکت کی زبان و قلم سے نکلے یہ وہ اوصاف ربانی تھے جو ان کے دنیوی اقتدار و حکومت کے باوجود اللہ کی ذات بے نیاز پر مکمل اعتقاد اور اس کی قدرت مطلقہ کے آگے خود کو عاجز و درماندہ تسلیم کرنے کا پتہ دے رہے تھے۔

اب ذیل میں اس عہد کے بعض وزراء، امراء، صلحاء اور ادباء کے خطبات و مکاتیب سے اللہ تعالیٰ کے اوصاف عالیہ کو یکجا کر کے صفت وار بیان کیا جاتا ہے۔ ان میں اس عہد کے مزاج و انداز کا کافی دخل نظر آتا ہے، اور ایجاز کے بجائے اطناب کو ترجیح دی جاتی ہے اور کثرت کے ساتھ متعدد صفات ربانی کو بیان کیا جاتا ہے۔ تاہم غلبہ اور کثرت کا اعتبار کرتے ہوئے الگ الگ تقسیم کر دیا گیا ہے تا کہ اس پورے عہد کے تصوراللہ کو آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکے۔ جنہیں مختلف مواقع اور مناسبت سے حالات اور تقاضے کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ ان میں کہیں دشمنوں کے خلاف اللہ کی نصرت و حمایت کا اعلان ہے کہیں اس کی قدرت و غلبہ کا اظہار، کہیں انعام و اکرام کا تذکرہ ہے اور کہیں خشیت و للہیت کا درس۔ لیکن ان سب میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت اور وحدانیت و صمدیت کا عنصر شامل ہے۔ جس کا آغاز مشہور ولی عہد سلطنت عیسیٰ بن موسیٰ (۱۰۲ھ۔۱۶۷ھ/۷۲۱ء۔۷۸۳ء) کے اس خط سے کرتے ہیں جو خلیفہ المنصور کے نام لکھا گیا تھا۔

كفى الله من الظالم منتصرا، والمظلوم ناصرا، ولاقوة الا بالله وهو حسبي واليه المصير۔ (جمہرۃ رسائل ۳/۱۰۶)

"ظالم سے انتقام لینے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لئے اللہ کافی ہے، اللہ کے علاوہ کوئی طاقت و قوت نہیں، وہی میرے لئے کافی ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے"۔

ذوالعزة والجلال

عزت و بلندی صرف اس اتفاقی و لازوال ہستی کو روا ہے جس کی عظمت و جلال پر پوری کائنات گواہی دے رہی ہے، انسان وقتی اور تھیلی مدتی اقتدار پر فخر و غرور جائز نہیں، عظمت و کبریائی تو صرف اسی وحدہ لا شریک کی شان ہے۔

خراسان کے گورنر اور خلیفہ المامون کے معتمد خاص طاہر بن حسین خلیفہ عباسی المامون کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں

الحمد لله المتعالى ذى العزة والجلال والملك والسلطان، الذى اذا اراد امرا فانما يقول له كن فيكون، لا اله الا هو الرحمن الرحيم كان فيما قدرالله فاحكم و دبرفابرم . الله ولى ماضع من ذلك السهم له، انه سميع لطيف لما يشاء (طبری ۱۰/۲۰۳)

"تمام تعریف اس بلندی والے صاحب عزت و جلال بادشاہ کل اللہ کے لئے ہے جو کسی چیز کا جب بھی ارادہ کرتا ہے تو صرف "کن" کہتا ہے اور وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو رحمن و رحیم ہے۔ اللہ نے جو کچھ مقدر کر دیا ہے وہ تو ہو کر رہے گا، اور جو کچھ سوچ لیا ہے اس کو پورا کر کے رہے گا، اللہ ہی ذمہ دار ہے، وہی چیزوں کا پورا کرنے والا ہے، اور اپنی مرضی سے سننے والا اور لطف کرنے والا باریک بیں ہے"۔

اسی عہد عباسی کے مشہور شاعر "ابراہیم بن سیابہ" نے مشہور وزیر یحییٰ بن خالد برمکی کے نام ایک خط میں اس وصف ربانی کو اس طرح بیان کیا:

"بے شک میں آپ اور ہر چھوٹے بڑے سے غلبہ و قدرت والے اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کی رحمت عام اور برکت بے پایاں ہے"۔ (البیان والتبیین: ۳/۱۱۰)

ممتاز ادیب عبداللہ بن مقفع نے متعدد اوصاف الٰہی کو بیان کرتے ہوئے اس کی عظمت و قدرت کو اس طرح ظاہر کیا:

الحمد لله ذى العظمة القاهرة، والآلاء الظاهرة الذى لايعجزه شى ولا يمتنع منه، ولايدفع قضاؤه و لا امره، "انما اذا اراد شيئا ان يقول له كن فيكون" والحمد لله الذى خلق الخلق بعلم و دبر الامور بحكم يخلق مايشاء ويختار، سبحان الله تعالى عمايشركون والحمد لله الفتاح العليم، العزيز الحكيم، ذى المنّ والطول، والقدرة والحول، الذى لاممسك لمافتح لا و لبانه من رحمته، ولا دافع لما نزل باعدائه من نعمته يفعل مايشاء ويحكم مايريد"۔ (جمہرۃ رسائل ۳/۵۳)

"تمام تعریف اس غالب عظمت والے اور عظیم نعمتوں والے اللہ کے لئے ہے جس کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس سے بچ سکتی ہے، اور نہ ہی اس کے حکم و فیصلہ کو ٹال سکتی ہے، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا

ہے تو صرف "کن" کہتا ہے اور وہ وجود میں آ جاتی ہے، اور تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مخلوق کو اپنے علم خاص سے پیدا کیا اور حکمت کاملہ سے معاملات کو چلایا، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اختیار کرتا ہے، وہی مختار کل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے پاک ہے جن کو لوگ اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں، تمام تعریف اسی زبردست حاکم اور باخبر غالب و دانا صاحب فضل و احسان اور قدرت و طاقت کے مالک اللہ کے لئے ہے، اس کے محبوبین پر اس کی رحمت کے نزول کو کوئی روک نہیں سکتا اور دشمنوں پر ہونے والی سزاؤں کو کوئی ٹال نہیں سکتا، جو چاہتا ہے اور جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے۔

مالک الملک

دنیا کی ساری سلطنت و شہنشاہیت کا مالک صرف وہی ذات ہے، یہ اسلام کا وہ بنیادی نظریہ ہے جس کے ذریعہ متعدد خداؤں کی مشترکہ سلطنت میں لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس پوری کائنات کو مکمل نظم و ضبط، ہم آہنگی و یکسانیت کے ساتھ چلانے کے لئے ضروری ہے کہ پوری دنیا کے تخت سلطنت کا مالک صرف ایک ہستی کو تسلیم کیا جائے، اور وہ وہی مالک الملک ہے جو "یوتی الملک من یشاء وینزع الملک ممن یشاء" (جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے) پر قادر ہے۔

والیٔ حجاز داؤد بن عیسیٰ اپنے ایک خطبہ میں اس وصف کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

الحمد لله مالك الملك، يؤتي الملك من يشاء وينزع الملك ممن يشاء، ويعز من يشاء ويذل من يشاء بيده الخير، وهو على كل شي قدير، اشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له قائما بالقسط، لا اله الا هوالعزيز الحكيم، واشهد ان محمدا عبده ورسوله ارسله بالدين، وختم به النبيين وجعله رحمة للعالمين صلى الله عليه في الاولين والآخرين"۔ (طبری ۱۰/۱۷۰)

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو ملکوں کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے، اسی کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ وحدہ لاشریک کے کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ انصاف کا معاملہ کرنے والا ہے، کوئی معبود نہیں سوائے اس غالب و حکمت والے کے، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، جن کو اس نے دین کے ساتھ بھیجا اور انہیں پر نبوت کو ختم کیا، اور اولین و آخرین میں انہیں کو ساری دنیا کے لئے رحمت بنایا، اللہ کی رحمتیں ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام سلف و خلف میں"۔

سپہ سالار طاہر بن حسین نے خلیفہ امین کو قتل کرنے کے بعد بغداد میں اپنے خطبہ میں کہا تھا:

"یہ تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو ملکوں کا مالک ہے، جس کو چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے، اسی کے قبضہ و اختیار میں سب کچھ ہے وہی ہر چیز پر قادر ہے، فساد برپا کرنے والوں کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا، اور خیانت کرنے والوں کے مکر و چال کو کامیاب نہیں بناتا"۔ (طبری:۲۰۶)

ہارون الرشید کے عہد حکومت میں "صنعا" کے والی بشر البلوائی نے ابراہیم بن عبداللہ کے نام ایک خط

میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہوئے تحریر کیا تھا:

"بے شک اللہ ہی کے لئے ساری تعریفیں ہیں۔۔۔ میرے سامنے متعدد چیزے پیش کئے اور حلال کمائی کے حاصل کرنے کا مجھے اختیار دیا تو میں نے اللہ عز و جل کی توفیق و احسان سے امیر المومنین کی رفاقت کو اختیار کر لیا۔۔۔ عنقریب انہیں فتح اور مال غنیمت سے نوازے گا، اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔۔۔ میرے سلسلہ میں کس چیز کا [illegible] ہیں؟ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ملک عطا کیا، حکمت سکھائی اور زمین کے خزانوں پر قدرت بخشی [illegible] بنایا اور اسلام میں پناہ اور ٹھکانہ"۔ (جمہرۃ رسائل، ۱۹۴/۳)

القادر

"ان اللہ علی کل شیء قدیر" اس کا غلبہ و اقتدار سارے عالم کو محیط ہے، ذرے سے لے کر آفتاب تک ہر شے اسی کی قدرت مطلقہ [illegible] سرنگوں ہے، پورے نظام کائنات پر وہی حاکم ہے، یہ وہ صفت ربانی ہے جس کا استحضار و اظہار بندے کو [illegible] و غرور میں مبتلا نہیں کر سکتا۔

خلیفہ المامون کے وزیر کبیر "فضل بن سہل" کے قتل کے بعد جب عباسی خلیفہ نے اس کے بھائی "حسن بن سہل" کو وزیر بنانا چاہا تو اس نے اس اکرام کے شکریہ میں "احمد بن یوسف" کے ذریعہ خلیفہ کے نام ایک تفصیلی خط میں اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات کے ساتھ اس کی قدرت کا اظہار اس طرح کیا:

الحمد لله القاهر القادر الخالق الرازق فاطر السموٰت والارض، الذی احاطه بكل شیٔ علماء و اتقه حكمة و علما، والف بين مختلفة و متفقه ليدل بقوام بعضه على بعض، على اتصال تدبير مشيته و مبتدعه، وانه احد صمد لا ضدله ولاند۔

والحمد الله الذی اصطفیٰ محمدا صلى الله عليه وسلم نبيا لرسالته، وأتمنه على وحيه، و انزل عليه كتابه العزيز، الذی لا ياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد"۔ (جمہرۃ رسائل العرب: ۳/۳۱۱)

"تمام تعریف غلبہ و قدرت والے خالق و رازق، آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والے اللہ کے لئے ہے جس کے علم نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، اور علم و حکمت سے اس کو کامل و مکمل کر دیا، اس کے متفق و مختلف اجزاء کے درمیان ربط پیدا کر دیا تاکہ آپسی ربط و تعلق اس ہستی کی مشیت و قدرت پر دلالت کرے، بے شک وہ تنہا اور بے نیاز ہے، اس کا کوئی مخالف ہے اور نہ ہمسر۔

اور تمام تعریف اس کے لئے ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت نبی کے اپنی رسالت کے لئے منتخب فرمایا، اور ان کو اپنی وحی پر امین بنایا، اور ایسی کتاب عزیز ان پر نازل فرمائی جس کے سامنے باطل ٹھہر نہیں سکتا، کیونکہ وہ حکمت والے قابل تعریف کی طرف سے اتری ہوئی ہے"۔

عباسی عالم "عیسیٰ بن علی" (۸۳ھ-۱۶۳ھ/۷۰۲-۷۸۰ء) نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس کی گرفت سے کوئی فرار نہیں پا سکتا، اور اس کی پکڑ سے کوئی بچ نہیں سکتا، اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا چاہے کافر ناپسند کرتے رہیں"۔ (جمہرۃ خطب: ۳/۹)

عبداللہ بن المقفع نے اپنے ایک تعزیتی خط میں قدرت الٰہی کو اس طرح بیان کیا

"بے شک دنیا و آخرت کا معاملہ اللہ کے قبضہ میں ہے، وہی ان کو چلاتا ہے، اور اپنی مرضی سے ان میں فیصلہ کرتا ہے، کوئی بھی اس کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتا، اور اس کے حکم کو رد نہیں کر سکتا، بے شک اللہ نے اپنی مخلوق کو اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا، پھر ان کے لئے موت و حیات کو متعین کر دیا تاکہ اس مخلوق میں سے کوئی دائمی زندگی کی امید نہ کرے، ہر چیز کا ٹھیک وقت مقرر ہے، [illegible] کبھی نہ اس میں تاخیر ہو سکتی ہے اور نہ تقدیم"۔ (جمہرۃ رسائل العرب: ۵۹/۳)

خلیفہ المہدی کے وزیر ابوعبیداللہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا یوں بیان کی ہے

الحمد لله الذى ذى الآلاء والقدرة، و الطول والعزة الذى اصطفى الاسلام دينا لنفسه و ملائكته و انبيائه و من كرم انبياء عليه من خلقه فبعث به محمدا صلى الله عليه وسلم۔ (جمہرۃ رسائل ۲۲/۳)

"تمام تعریف قدرت و نعمت اور غلبہ و عزت والے اللہ کے لئے ہے جس نے اپنی ذات اور اپنے ملائکہ، انبیاء اور مکرم بندوں کے لئے اسلام کو بحیثیت دین کے منتخب فرمایا، اور اس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا"۔

والی کوفہ داؤد بن علی (۸۱ھ-۱۳۳ھ/۷۰۰ء-۷۵۰ء) نے ایک خطبہ میں فرمایا

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمارے دشمن کو ہلاک کیا، اور ہماری طرف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کو لوٹا دیا۔ میں اللہ سے امیر المومنین کی عافیت کے لئے دعا کرتا ہوں"۔ (طبری: ۱۲۶/۹)

عہد عباسی کے ادیب "جبل بن یزید" نے دوستوں کے نام خط میں لکھا

"بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے میرے اور تمہارے درمیان اخوت و محبت اور لطف و موانست کو جاری فرمایا"۔ (جمہرۃ خطب العرب: ۱۳۵/۳)

خالق و رازق

پوری کائنات اور کائنات کی ہر شئے ابتدائی منصوبہ سے لے کر اپنی مخصوص شکل و صورت تک اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس کے منصوبہ و عمل میں کوئی شریک و مشیر نہیں، وہی پیدا کرنے والا ہے اور وہی رزق بہم پہنچاتا ہے، اس کے لئے اسباب فراہم کرتا ہے، رزق رسانی کا ذمہ اسی کا ہے۔

تمیم بن جمیل نے خلیفہ معتصم باللہ کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے اللہ کی صفت تخلیق کو اس طرح بیان فرمایا۔

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہر چیز کو اچھی طرح پیدا فرمایا، انسانی تخلیق کا آغاز مٹی سے کیا، پھر ذلیل پانی کے قطرہ اور حصہ سے اس کی نسل تیار کیا"۔ (العقد الفرید: ۱۳۵/۱)

عباسی سپہ سالار "احمد بن یوسف" سندھ کی فتح کے موقع پر حمد باری تعالیٰ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الحمد لله وليّ الحمد، واهل الثناء والمجد الخالق الخلق، ومدبرالامر، المسبغ على عباده،

والموجب علیهم حجته" (جمہرۃ خطب العرب: ۳/۳۹۹)

"تمام تعریف اللہ کے لئے ہے جو بزرگی و ثناء کے حقدار، مخلوق کو پیدا کرنے والے، معاملات کے چلانے والے اور بندوں پر اپنی نعمت کو پوری کرنے اور حجت کو لازم کرنے والے اللہ کے لئے ہے"۔

مشہور ادیب و سپہ سالار خزیمہ بن حازم (م ۲۰۳ھ) نے "ضاریہ" (طبری نے اپنی تاریخ جلد ۹ اور بغدادی نے جلد ۸ میں اس کا تذکرہ کیا ہے مگر جگہ کی تفصیل نہیں لکھی اور نہ ہی معجم البلدان وغیرہ میں ملی) کی فتح کے موقع پر اللہ رب العزت کی حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"الحمد لله ذی الملکوت والقدرة، والجبروت والعزة، والسلطان والقوة، اهل المحامد کلها، و مدبر الامور و ولیها، خالق الخلائق وباریها، ومميتها، و محییها، و باعثها و وارثها الذی اوجب علی نفسه بماانفذ من مشیته، وسبق من علمه، ورتب فی اللوح المحفوظ عند اعزاز دینه واظهار حقه واعلاء کلمته، و ابلاج حجته"۔ (جمہرۃ رسائل ۳/۲۰۰)

"عزت و قدرت والے، غلبہ و طاقت والے سلطنت و قوت والے اللہ کے لئے ساری تعریفیں ہیں، تمام اچھائیوں والا وہی ہے، معاملات کو وہی چلاتا ہے اور وہی اس کا ذمہ دار ہے، ہر چیز کا خالق اور وجود بخشنے والا بھی وہی ہے، وہی موت و حیات کا مالک ہے، سبب تخلیق سے بھی وہی واقف ہے اور وہی وارث بھی ہے، جس نے اپنے اوپر اپنی مشیت اور علم کے نفاذ کو واجب کر دیا ہے۔ اور اپنے پاس لوح محفوظ میں اپنے دین کی سربلندی، حق کے غلبہ، کلمہ کی رفعت اور حجت کو واضح کرنے کا فیصلہ ثبت کر دیا ہے"۔

نامور عالم عبداللہ بن الحسن بن علی بعض رفقاء کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"میں تم کو اللہ بزرگ و برتر کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، بے شک اللہ نے متقیوں کے لئے ناپسندیدگی سے نکلنے کی جگہ متعین کر دی ہے، وہاں سے رزق پہنچاتا ہے جہاں ذہن کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی"۔ (زہر الاداب: ۱/۹۳)

بوربیع محمد بن لیث نے ہارون الرشید کی طرف سے شہنشاہ روم قسطنطین کے پاس ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں اللہ کی خلاقیت و رزاقیت کو اس طرح بیان فرمایا:

"بے شک اللہ عز و جل نے مخلوق کے لئے زمین بنائی، اور اس پر اپنی مخلوقات بسائی، پھر اس میں پیڑ پودے اگائے، اور اس کو تمہارے لئے متاع حیات اور جانوروں کے لئے ذریعہ معاش بنایا، پھر آسمان سے اپنے علم خاص کے ذریعہ اس کے لئے متعین مقدار کے مطابق بارش نازل فرمائی، پیڑ، پودے، گھاس پھوس کا اگانا اور مٹانا اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ (اس کے بعد انسان کی تخلیق کو تفصیل کے ساتھ بالترتیب بیان کرنے کے بعد تحریر فرمایا:

فتبارك الله احسن الخالقين.

بلند و بابرکت ہے بہترین پیدا کرنے والا اللہ جس نے حقیر و ناچیز پانی کے قطرے سے رحم مادر میں انسانوں کو پیدا کیا اور نقشہ کے ساتھ اس کی صورت بنائی، اور مختلف اجزاء اور متنوع اعضاء کو حسن ترکیب کے

ساتھ جوڑا"۔ (جمہرۃ رسائل: ۲۵۳/۳)

منعم و محسن

اظہار بندگی کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کے انعامات و احسانات کا اعتراف سب سے افضل عمل ہے۔ اس عہد کے خطبات و رسائل میں اس وصف عالی کا اظہار کثرت سے ملتا ہے۔

منصور کے سپہ سالار "ابو مسلم خراسانی" خلیفہ ابو جعفر المنصور کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں

ان الله بمنّه و كرمه اتاح لي الحسنة و تداركني بالرحمة، واستنقذني بالتوبة، فان يعفو فقد يما عرف بذالك، وان يعاقب فيما قدمت يداي، وما الله بظلام للعبيد۔ (الامامۃ والسیاسۃ ۲/۱۰۳)

"بے شک اللہ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اعمال حسنہ کی توفیق عطا فرمائی، رحمت کاملہ سے نوازا اور توبہ کے ذریعہ نجات بخشی، پس اگر وہ مغفرت فرمائے تو یہ اس کی شان ہے اور اگر عذاب دے تو یہ ہمارے کرتوت ہیں، اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا"۔

ابو مسلم خراسانی نے ہی اپنے ایک خطبہ میں اس طرح فرمایا:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے خود اپنی حمد بیان کی اور اسلام کو بطور دین کے اپنے بندوں کے لئے منتخب فرمایا، پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی نازل فرمائی اپنی تمام مخلوق میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار فرمایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی واضح کتاب نازل فرمائی جس کی خود اپنے علم ذاتی سے اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول فرمائی اور فرشتوں نے اس کے برحق ہونے کی گواہی دی"۔ (جمہرۃ خطب ۱۵/۳)

قاضی یحییٰ بن اکثم نے خلیفہ المامون کو خطاب کرتے ہوئے کہا

"تمام تعریف اسی اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں دوری کے بعد آپ سے قریب کیا اور ذلت کے بعد آپ کی حکومت میں عزت بخشی"۔ (کتاب الصناعتین ص ۴۰)

جس روز خلیفہ ہارون الرشید مسند خلافت پر متمکن ہوئے اس روز "یوسف بن قاسم" (م ۱۸۰ھ/۷۹۶ء) نے خاندان بنی عباس کو مخاطب کر کے کہا:

"ان الله بمنّه ولطفه، منّ عليكم معاشر اهل بيت نبيه"۔ (طبری ۳۸/۱۰)

"بے شک اللہ نے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والو! تم پر اپنے لطف و احسان کے ذریعہ فضل فرمایا"۔

عہد عباسی کے مشہور ادیب و کاتب "جبل بن یزید" اپنے بھائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اللہ نے ہم پر اور تم پر اپنی نعمتوں کو مکمل فرمایا، اور بہترین بدلہ عطا کیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہی ہم لوگوں کے مابین اخوت و موانست پیدا کی"۔ (جمہرۃ رسائل: ۱۳۵/۳)

جبل بن یزید نے ہی بارش کے نزول کے بعد امیرالمومنین کو اس کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

"اللہ نے اپنی رحمت سے بارش نازل فرمائی، پھر اس کی رحمتیں مسلسل بارش کے ذریعہ نازل ہوتی رہیں، اسی نے بارش نازل فرمائی، اور اسی عظمت و رفعت والے اللہ کے فضل سے اس کی رحمتیں عام ہوئیں، رزق بڑھا،

نعمتیں پوری ہوئیں۔ اللہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی نعمتوں پر اس کی تعریف کی جائے، اور شکر ادا کیا جائے"۔ (جمہرۃ رسائل ۳/۱۳۸)

عبداللہ [illegible] صحت یابی پر خط لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"آپ کے [illegible] آپ کی صحت و تندرستی کا علم ہوا، آپ نے اس سلسلہ میں جس عظیم نعمت کا تذکرہ کیا ہے، ہم اس پر اس نعمت [illegible] منعم حقیقی اور صاحب فضل و کرم کی حمد بیان کرتے ہیں اور اسی ذات عالی سے سوال کرتے ہیں [illegible] اور آپ کو مزید اپنا شکر ادا کرنے اور ذکر کی توفیق عطا فرمائے"۔ (جمہرۃ رسائل ۳/۶۱)

مامون کے [illegible] بن عبدالحمید اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بے شک [illegible] طرح بندوں کی شکلیں بنائیں اسی طرح ان کے اخلاق بھی مختلف بنائے، اور اپنے بندوں میں بعض [illegible] اپنی نعمتوں سے نوازا اور ان کے لئے معاملات کی درستی میں ایک رائے بنائی"۔ (جمہرۃ رسائل: ۳/۱۱۳)

آذربیجان کے والی یزید بن مزید (م ۱۸۵ھ/۸۰۱ء) خلیفہ ہارون الرشید کی رضامندی کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے میرے لئے آپ کی ملاقات کے ذریعہ عزت و شرف کی سبیل پیدا فرمائی، اور آپ کی رضامندی کے ذریعہ مجھے نعمتوں سے سرفراز کیا، اور آپ کے جود و سخا کے ذریعہ مصیبت کے بادل کو مجھ سے ہٹا دیا"۔ (جمہرۃ رسائل: ۳/۸۹)

یحییٰ بن زیاد عیسیٰ بن موسیٰ کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت بیکراں کے ذریعہ ہم سے اور آپ سے ان چیزوں کو دور کیا جن کو ہم ناپسند کرتے تھے، اور مشتبہ معاملات سے ہمیں بچایا، یہاں تک کہ ہماری خواہش اور مرضی کے مطابق فیصلہ فرمایا"۔ (جمہرۃ رسائل ۳/۷۴)

معبودِ حقیقی

"ان الھکم الہ واحد لا الہ غیرہ" قرآن اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات اور رحمت و رافت کے ساتھ ساتھ اس کے معبود حقیقی ہونے اور اس کے علاوہ کسی اور کو پرستش کے لائق نہ سمجھنے کی بار بار تلقین کرتا ہے۔ جس کا اثر اس کے تمام نیک اور صالح بندوں پر پڑا اور وہ بھی اپنے اعمال و اقوال اور زبان و بیان سے اس کا اظہار کرتے رہے۔

سفاح کے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ (۱۰۲ھ۔۱۶۷ھ/۷۲۱ء۔۷۸۳ء) خلیفہ منصور کے نام ایک خط میں اللہ تعالیٰ کی عبودیت و قدرت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

انی احمد الیک اللہ الذی لا الہ الا ھو، و ان یعلم خائنۃ الاعین وماتخفی الصدور... واللہ الامور کلھا بید اللہ ھو مدبرھا و مقدرھا، مصدرھا عن مشیتہ... لکن اللہ اذا اراد عزما لا نفاذ امرہ، وانجاز

وعدہ، واتمام عهدہ،احكم ابرامه، و ابرم احكامه، فلايستطيع العباد تاخير ما معجل، و لا تعجيل ما اختر"۔ (طبر ۲۷۰/۹)

"بے شک میں آپ کے سامنے اس اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور اللہ آنکھوں کی خیانت اور سینوں کے راز سے واقف ہے، بے شک تمام کے تمام معاملات اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہی ان کو چلاتا، مقدر کرتا اور اپنی مرضی سے ان کو صادر کرتا ہے، جب وہ کسی معاملے کے نفاذ، وعدے کی تکمیل اور عہد و پیمان کے اتمام کا ارادہ کرتا ہے تو کر گزرتا ہے، کوئی بندہ اس کے فیصلے میں تاخیر و تعجیل نہیں کر سکتا"۔

بصرہ کے گورنر، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے "محمد بن سلیمان" نے جمعہ کے ایک خطبہ میں فرمایا:

"تمام تعریف اللہ کے لئے ہے، میں اس کی حمد بیان کرتا ہوں، اس سے مدد اور مغفرت کا خواہاں ہوں، اسی پر ایمان رکھتا ہوں اور بھروسا کرتا ہوں، اور گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ وحدہ لا شریک لہ کے کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، جن کو اس نے ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ مشرکوں کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کو ساری دنیا پر غالب کرے، جس نے اللہ اور اس کے رسول کو مضبوطی سے پکڑ لیا اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا، اور جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی وہ بڑی گمراہی کا شکار ہوا، اور عظیم ناکامیوں سے دوچار ہوا"۔ (البیان والتبیین ۶۵/۲)

شہنشاہ روم قسطنطین کے نام لکھے جانے والے تفصیلی خط میں "ابو ربیع محمد بن لیث" اللہ کی عبودیت و وحدانیت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

انی احمد الله الذی لا شريك معه ولا ولد له، ولااله غيره، الذی تعالىٰ عن شبه المحدودين بعظمته، واحتجب دون المخلوقين بعزته، فلست الابصار بمدركة له، ولا الاوهام بواقعة عليه، انفرادا عن الاشياء ان يشبهها، وتعاليا ان يشبهه شی منها، و هو الوحد القهار الذی ارتفع عن مبالغ صفات القائلين، ومذاهب لغات العالمين، و فكر الملائكة المقربين، فليس كمثله شیء، وله كل شیء، وهو على كل شیء قدير، .. ان الله السماء و الارض و ما بينهما من الهواء والخلق واحد لا شريك له خالق لا شیء معه"۔ (جمہرۃ رسائل: ۲۵۳/۳)

"بے شک میں اس اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے ساتھ کوئی شریک نہیں، نہ تو اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی معبود، وہ اپنی عزت و سربلندی کی وجہ سے محدود النظر کی تمام تشبیہات سے ارفع ہے، اور عزت و ہیبت کی وجہ سے تمام مخلوق کی نگاہوں سے مخفی ہے، نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، اور وہم و خیال اس کو چھو نہیں سکتا، وہ منفرد ہے کوئی ایسی چیز نہیں جس سے اس کو تشبیہ دی جائے، وہ بلند ہے، کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہو سکتی، وہ واحد و قہار بیان کرنے والوں کے مبلغ صفات، سارے جہاں کے ذخیرۂ الفاظ اور مقرب فرشتوں کے فکر و خیال سے بھی بلند ہے، اس کی طرح کوئی چیز نہیں، اس کے لئے ہر چیز ہے، اور وہی ہر چیز پر قادر ہے، بیشک آسمان و زمین، ان کے مابین اور فضاؤں میں بسنے والے ہر ایک کا ایک ہی معبود ہے، جس کا

کوئی شریک نہیں، وہ سب کا خالق ہے، اس کی تخلیق میں کوئی اس کا معاون نہیں"۔

احمد بن یوسف نے خلیفہ المامون کی طرف سے خراسان کے شیعان بنی عباس کے نام خط میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف حسنہ کو اس طرح بیان فرمایا:

الحمد لله القادر القاهر الباعث الوارث، ذی العزة والسلطان، و النور والبرهان، فاطر السموت والارض و ما بينهما، والمتقدم بالمن والطول على اهلها جعل البديع خالق الخلق، و مالك الامر عن ذلك و به يرضى ناصرا و وليا، و كفى بالله وليا و كفى بالله نصيرا"۔ (جمہرۃ رسائل ۳/۳۷۸)

"تمام تعریف اس اللہ کی ہے جو مکمل اختیار و غلبہ والے بھیجے اور اٹھانے والے، وارث حقیقی، عزت، سلطنت اور نور و برہان والے آسمان، زمین اور ان کے مابین مخلوقات کے پیدا کرنے والے اور اس کے باشندوں پر فضل و احسان میں سب پر سبقت لے جانے والے اللہ کی ہے.... ساری مخلوقات کا خالق اور ان کے سلسلہ میں جملہ معاملات کا مالک وہی ہے.... اسی کی نصرت و حمایت سے راضی ہوا جا سکتا ہے، اور اللہ کی نصرت و حمایت کافی ہے"۔

عہد ہارونی کے مشہور شاعر محمد بن عبداللہ بن حرب (م ۱۹۰ھ/۸۰۵ء) کے ایک خط میں صفات الٰہی کا ظہور اس طرح ہوتا ہے:

"بے شک میں اس اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جو اپنی ذات کی حمد بیان کرنے میں منفرد ہے، اور اسی کو اپنے بندوں کے شکر کی انتہا قرار دیتا ہے۔ یہی اہل جنت کی پہلی آواز ہے جس کے ذریعہ سے غم کو دور کیا اور ان لوگوں کو اپنی مغفرت سے نواز کر اپنے فضل و کرم سے ہمیشگی کے گھر میں ٹھہرایا، اور حمد کے بعد اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام ہو جن کو اللہ نے خیر سے سرفراز فرمایا، اور ہر برائی سے محفوظ و معصوم بنایا"۔ (جمہرۃ رسائل: ۳/۱۸۶)

ان کے علاوہ بھی اس عہد کے خطبات و رسائل میں دیگر صفات کا صدور ہوا ہے، مثلاً عبدالملک بن صالح اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں:

"میں شیطان رجیم سے سمیع و علیم اللہ کی پناہ چاہتا ہوں"۔ (العقد الفرید ۲/۳۵)

داؤد بن علی نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

"والله افضل مستعان"۔

"اللہ ہی سب سے افضل فریاد رس اور مدد کا سہارا ہے"۔ (کتاب الصناعتین، ص ۲۱)

مشہور ہارونی وزیر جعفر بن یحییٰ برمکی اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں:

"تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے میری تنہائی کے عالم میں حفاظت فرمائی اور عافیت کے ساتھ مجھ کو روکے رکھا، مقبولیت سے نوازا اور لوگوں سے اطاعت و فرمانبرداری کرائی، اور میرے اور معصیت کے پیروکاروں کے درمیان حائل ہوا۔

تمام تعریف اے امیرالمومنین! اس اللہ کے لئے ہے جس نے وحشت کی حالت میں میری موانست فرمائی، میری دعا کو قبول کیا، میری آہ و زاری پر رحم فرمایا اور موت کو مجھ سے دور کیا"۔ (طبری، ۱۰/۶۶)

خطبات و مکاتیب کے ذخیرے سے جس قدر بھی حصہ اوپر بیان [illegible] حقیقت حضرات صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ان کے متبعین کے ایمان و عقیدے کی ایک عملی [illegible] باری تعالیٰ سے تعلق و وابستگی کا ایک مفصل باب اور کتاب ہدایت "قرآن مجید" سے فیض و اکتساب [illegible] جس کو قومیں اپنے ایمان و عقیدے کی اصلاح و درستگی اور صفائی و پختگی کے لئے ایک مستحکم [illegible] نمونہ بنا سکتی ہیں۔ جس میں اللہ وحدہ لا شریک لہ کی قدرت مطلقہ کے اعتراف، اس کی خلاقیت [illegible] کے ساتھ "قرآن حکیم" جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جس کے بعد کوئی صحیفہ نہیں نازل [illegible] تعلق کو مضبوط بنانے کی تعلیم و ہدایت بھی پوشیدہ ہے۔

اس آخری کتاب ہدایت کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے انسانوں [illegible] باری تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلایا بلکہ صفات الٰہیہ کو اپنا جزو عظیم بنا کر انسانوں کو شرک و [illegible] کرنے والے تمام اسباب و ذرائع کا سدباب کر دیا اور ذہنوں سے اس کی گندگی اور غلاظت کو [illegible] کر دیا۔ اسی بنیاد پر اس نے یہ مطالبہ کیا کہ "فاعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین" (قرآن) اللہ کی [illegible] کو اسی کے ساتھ خالص کرتے ہوئے۔

قرآن کے اس مطالبہ کی تکمیل صفت الٰہی کے استحضار کے بغیر [illegible] نہیں اس لئے دوسری جگہ ارشاد فرمایا "وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا" (آیت) اور اللہ کے بہترین نام ہیں ان [illegible] انہیں ناموں سے پکارو" تاکہ اس کے ذریعہ ذہن انسانی پر قدغن لگ جائے اور واردات قلبی کے اظہار [illegible] بھی وہ شرک کی آلودگی سے محفوظ و مامون رہے۔

جس میں یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ شرک کی بیخ کنی "اسماء حسنیٰ" سے ہی ممکن ہے، جس کے ذریعہ اللہ رب العزت کی ذات و صفات یا افعال کے بارے میں کوئی غلط عقیدہ یا تصور نہیں پیدا ہو سکتا۔ جس کی انجام دہی میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی متفکر نظر آنے لگے اور اس قدر دلسوزی و جانفشانی کا معاملہ فرمانے لگے کہ معبود حقیقی کو یہ کہنا پڑا "فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم ان لم یومنوا بھذا الحدیث اسفاء" (آیت) اور جو آپ ان پر اتنا غم کھا رہے ہیں سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تمام جدوجہد اور جانفشانی و فکرمندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام پیروکار جام توحید سے سرشار ہو کر شرک کے خلاف برسرپیکار ہو گئے اور ایک خدا کی عبادت کے علاوہ کسی کے سامنے ان کی گردنیں نہ جھک سکیں۔ صفات ربانی کا استحضار ان کی زندگی کا ماحصل اور شرکت غیر سے پاک تصور الٰہ ان کے وجود مسعود کا ایسا پاکیزہ نشان بن گیا جس سے قلب و نگاہ کو جلا ملتی ہے، اور ذہن و دماغ کی آلائشیں دور ہوتی ہیں۔ جو "خیرالقرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" (الحدیث) (سب سے بہترین صدی میری صدی ہے پھر اس کے بعد پھر اس کے بعد) کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، جس کو دیکھ کر ہر شخص اپنے عقیدہ و عمل کی اصلاح کر سکتا ہے اور اس کا مطالعہ اس حیثیت سے بھی مفید و سودمند ہے کہ یہی

آخری دین "اسلام" کی روح اور آخری کتاب "قرآن" کی جان ہے۔

حمد باری تعالیٰ [illegible] حسین مرقع جہاں اللہ رب العزت کی صفات حسنیٰ اور قدرت کاملہ پر غماز ہے، وہیں انقلاب زمانہ اور تبدیلی حالات کے باوجود وابستگان دین رحمت کے عقیدۂ توحید میں یکسانیت و ہم آہنگ اور الٰہی تصورات کے اظہار بیان میں [illegible] وحدت و پختگی کا مظہر بھی ہے، جس کو مستند کتب تاریخ و ادب اور دیگر علمی مآخذ کی مدد سے مدون کیا گیا ہے [illegible] اس کی کوشش کی گئی ہے کہ ان مذکورہ مجموعوں میں حمد الٰہی کا (خطبات و مکاتیب کے حوالے [illegible] اور جس انداز سے ظہور عمل میں آیا اس کو یکجا کر دیا جائے، تاہم اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی [illegible] ساتھ اس کا قطعاً دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حتمی اور آخری مجموعہ ہے جس میں کسی ترمیم و تغیر اور حذف و اضافہ کی گنجائش نہیں۔

❀❀❀

مآخذ و مراجع

جن کتابوں سے اس میں استفادہ کیا گیا ہے ان میں

۱۔ ابوالفرج اصفہانی کی اغانی۔

۲۔ ابن قتیبہ کی "الامامۃ والسیاسۃ"۔

۳۔ ابوجعفر ابن جریر طبری کی "تاریخ الامم والملوک"۔

۴۔ احمد زکی صفوت کی "جمہرۃ خطب العرب"۔

۵۔ احمد زکی صفوت کی "جمہرۃ رسائل العرب"۔

۶۔ ابواسحاق حصری کی "زہر الآداب"۔

۷۔ ابن الجوزی کی "سیرۃ عمر بن عبدالعزیز"۔

۸۔ ابوالعباس القلقشندی کی "صبح الاعشیٰ"۔

۹۔ ابوہلال العسکری کی "الصناعتین"۔

۱۰۔ ابن عبدربہ کی "العقد الفرید"۔

۱۱۔ ابن قتیبہ کی "عیون الاخبار"۔

۱۲۔ ابن الاثیر کی "تاریخ الکامل"۔

۱۳۔ المبرد کی "الکامل"۔

۱۴۔ مسعودی کی "مروج الذہب"۔

۱۵۔ شہاب الدین نویری کی "نہایۃ الارب"۔

شامل ہیں جنہیں کتب تاریخ و ادب میں مصادر و مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وجود پر براہین

عباس محمود عقاد

مترجم: عبدالصمد صارم

ہماری رائے میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا مسئلہ ہر شعور سے قبل احساس سے تعلق رکھنے والا ایک مسئلہ ہے۔ انسان کو اپنے وجود خاص اور اپنی ذاتی حقیقت کا یقینی احساس حاصل ہے۔ ایسے ہی کوئی انسان وجودِ اعظم اور حقیقتِ ہستی کے یقینی احساس سے بھی خالی نہیں، کیونکہ وہ بھی اسی وجود سے متصل ہے بلکہ اسی پر قائم ہے۔ یہ احساس اور عقل دو متناقض چیزیں نہیں اگرچہ احساس عقل و ادراکات سے عام ہے کیونکہ عقل تمام انسانوں کی حقیقت سے مدد لیتی ہے۔ اور انسان کے ظاہر و باطن اور اس کے شعور و لاشعور میں دخل رکھتی ہے لیکن بایں ہمہ شعور و احساس کا قیام عقل ہی کے ہمراہ ہوتا ہے جو تفصیل و تشریح کا محتاج ہوتا ہے۔

خود عقل کی حقیقت سمجھنے میں ہم ایک غلطی میں مبتلا ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عقل اشیاء کے تحلیل و تجزیہ میں منحصر ہے اور وہ اس وقت تک اپنا پورا عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ منطق تقسیم مقدمات و نتائج کے قضایا کی ترکیب اور مشہور طریقہ کے مطابق براہین کے ذریعہ نتائج کے اثبات کا طریقۂ کار نہ اختیار کرے۔ لیکن عقل اس تمام تجزیہ و تقسیم کے بغیر بھی موجود ہوتی ہے۔

عقل اپنے وجود میں ایک زندہ قوت ہے۔ وہ زندہ عمل پیش کرتی ہے۔ عرف منطقیین کے مطابق منطق کے فن اور اس کے ضوابط پر اس کا عمل موقوف نہیں۔

وہ ہمیشہ درست گوئی کی ذمہ دار نہیں۔ بعض دفعہ وہ غلطی بھی کر جاتی ہے۔ لیکن اس کے غلطی میں مبتلا ہو جانے سے اس کی کامل عصمت کی نفی تو ضرور ہے لیکن اس کے وجود کی نفی نہیں ہوتی۔ کبھی عقل اجمالی طور پر کارفرما ہوتی ہے اور ساتھ ہی تھوڑی یا بہت غلطیوں سے معصوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے اس کے موجود ہونے سے یا اس کی فکری صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جس طرح اجمالی عقل اپنے مجمل فیصلوں میں غلط ہو سکتی ہے اسی طرح منطقی تقسیم کا بھی بہرحال صحیح ہو جانا ضروری نہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ سرے سے منطقی تقسیم موجود ہی نہیں یا وہ تفکر کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔ بداہت عقلی جب اعتراف کرے کہ "ہاں اللہ تعالیٰ موجود ہے" تو اس کا یہ قول نظر انسانی میں بڑی قیمت رکھتا ہے۔ جو منطق و قیاس کی قدر و

قیمت سے کسی طرح کم نہیں۔ وجہ یہ کہ یہ اسی زندہ عقل کی توضیح ہے۔ منطق و قیاس بھی اس کی تنقید اور مضبوط سند سے باہر نہیں، اجمالی عقل ہمیشہ ایمان لاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر بحث کا جہاں بھی میدان آیا لبیک کہتی رہی، منطقی تقسیم کے بس کا یہ روگ نہیں کہ وہ قطعیت سے کہ دے کہ [illegible]۔

اس کے بعد یہ باقی رہا کہ "شعور" عقل اجمالی سے زیادہ عام زیادہ [illegible] اور حیثیت انسانی کے ساتھ ساتھ زیادہ وسیع رہا ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ یہ فطری شعور جو طبیعت انسانی میں [illegible] ترکیب رکھتا ہے اس حقیقت کبریٰ پر ایمان لانے میں جو موجودات پر احاطہ رکھتی ہے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان کو کائنات میں جمالیات، نظام تکوینی اور اسرار و عیوب کا شعور [illegible] ہے۔ اور وہ جمال کچھ لوگوں پر منکشف ہو اور کچھ کے لئے مستور ہو تو یہ اس کے وجود یا اس کے [illegible] والوں کے سچے احساس میں قادح نہیں۔ ریاضی کے یہی اصول اور اصول کائنات اگر ایک فریق سے [illegible] یقینی اور منظم ہیں تو دوسرے فریق کی عقل میں ان کے مضطرب ہونے سے کوئی فرق پیدا نہیں [illegible] انسانوں کے ایک گروہ میں یہ کائنات سرمدی اسرار و حکم سے خالی ہے تو اس فریق کو یہ حق نہیں [illegible]۔ وہ اس فریق کو پراگندہ خیال پر مبنی ٹھیرائے جو ان اسرار و حکم کی تصدیق کرتا ہے اور مناجات و مکاشفہ [illegible] "ہاں" اور "نہیں" میں تصدیق کے قابل ہاں ہے۔ نہیں، نہیں، کیونکہ وہ انکار پر مبنی ہے۔ اس لیے [illegible] سرمدی [illegible] میں انکار ایک قسم کا دعویٰ ہے۔ جس پر منکر سے دلیل طلب کی جائے گی اور ابتدائی عقلوں میں سرمدی حقیقتیں ہمیشہ کمال مطلق کی صورت سے وابستہ رہی ہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ عظیم سرمدی حقیقت ممکن ہے کہ ایک قاصر حقیقت ہو یا ممکن ہے کہ عقل نے بغیر کمال و اطلاق ہی کے اس کا تخیل کر لیا ہو تو گویا وہ ظاہری شعور پر تی احساس کے خلاف دعویٰ کرتا ہے جس پر اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

جب ہم انسان کے ایمان کی تاریخ کی طرف لوٹتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ فطری شعور، منطقی قضیوں اور عقلی دلائل پر اعتماد کرنے سے کہیں زیادہ عظیم الشان ثابت ہوا ہے۔ اور وہ اس تعیین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ طاقتور ہے جو اسے تحلیل و تقسیم کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ خود فلسفہ از منہ قدیم میں اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلائل اس لئے نہیں قائم کر رہا تھا کہ ایمان کی طرف سہارا ڈھونڈنے کے عقیدہ میں وہ دوسروں کو قناعت بخشنا چاہتا ہے، بلکہ ان قدیم فلسفیوں کا اللہ تعالیٰ کے وجود کے سلسلہ میں کلام علمی مباحث پر کلام کی نوعیت رکھتا تھا تاکہ فطرت کے مظاہر کی تشریح ہو سکے۔ مثلاً ارسطو نے اللہ تعالیٰ کے وجود کو اس لیے ثابت نہیں کیا تاکہ وہ اس کے ذریعہ کفر و الحاد میں مبتلا کسی منکر کو مومن کرے۔ بلکہ اس لیے ثابت کیا تھا کہ کائنات کے مظاہر کی تشریح بغیر اس اثبات کے مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔

چنانچہ ارسطو وغیرہ کے نزدیک وجود الٰہی کوئی دینی یا غیبی مسئلہ نہیں کہ وہ اس میں اثبات و نفی سے اس لیے بحث کر رہے ہوں جس طرح ہدایت و ضلال کا اختلاف ہوتا ہے بلکہ یہ ایک عقلی حقیقت تھی جیسے ہندسی حقائق کہ افلاک و سماوات میں حرکات و اشکال کا تصور انہیں پر موقوف ہوتا ہے۔

جس وقت توحید پرست ادیان کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں اختلاف عظیم رونما ہوا۔ یہ اختلاف

خود اللہ تعالیٰ کے وجود میں اختلاف سے کہیں زیادہ شدید تھا۔ یہ لاہوتی لوگ ایک زمانہ تک خاموش بیٹھے رہے کہ اس مخلوقات کے خلق کے وجود کے متعلق انہوں نے کسی کو قانع و مطمئن کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ محسوس ہوئی تو اس وقت ہوئی جب کہ دینی عقائد میں فلسفیانہ افکار کا اختلاط ہوا۔ اور جدل و برہان کے میدان میں فلاسفہ و مناطقہ سے ان کے مناظروں کی گرم بازاری ہوئی۔

مومنین [illegible] مباحث ان دلائل و براہین سے چمک اٹھے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات پر قائم کیے تھے۔ [illegible] سمجھتے ہیں کہ اگر وہ دلائل یہاں بیان کیے جائیں تو ان کا بیان ایک صحیح موقع پر ہو گا جن کا حاصل یہ ہے کہ [illegible] اور دینی شعور پر مبنی عقیدہ حاصل کرنے میں کائناتی شعور سے تمام دلائل مستغنی نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہ [illegible] کا احاطہ کرنا ایک ایسا عقیدہ ہے جو کسی انسان کی عقل و دلیل میں منحصر نہیں ہو سکتا بلکہ مقصود [illegible] دو نوعیتوں میں ترجیح پیدا کرنا ہے۔ دلائل و براہین کی ایک قسم وہ ہے جس پر مومنین اعتماد کرتے [illegible] وہ جس پر منکرین اعتماد کرتے ہیں۔ جبکہ مومنین کے دلائل منکرین کے دلائل پر راجح ہیں تو دلائل [illegible] اور حتی الامکان قیاس کا پیغام صحیح ہے، دلائل و براہین واقع میں کفر پر قانع بنانے میں زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں۔ چہ جائیکہ ہدایت کا عقیدہ بخشیں۔ جیسا کہ اس میزان کے دونوں پلڑوں میں بانصاف موازنہ کرنے سے واضح ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اثبات و نفی کا اصول دو مقابل گروہوں کے مناقشات میں اس عظیم الشان موضوع پر منطبق نہیں ہوتا۔ عقل انسانی کو نہ اثبات سے کوئی خصوصیت ہے اور نہ انکار سے۔۔۔۔ اسی طرح حقیقتِ وجود کی بحث میں نہ کسی کے ذمہ تمام دلائل کا مہیا کرنا ہے، اور نہ انکار کی تمام صورتوں کا۔ اور نہ منکر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی خوابگاہ میں آرام کی نیند سوئے ہوئے مومن سے کہہ دے کہ تیرا قضیہ ہے تو خود ہی اس پر بحث کر، اپنی پوری جدوجہد کو کام میں لا، پھر مجھے بیدار کر دینا تاکہ تو مجھ سے اپنے عقیدہ پر میرے خیالات سُن سکے۔۔۔۔ کیونکہ منکر ہی درحقیقت طلبِ دلیل میں جدوجہد کرنے کے زیادہ لائق ہے کیونکہ وہی صاحبِ ادّعا ہے۔ اس لیے جب وہ کہتا ہے کہ مادہ ہر اس تدبیر پر قادر ہے جو ہم اس کائنات میں دیکھتے ہیں تو اس کے اس جواب سے وجودِالٰہی کا محض انکار ثابت ہوتا ہے اور نہ اس طرح وہ اثبات و انکار کے درمیان میں کسی درمیانی خط ہی کو پکڑے ہوئے ہے۔

ہم اس مضمون میں ان تمام دلائل و براہین کو جمع کرنے کا قصد نہیں رکھتے جو فلاسفہ نے وجودِالٰہی پر پیش کیے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی طویل داستان ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی کثرت میں کچھ قدر مشترک بھی موجود ہے۔ اختلاف اگر ہے بھی تو صرف تفصیلات و فروع میں ہے۔ ورنہ بنیادی منشا میں ایک دوسرے سے کافی یگانگت رکھتے ہیں۔ بہرحال ہم ان میں سے ان دلائل پر اکتفا کرتے ہیں جو مشہور، جامع اور تواتر و قبولیتِ عامہ کے لحاظ سے قریب تر ہیں۔ وہ دلائل ہیں براہانِ تخلیق، برہانِ غایت، برہانِ اشکال یا برہانِ استقصاء اور برہانِ اخلاق یا ضمیر کی آواز جو اسے کنٹرول کرتی ہے۔

برہانِ خلق —— یورپین لغات میں اسی کا نام برہانِ تکوینی ہے یا The Cosmological Argument ، یہ بڑی پرانی ہمہ گیر اور ہمارے خیال میں مطمئن کرنے میں بڑی ٹھوس دلیل ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

موجودات کے لیے ایک موجد ہونا ضروری ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودات میں سے ہر موجودات اپنے غیر پر موقوف ہوتا ہے۔ اسی طرح اس غیر کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے غیر پر موقوف ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں اس سلسلہ میں یہ معلوم نہ ہو کہ کسی ضروری سبب کی بنا پر اس کا وجود ذاتی طور پر دوسری چیز کے وجود کے لیے موجب بنا۔ یہ کہنا ممکن نہیں کہ تمام موجودات اپنے وجود میں ناقص ہیں اور تمام کائنات میں کمال کی طرف حرکت پائی جاتی ہے، کیونکہ اس کہنے کا مطلب یہ ہو گا کہ گویا نقص کا مجموعہ کمال ہے۔ اور متناہی اشیاء کے مجموعہ کے لیے خود کوئی انتہا نہیں اور قاصر و ناقص اشیاء کا مجموعہ ایک ایسی قوت ہے جس میں کوئی قصور پیدا نہیں ہوتا۔ حاصل یہ کہ تمام موجودات جبکہ لذاتہ غیرواجب ہیں تو لازمی طور پر ان میں سے ہر ایک کے لیے سبب کا ہونا ضروری ہے جو ان کے لیے موجب بنے اور اس کا وجود کسی اور سبب کے وجود پر مبنی نہ ہو۔

یہ برہان اپنے متعدد اسلوب بیان کی شکلوں میں ہر اسلوب کے لحاظ سے محرک برہان کہلاتی ہے جو خود متحرک نہ ہو۔ یا اس کے مختلف معانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ لیجئے کہ یہ ایک ایسا محرک ہے جس نے تمام کائناتی حرکتوں کو وجود دیا۔ ان ہی حرکات میں سے ایک حرکت یہ بھی ہے جس کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا یا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا یا حیز امکان سے حیز وجود کی طرف منتقل ہونا یا قوت سے فعل کی طرف منتقل ہونا۔ بہرحال حاصل اس برہان کا یہ ہے کہ ہر متحرک کے لیے کسی محرک کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس محرک کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی اس حرکت میں کسی اور سے مدد لے رہا ہو، یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ عقل کسی ایک محرک پر جا کر رک جائے گی کہ جس پر خود کوئی محرک نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ خود ہی مکان و زمان کی حدود سے آزاد ہو کر قائم بذاتہ ہو گا اور یہی اللہ تعالیٰ ہے۔

مادہ پرست اس برہان کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس بات کے سمجھنے میں کوئی مانع نہیں کہ ہم اس ابتدائی محرک کو بھی ممکن یا مادی محرک ہی تسلیم کر لیں۔ البتہ اس کا وجود ابدی ازلی اور بغیر ابتداء انتہا کے ہو۔ کیونکہ عالم کے قدیم ہونے کو عقلاً ناممکن نہیں کہا جا سکتا اور نہ تصوراتی لحاظ سے یہ محال ہے۔ البتہ عالم کا حدوث ہمیں اشکال میں ڈال دیتا ہے۔ اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے زمانۂ عدم میں جب وہ نیست تھا تو ہست کیوں ہوا؟ مشیتِ الٰہی اس کی تخلیق پر کیوں آمادہ ہو گئی؟ حالانکہ مشیتِ الٰہی کسی حالت کے طاری ہونے کو یا اسباب و موجبات کے تغیر کو قبول نہیں کرتی۔

ان مادیین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جزم کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ تمام کائنات کسی ایک شی پر مشتمل نہیں جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ یہ دوسرے کی وجہ سے موجود ہے۔ اور اس سلسلہ میں نظامِ عالم، عقل یا حیات کسی لحاظ سے بھی ان کے نزدیک اس مذکورہ قانون سے کوئی استثناء نہیں۔

چنانچہ ان کا قول ہے کہ صرف اتفاقی تصادم، ارضی کائنات کے تمام نظام کی تشریح کے لیے کافی ہے۔ وہ اس کی ایک مثال دیتے ہیں کہ مثلاً حروفِ ابجد کا ایک صندوق ہو۔ اس میں سے حروف لے کر مختلف ترتیبوں کے ساتھ سیکڑوں، ہزاروں اور کروڑوں مرتبہ جوڑا جائے اور ایک ایسے زمانہ کے امتداد کے ساتھ ساتھ یہ عمل جاری رہے جس کو سال اور صدیاں بھی شمار نہ کر سکیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی دفعہ ہومر کی الیڈیا کوئی منظوم

قصیدہ یا بامعنی کلمات بن جائیں۔ اس صورت سے ان حروف کے متحقق ہونے میں سوائے ایک اتفاقی تصادم کے اور کوئی وجہ نہیں۔

اسی طرح مادی کائنات انہیں گوناگوں حرکات میں جو اسے تمام ممکنہ تصادموں کی شکل میں پیش آئی ہیں۔ عقلاً اس کے اس طرح تسلیم کرنے میں کوئی مانع نہیں کہ اس کا ایک اتفاقی تصادم اسی طرح کے ایک مسلسل نظام کی خبر دیتا ہے۔ اسی قسم کی تکوینات کے سلسلے عالم جماد و عالم حیات وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مگر بعینہٖ یہی مثال اس کے قائلین کے دعویٰ کی تردید کرتی ہے۔ اور ان فرضی تصادمات کے علاوہ جو تمام اشکال و احوال میں یہ لوگ بے تکرار پیش کرتے ہیں ایک اور فرضی چیز لازم آتی ہے۔

وہ اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اس چیز کو بھول گئے کہ انہوں نے شروع میں ان حروف کے وجود کو ایک مفروضہ کی شکل میں لفظی علاقہ کے ساتھ مربوط مانا ہے جس سے کلامِ مفہوم وجود میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر فا، یا، لام، سین اور واؤ کا وجود اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان حروف سے بنے ہوئے ایک یا چند کلموں کا وجود نہ ہو۔ اسی طرح یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ متماثل مادہ کے اجزاء ابجدی حروف کی طرح باہمی تشکیل کا علاقہ رکھتے ہیں؟ اجزاء میں اس قسم کا تنوع مادہ پر کیسے طاری ہو گیا؟ اور ایک قابلِ فہم شکل میں اس تنوع میں اتحاد کی قابلیت کیسے پیدا ہو گئی؟

نیز انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ شروع میں انہوں نے ایک مفروضہ قائم کیا ہے کہ تنسیق و تنظیم کی نگراں ایک قوت و صلاحیت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ عقلاً یہ ضروری نہیں کہ حروف کے درمیان یہ قوت و صلاحیت ہو، اور ان کا وجود جمع و تنظیم کے تو موافق ہو مگر بدنظمی و پراگندگی پر ان میں کبھی اتفاق نہ ہو۔

اسی طرح انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ انہوں نے اس جامع قوت و صلاحیت کے متعلق یہ فرض کر لیا ہے کہ ہر احتمالی شکل میں وہ قوت ان حروف میں منظم صورت ہی میں اعادہ کرتی ہے۔ گویا اس قدر عقلمند ہے کہ شروع ہی میں تمام احتمالات کو ذہن میں رکھتی ہے اس کی یہ قوت ہر احتمالی صورت میں برابر جاری و ساری رہتی ہے اور کبھی ان میں گڑبڑ نہیں ہوتی وہ بار بار ہر تجدید و اعادہ میں یونہی نہ ختم ہونے والی شکل میں جاری رہتی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں وہ یہ بھی بھول گئے کہ باہمی تنظیم و ترتیب کی کامیابی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تنظیم بقائے منفعت کی حد تک پہنچ کر رُک جائے۔ سوال یہ ہے کہ اتفاقی طور پر جب اشیاء کا وجود ہوا تو باہمی نظم بقائے انفعیت ہی میں کیوں منحصر ہوا۔ اس میں بہت تیزی سے خلل بھی آ جانا چاہیئے تھا۔ کسی نہ کسی شکل میں تنظیم کی بجائے بدنظمی و انتشار کا ظہور بھی ہو جانا چاہیئے تھا؟ تو وہ کون سی قوت تھی جس نے بقائے اصلح کو ترجیح دی۔ اور بدنظمی و خلل سے بچایا۔ حالانکہ نظم اور بدنظمی احتمالاً دونوں یکساں ہیں؟ مادیین کا یہ طرزِ فکر بھی بڑا عجیب ہے کہ وہ عناصر وجود میں سے ہر عنصر میں کمالِ مطلق کو جائز سمجھتے ہیں۔ مگر ایک عقل کا عنصر ہی ایسا ہے جس کے متعلق وہ انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ عقل کو صرف انسان ہی میں محدود کرتے ہیں اس سے ان کے نزدیک مادہ وجود و بقاء و زمان و مکان میں محدود نہیں، نہ قوت، حرکت اور تکرار میں محدود ہے۔ لیکن جب وہ عناصر کے اشرف جزو یعنی

عنصر عقل پر کلام کرتے ہیں تو انسان میں اس کے منحصر ہونے کو جائز کہتے ہیں اور اس کو انہی حدود میں مطلق نہیں چھوڑ دیتے ہیں جن میں تمام عناصر وجود کو چھوڑا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ کیسے ممکن ہے کہ مادہ عقل کی تخلیق پر قادر ہو گیا۔ جب کہ انسان کی تخلیق سے پیشتر اس کائنات میں کروڑہا کروڑ سال سے وہ اس مادہ کو عقل سے مجرد ملتے ہیں؟

آخر کیوں؟ وہ کائنات جس کی کوئی ابتدا نہیں، مدتوں پہ مدتیں بیتتی چلی آتی ہیں نہ اس کا حساب کروڑوں میں آ سکتا ہے اور نہ ان کروڑوں کو دوچند سہ چند کرنے میں مادہ پر وہ کیا افتاد پڑی کہ اس نے عقل کی تخلیق کی، جب کہ عقلِ انسانی کے ظہور سے پیشتر مادہ عقل سے بالکل عاری تھا؟ ــــ ماننا پڑے گا کہ عقل کی تخلیق دنیا میں نہایت قریبی تاریخ رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے پیشتر دنیا کی کوئی حد نہیں اور نہ کوئی حساب اس کی عمر کا جائزہ لے سکتا ہے۔

بعض نے اس کی تشریح کرتے ہوئے اسی کو مادہ کے تسلسل ادوار سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تسلسل ازل سے شروع ہوا جس کی کوئی ابتدا نہیں اور اس ابد کی طرف چلا جا رہا ہے جس کی کوئی انتہا معلوم نہیں۔ اس تسلسلِ ادوار سے مراد یہ ہے کہ ہر دور میں کائنات بنتی اور بگڑتی ہے۔ زمانہ کے نشیب و فراز ابھرتے ہیں۔ آسمانی تنظیمیں حرکت میں آتی ہیں۔ آسمانی ستاروں میں سے کوئی ستارہ اپنے زندگی کے ظہور کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اس زندگی کے طور طریق برابر ارتقاء کی طرف مائل رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ حیاتِ انسانی کے دور کو جا پکڑتے ہیں۔ حیاتِ انسانی اپنے تمام خوبیوں یعنی عقل و تمیز کے ساتھ وجود میں آ جاتی ہے اسی طرح یہ سلسلہ اپنی انتہا کی طرف ارتقاء کرتا ہے اور اس کے پورے ہو جانے پر انتشار و تنزل کی خبر دیتا ہے۔ پھر یہی سلسلہ مکرر عود کرتا ہے۔ بے شمار منتشر اجزاء فضا میں پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ عنصر عقل کے مقررہ درجہ تک ان کی انتہا ہوتی ہے اور یہی عقلِ انسانی یا اس عقل سے جو بھی مشابہ ہو اس کا درجہ ہے۔

مادیین کا یہ گروہ خیال کرتا ہے کہ انہوں نے اپنی اس تشریح سے اس عقلیت کی عجوبہ کاری کو باطل کر دکھایا جو ازل میں مستور تھی۔ اور کائنات میں اس کا ظہور کچھ محدود مدت مثلاً چند ہزار سال یا چند کروڑ سال پیشتر ہوا۔ بہرحال وہ بھی چند ہزار سال ہی کے حکم میں ہے۔ مگر ان کے اس دعویٰ میں کوئی ندرت پیدا نہ ہو سکی کیونکہ حاصل یہ ہوا کہ عقل قدیم ہے اور ازل الآزال سے ابدالآباد تک تجدیدی رنگ میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔

تو کیا اس عجیب قسم کے من گھڑت نظریہ سے وہ عجوبہ کاری زائل ہو گئی؟ اور کیا عقل اس کو مانتی ہے کہ عنصر عقل ہی ایسا تنہا اور محدود عنصر ہے جو انسانی ترقیوں میں سب سے زیادہ ترقی پذیر ہے؟ اور یہی وہ عارضی طور پر طاری ہونے والا عنصر ہے جو تمام کائنات میں سے ایک وجود یعنی انسان پر طاری ہوتا ہے؟ کیوں وجودی اعتبار سے عقل ازلی نہیں ہو سکتی۔ کہ عقل خدا کی حیثیت حاصل کر لے کیونکہ خدائی صفات میں ازل اس کی شان کے لائق ہے؟ کیوں آخر ہم ان ازلی ادوار کو تسلیم کریں اور عقل کو ازلی تسلیم نہ کریں۔ جو سمجھنے میں آنے والی صاف بات ہے؟ کیوں آخر ہم عقلی حدود کے فیصلے کریں۔ اور ان ابدی ادوار کے من گھڑت نظریہ کو مانیں؟ حالانکہ ان میں سے کچھ بھی ہمارے مشاہدہ میں آنے والی بات نہیں۔ نہ یہ کوئی صحیح منطق ہے اور نہ کسی تجربہ اور

استقراء کے ذیل میں آتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ الٰہی کو قبول کر لینا ان تمام اوہام و تکلفات کے قبول کرنے سے کہیں آسان ہے۔ بالآخر کون شخص ہے جو ان اوہام و مفروضات کے نیچے دب کر ہلاکت مول لے۔ یہ بھی مادی لوگ ہیں جو حس، تجربہ اور استقراء سے ماورا ہر چیز کو باطل قرار دیتے ہیں، لیکن جب یہ لوگ عالم غیب و ایمان میں داخل ہوں گے تو ان کا یہ تمام مذہب ان کے نیچے سے نکل کر جا چکا ہو گا اور انہیں پتہ بھی نہ چلے گا۔

*****

جدید فلسفی مباحث، دورِ حاضرہ یعنی بیسویں صدی میں ابھرے، مادہ میں ظہورِ حیات کی وجہ بتلاتے ہوئے دو نظریوں میں منقسم ہو گئے۔ یہ دونوں نظریے بنیادی لحاظ سے تو قریب قریب ایک ہی ہیں، مگر تفصیلی صورت میں دونوں کے نتیجے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک کا عنوان ہے "روئیدہ زندگی" اس کا قائل ایک انگریز فلسفی صموئیل اسکندر ہے۔ انگریزی میں یہ نظریہ Emergent Vitalism کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرے کا عنوان ہے "ترکیبِ کامل"۔ اس کا قائل مارشل سمٹس جنوبی افریقہ کا مشہور عالم ہے۔ اس نظریہ کو انگریزی میں ہولزم (Holism) کہتے ہیں۔ یہ افریقی زبان کا لفظ ہے بمعنی "کاملِ کل"۔

ان دونوں نظریوں کی فکری اساس کا خلاصہ یہ ہے کہ مادہ ترکیب کی طرف یا کامل مرکبات تیار کرنے کی طرف متوجہ رہتا ہے اور اسی آمیزش و ترکیب کے وقت حیات رونما ہوتی ہے۔ جس طرح کہ بعض عناصر کی آمیزش سے کیمیاوی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس سے پیشتر عناصر کی انفرادی حالت میں وہ حیات موجود نہیں ہوتی۔ اس نظریہ میں مارشل سمٹس کے نظریہ کے مقابلہ میں صموئیل اسکندر کا نظریہ زیادہ عام ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اس طریقہ سے کائنات میں عقلِ الٰہی بذاتِ خود پیدا ہو گئی۔ مادہ ازل الآزال سے موجود تھا۔ پھر ان اجزاء و ذرات میں باہمی ترکیب و تاثیر سے کسی مرحلہ میں عقلِ الٰہی پھوٹ پڑی۔

مسئلہ کی نوعیت جیسا کہ ہم خیال کرتے ہیں ایک اعتقادی اور تقدیری قسم کے مسئلہ کی سی ہے۔ ایسی صورت میں ہم نہیں سمجھتے کہ کیوں انسانی عقل کے لیے یہ تصور آسان ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مادہ سے پیدا شدہ تصور کرتا ہے۔ اور مادہ کو قدرتِ الٰہی سے پیداشدہ تصور کیوں نہیں کرتا؟ اور کیوں اس اعتقاد کو اس اعتقاد پر ترجیح دیتا ہے؟

یہ کہنا کہ مادہ ترکیب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس میں بعض حالات میں لازمی طور پر زندگی پھوٹتی ہے۔ اس میں ظہورِ حیات کی قطعاً کوئی تشریح نہیں ملتی۔ بلکہ حاصل اس تمام بحث کا یہ ہے کہ یہ زندگی کے آثار و ظواہر کی ایک حالت ہے جو ہم محسوس کرتے اور جانتے ہیں۔ ہمارے مشاہدہ میں کچھ زندہ اجسام آئے تو کہہ دیا کہ مادہ زندہ اجسام کی تخلیق کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس طرح محسوس مظاہر پر آکر تشریح رک گئی۔ اسی وجود کے اسباب کو اس وجود کے اظہار کے لیے تشریح قرار دے لیا گیا۔

اس قسم کے اقوال سے اس خصوصیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ظہورِ حیات کے ساتھ بعض اجزاء کیوں خاص ہوئے۔ تمام اجزاء جن پر ارضی و سماوی کائنات مشتمل تھے ان سب کو یہ حیات کیوں نہ عام ہو گئی۔

کیونکہ مادہ کے اجزاء ایک ساتھ ظاہر ہوئے ان میں باہم کوئی فرق نہ تھا جو مستلزم ہوتا کہ بعض اجزاء میں ترکیب واقع ہو اور بعض میں نہ ہو۔ لہذا بعض میں یہ اختلاف کیوں ہوا؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ یہ اختلاف اس منزل کے لیے جس میں کہ یہ حیات پروان چڑھتی ہے کیوں تدبیر منزل کی حیثیت رکھتا ہے؟ اور کیوں اس منزل میں بسنے والے جانداروں کی ضروریات کے مطابق غذا وغیرہ کے مہیا کرنے کا اتفاق رونما ہوا اور اردگرد کے جمادات سے امتیازی حیثیت قائم ہوئی۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ہم مادہ کے عناصر کو باہم ترکیب دے سکتے ہیں جس طرح کہ کسی صاحبِ ارادہ جاندار جسم کے وجود میں ترکیب ہوتی ہے تو کیا ایسی صورت میں ان سے بیان کیے ہوئے طریقہ کے مطابق اس میں حیات رونما ہو جائے گی؟ اگر ہم کسی معین شخص کے لیے ترکیب و آمیزش کی ایک صورت قرار دیں اور مرکب مخلوق میں ہر خلیہ کے سامنے بطور نمونہ اس کی مخصوص جسمانی خلیوں کو رکھیں تو کیا اس مرکب مخلوق میں کیفیات انسانی مثلاً اخلاق، عقلی ملکات، تناسلی خصوصیتیں جو باپ بیٹے میں منتقل کرتا ہے پیدا کر سکیں گے؟ مثلاً ایک شیر کے تمام جسمانی خلیے لے کر اگر ترکیب دیں تو اس طرح وہ حقیقی شیر پھوٹ پڑے گا جس کی خصوصیتیں یہ ہیں کہ چیر پھاڑ کرنے والا درندہ ہے۔ گوشت کھاتا ہے اور شیرنی سے مل کر یہی نسل چلاتا ہے۔ یا اگر ایک بلبل کو اس کے تمام جسمانی خلایا کے ساتھ ترکیب دیں تو کیا یہ بلبل چہچہاتی ہوئی پھولوں پر عاشق، راتوں کے گیتوں کی شیدائی، باز اور گدھوں سے خوف کھائی ہوئی ٹھیک اسی طرح اٹھ بیٹھے گی جس طرح وہ ماہابیر جو نر و مادہ سے بطور نسل کے پیدا ہوئی ہیں؟ یا اگر ہم ایک شخص اہل چین کی صورت پر ایک شخص حبشی صورت پر، ایک شخص سرخ ہندوستانیوں کی صورت پر اور ایک شخص گورے رنگ کے امریکیوں کی صورت پر ترکیب دیں تو کیا مادی خلیوں کی یہ محاکات ان تمام جنسی اور اصلی خصوصیات یعنی باہمی عداوت دوستی ذوق اور خواہش کے رونما ہو جانے کا باعث ہو جائے گی؟ اور کیا یہ شخص اصلی انسان کی طرح اپنی بیوی یا معشوق کی طرف دوڑنے لگے گا؟ کیا وہ بچوں پر باپ کی طرح شفقت کرنے لگے گا۔ اور کیا وہی زبانیں جو اصلی صورتوں میں بولتے تھے بولنے لگے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ حیات کے خلیئے اپنی ترکیب و مزاج میں تمام خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ جس کے تمام عالم مادی میں دیگر خلیئے حامل نہیں ہوتے۔ ان خصوصیات میں پہلی چیز تکرار و تنوع حفظِ نوع اور ٹھیک اسی طریقہ پر نوع کی تجدید ہے جس طرح دیگر انواع اس میں خصوصیت رکھتی ہیں جسم میں ہر خلیہ وہی عمل کرتا ہے جو اس کے طریقہ کے مطابق ہو اور جس وقت میں جو کام اس کے کرنے کا ہو۔ ان خلیوں کے اعمال کی تقسیم اپنی اپنی نوعیتِ عمل کے مطابق حیرت انگیز عجوبہ ہے ایک معجزہ ہے کہ ایک خلیہ مذکر سے خارج ہوتا ہے اور ایک خلیہ مؤنث سے اور ضروری مقدار کے ساتھ تمام جسم کے وجود میں لانے کے لیے منقسم ہو جاتا ہے۔ ہر خلیہ اپنی جگہ قلب میں یا پھیپھڑوں میں یا جگر اور دماغ میں پہنچ جاتا ہے اس سے وہی جسم تیار ہوتا ہے اور زندگی کے تمام معمولات پورے ہونے لگتے ہیں۔ پھر یہ عمل اسی ایک بنیادی نظم پر قائم نہیں بلکہ تمام اجزاء میں حلول و اندفاع کی وہ تمام کیفیات باقی رہتی ہیں جو ازسرنو ایک نئے انتظام سے قائم ہونی ضروری ہیں۔ حتیٰ کہ وہ خلایا مثلاً

جو آگے چل کر دانت بننے والے ہوتے ہیں اپنے مخصوص مقدار میں ہر دانت کے مادہ اس کے حجم، کھانا چبانے میں اس کے عمل اس کے اوقات کار اور حسب ضرورت طریقۂ معہود کے مطابق نشوونما کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان تمام انواع میں وہ مادہ جس سے ان کی ترکیب ہوتی ہے ایک ہی ہے۔

اگر اس عجیب تعبیر پر ان بلوری شکلوں کو قیاس کیا جائے جو ایک ہی صورت سے کئی کئی دفعہ وجود میں آتی رہتی ہیں تو یہ قیاس لغو اور مضحکہ خیز کہا جائے گا، کیونکہ سانچوں کا عمل اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ ہر بار ایک ہی شکل کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی شکل دینا ان کے بس میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اندھے سانچوں سے عمل سے ہٹ کر اس محکم مقصد کے لیے دیگر متعدد عوامل ملحوظ کرنے پڑیں گے جن کی تشکیل خلیوں میں داخل ترکیب و مزاج ہے اور تمام جانداروں کے اجسام میں یہ نظام پھیلا ہوا ہے۔

صحیح منطقی فیصلہ بشرطیکہ پیش نظر تحقیق ہو یہ ہے کہ قصد اس وقت ہوتا ہے جب کوئی قصد کرنے والا صاحب ارادہ ہو، نہ یہ کہ عقل ہر قصد کا انکار کرے اور ہر اس تشریح کو رد کر دے جس میں نظامِ عالم کو اتفاقی واقعات سے تعبیر نہ کیا گیا ہو گا۔ سوچنے کی بات ہے کیا عقلاً اس اتفاقی صورت کو فرض کیا جا سکتا ہے بجز اس صورت کے کہ قصد و ارادہ کا فرض کرنا ہمارے نزدیک محال ہو جائے؟ کیا نظامِ عالم کے واقعات کو اتفاق و تقدیر کے ساتھ مربوط کرنا زیادہ آسان و واضح ہے یا ایک صاحب قصد و ارادہ کے عمل کے ساتھ اس کی تشریح کرنا زیادہ واضح ہے؟

بیالوجی کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ تنہا مادہ کے قوانین۔ اجسام میں زندگی کے مظاہر کی تشریح کے لیے کافی ہیں۔ اور اس پر مزید بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ درحقیقت بیالوجی کے ماہرین ہی اس موضوع پر صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا مقام رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے علم کا نام علم الحیات زبان زدخاص و عام ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماہرین بیالوجی صرف زندہ اجسام کے اعضاء کو پہچان سکتے ہیں۔ خود نفس حیات کے معاملہ میں دیگر علماء کی نسبت وہ کسی خاص امتیازی حیثیت کے مالک نہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اعضاء کے وظائف و اعمال کی تشریحات کے جان لینے سے آدمی فلسفہ حیات اور کائناتِ اعظم کے اصول کا بھی ماہر ہو جائے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ ان اصولوں میں سے پہلا اصول یہ حیات ہے۔ لہٰذا ایک ماہر کیمیا کے لیے یہ صحیح نہ ہو گا کہ وہ مادہ کی اصل اور زمان و مکان کے قدیم ہونے کو اپنے لیے اصولِ حیات تصور کر لے۔ اسی طرح ایک پریس کے انجینئر کے لیے یہ صحیح نہ ہو گا کہ وہ لفظوں کے اسرار اور کلمات کے معانی میں فیصلے صادر کرنے کا اپنے لیے مقام تجویز کرے۔ اس لئے کہ اس کا منصب صرف یہ ہے کہ وہ حرفوں کی چھپائی کا خیال رکھے۔ اور مشین کے پرزے درست رکھے تاکہ اس کے سامنے ساری کتاب کے نسخے ٹھیک طریقہ سے چھپ جائیں۔ ایسے ہی اس بڑھئی کے اس طریقہ کو غلط کہا جائے گا جو شطرنج بناتے بناتے یہ بھی خیال کرنے لگے کہ وہ کھیل کے وقت بساط پر فلاں مہرے کو حرکت دینے میں تمام کھلاڑیوں سے زیادہ ماہر ہے اور مہروں کی چال سے ایک ماہر کھلاڑی کی طرح خوب واقفیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کھیل کا ماہر کھلاڑی ایک مہرہ کو بنانے، لکڑی کو کاٹنے اور جوڑنے میں تمام آدمیوں سے زیادہ نکما ثابت ہو۔

علاوہ ازیں مادیین مادہ کے قوانین سے پوری طرح سے واقف نہیں ہوتے نہ وہ مادی اجسام کے خصائص ہی کو سمجھتے ہیں۔ نہ ان کے پاس ایسا کوئی اصول ہے جس سے جان سکیں کہ ہر شے پر ایک محرک کے سوا دیگر محرکات کا اثر ناممکن ہے۔ چنانچہ مادی تجارب سے ایک تجربہ کے بعد بات پختہ نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ ہر بات کا تجربہ ایک ہی قسم کا نتیجہ پیش نہیں کرتا۔ کچھ نہ کچھ فرق ضرور رہتا ہے خواہ تجربہ کرنے والے کتنے ہی بیدار مغز اور پرزوں کی ترکیب میں کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں۔۔۔ چنانچہ ہیزنبرگ نے ان اختلافات میں خلل کی مقدار نوٹ کرتا ہے۔ یہ مقدار۔۔۔ خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ دروازہ کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ لہذا ہم کہتے ہیں کہ بعض حالات میں روحانی دخل ضرور ہوتا ہے تب ہی تو اختلاف ہوتا ہے۔

برہانِ تخلیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عقل، ذہنیت اور جاندار عاقل کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ قضیہ عقلی ہے اور بے غبار ہے۔ یہ کہنا کہ مادہ کائنات میں ہر چیز کا خالق ہے ہمیں بہت سے مفروضے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، جن کو نہ احساس تسلیم کرتا ہے اور نہ منطق [illegible] مادیین نے تمام افکار و نظریات کی تسلیم کے لئے جو ترازو مقرر کی ہے، یعنی مشاہدہ اور محسوس دلیل کی ترازو اس کے ساتھ بھی یہ بات ساز نہیں کرتی۔

برہانِ غایت

یہ دلیل اپنے مفہوم میں برہانِ تخلیق کے لحاظ سے بہت وسیع ہے۔ اس پر کچھ زیادتی کی گئی ہے اور کچھ تصرفات بھی کیے گئے ہیں۔

اس دلیل سے بھی وجود مخلوقات سے وجود خالق پر استدلال کرتے ہیں۔ اس پر اتنا اور اضافہ کر لیتے ہیں کہ یہ مخلوقات اپنی تکوین میں ایک قصد اور اپنی رفتار و تدبیر میں ایک حکمت کی خبر دیتی ہے۔ آسمان میں ستارے ایک مخصوص نظام پر جاری ہیں اور ایک خاص حساب پر چلتے اور ٹھہرتے ہیں۔ مادی اجزاء باہمی ترکیب یا افتراق میں اپنی اس ترکیب و افتراق کے ذریعہ زندگی کی نشوونما اور دوامِ حیات کی استعداد رکھتے ہیں۔ زندہ اجسام کے اعضاء اپنے ان مختلف وظائف کے ذریعہ جن سے مجموعی طور پر زندگی وجود میں آتی ہے اور ہر عضو کے وظیفہ کو تکمیل بخشتی ہے۔ اس تمام نظام جسمانی کے کفیل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص آنکھوں کے وظیفہ بینائی کے عمل پر غور کرے تو اسے ایک شائستہ اور محکم ترکیب نظر آئے گی جس کو محض اتفاقی تخلیق و فطرت نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح دیگر تمام اعضاء کی ترکیب و تخلیق میں غور و فکر سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ اس استدلال کے مقابلہ میں مختلف الخیال لوگوں نے تنقیدی نگاہ سے تبصرے کئے گئے ہیں۔ ان میں مادیین اور قطعی ملحدین کے علاوہ بھی کچھ لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ چنانچہ بعض الوہیت پرست بھی کہتے ہیں کہ عقلِ انسانی حکمتِ الٰہیہ پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ نہ اس کے مقاصد و اغراض جانداروں اور دیگر مخلوق سے وابستہ ہو سکتے ہیں کیونکہ خداوند یگانہ و یکتا ہے۔ وہ اپنے علاوہ تمام ماسوا سے مستغنی ہے۔

مگر یہ اعتراض بالکل کمزور ہے۔ عام اس سے کہ اس کو تمام مخلوقات میں عام رکھا جائے یا غیر جانداروں اور جانداروں میں محدود کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہر قسم کی حاجت سے مستغنی ہے تو مخلوقات کو

تو اس کی احتیاج سے مستغنی نہیں کہا جا سکتا۔ خدا کی حکمت بے شک انسانی عقل کی طاقت پرواز سے بلند سہی لیکن عقلِ انسانی کو اتنی بصیرت تو عطا ہوئی ہے کہ وہ بقصد و ارادہ کیے گئے اعمال میں اور فضول و عبث اور بے قصد و غایت اعمال میں امتیاز کر سکے۔ گو اس کی قدرتِ سرمدی کو اغراض و غایات احاطہ نہیں کرتیں، لیکن خود محدود وجود کی تو کوئی غرض و غایت ہو گی۔ پھر اس غرض و غایت کے لیے ایک تقدیر و اندازہ بھی ضروری ہے۔ اس تقدیر و تدبیر سے متعلق سوال ہوتا ہے کہ خدا پرستوں کی نظر میں اگر یہ منجانب اللہ نہیں تو پھر کہاں سے آئی؟

مذکورہ بالا استدلال پر مادیین کا اعتراض خداپرستوں کے اعتراض سے کچھ زیادہ جاندار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کواکب کا یہ نظام کسی تنظیم کا محتاج نہیں اور نہ عناصر کی حقیقت ہی کسی تخلیق کی محتاج ہے۔ صرف مادہ کی فطرت ہے جو اس مادے کے نظام کو سمجھنے میں کافی ہے۔

گرم مادہ حرکت میں آتا ہے اور حرکت اس حرارت کو شعاعوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جب یہ شعاعی سلسلہ پیدا ہوتا ہے تو بعض اجزاء میں یہ حرارت قلیل درجہ کی ہوتی ہے۔ یعنی حرارت و برودت کا باہم مختلف عمل ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس طرح بعض اجزاء بعض اجزاء سے پھٹنے لگتے ہیں۔ ایسے وقت میں حرکتِ مرکزیہ کے قانون کے مطابق چھوٹی چیز کو بڑی کے گرد گھومنا اور برابر گھومتے رہنا ضروری ہے۔ شمسی نظام یونہی پیدا ہوتا ہے، نوبت قائم رہتے ہیں۔ سیارات ان کے گرد اپنی اپنی مختلف ضخامتوں، شعاعی درجوں اور مسافتوں کے حساب سے چکر لگاتے رہتے ہیں۔

نیز وہ کہتے ہیں کہ تمام عناصر نواۃ (گٹھلی) اور کہربائی طاقتوں سے مرکب ہیں۔ عقلاً ضروری ہے کہ ایک نواۃ اور ایک کہربا یا ایک نوات اور دو کہربا یا ایک نواۃ اور تین کہربا یا چار یا پانچ جہاں تک کہ نواۃ کی قوت و طاقتِ کشش ہو یہ سلسلہ چلتا ہے۔ اور جوں جوں عدد مختلف ہو گا، اسی طرح مادہ میں لازمی طور پر ایک جدید عنصر وجود میں آئے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ عناصر و اجسام کے تعدد کا اس کے سوا اور کوئی سبب نہیں۔

واقعہ کے لحاظ سے یہ تمام باتیں ہمارے خیال میں صحیح ہو سکتی ہیں۔

لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہم کسی واقعہ کے لیے عقلاً جس قدر وجوہ و اشکال فرض کرتے ہیں حقیقت کے لحاظ سے بھی وہ واقعہ انہیں میں منحصر ہو؟

کیا یہ بات کسی بدیہی اصول کے فیصلہ کی بناء پر ضروری ہے؟ یا کسی اور سبب کی وجہ سے مگر بہرحال حقیقت اسی صورت پر مبنی ہے جس کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے؟ بدیہی مشاہدہ یہ ہے کہ حرکت کو حرارت لازم نہیں اور حرارت کے لیے شعاع ریزی ضروری نہیں۔

بدیہی فیصلہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ چھوٹی چیز بڑی چیز کی طرف کشش رکھتی ہو اور مرکزی حرکت فلک میں ایک ایسی گردش کی متقاضی ہو جس میں کبھی خلل رونما نہ ہو۔

بلکہ عقلاً یہ قطعاً ممکن ہے کہ حرارت ہو اور شعاع نہ ہو۔ انشقاق ہو مگر انجذاب و کشش نہ ہو۔ عقلاً یہ بھی ممکن ہے کہ نوات ہوں اور کہربائی طاقت نہ ہو۔ حرارت ہو برودت نہ ہو اور ہم شکل اجزاء سے ترکیب وجود

میں آئے مگر اس سے کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔

سوال یہ ہے کہ نظام کی یہی صورت کیوں ہوئی، اور کوئی صورت کیوں نہ ہوئی؟

پھر اس نظام کو اختلافِ کواکب سے لگاؤ کیوں ہے؟ اختلافِ کواکب عناصر کے اختلاف سے کیوں تطبیق رکھتا ہے؟ عناصر کا اختلاف فصلوں اور موسموں کے اختلاف کو قبولِ حیات حرارت کے تناسب کی لازمی تدبیریں اور غذا تیار ہونے کی لازمی قوت پیدا کرنے سے کس طرح لزوم و تعلق ہوا؟

حقیقت یہ ہے کہ عقلِ انسانی کو دو فرضی راہیں اس مقام پر نظر آتی ہیں۔ اسے اختیار ہے جسے چاہے پسند کرے۔ مگر اس کے لیے ایک ایسی صحیح وجہ پر اعتماد کرنے کے سوا چارہ نہیں جو اس اختیار کی صحیح وجہ بھی سمجھی جائے۔

یا تو یہ فرض کیا جائے کہ قصد و ارادہ محال ہے اور ممکنہ صورت کی اس کے علاوہ کوئی اور شکل ہے اور وہ شکل یہ کہ تنظیم و تشکیل اس لیے وجود میں آئی تاکہ طوائف الملوکی اور بدنظمی کا دور دورہ نہ ہو۔ حیات اس لیے تاکہ موت ناممکن ہو جائے۔ بینائی اس لیے ممکن ہوئی تاکہ نابینائی ناپید ہو جائے۔ غرض ہر چیز سلبی طاقت کے ساتھ وجود میں آئی مگر بغیر کسی ایجاد و اثبات کے۔

یا یہ فرض کیا جائے کہ قصد سے صاحبِ قصد و ارادہ کا پتا چلتا ہے اور حقیقت ایجابی کا وجود یقیناً موجود ہے، مگر اس سلبی حقیقت کا وجود اس کائنات میں موجود نہیں کیونکہ اس کا نام "ناموجود" ہے۔

اول الذکر مفروضہ بلاکسی وجہ کے ویسے ہی فرض نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا اس کا سبب یا وجہ بتائی جائے کہ کیا ہے؟ اور اس دعوی کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے؟

اور اگر یہ بالفرض مان بھی لیا جائے کہ یہ سلبی علتیں ہی ان اثباتی نتائج تک پہنچنے کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت معلوم ہو جانے پر ہماری عقل صرف بات پر کب قانع ہو کر بیٹھ رہے گی کہ سلبی علتیں ہی وہ تدبیریں ہیں جو منزلِ مقصود کی حقیقت تک پہنچاتی ہیں۔

تم کہہ سکتے ہو کہ کچھ جاندار اس لیے زندہ رہے کہ ان کی زندگی منقطع نہیں، جیسا کہ اسباب معاش اور وسائلِ بقاء کے منقطع ہونے سے دوسرے جاندار منقطع ہو گئے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ جانداروں کے درمیان باہمی تفاضل وہ راہِ مقصود نہیں جن کو صاحبِ ارادہ خالق نے اختیار کیا تاکہ حیاتِ مثلی قائم رہے اور اس کے ذریعہ کمال کے مدارج طے کئے جائیں۔ نہ یہی کہہ سکتے ہو کہ اتفاقی واقعہ پر محمول کرنا اس تشریح کے مقابلہ میں تصور کے لیے زیادہ قریب ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ تم اپنے سامنے ترقی حیات میں صرف ایک خلیہ کو ترقی کرتے کرتے عقلِ انسانی تک پہنچتا ہوا دیکھتے ہو۔

اس برہان پر جس قدر اعتراضات وارد ہوئے ہیں ہمارے خیال میں ان تمام میں وزنی حیثیت صرف ایک اعتراض رکھتا ہے اور وہ یہ کہ زندگی میں شر اور تکلیف کا وجود کیوں ہے؟ جب یہ کہا جاتا ہے کہ عالم میں ایک حکیم کا قصد و حکمت کارفرما ہے۔ پھر یہ شر، نقص اور ظلم کیوں ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شر مقصود کا درجہ رکھتا ہے؟ یا کیا یہ کہنا چاہیئے کہ ظلم کرنا حکیم کی شان کے لائق ہے؟

اس اعتراض کا ہم یہ جواب نہیں دیتے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے اسباب و دواعی مستور ہیں۔ کیونکہ وہ دواعی جنہیں ہم فرض کریں گے وہ ان اشیاء کی غرض و غایات تک ہمیں نہیں پہنچا سکتے اور غرض و غایت تک رسائی میں ہمارا ساتھ نہیں دیتے۔

البتہ ہم اس عالم کا اس عالم سے تقابل و توازن کریں گے۔ جو یہ معترضین اپنے خیال میں صحیح سمجھتے ہیں۔ اگر وہ تخیلی عالم یقینی و تصور سے قریب ہو گی تو بے شک یہ معترضین ٹھیک کہتے ہیں اور اگر وہ عالم جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، تصور سے زیادہ قریب ہے تو اعتراض ہی ختم ہو جاتا ہے۔

لہذا سوال یہ ہے کہ معترضین جس عالم کا نقشہ مرتب کرتے ہیں وہ کیا ہے جسے وہ ہمارے اس عالم سے حکمتِ الہٰی اور صاحب تدبیر و صاحب ارادہ کے قصد کے لحاظ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں؟

وہ ایک ایسی دنیا ہو گی جس میں نہ کوئی نقص ہو گا نہ نشوونما۔ نہ باپ نہ بیٹا، نہ صلاحیت و استعداد، نہ عمر میں کوئی فرق۔ اور نہ مذکر و مونث کا جنسی تقابل ہو گا۔ اس کے باشندے ہمیشہ ایک حالت پر برقرار رہنے والی ایک قوم ہو گی کہ اس میں نہ کوئی مرتا ہے اور نہ غذا و دوا طلب کرتا ہے۔

چونکہ اس عالم میں کوئی نقص نہیں ہو گا اس لیے کوئی حدود بھی نہیں ہوں گے۔ ان میں سے ایک شخص اور اس کے بھائی کے درمیان حدود کیوں ہو گے؟ بلکہ کیوں ہزاروں، لاکھوں انسان باہمی فرق کے بغیر ایک نسخہ کتاب کی مانند نہ ہوں گے۔ اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو گی۔ کیونکہ اختلاف کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہاں ایک صفت ناقص ہے اور وہ وہاں پائی جاتی ہے۔

ایسی صورت میں تو ایک انسان پیدا ہونا چاہیے جو تمام انسانیت کے معانی کا جامع ہو کہ اس میں نہ کوئی نقص ہو نہ تعدد نہ ابتدا ہو اور نہ انتہا۔۔۔ گویا یہ ایک دوسرا خدا ہو جو تمام صفات کمال و دوام سے آراستہ ہو۔

معترضین کا یہ تخیلی عالم حرماں نصیبی سے بالکل پاک ہو گا۔ نہ اس میں کوئی زندہ، کل کسی آنے والی چیز کا منتظر ہو گا نہ آج کسی نامعلوم چیز کا مشتاق ہو گا۔

بلکہ یہ بھی کیوں کہا جائے؟ کل اور آج کیسی؟ کل اور آج کا فرق اس عالم میں کہاں سے آئے گا جس میں کوئی تغیر ہی نہیں اور نہ ترکیب و حرکات میں کوئی تنوع ہے؟ کیونکہ کل آج کواکب کی حرکت، ضخامت اور گردش کے تغیر سے وجود میں آتے۔ جب تغایر و ترکیب ہی غلط ٹھہری تو نہ سورج ہونا چاہیے نہ زمین نہ چاند نہ دن نہ سال۔

یہ جہان واقعی وہ جہان ہو گا جس میں نہ تکلیف ہو گی نہ محنت و مشقت، نہ کسی خطرہ سے بچاؤ کی فکر نہ کسی کی کامیابی پر رشک۔ اس جہان میں آرزو، محبت، اشتیاق، صبر، گھبراہٹ، خوف اور خلوق کا باہمی تعلق کچھ نہ ہو گا، کیونکہ باہمی تعلقات اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے قائم ہوتے ہیں، اس عالم میں کوئی احتیاج ہی نہ ہو گی جس کی وجہ سے ارباب کمال سے کوئی تعلق قائم کرنے کی ضرورت پڑے۔ اس جہان میں کوئی ظلم نہ ہو گا۔ لہذا نہ کسی کو فضیلت حاصل ہو گی نہ رذالت۔ کیونکہ صاحبِ فضیلت وہ انسان ہے جو خیر کی راہ پر چلے۔ اگرچہ اس راہ میں اسے تکلیف ہو اور شر سے بہرحال بچے خواہ اس میں کتنی ہی لذتیں ہوں۔ جب اعمال پر دست بدست جزا ملے

گی تو صاحبِ فضیلت کو شریر آدمی پر کوئی فضیلت حاصل نہ ہو گی۔ جس عالم میں ہمیشہ شریروں کو سزائیں دی جائیں گی اور نیکوں کو ہمیشہ جزاء و ثواب دیا جائے گا۔ وہ عالمِ ظلم سے اس قدر پر ہو گا کہ اس موجودہ دنیا (جس کو منکرین حکمت ظلم سے تعبیر کرتے ہیں) کے مقابلہ میں انسانوں کے ساتھ لپٹے ہوئے دکھ بھی نہیں ملے گے۔۔۔ یہ وہ عالم ہو گا، جس میں ابد اور ایک گھڑی میں کوئی فرق نہ ہو گا۔ کیونکہ ہر زندگی کی ساعت میں تمہارے تقاضے یہ ہوں گے کہ ابدی حکمت حاصل کریں اور زندگی کے مقاصد وہ مقاصد ہوں گے جن میں کوئی آخری حد نہ ہو گی۔ لہٰذا ہاتی زمانہ کا انتظار ہی نہ ہو گا کیونکہ انتظار کا موجب بھی کوئی نہ ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ محدود الحیات مخلوق اگر اس کے احساسات میں فنا کے رنگوں میں کوئی رنگ نہ بھرا ہو بغیر انتظار کے زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔

اسی موضوع پر میں نے ایک مکالمہ لکھا ہے جس سے اس مضمون پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ یہ مکالمہ میں اپنی کتاب "نئی بیتی" (میرے گھر میں) سے نقل کرتا ہوں، جس کا موضوع ہے ۔۔ "خدا ہے"۔۔۔ یہ مکالمہ سوال و جواب کی صورت میں حسبِ ذیل ہے۔

"میرا ایک ہم نشین پوچھتا ہے۔ کیا کبھی اپنے فلسفہ زندگی سے آپ کو کوئی سبق ملا ہے؟

میں: جی ہاں، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔

ہم نشین: آپ اس وقت فلسفیانہ نقطہ نظر سے بول رہے ہیں یا دینی نگاہ سے؟

میں: مَیں اس وقت فلسفیانہ نقطہ نظر ہی سے بول رہا ہوں۔ فلسفہ ہمیں بتاتا ہے کہ عدم معدوم ہے اور وجود، موجود، یعنی بغیر ابتداء و انتہا کے موجود ہے۔ کیونکہ آپ نہیں کہہ سکتے کہ اس موجود سے پیشتر عدم تھا یا بعد میں عدم طاری ہو گا۔ نیز وہ بے نقص ہے۔ کیونکہ وجود پر عدم طاری ہونا نقص ہے اور وہاں کسی عدم کا گزر ہی نہیں۔۔۔ وہ بغیر ابتداء، بغیر انتہا اور بغیر کسی قصور و نقص کے موجود ہے۔ یہ کامل الوجود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

ہم نشین: مگر اس کامل وجود اور شرور و آلام حیات میں آپ کیسے تطبیق دیتے ہیں؟

میں: یہ سوال آسان نہیں۔ کیونکہ ہم فانی ہیں۔ نیز محدود زمانہ میں دائمی اور ابدی صورت کا صرف ایک رخ ہماری سامنے ہے۔ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے سیاہ بادل بھی اس تصویر کے لیے اسی قدر ضروری ہیں جس قدر اس میں چمکیلے نقوش اور سفید لکیریں ضروری ہیں؟ اگر تکلیف اور نقصان کے رخ ہی موجود نہ ہوں تو بہادر و بزدل اور صابر و بیقرار میں کیا فرق ہو؟ اگر شر اور مصیبت ہی نہ ہو تو ہدایت و ضلال اور شرافت و کمینگی میں کیا فرق رہے؟ آپ کے اردگرد پھیلے ہوئے عناصر فطرت کے درمیان اگر مخالفت و تغایر نہ ہو تو آپ کے وجود میں استقلال کیسے اور آپ کے موافقین و مخالفین اپنا وجود علیحدہ کس طرح قائم رکھ سکیں؟ اگر قیمت نہ ہو تو بیش قیمت اور نفیس چیزیں گراں کیوں ہوں؟

ہم نشین: کیا یہ ہمارے مجبور ہونے کی دلیل نہیں کہ بسا اوقات ہم ناکام ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ ناکامی نہ ہو؟ کیا یہ عیب نہیں کہ ہم کمال پیدا کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور کوشش ہوتی ہے کہ باکمال ہوں؟

میں متعدد و مختلف اشیاء میں کمال پیدا ہونا ناممکن ہے؟ کمال تو صرف ایک کامل و ابدی ہستی ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔

ہم نشین، جو چاہے کہہ [illegible]۔ بہرحال تکلیفیں جھیلنا انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ تکلیفیں دینا ایک ابدی رحم پرور کی [illegible] ہو سکتی ہے۔

میں۔ اس کے [illegible] کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔

یہ بات [illegible] صحیح ہو سکتی ہے جب کہ انسان کی زندگی منتہا کی حیثیت رکھتی ہو اور یہ منتہا تمام گزشتہ و آئندہ کائنات [illegible] لیے ایک قیاس و دلیل ہو۔ لیکن جب کہ فرد کی زندگی زمانہ کے اس طویل و ابدی نظام میں ارض کی صورت [illegible] تو بچوں کے رونے کو آپ کیا کہیں گے؟ لیکن بچوں کے رونے پر سب ہنستے ہیں، کیونکہ ان کا یہ زمانہ [illegible] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس عاجزی و نارسائی کی حالت پر بچہ کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اسی طرح خوش نصیب [illegible] بھی بچوں کے ان ابتدائی ایام میں رونے والی حالت سے کچھ کم نہیں ہوتے۔

دوست! یہ کائنات عظیم الشان ہے۔ یہ تمام محسوسات عظیم ہیں، اپنی بصیرت و نگاہ سے کام لیتے ہوئے جب ہم اردگرد پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری حیرانی اس کائنات میں اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ سوچو! کہ اس عظیم الشان کائنات کے پیچھے کیا ہے۔ یہ ہمارے قیاس کی تمثیل ہے۔ یا ہم اس پر کسی اور چیز کو قیاس کرتے ہیں؟ اگر ہم اس پر کامیابی نہ حاصل کر سکیں تو ہماری اس سعادت کی ناکامی ہو گی جسے ہم ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ اس بارے میں آپ کو کوئی قطعی قدم اٹھانے سے پیشتر یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ عیب کائنات اور اس کی تدبیروں یا نظام میں ہے یا نہیں یا پھر اپنے احساس سے ماوراء دنیا کا انکار کر دو۔ لیکن قطعیت سے آپ ایک عارف کی طرح یہ فیصلہ نہیں کر سکیں گے، کیونکہ آپ کے لیے یہ سب کچھ نامعلوم ہے۔۔۔ ہمارے خیال میں ہم ان تمام بیان و تردید کے ذریعہ اس حکمت کی دلیلوں پر وارد ہونے والے اعتراض کا مقابلہ کر رہے ہیں جو اس حکمت میں قصد و ارادہ کو ترجیح دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کافی ہے کہ اثباتی دلیل انکاری دلیل کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہو۔۔۔ لہٰذا عقل انسانی کی دلیلوں میں سے ہمیں کسی دلیل پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ان دلیلوں کے ذریعہ وجودِ الٰہی کو پوری طرح ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں یا ہم نے اس طرح سے ان واقعی براہین کے مقام کو پا لیا ہے جو ہم عالم محسوس و معقول میں ہر محدود پر قائم کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری عقلوں کی پیمائش سے اللہ تعالیٰ کی ہستی بہت بڑی ہے۔ صرف اتنا ہے کہ ہم دلائل قائم کر کے عقل کو اس کا حصہ دے دیتے ہیں اور پھر اسے ان براہین میں موازنہ کرنے کے لیے اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اب یہ عقل کا کام ہے کہ وہ خود کس دلیل کو ترجیح دیتی ہے۔

تیسری برہان اہلِ صناعت کی برہان سمجھی جاتی ہے کیونکہ دینی فلسفہ اور منطق میں بحث کرنے والے ہی اس میں زیادہ تر دلچسپی لیتے ہیں۔ جمہور متکلمین اسلام (جنہوں نے ان بحثوں کے دروازے کھٹکھٹائے) کی زبانوں سے ہم نے یہ برہان نہیں سنی۔ اس کا نام برہان استعلاء، برہان استکمال اور برہان مثل اعلیٰ ہے۔

اس برہان کو ابتدائی صورت میں پوپ انسم نے ڈھالا۔ پھر تنقیح کرنے والوں اور اضافہ کرنے والوں نے مزید کچھ اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ ڈیکارٹ کے فلسفہ میں اس کی تشکیل مکمل ہو گئی۔ چنانچہ اس کا انتساب قریب

قریب اسی کی طرف کیاجاتا ہے۔ ایک جامع عبارت میں اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان جب کسی عظیم چیز کا تصور کرتا ہے تو اس سے اعظم کا بھی تصور کرتا ہے۔ کیونکہ درجہ قاصرہ میں عظمت سے متعلق واقفیت کسی سبب کی محتاج ہوتی ہے۔ اور وہ یعنی انسانی عقل قصور کے سبب کو دریافت نہیں کر پاتی

حاصل یہ کہ عقل انسانی جب کسی کامل سے مطلع ہو گی تو اس سے اکمل پر ضرور مطلع ہونا چاہے گی۔ اسی طرح پھر اس اکمل سے اکمل تر کی طرف ترقی کرے گی۔ مسلسل یونہی چلتی رہے گی۔ یہاں تک اس کی غایت وہ کمال مطلق ہو گا جس پر نہ زیادتی متصور ہو گی نہ نقص۔

یہ مکمل ہستی کہ جس کے کمال پر زیادتی مقصود نہیں یقیناً موجود ہے۔ ہونہ اس کا متصور وجود حقیقی وجود سے کم تر درجہ کا ہے۔ لہذا وہ حقیقت میں ضرور موجود ہو گا کیونکہ اگر وہ معدوم ہو تو پھر کمال مطلق نہ ہوا۔ نہ اس کے لیے کمال ہی باقی رہے گا بلکہ اس کو نقص مطلق کہنا چاہیے۔ لہذا اس کمال کا محض تصور ہی اس کے وجود کا اثبات ہو گا۔ اس لیے لازماً اللہ تعالیٰ ثابت الوجود ہوا، کیونکہ کمال کی غایت وہی ہو سکتا ہے۔ عقلاً اس سے کم تر درجہ کو تصور نہیں کیا جا سکتا۔ نہ عقل اسے تسلیم کرتی ہے اور نہ مطمئن ہوتی ہے کیونکہ بلندترین کمال کا تصور کامل الوجود ہستی کے تصور کے ہم معنی ہی ہے۔

غرض انسانی عقل کا لازمی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔

اس برہان پر تنقیدیں کی گئی ہیں۔ بلکہ گیارھویں صدی میں انسلم پوپ کے بعض دین پرست معاصروں نے اس برہان کا مذاق اڑایا ہے، ان مذاق اڑانے والوں میں سب سے آگے آگے راہب گونو ہے۔ دورِحاضرہ کے بڑے فلاسفہ میں سے عمانویل نے بھی اس دلیل کی تضحیک کی ہے۔ ان لوگوں کی تنقید کاخلاصہ یہ ہے کہ اگر سمندروں کے نامعلوم علاقوں میں ایک انتہائی مکمل جزیرہ کا تصور کیا جائے تو اس تصور سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ جزیرہ واقع میں بھی پایا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی دس اشرفیوں کا تصور کرے تو ضروری نہیں کہ اس تصور کے بعد یہ اشرفیاں اس کی مٹھی میں بھی آ جائیں۔ مطلب یہ کہ متصور شئے کا وجود قطعی الوجود نہیں ہوتا۔

لیکن یہ برہان اس قسم کی تنقید سے حقیقت میں بلند اور مضبوط ہے۔ کیونکہ ہم دس اشرفیوں کا تصور کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کا وجود حقیقت میں نہ پایا جاتا ہو، لیکن یہ نہیں کر سکتے کہ ایک کمال کا تصور کریں جس پر کوئی اضافہ ممکن نہ ہو اور پھر اسی وقت میں یہ تصور بھی کریں کہ اس پر زیادتی و اضافہ ممکن نہیں کیونکہ وہ معدوم ہے ——— مثلاً ہم کہیں کہ ویشیون ممکن نہیں کہ سب سے بڑا عدد ہو لہذا ویشیوں ایک عدد کی طرح بلاشک موجود ہے۔ اگرچہ اشیاء میں سے کسی شئے کے شمار میں ہم اسے کام میں نہ لائیں۔

ڈیکارٹ خواہ مخواہ غلوباز نہیں۔ جو اس برہان پر بڑی مضبوطی سے قائم ہے اور کہتا ہے کہ وجود الٰہی یقیناً ثابت ہے اور پھر اسی سے وہ عالم کی تمام محسوسات کے وجود پر استدلال کرتا ہے کیونکہ محسوسات متغیر و زوال پذیر ہیں اور ہمارا احساس قاصر اور گمراہ ہو سکتا ہے بلکہ اکثر اس پر وہم غالب رہتا ہے۔ البتہ اس کے یقین کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم حقیقتِ مطلقہ، اللہ تعالیٰ کی راہ سے ثبوت بہم پہنچائیں۔

حاصل یہ کہ عقل ایک ایسے وجود کے وجوب کو مستلزم ہے جو برحق اور منزہ عن العیوب ہے اور کسی چیز

کی حقیقت اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ حقیقتِ مطلقہ عندالعقل ثابت نہ ہو جائے۔ اس حقیقتِ مطلقہ پر عقل کے ایمان لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم موجود ہے اور وہم و فریب نہیں۔ کیونکہ اس کا پیدا کرنے والا بھی وہم و فریب سے منزہ ہے۔ ان براہین کی تلخیص میں ہم نے حسبِ عادت ان میں اور ان کے مقابل انکاری براہین یا ان کے خلاف تردید کرنے والی براہین میں موازنہ پر اکتفا کیا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ان براہین کو اگر مقابل و مخالف دلائل سے وزن کیا جائے گا تو پلہ انہیں براہین کا بھاری رہے گا۔

یہ کمال کے تصور میں ثبوت بہم پہنچانے والوں کا قول ہے۔

منکرین یہاں کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کے عقلاً تصور میں ایک نقص موجود ہے۔ بایں ہمہ وہ ابدی ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے اور نہ قوت و مادہ کے لحاظ سے اس کی مقدار میں کوئی حد ہے یا کہتے ہیں کہ ہم کائنات کو عنصر عقل کے سوا ہر چیز میں کامل تصور کر سکتے ہیں مگر اس پر احاطہ کرنا عقل انسانی کی حدود سے باہر نہیں۔

اس کے بعد ہر شخص کو اختیار ہے کہ دونوں قولوں میں سے جسے چاہے اختیار کر لے۔

عمانوئیل کانٹ ——— جس نے اس برہان کی تضعیف کی ہے ——— اس سے زیادہ مضبوط دلیل پر اعتماد کرتا ہے۔ جو "اللہ تعالیٰ" اور اس کی شایان شان صفات پر دلالت کرنے میں زیادہ صحیح ہے۔

اس کے خیال میں برہان تخلیق اور برہان قصد صانع و قادر کے وجود کو ثابت تو کرتی ہے۔ لیکن اس کے قادر و صانع ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ "معبود" ہو، خیر و رحمت کا منبع ہو اور لوگ محبت و ایمان کے ساتھ اس کی پرستش کریں۔

اس معبود کا وجود انسانی نفس میں ایک ایسی علامت قائم کرتا ہے کہ جو انسانی نفس میں بغیر معبود کے وجود کے ممکن نہیں۔ یہی علامت اخلاقی تقسیم، فرض اور ضمیر کی علامت ہے۔

انسان نے اپنے نفس کو حق کے ساتھ وابستہ کر کے یہ نتیجہ کہاں سے نکالا۔ اگر حق کو پہچاننے کے لیے کائنات میں کوئی ایسی ترازو موجود نہیں جو اس کے دل میں اس داعیہ کی تخم ریزی کرے؟ اور انسان کی فطرت میں یہ حقیقت کیسے جاگزیں ہوئی کہ وہ اپنے لیے پُرمشقت فرائض کی بجاآوری کو محبوب خواہشات کے مقابلہ میں زیادہ بہتر سمجھتا ہے؟ اگرچہ اس سلسلہ میں کسی کو اپنے دل کا راز معلوم نہیں۔

اس دلیل کو کمزور ٹھہرانے والے کہتے ہیں کہ یہ ایک اجتماعی عادت ہے جو اولاً نفس میں راسخ ہوئی پھر ایک پسندیدہ رغبت اور محبوب شغل میں تبدیل ہو گئی۔

لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی سبب کی دریافت سے اصل مقصود کا باطل ہونا یا حکمت کا مفقود ہونا لازم نہیں آتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ریلوے انجن اسٹیم سے حرکت کرتا ہے۔ انجینئر اسے چلاتا ہے کیونکہ اسے چلانے کی محنت پر اسے تنخواہ ملتی ہے۔ ایسے ہی دیگر ریلوے ملازمین بھی ریل کی حرکت کو ٹھیک رکھنے پر ملازم ہیں۔ وہ جب اپنے فرائض میں سستی کرتے ہیں تو ان سے بازپرس کی جاتی ہے لیکن اس تمام عمل سے غایت باطل نہ ہو گی اور یہ تمام رفتار عمل اور ریلوں کی آمد و رفت بے حکمت و تدبیر نہیں کہی جا سکے گی۔

برہانِ ضمیر کی تضعیف کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ "اجتماعی مزاج" اس تخمین پر مبنی نہیں ہے جو اس کے وجود میں آنے کی علت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ اس کی علت نہیں بلکہ یہ تو ہمارا اپنا بار بار کا مشاہدہ خارجی ہے۔ ان تضعیف کرنے والوں میں سے اگر کوئی پوچھے کہ یہ اجتماعی مزاج کس طرح وجود میں آیا؟ تو وہ کہیں گے، کسی اجتماعی مصلحت سے..... لیکن وہ اپنے ضمیر سے یہ نہیں پوچھتے کہ وہ کیا راز ہے جس کی خاطر یہ اجتماعی مصلحت کا فیصلہ کیا گیا اور اس کی وجہ سے یہ مصلحت پسند جماعت وجود میں آئی۔ آخر کیوں اجتماعی مصلحت کی علت عادت کے نشوونما کو ٹھیرایا جاتا ہے اور خود اس عادت کے نشوونما کے وجود میں آنے کی کوئی علت تلاش نہیں کی جاتی؟

یورپین فلاسفہ میں سے اس برہان کے قائلوں میں "عمانوئیل کانٹ" اس برہان کا پہلا پیش کرنے والا نہیں، کیونکہ اس کی طرف منسوب ہونے والی یہ برہان تو مارلاکوبی پوپ کی برہان کا ایک مختصر حصہ ہے۔ مارلاکوبی وجودِ الٰہی پر آیاتِ خیر، نفسِ انسانی میں جمال و محاسن کے وجود اور مشاہدۂ فطرت کے ذریعہ استدلال کرتا ہے۔

ہم اس دلیل کی رُو سے جمال و محاسن کو درجہ بدرجہ فضیلت کے اعتبار سے اوپر پہنچتے ہیں۔ ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ان محاسن میں باہمی فضیلت و کمال کا تقابل کریں، بجز اس کے کہ ہمارے پاس ایک ایسی عام ترازو ہو کہ اس کے ذریعہ ہم خیر و جمال کے سمجھنے میں مدد لیں۔ یہ عام ترازو یا پیمانہ فضیلت و محاسن کی ادنیٰ صورت میں کام نہیں دے گا۔ جب تک کہ حسن و جمال کے بلندترین اصل مرتبہ یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ کی جائے۔

اب معین صورت میں یہ نظریہ نہیں رہ سکتا کہ ہر شئے جمیل و خیر ہے کہ اس پیمانہ سے ہم تمام عالم پر جستجو کی نگاہ ڈال سکیں بلکہ صرف یہ کافی ہو گا کہ عالم میں خیر و جمال موجود ہے تاکہ ذہن اس پیمانہ کے ذریعہ تقاضا و جستجو کا سلسلہ قائم کر سکے۔

وجودِ الٰہی پر عام فلسفی دلائل کا یہ خلاصہ تھا جو ہم نے پیش کیا۔ مگر سچ یہ ہے اور ہم مکرر کہیں گے کہ ایمان باللہ صرف انہیں دلائل پر موقوف و مبنی نہیں۔ یہ سب اقناع و اطمینان کا سامان ہے تاکہ منکرین کے ردّ و اعتراض کے مقابلہ میں ایمان باللہ کے نظریہ میں وزن پیدا ہو جائے خصوصاً ان منکرین کے مقابلہ میں جو چند مفروضات پر بلا دلیل ہجوم کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں۔ اس مقام پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمیں یہ ضرورت ہی کیوں لاحق ہوئی کہ وجودِ الٰہی کو ثابت کرنے کے لیے دلائل ڈھونڈیں۔ خود اللہ تعالیٰ کیوں انسان کی چشم ظاہر بیں کے سامنے جلوہ آرا نہیں ہو جاتا، تاکہ ہر انسان یقین کر لے۔

ہم اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ ہم اس کی وجہ نہیں جانتے..... لیکن اگر ہم تمام مخلوق کے لیے حقیقتِ الٰہیہ کی جلوہ آرائی کے طالب ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس راز سے ہر ایک کے لیے بغیر کسی تاریکی کے تمام حقائق سے پردہ اٹھ جائے تو اس صورت میں بے شک ہم بغیر کسی اختلاف و حدود کے کمال مشابہت رکھنے والی مخلوق کی طرف لوٹنے پر مجبور ہوں گے۔ ہمارا تخیل اس عالمِ مشہود و حاضر کے بارے میں بھی کچھ زیادہ آسان نہیں ہے تو اس مطلوبِ جہاں کا تصور کیسے آسان ہو جائے گا۔

قرآنی براہین

اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرنے والے دلائل آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب میں اس قدر تکرار کے ساتھ نہیں آئے جس قدر قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں۔

منکرین وجود الٰہی کے مقابلہ میں اس قدر اشارے نہ ہی تورات میں ملتے ہیں اور نہ انجیل میں۔ کیونکہ انبیائے تورات کے سامنے تمام تر وہ لوگ تھے جو بنی اسرائیل کے معبود پر ایمان رکھتے تھے اور اس کے وجود کے منکر نہ تھے۔ اس لیے انبیاء کی تعلیم ایسی نہ تھی کہ وہ کسی منکر یا متردد گروہ کو اللہ کے وجود پر مطمئن کریں۔ بلکہ ان کی تبلیغ کا تمام تر انحصار اس پر تھا کہ قوم کو خدا کی ناراضی سے ڈراتے اور غیر اللہ پر ایمان لانے کے انجام بد سے خوف دلاتے اور خدا کی وعدہ وعید کو یاد دلاتے اور غیر اقوام میں جاتے تو جو لوگ بنو اسرائیل کے معبود "یاھواہ" کے علاوہ کسی دوسرے معبود کی عبادت کرتے تھے، انہیں اس سے روکتے۔

یہ معبود دوسرے قبائل کے معبود ہوتے تھے کیونکہ بنی اسرائیل "یاھواہ" کو ہی اپنا معبود سمجھتے تھے اور اس میں کسی غیر کی شرکت و پسند نہ کرتے تھے۔ نہ اس معبود کے ساتھ وہ کسی اور معبود کی شرکت گوارا کرتے تھے۔ لیکن خالص توحید پر ایمان لانے سے پہلے ان کا یہ تصور نہ تھا بلکہ بات اصل میں یہ تھی کہ "یاھواہ" کے عبادت گزار نہ "یاھواہ" کے وجود کے منکر تھے اور نہ اس کے علاوہ دیگر کسی معبود کا انکار کرتے تھے۔ البتہ ان کا یہ معبود دیگر معبودوں پر فضیلت رکھتا تھا۔ جیسا کہ وہ خود بھی دیگر قبائل کے مقابلہ میں فضیلت و شرف کے مالک سمجھے جاتے تھے۔

دیگر معبود ان کے خیال میں اسی طرح موجود تھے جس طرح ان کا معبود "یاھواہ" موجود تھا۔ لیکن وہ ان کے خیال میں عبادت کے مستحق نہ تھے۔ کیونکہ وہ ان کے غیروں اور دشمنوں کے معبود تھے۔ ان معبودوں کی پرستش بنی اسرائیل کے خیال میں ایک بڑی خیانت تھی۔ کفر نہ تھا، جیسا کہ بعد میں آنے والے لوگوں نے سمجھ ہے۔ حاصل یہ کہ ان کے نزدیک اجنبی معبودوں کی پرستش ایسی ہی قبیح تھی جیسی کہ کسی اجنبی بادشاہ سے وفاداری ایک قسم کی قومی غداری و خیانت متصور کی جاتی ہے۔

اسی لیے انبیائے تورات دیگر معبودوں کے مقابل یاھواہ کو ثابت کرنے میں معروف نہ رہتے تھے بلکہ ان کا زیادہ تر شغل یہ تھا کہ لوگ یاھواہ کی غیرت و ناراضی سے ڈریں اور اس کے انتقام و عذاب سے بچیں۔ یاھواہ کا عذاب اس وقت کہیں زیادہ سخت ہو جاتا تھا جب کہ بنی اسرائیل، مصر، بابل یا کنعان کے معبودوں میں سے کسی معبود کی پرستش کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔

مسیحیت کا ظہور ہوا تو اس مذہب اور دیگر اسرائیلی مذاہب میں وجود الٰہی یا انبیائے تورات کی تعلیمات کے مسئلہ میں کوئی اختلاف نہ تھا، بلکہ زیادہ تر رئیسوں اور کاہنوں کا باہمی اختلاف تھا، کیونکہ وہ عبادت کے مظاہر اور شعائرِ مقدسہ کی آڑ میں اموال و سلطنت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور دنیوی مصالح کو ایمانی فرائض پر فوقیت دیتے تھے۔

مسیحی مبلغوں کو ربوبیت کے نظریہ میں اخلاص کی اشاعت کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب کہ ان

کی تبلیغ کا دائرہ اس وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں یعنی یونان و روم وغیرہ میں وسیع ہوا۔ یہ زمانہ انجیلوں کی کتابت کے کچھ ہی بعد کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تورات و انجیل کے صحیفوں میں وجود الٰہی کے اثبات پر براہین کا تکرار و اعادہ نہیں ہوا مگر چونکہ قرآن کا خطاب منکرین، مشرکین، یہود اور ربوبیت و عبادت کے بارے میں اختلاف کرنے والوں سے تھا اور اپنے زمانہ نزول میں بسنے والی تمام اقوام، قبائل عرب اور تمام امتوں سے تھا۔ اسی لیے اسے اپنے ہر خطاب میں ربوبیت کا ایک واضح تصور پیش کرنا پڑا۔ اس کی دعوت حکیمانہ فراست و تسلی سے متحد عبادت سکھاتی ہے اور ایک برحق معبود اور ان دیگر باطل معبودوں میں تفریق کرتی ہے جو اس وقت سب باطل معبود بنے ہوئے تھے۔

قرآن نے جن لوگوں کو خطاب کیا ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو معبودوں کا انکار کرتے تھے چنانچہ وہ کہتا ہے: "کچھ لوگ کہتے ہیں ہماری یہ دنیوی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ ہمیں زمانہ ہلاک کر دیتا ہے۔ انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں بلکہ صرف اٹکل سے باتیں کرتے ہیں"۔

ان میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جو بت پرستی یا ثنویت کا عقیدہ رکھتے تھے اور آباء و اجداد سے وراثت میں یہی عقیدہ انہیں ملا تھا۔

کچھ لوگ وحدانیت کے نظریہ میں ثنویت کی آمیزش کرتے تھے اور کتب منزلہ کی تشریحات میں لڑتے جھگڑتے تھے، جیسے کہ یہود و مسیحی گروہ۔

وہ عقل کو خطاب کرتا ہے تاکہ اس معبود کی مخالفت کرنے والوں کو جس کو انسانی عقلیں قبول کرتی ہیں اطمینان و سکون کی دنیا عطا کرے۔ وہ فصل سابق میں ہماری تمام اختصاراً بیان کی ہوئی براہین میں سے ہر برہان پیش کرتا ہے۔ ہدایت کا تصور اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرار دیتا ہے مگر عقل و بصیرت کے رنگ میں وہ کہتا ہے:

"کہہ دو مشرق و مغرب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے"۔

"کہہ دو کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ ۔ ۔ "کوئی شخص ایمان نہیں لاتا مگر اسی کی مرضی سے اور بے عقل لوگوں کو ناپاکی دیتا ہے"۔

"اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے"۔

آیاتِ الٰہی ہر اس شخص کے لیے بالکل واضح ہیں جو ان سے استفادہ کرے اور ان کے مغز و روح کو مضبوطی سے پکڑے، لیکن جو شخص آیات سے ارادت مندی و استقامت کا معاملہ نہ رکھنا چاہے اس کے لیے آیات، قناعت و تسلی کے لیے کافی نہیں ہو سکتیں:

"اگر ہم ان پر آسمان سے ایک دروازہ کھول دیتے اور وہ اس میں داخل ہو جاتے تو وہ اس وقت بھی یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں پر نشہ طاری تھا بلکہ ہم پر سحر کیا گیا تھا"۔

گویا کھلی آنکھوں مشاہدہ بھی اس شخص کے لیے کافی نہیں جو قناعت و تسلی کی راہ سے اپنی عقل کو پھیر لے۔ کیونکہ وہ خود ہی اپنی آنکھوں اور کانوں پر اطمینان نہیں کرتا۔ ورنہ زمین و آسمان کی ہر چیز استدلال کے لیے

کافی ہے مگر شرط یہ ہے کہ عقل کو انکار اور ہٹ دھرمی سے الگ رکھا جائے۔

"خدا کی نشانیوں میں سے زمین و آسمان کی تخلیق اور تمہاری سائنس دانوں کا اختلاف بھی ہے۔ یہ سارے جہان کے لیے کھلی نشانیاں ہیں"۔

"کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟ ہم نے تمہاری تخلیق میں جوڑے پیدا کیے۔ تمہاری نیند کو تمہارے لیے راحت جسمانی کا ذریعہ بنایا۔ رات کا وقت تمہارے لیے ساتر اور دن کا وقت معاشی امور کی بجاآوری کے لیے بنایا۔ تمہارے اوپر مضبوط سات آسمان بنائے۔ تمہارے لیے ایک نہایت روشن چراغ (سورج) پیدا کیا۔ بادلوں سے پانی برسایا تاکہ ہم تمہارے لیے غلے، نباتات اور ہرے بھرے باغات پیدا کریں"۔

"اور زمین میں پاس پاس قطعے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں گنجان بھی اور چھدری بھی جو ایک ہی پانی سے سیراب کیے گئے اور پھر بھی ہم ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دیتے ہیں۔ بے شک ان سب میں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں دلائل ہیں"۔

"ہم نے زمین میں ہر قسم کے پُررونق پھل پھول اگائے"۔

"اسی نے دو جوڑ یعنی نر و مادہ کو پیدا کیا"۔

"اور تمام مونث و مذکر اس نے پیدا کیے"۔

"وہ زمین و آسمان کا خالق ہے خود تم ہی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کیے اس نے تمہیں زمین پر بکھیر دیا ہے۔ اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور سب کچھ سنتا دیکھتا ہے"۔

"اس کی نشانیوں میں سے ہی یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر تم انسان بن کر روئے زمین پر پھیل گئے"۔

"اس کی یہ بھی نشانی ہے کہ تم میں سے تمہاری بیویوں کو پیدا کیا۔ جن کے ہمراہ تم زندگی میں سکون پاتے ہو۔ اس نے تمہارے اندر محبت و شفقت پیدا کی۔ سوچنے والے لوگوں کے لیے اس میں بہت کچھ نشانیاں ہیں"۔

"اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ تمہیں آسمان و زمین سے کون رزق دیتا ہے؟ تمہاری قوتِ بصارت و قوتِ سمع کا کون مالک ہے؟ کون زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے پیدا کرتا ہے اور اس تمام جہان کی تدبیر فرماتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ"۔

"اور اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لیے سماعت، بصارت اور دل پیدا کئے تاکہ تم شکرگزار ہو"۔

"آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں بھی غیراللہ کو دوست بنالوں، حالانکہ وہ آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ کھلاتا ہے اور خود نہیں کھاتا"۔

"اس کے مثل کوئی چیز نہیں"۔

"اللہ تعالیٰ کی مثال بہت بلند ہے"۔

"ہر ذی علم پر ایک علیم موجود ہے"۔

"وہ انسانوں کے سامنے اور پیچھے کی سب حالتوں کو جانتا ہے اور لوگ اس کے علم پر احاطہ نہیں کر سکتے"۔

قرآن کریم میں صرف یہی دلائل نہیں، بلکہ بہت سی مثالیں ہیں اور مختلف نوعیت سے روشنی پڑتی ہے۔ ان آیات میں تمام اہم دلائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ بہت سے حکما نے وجود باری کے اثبات پر ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان دلائل کے نام یہ ہیں، براہینِ تخلیق و ایجاد، براہینِ قصد و نظام، براہینِ کمال و استکمال اور عقلِ اعلیٰ۔

قرآن میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے جو دلائل اس نے خاص طور پر بیان کیے اور تاکید و توضیح کے ساتھ انہیں مخصوص کیا، ان میں قناعت بخشنے والی دلیل اور اندھے مادہ پر کائنات کے وجود کو قائم کرنے والوں کے قول کو پارہ پارہ کر دینے والی پہلی دلیل برہان ظہور حیات ہے، یعنی مادہ میں کس طرح جان پڑی؟ قرآن کہتا ہے:

"اللہ تعالیٰ بے جان سے جان دار پیدا کرتا ہے"۔

"اللہ تعالیٰ ہی نے تمہارے کان، آنکھیں اور دل پیدا کیے"۔

دوسری دلیل برہان تناسل ہے، یعنی بقائے حیات کے لیے جانداروں میں اس نے سلسلۂ تناسل قائم کیا۔ چنانچہ فرمایا:

"تمہارے ہی نفوس میں تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے، اسی طرح جانوروں میں بھی"۔

"ہم نے زمین پر بارونق جوڑے پیدا کیے"۔

ظہورِ حیات کے مسئلہ میں مادیین بے بس نظر آتے ہیں۔ بے جان مادہ میں ظہورِ حیات کی وہ کوئی توجیہ نہیں کر سکے۔ بجز اس کے کہ جو دعویٰ ہے وہی دلیل ہے یا پھر اٹکل سے رجماً بالغیب، بے دلیل باتوں میں مخبوط الحواس نظر آتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر تو ان کا ایمان نہیں۔ غیب کی وہ تصدیق نہیں کرتے اور مشاہدہ یا جو مشاہدہ میں داخل ہے، یعنی لمس وغیرہ کے سوا وہ کسی چیز پر اعتماد نہیں کرتے۔

مادہ میں ظہورِ حیات کی بعض نے یہ تشریح کی ہے کہ مادہ میں باہمی ترکیب و آویزش کے بعد جان پڑنے کی صلاحیت موجود ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی تشریح نہیں۔۔۔ بلکہ ایسا ہے جیسے ایک محسوس واقعہ کی اسی محسوس واقعہ سے تشریح کر دی جائے۔

بعض عالموں جیسے لارڈ کلفن کی رائے ہے کہ حیات کے جراثیم اس کرۂ ارضی پر فضا میں منتشر شہابی شعلوں کی صورت میں منتقل ہوئے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض بحالہٖ قائم رہتا ہے کہ ان جراثیم کے کرۂ ارضی کی طرف منتقل ہونے اور ظہورِ حیات کی نوبت آنے کی کیا وجہ تھی؟ حالانکہ اس بے جان مادہ میں حیات کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

حاصل یہ ہے کہ ظہورِ حیات کے مسئلہ میں دو قولوں میں سے ایک قول اختیار کرنے کے سوا چارہ نہیں یا تو یہ کہا جائے کہ خود مادہ میں اس قسم کی صلاحیت موجود ہے لہٰذا کسی پیدا کرنے والے اور صاحبِ ارادہ کو ماننے کی

ضرورت نہیں اور یا یہ کہا جائے کہ یہ ایک صاحبِ ارادہ خالق کا فعل ہے جو اپنے ارادوں میں دانا و بینا ہے۔

اگر یہ تمام عالم مادہ ہی مادہ ہے اس کے سوا اور کچھ موجود نہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ مادہ ازلی ابدی ہے، جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ وہ ازل سے اپنی کامل قوتوں اور جملہ خصوصیتوں کے ساتھ موجود ہے۔ وہ خصائص مادہ کو لازم ہیں خواہ وہ مادہ فضا یا ارض میں موجود ہو یا اس کے علاوہ کہیں اور اپنا مقام رکھتا ہو۔

لیکن اس صورت میں اس بات کی توجیہ کرنا ہو گی کہ کروں میں سے کسی کرہ میں زندگی ہے کسی میں نہیں۔زمانہ کی مسلسل رفتار میں بھی یہی صورت ہے کہ زمانہ کے بعض حصوں میں زندگی تھی اور بعض میں نہیں تھی۔ جب حیات کی صلاحیتیں مادہ میں موجود تھیں تو وہ صلاحیتیں کروڑوں سال پہلے سے کیوں بروئے کار نہیں آئیں بلکہ سالوں کا حساب کروڑوں سے بھی اوپر ہے۔ پھر ایک زمانہ جو صرف چند ہزار سال میں محدود ہے ایسا آتا ہے کہ ایک معینہ تاریخ میں حیات کا ظہور ہو جاتاہے۔ اس مسلسل ازلی نظام میں اس معین تاریخ کا کیا جوڑ؟

سوال یہاں اس اضطراری کیفیت کا ہے جس میں کوئی اختیار موجود نہیں۔ اگر اس مسئلہ کو کسی صاحبِ اختیار کے ارادہ پر مبنی کیا جائے تو اس کی توجیہ آسان ہو جائے گی کیونکہ خاص زمان و مکان میں یہ تقدیر و تخلیق ہوئی کیونکہ تقدیر کا تعلق اختیار و ارادہ سے ہے۔

مادہ میں اگر ازل سے کچھ خصوصیات پنہاں تھیں تو ان کا عمل کیوں ازل ہی سے جاری نہیں ہوا؟ یہ ترکیبی خصوصیات زمانہ کی کیوں محتاج ہوئیں۔ حالانکہ زمانہ بھی مادہ ہی کی فطرت سے وجود میں آیا ہے۔ جب سے وہ خصوصیات موجود ہیں مادہ کی فطرت بھی انہیں لازم ہے۔ یہ ترکیب کیوں اس معین زمانہ کو مقتضی ہوئی اور یوں مادہ کے علاوہ کسی جزو میں اور فضا کے کسی محدود مکان کے علاوہ یہ ترکیبی تقاضے پورے نہیں ہوئے۔ مسئلہ ہزار سال، دس ہزار سال یا کروڑ، دس کروڑ یا ہزار کروڑ یا کروڑہا کروڑ کا نہیں ہے بلکہ "ابد" کا ہے جس میں نہ عالم کی ابتدا ہے نہ انتہا نہ عقل کے لیے ٹھیرنے کا کوئی مقام۔ اس غیر محدود زمانہ میں یہ حیاتی خصوصیات کیوں محدود ہیں؟ اور کیوں یہ ترکیبی اجزاء زمان و مکان کے محدود حصوں میں تقسیم ہوئے؟ حیات مادہ سے کیوں ایک دم متصادم ہو گئی۔ اس میں جو تمام تدبیری صورتیں ممکن تھیں بے عقل مادہ میں کیسے آ گئیں؟

یہ بات عقل کے ذمہ ہے کہ وہ ان ترجیحی اسبابِ حیات کو خالق و صاحبِ ارادہ کی صفت قرار دے۔ لہٰذا اس آسان سے فرض کے مقابلہ میں ایک غیر ممکن فرض کو کیوں ترجیح دی جائے۔

ہمارا یہ مفروضہ نہایت سہل الفہم ہے کہ حیات کا ظہور صاحبِ ارادہ خالق کی طرف ہوا۔ اس خالق کے تمام یا بعض مقاصد اگر ہمیں معلوم نہ ہوں تو بھی عقل اس خالق کا انکار یا نفی نہیں کرتی۔ کیونکہ اس قدر جان لینا کافی ہے کہ صاحبِ ارادہ خالق اپنی غرض بھی جانتا تھا۔ اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ ہر عقل کو بھی اس کا علم ہو اور ہر عاقل اس پر احاطہ رکھتا ہو۔ یہ ہمارے شعور کے لیے یہ تسلیم کرنا ممکن نہیں کہ بے عقل اندھے مادہ نے خاص زمان و مکان میں ظہورِ حیات کو ترجیح دی۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شانِ حیات میں مادہ کے قوانین ازلی دور میں کروڑہا کروڑ سالوں کے بعد یونہی جاری ہوا کرتے ہیں۔ ہاں یہ کہنا صاف اور سیدھی بات ہو گی کہ زمان و مکان کی یہ ترجیح ایک صاحبِ اختیار و ارادہ کی جانب سے ہوئی۔ ساتھ ہی وہ جو کچھ اختیار کرتا اور ارادہ کرتا ہے اس

کو جاننا بھی ہے۔ مسئلہ کی اس طرح تشریح کے بعد حیات کے ظہور کے لیے زمان و مکان کی ترجیح کا کوئی سوال باقی نہیں رہ جاتا، کیونکہ خالق و مرید کے ہوتے ہوئے حیوانی یا انسانی زندگی تمام زمان و مکان میں حیات کونیہ کی پہلی نشأت نہ ہوگی، بلکہ یہ حیاتِ کونیہ کے مظاہر میں سے ایک ظہور ہوگا جس کے لیے عجب نہیں کہ کوئی محدود وقت یا محدود حیز و مکان ہو۔

لہٰذا بے جان مادہ میں زندگی کی تخلیق --- یا میت سے زندہ کا خروج... قرآن کریم کی تاکید و توضیح کی روشنی میں ایک معجزہ ہے اور لطیف دلائل کے ساتھ ایک لطیف بات ہے [illegible] معنوں میں حیرت انگیزی کا موجب ہے۔ کیونکہ مادہ افلاک، مدار اور برجوں میں منظم ہی نظر آتا ہے [illegible] میں ایک ایسی حالت ہے جو مادہ کو پیش آسکتی ہے اور عقل کو کسی خارجی قوت کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن کیا مادہ نے خود ہی اپنے کان، آنکھ اور دل پیدا کر لیے یہ کسی طرح عقلاً قابل قبول نہیں جب تک [illegible] کی تشریح نہ کی جائے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ زندہ جسم کی ترکیب قابل تعجب نہیں [illegible] دیکھتے ہیں کہ ایک معلوم مقصد کے لیے خاص نظام و عمل کے تحت حرکت کرتے ہیں [illegible] تعجب زندہ اجسام اور آلات کے درمیان تشابہ ماننے پر ہے، کیونکہ آلات صانع کے بغیر چل نہیں سکتے۔ [illegible] مادہ کے اعمال کی توجیہ حرارت و حرکت سے کی بھی جائے تو بھی گویا ایک ایسے انجینئر کو ماننا [illegible] قوانین کو مسخر کرنے والا ہے۔

لوگ ظاہر بیں آنکھوں سے زندہ اجسام کے اعضاء کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس پر انتہائی تعجب کرتے ہیں کہ وہ دقیق ہیں۔ باہم ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ ایک کا عمل دوسرے کے لیے معاون ہے۔ نشوونما کے عمل کی رفتار عمر اور نوعیت کے مطابق جاری ہے۔ انسان، حیوان، حشرات اور نباتات تمام کے اجسام میں یہی کیفیت ہے۔ اس تعجب کرنے والوں کو اس سے کہیں زیادہ تعجب ان اعضاء کی اس ترکیب پر ہونا چاہیے جو ہمیں عمل تحلیل خوردبینوں سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ یہ وظائف کس طرح باہم ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ ان کو معلوم ہوگا کہ آنکھوں سے نظر آنے والے یہ اعضاء ان ان‌دیکھے ذرات سے مرکب ہیں جو آنکھوں سے دکھائی بھی نہیں دے سکتے۔ ہر ذرہ جسم کے مناسب مقام پر ٹھیرا ہوا ہے اور ایک دوسرے کو اس طرح مدد دے رہا ہے گویا اسے دوسرے ذرات کی احتیاج و طلب ہے۔ ان میں سے اگر ایک ذرہ بھی بیماری کی وجہ سے اپنے عمل سے بھٹکنے لگتا ہے تو دوسرے تمام ذرات اس کی اصلاح کرنے کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی سالانہ فزیالوجی کانفرنس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے پروفیسر لعصیس نے کہا تھا کہ "پروٹین کا ہر خلیہ سیکڑوں حلقوں کے سلسلہ میں مربوط ہوتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر حلقہ کچھ ایسے ذرات سے مرکب ہے جن کا قوام نوشادر کی ترشی پر مبنی ہے۔ یہ ترشی ان میں تقریباً بیس فیصد ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نسبت و ترکیب کا ہر ایک کا وقوع نہ ہو لیکن ہمارا مشاہدہ یہی ہے کہ ہر حلقہ میں یہی نظام موجود ہے۔ اس کے خلاف کوئی بھی نادر صورتِ حال نہیں"۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس دقیق نظام میں کوئی غلطی پیش کر سکتے ہیں؟ قوتِ خیال کی اس دقیق رسی کے لیے یہ مثال کافی ہے کہ عام انسانی لغت میں ابجدی حروف کو سوچیں کہ یوں تو وہ تیس سے زائد نہیں مگر اپنی

متغیر ترکیبوں میں قوموں کے تمام کلمات و عبارات میں بولے جانے والے الفاظ کو دیکھیں تو وہ بے شمار ہیں۔ اسی طرح پروٹین کا خلیہ اپنے چھوٹے سے جسم میں ہزاروں خلیوں کو قبول کرتا ہے مگر ہمارا مشاہدہ ایک متغیر ترتیب میں صرف ایک ہی غلطی کا نام ہے۔ اس سے آپ توفیق و ترکیب کی اصلاح و درستی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اسی خیال کو سائنس دان نے ایک مثال سے واضح کیا تھا کہ کہکشاں کی روشنی کو ایک جانب سے دوسری جانب پہنچنے میں تین لاکھ سال لگتے ہیں تو اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ خلیہ کی ترکیب کو ٹھیک نشانہ پر بیٹھنے میں ایک قابل فہم مثال سے تشبیہ دیں تو اس کی واضح تصویر یہ ہو سکتی ہے کہ زمین سے ایک گولی چلائی جائے جو کہکشاں کی نہر میں بیل کی آنکھ سے ہوتی ہوئی ایک معین ستارے کے نشانہ پر جا کر لگے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے برابر گولیاں چلیں اور کبھی اس نشانہ سے خطا نہ کریں۔ یہ نظریہ بھی اس مفروضہ پر قائم ہے کہ خلیہ کے حلقے صرف پچاس ہیں سیکڑوں نہیں۔

اگر یہ تمام نظام اتفاقی تصادم ہے اور اس میں خلق و تدبیر نافذ نہیں تو چاہئے کہ عقل کی ڈکشنری سے قصد کے معنی حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں۔

اس تمام احاطہ اور تجزیہ سے بھی حیرت و تعجب کے تمام مراحل ہم نے طے نہیں کر لیے کیونکہ وہ جاندار جسم جس میں یہ معجزات بہ لحظہ مکرر ہوتے ہیں۔ اسی جسم میں اس کے علاوہ اور بہت سی حیرت انگیزیاں موجود ہیں جو شاید ہماری اس دریافت شدہ حیرت و استعجاب سے کہیں زیادہ ہوں۔ غور کیجئے کہ یہ ننھے ذرات جمع بھی ہوتے ہیں اور منتشر بھی۔ یہ ترکیب و انتشار ایسے طریقے پر ہوتا ہے کہ جو تجدد اور دوامِ حیات کا بھی ضامن ہے۔ ہر جاندار دو جنسوں سے مرکب ہوتا ہے۔ ہر ایک میں سے خلیہ نکلتا ہے اور وہ باہم مل کر ایک نیا جان دار بن جاتا ہے۔ یہ دونوں خلیے کبھی جوڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور کبھی انفرادی طور پر، الغرض جس مرحلہ میں جیسا مقام مناسب ہوتا ہے منقسم ہو جاتے ہیں۔ جانداروں کی ہر نوع میں بغیر زیادتی و نقصان کے ان خلیوں کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔ ہر جاندار اپنی مخصوص عادتیں لے کر پیدا ہوتا ہے، جو ایک مقررہ وقت پر اس کو تناسل کی طرف لاتی ہیں۔ پرندوں میں وقت سے بہت پہلے ہی گھونسلہ تیار کیا جاتا ہے۔ سمندری مچھلیاں اپنی نسل کی ولادت سے پہلے شور پانی سے نکل کر نہروں اور خلیجوں میں پہنچ جاتی ہیں اور ولادت سے پیشتر ہر جوڑا ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے قرار نظر آتا ہے۔

ہم پھر یہی کہیں گے کہ اگر یہ تمام ناگہانی اتفاقات پر مبنی ہے اور اگر خلق و تدبیر کے مقابلہ میں یہی رائے زیادہ صحیح ہے تو انسانی عقل میں قصد کے معنی بالکل غلط ہیں۔

قرآنِ کریم میں جہاں کہیں بھی خالقِ کریم کے وجود کے اثبات میں برہانِ حیات اور برہانِ نسل پیش کی ہے۔ زندگی رکھنے والوں کو زندگی کے لغت سے خطاب کیا ہے اور عقل مندوں کو عقل کے لغت سے خطاب کیا ہے۔ جس برہان کے ذریعہ قرآن اس کی وحدت ثابت کرتا ہے۔ اس کے مدبر و حکیم ہونے کے اثبات پر بھی اسی برہانِ حیات یا برہانِ نسل کے ذریعہ استدلال کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

"اگر آسمان و زمین میں خدا کے علاوہ اور بھی کچھ معبود ہوتے تو یہ زمین و آسمان تباہ ہو جاتے"۔

وحدانیت کے اثبات میں اس سے مضبوط دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ متکلمین اسلام اور توحید پر بحث کرنے والے اس کو دلیلِ "تمانع" کہتے ہیں۔

مگر اس کی تشریح میں اختلاف ہوا ہے۔ لیکن ہمیں اس میں اختلاف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ اس برہان کی صحیح مراد سمجھنے میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے کہ جس کی خاطر جدل کو طول دینے کی ضرورت ہو۔

امام تفتازانی کہتا ہے کہ یہ دلیل صرف اقناعی یاخطابی کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا چند خداؤں عقلاً ان میں اختلاف ہونا ضروری نہیں۔

امام ابوالمعین نسفی اور امام عبداللطیف کرمانی نے تفتازانی کی اس رائے پر شدید ناراضی کا اظہار کیا ہے اور اسے کفریہ رائے قرار دیا ہے کیونکہ اقناعی برہان سے استدلال کرنے کا مطلب یہ ہو گا۔ "گویا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی برہان سے استدلال پیش کرتے ہیں جو مشرکین کے لیے مکمل نہیں۔ اس سے لازم آتا ہے کہ استدلال پیش کرنے والا یا جاہل ہے یا بے وقوف۔ حالانکہ اس انتساب سے اللہ تعالیٰ منزہ اور پاک ہے"۔

تفتازانی کا شاگرد امام محمد بخاری اپنے استاد کی طرف سے اس تہمت کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ صانع کے وجود پر دلائل، عقول کے ادراک کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا سب کو مکلف قرار دیا گیا ہے اور عوام قطعی برہانی دلائل کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لیے دلائل خطابیہ ہی مفید ہو سکتے ہیں۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ تعدد الٰہہ کی صورت میں فساد ممکن ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس ممکن کو ظاہری بنا پر واقعہ کی صورت میں بیان کر دیا ہے۔

امام نورالدین صابونی سے صاحبِ سفینۃ الراغب نقل کرتا ہے۔ تعدد الٰہہ کی صورت میں اگر ان دو معبودوں میں موافقت و مصالحت ہو گی تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ ضروری اور جبری ہو گی اس صورت میں وہ دونوں عاجز و مضطر ٹھہرے۔ یا اختیاری ہو گی۔ مگر دونوں میں اختلاف ہو جانا بھی ممکن ہو گا تو اس صورت میں دلیل کا مدعا حاصل یعنی ایک غالب اور دوسرا مغلوب ہو گا"۔

شرح ملا جلال کے حاشیہ میں امام اسماعیل کلنبوی نے خوب لکھا ہے کہ اس صورت میں نظامِ عالم کے لیے یا تو ان متعدد خداؤں کا قدرت اور ارادہ کافی ہو گا یا کافی نہ ہو گا۔ یا اس کے لیے صرف ایک ہی کافی ہو گا۔ پہلی صورت میں دو مکمل مؤثروں کا ایک معلول پر اجتماع لازم آتا ہے جو محال ہے۔ دوسری صورت میں دونوں خدا عاجز ہوئے۔ کیونکہ ان کی قدرت اسی وقت نافذ ہو سکتی ہے جب کہ دونوں شریک ہوں۔ تیسری صورت میں جب کہ ایک کافی ہے تو دوسرا خالق نہ ہوا۔ لہٰذا وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا"۔

مگر صحیح یہ ہے کہ تشریح اس طرح کی جائے کہ دو سرمدی و ازلی خداؤں کا وجود محال ہے اور صفات میں سے کسی ایک صفت میں ایک کمالِ مطلق دوسرے کمالِ مطلق کو جائز قرار نہیں دیتا اور دو خداؤں کا تصور ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ ہر ایک دوسرے کے ساتھ مطلق بھی ہو اور ہر ہر شئے میں ایک دوسرے سے ممتاز

بھی ہو۔ حالانکہ فرض کیا گیا ہے کہ دونوں ازلی ابدی ہیں۔ دونوں میں سے ہر ایک وہی ارادہ کرتا ہے جو دوسرے کا ارادہ ہے اسی فعل پر قادر ہوتا ہے جس پر دوسرا قادر ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز میں ایک ہی عمل کرتا ہے جو دوسرا کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ دونوں وجود حقیقت میں ایک وجود ہوئے نہ کہ دو اور اگر وہ دو ہیں تو دونوں باہم ممتاز اور متغایر ہوں گے۔ لہٰذا اس امتیاز و تغایر کی شکل میں ایک ہی نظام نہیں رہ سکتا ہے اور جب کہ وہ دونوں کامل ہوں گے تو مخلوقات ناقص ہو گی۔ لہٰذا ناقص مخلوق کی تدبیر ایک وجہ پر نہیں بلکہ متعدد وجوہ پر ہو گی۔

اس بنا پر قرآن کریم میں وحدانیت پر یہ برہان قطعی برہان ہو گی خطابی یا اقناعی نہیں ہو گی۔ دین و عقیدہ کے بارے میں قرآن کی شان مشہور و معروف ہے۔ اس کی یہی شان حکمتِ الٰہیہ میں بھی جاری و ساری ہے کیونکہ وجودِ الٰہی اور اس کی وحدانیت کا تصور لازم و ملزوم ہیں۔

حقیقتِ الٰہیہ اور فلاسفۂ معاصرین کے افکار

دورِ قدیم کے لوگوں نے خدا کو مقید اور پابند قسم کا معبود تصور کیا تھا، وہ متعدد خداؤں یا دو خداؤں پر ایمان رکھتے تھے۔ جن کے درمیان آپس میں (ان کے خیال کے مطابق) باہم چشمک اور غالب و مغلوبیت کی شان تھی۔ وہ دو خداؤں میں ایک الٰہ خیر اور دوسرا الٰہ شر تھا یا بالفاظِ دیگر ایک الٰہ نور اور دوسرا الٰہ ظلمت تھا۔

جب توحیدی ایمان کا شیوع ہوا تو یہ الٰہِ مقید کا نظریہ بتدریج غلط ہونے لگا کیونکہ ایک معبود کو کوئی چیز مقید نہیں کر سکتی۔ نہ اس پر حدود و نہایت مفید ہو سکتی ہیں۔ فلسفی عقلیں اس کی ذات کے بارے میں جو افکار رکھتی ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا محالات سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے مقابل بعض متکلمین نے قدرت کو عام مانا ہے۔ جس میں محالات بھی داخلِ قدرت تسلیم کیے گئے ہیں۔ دراصل یہ رائے اس بنیاد پر قائم کی گئی ہے کہ خدا کے لیے کسی چیز کو محال کہنا اس کی قدرت کو محدود کہنا ہے۔ حالانکہ خدا کی ذات ہر قسم کی قیود و حدود سے منزہ تسلیم کی جاتی ہے۔

آگے چل کر لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ کہا گیا کہ زمین ایک کروی سیارہ ہے جو اور سیاروں کی طرح فضا میں گھومتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے نشوونما اور تدریجی تبدیلیوں کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کے داعیوں نے انہیں بتلایا کہ انسان دوسرے جانداروں کی طرح ایک جاندار ہے۔ ان جانداروں نے زمین پر نشوونما پائی۔ احوالِ عالم میں بتدریج درجہ بدرجہ اور مخلوقات کے مراتب کے مطابق طبقہ بطبقہ تبدیلیاں ہوئیں۔

مطالعہ کائنات کے دوران دو مکاشفوں نے نظریۂ انسان پر ایک بہت گہرا اثر چھوڑا۔ یہ دو مکاشفے ذاتِ انسان اور حقیقتِ انسان سے متعلق تھے۔

ابتداً میں ان کا خیال تھا کہ انسان تمام کائنات میں مرکزی شان کا مالک ہے یا بالفاظِ دیگر وہ زمین و آسمان کی تمام تر تخلیق کی اصلی غرض و غایت ہے۔ وہ خیال کیے ہوئے تھے کہ وہ عالی شان اور مافوق الفطرت ہستی کا مالک ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے تمام جاندار اس کے تابع فرمان ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہ تھا کیونکہ وہ اس درخت کی ایک شاخ ہے جس سے اور بھی بہت سی شاخیں پھوٹی ہیں۔ اسی لیے کائنات اور اپنی ذات کے متعلق

انسان کا نظریہ تبدیل ہو گیا۔

لیکن کیا اس کا نظریہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق بھی تبدیل ہو گیا ہے؟

زمین کی گردش یا نشأت و ارتقاء کے علم کا نتیجہ تو یہ ہو سکتا تھا، کیونکہ یہ چیزیں انسانی قدرت کے مقابلہ میں ضرور غیر محدود تھیں، لیکن قدرتِ الٰہی کے سامنے غیر محدود نہ تھیں۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ان دین پرستوں کے عقیدوں میں زد پڑ گئی۔ جنہوں نے دین کو غلط سمجھا تھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ دین اب تک انہیں یہ عقیدہ دیئے ہوئے تھا کہ سورج زمین کے گرد گردش کر رہا ہے اور دیگر مخلوقات اور انسان میں کوئی علاقہ نہیں ہے۔ مگر جن لوگوں نے مذکورہ دو انکشافات کو سمجھ لیا انہوں نے ایمان باللہ کے عقیدہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی۔ بلکہ کائنات کی وسعت سے ان کو نئی دلیلوں کا سراغ لگا، انہیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی تمام مخلوق کا نظام برقرار رکھنا نہایت آسان ہے۔ مگر انسانی شعور کے لئے اس کا فہم و ادراک مشکل ہے۔

پھر دورِ حاضر کے خداپرست جدید فلسفوں میں یہ زلزلہ کہاں سے آگیا؟ کہ وہ خدا کو بھی اپنے قوانین یا مادہ و قوت کے قوانین میں جکڑبند کرنے لگے یا اور مزید افراد سے کام لے کر بتانے لگے کہ خدا پر ایمان بھی اس محیط کائنات میں تغیرات کا نتیجہ ہے۔ یا خدا عناصر میں سے ایک عنصر کا نام ہے جو کبھی تو ان عناصر پر قابو پا لیتا ہے اور بہرحال ان عناصر کے قابو میں رہتا ہے۔

تاہم یہ وہم و خیال کی نشو و ارتقا کا نہ شعوری نتیجہ تھا اور نہ فضا میں زمینی گردش کے نظریہ کو اس میں کوئی دخل تھا۔ جیسا کہ بعض افکار میں یہی اصلی سبب بنا ہے۔ یہ تمام ترقی یا علمی انکشافات کے نتائج سے نہیں بلکہ حیاتِ اجتماعی کی تبدیلیوں کے نتائج سے متعلق ہے، اسی حقیقت کا شعوری نتیجہ ہے کہ اس وقت حیاتِ اجتماعی کی بہترین ارضی سیاست قوانین و دساتیر میں مقید قسم کی حکومت سمجھی جاتی ہے۔ حیاتِ اجتماعی کے افکارِ حاضرہ کی یہ جدید صورت ہے کہ حکمران اراکینِ حکومت کے شورائی قوانین و مقتضیات کے پابند ہوتے ہیں۔ یہی نظریہ آج زمین کے ٹکڑوں پر حکومت کرنے والوں سے منتقل ہو کر تمام کائنات پر حکومت کرنے والی ہستی کے بارے میں بھی سمجھا جانے لگا ہے۔

بعض ان مشرقی قوموں میں جن کے حکام آج تک اپنی معاشرتی، اقتصادی اور اخروی حالتوں میں آسمانی کتابوں کے پرستار واقع ہوئے ہیں ان میں یہ نظریہ ضرور اجنبی رہا مگر مغربی سیاست جن الہامی کتابوں پر ایمان رکھتی تھی وہ آج کے معاشی حالات میں ان کتابوں سے کوئی تعرض نہیں کر رہی ہے۔ شرع و قوانین کی وضع میں عوام کو بالکل آزادی ہے۔ بہرحال ان کے نزدیک اس آزادی کا تصور یہ ہے کہ حکمران تو آزاد نہیں ہے بلکہ اسے پارٹی سسٹم کی سیاست میں مقید ہونا چاہئے اور اس کے بعد یہ تصور بھی عام ہوا ہے کہ ہر وہ حاکم مطلق جس پر اب تک بعض قیود کی گرفت نہ تھی وہ بھی پابندیاں قبول کرے۔

اس سے پہلے انسان کو اپنے مرکزِ کائنات سمجھتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی خود مختار اور مطلق العنان بادشاہوں کے سامنے جبہ سائی بھی کرتا تھا۔ اس وقت اس کے دائرہ خیال میں بھی یہ نہ آ سکتا تھا کہ ارض و سماوات کے

شہنشاہ پر محاسبہ و تنقید کی پابندیاں عاید ہوں۔

جب انسان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ مرکز کائنات نہیں بلکہ شجر حیات کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے تو اس صورت میں مناسب تو یہ تھا کہ وہ مزید احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اقتدار الٰہیہ کے حضور میں کہیں زیادہ انکسار و تواضع کی صورتیں اختیار کرتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ ایک جانب سے چھوٹا ہوا تو دوسری جانب بڑ ہو گیا، یعنی کائنات میں چھوٹا ہو گیا اور اپنی سیاسی زندگی میں بڑا بن گیا۔ وہ اب ان حکمرانوں پر جو اب تک مطلق العنان تھے، برملا تنقید کرنے لگا۔ اس سے ۱۲۱۵ء نے اس کو ان حکمرانوں کا شریکِ حکومت بنایا۔ حالانکہ وہ پہلے بذات خود تمام قوانین کا سرچشمہ تھے۔ اس جمہوری نظام فکر میں کچھ عقلیں اگر سلطان الکائنات کو بھی مناسب حدود میں رکھنا چاہیں تو یہ امر تعجب انگیز نہ ہو گا، کیونکہ اب تنقید تحدید قابل فہم ہو گئی تھی اس سے پیشتر یہ ناقابل فہم تھا۔ یورپین ممالک میں یہ شاہی فیشن جاری ہے کہ شاہی وظیفہ خوار بادشاہ تاج پوش ضرور ہے مگر حکومت کے معاملات میں اس کا دخل اسی حد تک ہے جہاں تک رعایا اسے اجازت دے۔

جمہوری سیاست کی داغ بیل جان سٹیوارٹ مل نے ڈالی جو حریت افکار اور دستوری سلطنت میں نیابتی نظام حکومت (پارلیمنٹری سسٹم) کا بہت بڑا داعی تھا۔ اس نے مشرقی ہند میں نہایت اہم کارنامے انجام دیے تھے۔ بعد ازاں برطانوی حکومت کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔

جان سٹیوارٹ مل انیسویں صدی کے شروع میں پیدا ہوا (۱۸۰۶ _ ۱۸۷۳) اس کی تمام زندگی پارلیمانی رقابتوں میں کامیابی سے ہمکنار رہی۔ انتخابی حقوق میں اس نے زیادہ سے زیادہ وسعتوں کو فروغ دیا۔ اس نے کائنات پر غور کیا تو دیکھا کہ محکومین کا حکمرانوں کے ساتھ شدید تعلق ہے۔

جان سٹیوارٹ مل طبیعت کا فلسفی نہ تھا بلکہ اسے پوری طرح ماورائے طبیعیات یا ادیان تعلیم کا بھی علم نہ تھا۔ چونکہ اس کے باپ نے اپنی اخیر زندگی میں تمام دینی عقائد کا اظہار کر دیا تھا، اسی لیے وہ بھی ابتدائی عمر میں دین و عقیدہ رکھنے والوں میں سے نہ تھا...... اس لیے ضروری تھا کہ ایسے باپ کا بیٹا کائنات کے معبود اور مدبر عالم پر نظر کرتا تو مادہ کی عظمت کے سامنے نہ جھکتا۔

میں نے اس کے تین رسالوں میں جو اس نے "دین" پر لکھے، اس کے دینی فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا۔ یہ رسالے اس کی زندگی میں طبع نہ ہو سکے۔ اس موضوع پر اس نے اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غالباً ان میں اس نے اپنی اخیر رائے لکھی ہے۔

پہلے رسالہ کا عنوان طبیعت ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرت کی راہ کوئی ایسی راہ نہیں ہے کہ جس کی پیروی میں انسان کمال پیدا کر سکے۔ انسان کا مقام یہ ہے کہ اس کو مسخر کرے اور اس کی قیادت کرے۔ نہ یہ کہ اپنے آداب و معاملات میں اس کو اپنا مقتدا تسلیم کرے۔ اسی لیے یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہ خدائے رحیم و قادر کی تخلیق ہے کیونکہ تمام طبیعت قساوت و تکلیف و محنت سے بھرپور ہے۔ بہت کم کوئی انسان اس کی خیر و برکت پر کامیابی پاتا ہے۔ ہاں جس چیز سے یہ قبضہ میں آتی ہے۔ وہ بے انتہا کوشش اور زبردست جدوجہد ہے۔

اس کے دوسرے رسالے کا موضوع ہے "دین کا فائدہ" اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ادیان نے قدیم زمانہ سے انسان کو مکارمِ اخلاق اور محاسنِ عادات کی تعلیم دی۔ حسنِ اخلاق کی افادیت ہی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی حسن و قبح اور جائز و ناجائز میں تمیز کرتا ہے۔ لیکن ادیان اپنے فرائض و واجبات ـــ اہتمام سے انسانی عقل پر ایسی گرہ لگا دیتے ہیں کہ نہ وہ اخلاقیات کے مضامین پر غور و فکر کر سکتا ہے اور نہ عیب و صواب کو چھانٹ سکتا ہے۔ مل کے نزدیک اگر مابعد الطبیعیات پر لوگوں کا اعتقاد نہ ہو تو عوام کے عقائد لوگوں کی تہذیب و قیادت کے لیے کافی ہیں کیونکہ اگر ان عقاید کو عظمت حاصل نہ ہوتی تو یہ انسانی عقید میں جگہ نہ پاتے۔ وہ کہتا ہے کہ عقل و علم کی روشنی میں موت کے بعد نئی زندگی ملنا ممکن ہے۔ ادیان کے اس وعدہ میں ہمیں کوئی مانع یا دشواری نظر نہیں آتی۔

اس کا تیسرا رسالہ "ربوبیت" پر ہے، جس میں یہ فیلسوف نظامِ کائنات کا معترف ہے۔ یہاں وہ مادہ کے ظاہری نشو و ارتقاء کے نظریہ سے مطمئن نظر نہیں آتا۔ مگر چپ لوٹتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ نظام کائنات خالق و قادر کے وجود کو ثابت کرنے میں کافی نہیں، اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ کائنات کا مدبر کوئی مطلق القوت معبود ہو کیونکہ دنیا میں جو نظام پایا جاتا ہے وہ آفات و شرور سے خالی نہیں۔ خدا اس پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کو تبدیل کر کے بہترین کیوں نہیں بنا دیتا۔ لہٰذا یہ تو صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ مخلوق کی بھلائی اور سعادت چاہتا ہے مگر اس کی قدرت اور ارادہ محدود ہے۔ انسانی امور سے بہت کم واسطہ ہے بہت سے امور میں اس کی توجہ مصروف ہے۔ وہ مادہ کی قوتوں کو رام کر کے اپنی مرضی کے تابع فرمان بنانا چاہتا ہے۔

یہ مذکورہ بالا افکار وہ ہیں جو موجودہ زمانہ میں محدود و مقید خدائی کے تصور کے لیے ایک تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔ جان سٹیوارٹ مل کے افکار کا مطالعہ کرنے والے بعض شارحین کی رائے ہے کہ اس جدید مذہب کے وجود میں آنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ مل عقلی کیمیاء کا قائل تھا۔ عقلی کیمیاء سے اس کی مراد یہ تھی کہ بہت سے افکار کے امتزاج سے نئے افکار وجود میں آتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس ترکیب افکار کا اثر ہوتا ہے۔ ورنہ امتزاج سے پہلے ان عناصر میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی جیسے ہائیڈروجن اور آکسیجن سے پانی کی پیدائش ہوتی ہے۔ حالانکہ اپنی خصوصیات میں یہ دونوں پانی کے برخلاف ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں نشو و ارتقا کے تصور پر بہت سے افکار وجود میں آئے، اس دور کے بعد نظریۂ اضافیت وجود میں آیا جس کا بانی آئن سٹائن ہے۔ اس نظریہ میں وہ بتلاتا ہے کہ فضا چار بُعدوں پر مشتمل ہے اور چوتھا بُعد زمانہ کا ہے۔ لہٰذا کوئی حرکت طولاً، عرضاً اور عمقاً تنہا ممکن نہیں جب تک کہ اس میں زمانہ کا اضافہ نہ ہو۔ یہی وہ چوتھا بُعد ہے جو ان ابعاد کی تکمیل کرتا ہے۔

جان سٹیوارٹ مل کے افکار جدید یورپین فلسفہ میں ریڑھ کی ہڈی بن گئے ہیں۔ اس کے بعد جس قدر افکار و نظریات ابھرے یکے بعد دیگرے سب نے اس کی تائید کی۔ اسی لیے بیسویں صدی میں کسی فلسفی کا مذہب اس کی آراء و افکار سے خالی نہیں، البتہ کسی کے یہاں یہ افکار مجموعی طور پر ملتے ہیں اور کسی کے یہاں متفرق طور پر۔ مجموعی طور پر ان تمام نظریات کو اگر ایک قدرِ مشترک پر جمع کرنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام کی فکری اساس صرف ایک چیز ہے گو یہ نتائج کے لحاظ سے باہم کر الگ الگ کیے جا سکتے ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہر نظریہ

صلاحیت رکھتا ہے کہ اس کو "نظور انبثاقی" یا "ترکیب منتخب" کا نام دیا جائے۔ اس نام کی حقیقت اس وقت واضح ہو سکتی ہے جب کہ ان تمام مذاہب پر پوری نظر ہو۔

ان تمام مذاہب کا خلاصہ پیش کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ چنانچہ اکثر اہل قلم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ مگر فلاسفہ کی ایک جماعت ان کی شرح و تخریج میں مشغول رہی ہے۔ یہ فلاسفہ بیس سے اوپر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جدا راستہ رکھتا ہے۔ کہیں اختلاف مغز کا ہے اور کہیں پوست کا۔ بہر حال ہمارے لیے یہ تو چنداں مفید نہ ہوگا کہ ہم ان تمام افکار پر کلام کریں۔ البتہ ان میں سے کچھ واضح تشریحی فلسفیانہ اقوال پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اس فلسفہ کے تین ستون ہیں، مورجان، اسکندر، اسمٹھ، ہم ان تینوں کی تشریحات ہی پر اکتفا کریں گے۔ اسے "ترکیب و انبثات" کے نظریہ پر ایک بہترین خلاصۂ افکار سمجھنا چاہیے۔

لائیڈ مورجان ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوا۔ اس نے علم ہندسہ اور علم طبقات الارض کی تعلیم حاصل کی۔ پھر علامہ توماس ہکسلے کے یہاں بیالوجی کے لیکچروں میں حاضر ہونے لگا۔ اس نے اپنے بچپن ہی میں نئے پرانے کلام میں سے چیدہ چیدہ اشعار بھی یاد کر لیے تھے۔ وہ ابھی نومشق بچہ ہی تھا کہ اس کے استاد نے اسے دو فلسفیوں کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ ایک برکلے اور دوسرا ہیوم۔ اس نے ان دونوں کو پڑھا اور اس کے علاوہ ڈیکارٹ، سپنوزا، لیبنٹز کا بھی مطالعہ کیا۔ ثقافت عصریہ کے مختلف شعبوں میں تدریسی پریکٹس بھی کرتا رہا۔ جن میں اس نے وسیع معلومات پیش کیں۔ اس نے علوم طبعیہ، تاریخ دستوری، زبان انگلش کے آداب، علم طبقات الارض اور علم الحیوان پر لیکچر دیے۔ اس کے ابتدائی لیکچر جنوبی افریقہ میں ہوئے، پھر انگلینڈ لوٹا اور برسٹول کے کالج میں تدریسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے لگا۔ یہاں وہ چند سالوں میں پرنسپل کے منصب پر فائز ہو گیا۔

وہ شروع میں ہربرٹ سپنسر کے نظریہ کو درست سمجھتا رہا جو کہتا ہے کہ مادۂ عضویہ و غیر عضویہ دونوں میں یکساں ارتقا ہے۔ مادہ اپنی بسیط حالت سے ترکیب کی طرف اور تشاکل سے تنویع کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ مورجان کی رائے یہ تھی کہ بساطت سے ترکیب کی طرف منتقل ہونا ظہور حیات کی تفسیر کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ ترکیب میں کوئی نئی چیز شامل نہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ ترکیب نئی چیز کو اسی صورت سے تخلیق کر سکتی ہے جو ہم ہائیڈروجن اور آکسیجن کی ترکیب سے پانی کی تخلیق میں لکھ آئے ہیں۔ نیز وہ کہتا ہے کہ زمانہ قدیم سے مادہ میں روحانی یا حیوانی خصوصیات موجود تھیں۔ ترکیب ہی درحقیقت ان نفسانی خصوصیات کو ابھارنے میں اصل سبب بنی۔ ترکیب سے پیشتر مادہ کی بساطت و تفرد کی حالت میں یہ خصائص پوشیدہ تھیں۔ اس کی صورت اہرام مصر کی سی سمجھنی چاہیے جو نیچے سے وسیع ہے اور بالائی حصہ میں محدود ہوتا چلا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ مادہ نچلی بنیاد ہے اور عقل اس کی بالائی چوٹی ہے۔ اس میں ہر طبقہ اپنے ماتحت طبقہ سے بلند ہوتا ہے۔ یہ بلندی روحانی خصوصیات کے تناسب سے ہوتی ہے۔

ارتقا کی ترتیب اس کے یہاں اس طرح ہے کہ اولاً مادہ اپنی بسیط و مفرد صورت میں تھا۔ پھر مادہ اپنی کیمیاوی اور طبعی آمیزشوں میں آیا پھر حیات اور پھر عقل کا درجہ آیا جو موجودات کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن ہر نیا طبقہ بسیط موجودات میں قدیم زمانہ سے مستور و مکنون رہا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ذرہ بھی عقل

رکھتا ہے، جمادات بھی عقل رکھتے ہیں اور شجر بھی عقل رکھتے ہیں کیونکہ یہ تمام عقل کے عناصر سے خالی نہیں ہیں۔ وہ ذرہ بے مقدار کی حقیقت میں مستور ہے یا استقرار کی حالت میں ہے تا آنکہ معروف طریقہ کے مطابق انسانی عقل کی صورت میں ظہور کرتی ہے۔

عقل و مادہ کے باہمی تعلق پر اس کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں طبقہ بطبقہ ایک ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں کسی کو فوقیت نہیں لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ نہ عقل بلا مادہ ہے اور نہ مادہ بلا عقل۔

مورجان اپنے اس مذہب کا نام "نظریہ ترکیب منتخب" رکھتا ہے۔ یعنی ایسی ترکیب جس میں مختلف ترکیبوں سے وہ گزرتا ہے اور اس کے وجودی خصائص میں سے بتدریج چھنتا چلا جاتا ہے۔ اس کو "ظہور انشباقی" بھی کہتے ہیں۔ چونکہ یہ نام بولنے اور قریب الفہم ہونے میں زیادہ بہتر تھا۔ اس لیے ہم نے بھی اسی لفظ کو منتخب کیا۔

مورجان اور اس کے دیگر "انشباقی" نظریہ رکھنے والا فلاسفر دوستوں کا اس پر اتفاق ہے کہ مادہ قدیم ہے اور قدیم زمانے سے ہی اس میں عقل و حیات کے وجود میں آنے کی صلاحیت و خصوصیت موجود ہیں۔ لیکن مورجان اپنے ان اکثر ہم خیالوں سے اس نظریہ پر متفق نہیں کہ مادی خصائص کے اثبات کے ساتھ ساتھ ارادۂ الہیہ کا اثبات بھی کیا جائے۔ لیکن وہ بار بار پوچھتا ہے، وہ کون ہے جو اس عجیب ترتیب سے مادہ کو اس کی نو بر نو حالت سے نکالتا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ یقیناً یہ خدا کی تدبیر ہے یا خدائی توجیہ ہے۔ ان تمام مباحث میں گھوم پھرنے کے بعد انجام کار ترکیب کے قوانین اس کو مستغنی عن اللہ نہ کر سکے۔

زمانۂ حال کے یہ عظیم الشان تین فلاسفر جو دورِ حاضر کے مختلف فلسفوں کے جامع سمجھے گئے ہیں، ان میں دوسرا فیلسوف پروفیسر صموئیل اسکندر ہے جس کو دنیا صرف اسکندر کے نام سے جانتی ہے۔

یہ آسٹریلیا کا باشندہ ہے۔ سڈنی میں پیدا ہوا (۱۸۵۵ء) اس نے سب سے پہلے ملبورن یونیورسٹی پھر آکسفورڈ میں ذکاوت و ذہانت میں نام بلند کیا۔ امتحانوں میں اول آیا۔ اس نے بہت سے انعامات اور میڈل حاصل کیے۔

اس کے زمانہ میں جس بڑے فلسفہ سے لیکچر روم اور تدریسی حلقے گونج رہے تھے وہ ہیگل کا فلسفہ تھا جس کو ڈارون کا فکر تکمیل تک پہنچاتا ہے اور ہکسلے اور سپنسر کے افکار اس کی تشریح کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ فلسفہ واقعیت سے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ ورنہ ہیگل اپنے دور میں واقعیت کے مقابلہ میں مثالیت کے فلسفہ میں مشہور رہا ہے چنانچہ اسکندر واقعیت کے فلسفہ میں ایک عظیم ستون شمار کیا جاتا ہے۔

اسکندر، فلسفہ "انشباقی" کے انصار میں بہت وسیع الخیال تصور کیا جاتا ہے۔ مگر وہ نتائج و افکار کے لحاظ سے کافی مختلف الخیال ہے۔ کیونکہ وہ اپنے فلسفہ میں خدا کا تصور بھی شامل کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ کی درجہ بدرجہ ترقی ظہور "عقل" ہی کے لیے ہے یا بالفاظ دیگر تمام نتائج و ثمرات میں آخری ثمرہ جس کی طرف ارتقاء و انبثات ترقی کرتا ہے وہ یہی عقل ہے۔ مادہ جن بلند مراتب کی طرف ترقی کرتا ہے وہ گویا فکرِ الٰہی ہے جو مادیات کے آخر میں لازمی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

اسکندر اس تصور اور ہیگل کے فکر کو آپس میں جوڑتا ہے۔ کیونکہ ہیگل نے کہا کہ اللہ تعالیٰ "وجود مطلق" ہے جو وجود مشہود کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور عقلِ انسانی وہ آخری مثال ہے کہ تجلی الٰہی میں وجود اس تک پہنچا ہے۔ اس لیے شائیت میں وہ سب سے ارفع ہے۔

اسکندر کے نزدیک مادہ اور اس کے تمام مظاہر ایک مصدر سے صادر ہوئے وہ مصدر ہے ایک ایسا وجود جو مکان و زمان سے مرکب ہے۔ لہٰذا مکان میں خلاء نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ مکان و زمان سے جدا ہو جائے۔ اسی طرح زمنہ معدوم نہیں۔ الا یہ کہ وہ مکان سے علیحدہ ہو جائے۔ لیکن جب یہ دونوں جمع ہو جائیں۔۔۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ جمع رہتے ہیں، تو اس سے حرکت پھوٹتی ہے اور یہی مادہ کی اور تمام موجودات کی اصل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زمان و مکان کے تصور میں آئن سٹائن کے نظریہ پر ہیگل کے فلسفہ مذکورہ نے گہرا اثر چھوڑا ہے۔ علاوہ بریں اس نظریہ کو حرارت و برق کے سائنسی علوم میں بھی جگہ دی گئی ہے۔ خصوصاً ان مباحث میں جو یہ بتاتے ہیں کہ مادہ کے ذرات شعاعوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ گویا شعاعوں کی اصل مادہ ہے۔ نیز شعاعیں مجرد حرکت بھی ہیں اسی لیے فلسفی کو لازمی طور پر اس مقام پر خیال ہوتا ہے کہ فضا میں حرکت کا حدوث ہی مادہ کی ابتدائی صورت ہے اور حرکت کا حدوث فضا میں گویا بالفاظ دیگر زمان و مکان کا اتصال ہے کیونکہ زمنہ حرکت اور وقوعِ حرکت کے معنی ہیں حرکت کا مکان کے ساتھ متصل ہونا۔

لہٰذا جب حرکت حادث ہوئی تو مکان و زمان کا اتصال ہوا، اور جب حرکت وجود میں آئی تو شعاعیں پھوٹیں۔ چنانچہ مادی اشیاء انہیں شعاعوں سے مسلسل وجود میں آئیں۔

اس کے چند درجے ہیں۔ اولیٰ مادی طبقہ۔ بعد اس کے کہ فضا و زمنہ سے اس کا صدور ہو چکا ہو۔۔۔ اس کے اولین خصوصیات یعنی حجم، شکل، عدد اور حرکت ہیں۔ پھر اس مادہ پر اس خصائص والے طبقہ سے بلندی و ترقی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ترقی کرتا ہوا رنگ، آواز، بو اور درجہ حرارت کو پہنچتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اولین خصائص تمام حواس کا ادراک رکھتے ہیں اور کسی چیز کا خاصہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو دوسری چیز کے ساتھ اتصال حاصل نہ ہو جیسا کہ رنگ اس وقت مکمل ہو گا جب کہ اس میں کچھ نور بھی شامل ہو۔ آواز اس وقت مکمل ہو گی جب کہ ہوا میں اس کا ارتعاش بھی ہو لہٰذا اس حالت میں بھی اس کو کچھ نہ کچھ ترکیب حاصل ہوئی۔

وہ اپنی ایک مفصل کتاب "زمان و مکان اور خدا" میں کہتا ہے:

اگر ہم لفظِ نظام کو لفظِ منظم سے تبدیل کرنا چاہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ اس طرح ہم اس واقعی حقیقت کا نام رکھنے میں کوئی غلطی نہیں کریں گے کیونکہ عالم ایک ایسے نظم میں جاری ہے جس سے ایک تنظیم وجود میں آتی ہے۔ ہم اسی عالم کو جس کو اس صورت سے ادراک کر رہے ہیں "خدا" کہہ سکتے ہیں۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس حقیقت کی بنا پر ایسا خدا عبادت و پرستش کے قابل ہو سکتا ہے؟ پرستش کا تصور صرف ایک صورت سے ہو سکتا ہے کہ ہم نظام کے اس فکر میں ۔۔۔ جو بعض مقررہ واقعات کی توجیہ کرتا ہے نظام کو چلانے والے مدبر کو

داخل کریں اور یہ وہی رائے ہے جو ہم اوپر مفصل لکھ چکے ہیں اور اسے باطل کر چکے ہیں۔

اس مقام پر پہنچ کر جو چیز ہم پیش کرتے ہیں وہ عام علمی رفتار کے مقابل تواضع و اعتدال سے زیادہ قریب ہے۔ خدا کی تعریف کے سلسلہ میں ہمیں اپنے نفوس سے پوچھنا ہوگا کیا وہاں عالم میں صفتِ الٰہیہ کے لیے کوئی محل ہے؟ اس کے بعد ہمیں اس وجود کی حقیقت کو پا لینے کی کوشش کرنی ہوگی جو اس صفت سے موصوف ہے، ہم اپنے دینی احساس کی طرف لوٹیں گے تاکہ اس موجود میں اس خدا کی صفتوں کو مطابق کر سکیں جو عبادت کے قابل ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر اس گزرگاہ اشیاء میں، خدا کا وہ محل کہاں ہے۔ جبکہ اس کا محل معین نہیں بلکہ علی الاطلاق ہے۔

اس مادہ شاملہ میں جو فضا و زمان سے پیدا ہوتا ہے کائنات ایک گردش میں رہتی ہے۔ کائنات کے سلسلہ میں یکے بعد دیگرے نئی نئی کیفیتوں سے انطباقی کیفیت جاری رہتی ہے۔ ہر کیفیت میں اس کی مخصوص صفات پائی جاتی ہیں۔ اس کائنات میں سب سے ارفع و بلند ہمارے خیال میں عقل و شعور یا قوت محافظہ ہے گویا خدا وہ موجود ہے جو ہمارے مطالعہ میں تمام اعلیٰ موجودات میں سب سے اعلیٰ ہے۔

----- چونکہ زمانہ ابدی اور نہ ختم ہونے والا ہے اور وہی نمو و ارتقاء کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے ہمارے امکان میں نہیں کہ ہم زمانہ کا تصور کچھ اس طرح کریں کہ وہ اس محدود کائنات کو پیدا کرنے کے لیے قائم ہے اور یہی کائنات عقل یا قوتِ محافظہ کے لیے بھی راہنما ہے بلکہ ہمارے لیے ضروری ہوگا کہ ہم اپنے افکار کو اسی سمت میں دوڑائیں جس سمت میں ہم نے اس مذکورہ انطباقات کے تجربات حاصل کیے ہیں۔ زمانہ و فضا میں یقیناً ایک ایسا باعث موجود ہے جو مخلوقات کو اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کی طرف دھکیل دیتا ہے جس طرح موجودات کو طبقہ عاقلہ یا محافظہ کی طرف دھکیلتا ہے۔

عقلاً ہمارے لیے کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہیں جو ہمیں کسی حد پر روک دے اور ہم اسے آخری حد کہہ سکیں۔ کیونکہ زمانہ میں تبدیلیوں اور ارتقاء کا نظام ابدی ہے----- بلکہ خود زمانہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ زمانہ کی مخلوقات میں سے ہم دوسری مخلوق کا انتظار کریں۔ اس لیے ہمیں اس کی گنجائش ملتی ہے کہ ہم صفات کے سلسلہ کا تتبع کریں اور اس محدود کائنات کا تخیل کریں۔ جن کا ہم فرشتے نام رکھتے ہیں۔ یہ وہ کائنات ہے جس کے ملکی وجود سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن عقل کچھ ایسے طریقہ سے سوچتی ہے کہ خود ہی اس میں عاجز رہ جاتی ہے جس طرح کہ تم عقل کو پاتے ہو کہ وہ اپنے سے اسفل دیگر مراتبِ حیات اور سفلی موجودات میں غور کرتی ہے----- نیز ہمیں یہ بھی پوچھنا ہوگا کہ ان محدود خداؤں میں جنہیں فرشتے کہتے ہیں اور لامحدود خدا کے درمیان کیا علاقہ ہے؟

گویا خدا ایک طبقہ مثالیہ ہے جو عقل اور قوتِ مدرکہ پر فوقیت رکھتا ہے اور اس حالت میں کائنات کو حرکت دیتا ہے تاکہ اس کے طبقات میں سے اسے نکالے----- ہم ایک عام غور و فکر کے لحاظ سے اس یقین پر ہیں کہ یہی صفتِ کائنات مختلف صورتوں کو جنم دیتی ہے۔ لیکن یہ صفتِ موعودہ کیا ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں، کیونکہ نہ ہم اس صفت سے آراستہ ہونے کی طاقت رکھتے ہیں نہ اسے سوچ سکتے ہیں۔ بہرحال انسانی محرابیں اس

خدائے مجہول کے استقبال کے لیے ہمیشہ چشم براہ رہتی ہیں۔ اگرچہ ہمارے لیے کوئی راہ نہیں کہ ہم اسے جانیں اور یہ جانیں کہ اس کی معبودیت کی شان کیسی ہے؟ اور خود اس معبود کو اپنے وجود کا شعور کس طرح حاصل ہے۔ الاّ یہ کہ ہم اس سے پیشتر اس کی صفتِ معبودی کے سامنے نرم دل ہو جائیں۔۔۔ آگے چل کر کہتا ہے۔ خدائی ایک وصف ہے جو اپنے سے ماورا طبقہ عقل سے متعلق تمام صفات پر نگراں رہتا ہے۔ اسی طرح عقل اپنے سے نچلے طبقے پر نگراں ہے۔ جس قدر بھی اس میں ترکیب و تنسیق ہوتی جاتی ہے اسی قدر یہ سلسلہ آگے چل کر تمام مقدرہ کائنات تک پہنچتا جاتا ہے۔

اس فلسفی کے یہ فرضی اور تخمینی فیصلے اور آگے چلتے ہیں۔ وہ فرض کرتا ہے کہ الٰہ اعلیٰ سے تمام عالم وجود میں آتا ہے اور عالم تک پہنچنے میں رُوح و عقل کے معدن کا فیضان ہوتا ہے لیکن تمام کائنات اپنی تمام خصائص کونیہ میں مشترک ہے جس طرح ایک انسانِ عاقل، مادہ اور دیگر تمام جانداروں کی خصوصیات میں مشترک ہوتا ہے۔

فلسفی موصوف کے خیال میں وجود کے چند درجے ہیں۔ اول زمان و مکاں کا وجود، دوم مادہ کا وجود جس میں سوائے شکل، ضخامت اور عدد کے کوئی کیفیت نہیں۔ وہ اپنے دیگر افراد سے تعلق رکھنے میں نہ احتیاج رکھتا ہے اور نہ اس کے ادراک میں کسی امتیاز کرنے والے حاسہ کی ضرورت ہے۔ سوم، اس مادہ کا وجود جو رنگ و بو اور آواز سے متکیف ہے اور اس کے ساتھ مل کر ترکیب کا ایک مقام پیدا ہو جاتا ہے۔ چہارم، وجود حیات۔ یہ احساس کی پذیرائی سے شروع ہوتا ہے، جو ظاہری شکل و صورت میں بعض غیر عضوی مواد کو بعض موثرات کے لیے پذیرائی کی کیفیت دیتا ہے۔ پنجم، حیاتِ عاقلہ و مدرکہ کا وجود۔ ششم، وجودِ معبود، جو ان سب سے عالی ہے اور زمانہ ابدی و سرمدی اور غیر منتہی کے ساتھ علو رکھتا ہے۔

مارشل کرسچین اسمتھ نے اس سلسلہ میں اپنا جو فکر پیش کیا ہے وہ اسکندر کی رائے سے کسی لحاظ سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ نہ مبادی میں اور نہ انتہائی نتائج میں۔ البتہ وہ ثبات و ترکیب کے نظریہ میں اس سے متفق ہے بلکہ تمام کائنات کو مکمل ترکیبات قرار دیتا ہے۔ یہ ترکیبیں اپنے مراتب میں ترقی کرتی اور اپنے لیے ایسی صفت کی متلاشی ہوتی ہیں۔ جو اس ارتقائی مرتبہ سے قبل اس میں موجود نہ تھی۔ مطلب یہ کہ کائنات کا مادہ کوئی ایک معین چیز نہیں جس میں بڑے بڑے فلاسفہ و علماء کے تخیل کے مطابق تشابہ و تکرار کی صورت ہو اور نہ اس کے عناصر پراگندہ متماثل ہیں کہ ہر ہر ٹکڑا اس طرح علیحدہ ہو۔ گویا ان میں آپس میں جزو ہونے کا کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ وہ ایسی ترکیبوں کا مجموعہ ہے جو باہمدگر ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ اس کے اور اس کی اردگرد کی چیزوں کے درمیان قطعاً جدائی نہیں بلکہ وہ ترکیبیں کچھ موثر اور کچھ متاثر ہیں۔ ان ترکیبوں میں ہر کل کی گرفت میں ہے اور ہر کل اس سے مرکب ہے۔ جس طرح اجسام میں اعضاء مربوط ہوتے ہیں۔ ہولزم کا نام اسی نظریہ پر مبنی ہے۔ یہ ایک یونانی لفظ ہول سے بنا ہے جس کے معنی ہیں "کل" یا مجموعہ۔

لہٰذا ذرہ بھی ترکیب ہے اور عناصر اولیہ بھی ترکیب ہیں۔ کیمیاوی آمیزشیں بھی ترکیب ہیں۔ اسی طرح تمام جمادات، نباتات یا ذی حیات ترکیبیں ہیں فرق آپس میں صرف چند مخصوص صفات کی وجہ سے ہے۔

مثلاً حیات ایک صفت ہے جو ترکیبِ عضویہ سے تعلق رکھتی ہے اور عقل ایک صفت ہے جو ترکیب انسانی میں پائی جاتی ہے۔ جب ایک ترکیب میں ارتقاء ہوتا ہے تو اس میں ایک نئی خصوصیت پھوٹتی ہے جو اس کے متفرق اجزاء میں پہلے نہ تھی یا ان ترکیبوں میں پہلے نہ تھی جو وجود کے حقیقت میں قلیل ترین درجہ رکھتی ہیں۔

اسمٹھ کہتا ہے کہ کائنات کی فطرت یہ ہے کہ وہ کلیت، کمال اور برکت کی طرف بڑھنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور یقینی شکست انسان اور موجودات کے دیگر طبقوں کو ہی۔ وہ موجودات جو اس جدوجہد سے بچ کر اپنی تکلیف و عذاب کو کم کرنا چاہتے ہیں یہ خیر و صلاح کی راہ میں سکون سے بچ کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ یہ ترکیبی نزاع ہوتی ہے جو کائنات کی عمیق ترین منزل سے فوری کی طرف ... یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ ہم انتشار و تنزل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔ حق، جمال، خیر اور استقامت کی ارزو میں تمام اشیاء کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں۔ تاہم حیات یہ صفات زائل نہیں ہوتیں، واقعیت، ... روشنی میں کلیت، شفا اور قدس ...... کے تمام الفاظ اپنے مفہوم و حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں۔ یہ سب ... ارتقاء پذیر درجہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بتدریج کمال کی طرف مائل ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرے، ... کامل شکل وجود میں آئے گی۔ کلیات میں یہ ارتقاء و تکمیل وجودِ اعظم میں داخل ہے۔ اس کو سعی عام کہا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ سست رفتار سہی، لیکن اس کی انتہا کائنات کلی کے ہدف ہی کی طرف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ موجودات اپنے کائناتی وجود میں ترکیبِ کامل کی فطرت سے مدد ملتی ہے۔ پھر خود یہ کائنات اس ترکیب کی محتاج ہو جاتی ہے جس کی طرف رسائی ان موجودات میں تکامل اور تراکیب کے طریق سے ہوتی ہے۔

اسمٹھ پہلی جنگِ عظیم میں شریک ہوا ہے وہ اپنے ذہن و دماغ میں اسی نظریہ کو پختہ کرنے میں مشغول رہا۔ اس کو جنگ کے شعلوں نے اس کائناتِ کلی کے مطالعہ سے مایوس نہیں کیا۔ اس نے قوموں کے زوال و گردش پر اپنی اس تحقیق یعنی انسانیت کی ترکیبِ کلی کی نظری تحقیق کا آغاز بڑے پُرمسرت انداز میں کیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ کائناتِ کلی کے ارتقائی دور میں ایک قدم ہے۔ اس میں ترکیبوں کا تعلق و مقصد ایسا ہی ہے جیسے جسم واحد میں اعضاء باہم ایک دوسرے کے لیے مقصود ہوتے ہیں۔ اس میں ارتقاء یہ ہے کہ تنافر و ظلم سے اس کے اجزا بلند ہو جاتے ہیں اور باہم محبت و صفائی خاطر کا مرتبہ پا لیتے ہیں۔

انتہائی نظریہ میں یہ پہلو الحاد کو مستلزم نہیں اور نہ اس میں مادہ زمان و فضا سے اللہ کے انشقاق کا تصور پیدا ہوتا ہے بلکہ مراتبِ مادہ میں اعلیٰ صورتوں کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خاصۂ جدیدہ کہاں سے آتا ہے جب ترکیبات یا کامل مجموعوں میں ارتقاء ہوتا ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ یہ شاید اس کائنات کے علاوہ دوسرے جہان کی منقولات میں سے ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شاید منجانب اللہ ہے۔

اس انبثاقی نظریہ کے علاوہ بھی یورپین ممالک میں کچھ فلسفے وجود میں آئے۔ اس قسم کے فلاسفہ امریکہ اور یورپ میں تقریباً ایسی شہرت کے مالک ہوئے ہیں جو انبثاقی فلسفہ کے بانیوں کو حاصل ہوئی۔ ان فلاسفہ میں سر گروہ کی حیثیت ہوائیٹ ہیڈ (۱۸۶۱ء) کی ہوئی۔ یہ ریاضیات کا فلسفی ہے۔ اس کے نظریہ کو کیانِ عضوی، کے نام سے

پکارا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام کائنات اپنے اجزا کی ترکیب میں ایک زندہ ڈھانچہ کی طرح "کیانِ عضوی" ہے اور جس قدر کیانت عضوی اس میں پائے جاتے ہیں اتنی ہی زندہ جسمانی نفرت پائی جاتی ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ اعضا کی جامع ہے اور تمام عضوی معمولات و وظائف کی طرح باہم ایک دوسرے کے لیے معاون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام نظریات میں یہ نظریہ اس قابل ہے کہ اس کو "زندہ ڈھانچہ" کے دیگر نظریات کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ اگرچہ اس نظریہ کی بنیاد اتفاقی نظریہ پر نہیں ہے۔

ہوئیٹ ہیڈ کہتا ہے کہ کائنات اشیاء پر نہیں بلکہ حوادث پر مشتمل ہے ان حوادث میں سے ہر حادثہ علی الدوام جدت پذیر ہے۔ ... مثلاً اس نظام میں قدامتِ زمانہ ضرور موجود ہے۔ اس نظام میں کائنات کا کوئی بھی حادثہ علیحدہ صورت پر نہیں کیونکہ کائنات میں زمان و مکان تمام حوادث جال کے حلقوں کی طرح باہم پیوستہ ہیں۔

زمانہ کیا ہے؟

زمانہ خود بھی جدت پذیر ہے۔ اس کا وجود علیحدہ یا مستقل نہیں، نہ وہ ظرف کی حیثیت رکھتا ہے جو کائنات پر محیط ہو یا اسے اس سے مقدم یا متصل کہا جائے۔

مکان کیا ہے؟

جو حوادث مکان میں وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ حوادث سے علیحدہ نہیں بلکہ ان کی ایک صورت ہے جس سے ہم امتداد کا ادراک کرتے ہیں۔

تجدد پذیر حوادث کے اس واقعی سلسلہ میں کائنات "کلیاتِ ممکنہ" کے وجود کے سوا اور کسی وجود پر مشتمل نہیں۔ کیونکہ حادثہ ممکن ہے کہ مختلف صورتوں پر واقع ہو۔ لیکن جب وہ واقعہ ہوتا ہے تو اس کی صورت ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ مختلف صورتیں کلیاتِ ممکنہ ہیں اور ایک صورت حادثہ واقعیہ ہے۔ لیکن کلیاتِ ممکنہ کی وجود میں کوئی صفت نہیں، بجز اس کے کہ عالم حدوث میں وہ واقعہ کے رنگ میں نمودار ہو۔

ہوئیٹ ہیڈ کے خیال میں جو حادثہ ہمارے سامنے کسی شے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔وہ کامل الترکیب ایک عضوی عنصر ہے۔ چنانچہ ذرہ بذات خود ایک عضوی عنصر ہے کیونکہ اس کی شخصیت اس وقت مفقود ہوتی ہے جب اس کی ترکیب مختلف ہو، جیسا کہ حیوان کی بنیاد اس وقت خلل پذیر ہوتی ہے جب اس میں اعضاء کی قوت مختلف ہو۔

موجودات میں عقل اور جسم دو جداگانہ چیزیں نہیں۔ بلکہ وہ دونوں ہر موجود کے لیے لازم و ملزوم مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں اور ترکیب میں ارتقاء ہی وہ چیز ہے جو ایک موجود کو دوسرے موجود پر حیات و شعور کی صفتوں کے ساتھ ترجیح دیتاہے۔ یہ ارتقاء ایک نئی زندہ بنیاد کی تکوین ثابت ہوتا ہے۔ ہائیڈروجن کے کروڑوں ذرے کروڑوں ہی ملتی جلتی زندہ بنیادیں ہیں۔ لیکن جب یہ مختلف ذرے کروڑوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں اور ایک نئی بنیاد پر جمع ہو کر مکمل ہوتے ہیں تو اس وقت ایک بنیاد پر دوسری بنیاد کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ اس وقت عالم میں حیات کا نشوونما ہوتا ہے اور حیات کے تمام اجزاء مع کچھ زیادتی کے مساوی ہوتے ہیں۔ یہ زیادتی کا وجود حسابی مفہوم کے برخلاف ہے۔۔۔ اور یہ زیادتی ہی فکر و حیات کی نقش آرا ہوتی ہے۔

کل کے مجموعی اجزاء کیمیائے حیات میں جب مختلف ہوئے اور اس سے ایک جدید ترکیب کی تکمیل ہوئی تو اس میں ان اجزاء پر جو زیادتی ظاہر ہوئی وہ بحالت تفریق ان میں ملحوظ نہ تھی۔ لیکن یہ حالتِ ظہور ایک قسم کی حالتِ مستوری کے بعد ہے۔ اس کو وجود بعد العدم نہیں کہا جائے گا اور نہ یہ کہ یہ بغیر اساس کے ایک شئے کا ارتقاع ہے۔

حوادث میں ان کا مستقبل اور ماضی مستور ہوتا ہے، کیونکہ حادثہ اور ثبات ممکنہ میں توافق کی تجدید سے مستقبل پیدا نہیں ہوا، جب واقعی حادثہ اور کلی ممکن آپس میں متفق ہوئے تو یہ مستقبل کے لیے راستہ ہے جس سے وہ متجاوز نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ "کلیات" ممکنہ نہ ہوتیں تو جدید حادثہ اور حادثہ سابقہ کا بغیر کسی اختلاف کے تکرار ہوتا، اور یہ تکرار ایک فضول ذریعہ ہوتا جس کو زندہ کی فطرتوں سے توافق نہ ہوتا۔

یہ ہے ہوائیٹ کے نظریہ میں کائنات کی حقیقت ہوائیٹ اور اس کے ہم خیال جس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں اسے کائنات عضوی یا واقعہ حدیثہ کا مکتب فکر کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ فلسفی مذکور نے کائنات کا جو تخیل پیش کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا کیا مقام ہے۔ کیا اس میں اللہ تعالیٰ کو کوئی لازمی مقام ملا ہے؟ اس کا جواب اثباتی ہے۔ یعنی اس کو ایک مقام حاصل ہے، کیونکہ اس کے بغیر کائنات کی حقیقت ممکن نہیں۔

یہ کلیاتِ ممکنہ جس وقت ایک حادثہ واقعہ ثابت ہوتی ہیں تو کون طاقت ہے جو ان ممکنات میں اختیار و ترجیح کا مقام عطا کرتی ہے؟ ان متعدد کثرتوں میں ایک واقعہ کو کون ظہور عطا کرتا ہے؟

وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے؟

اس عضوی کائنات میں کون ہے جو مساوات رکھتے ہوئے ترکیب کامل سے ترتیب اکمل کی طرف ارتقا بخشتا ہے؟ جواب وہی ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اس عظیم عضوی کائنات میں اللہ تعالیٰ کا کام صرف مساوات و موازنہ ہے۔ ٹھیک اسی طریقہ پر جیسا کہ دماغ ایک زندہ بنیاد کی سرپرستی کرتا ہے اور عمل کرتا ہے، لیکن وہ کچھ چاہے حسب منشاء نہ ارادہ کر سکتا ہے اور نہ عمل کر سکتا ہے۔ بلکہ اس بنیادی نظام سے متعلق بسا اوقات اس میں ارادہ کے کچھ محرکات ظاہر ہوتے ہیں اور اسی پر عمل کے محرکات اور تدبیر و انتظام کے پُر سہولت اسباب مرتب ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم یورپین ممالک سے امریکہ کی طرف رخ کریں تو ہمارے سامنے دوسرے فلسفی مذاہب و افکار آتے ہیں۔ یہ افکار اگر ایک طرف برطانوی افکار سے ملتے جلتے ہیں تو دوسری جانب سے ان سے کچھ مختلف بھی ہیں۔

یعنی الوہیت مقیدہ کو تسلیم کرنے میں ان سے ملے ہوئے ہیں اور خدائے قادر و مختار کے وجود کے ہوتے ہوئے عالم میں شر و الم کے وجود پر حیران و ساکت نظر آتے ہیں۔ وہ بھی ان دونوں حالتوں میں کوئی تطبیق نہیں دے سکے۔ چنانچہ اس گتھی کو سلجھانے اور اس کی علت دریافت کرنے میں یہ امریکی مفکر برطانوی فلسفے سے جدا ہو جاتے ہیں۔

امریکی مذاہب و افکار میں شہرت یافتہ اور مختلف اسلوب فکر کے جامع ہونے کی حیثیت میں تین کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔

۱۔ فلسفہ ولیم جیمس (۱۸۴۲ء۔ ۱۹۱۰ء)

۲۔ فلسفہ جوسیا رولیس (۱۸۵۵ء۔ ۱۹۱۶ء)

۳۔ فلسفہ جارج سانٹیانا (۱۸۶۳ء۔ ۱۹۴۸ء)

ولیم جیمس ـــــ کے فلسفہ کو عربی میں مذہب ذرائع کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ولیم جیمس کی رائے میں حقیقت نتائج کے لیے ہر شئے میں اس کی صحت کا معیار واقعہ ہے۔ چنانچہ علمی مسائل میں صحت کا معیار تطبیق و نتائج کا تکرار ہے۔ اخلاق و آداب میں صحت کا معیار کثرتِ مطابقت اور ایک بڑے گروہ انسانی کے نفع عام کا تکرار ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم ان مسائل الٰہیہ پر ایمان لائیں جو علمی تجربوں یا منطقی براہین سے ثابت نہیں ہوتے کیونکہ ایمان ہی ہمارے ضمیر کے لیے راحت رساں ہے اور ہمارے اشواق و میلانات کا ہم آہنگ ہے۔ کائنات میں ترکیبی وفاق کو ہم اپنی اندرونی فطرت کا تقاضا محسوس کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ جو خود فطرت ہی سے امداد کا طالب ہو رہا ہے۔ کائناتی حقیقت سے خالی ہرگز نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جو حقیقت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس کو صرف تاثراتی اعتبار سے ہی قبول نہیں کرتے بلکہ اس پر احساس و تعقل کی قسم سے کوئی دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔ کوئی روحانی حقیقت ایسی نہیں جو اس تاثر سے زیادہ محتاج ہو۔ یہی تاثر ہے جس کے ساتھ ہمارے اور کائناتی حقائق کے درمیان استدلالی تعلق قائم ہوتا ہے، ولیم جیمس نے علماء و محققین کی ایک جماعت کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایمان ایک اخلاقی شجاعت کا مطالبہ کرتا ہے جس کے سامنے تمہیں اپنی عقول و ضمائر کو حسن عقیدت کا عادی بنانا ہوگا۔ وہ اپنی تقریر کی ابتداء میں ان سے یہ کہہ چکا تھا کہ اگر اسے عام فوجی جماعت کے سامنے عقائد پر گفتگو کا موقعہ ملے تو وہ انہیں نصیحت کرے کہ ایمان کے باب میں تنقید اور قطعی دلائل کو قبول کرنے کے لیے بہادر بن جاؤ۔ کیونکہ عقاید میں ان کو فکری حریت کی بہت ضرورت ہے اور اگر وہ علماء و فلاسفہ کو اپنا مخاطب بنائے تو ضرور ان سے یہ بات کہے کہ میرے خیال میں تم ایک ایسی شجاعت کے محتاج ہو جو اعتقاد کے بوجھ کی متحمل ہو سکے۔ اگرچہ علمی تجربے اور منطقی دلائل اس کی تائید نہ کریں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ لوگ صحیح عقاید کو قبول کرنے میں ناکامی کا منہ اس لیے دیکھتے ہیں کہ اس کے پس منظر میں وہ کسی تجربہ یا دلیل کا سامنا کرنے میں بڑے بزدل واقع ہوئے ہیں۔

وجود اللہ کے بارے میں ولیم جیمس نے جن دلائل کا سہارا لیا ہے۔ ان کی رُو سے معبود ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں یا ایک ہی معبود ہو تو زیادہ سے زیادہ اس کا مقام یہ ہے کہ وہ انسان کے مقابلہ میں بڑا ہے اور دیگر موجودات کی نسبت سے انسان کی زیادہ مدد کرنے پر قادر ہے۔ چنانچہ وہ مسلمات دینی پر کلام کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "میرے خیال میں یہ تمام دینی افکار اور عملی مقاصد کے تقاضے اس اعتقاد سے پورے ہو جاتے ہیں کہ انسان کے مقابلہ میں ایک بڑی قوت کو مان لیا جائے جو انسان کو مدد دیتی اور اس پر عنایت فرما ہوتی ہے۔ ہمارے تمام مطالعہ اور دلائل کا حاصل یہ ہے کہ ایک ایسی قوت ہونی چاہیئے جو ہمارے اپنے نفوس کے علاوہ ہو۔ اس سے زیادہ بڑی

زیادہ وسیع اور زیادہ طاقت ور، بس اس طرح کی قوت کافی ہے بشرطیکہ وہ جملہ امور میں کافی ہو اور ہر قدم پر اس پر اعتماد کیا جا سکے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غیر متناہی طاقت ہے یا ایک ہے۔ بس تصور کا مقام صرف اس قدر ہونا کافی ہے کہ وہ نفس اکبر و اقدس ہے۔ انسانی وجود اس کبریائی اور تقدس کی تمثیل ناقص کرتا ہے۔ ورنہ تمام کائنات ان مقدس اور اکبر نفوس کا مجموعہ ہے کہ یہ نفوس اپنے درجات کے مطابق کسی مشترک حقیقت کے جامع ہوں۔ کیونکہ ان کے درمیان کوئی حقیقت مشترک نہیں ہوتی۔ یہاں ہم رہے ... خدا کے تعدد کا مسئلہ اٹھتا ہے۔ لیکن میں اس کی یہاں کوئی مدافعت نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس مقام پر میں صرف حدود صحیح کے اندر رہ کر دینی تجربہ کے اقرار پر اپنے مقصد کو ختم کرتا ہوں"۔

جیمس کی رائے میں اعتقاد کا مسئلہ قسمت آزمائی کی سی صورت رکھتا ہے۔ اس قسمت آزمائی کو معری کے دو شعر بہترین طور سے ادا کرتے ہیں

قال النجم والطبیب کلاهما لا بعث بعد الموت، قلت الیکما

"نجومی اور طبیب دونوں کہتے ہیں کہ موت کے بعد زندگی نہیں، میں نے کہا دور ہو جاؤ"۔

ان صح قولکما فلست بنادم او صح قولی فالخسار علیکما

"اگر تمہاری بات صحیح نکلی تو مجھے کوئی ندامت نہ ہوگی اور اگر میرا قول صحیح ثابت ہوا تو تمہارے لیے ناکامی ہی ناکامی ہے"۔

اور رہ گئے جوسیا رائس، تو ان کا نظریہ مذاہب جدیدہ میں "وحدۃ الوجود" کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ جوسیا کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایک ذات ہے جو موجودات کی ہر ذات میں شامل ہے۔

وہ کہتا ہے کہ کائنات اعظم کے حقائق و علوم کے ذریعہ ہمیں مادہ کی حقیقت و حرکت کا صحیح علم حاصل ہوتا ہے ورنہ زمان و مکان کی حقیقت کو ہم زیادہ سے زیادہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ہم یعنی ہماری ذات کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس اپنی نفسی معرفت کے ذریعہ ذاتِ عظمیٰ (اللہ) کی معرفت میں مدد لینی چاہیے۔

ذاتِ انسانی کیا ہے؟ یہ مستقل باوجود شخصیت جس کا نام ہم "اپنا نفس" رکھتے ہیں اور اس سے تمام ماحول میں امتیاز کرتے ہیں کیا ہے؟

اگر کوئی ایسی دنیا فرض کی جائے جہاں صرف ہم ہوں نہ وہاں کوئی جاندار ہو، نہ جماد نہ زمین و آسمان اور کوئی ایسی چیز بھی نہ ہو جو شعور میں داخل ہو سکے یا اس سے متعلق ہو سکے۔ کیا اس وقت ہمارے اندر کوئی شعور ہوگا؟ کیا ایسی دنیا میں ہم اپنے کو نفس یا ذات کہہ سکیں گے؟ کیا تم اس وقت کسی چیز کا تصور کر سکو گے جب کہ وہاں تصور کے لیے کوئی چیز بھی نہیں ہے یا کیا تم اپنے لیے ذات قرار دو گے۔ حالانکہ وہاں اس ذات کے برخلاف کوئی چیز بھی نہیں ہے؟

روئس کہتا ہے۔ ہرگز نہیں، ذات اس وقت تک ذات ہے جب کہ ذات کے علاوہ بھی کچھ ہو، گویا ذات کا وجود اس وقت تک ہے جب کہ غیر ذات کا بھی وجود ہو، اس لیے کہنا چاہیے کہ ذات اشیاء کے بغیر خود مستقل

بالوجود نہیں اور اشیاء ذات کے بغیر مستقل بالوجود ہیں۔

ہم جو کچھ دیکھتے یا یاد کرتے ہیں اس کا ماحصل یہ ہے کہ ہم نے اس چیز کو دیکھا یا تصور کیا کہ وہ موجود ہے یا موجود ہو گی۔ بس یہی ہماری ذات کی حقیقت ہے۔ ہمارے تصور یا شعور کی پہنچ بس اسی قدر ہے اور موجودات سے انسان جس قدر متصل ہوتا ہے۔ اسی قدر اس کے تصور کی قوت، شعور کی وسعت اور اپنی ذات کی عظمت مفہوم ہوتی ہے۔ بند کائنات کے ساتھ اتصال یا تعلق مع اللہ تعالیٰ..... ہی ذات کی سب سے بڑی تحقیق اور اقرار وجود کی ثبوت دلیل ہے۔

ذات مطلقہ... اللہ تعالیٰ۔ ہی وہ ذات ہے جو ہر چیز سے متصل، ہر شئے پر محیط اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ یہ ذات کلی وجدانی ہے، کیونکہ وہ تمام موجودات پر نگراں ہے۔ اس کی ذات کی حقیقت ہی یہ اتصال شعور انسانی ہے جو تمام ماسوا پر محیط ہے لیکن یہ اتصال ہمہ گیر، دُوررس اور دوام و خلود سے قریب تر ہے۔

یہ دینی احساس اپنی مضبوطی میں ایک فطری عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ ایک ایثار کا تصور لیے ہوئے ہے جس میں اغیار سے تعلق ایک وسیع زندگی کا معیار ہے یا بالفاظ دیگر ذات مستفیض وجود کامل اور روایات ماثورہ کی حامل ہے۔ حاصل یہ کہ جو دوسری ذوات میں فنا ہو گیا وہی حقیقۃً موجود ہے اور جو شخص فنا فی اللہ ہو گیا وہ عظیم ترین وجود کا مالک ہے۔

اور اب جارج سانتیانا جس کے فلسفی ہونے کا تصور عوام میں محدود قسم کا ہے۔ کیونکہ وہ سوائے امریکہ اور سوائے اس صدی کے آخری دور کے فلسفی نہیں سمجھا گیا۔ امریکہ میں ولیم جیمس حقیقتِ فکری کی تمثیل کرتا ہے اور جو سیاردیس فکر مثالی کی تمثیل کرتا ہے۔ ان دونوں مفکروں کے بعد اس مفکر کے لیے میدان خالی رہ جاتا ہے جو واقعیت شعبہ کی تمثیل پیش کرے جیسا کہ ہر دور اور ہر جگہ کے جمہور یہی تصور کرتے چلے آئے ہیں۔

سانتیانا ان دونوں فلسفیوں کا ایک دوسری حیثیت سے تکملہ سمجھا جاتا ہے جس کا تعلق اس جنس سے ہے جس کی طرف یہ تصور قدم بڑھا رہا ہے۔ ولیم جیمس امریکہ کی ایک عظیم شخصیت ہوا ہے اور رویس موجودہ دور کا برطانوی مفکر ہے لیکن سانتیانا اسپینی ہے۔ اس کی پیدائش میڈرڈ میں ہوئی اور جزیرہ فلپائن میں اس کی زندگی گذری۔ لندن میں رہ کر اس نے علمی دامن وسیع کیا، پھر آخرکار کچھ تارکین کے ہمراہ امریکہ کی قومیت قبول کی۔ اس لحاظ سے یہ تینوں مختلف زاویہ نگاہ سے امریکی تہذیب و خیال کے علمبردار ہیں۔

بہرحال سانتیانا بجز امریکہ کے اور کہیں بھی فلسفی نہیں سمجھا گیا۔ شمالی امریکہ کے باشندوں نے اپنا مکتب علیحدہ ہی قائم کر رکھا ہے جو مطالبِ حیات میں دیگر تمام اغراضِ حیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ان کا فلسفہ علم اور تاریخ سب کچھ جداگانہ ہے۔ یہاں گروہی فیلسوف اور گروہی فلسفہ ہے۔ جس طرح کھلاڑی اور کھیل کے انداز یا صحیفے اور صحافی جداگانہ ہیں۔

اس لیے بلاشبہ سانتیانا ایک گروہی فلاسفر ہے، اس کا فلسفہ ایک ایسے گروہی خیال کا آئینہ دار ہے جو اس کے ہم گروہ مفکرین کا ترجمان ہے۔

فلسفہ اور عقیدہ دونوں کے مسائل میں فیصلہ احساس کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے یعنی جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہی حق، قابل یقین اور دنیوی زندگی میں بھروسا کے قابل ہے۔ گویا ہمارے لیے "حیوانی عقیدہ" کافی ہے جو ہمارے حس اور شعور کو ازخود حاصل شدہ نتائج سے پُر کر دے۔ حالانکہ یہ بالکل ضروری نہیں کہ دینی عقیدہ کے لیے ریسرچ کی ضرورت اسی دائرہ میں محسوس کی جائے جس دائرہ کو ہم علمی تجربوں کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور نہ عقل و معرفت کی راہ میں طبعی شعور کا انکار ضروری ہے۔ کیونکہ عقل طبعی شعور کو منظم کرتی ہے۔ نہ یہ کہ اس کے مناقض ہے۔ یہ ہے حاصل طبعیاتی عقاید کا ـــ جنہیں روحانیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام شاعرانہ تخیل ہے۔ ہم اس کو ایسے ہی قبول کریں گے جس طرح ایک اچھے شعر یا خوبصورت فوٹو پر تھوڑی دیر کے لیے دلچسپی کی نگاہ ڈال لیتے ہیں۔ بڑی تنگدلی ہوگی اگر ہم ان روحانیات کے بارے میں تعصب کریں یا ان کی تغلیط پر اصرار کریں کیونکہ اگر یہ کوئی علمی یا قیمتی فلسفہ نہیں تو اس میں شک نہیں کہ ایک قیمتی یا شعوری فن کاری ضروری ہے۔ بہر حال نظریات کی صف میں اس کو بھی جگہ لینے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ آخر یہ بھی تو اس احساس کی ایک آواز ہے کہ جو اس تخیل میں کارفرما ہے۔ اس ذوق کا ایک اظہار ہے جو اس کی موافقت کر رہا ہے یا ایک آرزو ہے جو اسے پسند کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

یہ مادہ جس کی صحت پر فلاسفہ کو اس قدر اختلاف ہے، ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے؟ اور یہ بھی ہمارے لیے کچھ مضر نہیں کہ اس مسئلہ کو علماء پر انحصار رکھیں کہ وہ ہمیں اس کی حقیقت سے روشناس کرائیں اور اس کی باریکیوں میں پہنچ کر اس کے اجزاء و اصول سے بحث کریں۔ لیکن اتنا ضرور ہمیں بھی حق پہنچتا ہے کہ اس کی تھوڑی بہت حقیقت جانتے ہوئے ہم اسے مادہ کے نام سے یاد کریں۔ جس طرح تم اپنے دوست کو سمتھ یا جارج وغیرہ ناموں سے پکارتے ہو اور ساتھ ہی ان ناموں کے مفہوم یا مراد سے تمہیں قطعاً کوئی غرض نہیں ہوتی۔

سانتیانا کو کائنات کے نظام و ترتیب سے انکار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات میں بے شک نظم و ترتیب موجود ہے۔ کیونکہ ہم اس کائنات میں موجود ہیں اور ہماری عقل اس میں نظام کو تسلیم کرتی ہے۔ ہمارا تصور ہر اس کائنات کے بارے میں یہی ہو گا جس میں ہم موجود ہوں گے، اور ہماری عقل و حیات اس سے شعوری طور پر مستفید ہو گی، کیونکہ ہم اس کائنات سے باہر ہو کر اس کے علاوہ اور چیزوں سے مستفید ہی نہیں ہو سکتے۔ لیکن بایں ہمہ دنیا کی ہر منظم حرکت کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو کیا عقلی یا ادبی کسی حیثیت سے بھی کوئی روحانی تقاضا ہمیں ملتا ہے؟ سانتیانا یہ سوال پوچھتا ہے۔ پھر خود ہی جواب دیتا ہے ہرگز نہیں! بلکہ دنیوی نظام سراسر مادی فلسفہ سے پُر ہے۔ جس کا ہم حیوانی عقیدہ سے استقبال کرتے ہیں اور مختلف غلطیوں اور تخیلات کے ذریعہ اس کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی چیز جو اس سے سمجھ میں آتی وہ یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی ـــ بشرطیکہ موجود بھی ہو ـــ کا منشا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ ہم اس صورت کے علاوہ اور کسی صورت سے حقیقت کو معلوم کر سکیں۔

اس کے بعد واضح ہونا چاہیئے کہ یہ برطانوی اور امریکی دورِحاضرہ کے مکاتبِ فکر کا کچھ مختصر خلاصہ ہے۔ شاید ہم اس تلخیص کو چنداں اہمیت بھی نہ دیتے کیونکہ یہ نہ کوئی اہم مکاتبِ فکر ہیں اور نہ فلسفہ کے میدان میں ان کا کوئی وزن ہی ہے، لیکن ہم نے اس خیال سے یہ مختصر تبصرہ پیش کر دیا ہے تاکہ ہم اپنی کتاب میں مختلف

ستوں کے غائب افکار کو جمع کر سکیں۔ ناظرین محسوس کریں گے کہ یہ فکر دو سمتوں میں جا رہا ہے۔

اول یہ کہ دورِ حاضر کے فلاسفہ دو چیزوں یعنی قدرتِ خداوندی کی وسعت اور مخلوق کے اندر شر و الم کے وجود میں تطبیق دینے میں بے بس رہ گئے۔

دوسرے یہ کہ اس مشکل مسئلہ کا حل انہوں نے یہ دریافت کیا کہ قانونِ فطرت کو عام اور طاقت ور ٹھہرا لیا اور حقیقتِ الٰہیہ کو انہوں نے اس کے ضمن میں جگہ دے دی۔

دنیا میں شر و الم کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تمام ادیان، فلسفے اور انسانی قوانین شرور کے ناجائز ہونے، اہل شر و قابل سزا ٹھہرانے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں یک زبان متفق ہیں۔ لیکن قدرتِ خداوندی پر اعتقاد رکھتے ہوئے اس عالم کو سمجھنا جب کہ ایک دشوار مسئلہ بن جائے تو ــــ ایک فلاسفر کا فرض ہے ــــ کہ وہ ہمارے سامنے عقل کی روشنی میں دلائل و براہین کے ساتھ میں اس گتھی کو سلجھائے۔

بد قسمتی سے ان فلاسفہ میں سے ایک بھی فلسفی نے اپنا یہ فرض ادا نہیں کیا ــــ عقلِ انسانی سے قریب ہو کر اگر انہوں نے کوئی حل پیش بھی کیا تو وہ ایسا بے جان ثابت ہوا کہ نہ اسے برہان کے درجہ میں قبول کیا جا سکتا ہے نہ اعتقاد کے اور نہ ظن و تخمین کے۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسانوں کے گروہ جو عذاب و بلا کا سامنا کرتے ہیں ہم اس میں حکمتِ الٰہیہ پر احاطہ کر سکتے ہیں۔ لیکن غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ عالم کی کوئی صورت تو سمجھ میں آئی۔ جو حکمتِ الٰہیہ پر احاطہ کے مقابلہ میں کسی درجہ میں تو عقل سے قریب تر ہو۔ مگر فلاسفہ نے جو کچھ حل سوچے ہمارا مطالعہ یہی ہے کہ وہ بجائے خود اشکال در اشکال ہیں۔

ایسی گومگو کی حالت میں انہوں نے کیسے سمجھا کہ خداوند تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؟

دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ وہ موجود ہے مگر علی الاطلاق خالق نہیں۔

اور دوسرے یہ کہ وہ موجود ہے اور تخلیقِ کامل کے وصف سے بھی موصوف ہے۔ ہر قسم کے نقص سے منزہ، غیر مولود اور دائم الحیات ہے اور کسی قسم کی شہوت نہیں رکھتا۔ اگر پہلی صورت ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ مگر اس میں وصفِ تخلیق علی الاطلاق نہیں ہے تو یہ نظریہ غلط ہو گا۔ کیونکہ اس صورت میں نہ اسکا وصفِ قدرت رہتا ہے نہ صفتِ رحمت قائم رہتی ہے۔

یا وہ خالقِ کامل ہے۔ مگر اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ بجز اس کے کہ یہ فلاسفہ اس سے مطالبہ کریں کہ وہ ایک دوسرا اپنے جیسا پیدا کرے جو کمالِ سرمدیت اور استغنا میں بالکل اسی جیسا ہو، عقلِ انسانی کے تمام مفروضے اس فرضِ محال سے قریب تر ہیں۔

مگر یہ بات کچھ معقول نہیں کہ وہ مخلوق کامل ہو نہ اسے کوئی شکایت ہو نہ الم اور نہ اس میں تحول و تبدل ہو مگر یہ کہ وہ ایک دوسرا خدا ہو۔ جو اسی کی طرح ہر چیز پر قادر ہو۔ کیونکہ اگر ہم ہزار یا کروڑ یا اس سے زیادہ تعداد میں انسانوں کا تخیل کریں جو تمام کے تمام قدرتِ الٰہی رکھتے ہوں تو اس تخیل کو صحیح نہیں کہا جا سکتا ہے اور نہ یہ ہمارے مشاہدہ کے مطابق ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا کیوں ان لوگوں کو حیاتِ دوام کے ساتھ مخصوص کرتا ہے اور کس بنا پر ان کو دوسروں پر ترجیح دیتا ہے؟ کیا یہ انصاف کے قرین ہے؟ اور جب کہ وہ دائمی و سرمدی

تھے تو پھر کیسے مخلوق ہے۔

حاصل یہ کہ مذکورہ دونوں مفروضوں میں عقل مطمئن نہیں ہوتی۔ نہ اس تصور سے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہو مگر نہ وہ خالق کثیر ہو، نہ خالق قلیل، نہ خالق سعید اور نہ خالق شقی۔۔۔ اسی طرح عقل اس تصور سے بھی مطمئن نہیں ہوتی کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ایک دوسرا خدا اپنا ہی جیسا پیدا کر دیتا ہے اور اس مخلوق اور اس خالق میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ان دونوں مفروضوں کے بعد عقل کے لیے باقی رہ ہی کیا گیا۔ عالم کی کون سی صورت ہے کہ جسے ہم موجودہ صورت کانعم البدل قرار دیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا خالق محدود بھی ہو اور اس محدود ہونے کو نقص، الم اور حرمان کا مظہر بھی نہ سمجھا جائے؟

یہ وہ صورت ہے جو اللہ تعالیٰ کے عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قدیر ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ قبول ہو سکتی ہے اور یہ صورت ایسی نہیں ہے جو اس کے وجود کے منافی ہو اور عقل و اعتقاد پر بار ثابت ہو۔

یا یہ کہ وہ معبود ہے اور کچھ نہیں۔

یا وہ معبود ہے، خالق ہے اور اس کے علاوہ ایک دوسرا مخلوق خدا بھی ہے۔ ان دونوں خداؤں میں کوئی فرق نہیں۔ دنیا کیا ہے؟ اس کے جواب میں اس کو صرف اپنے مشاہدہ پر محدود رکھا جائے۔ آخرت سے ہم ناواقف ہیں یا بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ ہم اس سرمدی آخرت کو اپنے مشاہدۂ دنیوی کی بنیاد پر قیاس کر کے دریافت نہیں کر سکتے۔

حقیقت میں یہ نظریات ترتیب الفہم سہی مگر انسانی عقل کے لیے انہیں حلق سے نیچے اتار لینا آسان نہیں، جب تک فکری و اجتماعی زندگی کے تجربات کی تائید نہ ہو۔

ایک باپ اپنے بیٹے سے کم از کم ۱۹ یا ۲۰ سال بڑا ہوتا ہے۔ اس معمولی فرق کی وجہ سے باپ کی حیثیت مربّی کی سی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں باپ یہ نہیں سوچتا کہ وہ بچے کے حق میں بڑا سخت گیر اور جابر ہے۔ نہ لوگ ہی اسے ظالم سمجھتے ہیں۔ عمر میں اس قلیل فرق کی بدولت باپ کو شعور کا اعلیٰ مقام دے دیا جاتا ہے۔ بیٹا جب خود بڑا ہو جاتا ہے تو اسے باپ پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس سخت گیری کو حق بجانب قرار دیتا ہے جبکہ اس وقت اس کے دل میں رنج اور آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں۔

ایک انسان دوسرے انسان سے محبت کرتا ہے۔ اس کی محبت میں الم و عذاب اٹھاتا ہے اور پھر اس تکلیف و مشقت کو اپنی قلبی راحت قرار دیتا ہے۔ اور اس کو وفا و ایثار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ محبتِ الٰہی میں یہ سوز و گداز کہیں زیادہ ترقی کر جاتا ہے کیونکہ ذات باری کا حق یہ ہے کہ اس کی عارفوں کے دل میں ایسی زبردست محبت ہو جو کسی بھی فانی و محدود شئے کی محبت سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہماری یہ محبت خداتعالیٰ سے اس لیے ہوتی ہے کہ ہم اس کی صفات کے ساتھ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

ہم کسی پائیدار و خوب صورت تختہ کو کسی جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کی خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک پتھر یا مٹی کا ایک ڈھیلا نظر آنے لگتا ہے۔ اگر نوع انسان کو زیادہ سے زیادہ طویل زندگی ایک خاص دل لبھانے والے قطعہ زمین پر عطا کی جائے تو یہ قطعہ بھی ایک دن ویران ہو جائے گا کیونکہ

لامحدود زمانہ و مکان میں اس کمزور قطعہ کو جگہ ملی ہے، لہٰذا سوچنا چاہیے کہ ہم ابدی جمال آرائی کو اپنے موجودہ اور وقتی منظر پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں؟ ازل و ابد کے غیر محدود سلسلہ کو ایک گزرتے ہوئے لمحہ میں کیسے قابو کر سکتے ہیں اور وہ جس تک رسائی سے عقلیں عاجز ہوں، ہمارے حواس میں کیونکر سما سکتی ہے؟

ابد کی سب سے وسعت میں دنیا کے وجود کو کوندتی ہوئی بجلی کا سا وقت ملا ہے۔ جو آنے والی زندگی اور یہ کہ اس کے بعد کیا ہوگا، اس سوال کے جواب میں بہترین دلیل ہے۔ ہماری اس محدود زندگی میں ہمیں ایک یقین ملتا ہے اور وہ یہ کہ زندوں کے دکھ سکھ کا یہ نظام اتفاقی اور بے فائدہ وجود میں نہیں آتا۔ بلکہ یہ ان کے لیے ارتقاء و انتفاع کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر نہ زندگی میں کوئی معیار رہتا ہے اور نہ دلچسپی۔

یہ خواہش ہماری عقلوں کے لیے خدائے قادر کے تسلیم کرنے میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوتے کیونکہ ہمیں دوسری کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی جو اس سے بہتر معلوم ہو اور ہم اسے اختیار کر لیں۔ اس صورت کے اختیار کرنے سے تمام تناقض بھی دور ہو جاتے ہیں مثلاً خداوندتعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے مگر کسی شئے کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کا کوئی مثیل و نظیر نہیں مگر اس نے ایک دوسرے خدا کی تخلیق کی جو بالکل اسی کے مشابہ ہے۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ عالم میں شر کیوں ہے؟ یہ سوال بہرحال اٹھتا ہے خواہ تخلیق عالم کا مسئلہ کسی صورت سے بھی طے کیا جائے یہ کہنا کہ کائنات کو ایک الٰہ قادر نے تخلیق کیا ہے اور ایک ایسی حکمت اس نظام کو گردش دے رہی ہے جو عقل سے ماوراء ہے۔ یہ نظریۂ الٰہ قبول و پسند سے زیادہ قریب ہے۔ اس خدا سے جو اندھے مادے سے وجود میں آیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ زمانوں کی لگاتار گردش کے بہت بعد یہ دیوتا کیوں کر وجود میں آئے؟ کیا کوئی بالاتر قوت تھی جس نے اللہ کو پیدا کیا اور اس کے ماتحت اور دیوتاؤں کو وجود بخشا۔

ان خداؤں کا وجود کسی قطعی منطقی دلیل یا علمی تجربہ کی روشنی میں ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کے تسلیم کرنا کوئی ایمانی تقاضا ہے۔ کیونکہ یہ ایمان کے مزاج سے موافقت نہیں رکھتے۔

یہ تمام تر تخمینی فیصلہ ہے جس کے لیے خیال وجوہ و قرائن کی تلاش کرتا ہے اور پختہ دلائل ڈھونڈتا ہے مگر کسی حال میں بھی اسے استقرار نصیب نہیں ہوتا۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس کائناتِ غیر محدود کے ارتقاء کو سمجھیں۔ لیکن بہزار دقت نہیں سمجھ پاتے اور نہ اسے کسی مفہوم کے قریب لا سکتے ہیں۔ کیونکہ غیر محدود کائنات کسی معین زمانہ سے آغاز پذیر ہے ہی نہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ وہ اپنے ارتقائی عمل کو فلاں زمانہ سے شروع کرتی ہے۔ اس کی ارتقائی صلاحیتیں ہمیشہ سے ہیں۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارتقائی عمل فلاں دور ارتقاء میں مکمل ہوا۔ نہ اس کا کوئی خطِ مستقیم ہے، جس کا زمانی یا مکانی طور پر کوئی نقطۂ آغاز فرض کیا جا سکے۔ حاصل یہ کہ ہر ارتقاء محتاجِ تصدیق ہے۔ لیکن کوئی دین بھی اس ارتقاء کے زمانی تعین کی احتیاج محسوس نہیں کرتا۔

اور آگے بڑھیئے۔ اس مدی کائنات میں ارتقاء کا مفہوم سمجھنے کے لیے اور کوئی صورت نہیں بجز اس کے کہ اس کا تقابل ذی حیات مخلوق سے کیا جائے۔ پھر کسی مخصوص حادثہ یا واقعہ کا کھوج نکالا جائے جو اس سے کچھ

زمانہ پیشتر وقوع پذیر ہوا ہو۔

اس طرح یہ سوال ہے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج کی شکل پانی کیوں ہے؟ آیا صرف اس لیے کہ پانی زندوں کی زندگی کو برقرار رکھتا ہے یا اس کا کوئی جمالیاتی پہلو ہے۔

اسی طرح سونگھے جانے والی، دکھائی دینے والی اور سنے جانے والی اشیاء، ان خاص حجم و شکل رکھنے والی چیزوں کے مقابلہ میں ارتقاء پذیر کیوں ہیں جن میں نہ کوئی بو ہے، نہ رنگ اور نہ آواز؟ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ حیات ہی تمام موجودات میں ارتقاء کا معیار ہو اور کسی معین زمانہ کے لحاظ سے ان کے ظہور میں تقدم فرض کیا جائے۔

اور گھومنے والے کواکب فضا میں بے نور تیرنے والے کروں کے مقابلہ میں کیوں زیادہ جمال رکھتے ہیں؟ ان میں جمال کا ارتقاء بجز اس کے متصور نہیں کہ وہ اپنے ادوار میں کسی زندوں معیشت کو درست رکھنے والے ہیں اور اس کی نگاہ کے لیے دلفریب ہیں۔

بلکہ ہم پوچھتے ہیں کہ کروں کا بے نوری کیفیت سے تبدیل ہو کر کواکب میں ڈھل جانا ارتقاء کیوں ہے؟ مادہ کی ایک معلوم رفتار ہمارے سامنے ہے کہ وہ فنا پذیر ہے پرانا ہوتا ہے پھر برباد ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی حرارت ختم ہو جاتی ہے۔ طاقت متفرق ہو جاتی ہے اور مادہ جمود کی طرف حرکت کرتا ہے۔ اگر یہی حالت قوت بندی اور ظہور حیات کے لیے مقدمہ ہے تو یہ علامت قصد و تدبیر کی سمجھنی چاہیے نہ کہ اس قانون عام کی جس کی فطرت ہر ذرہ میں نادانی و نابینائی کا مظہر ہے۔

ارتقائی فلاسفہ جس چیز کو ثابت کرنے میں اپنا پورا زور صرف کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ عقل حیات کے مقابلہ میں ارتقاء ہے اور یہ کہ عالم ارتقاء کی راہ میں قطعاً مستقیم ہے۔

سوال یہ ہے کہ عقل کا محدود حصہ کائنات کو کیونکر نصیب ہوا، اور غیر محدود مادہ سے قدامت کے دور کے بعد عقل کا محدود حصہ کیوں وجود میں آیا؟

یہ "فلاسفہ" اکثر دین پرستوں پر یہ طنز کرتے رہے ہیں کہ اپنے انسانی تصورات میں کھو کر حقیقتِ الٰہی اور حقیقتِ وجود گھڑتے ہیں اور خدا کو خالق تصور کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح انسان بعض مصنوعات کی تخلیق کرتا ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ "ذہنی افتاد" خود انہیں فلاسفہ پر عائد ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ اس سے گریز کرتے ہیں۔۔۔ کیونکہ ان کا کائنات سے متعلق تصور ایسا ہی ہے جس طرح انسان مراحلِ حیات کے بارے میں تصور کرتا ہے۔ وہ اسے ایک بچہ قرار دیتے ہیں جو بڑا ہوتا ہے جوان ہوتا ہے، پھر ایک پورا مرد ہوتا ہوا سن کہولت کو پہنچتا ہے۔ جسم و عمر میں روز بروز اور سال بسال ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ تصور کرتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے اسے ایک غیر محدود کائنات تصور کیا ہے جس کی نہ تو مدت معلوم ہے اور نہ وسعت، ایسی صورت میں اس کے نمود و ارتقاء کو جانداروں کے نمود و ارتقاء پر قیاس کرنے کے کیا معنی، جو ایک مدت میں محدود ہیں۔ آخر یہ کائنات کہاں تک ترقی کرے گی، حالانکہ نہ اس کی انتہا ہے نہ ابتدا؟ اور اس غیر مختتم زمانہ میں جب وہ عقل کی

مدت کو پہنچتی ہے تو کیا اس وقت بھی وہ مادہ ہی کے احکام کی پابند رہتی ہے۔ گویا عقل و شعور ہمیشہ طفولیت کے دور میں رہتے ہیں جیسے وہ ایک بچہ ہے جو لڑکھڑاتا رہتا ہے؟ یا پھر وہ ہر چیز پر بذات خود قدرت حاصل کر لیتا ہے جبکہ عقل ہر چیز پر قادر بھی ہو جاتی ہے، مگر اس کی یہ قدرت کسی چیز پر بھی نافذ نہیں ہوتی وہ اپنے سامنے بجز اس کے کوئی عمل نہیں رکھتی کہ ماضی کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہے جس طرح کوئی عاجز دیکھتا ہے۔ لہٰذا عقل الٰہی عبث ٹھیرے گی کیونکہ کائنات اس سے مستغنی ہے۔

موجودہ فرانس کے فلاسفہ کی حالت بھی برطانوی اور امریکی فلاسفہ کی سی سمجھنی چاہیئے کچھ تھوڑا بہت حقیقت میں فرق سہی، لیکن سمت میں کوئی اختلاف نہیں۔

دورِ حاضر کا سب سے بڑا فرانسیسی فلسفی ہنری برگسان ہے۔ بلکہ غالباً وہ برطانوی اور امریکی فلاسفہ میں سب سے پہلا فلسفی ہے جس نے فلسفہ الٰہیات میں ارتقائی فلسفہ کی آواز اٹھائی، لیکن وہ ان سے دو جوہری افکار میں اختلاف رکھتا ہے، یعنی زمان و مکان میں تفریق اور مادہ و روح میں جدائی کا تصور۔

کیونکہ ان کے یہاں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں زمان و مکان میں وحدت ہے کوئی انفصال نہیں اور روح، مادہ کے خواص میں سے ایک خاصہ یا اس کے اندرونی ارتقائی انقلابات میں سے ایک ارتقاء ہے۔

لیکن برگساں کے نزدیک زماں و مکان دو جداگانہ شئے ہیں، اسی طرح روح مادہ سے مغائر شئے ہے بلکہ وہ آپس میں متضاد و متناقض ہیں۔ اس کی رائے میں حیات عنصر مکان کی نسبت عنصر زمان سے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ حیات ایک حرکت ہے جس میں کوئی استقرار نہیں۔ حیات کا سب سے بڑا ملکہ ... یعنی قوتِ ذاکرہ... ایک مخزن زمنہ ہے۔ اسی طرح بعض حالات میں دیگر حیاتی مرکز بھی ہے۔

اس کی رائے میں مادہ کا معدن روح کے معدن سے مغائر ہے کیونکہ روح آزاد اور ارتقاء پسند ہے اور مادہ مقید و سفلی ہے۔ اس کے خیال میں مضحک دونوں کی فطرت کے متناقض ہونے پر دال ہے۔ کیونکہ جب ہم کسی انسان کو کسی مادی آلہ کا سا تصور کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس پر ہنستے ہیں۔... کیونکہ روح کے ہوتے ہوئے اس کا یہ تصرف اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ہم ایک مادہ یا اس کیڑے پر نہیں ہنستے جس کی آزادی سلب کر لی گئی ہو۔ ہاں اس "ذی روح" پر ضرور ہنستے ہیں، جو جماد کا سا تصرف کرے۔

عقلِ انسانی مکانی حقائق کو خوب پہچانتی ہے۔ لیکن حرکت زمانی کی اندرونی گہرائیوں تک اس کی رسائی نہیں، بلکہ اس کی طرف "بداہت" نفوذ کرتی ہے۔ حیوانی خصوصیات کے ارتقاء میں یہی سب سے بڑا ارتقاء ہے۔ مگر برگسان عقل کو دماغ کے ساتھ مقید نہیں کرتا، جیسا کہ بعض مادی فلاسفہ کرتے ہیں، بلکہ وہ کہتا ہے کہ عقل کبھی بغیر دماغ کے بھی فکر کرتی ہے۔ جس طرح بعض جاندار بغیر معدہ کے بھی ہضم کی قوت رکھتے ہیں۔ لہٰذا دماغ عقل کا اصلی منبع نہیں، بلکہ صرف ایک ظرف اور ذریعہ ہے جو ایک طویل استعداد کے بعد عقل کی توجیہات فراہم کرنے لگتا ہے۔

عنصر زمانہ کے ساتھ حیات کی اس تعلیق پر اعتماد کرتے ہوئے یہ فلسفی دور دراز امیدوں کو ابدالآباد تک باقی رہنے والے زمانہ میں مستقبلِ حیات پر پھیلا دیتا ہے۔ یہی حیات بلندی حاصل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ موت

پر غلبہ پا لیتی ہے اور کبھی عقل بلند ہوتی ہے یہاں تک کہ مکان یا اس مادہ کی قیود کو کچل ڈالتی ہے جو اس کے خیال کے مطابق عنصر مکان سے زیادہ وابستہ ہے۔

برگسان کے نزدیک خالق کا تصور نہ دین پرستوں کے عقیدہ سے مطابق ہے اور نہ ہی ان مشینی فلاسفہ کے تصور سے ملتا جلتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔

وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے خالق کو انسانی عمل سے تشبیہ دی ہے۔ انہوں نے کائنات کو ایک ایسے انسان کبیر کی مصنوعات قرار دیا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

دراصل ان لوگوں کے افکار پر صنعت و ترقی کا بھوت کچھ اس طرح سوار ہوا ہے کہ انہوں نے کائنات کو بھی انہیں بھاری بھرکم مشینوں پر قیاس کیا ہے جو بھاپ یا بجلی سے دقیق و خاص رفتار پر گردش کرتی ہیں۔

برگسان کے نزدیک ان دونوں فریقوں کے مابین قول فیصل یہ ہے کہ قوت خالقہ ــــ یا تخلیقی ارتقاء ــــ کائنات میں موجود ہے۔ خارجی کائنات میں نہیں۔ وہ ایک دائمی حرکت ہے جو مادہ کے دائمی جمود کے مقابلہ میں جدوجہد سے دوچار ہے۔

لیکن سب سے بڑی مشکل جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وہ یہاں بھی موجود ہے یعنی قوت خالقہ وہ اس کائنات ہی میں موجود ہے۔ کائنات ہی کے ساتھ مقید ہے اور پھر اسی سے ارتقائی ادوار میں تخلیق رونما ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ارتقائی ادوار میں تخلیق کیوں آئی۔ ازل میں وہ "واحد" کیوں نہ وجود میں آ گئی۔ کیا کائنات باہم معاون اور زیادت پسند تھے؟ یا مادہ نقص و شکست کا شکار تھا؟ حالانکہ اسلحہ سے لیس فوجیں اور تمام قیادتیں اور صلاحیتیں ایک شروع نہ ہونے والے دور سے برابر موجود چلی آتی ہیں۔ لہٰذا یہ ارتقاء کیوں وجود میں آیا؟ اور زمانہ میں کیوں تبدیلی ہوئی؟ انجام کار اس دور میں کامیابی کیوں ہوئی اور پہلے ناکامی کیوں تھی؟

یورپی اور فرانسیسی فلسفہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم جرمنی فلسفہ کی طرف آتے ہیں، یہ فلسفہ عہد حاضر کے دیگر فلسفوں کے مقابلہ میں کسی خاص امتیاز کا حامل نہیں۔ حقیقتِ الٰہیہ کا ادراک اور طبیعت و مابعد الطبیعت کی تشریحیں کوئی ایسا معیار نہیں رکھتیں جس سے عقل کی مرضی پوری ہو اور ضمیر اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو جائے۔

جرمن شہروں کے متعلق یہ مشہور رہا ہے کہ وہ فلسفہ الٰہیات کے سرسبز و شاداب مکاتب رکھتے ہیں۔ فلسفہ الٰہیات سے ہماری مراد مسائل مابعد الطبیعیات ہیں ــــ لیکن انیسویں صدی کے اخیر میں اس میدان میں کوئی نیا مذہب نہیں پھوٹا۔ جو جرمنی کے متقدمین فلسفی افکار سے ملتا ہوا ہو۔ بلکہ بعد والے فلاسفہ اس میدان کو چھوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مشہور نظریات جن کی تشریحات ظاہریہ یا وجودیہ کے نام سے کی جاتی ہیں، وہ سب انہی قیاسات کی وضع کی طرف لوٹ جاتی ہیں جو حقائق کی تنقیح کے لیے وضع ہوئے ہیں اور جن کے ذریعے فلسفہ، علم اور نفسیاتی تجربات کے دوائر معین ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ملحدوں اور کہیں مومنوں کے دعاوی سے

منسلق ہوتے ہیں اور کہیں مابعدالطبیعاتی مسائل سے اس طرح مکمل اعراض کر جاتے ہیں گویا وہ ایک بالکل گم نام اور مایوس کن دنیا ہے۔ ان میں سے اگر کسی نے ان مسائل سے تعرض بھی کیا ہے تو الٰہیات کے فلاسفہ کی سی وسعت فکری اختیار نہیں کی، جنہوں نے ہر موضوع سے پیشتر اسی موضوع کو قابل بحث سمجھا۔

ہم الٰہیاتی نظریہ پر ان افکار کا خلاصہ پیش کریں گے جو بیسویں صدی کے مفکروں کے شہرت یافتہ افکار سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے تین مفکر بحث کے لیے کافی ہیں۔ یعنی نیٹشے، ہارٹمین اور شپنگلر یہ تینوں مفکر مابعدالطبیعیات پر ایک مستقل رائے رکھتے ہیں۔ ان کی اس رائے کا تعلق کیتھولک یا پروٹسٹنٹ تشریحات سے نہیں ہے اور نہ ان کو منطقی و علمی قیاسات کا حاصل خیال تصور کیا جا سکتا ہے۔

نیٹشے (۱۸۴۴ء۔ ۱۹۰۰ء) کہتا ہے کہ خدا "مر چکا ہے"۔ اس کے نزدیک بہادری ہی وہ دین ہے جو ہر انسان کو زندگی میں بنا اعتقاد سمجھنا چاہیے کیونکہ ہر اخلاق یا عقیدہ سے بڑھ کر خدا سے خالی اس دنیا میں جو چیز انسانی نفس کے لیے لازم ہے، وہ شجاعت ہے۔ نیٹشے کے خیال میں عالم ایک قوت کے مثال ہے، جس کا ہم بلاحدود کے تخیل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ غیر محدود قوت کا نظریہ خود قوت کے فکری اسپرٹ کے منافی ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ دنیا ابدی تجدید سے وسیلوں کو معدوم کر دیتی ہے۔ کائنات مکرر ہوتی رہتی ہے اور بے انتہا طور پر برابر متکرر رہتی ہے۔

ایڈورڈ وان ہارٹمین کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ ذات نہیں۔ نہ وہ اپنی ذات سے واقف ہے اور نہ وہ اس انانیت یعنی "انا" کا مظہر ہے جو کائنات میں تشخص کا باعث ہوتی ہے۔۔۔ ذات ہونا یا انا ہونا ہارٹمین کے خیال میں خداوندی تقدس سے بعید ترین تصور ہے۔ البتہ کائنات میں دو چیزیں ہیں۔ فکر اور ارادہ یہ دونوں طاقتیں اس کے نزدیک تقریباً اسی طرح مقابل ہیں جس طرح مجوس کے یہاں اہرمن اور یزدان یعنی خدائے نور اور خدائے ظلمت کا تقابل ہے۔ مطلب یہ کہ تمام شر، عالم ارادہ کی وجہ سے ہے۔ عالم ارادہ سے مراد ہمارا یہی عالم ہے جس میں ہم آلام و آثام کی مشقت سے دوچار ہوتے ہیں۔ فکر کو ارادہ کے ساتھ اس لیے مبتلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی صفائی اور پاکیزگی کی طرف شعور اور ذات سے منزہ ہو کر بازگشت کر سکے۔ عجب نہیں کہ ہارٹمین کے نظریہ میں یہ تخیل بھی ہو کہ "ارادہ" میں قصد کو تو مانا گیا ہو مگر اس مقصدیت میں ادراک و شعور کو نہ مانا گیا ہو۔ کیونکہ فطرتِ حیوانی کسی منتہیٰ کی طرف قصد تو کرتی ہے مگر اس منتہا کا اسے شعور نہیں ہوتا۔

شپنگلر (۱۸۸۰ء۔ ۱۹۳۶ء) کی رائے میں اللہ تعالیٰ کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ارادہ ہے۔ دورِ حاضر کے جرمنی مفکرین کی رائے کے مطابق فکر پر ارادہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ روح کی حقیقت پر وہ اپنی کتاب "مغرب کی پستی" میں حسب ذیل کلام کرتا ہے۔ "جب ہماری طرف سے خدا کی نسبت گفتگو ہوتی ہے تو اس سے وہ خدا مراد ہوتا ہے جس کو دوسرے لفظوں میں وسعتِ عالم یا قوتِ تخلیق کہہ سکتے ہیں، یہی خدا ہے جو فعال ہے اور دائمی طور پر دہاب بھی ہے اور عالم کی فضا سے منعکس ہو کر فضائے روح پر جلوہ گر ہوتا ہے جو خیال کے ساتھ قائم ہونے والی قوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے لازمی طور پر محسوس کرتی ہے اور یہ بلاشبہ ارادہ ہے اور مجوسی اثنینیت یا قوم وسکی (یونانیوں) کی ثنویت کے مشابہ ہے یا اسے ایرانیوں کی تعبیر کے مطابق یزدان و اہرمن کہا

جائے یا یہودیوں کے خیال کے مطابق یہوواہ اور بعلزبوب کہا جائے اور چاہے مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اللہ اور ابلیس یا خیر مطلق اور شر مطلق نام دے دیا جائے۔ حقیقت سب کی ایک ہے۔ یہی دو ضدیں ہیں جو مغربی مفکروں کے لیے ایک معمہ بن گئیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ارادہ پر جس قدر بھی غور کیا جائے، تاکہ ذہن و عزم کی باہم رسہ کشی میں روحانی وحدت کا مرکز معین ہو سکے۔۔۔ اسی قدر اس واقعی دنیا میں شیطان کا تصور مضمحل ہو جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کا طرزِ فکر وحدۃ الوجود تھا جو گویا عالم باطنی کا ایک اثر تھا جو عالم خارجی میں ڈھل گیا۔ جس نے لفظِ اللہ اور لفظِ دنیا کے درمیان تقابل کو ظاہر کر دیا۔ وحدت الوجود کی پوری دلالت اگر دیکھنی ہو تو روح اور ارادہ کے درمیان تقابلی کیفیت میں دریافت کرنی چاہیے۔ ارادہ وہ قوت ہے جو اپنے تسلط کے زیر سایہ واقع ہونے والی چیز کو متحرک رکھتا ہے۔ اس سمت پر اگر ہم اپنے شعور کو موڑیں تو اندہ سے بھی کچھ زیادہ اختلاف نہیں رہتا۔ کیونکہ ملحد یا ڈارون کے ہم خیال جب اس فطرت پر کلام کرتے ہیں جو ان کے خیال میں ہر چیز کو منظم رکھتی ہے۔ جو چاہتی ہے انتخاب کرتی ہے اور جسے چاہتی ہے ایجاد یا فنا کر دیتی ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والوں اور اٹھارھویں صدی کے ان منکرین میں صرف لفظی اختلاف رہ جاتا ہے کیونکہ دنیوی شعور دونوں کے ہاں بہرحال قائم ہے اس پر کوئی تغیر نہیں آیا۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ عقل دین سے علم کی طرف منتقل ہو تا کہ ہمارے لیے نفسیات و طبیعیات کی اصطلاح میں ایک مزاج مرکب واضح ہو گویا جس وقت قوت کا تقابل مادہ سے اور ارادہ کا تقابل رغبت و شہوت سے ہوتا ہے تو کسی خارجی تجربہ کی طرف اسے سہارا نہیں ڈھونڈنا پڑتا، بلکہ اپنے اندرونی حیوانی شعور کا سہارا لینا ہوتا ہے۔ ڈارون کے ہم خیال منکرین اسی کیفیت کو سطحی الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح علمائے بیالوجی کی دریافت اور افریقی تخیل کے مطابق لفظ فطرت میں کوئی فرق نہیں۔ جب ہم کہتے ہیں "خدائی ارادہ" تو یہ ایک قسم کا فضول اور مکرر کلام ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ۔۔۔ یا بعض کے قول میں فطرت۔۔۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ارادہ ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کا تخیل مشخص احساس سے گذر کر اصلاحی نقطۂ نظر اختیار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا تخیل وہ وسیع فضا ہو گی جس کی کوئی انتہا نہ ہو گی اور اسی فضا کو تحقیقی ارادہ کا درجہ نصیب ہو گا۔ جو تمام کائنات پر مسلط ہے۔ اسی لحاظ سے قریب ۱۳۰۰ سال سے فن تصویر فن موسیقی سے علیحدہ مقام لے چکا ہے۔ کیونکہ یہی وہ واحد و منفرد فن ہے جو احساس الٰہی کی واضح تعبیر پر قادر ہے۔۔۔

ان پراگندہ خیال فلاسفہ میں یہی وہ قدر مشترک ہے جہاں تعبیر کر وہ تخلیقی حقائق اور صفات الٰہی میں ارادہ پر زور صرف کرتے ہیں۔ حاصل یہ کہ ارادہ یا بالفاظ دیگر "تسلط" اصولِ وجود میں حقیقتِ کبری کی حیثیت رکھتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک مقام ہے جو عقلوں کے لیے کئی لحاظ سے سامانِ عبرت ہے کیونکہ جرمن فلسفہ میں تسلط پر زور دینا اور دیگر ممالکِ فرنگ میں دستوری خدائی کی حمایت کرنا، یہ دونوں محض اتفاق نہیں ہیں۔

مقامِ عبرت ہے کہ جدید فلاسفہ دین پرستوں پر گرفت کرتے ہیں کہ یہ لوگ حقائقِ مجردہ کو انسانی دائرۂ فکر و عمل پر قیاس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف وہی اعمال و اوصاف منسوب کر دیتے ہیں جو انسان سے صدور میں آتے ہیں۔ اسی طرح وہ ارضی سلطنت پر تمام کائنات کو قیاس کرنے لگتے ہیں اور اپنی اس ذہنی افتاد پر ایک قسم کا ترفع محسوس کرتے ہوئے فخر کرتے ہیں۔ یوں بزعم خویش وہ محسوس اور مفہوم یا مجسمات و مجردات میں

خلطِ مبحث سے بچ جاتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم اپنی رائے لکھ چکے ہیں وہ اس طرح تشبیہ و قیاس اور اپنے احساس کے مطابق صفاتِ ارضی اور تخیلاتی تدبیر کائنات میں خلطِ مبحث پیدا کرنے سے سلامتی پر قائم نہیں رہتے۔ عالم تجرید پر ان کا تمام فلسفہ آرائی احساس و خیال کی گمراہی کا پتا دیتی ہے۔

چنانچہ جرمن فلسفہ میں "ارادہ" کے نظریہ کی دریافت گویا زمین و آسمان کی ہر چیز کو دریافت کر لینے کے مترادف ہے۔ یہ ارادہ خواہ اندھا ہو یا قوت مسلط ہو اور ساتھ ہی ان کے نزدیک یہ ارادہ نا سمجھ اعمال و افکار صادر کرنے والی ایک اندھی قوت بھی ہے۔ کیونکہ یہ تسلط ہی سراپا کورِ چشم ہے۔

یہ ارادہ دوسری اقوام کے دیگر فلسفوں میں بے حقیقت چیز بن گیا ہے کیونکہ دستوری اور جمہوری طرزِ حکومت میں حاکم کا ارادہ تمام قسم کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہوتا۔ جبکہ فلاسفہ کے یہاں ارادہ ایک ایسے نظام پر مشتمل ہے جو تمام موجودات پر ایک ہی مقصد کے ساتھ حاوی ہے۔

یہ فلسفہ جو تجرید و تجزیہ پر فخر کر رہے تھے۔ انسانی تشبیہ و قیاس آرائی کے چکر سے نہیں نکل سکے، ہم نہیں خیال کرتے کہ یہ کورِ چشم ارادہ اپنی تمام رفعت کے ساتھ جرمنی میں کامیاب ہو سکے گا اور یہ تقلید فرانسیسی اور فرنگی افکار میں مقبول ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں کہ فلاسفہ کے یہ دونوں فریق تشبیہ و التباس کی خیال آرائی سے واقعی علیحدہ ہو کر حقائق پر سے پردہ اٹھا رہے ہیں۔

فلاسفہ کے ان مذکورہ دونوں فریقوں میں اختلاف کے ساتھ ساتھ ایک قدر مشترک بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اصولِ نفسیات میں جرمنی اور دیگر یورپ کس طور پر ایک ساتھ ہو کر چلے ہیں اس کا نام "ترکیب" یا ترکیب کامل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اعتبار و قیاس میں ترکیب اجزاء و مفردات پر مقدم ہے۔

جرمنی فلسفہ جشتالت............ یہ بالفاظِ دیگر شکل مرکب کا نظریہ زمانہ حاضرہ کے نظریات میں یورپی سرزمین کے علمائے نفسیات کا بڑا مقبول نظریہ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ علم النفس کے پہلے مرحلہ میں اسی سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر اس سے دوسرے نام اپنے اپنے تخیل کے مطابق فلسفہ الٰہیات اور مباحث طبیعیت و مابعد الطبیعیت میں تطبیق دینے کے لیے تجویز کر لیے گئے ہیں۔

اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "کل" اجزاء کے مقابلہ میں محسوسات کے مشاہدہ و مطالعہ میں مقدم ہے اور یہ کائنات سے متعلق انسان کا علم مفردات کے مطالعہ سے نہیں بلکہ مرکبات کے شعور کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔۔۔ ان فلاسفہ کے قول میں ہر مرکب بہت سے دیگر مرکبات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ لوگ ان میں پانچ قسمیں دریافت کرتے ہیں:

۱۔ مرکباتِ مادیہ "غیر عضویہ" جیسے پتھر اور صابون کے جھاگ۔

۲۔ مرکباتِ صناعیہ جیسے مختلف آلات، سامان کے ٹکڑے اور پرندوں کے گھونسلے۔

۳۔ مرکباتِ عضویہ یعنی وہ مجموعے جو ہر جاندار کی ترکیب میں پائے جاتے ہیں۔

۴۔ مرکباتِ متداخلہ جیسے موسیقی کی آواز جو مختلف نغموں سے مرکب ہوتی ہے یا جیسے وہ عبارت جو مختلف کلمات کی ترکیب سے مفہوم ہو۔

۵۔ مرکباتِ اجتماعیہ جیسے اقوام، جانوروں کے ریوڑ اور [illegible]۔

عقل کی تخلیق بھی اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ اشیاء کو مرکب ہونے کی حالت میں ادراک کرے اور اگر اسے ضرورت ہو تو اس کے اجزاء کی بھی تحلیل کرے۔ گویا اس نے مجموعے کے ادراک میں بصیرت یا نفوذ ہونے والی ذکاوت پر اعتماد کرتی ہے، عقل کا بڑا اعتماد متفرق احساسات اور [illegible] نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کسی موقع میں ذہنِ ثاقب "کل" کے ادراک کرنے سے قاصر رہ جائے تو [illegible] ہے نہ علم نہ خیال۔۔۔ یہ ایک فضول بحث ہو گی کہ ہم اپنی توجہ ایک جزو پر مرکوز کر دیں اور پھر [illegible] سے دیگر اجزا کا اضافہ کر دیں اور اس کے بعد یہ تخیل قائم کریں کہ ہم نے "کل" کا احاطہ [illegible] صحیح راہ یہی ہے کہ پہلے کل کی طرف التفات کرو۔ اس کے بعد اس کے اجزاء کا مقام و مرتبہ دریافت [illegible] کوئی جزو کبھی بھی اپنی انفرادی حالت میں نہیں پایا جاتا۔ اس طرح ہر جزو اپنے اندر ایک علاقہ رکھتا ہے جس سے وہ اپنے غیر کے ساتھ موثر یا متاثر ہوا ہے اور تمام اجزاء اسی کی طرف سمٹ جاتے ہیں جہاں ان اجزاء میں ترکیب کامل یا ایک مکمل تعمیر ہوتی ہے۔

اس نظریہ کا حکمتِ الٰہیہ سے جوڑ اس طرح لگا کہ یہ نظریہ عقل اور جسم کی حقیقتوں کو باہم مرکب و مربوط قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل کو وسط میں جگہ دی جاتی ہے۔ اس پر جماعتِ الہیین، جماعت قصدیین یا عوارضِ جسمانی سے عقل کی علیحدگی کو جائز ماننے والے سب متفق ہیں۔

آلی فلسفہ کے بانی جن میں سب سے چوٹی کے دو روسی عالم باخوف اور بخترو۔۔۔ سمجھے جاتے ہیں وہ ہر فکر کو جسمانی موثرات کی طرف راجع قرار دیتے ہیں، خواہ زمانہ حاضرہ ہو یا ماضی ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو حقائق ہمارے لیے مجہول ہوتے ہیں، ان کی طرف ہماری راہنمائی ہماری معلومات کرتی ہیں۔ یہ لوگ تصورات، حرکاتِ عضویہ اور جسمانی قطع و تراش میں باہمی علاقہ کو دریافت کرنے کے لیے حیوانات پر اپنے تجارب دہرا رہے ہیں۔

اس نظریہ کا معتدل مکتبِ فکر سلوکیہ۔۔۔ ہے جو سلوک کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موثرات و اعضاء کے درمیان ایک ضروری کشش کا نام سلوک ہے۔ اس نظریہ میں عقل مجرد کا کوئی مقام نہیں عام، انسان، طبیعت اور مابعد الطبعیت میں کہیں بھی اس کا کوئی مقام نہیں۔

نظریۂ ارادہ رکھنے والوں کا رئیس الجماعت ولیم میکڈو گال امریکی ہے۔۔۔ یہ نظریہ رکھنے والے عقل مجرد کو تسلیم کرتے ہیں اور بعض بیالوجی اور فزیالوجی کے ماہرین کے اس دعویٰ کا رد کرتے ہیں کہ عقل، دماغ و اعصاب کا عمل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کے مظاہر مادی مظاہر سے مختلف ہیں۔ اس طرح عقل کے مظاہر فطرتِ حیات سے مختلف ہیں وہ کہتے ہیں کہ علم اب تک ثابت نہیں کر سکا کہ عقل کا سرچشمہ دماغ ہے اور دماغ کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہیں، نیز علم نے ایسے دلائل بھی فراہم نہیں کیے جس سے اس بات کی نفی ہوتی ہو کہ دماغ عقل کا ایک ایسا آلہ ہے کہ جسم میں عقل اسی کے ساتھ عمل پیرا رہتی ہو۔

شکلِ مرکب یا جشٹالٹ کا نظریہ، آلی اور ارادی دونوں نظریوں میں ایک درمیانی اور اعتدال پسند راہ ہے۔

کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک عقل موجود ہے مگر اس کا وجود کسی احساس پر موقوف نہیں۔ اس کے بعد وہ دو مقابل شعبوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ عقل حقیقتِ مجردہ کا نام ہے جو حواس سے منفرد اور ممتاز بھی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے انسانی اعمال میں اس کے قصد و تاثیر کو اصلی مؤثر مانا ہے اور وہ اس سے زیادہ بلندی پر ایک عقلِ مطلق کو تسلیم کرتے ہیں جس کی تاثیر کائناتی حرکات اور اجسام و نفوس کے عوارض میں ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جو سمجھتے ہیں کہ مرکبات اور اجزاء کے مفہوموں میں تفریقِ کلی ہے اور یہ کہ جسمانی مؤثرات اختلافِ مصادر سے متعلق اور عقل کی تشریح میں کافی ہیں۔ وہ عقلِ مجرد کے مقام و محل کا انکار کرتے ہیں۔ یہی لوگ تخلیق و خالق کے مسئلہ میں الٰہیین یا مادیین کے گروہ سے شمار ہوتے ہیں۔

مذہبی نظریات کے علاوہ یورپ کی سرزمین ان نظریات سے بھی خالی نہیں رہی ہے جو مختلف ممالک میں ظاہر ہوئے۔ مثلاً اشتراکی ممالک جیسے روس اور پولینڈ یا ٹیوٹانیہ ممالک جیسے ڈنمارک، سویڈن اور ناروے یا لاطینی ممالک جیسے اٹلی، اسپین اور بالشویک تحریک والے بعض ممالک۔ لیکن ان نظریوں میں اکثر نظریات کا حال یہ ہے کہ بعض خالص مادی ہیں جن کے حدود مادیت پر ختم ہو جاتے ہیں۔ کچھ نظریات مسیحی افکار پر مشتمل ہیں جو یا تو کسی مشہور مذہب کے تخیلات پر منتہی ہوتے ہیں یا تمام مذہبوں سے ہٹ کر صرف انفرادی عقیدہ پیشِ نظر رہا ہے اور دیگر تمام اجتماعی شعائر سے صرفِ نظر کر لیا گیا ہے۔

ضروری نہیں کہ ہم ان تمام مباحث پر تبصرہ کریں۔ البتہ ان میں سے ایک نظریہ ضرور قابلِ ذکر ہے۔ یہ نظریہ نہ خالص افکار پر مبنی ہے اور نہ اسے خالص دینی تشریح کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ ایک اطالوی مفکر "بندیتو کروشی" کی جانب منسوب ہے جس کو دورِ جدید کا ہیگل ثانی سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے دینی افکار ہیگل سے ملتے ہیں، گو وہ دینی تشریحات کی ان راہوں میں اس سے اختلاف رکھتا ہے کہ جن کی وجہ سے عالم میں جلوہ آرائی ہو رہی ہے۔

کروشی کے نظریہ کا خلاصہ ـــــ فلسفہ الٰہیات میں ـــــ یہ ہے کہ فکر کا وجود قطعی اور یقینی ہے جسے بلاشبہ تسلیم کرنا پڑتا ہے اور افکار ابدی مسلسل اور مختلف حلقوں میں جلوہ آرا ہوتے ہوئے بعض بعض کو منسوخ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن مرکزِ توجہ ان سب کا شر کے ساتھ ایک قسم کا مجاہدہ ہوتا ہے تاکہ اس پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ یہ منسوخ ہونے والے اضداد آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ضد کا تقابل رکھتے ہیں لیکن پھر ایک وحدتِ کاملہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام ادیان انہی فکری اطوار میں سے ہوتے ہیں لیکن ان میں مسلسل ارتقاء کی طرف میلان ہوتا ہے تاآنکہ انسانیت میں فکرِ صحیح کی طرف تقدم حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے خیال میں ادیان کی اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی جب کہ فلسفہ کو ارتقاء حاصل ہو چکا ہے اور وہ پرانی اساطیر کے باقیات سے مجرد ہو چکا ہے۔ وہ اپنی تصنیف ادب الحیات یا مسالک الحیات کی آخری فصل میں کہتا ہے: "جس دورِ حیات سے ہم گذر رہے ہیں اس پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ یہ دور ادیان کی بیخ کنی کرتا ہے۔ حالانکہ یہ خود ایک تہمت ہے۔ کیونکہ یہ وہ دور ہے جس میں حیاتِ انسانی نے صحیح منازل، آداب اور قرار و امن کو دریافت کر لیا ہے۔ ہمارے اس دور نے ایک ایسی چیز تیار کر لی ہے جس سے گریز کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ادیان کے چہروں سے

پرانے اساطیر کی چادریں اتر گئی ہیں جس سے خود بخود اس پرانی عمارت کے مضبوط ستون گر گئے۔ ان گرے ہوئے ستونوں میں نفیس افکار و فضائل نمایاں ہوئے ہیں کہ پرانے قضایا کے ساتھ وابستہ ہو کر ان کی درستگی ممکن نہیں۔ ہمارے دور نے ان افکار و فضائل کو چمکایا اور ان کو گرد و غبار سے صاف ستھرا کر کے مناسب جگہ میں فٹ کیا ہے۔ یہ فننگ پرانی عمارت کے ملبے سے کہیں زیادہ مضبوط، قوی اور فراخ ہے۔ ہماری قوم کے لیے یہ بہت بڑا فخریہ کارنامہ ہے کہ اس نے انسانی دیانت کی تاسیس میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور ایک صاف ستھرا عقیدہ دیا ہے جو خالص اور صحیح فکر سے وجود میں لایا گیا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ وہ فکر ہے جس میں حیاتِ مجسم ہوتی ہے یا کہو کہ یہ فکر ایک نئی زندگی بخشتا ہے"۔

اس نظریہ پر کئی وجہ سے کلام ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ اس نظریہ میں بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ "فکر" ہی حقیقتِ مطلقہ ہے۔ اس انتہائی عجیب نظریہ کو وہ اس حالت میں قائم کیے ہوئے کہتے ہیں کہ مادہ فکر کی راہ میں ایک "غیر صحیح" وجود ہونے کی حالت میں کھڑا ہوا ہے ورنہ حقیقت میں صحیح وجود فکر ہی کو حاصل ہے۔۔۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مادہ اور فکر دونوں کا وجود ہے اور فکر پر مشتمل ہے، یہ بے شک ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے کیونکہ اس میں تخیل یہ ہے کہ فکر مادہ کے ارتقاء اور مختلف حالات پر موقوف ہے۔ اگرچہ ہمیں ان کے ان عبارت سے اختلاف ہے لیکن یہ کہنا کہ فکر ہی حقیقتِ مطلقہ ہے، ناقابلِ فہم تخیل ہے۔ کیونکہ ان کے اس تخیل میں وجود غیر صحیح پر فکر غلبہ حاصل کر کے ارتقاء حاصل کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ابد اور لاانتہا چند محدود حلقوں کے مجموعہ کو نہیں کہتے۔ کیونکہ محدود کا مجموعہ بھی محدود ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ ابتداء یا انتہا کے عرصہ میں امتداد ماننے سے کوئی شے لاابتدا یا لاانتہا نہیں کہی جا سکتی۔ بلکہ ابد "محدودات" سے بالاتر ہوتا ہے۔ محدودات خواہ کتنے ہی طویل و وسیع ہو کر متحد ہوں ابد نہیں کہلا سکتے، اور نہ ابد کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مسافت میں زمانہ سے سابق ہو یا اس مسافت میں زمانہ اس سے لاحق ہوتا ہو۔ بلکہ ابد ایک ایسی مسافت کا نام ہے کہ وہ زمانہ پر محیط ہوتی ہے اور زمانہ اس کو محیط نہیں ہوتا۔ یا دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ لیجئے کہ زمانہ اس کا کوئی حصہ اور ٹکڑا نہیں ہوتا کیونکہ بالفرض اگر ہم اس کے حساب میں سے یہ ٹکڑا نکال ڈالیں تو اس میں سے کوئی چیز بھی خارج نہیں ہو پاتی اور نہ اس میں خلاء پیدا ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اسطورہ (پرانی منقول روایت) کا عنصر عقیدہ سے مختلف ہوتا ہے اور عموماً فلسفہ یا معرفتِ عقلی کا عنصر عقیدہ کے عنصر سے بالکل جداگانہ چیز ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسطورہ ۔۔۔ جب کہ عقیدہ سے جدا کوئی چیز ہو ۔۔۔ تو اس کی حیثیت ایک پرانی خوبصورت تصویر کی سی رہ جاتی ہے اور فلسفہ کی حقیقت صرف یہ ہوتی ہے کہ کائنات کا شعور و معرفت حاصل ہو جائے۔ برخلاف اس کے عقیدہ کائنات کے احساس کا نام ہے۔ فلسفہ کا خلاصہ تو یہ ہوا کہ انسان جان لے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے لیکن تدین یا اعتقاد کا خلاصہ صرف یہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے وابستہ اعتقاد ہوتا ہے جس سے انسان اپنے نفس اور اللہ تعالیٰ کے درمیان یا اللہ تعالیٰ اور اپنے نفس کے درمیان ایک خاص ربط محسوس کرتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اسے زندگی بخشی ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یا کائنات سے حیاتِ ابدی چھین لی ہے۔

بہر حال اسطورہ، اعتقاد اور فلسفہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اسطورہ صرف شعر و فن کی تعبیروں میں مقام رکھتا ہے۔ وہ ایک تشبیہ ہے جسے نیند یا بیداری کے عالم میں انسان محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح فلسفہ اکثر اپنے تمام مال، و ما علیہ کو کہہ چکنے کے بعد بھی اتنی قوت کا مالک نہیں ہوتا کہ وجدانی عقیدہ کے عنصر کی جڑیں کھوکھلی کر سکے۔ اگر کبھی ایسا ہوا بھی ہو تو فلسفہ خود اس عقیدہ کا سا مقام کبھی نہیں حاصل کر سکا۔ حاصل یہ کہ فلسفہ عقیدہ کی نقیض نہیں کہ اسے باطل کر سکے، ہاں ایک وسیع مقام سامنے کھول دیتا ہے کہ انسان اپنے سابقہ عقیدہ سے ہٹ کر دوسرا عقیدہ اس کے بدلہ میں قائم کر لے۔

مختصر لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ فلسفہ اور دین میں تقابل و تناقض نہیں اور نہ ہی وہ دونوں ایک چیز ہیں۔ کیونکہ دو منفصل اور جداگانہ چیزوں کے ہونے سے آپس میں تناقض ہونا لازم نہیں آتا۔

ان تمام مرقومہ بالا افکار و نظریات سے دو نتیجے بطور خلاصہ نکلتے ہیں۔

ایک یہ کہ ان تمام افکار کا مشترک طور پر یہ ایمان ہے کہ مادہ کی حالتِ بسیط نے ترکیب تک پہنچنے میں یا پستی نے بلندی اختیار کرنے میں ارتقاء اور تغیر کی راہ اختیار کی ہے۔

لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ اگر کائنات بغیر ابتدا اور انتہا کے ابدی و سرمدی ہے تو اس ارتقاء و تغیر کے نظریہ کو ناقابلِ فہم کہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ابد میں ہر دن یکساں ہے۔ کائنات پر جس طرح آج کا دن آیا اسی طرح اس پر ہر دن آیا ہے۔ لہٰذا اس کے پس منظر میں اگر کوئی عقل کارفرما نہیں تو ارتقاء کے بھی کوئی معنی نہیں۔ ہاں عقل کی کارفرمائی کو تسلیم کر لینے کے بعد تمام عقدہ حل ہو جاتا ہے۔ گو ہمیں منطقی طور پر تمام کائنات کے بناؤ بگاڑ میں اس عقلِ مدبر کی علل اور حکمتیں دریافت نہ ہو سکیں۔

دوسری چیز جو بطور نتیجہ ہمارے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ علومِ تجربیہ درحقیقت فلسفہ قدیم اور منطق و قیاس کی معرفت اور واقفیت ہی کا ارتقائی نتیجہ ہیں۔ دورِ حاضر کے فلسفوں کی اٹھان علومِ تجربیہ پر مبنی ہے اور ساتھ ہی ان علوم کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ کائنات کی صحیح معرفت کا سرچشمہ صرف وہی ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک دور کا ارتقاء دوسرے دور کے ارتقاء سے بہ نسبت انکار کے اقرار سے زیادہ قریب ہونا چاہیے مگر پہلے ہی قدم پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلسفیانہ مذاہب کا موضوع ہی یہ ہے کہ گہرائیوں میں اتر کر نئے نئے نظریات کی روشنی میں عقیدہ و ایمان کا انکار کیا جائے۔ ایسی صورت میں یہ بعد والے فلسفہ کو پہلے فلسفہ کی روح یا مغز نہیں کہہ سکتے۔

کیونکہ اس میں صرف ان معلوماتی ذرائع کا اقرار ہے جو بطور تخلیل و مشاہدہ حسی حاصل ہوں اور یقیناً اس میں وجود اور موجودات پر ایک ایسا اعترافِ نفسی (یا روحانی) پایا جاتا ہے جو کسی عمل گہ یا ریسرچ روم کی خوردبین پر موقوف نہیں۔ اس طرح پھر روح و ایمان کی طرف واپسی ہوتی ہے اور گویا الہام و بداہت کا دروازہ پھر کھول دینا پڑتا ہے۔ جب کہ قریب تھا کہ ہماری حس اس دروازے کو بند ہی کر چکی ہوتی۔

مگر اس الہامی دروازے کو ہم بھی ہرگز کھلا نہ رہنے دیں گے جب تک کہ کوئی اسے کھٹکھٹائے نہیں۔

فلسفہ الٰہیات اور علومِ طبعی (سائنس)

ابھی ہمیں فلسفہ الٰہیات پر جدید علوم کا تبصرہ پیش کرنا ہے۔

ایک طبیعیاتی محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی رائے مباحثات الٰہیات میں رکھتا ہو جو صحت و وسعت اور صدقِ مقال و براہین میں دیگر علوم کی طرح ممتاز ہو۔ طویل جستجو، تحقیق و تجربہ اور ایک ایک موضوع پر کثیر معلومات اس کے ان اوصاف کو مزید اجاگر کر دینے والی ہیں۔ اگر لوگ نظامِ کائنات سے اس کے صانع کی قدرت پر استدلال کرتے ہیں تو ایک طبعی عالم کی وسعتِ نظر اس نظام کی باریکیوں اور مادہ کے ظواہر و اسرار سے وہ پردے اٹھا سکتی ہے جو اور علماء کی نظروں کے لیے حاجب بنے رہے۔

لیکن بذاتِ خود علم طبیعیات کا ذاتی تقاضا یہ نہیں کہ اس کے جاننے والے الٰہیات کے مباحث یا مسائلِ ابدیہ میں گفتگو کریں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ علوم اپنے دائرۂ بحث میں انہیں معلومات پر محدود رہتے ہیں جو تجربہ و مشاہدہ میں آچکے ہوں یا دوسرے لفظوں میں وہ موجودات کی ایک خاص نوع میں محدود ہیں، یعنی ادھر ادھر سے موجودات کے جس قدر عوارض ہاتھ آتے ہیں یہ علم ان کو لے لیتا ہے اور جوہر وجود کو نہیں لیتا کیونکہ جوہریت اس علم کے تجربوں سے خارج شئے ہے۔

مثلاً بیالوجی زندہ جسم کے اعضاء کا درس دیتی ہے لیکن وہ اپنے علم میں اس پر قادر نہیں کہ جاندار، مردہ اور جامد خلیوں میں اختلاف کا سبب بتلائے اور نہ اس کے اختیار میں خود ماہیتِ حیات پر بحث کرنا ہے، کیونکہ اعضاء کی حرکت اور چیز ہے اور وہ قوت جس کی وجہ سے یہ اعضاء حرکت میں آئے دوسری چیز ہے جو بیالوجی کے دائرہ میں داخل نہیں۔ کیونکہ بیالوجی کے طالب علم کی اونچی سے اونچی پرواز جاندار جسموں کی ترکیب پر ریسرچ کرنا ہے۔

اگر بیالوجی کا علم یہ ثابت کرے کہ مادہ حیات کو قبول کر سکتا ہے تو یہ اس کی گفتگو موضوع سے خارج سمجھی جائے گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے اسے خیال اور مفروضہ قرار دیا جائے۔ اسی طرح معدنیات کے ماہر کے لیے جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ مادہ حیات کے خاصہ کا مالک نہیں۔ کیونکہ یہ مادہ ذرہ کی معدنیاتی صورتوں پر ایک درس کی حیثیت رکھتا ہے۔

حاصل یہ کہ سائنس فلسفہ الٰہیات پر کوئی مستقل فصل پیش نہیں کرتی۔

لیکن ماہر سائنس کو یہ استحقاق ضرور حاصل ہے کہ وہ اس مسئلہ میں عقل و دلیل اور بدیہی شعور کے استحقاق کے مطابق اپنی رائے ظاہر کرے۔ کیونکہ بہرحال ایک سائنس دان بھی انسان ہے اور دیگر انسانوں کی صفات میں مشترک ہے وہ بھی اپنے امتیازی مقام کے مطابق ایمان کے بارے میں اپنا تخیل ظاہر کرنے کا حق رکھتا ہے۔ نیز خود علم بھی انسانی افتادِ طبع سے مستغنی نہیں۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کائنات کے نامعلوم اور پُراسرار حالات میں حق کی جستجو کرتا ہے۔

بعض علماء بداہت کے قابلِ اعتبار مقام کا انکار کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اصولِ تفکر و تعلیم کے منافی ہے۔۔۔ یہ لوگ اس طرح علم بدیہی کے ذمہ دارانہ مؤقف سے غافل رہ گئے اور اگر غور کرتے تو معلوم

ہوتا کہ علوم میں سرایت کرنے اور علوم کے منافع کو عارف اور غیر عارف کے درمیان مساویانہ درجہ میں عام کرنے کی صلاحیت اس میں کس قدر موجود ہے۔

جاہلوں سے قطع نظر—— خود علماء میں علمی مسلمات کس طرح عام ہو سکتے ہیں۔ اگر بداہت کو قابلِ قبول اور ذمہ دارانہ مقام حاصل نہ ہو؟

ایک انجینئر ڈاکٹری اصول کی کس طرح تصدیق کرے جب کہ خود اسے یہ اصول معلوم نہیں۔ واضح رہے کہ ہم یہ نہیں کہ کہتے ایک ڈاکٹری اور انجینئرنگ کے اصول سے ناواقف آدمی ان اصول کی تصدیق کس طرح کرے بلکہ تقابل علماء کا مقصود ہے؟

ایک علمی مسلہ نظریہ کیونکر ایک حقیقت کا مقام لے سکتا ہے۔

ان حقائق میں سے کوئی بھی حقیقت ایسی نہیں کہ جس کا منشا بداہت کا قابلِ اعتبار مقام یا ایمان کی اہمیت عام انسانی معاشرہ میں نہ تسلیم کی گئی ہو۔

نہ کوئی حقیقت ایسی ہے کہ اس سے تمام استفادہ کرنے والے واقفین کی طرح استفادہ کر رہے ہو، نہ یہ ممکن ہے کہ بعض افراد کی طرح تمام ماہر ہو جائیں۔ حالانکہ تمام مسائل محدود درجہ رکھتے ہیں جن سے ہر کوئی واقف ہو سکتا ہے۔

لہٰذا دل میں یہ وسوسہ کیوں گزرتا ہے کہ یہ حقیقت کبریٰ انسانی بدیہی معلومات سے مستغنی ہے اور اس میں ادراک و شعور رکھنے والے تمام انسانوں کے لئے تجرباتی علوم کے مرحلہ سے گزرنا ضروری ہے؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ جو کوئی ان معلومات پر غور و خوض سے کام لیتا ہے وہ ان کا عارف ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ اسے تمام میزان و معیار میسر ہوں، جیسا کہ اکثر انسانوں کے لیے یہ ممکن الحصول ہیں۔

لیکن آپ پورے حزم و یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عقیدہ و ایمان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، کیونکہ جو لوگ رسولوں اور مقدس نفوس کے ایمان کی آزمائش کرتے ہیں وہ لازمی طور پر اس ایمانی شعور کو پا لیتے ہیں جو رسولوں اور مقدس ہستیوں کو حاصل تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو نظریات کے رنگ سے ہٹ کر علماء کے اسلوب و پیرایہ میں نہ سہی لیکن اپنے مخصوص رنگ میں تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کی یہ حالت قابلِ استعجاب ہرگز نہیں، بلکہ اس سے ان کی الفت و وابستگی کا پتا چلتا ہے۔ یعنی یہ کہ وجدانیات کی تعبیر معقولات کی تعبیر سے مختلف ہوتی ہے، چنانچہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے لوگ اپنے احساسات کو عجیب عجیب اسلوبوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

موسم بہار کی رونق سے ایک پرندہ، ایک گھوڑا اور ایک انسان سب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پرندہ چہچہاتا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے اور انسان شعر و سخن کی صورت میں قصیدے مرتب کرتا ہے اور اگر وہ آرٹ کا دلدادہ ہوتا ہے تو اس کی تصویر کھینچتا ہے۔اور اگر اسے موسیقی سے دلچسپی ہوتی ہے تو راگنیوں میں لے ڈھالتا ہے۔ اگر افسانہ نگار ہوتا ہے تو اس پر افسانوی پلاٹ ترتیب دیتا ہے۔ حاصل یہ کہ مختلف تعبیرات کی وجہ سے ہم شعور و احساس کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے بلکہ ماننا پڑتا ہے کہ بلاشبہ شعوری دنیا موجود ہے۔

بعض حالات میں انسان کو خوشی ہوتی ہے تو وہ اپنی مسرت کا اظہار مختلف انداز میں کرتا ہے مثلاً صدقات تقسیم کرتا ہے۔ مساکین کو کھانا کھلاتا ہے یا دوستوں کو پارٹی دیتا ہے، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ مسرت

کا اظہار ڈھول تماشوں اور ناچ رنگ کے ذریعہ کرتے ہیں اور نماز، دعا اور وظائف میں مشغول نظر آتے ہیں، کبھی کسی خوشی میں چہرہ مسرت سے تمتما اٹھتا ہے اور فرطِ خوشی میں آنکھوں سے آنسو چھوٹ پڑتے ہیں۔ اس میں کیسے شک کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی اقتضائے طبع کے مطابق مختلف مواقع پر اپنے فطری ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔

ان بدیہی کیفیتوں کو علمی مسلمات میں جب کہ ناقابلِ انکار مقام حاصل ہے تو ایمان بالغیب کے مسئلہ مسائل میں بھی ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری عقل اس اذلی حیثیت کو مانتی ہے اور صرف بداہت کی وحی یا صرف تسلیم پر اعتماد نہیں کرتی ہے۔

کمالِ مطلق وہ وجود ہے جو عقول کی حدود میں داخل نہیں اور علم و تحقیق کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتا۔ پھر اس باب میں وہ کون سی چیز ہے جس پر عقل اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے۔

عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ ایمان کا سبب ہی خود ایمان کا مطالبہ ہے۔ چونکہ کوئی بھی عقل یا علم اس کو صحیح قرار نہیں دے سکتے۔ بلکہ عقل وہی فیصلہ صادر کر سکتی ہے جس کو واقعہ نے بھی صادر کیا ہو اور فہم و احساس کا اس پر اتفاق بھی ہو۔ یعنی ہمیں صرف عقل یا صرف علم پر اکتفا کرتے ہوئے اس وجود پر ایمان نہیں لانا چاہیے۔ جو ایمان کا مستحق ہے۔ ہمیں یہ راز بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہدایت کا قابلِ یقین شعور، معرفت ہی میں عقل و علم کی مساعی کو تکمیل بخشتا ہے۔ ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا حالانکہ تمام عقلی و علمی مسائل میں یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ کا تعلق تمام جوہر و عرض اور ظاہر و باطن کے وجود سے وابستہ ہے اور تمام عالم و معلوم اور عقل و معقول کی گتھیاں اسی سے سلجھتی ہیں۔

علمائے معاصرین میں سے ایک گروہ نے غیبی امور اور عقیدۂ الہیہ کی تفسیر و توضیح میں اس موقف کو چھوڑ کر ایک دوسرا موقف پسند کیا ہے۔ اکثریت کے لحاظ سے اس گروہ میں وہی بیالوجی کے علما ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ وہ حیات کے نشو و ارتقاء کے لیے مادی قوتوں کے علاوہ اور کسی قوت کے فرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

مگر افسوس ان کے اس علم کو کوئی خاص مفاد حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ہمیں ایک ایسے مکان کی نشاندہی نہ کریں، جس میں جماد سے حیات پھوٹی ہے۔ جیسا کہ ارتقاء سے پیشتر کے متعلق انہوں نے دعویٰ پیش کیا ہے یا جس روز ہمیں کھلی آنکھوں دکھلایا جائے کہ ایک خلیہ سے انسان پھوٹ رہا ہے پھر وہ ایک خلیہ اسی جیسا بنا کر دکھائیں کہ اس سے اسی جیسا انسان نکل رہا ہے اور اس میں وہی خصائل و عادات ہیں جو ہزاروں سال پیشتر سے اس کے آباؤ اجداد میں چلی آتی ہیں۔

کیمیا کے ماہرین کہتے ہیں کہ شعاعیں مادہ کی تفسیر اور اس کی عضوی و غیر عضوی ترکیبوں کے سمجھ لینے کے لیے کافی ہیں، مگر اس گروہ سے بھی وہی سوال ہوتا ہے جو دیگر فلاسفہ سے ہم نے کیا ہے۔ یعنی ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ شعاع فضا کو بھر دیتی ہے۔ اس نظریہ کی تحلیل کے بعد انہیں چاہیے کہ یہ دکھلائیں کہ کس جگہ شعاع ذرہ میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر یہ ذرہ کہاں ایک جاندار خلیہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ یہ ثابت کر دیں گے تو اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والوں کے یقین کو "باطل نہ کر سکیں گے"۔ کیونکہ صنعت کا عمل اتفاقاً ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ ذہن کو ایک صانع کی طرف لوٹاتا ہے۔ جس نے جیسا چاہا ویسا ہو گا۔

حقیقت الہیہ کا انکار بہت دشوار اور کٹھن مرحلہ ہے۔ بڑے بڑے منکرین نے اس کا انکار بھی کیا مگر کائنات کے نظام میں انہیں بالآخر "عقل" نام کی کسی چیز پر ایمان لانا پڑا۔ اگر کوئی ارادۂ الہیہ سے کائنات کی تشریح کا رشتہ جوڑتا ہے تو وہ اسے عقل و ضمیر کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ان دو گروہوں کے علاوہ اور بھی بہت سے مختلف الخیال علمائے طبیعیات و ریاضی ہیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ منکرین کے مقابلہ میں ان علماء کا مقام بلند تر ہے جو طبیعیات و ریاضیات کے جامع ہیں، کیونکہ ان منکروں کی بہ نسبت ان جامع علماء کو علوم متعلقہ میں زیادہ پائیدار و مستحکم مرتبہ حاصل ہے۔

جب کہ عصر میں تقابل کا سوال پیدا ہی ہو گیا تو سمجھنا چاہیے کہ الٰہیات میں مباحث کے لحاظ سے سب سے زیادہ بلندی سائنس کے ماہرین افلاک کو حاصل ہے۔ کیونکہ ماہرین فلکیات کا بدیہیات عقل پر اعتماد ہوتا ہے اور ماہر طبیعیات کا اعتماد محسوسات خارجیہ کے تجارب پر ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ شخص جو ان دونوں علوم کا جامع ہو گا۔ یعنی ایک طرف عقل و مشاہدہ کے دلائل اس کے پیش نظر ہوں گے تو دوسری طرف وہ فلکیاتی نظام اور حیات ارضی کے مسائل پر نظر رکھتا ہو گا۔ وہی شخص مسئلہ الٰہیات میں صاحب الرائے کہلانے کے قابل ہو سکتا ہے۔ ان مباحث میں ریاضی کو تنقیدی مقام حاصل ہے کیونکہ اس کے پاس جدید انکشافات کی روشنیاں ہیں جو سائنسی علوم میں متعدد گرہوں کو کھولتی ہیں۔ مستقبل میں کیا عجب ہے ریاضی کے ماہرین کو تمام کائنات ایک مربوط تنظیم کے ساتھ بنے ہوئے کپڑے کے تاروں کی طرح سیدھی اور صاف نظر آ جائے اور پرانے ماہرین افلاک کا یہ قول ثابت ہو کر رہ جائے کہ "خدا انجینئرنگ کرتا ہے"۔ اور علم ہندسہ خدا کی حکمتوں اور تمام علوی و سفلی مخلوقات میں مدبرانہ تنظیم سے پردے ہٹاتا ہے۔

ان علماء میں ایک بڑی شخصیت کا مالک سر آرتھر ڈ بجون ---- کہتا ہے کہ "حرکتِ الٰہیہ" سے کائنات کی تشریح کرنا علوم جدیدہ کی نظر میں غلط ہے۔ وہ ریاضی کی نسبتوں کا ادراک کرتا ہے اور کائنات اور اپنی عقلوں میں ایک مضبوط تعلق محسوس کرتا ہے۔ اگر حرکتِ الٰہیہ کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ مستقبل میں ایک "آلی انسان" پیدا کر دے تو عقلاً تخیل میں یہ کس طرح بٹھلایا جائے کہ یہ انسان حقیقت کا سائل بن کر حق و باطل کے اسباب پر فکر بھی کر سکے گا۔ حقیقت طلبی کا یہ شوق ہی دراصل انسانی حیات کا لب لباب ہے، جب سے انسان فطرت کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے، اس کی فطرت میں حقیقت رسی کی یہ امنگ ہی اس کے وجود کا محور ثابت ہوتی رہی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو اردگرد کے دیگر مظاہر سے مغائر بناتی ہے اور اسے ایک قوتِ روحانی ثابت کرتی ہے---- اگر انسانی قلب سے یہ آواز سنائی دے کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ تو اس پکار کا صحیح جواب یہ نہ ہو گا کہ یہ تمام کائنات منتشر مادی ذرات کا مجموعہ ہے، یا یہ تارے ہیں جو ادھر ادھر گردش کرتے ہوئے کسی جانب رواں دواں ہیں---- یہ جواب مناسب نہیں بلکہ اس تمام کائنات کے پیچھے ایک روح کارفرما ہے۔ وہ روح ذات کو اسی قدر نشوونما بخشتی ہے جس قدر اس میں خیر و جمال کی طرف بڑھنے کی آرزو پائی جاتی ہے"----

ماہرین سائنس و فلکیات کے گروہ میں جس شخص نے اس نظر سے حقیقتِ الٰہیہ کا مطالعہ کیا ہے وہ ایک بڑا محقق جینز ہے جو شعاعوں اور ذرات کے متعدد مباحث کا خالق سمجھا جاتا ہے۔ آلی تشریحات کو یہ بھی ڈ بجون کی طرح قابلِ تردید خیال کرتے ہوئے نسب ریاضی سے وجودِ خداوندی پر استدلال قائم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "مادہ کی

دنیا کے سامنے عقل کو طفیلی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم سے پیشتر چند لوگ یہ خیال کر چکے ہیں بلکہ ہم اس امکان کے بھی قائل ہیں کہ اس کو دیکھ سکیں گے اور اس کی عزت و تمجید کر سکیں گے۔ کیونکہ وہ عقل مادہ کی دنیا کی خالق اور اس پر محافظ ہے۔ عقل سے مقصود ہماری اپنی انسانی عقول نہیں۔۔۔ بلکہ وہ عقلِ عظیم مقصود ہے جس کے پرتو سے وہ ذرات وجود میں آئے جن سے ہماری عقلیں نشوونما پا رہی ہیں۔۔۔ نسب ریاضی کے متعلق یہ بنیادی نقطہ نظر ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ ریاضی حقائق ہیں عقلی دریافت [illegible] چاہیے۔ ہم نے انہیں دریافت کیا اور تمام ماحول پر مطابق پایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت کائنات و حیات کے قوانین میں سے یہ بھی مضبوط قوانین ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی عقلِ الٰہی کی عطا کردہ روشنی ہے جو اس نے ہمارے افکار میں ودیعت کی ہے۔ حاصل یہ کہ کائنات کو "فکر عظیم" کہنا زیادہ بہتر ہوگا نہ کہ [illegible] عظیم یعنی انسانی دماغ میں اٹھتے ہوئے افکار سے کہیں زیادہ پُرخطر اور پُرعظمت "فکر عظیم" ہے۔

علامہ البرٹ آئن سٹائن جو طبیعیات و ریاضیات میں حجت اور فلسفہ اور فن موسیقی میں بڑی قابلیت کا مالک سمجھا گیا ہے، خدا کے وجود پر بڑا مضبوط ایمان رکھتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے، ہر دور میں دینی عظمت رکھنے والے عبقری ایک ایسے دینی شعور سے متعارف ہوتے رہے ہیں جو خلاف واقعہ اور غلط نسبت نہیں رکھتا۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی صورتوں میں خدا نمودار ہوتا رہا ہے۔۔۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ کائناتی دینی شعور ایک انسان سے دوسرے انسان کی طرف منتقل ہوتا ہو جب کہ اس کا کسی معین صورت میں ظہور نہ ہو ہو، میں سمجھتا ہوں کہ علم اور فن کی خدمات میں سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ اس شعور کو بیدار رکھے اور ان لوگوں میں جو اس شعور کے لیے ہمہ تن تیار ہیں، اس کو زندہ و پائندہ رکھے۔

انہی علمائے کبار میں سے جو بڑے دین پرست واقع ہوئے اور صرف عقل و ضمیر میں اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان کو کافی نہیں سمجھتے سر اولیفر لاج ہیں جو مشہور ماہر ریاضیات و طبیعیات تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ اور روح پر ایمان رکھتے تھے۔ نماز کے فوائد کے قائل تھے اور اس لوگوں کی تردید کرتے تھے جو اپنے غلط تصور کی بنا پر ابدی قوانین اور ادیان کو متناقض خیال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے نفوس کو یوں تصور کرتے ہیں گویا وہ کائنات سے علیحدہ اور جداگانہ ہیں۔ وہ اس میں خود عامل و حکمران ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کائنات کے مظاہر کو تبدیل کر کے کسی ایسے نظام میں پناہ لیں جو ان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے قویٰ پر مشتمل ہو"۔۔۔ "لیکن اگر ہم ذہانت سے کام لیں تو معلوم ہو گا کہ ہم اس تمام نظام کا ایک مضبوط جزو ہیں۔ ہماری رغبتیں اور خواہشات ایک پرسکون اور تسلط رکھنے والے ارادہ کی صدائے بازگشت ہیں، جسے ہماری عقلوں کے مؤثر ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہم اس عقلِ مؤثر کی روشنی میں چلیں تو کائناتی قوانین اس کی تصدیق کرتے ہیں"۔

سر اولیفر اس کو ایک نہایت عمدہ قسم کی جمہوری ریاست سے تشبیہ دیتا ہے۔ جس کی پارلیمان میں تمام قوم کے منتخب نمائندے دستور سازی میں مشغول ہوں جس سے قومی خواہش اور اصولِ سلطنت میں بہت اعلیٰ پیمانہ کی ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔

ایمان پرست علماء کی کتابیں یورپ میں کثرت سے پڑھی جا رہی ہیں جن میں وہ وجودِ الٰہی پر اپنے افکار و آرائ پیش کر رہے ہیں۔ وہ ان اسباب سے بحث کر رہے ہیں جو ان کے ایمان کے لیے داعی ہوئے اور جن سے

ایمانی تدبیر پر ان کو یقین و وثوق حاصل ہوا۔ انہیں کتابوں میں ایک نئی کتاب پروفیسر کریسی[1] موریسن کی تصنیف ہے جو نیویارک کی سائنسی مجلس کا صدر رہا ہے۔ کتاب کا نام ہے "انسان تنہا نہیں" اس میں حقیقتِ الٰہیہ پر ایمان لانے کی مختلف سات وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ یہ وجوہ ماہرین ریاضیات و طبیعیات کے نزدیک ناقابلِ تردید افکار پر مبنی ہیں۔ ان میں ایک قطعی لزوم موجود ہے جس میں بھی اتفاقی واقعہ کا امکان کروڑوں میں ایک کی نسبت سے بھی موجود نہیں۔ ان سات اسباب میں سے سب سے قوی سبب قوت تناسل[2] پر تحقیقی تبصرہ ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ "نہایت وثوق ہی سے کام لے کر اگر ہم بالفرض تمام ان نسلی مادوں کو جمع سے کہ تمام روئے زمین پر بسنے والے انسان پیدا ہوئے ایک جگہ جمع کریں تو ایک انگشتانہ سے زیادہ نہ ہوں گے۔ لیکن اس قلیل ترین مقدار میں وہ تمام خصائص موجود ہوں گے جو ہر جاندار میں الگ الگ ہوتے ہیں اور وہ تمام خصوصیات اور فطری اسرار بیک وقت اس مادہ میں جمع ہوں گے جن سے دنیا بھر کے انسان متصف ہو سکیں"۔۔۔ پھر کہتا ہے "انگشتانہ نہایت چھوٹا ظرف ہے لیکن اس میں کروڑوں مختلف انسانوں کی تمام خصوصیات پر احاطہ کر لیا گیا۔ یہ ایک واقعہ ہے جس میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ غور طلب مقام ہے کہ ان نسلی اجزاء میں اسلاف کے گروہ کے گروہ کس طرح اپنی تمام تخلیقی عوامل کے ساتھ جمع ہو گئے اور ہر فرد کی منفرد حقیقتیں اس چھوٹے سے حیز میں کیونکر جمع ہو گئیں"۔

اس معمولی سی مثال میں تمام وہ تفصیلی دلائل پیش کر دیے گئے ہیں جنہیں ایک عالم ریاضیات ہی پیش کر سکتا ہے۔ کیونکہ نر و مادہ کی تخلیق ہی ایک بڑا معجزہ ہے جس سے حیات کی تخلیق اور جانداروں کے بقاء کے لیے اسبابِ دائمی کے اثبات پر کافی واضح دلیل فراہم ہو جاتی ہے۔ اس اعجاز نے مختلف اور متنوع طبائع پر ایسی بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ جو واقف و ناواقف کسی پر بھی مخفی نہیں۔ مگر دقت نظر کا یہ بلند مقام ایک عالم طبعیات ہی کو زیب دیتا ہے کہ وہ اس دلیل کو کئی گناہ وزنی ثابت کر سکے۔ وہ ہمیں اس دلیل میں فطرت کی نہایت عمیق اور حیرت افروز قوت سے باخبر کرتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ حیات ایک ایسی قوت کا نام ہے جس کا تعلق دنیائے عقل ہی سے ہو سکتا ہے، عالم زمان و مکان سے نہیں۔ اس لیے کہ وہ حیز جو قوتِ تناسل کو جمع کر سکتا ہے، وہ انتہائی حقیر حجم کے باوجود تمام مادی ذرات کو جمع کر سکتا ہے۔ وہ قوئی کی ایک ایسی دنیا کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے جن کا اجسام کے ذروں میں نام و نشان بھی نہیں۔ حیرت افزائی اور تعجب انگیزی کے طور پر اگر کہا جائے کہ "اگر پیرس کو اٹھا کر ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر دیا جائے تو سننے والا اس کو ایک محال کی تصویر کشی اور غیر ممکن و فرضی عجوبہ کی دلچسپ آرزو قرار دے گا۔ لیکن واضح رہے کہ ہم اس مقام پر کسی فرضی یا خیالی آرزو کے درپے نہیں ہیں بلکہ تمام خیالی اور فرضی شکلوں سے بھی بڑھ کر عجیب ترین حقیقت کا سامنا کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ یہاں صرف پیرس ہی کو ایک ڈبیہ میں نہیں رکھا جا رہا ہے بلکہ پوری نوع انسانی کو ڈبیہ سے بھی چھوٹی چیز میں رکھا جا رہا ہے۔ یعنی ایک انگشتانہ میں جس میں زیادہ سے زیادہ صرف انگلی کو پورا سما سکتا ہے مگر بایں ہمہ تمام نفوسِ انسانی مع اپنے احساسات، مزاج، فطرت، عقول، افکار فلسفہ، موجدانہ ذہن و فکر، عقائد، اخلاق، شوق، جسمانی خصوصیات و عیوب محاسن یا آپس کے مختلف تعلقات، بیگانگی اور یگانگت وغیرہ کے اس چیز میں جمع نظر آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کھلی آیت و دلیل کے بعد بھی اگر کسی کا علم عقول تک رسائی سے مانع ہو تو اس سے علم کی سعی و جستجو معلوم۔ ایسی صورت میں نہ یہ کسی چیز تک پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی حقیقت اس تک پہنچ

سکتی ہے۔

لیکن اس بے حسی اور عقلوں کو شل کر دینے والے تعطل کے دور اور عدم کو نہیں گردانا جا سکتا جو انسان سے اعتقادی شجاعت و حوصلہ کو کم کر دے۔ اس انکار کا جواب ایک ہی ہے کہ شک والا جاہل ہے عالم نہیں۔ لہٰذا ایسے "عالم" کو اعلان کر دینا چاہیے کہ وہ جاہل ہے اور مسئلہ کی حدود پر احاطہ کرنا اور واقف ہونا اس کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن بہرحال اسے یہ یقین کرنا ہوگا کہ وہ جس چیز سے دانستہ یا نادانستہ ناواقف ہے اور اس کے حدود پر احاطہ نہیں کر سکا وہ بلاشبہ اپنی جگہ پر موجود ہے۔

موضوع بحث پر آخری نظر

اس کتاب کے صفحات میں ہم نے جو پُرپیچ وادیاں قطع کیں، اس راہ میں انسانیت کے بڑے سفر کو دیکھتے ہوئے ہمارا یہ سفر کوئی زیادہ طویل نظر نہیں آتا اور غالباً اس راہ کے جس قدر کٹھن مرحلے باقی ہیں وہ بھی ہمارے پیش نظر ہیں۔ کیونکہ ابدی حقیقت تک رسائی کی سعی و جستجو نہ ختم ہونے والی سعی ہے جو ہر دور اور گردو میں برابر جاری رہے گی۔

ہم نے اختصار سے کام لیا ہے اور یہ ضروری بھی تھا لیکن اختصار کے ساتھ یہ مقصد بھی سامنے رہا ہے کہ ضروری مباحث کی طرف اشارہ کرنے میں مناسب وضاحت سے کام لیا جائے اور ان نتائج کو کافی واضح کیا جائے۔ جن کی ہمارے ضمیر و عقل کو تلاش ہے۔ خواہ گفتگو دینی عقاید سے ہو یا نظری بحثوں سے۔

متعلقہ موضوع کے خاتمہ پر ہم حسب ذیل نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔

پہلا نتیجہ یہ ہے کہ عقائدِ الٰہیہ میں توحید کا مقام اعلیٰ ترین مقام ہے اور یہ کہ توحید ہی انسان کی عقلی اور فطری صلاحیتوں کے لیے موزوں ترین چیز ہے۔ لیکن واضح رہے کہ انسان توحید کے مقام پر دفعتہً نہیں پہنچ گیا اور پہنچنے پر بھی وہ اس کے صحیح مقام کو نہیں پا سکا۔ بلکہ اس دوڑ میں اس نے ٹھوکریں کھائیں۔ عقل و شعور کے قدم لڑکھڑائے اور معاشرتی و اجتماعی بندھنوں میں زمانہ بزمانہ وہ الجھا رہا ہے۔ اس لیے وہ اس عقیدہ سے اسی قدر حصہ پا سکا جس قدر کہ اس کی فہم نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کو کسی نئے قدم کی دریافت اس وقت ہو سکی جب کہ وہ کچھ اسباب و مقدمات سے دوچار ہوا۔ بہرحال اس کا علم اسے اخلاق و معرفت کی طرف برابر دھکیلتا رہا۔

اس تمام غایت و مقصد میں وہ جو قدم بھی اٹھا رہا تھا کوئی چیز اس کے لیے قابلِ اعتراض نہ تھی اور حقیقت کبریٰ تک رسائی کے لیے اس کی جادہ پیمائی کوئی معیوب روش نہ تھی۔ کیونکہ انسانی معرفت کا حقیقتِ کبریٰ تک یک بارگی پہنچنا محال تھا۔ قدم بقدم آگے بڑھنا اس کی اس عام فطری رفتار کا مظاہرہ تھا۔ ان طویل مدتوں میں تمام علوم اور صنعتوں پر ایک ایک کر کے عبور حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ انسان اپنی پہلی ہی نشأت میں وجودِ اکبر کی حقیقت کو کامل صورت میں جان سکتا۔ کیونکہ اس پر ہزاروں سال ایسی حالت میں گذر گئے کہ اس کے سامنے اپنی بقا کے علاوہ کوئی مقصد نہ تھا۔

اگر وہ اپنے لئے غذا فراہم کرنے سے پیشتر "وجودِ مطلق" کا ادراک نہیں کر سکا تو اس پر حیران ہونا صحیح نہیں۔ اس بناء پر ہم عقیدہ کی حقیقت اور کائنات کے اسرار کے سلسلہ میں اس کی کوششوں پر شک نہیں کر

سکتے۔ بلکہ اگر اس کی رفتار اس کے برخلاف ہوتی تو یہ تعجب کی بات تھی۔

دوسرا نتیجہ جس کو عقلاً پسندیدہ حیثیت حاصل ہے اور وہ ہمارے ضمیر کا مطلوب بھی ہے یہ ہے کہ خدا ایک وحد معین "ذات" ہے۔ اس کے سوا عقلاً ہر صورت غلط ہے۔

ہم وہ قول لکھ چکے ہیں جو احکام و افکار قیاس اور معیار پر ایک دوسرے سے کافی مشابہ ہیں۔ ان تمام قوال میں ایک چیز اجماعی ور متفق علیہ نظر آتی ہے۔ حالانکہ ایسے امور میں اجماع کا حاصل ہو جانا بظاہر دشوار ہے، بہر حال وہ اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ مطلقاً کائنات کا اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ وجودی "ذات" ہونے سے خالی نہیں۔

متقدمین فلاسفہ نے عقل و ہیولیٰ کا ذکر قائم کیا۔ دورِ حاضر کے فلاسفہ نے نشوو ارتقاء کا نظریہ دریافت کیا۔ نشوونما ماننے والوں نے بقائے اصلح یا انتخاب کا اصول تسلیم کیا اور دیگر تمام مفکرین ایک رائے پر متفق ہیں اور وہ یہ کہ ارتقاء وجودِ غیر ذات سے ترقی کر کے وجودِ ذات تک پہنچنے کا نام ہے۔

چنانچہ وہ جماد جس میں کوئی تعین نہ ہو۔ اس جماد کے مقابلہ میں حقیر ہے جس میں معین اجزاء ہوں اور اشکال و صفات اس کو ممتاز کرتی ہوں۔

یہ جماد نبات کے مقابلہ میں حقیر ہے۔

نبات نے جوں جوں ترقی کی ایک ایک درخت اور ایک ایک پھل میں تعین کا ظہور ہوا اور تعیم کے بعد تخصیص کی صورتیں نمودار ہوئیں۔

یہی حال افراد حیوان کا ہے۔

یہی صورت افراد انسانی کی ہے۔

یہی وجود جب اپنے انتہائی ارتقاء تک پہنچا تو "ذات" ہو گیا۔ جس میں قطعاً کوئی تنوع نہ تھا، نہ اس میں کسی دوسری ذات سے التباس و تماثل تھا یہی وہ صحیح مقیاس ہے جس سے تمام کائنات میں درجاتِ کمال کو ترتیب دی جا سکتی ہے۔

لہٰذا وجودِ اکمل ذات سے مجرد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ عقل سلیم کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکتی کہ وہ ذات سے مجرد ہے جیسا کہ بعض ادیان میں یہی تخیل قائم کیا گیا ہے اور پھر وہ اس وہم میں مبتلا ہو جانے کے بعد طرح طرح کے متناقض افکار میں مبتلا ہو گئے۔

بات ظاہر ہے کہ عقل کو اس کے وجود کا علم ہے اور جب عقل کو اس کا علم ہو گیا تو وہ ذات ہی ہوا۔ لیکن اگر عقل کو اس کے وجود کا شعور حاصل نہیں تو وہ عقل عقل نہ ہوئی، اسے عقل کہنا اس کی درماندگی کا اعتراف کرنا ہے اور اس نام کے علاوہ کوئی اور نام تجویز کرنا محض سخن آرائی ہو گی۔۔۔۔ حاصل یہ کہ اگر وہ مادی قوت ہے تو اس کو کائناتی قوت سے علیحدہ اور جدا ماننے کا مفروضہ بے حقیقت ہو جائے گا اور اگر وہ قوت عقلیہ ہے تو قوتِ عاقلہ ذات کے علاوہ متصور نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد تیسرے نتیجہ کا نمبر آتا ہے اور وہ ہے اس ذات کا شعور و ادراک۔

اس سلسلہ میں "ذات" کے تصور کو چند معلوم صفات میں سے کسی صفت کے ساتھ مقید کرنے والوں نے جو بھی شرط عاید کی ہے، وہ بے بنیاد ہو جاتی ہے۔

یہ کہنا بے بنیاد ہو جاتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ" میں صفات موجود نہیں کیونکہ وہ تو بسیط ہے۔

یہ کہنا بھی بے بنیاد ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ ارادہ نہیں۔ کیونکہ ارادہ کا مطلب یہ ہے کہ چند حالتوں میں سے کسی حالت کو اختیار کیا جائے اور اللہ تعالیٰ حادث سے منزہ ہے۔ یہ کہنا بھی بے بنیاد ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہوتا کیونکہ وہ صرف اشرف المعقولات کا عالم ہے اور اشرف المعقولات اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم مادہ کے بسیط ہونے اور اس کے متعلقہ احکام سے ناواقف ہیں۔ ہمارا احساس صرف اجسام سے متعلق ہے۔ ہم اجسام ہی میں زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ ہم چونکہ مادۂ بسیط سے ناواقف ہیں، اس لیے متقدمین نے کہا کہ مادہ سراسر آگ، مٹی، ہوا اور پانی سے وجود میں آیا۔ پھر انہوں نے اس میں ترکیب کی علت یہ تلاش کی کہ عناصر کے تعدد اور مسلسل ذرات کے اختلاط سے یہ ترکیب وجود میں آئی۔ پھر ہم نے محسوس کیا کہ تمام ذرات شعاعوں پر مبنی ہوتے ہیں اور شعاعیں محسوسات و خیال میں سب سے زیادہ بسیط ہیں۔ متقدمین فلاسفہ کی رائے تھی کہ اجرامِ علوی ابدی ہیں۔ ان پر کوئی تغیر یا فساد رونما نہیں ہوتا کیونکہ وہ نورِ بسیط ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام اجسام نورِ بسیط ہیں۔ ہمیں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ فضا میں نور متحرک ہے۔۔۔ صدیاں کی صدیاں ہمارے اوپر اس حالت میں گزری ہیں کہ ہم بساطت کے احکام و صفات ہی سے ناواقف رہے ہیں۔ حرکت و سکون کے اوصاف کے بارے میں ہم اوہام کی دنیا میں گم گشتہ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک ایسے وصف پر قیاس کرتے ہوئے جس پر عقول کا احاطہ ہی نہیں ہو سکتا بساطتِ الٰہیہ کے احکام کا ہمیں کیسے علم ہو سکتا تھا؟

غور طلب مقام یہ ہے کہ آخر کس طرح سمجھ لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ بھی ہمارے ہی ارادہ کی طرح ہے؟ اور اس کا علم ہمارا سا علم ہے؟ اور وہ وجود ہی کیا ہوا، اگر وہ عدم کا مخالف نہ ہوا؟ اور عدم کا وہ کیونکر مخالف ہو سکتا ہے جبکہ وہ خود سلبی قسم کا ہو یعنی بطور ثبوت اس میں کوئی تاثیری قوت ہی موجود نہ ہو؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی عقیدہ محض صحیح اور کافی ہی نہیں بلکہ وہ ایک فلسفیانہ صداقت بھی ہے جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ "کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہو سکتی"۔ (لیس کمثلہ شیء)

ہماری تمام معلومات اس نقطے پر مرکوز ہونی چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ "کمالِ مطلق" ہے، اور محدود عقل، کمالِ مطلق پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ پھر اس عقل کو یہ سوال بھی زیب نہیں دیتا کہ پوچھے وہ کمالِ مطلق کس طرح ہے۔ فعال کیونکر ہے اور صاحبِ ارادہ کس طرح ہے؟

شعوری عقل ہمیں ایک چوتھے نتیجہ پر بھی پہنچاتی ہے۔ یعنی یہ کہ عقل و ایمان میں باہمی ایک رشتہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ عقلِ انسانی اگر ذاتِ الٰہی کے ادراک سے قاصر ہو تو ہم اس پر ایمان کیسے لا سکتے ہیں؟ اور کمالِ مطلق و انسان میں باہمی رشتہ و تعلق کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہم ایک اور سوال بطور تمہید اٹھاتے ہیں جس سے تمام بحث کا خاتمہ ہو جائے

گا۔ سوال یہ ہے کہ عقل سے کیا مراد ہے کہ ہم ایمان سے گریز اس لیے کریں تاکہ عقل کو کمالِ مطلق کا درجہ مل جائے؟ یا یہ مراد ہے کہ کمالِ مطلق کے درجہ سے نیچے ہم ایک معبود پر ایمان لائیں؟

حقیقت یہ ہے کہ واقعہ میں نہ یہ ہے نہ وہ۔ کیونکہ جو ذات ایمان کی مستحق ہے وہ ایک ایسا وجود ہے جو تمام صفات کے لحاظ سے کمالِ مطلق سے موصوف ہے۔ پھر یہ خیال قطعاً غیر معقول ہو گا کہ جو چیز ایمان کا سبب ہو وہی ایمان کو باطل بھی قرار دیتی ہو۔ ایسے ہی یہ خیال بھی غیر معقول قرار دیا جائے گا کہ کامل صفات کے ساتھ موصوف ایک معبود کے وجود کے ہوتے ہوئے، اس پر ایمان محال سمجھا جائے۔ اس تناقض سے نکلنے کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ خالق اور اس کی مخلوق کے درمیان تعلق صرف عقل پر موقوف نہ ہو۔۔۔ اس میں کون سی حیرانی کی بات ہے؟ تمام انسان وجود رکھتے ہیں اور وجودِ انسانی کے لیے تنہا عقل مقوم و مثبت نہیں ہو سکتی۔

تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ ایمان کے مسئلہ میں عقلِ انسانی کا کوئی واسطہ نہیں؟

ہرگز نہیں۔ حقیقت میں عقل کو بہت بڑا دخل ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ مدارِ عمل صرف عقل ہی نہیں ہے۔ عقل کی حدود کو سمجھنا اور ایک مقام پر پہنچ کر اس کی رفتارِ عمل کا باطل ہو جانا، دونوں جداگانہ مفہوم ہیں۔ ایمانیات میں عقل بے حد ضروری ہے۔ عقل ہی عقیدۂ شرک اور عقیدۂ توحید میں فرق کر سکتی ہے۔ عقل ہی کی بدولت ہم ادنیٰ ایمان اور اعلیٰ توحید کو سمجھ سکتے ہیں۔ مومن اور ایمان سے معطل ہونے والوں کے مقام میں عقل ہی تفریق کر سکتی ہے۔ عقل کی طاقت سے یہ ممکن ہے کہ جب وہ اپنے منتہا کو پہنچ جائے تو اگلے جہان کا انکار نہ کر دے۔ عقل ہی یہ سوال بھی پیدا کر سکتی ہے کہ خدا پر میرے لیے ایمان لانا آخر کیوں ناممکن ہے؟ کیا اس لیے کہ مومن کا ایمان جس کامل الصفت ہستی پر ہے میں خود ہی وہ صفات رکھتی ہوں؟ اگر ایسا ہونا ممکن نہیں تو مجھے بھی "دینی شعور" کو اپنا لینا چاہیے۔ کیونکہ اس سے کوئی مفر نہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو اس کو ابتدائی بنیاد ہی سے اختیار کر لینی ضروری ہے اور رہتی دنیا تک اختیار کرنی ہو گی۔

اس مقام پر خیر و شر کا وہ مشکل مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو کتابی ادیان کے وجود میں آنے کے بعد وجود میں آیا اور برابر چلتا رہا۔ تاآنکہ علم الکلام اور علم لاہوت کی پیچیدہ بحثوں میں سرفہرست سمجھا گیا۔ بلکہ کتابی ادیان سے پیشتر بھی یہی مسئلہ تھا جو "ثنویت" اور اللہ کے مادۂ ہیولیٰ کے مابین کتنے ہی واسطوں کے ماننے کا باعث ہوا۔ جب بھی ذاتِ الٰہی کے کمال پر بحث ہوئی اسی وقت یہ سوال اٹھا کہ دنیا میں نقص اور شر و عذاب کیوں ہے اور اس کے کمال کے ساتھ شر کی تطبیق کس طرح کی جائے؟

یہ سوال جس قدر مشہور و مسلسل چلا آتا ہے اسی قدر عجیب بھی ہے۔ کیونکہ کمالِ مطلق خالق کی صفت ہے مخلوقات کی نہیں اور ہر مخلوق محدود ہے۔ لہٰذا ہر محدود میں نقص ہونا بھی لازمی ہے خواہ وہ نقص کسی صورت سے بھی محسوس ہو۔ بدنمائی، شر اور عذاب سب کا یہی جواب ہو گا۔

قوش قرآن نمبر کی تقریبِ اجرا

نقوش قرآن نمبر کی تقریب اجرا کی رُوداد
اہلِ علم و قلم کی آراء و تبصرے

جاوید طفیل

محترم المقام صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ صاحب
گورنر پنجاب شاہد حامد صاحب
اور معزز خواتین و حضرات!

۱۹۹۸ء میں "نقوش" کے پچاس برس پورے ہو گئے ہیں۔ نقوش کی یہ نصف صدی اردو ادب کی خدمت کی ایک مسلمہ تاریخ ہے۔ نقوش نے جس موضوع پر کام کیا بفضل تعالیٰ اس کا حق ادا کیا۔ یہ میں نہیں کہتا، اہل نظر کہتے ہیں۔ موضوع ادب ہو یا ادیب، غزل ہو یا افسانہ، شاعر ہو یا شخصیت، مکاتیب ہوں یا آپ بیتی، طنز و مزاح ہو یا ادبی معرکے، اردو زبان و ادب کی کسی صنف پر پی ایچ ڈی کرنے والا نقوش سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

۱۹۸۱ء تک نقوش کے موضوعات غزل، افسانہ، مکاتیب، شخصیات، طنز و مزاح، لاہور، خطوط، پطرس، شوکت تھانوی، میر تقی میر، غالب، میر انیس اور اقبال تھے۔ ان مختلف ہولی موضوعات پر نقوش نے ۴۴۱۵۱ صفحات کا عظیم ورثہ اردو کو دیا۔ ۱۹۹۸ء تک تقریباً ۶۶۰۰۰ صفحات صاحبان علم کی خدمت میں پیش کئے جا چکے ہیں۔

یہ بات آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گی کہ مسجد شہدا لاہور کی تعمیر کے وقت اس کی بنیاد کے نیچے گہرائی میں ایک کیپسول خصوصی طور پر بنوا کر دفن کیا گیا تھا کہ خدانخواستہ اگر کبھی لاہور کا وجود نہ رہے تو مستقبل کا مورخ اس کیپسول کے ذریعے لاہور کی تاریخ کو دریافت کر سکے۔ اس کیپسول میں اس دور کی ٹکٹیں، سکے اور نقوش کا لاہور نمبر تھا۔

۱۹۸۲ء نقوش کی زندگی کا اہم ترین برس ہے جب نقوش نے سیرت رسولؐ پر اپنے کام کا آغاز کیا جس کو اہل علم نے سیرت نبویؐ پر اردو کا سب سے بڑا ذخیرہ قرار دیا۔ میں اس موقع پر صرف چند ایک حضرات کی رائے کا ذکر کروں گا۔

مولانا نعیم صدیقی کہتے ہیں:

"علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگ میل قائم کیا تھا۔ اب ویسا ہی دوسرا سنگ میل ـــ شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا ادارہ نقوش نے قائم کیا ہے۔ آج اردو زبان کے ذخیرۂ سیرتِ پاکؐ میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا ہے"۔

مولانا متین ہاشمی نے کہا:

"میرا ذاتی خیال ہے کہ سیرت پاکؐ سے متعلق مواد کا ایسا گلدستہ اور مجموعہ اردو تو کیا دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے گا"۔

مولانا سعید اکبر آبادی نے کہا:

نقوش قرآن نمبر
جلد اول و دوم
کی تقریب اجرا کے
موقع پر لی گئی
چند تصاویر

○○○○

سابق صدر پاکستان
جناب محمد رفیق تارڑ
حاضرین سے خطاب
کر رہے ہیں۔

حاضرین مجلس کی چند جھلکیاں

"اسے نمبر کیوں کہیے، یہ تو اردو زبان میں سیرت طیبہؐ کا انسائیکلوپیڈیا ہے"۔

جناب محمد طفیل نے سیرت پاکؐ پر اپنے کام کے بارے میں لکھا:

"آج ۱۹۸۲ء میں پورے اٹھارہ برس بعد اپنی محنت کے اعتبار سے، اپنی لگن کے اعتبار سے وہ حاصل زندگی نمبر پیش کر رہا ہوں جو کہ میرا سپنا تھا۔

۱۹۶۴ء میں چھپنے والا نمبر دنیاوی شخصیتوں کے بارے میں تھا۔ ۱۹۸۲ء میں چھپنے والا یہ نمبر صرف ایک ہستی کے بارے میں ہے جو دنیا کی تمام موجود اور مرحوم شخصیتوں سے اتم ہے، افضل ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے جس سے دین اور دنیا کا ناتا جڑا ہوا ہے۔

آج میری وہ آرزو پوری ہوئی جس کے لئے برسوں بے کل رہا۔ آج میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ حضورؐ سے میری بھی کوئی نسبت ہے۔ اس اعزاز پر خدا کی بارگاہ میں جتنے بھی سجدے کروں وہ کم ہوں گے کیونکہ میں بھی آپؐ کی شمار قطار میں ہوں"!

اب ۱۹۹۸ء ایک اور اہم سنگ میل یعنی نقوش کا 'قرآن نمبر' ـــ قرآن پاک پر کام کا آغاز ۱۹۶۴ء میں سیرت رسولؐ کے ساتھ ہی ہوا۔ یہ دو نسلوں کی عاجزانہ کاوش ہے۔ اس کی پہلی دو جلدیں اب منظر عام پر آئی ہیں۔ قرآن پاک اور سیرت رسولؐ ایسے موضوعات ہیں جن کا حق ادا کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف توفیق اور انعام والا معاملہ ہے۔ قرآن پاک پر ۱۴۰۰ برس سے کام ہو رہا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ انسان کا اولین موضوع تھا اور ہے۔

قرآن نمبر کی کم از کم ۲۵ جلدیں پیش کی جائیں گی اور یوں انشاء اللہ جوں جوں ہمارا خاکہ مکمل ہوتا جائے گا، نقوش کا قرآن نمبر، قرآن پاک پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت اختیار کرتا جائے گا۔ نقوش کا قرآن نمبر اپنے آپ کو اور آئندہ نسلوں کو سنوارنے کی ایک اہم کوشش ہے۔

قرآن نمبر کی پہلی دو جلدیں دیکھ کر میرے ایک بزرگ نے، جو پاکستان میں حمد اور نعت کے حوالے سے اہم ترین شخصیت ہیں، مجھ سے پوچھا کہ کیا حمد کے انتخاب میں میری حمد بھی شامل ہو گی؟ میں نے ادب سے عرض کی کہ اس انتخاب میں کوئی زندہ شخصیت شامل نہیں ہے۔ انہوں نے زار و قطار روتے ہوئے کہا کہ اگر آپ کی شرط یہ ہے کہ کوئی زندہ شخصیت اس انتخاب میں شامل نہیں ہو سکتی تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے موت دے تاکہ میں اس سعادت سے محروم نہ رہ جاؤں۔

میں صدر محترم آپ کا، گورنر صاحب آپ کا اور سب خواتین و حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نقوش قرآن نمبر کی رسم اجرا میں تشریف لائے اور مجھے سرفراز کیا۔

———

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

عزت مآب جناب صدر پاکستان
محترم گورنر صاحب
معزز خواتین و حضرات!

عربی زبان کی ایک ضرب المثل ہے کہ من شابه اباه فلا ظلم (جو اپنے باپ جیسا ہو گیا اس نے کونسی برائی کی)۔ یہ مثل جناب طفیل کے فرزند ارجمند جناب جاوید پر حرف بحرف صادق آتی ہے۔ جس باپ کی اولاد اچھی اور نیک ہو اس کی نیک نامی میں اضافے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ یقیناً جس باپ کا بیٹا جاوید طفیل ہو وہ تو بہت خوش نصیب اور زندہ جاوید ہے، جاوید طفیل اپنے والد کے کام کو نہ صرف یہ کہ جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ آگے بڑھا رہے ہیں۔ وہ بلاشبہ اپنے والد مرحوم کی آن بان اور شان کے لئے ایک دائمی خراج تحسین ہیں۔

رسولؐ نمبر کے بعد نقوش کا قرآن نمبر آنا ضروری تھا اس لئے کہ صاحب قرآن کے ساتھ اگر قرآن کی بات نہ ہو تو بات نامکمل رہے گی۔ قرآن کریم کو رسولؐ کریم سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ذکر قرآن کے بغیر ذکر رسولؐ نامکمل رہتا ہے کیونکہ قرآن کریم وہ کتاب زندہ ہے جو سیرت رسولؐ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خراج تحسین بھی ہے۔ قرآن کریم نے رسول کریمؐ کے متعلق فرمایا کہ انک لعلی خلق عظیم (آپ کا ذکر تو خلق عظیم ہے)۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کان خلقه القرآن یعنی آپؐ کی سیرت و اخلاق تو قرآن ہے۔ آپ تو چلتا پھرتا قرآن تھے۔ اس لئے رسولؐ نمبر کے بعد قرآن نمبر ضروری اور واجب تھا۔ جاوید طفیل صاحب یہ فریضہ انجام دے کر اپنے والد کی روح کے لئے تسکین اور مغفرت کا سامان بھی کر رہے ہیں اور ان کی ایک آرزو پوری کر کے انہیں خراج تحسین بھی پیش کر رہے ہیں۔

نقوش علم و ادب کی دنیا میں روشن ترین اور انمٹ نقش کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں اردو ادب کا مؤرخ نقوش کا نام لئے بغیر اپنے منصب میں کوتاہی کا مرتکب سمجھا جائے گا اور آنے والے وقتوں میں نقوش ایک ایسا مصدر و ماخذ قرار پائے گا جو تشنگان علم و ادب کے لئے سیرابی و تسکین کا سامان مہیا کرے گا اور بحث و تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک معتبر حوالہ اور مضبوط سہارا ثابت ہو گا۔

نقوش کے قرآن نمبر کی پہلی اور دوسری جلد کے تمام مقالات علم و معرفت کا نچوڑ اور جامع معلومات کا خزینہ ہیں۔ مگر پہلے حصے میں جناب محمد فارس برکات کا مقالہ جو مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمے آیات کے ساتھ شامل اشاعت ہے اور دوسرے حصے میں جناب جمشید احمد ندوی کا مقالہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ تاہم ان دونوں جلدوں میں جناب ڈاکٹر محمد لیٰسین مظہر صدیقی کے دو مقالات بہت قیمتی سرمایۂ علم کے زمرے میں آتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی نقوش کے قرآن نمبر نے رسولؐ نمبر کی یاد تازہ کر دی ہے۔ وہی حسن ترتیب، طباعت کی وہی رعنائیاں، قیمتی معلومات کا وہی خوبصورت ذخیرہ اور تقدیم و پیشکش کا وہی اسلوب و انداز جو رسولؐ نمبر کا امتیاز تھا قرآن نمبر میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آیا۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ جناب محمد طفیل مرحوم و

مغفور پھر سے جی اٹھے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاالرحمٰن ندوی

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی محمد و آله واصحابه اجمعین

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر عالی قدر عزت مآب جناب محمد رفیق تارڑ صاحب
مہمان خصوصی و صدر نشین جشن اجراء قرآن نمبر
قابل احترام گورنر پنجاب جناب شاہد حامد صاحب
ادارہ نقوش کے رگ و پے میں جاری و ساری روح طفیل اور اس کے موجودہ پیکر جمیل حضرت جاوید طفیل
معزز شرکائے جشن، محترم خواتین و حضرات!
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ:

آپ کا یہ دور افتادہ بھائی جس کی آنکھیں کم و بیش نصف صدی سے اس "ارض پاک" کی دید کو ترس رہی تھیں آج اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر پا کر اپنی قسمت پر نازاں ہے۔ اپنے نصیب ور ہونے کی خوش فہمی تو مجھے کبھی نہ تھی تاہم پروفیسر لیسین مظہر صدیقی ندوی جنہیں خدا نے علم و تحقیق کی ہر محفل میں سرخروئی بخشی ہے، جو "خانوادۂ نقوش" کے لئے گھر کے فرد ہیں اور میرے لئے تو ان کی شخصیت "ہمدم دیرینہ" کی ہے جن سے اس "جہان رنگ و بو" کی واردات و کیفیات جاننے کا ہمیشہ آرزومند رہا کرتا تھا، انہوں نے جب یہ خوش خبری سنائی کہ قرعہ فال اب کے تمہارے نام بھی ہے، تو محسوس ہوا کہ "آہ محروماں" کے بغیر بھی کبھی "اجابت از درحق بہر استقبال" آ جایا کرتی ہے:

جب سے سنا ہے اہل جنوں کا آ گیا نام اسیروں میں
اہل خرد کچھ دیکھ رہے ہیں ہاتھ کی چند لکیروں میں

حضرات! رسالہ نقوش کا نقش اول پچاس برس قبل جب پردۂ صحافت پر ابھرا تھا تو وقت کی چشم دوربیں نے اسی دن اس کے روزافزوں نور و نکہت کا مشاہدہ کر لیا ہو گا۔ یقیناً وہ اس پرخلوص جدوجہد کی معراج تھی جب بانی نقوش نے سیرت محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل "رسولؐ نمبر" ایک دو نہیں پوری تیرہ جلدوں میں پیش کیا، اور شبلیؒ و سلیمانؒ کے بعد جو "چندے مقیم آستان غیر" رہ کر "پیغمبر خاتم" کی سیرت نگاری کی بدولت "خاتمہ بالخیر" کی ضمانت لئے ہوئے اپنے ساتھ اپنے قاریوں کی عاقبت بھی سنوار گئے۔

اردو زبان میں سیرت نبویؐ کا یہ "نقش ثانی" اتنا آبدار، نیکھا اور تابدار ہے جس کی تب و تاب نے دنیا کے تمام سوانحی ادب کی نگاہیں خیرہ کر ڈالی ہیں۔ پہلے "رسولؐ نمبر" پھر "قرآن نمبر" کی یہ ترتیب بھی بجائے خود بہت معنی خیز ہے کہ یہ آدم خاکی اسی ترتیب کے ساتھ دونوں سے روشناس ہوا تھا۔

پچیس متوقع جلدوں پر مشتمل قرآن نمبر کا یہ عظیم منصوبہ جس کی قسط وار تکمیل کا آج آغاز ہو رہا ہے

اور جس کی تقریب اجرا میں ہم سب بہ طفیلِ جاوید طفیل یہاں جمع ہیں ایک ایسی دنیا کی سیر کراتا ہے جو اپنے سیاح کا رشتہ اس کے خالق و پالنہار سے براہِ راست جوڑ دیتی ہے۔ یہ کتاب جو اس کائنات کی کتابِ زندگی کی حیثیت رکھتی ہے، اپنے صفحۂ اول سے بھی پہلے ایک "التماس" کے ذریعہ قاری کو اپنی رفاقت میں لے لیتی ہے جو مرحوم محمد طفیل کی تحریر ہے:

"جو خواہش مولانا محمود حسن صاحب کی تفسیر کے بارے میں تھی ویسی ہی خواہش میری اس نمبر کے بارے میں ہے۔ وہ عالم تھے، میں طالبِ علم ہوں، وہ پرہیزگار تھے، میں گنہگار ہوں۔ اس کے باوجود خواہش میری بھی وہی ہے کہ اس کام کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ لہٰذا اس نیکی میں آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔ مضامین لکھ کر بھی، موجودہ شماروں کے متعلق اپنی رائے سے نواز کر بھی، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کی جا سکے۔ جیسا کہ سیرت النبیؐ کے سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کا ساتھ دیا تھا۔"

اور اب ۱۹۹۸ء کی بات! جاوید طفیل کے قلم سے۔

"میرا اپنی اہلیت کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں۔ شاید میری حیثیت قرآن مجید کے طالبِ علم والی بھی نہ ہو، لیکن خواہش اپنے کئے ہوئے کام کو بہتر سے بہتر بنانے کی ہے۔ جو میرا کام تھا وہ میں نے کر دیا، اب جو آپ کا کام ہے اس کے لئے میں آپ سے ملتمس ہوں کہ اس نیکی میں آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

مذکورہ بالا دونوں اپیلوں کے تیور دیکھئے۔ صاف محسوس ہوگا کہ پدر و پسر دونوں شہ عرب و عجم کے کرم کی آس لگائے اس "گدا" کی مانند دلوں پر دستک دے رہے ہیں جسے قدرت نے امانِ سکندری عطا کیا ہے۔

"التماس" کے بعد پہلی جلد "قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا" کے ربانی اعلان کے بعد یوں طلوع ہو رہی ہے

"صفاتِ خالق کی ایک نہ ختم ہونے والی فہرست اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی انسانی خواہش اس وقت اور بھی معصوم اور بھلی لگتی ہے جب خواہش رکھنے والا یہ بھی جانتا ہو کہ اس کی خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔ حضرت انسان اپنی کم علمی و کم فہمی کے باوجود اپنے عجز اور اس کی رحمت کے سہارے اپنے کام میں مگن ہے اور رہے گا حتیٰ کہ صور پھونک دیا جائے اور دنیا کا کھیل ختم ہو جائے۔"

چھ سو باسٹھ (۶۶۲) صفحات پر محیط اس جلد میں "الٰہیات" کے عنوان سے محمد فارس برکات، "اللہ اپنے کلام میں" کے عنوان کے تحت پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، "قرآن کا تصورِ الٰہ" پر مولانا ابوالکلام آزاد، "قرآن کا تصور خدا" پر ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ، "باری تعالیٰ قرآنی دلائل کی روشنی میں" کے موضوع پر محمد عبدالسلام خاں، "سورۃ الحمد کی تفسیر ربانی" پر مولانا محمد یٰسین ندوی، اور "اللہ تعالیٰ کلام رسول میں" کے عنوان سے ڈاکٹر صلاح الدین عمری نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ تمام مصنفین قلم رو تحقیق کے شہ نشین ہیں اور تہِ دل سے ہماری تہنیت و تشکر کے مستحق ہیں۔

چھ سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل دوسری جلد کے افتتاحی کلمات ہماری توجہ اس طرح اپنی جانب مبذول کراتے ہیں:

"قرآن نمبر دو نسلوں کی عاجزانہ کاوش ہے، جس کا آغاز ۱۹۹۸ء میں ہوا۔ ہر برس اس کی دو جلدیں چھاپنے کا پروگرام ہے۔ ہمارے خاکے کے مطابق اس نمبر کی تکمیل کا تخمینہ ۲۰۱۰ء ہے (بشرط زندگی)"۔

دیکھئے اس شرط کو سن کر کون سا دل ایسا ہو گا جو ان کی صحت و زندگی کے لئے دعاگو اور آمین گذار نہ ہو۔

اس جلد کا "طلوع" اس انداز سے نظر افروز ہوتا ہے:

"انسانی علم مبالغہ کی آخری حد پر پہنچ جائے پھر بھی ان گنت صفاتِ الٰہیہ میں سے کسی ایک کا احاطہ کرنا انسانی فہم و ادراک سے آگے کی بات ہے"۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم — وز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم و خواندہ ایم

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

انسانی نارسائی کی یہ داستان ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسی سچائی کی طرف رہنمائی کی

"اس کی پہچان سے عاجز رہنے کی پہچان ہی اصل پہچان ہے۔ پس بے عیب ہے وہ جس نے اپنی مخلوق کے لئے اپنی پہچان کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں رکھا کہ اس کی پہچان سے عاجز رہنے کا اقرار کرے۔ انسانی نارسائی کا سچ اپنی جگہ، لیکن اللہ کے تصور کا نشہ اور اس کا سرور ایسا ہے کہ الفاظ کے سانچے میں نہیں ڈھلتا، زندگی کی خواہش بن جاتا ہے"۔

اس جلد کو سنوارا ہے اپنے قلم تحقیق رقم سے جمشید احمد ندوی نے "حمدِالٰہی اور خلفائے راشدین" کے عنوان سے، ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی نے "بسم اللہ الرحمان الرحیم ــ حمد اولیں" کے عنوان سے، مولانا نیئین ندوی نے "تفسیر سورۃ الحمد ــ عبد بہ عبد" کے عنوان سے۔ ان کے علاوہ اسماء و صفاتِ الٰہی کے حصہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا مضمون "اللہ تعالیٰ کی دو قرآنی صفات" پر، علامہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا مضمون "الرحمان اور الرحیم کے تفصیلی معارف" پر اور اسمائے حسنیٰ کے پرکشش موضوع پر، مولانا مشتاق احمد تجاروی کا قیمتی مضمون مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے۔

خواتین و حضرات! "رسولؐ نمبر" اور "قرآن نمبر" ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر اس دیار کی خاک پاک اگر افلاک کی ہمسری کا دعویٰ کرے تو ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہ ہو گی۔ اس بابرکت تقریب میں حاضری میرے لئے بڑے شرف و سعادت کی بات ہے۔ اس کے لئے میں دل کی گہرائیوں سے جناب جاوید طفیل اور ان کے رفقائے کار کا شکرگذار ہوں، بارگاہ ایزدی میں اس دعا کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ وہ اس "ارضِ پاک" کو قرآن و سنت کی بالادستی اور تنفیذ شریعت اسلامی کی سچی تجربہ گاہ بنا دے۔

اس دعا از ما و از جملہ جہاں آمین باد

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

عزت مآب محمد رفیق تارڑ صاحب صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان،
محترم المقام شاہد حامد صاحب، گورنر پنجاب اور
معزز خواتین و حضرات! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

یہ ایک مبارک دن اور مسعود ساعت ہے کہ ہم سب رسالہ نقوش لاہور کے نہایت اہم اور تاریخ ساز قرآن نمبر کی رسم اجراء میں شریک ہو رہے ہیں۔

نقوش اردو زبان کا سب سے ممتاز ادبی اور علمی مجلّہ ہے۔ اردو کی ادبی صحافت کا ارتقاء اسی بیسویں صدی میں ہوا ہے اور اس میں سب سے بڑا حصہ پنجاب کا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بھی اسی خطے کو بخشا کہ اردو کا سب سے مؤقر، معتبر اور معیار و مقدار میں سب سے بالاتر ادبی مجلّہ نقوش بھی لاہور سے شائع ہوتا ہے۔

نقوش ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا تھا۔ اب اس پر آدھی صدی گزر چکی ہے، ان پچاس برسوں میں اس رسالے نے اردو زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت کی ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت اس کے خاص نمبر رہے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب اردو کی کوئی ادبی تاریخ نقوش سے استفادہ کیے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔ اس کے ضخیم شماروں میں ادبی تاریخ کے تقریباً سب اہم پہلوؤں کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ نقوش کو یہ اعزاز و امتیاز اس کے ایڈیٹر محمد طفیل مرحوم کی ان تھک محنت اور غیر معمولی صلاحیت کی بدولت نصیب ہوا۔ انہوں نے اس رسالہ کے لئے خود کو ایسا وقف کر دیا تھا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ان کا نام ہی "محمد نقوش" رکھ دیا تھا۔

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے کہا تھا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں رکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

محمد طفیل مرحوم نے بھی برسوں تک چمنستان ادب کی آبیاری کر کے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو سیرۃ طیبہ کے موضوع پر ۱۳ جلدوں میں بے مثال رسولؐ نمبر وجود میں آ گیا جسے اردو زبان کا سیرۃ انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ رسولؐ نمبر کی اشاعت ان کا خاتمہ بالخیر ہونے کی علامت بھی بن گئی۔ یقین ہے کہ یہ ان کے لیے سب سے اچھا توشۂ آخرت ثابت ہوا ہو گا۔

عربی شاعر نے عباسی شہزادہ محمد کی مدح کہا تھا:

و اذا المطی بنا بلغن محمداً فظهورهنّ علی الرحال حرام

جب سواریاں ہمیں لے کر محمد تک پہنچ جائیں تو پھر ان کی پیٹھ کجاووں کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔

اگر ہم اس کی نسبت حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ رسولؐ نمبر کے بعد نقوش پر دوسرے موضوع حرام ہو گئے۔ اب اگر کسی موضوع کی گنجائش رہ جاتی ہے تو وہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی بے ہمتا ذات اور اس کی نازل کردہ کتاب معجز بیان قرآن کریم ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رسولؐ نمبر کے بعد محمد طفیل مرحوم نے قرآن نمبر کا خاکہ تیار کیا۔ ان کے خواب کی تعبیر آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن کریم تمام علوم اسلامیہ کا محور ہے۔ دوسری کوئی کتاب ایسی نہیں جس کی بدولت اور جس کے صدقے میں ہزاروں لاکھوں دوسری کتابیں وجود میں آ گئی ہوں۔ ڈیڑھ ہزار سال سے علمائے امت اس کی تفسیر و تشریح لکھ رہے ہیں اور آئندہ بھی ہزاروں برس تک لکھتے رہے گے۔ مگر آخر میں یہی کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے کہ

اے برتر از قیاس و گمان و خیال و وہم
وز ہر چہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایان رسیدہ عمر
ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

قرآن پاک اللہ جل جلالہ کا سچا کلام ہے جس کے ایک لفظ کن سے ایسی وسیع و عریض کائنات وجود میں آ گئی جس کے اور چھور کا آج تک کسی کو پتا نہیں۔ عاجز انسان کی محدود عقل اس کا ادراک کر ہی نہیں سکتی۔

قرآن نمبر کا جو خاکہ اب تک بنایا گیا ہے اس کی رو سے وہ ۲۵ جلدوں پر مشتمل ہو گا۔ اس کی پہلی اور دوسری جلد کا اجراء آج ہو رہا ہے۔ جس طرح رسولؐ نمبر اردو میں سیرۃ طیبہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے اسی طرح ان شاء اللہ قرآن نمبر اردو میں علوم قرآنیہ کا دائرۃ المعارف ثابت ہو گا۔

محترم خواتین و حضرات!

یہ ہمارے لیے فخر اور مسرت کی بات ہے کہ اردو کے سب سے بڑے علمی مجلہ نقوش کا سب سے بڑا اور ممتاز قرآن نمبر اس ملک کی سب سے زیادہ ممتاز و محترم اور دینی و علمی مزاج والی شخصیت صدر مملکت جناب محمد رفیق تارڑ کے مبارک ہاتھوں سے جاری کیا جا رہا ہے جو قرآن کریم اور اس سے متعلق کسی ایسی کوشش کا حق بھی تھا۔

صدر گرامی قدر!

یہ آپ کے لئے بھی شرف و سعادت کی بات ہے کہ اس عاجزانہ مگر مقدس اور مبارک کوشش کا اجراء آپ کے دست مبارک سے ہو رہا ہے۔

عزیزم جاوید طفیل تہنیت کے علاوہ دعاؤں کے بھی مستحق ہیں۔ جو کام کسی "اکادمی" کے کرنے کا تھا وہ

"ایک آدمی" نے انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اپنے عاجز بندوں سے بھی ایسے کام لے لیتا ہے جو بظاہر اس کی ہمت اور استطاعت سے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ توفیقِ الٰہی ہے جسے بھی نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے اور انہیں ان کے عزائم میں کامیاب کرے۔ آمین۔

محمد طفیل مرحوم اور نقوش سے میرا تعلق ۱۹۵۶ء سے استوار ہے اس لیے میں بہت خوش ہوں اور شکرگزار ہوں کہ مجھے اس نہایت اہم اور مبارک محفل میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

Aslub Ahmad Insari

His Excellency the President of Pakistan,
Ladies and Gentlemen!

Asking a non-specialist like me to speak on the auspicious occasion of the release of the first two volumes of the Quran nu,mber of Nuqoosh, compiled by Mr Javed Tufail at the gracious hands of the President of the Islamic Republic of Pakistan, is a very fine gesture, indeed Quran is a manifestation of the Divine essence of God, and the Prophet (peace be upon him) is its symbol. It may also be conceived as the objectivation of the word through which man can establish his contact with Being or Being - Beyond by using the transcendent intelligence implanted in him by God it is co-eternal with God Religion, as for as I can see has a dual focus or dimension, it embodies ethical principles and legislative parameters and it also rests on a metaphysical foundation: it is equivalent, in other words, to Law and Truth The ethical maxims can be held in common and are inculcated by all religions, but the metaphysics of each religion, its cosmic perspective and symbolism are entirely its own special distinction. Religion pertains to man as such and the collective entity, and they are intertwined. Reality and Manifestation, Divinity and Humanity, are the two poles around which apeculative theology moves. Islam is basically, and in all essentials the religion of certitude and faith whereas Christianity is the religion of sacrifice and love. The purpose of the two volumes which are being released this evening is, perhaps, largely to focus on the fundamentals of Islam which etymologically imply conformity to the Divine or the Absolute. This does not necessarily negate the freedom of the human will. the freedom is both limited and relative as against the cognition of God In any study of the Quran three constituents of it are to be taken into account: its doctrinal

framework, its narrative content, dealing with the vicissitudes of the soul and its miraculous power, its majestic resonance and rhythm which contributes to its miraculous power. All these are major components of its metaphysics and its eschatology and the multiplicity of the Quran coheres ultimately into its unity. These two volumes are intended to explore the nature of the Divine Reality and are based as supportive evidence on the orthodox commentaries of the Quran which form part of the traditional Islamic learning. This necessarily involves exposition of the attributes of God, apart from the philosophical distinction between substance and accidents, the nature of invocation and prayer as a means of establishing contact with the Divine and also entails discussion of the dalliance of the Law of Sheriah as an organizing principle in the life of the Islamic community. It goes without saying and it needs no stressing, that Islam, and the Quran which is its animating spirit provides us with a norm and an ideal for the integration and sustainment of human life. The articles comprising these two volumes, aimed indirectly, at the exegesis of the Quran, are a mine of information. Maulana Abul Kalam Azad, delves deep into the nature of the Deity as both the creator and sustainer of the world. Maulana Abul Ala Maudoodi discusses the two fundamental attributes of God and Maulana Yaseen Nadvi makes a very thoughtful commentary on the opening sura of the Quran which by common consent succintly and almost miraculously sums up the substance of the Quran. Similarly, Professor Yaseen Mazhar Siddiqui offers a very fine exposition of how God reveals Himself in the Quran. The intellectual apparatus built up by all these scholars and specialists is very formidable and impressive. The exegesis of the Quran requires decoding of its symbolism, explanation of its seeming confusions or ambiguities and elucidaztion of its organizing principles. The two primary levels of the Quran are the Revelation from above and beyond and the intellect here and below. In other words, what is manifested by revelation is to be deciphered by the exercise of the intellect. It should be kept spot lit in mind though, that apart from the ethical imperatives laid down in the Quran, its cosmology pertaining to the phenomenal world and eschatology which treats of death, judgement and the future state of the soul are of paramount importance. History, cosmology and eschatology are the multiple aspects of the unity which was revealed as an eternal creative act of God, and these can no way be dissociated from one another and from the act of faith which is the great Integrator. Other cognate areas of enquiry are the notion of predestination, freedom and free will, the meaning and nature of prayer, of good and evil, the life in the Hereafter and the economy of rewards and punishments. It is also intriguing to note that not only God

but also the personality of the Prophet is also glimpsed through the prism of the Quran. It has been pointed out that on being queried about the august personality of the Prophet Hazrat Ayesha, his favorite wife, next to Hazrat Khadeja, is reported to have declared "Don't you see it repealed in the Quran".

The two volumes which are being released this evening consist of a number of other valuable articles besides the ones which were specifically mentioned earlier. It is hoped that the volumes which will be published subsequently will be focused one of the fundamentals of monotheism which is the pivotal point of Islamic teachings, the state of the immanent Quran or in other words its anteriority and also the revelation in time as also beyond time, Quran in the perspective of the evolution of human thingking, the Islamic concept of man as it stems from the Quran and the norm it affords for the evaluation of the march of humanity through the eons. It is thus evident that the plan envisaged, and partly executed by the compiler of these volumes, the illustrious son of the late Muahmad Tufail, is a very ambitious one: It is a Herculeas task, requiring sustained labour and the passion and sincerity of commitment which elicits tremendous admiration of the reader. Nuqoosh made history through the decades in the subcontinent for keeping alive and furthering the cause of Urdu literature in its manifold forms. And now this launching of a new programme, a continuation of the volumes already published on the Holy Prophet, will certainly leave its impress on the Islamic studies. This will most probably provide stimulus for the study of Islam in the modern context as well as keeping open the window on traditional teaching and scholarship. This has no doubt on a claim on the attention and interest of all those who adhere to the Islamic faith. Let us hope that the forthcoming volumes will be as provocative and intellectually satisfying as the volumes in hand. May the tremendous energy of Mr. Javed Tufail that has gone into the planning of these volumes, flow unchecked and unimpeded and we all salute him for successfully carrying on this noble and laudable venture till now and for the still brighter futurer that awaits him beyond the horizon.

اس تقریب میں محمد اسماعیل قریشی صاحب ایڈوکیٹ اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے بھی خطاب فرمایا۔ محمد اسماعیل قریشی صاحب کا موضوع پاکستان میں نفاذ شریعت تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے زبانی مختصر خطاب کیا جو بوجوہ ریکارڈ نہیں کیا جا سکا اس لئے ان دونوں معزز حضرات کی تقاریر اس روداد میں شامل نہیں ہو سکیں۔

(ادارہ)

سابق صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ صاحب

گورنر پنجاب جناب شاہد حامد
مدیر نقوش جاوید طفیل صاحب!

میں نقوش کے قرآن نمبر کی تقریبِ اجراء میں شرکت اپنے لئے باعث سعادت خیال کرتا ہوں اور اس کا موقع فراہم کرنے پر جناب جاوید طفیل کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے حوصلہ اور استقامت عطا فرمائے۔

خواتین و حضرات!

"نقوش" اور "صاحب نقوش" یعنی جناب محمد طفیل مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اگر عالمی سطح پر بیسویں صدی میں چھپنے والے مختلف زبانوں کے ادبی جرائد کی فہرست مرتب کی جائے تو مجھے یقین ہے کہ "نقوش" کا درجہ و مقام نہایت نمایاں ہوگا۔ اسی طرح اگر بے پناہ ریاضت، جاں سپاری، محنت اور لگن کے ساتھ ایک ایک لمحہ حیات کو کسی مشن کے لیے وقف کر دینے والی شخصیات پر نظر ڈالی جائے تو محمد طفیل صاحب کا نام ان شخصیات کی صف میں روشن دکھائی دے گا جنہوں نے اپنی ذات کو اپنے مقصد میں ضم کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نقوش اور محمد طفیل صاحب کی کہانی عشق و مستی اور جنون و وارفتگی کی کہانی ہے۔ مشن کے ساتھ ان کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ان کی ذات بھی نقوش میں جذب ہو گئی اور "من تو شدم تو من شدی" کی یہ کیفیت ہی لافانی شہ پاروں کو وجود میں لاتی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

گذشتہ نصف صدی کے دوران ادبی جرائد کی دنیا میں "نقوش" ایک عظیم معجزہ فن کے طور پر ابھرا جس کی نمود کے لیے محمد طفیل صاحب نے اپنے خونِ جگر سے حرف و معنی کے چراغ روشن کیے۔ مختلف ادبی اصناف کو حیاتِ نو دینے اور اردو کے عظیم ادبی سرمائے کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ سیرۃ النبی کی تدوین ایک ایسا کارنامہ ہے جو لائق فخر بھی ہے اور باعث سعادت بھی۔ کیا اچھا زادِ سفر ہے جو محمد طفیل مرحوم اپنے ساتھ لے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

نقوش کا "قرآن نمبر" محمد طفیل مرحوم کی وہ آرزو ہے جس پر کام کا آغاز ۱۹۶۳ء میں ہی ہو گیا تھا۔ جناب جاوید طفیل نے بجاطور پر کہا ہے کہ یہ عظیم کاوش دو نسلوں کی محنت اور عرق ریزی پر محیط ہے۔ جاوید صاحب نے اپنے والد مرحوم کے خواب میں تعبیر کا رنگ بھرنے کے لیے قابل تحسین جدوجہد کی ہے۔ آج ان کے والد کی روح یقیناً آسودہ ہو گی کہ عقیدت و محبت کا کارواں ابھی تک سرگرم سفر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کارواں کے حوصلوں کو جواں رکھے۔

خواتین و حضرات!

قرآن حکیم بنی نوع انسان کے لیے وہ سرچشمہ علم و حکمت ہے جو ابد تک ہمارے قلب و ذہن کو سیراب کرتا رہے گا۔ نبی آخرالزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے توسط سے ہم تک پہنچنے والا یہ نسخہ کیمیا انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا کامل احاطہ کرتا اور تہذیب و ثقافت کے ہر ایک زاویے کے بارے میں راہنمائی عطا کرتا ہے۔ حکمت و دانش اور تدبر و فراست کی حامل قرآنی تعلیمات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ازلی و ابدی منشور ہیں جو فرد کے روزمرہ معمولات سے لے کر نظام ریاست کی تشکیل تک پوری جامعیت کے ساتھ راہنما اصول دیتی ہیں۔ سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

"(اے نبی) آپ کہہ دیں میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کیا گیا ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں اور (یہ) ایماندار لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے"۔

"بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ لوگوں کے درمیان آپ اس طرح فیصلہ کریں جس طرح اللہ آپ کو دکھائے"۔

سامعین محترم!

اللہ تعالیٰ کی یہ "کتاب حکمت" اسلام کے دائرے میں داخل ہونے والوں سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی سیرت و کردار کو اس کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں اور اگر انہیں کسی خطہ ارضی پر حکمرانی عطا ہو تو وہ امور مملکت کو قرآن و سنت کے اصول و ضوابط پر استوار کریں۔ بیسویں صدی میں برصغیر جنوبی ایشیاء سے اٹھنے والی مسلمانوں کی تحریک آزادی اسی شعور، اسی احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ علامہ اقبال نے واضح طور پر کہا تھا کہ اسلام کے نظام سیاست و معیشت کو بروئے کار لانے کے لیے ایک آزاد خطہ زمین ضروری ہے۔ خطبہ الہ آباد کی مرکزی روح و فکر بھی یہی تھی اور یہی سوچ مجاہدین آزادی کے دلوں میں آتش آرزو بن کر دہک رہی تھی۔ جو لوگ قیام پاکستان کی تحریک کو محض مادی مفادات کے حوالے سے دیکھتے ہیں وہ یا تو کم نظری کا شکار ہیں یا علمی خیانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ" کا نعرہ بلند کرنے اور لازوال قربانیوں کی ولولہ انگیز داستانیں رقم کرنے والے مسلمانان ہند کی آنکھوں میں کون سے خواب لو دے رہے تھے۔

حاضرین کرام!

الحمدللہ نقوش کے قرآن نمبر کی دو جلدیں اس وقت سامنے آ رہی ہیں جب اہل پاکستان، تحریک آزادی کے سب سے اہم سنگ میل یعنی نفاذ اسلام کی منزل کے قریب آ چکے ہیں اور قرآن و سنت کی بالادستی کے آئینی اہتمام کا مرحلہ شوق درپیش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قوم کی دیرینہ آرزو ضرور پوری ہو گی اور انشاء اللہ پاکستان ایک عظیم ایٹمی قوت کی حیثیت سے اسلامی نظام کے پرچم تلے اکیسویں صدی میں داخل ہو گا۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ پاکستان اسی دن قائم ہو گیا تھا جس دن برصغیر کے پہلے شخص نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور حاضرین کرام! یقین جانیے کہ اسلامی نظام اسی دن اس خطہ ارضی کا مقدر بن گیا تھا جس دن پاکستان کے نام سے یہ ریاست

وجود میں آئی تھی۔

منزل قریب آ رہی ہے جس کے بعد ہمیں ریاستی نظام کی ہمہ گیر اصلاح کے لیے متعدد اقدامات کرنے ہوں گے۔ ہمیں قرآن و سنت پر مبنی ایسے علمی مواد کی ضرورت ہو گی جو جدید عصری تقاضوں کے شعور کے ساتھ اسلام کے عملی اطلاق میں ہماری راہنمائی کرے۔ علمائے کرام اور اہل علم و دانش کو پوری مستعدی کے ساتھ آنے والے دور کے اس چیلنج کا سامنا کرنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس حوالے سے نقوش کا قرآن نمبر بیش بہا سرمایہ ثابت ہو گا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جاوید طفیل صاحب کو یہ عظیم کام مکمل کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔ بلاشبہ یہ وسائل سے مالا مال اداروں یا جامعات کا کام ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کارِ خیر میں جاوید طفیل تنہا نہیں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسلام کے شیدائیوں کا ایک پر عزم کارواں ان کا ہم قدم ہو گا۔ میں انہیں اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن و سنت پر مبنی نظام کے قیام کے لیے اپنے حصے کا کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

پاکستان پائندہ باد

نقوش قرآن نمبر کی پہلی دو جلدوں کے بارے میں اہل علم کے تبصرے اور آراء

ڈاکٹر انور سدید

نقوش کا قرآن نمبر ـــــ ایک عہد آفریں دستاویز

میں اس ساعت کو بے حد سعید سمجھتا ہوں جب محمد طفیل مرحوم نے اپنے رسالہ "نقوش" کو ترقی پسندوں کے نرغے سے نکال کر اس کی ادارت خود سنبھال لی تھی اور وہ ساعت سعید تر تھی جب ان کے دل میں "رسولؐ نمبر" چھاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر اس خیال کا بیج برگ و بار لانے لگا تو رسولؐ نمبر تیرہ جلدوں پر پھیل گیا۔ محمد طفیل ایک دن کہنے لگے:

"تیرہ ضخیم جلدیں چھاپ کر احساس ہوتا ہے کہ میں نے سیرت نبویؐ کے سمندر سے چند قطرے ہی جمع کیے ہیں، جی کرتا ہے کہ اپنی اور نقوش کی باقی ماندہ زندگی حضورؐ کی سیرت کے نقوش طیبہ کی اشاعت کے لئے وقف کر دوں"۔ــــ دنیا کے سب کام چھوڑ کر صرف اس کام میں مصروف ہو جاؤں"۔

میں نے گزارش کی کہ نقوش کے اس قدر وسیع کام سے کیا طبیعت سیر نہیں ہوئی"؟

بولے "یوں کہیئے کہ تشنگی بڑھ گئی ہے"۔

پھر ایک دن کہنے لگے۔ "میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا الطاف حسین حالی گلے میں مفلر لپیٹے اور سر پر اپنی خاص وضع کی ٹوپی ڈالے ہوئے "نقوش" کے دفتر میں داخل ہوئے، مجھے گلے سے لگا لیا اور بولے "اس عاجز سے "مسدس مدوجزر اسلام" سرسید احمد خان نے لکھوائی تھی، رسولؐ نمبر مرتب کرنے کا خیال آپ کے اپنے دل میں پیدا ہوا۔ مسدس میرے لئے توشۂ آخرت ہے، رسولؐ نمبر آپ کے لئے توشۂ آخرت ہے۔ آپ کی تعریف میں نئے آسمانوں پر سنی ہے"۔

محمد طفیل نے بتایا۔۔۔ یہ دلنواز آواز سن کر میں آنکھیں اوپر نہ اٹھا سکا۔۔۔ سر عقیدت مولانا حالی کے سامنے جھکا ہوا تھا، دل نے صدا دی کہ "یہ نشانِ راہ ہے اور منزل ابھی دور ہے"۔ دلی مسرت آنسو بن کر بہہ نکلی لیکن کمرے میں مولانا حالی نظر نہ آئے۔

رسولؐ نمبر کا کام ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۸۹ء میں تیرہ جلدوں کی اشاعت کے بعد ابھی جاری تھا کہ محمد طفیل کو "قرآن نمبر" چھاپنے کا خیال آ گیا، اور یہ سودا بھی ان کے دل میں سما گیا کہ یہ نیا کام نہیں بلکہ سابقہ کام کی توسیع ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں نبی آخرؐ، اللہ کے ساتھ ہم کلام ہیں، محمد طفیل نے ان ہم کلامیوں پر رسالہ "نقوش" کی کئی جلدیں اہل نظر کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ابھی وہ ابتدائی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ خالق حقیقی نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ مجھے معلوم ہے کہ محمد طفیل اپنی زندگی میں کہا کرتے تھے کہ "یہ مقدس کام ایک نسل کے کرنے کا نہیں، خدمتِ اسلام کی یہ وراثت میرے بچوں کو ملے گی اور انہیں "قرآن نمبر" شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو گی"۔ شاید محمد طفیل اپنی اس آرزو کی تکمیل کے لئے ہی عین اس وقت جب ان سب کی رگ و پے میں کام کرنے کا ولولہ تازہ تھا، دنیا سے اٹھ گئے اور اپنا یہ مقدس کام جاوید طفیل کو سونپ گئے۔ اس لئے انہوں نے اپنی زندگی کو سیرتِ نبویؐ کی نقوشِ عالیہ کی اشاعت کے لئے وقف کرنے کا جو عہد کیا تھا وہ پورا کر دیا۔ لیکن "نقوش" حیات ہے اور یہ ان کے مشن کی تکمیل ہی میں کوشاں ہے۔

قرآن نمبر کی پہلی دو جلدیں چھپ کر آئیں تو میں نے جاوید طفیل کو مبارکباد دی کہ انہوں نے اپنے والدِ گرامی کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا تھا اور سیرتِ نبویؐ کے کام کو وہاں سے شروع کیا تھا جہاں محمد طفیل چھوڑ گئے تھے۔ جاوید طفیل بڑے انکسار سے بولے

"انور سدید! اس کام کی ترغیب انسانی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ اور اس سلسلے کا ناتہ بھی میرے والد کے حسنِ عمل سے ملا ہوا ہے"۔۔۔ جاوید طفیل نے مجھے بتایا! "شاید دنیاداری کے تقاضے والد کی وفات کے بعد مجھ پر غالب آ جاتے، لیکن ہر جمعہ کی شب کو میرا کمرہ آدھی رات کے وقت خوشبوؤں سے معمور ہو جاتا، غیب سے کوئی آواز سنائی دیتی، جس کا مفہوم واضح نہ ہوتا۔ آنکھ کھلتی تو کچھ نظر نہ آتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ "والد تشریف لائے تھے اور کسی ضروری ۔۔۔ بے حد ضروری کام میں تاخیر پر تشویش کا اظہار کر رہے تھے"۔ میں نے اسے "قرآن نمبر" کی اشاعت سے منسوب کیا اور کام کی رفتار تیز کر دی۔ اس کے باوجود پہلی دو جلدیں چھاپنے میں نو برس صرف ہو گئے ہیں لیکن اطمینان یہ ہے کہ کم و بیش ۲۰ مزید جلدیں چھاپنے کا مواد جمع ہو چکا ہے۔ اور تلاش و تحقیق کا کام

سلسلہ جاری ہے"۔

نقوش کے قرآن نمبر کے پہلی دو جلدیں ۱۳۱۰ صفحات پر مشتمل ہیں، پہلی جلد میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کا تعارف قرآن کی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ مطالب و معانی کی توضیح و تشریح ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی نے کی ہے، اس حصے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا گراں قدر مقالہ "قرآن کا تصورِ الٰہ" بھی شائع کیا گیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس انحطاطی دور میں "تعدد الٰہ" سے توحیدِ الٰہی کے برتر تصور کو اجاگر کیا جائے۔ محمد برکات فارس نے مختلف عنوانات کے تحت آیات قرآنی کو جمع کیا ہے یہ آیات مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمے کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔ "نقوش" میں یہ کتاب "حمدِ الٰہی بہ کلامِ الٰہی" کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ اس جلد میں محمد عبدالسلام خاں کا مقالہ "باری تعالیٰ قرآنی دلائل کی روشنی میں"۔ محمد صلاح الدین عمری کا مقالہ "اللہ، احادیثِ نبوی کی روشنی میں"۔ ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کا مقالہ "قرآن کا تصورِ خدا" ذہن و خرد کو منور کر دیتے ہیں۔ محمد یسین ندوی صاحب نے سورۃ الحمد کی ربانی تفسیر سے ایک نیا جہانِ معنی کشادہ کیاہے۔ قرآن نمبر کی دوسری جلد میں جناب جمشید احمد ندوی نے خلفائے راشدین کے خطبات سے حمدالٰہی کے زاویے مرتب کیے ہیں، اس نوع کا دوسرا باب مفسرین قرآن کے حوالے سے مرتب کیا گیا ہے اور یوں نمائندہ تفاسیر و تراجم کے حوالے سے حمد الٰہی اور تعریف ربانی کے ان گنت گوشے منور کیے گئے ہیں، اس باب میں ابن مسعود سے لے کر مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تک تیرہ سو برس کی تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ نمبر اسماء و صفات الٰہی کے لیے مخصوص ہے اور اس میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر علامہ پروفیسر طاہرالقادری اور مولانا محمد مشتاق تجاروی کے مقالات شامل ہیں۔

نقوش کے قرآن نمبر کی یہ دو جلدیں اس مقدس کام کا آغاز ہے جو آئندہ چند برسوں میں بیس پچیس جلدوں پر پھیل جائے گا۔ مضامین کا مندرجہ بالا اجمال اس حقیقت کا مظہر ہے کہ جاوید طفیل نے کتنے بڑے کام کی تکمیل کا فریضہ قبول کیا ہے اور اس کا آغاز کس خوش اسلوبی اور حسنِ طباعت و اشاعت سے کیا ہے۔ بلاشبہ نقوش کا رسولؐ نمبر ایک عہد آفریں دستاویز تھی اور اب قرآن نمبر بھی معنوی اور صوری طور پر ایک ایسی عہد آفریں دستاویز ثابت ہو گا جس کی نظیر اردو زبان و ادب میں آیندہ پیش نہ کی جا سکے۔ یہ کام حکومتوں اور اداروں کے کرنے کا تھا۔ لیکن خانوادۂ محمد طفیل کے ایک فرزندِ فرید جاوید طفیل نے یہ کام کر دکھانے کا بیڑا اٹھا لیا ہے تو اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ نقوش کا رسولؐ نمبر اب ہر گھر میں عقیدت و احترام سے رکھا جاتا ہے، اسے اصلاحِ حیات کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے اور ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔۔۔ "قرآن نمبر" کو بھی ایک دائرۃ المعارف کی حیثیت حاصل ہے۔ انشاء اللہ اس سلسلے کو بھی قبولِ عام اور تسکینِ دوام کی سند حاصل ہو گی۔ اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں خانوادۂ طفیل کی دو نسلیں شامل ہیں، دونوں نسلوں کے لیے یہ ثوابِ دارین کا کام ہے جو ہمیشہ روشن اور منور رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

(نوائے وقت، لاہور)

صاحبزادہ خورشید گیلانی

"نقوش" —— ہر کام، نقش دوام

"رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی" پنجابی زبان کے اس لافانی مصرعے کا مصداق اگر کوئی شخصیت ہوئی ہے تو وہ مرحوم محمد طفیل کی تھی جو "نقوش" میں اس طرح محو ہوئے کہ محمد طفیل سے "محمد نقوش" ہو گئے۔

جس طرح لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں اور ہیر رانجھا لازم و ملزوم ہیں اسی طرح مرحوم محمد طفیل اور "نقوش" کا معاملہ پھول اور خوشبو، سورج اور کرن اور شہد اور مٹھاس والا ہو گیا۔ نہ وہ اس سے الگ اور نہ یہ اس سے جدا۔۔۔

من تو شدم تو من شدی　　من جاں شدم تو تن شدی

مرحوم کی دلچسپیاں دنیا والوں سے قطعاً مختلف تھیں لوگ ہر سال گاڑی کا ماڈل بدل کر خوش ہوتے ہیں وہ "نقوش" کا نیا نمبر پیش کر کے شاد ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کے کل جتنے ایام تھے ان سے چار پانچ گنا زیادہ اوراق انہوں نے نقوش کے خصوصی نمبروں کے طور پر پیش کئے۔ آپ بیتی نمبر، غالب نمبر، لاہور نمبر، طنز و مزاح نمبر، میر تقی میر نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، شوکت تھانوی نمبر، خطوط نمبر، ادبی معرکے نمبر اور پھر تیرہ ضخیم جلدوں میں رسولؐ نمبر۔ یہ سارے کارنامے مرحوم محمد طفیل نے انجام دیئے۔ ان میں سے ہر نمبر تاریخی اہمیت اور یادگار نوعیت کا حامل ہے۔ تبھی تو ایک موقع پر علامہ نیاز فتح پوری نے کہا تھا

"اگر طفیل صاحب مجھ پر اس طرح کا ضخیم نمبر نکالنے پر تیار ہوں تو میں ابھی مرنے کو آمادہ ہوں"۔

نقوش کے خصوصی شمارے تقریباً ساٹھ ہزار صفحات پر محیط ہوں گے۔

مرحوم جس زمانے میں نقوش کا "رسولؐ نمبر" شائع کرنے کا ارادہ کر رہے تھے ان دنوں میرا ان سے بہت قریبی رابطہ رہا اور باہمی آمدورفت میں ایک طرح کا تسلسل اور تواتر رہا تھا جب پہلی بار انہوں نے اس منصوبے کا ذکر کیا تو مجھے سچی بات ہے کہ بہت مسرت تو ہوئی لیکن ایک گونہ حیرت تھی۔ حیرت اس پر کہ طفیل صاحب ایک ادبی شخصیت ہیں اور مجلّہ "نقوش" ایک ادبی رسالہ، سیرت النبیؐ کا نازک پل کیسے عبور کر پائیں گے؟ اور مسرت کا پہلو یہ تھا کہ موضوع کوئی ہو کام کا سلیقہ اور قرینہ ہو تو اس سے انصاف ہو ہی جاتا ہے چنانچہ اہل علم و ادب نے دیکھا کہ نقوش کا "رسولؐ نمبر" اپنے صوری اور معنوی دونوں محاسن سے بھرپور اور اپنی پیش کش کے لحاظ سے ایک یادگار نمبر ثابت ہوا۔

مرحوم کی وفات کے بعد ایک طرح سے "نقوش" کو چپ سی لگ گئی۔ اگرچہ اس دوران خود "مدیر نقوش" پر دو جلدوں میں ایک ضخیم نمبر نکلا مگر کسی نئے منصوبے کا انتظار رہا۔ میرے سمیت بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جاوید طفیل چونکہ اہل قلم اور ادیب نہیں شائد وہ اب اس طرف متوجہ نہیں ہوں گے اور سارا دھیان دیگر اشاعتی بزنس پر صرف کریں گے۔ مگر جاوید طفیل نے اہل علم اور ادب دوست حلقوں کو بہت بڑا "سرپرائز" دیا کہ انہوں نے نقوش کا "قرآن نمبر" پیش کیا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ نقوش کا مزاج انتخاب اور معیار وہی ہے

جو اس کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ اور ارباب ذوق کے لئے ہمیشہ وجہ شادابی قلب و نظر ثابت ہوا ہے۔ پہلی قسط کے طور پر نقوش قرآن نمبر کی دو جلدیں آئی ہیں۔ منصوبے کے مطابق ہر سال دو جلدیں لانے کا پروگرام ہے۔ موجودہ اور آئندہ دو جلدیں اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان پر مشتمل ہیں۔ زیر نظر دو جلدوں میں حمد کلام اللہ میں، حمد الٰہی کلام رسالت میں حمد الٰہی اور خلفائے راشدین، حمد الٰہی اور مفسرین قرآن، اور اسماء و صفات الٰہی جیسے عنوانات عرفان و ایقان کے لئے ایک سوغات ہیں۔ قرآن نمبر کسی ہنگامی اور وقتی جذبے کی پیش کش نہیں دو نسلوں کی کاوش ہے۔ مرحوم محمد طفیل نے ۶۰ء کی دہائی میں یہ منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ ۱۹۹۸ء میں اس کی اشاعت کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور تکمیل کا تخمینہ ۲۰۱۰ء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نمبر چوبیس جلدوں پر محیط ہو گا۔ اس نمبر سے پہلے ظاہر ہے قرآنی علوم، قرآنی مضامین، قرآنی تعلیمات، قرآنی ہدایات اور قرآنی احکامات کے ضمن میں بے پناہ کام ہو چکا ہے۔ قرآنی تفاسیر کی ایک کہکشاں ہے جو دنیا کی ہر زبان اور ہر خطے میں جگمگا رہی ہے۔ تفاسیر کا ذخیرہ عربی انگریزی، فرانسیسی، فارسی، افریقی، سواحلی، بنگالی، سندھی، پنجابی، ملائی، ڈچ، روسی غرض بے شمار زبانوں میں موجود ہے۔ قرطبی، رازی، زمخشری، ابن کثیر، شاہ ولی اللہ، ابن جریر، سیوطی، بیضاوی، خازن، جیسے اہل علم نے قرآنی علوم کے سمندر میں غوطہ زنی کی اور موتیوں سے دامن بھر کر لائے۔ اسی برصغیر پاک و ہند میں اردو زبان میں بیش قیمت تفاسیر سامنے آئیں۔ تفسیر حقانی، بیان القرآن، خزائن العرفان، تفہیم القرآن، ضیاء القرآن، معارف القرآن، تفسیر ماجدی، ترجمان القرآن، تدبر قرآن، تذکیر القرآن، معالم القرآن، مطالب الفرقان، تفسیر عثمانی، تفسیر حسینی، منہاج القرآن، انوارالقرآن، جیسی بلند پایہ تفاسیر علمی حلقوں میں تحسین کی نظر سے دیکھی گئیں۔ قرآن مجید کے ایک ایک موضوع اور مضمون پر کئی کئی جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔ اس سارے گرانقدر کام کے باوجود عالم وہی ہے جس کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"کہہ دو کہ اگر سمندر پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے سیاہی ہو تو قبل اس کے میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ویسا ہی اور سمندر اس کی مدد کو لائیں۔ (سورہ الکہف: ۱۰۹)

نقوش کا "قرآن نمبر" اس سنہری سلسلے کی ایک خوبصورت کڑی ہے۔ یہ کام اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک عالم تمام نہیں ہو جاتا۔ قرآن مجید محض کتاب ثواب نہیں بلکہ ایک صحیفہ انقلاب ہے۔ اسی کتاب نے عہد جدید کی بنیاد رکھی، نیا علمی منہاج قائم کیا۔ انفس و آفاق پر تدبر کی دعوت دے کر نفسیاتی تحلیل اور سائنسی تجزیے اور تجربے کا دروازہ کھولا، الٰہی فکر پر ایک تمدن استوار کیا اور قبائلی معاشرے کو ایک باقاعدہ سیاسی نظام فراہم کیا جو آگے چل کر دنیا میں شہری حکومتوں کا پیش خیمہ بنا۔ آج پھر اسی کتاب انقلاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بے سمت ہوتی ہوئی دنیا کو اس کائنات کے خالق کی مرضی کے رخ پر موڑا جا سکے۔ کتنے اچھے لوگ ہیں وہ جو اس کام کو مشن سمجھ کر انجام دے رہے ہیں اور دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی اپنے لئے سرخروئی کا سامان کر رہے ہیں۔

ہر خاندان کی اولاد تین طرح کی ہوتی ہے۔ سپوت، پوت، اور کپوت۔۔۔۔ سپوت وہ جو باپ دادا کے نام اور کام کو وسعت اور عزت دے، پوت وہ جو برقرار رکھے اور کپوت وہ جو رہی سہی بھی ڈبو دے۔۔۔۔ ماشاء اللہ

برادرم جاوید طفیل "سپوت" ہیں جو اپنے مرحوم والد کی عظمت و توقیر کو آگے بڑھا رہے ہیں اور ان کے علمی و ادبی منصوبوں کو ادھورا چھوڑنے کے بجائے پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جب "قرآن نمبر" کی دونوں جلدیں میرے پاس بھجوائیں تو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ نقوش کا چراغ بجھ نہیں بلکہ اس کی روشنی اور بڑھ گئی ہے۔ اللہ کرے کہ یہ روشنی ہر دل و دماغ کو منور کرے۔

(نوائے وقت، لاہور)

اسلم کمال

ایک معجزہ

قرآن پاک کی پہلی آیت کریمہ، اقرا باسم ربك الذی خلق، کو موضوع فن بنانے کی سعادت مجھے بار بار حاصل ہوئی ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا پہلا لفظ "اقراء" اپنی صوت میں ایک ایسی گونج رکھتا ہے جو پوری کائنات کو اپنے اندر گھیرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ لفظ "اقرا" خاص طور پر میرے دل کو کھینچتا اور مو قلم کو یوں نوازتا ہے کہ اکثر اس آیت کی ایک تصویر ادھر مکمل ہوتی ہے ادھر فوراً اس کی کوئی دوسری شکل میرے مدارِ تخلیق میں گردش کرنے لگتی ہے۔

یہ لفظ، اقرا، عجیب و غریب لفظ ہے۔ اس میں بڑا ہی انوکھا سا ایک بلاوا ہے۔ میں جس کے اثر میں مکہ مکرمہ سے تین میل دور اور دوہزار فٹ بلند جبلِ نور کی طرف ہر بار بے اختیار ہو کر چل پڑتا ہوں۔ اور ہر بار کوئی نئی حیرت اس کے دامن میں مجھے پہروں مبہوت کئے رکھتی ہے۔ اس جبلِ نور میں ایک غار کا نام غار حرا ہے۔ یہ غار حرا اس جبلِ نور کے سر میں دماغ کی طرح واقع ہے۔ یہی غار حرا اس پہاڑ کے سینے میں ایک دل کی طرح نصب ہے اور یہی غار حرا اس پہاڑ کی پیشانی میں لگی ہوئی وہ آنکھ بھی ہے جو ہمیشہ بیدار رہتی ہے۔ اس آنکھ اس دل اور اس دماغ کے ساتھ یہ جبلِ نور کسی کی یاد میں اس لفظ "اقرا" کی تلاوت کرتا مجھے ہمیشہ دکھائی دیتا ہے۔

تلاوت کے ان گنت انداز ہیں۔ رنگ اور روشنی کے لحن میں آیاتِ قرآنی کی تلاوت کو ہم مصور خطاط لوگ مصورانہ خطاطی کہتے ہیں۔ میں نے پہلے پہل جب "اقرا باسم ربك الذی خلق" کی تصویر بنائی تھی تو مجھے تخلیقی عمل میں بڑا ماورائی سا حوصلہ حاصل ہوا تھا۔ میں نے اگلی آیت کی تصویر بنائی تو دل میں ایک مقدس سا لالچ جاگ اٹھا تھا جس میں مبتلا ہو کر میں نے اگلی آیت "اقرا و ربك الاکرام" کی تصویر مکمل کی تو میرے جسم و جاں نے صاف صاف محسوس کیا تھا کہ مجھ پر کرم فرما دیا گیا تھا۔ چنانچہ جب میں "الذی علم بالقلم" کے تخلیقی عمل میں سے گذر رہا تھا تو مجھے خود اپنے موقلم پر رشک آنے لگا تھا۔ اس سر خوشی کے عالم میں جب میں "علم الانسان مالم یعلم" کے تکمیلی مراحل میں داخل ہوا تو جو میں نہیں جانتا تھا وہ مجھے سکھا دیا گیا اور میں نے جانا کہ جس طرح قرآنِ پاک کے حروفِ مقطعات کی تاویل صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں

ہے۔ اسی طرح اس "اقرا" لفظ کے چاروں حروف بھی الگ الگ رمز و کنایہ کے حامل ہیں۔ جن کا علم قرآن حکیم اپنے قاری کے لئے انعام کے طور پر اپنے پاس چھپا کر رکھتا ہے۔ چنانچہ میں نے لفظ اقرا کے چاروں حروف کے مخفی معنی کے حصول میں بہت ساری آیات کی تلاوت رنگ و نور کے لہجہ و لحن میں ایک زمانے تک لگاتار کی تو صریرِ خامہ نے مجھے سمجھایا.... الف سے اللہ، قاف سے قرآن، رے سے رسولؐ اور الف سے انسان..... یہ سن کر میں حیرت زدہ ہوا تو نوائے سروش نے میری حیرت کو علم میں بدل دیا یہ کہہ کر..... اللہ کا قرآن، رسول کے ذریعے انسان کے لئے ہے۔

مرحوم محمد طفیل میرے بزرگ دوست تھے۔ وہ اپنی ایک علالت جس میں زندہ بچنے کے امکانات تقریباً ختم نظر آتے تھے کا ذکر کبھی کبھی بہت دلچسپی سے کیا کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ انہوں نے ایک ارادہ دل میں باندھا اور اس کی تکمیل کے لئے پاک پروردگار سے توفیق اور مہلت مانگی تھی اور وہ صحت یاب ہو گئے اور کافی عرصہ بعد وہ جب خانہ خدا اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دے کر واپس آئے تو ایک دن بڑے رمزیہ انداز میں مجھے مخاطب کر کے بولے اسلم کمال! میں جس سفر سے لوٹ کر آیا ہوں، یہ سفر اگرچہ میں نے اب کیا ہے لیکن اس کے مقدس مقامات کی زیارت تو میں پہلے ہی کئی بار کر چکا تھا۔

محمد طفیل کو اس سفر کی سرخوشی میں گم میں کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ اپنے لکھے ہوئے بہت سارے کاغذات اپنے سامنے رکھے ایک ایک کر کے الٹتے رہے۔ تب میں نے بہت واضح مشاہدہ کیا۔ محمد طفیل کے چہرے پر چار مختلف شفاف رنگ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کی تھوڑی سے طلوع ہو کر پورے چہرے کو روشن کرتے ہوئے ان کی پیشانی میں یکے بعد دیگرے جذب ہوتے گئے۔ تو میرے دل نے گواہی دی کہ محمد طفیل کو ان خوش نصیبوں کی صف میں جگہ مل چکی ہے جن کو لفظ "اقرا" میں شامل حروف کا علم قرآن انعام کے طور پر قلب و قلم اور قلم و قرطاس کے مراحل میں عطا کرتا ہے۔ محمد طفیل کو شاید یہ علم بکثرت عطا کیا گیا تھا جس کے اظہار تشکر میں انہوں نے نقوش کا رسولؐ نمبر شائع کیا جو تیرہ جلدوں پر مشتمل تھا۔ جس نے چار دانگِ عالم میں دھوم مچا رکھی ہے۔

ایک صاحب نے اظہار تعجب کیا کہ غزلوں نظموں، تنقیدی تحریروں، افسانوں اور خاکوں کی زندہ روایتوں والے نقوش کا رسولؐ نمبر؟ محمد طفیل نے بڑے پُراعتماد لہجے میں اس سوال کے جواب میں کہا میں آج تک ادب پڑھتا ہی نہیں آیا، ادب مرتب کرتا اور شائع کرتا ہی نہیں آیا بلکہ ادب سیکھتا اور سیتنا بھی آیا ہوں..... نقوش کے رسولؐ نمبر کے لئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس معجزے پر بہت فخر فرمایا کرتے تھے۔ اس کا نام قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے نقوش کے رسولؐ نمبر کا معجزہ نقوش کا قرآن نمبر شمار کیا جائے گا جس کی پہلی دو جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ نقوش کی اپنی روایت میں اس تھوڑی سے تبدیلی کے ساتھ کہ نقوش کے رسولؐ نمبر پر مدیر کا نام محمد طفیل اور اب قرآن نمبر پر مدیر کا نام جاوید طفیل ہے۔ جو لوگ محمد طفیل مرحوم کے مزاج آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ نقوش کے معاملے میں مشورہ تو سب کا دل و جان سے سنتے تھے لیکن کسی بھی طرح کی مداخلت یا حکم کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ہو سکتا ہے بلکہ نقوش کے قرآن نمبر پر محمد طفیل کا نام بطور بانی

اور اس کے بالمقابل مدیر کے طور پر جاوید طفیل کا نام دیکھ کر کچھ ذہنوں میں یہ سوال ابھرے کہ یہ جاوید طفیل کون ہیں؟ میری معلومات کے مطابق محمد طفیل اور جاوید طفیل میں فرق اک گمان سے زیادہ ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نمبر پر محمد طفیل نے اپنا نام بانی کے طور پر روشناس کرانے کی جدت بھی کی اور اپنے نام "طفیل" سے پہلے جاوید بمعنی دائمی کے لگا کر نقوش کے مدیر کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھنے کا اہتمام بھی کر لیا ہے۔ کیونکہ یہ نقوش کا قرآن نمبر ہے اور قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھی ہے۔

نقوش کے قرآن نمبر کی پہلی جلد ۶۶۳ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ فہرست مضامین کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان "حمدِالٰہی بہ کلامِ الٰہی" ہے جس میں مضمون اول "اہمیت" کے بارے میں ہے جس کے مرتب محمد فارس برکات ہیں۔ مضمون دوئم "اللہ اپنے کلام میں"، ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی کے قلم سے ہے۔ مضمون سوئم "قرآن کا تصورِ الٰہ" مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم کا کرشمہ ہے۔ مضمون چہارم "قرآن کا تصورِ خدا" ڈاکٹر ملک غلام مرتضےٰ کی نگارش ہے۔ مضمون پنجم "باری تعالیٰ قرآن دلائل کی روشنی میں" محمد عبدالسلام خان کے قلم کا شہکار اور مضمون ششم "سورۃ الحمد کی تفسیر ربانی" مولانا محمد یسین ندوی کی بلند پایہ تحریر ہے۔ یہ سب نگارشات اعلیٰ درجہ بصیرت کی آئینہ دار ہیں اور قرآن سے متعلق ہیں۔ قرآن پاک جو کہ اللہ کا کلام ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ رحمٰن و رحیم اور خالق و مالک ہے اور ازل و ابد اور زمان و مکان کی ہر حد اور ہر حساب سے بے نیاز ہے۔ وہ حاضر و ناظر اور موجود ہر آن اور ہر جگہ پر ہے۔ اس کا تخت پہلے پانیوں پر تیرتا تھا۔ پھر اس نے زمین اور آسمان بنائے۔ کائنات میں صرف اسی کی بادشاہت ہے۔ وہ ایک ہے، اکیلا ہے، تنہا ہے، واحد ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں اور معلوم و نامعلوم کائنات میں ہر ایک شئے اسی کی محتاج ہے۔ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ وہ لاشریک ہے وہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ وہ بے حد مہربان اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اس جلد کے مضامین کے دوسرے حصے کا عنوان ہے "حمدِالٰہی کلامِ رسالت میں"۔ اس بلندپایہ مضمون میں کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس سے متعلق جوہر کی حامل احادیث کو ایک جامع مضمون کی صورت میں بڑی ذہانت سے پیش کیا گیا ہے۔

نقوش کے قرآن نمبر کی جلد دوئم کی فہرست میں مضمون اول حمدِالٰہی اور خلفائے راشدین، مضمون دوئم حمدِالٰہی اور مفسرینِ قرآن اور مضمون سوئم اسماء و صفاتِ الٰہی جیسی بلندپایہ اور گرانمایہ نگارشات علی الترتیب ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی، مولانا محمد یسین ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ ڈاکٹر پروفیسر محمد طاہر القادری اور مولانا مشتاق احمد تجاروی کے قلم سے ہیں۔ یہ سب تحریریں اللہ تعالیٰ کے مقام و مرتبہ، اس کے جاہ و جلال، اس کی سطوت و شہنشاہیت، اس کی عظمت و ہیبت، اس کی قوت و قدرت، اس کی بزرگی و برتری، اس کے رعب و دبدبہ، اس کی شان و شوکت اور اس کے مقام کبریائی کے حضور اس کے اسماء اور صفات کے حوالے سے خلفائے راشدین اور مفسرینِ قرآنِ حکیم کا ہدیۂ حمد پیش کرتی ہوئی ۶۴۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

نقوش کے قرآن نمبر کی ۱۳۱۰ صفحات پر مشتمل یہ دو جلدیں دراصل مکمل قرآن نمبر کا دیباچہ ہیں۔ جس کو نقوش کے مدیر باتدبیر نے ۲۵ جلدوں میں سمیٹنے کا مقدس اور مصمم منصوبہ بنا رکھا ہے۔ ان دو جلدوں کی

ترتیب تزئین اور تدوین میں ہنر اور سلیقے کی تازگی اور تنوع ہے۔ خیال افروز سرورق سے لے کر اندر کے صفحات میں ابواب، مضامین، سطور اور الفاظ و حروف جذبے کی جس روشنی سے منور اور خلوصِ نیت کی جس مہک سے معطر ہیں ان کی بنا پر اس سے پہلے کہ میرا ذہن جاوید طفیل کی اس گرانقدر مقصد میں یقینی کامیابی کی پیش گوئی کرے، میرا دل اسے پیشگی مبارکباد دینے میں سبقت لے جاتا نظر آتا ہے۔ وہ اس لئے کہ نقوش کا قرآن نمبر نقوش کے رسولؐ نمبر کا معجزہ ہے اور معجزہ مکمل ہو کر رہتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

میں امریکہ گیا ہوا تھا۔ چار ماہ اور سات دن گزار کر پرسوں واپس آیا ہوں۔ یہ پہلا خط ہے جو میں لکھ رہا ہوں۔ واپسی پر ڈاک کے ڈھیر میں نہ صرف قرآن نمبر حصہ اول و حصہ دوم کا ایک ایک نسخہ ملا بلکہ آپ کا فیکس بھی۔ دونوں کے لیے تہ دل سے شکرگزار ہوں۔

نقوش کا قرآن نمبر یقیناً ایک بڑا اور رہنے والا کام ہے۔ ماشاءاللہ۔ آپ کو بہت بہت مبارک باد۔

مشفق خواجہ

قرآن نمبر کی پہلی دو جلدیں ملیں۔ محمد طفیل مرحوم بے اختیار یاد آئے۔ آپ نے اُن کے خوابوں کی تعبیر جس خوب صورت انداز میں پیش کی ہے، اس سے ان کی روح تو خوش ہو گی ہی، مرحوم کے نیازمندوں کے لئے مقامِ شکر ہے کہ ان کے سعادت مند بیٹے نے باپ کے کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ آگے بڑھایا۔

مرحوم کا جب انتقال ہوا تھا تو پہلا خیال یہ ذہن میں آیا کہ اب "نقوش" بھی "مرحوم" ہو جائے گا۔ اپنے خیال کے غلط ثابت ہونے پر میں نہ صرف خوش ہوں بلکہ آپ کی درازیٔ عمر اور صحت کے لئے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

نقوش "قرآن نمبر" سامنے ہے اور دل و نگاہ کو پرنور کر رہا ہے۔ محمد نقوش (مرحوم) کی روح کے لئے یہ نمبر یقیناً سرور کا باعث ہو گا۔

پروفیسر نجم الاسلام

قرآن نمبر کی ابتدائی دو جلدیں موصول ہوئیں، میں تہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس عظیم و ضخیم علمی کارنامے کی اشاعت شروع ہو جانے پر جس کے ہم سب شدت سے منتظر تھے۔ دونوں جلدوں کے مشمولات نہایت عمدہ، پرکشش اور قابل توجہ ہیں۔ جلد سوم و چہارم کے اہم ابواب کا اعلان پڑھا، توقع ہے کہ اس

علمی منصوبے کو بھی آپ اعلیٰ ترین علمی معیار پر پہنچائیں گے اور یہ بھی رسول نمبر کی طرح نافع اور یادگار کام ہو گا ان شاء اللہ۔

پروفیسر حفیظ تائب

نقوش کے قرآن نمبروں کے سلسلہ کا دو جلدوں سے آغاز کر کے جاوید طفیل نے خود کو اپنے والد محترم محمد طفیل کا سچا جانشین ثابت کیا ہے اور اپنے آپ کو سچ مچ جاوید بلکہ زندہ جاوید کر لیا ہے۔ اس کارنامہ عظیم پر اہل علم و ادب اور صاحبان عرفان و محبت کے قلوب شاد ہوئے ہیں تو رسول نمبر کے مدیر شہیر --- جناب محمد طفیل کی روح بھی بے حد مسرور ہوئی ہو گی۔

پروفیسر ایم آر کے۔ ندوی، علی گڑھ

انمٹ نقوش کے قرآن نمبر کی ابتدائی دو دلفریب جلدیں موصول ہوئیں۔ پیکٹ کھولتے ہی جاذب نظر رنگین جلد پر اللہ نورالسموٰت والارض کے عکس جمیل سے ماحول میں ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا محسوس ہوا اور دل و دماغ کی دنیا جھوم گئی۔

انتظار تو عرصہ سے تھا۔ تفصیلات بھی معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ بیتابی کے ساتھ شوق انتظار بھی بڑھتا جاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے وہ مرحلہ ختم ہوا۔ شنید سے دید کا موقع ملا۔ تمنا بر آئی، آنکھیں روشن ہوئیں، دل باغ باغ ہوا اور آپ کی بارآور محنت کے اس مبارک نتیجہ کی قبولیت عامہ کے لئے بے تحاشا دعائیں نکلیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور آپ کو دنیا و آخرت کی سعادت نصیب فرمائے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکیہ آیا اور نقوش کے قرآن نمبروں کا پیکٹ دے گیا۔ پیکٹ کھولا تو قرآن نمبر کی پہلی دو جلدیں میرے ہاتھ میں تھیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں، دل مسرتوں سے جھوم اٹھا۔ ذہن آج سے کئی سال پیچھے پہنچ گیا، طفیل صاحب یاد آئے، ان کے عظیم کارنامے یاد آئے، رسول نمبر کی تیرہ جلدیں یاد آئیں، قرآن نمبر کا اعلان یاد آیا اور پھر دیر تک ان کے خیال میں گم ہو گیا اور ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔ اس کے ساتھ آپ کی یاد آئی، آپ کے لئے بھی دل سے دعائیں نکلیں۔ سوچتا رہا کہ کاش طفیل صاحب ہوتے تو اپنے لائق بیٹے کے اس عظیم کام پر کس قدر خوش ہوتے۔

ڈاکٹر نیر مسعود

قرآن نمبر مکمل ہونے کے بعد --- اور ان شاء اللہ ضرور مکمل ہو گا اور آپ ہی کے ہاتھوں--- اردو زبان کی کتنی شان بڑھا دے گا، اس کا تصور کر کے ابھی سے خوش ہو رہا ہوں۔

محمد علی صدیقی

قرآن نمبر جلد اول و دوم کی اشاعت پر دلی مبارکباد۔ آپ نے واقعتاً کمال کر دکھایا ہے۔ اس

قدر اعلیٰ معیار کا منصوبہ ہے کہ آپ کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔ آپ نے جس طرح اپنے والدِ مرحوم کے مشن کو زندہ رکھا ہے وہ ہم سب کے لئے باعثِ فخر ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

محمد طفیل مرحوم نے رسولؐ نمبر کے بعد، قرآن نمبر کا منصوبہ تیار کیا تھا اور غالباً عملاً بھی کچھ کام شروع کر دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد، اس خاص نمبر کی تیاری و ترتیب کا بیڑا، مرحوم کے فرزند ارجمند جناب جاوید طفیل نے اٹھایا اور الولد سرلابیہ کے مصداق، انہوں نے قرآن نمبر کی پہلی دو جلدیں اسی حسن ترتیب، جمالیاتی ذوق و اہتمام اور آب و تاب کے ساتھ شائع کی ہیں، جو مرحوم طفیل صاحب کا خاصا تھا۔

دونوں جلدیں چھے چھے طویل مقالات پر مشتمل ہیں۔ مقالات جامع، مفصل اور تحقیقی نوعیت کے ہیں اور بڑی محنت اور کدوکاوش سے تحریر کیے گئے ہیں۔ زیرِ نظر قرآن نمبر کو "دو نسلوں کی عاجزانہ کاوش" قرار دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہر برس دو جلدیں چھاپنے کا پروگرام ہے اور تکمیل بہ شرط زندگی ۲۰۱۰ء میں متوقع ہے۔

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی ("نقطہ نظر"، اکتوبر ۱۹۹۹ء ۔ ستمبر ۲۰۰۰ء)

اردو کے معروف مجلّے "نقوش" (لاہور) نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، اسوۂ حسنہ اور پیغام پر تیرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل "رسولؐ نمبر" شائع کر کے علم و فضل اور ادارتی لگن کا ایک معیار متعین کر دیا تھا۔ اب قرآن نمبر کی پہلی دو جلدیں شائع کر کے حسبِ سابق ایک حوصلہ مندانہ اور قابلِ رشک کام کا آغاز کیا ہے۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ مجلّے کے مدیرِاعلیٰ جناب جاوید طفیل نے حیرت انگیز طور پر اعلیٰ ترین ادارتی معیار برقرار رکھا ہے۔

افتخار عارف

خیر کے راستوں کو جانے والے اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اجرِ عظیم سے دنیا میں بھی نوازے جاتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ یہ میرا ایمان ہے۔ گھر میں نقوش قرآن نمبر جیسی روشن کتابیں موجود ہوں تو فیض کی ہزار صورتیں ازخود نکلتی ہیں۔

ممتاز قریشی

آپ نے جن موضوعات پر اسلامی اسکالروں سے مضامین لکھوائے ہیں یا لکھے ہوئے شامل کئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے قرآن پاک کے بارے میں ہر موضوع کی تشریح و تفسیر کروائی ہے۔ یہ نئی نسل کے لئے انمول تحفہ ہے۔ آج تک کسی رسالے نے اس قدر محنت، لگن اور کاوش نہیں کی جتنی آپ نے اور آپ کے رفقاء نے کی ہے۔

لطیف الزمان خاں

قرآن نمبر ملا۔ چوما، آنکھوں کو لگایا اور سر پہ رکھا۔ میں نے فارسی میں پڑھا ہے آپ نے اسے عملی شکل دے دی۔ "پسر تمام کند"۔ آپ اپنے والد مرحوم کی روح کو اس سے بڑی تسکین نہیں دے سکتے تھے۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ طفیل بھائی کے صحیح جانشین ہیں۔

محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ

قرآن نمبر کی دو جلدوں میں ذاتِ وجودِ باری کا خود کلام الٰہی میں ظہور لنہ الوہیت کے قرآنی اسرار و معارف کو علم و تحقیق کے جس اعلیٰ معیار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور ان مضامین کے انتخاب کے لئے نقد و نظر کا جو معیار قائم کیا گیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ قرآنی انسائیکلوپیڈیا دراصل گذرنے والی صدی کا آنے والے صدی کے لئے ایک نہایت گراں بہا سوغات ہے اور اقوام عالم، خاص طور پر اسلامی دنیا کے لئے امن و آشتی، ترقی اور خوش حالی کی بشارت بھی۔

محمود عالم قریشی

نقوش قرآن نمبر کی ابتدا کی دو جلدیں کہنے کو تو صفات الٰہی اور اسماء حسنیٰ پر مشتمل ہیں مگر متکلم کی بات اس کے کلام کے حوالے ہی سے مناسبت رکھتی ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر دونوں جلدیں دراصل خالصتاً اللہ پر نہیں کلامِ الٰہی قرآن پر ہیں۔

نقوش کے قرآن نمبر کا ظاہری حسن موضوع سے مطابقت کے ساتھ ساتھ نہایت دیدہ زیب مرقع حسن و جمال ہے، اللہ تعالیٰ مالک و رب کائنات ہے۔ اسی مناسبت سے دونوں جلدوں کا ٹائیٹل کائنات کی عکاسی کرتا ہے۔

سید جمیل رضوی

نقوش قرآن نمبر کی پہلی دو جلدیں وصول ہوئیں۔ ان کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ معنوی اور صوری خوبصورتی سے آراستہ ہیں۔ ان میں شامل مقالات کے مندرجات کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

نقوش کا یہ تحقیقی منصوبہ قرآنی تعلیمات کو عام کرنے میں ممدومعاون ثابت ہو گا۔ ملت اسلامیہ کی بقا اور ارتقاء اس روشنی میں سفر جاری رکھنے میں مضمر ہے جو قرآن مجید فراہم کرتا ہے۔

ادارۂ نقوش نے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نقوش کے درج ذیل پرچوں کو C. D. پر منتقل کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ درج ذیل پرچے C. D. پر محدود تعداد میں جلد دستیاب ہوں گے۔

قرآن نمبر اوّل، دوم، سوم، چہارم

قرآن نمبر (انگلش ترجمہ) اوّل، دوم

رسولؐ نمبر (مکمل)

افسانہ نمبر ۔ شخصیات نمبر ۔ لاہور نمبر

غزل نمبر ۔ گولڈن جوبلی نمبر

○

نقوش کے درج ذیل پرچے عرصہ دراز سے سٹاک میں موجود نہیں تھے اب
ہم نے ان کو ایک باقاعدہ پروگرام کے تحت چھاپنا شروع کیا ہے ۔

○ رسولؐ نمبر مکمّل سیٹ ۳۹۰۰/- روپے
○ شخصیات نمبر دو جلدیں ڈی لکس ایڈیشن ۱۰۰۰/- روپے
○ افسانہ نمبر ڈی لکس ایڈیشن ۸۰۰/- روپے

——— دستیاب ہیں

○ قرآن نمبر (انگلش ترجمہ) جلد اوّل، دوم ۸۰۰/- روپے
○ لاہور نمبر ڈی لکس ایڈیشن ۱۰۰۰/- روپے
○ غزل نمبر ڈی لکس ایڈیشن ۸۰۰/- روپے

——— اکتوبر/ نومبر میں دستیاب ہوں گے

○

نقوش
قرآن نمبر
جلد پنجم کے
اہم ابواب
تخلیقِ کائنات سے تخلیقِ آدم تک
مذاہب عالم میں تصورِ اللہ
صحف سماویہ اور مقدس کتابیں